

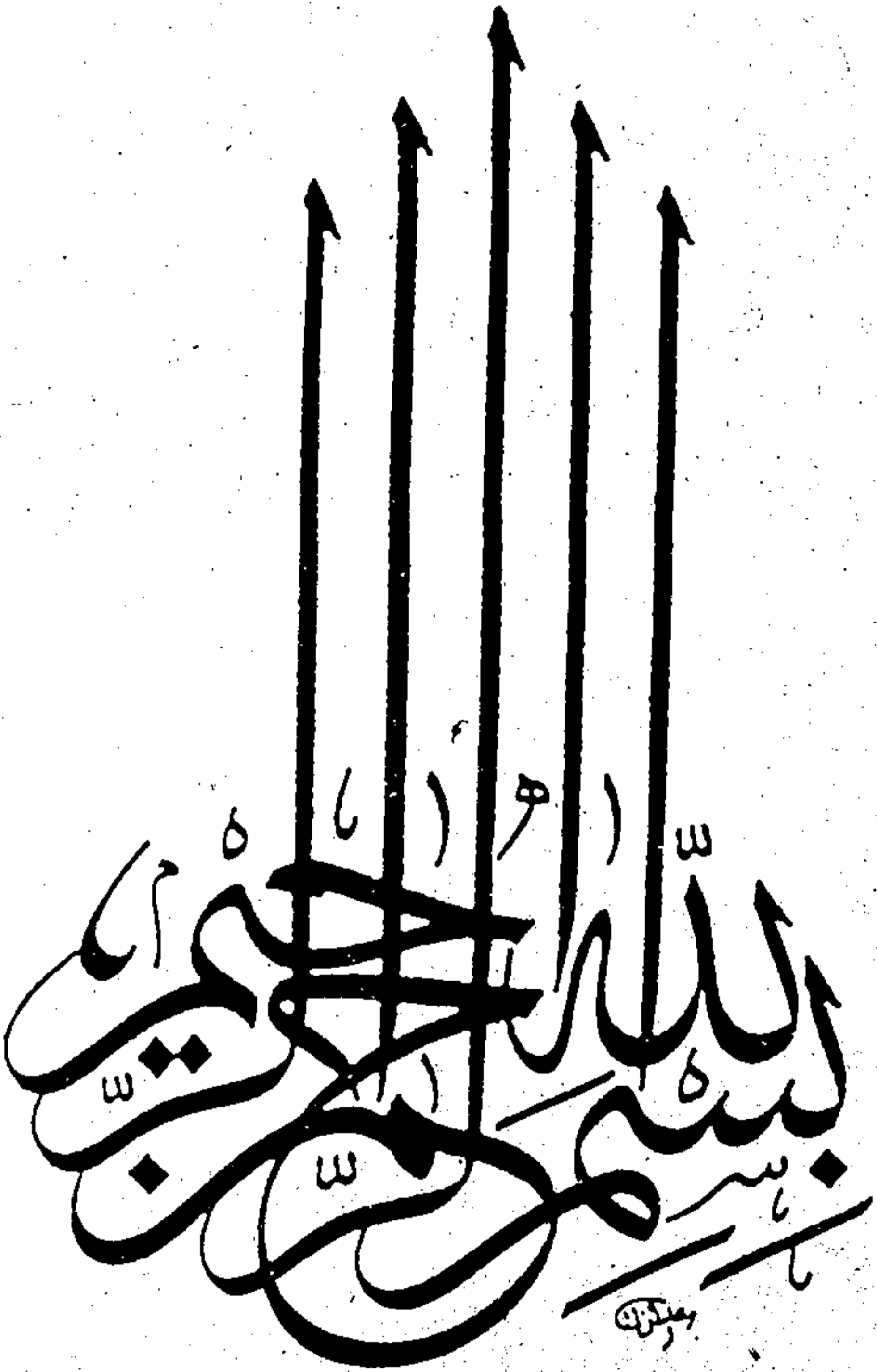


پروفیسر محمد اکرم رضا

قادی رضوی کتب خانہ لاہور

Click For More Books

<https://archive.org/details/@zohaibhasanattari>



Click For More Books

<https://archive.org/details/@zohaibhasanattari>

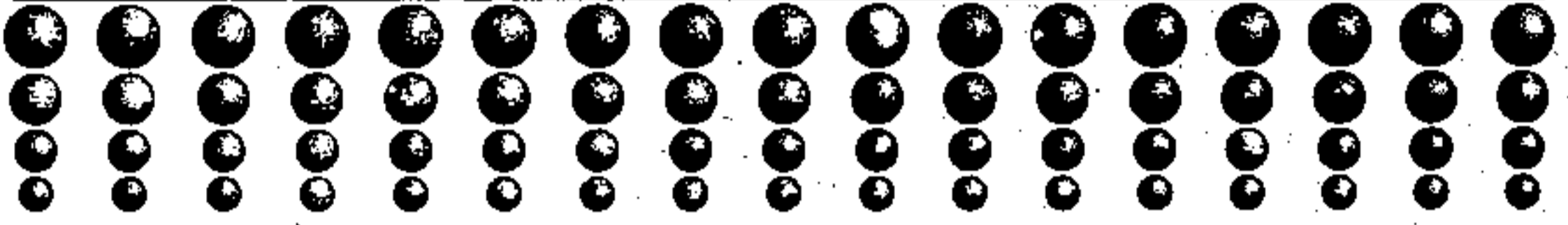


الصَّلَاةُ وَالشَّلَاةُ عَلَيْكَ يَا سَيِّدِي يَا سَيِّدِي يَا سَيِّدِي يَا سَيِّدِي
وَعَلَىٰ أُمَّتِكَ يَا سَيِّدِي يَا سَيِّدِي يَا سَيِّدِي يَا سَيِّدِي
اللَّهُمَّ صَلِّ عَلَىٰ مُحَمَّدٍ وَآلِهِ وَسَلَّمَ
صَلِّ عَلَىٰ مُحَمَّدٍ وَآلِهِ وَسَلَّمَ

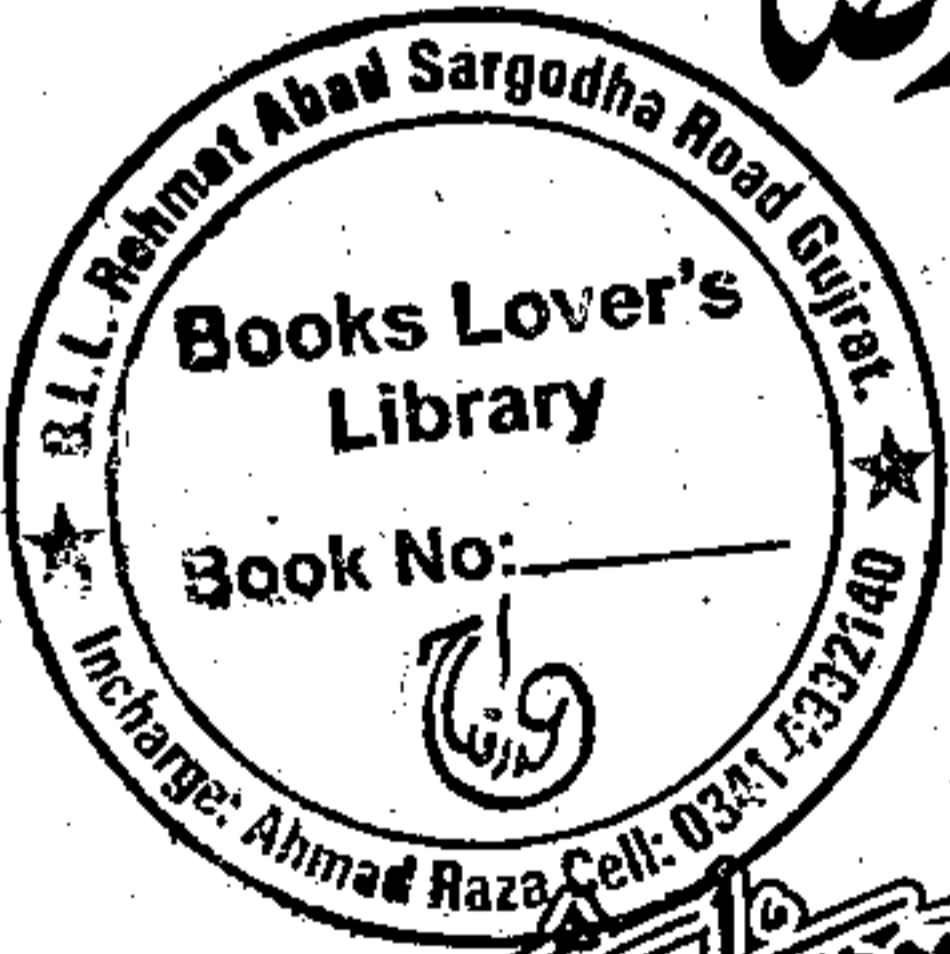
مَوْلَايَ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًا أَبَدًا
عَلَىٰ حَبِيبِكَ خَيْرِ الْخَلْقِ كُلِّهِمْ
هُوَ الْحَبِيبُ الَّذِي تُرْجَىٰ شَفَاعَتُهُ
لِكُلِّ هَوَلٍ مِنَ الْأَهْوَالِ مُفْتَحِيمٍ
مُحَمَّدٌ سَيِّدُ الْكَوْنَيْنِ وَالْبَقَلَيْنِ
وَالْفَرِيقَيْنِ مِنْ عَرَبٍ وَمِنْ عَجَمٍ
فَإِنَّ مِنْ جُودِكَ الدُّنْيَا وَضَرَّتْهَا
وَمِنْ عُلُومِكَ عِلْمُ النَّوْجِ وَالْقَلَمِ



انعام یافتہ مستندیاں



پروفیسر محمد اکرم رضا



قاری رضوی لکچرری

گنج بخش روڈ، لاہور 042-7213575

Click For More Books

<https://archive.org/details/@zohaibhasanattari>

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں



انعام یافتہ ہستیاں	نام کتاب
پروفیسر محمد اکرم رضا	مصنف
محمد نعیم اللہ خان قادری	پیش کش
محمد نعیم اللہ خان قادری	نظر ثانی
1429ھ 2008ء	بار اول
816	صفحات
1100	تعداد
عزیز کمپوزنگ سنٹر 0344-4996495	کمپوزنگ
محمد رمضان فیضی گرافکس سٹا ہوٹل لاہور	سرورق
چوہدری محمد خلیل قادری	زیر نگرائی
چوہدری محمد ممتاز احمد قادری	تحریک
چوہدری عبدالحمید قادری	ناشر
400/- روپے	ہدیہ

ملنے کا پتہ

مکمل مشیہ حقیقیہ گنج بخش روڈ لاہور
قادری رضوی کتب خانہ گنج بخش روڈ لاہور
Hello: 042-7213575, 0333-4383766

Click For More Books

<https://archive.org/details/@zohaibhasanattari>

فہرست

صفحہ نمبر	عنوان	نمبر شمار
10	ابتدائیہ..... اَنْعَمْتُ عَلَيْهِمْ	1
19	علامہ پروفیسر محمد اکرم رضا۔ اجمالی تعارف	2
صحابہ کرام رضی اللہ عنہم		
26	سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ	3
33	اسوۃ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اور قرون اولیٰ کی ایک جھلک	4
40	امیر المومنین حضرت سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ	5
54	سیدنا علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ الکریم	6
66	امیر المومنین سیدنا امام حسن رضی اللہ عنہ	7
83	سید الشہداء امام حسین رضی اللہ عنہ	8
91	حضرت امیر حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ	9
101	حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ	10
107	حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ	11
118	حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ	12
128	حضرت سعد الاسود رضی اللہ عنہ کا ذوق شہادت	13
137	حضرت زیاد رضی اللہ عنہ	14
142	سیدنا حضرت امام زین العابدین رضی اللہ عنہ	15
149	حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ	16
محدثین عظام		
157	امام ابو عبداللہ محمد بن اسماعیل البخاری رضی اللہ عنہ	17
171	حضرت امام مسلم رضی اللہ عنہ	18
ائمہ کرام		
181	سراج الائمہ امام اعظم نعمان بن ثابت رضی اللہ عنہ	19

صفحہ نمبر	عنوان	نمبر شمار
188	امام محمد بن ادریس شافعی <small>رحمۃ اللہ علیہ</small>	20
200	حضرت امام احمد بن حنبل <small>رحمۃ اللہ علیہ</small>	21
صوفیائے کرام اور اولیائے عظام		
213	تصوف اور صوفیائے عظام	22
237	حضرت فضیل بن عیاض <small>رحمۃ اللہ علیہ</small>	23
248	حضرت مالک بن دینار <small>رحمۃ اللہ علیہ</small>	24
258	حضرت جنید بغدادی <small>رحمۃ اللہ علیہ</small>	25
268	حضرت ذوالنون مصری <small>رحمۃ اللہ علیہ</small>	26
273	حضور داتا گنج بخش سیدنا علی ہجویری <small>رحمۃ اللہ علیہ</small>	27
288	محبوب سبحانی سیدنا عبدالقادر جیلانی <small>رحمۃ اللہ علیہ</small>	28
305	حضرت خواجہ بہاؤ الدین زکریا ملتانی <small>رحمۃ اللہ علیہ</small>	29
315	مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندی <small>رحمۃ اللہ علیہ</small>	30
325	خواجہ خواجگان حضرت خواجہ معین الدین چشتی <small>رحمۃ اللہ علیہ</small>	31
336	زہد الانبیاء حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکر <small>رحمۃ اللہ علیہ</small>	32
352	سلطان العارفین حضرت سلطان باہو <small>رحمۃ اللہ علیہ</small>	33
357	حضرت نخی سرور سلطان <small>رحمۃ اللہ علیہ</small>	34
362	حضرت میاں میر بالا قادری لاہوری <small>رحمۃ اللہ علیہ</small>	35
376	حضرت خواجہ محمد سلیمان چشتی تونسوی <small>رحمۃ اللہ علیہ</small>	36
386	حضرت سید جماعت علی شاہ ثانی لاہانی <small>رحمۃ اللہ علیہ</small>	37
392	امیر ملت پیر سید جماعت علی شاہ محدث علی پوری <small>رحمۃ اللہ علیہ</small> اور تحریک پاکستان	38
406	حضرت پیر سید علی اکبر شاہ نقشبندی <small>رحمۃ اللہ علیہ</small>	39
412	حضرت شاہ رحمان نوشاہی <small>رحمۃ اللہ علیہ</small>	40
417	حضرت سائیں توکل شاہ انبالوی <small>رحمۃ اللہ علیہ</small>	41
424	شیر ربانی حضرت میاں شیر محمد شرقی پوری <small>رحمۃ اللہ علیہ</small>	42
433	حضرت سید محمد اسماعیل شاہ بخاری <small>رحمۃ اللہ علیہ</small> کرمانوالہ	43

صفحہ نمبر	عنوان	نمبر شمار
442	حضرت سید نور الحسن شاہ بخاری <small>رحمۃ اللہ علیہ</small> حضرت کیلیا نوالہ شریف	44
453	حضرت خواجہ محمد عمر بیر بلوی <small>رحمۃ اللہ علیہ</small>	45
460	شمس العارفین حضرت خواجہ شمس الدین سیالوی <small>رحمۃ اللہ علیہ</small>	46
468	حضرت خواجہ محمد دین ثانی سیال شریف <small>رحمۃ اللہ علیہ</small>	47
480	حضرت خواجہ محمد ضیاء الدین سیالوی <small>رحمۃ اللہ علیہ</small>	48
488	حضرت شیخ الاسلام خواجہ محمد قمر الدین سیالوی <small>رحمۃ اللہ علیہ</small>	49
498	قطب عالم حضرت خواجہ احمد میروی <small>رحمۃ اللہ علیہ</small>	50
504	حضرت خواجہ محبوب احمد چشتی میروی <small>رحمۃ اللہ علیہ</small>	51
511	تحریک پاکستان اور مشائخ و علمائے کرام	52
522	حضرت علامہ محمد امجد علی اعظمی <small>رحمۃ اللہ علیہ</small>	53
532	محدث اعظم پاکستان حضرت مولانا سردار احمد قادری <small>رحمۃ اللہ علیہ</small>	54
538	قطب مدینہ حضرت علامہ مفتی محمد ضیاء الدین احمد مدنی قادری <small>رحمۃ اللہ علیہ</small>	55
544	شیخ القرآن حضرت مولانا عبدالغفور ہزاروی <small>رحمۃ اللہ علیہ</small>	56
552	مجاہد تحریک پاکستان حضرت مولانا محمد بخش مسلم <small>رحمۃ اللہ علیہ</small>	57
564	ضیاء الامت حضرت جسٹس پیر محمد کرم شاہ الازہری <small>رحمۃ اللہ علیہ</small>	58
570	قائد ملت اسلامیہ حضرت مولانا شاہ احمد نورانی صدیقی <small>رحمۃ اللہ علیہ</small>	59
578	بحر العلوم مولانا محمد فیض قادری <small>رحمۃ اللہ علیہ</small>	60
586	شمس العلماء حضرت مولانا محبوب عالم قادری <small>رحمۃ اللہ علیہ</small>	61
593	سراج معرفت حضرت داتا شاہ جمال نوری <small>رحمۃ اللہ علیہ</small>	62
604	شہباز طریقت حضرت مولانا غلام جیلانی <small>رحمۃ اللہ علیہ</small>	63
613	فخر الاصفیاء حضرت ملا محمد سعید <small>رحمۃ اللہ علیہ</small>	64
621	مبلغ اسلام مولانا غلام احمد چشتی <small>رحمۃ اللہ علیہ</small>	65
626	حضرت خواجہ محمد کریم اللہ عباسی قادری <small>رحمۃ اللہ علیہ</small>	66
637	حضرت خواجہ محمد بشیر عباسی قادری <small>رحمۃ اللہ علیہ</small>	67
643	حضرت سید بشیر احمد سوہدروی <small>رحمۃ اللہ علیہ</small>	68

Click For More Books

<https://archive.org/details/@zohaibhasanattari>

صفحہ نمبر	عنوان	نمبر شمار
646	حضرت خواجہ دین محمد قادری <small>رحمۃ اللہ علیہ</small>	69
651	حضرت خواجہ پیر محمد بڈھا <small>رحمۃ اللہ علیہ</small>	70
653	مفسر قرآن مولانا محمد عمر رتالوی <small>رحمۃ اللہ علیہ</small>	70
657	حضرت قبلہ پیر محبت علی شکوری <small>رحمۃ اللہ علیہ</small>	71
661	حضرت مولانا محمد عالم آسی <small>رحمۃ اللہ علیہ</small>	72
664	حضرت علامہ مفتی بشیر حسین قادری <small>رحمۃ اللہ علیہ</small>	73
670	حضرت مولانا محمد حسین اہل <small>رحمۃ اللہ علیہ</small>	74
672	حضرت محمد حسین شاہ <small>رحمۃ اللہ علیہ</small>	75
678	حضرت موسیٰ بن سلیمان ہاشمی <small>رحمۃ اللہ علیہ</small>	76
683	مجاہد اسلام سلطان محمود غزنوی	77
689	نیکی اور بدی کے دو کردار	78
695	حضرت خواجہ محمد عمر عباسی قادری <small>رحمۃ اللہ علیہ</small>	79
702	شہر یار خطابت صاحبزادہ سید فیض الحسن شاہ آلومہاروی <small>رحمۃ اللہ علیہ</small>	80
711	حضرت مولانا مفتی عبداللہ قادری مردانوی <small>رحمۃ اللہ علیہ</small>	81
718	رئیس الحدیث حضرت سید احمد سعید شاہ کاظمی <small>رحمۃ اللہ علیہ</small>	82
732	عالمی مبلغ اسلام حضرت شاہ عبدالعلیم میرٹھی <small>رحمۃ اللہ علیہ</small>	83
743	مجاہد تحریک آزادی امام فضل حق خیر آبادی <small>رحمۃ اللہ علیہ</small>	84
755	حضرت قطب جمال الدین ہانسوی <small>رحمۃ اللہ علیہ</small>	85
764	حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء <small>رحمۃ اللہ علیہ</small>	86
777	حضرت ابراہیم بن ادہم <small>رحمۃ اللہ علیہ</small>	87
793	امام محمد ابو عیسیٰ ترمذی <small>رحمۃ اللہ علیہ</small>	88
803	حضرت ابوالبلیان علامہ محمد سعید احمد مجددی <small>رحمۃ اللہ علیہ</small>	89
810	حضرت شیخ ابوالحسن علی بن احمد خرقانی <small>رحمۃ اللہ علیہ</small>	90
817	پیر سید محمد معصوم شاہ گیلانی نوری <small>رحمۃ اللہ علیہ</small>	91



Click For More Books

<https://archive.org/details/@zohaibhasanattari>

افتساب

ان عظیم المرتبت محسنین اسلام کے نام کہ جن کی زبان کی تاثیر، عمل کی سرفرازی، علم کی سر بلندی، اسوۂ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پیروی اور قلم کی تب و تاب سے بزم ہستی اپنی آخری ساعتوں تک جگمگاتی رہے گی۔

(پروفیسر محمد اکرم رضا)

Click For More Books

<https://archive.org/details/@zohaibhasanattari>

ابتدائیہ

انعمت علیہم

وقت ہمیشہ ان فرزند ان روزگار کے سامنے سر خمیدہ نظر آتا ہے جنہوں نے اپنی سیرت کی خوشبو کردار کے حسن اور عمل کی قوت تسخیر سے ہر دور کو متاثر کیا ہوتا ہے۔ یہی خوش بخت اصحاب نظر ہوتے ہیں جن کی زبان کی تاثیر اور فکر و عمل کی شوکت تعمیر سے ہر زمانے کو صراط حق سے آشنائی عطا ہوتی ہے۔ ظلمت جس قدر گہری ہو اجالوں کی تمنا اتنی ہی زیادہ بڑھتی جاتی ہے۔ اشرار باطل جس قدر بھی قوی ہوں چراغ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی جلوہ گری کی تمنا اتنی ہی زیادہ دلوں میں ابھرنے لگتی ہے۔ تقدیر خداوندی تو بندگان حق و صداقت کے دلوں سے ابھرنے والی تمناؤں کی منتظر ہوتی ہے اور پھر یہیں سے الطاف خداوندی کا دھارا ایسے نفوس قدسیہ کو صدیوں کا اعزاز بنا دیتا ہے جو اپنے علم و عمل سے قلعوں کو نہیں بلکہ دلوں کو تسخیر کرتے ہیں۔ ان نفوس قدسیہ کا ظاہر و باطن احکامات خدا و مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء میں اس قدر ڈھل چکا ہوتا ہے کہ یہ جدھر بھی بڑھتے ہیں تقدیر خداوندی کا لہراتا ہوا پھریرا ان کے سروں پر جلوہ فگن رہتا ہے اور پھر دنیاوی و اخروی اعزازات اور ازلی وابدی اکرامات ان کا سرمایہ اعزاز بن جاتے ہیں۔ یہ اپنے کردار کو عشق و عقیدت کی روشنی بخش کر خود کو تقدیر یزداں کے حوالے کر دیتے ہیں۔ وہ خدائے لم یزل جو خطا کاروں کو بھی محروم کرم نہیں رکھتا ان کو اپنی لاقتناہی قوتوں کا مظہر بنا دیتا ہے۔ ارشاد خداوندی ہے۔

من یطع اللہ والرسول فأولئک مع الذین انعم اللہ علیہم من النبین والصدیقین

والشهداء والصلحین وحسن اولئک رفیقاً ذلک فضل من اللہ وکفی باللہ علیمان

(پارہ ۵، رکوع ۱۰)

ترجمہ جس نے اطاعت کی اللہ اور اس کے رسول کی پس ایسے لوگ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام کیا اور وہ انبیاء صدیقین، شہداء اور صالحین ہیں اور یہ حضرات اچھے ساتھی ہیں۔

Click For More Books

<https://archive.org/details/@zohaibhasanattari>

یہ فضل اللہ کی طرف سے ہے اور کافی ہے اللہ باعتبار علم کے۔

حق یہ ہے کہ جب بندہ خدا کی رضا میں ڈھل جاتا ہے اس کی ایک ایک سانس، نبضوں کی حرارت، ذہنوں کی ذہانت، افکار کی ندرت، اس کا کھانا، اس کا پینا، اس کی نماز اور قربانی، اس کا ناز و نیاز، اس کی سحر کا گداز، اس کے ایمان کی حرارت، اس کی ذہنی تپ و تاب سب کچھ خدا اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے وقف ہو جاتے ہیں۔ لفظ دم توڑ جاتے ہیں۔ عمل خمیدہ سر بارگاہ ایزدی میں ہدیہ نیاز بجالاتا ہے تو پھر خدا کی رحمتیں اس کے انعامات قدسیہ کا روپ دھار کر اس بندہ مومن کے روپ میں ظاہر ہو جاتی ہیں اور اس کے سر عجز و نیاز پر۔

”انعمت علیہم“

کا تاج روحانیت سجا دیا جاتا ہے۔ پوری کائنات اس کی جاگیر ہوتی ہے وہ جو چاہتا ہے ہو جاتا ہے کیونکہ اب اس کا اپنے لئے کچھ نہیں سب کچھ رب ذوالجلال کیلئے ہوتا ہے۔ وہ رب ذوالجلال جس کے انعامات اس خاک نشین کو افلاک بداماں کر دیتے ہیں مگر وہ عطا ہونے والے تمام انعامات کو محبوب دو عالم مدوح کائنات حضور محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کی پیروی سے مشروط کر دیتا ہے رب کریم اسے ”من یطع الرسول فقد اطاع اللہ“ کا پیغام سرمدی عطا کر کے جلوہ ہائے مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم کی بدولت تجلیات ربانی سے بہرہ اندوز ہونے کی توفیق عطا کرتا ہے۔ ”انعمت علیہم“ کے منصب نور پر فائز ہوتے ہی اس بندہ حق پر فقر و درویشی کے دروازے کھلنے لگتے ہیں۔ اسے شریعت کے آئینہ خانے میں جھانک کر ہی طریقت اور معرفت کا حصہ وافر عطا ہوتا ہے۔ اس کی ضرب، ضرب ید الہی اور اس کی راست گوئی صدق صدیق کی ترجمان بن جاتی ہے مگر بات لفظ و آہنگ کی نہیں بلکہ عمل اور فقط عمل کی ہے۔ خدا کے نام پر عمل کی میزان پر تلنے والا کبھی سرنگوں نہیں ہوتا اور ظاہریت کے جمال میں گم ہونے والا خرد کی پہلی ہی منزل پر گمراہ منزل ہو جاتا ہے۔ اس کے نصیب میں عشق سرفراز کی نوازشیں کہاں؟

فقر و تصوف کو جو نام چاہے دے لیں اس کا خمیر ہمیشہ شریعت حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اٹھا ہے۔ شریعت کا دشمن ہواؤں میں اڑ کر آگ اور پانی پر چل کر شعبدہ باز تو ہو سکتا ہے قرب الہی کی منزل اولین کا مسافر بھی نہیں بن سکتا۔ اب یہی فقر و درویشی اس کیلئے عطائے خداوندی بن جاتی ہے عرفان ذات مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے بہرہ یاب ہونے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ یہی وہ مقام ہوتا ہے جب قدم اس کے ہوتے ہیں حرکت خدا کی ہوتی ہے ہاتھ اس کے ہوتے ہیں قوت خدا کی ہوتی ہے زبان اس کی ہوتی ہے ترجمانی رب ذوالجلال کی ہوتی ہے اور یہی وہ کیفیت ہوتی ہے کہ جب

Click For More Books

<https://archive.org/details/@zohaibhasanattari>

گفتہ او گفتہ اللہ بود
گرچہ از حلقوم عبد اللہ بود
اللہ اللہ گفتن اللہ سے شود
ایں سخن حق است واللہ سے شود
یک زمانہ صحبت با اولیاء
بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

اب ان کے مقامات ملاحظہ کیجئے جو ”انعمت علیہم“ کی رفعتوں کے حق دار بنے۔ صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ”سات آدمی قیامت کے دن وہ ہوں گے جن کو اللہ تعالیٰ اپنے عرش کے سائے کے نیچے رکھے گا، جس دن اللہ کے عرش کے سایہ کے علاوہ کوئی سایہ نہ ہوگا۔ حاکم عادل وہ جوان جو اللہ کی عبادت کرتا ہوا جوان ہوا، وہ آدمی جس کا دل ہر وقت مسجد سے معلق رہے۔ وہ دو آدمی جو آپس میں صرف اللہ ہی کیلئے محبت کرتے ہیں، اس پر جمع ہوتے ہیں اس پر جدا ہوتے ہیں، وہ آدمی جس کو حسن و جمال والی عورت نے برائی کی دعوت دی لیکن وہ یہ کہہ کر کنارہ کش ہو گیا کہ میں اللہ سے ڈرتا ہوں۔ وہ جو اپنے دائیں ہاتھ سے خرچ کرتا ہے لیکن بائیں ہاتھ کو پتہ بھی نہیں لگنے دیتا کہ میں نے کیا خرچ کیا۔ وہ شخص جو اللہ کو یاد کرتا ہے، خوف خدا سے اس کے آنسو نکل آتے ہیں۔

معلوم ہوا کہ ”انعمت علیہم“ کے مقام پر فائز ہونے کیلئے عمر لباس وقت اور کسی مخصوص طرز عمل کی ضرورت نہیں۔ لازم ہے کہ وہ رضائے الہی اور رضائے مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا متلاشی رہے۔ اس کے قول و فعل میں معمولی سا تضاد نہ ہو، وہ جس نیک گفتاری کا سہارا لیتا ہے اس کی خلوتیں اور اس کی جلوتیں اس کی شاہد ہوں۔ وہ خوف خدا میں اس قدر ڈوب جائے کہ شاہان وقت کے سامنے کلمہ حق کی سر بلندی کے نام پر ہر سختی اور سزا کو خالق کو نین کا انعام خیال کرے۔

مرد خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ

عشق ہے اصل حیات موت ہے اس پر حرام

یہی ”انعام یافتہ ہستیاں“ ہیں جو فقر و درویشی کو چراغ راہ بنا کر منزل معرفت الہی کی طرف بڑھتی ہیں۔ علم ان کا اعزاز، عشق خداوندی ان کا افتخار، محبت رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام ان کا امتیاز، قرآن ان کی پہچان، عمل ان کی زندگی کا اعزاز، فقر ان کی ڈھال، سادگی و درویشی ان کی زرہ بن کر انہیں جادۂ

عمل پر چلتے رہنے کا حوصلہ بخشتے ہیں۔ زمانہ انہیں دیکھے تو پہچان نہ پائے، وقت ان کی گرد راہ تک نہ پہنچ سکے۔ شاعر مشرق نے بھی اس تصور خدا شناسی کو اس طور اجاگر کیا ہے۔

عقل ہے تیری سپر، عشق ہے شمشیر تیری
مرے درویشِ خلافت ہے جہانگیر تیری
ماسوا اللہ کے لئے آگ ہے تکبیر تیری
تو مسلمان ہو تو تقدیر ہے تدبیر تیری
کی محمد سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

خدائے قدوس کی طرف سے رحمتوں کی خوشخبری ”ہم تیرے ہیں“ اور ہم ہی نہیں ”لوح و قلم بھی تیرے ہیں“ دراصل وہ انعامِ قدسی ہے جو مقدر سے ہی کسی کا اعزاز بنتا ہے۔ خدا کی طرف سے ”انعام یافتہ“ ہونے کی تمنا تو سبھی کرتے ہیں مگر اس کے حصول کیلئے جس طرح سے اپنی حیات مستعار کا لمحہ لمحہ انعامِ خداوندی کے نام پر تصدق کرنا پڑتا ہے۔ وہ شوکتِ ایمان کی داستان نور کا حسین باب ہے۔ معرفتِ شناسی کا نعرہ آسان ہے مگر اس کے پس پردہ قربانی و عزیمت کی لازوال داستان ہے۔ وہ خدا ہی کیا جو شریعت اور اطاعتِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے قطعاً بے بہرہ کو انعام و اکرامِ ابدی کا حق دار قرار دے دے۔ بے شک وہ صاحبِ قدرت ہے مگر اس کی قدرت کے اسرارِ قرآنِ حکیم اور احادیث کے شہ پاروں سے انوار کی صورت چھن چھن کر ابھر رہے ہیں اور انہی فیوض کی قوسِ قزح سے بزمِ ہستی منور ہو رہی ہے۔ اس ضمن میں یہ حکایت ہر صاحبِ نظر کی راہنمائی کرتی ہے۔

سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کا لنگر بہت بڑا تھا۔ جس سے اپنے بیگانے مسافر، راہرو سبھی فیضیاب ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک شخص آپ سے شرفِ بیعت حاصل کرنے کی غرض سے آیا۔ اس نے آپ کی کرامات کا شہرہ سن رکھا تھا۔ وہ قریباً ایک سال وہاں مقیم رہا اور پھر اچانک واپسی کا ارادہ کر کے حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا۔ روشن ضمیر حضرت جنید بغدادی نے پوچھا: اے مرد صالح تو ایک عرصہ ہمارے ہاں مقیم رہا، نہ آنے کا سبب بتایا اور اب جانے کے بارے میں کچھ نہیں بتا رہے۔ اس نے کہا: حضرت! میں آپ کی کرامات کا شہرہ سن کر آیا تھا۔ مگر اس ایک سال کے عرصہ میں نے آپ کی کوئی کرامت نہیں دیکھی۔ آپ نے فرمایا: تم نے اور مقامات پر کیا کیا دیکھا ہے؟ اس آدمی نے کہا: میں نے ایک مقام پر ایک مرد درویش کو ہوا میں پرواز کرتے دیکھا۔

ایک اور مقام پر ایک درویش کو پانی پر چلتے دیکھا۔ ایک جگہ ایک صوفی کو آگ پر چلتے دیکھا، لیکن آپ کے ہاں تو میں نے ایسی کوئی بات نہیں دیکھی۔ حضرت نے مسکرا کر کہا: کیا تم نے میرا کوئی عمل خلاف شریعت دیکھا ہے؟ میں نے نماز نہ پڑھی ہو، روزے نہ رکھے۔ قرآن و سنت کا درس نہ دیا ہو، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے راستے کو چھوڑا ہو۔ کبھی کوئی ایسا جملہ میری زبان سے نکلا ہو جو خدا و مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے منافی ہو۔ اس شخص نے کہا: نہیں حضرت ایسی تو کوئی بات نہیں۔ آپ نے فرمایا: شریعت کی یہی پابندی تو عین کرامت ہے۔ پھر فرمایا: تم ہوا میں اڑنے والے کو صاحب کرامت صوفی سمجھتے ہو تو ہوا میں تو مچھراؤ رکھیاں بھی اڑتی ہیں، تم ان کی بیعت کر لو۔ تم نے پانی پر چلنے کو کرامت سمجھا ہے۔ پانی میں تو مچھلیاں اور مینڈک بھی تیرتے ہیں۔ تم ان کے جادہ پر عمل کیوں نہیں کرتے۔ تم آگ پر چلنے کو کرامت سمجھتے ہو تو یہ تو سراسر شعبہ بازی ہے۔ تم ان شعبہ بازوں کے غلام کیوں نہیں بن گئے؟ اب اس شخص کی نگاہ باطن بہت کچھ دیکھ رہی تھی، وہ کرامت اور شعبہ بازی میں فرق سمجھ رہا تھا، بے اختیار رونے لگا اور عرض کیا ”حضرت! پھر ارشاد فرمائیے کہ کرامت کسے کہتے ہیں؟ حضرت جنید بغدادی نے جلال کے عالم میں اس طالب حق کو دیکھا۔ اس کے دل پر نگاہ کی اور فرمایا ”اصل کرامت یہ ہے کہ مرد مومن کسی طالب حقیقی کے دل میں برے کے بغیر سوراخ کر کے اللہ ہو کی ضرب لگاتا ہو اس طرح جا بیٹھے کہ مومن کا دل اللہ کی تجلی گاہ بن جائے۔ یہ فرما کر آپ نے عظمت کبریائی کا نعرہ لگایا تو اس طالب حقیقی کو ایسا لگا جیسے حضور میرے دل کے ایوان میں تشریف فرما ہیں اور خدا کی رحمت و عنایات کے انوار سے اس کا دل بھر پور ہوتا جا رہا ہے۔

دراصل یہی وہ کرامت ہے جو خدا سے بے بہرہ انسانوں کو معرفت الہی کی منزل عطا کرتی ہے۔ دنیا کی برکات اور آخرت کی عنایات کو اس کے نام کر دیتی ہے۔ چار دانگ عالم میں اسلام جس تیزی سے پھیلا ہے اس کا سب سے بڑا سبق ان صوفیائے عظام کی کرامات ظاہری نہیں تھیں بلکہ وہ کرامات باطنی تھیں، جنہوں نے تاریک دل جگمگا دیئے۔ خدا سے بے خبر انسانوں کو خدا کی ذات سے آگاہی عطا کی۔ ان مردان حق کا اپنا کوئی وطن نہیں ہوتا۔ مشرق و مغرب، شمال و جنوب سب ان کی جاگیر ہوتے ہیں۔ یہ عبادت الہی میں شب و روز محو رہ کر کرامات طلب نہیں کرتے بلکہ کرامات تو ان کیلئے اضافی انعام ہوتا ہے تاکہ ”انعمت علیہم“ کی منزل پر فائز ہونے والوں کو جو انعام عطا ہوتا ہے اس سے ساری دنیا باخبر ہو جائے، کیونکہ دنیا کی باخبری کیلئے کچھ ظاہری مظاہر بھی ہوتے ہیں، کسی مرد حق نے کبھی دعا میں کرامات طلب نہیں کیں۔ انہوں نے تو خدا سے خدا ہی کو مانگا ہے اور اس شان

سے خدا کی عبادت کے جلوؤں میں گم ہو گئے کہ عبد ہو کر معبود کے جلوؤں کے ترجمان بن گئے۔ یہی وہ منزل ہوتی ہے جب بندہ مومن خدا کا ہاتھ بنتا ہے اس کی زبان بنتا ہے اس کی نظر اور اس کے پاؤں بنتا ہے۔ رب العالمین ان سب چیزوں سے بے نیاز ہے مگر ان بندگان خاص کے ذریعہ ہی پہچان کرانے کیلئے انہیں غیر معمولی جلالت، فہم و بصیرت، دور رس نظر اور کبھی شکست نہ کھانے والی قوت سے نوازتا ہے۔

وہ جس کے بازوؤں سے اک زمانہ سہا جاتا ہے
نگاہ پاک سے آئینہ دل جھلملاتا ہے
دل پر نور جس کا اک جہاں کو جگمگاتا ہے
قدم اس کا جدھر اٹھتا ہے باطل لڑکھراتا ہے
یہی ہیں جن پہ لطف خالق دارین ہوتا ہے
ہر اک درویش کامل حاصل کونین ہوتا ہے
(رضا)

جن ہستیوں کا انعام خداوندی مقدر بنتا ہے ان کے تذکرے رب العالمین از خود زمانے بھر میں عام کر دیتے ہیں۔ اپنی ولایت کا ڈھنڈورا خود پیٹنے والے تو بتان عجم کے پجاری ٹھہرے مگر ان کا کیا کہیے جو رضائے الہی میں زندگی گزار کر آسودہ لحد ہو جاتے ہیں مگر بزم ہستی یکا یک ان کی روحانی چکا چوند اور ایمانی جگمگاہوں سے ضو بار ہو جاتی ہے۔ لاہور کے داتا گنج بخش سید علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ ہوں یا اجمیر کے غریب نواز خواجہ معین الدین چشتی اجمیری، سرہند کے مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی ہوں یا بغداد کے غوث الاعظم سید عبدالقادر جیلانی، پاکپتن کے بابا فرید الدین مسعود گنج شکر ہوں یا ملتان کے حضرت بہاؤ الدین زکریا ملتانی، دہلی کے خواجہ قطب الدین بختیار کاکی ہوں یا خواجہ نظام الدین اولیاء تونسہ کے صحراؤں میں معرفت الہی کے گلاب اگانے والے حضرت شاہ سلیمان تونسوی ہوں یا عصر حاضر میں شرقپور کے شیر ربانی میاں شیر محمد شرقپوری ان میں سے کسی کی خوشبوئے کرم نوازی کتابوں، رسائل و جرائد اور من گھڑت کرامات کی مرہون منت نہیں ہے۔ یہ تو عین فضل الہی ہے جو بنجر وادیوں کو آب حیات بخشا، ظلمتوں کو انوار سے ضو بار کرتا اور اپنی رضا میں سرمست ہو کر زندگی گزارنے والوں کو زمانے بھر کیلئے اپنی عظمتوں کا لافانی مظہر بنا دیتا ہے۔ وہی انعام سے نوازے تو کیسے ممکن ہے کہ کائنات کے سب سے بڑے حکمران کے انعام یافتہ افراد کے تذکار وقت کے دھند لکوں

میں چھپ جائیں۔ یہ لوگ تو خدا کی دلیل ہیں۔ ان کے کردار کی پاکیزگی سے تو رب پہچانا جاتا ہے پھر رب العالمین اپنی دلیل کو کیسے تاریکیوں کے حوالے کر سکتا ہے۔ سچ کہا حکیم الامت نے

فطرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے

دنیا میں بھی میزان قیامت میں بھی میزان

یہ بندگان خدا گفتار اور کردار میں اللہ کی برہان ہوتے ہیں اس لئے ان کے ارادوں کی مضبوطی میں قوت خداوندی کا پرتو ہوتا ہے اور ان کے عزائم کی وسعت میں شوکت الہی کے لامتناہی مظاہر پوشیدہ ہوتے ہیں۔ جن کو ان کا خدا ہمیشگی عطا کر رہا ہو حیات دوام سے نواز رہا ہو جن کے ہر نقش حیات کو اہل ایمان کے جادہ حق کی منزل قرار دے رہا ہو وہ وقت کی آندھیوں سے کس طور مٹ پائیں گے۔ خدا کی قوت جب ان مردان حق کا اعزاز بنتی ہے تو انہی میں سے ایک درویش چنگیز و ہلاکو کی اولاد کو اسلام کی تجلیات میں گم کر دیتا ہے تاکہ چنگیز خاں کی قہر سامانیوں نے اسلام کو جس قدر نقصان پہنچایا ہے اس کی اولاد آنے والے ادوار میں نہ صرف اس نقصان کا ازالہ کرے بلکہ اسی کی بدولت فروغ اسلام اور ترویج دین مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم کو غیر معمولی وسعت اور ہمہ گیری عطا ہو سکے۔

ہمارے الفاظ کیا حقیقت رکھتے ہیں۔ یہ تو خدا کا فیصلہ ہے جو وہ مختلف ادوار میں صادر کر چکا

ہے کہ

تو نہ مٹ جائے گا ایران کے مٹ جانے سے

نہ سے کو تعلق نہیں پیمانے سے

ہے عیاں یورش تاتار کے افسانے سے

یاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

گشتی حق کا زمانے میں سہارا تو ہے

عصر نورات ہے دھندلا سا ستارا تو ہے

اگر ہم بنظر غائر دیکھیں تو ان حق پرستوں نے اپنے لئے قصر و ایوان تعمیر نہیں کئے۔ ارادت مندوں کی بڑی تعداد رکھتے ہوئے بھی سنگ مرمر کی خانقاہیں نہیں بنوائیں۔ میلوں تک پھیلے ہوئے لنگر خانے تعمیر نہیں کروائے یہ تو رضائے الہی میں سرمست و سرخوش رہنے والے مردان خوش نہاد تھے۔ جو تختہ دار کو چوم کر بھی خوشنودی خدا کے نام پر زندگی تابندگی کا نمونہ بنے رہے۔ برف کی سلوں پر لیٹ

کر بھی امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کی طرح مسکراتے رہے۔ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی طرح کوڑے کھا کر بھی رضائے الہی پر راضی رہے۔ امام شافعی کی طرح غریب الوطنی کی زندگی بسر کر کے بھی اپنے خالق و مالک کے جلوؤں میں گم رہے۔ حضرت بابا فرید رحمۃ اللہ علیہ کی طرح وطن سے بے وطن ہوئے۔ سیدنا علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ کی طرح افغانستان سے بے سروسامانی کے عالم میں ہجرت کر کے لاہور میں دریائے راوی کے کنارے ڈیرہ ڈالے رہے۔ کس کس کا نام لیا جائے ان میں سے کسی کا عمل بھی اپنی خواہشات کے تابع نہیں تھا اور پھر انعامات خداوندی نے انہیں یوں نوازا کہ جہاں جہاں انہوں نے قیام کیا وہ مقامات اہل شوق کیلئے مرکز تجلیات بن گئے۔

رزم گاہ حق و باطل میں تاریخ نے ہزاروں معرکے دیکھے۔ ایک طرف یہ بے سروسامان اصحاب تصوف تھے جن کا اسلحہ فقط رضائے الہی تھا، یہ خوشنودی رسول کیلئے جیتے تھے شریعت ان کا نور تھی، طریقت ان کا روحانی پیر، ہن تھا، صداقت ان کی صدائے حریت تھی، معرفت الہی ان کیلئے خدا کا انعام تھی، یہ دنیاوی سپاہ سے بے نیاز تھے تیغ و سپر کے تصور سے بھی نا آشنا تھے۔ یہ جہاں جاتے تھے اپنا حجرہ بعد میں بناتے تھے مسجد پہلے تعمیر کرتے تھے تاکہ قال اللہ اور قال الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کی وجد آفریں صداؤں سے زمانہ منور ہو جائے۔ یہ بوریائیں اپنی سادگی میں بھی قوت سکندر و دارا کو قدموں تلے روندنے کی قوت رکھتے تھے۔ یہ چلتے تھے تو ایک زمانہ ان کے ہمراہ ہوتا تھا، یہ بڑھتے تھے تو کہسار و دریا راستہ چھوڑ دیتے تھے۔ یہ بولتے تھے تو منہ سے پھول جھڑتے تھے۔ جدھر نگاہیں اٹھاتے تھے زمانہ اپنی نگاہیں ان کے قدموں تلے بچھا دیتا تھا۔ یہ خدائے مہربان پر اعتماد کامل کا ثمر تھا۔ اپنے مالک اور اس کے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم سے غیر متزلزل وابستگی کا اعزاز تھا، ان کا ہر نقش عمل لوح فطرت کی تحریر تھا یہ خودی و خودداری کی تصویر تھے۔

خودی ہو زندہ تو ہے فقر بھی شہنشاہی

نہیں ہے سخر و ظفرل سے کم شکوہ فقیر

خودی ہو زندہ تو دریائے بے کراں پایاب

خودی ہو زندہ تو کہسار و پر نیان و حریر

نہنگ زندہ ہے اپنے محیط میں آزاد

نہنگ مردہ کو فوج سراب بھی زنجیر

اس کتاب کا عنوان ”انعام یافتہ ہستیاں“ اس حقیقت ابدی کا شاہد ہے کہ اس میں عظیم المرتبت

شخصیات کا تذکرہ کیا گیا ہے جن کی زندگیوں کے شب و روز رضائے الہی کے حصول میں بسر ہوئے جنہوں نے اپنی زندگیوں کے عمل کا حسن سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے جمال جہاں آرز پر نچھاور کر دیا۔ ان میں اصحاب رسول کا تذکرہ ہے جو ”رضی اللہ عنہم ورضوعنہ“ کے مصداق ٹھہرے۔ ان محدثین اور محسنین اسلام کا ذکر جمیل ہے جن کے علمی اور عملی کارناموں سے آج گلستان ہستی مہکا ہوا ہے۔ جملہ سلاسل روحانیت سے تعلق رکھنے والے ان صوفیائے عظیم کو خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے جن کے کارہائے نمایاں سے اب تک بزم ہستی جگمگا رہی ہے اور قیامت تک ان جگمگا ہٹوں میں کبھی کمی نہیں آئے گی۔

”انعام یافتہ ہستیاں“ کا ابتدائی قلم بند کرتے ہوئے میں عزیز مکرم فاضل نوجوان رانا محمد نعیم اللہ خاں کا بے پناہ ممنون ہوں محمد نعیم اللہ خاں اعلیٰ تعلیم یافتہ اور صالح فکر نوجوان ہیں۔ اپنی زندگی دینی اور نظریاتی لٹریچر کے فروغ کیلئے وقف کر چکے ہیں۔ متعدد تصانیف اور تالیفات کے علاوہ کئی کتب کے مرتب بھی ہیں۔ میں ان کا ممنون و تشکر ہوں کہ انہوں نے اس ضخیم کتاب کا تمام مواد میری لائبریری سے برآمد کیا، ترتیب و تدوین اور کمپوزنگ سے لے کر پروف ریڈنگ تک کے تمام مشکل مراحل سے نبرد آزما ہوئے۔ ابھی ان کے پاس میری کئی کتب کے مسودات ہیں اور مجھے یقین ہے کہ وہ ان مسودات سے بھی ایسے ہی حسن سلوک کا مظاہرہ کریں گے جیسا انہوں نے اس ضخیم کتاب میں کیا ہے۔ خدا نے انہیں ذہن رسا اور ہر صاحب تحریر سے علمی تعاون کے جذبہ سے نوازا ہے۔ میں برملا اس حقیقت کا اظہار کرنا چاہتا ہوں کہ محمد نعیم اللہ خاں گورنمنٹ کالج گوجرانوالہ میں میرے نہایت ہونہار اور حصول علم کیلئے گہری دلچسپی رکھنے والے طالب علموں میں سے ہیں۔

دعا ہے کہ مالک کونین ان کی ادبی اور علمی صلاحیتوں کو مزید جلا بخشنے۔ آمین

اس کے ساتھ ہی میں اس کتاب کے ناشر محترم محمد خلیل قادری صاحب ڈائریکٹر قادری رضوی کتب خانہ گنج بخش روڈ کا نہایت شکر گزار ہوں جنہوں نے خوبصورت انداز میں اس کتاب کی اشاعت کا اہتمام کیا۔ محنت اور لگن سے کوئی کام بھی کیا جائے وہ ظاہری و باطنی نکھار کی تصویر بن جاتا ہے۔ جناب محمد خلیل قادری صاحب نے جس خلوص عمل سے رحمت ایزدی کے سہارے گنج بخش روڈ لاہور پر حضور داتا گنج بخش علیہ الرحمۃ کے سائے میں قادری رضوی کتب خانہ کا چراغ علم روشن کیا ہے دعا ہے کہ ہر آنے والا دوران کی مزید سرفرازی مقبولیت اور اشاعتی کامرانی کی نوید لے کر طلوع ہو۔



علامہ پروفیسر محمد اکرم رضا

(اجمالی تعارف)

تخلیق ادب و انشاء ہو یا شاعری، فن تقریر ہو یا جمال تحریر، الفاظ کی ساحری ہو یا تحقیق و جستجو کی جلوہ گری، یہ سب خون جگر سے ترتیب پانے والے عناصر ہیں جو رحمت خداوندی سے اصحاب ذوق کا مقدر بنتے ہیں۔ کوئی صاحب فکر ایک خصوصیت سے بہرہ ور ہوتا ہے یا دو خوبیوں میں کمال رکھتا ہے لیکن بعض ایسے خوش بخت ہوتے ہیں جو کئی فکری میدانوں میں یکساں مہارت کے ساتھ اپنی خداداد صلاحیتوں کا جادو جگا سکتے ہیں۔ ممتاز ماہر تعلیم، محقق اور معروف علمی و ادبی سکالر علامہ پروفیسر محمد اکرم رضا کا شمار بھی ایسے ہی سعید بخت افراد میں ہوتا ہے جنہیں قدرت متعدد ادبی و علمی سرفرازیوں سے نواز کر ایک جامع شخصیت میں ڈھال دیتی ہے۔

علامہ پروفیسر محمد اکرم رضا ممتاز شاعر ہیں، صاحب اسلوب نثر نگار ہیں، تحقیق و جستجو کی کٹھن راہوں پر سفر کرنے والے محقق ہیں، ادب و انشاء لطیف کے گلاب مہکانے والے قلم کار ہیں، آپ ایسے خطیب ہیں کہ جن کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے، کسی علمی و ادبی اور دینی و روحانی موضوع پر ہزاروں کے اجتماع سے خطاب کرتے ہیں تو ان کے حسن تکلم سے الفاظ نئی زندگی پاتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ آپ سے محبت کرنے والوں کے نزدیک آپ کا فرمایا مستند اور آپ کی فکر کا ہر پہلو باعث توقیر ہے۔ علامہ رضا بلاشبہ اپنی گونا گوں علمی صفات کی بناء پر کثیر الجہت انسان ہیں اور فیاض قدرت نے انہیں ہر جہت سے انصاف کرنے کا ہنر عطا کر رکھا ہے۔

گوجرانوالہ کے اس نامور فرزند کو اوائل عمری ہی میں گھر میں ایسا ماحول میسر آیا جو ادبی بھی تھا اور دینی و سیاسی بھی۔ گوجرانوالہ کے لواحقی گاؤں کوٹلی نواب میں جنم لینے والے محمد اکرم رضا کے والد محترم مولانا محمد علی تحریک پاکستان کے قابل فخر مجاہد تھے۔ یہاں ممتاز محمد خاں دولتانا نواب افتخار

Click For More Books

<https://archive.org/details/@zohaibhasanattari>

حسین ممدوٹ، ظفر الملت مولانا ظفر علی خاں، شیخ القرآن علامہ محمد عبدالغفور ہزاروی جیسے تحریک پاکستان کے معروف قائدین کے پہلو بہ پہلو آپ سیاست کی دنیا میں مشغول رہے۔ جناب محمد علی برصغیر کے عظیم شاعر، ادیب اور مدیر بابائے صحافت مولانا ظفر علی خاں سے عشق کی حد تک پیار کرتے تھے۔ گھر میں روزانہ روزنامہ زمیندار سمیت مولانا ظفر علی خاں اور ترجمان حقیقت حکیم الامت حضرت علامہ محمد اقبال کی تخلیقات کے چرچے تھے۔ جناب محمد علی نے معروف مسلم لیگی قائدین کو قیام پاکستان سے پیشتر اپنے علاقہ میں بلوایا اور دو قومی نظریہ کو بے شمار دلوں میں جلوہ گر کرتے رہے۔ اس بناء پر پروفیسر محمد اکرم رضا کو آنکھیں کھولنے کے بعد خرد کی پہلی منزل کو چھوتے ہی مولانا ظفر علی خاں کی محبت ورشہ میں ملی۔ یہیں سے نثر نگاری اور شاعری کا ذوق پروان چڑھا۔ وہ ابھی نویں جماعت میں تھے کہ معروف ماہنامہ ”آئینہ“ لاہور اور روزنامہ ”ہلال“ راولپنڈی میں ان کی منظومات اور نثری مضامین چھپنے لگے۔ اسلامیہ کالج میں داخل ہوئے تو یہ سلسلہ پھیل گیا اور آج ان کے نثری مضامین تو اتر سے معروف رسائل و جرائد میں شائع ہو رہے ہیں اور ان کی منظومات اور غزلیات باقاعدگی سے مشہور جرائد کی زینت بن رہی ہیں۔

پروفیسر محمد اکرم رضا دینی اور دنیاوی تعلیم سے بہرہ ور ہیں۔ ایم اے کے بعد جامعہ رضویہ مظہر الاسلام فیصل آباد سے درس نظامی کی صورت میں علوم حاصل کئے، اسی وجہ سے ان کا شمار معروف ادبی سکالروں اور مذہبی فضلاء میں ہوتا ہے۔ وطن عزیز میں بہت کم ایسی شخصیات ہوگی جو دنیاوی تعلیمات کے فوائد اور دینی و روحانی تعلیمات کے فیض و برکات سے بہرہ ور ہو کر زمانے کو علوم اسلامیہ کے حقیقی معارف عطا کر رہی ہوں گی۔

قدرت نے آپ کو ذوق خطابت سے بہرہ ور کر رکھا ہے۔ اس ضمن میں آپ کی خوش بختی یوں آپ پر سایہ فلگن ہوئی کہ برصغیر کے نامور مقرر خطیب الاسلام حضرت صاحبزادہ سید فیض الحسن شاہ کی محبت انہیں کم و بیش ۲۵ سال میسر آئی۔ خطیب الاسلام ان سے بیٹے کی طرح پیار کرتے تھے۔ پروفیسر محمد اکرم رضا نے ہر قسم کی فرقہ واریت اور مسلکی اختلافات سے بے نیاز ہو کر تاریخ ساز مقررین کو سنا، ان کے حسن خطابت سے خوشہ چینی کی اور اپنا الگ سے اسلوب خطابت تخلیق کیا۔ تاریخ گو جرنال والہ کے آپ واحد خطیب ہیں جو ادبی و شعری اور تہذیبی و ثقافتی موضوعات پر جس

روانی سے تکلم بارہوتے ہیں اسی مہارت فکر کے ساتھ دینی مذہبی اور روحانی موضوعات پر اظہار خیال کرتے ہیں۔ آپ اس کا سبب کثرت مطالعہ اور عظیم مقررین کے فیضانِ محبت کو قرار دیتے ہیں۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ آپ جس طرح بیک وقت نظم و نثر، خطابت اور تحقیق و جستجو کی وادیوں میں آگے بڑھ رہے ہیں اسے دیکھ کر مولانا ظفر علی خاں، مولانا محمد علی جوہر، شورش کاشمیری اور صاحبزادہ سید فیض الحسن شاہ کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ کیونکہ متذکرہ بالا شخصیات بیک وقت شعر و ادب، نثر نگاری اور لازوال خطابت کی شہسوار تھیں۔ پروفیسر محمد اکرم رضا خود کو ان فرزند ان روزگار کے افکار کا امین سمجھتے ہیں کہ تاریخ برصغیر کے اُفق پر یہ عظیم ہستیاں مہر و ماہ بن کر جو کرنیں بکھیرتی رہی ہیں آپ خود کو انہی کرنوں کی ادنیٰ سے جھلک سمجھتے ہیں۔ کیونکہ

ع..... میں آفتاب نہ سہی نسبت ہے آفتاب سے

پروفیسر محمد اکرم رضا کی شاعری ۱۹۶۰ء سے اخبارات و رسائل کی زینت بن رہی ہے۔ نظم ہو یا غزل، نعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہو یا مرثیہ، منقبت نگاری ہو یا حب وطن کے نعمات، انہوں نے ہر صنفِ سخن میں یوں طبع آزمائی کی کہ سرزمین گوجرانوالہ کا اعزاز بن گئے۔ انہیں فخر ہے کہ وہ ڈاکٹر فقیر محمد فقیر، عبدالغنی وفا، علامہ غلام یعقوب انور اور صوفی غیرت قادری جیسے نامور شعراء کے ساتھ مشاعروں میں شریک ہوتے رہے ہیں۔ اس حوالے سے ان کے پاس دل نشیں یادوں کا ایک ذخیرہ ہے جسے آپ مختلف مواقع پر احاطہ تحریر میں لا کر تاریخ کی زینت بناتے رہتے ہیں۔ پروفیسر محمد اکرم رضا کسی ادبی گروہ بندی کے کبھی بھی قائل نہیں رہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جو بھی جوہر قابل ہے وہ بہر صورت اپنے وجود کو منوالیتا ہے۔ کسی بھی ابھرنے والے کا راستہ روک کر ہم فطرت کے تقاضوں سے روگردانی کے مرتکب ہوتے ہیں۔

تحقیق و جستجو کا جذبہ ہمیشہ انہیں اگلی منزلوں کی جانب سفر کرنے کا حوصلہ عطا کرتا رہا ہے۔ سرزمین گوجرانوالہ کا فرزند ہونے کی بناء پر آپ کے دل میں مدتوں سے یہ خواہش جنم لے رہی تھی کہ گوجرانوالہ شہر اور ضلع کی جامع تاریخ قلم بند ہونی چاہیے۔ گوجرانوالہ کے حوالے سے چند مضامین تو مختلف ادوار میں لکھے گئے تھے مگر تاریخ سے پہلو تہی کی گئی تھی کہ حکومت برطانیہ کے شائع کردہ گزیٹیئر میں اس شہر کی تاریخ پر صرف ایک پیرا گراف میسر تھا۔ تاریخ گوجرانوالہ کی تدوین اور تالیف

Click For More Books

<https://archive.org/details/@zohaibhasanattari>

کے حوالے سے انہیں جناب پروفیسر محمد اقبال جاوید کی سیادت نصیب ہو گئی اور یوں ۱۹۸۵ء میں تقریباً بارہ سو صفحات پر مشتمل تاریخ گوجرانوالہ اشاعت پذیر ہوئی جسے چھپتے ہی ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ پاکستان کے طول و عرض کے علاوہ غیر ممالک میں اس کی طلب بڑھنے لگی۔ بلاشبہ تاریخ گوجرانوالہ ایسا کار عظیم ہے جو صدیوں تک فرزندان گوجرانوالہ سے خراج عقیدت لیتا رہے گا اور تحقیق و جستجو کی راہوں پر سفر کرنے والے اہل شوق اس سے خوشہ چینی کرتے رہیں گے۔

پروفیسر محمد اکرم رضا کے سینکڑوں طویل ترین مقالات مختلف موضوعات کے حوالے سے رسائل و جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ شاعری کے حوالے سے ان کا نام بطور خاص سرزمین گوجرانوالہ کا روشن حوالہ ہے۔ نثر و نظم کے حوالے سے آپ کی شخصیت اس قدر دلکش ہمہ گیر اور مضبوط و توانا ہے کہ ان کا نام ملک بھر میں شاعری، نثر نگاری اور خطابت کے حوالے سے گوجرانوالہ کا افتخار کہلاتا ہے۔ وہ گروہ بندی کے قائل نہیں لیکن ان سے شعری و ادبی سلسلہ تلمذ رکھنے والوں کی ایک بڑی تعداد ہے جس کا تعلق گوجرانوالہ کے علاوہ ملک کے دوسرے شہروں سے ہے۔ ان سے ادبی خوشہ چینی کرنے والوں میں بعض قومی سطح پر نام پیدا کر چکے ہیں اور پروفیسر صاحب ان پر فخر کرتے ہوئے انہیں اپنی پہچان قرار دیتے ہیں۔

پروفیسر محمد اکرم رضا نے صحافت اور ادارت سے بھی بھرپور انصاف کیا ہے۔ گوجرانوالہ کے معروف ہفت روزہ قومی دلیر کے مدیر رہے۔ کچھ عرصہ روزنامہ ”نوائے وقت“ لاہور میں باقاعدہ کام کیا۔ ادبی سہ ماہی ”کارواں“ گوجرانوالہ اور ”الاستاذ“ فیصل آباد کے مدیر رہے۔ گورنمنٹ کالج شکر گڑھ کے مجلہ ”عزم نو“ کی ادارت کرتے رہے۔ گورنمنٹ کالج گوجرانوالہ کے ادبی مجلہ ”مہک“ کے عرصہ چھبیس سال مدیر رہے۔ محکمہ تعلیم کے ماہنامہ ”تحریک“ اور دینی رسالہ ”ترجمان لائٹانی“ کی ادارت کے فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔ ہفت روزہ نقاب، ماہنامہ مفیض، ماہنامہ ”دلچسپ“ ماہنامہ ”متاع امیر“ ماہنامہ ”کاروان نعت“ ماہنامہ ”سرپرائز“ اور ماہنامہ ”تاریخ ساز“ ماہنامہ ”کاروان نعت“ کے نگران اور مشیر کے طور پر بھی گیسوئے ادب سنوارنے کا اہتمام کر رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ماہنامہ ”نعت رنگ“ کراچی، ماہنامہ ”جہان رضا“ کے اعزازی سرپرست بھی ہیں۔

شاعری میں تمام اصناف سخن سے محبت اور لگاؤ اپنی جگہ مگر رضا صاحب نعت نگاری کے

مہکبار ماحول میں روحانی آسودگی محسوس کرتے ہیں۔ نعت نگاری ان کی زندگی کا حاصل اور سب سے بڑا اعزاز ہے۔ نعت نگاری میں یہ امام احمد رضا، علامہ اقبال، کفایت علی کافی اور مولانا ظفر علی خاں کو اپنا مرشد تصور کرتے ہیں۔ عصر حاضر میں حضرت حفیظ تائب سے والہانہ پیار کرتے ہیں۔ نعت نگاری نے انہیں جس غیر معمولی عزت و توقیر سے نوازا ہے وہ اسے محبوب دو عالم، فخر آدم و بنی آدم حضور محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت خاص سمجھتے ہیں۔ نعت نگاری کے حوالے سے ان کے تحقیقی مقالات ادب عالیہ کا حصہ ہیں اور اصحاب نقد و نظر ان سے خوشہ چینی کرتے ہوئے خوشی محسوس کرتے ہیں۔ نعت نگاری کے حوالے سے ان کا یہ پیغام آج بے شمار عشاق سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم کے دلوں کی دھڑکن بن چکا ہے۔

دہر کو سیرت سرکار سکھا دی جائے
سنگاری جو کرے کوئی دُعا دی جائے
جو ہیں محروم ثنا خوانی شاہ بطحا
یا خدا ان کو بھی توفیق ثنا دی جائے

اس وقت تک پروفیسر محمد اکرم رضا کی چوبیس کتب شائع ہو چکی ہیں۔ آپ ڈیڑھ سو سے زائد کتابوں کے مقدمات اور دیباچے لکھ چکے ہیں۔ یہ سلسلہ جاری ہے اور نقد و نظر کی دنیا کے باسی مسلسل ان سے ادبی و شعری رہنمائی لے رہے ہیں۔ آپ کو تصوف و روحانیت کے کوچے سے خصوصی لگاؤ ہے۔ آپ کا کہنا ہے کہ جب اعصاب شل ہو جائیں، افکار کا سرچشمہ خشک ہونے لگے، ذہن پر مادیت کی کثافتیں غلبہ پانے لگیں، دلوں کے آئینے دھندلانے لگیں تو پھر تصوف اور روحانیت کی ایمان آفرین چھاؤں میں ہی آسودگی حاصل ہوتی ہے اور اسی کوچہ تصوف میں آ کر خدا شناسی کے ساتھ ساتھ اسوہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی معراج عطا ہوتی ہے۔ آپ کی تصنیفات جمال فقر، تجلیات مخدوم، فیضان اکبری اور فخر جیلانی کا تعلق بطور خاص تصوف اور روحانی فیوضات سے ہے۔ آپ نے تصوف کی آغوش میں آنکھ کھولی ہے۔ آپ کے خاندان میں متعدد ایسی روحانی اور فکری شخصیات نے جنم لیا جن کا تذکرہ مختلف تواریخ میں ملتا ہے۔ یہ شخصیات شعری و ادبی طور پر بھی بلند درجہ رکھتی تھیں۔

حضور سلطان دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مطہرہ پروفیسر صاحب کیلئے زندگی کے ہر مقام پر خضر راہ کا کام کر رہے ہیں۔ ان کا ایمان ہے کہ اسی اسم مقدس کے حوالے سے ہماری آبرو ہے، جس طرح حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے گالیاں سن کر دعائیں دیں، یہی اُسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم آپ کے صحابہ اور اصحاب تصوف کے پیش نظر رہا۔ اسی لئے دہر میں اسم محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی صورت اُجالا ہو سکتا ہے کہ آپ اپنے دلوں کو حرص و ہوس اور زبانوں کو کثیف اور غلاظت زدہ الفاظ کے استعمال سے پاک کر لیں۔

پروفیسر محمد اکرم رضا بلاشبہ عصر حاضر کے ایوانوں میں دو قومی نظریہ کی صدائے بازگشت ہیں۔ وہ دو قومی نظریہ جو پاکستان کی پہچان اور اصحاب ایمان کی جان ہے۔ وہ اسی نظریہ کا نور آج پاکستان کی فضاؤں میں پھیلا رہے ہیں۔ وہ خود کو اس نظریاتی ورثے کا محافظ سمجھتے ہیں اور اس کی حقیقی روح کو ہر دل میں موجزن دیکھنا چاہتے ہیں۔ تحریر ہو یا تقریر وہ نظریہ پاکستان کے نام پر کسی مصلحت یا سمجھوتے کے قائل نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اس آفاقی نظریہ پر مرثا ہی حب الوطنی کی روشن دلیل ہے۔

شاہد چشتی
روزنامہ ایکسپریس



صحابہ کرام رضی اللہ عنہم

Click For More Books

<https://archive.org/details/@zohaibhasanattari>

سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ

حضور نبی کریم محمد مصطفیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی محبت دنیوی سرخروئی کا سامان بھی ہے اور میدان محشر میں بخشش کا وسیلہ بھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم محبوب دو عالم بھی ہیں اور محبوب خدا بھی۔ تاریخ شاہد ہے کہ جب غلامانِ رسول عشق و عقیدت کے سردی جذبے سے سرشار ہو کر میدانِ حیات میں آگے بڑھے تو کائنات ان کے قدموں میں جھک گئی، مبارک تھے وہ پاکیزہ نفوس کہ جنہیں آقا و مولا صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ میسر آیا اور آپ کی پاکیزہ صحبت سے فیضیاب ہو کر عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی دولت بے بہا سے بھی بہرہ ور ہوئے۔ عشاقِ حضور رسالت مآب علیہ الصلوٰۃ والسلام میں خلیفہ اول سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا مرتبہ و مقام بہت بلند و بالا ہے۔ حضرت سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے محبتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے فکری و عملی تقاضوں کو جس طور قبول کیا اور عشق و عقیدت کے جو نقوش تابندہ صفحہ تاریخ پر ثبت کئے ان کی جگہ گاہٹ لازوال بھی ہے اور بے مثال بھی۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اس وقت اسلام قبول کیا جب چاروں طرف سے اعدائے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پیغامِ خداوندی کی شمع کو بجھانے کیلئے اپنی ناپاک کوششوں میں مصروف تھے۔ آپ کی زندگی کے ہر مرحلہ پر قربانی و ایثار کے حیرت انگیز نمونے پیش کئے۔ زندگی بھر خوشنودی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو مقدم رکھا۔ عظمتِ اسلام کے لئے تن من دھن کی بازی لگانے سے کبھی گریز نہ کیا۔ آپ کو زندگی کے ابتدائی دور سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت نصیب ہوئی تھی اس لئے آپ مزاج شناس مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء تھے۔ آپ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہجرت کے ساتھی تھے اور وفات کے بعد آپ کو اپنے آقا و مولیٰ کے قریب میں جگہ عطا ہوئی۔

یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

اب ہم قرآن و احادیث اور تفاسیر و تواریخ کی روشنی میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے بے مثال عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی چند جھلکیاں قارئین کی نذر کرتے ہیں۔

Click For More Books

<https://archive.org/details/@zohaibhasanattari>

عقل اور عشق کی آویزش ازل سے جاری ہے۔ عقل ہر معاملے میں سوچ و پچار اور بحث و تکرار کی عادی ہے جبکہ عشق صرف اور صرف محبوب کی خوشنودی مقدم رکھتا ہے۔ عقل کوائف و اسباب کو پیش نظر رکھتی ہے مگر عشق فقط رضائے حبیب کو سرمایہ حیات تصور کرتے ہوئے ہر آزمائش گاہ میں جان و تن کا نذرانہ پیش کرنے کیلئے تیار رہتا ہے۔ عشق قبل و قال کا خوگر نہیں بلکہ ایثار قربانی کا مجسمہ ہے۔ سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ بھی اسی لازوال عشق رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشبو سے دل و جان کو بسائے ہوئے تھے۔ آپ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بچپن بھی دیکھا تھا اور جوانی بھی۔ آپ کی معاملہ فہمی اور حق پرستی بھی دیکھی تھی اور علائق دنیوی سے بے تعلقی بھی۔ اعلان نبوت سے قبل بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کردار دیکھا تھا اور اعلان نبوت کے بعد بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا مشاہدہ کیا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی محبت آپ کے اعلان نبوت کی محتاج نہ تھی بلکہ وہ تو اعلان نبوت سے برسوں قبل ہی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شخصیت کو نمونہ ہدایت قرار دے کر اپنے دل کی خلوتوں میں بسا چکے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان نبوت فرمایا تو کفار فوراً حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچے اور کہا کہ دیکھو تمہارا ساتھی نبوت کا دعویٰ کر رہا ہے۔ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ بلا تاخیر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سوال کیا کہ میرے آقا کیا میں نے آپ کے اعلان نبوت کے بارے میں درست سنا ہے جب حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی نبوت کی تصدیق فرمائی تو آپ نے فوراً سر تسلیم خم کرتے ہوئے عرض کیا:

خدا کی قسم! آپ سے کبھی جھوٹ سرزد نہیں ہوا اور آپ خلیق بالرسالت امین صلہ رحمی کرنے والے اور بہترین کام کرنے والے ہیں۔ اپنا ہاتھ بڑھائیں تاکہ میں آپ کی بیعت کروں۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا دست مبارک آگے بڑھایا تو آپ نے کوئی سوال کئے بغیر یا تصدیق کئے بغیر آپ کے دست اقدس کو بوسہ دیا اور بیعت فرمائی اور اپنے اسی غیر معمولی عشق و ارادت کی بناء پر صدیق اکبر کے لقب کے مستحق ٹھہرے۔ آپ کی یہ قبولیت اسلام مردوں میں سب سے پہلی قبولیت تھی۔

قبولیت اسلام کے ساتھ ہی حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کفار کے ظلم و ستم کا نشانہ بن گئے آپ نے کوچہ حق و صداقت میں قدم رکھا تو زندگی بھر کیلئے آپ کے قدموں میں لغزش پیدا نہ ہوئی۔ حب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی پاداش میں ہر ظلم کو برداشت کیا، ہر سختی جھیلے تھے ہر آزمائش پر

لیک کہتے رہے۔ ایک بار آپ کے ہم قبیلہ ایک مشرک عثمان بن عبید اللہ نے انہیں اپنے بھائی طلحہ کے ساتھ ایک ہی رسی سے باندھ کر سخت زدوکوب کیا مگر آپ جاں نواز مسکراہٹ لبوں پر بکھیرے اُحد اُحد اور احمد احمد کا نعرہ مستانہ بلند کرتے رہے اور شتی القلب دشمنوں کی ہر ضرب پر عظمت رسالت کا وجد آفریں آواز لگاتے رہے۔

ایک بار حضور سرور کونین، فخر دارین ہجرت سے قبل طواف کعبہ کے لئے حرم شریف کے اندر تشریف لے گئے تو کفار نے موقع غنیمت جان کر آپ کو گھیر لیا اور آپ پر کوہِ ستم توڑنے کیلئے حملہ آور ہو گئے۔ حضرت صدیق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری کیلئے آ رہے تھے کہ راستہ ہی میں کسی نے آپ کو خبردار کرتے ہوئے کہا کہ دوڑ کر جاؤ اور اپنے آقا کی خبر لو۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ یہ پریشان کن خبر سنتے ہی حرم کعبہ کی طرف دوڑے تو دیکھا کہ حضور واقعی کفار کے زرعے میں گھرے ہیں اور کفار بڑھ چڑھ کر آپ پر سختی کر رہے ہیں۔ یہ غمناک صورتحال آپ سے برداشت نہ ہو سکی اور تیزی سے کفار پر جھپٹ پڑے اور فرمایا:

”تم پر افسوس ہے کہ ایسے شخص کو تم یہ کہنے پر اپنے ظلم کا نشانہ بنا رہے ہو جو یہ اعلان کرتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے اور حق تو یہ ہے کہ وہ خدا کی طرف سے تمہارے لئے منور دلیلیں لے کر آیا ہے۔“
آپ کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑیاں لگی ہوئی تھی، دل غم کی آگ میں سلگ رہا تھا، جس محبوب سے زندگی موت کا اقرار کر رکھا تھا اس پر اعدائے اسلام کے ہاتھ اٹھ رہے تھے۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ دشمنوں پر شاہین کی صورت جھپٹتے ہوئے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو ان کے زرعے سے نکالنے کی کوشش کرتے ہوئے فرما رہے تھے کہ میرے محبوب کو چھوڑ دو، میں جو اس کا چاہنے والا آ گیا ہوں، جو سلوک میرے ساتھ کرنا چاہتے ہو کر لو۔ آپ کی اس مداخلت کا نتیجہ یہ نکلا کہ دشمنوں نے حضور محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو تو چھوڑ دیا اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو اس مداخلت اور حمایت کی سزا دینے کیلئے گھیرے میں لے لیا پھر تو حضرت صدیق پر مشرکین نے اس قدر ستم ڈھایا کہ کیفیت قلمبند کرتے ہوئے مورخ کا قلم لرز اٹھتا ہے۔ اعداء کی ستم کاریاں سہتے سہتے آپ کا جسم لہولہان ہو گیا۔ سر پر وہ ضربیں پڑیں کہ گھر کو لوٹنے کے بعد سر کے جس حصہ ہر ہاتھ رکھتے وہیں سے بال جھڑنے لگتے۔ اس محشر خیز آزمائش کی گھڑی میں آپ کے لبوں سے فقط یہی صدائے حق بلند ہو ہی تھی کہ

تبارکت یا ذوالجلال والا کرام

آپ کے قبیلے کو علم ہوا تو قبیلے کے جوان مجتمع ہو کر آئے اور آپ کو کفار کے زرعہ ستم سے

نکال کر گھر لے گئے۔ آپ پر غشی طاری تھی، نبضیں ڈوب رہی تھیں، ہوش آیا تو اہل خاندان نے آپ کی خیریت پوچھی مگر آپ نے فقط یہی سوال کیا کہ:

”مجھے بتاؤ کہ میرے آقا و مولا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا حال ہے۔“

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی اہل فداکاری نے ثابت کر دیا کہ غلامانِ رسول جان دینے سے نہیں ڈرتے۔ انہیں اپنی سلامتی کی فکر و منگیر نہیں ہوتی تھی بلکہ وہ فقط ناموسِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی پاسداری کیلئے زندہ رہتے تھے۔ ان سب کا ایک یہی مقصود نظر اور مدعاۓ زندگی تھا کہ:

محمد ہے متاعِ عالم ایجاد سے پیارا

پدر مادر برادر مال و جاں اولاد سے پیارا

محمد کی غلامی ہے سندِ آزاد ہونے کی

خدا کے دامنِ توحید میں آباد ہونے کی

محمد کی محبت دینِ حق کی شرطِ اول ہے

اسی میں ہوا گر خامی تو ایماں نامکمل ہے

اور پھر چشمِ فلک نے وہ منظر بھی دیکھا کہ مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ کی جانب ہجرت کے دوران میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی رفاقت نصیب ہوئی۔ راستے میں غارِ ثور میں قیام پذیر ہونا پڑا تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے غار کی صفائی کی۔ اپنی چادر نکلڑے نکلڑے کر کے غار کے سوراخ بند کئے کہ مبادا کوئی سانپ یا کوئی اور موذی کیڑا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ڈس نہ لے۔ ایک سوراخ باقی بچا تو اس پر اپنا پاؤں رکھ دیا اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو ڈس نہ لے ایک سوراخ باقی بچا تو اس پر اپنا پاؤں رکھ دیا اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سراقدس کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ اسی غار میں ایک طویل عرصہ سے ایک سانپ کا بسیرا تھا۔ اس سانپ نے باہر نکلنا چاہا مگر تمام سوراخ بند پائے۔ فقط ایک سوراخ پر انسانی پاؤں دیکھ کر اس نے فوراً ڈس لیا، حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ شدتِ کرب سے تڑپ اٹھے مگر اپنے منہ سے ہلکی سی آواز بھی نہ نکالی کہ کہیں آقا و مولا کے آرام میں خلل نہ پڑ جائے۔ دردِ حد سے بڑھا تو بے اختیار آنکھوں سے آنسو اُبل پڑے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشانی پر جا گرے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بیدار ہوئے تو تمام کیفیت سے آگاہ ہو گئے اور اپنا لعابِ دہن صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے زخم پر لگا دیا۔ فوراً درد رفع ہو گیا اور زہر کا اثر جاتا رہا۔ احترامِ نبوت کا یہی وہ عالی قدر جذبہ تھا جس نے سیدنا

ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو حضور سرور کائنات کی آنکھوں کا تارا بنا دیا کیونکہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اپنے آقا و مولا کے مقام سر بلند سے آگاہ تھے کہ:

ممكن ہوگر تو سانس بھی دھیرے سے لو یہاں یہ بارگاہِ سیدِ عالی مقام ہے
اس بارگاہِ قدس میں سرکار کے حضور فرمانروائے وقت بھی ادنیٰ غلام ہے
حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ایک عظیم عاشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت سے
اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ جب تک حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات اقدس کو اپنے مال، اولاد اور
جان سے فزوں تر نہ سمجھا جائے، عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ تھی کہ
جب ایک غزوہ کی تیاری کے سلسلہ میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں سے مالی تعاون
کی اپیل کی تو تمام مسلمان حسب توفیق اپنا اپنا اندوختہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نذر کرنے لگے۔ اس
وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مالی حالت بہت مستحکم تھی، اس لئے انہوں نے اپنی نصف جائیداد تو
خاندان کے استعمال کیلئے چھوڑی اور نصف راہِ خدا میں۔

اتنے میں انہوں نے دیکھا کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اپنے گھر کا گل اثاثہ راہِ خدا
میں نچھاور کرنے کیلئے لے کر چلے آ رہے ہیں۔ جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت کیا
کہ صدیق گھر میں کیا چھوڑ آئے ہیں تو انہوں نے بعد افتخار عرض کیا کہ:
”یا رسول اللہ! میرا جو کچھ اثاثہ حیات تھا، آپ کی خدمت میں لے آیا ہوں اور گھر میں
فقط آپ کی یاد اور آپ کا عشق چھوڑ آیا ہوں۔“

شاعر مشرق علامہ اقبال نے اسی احساس کی ترجمانی کی تھی کہ:
پروانے کو چراغ ہے بلبل کو پھول بس صدیق کے لئے ہے خدا کا رسول بس
گویا حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ وہ بلبل گلستانِ نبوت تھے جسے فقط عشقِ مصطفیٰ کی
خوشبودل آویز لگتی تھی اور آپ کی فداکاری ایک ایسے پروانے کی صورت تھی جو محبت رسول صلی اللہ علیہ
وسلم کی شمع پر نور پر جان دینا عشق و ارادت مندی کا اولین تقاضا سمجھتا ہو۔ واقعہ معراج کے سلسلہ
میں آپ کی گواہی بھی تاریخِ عشق و عقیدت کے زرنگار ایوانوں میں جگمگا رہی ہے کہ جب حضور علیہ
الصلوٰۃ والتسلیم معراج کی شب عرشِ اعلیٰ کی سیر اور دیدارِ خداوندی سے مشرف ہو کر واپس تشریف
لائے تو کفار مکہ نے آپ کی زبان فیضِ ترجمان سے معراج کے سفر کی داستانِ شوق سن کر آپ کو
جھٹلانا شروع کر دیا۔ اسی اثنا میں چند با اثر رؤسائے مکہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے پاس

بچے اور کہا کہ کیا یوں بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص زمینوں آسمانوں کی سیر اتنی مختصر مدت میں کر آئے کہ اس کا بستر بھی گرم رہے اور زنجیر در بھی ہلتی رہے۔ اس پر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا کہ وہ شخص کون ہے؟ جب معلوم ہوا کہ وہ شخصیت حضور پر نور سید یوم النور محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے تو کسی قسم کی ہچکچاہٹ تامل اور غور و فکر سے کام لئے بغیر فوراً یہ کہہ کر عشق مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ناموس کی لاج رکھ لی کہ:

”اگر میرے آقا کہتے ہیں تو پھر سچ کہتے ہیں اور میں اس کی تصدیق کرتا ہوں“

آپ کی یہ تصدیق عشق و عقیدت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دائمی سرخروئی کا سامان پیدا کر گئی کہ:

قلندر جز دو حرف لا الہ کچھ بھی نہیں رکھتا فقہیہ شہر قارون ہے لغت ہائے حجازی کا سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کیلئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر قول قول فیصل کا درجہ رکھتا تھا۔ وہ ہر آن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشنودی اور رضا جوئی کے طالب رہتے تھے کیونکہ وہ اس حقیقت سے بہرہ ور تھے کہ خوشنودی رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی رضائے خداوندی کے حصول کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لبوں سے کوئی ارشاد سن کر اس سے سر مو انحراف آپ کیلئے ممکن ہی نہیں تھا۔ تعمیل حکم رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ایمان آفرین مظاہرہ اس وقت دیکھنے میں آیا جب مسند خلافت پر فائز ہونے کے بعد آپ کو جھوٹے مدعیان نبوت کے استیصال کیلئے عسا کر اسلام کو میدان جہاد کی سمت روانہ کرنا پڑا۔ حضرت محمد مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء کی وفات اقدس کے بعد مسلمانوں پر بہت کٹھن وقت آیا کئی جھوٹے مدعیان نبوت نے اعلان نبوت کر کے صورتحال سے فائدہ اٹھانا چاہا کئی قبائل نے زکوٰۃ کی ادائیگی بند کر دی مختلف شورشیں سر اٹھانے لگیں۔ ایسے عالم میں بھی آپ کو فقط یہی یاد تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی وفات سے قبل ایک لشکر حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ کی قیادت میں روانہ کرنے والے تھے جب آپ نے حکم رسالت کی تعمیل میں فوج کو روانہ کرنا چاہا تو آپ کے مشیران باتدبیر اور کئی دردمند صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے صورت حالات کی نزاکت کا واسطہ دے کر آپ کو مصلحت اندیشی کے نام پر لشکر اسلام کی مدینہ سے روانگی سے باز رکھنا چاہا مگر آپ نے عزم مصمم کے ساتھ یہ فرما کر تمام اندیشوں کا خاتمہ کر دیا کہ:

”قسم ہے اس ذات کی جس کے اختیار و قدرت میں میری جان ہے اگر مجھے جنگل کے درندے اٹھا کر لے جائیں! تب بھی میں ہمیشہ اُسامہ رضی اللہ عنہ کو روانہ کر کے رہوں گا۔ اسے خود

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے روانہ فرمانے کا حکم جاری کیا تھا۔ اگر مدینہ میں میرے علاوہ کوئی اور شخص بھی میری حمایت کیلئے موجود نہ رہے تب بھی میں اپنے آقا و مولا کے حکم اقدس کی تعمیل کر کے رہوں گا۔

غیر معمولی عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک فکر آفریں منظر اس وقت بھی تاریخ کی زینت بن رہا تھا، جب غزوہ بدر میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ لشکر اسلام کی طرف سے اور آپ کے ایک بیٹے کفار کی طرف سے لڑ رہے تھے۔ جنگ تمام ہو گئی اور آپ کے وہ بیٹے بھی ایمان لے آئے تو ایک دن انہوں نے غزوہ بدر کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنے باپ سے عرض کیا کہ ”ابا جان! دوران جنگ میں آپ کئی مرتبہ میری تلوار کی زد میں آئے مگر ہر بار محبت پدری مجھ پر غالب آ گئی اور میں نے آپ پر تلوار چلانے سے گریز کیا۔“ بیٹے کی زبان سے یہ بات سنتے ہی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے دو ٹوک انداز میں فرمایا:

”مجھے قسم ہے رب ذوالجلال کی اگر تم ایک بار بھی میری تلوار کی زد میں آ جاتے تو میں ناموس رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر فوراً تمہاری گردن اڑا دیتا۔“

یہ شہادت کہ الفت میں قدم رکھنا ہے لوگ آساں سمجھتے ہیں مسلمان ہونا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا یہی غیر معمولی عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم تھا، جس کی بدولت روحانی لحاظ سے آپ مقامات بلند پر فائز بھی ہوئے اور آپ کو سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد عالم اسلامی کی اولین خلافت کی ذمہ داری بھی عطا ہوئی۔ عشق رسالت کا دعویٰ جس قدر آسان ہے اس کی عملی تفسیر اسی قدر مشکل ہے اور تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے جن تقاضوں کو قبول کیا تھا، زندگی کی آخری ساعتوں تک ان سے بصد حسن عمل عہدہ برآ ہوتے رہے۔ آج ہم مادیت پسندی کی زد میں بہتے ہوئے جادہ مستقیم سے بھٹک چکے ہیں۔

اس لئے ضرورت ہے کہ ظلمت وقت میں علم و آگہی کے چراغ روشن کرنے کیلئے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے لازوال عشق رسول کے تقدس کو عملی و فکری لحاظ سے دل و جان میں بسایا جائے۔ ہم اپنی اس تحریر کا اختتام اس حدیث نبوی پر کر رہے ہیں:

فرمایا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے

”اگر ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ایمان کے ساتھ تمام اہل زمین کے ایمان کا وزن کیا جائے تو

ابوبکر کا پلہ ان سے بھاری رہے گا۔“

اُسوۂ فاروقِ اعظم اور قرونِ اولیٰ کی ایک جھلک

کبھی اے نوجوان مسلم تدبر بھی کیا تو نے
وہ کیا گرووں تھا جس کا ہے تو اک ٹوٹا ہوا تارا
مسلمان قوم زوال پذیر کیوں ہے؟ اس کا مستقبل کیوں محفوظ نہیں ہے؟ اس کا صرف ایک
ہی جواب ہے اور وہ یہ کہ ہم میں اسلافِ صالحین مفقود ہے۔ ہمارا سوچ و فکر کا زاویہ اس قدر پست
ہو چکا ہے کہ ہم نے اپنے آباؤ و اجداد کی تاریخ کا مطالعہ کرنے کی کبھی کوئی کوشش نہیں کی۔ قرونِ
اولیٰ کے مسلمانوں نے انسانی سیرت و کردار کا جو اعلیٰ نمونہ پیش کیا تھا، تاریخ اس کی مثال پیش کرنے
سے قاصر ہے۔ وہ مساوات کے حامی تھے عدل و انصاف کے قائل تھے دنیا ان سے سبق لیتی تھی۔
ان کے آباؤ و اجداد نے راہزموں کو راہ سکھائی، بت پرستوں کو حق سے روشناس کرایا، راستہ سے بھٹکے
ہوؤں کیلئے وہ مشعلِ راہ ہے۔

وہ معزز تھے زمانے میں مسلمان ہو کر
اور ہم خواہ ہوئے تارکِ قرآن ہو کر
ایک قوم کی تاریخ اس کا سب سے بڑا سرمایہ ہوتی ہے، یہی عدل و انصاف کے متعلق تاریخ
کے چند صفحات کی نقاب کشائی کرتا ہوں۔

حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کی خلافت کا زمانہ ہے۔ قاضی القضاة کے عہدہ پر سید
لانصارِ ابی بن کعب فائز ہیں۔ عدالت باوقار طریقہ سے انصاف کا سرچشمہ بنی ہوئی ہے۔ ایک شخص
پکارتا ہے ”عباس بن عبدالمطلب حاضر ہوں“ (عم رسول)

ابی بن کعب (قاضی شہر) ”ابوالفضل! (حضرت عباس کی کنیت) ادھر آئیے۔“
حضرت عباس قریب آتے ہیں

ابی بن کعب: ”ابوالفضل! آپ کا دعویٰ کس شخص پر ہے؟“
حضرت عباس: ”میرا دعویٰ امیر المؤمنین حضرت عمر پر ہے۔“

Click For More Books

<https://archive.org/details/@zohaibhasanattari>

ابی بن کعب پکارتے ہیں: ”کیا امیر المومنین یہاں موجود ہیں؟“
خادم: ”نہیں حضور!“

ابی بن کعب: ”جاؤ انہیں فوراً عدالت میں بلا لاؤ۔“

خادم: بہت بہتر! (جانے لگتا ہے)

ابن بن کعب: ”امیر المومنین جس حالت میں ہوں فوراً بلا لائیے۔“

خادم: آپ کے حکم کی تعمیل کی جائے گی (چلا جاتا ہے)

○

امیر المومنین حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ دربار لگائے بیٹھے ہیں اور مہاجرین کے سر پر آوردہ اصحاب ان کے پاس موجود ہیں۔ کسی جگہ حملہ کرنے کے متعلق مشورہ کیا جا رہا ہے۔ اتنے میں ابی بن کعب کا خادم پہنچتا ہے۔

ایک شخص: یہ تو قاضی ابن کعب کا خادم معلوم ہوتا ہے۔

دوسرا: شاید ہم میں سے کسی کی طلبی ہوئی ہے۔

خادم مجمع سے گزرتا ہوا آگے بڑھ رہا ہے کئی اشخاص اس سے کچھ دریافت کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ خاموشی سے امیر المومنین کے سامنے جا کر مودبانہ طریق سے کھڑا ہو جاتا ہے۔

امیر المومنین: ”کہاں سے آرہے ہو بھئی!“

خادم: ”قاضی مدینہ ابی بن کعب کی طرف سے“

امیر المومنین: ”کس کی طرف آئے ہو؟“

خادم: ”آپ کی سمت۔ آپ کو انہوں نے عدالت میں طلب کیا ہے۔“

امیر المومنین: ”کیوں کیا معاملہ ہے؟“

خادم: ”میرا فرض مجھ کو اجازت نہیں دیتا اس لئے میں آپ کو نہیں بتا سکتا۔“

امیر المومنین: ”تم چلو میں آتا ہوں۔“

خادم: ”نہیں انہوں نے آپ کو اسی وقت طلب فرمایا ہے۔“

امیر المومنین خاموشی سے اٹھتے ہیں اور خادم کے ساتھ روانہ ہو جاتے ہیں۔

○

ابن بن کعب: مسند قضا پر بیٹھے ہیں۔ حضرت عباس سامنے کھڑے ہیں ایک خادم آتا ہے۔

ابی بن کعب: ”لے آئے امیر المومنین کو؟“

خادم: ”لے آیا ہوں عالیجاہ۔ دروازے کے باہر کھڑے ہیں۔“

”ابی بن کعب: جاؤ انہیں لے آؤ۔“

امیر المومنین باوقار انداز سے چلتے ہوئے آتے ہیں اور السلام علیکم کہہ کر ابی بن کعب کے

قریب ہی بیٹھ جاتے ہیں۔

ابی بن کعب: ”اٹھیے یہاں سے اس وقت یہاں آپ امیر المومنین نہیں بلکہ صرف عمر بن

خطاب رضی اللہ عنہ ہیں۔“

(حضرت عمر وہاں سے اٹھ کر سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں)

ابی بن کعب: (حضرت عباس سے) کہتے ”ابوالفضل کیا معاملہ ہے؟“

حضرت عباس: جناب میرے مکان کا پرنا لہ شروع ہی سے مسجد نبوی کی طرف تھا۔ آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تھا۔ خلیفہ اول حضرت ابوبکر کے زمانہ میں بھی وہیں تھا مگر.....

حضرت عمر: (بات کاٹ کر) ”ٹھہریئے ابوالفضل!“

ابی بن کعب (غصہ سے) ابن خطاب آپ کو بولنے کا کوئی حق نہیں پہلے مدعی کو اپنا بیان ختم

کر لینے دیجئے۔

حضرت عباس: (سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے) ”مگر امیر المومنین (اشارہ کر کے) نے

اسے اکھاڑ دیا ہے۔ مجھے تکلیف پہنچی ہے میرا انصاف کیجئے۔“

ابی بن کعب: ”تمہارا انصاف ضرور ہوگا۔ ابن خطاب! آپ اپنی عفاکی میں کیا کہنا چاہتے

ہیں؟“

حضرت عمر: ”ابوالفضل نے سچ کہا ہے میں اپنا قصور تسلیم کرتا ہوں۔“

ابی بن کعب: ”ابن خطاب آپ نے قصور تسلیم کر لیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ آپ نے مالک

مکان کی اجازت کے بغیر کیوں یہ کام کیا۔ آپ کو کیا حق تھا؟“

حضرت عمر: جناب میں نے کوئی نا واجب حرکت نہیں کی۔

ابی بن کعب: کیسے؟

حضرت عمر: ”جب پرنا لہ سے پانی گرتا تھا تو نمازیوں کے کپڑوں پر چھنٹیں پڑتی تھیں۔“

ابی بن کعب: ”ابوالفضل آپ اس کے جواب میں کیا کہتے ہیں؟“

حضرت عباس: ”یہ پرنا لہ میں نے خود نہیں لگایا بلکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مرضی تھی اور جب میں یہ پرنا لگانے لگا تھا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے مجبور کیا تھا کہ میں ان کے کندھوں پر سوار ہو کر لگاؤں۔ میں نے ادباً انکار کیا مگر اصرار پر مجھے تعمیل کرنا پڑی۔“
(حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر سے سبھی آبدیدہ ہو جاتے ہیں، حضرت عمر بھی پشیمان نظر آتے ہیں)

ابی بن کعب: ”ابو الفضل! اس واقعہ کے گواہ لا سکتے ہو؟“

حضرت عباس: بہت سے انصاری گواہ ہیں۔

ابی بن کعب: ”جائے انہیں بلا لائے۔“ (حضرت عباس چلے جاتے ہیں)

○

تھوڑی دیر بعد مقدمہ کی کارروائی شروع ہوتی ہے۔ قاضی ابی بن کعب رضی اللہ عنہ بھی سنبھل کر بیٹھ جاتے ہیں۔ ایک طرف امیر المومنین ہیں تو دوسری طرف شاہِ دو جہاں کے عم مکرم۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ چند آدمیوں کو لے کر آ جاتے ہیں۔

ابی بن کعب: ”آگے ہو ابو الفضل۔“

حضرت عباس: ”اور گواہ بھی لے آیا ہوں۔“

ابی بن کعب: (ایک انصاری سے) ”تمہیں معاملہ کا علم ہے؟“

انصاری: ”جی ہاں۔“

ابی بن کعب: ”اور تم گواہی دیتے ہو کہ ابو الفضل سچے ہیں۔“

انصاری: ”میں اس واقعہ کا چشم دید گواہ ہوں۔ میں نے خود ابو الفضل کو آنحضرت صلی اللہ

علیہ وسلم کے دوشِ اقدس پر سوار ہوتے دیکھا ہے۔“

ابی بن کعب: (دوسرے انصاری شاہدوں سے) ”اور تم بھی گواہی دیتے ہو۔“

انصاری: ”ہاں ہم ابو الفضل کے بیان سے متفق ہیں۔“

حضرت عمر پہلے سے زیادہ پشیمان نظر آتے ہیں۔ ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے ہیں۔

ان کے سامنے سرور کائنات کا جسم اطہر پھر جاتا ہے جس پر ابو الفضل نے سواری کی۔ دوسرے ہی لمحہ

وہ خلیفہ جس کے نام سے ایوانِ باطل پر زلزلہ طاری ہو جاتا ہے جس کا شہرہ قیصر و کسریٰ کی نسبت کہیں

زیادہ زبانِ زو عام ہے، لرزہ بر اندام نظر آتا ہے۔

Click For More Books

<https://archive.org/details/@zohaibhasanattari>

حضرت عمر: (کیکپاتی آواز میں قاضی سے) ”مجھے معاف کر دیجئے“ میں حقیقت سے ناواقف

تھا۔

ابی بن کعب: ابوالفضل سے معافی مانگو

حضرت عمر (حضرت عباس سے) ”ابوالفضل اللہ مجھے معاف کر دیجئے“ میں کس قدر گنہگار

ہوں۔

(چند ٹائیے خاموشی رہتی ہے۔ حاضرین کی نظریں بار بار خلیفہ اسلام کے چہرہ کا طواف کر

رہی ہیں۔ حضرت عمر کی آواز آتی ہے)

ابوالفضل: ”کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ تم میرے کندھے پر سوار ہو کر یہ نالہ نصب کرو۔“

حضرت عباس: ”مجھے منظور ہے۔“

.....○.....

(تھوڑی دیر بعد تاریخ ایک نیا ورق لٹتی ہے۔ وہ خلیفہ اسلام جس پر اسلام کو ناز ہے

حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے مکان کے قریب اس جگہ رکوع کے بل جھکا نظر آتا ہے جہاں سے

پر نالہ اکھاڑا گیا تھا)

حضرت عباس: ”امیر المومنین کانپے نہیں ورنہ میں گر پڑوں گا۔“

(اس آواز کے ساتھ ہی حضرت عمر کے جسم سے ظاہری کپکپی دور ہو جاتی ہے۔ گودل خون

کے آنسو رو رہا ہے)

حضرت عباس: ”امیر المومنین جسم سنبھالے رکھئے“ مجھے نصب کرتے ہوئے کچھ دیر لگے

گی۔

حضرت عمر: ”ابوالفضل، قسم ہے مجھے رب کعبہ کی جب تک تم نہ کہو گے عمر اسی طرح جھکا

رہے گا۔“

(تھوڑی دیر بعد حضرت عباس کو دکر نیچے آجاتے ہیں)

حضرت عمر: ”پر نالہ نصب ہو گیا ابوالفضل!“

حضرت عباس: ”ہاں ہو گیا“ امیر المومنین!“

(حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے گوبدلہ دے دیا ہے مگر شیروں کو دہلانے والا ابھی تک لرز رہا

ہے۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں)

”امیر المومنین! میں نے بدلہ لے لیا ہے، میری بے ادبی معاف فرمائیے۔“
حضرت عمر: ”خدا کی قسم عمر مسلمان نہیں اگر اس معاملہ میں رنج رکھے۔“
حضرت عباس: ”اور سنئے امیر المومنین! میں اپنا یہ مکان راہِ خدا میں دیتا ہوں۔ آپ گرا کر مسجد نبوی میں شامل کرا دیجئے۔“
حضرت عمر: ”ٹھہر جاؤ، ابوالفضل سوچ کر فیصلہ کرو۔“
حضرت عباس: ”میں نے سوچ لیا ہے اور خدا سے دعا کرتا ہوں کہ میری اس قربانی کو قبول فرمائے۔“

حضرت عمر: ”آمین“

(اور دوسرے ہی لمحہ وہ بزرگ ہستیاں بغل گیر ہو جاتی ہیں)



حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ

صاحب دل شوکت ایمان عثمان غنی
ہاں وہ داماد شد ذیشان عثمان غنی
دے گئی جن کی شہادت زندگی ایمان کو
افتخار بیعت رضوان عثمان غنی
منبع جود و سخا وہ پیکر حلم و حیا
جان غیرت نور قلب و جان عثمان غنی
ان کی بیعت ہو گئی تھی بیعت شاہ حجاز
ظلمتوں میں نور کی پہچان عثمان غنی
زندگی بھر دین کے پرچم کو جھکنے نہ دیا
خود اگرچہ ہو گئے قربان عثمان غنی
مظہر صدق و صفا وہ جانشین مصطفیٰ
نور ایمان جامع القرآن عثمان غنی
ہاں رضا وہ نازش عشاق سلطان عرب
سربرس اللہ کا احسان عثمان غنی

(محمد اکرم رضا)

Click For More Books

<https://archive.org/details/@zohaibhasanattari>

امیر المؤمنین حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ

حضرت عثمان غنی بن عفان تاریخ اسلام کا اعزاز ہیں۔ آپ کی ذات کئی حوالوں سے محترم ہے۔ آپ کا شمار اسلام لانے والے اولین صحابہ میں ہوتا ہے۔ آپ نے اسلام قبول کر کے بے پناہ صعوبتوں اور مصائب کا سامنا کیا۔ آپ اجبشہ اور پھر مدینہ منورہ کی جانب دو مرتبہ ہجرت کی سعادت حاصل ہوئی۔ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے بعد آپ کو اتفاق رائے سے خلیفہ ثالث منتخب کیا گیا۔ آپ نے جمع قرآن اور ترمیم الم اسلام کو قرآن کی قرأت اور تفہیم کے حوالے سے ایک مقام پر جمع کیا۔ ورنہ امت اسلام میں بہت بڑا فتنہ رونما ہو چکا ہوتا۔ آپ نرم مزاج خوش خو، حلیم طبع اور حیا و شرم کا پیکر تھے۔ آپ کا یہ اعزاز آپ کو ہمیشہ امتیازی حیثیت عطا کرتا رہے گا کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یکے بعد دیگر اپنی دو صاحبزادیاں سیدہ رقیہ سیدہ ام کلثوم رضی اللہ عنہما آپ کے نکاح میں دیں۔ اس حوالے سے آپ ذوالنورین کہلائے۔

نور کی سرکار سے پایا دو شالا نور کا

ہو مبارک تجھ کو ذوالنورین جوڑا نور کا

حضرت عثمان غنی کا سلسلہ نسب پانچویں پشت میں عہد مناف پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مل جاتا ہے۔ ان کی وقائدہ اروی بنت کریم ہیں اور نانی ام حکیم البیضاء بنت عبدالمطلب جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سگی پھوپھی تھیں اور آنحضرت کے والد عبد اللہ کی توام بہن (انساب الاشراف) ان کی کنیت ابو عمر اور ابو عبد اللہ اور بقول بعض ابو یعلیٰ بھی) تھی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی ولادت عام الفیل کے چھ سال بعد ۵۷۶ عیسوی میں ہوئی۔ گویا وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عمر میں چھ سال چھوٹے تھے۔ ان کا شمار ان معدود سے چند افراد میں ہوتا ہے جنہوں نے زمانہ جاہلیت ہی میں لکھنا پڑھنا سیکھ لیا تھا۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں بھی کتابت وحی پر مامور فرمایا۔ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معتمد (سیکرٹری) کے فرائض بھی انجام دیتے رہے۔ بڑے سلیم الفطرت تھے۔ دور جاہلیت کی کسی برائی سے ان کا دامن آلودہ نہیں ہوا۔ شرم و حیا

Click For More Books

<https://archive.org/details/@zohaibhasanattari>

ان کے اخلاق عالیہ کا طرہ امتیاز تھا۔ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اشد امتی حیا عثمان بن عفان ابن حجر البیتمی نے اصواعق المحرقہ میں ان عنوان پر بہت سی احادیث جمع کی ہیں۔ اُمت مسلمہ میں کامل الحیا والایمان کے الفاظ انہیں کی شان میں استعمال کئے جاتے ہیں۔ جوان ہونے پر انہوں نے معززین قریش کی طرح پیشہ تجارت کو اپنایا اور اپنی صداقت و دیانت اور امانت و راست بازی کی بدولت تجارت میں غیر معمولی کامیابی حاصل کی۔ وہ مکے کے معاشرے میں ایک ممتاز و معزز اور دولت مند تاجر کی حیثیت سے مشہور و معروف تھے اور ”غنی“ کے لقب سے پکارتے جاتے تھے۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا شمار سابقون الاولون عشرہ مبشرہ اور ان چھ اکابر صحابہ میں ہوتا ہے جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام زندگی خوش رہے۔

حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دوسری صاحبزادی حضرت اُم کلثوم رضی اللہ عنہا (رک باں) کا نکاح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے کر دیا۔ یہ نکاح منشاء الہی کے مطابق تھا۔ (الاصابة) شعبان ۹ھ میں حضرت اُم کلثوم رضی اللہ عنہا کی وفات پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”اگر میری کوئی لڑکی اور بھی ہوتی تو وہ میں عثمان سے بیاہ دیتا“۔ ابن الاثیر نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے فرمایا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا۔ آپ نے فرمایا اگر میری چالیس بیٹیاں بھی ہوتیں تو میں انہیں یکے بعد دیگرے عثمان رضی اللہ عنہ سے بیاہ دیتا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی سے منقول ہے کہ لوگوں نے ان سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے فرمایا ”وہ ایک ایسے شخص تھے جنہیں ملا اعلیٰ میں ’ذوالنورین‘ کہہ کا پکارا گیا۔ یہ اس لئے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دو بیٹیوں کے خاوند تھے“۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی زندگی کا ایک اہم واقعہ وہ ہے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ذوالقعدہ ۶ھ میں اہل مکہ کی طرف اپنا سفیر بنا کر بھیجا۔ اسی کے نتیجے میں ”بیعت رضوان“ اور صلح حدیبیہ کے واقعات ظہور پذیر ہوئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سال چودہ سہ مسلمانوں کی بیعت میں عمرے کا ارادہ فرمایا اور مکے کی طرف تو روانہ ہو گئے جب آپ مقام حدیبیہ (رک باں) پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ قریش آمادہ پیکار ہیں اور وہ مسلمانوں کو مکے میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مع صحابہ کرام صرف زیارت حرم کیلئے تشریف لائے تھے اور جنگ

کرنا آپ کا مقصد نہ تھا چنانچہ آپ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے زیادہ کوئی اور معزز ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی جگہ اسے بھیجتے۔ مکہ معظمہ میں قریش نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو روک لیا۔ ادھر مسلمانوں میں یہ افواہ پھیل گئی کہ کفار نے حضرت عثمان کو شہید کر دیا ہے۔ اس خبر سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فکر مند ہو گئے۔ مسلمانوں کو سخت رنج پہنچا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تک ہم ان لوگوں سے جنگ نہ کر لیں یہیں رہیں گے۔ یہ کہہ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خون کا بدلہ لینے کیلئے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے جانبازی کی بیعت لی۔ (الطبری) اسی کو تاریخ میں اسلام ”بیعت الرضوان“ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا ایک ہاتھ دوسرے ہاتھ پر رکھا اور فرمایا ”ہذا لعثمان“ یہ ایسا اعزاز ہے جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے علاوہ کسی اور کے حصے میں نہیں آیا۔ (فتح: ۱۸) میں اسی واقع کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

حضرت عثمان کی بیعت حضرت عمر کی تدفین کے تین دن بعد محرم ۲۳ھ نومبر ۲۳ء میں ہوئی۔ حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ بن مسعود نے بیعت عثمان رضی اللہ عنہ کے موقع پر کہا ”بلاعتنا خیرنا“ ہم نے اپنے میں سے بہترین شخص کی بیعت کی ہے۔

خلافت عثمانی میں جو بارہ سال سے عرصے پر محیط ہے۔ ایسی عظیم الشان فتوحات حیرت انگیز سرعت کے ساتھ ہوئیں جن کی نظیر اس سے بیشتر کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ ان فتوحات کا سہرا ان کے عہد کے سپہ سالاروں حضرت ولید بن عقبہ، حضرت سعید بن العاص، حضرت عبد اللہ بن عامر، حضرت عبد اللہ بن سعد بن ابی سرح اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہم کے سر تھا۔ اس زمانے میں اسلامی مملکت کے دائرے میں بڑی وسعت ہوئی اور اس کی حدود سندھ سے لے کر اندلس تک جا پہنچیں۔ اسلامی افواج نے اس عہد میں بڑی جنگوں کے علاوہ بحری قوت کا مظاہرہ بھی کیا اور قبرص اور روؤس کے جزائر فتح کئے۔ ایک عظیم الشان بحری بیڑا تیار کیا گیا۔ حالانکہ اس سے بیشتر ان کے پاس ایک کشتی بھی نہ تھی۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ تو سمندری راستے سے اتنی دور جا نکلے کہ ۲۲ھ میں آبنائے قسطنطنیہ (بامفوس) تک جا پہنچے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بڑے مالدار تاجر اور حد درجہ فیاض اور فقی تھے۔ ان کا مال ہمیشہ اسلامی رفاہی کاموں میں صرف ہوتا تھا۔ خصوصاً غزوات کے موقع پر بہت کام آتا تھا۔ مدینہ منورہ میں پینے کے پانی کی قلت تھی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بحر رومہ ایک یہودی سے بیس یا تیس

ہزار روم میں خرید کر عام مسلمانوں کیلئے وقف کر دیا۔ آنحضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بڑے رومہ کو مسلمانوں کیلئے وقف کر دینے والے شخص کیلئے جنت کی بشارت دے کر ترغیب دلائی تھی۔

بعد میں انہوں نے اور بھی متعدد کنویں کھدوائے اور مسلمانوں کیلئے وقف کئے مثلاً بڑے سائب، بڑے عامر اور بڑے اریس، براریس وہی ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی انگٹھی جو یکے بعد دیگرے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں کی زینت بنی رہی تھی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ہاتھ سے گر پڑی۔ کنویں کا سارا پانی نکال دیا گیا لیکن انگٹھی نہیں ملی۔ عہد نبوی میں نمازیوں کی کثرت کے باعث جب مسجد نبوی کی توسیع کی ضرورت پیش آئی تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مسجد کے قریب واقع ایک زمین کا ٹکڑا خرید کر وقف کر دیا۔ غزوہ تبوک قحط سالی کے زمانے میں پیش آیا۔ اس موقع پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بڑھ چڑھ کر مالی امداد فراہم کی۔ اس لشکر کو ”جیش العسرة“ کے نام سے پکارا گیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے سامان رسد کیلئے ایک ہزار اونٹ ستر تھوڑے اور ایک ہزار دینار خدمت نبوی میں پیش کئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس فیاضی سے اس قر خوش ہوئے کہ دیناروں کو دست مبارک پر اچھالتے تھے اور فرماتے ماضر عثمان ما عمل بعد ہذا لیوم“ آج کے بعد عثمان رضی اللہ عنہ کچھ بھی کریں ان کو کوئی عمل نقصان نہیں پہنچائے گا۔

سب سے بڑا اور عظیم الشان کارنامہ جو خلافت عثمان رضی اللہ عنہ میں سرانجام پایا وہ عالم اسلام کو ایک مصحف اور قرأت پر جمع کرنا تھا۔ قرآن مجید کو لکھوا کر تمام ممالک اسلامیہ میں شائع کرنا اور ایک ہی قرأت پر سارے عالم کو اسلام کو متفق کر دینا خلافت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا مہتمم بالشان واقعہ ہے۔ ابن حجر ایتیمی لکھتے ہیں ”الما تميز عثمان“ بجمع القرآن فی الصحف علی توبیہ الیوم“ (الصواعق المحرقة) یہی وہ شاندار کارنامہ ہے جس کی بناء پر ان کا لقب ”جامع القرآن“ اُمت میں مشہور ہوا۔

ابن کثیر لکھتے ہیں:

”ومن مناقبه الكبار و حسناته العظيمة انه اجمع الناس علی قراءة واحدة“

روایت کے مطابق حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اُم المؤمنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس محفوظ مصحف کی سات نقلیں کروائیں اور مکہ معظمہ، مدینہ منورہ، شام، یمن، بحرین، بصرے اور کوفے میں ایک ایک نسخہ محفوظ کیا گیا۔ (جمع قرآن مجید کی پوری تفصیل البخاری اور فتح الباری ابواب جمع قرآن میں موجود ہے) مصحف عثمانی کے مندرجہ بالا نسخوں میں سے ایک وقت چار نسخے دنیا میں

محفوظ ہیں۔

- ۱۔ حجرہ نبوی کا نسخہ
 - ۲۔ خزانہ آثار مدینہ استانبول
 - ۳۔ کتاب خانہ مصری
 - ۴۔ کتاب خانہ ماسکو
- آپ زندگی بھر ارشادات رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر عامل رہے۔
آپ کے ایک خطبہ سے چند سطور ملاحظہ ہوں۔

”مجھے لوگوں نے مکلف بنایا ہے اور میں نے یہ ذمے داری قبول کر لی ہے۔ یاد رکھو! میں اتباع کرنے والوں میں سے ہوں بدعتی نہیں۔ یاد رکھو! مجھ پر کتاب اللہ اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد تمہاری نسبت سے تین باتیں واجب ہوں گی تم سے ان باتوں پر عمل کرانا جو تم میری خلافت سے قبل اجتماعی طور پر قبول کر چکے ہو اور ان پر عمل کرتے رہو۔ دوسری چیز اہل خبر کی سنت ہے۔ اگرچہ اس سلسلے میں کوئی حکم قرآنی نہیں تیسرے یہ کہ تم سے (جبراً) کچھ نہ لینا جب تک تم سزا کے طور پر اس کے مستوجب نہ ہو۔“

یہ حقیقت ہے کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی خلافت قرآنی سیاست کی آئینہ دار تھی۔ جہاں تک اسلامی معاشرے کی تشکیل و تنظیم اور داخلی نظم و نسق کا سوال ہے اس کا آغاز دور فاروقی میں ہو چکا تھا اور جو لائحہ عمل تجویز کیا جا چکا تھا۔ اس میں کسی ترمیم و تہنیک کی کوئی خاص ضرورت نہ تھی۔ مرکزی نظام مملکت اور صوبائی نظم و نسق باضابطگی سے چل رہا تھا۔ ابن جیر طبری کے بیان کے مطابق اس وقت مملکت اسلامیہ کی صوبائی تنظیم سیاسی اعتبار سے مندرجہ ذیل تھی

- ۱۔ مکہ
- ۲۔ طائف
- ۳۔ صنعاء
- ۴۔ نجد
- ۵۔ کوفہ
- ۶۔ بصرہ
- ۷۔ مصر
- ۸۔ حمص
- ۹۔ دمشق
- ۱۰۔ بحرین

ان تمام صوبوں میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بحیثیت والیان صوبہ متعین تھے۔ تمام والیان صوبہ دینی سیاسی و اقتصادی امور میں ماہر تھے۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی خلافت کی حدود ایران، خراسان، روم، مصر اور لیبیا تک پھیلی ہوئی تھی اور ہر جگہ ایک قانون ایک دین اور ایک ہی نظام حکومت رائج تھا۔ اس وسیع مملکت کی

حفاظت اور مزید وسعت کیلئے ایک زبردست تربیت یافتہ فوجی نظام بھی موجود تھا۔ سرحدوں کے تحفظ کیلئے اہم مقامات میں مستقل فوجی مرکز قائم تھے۔ ملکی تنظیم اور سیاسی آپ ہی جستہ تقریر و خطابت کا زیادہ ملکہ نہ تھا لیکن آپ کی تقریر ہمیشہ نہایت مختصر صریح و موثر ہوتی۔

اپنے ایک خطبہ میں فرماتے ہیں:

”لوگو! بعض حرص و طمع احتیاج محض ہے اور نا اُمیدی تو نگری و بے نیازی کے مترادف ہے۔ تم ایسی چیزیں جمع کرتے ہو جن سے متمتع نہیں ہو سکتے اور ایسی امیدیں باندھتے ہو جو پوری نہیں ہو سکتیں تم لوگ اس دھوکے کے گھر میں ایک مقرر وقت کیلئے چھوڑے گئے ہو۔“

ارشادات رسول

امام احمد (مسند احمد) میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں انہوں نے فرمایا ”ایک دن حضور طلوع شمس کے بعد تشریف لائے اور فرمایا میں نے (خواب) دیکھا ہے مجھے ترازو دی گئی مجھے ایک پلڑے میں رکھا گیا اور میری اُمت دوسرے پلڑے میں رکھی گئی پھر وزن کیا گیا تو میں بھاری رہا۔ پھر ابو بکر رضی اللہ عنہ لائے گئے اور انہیں تو لا گیا وہ ساری اُمت کے برابر ہے۔ پھر عمر رضی اللہ عنہ لائے گئے ان کا وزن کیا گیا وہ ان سب سے ہم وزن رہے۔ پھر حضرت عثمان لائے گئے۔“

ایک روایت میں ہے فرمایا ”یہ عثمان بہت زیادہ صاحب حیا ہیں۔ مجھے خوف تھا کہ اگر انہیں اسی حالت میں حاضر ہونے کی اجازت دے دیتا تو وہ مجھے نہ مل سکتے اور جو بات انہیں کہنی تھی نہ کہہ سکتے۔ یعنی میری نہ پنڈلیوں کو کھلا دیکھ کر غلبہ ادب اور غایت حیا سے واپس چلے جاتے۔“

ابو یعلیٰ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت جابر رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کی ہے وہ کہتے تھے ہم مہاجرین کی ایک جماعت کے ساتھ جن میں حضرت ابو بکر، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت طلحہ، حضرت زبیر، حضرت عبدالرحمن بن عوف اور حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہم تھے۔ ایک مکان میں بیٹھے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”تم میں سے ہر شخص اپنے کفو کے ساتھ کھڑا ہو جائے۔“ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف تشریف لے گئے اور ان سے بغل گیر ہونے اور فرمایا تم دنیا اور آخرت میں میرے دوست ہو۔“

.....○.....

حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”ہر نبی کا ایک رفیق ہوتا ہے اور میرا رفیق یعنی جنت میں عثمان ہے“ (ترمذی و ابن ماجہ)

Click For More Books

<https://archive.org/details/@zohaibhasanattari>

ترمذی میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرمایا ”نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک شخص کے جنازہ پر تشریف لائے تاکہ نماز جنازہ پڑھائیں لیکن آپ نے اس کی نماز جنازہ نہ پڑھی عرض کیا گیا اس سے قبل ہم نے کبھی نہیں دیکھا کہ آپ نے کسی کی نماز جنازہ نہ پڑھائی ہو فرمایا یہ ”عثمان“ سے بغض رکھتا تھا۔ لہذا اللہ عزوجل اس کو مغفوض رکھتے ہیں۔“

.....○.....

ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی اتنا ہاتھ اٹھا کر دُعا کرتے نہیں دیکھا کہ آپ کی بغل مبارک ظاہر ہو جائے۔ مگر عثمان رضی اللہ عنہ بن عفان کیلئے جب دعا فرماتے تھے:

حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرمایا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ”اول شب سے طلوع فجر تک ہاتھ اٹھا کر عثمان رضی اللہ عنہ کیلئے دعا ارشاد فرماتے رہے۔ فرماتے تھے پروردگار میں عثمان رضی اللہ عنہ سے راضی ہوں۔ آپ بھی راضی ہو جائیں۔“

اور ایک روایت میں سے عثمان رضی اللہ عنہ سے حضور نے فرمایا:

”اللہ تعالیٰ سے تمہارے خفیہ ظاہر سب گناہ معاف فرمادے جو تم سے ہو چکے تا قیامت تک ہوں گے۔“

خوف خدا

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اکثر خوف خداوندی سے آبدیدہ رہتے۔ موت قبر اور عاقبت کا خیال ہمیشہ دامن گیر رہتا۔ سامنے سے جنازہ گزرتا تو کھڑے ہو جاتے اور بے اختیار آنکھوں سے آنسو نکل آتے۔ مقبروں سے گزرتے تو اس قدر روتے کہ داڑھی تر ہو جاتی، لوگ کہتے کہ دوزخ و جنت کے تذکروں سے تو آپ پر اس قدر رقت طاری نہیں ہوتی، آخر مقبروں میں کیا خاص بات ہوتی ہے کہ انہیں دیکھ کر آپ بے قرار ہو جاتے ہیں؟ فرماتے ”آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ قبر آخرت کی سب سے پہلی منزل ہے۔ اگر یہ معاملہ آسانی سے طے ہو گیا تو پھر تمام منزلیں آسان ہیں اور اگر اس میں دشواری پیش آئی تو پھر تمام مرحلے دشوار ہوں گے۔“

خدمت رسول صلی اللہ علیہ وسلم

آپ اکثر و بیشتر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں تحائف و ہدایا اور اموال و رقوم پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتے رہتے تھے۔ ایک دفعہ چار دن تک آل رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے

Click For More Books

<https://archive.org/details/@zohaibhasanattari>

فقروفاقہ سے بسر کیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوا تو آنکھوں سے آنسو نکل آئے اور اسی وقت بہت سا سامان خورد و نوش اور تین سو درہم لا کر بطور نذر پیش کیا۔

احترام رسول

وفا و محبت اور صدق و صفا کا ایک مظہر و ثبوت محبوب کا احترام اور اس کے متعلقین کا احترام ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ادب و احترام اس قدر ملحوظ تھا کہ جس ہاتھ سے آپ کے دست مبارک پر بیعت کی تھی پھر اس کو نجاست یا محل نجاست سے مس نہ ہونے دیا۔ اہل بیت نبوی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہما کا خاص طور سے پاس و خیال تھا۔ چنانچہ اپنے عہد خلافت میں جب اصحاب و طائف کے رمضان کے روزینے مقرر کئے تو ازواج مطہرات کا روزینہ سب سے گرانقدر تھا۔

بارگاہِ نبوت میں توقیر و تعظیم

حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایسی جگہ تشریف فرما تھے جہاں پانی تھا (بئر اریس کے کنارے) آپ نے دونوں زانوں زانو یا ایک زانو مبارک کھول رکھا تھا۔ جب (حضرت) عثمان رضی اللہ عنہ اس جگہ آئے تو آپ نے زانو کو ڈھانپ لیا۔ ایک اور موقع سے متعلق انہی حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے:

”حضور صلی اللہ علیہ وسلم نکیہ لگائے ہوئے تھے جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ آئے تو آپ سیدھے بیٹھ گئے۔“

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر میں لیٹے ہوئے تھے آپ کی رانیں مبارک یا پنڈلیاں مبارک کھلی ہوئی تھیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اجازت طلب کی۔ آپ نے انہیں بھی اجازت دے دی اور وہ بھی اسی طرح بات چیت کرتے رہے پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ تشریف لے گئے تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ آئے مگر آپ نے پروا نہ فرمائی اور نہ ہی حرکت فرمائی پھر عمر رضی اللہ عنہ آئے مگر آپ نے پروا نہ فرمائی اور نہ ہی پروا کی پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ آئے تو آپ اٹھ کر بیٹھ گئے اور اپنا کپڑا ٹھیک فرمایا تو آپ نے فرمایا کیا میں.....

محبت رسول

آپ کو حضور پاک سے جو والہانہ اُلفت و محبت اور بے تابانہ دل بستگی شنگلی تھی اس کا اندازہ

اس واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مکہ تشریف لے گئے تو صحابہ رضی اللہ عنہم کو رشک ہوا کہ عثمان رضی اللہ عنہ تو مزے سے کعبہ کا طواف کر رہے ہوں گے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے اُمید نہیں کہ وہ میرے بغیر طواف کریں۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ابوسفیان وغیرہ مکہ کے سرداروں سے ملتے رہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام پہنچاتے رہے جب واپس ہونے لگے تو قریش نے خود درخواست کی کہ تم مکہ میں آئے ہوئے ہو تم طواف کرتے جاؤ انہوں نے جواب دیا یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو روکے گئے ہوں اور میں طواف کر لوں قریش کو اس جواب پر غصہ آیا جس کی وجہ سے انہوں نے حضرت عثمان کو روک لیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت ذوالنورین کی قلبی محبت و وابستگی اور دلی ربط و تعلق ایک اور ثبوت یہ ہے کہ جب بزار لیس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی انگشتی مبارک ان کے ہاتھ سے گر پڑی تو انہوں نے اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ..... دن تک اسے تلاش کیا کنویں کا سارا پانی نکال ڈالا مگر انگٹھی نہ ملی۔

ان کے عہد خلافت میں تہذیب و تمدن، صنعت، تجارت اور علوم و فنون کو بھی ترقی ہوئی۔ دولت و ثروت اور فارغ البانی کا دور دورہ تھا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے مدینہ منورہ اور اس کے قرب و جوار میں خوبصورت عمارتیں تعمیر کروائیں اور خوشحالی عام ہو گئی۔ اسی زمانے میں قدیم بازاروں کے علاوہ نئے بازار بھی تعمیر کئے گئے اور عائد قریش حجاز سے نکل کر درواز علاقوں میں پہنچ گئے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی اسلامی خدمات کا تذکرہ بڑا طویل ہے۔ ان کی ایک اہم خدمت مسجد الحرام کی توسیع ہے۔ جو ۲۶ھ میں کی گئی۔ اس مقصد کیلئے آس پاس کے مکانات خرید کر وہ جگہ مسجد میں شامل کر دی گئی۔ (الطبری)

۶۹ھ میں انہوں نے مسجد نبوی کی تعمیر و توسیع کرائی۔ اس کام میں پورے دس ماہ صرف ہوئے۔ عمارت کیلئے چونا اور منقش پتھر استعمال کئے گئے۔ حضرت عمر کے زمانہ میں مسجد نبوی کا طول ایک سو چالیس گز اور عرض ایک سو بیس گز تھا۔ اب طول ایک سو ساٹھ اور عرض ایک سو پچاس گز ہو گیا۔ بحری فتوحات کے سلسلے میں بھی حکم دیا کہ مفتوحہ علاقوں میں مسجدیں تعمیر کی جائیں اور پرانی مساجد مزید وسیع کی جائیں۔

اتباع سنت

سیدنا حضرت ذوالنورین رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے محبت صادق تھے لہذا آپ کے مطیع و منقاد اور آپ کی سنت کے تابع و متبع تھے۔ ذیل میں آپ کی اتباع سنت کے چند جلوے ملاحظہ ہوں:

اپنے ہر قول و فعل یہاں تک کہ حرکات و سکنات اور اتفاقی باتوں میں بھی محبوب آقا کی اتباع کو پیش نظر رکھتے تھے۔ ایک دفعہ وضو کر کے متبسم ہوئے لوگوں نے اس بے موقع تبسم کی وجہ پوچھی فرمایا میں نے ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم (روحی فداہ) کو اسی طرح وضو کر کے ہنستے ہوئے دیکھا تھا۔

ایک دفعہ سامنے سے دوسرے دروازہ پر بیٹھ کر بکری کا پٹھا منگوایا اور کھایا اور بغیر تازہ وضو کئے ہوئے نماز کھڑے ہو گئے۔ پھر فرمایا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسی جگہ بیٹھ کر کھایا تھا اور اسی طرح کیا تھا۔

عبدالرحمن بن ابان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس وضو کا پانی لایا وہ بیٹھنے کی جگہ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ نے نہایت اچھا وضو کیا۔ پھر فرمایا میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا آپ نے اسی جگہ بیٹھ کر نہایت اچھا وضو کیا۔ پھر فرمایا جو شخص اسی طرح وضو کر کے مسجد میں آئے اور دو رکعت نماز پڑھے پھر (فرض نماز کی انتظار میں بیٹھ جائے تو اس کے تمام گزشتہ گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں)

بشارت جنت

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بارہا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو جنت کی بشارت عطا فرمائی۔ شیخ الاسلام امام ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

متواتر اسناد و عرق سے یہ حقیقت ثابت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو جنت کی بشارت عطا فرمائی۔ انہیں اہل جنت میں شمار فرمایا اور ان کیلئے شہادت کی گواہی دی۔ علامہ ابن عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ رقمطراز ہیں:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ان دس حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے ایک ہیں جن کیلئے رسول کریم نے جنت کی شہادت دی ہے اور وہ ان چھ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے ایک

ہیں، جن کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے شوریٰ کیلئے نامزد فرمایا تھا اور خبر دی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بوقت وفات ان (چھ) سے خوش تھے۔

حضرت امام ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

حضرت عثمان بن عفان امیر المؤمنین ذوالنورین دو ہجرتوں سے مشرف اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دو صاحبزادیوں کے زوج اقدس تھے اور آپ ان دس حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے ایک تھے جن کیلئے حضور نے جنت کی شہادت دی اور چھ اراکین شوریٰ میں سے ایک تھے اور پھر ان چھ میں سے جو تین حضرات خلافت کیلئے بیچ گئے تھے۔ (تین حضرات دس بروار ہو گئے تھے) آپ ان باقی ماندہ تین میں سے ایک تھے پھر انصار و مہاجرین رضی اللہ عنہم کے اجماع سے آپ خلیفہ منتخب ہوئے۔ پس آپ خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم اور آئمہ مہدیین رضی اللہ عنہم میں تیسرے تھے جن کی اتباع و اقتداء کا امت کو (خدا اور رسول کی طرف سے) امر اور حکم ہے۔

حضرت عبدالرحمن رضی اللہ عنہ بن عوف سے روایت ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ابوبکر جنت میں ہیں اور عمر رضی اللہ عنہ اور عثمان رضی اللہ عنہ اور علی رضی اللہ عنہ اور طلحہ رضی اللہ عنہ اور زبیر رضی اللہ عنہ اور عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ اور سعد بن ابی وقاص اور سعید بن زید اور ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ بن جراح جنت میں ہیں۔

شہید مدینہ

آپ نے تقریباً ۱۲ سال حکومت کی پہلے چھ سال نہایت اطمینان اور ریاستی امن و سلامتی سے گزرے مگر آخری چھ سال میں آپ کو شدید شووشوں کا سامنا کرنا پڑا۔ آپ چاہتے تو قوت ان تمام شووشوں کا خاتمہ کر سکتے تھے مگر آپ فرماتے تھے کہ یہ تو میرے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کا شہرہ اور میں یہاں خون بہاؤں، یہاں بے گناہ عثمان رضی اللہ عنہ تو شہید ہو سکتا مگر تمام تر حکومتی اختیارات اور قومی قوت ہوتے ہوئے بھی مجھے مسلمانوں کا (خواہ وہ باغی ہی کیوں نہ ہوں) خون بہانا گوارا نہیں۔ آپ ہر طرح طرح کے الزامات لگاتے گئے جن کی کوئی خاص حقیقت نہیں تھی لیکن آپ بھی وضاحت فرماتے رہے۔

اپنے اوپر لوگوں کے کئے گئے اعتراضات کے جواب میں ایک بڑا جامع خطبہ ارشاد فرمایا جس سے الزامات کی پوری طرح نفی کر دی۔ آپ کا یہ خطبہ زبان و بیان کا ایک منفرد شاہکار ہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ میں اپنے خاندان والوں سے محبت رکھتا ہوں اور ان کے ساتھ فیاضی کرتا ہوں لیکن میری محبت نے مجھے ظلم کی طرف مائل نہیں کیا بلکہ میں صرف ان کے واجبی حقوق ادا کرتا ہوں۔ اسی طرح فیاضی بھی اپنے ہی مال تک محدود ہے۔ مسلمانوں کا مال نہ میں اپنے لئے حلال سمجھتا ہوں اور نہ کسی دوسرے کیلئے۔ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں بھی اپنے مال سے گرانقدر عطیے دیتا تھا۔ حالانکہ میں اس زمانہ میں اپنے مال کو وسعت دے رہا ہوں اور اب جبکہ میں اپنی خاندانی عمر کو پہنچ چکا ہوں، زندگی ختم ہو چکی ہے اور اپنا تمام مال اور سرمایہ اپنے اہل و عیال کے سپرد کر دیا ہے تو ملحدین ایسی باتیں مشہور کرتے ہیں۔ خدا کی قسم! میں نے کسی شہر پر خرچ کا کوئی بار ایسا نہیں ڈالا کہ اس قسم کا الزام دینا جائز ہو اور جو کچھ وصول ہوا۔ انہی لوگوں کی رفاہ اور یہود پر صرف ہو گیا، میرے پاس صرف غمخس آتا ہے اور اس میں سے بھی میرے لئے کچھ لینا جائز نہیں۔ مسلمانوں نے اس کو میرے مشورہ کے بغیر مستحقین میں صرف کیا۔ یہ مال میں ایک پیسہ کا بھی تصرف نہیں کیا جاتا۔ میں اس سے کچھ نہیں لیتا۔ یہاں تک کہ کھاتا بھی اپنے مال سے ہوں۔

ہر حال حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے افواہوں کو سن کر حالات کی تحقیقات کیلئے ایک تحقیقاتی کمیشن مقرر کیا اور مختلف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو مختلف علاقوں کی طرف بھیجا کہ وہ واپس آ کر صحیح صحیح رپورٹ پیش کر دیں۔ (الطبری)

پھر پوری مملکت میں اعلان کر دیا کہ جس شخص کو میرے عمال کی خلاف کوئی شکایت ہو وہ حج کے موقع پر بیان کرے میں ظالم سے مظلوم کا حق دلاؤں گا۔

پھر بعض باتوں کی وضاحت خود حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے بعض خطبات میں کر دی اور نہایت نرمی اور صاف گوئی سے معترضین کی تردید فرمائی۔ ۳۵ھ کے آخر میں شریکوں نے مدینے کا رخ کیا۔ اس زمانے میں بسبب حج مدینہ تقریباً خالی تھا۔ ان باغیوں نے پہلے تو امیر المومنین کا مسجد میں آنا جانا دشوار بنا دیا اور پھر ان کے دولت کدے کا محاصرہ کر لیا جو مختلف روایات کے مطابق کم و بیش چالیس دن جاری رہا۔ اس دوران میں امیر المومنین رضی اللہ عنہ نے کئی بار کان کی چھت پر سے باغیوں کو خطاب فرمایا۔

شورش پسندوں کو نصیحت کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ساتھ اپنی نیاز مندی کے حوالے دیئے۔ اسلام کی خاطر اپنی خدمات جلیلہ گنوائیں، لیکن اثر کون قبول کرتا۔ انہوں نے باغیوں کو متنبہ کیا،

بخدا اگر تم نے مجھے قتل کر دیا تو پھر تا قیامت نہ ایک ساتھ نماز پڑھو گے نہ ایک ساتھ جہاد کرو گے۔
باغیوں نے ان سے خلافت سے دستبردار ہونے کا مطالبہ بھی کیا۔ کئی صحابہ نے مدینہ منورہ چھوڑ کر مملکت کے کسی اور حصے میں چلے جانے کی رائے دی۔ لیکن انہوں نے انکار کر دیا کہ نہ تو میں اس قمیض کو اتاروں گا جو اللہ نے پہنائی ہے اور نہ جو ار رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے جدائی ہی اختیار کروں گا۔
ان کی حفاظت کے لئے بعض اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم نے اپنے فرزندوں کو ان کی قیام گاہ کے باہر مقرر کر دیا تھا۔ حضرت حسن، حضرت حسین، حضرت عبداللہ بن زبیر اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم انہیں نوجوانوں میں سے تھے۔ ان کے علاوہ بھی ایک جم غفیر ان کے پاس موجود تھا۔ لوگوں نے اس خواہش کا اظہار بھی کیا کہ امیر المومنین انہیں باغیوں کا مقابلہ کرنے کی اجازت دیں لیکن انہوں نے منع کر دیا۔

اور فرمایا جس پر میرا کچھ بھی حق ہے میں اسے اللہ کی قسم دلا کر کہتا ہوں کہ وہ اپنا ہاتھ روکے رکھے اور اپنے گھر کو چلا جائے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اُمت میں خونریزی اور خانہ جنگی گوارا نہیں تھی۔ آخر میں تو یہ حالت آ پہنچی کہ امیر المومنین کا پانی بند کر دیا گیا، انہیں پتھر مارے گئے، گھر کو آگ لگا دی گئی، سامان لوٹ لیا گیا، لیکن انہوں نے تمام مصائب کو حیرت انگیز صبر و استقلال سے ساتھ برداشت کیا اور اپنی حمایت میں کسی جو جنگ کرنے کی اجازت نہ دی اور اپنے ذاتی تحفظ کیلئے مدینہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حرمت پر آنچ نہ آنے دی۔ ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش گوئی کے مطابق اپنی شہادت کا یقین ہو چکا تھا۔ آخری رات انہوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا۔ آپ نے فرمایا ”یا عثمان افطر عندنا“

اے عثمان! ہمارے ساتھ روزہ افطار کرنا، آخر کار یوم الجمعہ ۱۸ ذوالحجہ ۳۵ھ کو چند باغیوں نے گھر میں داخل ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تیسرے خلیفہ رضی اللہ عنہ کو اس وقت شہید کر دیا جب وہ تلاوت قرآن مجید میں مصروف تھے۔ شہادت کے وقت ان کی عمر اسی سال سے متجاوز تھی۔ ان جریر کے مطابق امیر المومنین کی لاش کو چند صحابہ نے جن میں حضرات علی بن ابی طالب، طلحہ، زبیر، کعب بن مالک، زید بن ثابت، جبیر بن مطعم اور حزام رضی اللہ عنہم شامل تھے۔ اٹھایا اور البقیع کی مشرقی جانب عشق کو کب میں سپرد خاک کر دیا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے آخری زمانے میں جو فتنہ و فساد برپا ہوا، اس کی وجہ درحقیقت یہی ہے کہ دولت مندی اور تمول کی کثرت نے مسلمانوں میں بھی اس کے وہ الزام پیدا کر دیئے جو

ہر قوم میں ایسی حالت میں پیدا ہو جاتے ہیں اور بالآخر ان کے ضعف اور انحطاط کا سبب بن جاتے ہیں۔ اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں سے فرمایا کرتے تھے ”مجھے تمہارے فقر و فاقہ سے کوئی خوف نہیں ہے بلکہ تمہاری دنیاوی دولت ہی کے خطرات سے ڈرتا ہوں تمہول اور دولت کی کثرت کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کل قوم کے فوائد کے مقابلے میں ہر جماعت اور ہر فرد اپنے جماعتی اور شخصی فوائد کو ترجیح دینے لگتا ہے جس سے بغض و عناد پیدا ہو جاتا ہے۔ قومی وحدت پارا پارا ہو جاتی ہے اور انسان اپنی ذاتی اغراض کا غلام ہو جاتا ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنی شہادت کے درپے اور فتنہ و فساد پر آمادہ بلوائیوں سے سچ فرمایا کہ اگر تم نے میرے خون سے ہاتھ رنگ لئے تو اُمت اسلام پھر کبھی ایک مرکز پر جمع نہ ہو پائے گی۔ آپ کا یہ ارشاد تاریخ کی صداقت بن گیا۔ آج صدیاں ہونے کو ہیں مگر صدیوں پیشتر بھی او ر آج بھی ملت اسلام کے ایک ہونے کے آثار نظر نہیں آتے۔ ہم فتنہ و فساد تعصبات اور لسانی و علاقائی وحدتوں میں الجھ گئے اور اسلام کی وحدت کو فراموش کر دیا۔

لاکھوں سلام ہوں اس شہید مدینہ پر جس نے اپنے خون سے مدینہ طیبہ کی زمین کو لہو رنگ کر دیا مگر اوروں کا خون بہانا گوارا نہ کیا۔

سلام میں اس ابتدائی دور کے مسلمان پر جو اسلام لانے والوں میں چوتھا مسلمان تھا۔ سلام ہوں اس پیکر سنی..... جس نے اپنا مال بارہ اسلام اور مسلمانوں کیلئے وقف کر دیا۔ سلام ہوں اس جنت کے حقدار پر کہ جس نے..... ہائے مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے لئے جنت کی خوشخبری سنی۔

سلام ہوں اس امیر المومنین پر جس کے دور میں اسلامی فتوحات کا دائرہ دور دور تک جا پہنچا۔ سلام ہوں اس ”ذوالنورین“ پر کہ جس کے اعزاز کو کوئی اور چھو نہ سکا۔ سلام ہوں اس بطل جلیل پر جو قبول اسلام سے شہادت تک امن و سلامتی کا پرچم لہراتا تھا۔ سلام ہوں اس صاحب حلم و حیا پر کہ جس کا اسوہ ہر حال میں ہمارے لئے شمع راہ ہے۔ سلام ہوں اس جامع القرآن پر جس کی بصیرت اور فکری روشنی نے قرآن حکیم کو کسی بھی قسم کی رختہ اندازی سے پاک کر دیا۔

صوفیوں کا ہے اسما عالی حضرت عثمان کا
ان کی رخشندہ بصیرت شوکت ایمان کا

سیدنا علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ

جس طرح آفتاب نصف النہار پر ہو تو ذرات ریگزار کو اپنی روشنی کا پرتو بخش دیتا ہے اور ذرات بے مایہ بھی جگمگا اٹھتے ہیں اسی طرح جب حضور محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مہر عالمتاب نبوت بن کر کوہِ قارآن پر جلوہ گر ہوئے تو آپ کے کردار کی لازوال کرنوں نے ذراتِ ریگزار کی صورت بے مایہ صحرائشینوں کے قلب و جان کو منور کر کے انہیں اقوامِ عالم میں ممتاز کر دیا، جو بھی آپ کے دامانِ فیوض سے وابستہ ہوا بزمِ ہستی کی نگاہوں کا ستارا بن گیا۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ آئے تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا لقب پایا، حضرت عمر ابن الخطاب کو فاروقِ اعظم کا خطاب ملا، حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو کامل الحیا والایمان کی سند ملی اور جب سیدنا علی ابن ابی طالب آپ کے دربار گہر بار سے فیضیاب ہوئے تو اسد اللہ الغالب کا اعزاز ان کا مقدر بن چکا تھا۔ کس کس محبت سرور کو نین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تذکرہ کیا جائے، حق تو یہ ہے کہ:

جس طرف چشم محمد کے اشارے ہو گئے جتنے ذرے سامنے آئے ستارے ہو گئے

ولادتِ حضرت علی رضی اللہ عنہ

آپ کی ولادت باسعادت ۱۳ رجب المرجب بروز جمعۃ المبارک عام الفیل کے تیس سال بعد مکہ مکرمہ میں ہوئی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ قبیلہ بنی عبد العزیٰ کے چند لوگوں کے ساتھ مسجد بیت الحرام میں تشریف فرما تھے کہ مولا علی کرم اللہ وجہہ کی والدہ فاطمہ بنت اسد وہاں تشریف لائیں۔ جب وہ مصروفِ طواف ہوئیں تو چوتھے چکر میں چلنے کی قوت نہ رہی، دروازہ نے شدت اختیار کر لی تو آپ بے اختیار ہو کر پکاریں:

”اے رب کعبہ، محرمت کعبہ اس ولادت کو مجھ پر آسان کر“

یکلخت دیوارِ کعبہ شق ہوئی اور فاطمہ بنت اسد کعبے کے اندر تشریف لے گئیں اور وہاں موجود افراد کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئیں۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے آپ کو اندرونِ کعبہ تلاش کیا مگر آپ نہ ملیں۔ چوتھے روز آپ اسی کعبہ سے باہر تشریف لائیں تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو گود میں

لئے ہوئے تھیں۔

جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ولادت کی خبر ملی تو آپ نے اپنے چچا اور چچی سے فرمایا کہ اس کا نام کیا رکھا ہے؟ حضرت ابوطالب نے کہا کہ میں نے اس کا نام زید اور اس کی والدہ نے اسد رکھا ہے۔ اس پر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا اس کا نام علی رکھو جو عالی ہمتی کی خبر دے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی والدہ نے عرض کیا خدا کی قسم مجھے غیب سے یہ آوازیں آتی تھیں کہ فاطمہ اس کا نام ”علی“ رکھ کر میں نے اس کو چھپایا تھا۔

قبولِ اسلام

حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یہ اولیت حاصل ہے کہ آپ نے نو عمر لڑکوں میں سے سب سے پہلے دعوتِ اسلام کو قبول کیا اور حضور محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لائے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عمر ابھی دس سال ہی کی تھی کہ جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو رب کی طرف سے اعلانِ نبوت کا حکم عطا ہوا اور اس کے ساتھ ہی نماز بھی فرض ہو گئی۔ ایک دن حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اور حضرت خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ عنہا نماز پڑھ رہے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حیرت سے اس نئے منظر کو دیکھا اور اپنے بزرگ بھائی سرور کائنات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا کہ یہ سب کیا تھا؟ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی توحید اپنے منصبِ نبوت اور نماز وغیرہ کے بارے میں بتایا اور انہیں اسلام قبول کرنے کی دعوت دی۔ ایک دن کے غور و فکر کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ دامانِ نبوت سے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے وابستہ ہو چکے تھے۔ اسلام قبول کرنے والوں میں آپ تیسرے فرد تھے۔

اشاعتِ اسلام میں معاونتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم

جب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اعلانِ نبوت فرما چکے تو آپ تین سال تک خفیہ طریق سے اسلام کی تبلیغ کرتے رہے۔ عام اجتماعات سے خطاب کرنے کے بجائے آپ مخصوص افراد سے ملاقاتیں کرتے اور انہیں قبولِ اسلام کی دعوت دیتے۔ اعلانِ نبوت کے چوتھے سال حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خدا کی طرف سے حکم ہوا کہ اب آپ خفیہ طور پر نہیں بلکہ اعلانیہ طور پر تبلیغ کیجئے اور اس کی ابتداء اپنے قریبی رشتہ داروں سے کیجئے۔

حکمِ ربانی کی تعمیل میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کوہِ صفا پر چڑھ کر اپنے خاندان کے

لوگوں کو جمع کیا۔ انہیں توحید اور اپنی رسالت پر ایمان لانے کو ارشاد فرمایا لیکن ابولہب نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں بدتمیزی کی جس سے مجمع منتشر ہو گیا۔ آپ نے ایک مرتبہ پھر اپنے عزیزوں کو جمع کیا اور فرمایا کہ اے بنو عبدالمطلب میں تمہارے سامنے دنیا اور آخرت کی بہترین نعمتیں پیش کرتا ہوں۔ بتاؤ اس معاملہ میں کون میرا ساتھ دے گا؟ آپ کی یہ بات سن کر جملہ عزیز خاموش رہے۔ فقط حضرت علی رضی اللہ عنہ کی آواز ابھری انہوں نے پُر عزم لہجے میں کہا:

”اگرچہ میری عمر سب سے چھوٹی ہے میری آنکھیں دکھتی ہیں اور میری ٹانگیں پتلی ہیں لیکن میں اسلام کی راہ میں آپ کا ساتھ دوں گا“

چھوٹی سی عمر میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قبولیت اسلام کا اظہار اور حضور محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیلئے معاونت کا اعلان آنے والے ادوار میں آپ کی انتہائی سعید بخشی کا سبب ثابت ہوا۔

ہجرت رسول ﷺ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جانثاری

جب کفار نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شہادت کا منصوبہ بنا لیا تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہجرت کا حکم ملا۔ رات کا وقت تھا آپ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی معیت میں مکہ سے مدینہ کی جانب روانہ ہونا چاہتے تھے مگر آپ کے پاس اہل مکہ کی امانتیں تھیں جنہیں لوٹانا ضروری تھا۔ کفار نے چاروں طرف سے آپ کے گھر کا محاصرہ کیا ہوا تھا۔ اس موقع پر آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ میرے پاس اہل مکہ کی بہت سی امانتیں ہیں جنہیں واپس لوٹانا ضروری ہے تم میرے بستر پر لیٹ جاؤ صبح جب تم یہ امانتیں حقداروں کے سپرد کر چکو تو مدینہ چلے آنا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حکم مصطفوی کی اطاعت میں ذرا بھر بھی تامل نہیں کیا اور بے خوف و خطر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بستر پر لیٹ گئے۔ صبح جب کفار تلواریں سونت کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مکان میں آئے تو دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بجائے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جانثار آپ کے بستر پر سو رہا ہے۔ دل و جان مطمئن لبوں پر کفار کیلئے خندہ استہزاء کفار کی دھمکیاں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پائے استقلال میں ذرا بھر بھی لغزش پیدا نہ کر سکیں اور آپ جملہ امانتیں حقداروں میں تقسیم کر کے تین چار یوم بعد حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم کے مطابق مدینہ کو ہجرت کر گئے۔

دلیری و شجاعت

سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نہایت شجاع بہادر جوان مرد اور دلیر تھے۔ آپ کی شجاعت و

دلیری ضرب المثل میں ڈھل چکی ہے جس دشمن کے مقابلے میں میدان میں اترے اس سے کبھی شکست نہ کھائی ہر معرکہ میں آپ کو اپنے حریف پر فتح کامل عطا ہوئی۔ آپ تلوار کے دھنی جنگ آزما اور حرب و ضرب کے ماہر تھے۔ علامہ اقبال نے آپ کی شجاعت کو عالم اسلام کا افتخار قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ:

تری خاک میں ہے اگر شر تو خیال فقر و غنا نہ کر کہ جہاں میں نان شعیر پر ہے مدارِ قوتِ حیدری
آپ کی تیغ بے نیام جب کفار کے خلاف نیام سے باہر آتی تھی تو غلبہ اسلام کا احساس
دلانے بغیر نہیں رکتی تھی۔ آپ میدانِ جہاد میں دشمنوں پر ہمیشہ بڑھ چڑھ کر وار کرتے تھے۔ غزوہ
بدر میں آپ نے بہادری و دلیری کے وہ جوہر دکھائے کہ دشمن دنگ رہ گئے۔ اس دور میں دستور تھا
کہ پہلے متحارب فوجوں کے بہادر افراد باری باری مقابلہ کیلئے نکلتے تھے اور پھر عام جنگ شروع ہوتی
تھی۔ کفار کی طرف سے عتبہ و لید اور شیبہ مقابلے کو نکلے جبکہ مسلمانوں کی طرف سے حضرت حمزہ
حضرت علی اور حضرت عبیدہ رضی اللہ عنہم مقابلہ میں آئے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے عتبہ کو مار گرایا
حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ولید کو تہ تیغ کر دیا ان کے برعکس شیبہ نے حضرت عبیدہ کو زخمی کر دیا تو
حضرت علی تلوار سونت کر آگے بڑھے اور ایک ہی ضرب کاری سے شیبہ کو فنا فی النار کر دیا۔ اس معرکہ
کے علاوہ آپ نے غزوہ احد، غزوہ خندق، بنو نضیر اور بنو قریظہ سے جنگ بنو سعد کی سرکوبی اور معرکہ
خیبر میں بھی ایمانی شجاعت کا مظاہرہ کیا۔

خیبر کا معرکہ بالخصوص سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی خداداد شجاعت کا مظہر ہے۔ جب کئی
روز تک لڑائی کے باوجود قلعہ خیبر فتح نہ ہوا تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ کل میں جھنڈا اس
کے ہاتھ میں دوں گا جس کے ہاتھ پر اللہ تعالیٰ خیبر کو فتح کرے گا۔

اگلے روز جملہ اصحاب رسول منتظر تھے کہ یہ جھنڈا کس خوش بخت کو عطا ہوتا ہے۔ حضور صلی
اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جملہ صحابہ کی طرف دیکھ کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں دریافت کیا
کہ وہ کہاں ہیں؟ صحابہ نے کہا کہ ان کی آنکھیں دکھتی ہیں وہ بیمار ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بلایا اور اپنا لعاب دہن ان کی آنکھوں پر لگا دیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ
فرماتے ہیں کہ لعاب دہن لگنے کی دیر تھی کہ درد جاتا رہا اور پھر کبھی آنکھوں کو تکلیف لاحق نہ ہوئی۔
پھر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو علم خاص عطا کرتے ہوئے فرمایا کہ پہلے
کفار کو اسلام کی دعوت دینا پھر ان سے جنگ کرنا۔

☆ اس جنگ میں خیبر کا سردار مرحب آپ کے مقابلے میں اُترا، اسے اپنی طاقت اور شہ زوری پر بہت گھمنڈ تھا اس نے اپنی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیئے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جواب میں کہا کہ میری ماں نے میرا نام حیدر رکھا ہے اور اس کے معنی شیر کے ہیں۔ یہ کہا اور ایک ہی وار میں مرحب کا خاتمہ کر دیا۔ جنگ کے دوران میں قلعہ خیبر کا دروازہ کہ جسے چالیس آدمی بھی مل کر نہ اٹھا سکتے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک ہی ضرب سے اسے جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا۔ امام رازی کے مطابق اس وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ قوت یزدانی کے مظہر بنے ہوئے تھے۔ اسی قوت یزدانی کے سامنے قلعہ خیبر کا دروازہ ایک تنکے کی حیثیت رکھتا تھا۔ سچ ہے کہ:

شیر مرداں شاہ یزداں قوت پروردگار
لافتی الا علی لا سیف الا ذوالفقار

باب مدینۃ العلم

حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طویل صحبت میسر آئی تھی۔ آپ نے محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سہارے شب و روز احکام مصطفوی کو بجالانا اپنا شعار زندگی بنا لیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ حضور رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم بھی آپ پر غیر معمولی شفقت و عنایت فرمایا کرتے تھے۔ اسی عنایت خاص کا کرشمہ تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ جہاں دلیری و شجاعت میں بے مثال تھے وہاں حکمت و دانائی میں بھی آپ کا کوئی ثانی نہ تھا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

الامدینۃ العلم و علی بابہا۔

میں علم کا شہر ہوں اور علی اس کا دروازہ ہے۔

اب ظاہر ہے کہ شہر جس قدر وسیع، عظیم اور بے مثال ہوگا، اس کے دروازے کی قدر و

منزلت بھی اتنی ہی زیادہ ہوگی۔

علامہ محمد اقبال کہتے ہیں:

ذات او دروازہ شہر علوم زیر فرمانش حجاز و چین و روم

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی دانائی و حکمت کا کمال یہ تھا کہ آپ بڑے بڑے مسائل چشم زدن

میں حل کر دیتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ سے محبت فرماتے تھے۔ ایک موقع پر آپ نے

فرمایا ”علی مجھ سے ہے اور میں علی سے ہوں۔“

حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حجۃ الوداع سے واپسی پر جب حضور

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غدیر خم کے مقام پر پہنچے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ہاتھ اٹھا کر صحابہ سے

Click For More Books

<https://archive.org/details/@zohaibhasanattari>

مخاطب ہو کر فرمایا: کیا تمہیں نہیں معلوم کہ تمام مسلمان مجھے اپنی جانوں سے بھی زیادہ محبوب رکھتے ہیں۔ صحابہ نے عرض کیا کیوں نہیں؟ آپ نے پھر فرمایا کیا تمہیں نہیں معلوم کہ ہر مومن مجھے اپنے جان سے بھی زیادہ محبوب رکھتا ہے۔ صحابہ نے عرض کیا کیوں نہیں؟ پھر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا جس کا میں محبوب ہوں اس کے علی محبوب ہیں۔ اے اللہ! اس سے محبت کر جو علی سے محبت رکھے۔ اے اللہ! اس سے عداوت رکھ جو علی سے عداوت رکھے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ہمیشہ بڑے سے بڑے اعزاز کا مستحق سمجھا، جب آپ ہجرت کی غرض سے مکہ کو روانہ ہوئے تو تمام امانتیں آپ کے سپرد کر گئے۔ دوسری بار آپ غزوہ تبوک کی خاطر تشریف لے گئے تو اہل مدینہ کی حفاظت کیلئے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو چھوڑ گئے۔ جب حضرت علی جہاد میں شرکت سے محرومی پر رنجیدہ ہوئے تو سلطانِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

”اے علی کیا تم اس بات پر خوش نہیں ہو کہ تم میرے لئے ایسے ہو جیسے موسیٰ کیلئے ہارون تھے لیکن میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔“

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حضرت علی کس قدر عزیز تھے اس کا اندازہ رد شمس کے واقع سے ہو جاتا ہے۔ ایک بار حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عصر کی نماز ادا فرمانے کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کی گود میں سر مبارک رکھ کر استراحت فرمانے لگے کہ معاً نزولِ وحی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ابھی تک عصر کی نماز نہیں پڑھی تھی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سورج کو غروب ہوتے دیکھتے رہے لیکن احترامِ نبوت کے پیش نظر ذرا بھی جنبش نہ کی جب وحی کا سلسلہ منقطع ہوا تو آقائے دو جہاں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خاطر زب کریم سے عرض گزار ہوئے کہ:

”اے اللہ! بے شک یہ تیری اور تیرے رسول کی اطاعت میں تھا، پس تو سورج کو اس کیلئے لوٹا دے۔ چنانچہ ڈوبا ہوا سورج دوبارہ طلوع ہو گیا۔“

بقول امام احمد رضا خاں رحمۃ اللہ علیہ:

تیری مرضی پا گیا سورج پھر اُلٹے قدم تیری انگلی اٹھ گئی مہ کا کلیجہ چر گیا
جملہ اصحاب رسول اس امر سے بخوبی آگاہ تھے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کس قدر عزیز ہیں اسی لئے وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تکریم و تعظیم کرتے

تھے۔ خلفائے راشدین حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق اعظم اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم اہم مسائل میں آپ کے مشورے اور رائے سے فیصلہ کرتے تھے۔ حضرت ابوسعید خدری روایت کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

”اے علی! تمہارے ساتھ محبت رکھنا ایمان ہے اور تمہارے ساتھ بغض رکھنا منافقت ہے۔ سب سے پہلے تمہارے محبت جنت میں داخل ہوں گے اور تمہارے ساتھ بغض رکھنے والے سب سے پہلے دوزخ میں داخل ہوں گے۔“

سیدہ فاطمہ الزہرا رضی اللہ عنہا کا نکاح

حضرت علی رضی اللہ عنہ جناب رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس قدر عزیز تھے کہ آپ نے انہیں دامادی کا شرف بھی عطا کر دیا۔ غزوہ بدر کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہا کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبوبہ صاحبزادی سے نکاح کیلئے درخواست کریں، جب حضرت علی مدعا کہہ چکے تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوچھا کہ تمہارے پاس مہر ادا کرنے کیلئے کچھ ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا ایک گھوڑے اور ایک زرہ کے سوا کچھ نہیں ہے۔ آپ نے فرمایا گھوڑے کو جہاد کیلئے رکھو اور زرہ کو فروخت کر دو۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ زرہ چار سو اسی درہم میں فروخت کی اور قیمت لا کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پیش کر دی۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بلال کو حکم دیا کہ بازار سے عطر اور خوشبو خرید لائیں۔ اس کے بعد خود نکاح پڑھایا اور خیر و برکت کی دُعا دی۔ نکاح کے تقریباً دس گیارہ ماہ بعد رخصتی ہوئی۔ رخصتی کے وقت خاتونِ جنت کو جو جہیز ملا وہ یہ تھا ایک پلنگ، ایک بستر، ایک چادر، دو چکیاں اور ایک مشکیزہ۔ خاتونِ جنت کو دیا جانے والا یہ جہیز رہتی دنیا تک امتِ اسلام کیلئے نمونہ عمل بنا رہے گا۔

دورِ خلافت

حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کا دورِ خلافت ہنگاموں اور شورشوں کی زد میں رہا۔ ان ہنگاموں کا سلسلہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت ہی سے شروع ہو گیا تھا۔ دارالخلافت اور پھر اسلامی سلطنت کے مختلف صوبوں میں شورشوں اور بغاوتوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کیلئے سب سے زیادہ تکلیف دہ یہ امر تھا کہ انہیں مجبوراً اپنوں کے خلاف صف آراء ہونا پڑا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی دردناک شہادت نے مفسدوں کو قوت بخش دی تھی اور اب وہ اسلامی سلطنت کی بنیادوں کو کھوکھلا کرنے کے درپے تھے۔ لیکن سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے ٹھان رکھی تھی کہ جب تک سینے میں سانسوں کی روانی ہے وہ اپنے مؤقف اور اسلامی سلطنت کی مرکزیت کو قائم رکھنے کے تصور سے دستبردار نہیں ہوں گے۔

یہ تاریخ اسلام کا کن قدر کٹھن دور تھا کہ سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو جنگ جمل میں ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے خلاف میدان جنگ میں اترنا پڑا اور حضرت طلحہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما جیسے بزرگ صحابہ شامی سپاہ کی تلواروں کا نشانہ بن گئے۔

جنگ صفین میں حضرت امیر معاویہ، حضرت عمرو بن العاص، حضرت مغیرہ بن شعبہ جیسے جلیل القدر صحابہ آپ کے خلاف صف آراء ہوئے۔ یہ جنگیں تھیں کہ مشیت ایزدی دونوں طرف اصحاب رسول اور تابعین کا خون بہہ رہا تھا۔ آج ہم میں سے کوئی بھی فیصلہ نہیں کر سکتا کہ ان جنگوں میں کون حق پر تھا اور کون باطل پر۔ کس کی جرات ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ میں سے کسی ایک کے حق میں حق و باطل کا فیصلہ سنا سکے۔ یہ تو تاریخ اسلام کا وہ المناک باب ہے کہ جس پر ایک نظر ڈالتے ہی قاری کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھریاں لگ جاتی ہیں۔ البتہ یہ بات برحق ہے کہ حضرت علی خلیفہ راشد تھے اور اپنے معاصر صحابہ اور تابعین میں سب سے افضل تھے، علم و حکمت، عدل و انصاف، سخاوت و عبادت میں کوئی آپ کا ہمسرنہ تھا۔ اگر اس وقت سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی خلافت مستحکم ہو جاتی، شورشیں اور بغاوتیں دب جاتیں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو سکون اور دلجمعی کے ساتھ حکومت کرنے کا موقع میسر آ جاتا تو امت اسلام آنے والے ادوار کے تنزل و ادبار سے کافی حد تک محفوظ ہو جاتی۔

القاب

آپ کے القاب میں اسد اللہ الغالب، مرتضیٰ، حیدر کراز، امام الاولیاء، سید العرب، مطلوب کل طالب، خلیفۃ الرسول، امیر المسلمین، مولی المومنین وغیرہ خاص شہرت کے حامل ہیں۔ آپ کی کنیت ابو تراب ہے۔ یہ کنیت آپ کو بہت پسند تھی کیونکہ یہ آپ کو بارگاہ مصطفوی سے عطا ہوئی تھی۔ مسلم شریف میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی صاحبزادی سیدہ فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کے گھر تشریف لے گئے تو گھر میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو نہ پایا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے بارے میں دریافت فرمایا تو سیدہ فاطمہ نے عرض کیا کہ میرے اور ان کے درمیان کچھ باتیں ہوئیں

جس پر وہ ناراض ہو کر چلے گئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک شخص سے فرمایا کہ دیکھو علی کہاں ہیں؟ اس شخص نے عرض کیا کہ علی مسجد میں سوئے ہوئے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس تشریف لے گئے۔ وہ لیٹے ہوئے تھے اور چادر ان کے پہلو سے ہٹی ہوئی تھی اور ان کے بدن پر مٹی لگ گئی تھی۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام وہ مٹی صاف کر رہے تھے اور فرماتے جا رہے تھے:

قم ابا التراب۔ قم ابا التراب

اے ابوتراب اٹھو..... اے ابوتراب اٹھو

اسی طرح آپ کو کرم اللہ وجہہ بھی کہا جاتا ہے۔ علامہ محمد بن علی الصبان ابن سعد کے حوالے سے رقمطراز ہیں کہ حضرت حسن بن زید بن حسن رضی اللہ عنہم نے فرمایا کہ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے کبھی بھی بتوں کی پوجا نہیں کی اور اسی وجہ سے آپ کو کرم اللہ وجہہ کہا جاتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے چہرے کو عزت دے۔

شہادت

خارجیوں کا گروہ علی الاعلان حضرت علی کی مخالفت کر رہا تھا۔ یہ لوگ خود کو دین کا محافظ کہتے تھے۔ حالانکہ یہ دین کے بدترین دشمن تھے۔ خارجیوں کی سوچ یہ تھی کہ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اور حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کا خاتمہ کر دیا جائے تو اسلامی دنیا آئے دن کی شورشوں اور فسادات سے محفوظ ہو جائے گی۔ اس مقصد کی خاطر تین خارجی عبدالرحمن بن ملجم، برک بن عبد اللہ اور عمرو بن بکیر تمیمی مکہ معظمہ میں جمع ہوئے اور طے پایا کہ ابن ملجم حضرت علی کو برک حضرت امیر معاویہ کو اور ابن بکیر حضرت عمرو بن العاص کو شہید کرے گا۔ برک نے حضرت امیر معاویہ پر حملہ کیا، وازا اوچھا پڑھا اور وہ بچ گئے، حضرت عمرو بن العاص اس روز مسجد ہی نہ آئے، ان کے دھوکے کوئی اور شہید کر دیا گیا لیکن حضرت علی ابن ملجم کے حملے سے نہ بچ سکے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ فجر کی نماز کیلئے کوفہ کی جامع مسجد میں تشریف لائے۔ آپ راستے میں بلند آواز سے لوگوں کو نماز کی طرف بلا رہے تھے۔ مسجد میں داخل ہو کر نماز کی نیت باندھی اور نماز ادا کرنے لگے۔ ابن ملجم نے آپ کے سر پر زہر میں بچھی ہوئی تلوار سے ضرب لگائی جو آپ کے دماغ تک پہنچ گئی۔ آپ نے اکیس رمضان المبارک ۴۰ھ بروز جمعہ جام شہادت نوش کیا۔ اس وقت آپ کی عمر تریسٹھ برس کی تھی۔ حضرت امام حسن، امام حسین اور عبد اللہ بن جعفر رضی اللہ عنہم نے

آپ کو غسل دیا اور حضرت محمد بن حنفیہ پانی ڈالتے جاتے تھے۔ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے آپ کی نماز جنازہ پڑھائی۔

آپ کی وفات سے دُنیاے اسلام میں انتشار و افتراق کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔ عشاق رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیلئے آپ کی وفات ناقابل برداشت صدمے کے مترادف تھی۔ جناب حسن بن کثیر اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ جس روز سیدنا علی شیر خدا شہید ہوئے اس روز آپ گھر سے نماز فجر کیلئے باہر نکلے تو آپ کے آگے بطنخوں نے چلانا شروع کر دیا۔ لوگوں نے ان کو آپ کے پاس سے ہٹایا تو آپ نے فرمایا ”ان کو چھوڑ دو یہ تو نوحہ پڑھ رہی ہیں“ اور اس کے فوراً بعد ہی آپ کو ابن ملجم نے شہید کر دیا۔ (نور الابصار)

ازواج و اولاد

امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی کل نو ازواج تھیں۔ جنابہ سیدۃ النساء حضرت فاطمہ الزہرا (سلام اللہ علیہا) جنابہ ام البنین بنت خرام بن خالد جنابہ لیلیٰ بنت مسعود جنابہ اسماء بنت عمیس جنابہ امامہ بنت ابوالعاص جنابہ خولہ بنت جعفر جنابہ أم سعید بنت عروہ جنابہ ام حبیبہ بنت ربیعہ جنابہ مسامہ بنت امراء القیس۔

آپ کے اٹھارہ صاحبزادے اور اٹھارہ صاحبزادیاں تھیں۔

صاحبزادگان کے نام یہ ہیں

سیدنا امیر المومنین امام حسن رضی اللہ عنہ سیدنا امام حسین شہید کربلا رضی اللہ عنہ سیدنا عمر سیدنا عباس سیدنا جعفر سیدنا عبید اللہ سیدنا عثمان سیدنا عبد اللہ سیدنا ابوبکر سیدنا عون سیدنا یحییٰ سیدنا محمد سیدنا اوسط سیدنا محمد حنفیہ سیدنا محمد اکبر سیدنا عمر اطرف سیدنا محسن سیدنا عمران (رضی اللہ عنہم)

عظیم شخصیت

سیدنا علی المرتضیٰ بلاشبہ تاریخ اسلام کے عظیم محسن ہیں۔ آپ کی پوری زندگی عشق محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نمونہ ہے۔ آپ نے اس وقت اسلام قبول کیا جب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام چاروں طرف سے خطرات کی زد میں تھے۔ آپ نے ہر موقع حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جان نثار کرنے کی کوشش کی اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیغام کو عام کرنے کیلئے کبھی کبھی کسی قربانی سے

درلیغ نہ کیا۔ ہجرت کی رات حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بستر پر سونے سے لے کر غزوات میں شمولیت تک آپ نے ہر موقع پر بے جگری اور غیر معمولی شجاعت اور فداکاری کا مظاہرہ کیا۔ اسی بناء پر تاریخ کے صفحات میں شیر خدا کے نام سے جگہ پائی۔

ایک طرف آپ کی شجاعت ضرب المثل تھی تو دوسری طرف آپ کا فقر انتہاء کو پہنچا ہوا تھا۔ آپ کو سیدہ فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا سے شادی پر جو جہیز ملا تھا، عمر بھر اس میں اضافہ نہ کر سکے۔ امیر المؤمنین ہو کر بھی سادگی، فقر و غنا اور توکل کو اس حد تک اپنا شعار حیات بنائے رکھا کہ کوئی بھی انہیں دیکھ کر ان کے لباس سے تمیز نہیں کر سکتا تھا کہ یہ خلیفۃ المسلمین ہیں۔

مسلم اول شہ مرداں علیؑ..... عشق را سرمایہ ایماں علیؑ

اس قدر دلیری و شجاعت کے باوجود خدا نے آپ کو اپنے جذبات اور غصے پر قابو کی قوت بھی عطا کی تھی کیونکہ صحیح معنوں میں طاقتور وہی ہوتا ہے جو اپنے نفس کو پچھاڑ کر رکھے۔ ایک مرتبہ آپ کی ایک کافر سے جنگ ہوئی۔ دیر تک مقابلہ آرائی کے بعد آپ نے اس کافر کو زیر کر لیا اور تلوار کھینچ کر چاہا کہ اس کی گردن اڑا دوں۔ اسی لمحے کافر نے آپ کے چہرے پر تھوک دیا۔ ایک لحظہ کیلئے آپ کا چہرہ شدت غیظ سے متغیر ہوا مگر پھر فوراً کافر کے سینے سے اتر آئے اور مقابلے سے دستبردار ہو گئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے اس بے موقع معافی پر وہ کافر سخت حیران ہوا اور پوچھنے لگا کہ آپ نے مجھ پر قابو پا لیا اور پھر معاف بھی کر دیا۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جواب میں فرمایا کہ پہلے میں خدا کیلئے جنگ کر رہا تھا اور تمہیں قتل کرنا چاہتا تھا مگر تمہارے تھوکنے کے بعد اگر میں تمہیں قتل کر دیتا تو میری یہ جنگ خدا کیلئے نہیں بلکہ ذاتی انا اور انتقام کی لڑائی سمجھی جاتی میں اللہ کا بندہ ہوں، اس کیلئے تلوار چلاتا ہوں، میں اپنے نفس کا غلام نہیں ہوں۔

گفت من تیغ از پے حق سے زخم
بندہ ہم نہ مامور تم

بلاشبہ آپ شیر خدا تھے اور شیر خدا وہی ہوتا ہے جس کی زندگی اور موت خدا کیلئے ہو بلاشبہ سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے قبولیت اسلام سے شہادت تک ناموس مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عظیم فدائی کی حیثیت سے زندگی گزار کر ثابت کر دیا کہ آپ خدا اور محبوب خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے عطا کئے گئے تمام اعزازات کے مستحق تھے۔

میسر نہ شد ہر کسے اس سعادت
بکعبہ ولادت بمسجد شہادت

Click For More Books

<https://archive.org/details/@zohaibhasanattari>

خليفة راشد سيدنا امام حسن رضی اللہ عنہ

نور چشم مصطفیٰ ہاں سید والا حسن
وہ امیر المؤمنین وہ زینت ہر انجمن
سرور عالم کی رحمت نے نوازا تھا انہیں
اور علی نے بخش دی تھی تابش فکر و سخن
سیدہ عالمین ہاں فاطمہ بنت رسول ﷺ
ان کی شفقت سے حسن تھے ناز دیں فخر زمن
ان کی عظمت اور روحانی جلالت دیکھ کر
ان پہ ہوتے ہیں فدا اہل نظر کے جان و تن
حسن میں بے مثل، لاثانی، شہیدہ مصطفیٰ ﷺ
ان کی باتوں سے مہکتے وقت کے سر و سمن
اپنے نانا جان کے فرمان کو پورا کیا
جنگ روکی عام کر کے صلح و رحمت کا چلن
جان ایمان، روح جان و دل، امیر المؤمنین
ان کی یادوں سے مرے ایمان کا مہکا چمن

(محمد اکرم رضا)

پانچویں خلیفہ راشد

امیر المومنین سیدنا امام حسن رضی اللہ عنہ

سیدنا امام حسن بن علی رضی اللہ عنہما کا مقام بے پناہ بلند و بالا ہے۔ روحانیت، فکر و عمل اور علم و حکمت میں آپ خاص مقام رکھتے تھے۔ آپ شفقت و رحمت کا پیکر تھے، غفور و درگزر کی تصویر تھے، امت اسلام پر اللہ کا احسان تھے، آپ کے بارے میں درجنوں احادیث مروی ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو اپنی آنکھوں کا نور کہا کرتے تھے۔ آپ اور آپ کے چھوٹے بھائی سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ کے بارے میں ان کے نانا جان کے ارشادات مبارکہ جہاں تاریخ اہلبیت کا روشن باب تھے وہاں ان سے آپ کے مقامات قدسیہ کی سر بلندی کا بجا طور پر احساس ہوتا ہے۔

حضرت امام حسن نصف رمضان ۳ھ میں پیدا ہوئے۔ ان کی دایہ کا نام سووہ بنت مسرح الکندیہ ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ساتویں دن دو مینڈے عقیقہ کے ذبح کئے اور سر کے بالوں کے برابر چاندی کا صدقہ دیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ امام حسن کا نصف بالائی پیکر اور امام حسین کا نصف زیریں پیکر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مشابہ تر تھا۔ حضور نے خود امام حسن رضی اللہ عنہ کی ناف کاٹی تھی اور لعاب دہن ان کے منہ میں ڈالا تھا اور حسن نام بھی خود تجویز فرمایا تھا اور اپنے دست مبارک سے ان کے سر پر خوشبو لگائی تھی۔

آپ کا نام نامی حسن ہے اور کنیت ابو محمد ہے۔ آپ کس قدر خوش بخت ہستی تھے کہ ماں ملی تو سیدۃ النساء العالمین سیدہ فاطمہ بنت رسول جیسی کہ جو شرم و حیا کی پیکر اور غیرت ایمانی کی مظہر تھیں اور باپ وہ جسے علی المرتضیٰ شیر خدا کرم اللہ وجہہ کہتے ہیں جو شہر علوم کا دروازہ اور ہر اس مسلمان کا مولا ہے جس کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم مولا ہیں۔ بھائی عطا ہوا تو امام حسین شہید کربلا جیسا جس نے میدان کربلا میں اپنی اور تمام اصحاب اہلبیت کی راہ حق میں قربانی پیش کر کے اسلام کی حقانیت اور سر بلندی کی لاج رکھ لی۔

یوں تو آپ کے بہت سے القاب ہیں مگر مشہور لقب تقی ہے اور روحانی مقام و مرتبہ کے لحاظ

Click For More Books

<https://archive.org/details/@zohaibhasanattari>

سے آپ کا احسن ترین لقب سید ہے۔ جو بوسیلہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم آپ کا مقدر بنا۔
حضرت ابو بکرہ بن حارث رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ
وسلم کو منبر پر دیکھا کہ حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما آپ کے پہلو میں بیٹھے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ
وسلم کبھی لوگوں کی طرف توجہ فرماتے اور کبھی حسن کی طرف دیکھتے اور فرماتے تھے (ان ابنی ہذا سید
ولعل اللہ ان يصلح به بين فئتين من المسلمين) (بخاری شریف، جلد ۱، ص ۵۳۰، ترمذی جلد ۲،
ص ۲۱۸، مشکوٰۃ باب مناقب اہل بیت)

ترجمہ (کہ میرا یہ بیٹا سید ہے شاید اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ مسلمانوں کی دو جماعتوں میں صلح کرا
وے)

یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم دوران وعظ کبھی لوگوں کی طرف توجہ فرماتے اور کبھی امام عالی مقام
حسن علیہ السلام کی طرف محبت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔

اس حدیث پاک میں نبی مغیب دان صلی اللہ علیہ وسلم نے مستقبل میں پیش آنے والے اس
واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے جب آپ نے چند شرائط پر حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے صلح کر لی
تھی۔ آپ کی شان میں متعدد احادیث مروی ہیں۔ چند احادیث درج تحریر ہیں۔

☆ حضرت براء بن عازب رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے مخبر صادق صلی اللہ علیہ
وسلم کو دیکھا کہ آپ نے حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما کو اپنے شانے پر بٹھا رکھا ہے اور فرما رہے
ہیں: اللہم انی احبہ فاحبہ (صحیح مسلم، جلد ۲، ص ۲۸۲، بخاری شریف، جلد ۱، ص ۵۳۰)
اے اللہ میں اس سے محبت رکھتا ہوں تو بھی اس سے نسبت رکھ۔

☆ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ سرور عالم نور مجسم صلی اللہ علیہ وسلم نے
ارشاد فرمایا ”من احب الحسن و الحسین فقد احبنی و من ابغضہما فقد ابغضنی“
(سنن ابن ماجہ شریف، ص ۱۳)

”جس نے حسن و حسین (رضی اللہ عنہما) سے محبت کی اس نے مجھ سے محبت کی اور جس نے
ان دونوں سے بغض رکھا اس نے مجھ سے بغض رکھا۔“

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے
حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لئے فرمایا ”اللہم انی احبہ فاحبہ و احبب من یحبہ“
(مسلم شریف، جلد ۲، ص ۲۸۲)

”اے اللہ میں اس سے محبت رکھتا ہوں تو بھی اس سے محبت رکھ اور اس سے بھی محبت رکھ جو اس سے محبت کرے۔“

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما کو اپنے کندھے پر اٹھائے ہوئے تھے کہ ایک شخص نے کہا ”نعم المركب رکبت یا غلام“ (اے لڑکے تو کیسی اچھی سواری پر سوار ہے) اس کے جواب میں نبی الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”نعم الراكب“ (سوار بھی تو بہت اچھا ہے)

(جامع ترمذی شریف، جلد ۲، ص ۲۱۸)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ لم یکن احد منهم اشبه برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من الحسن بن علی (ترمذی شریف، جلد ۲، ص ۲۱۸)

کوئی بھی حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما سے زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم شکل نہ تھا۔

☆ حضرت ابو جحیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا: فكان الحسن بن علی یشبهہ (ترمذی شریف جلد ثانی، ص ۲۱۸)

کہ حضرت حسن بن علی آپ کے زیادہ مشابہ تھے۔

حضرت حافظ ابو نعیم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اپنی حدیث میں سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی ہے کہ جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں نماز پڑھا رہے ہوتے۔ آپ جب سجدہ میں ہوتے تو حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ تشریف لاتے جبکہ آپ کمن تھے تو کبھی آپ کی کمر پر بیٹھ جاتے، کبھی گردن پر سوار ہو جاتے اور حضور علیہ السلام ان کو آہستہ سے اٹھاتے (کہ کہیں گرنہ جائیں) جب نماز سے فارغ ہوئے تو صحابہ کرام نے عرض کیا ”یا رسول اللہ انا راینک تصنع بهذا الصبی شیئا مارا یناک تصنعه باحد“۔ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ نے اس بچے کا سا سلوک کسی سے نہیں کیا۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا: ان هذا ریحانتی وان هذا ابنی سید رعی اللہ ان یصلح بہ بین ففتین من المسلمین۔ ”یہ میری خوشبو ہے، یہ میرا بیٹا سید ہے اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی دو جماعتوں میں صلح کرائے گا۔“

ابن سعد نے حضرت عبداللہ بن عبدالرحمان بن زبیر سے جو روایت بیان کی ہے اس کا آخری

حصہ یوں ہے کہ میں نے حضرت حسن کو آتے دیکھا اور حضور علیہ الصلوٰۃ و تسلیمات سجدہ کی حالت میں تھے۔ حضرت حسن حضور کی گردن یا پشت پر سوار ہو گئے اور اپنی مرضی سے ہی اترے اور میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو رکوع کی حالت میں دیکھا: فیفرج لہ بین رجلیہ حتی ینخرج من الجانب الاخر۔

☆ ایک دفعہ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ غسل فرما کر اس حالت میں باہر تشریف لائے کہ آپ پر ایک خوبصورت اور قیمتی چادر تھی۔ کانوں کی لو تک بال مبارک اور چہرہ خوشنما تھا۔ راستے میں ایک محتاج یہودی سامنے سے آتا ہوا نظر آیا شکستہ چہرے کا لباس اور وہ غربت و ذلت پر سوار تھا اور دوپہر کے سورج نے اس کے ہونٹ خشک کر دیئے تھے۔ وہ پانی کا مٹکا کندھوں پر اٹھائے ہوئے تھا۔ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کو روک کر عرض کرنے لگا: اے ابن رسول اللہ میرا ایک سوال ہے اس کا جواب چاہیے۔ آپ نے فرمایا: کہو کیا سوال ہے۔ اس نے کہا: آپ کے نانا کا فرمان ہے الذنیا سجن المؤمن وجنة الکافر۔ (دنیا مومن کے لئے قید خانہ اور کافر کے لئے جنت ہے) آپ مومن ہیں اور میں کافر ہوں۔ میں دنیا کو آپ کے لئے جنت دیکھ رہا ہوں کہ آپ اس میں عیش و آرام سے زندگی بسر فرما رہے ہیں اور میں اسے اپنے لئے قید خانہ دیکھ رہا ہوں کہ اس کی تکالیف و عسرت نے مجھے ہلاک کر دیا ہے اور اس کی غربت و مسکنت مجھ کو مصائب و آلام میں مبتلا کر رکھا ہے۔ امام حسن مجتبیٰ رضی اللہ عنہ نے اس کی بات سن کر فرمایا: اے یہودی اگر تو وہ نعمتیں دیکھ لے جو اللہ نے میرے لئے جنت میں تیار کی ہوئی ہیں تو یقین کرے گا کہ میں ان نعمتوں کی نسبت اب قید خانے میں ہوں اور اگر تو وہ عذاب الیم دیکھ لے جو اللہ تعالیٰ نے تیرے لئے آخرت میں تیار کر رکھا ہے تو اس وقت تو دنیا میں اپنے آپ کو وسیع جنت میں دیکھے گا۔

آپ کی شان روایات مقدسہ اور احادیث عالیہ کی روح سے بہت اعلیٰ و بالا ہے۔ آپ کا نام نامی حسن (رضی اللہ عنہ) تھا اور آپ کا ہر انداز بے پناہ احسن اور خوبصورت تھا۔ کسی بدطینت کی بکواس برداشت کر لیتے کسی پر کبھی سختی نہ کی۔ سخی ایسے کہ فخر الاخیاء تھے ہاتھ ہمیشہ کھلا رکھا اور سوالی کے سوال کو کبھی رو نہ کیا۔ لہجہ مبارک انتہائی نرم اور دشتوں کے ساتھ آپ کا رویہ بھی شفقت آمیز تھا۔ بعض اوقات آپ مخالف کو سخت جواب دینے یا سزا دینے کی صلاحیت رکھتے تھے مگر ہمیشہ معاف کرنے میں مقدم جانا۔ اسی بناء پر آپ کے مخالفین اکثر نادم ہوتے اور آپ سے معافی طلب کرتے۔

☆ مروان نے آپ کی طرف اپنی بیجا۔ جو آپ کو گالیاں دیتا تھا وہ مدینہ کا عامل تھا اور ہر

جمعہ کو منبر رسول پر حضرت مولیٰ علی کو گالیاں دیتا تھا۔ حضرت حسن نے اس ایلچی سے کہا اس کو جا کر کہہ دے خدا کی قسم میں تجھ کو گالیاں دے کر کوئی بات مٹانا نہیں چاہتا جو تو نے کہی ہے اللہ کے ہاں تیرے اور میرے جمع ہونے کی ایک جگہ ہے۔

فان كنت صادقا فجزاك الله خيرا بصدقك، فان كنت كاذبا فالله اشد نقمة (اگر تو سچا ہے تو اللہ تعالیٰ تیرے سچ کی تجھے جزا دے گا اور اگر تو جھوٹا ہے تو اللہ تعالیٰ سخت انتقام لینے والا ہے۔ (صواعق محرقة ص ۱۳۹)

☆ سیدنا امام حسن علیہ السلام کی سخاوت کے تذکرے شاہوں کے محلات اور گداؤں کی جھونپڑیوں میں قیامت تک ہوتے رہیں گے۔ آپ اس سخی گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں، کائنات ارضی میں جس کی نظیر نہیں ملتی۔ ایک مرتبہ آپ سے پوچھا گیا: ہم دیکھتے ہیں کہ آپ کسی بھی سائل کو خالی ہاتھ واپس جانے نہیں دیتے اگرچہ آپ کے پاس کچھ ہو یا نہ ہو۔ آپ نے فرمایا: میں اللہ کی بارگاہ میں سوال کرتا ہوں مجھے شرم آتی ہے کہ میں خود سائل ہوں اور اگر کوئی سائل دامن پھیلائے تو اسے خالی ہاتھ واپس کروں۔ اللہ تعالیٰ نے میرے ساتھ عہد کیا کہ وہ مجھ پر اپنی رحمتوں کے دریا بہائے گا اور میں نے اس سے عہد کیا ہے کہ میں لوگوں پر نعمتوں کے دریا بہاؤں گا۔ مجھے ڈر ہے کہ اگر میں یہ عادت ختم کر دوں تو اللہ تعالیٰ مجھ سے اپنی عادت روک لے گا۔

حافظ ابن قیم کی کتاب ”الطریق الحکمیہ“ (مطبوع مصر ص ۵۶) میں رقم ہے کہ ایک شخص کو گرفتار کر کے حضرت مولا علی رضی اللہ عنہ کی بارگاہ میں پیش کیا گیا۔ گرفتاری ایک غیر آباد مقام سے ہوئی تھی۔ گرفتاری کے وقت اس کے ہاتھ میں ایک خون آلود چھری تھی۔ یہ کھڑا تھا اور ایک لاش خون میں لت پت تڑپ رہی تھی۔ اس شخص نے امیر المومنین کے سامنے اقبال جرم کر لیا۔ آپ کے حضور اقبال جرم کرنے والا ایک اور شخص بھی کھڑا تھا۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے ملزم اول سے دریافت فرمایا کہ تو نے کیوں اقبال جرم کیا؟ اس نے عرض کیا کہ جن حالات میں میری گرفتاری عمل میں آئی میں نے سمجھا کہ ان حالات کی موجودگی میں میرا انکار فائدہ مند نہ ہوگا۔ اس سے پوچھا گیا کہ اس واقعہ کی تفصیل بیان کر۔ اس نے عرض کیا کہ میں قصاب ہوں، میں نے جائے وقوعہ کے قریب بکرے کو ذبح کیا۔ اسی عمل میں مصروف تھا کہ مجھے پیشاب کی حاجت ہوئی۔ ابھی پیشاب سے فارغ ہی ہوا تھا کہ میری نظر اس لاش پر پڑ گئی۔ میں اس لاش کے قریب کھڑا تھا کہ لوگوں نے مجھے قاتل سمجھ کر پکڑ لیا، مجھے اس امر کا یقین ہو گیا کہ ان تمام لوگوں کے بیانات کے سامنے میرے

انکاری بیان کا کچھ اعتبار نہ کیا جائے گا اس لئے میں نے اقبال جرم کر لیا۔ پھر دوسرے اقبالی مجرم سے دریافت فرمایا۔ اس نے عرض کیا میں ایک اعرابی ہوں، مفلس و نادار ہوں، مقتول کو میں نے مال کے لالچ کی بناء پر قتل کیا تھا کہ اتنے میں مجھے کسی کے آنے کی آہٹ محسوس ہوئی اور میں ایک گوشے میں جا چھپا، اتنے میں لوگوں نے اس قصاب کو گرفتار کر لیا۔ میرے دل نے مجھے اقبال جرم کرنے پر آمادہ کیا کہ میری وجہ سے یہ بے گناہ مارا جائے۔ حضرت مولا علی رضی اللہ عنہ نے اپنے فرزند ارجمند سے پوچھا کہ تمہاری اس مقدمہ میں کیا رائے ہے، حضرت حسن مجتبیٰ رضی اللہ عنہ نے کہا: امیر المؤمنین! اگر اس شخص نے ایک آدمی کو ہلاک کیا ہے تو ایک کی جان بھی بچائی ہے اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

ومن احياها فکانما احيا الناس جميعا (پ ۶، سورہ مائدہ، آیت ۳۲)

ترجمہ: (جس نے ایک شخص کی جان کو بچایا گویا اس نے سب لوگوں کی جان کو بچالیا)

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جناب حسن رضی اللہ عنہ کا مشورہ پسند فرمایا اور آپ نے دوسرے اصل مجرم کو بھی چھوڑ دیا اور مقتول کا خون بہا بیت المال سے ادا کرنے کا حکم دیا۔

سیدنا امام حسن رضی اللہ عنہ اخلاق کے بلند ترین معیار پر فائز تھے۔ عفو و درگزر آپ کا انداز خاص تھا، اپنی جان پر بن جاتی مگر پھر بھی اپنے دشمن کو معاف فرمایا۔ اللہ اللہ یہ انتہائی حوصلے اور عنایت کی انتہاء ہے۔ کہنا آسان ہے اور کرنا مشکل۔ آپ نے جب بھی جو کہا وہ کر کے دکھلا دیا۔

علامہ ابن حجر نے بزار کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ جب آپ خلیفہ مقرر ہوئے تو ایک آدمی نے نماز کی حالت میں آپ پر حملہ کر دیا اور سجدے میں آپ پر خنجر کا وار کیا تو آپ نے خطبہ میں ارشاد فرمایا اے اہل عراق اتقوا اللہ فینا فاننا امراء کم و ضیفانکم۔ ”ہمارے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرو کہ ہم آپ کے امیر اور مہمان بھی ہیں“

ونحن اهل البيت الذين قال الله فيهم

اور ہم وہ اہل بیت ہیں جن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

انما يريد الله ليذهب عنكم الرجس اهل بيت

و يطهرکم تطهیرا (پارہ ۲۲ سورہ احزاب، آیت ۳۳)

اللہ تو یہی چاہتا ہے اے نبی کے گھر والو کہ تم سے ہر ناپاکی دور فرما دے اور تمہیں پاک کر کے خوب ستھرا کر دے۔

آپ اس آیت کو بار بار پڑھتے رہے یہاں تک کہ تمام اہل مسجد رو پڑے۔

(صواعق محرقہ، ص ۱۳۹)

نصاری سے مباہلہ اور آپ کی شرکت

مباہلہ نجران کے عیسائیوں سے ہوا تھا۔ نجران کے عیسائیوں کے ساتھ پڑھے لکھے افراد پر مشتمل وفد مدینہ آیا تاکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے مذاکرات کر سکے۔ یہ ۹ھ کا واقعہ ہے۔ ان میں سے چوبیس آدمی اشراف مین سے تھے جن میں سے تین آدمیوں کو اہل نجران کی سربراہی اور سرکردگی حاصل تھی۔ ایک عاقب جس کے ذمہ امارت و حکمت کا کام تھا اور اس کا نام عبدالمسیح تھا۔ دوسرا اُسید جو ثقافتی امور کا نگران تھا اور اس کا نام ابہم یا شرجبل تھا۔ تیسرا اسقف (لاٹ پادری) جو دینی و روحانی شعبے کا سربراہ تھا۔ اس کا نام ابو حارثہ بن علقمہ تھا۔

وفد نے مدینہ پہنچ کر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کی۔ پھر آپ نے ان سے کچھ سوالات کئے اور انہوں نے آپ سے کچھ سوالات کئے۔ اس کے بعد آپ نے انہیں اسلام کی دعوت دی اور قرآن حکیم کی آیتیں پڑھ کر سنائیں لیکن انہوں نے اسلام قبول نہ کیا اور دریافت کیا کہ آپ مسیح علیہ السلام کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟ اس کے جواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس روز دن بھر توقف کیا یہاں تک کہ آپ پر یہ آیات نازل ہوئیں:

”ان مثل عیسیٰ عند اللہ کمثل ادم خاقمہ من تراب ثم قال له کن فیکون۔ الحق من ربک فلا تکن من الممترین۔ فمن حاجک فیہ من بعد ماجاءک من العلم فقل تعالو اندع ابناءنا و ابناءکم و نساءکم و انفسنا و انفسکم ثم نبتھل فنجعل لعنت اللہ علی الکذبین“ (۶۱:۶۰، ۵۹:۳)

بیشک عیسیٰ علیہ السلام کی مثال اللہ کے نزدیک آدم (علیہ السلام) جیسی ہے اسے مٹی سے پیدا کیا پھر اس سے کہا ہو جا تو وہ ہو گیا۔ حق تیرے رب کی طرف سے ہے پس شک کرنے والوں میں سے نہ ہو۔ پھر تمہارے پاس علم آ جانے کے بعد جو کوئی تم سے اس (عیسیٰ علیہ السلام) کے بارے میں حجت کرے تو اس سے کہہ دو کہ آؤ ہم بلائیں اپنے اپنے بیٹوں کو اور اپنی اپنی عورتوں کو اور خود اپنے آپ کو پھر مباہلہ کریں پس اللہ کی لعنت ٹھہرائیں جھوٹوں پر۔

صبح ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان ہی آیات کریمہ کی روشنی میں انہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق اپنے قول سے آگاہ کیا اور اس کے بعد دن بھر انہیں غور و فکر کے لئے آزاد چھوڑ دیا لیکن انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں آپ کی بات ماننے سے انکار

Click For More Books

<https://archive.org/details/@zohaibhasanattari>

کر دیا پھر جب اگلی صبح ہوئی درآنحالیکہ وفد کے ارکان حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں آپ کی بات تسلیم کرنے اور اسلام لانے سے انکار کر چکے تھے۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں مباہلے کی دعوت دی اور آپ حسن و حسین رضی اللہ عنہما سمیت ایک چادر میں لپیٹے ہوئے تشریف لائے۔ پیچھے پیچھے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا چل رہی تھیں ان کے پیچھے علی المرتضیٰ تھے۔ جب وفد نے دیکھا کہ آپ واقعی بالکل تیار ہیں تو تنہائی میں جا کر مشورہ کیا۔ عاقب اور اُسید دونوں نے ایک دوسرے سے کہا دیکھو مباہلہ نہ کرنا خدا کی قسم اگر یہ نبی ہے اور ہم نے اس سے ملاعت کر لی تو ہم اور ہمارے پیچھے ہماری اولاد ہرگز کامیاب نہ ہوگی۔ روئے زمین پر ہمارا ایک بال اور ناخن بھی تباہی سے نہ بچ سکے گا۔“ آخر ان کی رائے یہ ٹھہری کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو اپنے بارے میں حکم بنایا جا۔۔۔ چنانچہ انہوں نے آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ آپ کا جو مطالبہ ہو ہم اسے ماننے کو تیار ہیں۔ اس پیش کش پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے جزیہ لینا منظور کیا اور دو ہزار جوڑے کپڑوں پر مصالحت فرمائی۔ ایک ہزار ماہ رجب میں اور ایک ہزار ماہ صفر میں اور طے کیا کہ ہر جوڑے کے ساتھ ایک اوقیہ (ایک سو باون گرام چاندی) بھی ادا کرنی ہوگی۔ اس کے عوض آپ نے انہیں اللہ اور اس کے رسول کا ذمہ عطا فرمایا اور دین کے بارے میں مکمل آزادی مرحمت فرمائی۔ اس سلسلہ میں آپ نے انہیں ایک باقاعدہ نوشتہ لکھ دیا۔ ان لوگوں نے آپ سے گزارش کی کہ آپ ان کے ہاں ایک امین آدمی روانہ فرمائیں۔ اس پر آپ نے صلح کا مال وصول کرنے کے لئے اس امت کے امین (امانت دار) حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کو روانہ فرمایا۔

اس کے بعد ان کے اندر اسلام پھیلنا شروع ہوا۔ اہل سیر کا بیان ہے کہ اُسید اور عاقب نجران پہنچنے کے بعد مسلمان ہو گئے۔ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے صدقات اور جزیے لانے کے لئے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو روانہ فرمایا اور ظاہر ہے کہ صدقہ مسلمانوں ہی سے لیا جاتا ہے۔

اس واقعہ سے ہمارا یہ عرض کرنا مقصود ہے کہ سیدنا امام حسن رضی اللہ عنہ کا ظاہری اور باطنی مقام بہت سربلند ہے۔ آپ کے حاسدین اور دشمن کل بھی ایڑی چوٹی کا زور لگا کر آپ کے مقام و مرتبہ کو کم کرنے کی کوشش کر رہے تھے اور آج بھی سے نام نہاد مسلمان تاریخ کے بل بوتے پر اپنی طرف سے روایات وضع کر کے آپ کی عظمت کے تاثر کو زائل کرنا چاہتے ہیں۔ ایسے بھی ستم شعار ہیں جو دشمنی میں اس حد تک آگے چلے گئے ہیں کہ آپ کو خلیفہ راشد ہی تسلیم نہیں کرتے۔ بعض ان روایات سے بہانے بہانے سے انکار کر دیتے ہیں جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے آپ کی اور سیدنا

امام حسین رضی اللہ عنہ کی شان میں ارشاد فرمائیں۔ دراصل ان کو آپ سے خصوصی دشمنی یہ ہے کہ آپ نے حضرت امیر معاویہ سے مفاہمت کیوں کی حالانکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام مدتوں پہلے اس جانب اشارہ کر چکے تھے۔ مخبر صادق صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ تو عین تقدیر الہی ہوتے ہیں۔

شب کو کہا دن تو سورج نکل آیا

دن کو کہا شب تو رات ہو کے رہی

تیرے منہ سے جو نکلی وہ بات ہو کے رہی

علامہ ابن حجر نے امام ابو نعیم کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مجھے اپنے رب سے اس حال میں ملتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے کہ میں اس کے گھر کی طرف پیدل نہ چلا ہوں۔ فمشی عشرين حجة "چنانچہ آپ نے بیس حج پیدل کئے"

☆ امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے بیان کیا ہے کہ حضرت حسن نے پچیس حج پیدل کئے ہیں۔ و ان النجائب لتقاد بین یدیہ "اور اونٹنیاں آپ کے سامنے سے کھینچ کر لائی جاتیں" (صواعق محرقة، ص ۱۳۹)

☆ شواہد النبوت صفحہ 302 میں آپ کی ایک کرامت درج ہے۔ اس میں اور صحابہ بھی آپ کے ساتھ شریک سفر ہیں۔ بتایا گیا ہے کہ کس طرح آپ کی دعا سے خشک کھجوریں تروتازہ ہو گئیں، ملاحظہ ہو

ایک دن آپ رضی اللہ عنہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے کسی صاحبزادے کے ساتھ کہیں سفر کر رہے تھے کہ ایک خشک باغ میں ڈیرہ ڈال دیا۔ حضرت حسن کے لئے باغ کے ایک دامن میں اور حضرت ابن زبیر کے لئے باغ کے دوسرے دامن میں فرش بچھایا گیا۔ حضرت ابن زبیر بولے کاش کہ اس نخلستان میں تازہ کھجوریں ہوتیں جنہیں ہم کھاتے۔ حضرت امام حسن نے فرمایا: کیا تازہ کھجوریں چاہتے ہو۔ حضرت ابن زبیر بولے ہاں۔ آپ نے دست دعا اٹھایا اور زبیر لب کچھ پڑھا جو کسی کو معلوم نہ ہوا فوراً کھجور کا ایک درخت تروتازہ اور بار آور ہو گیا، اس میں تازہ کھجوریں لگ گئیں۔ ان کا ساتھی شتر بان بولا: بخدا یہ تو جادو ہے۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ جادو نہیں یہ اس دعائے مستجاب کا اثر ہے جو پیغمبر علیہ السلام کے بیٹے نے مانگی تھی۔ اس کے بعد لوگوں نے اس کھجوروں کے درخت پر خرما پر چڑھ کر تمام کھجوریں توڑ لیں جن سے تمام سیر ہو گئے۔

شواہد النبوت (حضرت عبدالرحمان جامی) ہی سے آپ کی ایک اور کرامت کا مطالعہ کیجئے

حضرت سیدنا امام حسن رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ پیدل چلتے ہوئے بغرض حج مکہ معظمہ تشریف لے جا رہے تھے تو آپ سے کسی غلام نے عرض کی 'کاش کہ آپ کسی سواری پر سوار ہو جائیں تاکہ ورم کم ہو جائے۔ آپ نے اس کی درخواست قبول نہ کی اور فرمایا: جب تم گھر پہنچو گے تو تمہیں ایک حبشی ملے گا جس کے پاس کچھ تیل ہوگا، تم اس سے خرید لینا اور جھگڑا مت کرنا۔ آپ کے غلام نے کہا میرے ماں باپ آپ پر قربان۔ ہم نے کسی جگہ بھی کوئی ایسا شخص نہیں دیکھا جس کے پاس ایسی دوا ہو اس جگہ کہاں دستیاب ہوگی۔ جب وہ اپنی منزل پر پہنچے تو وہ حبشی دکھائی دیا۔ انہوں نے کہا: یہ ہے وہ حبشی جس کے متعلق میں نے بتایا تھا، جاؤ اور اس سے تیل خرید لاؤ اور قیمت ادا کر آؤ۔ جونہی وہ غلام اس حبشی کے پاس گیا اور تیل طلب کیا تو اس نے کہا: اے غلام یہ تیل کس کے لئے خرید رہے ہو؟۔ غلام بولا: حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کے لئے۔ اس نے کہا: مجھے ان کے پاس لے چلو، میں ان کا غلام ہوں۔ جب وہ حبشی آپ کے پاس پہنچا تو کہنے لگا میں آپ کا غلام ہوں۔ تیل کی قیمت نہیں لوں گا۔ بس آپ میری بیوی کے لئے جو دردزہ میں مبتلا ہے دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ اسے ایک صحیح الاعضاء بچہ عطا کرے آپ نے فرمایا: اپنے گھر لوٹ جاؤ۔ اللہ تعالیٰ تمہیں ایسا ہی بیٹا عطا کرے گا جیسا تم چاہتے ہو وہ ہمارا پیروکار ہوگا۔ حبشی گھر گیا تو گھر کی حالت ویسے ہی پائی جیسے سی تھی۔

امام حسن رضی اللہ عنہ کی خلافت اور دست برداری:

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا دور خلافت نہایت پریشانیوں اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے جنگ و جدل میں گزرا۔ اس کے ساتھ ساتھ خارجی آپ کی پریشانیوں میں اضافہ کرتے رہے۔ بالآخر آپ نے خارجیوں کو کچل کر رکھ دیا اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے فیصلہ کن جنگ کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔ مگر آپ کو مہلت ہی نہ مل سکی اور آپ مسجد میں ہی شہید کر دیئے گئے۔

سیدنا علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کی شہادت ایک بہت بڑا سانحہ تھی۔ اب ضرورت اس امر کی تھی کہ خلافت اسلامیہ کے خلا کو پر کیا جاتا۔ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ خلافت قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر کو باغیوں نے زحف میں لے لیا تو جہاں چند مقتدر صحابہ نے اپنے بیٹے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی حفاظت کے لئے بھیج دیئے وہاں سیدنا علی المرتضیٰ نے بھی اپنے صاحبزادوں حضرت امام حسن اور امام حسین رضی اللہ عنہما کو سختی سے تاکید کی کہ وہ کسی باغی کو حضرت عثمان (رضی اللہ عنہ) کے گھر میں داخل نہ ہونے دیں۔ باغیوں کو خدشہ دامنگیر ہو گیا کہ اگر ہم نے اسیدھے راستے سے حملہ کیا تو حضرت امام حسن و امام حسین رضی اللہ عنہما اور

دوسرے صحابہ کے بیٹوں سے لڑائی چھڑ جائے گی۔ اور اگر ان بنو ہاشم کے شہزادوں کو کچھ ہو گیا تو بنو ہاشم اور دوسرے قبائل ہمیں نہیں چھوڑیں گے۔ اس لئے وہ عقبی دروازے سے داخل ہوئے اور امیر المؤمنین سیدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو پتہ چلا تو انہوں نے اپنے بیٹوں سے بہت سخت باز پرس کی کہ تمہاری موجودگی میں ایسا کیوں ہو گیا جب مورتحال واضح ہو گئی تو پھر خاموش ہو گئے۔

اب حضرت علی کرم اللہ وجہہ بھی شہید ہو چکے تھے اور مسند خلافت خالی تھی۔ خاندان رسول کے شہزادے سیدنا امام حسن رضی اللہ عنہ بڑی قدر و منزلت سے دیکھے جاتے تھے۔ آپ کا زہد و تقویٰ عالی نسب اور رفعت کردار و عمل کو عقیدت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا اور چالیس ہزار سے زائد مسلمانوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کر لی تھی۔ یہ سلسلہ بیعت بڑھتا جا رہا تھا اور ایک مورخ کے مطابق آپ کے ہاتھ پر بیعت کرنے والوں کا جوش و جذبہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی سپاہ سے بھی زیادہ تھا۔ حضرت امام حسن اب بالاتفاق رائے خلیفۃ المسلمین منتخب ہو چکے تھے۔ آپ فقط عابد و زاہد ہی نہیں تھے بلکہ نہایت شجاع اور بہادر تھے۔ سیدنا علی المرتضیٰ کے دور خلافت میں تمام لڑائیوں میں مجاہدانہ جوش و خروش کا مظاہرہ کر چکے تھے۔ حضرت علی کی شہادت کے بعد اس علاقے کے سوا جس پر حضرت امیر معاویہ کا قبضہ تھا باقی سارے ملک کی نظریں امام حسن پر لگی ہوئی تھیں۔ مسند خلافت پر متمکن ہو کر آپ نے سب سے پہلا خطبہ جو ارشاد فرمایا وہ یہ تھا

”لوگو! کل تم سے ایک ایسا شخص جدا ہوا ہے کہ نہ اگلے اس سے بڑھ سکے نہ پچھلے اس کو پاسکیں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غزوات میں اسے اپنا علم عطا فرما کر بھیجا کرتے تھے وہ کسی جنگ میں کبھی ناکام نہ لوٹا، حضرت میکائیل و جبرائیل دائیں بائیں اس کے جلو میں ہوتے تھے۔ اس نے سات درہم کے علاوہ جو اس کی تنخواہ سے بچ رہے تھے سونے چاندی کا ایک ذرہ بھی نہیں چھوڑا۔ یہ درہم بھی ایک غلام خریدنے کے لئے جمع کئے تھے۔“

حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ میں قدیم اختلاف چلا آ رہا تھا۔ حضرت امیر معاویہ حضرت علی کی حیات ہی میں عالم اسلامی پر حکومت کرنے کے خواب دیکھ رہے تھے۔ جناب علی رضی اللہ عنہ کی زندگی میں ان کا یہ خواب پورا نہ ہو سکا لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت امیر معاویہ نے فوراً فوجی پیش قدمی شروع کر دی اور عبداللہ بن عامر کو مقدمۃ الجیش کے طور پر آگے بھیجا۔ حضرت امام حسن اس وقت کوفہ میں تھے۔ آپ کو عبداللہ بن عامر کی پیش قدمی

کی اطلاع ملی تو آپ بھی مقابلہ کے لئے کوفہ سے مدائن کی طرف بڑھے۔ سابطا پہنچ کر اپنی فوج میں کمزوری اور جنگ سے پہلو تہی کے آثار دیکھے اس لئے اسی مقام پر رک کر یہ تقریر فرمائی

”میں کسی مسلمان کے لئے اپنے دل میں کینہ نہیں رکھتا اور تمہارے لئے بھی وہی پسند کرتا ہوں جو اپنے لئے پسند کرتا ہوں۔ تمہارے سامنے ایک رائے پیش کرتا ہوں، امید ہے کہ اسے مسترد نہیں کرو گے، جس اتحاد و یکجہتی کو تم پسند کرتے ہو وہ اس تفرقہ و اختلاف سے کہیں افضل و بہتر ہے جسے تم چاہتے ہو۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تم میں سے اکثر اشخاص جنگ سے پہلو تہی کر رہے ہیں اور لڑنے سے بزدلی دکھا رہے ہیں، تم لوگوں کو تمہاری مرضی کے خلاف مجبور نہیں کرنا چاہتا۔“

یہ تقریر سن کر خارجی عقائد کے لوگ جو آپ رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے لڑنا فرض عین سمجھتے تھے انہوں نے حضرت علی کی طرح حضرت حسن کو بھی برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ حضرت حسن نے یہ برہمی دیکھی تو گھوڑے پر سوار ہو گئے اور ربیعہ و ہمدان کو آواز دی۔ انہوں نے بڑھ کر خارجیوں کے زحف سے چھڑایا۔ آپ رضی اللہ عنہ سیدھے مدائن کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستے میں جراح بن قبیصہ خارجی حملے کی تاک میں چھپا بیٹھا تھا۔ آپ جیسے ہی اس کے قریب سے گزرے اس نے حملہ کر کے زانوئے مبارک زخمی کر دیا۔ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ مدائن پہنچ کر قصر ابیض میں قیام پذیر ہو گئے اور زخم بھرنے تک یہاں ٹھہرے رہے۔ صحت یاب ہونے کے بعد عبداللہ بن عامر کے مقابلے کے لئے تیار ہوئے۔

سید قاسم محمود ”اسلامی انسائیکلو پیڈیا“ ص ۷۸۸ میں آپ کی صحت یابی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

آپ کے مدائن چلے آنے کے بعد عبداللہ بن عامر کو موقع مل گیا، اس نے بڑھ کر مدائن کو گھیر لیا۔ آپ اپنی فوج کی بددلی دیکھتے ہوئے پہلے ہی لڑائی کا ارادہ ترک کر چکے تھے۔ چنانچہ آپ نے چند شرائط پر حضرت امیر معاویہ کے حق میں خلافت سے دستبردار ہونے کا فیصلہ کر لیا۔

حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ اور حضرت امیر معاویہ کی مصالحت کے بعد حضرت عمرو بن العاص نے جو حضرت امیر معاویہ کے ہمراہ تھا ان سے کہا کہ مناسب یہ ہے کہ مجمع عام میں حضرت حسن سے دستبرداری کا اعلان کراؤ تاکہ لوگ خود ان کی زبان سے اس صلح نامے کو سن لیں۔ چنانچہ حضرت امیر معاویہ کی فرمائش پر مجمع عام میں آپ رضی اللہ عنہ نے حسب ذیل تقریر فرمائی۔

لوگو! خدا نے ہمارے اگلوں سے ہماری ہدایت اور پچھلوں سے تمہاری خونریزی کرائی۔

دانائیوں میں بہترین دانائی تقویٰ اور کمزوریوں میں سب سے بڑی کمزوری بد اعمالیاں ہیں۔ یہ امر (خلافت) جو ہمارے اور امیر معاویہ کے درمیان متنازعہ فیہ ہے وہ اس کے حقدار ہیں یا نہیں۔ دونوں صورتوں میں امت محمدی کی اصلاح اور تم لوگوں کی خونریزی سے بچنے کے لئے میں اس سے دستبردار ہوتا ہوں۔“

پھر حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا ”یہ خلافت تمہارے لئے فتنہ اور چند روزہ سرمایہ ہے۔“

شرائط صلح

شرائط صلح کی تفصیلات کے بارے میں مؤرخین مختلف آراء رکھتے ہیں تاہم اکثر کے بیان کے مطابق شرائط حسب ذیل تھیں۔

- ۱۔ کسی عراقی کو محض دیرینہ عداوت کی بنا پر نہ پکڑا جائے اور بلا امتیاز سب کو امان دی جائے۔
- ۲۔ داراب جبر وکل کا خراج حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو دیا جائے اور ان کے بھائی حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو بیس ہزار سالانہ دیئے جائیں۔
- ۳۔ وظائف میں بنو ہاشم کو سب پر فوقیت دی جائے۔

حضرت امیر معاویہ نے بغیر کسی ترمیم کے تمام شرائط کو قبول کر لیا اور اقرار نامہ لکھ کر اور اس پر مہر ثبت کر کے نیز اکابر شام کی شہادتیں لکھ کر عبداللہ بن عامر کے ذریعہ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کے پاس بھجوادیا۔ آپ نے اپنے خطاب کے بعد جس کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ حضرت امیر معاویہ کی طرف اشارہ کر کے جب یہ کہا کہ ”یہ خلافت تمہارے لئے چند روزہ سرمایہ ہے“ یہ سن کر حضرت امیر معاویہ بولے بس کیجئے۔

حضرت امام حسن اور حضرت امیر معاویہ کی مصالحت کے نتائج امت مسلمہ کے لئے بہت مفید ثابت ہوئے۔ مسلمانوں کی خونریزی کا وہ سلسلہ جو مدتوں سے جاری تھا بند ہو گیا۔ ملک میں امن و سکون بحال ہوا اور جو قوت خانہ جنگی میں پارہ پارہ ہو رہی تھی۔ بار دیگر دشمنوں کے مقابلے میں صرف ہونے لگی۔ فتوحات کا سلسلہ از سر نو شروع ہو گیا۔ داخلی طور پر ملک میں ترقی اور اصلاح کے سلسلہ کا ایک بار پھر آغاز ہو گیا۔

حضرت امام حسن نے فرمایا: میں نے جو کچھ کیا مومنین کی ذلت کے لئے نہیں بلکہ اس لئے کیا کہ حکمرانی کے لئے مومنوں کو قتل کرانا میں پسند نہیں کرتا۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ العار خیز

من النار۔ کہ عارنار سے بہتر ہے۔

اس خاتم الفتن دستبرداری کے بعد حضرت حسن رضی اللہ عنہ اپنے اہل و عیال کو لے کر مدینہ الرسول تشریف لے گئے۔ اس طرح حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی ماہتاب روشن کی طرح پوری ہو گئی کہ میرا یہ بیٹا سید ہے خدا اس کے ذریعہ مسلمانوں کے دو بڑے گروہوں میں صلح کرا دے گا۔ آپ کی مدت خلافت میں اختلاف ہے۔ بعض کے نزدیک پانچ مہینہ ہے اور بعض کے نزدیک چھ ماہ سے کچھ زیادہ۔ بعض نے اسے سات ماہ سے کچھ زیادہ بتایا ہے۔

دستبرداری کے بعد حضرت حسن رضی اللہ عنہ آخری لمحات تک مدینے میں خاموشی اور سکون کی زندگی بسر کرتے رہے۔

آپ دنیاوی خلافت سے تو دستبردار ہو گئے مگر خدائے کریم نے آپ کو باطنی خلافت عطا فرمادی۔

سیدنا امام حسن رضی اللہ عنہ خلافت سے دستبردار صرف اللہ تعالیٰ کی رضا مندی کے لئے ہوئے تھے تو اللہ نے اس کے عوض آپ کو اور آپ کے اہل بیت کو باطنی خلافت سے سرفراز فرمایا۔ حتیٰ کے علماء کہتے ہیں کہ ہر زمانہ میں تمام اولیاء اللہ کا قطب صرف اہلبیت سے ہی ہوتا ہے۔

امام عالی مقام کی دنیا سے رخصتی

جب سیدنا امام حسن بن علی رضی اللہ عنہما مسند خلافت سے سبکدوش ہو کر مدینہ تشریف لائے تو وہاں آپ نے ہر قسم کی سیاست سے دور ہو کر دس سال گزارے۔ آپ نے کبھی سیاسی حالات پر تبصرہ نہ کیا کیونکہ آپ ہر قسم کی سیاسی کشمکش سے بے نیاز ہو چکے تھے۔ اس کے بعد آپ کو زہر دیا گیا جس کے سبب آپ کی شہادت واقع ہوئی مورخین کا اس میں اختلاف ہے کہ زہر کس نے دیا۔ بعض علماء نے آپ کی زوجہ جعدہ بنت اشعث بن قیس کنڈی کے بارے میں لکھا ہے کہ اس نے یزید لعین کے اکسانے پر زہر دیا اور بعض نے اس سے اختلاف کیا ہے جن میں حافظ ابن کثیر بھی ہیں۔ یہی رائے قاضی محمد سلیمان اور کئی دوسرے مورخین کی بھی ہے۔ جبکہ صدر الافاضل علامہ مولانا

سید نعیم الدین مراد آبادی نے زہر خورانی کی متذکرہ روایت پر ایک ناقدانہ تبصرہ تحریر فرمایا ہے جو یہاں نقل کیا جاتا ہے۔ آپ بیان فرماتے ہیں

مورخین نے زہر خورانی کی نسبت جعدہ بنت اشعث بن قیس کی طرف کی ہے اور اس کو حضرت امام کی زوجہ بتایا ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ یہ زہر خورانی باغوائے یزید ہوئی ہے اور یزید نے

اس سے نکاح کا وعدہ کیا تھا۔ اس طمع میں آ کر اس نے حضرت امام کو زہر دیا لیکن اس روایت کی کوئی سند صحیح دستیاب نہیں ہوئی اور بغیر کسی سند کے کسی مسلمان پر قتل کا الزام لگانا اور ایسے عظیم الشان قتل کا الزام کس طرح جائز ہو سکتا ہے۔ قطع نظر اس بات کے کہ روایت کے لئے کوئی سند نہیں ہے اور مورخین نے بغیر کسی معتبر ذریعہ یا معتمد حوالے کے لکھ دیا ہے۔

یہ خبر واقعات کے لحاظ سے بھی ناقابل اطمینان معلوم ہوتی ہے۔ واقعات کی تحقیق خود واقعات کے زمانہ میں جیسی ہو سکتی ہے مشکل ہے کہ بعد کو ویسی تحقیق ہو خاص کر جبکہ واقعہ اتنا اہم ہو مگر حیرت ہے کہ اہل بیت اطہار کے اس امام جلیل کا قتل۔ اس قاتل کی خبر غیر کو تو کیا ہوتی خود حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کو پتہ نہیں ہے کہ زہر کس نے دیا۔ یہی تاریخیں بتاتی ہیں کہ وہ اپنے برادر معظم سے زہر دہندہ کا نام دریافت فرماتے ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کسی کا نام لیتے انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ اب جعدہ کو قاتل ہونے کے لئے معین کرنے والا کون ہے۔ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کو یا امامین کے صاحبزادوں میں سے کسی صاحب کو اپنی آخر حیات تک جعدہ کی زہر خورانی کا کوئی ثبوت نہ پہنچا، نہ ان میں سے کسی نے اس پر شرعی مواخذہ کیا۔

ایک اور پہلو اس واقعہ کا خاص طور پر قابل لحاظ ہے وہ یہ کہ حضرت امام کی بیوی کو غیر کے ساتھ ساز باز کرنے کی شنیع تہمت کے ساتھ متہم کیا جاتا ہے یہ ایک بدترین تبرا ہے۔ عجب نہیں کہ اس حکایت کی بنیاد خارجیوں کی افتراءت ہوں۔ (سوانح کربلا: از سید نعیم الدین مراد آبادی)

قاضی سلیمان منصور پوری لکھتے ہیں کہ جب آپ بیمار ہوئے تو فرمایا کہ مجھے کئی بار زہر پلایا گیا۔ اس دفعہ تو وہ ایسا سخت ہے کہ میرا کلیجہ چبا ڈالا۔

امام حسین نے پوچھا: بھائی! زہر کس نے دیا؟ امام حسن رضی اللہ عنہ نے فرمایا: پوچھنے سے آپ کا کیا مطلب ہے کہ اسے قتل کر دو گے؟ امام حسین ہاں اگر زہر دینے والا وہی شخص ہے جس کی نسبت میرا گمان ہے تو اللہ تعالیٰ خود ہی انتقام لے گا اور اگر وہ نہیں تو میں پسند نہیں کرتا کہ کسی بے گناہ کو میری وجہ سے تکلیف پہنچے۔

اسلامی انسائیکلو پیڈیا کے الفاظ دیکھئے۔

آپ کی بیوی جعدہ بنت اشعث نے کسی وجہ سے زہر دے دیا۔ سم قاتل تھا، قلب و جگر کے کلڑے کٹ کٹ کر گرنے لگے۔ جب حالت زیادہ نازک ہوئی اور زندگی سے مایوس ہو گئے تو حضرت امام حسین کو بلا کر ان سے واقعہ بیان کیا۔ آپ کو اپنے نانا کے پہلو میں دفن ہونے کی تمنا تھی

چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے حجرہ نبوی میں دفن ہونے کی اجازت چاہی۔ انہوں نے خوشی کے ساتھ اجازت دے دی لیکن اجازت ملنے کے بعد بھی احتیاطاً فرمایا کہ میرے مرنے کے بعد دوبارہ اجازت لینا ممکن ہے میری زندگی میں مروت سے اجازت دے دی ہو۔ مگر دوبارہ اجازت مل جائے تو روضہ نبوی میں دفن کرنا۔ مجھے خطرہ ہے کہ اس میں بنی امیہ مزاحم ہوں گے۔ اگر مزاحم کی صورت پیش آئے تو زیادہ اصرار نہ کرنا۔

ام المؤمنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے دوسری بار بھی اجازت دے دی۔ لیکن جب مروان کو معلوم ہوا تو سخت اشتعال میں آ گیا۔ اس نے کہا، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ شہید ہوئے تو انہیں روضہ رسول میں جگہ نہیں ملی نہ ہی مدینہ طیبہ میں دفنایا گیا بلکہ انہیں مدینے سے باہر دفنانے پر مجبور ہونا پڑا۔ اب حسین ابن علی کے لئے میں کسی طور بھی اجازت نہیں دوں گا کہ روضہ رسول میں دفن ہو سکیں۔ یہ فقط خاندان ہاشمی یا اہلبیت سے تعصب تھا ورنہ مروان اور اس کا باپ تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ شہادت میں برپا ہونے والی شورشوں کی جڑ تھے۔ وہ ایسی ذلیل حرکت فقط اس لئے کر رہا تھا کہ سیدنا امام حسن نواسہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سیدنا علی الرضی اور سیدہ فاطمہ الزہرا کے صاحبزادے تھے۔ ان سے بڑھ کر کون محترم ہو سکتا تھا۔ مروان اور اس کا خاندان تو اس مقدس خاندان کے افراد کے قدموں کو بھی نہیں چھو سکتے۔ بہر حال شورش کے ڈر سے سیدنا امام حسن کو جنت البقیع میں ان کی عظیم والدہ ماجدہ سیدہ فاطمہ الزہرا کے پہلو میں دفن کر دیا گیا۔

آپ صورت و سیرت دونوں میں اپنا نانا جان سے مشابہ تھے۔ روایت میں ہے کہ آپ نے نہایت کثرت سے شادیاں کیں اور اسی کثرت سے طلاقیں دیں۔ مورخین اس کا سبب یہ بتاتے ہیں کہ اشراف کی عورتوں میں خاندان رسول سے رشتہ جوڑنے کا بڑا شوق تھا خواہ وہ ایک رات ہی کے لئے کیوں نہ ہو۔

آپ بزم ہستی کی محبوب ترین ہستی تھے۔ مدینے والوں کے پیارے تھے۔ عالم اسلام آپ سے پیار کرتا تھا۔ جب آپ کا جنازہ اٹھایا گیا تو اتنا ہجوم تھا کہ حد نظر تک انسان ہی انسان دکھائی دیتے تھے۔ اس سے پہلے مدینہ میں اتنا بڑا ہجوم دیکھنے میں نہیں آیا۔ لوگوں کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں کہ شہزادہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو رہا ہے۔

جب امام عالی مقام حضرت حسن علیہ السلام نے وفات پائی تو مروان آپ کے جنازے پر رویا تو حضرت امام حسین علیہ السلام نے اسے فرمایا کیا تو اس پر روتا ہے حالانکہ تو نے انہیں سخت

ترین اذیت میں مبتلا رکھا۔ مروان نے پہاڑ کی طرف اپنے ہاتھ سے اشارہ کر کے کہا ”انی کنت افعل ذالک الی احلم من هذا۔“ (میں یہ اس شخص سے کرتا تھا جو اس پہاڑ سے بھی زیادہ حلیم تھا)۔ (سواعق محرقہ ص ۱۴۰)

آپ کی کل مرویات کی تعداد 13 ہے۔ آپ عرب کے اخطب الخطباء کے فرزند تھے۔ آپ کے نانا جان حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم انصاح العرب تھے۔ اس لئے جب بولتے تو مجمع پر چھا جاتے۔ میدان جنگ میں بھی آپ کے خطبات حق و صداقت کا بلند ترین آوازہ ہیں۔ آپ کی باتیں خوشبو بن کر دل و جان میں اتر جایا کرتی تھیں۔ آپ کی ذات روحانی، باطنی اور دینی لحاظ سے اسوۂ نبوی کا نمونہ تھی۔ وہی شرم و حیا، وہی خدمت انسانیت، وہی صلح کلی، وہی امن و سلامتی کے پرچم کی سر بلندی۔ آپ تمام مکارم اخلاق کا پیکر مجسم تھے۔ زہد و تقویٰ، دنیاوی جاہ و حشمت سے بے نیازی اور بے تعلقی آپ کا ایسا خاص امتیازی وصف تھا جس میں آپ کا کوئی حریف نہیں۔ آپ کو حضرت امام حسین، حضرت محمد بن الحنفیہ اور حضرت عباس بن علی نے غسل دیا۔ اگرچہ مروان بن حکم جیسے ظالم شرا نگیز اور اہلبیت کے بدترین دشمن کی خباثت کی وجہ سے آپ روضہ رسول میں دفن ہونے کی سعادت حاصل نہ کر سکے مگر جنت البقیع میں خاتون جنت سیدہ فاطمہ الزہرا کے قرب میں آپ کا دفن کیا جانا اپنی جگہ بہت بڑی سعادت ہے۔

نانا کے جسم پاک کا پارا تھا وہ حسن

افلاک اہلبیت کا تارا تھا وہ حسن

حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ نے متعدد شادیاں فرمائیں جن سے آپ کے ۱۲ صاحبزادے اور ۹ صاحبزادیاں عطاء ہوئیں۔ صاحبزادوں کے نام یہ ہیں۔ حضرت زید، حضرت حسن ثنی، حسین اشرم، حضرت طلحہ، حضرت اسماعیل، حضرت حمزہ، حضرت یعقوب، حضرت عبداللہ، حضرت عبدالرحمان، حضرت ابوبکر، حضرت قاسم رضی اللہ تعالیٰ عنہم

حضرت سیدنا امام حسن کی نسل سیدنا زید اور سیدنا حسن ثنی سے چلی۔

آپ نے اپنی پاکیزہ سیرت، روشن کردار، دلکش اطوار، دلوں میں اتر جانے والی شوکت، گفتار، شفقت بے پایاں، رحمت فراوان، عفو بندہ نواز، لطف عالم پناہ، عبادت و پاکیزگی، امن و سلامتی، صلح و خیر اور صلح رحمی کے جو نقوش صفحہ ہستی پر ثبت کئے ہیں وہ ہمیشہ محبان آل رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے دلوں کو جگمگاتے رہیں گے۔

سید الشہداء امام حسین رضی اللہ عنہ

حقا کہ بنائے لالہ است حسین

شہادت وہ نعمت عظمیٰ ہے کہ جس کی آرزو ہر صاحب ایمان کے دل میں ہر آن مچلتی رہتی ہے۔ اس کائنات میں آنکھ کھولتے ہی ہر مسلمان غازی اور شہید کے فلسفے سے آشنا ہو چکا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شہادت کی تمنا اہل حق کا جزو ایمان بن جاتی ہے۔ تاریخ اسلام ایسے عظیم نفوسِ قدسیہ کے لہو رنگ تذکروں سے آباد ہے جنہوں نے اپنی متاعِ زندگی کو حیاتِ اُخروی کی خاطر مسکراتے ہوئے موت کی تلخیوں کو نذر کر دیا۔ ان شہدائے عظام کے پیش نظر فقط یہی مقصد تھا کہ ہم شہادت کی سعادت کو اپنا مقدر بنا کر فی الحقیقت اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی بنیاد رکھ رہے ہیں۔ انہی شہدائے قدسیہ کے قافلے کے امیر سید الشہداء حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت نے بطورِ خاص رہتی دُنیا تک کیلئے اہل ایمان کو باور کرا دیا کہ جس کشتِ ایمان کو شہداء کے مقدس لہو کا نم عطا ہوا ہو وہ کبھی ویران نہیں ہو سکتی۔

سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ کی بے مثال قربانی حق و صداقت کی پاسداری کی لازوال داستان ہے۔ اس قربانی نے وقت کی پیشانی پر یہ فیصلہ تحریر کر دیا کہ حق و انصاف کا کارواں کبھی بھی رُک نہیں سکتا بلکہ یہ ہر آن اور ہر ساعت پامردی کے ساتھ منزل کی جانب رواں دواں رہتا ہے۔ باطل چاہے کتنی رکاوٹیں کھڑی کر لے زبانوں پر چاہے کس قدر تالے لگا دے سچائی کا گلا گھونٹنے کیلئے جس قدر حربے چاہے اختیار کر لے صداقت کا آوازہ بہر صورت بلند ہو کر رہتا ہے اور سچائی کا پرچم زمانے کی وسعتوں میں اپنی سر بلندی کا اعلان کر کے رہتا ہے۔ سچائی مصلوب ہو کر بھی زندہ رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ میدانِ کربلا میں شہادت کے رُتبے پر فائز ہو کر بھی اپنی حیاتِ ابدی کا احساں دلا رہے ہیں۔

یہ کون حسین ہے کہ جس کی لازوال داستانِ صبر و استقامت سے تاریخ اسلام جگمگا رہی ہے۔ یہ وہی حسین ہے جسے سرورِ کائنات محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دوشِ اقدس پر سواری کا

Click For More Books

<https://archive.org/details/@zohaibhasanattari>

شرف حاصل ہے۔ یہ وہی حسین ہے جسے میرے آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سونگھتے تھے اور فرماتے تھے کہ مجھے حسین سے جنت کے پھولوں کی مہک آتی ہے۔ یہ وہی حسین ہے جسے جو انان جنت کا سردار ہونے کی بشارت عطا ہوئی۔ یہ وہی حسین ہے جسے خاتون جنت سیدہ فاطمہ الزہرا رضی اللہ عنہا کی آغوش تربیت نصیب ہوئی تھی اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ جیسے صف شکن نے آداب دلاوری سکھائے تھے۔ یہ وہی حسین ہے جس کیلئے سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا تھا کہ ”حسین مجھ سے ہے اور میں حسین سے ہوں“ اور پھر ارشاد فرمایا ”خدا اس کو دوست رکھتا ہے جو حسین کو دوست رکھتا ہے“۔ یہ وہی حسین ہے جسے آتے دیکھ کر نانا محترم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خطبہ منقطع کر کے منبر سے نیچے اتر کر اٹھالیا کرتے تھے۔ اسی حسین رضی اللہ عنہ کی شخصیت کی سربلندی تقاضا کر رہی تھی کہ انہیں شخصیت کے غیر معمولی محاسن کے شایان شان منصب عطا ہو۔ چنانچہ تقدیر نے ان کی قسمت میں شہادت عظمیٰ کی سعادت لکھ دی۔ ایسی شہادت جو استبدادیت کے قصر طاغوت کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے نیست و نابود کرنے کا باعث بن جائے اور حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے ایسا ہی کر دکھایا۔ بقول اقبال:

موج خونِ اوچمن ایجاد کرد..... تا قیامت قطع استبداد کرد

تاریکی جس قدر گہری ہو روشنی کی ضرورت اتنی ہی زیادہ محسوس کی جاتی ہے۔ یزید کا دور حکومت اسلامی تاریخ کا بدترین دور تھا۔ حرام و حلال کی تمیز اٹھ رہی تھی۔ خلافت کو طوکت میں بدلا جا چکا تھا۔ انصاف کے بدلے ظلم و ستم کو رواج دیا جا رہا تھا۔ اسلامی شعائر کی سزا عام توہین ہو رہی تھی۔ رعایا کے حقوق پامال ہو رہے تھے۔ ریاست کا ہر عامل اور افسر خود کو خدا کا نائب تصور کر رہا تھا۔ یزید تحت حکومت پر متمکن ہو کر غرور کی آخری حدوں کو چھو رہا تھا۔ اہل ایمان کی زبانوں پر تالے لگائے جا رہے تھے۔ برائیوں کو رواج دیا جا رہا تھا، اسلامی معاشرہ گناہوں اور برائیوں کی دلدل میں دھنس رہا تھا، یہ سب کچھ ایک منظم سازش کے تحت ہو رہا تھا۔ یزید اور اس کے حواری اسلام کے قانون احتساب کو طاق نسیاں کی نذر کر چکے تھے۔ شاہی خزانے کے منہ کھول دیئے گئے تھے اور مسلمانوں کے ضمیر اور دل کے سودے ہو رہے تھے۔ مصلحت پسندوں کی بن آئی تھی۔ دولت پرست اپنے نام نہاد ایمان کے دام کھرے کر رہے تھے۔ یزید اقتدار کے نشے میں بدمست ہو کر ”انا ولا غیر“ کا نعرہ لگاتے ہوئے مطمئن ہو چکا تھا کہ اب اس کو بد اعمالیوں پر روکنے کیلئے کوئی آواز نہیں اُبھرے گی۔

وقت کے اسی ظلمت کدے میں سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ کی صدائے حق روشنی کی کرن بن کر ابھری اور دیکھتے ہی دیکھتے اس روشنی سے اہل ایمان کے دل پھر سے منور ہونے لگے۔ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے پکار کر کہا ”یزید تم جھوٹے ہوئے تمہاری حکومت جمہوری ہے اور نہ تمہیں قیادت کا حق پہنچتا ہے۔ تم میرے نانا کی شریعت قدسیہ میں مداخلت کا کوئی حق نہیں رکھتے۔ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی آواز دلوں کو چیرتی ہوئی انسانی احساسات کو جھنجھوڑنے کا باعث بن گئی۔ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے باطل قوتوں کے سامنے نبرد آزما ہو کر بتلا دیا کہ سچائی کا راستہ نہیں روکا جاسکتا اور جو اسلام کو مٹانے کی کوشش کرے گا خود حرفِ غلط کی طرح مٹ جائے گا۔

شاہ است حسین بادشاہ است حسین
دین است حسین دین پناہ است حسین
سردار نہ داد دست در دست یزید
حقا کہ بنائے لا الہ است حسین
کربلا میں حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی یزید کے لشکر سے جنگ اقتدار کے حصول کی جنگ نہیں تھی یہ تو حق و باطل کا معرکہ تھا۔ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ ہرگز اقتدار کے خواہاں نہیں تھے اگر ان کے خاندان کو اقتدار اتنا ہی عزیز تھا تو ان کے برادر اکبر سیدنا امام حسن رضی اللہ عنہ امت اسلام کو تفرقہ اور خونریزی سے بچانے کیلئے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے حق میں حکومت سے دستبردار نہ ہوتے۔ انہوں نے تخت شاہی کو حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے حوالے کر کے گوشہ عافیت کو ترجیح دی۔ اسی طرح سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ نے بھی حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور حکومت میں بعض غلط احکامات پر تنقید تو کی مگر تلوار اٹھا کر میدانِ عمل میں نہ آئے کیونکہ وہ اقتدار کے خواہاں نہیں تھے۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے جب یزید کو اپنا جانشین مقرر کر دیا اور اس فاسق و فاجر کے حق میں بیعت لینا شروع کر دی تو امت مسلمہ میں اضطراب کی لہریں پیدا ہونے لگیں۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو یہ حق نہیں پہنچتا تھا کہ وہ اسلامی حکومت کو موروثی بنا دیں اور پھر یزید نے لوگوں سے جبری بیعت لینے کیلئے جو مظالم اہل ایمان پر ڈھائے ان کا تذکرہ انتہائی ہولناک ہے۔ مدینہ منورہ جیسے شہر امن پر یزید کا حملہ جو روا استبداد کی بدترین مثال ہے اس مقدس شہر کو شامیوں نے خوب لوٹا۔ مسجد نبوی کو جانوروں کا اصبطل بنا دیا گیا۔ شہداء میں کئی جید صحابی اور سات سو حفاظ قرآن تھے۔ مدینہ کے کل شہیدوں کی تعداد ۱۲۴۹ بتائی جاتی ہے۔ یہ سب کچھ یزید کی جبری بیعت لینے کیلئے کیا گیا تھا۔ بیعت کے الفاظ یہ تھے:

”یزید چاہے تم کو بیچے چاہے تم کو آزاد کرے چاہے خدا کی عبادت کی طرف بلائے چاہے

معصیت کی طرف بلائے تم اس کی اطاعت سے منہ نہ موڑو گے۔“

ظاہر ہے ملوکیت کی بیعت کوئی بھی اہل ایمان دل سے قبول نہیں کر سکتا تھا۔ اس وقت حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ بھی مصلحت پسندی کو اپنا شعار بنا سکتے تھے لیکن اب پانی سر سے اونچا ہر چلا تھا۔ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے سایہ نبوت میں پرورش پائی تھی، وہ حکومت کو موروثی بنانے اور اہل ایمان پر ظلم و ستم کب برداشت کر سکتے تھے۔ وہ بڑے باپ کے بڑے بیٹے اور تاریخ انسانیت کے محسن اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے تھے۔ ان کے شایان شان یہی تھا کہ وہ میدان عمل میں آ کر ملوکیت کو جھنجھوڑیں اور اسے باور کرائیں کہ بیعت لینے کا یہ عمل سراسر غیر اسلامی اور غیر آئینی ہے۔ آج حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی جدوجہد پر الزام لگایا جاتا ہے کہ یہ ان کی تمام تنگ و دو محض اقتدار اور تخت حکومت کیلئے تھی۔ الزام تراشی والوں کو حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کا حسب و نسب پر امن شہری کی حیثیت سے گذشتہ زندگی اور یزید کے ملوکانہ عزائم کو فراموش نہیں کرنا چاہئے۔ اگر حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی جنگ اقتدار کیلئے تھی تو کیا وہ اتنے ہی گئے گزرے تھے کہ علم بغاوت بلند کرتے تو لوگ ان کا ساتھ نہ دیتے۔ ابھی وہ لوگ زندہ تھے جنہوں نے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کو دوشِ نبوت پر سواری کرتے دیکھا تھا۔ وہ لوگ باقی تھے جنہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے لبوں کے بوسے لیتے دیکھا تھا۔ اگر حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ ان سے بیعت کے خواہاں ہوتے تو کیا وہ اسے سعادت سمجھ کر حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی بیعت نہ کرتے۔ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ سمجھتے تھے کہ اگر انہوں نے بیعت لینی شروع کر دی تو پھر اسے اقتدار کی جنگ کہا جائے گا اور نہ معلوم پھر مسلمانوں کی خونریزی کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ کب تک جاری رہے گا۔ اس لئے آپ نے کلمہ حق بلند کرنے کا تمام بوجھ اپنی اور اپنے خاندان کی ذمہ داری قرار دیتے ہوئے میدانِ کرب و بلا میں کود پڑنے کا عزم کر لیا۔

مدعائش سلطنت بودے اگر..... باچنیں ساماں نمی کردے سفر

یہ حقیقت ہے کہ اگر حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ اپنی خلافت کا اعلان کرتے تو مملکت اسلامیہ کے بے شمار نفوس آپ کے پرچم تلے جمع ہو جاتے۔ آپ کا مقصود ہرگز حصولِ اقتدار نہیں تھا۔ اقتدار کے حصول کے آرزو مند کبھی بھی اپنے اہل خاندان کے ہمراہ مقتل کی طرف نہیں بڑھتے بلکہ وہ تو مصلحت اندیش جنگ آزماؤں کی طرح اپنے چاہنے والوں کو میدانِ جنگ کی دہکتی ہوئی بھٹی میں جھونکتے ہیں۔

لیکن یہاں تو تسلیم و رضا کے تقاضوں کی بجائے آوری کا منظر تھا۔ بہتر نفوسِ قدسیہ کا کارواں تھا۔ ان میں محترم خواتین بھی تھیں اور معصوم بچے بھی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے گھرانے کی خواتین کہ جن کے چہروں کی جھلک سورج کی آتشیں آنکھ نے بھی نہیں دیکھی تھی، صبر و استقامت کی مشکل ترین ساعتوں میں مردوں کو ہمت و حوصلہ عطا کر رہی تھیں۔ عون و محمد جیسے معصوم بچے کربلا کے لہو رنگ نظاروں سے خوفزدہ ہونے کے بجائے سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ پر اپنی جان وارتے ہوئے فخر محسوس کر رہے تھے۔ حضرت علی اکبر رضی اللہ عنہ اور حضرت قاسم رضی اللہ عنہ اپنی جوانیاں حضرت سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ کے پر وقار بڑھاپے پر تصدق کر رہے تھے۔ اہل بیت کو پانی پلانے کی آرزو میں جان دینے والے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے چہرے پر ملکوتی تبسم رقصاں تھا۔ شیر خوار حضرت علی اصغر رضی اللہ عنہ اپنی ننھی سی جان کا نذرانہ پیش کر کے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے موقف کو کہیں زیادہ مضبوط و مستحکم کر چکا تھا۔ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے جانثار ایک ایک کر کے کٹ رہے تھے۔ یزیدی لشکر کے قائدین بار بار اپنا مطالبہ دہراتے کہ یزید کی بیعت کر لیں مگر حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کا ایک ہی موقف تھا کہ یزید فاسق و فاجر ہے، باطل کا نمائندہ ہے، میں اس کی بیعت کیسے کر سکتا ہوں؟

کہا جاتا ہے کہ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے کہا تھا کہ مجھے یزید کے پاس لے چلو میں اس کے ہاتھ پر بیعت کر لوں گا، یہ درست نہیں ہے جو انہوں نے کہا وہ یہ تھا کہ:

”مجھے یزید کے پاس جانے دو اور پھر اس سے فیصلہ کرنے دو، خواہ وہ میرے قتل ہی کا فیصلہ دے۔“

بعض لوگ کہتے ہیں کہ بعض دوسرے صحابہ نے تو بیعت کر لی تھی۔ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے کیوں نہیں کی اور وہ ان کو مطمئن کرتے ہیں۔ حالانکہ جب کوئی مسلمان حکومت پورے دبدبہ اور جاہ و جلال کے ساتھ قائم ہو تو اس کے خلاف ایک عام آدمی آواز بلند کرنے کی ہمت نہیں رکھتا۔ صرف وہی پرچم بلند کر سکتا ہے جو ابتدائی قدم پر ہی موت کو سینے سے لگا کر آگے بڑھے۔ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ پر ایسا اعتراض کرنے والوں کو صحابہ کرام کی طرف سے صفائی پیش کرنی چاہیے۔ اس سلسلہ میں حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی بے مثال قربانی کی اہمیت کو کم کرنا حقائق سے صریحاً انحراف کے مترادف ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ:

کرتی رہے گی پیش شہادت حسین کی آزادی حیات کا یہ سردی اصول

چڑھ جائے کٹ کے سر ترا نیزے کی نوک پر لیکن یزیدیوں کی اطاعت نہ کر قبول حضرت سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ کی لازوال قربانی حق و صداقت کی پاسداری کیلئے تھی۔ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کس طرح برداشت کر سکتے تھے کہ جس دین کو ان کے عظیم المرتبت نانا جان نے عرب و عجم میں بسنے والے انسانوں کے دلوں کی دھڑکن بنا دیا تھا، اسے باز سچے اطفال بنا کر کھلے بندوں اس کا مذاق اڑایا جائے۔ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے اپنے مقدس لہو سے کشت اسلام کو اس طور سیراب کر دیا کہ اب اس پر کبھی خزاں نہیں آسکے گی۔ انہوں نے اپنے اور اس بیت اطہار کے خون سے عظمت اسلام کی ایک ایسی شمع روشن کی ہے جسے کفر و بال کی آندھیاں کبھی بھی بجھا نہیں سکیں گی۔ ان کی قربانی ایک ایسی ناقابل فراموش داستان ہے کہ جس کو دل میں جگہ دینے والے اہل ایمان اسلامی اقدار کی سر بلندی کا پرچم ہمیشہ اوج وقت لہراتے رہیں گے۔ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے شہادت عظمیٰ کی خلعت جاودانہ پا کر اسلام میں ملوکیت کے باطل تصور کو فنا کی نذر کر دیا۔ ان کی قربانی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کو دلوں میں اُجاگر کر گئی کہ:

”قیصر ہلاک ہو گیا اور اس کے بعد کوئی قیصر نہ ہوگا اور کسریٰ ہلاک ہو گیا اس کے بعد کوئی کسریٰ نہ ہوگا“۔

حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی قربانی ایمان کی صداقتوں کو سب سے بڑا خراج عقیدت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ نے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کو ابدی سرخروئی اور جاودانی عظمت عطا کر دی جبکہ یزید ہمیشہ کیلئے گمنامی اور بدنامی کے گہرے تاریک غار میں دفن ہو گیا۔

نہ یزید کا وہ ستم رہا، نہ زیاد کی وہ جفا رہی جو رہا تو نام حسین کا جسے زندہ رکھتی ہے کربلا

حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے اپنے عمل سے ثابت کر دیا کہ حق و صداقت کے پاسدار زمانے کے شدائد اور حالات کی سختیوں کی پروا نہیں کرتے۔ وہ راہِ وفا میں آگے بڑھتے ہوئے اپنوں کی تعداد کی قلت اور دشمن کی کثرت کی پروا نہیں کرتے۔ وہ دشمن کے سامانِ حرب و ضرب سے ہراساں نہیں ہوتے۔ نقصان اور نتائج کی پروا کئے بغیر وہ شہادت گہ اُلفت میں مسکراتے ہوئے قدم رکھتے ہیں۔ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کربلا کے میدان میں شہید کر دیئے گئے مگر تقدیر نے انہیں شہرت عام اور بقائے دوام کے دربار کی تاجوری عطا کر دی۔ اگر اس وقت حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ باطل کے آگے جھک جاتے تو آج سچائی کا وجود ایک داستانِ پارینہ بن چکا ہوتا۔

جب تک چاند سورج ستارے دکتے رہیں گے جب تک صداقت کا حسن دلوں کو متاثر کرتا رہے گا جب تک سچائی اور انصاف کی تب و تاب انسانی دلوں کو ضوئیلن کرتی رہے گی اس وقت تک حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی لازوال قربانی دلوں کو ایمان و یقین کے عملی تقاضوں سے آشنا کرتی رہے گی۔

حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کا نام آج آزادی و حریت کی علامت بن چکا ہے جب بھی کوئی قوم آزادی کی رفعتوں سے ہمکنار ہونے کیلئے اپنے جان و مال کا نذرانہ لے کر لہورنگ داستان رقم کرنے کیلئے آگے بڑھتی ہے تو اس قوم کے حریت پسند حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کو قربانی و ایثار کا روشن استعارہ جان کر خراج عقیدت پیش کرنا اپنا فرض اولین سمجھتے ہیں۔ حق تو یہ ہے کہ:

انسان کو بیدار تو ہو لینے دو
ہر قوم پکارے گی ہمارے ہیں حسین

.....○.....

جو دکھتی آگ کے شعلوں پہ سویا وہ حسینؑ
جو جواں بیٹے کی میت پر نہ رویا وہ حسینؑ
جس نے اپنے خون سے دُنیا کو دھویا وہ حسینؑ
جس نے سب کچھ کھو کے پھر بھی کچھ نہ کھویا وہ حسینؑ
مرتبہ اسلام کا جس نے دوبالا کر دیا
اپنے خون سے جس نے عالم میں اُجالا کر دیا

.....○.....

اہل ایمان کے لئے تنویر حق تھا وہ حسینؑ
عظمت دین کے لئے تصویر حق تھا وہ حسینؑ
اہل ایمان کے لئے توقیر حق تھا وہ حسینؑ
دین کے پیاروں کے لئے تاثیر حق تھا وہ حسینؑ
وہ حسینؑ جس کی شہادت دیتی ہے ہم کو پیام
وقف کر دو جان و دل نور شہ والا کے نام



سیدنا حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ

جناب سید حمزہ خدائے پاک کے غازی
خدا پر ہیں یہ راضی تو خدا بھی ان پہ ہے راضی
انہی کی تیج ہیبت ناک سے کفار لرزاں تھے
انہی کے بازوؤں کی دھاک سے اشترار لرزاں تھے
شہیدان خدائے پاک کے سردار تھے حمزہ
نبی کے لاڈلے اسلام کی لکار تھے حمزہ
شہید ایسے کہ ان کی موت پر سرکار روئے تھے
صحابہ اور مدینہ کے در و دیوار روئے تھے
زہے قسمت شہ دو عالمیں کو ناز تھا ان پر
شجاعت، سرفروشی، غیرت ایماں کے مظہر
تعالیٰ اللہ شہادت ان کی خالق کی عنایت ہے
لہو میں ڈوب کر اسلام کی رنگیں شہادت ہے

سید تاریخ شہداء

حضرت امیر حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ

اسلام کی اشاعت اور دین حقہ کے فروغ کے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی جدوجہد لائق صد تحسین ہیں۔ یہی وہ مقبول بارگاہِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں کہ جنہوں نے رضائے الہی اور رضائے رسول کو خاطر کسی قسم کی قربانی سے دریغ نہ کیا۔ ان کے دل ایمان کی اس حقیقت سے عملی طور پر آشنا تھے کہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم جب تک ہیں مالِ اولاد ماں باپ جا سید اذ حتی کہ اپنی زندگی سے بڑھ کر پیارے نہ ہو جائیں اس وقت تک ہمارا ایمان مکمل نہیں ہوتا، یہی مکمل ایمان کا جذبہ نہیں ہر لحظہ ہر قسم کی قربانی پر تیار رکھتا تھا، وہ بجا طور پر سمجھتے تھے:

نماز اچھی، صبح اچھا، روزہ اچھا اور زکوٰۃ اچھی مگر میں باوجود اسکے مسلمان ہو نہیں سکتا نہ جب تک کٹ مروں میں خواجہ بطحا کی چوکھٹ پر خدا شاہد ہے کال میرا ایمان ہو نہیں سکتا آج اسلام کا نام لینا آسان ہے مگر مکہ میں جب کفر برسر اقتدار تھا، اشرار باطل مسلمانوں کو ستانے کیلئے روزانہ نئے بہانے تلاش کرتے تھے۔ ایسے وقت میں اعلائے کلمۃ الحق کرنا، عظمت اسلام کا نعرہ لگانا اور خدا و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نامی نامی سے فضاؤں کو پر نور بنانے کی کوشش کرنا، کفار کے بے پناہ غیض و غضب کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ اور پھر ایسے حالات جو خوش بخت قبولیت اسلام کا اعلان کر کے دامانِ محمدی سے وابستہ ہو جاتا تھا۔ اس پر ظلم و ستم اور جبر و استبداد کے دروزے کھول دیئے جاتے تھے مگر قربان جائے ان مسلمانوں کیلئے کہ جن کیلئے کفار مکہ کی شمشیر استبداد کا ہر وار ان کے جذبہ ایمانی کو تیز تر کر دیتا ہے۔

ان خوش بخت انسانوں میں جنہوں نے حضرت علیہ السلام والسلام سے اپنی محبت و عقیدت کا حق ادا کرنے کیلئے اسلام قبول کیا اور ان کے قبول اسلام سے اسلام کی شان و شوکت میں اضافہ ہو گیا، جن کے مسلمان ہونے نے عالم کفر کو لرزہ اندام کر دیا، ان میں حضرت سیدنا امیر حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ خاص طور سے قابل ذکر ہے۔

Click For More Books

<https://archive.org/details/@zohaibhasanattari>

بڑی تو نے توقیر پائی ہے حمزہ کفر پر ایک ہیبت سی چھائی ہے حمزہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت امیر حمزہ حضرت عبدالمطلب کے بیٹے ہیں۔ ان کی والدہ ہالہ بنت وہب تھیں۔ وہ رسول کریم کے رضاعی بھائی بھی ہیں کیونکہ ابولہب کی باندی ثویبہ نے ان دونوں کو دودھ پلایا ہے۔ یہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے صرف دو سال بڑے تھے۔ آپ سید الشہداء کے لقب سے ملقب ہوئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے لبنان کے اور حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے درمیان بھائی چارہ کروا دیا تھا۔ آپ نبوت کے چھٹے سال ایمان لائے۔ آپ کی کنیت ابوعمارہ تھی آپ بڑے بہادر جنگیز اور قد آور تھے۔

بچپن میں ان کو شمشیر زنی، تیر اندازی، پہلوانی اور سیر و شکار کا بے حد شوق تھا۔ قبائل کے باہمی جھگڑوں سے ہمیشہ گریز کرتے۔ چھ ہجری کو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم دار ارقم سے نکل کر لوگوں کو دعوت توحید دے رہے تھے کہ ابو جہل نے آپ کو گالیاں دیں اور اسلام کے بارے میں بھی برا بھلا کہا۔ آپ پر مٹی اور گوبر پھینکا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سب کچھ برداشت کر کے خاموشی سے تشریف لے گئے۔

بنو تمیم کے رئیس عبد اللہ بن جدعان کی آزاد کردہ لونڈی کوہ صفا پر بیٹھی سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو شکار سے واپس آتے دیکھ کر کہا ”ابوعمارہ کاش تھوڑی دیر پہلے تم یہاں ہوتے تو دیکھتے کہ عمرو بن ہشام (ابو جہل) نے تمہارے بھتیجے کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔ سخت گالیاں دیں ان پر مٹی اور گوبر پھینکا لیکن ابن عبد اللہ کچھ جواب دیئے بغیر خاموشی سے واپس لوٹ گئے۔

یہ سن کر حضرت امیر حمزہ رضی اللہ عنہ کی رگ حمیت پھڑک اٹھی، غصے سے بے قابو ہو کر گھر جانے لگی بجائے سیدھے خانہ کعبہ میں چلے گئے۔ جہاں پر دشمن خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم ابو جہل مشرکین مکہ کی محفل میں اپنی اس فبیح حرکت میں خوش ہو رہا تھا۔ حضرت امیر حمزہ رضی اللہ عنہ نے جاتے ہی بغیر کچھ پوچھے اپنی کمان اس زور سے ابو جہل کے سر پر ماری کہ عمرو بن ہشام (ابو جہل) کا سر پھٹ گیا اور خون بہنے لگا اور کڑک کر کہا تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو گالیاں دیتا ہے میں بھی ان کے دین پر ہوں جو وہ کہتے ہیں میں بھی وہی کہتا ہوں کہ اللہ ایک ہے۔ اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، اگر تجھ میں ہمت ہے تو مجھے بھی گالیاں دے کر دیکھو۔

ابو جہل کو لہولہان دیکھ کر اس کے قبیلے کے لوگ جو ساتھ بیٹھے تھے اٹھ کھڑے ہوئے۔ مگر ابو جہل نے ان کو روک دیا اور کہا کہ ابوعمارہ کو کچھ نہ کہنا میں نے اس کے بھتیجے کو گالیاں دی تو اسے غصہ

آگیا، میں نہیں چاہتا کہ بنو مخزوم اور بنو ہاشم میں جنگ چھڑ جائے۔ حضرت امیر حمزہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا ”مجھ پر حق واضح ہو چکا ہے میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے سچے رسول ہیں۔“

اب خوش ہو جاؤ مگر محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”چچا جان میں ایسی باتوں سے خوش نہیں ہوتا۔ میری خوشی اس میں ہے کہ تم مسلمان ہو جاؤ۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دین کی باتیں بتائیں۔ آپ کے ارشادات سن کر حضرت امیر حمزہ رضی اللہ عنہ کا دل یقین و ایمان سے بھر گیا، پکار اٹھے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ اللہ تعالیٰ کے سچے رسول ہیں اور آپ کے دست مبارک پر اسلام کی بیعت کی پھر ہر لمحہ اسلام ہی کی حمایت کی۔“

پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ آپ کے ابو جہل سے انتقام لینے، قبولیت اسلام کا اعلان کرنے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سب کچھ سنا دینے کے بعد آپ کی کیفیات یوں بیان کرتے ہیں:

رشتہ داری کے جوش میں یہ سب کچھ ہو گیا۔ ابو جہل سے اپنے پیارے بھتیجے کا انتقام بھی لے لیا اور اپنے مسلمان ہونے کا اعلان بھی کر دیا لیکن جب گھر واپس آئے تو نفس امارہ نے ملامت کرنا شروع کر دی کہ اے حمزہ تو نے یہ کیا کیا؟ فرط غضب میں تو اتنا دور چلا گیا کہ اپنے آباؤ اجداد کے عقیدے کو بغیر سوچے سمجھے ترک کر دیا اور ایک نئے دین کو قبول کرنے کا اعلان کر دیا، تو نے جلد بازی میں بڑا غلط فیصلہ کیا ہے۔ حمزہ گو مگر کے عالم میں ہیں، انہیں کچھ سمجھ نہیں آ رہی کہ وہ کیا کریں۔ انہیں یہ بات اپنی شان کے سراسر خلاف معلوم ہوئی کہ انہوں نے ایک ایسے دین کو قبول کر لیا ہے جس کے بارے میں انہوں نے پوری طرح سے غور و خوض ہی نہیں آیا۔ ساری رات بڑے قلق و اضطراب میں کئی۔ ایسی پریشان رات انہوں نے آج تک نہیں گزاری تھی۔ ایسے ڈہنی کرب سے انہیں پالا نہیں پڑا گیا۔ جب صبح ہوئی تو بارگاہ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر ہوئے۔ عرض کی:

اے میرے بھتیجے! میں ایک ایسی مشکل میں گرفتار ہو گیا ہوں جس سے نکلنے کا راستہ میں نہیں جانتا اور ایسی بات پر میرا قائم رہنا بڑا مشکل ہے۔ اس کے بارے میں مجھے یہ علم نہیں کہ یہ ہدایت ہے یا گمراہی۔ اس لئے مجھے اس بارے میں کچھ ارشاد فرمائیے۔ میرے بھتیجے! میری خواہش ہے آپ اس سلسلہ میں گفتگو کریں۔“ (سبیل الہدیٰ ص ۴۴۴)

عقل و دل و نگاہ کے مرشد کامل نے حمزہ کے بے تاب دل کی طلب پر توجہ فرمائی اور بڑے دل نشین انداز میں اسلام کی صداقت و حقانیت کے بارے میں چند ارشادات فرمائے۔ ”ویز کیہم“ کی شان والے نبی کی نگاہ التفات کی دیر تھی کہ سارے جوابات اٹھ گئے، ساری ظلمتیں کافور ہو گئیں۔

شک و شبہ کا غبار چھٹ گیا، دل کی دُنیا نورِ ایمان سے جگمگ جگمگ کرنے لگی اور عرض کی:

”میں دل کی گہرائیوں سے گواہی دیتا ہوں کہ آپ سچے ہیں۔ اے میرے بھائی کے فرزند آپ اپنے امن کا اظہار فرماتے رہے۔ بخدا میں اس بات کو ہرگز پسند نہیں کرتا کہ مجھے ہر وہ نعمت دے دی جائے جس پر آسمان سایہ فگن ہے تاکہ میں اپنے پہلے دین کی طرف لوٹ جاؤں۔“

اس موقع پر آپ نے اشعار پڑھے جن کا ترجمہ یوں ہے:

”میں اللہ تعالیٰ کی حمد کرتا ہوں، جب اس نے میرے دل کو ہدایت دی، اسلام قبول کرنے کیلئے۔ جو دین حنیف ہے، وہ دین جو رب کریم کی طرف سے آیا ہے، جو عزت والا ہے، جو اپنے بندوں کے حالات سے خا خبر اور ان کے ساتھ لطف و احسان فرمانے والا ہے، جب اس کے پیغاموں کی ہم پر تلاوت کی جاتی ہے تو ہر عقل مند اور زیرک انسان کے آنسو ٹپکنے لگتے ہیں۔ یہ ایسے پیغامات ہیں جو احمد مجتبیٰ لے کر آئے ہیں۔ ایسی آیات کے ساتھ جن کے حروف روشن ہیں، احمد مجتبیٰ وہ ہیں جن کی ہم میں اطاعت کی جاتی ہے۔ کوئی کمزور قول اور عقل و فہم سے گری ہوئی کوئی بات ان کا گھراء نہیں کرتے۔“ (ضیاء النبی، جلد دوم ص ۲۵۵-۲۵۳۔ از پیر کرم شاہ الازہری)

پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ نے سیدنا امیر حمزہ رضی اللہ عنہ کے قبولیت اسلام کا تذکرہ کرتے ہوئے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے ابو جہل کے سر پر کمان کھینچ کر مارنے کی بات کو قاضی سلیمان مسند پوری (مصنف رحمۃ اللعالمین) سے منسوب کرتے ہوئے کہا ہے مجھے کہیں سے اسکا سراخ نہیں ملا۔ قاضی صاحب کی ثقاہت کے پیش نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یقیناً ان کے پاس اس کا مسند حوالہ ہوگا۔ بہر حال یہ امر طے ہے حضرت امیر حمزہ رضی اللہ عنہ نے انتہائی جوش و جذبہ کے ساتھ خاندانی قرابت کو مد نظر رکھتے ہوئے ابو جہل کو شد زود کوب کیا اور ہاں اپنے قبولیت اسلام کا دعویٰ بھی فرمایا۔

ایک دن حضرت امیر حمزہ رضی اللہ عنہ بارگاہ رسالت میں صحابہ کرام کے ساتھ دارا ارقم میں بیٹھے تھے کہ قریش کے مرد آہن حضرت عمر الخطاب نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ سوراخ سے دیکھا تو عمر رضی اللہ عنہ تلوار لئے کھڑے تھے۔ حضرت امیر حمزہ رضی اللہ عنہ اٹھے اور کہا عمر رضی اللہ عنہ کو آنے دو۔ اگر نیک ارادے سے آیا ہے تو خیر ورنہ اسی کی تلوار سے اس کی گردن قلم کروں گا جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ اندر آئے تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی چادر کو مٹھی میں دبا کر زور سے کھینچا اور فرمایا ”عمر کہو کس ارادے سے آئے ہو، نبوت کی پر جلال آواز سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے جسم ز

کچی طاری ہوگئی اور نہایت عجز سے کہا:

یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں اللہ اور اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کیلئے حاضر ہوا ہوں۔ اس پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے زور سے اللہ اکبر کہا کہ دشت و جبل کانپ اٹھے اور دشمنوں کے گھروں میں یہ خبر پہنچ کر صف ماتم بچھ گئی۔

۷ ہجری بعثت کے بعد مشرکین مکہ نے بنو ہاشم اور بنو عبدالمطلب کو حق و صداقت کے پرچار کی سزا میں شعب ابی طالب میں تین سال تک محصور رکھا تو حضرت امیر حمزہ رضی اللہ عنہ بھی اس سخت دور میں رفقاء سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔ مکہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت امیر حمزہ رضی اللہ عنہ کا اسلامی بھائی حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو بنایا۔ ۱۳ ہجری حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ دوسرے مسلمانوں کے ساتھ ہجرت کر کے مدینے طیبہ تشریف لے گئے اور مدینے میں حضرت سعد بن خثیمہ رضی اللہ عنہ کے مکان پر قیام فرمایا۔

رمضان ایک ہجری میں سب سے پہلا علم حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو عطا کیا تا کہ ساحل علاقے میں قریش کے قافلے میں مزاحمت کریں مگر مجددی بن عمرو الجہنی کے باعث معاملہ بطریق احسن ختم ہو گیا۔ صفر ۲ ہجری میں سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ساٹھ یا ستر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ہمراہ غزوہ دان تشریف لے گئے۔ اس غزوہ میں بھی حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو فوج کا قائد اور علمبردار بنایا مگر اسلامی فوج کے ابوا پہنچنے پر قریش مکہ آگے نکل چکے تھے تاہم بنو ضمر اسے معاہدہ ہوا کہ نہ قریش مکہ نہ ہماری نہ ان کی مدد کریں گے بلکہ غیر جانبدار رہیں گے۔

رمضان ۲ ہجری حق و باطل کا معرکہ مقام بدر پر ہوا قریش مکہ کے دعوت مبارزت پر جس میں عتبہ بن ربیعہ شیبہ بن ربیعہ اور ولید بن عتبہ تلواریں سونت کر نکلے۔ لشکر اسلام سے تین انصار جانناز عوف معاذ اور معوذ رضی اللہ عنہم (پسران عفرات و حارث) مقابل میں نکلے۔ قریشیوں نے دیکھ کر کہا ”محمد! یہ لوگ ہمارے جوڑ کے نہیں۔ ہماری قوم کے آدمی بھیج جو اس پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ اور حضرت عبیدہ بن الحارث امطی رضی اللہ عنہم کو حکم دیا جاؤ ان لوگوں کا مقابلہ کرو۔

حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے سامنے شیبہ بن ربیعہ آیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سامنے ولید بن عتبہ اور حضرت عبیدہ بن حارث کے مقابلہ میں عتبہ بن ربیعہ سے ہوا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے پہلے ہی وار میں اپنے اپنے دشمن کو قتل کر ڈالا مگر عبیدہ بن حارث کو عتبہ بن ربیعہ نے شدید زخمی کر دیا تو حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ دونوں نے

Click For More Books

<https://archive.org/details/@zohaibhasanattari>

مل کر عقبہ بن ربیع کو واصل جہنم کر دیا۔

سرداروں کی ہلاکت دیکھ کر قریش کا نامور بہادر طبعیہ بن عدی شور کرتا میدان میں آیا۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ فوراً اس کی طرف بڑھے اور ایک ہی وار میں اس کو ختم کر دیا پھر بنو مخزوم کا ایک جنگجو اسود بن عبدالاسد بن ہلال آیا اور اعلان کیا۔ آج میں مسلمانوں کے حوض سے پانی پی کر اسے خراب کروں گا۔

حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ اس پر شیر کی طرح جھپٹے اور ایک ہی وار میں اس کی ٹانگ کاٹ دی مگر وہ سر کرتا ہوا حوض میں جا گرا۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے اسے حوض میں ہی قتل کر دیا پھر ۳ ہجری کو مشرکین مکہ نے بدر کا بدلہ لینے کیلئے ۷ شوال المکرم کو مدینے پر چھڑ دوڑے۔ اور کوہ احد کے دامن میں ایک دوسرے کے مقابل میں کھڑے ہو گئے۔ اس وقت حضور اکرم حمزہ رضی اللہ عنہ کے ہمراہ صرف سات سو صحابہ کرام تھے۔ مشرکین مکہ کی تعداد تین ہزار کے لگ بھگ تھی۔ دو سو سوار اور سات سو زرہ پوش تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پچاس تیر اندازوں کو دوڑے پر بٹھا دیا۔

جہاں سے دشمن کے آکر حملہ کرنے کا خطرہ تھا۔ پہلے قریش کا نامور علمبردار طلحہ بن ابی طلحہ نکلا اور پکارا تم میں کوئی ایسا ہے جو میرے مقابلے میں آئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نکلے اور ایک ہی وار میں اس کا کام تمام کر دیا پھر عثمان بن ابی طلحہ نکلا۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے اسے بھی کندھے پر تلوار ماری جو کمر تک اتر گئی اور نعرہ مار کر کہا ”یہ لے میں ساقی حجاز (عبدال مطلب) کا بیٹا ہوں پھر حضرت علیؑ حضرت حمزہؑ حضرت ابودجانہؑ حضرت سعد بن ابی وقاصؑ حضرت طلحہؑ حضرت سعد بن انصاریؑ حضرت اسیر بن خضیر صفوں میں گھس گئے اور دشمنوں کی صفوں کو کاٹ کر رکھ دیا۔ پھر مکہ کا ایک سربراہ صباح بن عبدالغریٰ سامنے آیا تو اسے بھی ڈھیر کر دیا مگر اسی دوران جبیر بن مطعم کا حبشی غلام وحشی ایک چٹان کے پیچھے چھپ کر بیٹھا تھا کہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ سامنے آئیں۔ وحشی کو جبیر بن مطعم نے اپنے چچا طبعیہ بن عدی (مقتول بدلہ) کا بدلہ لینے کیلئے وحشی کو حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے قتل کیلئے بلایا تھا۔ قدرتی طور پر حضرت حمزہ کا پاؤں لڑتے لڑتے پھسل گیا تو وحشی نے تاک کر اپنا بھالا پھینکا اور ناف پر لگا اور پارہ ہو گیا۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ پر حملے کرنے لگے۔ مگر لڑکھڑاکے گر پڑے اور اسی دوران ان کی روح نفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ۰

آپ کی شہادت عظمیٰ کے بعد ہندہ بنت عقبہ (زوجہ ابوسفیان) نے آپ کی لاش سے کان ناک اور ہونٹ کاٹ لئے پھر شکم مبارک چاک کر کے دل نکالا اور چبانے لگی مگر چبانہ سکی اور تھوک

دیا پھر ایک بلندی پر چڑھ کر اعلان کیا کہ آج ہم نے مسلمانوں سے در کا بدلہ چکا لیا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اپنے چچا کی لاش کی یوں بے حرمتی ہوتے دیکھی تو سخت افسوس ہوا۔ آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے اور فرمایا ”تم پر خدا کی رحمت ہو تم عزیز و اقربا کا سب سے زیادہ خیال رکھتے تھے اور نیک کاموں میں پیش پیش رہتے تھے۔ نیز فرمایا مجھے بشارت کی گئی ہے کہ حمزہ بن عبدالمطلب ساتوں آسمانوں پر اسد اللہ اور اسد الرسول لکھے گئے ہیں۔ اس اثنا میں آپ کی بہن حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا اپنے بھائی کی لاش دیکھنے آئیں تو فقط انا للہ وانا الیہ راجعون کہہ کر بھائی لاش کے بکھرے ہوئے ٹکڑے دیکھ کر صبر سے واپس چلی گئیں۔

آتی دفعہ اپنے بیٹے زبیر کو کفن کی خاطر دو سفید چادریں دے گئیں کہ ان میں اپنے ماموں کو دفن کر دینا۔

اس کے بعد رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے حضرت امیر حمزہ رضی اللہ عنہ کا جنازہ پڑھا پھر ایک ایک شہید احد کا جنازہ حضرت امیر حمزہ رضی اللہ عنہ کے پہلو میں رکھا گیا۔ آپ نے سب پر الگ الگ نماز جنازہ پڑھائی۔ اس طرح سے حضرت امیر حمزہ رضی اللہ عنہ پر ستر مرتبہ نماز جنازہ پڑھی گئی۔ اس فضیلت میں آج تک کوئی اور آدمی حضرت امیر حمزہ رضی اللہ عنہ کا شریک نہیں۔ جنازے کے بعد ان کے بھانجے حضرت عبد اللہ بن جحش کے ساتھ ایک ہی قبر میں احد کے گنج شہیداں میں سپرد خاک کر دیا گیا۔

۳۷ سال بعد حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے ۴۰ ہجری میں احد کی سمت سے ایک نہر کھودنے کا علم دیا تو کھدائی کے دوران کئی شہداء کی لاشیں بالکل تروتازہ حالت میں برآمد ہوئیں۔ اس دوران اتفاق سے حضرت امیر حمزہ رضی اللہ عنہ کے پاؤں پر بیچہ لگ گیا تو ان کے پاؤں مبارک سے خون کی چھینٹیں اس طرح اڑیں جیسے زندہ آدمی کو زخم لگنے سے خون نکلتا ہے۔ سبحان اللہ سیدنا حضرت امیر حمزہ رضی اللہ عنہ غیرت مند شجاع جانباز بے خود صلہ رحم کرنے والے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور شوق جہاد کے شائق تھے۔

ایک بار حضرت امیر حمزہ رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے جبرائیل علیہ السلام امین کو ان کی اصل صورت میں دکھا دیجئے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: چچا آپ میں اتنی طاقت نہیں کہ جبرائیل علیہ السلام کو اصلی حالت میں دیکھ سکیں مگر حضرت امیر حمزہ رضی اللہ عنہ نے انہیں دیکھنے پر اصرار کیا۔

ایک دن جبرئیل علیہ السلام نازل ہوئے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت امیر حمزہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا ”اپنی نگاہ اوپر اٹھائیے اور دیکھئے حضرت جبرئیل علیہ السلام اپنی اصلی صورت میں نازل ہوئے ہیں۔ حضرت امیر حمزہ رضی اللہ عنہ نے نگاہ اٹھائی تو حضرت جبرئیل علیہ السلام کے پاؤں دیکھ کر ہی غش کھا گئے۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں گذشتہ رات جنت میں داخل ہوا تو دیکھا کہ جعفر بن طیار رضی اللہ عنہ ملائکہ کے ساتھ اڑ رہے ہیں اور حمزہ رضی اللہ عنہ ایک تخت کے اوپر تکیہ لگائے بیٹھے ہیں۔

جب حضرت امیر حمزہ رضی اللہ عنہ شہید ہوئے اور ہندہ نے آپ کا کلیجہ چبانے کی ناکام کوشش کی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ اگر حضرت حمزہ کا کلیجہ ہندہ کے پیٹ میں چلا جاتا تو اسے دوزخ کی آگ نہ چھو سکتی۔ حفصہ اپنے چچا حمزہ کا جسم اس حالت میں دیکھ کر بہت روئے تھے۔ یہ کمال عفوی تھا کہ فتح مکہ..... نہ صرف ہندہ کو بھی معاف کر دیا بلکہ لرزیدہ بدن خطا کار وحشی ک بھی یہ کہتے ہوئے معاف فرما دیا۔

وحشی میں تجھے معاف کرتا ہوں مگر میرے سامنے نہ آیا کرتے دیکھ کر مجھے اپنے پیارے چچا حمزہ رضی اللہ عنہ یاد آ جاتے ہیں۔ یہ ہند ابوسفیان کی بیوی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی ماں تھی جس نے اپنے شوہر کے اسلام لانے کے بعد فتح مکہ خود بھی اسلام قبول کر لیا۔ حضرت عبد اللہ بن حبش کو بھی مثلہ کیا گیا تھا پھر وہ ان کے ماموں حضرت حمزہ ایک ہی قبر میں دفن کئے گئے۔ اسلام نے کسی کو مثلہ کرنے سے منع کیا کیونکہ یہ عمل بربریت ہے اور اسلام کے منافی ہے۔

غزوہ بدر تمام ہو چکا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو بہت تلاش کیا اور پھر انہیں شک چاک اور ناک کان کٹا ہوا پایا۔ آپ کو ان کی مسخ حالت دیکھ کر بہت رنج ہوا اور فرمایا اگر خدا نے مجھے قریش کس جگہ بھی غلبہ عطا فرمایا تو میں ان کے تین آدمیوں کا مثلہ کوں گا جب مسلمانوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے رنج و غم اور آپ کے چچا کی مثلہ کرنے والوں کو آپ کا غصہ دیکھا تو انہوں نے کہا..... اگر خدا نے ہمیں کہیں بھی مشرکین پر ختم نصیب فرمائی تو ہم ان کا ایسا مثلہ کریں گے کہ عرب میں کسی نے کبھی ایسا مثلہ نہ کیا ہوگا۔ عرب میں اگرچہ دشمنوں کی لاشوں کو مثلہ کرنا بہادری کی علامت سمجھا جاتا تھا مگر اسلام نے اسی فعل کو قبیح قرار دے کر ناجائز قرار دے دیا۔

حجرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے مثلہ کرنے سے متعلق مذکورہ قول پر اللہ تعالیٰ نے آیت ذیل عطا فرمائی:

”اگر تم کو بدلہ ہی لینا ہے تو اسی حد تک بدلہ لو جس حد تک تم سے بدل لیا گیا ہے اور اگر تم صبر کرو تو یہ عمل صابریں کے حق میں بہتر ہے۔ اے محمد! آپ صبر کریں اور آپ کا صبر کرنا صرف اللہ ہی کیلئے ہونا چاہئے آپ ان کے عمل سے نہ غمگین ہوں اور نہ ان کی مکارانہ حرکتوں سے دل تنگ ہوں۔“ (ترجمہ سورہ نحل)

یاد رہے کہ حضرت امیر حمزہ رضی اللہ عنہ احد پہاڑ کے دامن میں دفن کئے گئے تھے اور شہادت کے وقت آپ کی عمر اٹھ سال تھی۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کیلئے اپنے پیارے چچا کا غم برداشت ہی نہیں ہوتا۔ جنگ ختم ہوتے ہی آپ نے سب سے پہلے انہی کو تلاش کروایا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے آپ کی نعش ڈھونڈی تھی کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بار بار فرما رہے تھے:

ما فعل عمی (میرے چچا کہاں ہیں)

حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی غم انگیز لاش دیکھ کر آپ کی چشمان مبارک سے ہائے تاجدار ٹب ٹب کرنے لگے۔ حضور نے صحابہ سے پوچھا کہ انہوں نے سید حمزہ رضی اللہ عنہ کو جنگ میں کیسا پایا۔ ایک صحابی نے کہا جب بھگدڑ مچی۔

”وہ چٹانوں کے پاس کھڑے تھے اور یہ کہہ رہے تھے میں اللہ کا شیر ہوں اور اللہ کے رسول کا شیر ہوں۔ اے اللہ آپ ان کفار کی کارستانوں سے بریت کا اظہار کرتا ہوں اور اور ان مسلمانوں نے جو راہ فرار اختیار کی ہے اس کیلئے بھی معذرت خواہ ہوں۔“

پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان چٹانوں کے پاس پہنچے اور آپ کی مثلہ شدہ لاش دیکھ کر آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔ یہاں تک کہ ہچکی بندھ گئی پھر آپ کو مخاطب کر کے فرمایا:

”آپ پر اللہ تعالیٰ کی رحمتیں ہوں، آپ جس طرح کہ میں جانتا ہوں بھلائیاں کرنے والے تھے صلہ رحمی کرنے والے تھے اور اگر مجھے یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ آپ کی بہن یا ہمارے خاندان کی عورتیں غمزہ ہوگی تو میں ان کی لاش کو یوں ہی چھوڑ دیتا تا کہ قیامت کے دن ان کا حشر درندوں کے شکموں اور پرندوں کی پوٹوں سے ہوتا“

پھر فرمایا ”مبارک باد بھی جبرئیل علیہ السلام لائے ہیں اور انہوں نے مجھے بتایا ہے کہ ساتویں آسمانوں میں یہ شہید راہِ حق اسی نام سے مشہور ہے یعنی حمزہ اللہ کا شیر ہے اور اس کے رسول کا شیر ہے۔“

حضرت صفیہ بنت عبد اللہ حمزہ رضی اللہ عنہ کی بہن جب تشریف لائیں تو حضور پریشان ہو گئے کہ ان کا کیا حال ہوگا؟ ان کے بیٹے نے ان کا غم دیکھ کر کہا ”امی جان! حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو حکم دیا ہے کہ آپ واپس چلی جائیں وہ بولیں مجھے پتہ ہے کہ میرے بھائی کے ساتھ کیا ہوا ہے لیکن سب کچھ راہِ خدا میں ہوا ہے اور میں اس پر صبر کروں گی اور اس کے ثواب کی امید رکھوں گی۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اشارہ پا کر آگے بڑھیں اور حمزہ رضی اللہ عنہ کی چارہ پارہ شدہ نعش کو دیکھا اور انا اللہ پڑھا۔ اور ان کیلئے مغفرت کی دعائیں مانگیں۔

حضرت صفیہ کا بے مثل صبر دیکھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اندیشہ ہوا کہ کہیں ان کے دماغ پر اثر نہ پڑ جائے۔ اس لئے اپنا دست مبارک ان کے سینہ پر رکھا۔ چنانچہ آنسو ٹپکنے لگے اور غم ہلکا ہو گیا۔ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کفن کیلئے دو چادریں لائی تھیں۔ ایک میں آپ کو کفن دیا گیا اور دوسری میں ایک انصاری شہید کو دفنایا گیا جن کی لاش کی بھی توہین کی گئی تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو گوارا نہ ہوا کہ حضرت حمزہ کو دو چادروں میں کفن دیا جائے اور ایک دوسرا شہید بے گور و کفن رہے جس چادر میں آپ کو کفن دیا گیا وہ چھوٹی تھیں سر پر ڈال دی جاتی تو پاؤں ننگے ہو جاتے اگر پاؤں پر ڈال دی جاتی تو سر ننگا ہو جاتا۔ چنانچہ سر ڈھانپ دیا گیا اور مبارک قدموں پر ازخ گھاس ڈال دی گئی۔

جب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام مدینہ طیبہ میں حجرہ شریف میں تشریف لائے تو حضرت مسعود رضی اللہ عنہ بن معاذ اپنے قبیلہ میں گئے اور قبیلہ کی ساری عورتیں کو ہمراہ لے آئے تاکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سیدنا حمزہ کی دلنواز شہادت پر اظہارِ تعزیت کریں۔ مغرب سے عشاء تک یہ عورتیں روتی رہیں پھر آپ نے آرام فرمایا۔ قدرے افاقہ محسوس ہوا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم عشاء کیلئے تشریف لائے اور تعزیت کیلئے آنے والی انصاری عورتوں کو حکم دیا کہ وہ واپس چلی جائیں اسی طرح مہاجرین کی عورتوں کو بھی حکم دیا پھر آپ نے ان کے مردوں کو فرمایا:

”انہیں حکم دو کہ اپنے گھروں کو واپس چلی جائیں اور آج کے بعد کسی مرنے والے پر نہ روئیں۔“ اللہ نے یہ مرتبہ سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ کا کہ جن کیلئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے انصاری مہاجرین کی عورتیں رو کر نمگساری کا اظہار کرتی ہیں اور اس کے بعد رونے کی ممانعت کر دی گئی۔

سلام اے سیدنا حمزہ! بے شک آپ عظیم فاتح مجاہد اور عظیم شجاع تھے۔
بے شک آپ اسد اللہ تھے۔

اسد الرسول تھے سید الشہداء تھے اور اسلام کے شہر تھے۔

ایک عظیم مجاہد صحابی

حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ

یہ واقعی ایک عجیب بات تھی کہ وہ عرب جن کا حدود وطن سے باہر کوئی وقار نہ تھا، کس طرح یکا یک اٹھ کر کشور کشائی اور جہانبانی کیلئے یورپ، افریقہ اور ایشیا کی طرف بڑھنے لگے۔ عکاظ کی ریتلی اور پیاسی سرزمین جن کی خونریزیوں کی بدولت بارہا لالہ زار ہو چکی تھی، وہی وحشی اور غیر متمدن عرب ایک ہی مقصد کے حصول کیلئے ایک ہی منزل کی جانب شانہ بشانہ بڑھنے لگے۔ یہ سب اس محمد عربی کا فیض تھا، جس نے حضرت عبداللہ و آمنہ کے گھر جنم لے کر انہیں نئی زندگی کا پیغام دیا تھا۔ وہ اس حقیقت سے واقف تھے کہ ان کی اجتماعی سعی پیہم میں ہی ان کے انفرادی حقوق کا تحفظ ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر حق پرستوں کے گروہ میں وہ شانِ دلربائی نہ ہوتی جو انہیں امی لقب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی سے حاصل ہوئی تھی تو وہ اپنے اس عزم میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے تھے جو انہیں قدرت نے ودیعت کیا تھا۔

صحابہ و تابعین کے عہد ہمایونی میں بے شمار ایسے واقعات ملتے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کا نقطہ نظر بہت بلند تھا۔ ظاہر میں ان کے پاس کچھ بھی نہیں تھا، وہ تعداد میں تھوڑے تھے ساز و سامان کے لحاظ سے کمزور تھے ان کے مقابلہ میں طاغوتی طاقتیں پوری مادیت سے لیس تھیں، مگر اس کے باوجود بھی وہ کثرت پر غالب آگئے اور کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی ان کے پاس سب کچھ تھا۔ وہ صرف ایک ہی مقصد لے کر اٹھے تھے اور وہ تھا اسلام کا فروغ۔ رسول اللہ کے اس فرمان نے کہ ”جنت تلواروں کے سائے میں ہے“۔ ان کو کشاں کشاں نہیں بلکہ شاداں و فرحاں میدان جنگ کی دہکتی ہوئی بھٹی میں دھکیل دیا تھا۔

شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن نہ مال غنیمت نہ کشور کشائی
دو عالم سے رکھتی ہے بریگانہ ان کو عجب چیز ہے لذت آشنائی

مسلمان مجاہدین کی یلغار سے قیصر و کسریٰ کا تکبر خاک میں مل چکا ہے۔ مسلمان گمنامی سے نکل کر شہرت کی بلندیوں سے ہمکنار ہو چکے ہیں۔ اب یہ کمزور نہیں بلکہ ایک طاقت بن چکے ہیں۔ اس وقت مجاہدین کے گھوڑوں کے سموں کی ٹاپ سے طرابلس کے درودیوار گونج رہے ہیں، رومی فوج پے در پے شکستیں کھاتی ہوئی پیچھے ہٹ رہی ہے۔ مسلمانوں کو داؤد شجاعت دیتے ہوئے کئی روز ہو چکے ہیں۔ قریب تھا کہ رومی ہتھیار ڈال دیتے کہ خبر آئی کہ مشہور رومی سالار گریگوری دو لاکھ رومی سپاہیوں کے لشکر جرار کے ساتھ ان کی مدد کیلئے آ رہا ہے۔ اس خبر نے مسلمانوں کے حوصلے پست کر دیئے۔ اب اس عظیم جمعیت کا مقابلہ کرنا جان بوجھ کر خود کو موت کے منہ میں ڈالنے کے مترادف تھا لیکن وہ مسلمان ہی کیا جو باطل سے دب جائے۔ ایک جوشیلے مجاہد نے پکار کر کہا:

”یاد رکھو مسلمانو! اگر تمہارا خیال ہے کہ جس سیلاب سے بھاگ کر تم واپس جا رہے ہو وہ یہیں زک جائے گا تو یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔ رومی ہمیں دباتے ہوئے گھروں میں جا دستک دیں گے اور پھر نہ ہماری جانیں محفوظ ہوں گی اور نہ مال۔ ہماری بہو بیٹیوں کی عصمت ان درندوں کی وحشت و بربریت کی بھینٹ چڑھ جائے گی۔ تخت یا تختہ فتح یا شکست۔ ہم یہیں کٹ مریں گے واپس نہیں جائیں گے۔ متفقہ طور پر سلاح یہ ٹھہری کہ رومی لشکر کا مقابلہ کیا جائے۔“

رومی سردار گریگوری کے ساتھ اس کی نوجوان اور خوبصورت بیٹی بھی تھی جو فنون حرب کی ماہر تھی اور اس جنگ میں محض اپنی شمشیر زنی کے جوہر دکھانے کیلئے باپ کے دوش بدوش لڑنے کیلئے چلی آئی تھی۔ اس کی خوبصورتی اور بہادری کو دیکھتے ہوئے کئی رومی سرداروں نے اس کے ساتھ شادی کیلئے درخواست کی تھی مگر بدطینت اور چالاک باپ اسے بھی داؤ پر لگانا چاہتا تھا۔ چنانچہ اگلے روز جبکہ رومی اور مسلمان افواج ایک دوسری کے ساتھ جھگڑا ہو چکی تھیں تو گریگوری نے اعلان کیا:

”جو شخص مسلمانوں کے امیر عبداللہ بن سعید کا سر کاٹ کر لائے گا اسے نہ صرف اس علاقہ کا حاکم مقرر کیا جائے گا بلکہ میری بیٹی کی شادی بھی اس کے ساتھ کی جائے گی۔“

گریگوری کے اس اعلان نے رومی سرداروں کو ایک دوسرے سے بڑھ کر جانبازیوں دکھلانے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ گریگوری کی حور شمائل اور دلیر صفت بیٹی کو باپ کے دوش بدوش کھڑی ہو کر مسلمانوں پر تیر اندازی کرتے ہوئے دیکھ چکے تھے جب وہ بھڑکیلے لباس میں گھوڑا دوڑاتی ہوئی ایک طرف سے دوسری طرف جاتی تو نوجوانوں کی نگاہیں اس کے گھوڑے پر مرکوز ہو جاتیں اور وہ چند ساعتوں کیلئے میدان کی جنگی فضا کو بھول کر اپنے دل میں خوشگوار دھڑکنیں محسوس کرنے لگتے۔

مسلمانوں کیلئے صورت حال نازک ہو چکی تھی۔ امیر لشکر جناب عبداللہ بن سعید رضی اللہ عنہ پر بڑھ چڑھ کر حملے ہو رہے تھے۔ چنانچہ بجائے اس کے کہ مسلمان دشمن کا مقابلہ کرتے، ان کی طاقت حضرت عبداللہ بن سعید کے بچاؤ میں صرف ہونے لگی۔ وہ اس حقیقت سے باخبر تھے کہ امیر کے بغیر جمعیت نہیں لڑ سکتی۔ اگر حضرت عبداللہ بن سعید شہید ہو گئے تو پھر شکست یقینی ہے۔ چنانچہ انہیں دشمن کا مقابلہ کرنے کی بجائے اپنے امیر کی جان کی فکر لاحق ہو گئی۔

چند مسلمانوں نے حضرت عبداللہ کو مشورہ دیا کہ وہ خیمے میں بیٹھ کر ہدایات دیں تاکہ ان کی بہتر طور پر حفاظت ہو سکے۔ چنانچہ وہ خیمے میں بیٹھ گئے اور خیمے کے گرد دو سو مسلمانوں کا دستہ نگہبانی کیلئے چھوڑ دیا گیا اور باقی مسلمان رومی لشکر کے ساتھ برسر پیکار ہو گئے۔ تین چار روز تک اسلامی فوج کو جناب حضرت عبداللہ بن سعید خیمے سے ہدایات دیتے رہے۔ ایک روز مسلمانوں کے دلوں میں یہ سن کر خوشی کی لہر دوڑ گئی کہ حضرت زبیر بن العوام دار الحکومت سے مکہ لے کر مسلمانوں کی امداد کیلئے آ رہے ہیں مگر یہ کنگ زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی کیونکہ حضرت زبیر جو مکہ لے کر آئے تھے وہ بہت تھوڑی تھی۔ حضرت زبیر نے امیر لشکر سے ملاقات کرنی چاہی تو معلوم ہوا کہ وہ خیمہ میں بٹھا دیئے گئے ہیں کیونکہ ان کے سر کی قیمت مقرر کی جا چکی ہے۔

یہ سن کر حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کا چہرہ غصے سے تھما اٹھا وہ فوراً خیمے میں پہنچے اور جوش سے

کہا:

”عبداللہ! اگر بزدلوں کی طرح خیمے میں ہی بیٹھ رہنا تھا تو میدان جنگ میں آنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟“

حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے کہا ”خدا کی قسم میں بھی سوچ رہا ہوں مگر مصلحت کا تقاضہ بھی تو یہی ہے۔“

”جہنم میں جائے مصلحت“ حضرت زبیر نے غصہ سے کہا۔ آؤ میرے ساتھ“ چنانچہ وہ حضرت عبداللہ بن سعید کو ساتھ لے کر میدان جنگ میں پہنچے اور عین اس جگہ پہنچ کر جہاں لڑائی کا زور سب سے زیادہ تھا بلند آواز سے پکار کر کہا:

”مسلمانو! جو شخص گریگوری کا سر کاٹ کر لائے گا نہ صرف اسے مال و دولت سے نوازا جائے گا بلکہ گریگوری کی بیٹی کی شادی بھی اس کے ساتھ کر دی جائے گی۔“

اس اعلان سے مسلمان مجاہدین کے اندر نیا جوش پیدا ہو چکا تھا۔ بڑھ چڑھ کر حملے ہو رہے

تھے۔ ہر ایک کی کوشش یہی تھی کہ کسی طرح رومی سردار گریگوری تک پہنچ جائے اور اس کا سر کاٹ کر مقررہ انعام حاصل کرے۔ گریگوری کو اب اپنی جان کی فکر ستا رہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ پیچھے ہٹ رہا تھا مگر مسلمان شاہبازوں کے فولادی پنجوں سے بچ کر کہاں جا سکتا تھا۔ اچانک ایک مسلمان نے پکار کر کہا ”میں نے رومی سردار گریگوری کا سر کاٹ لیا ہے رومی جانے نہ پائیں“۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ آواز کس کی تھی کیونکہ ہتھیاروں کے ٹکراؤ، گھوڑوں اور اونٹوں کی ہنہناہٹ اور بلبلاہٹ، نعروں اور طبل ہائے جنگ کا شور اس قدر تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔

جنگ ختم ہو چکی تھی مگر گریگوری کے قتل کے تھوڑے ہی عرصہ بعد رومیوں نے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ گریگوری کی لاش بھی مل گئی تھی مگر اس کا سر غائب تھا۔ اچانک سر امیر لشکر حضرت عبداللہ بن سعید رضی اللہ عنہ کے خیمہ میں مل گیا مگر قاتل ندارد۔ اب سوال یہ پیدا ہو چکا تھا کہ انعام کسے دیا جائے۔ تمام مسلمان خاموش تھے کسی نے بھی بڑھ چڑھ کر دعویٰ نہیں کیا تھا، کوئی بازی جیت چکا تھا، مگر خود کو ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا، کوئی انعام کا مستحق ٹھہرایا جا چکا تھا مگر سامنے نہیں آ رہا تھا۔

اگلے روز مسلمان فتح و نصرت کے شادیاں بجاتے ہوئے مال غنیمت کے ساتھ مدینہ النبی کی جانب روانہ ہو گئے۔ امیر المومنین سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو اس عظیم الشان فتح کی اطلاع مل چکی تھی۔ چنانچہ وہ اس لشکر کے استقبال کیلئے شہر سے باہر تشریف لے آئے تھے۔

سارے لشکر نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ انور پر حاضری دی اور مسجد نبوی میں آ بیٹھے۔ حضرت عبداللہ بن سعید رضی اللہ عنہ نے امیر المومنین کو جنگ کے تمام حالات بتانے شروع کئے اور یہ بھی بتایا کہ اگر حضرت زبیر اس وقت اس بے نظیر حکمت عملی اور سیاست سے کام نہ لیتے تو شکست کا احتمال تھا اور پھر گریگوری کے قاتل کے بارے میں لاعلمی ظاہر کی۔ سارا واقعہ سن کر سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے دل میں شبہ سا ابھرا اور انہوں نے پکارا ”زبیر کہاں ہیں؟“

حاضر ہوں امیر المومنین! حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے پچھلی صف سے جواب دیا۔ وہ تمام سفر میں لشکر کے ایک طرف ہو کر چلتے رہے تھے۔

”قریب تو آؤ“ امیر المومنین کے دل میں شبہ قوی ہو گیا کہ اس عظیم الشان فتح کا اصل محرک اور پچھلی قطاروں میں حضرت زبیر رضی اللہ عنہ سامنے آنے سے ہچکچا رہے تھے۔ جب امیر المومنین نے اصرار کیا تو وہ سامنے آ گئے مگر ان کے سامنے آنے کی دیر تھی کہ گریگوری کی بیٹی غصہ سے ہونٹ چبانے لگی۔

”یہی ہے وہ شخص جس نے میرے باپ کو قتل کیا تھا“ اس نے چلا کر کہا اور پھر رو پڑی۔
”جزاک اللہ“ تمام مسلمانوں کی زبان سے نکلا۔

امیر المومنین نے فرمایا ”اب اعلان کے مطابق یہ انعام تمہیں دیا جائے گا“۔

”نہیں امیر المومنین“ حضرت زبیر نے کہا۔ اعلان کرتے وقت میرے دل میں یہ خیال تک
بھی نہیں تھا کہ میں گریگوری کا سر کاٹ سکوں گا بلکہ میں تو گریگوری کا داؤ اسی پر آزمانا چاہتا تھا اور
میں اس میں کامیاب ہو گیا۔

مسلمانوں نے اس اعلان کے بعد جس جوش و خروش سے لڑائی لڑی اس سے ظاہر ہوتا ہے
کہ میرا یہ وار رومیوں کیلئے بہت ہی مہلک پڑا تھا۔ میرا یہ جہاد فی سبیل اللہ تھا، میں نے اس لڑکی کی
خاطر گریگوری کو قتل نہیں کیا تھا بلکہ میرا یہ فعل خالص اسلام کیلئے تھا اور یہ فتح میری نہیں بلکہ ان
ہزاروں شہیدوں کی مرہون منت ہے جنہوں نے اپنی جان کی قربانی دے کر اپنے خون اور ہڈیوں
سے طرابلس میں اسلامی شوکت کی بنیاد رکھی۔“

امیر المومنین کھڑے ہو گئے اور انہوں نے کہا:

”زبیر تمہاری قدر و منزلت ہمارے دلوں میں کم نہیں ہو سکتی تم اسلام کے ایک بہادر اور نڈر
سپاہی ہو مجھے تم پر فخر ہے اور میں تمہارے جذبات کی قدر کرتا ہوں۔“

میری دعا ہے کہ خدائے تعالیٰ تمہیں اسلام کی خدمت کرنے کی توفیق دے مگر تمہیں اس
لڑکی کے ساتھ شادی ضرور کرنا پڑے گی، یہ تمام مسلمانوں کا متفقہ فیصلہ ہے۔

جیسی امیر المومنین کی مرضی، حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے سر جھکا لیا۔
اور رضا اللہ اکبر کے نعروں اور مبارک باد کی صداؤں سے گونج اٹھی۔



حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ

سیدی سلمان فارس عاشق خیر الوری
مظہر عشق و ارادت پیکر دین ہدی
ملک فارس سے چلے آئے مدینہ پاک تک
ہر طرف آیا نظر لطف حبیب کبریا
آپ نے فرمایا ”ہے سلمان اہل بیت کا“
اللہ اللہ بحر الطاف نبی بہتا ہوا
زندگی تھی آپ کی سلطان بطحا کی طرح
ان سے تھی ہر پل ہویدا شوکت فقر و غنا
تھے یہ محبوب صحابہ عاشق سلطان دین
سرور کونین سے پائی جزائے بے بہا
سرور دارین کے الطاف عالی دیکھ کر
رشتک سے سارا زمانہ ہر گھڑی ہے جھومتا
زندگی تھی آپ کی ہر پل عبارت فقر سے
ان کے اسوہ سے ہویدا عظمت صدق و صفا
اے رضا میری دعا ہے خالق کونین سے
حضرت سلمان سا کردار ہو سب کو عطا

(محمد اکرم رضا)

Click For More Books

<https://archive.org/details/@zohaibhasanattari>

عاشق خیر الوری

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نہایت محبوب صحابی تھے بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تو انہوں نے تو ان کا شمار اہل بیت میں کر لیا تھا۔ یہ وہ اعزاز تھا کہ خاندان رسول سے باہر کسی اور کو نصیب نہیں ہوا۔ آپ کے اندر اپنے آبائی مذہب (آتش پرستی) کے خلاف بغاوت کا جذبہ پیدا ہو گیا کہ یہ وہ آگ ہے جو ہمارے چلائے جانے کی محتاج ہے۔ ہماری خالق یا ہماری قسمتوں کی مالک کس طرح ہو سکتی ہے؟ آپ اصفیان (فارس) ایک نواحی قریہ ”جی“ کے سردار کے بیٹے تھے۔ باپ کا نام لوزخشان بن مورسلان آب الکی تھا جو دربار ایران میں خاص مقام رکھتا تھا اور اپنے علاقہ کا بڑا جاگیر دار ہونے کے علاوہ ایک بہت بڑے آتش کدے کا منتظم بھی تھا۔ آپ کا اصل نام ”مایہ“ تھا۔ آپ کا باپ آپ سے بڑا پیار کرتا تھا اور آپ بھی لڑکپن میں کینے کودنے کے بجائے آتش کدے کو بھڑکائے رکھنے کو ترجیح دیتے تھے۔

آتش کدہ بھڑکاتے بھڑکاتے دل میں تلاش حق کی شمع ہو گئی۔ دل و جان تڑپنے لگے کہ میں حقیقت تک کس طرح پہنچ سکوں گا۔ اس تلاش حق کے جذبے نے آپ کو بے پناہ تکالیف و مصائب سے گزارا۔ کئی بار تلاش حق کی جستجو کرتے کرتے دشمنوں کے زرخے میں گھر گئے۔ کئی بار غلام بنائے گئے اور غلام بنانے والوں نے آپ کو کئی بار دوسروں کے ہاتھ بیچ دیا۔ وہ ان سے بے پناہ مشقت لیتے، کھانے کو بہت کم دیتے، کئی کئی روز فاقے سے گزر جاتے مگر آپ شکایت کا ایک جملہ بھی زبان پر نہ لاتے بلکہ منتظر رہتے کہ کہیں سے کوئی خبر مل جائے تو انہیں مقصود حقیقی تک لے جاتے۔ جہاں تک جفا میں سہنے کا معاملہ تھا تو آپ سچے طالب صداقت تھے اور جانتے تھے کہ راہ حق کے متوالوں میں جفاؤں کا منڈلانا ایک معمول کا عمل ہے کیونکہ:

جفا جو عشق میں ہوتی ہے وہ جفا ہی نہیں ستم نہ ہو تو محبت میں کچھ مزا ہی نہیں
اب ہم ایک نظر دیکھتے ہیں کہ آپ میں تلاش حق کا جذبہ کس طرح بیدار ہوا۔

Click For More Books

<https://archive.org/details/@zohaibhasanattari>

حضرت سلمان کے والدان کے ساتھ بڑی محبت کرتے تھے۔ یہاں تک کہ ان کو لڑکیوں کی طرح گھر سے باہر نہ جانے دیتے تھے۔ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ فطرۃ مذہبی جوش و ولولہ لے کر آئے تھے۔ اس لئے آتش کدہ کی خدمت میں اس انہماک سے کرتے تھے کہ آگ برابر روشن رہتی تھی۔

ایک مرتبہ والد نے کہا کہ میں اپنی جائیداد کی دیکھ بھال کیلئے خود جا نہیں سکتا تم ہو آؤ۔ سلمان راضی ہو گئے راستہ میں ایک گرجا ملا جس میں اُس وقت نماز ہو رہی تھی سلمان کے دل پر اس کا بڑا اثر ہوا۔ گھر آئے تو والد کو اس کی خبر ہوئی وہ بہت برہم ہوئے اور اُن کو گھر میں مقید کر دیا۔ انہوں نے عیسائیوں سے کہلا بھیجا کہ کوئی قافلہ شام جائے تو مجھ کو اُس کی خبر کرنا، چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ سلمان موقع پا کر اس قافلہ کے ساتھ شام کی طرف چل دیئے۔ جہاں پہنچ کر انہوں نے معلوم کیا کہ عیسائیوں کا یہاں سے سب سے بڑا پیشوا کون ہے؟ لوگوں نے کہا: بشپ، سلمان اس بشپ کے پاس گئے اور اُس کے کردار کا مطالعہ کرنے لگے۔ یہ شخص انتہا درجہ کا ذلیل فطرت اور بد عمل تھا۔ سلمان اس کی بد علمی کو دیکھ کر دل ہی دل میں کڑھتے تھے مگر کہہ نہیں سکتے تھے۔ آخر کار وہ مر گیا اور اُس کا قائم مقام جو دوسرا بشپ ہوا وہ بڑا عابد و زاہد اور تارک الدنیا تھا۔ سلمان اُس سے بہت مانوس تھے جب یہ مرنے لگا تو سلمان نے پوچھا ”اب میں کس کے پاس جاؤں“۔ اُس نے موصل کے کسی شخص کے پاس جانے کی ہدایت کی۔ سلمان یہاں آئے دیکھا کہ واقعی یہ شخص بڑا عابد و زاہد اور متقی و پرہیزگار ہے مگر چند روز کے بعد جب اس کا بھی انتقال ہونے لگا تو اُس نے سلمان کو وصیت کی کہ تمام نصیبین کے فلاں شخص کے پاس چلے جائیں۔

بشپ کی وصیت کے مطابق سلمان نے نصیبین آ کر دیکھا کہ واقعی یہ شخص بھی پہلے دو بشپوں کی طرح عابد و زاہد ہے اتفاق کی بات چند روز کے بعد اُس کا بھی انتقال ہو گیا اور اُس کی وصیت کے مطابق حضرت سلمان عموریہ آئے۔ یہاں انہوں نے کچھ بکریاں خرید لیں اور اُن سے معاش کا انتقام کرنے لگے۔ آخر کار وقت آیا کہ اس اسقف کا ساغر حیات بھی تھلکنے لگا۔ سلمان نے اُس سے کہا کہ اب میں کہاں جاؤں؟ بشپ بولا! اب میری نظر میں کوئی بشپ ایسا نہیں ہے جس کے پاس جانے کی میں تم کو ہدایت کروں۔ البتہ ہاں اُس نبی کے ظہور کا انتظار کرو جو ریگستان عرب سے اُٹھ کر دین براہمی کو زندہ کرے گا۔ اس کی علامات یہ ہیں کہ وہ ہدیہ قبول کرے گا لیکن صدقہ کو اپنے لئے حرام سمجھے گا اس کے دونوں شانوں کے درمیان مہر نبوت ہوگی اگر تم اس سے مل سکو و ضرور ملنا۔ اس بشپ کے انتقال کے بعد کچھ دنوں تک حضرت سلمان عموریہ میں مقیم رہے کہ اتنے میں

بنو کلب کا ایک قافلہ ان کے پاس سے گزرا۔ سلمان نے ان لوگوں سے کہا ”میں تم کو اپنی بکریاں اور گائیں دے دوں گا تم مجھ کو اپنے شہر میں لے چلو“۔ قافلہ راضی ہو گیا اور حضرت سلمان رضی اللہ عنہ ان کے ساتھ چلے آئے مگر بعد میں ان لوگوں نے غلامی کی۔ وادی القریٰ پہنچ کر انہوں نے حضرت سلمان رضی اللہ عنہ کو غلام بنا کر ایسی یہودی کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ انہوں نے یہاں کھجوریں دیکھیں تو سمجھے میرا مقصود یہیں ملے گا۔ اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ میں قیام پذیر تھے۔ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ اپنے آقاؤں کی شدید سختیوں کی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر نہیں ہو سکے پھر جب آپ ہجرت کر کے مدینہ منورہ میں تشریف رکھتے تھے اسی دوران میں بنو قریظہ کے ایک شخص نے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کو خرید لیا اور اپنے ہمراہ ان کو لے کر مدینہ چلا آیا۔

قیام مدینہ کے زمانہ میں حضرت سلمان فرماتے ہیں کہ میں اپنے آقا کے باغ میں ایک درخت پر کام کر رہا تھا اتنے میں اُس کا ایک چچازاد بھاء آیا اور کہنے لگا خدا بنی قبیلہ (انصار) کو غارت کرے۔ میں اُن کے پاس سے ابھی گزرا تو دیکھا کہ ایک شخص جو اپنے تئیں نبوت کا دعویٰ کرتا ہے اور جو مکہ سے آیا ہے یہ سب لوگ اُس کے ارد گرد جمع ہیں۔ میں یہ سنتے ہی اس درجہ اثر پذیر ہوا کہ ایک بے ہوشی کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔

قریب تھا کہ درخت سے گر پڑوں بڑی عجلت کے ساتھ اپنے آقا کے پاس آیا اور پوچھا کہ کیا معاملہ ہے؟ اُس نے میرے طمانچہ مارا اور کہنے لگا ”جا اپنا کام کر تجھ کو ان باتوں سے کیا غرض؟“ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ اُس وقت تو خاموش ہو گئے۔ رات ہوئی تو کوئی چیز لے کر قباء میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ میرے پاس یہ یز جمع ہو گئی تھی اب میں اس کو آپ کے پاس یہ طور صدقہ لے کر آیا ہوں کیونکہ مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ آپ ایک صالح بزرگ ہیں اور آپ کے ساتھ حاجت مند لوگ ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس کو دیکھ کر اپنا دست مبارک روک لیا اور اپنے ساتھیوں سے فرمایا ”کھاؤ“ چنانچہ وہ سب کھانے میں مشغول ہو گئے اور سلمان واپس چلے آئے۔ پھر ایک مرتبہ اور آپ کی خدمت میں حسب سابق کوئی چیز لے کر حاضر ہوئے اور عرض کیا ”یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے ہدیہ ہے صدقہ نہیں“ آپ نے دست مبارک بڑھایا اور اُس میں سے خود بھی کھایا اور دوستوں کو بھی کھلایا۔ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے یہ دیکھ کر کہا یہ دو علامتیں تو صحیح نکلیں اب ایک خاتم نبوت کی علامت اور رہ گئی ہے۔ اُس کا بھی امتحان کر لینا چاہیے۔ چنانچہ ایک اور دن حضرت سلمان رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت

میں حاضر ہوئے۔ آپ اس وقت ایک جنازہ کے ساتھ بقیع الغرقہ جا رہے تھے۔

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ خاتم نبوت دیکھنے کی غرض سے پیچھے ہو گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا منشا معلوم کر لیا اور اپنے دوش مقدس سے چادر سرکا دی۔ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے خاتم نبوت دیکھی تو فوراً بڑھ کر بوسہ دیا اور رونے لگے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اپنے ساتھ بٹھا لیا۔ اب حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے آپ کو اپنا پورا واقعہ سنایا، جس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑی دلچسپی لی اور یہ خواہش ظاہر کی کہ آپ کے اصحاب بھی اس کو سنیں۔ اس وقت حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ اُس دولت لازوال کے مالک تھے جس کی تلاش و جستجو میں وہ اب تک سرگرداں پھرتے رہے تھے لیکن غلامی کے باعث وہ آزادی کے ساتھ تمام اسلامی فرائض انجام دے سکتے چنانچہ آپ بدر واحد کے معرکوں میں شرکت نہیں فرما سکے

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سلمان رضی اللہ عنہ کی اس مجبوری و بے بسی کو محسوس کرتے تھے۔ آپ نے اُن سے فرمایا ”تم اپنے آقا سے مکاتبہ کو لو“۔ یعنی کوئی معاوضہ دے کر آزادی حاصل کرو۔ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے آقا سے اس کی خواہش ظاہر کی۔ معاملہ تین سو کھجور کے درخت لگانے اور چالیس اوقیہ سونے کے ادا کرنے پر طے ہو گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو حکم فرمایا کہ کھجور کے درخت لگانے میں سلمان کی مدد کریں۔ سب نے حسب مقدرت ان کی امداد کی، جس میں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی شریک ہوئے۔ رہا سونا، اُس کی صورت یہ ہوئی کہ ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے، ایک شخص انڈے کے برابر سونا لئے ہوئے حاضر خدمت ہوا، تو نے پر معلوم ہوا کہ ٹھیک چالیس اوقیہ تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بلا کر حضرت سلمان رضی اللہ عنہ کو دلوادیا جس کو ادا کر کے وہ نعمت آادی سے بہرہ اندوز ہو گئے۔

آزادی کے بعد عرب کے قاعدہ کے مطابق ضروری تھا کہ کسی کے حلیف ہو کر رہیں۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سلمان رضی اللہ عنہ کی مواخات حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے کرادی۔

آزادی کے بعد سب سے پہلا معرکہ خندق کا پیش آیا۔ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے اس میں بڑے جوش و خروش اور شوق و ذوق کے ساتھ شرکت فرمائی۔ بلکہ حق یہ ہے کہ اس معرکہ کی کامیابی ظاہری اسباب کے پیش نظر بڑی حد تک حضرت سلمان رضی اللہ عنہ کی تجربہ کاری، دانائی اور فراست کے ہی باعث تھی۔ اس غزوہ میں عرب کے مختلف قبائل ایک زبردست جمعیت کی صورت

میں مسلمانوں کے خلاف اُمنڈ آئے تھے، حملہ مدینہ پر تھا جس کے ارد گرد نہ قلعہ تھا اور نہ فصیل تھی۔ اُدھر دشمنوں کی جمعیت کثیر اور مسلمانوں کی تعداد قلیل تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مشورہ کیا، حضرت سلمان رضی اللہ عنہ ایران کی معرکہ آرائیاں دیکھے ہوئے تھے، جنگ نہ کرنی چاہئے بلکہ مناسب یہ ہوگا کہ چاروں طرف خندقیں کھود کر شہر کو محفوظ کر دیا جائے۔ اس تجویز کو پسند کیا گیا، خندق کھودی گئی تو اُس کی کھدائی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود بہ نفس نفیس شریک تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار و مہاجرین کی یہ محنت و مشقت دیکھی تو بے ساختہ زبان مبارک سے نکلا ”اے اللہ زندگی تو دراصل آخرت ہی کی زندگی ہے پس تو انصار و مہاجرین کو بخش دے۔ فدا کاران رسالت پناہ کے نبوت کی لسان صدق و محبت کو یوں نوا پیرا دیکھا تو جوش اشاعت میں بول اُٹھے۔

نحن الدين بايعو محمدا على الجهاد ما بقينا ابدًا

”ہم ہی ہیں وہ جنہوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے جہاد پرست کی ہے جب تک ہم زندہ رہیں گے۔“

یہ واقعہ ۸ ذوالقعدہ ۵ھ کا ہے۔ حضور پر نور نے خود حدود قائم کیں۔ داغ بیل ڈال کر دس دس زمین دس دس آدمیوں پر تقسیم کر دی۔ انصار و مہاجرین میں اختلاف ہوا کہ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ کدھر رہیں گے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”سلمان تو ہمارے اہل بیت میں سے ہے“

حافظ ابن حجر کی روایت کے مطابق دشمنان اسلام جو بیس ہزار کی فوج گماں لئے ہوئے مدینہ پر حملہ آور ہونا چاہتے تھے۔ یہاں آ کر دیکھا خندق کھدی ہوئی ہے اور اندر پہنچنا سخت دشوار ہے۔ وہ

ان طریقہ جنگ سے پہلے سے بے خبر تھے وہیں محاصرہ کر کے پڑ گئے۔ تقریباً ایک ماہ تک مسلسل

محاصرہ قائم رہا مگر شہر تک پہنچنا اُن کو نصیب نہ ہوا۔ مشرکین میں سے عمرو بن عبدود ایک مشہور بہادر

فوجی تھا۔ وہ ہمت کر کے آگے بڑھا اور خندق عبور کر گیا۔ اب اس نے عرب کے دستور کے مطابق

الکا کر کہا ”کون ہے جو میرے مقابل آئے؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا ”میں“ آنحضرت صلی

اللہ علیہ وسلم نے آپ کو خود دست مبارک سے تلوار عنایت کی اور عمامہ باندھا، کچھ گفتگو کے بعد

دروازے میں جنگ ہوئی۔ عمرو بن عبدود کے پہلے وار کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس زور سے

سلاہ کیا کہ اُن کی تلوار حریف مقابل کا شانہ کاٹ کر نیچے اتر آئی۔ ساتھ ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ

نے اللہ اکبر کا نعرہ مارا اور فتح کا اعلان ہو گیا۔ اس فتح میں بڑا دخل خندق کو تھا، جس کا مشورہ حضرت

سلمان رضی اللہ عنہ نے ہی دیا تھا۔ اس لئے اس غزوہ کی کامیابی کو حضرت سلمان رضی اللہ عنہ کے

حصہ اہل میں نمایاں مقام حاصل ہے۔

خندق کے بعد کوئی غزوہ ایسا نہیں ہوا جس میں حضرت سلمانؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک نہ ہوئے ہوں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد عہد فاروق رضی اللہ عنہ کی ایرانی جنگوں میں بھی آپ شریک ہوئے اور چونکہ یہ خود ایرانی الاصل تھے اور جنگ کے طریقوں سے پوری طرح باخبر اسلئے آپ سے اسلامی لشکر کو بڑی مدد ملی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں مدائن کے گورنر تھے۔ اس کے باوجود درویشی و فقر کا یہ عالم تھا کہ ان کے پاس صرف ایک عبا تھی جس میں لکڑیاں جمع کرتے تھے اور اُس کا آدھا حصہ اوڑھتے اور آدھا بچاتے تھے۔

زہد و اتقا کی شان یہ تھی کہ عمر بھر کبھی کوئی گھر نہیں بنایا ایک مرتبہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے حضرت سلمان رضی اللہ عنہ سے کہا: ہم چاہتے ہیں کہ آپ کیلئے ایک مکان بنا دیں حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا ”کیوں! کیا تم میرے لئے ایسا مکان بنانا چاہتے ہو جیسا کہ تمہارا مسلمان مدائن میں ہے“۔ حضرت حذیفہ نے کہا: نہیں ہم آپ کیلئے بانس کا مکان بنائیں گے جس کی چھت گھانس اور پھونس کی ہوگی اور جو اس قدر مختصر ہوگا کہ آپ کھڑے ہوں گے تو اس کی چھت آپ کے سر کو لگے گی اور آپ لیٹیں گے تو اُس کی دیواریں آپ کے دونوں سپونوں کو لگیں گی۔ حضرت سلمان بولے ”تم نے میرے دل کی بات پالی“۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوالدرداء اور حضرت سلمان دونوں میں مواخات کرا دی تھی۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے بعد سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے عرصہ تک مدینہ میں قیام کیا۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے عہد میں انہوں نے عراق کی سکونت اختیار کر لی۔ ایران پر لشکر کشی کے وقت وہ بھی مجاہدین اسلام میں شریک ہو گئے۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ روم شناس آدمی تھے۔ انہوں نے سلمان فارسی کو مدائن کی گورنری پر مقرر فرمایا اور تقریباً چار یا پانچ ہزار درہم ان کی تنخواہ مقرر کی مگر آپ کی گورنری کی شان بھی صبا تھی۔ جو تنخواہ ملتی اسے مساکین میں تقسیم کر دیتے اور خود چٹائی بن کر روٹی کھاتے۔ چٹائی کی آمدنی کا ایک تہائی خیرات کر دیتے۔ خطبہ دیتے تو ایک معمولی عسا پہن کر کہیں جاتے تو ایک بغیر زین کے معمولی سے گدھے پر سوار ہو کر۔ لوگ ان کو دیکھ کر ہنستے اور مذاق اڑاتے۔ آپ نے ایک تنگ اور چھوٹی سی قمیص اور تہذیب تن کر رکھا ہوتا۔

آپ لوگوں کے ہنسنے پر فرماتے:

”خیر و شر کا اندازہ تو اس زندگی کے بعد ہوگا‘ آج جتنا چاہے ہنس لو“۔

آپ کے پاس اونٹ کے بالوں کا ایک بوسیدہ کمبل تھا۔ دن کے وقت اسے اپنے بدن پر ڈال لیتے اور رات کو سوتے وقت اوڑھ لیتے۔ ایک دن مدائن کے بازار میں جا رہے تھے۔ ایک ناواقف شخص نے انہیں مزدور سمجھ کر اپنا سامان اٹھانے کیلئے کہا۔

حضرت سلمان رضی اللہ عنہ سامان اٹھا کر اس کے پیچھے پیچھے چل دیئے۔ راستے میں لوگوں نے دیکھ کر تعجب سے کہا ”اے صاحب رسول! اے امیر۔ آپ نے یہ بوجھ کیاں اٹھا رکھا ہے۔ لائیے ہم اسے پہنچا دیں۔ سامان کا مالک مہکا بکا رہیا۔ نہایت شرمندہ ہو کر حضرت سلمان رضی اللہ عنہ سے معافی مانگی اور ان کے سر سے سامان اتروانا چاہا۔ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا ”بھائی تو نے یہ سامان اٹھوا کر اپنے مکان تک لے جانے کو کہا تھا۔ اب تو میں اسے منزل مقصود تک پہنچا کر رہی رہوں گا“۔

حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے تو عرس میں قیام کر لیا جبکہ ان کے مواخاتی بھائی ابوالدرداء رضی اللہ عنہ شام چلے گئے تھے۔ شام سے حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ نے اپنے بھائی کو لکھا:

”میں یہاں بہت خوش ہوں اللہ تعالیٰ نے مجھ کو مال و اولاد دونوں کی نعمت وافر عطا فرمائی ہے اور میں یہاں ارض مقدس میں ہوں“۔

آپ نے اس کا جواب لکھا ’سنو مال و اولاد کی کثرت یا ارض مقدس میں ہونا خیر نہیں ہے بلکہ خیر یہ ہے کہ تم کوئی ایسا عمل کرو جو تمہارے لئے مفید ہو اور تم اپنے تئیں مرد لوگوں سے سمجھو“۔

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑا تقرب حاصل تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں ”سلمان رات کو دیر تک آپ کی خدمت میں رہتے تھے یہاں تک کہ ہم کو یہ ڈر ہو گیا کہ کہیں آپ ہم سے غافل نہ ہو جائیں“۔ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”جنت تین شخصوں کی مشتاق ہے، علی، عمار اور سلمان، حضرت علی سے کسی نے حضرت سلمان کے علم کے متعلق پوچھا۔ آپ نے فرمایا انہیں اول و آخر کا علم دیا گیا ہے اور وہ ایک ایسے سمندر ہیں جو کبھی خشک نہیں ہوتا“

ایک دفعہ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے اپنے اسلامی بھائی ابودرداء کی بیوی کو آشفته حال دیکھا۔ پوچھا تم نے یہ کیا صورت بنا رکھی ہے؟ وہ کہنے لگی ”میں کس کیلئے بناؤ سنگھار کروں تمہارے

بھائی تو بالکل ہی تارک دنیا ہو گئے ہیں۔ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ مکان پر تشریف لائے تو حضرت سلمان کیلئے کھانا منگوا یا مگر خود معذرت کی کہ میں روزہ سے ہوں۔ حضرت سلمان بولے ”تو میں بھی کھانا نہ کھاؤں گا“ رات کو آپ نے وہیں قیام فرمایا، شب کے آخر میں حضرت ابودرداء عبادت کیلئے اٹھے تو آپ نے ان کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا ”تم پر تمہارے رب تمہاری آنکھ اور تمہاری بیوی کا سب کا حق ہے، روزوں کے ساتھ افطار اور شب بیداری کے ساتھ سونا بھی ضروری ہے۔“ اگلے دن صبح کو دونوں نے یہ معاملہ بارگاہ رسالت پناہ میں پیش کیا۔ آپ نے ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے مخاطب ہو کر فرمایا ”سلمان تم سے زیادہ مذہب سے واقف ہیں۔“

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ساتھ تقرب خاص رکھنے کی وجہ سے صحابہ کرام بھی آپ کا بڑا احترام کرتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ حضرت عمر کے پاس آئے۔ آپ اس وقت تکیہ لگائے بیٹھے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آپ کو دیکھتے ہی تکیہ آپ کیلئے ڈال دیا۔ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا ”میں ایک مرتبہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، اُس وقت آپ ایک تکیہ سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ آپ نے اُس کو میرے سامنے ڈال دیا۔ پھر فرمایا اے سلمان جو کوئی مسلمان اپنے مسلمان بھائی کے پاس جائے اور وہ اُس کیلئے ازراہ تعلیم و تکریم اپنا تکیہ پیش کر دے تو خدا اُس کی مغفرت کر دے گا۔“

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ خود بہت بڑے عالم اور صاحب کمال بزرگ تھے۔ انہوں نے ایک مرتبہ اپنے شاگرد سے کہا کہ چار آدمیوں سے علم حاصل کرنا، ان میں سے ایک حضرت سلمان رضی اللہ عنہ کا بھی نام تھا۔ ایک موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”سلمان خیر سے پر ہے۔“ آپ نے اس کو ”سلمان الجبر“ کا لقب بھی عطا فرمایا۔ آپ کی عمر مبارک متعلق مختلف روایات ہیں۔ صاحب اصحابہ نے لکھا ہے کہ اس تو کسی کو شک ہی نہیں کہ حضرت سلمان کی عمر اڑھائی سو برس کی تھی۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ آپ نے اسی برس کی عمر پائی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں علیل ہوئے۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ آپ کی عیادت کو آئے تو آپ رونے لگے۔ انہوں نے رونے کا سبب پوچھا اور کہا کہ آپ روتے کیوں ہیں؟ موت قریب آرہی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم آپ سے بے پناہ خوش ہو کر دنیا سے گئے تھے۔ اب آپ وہاں ان سے جا ملیں گے۔ بولے خدا کی قسم میں موت سے نہیں گھبراتا، اور نہ دنیا کی حرص میری دامنگیر ہے۔ رونا یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ ہمارا سامان ایک مسافر کے سامانِ رحلت سے زیادہ نہ ہو، میرے پاس یہاں

اس قدر سانپ بچھو جے ہیں۔

حضرت سعد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ کل سامان جسے سانپ بچھو سے تعبیر کیا گیا تھا یہ تھا ایک بڑا پیالہ ایک لگن اور ایک تسلہ۔

اس کے بعد حضرت سعد نے کہا کہ مجھ کو کوئی نصیحت کیجئے۔ فرمایا جب کسی کام کا قصہ کرو فیصلہ کرو یا تقسیم کرو تو خدا کو یاد رکھو۔

ایک دفعہ ایک شخص نے حضرت سلمان رضی اللہ عنہ سے کہا ”آپ بے گھر اور بے در ہیں۔ میں آپ کیلئے ایک مکان بنانا چاہتا ہوں۔ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے انکار کیا لیکن وہ شخص پیہم انکار کرتا رہا۔ آخر حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا ”بھائی گھر میرے لئے مکان بنانا اتنا ہی ضروری ہے تو اس طرح بناؤ کہ اگر لیٹوں تو پیر دیواروں سے لگیں اور اگر کھڑا ہوں تو سر چھت سے مل جائے۔“ اس شخص نے ان کی خواہش کے مطابق مختصر سی جھونپڑی بنا دی۔

حافظ عبدالبر رضی اللہ عنہ نے ”استیعاب“ میں یہ روایت درج کی ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”اللہ تعالیٰ نے مجھے چار آدمیوں سے محبت رکھنے کا حکم دیا ہے اور مجھے خبر دی ہے کہ اللہ بھی ان سے محبت رکھتا ہے۔ پوچھا گیا وہ کون ہیں؟ فرمایا ”علی، مقداد، سلمان ابوذر“ (رضی اللہ عنہم) متدرک حاکم میں درج ہے خود حضرت سلمان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس وقت آپ ایک تکیہ سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو میرے سامنے ڈال دیا اور فرمایا ”اے سلمان اگر کوئی مسلمان اپنے مسلمان بھائی سے ملنے جائے اور وہ ازراہ تعظیم اس کیلئے اپنا تکیہ پیش کر دے تو خدا اس کی مغفرت فرمائے گا۔“

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے پاس گئے تو انہوں نے بھی ازراہ تکریم اپنا تکیہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کو پیش کر دیا۔ حضرت سلمان نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو دعا دی اور وہ واقعہ بیان کیا جس میں حضرت نے انہیں اپنا تکیہ مرحمت فرمایا تھا۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مشققت بے بایاں کی بدولت اہل بیت سے نسبت ہو گئی تھی۔ اس لئے وہ صدقہ سے سخت پرہیز کرتے تھے۔ اگر کسی چیز میں صدقہ کا ذرہ بھر بھی احتمال ہوتا تو اس سے بھی بچتے تھے۔ خوف آخرت کا یہ عالم تھا کہ خود بھی اس سے لرزہ بر اندام رہتے تھے اور لوگوں کو بھی اس کی یاد دلاتے رہتے تھے۔ فرماتے تھے مجھے تین آدمیوں پر بڑا تعجب ہوتا

ہے۔ ایک وہ جو ہر وقت دنیا کی طلب میں ہے۔ دوسرا وہ جو موت کو بھلا بیٹھا ہے مگر موت اس سے غافل نہیں ہے۔ تیسرا وہ جو قہقہہ مار کر ہنستا ہے حالانکہ اسے یہ علم نہیں کہ اللہ اس سے راضی ہے یا ناراض۔ ایک دفعہ اکابر قریش کی جگہ پر جمع تھے اور اپنے اپنے فضائل و محامد بیان کر رہے تھے۔ حضرت سلمان بھی وہاں موجود تھے۔ ان سے کہا گیا کہ وہ بھی اپنے بارے میں کچھ بیان کریں۔ انہوں نے فرمایا:

”بھائیو! میں کس بات پر فخر کروں میرا آغاز ایک مخمس پاتی ہے اور انجام یہ ہوگا کہ ایک دن یہ جسم بدبودار لاش کی شکل میں اختیار کرے گا۔ پھر آخرت میں زندگی کے سارے اعمال تولے جائیں گے اگر نیکیوں کا پلڑا جھک گیا تو اللہ نے سرخرو کیا اور اگر بدیوں کا پلڑا بھاری ہوا تو پھر دائمی ذلت اور عذاب ہے۔“

یہ تھے حضرت سیدنا سلمان فارسی رضی اللہ عنہ جنہوں نے اُسوہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی درجہ خوش چینی کی کی کہ اس کی تصویر بن گئے۔ فقر و فاقہ ان کی زندگی تھی، مال و دولت سے نفرت ان کا شعار تھا۔ گورنر ہو کر بھی کبھی محل تو دور ہے عام سے کچے مکان کے بارے میں بھی نہ سوچا اور ایک تنگ سی کوٹھڑی میں زندگی بسر کرتے رہے۔ کپڑوں پر کئی کئی پیوند ہوتے۔ دوسروں کا بوجھ اٹھاتے۔ بیواؤں کے گھروں میں جھاڑو پھرتے۔ ان کیلئے کنوؤں سے پانی لا کر دیتے۔ زمانہ ان پر ہنستا مگر یہ ہر حالت میں خدا کی رضا میں راضی رہتے اور خدا اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو راضی کرنے کی کوشش کرتے اور زمانے نے یہ دیکھا آپ اس میں کامیاب ہی رہے۔ اللہ اگر ملک فارس کا تلاش حق کا متلاشی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں پہنچا تو ان کی نگاہِ کرم کے سبب سے ان کا صحابہ کرام کی آنکھوں کا ستارا بن گیا۔

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے ۳۵ھ میں لعہید خلافت امیر المومنین حضرت عثمان ذوالنورین وفات پائی۔ جیسا کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے حوالے سے آپ کے مرض الموت کا ذکر پہلے بھی ہو چکا ہے کہ گھر میں فقط ایک بڑا پیالہ ایک لوٹا ایک بوسیدہ کبیل اور تسلیہ سامان زندگی ہے۔ تکیہ کی جگہ سر کے نیچے دو اینٹیں رکھی ہیں اور عبادت کیلئے آنے والوں کو نصیحت فرما رہے ہیں کہ ہر حال میں خدا کو یاد رکھو اور کوشش کرو کہ حج یا جہاد کرتے ہوئے یا قرآن پڑھتے ہوئے اپنی جان خدا کے سپرد کرو اور امانت میں خیانت نہ ہونے پائے۔

اللہ اللہ کس قدر اعلیٰ تھے اصحاب رسول شوکت ایمان میں بالا تھے اصحاب رسول



حضرت ابوذر غفاری رحمۃ اللہ علیہ

اصول ملت اسلام توڑا جا نہیں سکتا
کوئی رشتہ عدوئے حق سے جوڑا جا نہیں سکتا
مظاہر تھے یہ سب اسلام کی شان جلالی کے
دلوں نے توڑا ڈالے پیکر اصنام خیالی کے
جنہیں خوشنودی ذات خدا مطلوب ہوتی ہے
لحاظ خوں سے ان کی طبع کب مغلوب ہوتی ہے
جہاں میں دشمن حق عام انسانوں کا دشمن ہے
جو انسانوں کا دشمن ہے مسلمانوں کا دشمن ہے
خدا ہی کیلئے جنگ اور صلح و آشتی کرنا
خدا کی راہ میں جینا خدا کی راہ میں مرنا
بشر جب رشتہ دل کو خدا سے جوڑ لیتے ہیں
تو اپنے دل جہاں ماسوا سے توڑ لیتے ہیں
نہ پاس خاندان ان کو نہ عزو جاہ کی خاطر
قربت دوستی سب کچھ فقط اللہ کی خاطر

(حفیظ جالندھری)

رمز شناس رسول

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ

یہ فقط رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اعجاز تھا کہ فسق و فجور، ظلم و ستم، جور و جفا اور ظلمت و جہالت میں گم انسان بزم عالم کے رہبر بن گئے۔ جن کو کل تک کوئی تو چھتا نہ تھا، وہی زمانے بھر کے مقدر کے مالک بن گئے جو زمانے کی ٹھوکروں پر تھے وہ بزم کونین کے آقا بن گئے۔ لات و ہبل اور عزئی و منات کو پوجنے والے ایک اُن دیکھے خدا کے ماننے والے بن گئے۔ ذرا ذرا سی بات پر خون کی ندیاں بہانے والے امن عالم کے علمبردار بن گئے۔ شراب اور رقص و سرود سے پیار کرنے والے اخلاص و وفا کے پیکر بن گئے۔ عظیم صحابی رسول حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کا قبیلہ ظلم و ستم اور لوٹ مار پر گزارا کرتا تھا مگر اچانک حضرت ابوذر کے دل میں عشق کی چنگاری بھڑک اُٹھی۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو دیکھا تو پھر ان کے ہی ہو رہے اور یہ ان کے عشق رسول کی بالاتری کا ہی اعزاز تھا کہ ”سیح الامت“ کے اعزاز سے پکارے گئے۔

شہ کونین کی عظمت کا یہ اعجاز دیکھا ہے
زمین و آسماں کو ان پہ محو ناز دیکھا ہے

اب ایک نظر آپ کے حالات دیکھئے۔

مکہ معظمہ سے شام و فلسطین کی طرف جو کاروانی سرک ریگستانی علاقہ سے ہو کر گزر رہی ہے وہیں مشرقی سمت کنانی النسل عرب کے سردار غفار بن ملیل کے خاندان میں خوشی اور مسرت کے شادیاں بچ رہے ہیں اور ہر شخص کی زبان پر غلغلہ بلند ہے کہ آج کی رات سردار قبیلہ جنادہ بن کعب بن صعیر بن الوقعہ بن سفیان بن حرام ابن غفار کے گھر میں ایک قبول صورت بچہ پیدا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو سعادت ازلی وابدی کا مالک اور کامرانی و عیش کا حقیقی وارث قرار دے۔ غفاریوں کی عام عادت کے مطابق ساتویں دن جنادہ اور رملہ بنت ربیع نے مل کر اس بچہ کا نام جناب رکھا اور بڑے

Click For More Books

<https://archive.org/details/@zohaibhasanattari>

ازمان آرزو کے ساتھ اس بچہ کی پرورش و تربیت کے انتظام کئے جانے لگے۔

بنو غفار چونکہ ایسے زبردست سرحدی مقام پر واقع تھے جہاں کی زمین فی نفسہ خود تو کوئی ایسی زیادہ زرخیز نہ تھی البتہ ملک شام کی تجارتی منڈی کے تاجر اور عربی رؤساء کے قافلے مال و دولت سے لدے ہوئے اس کے قریب سے ہو کر گزرتے تھے۔ اس لئے جاڑے اور گرمی کے موسم میں جب قافلوں کی آمد و رفت اپنے شباب پر ہوتی تھی غفاریوں کی بھی معقول آمدنیاں ہو جاتی تھیں۔

مختلف قسم کے سامان مختلف ملکوں کے آدمیوں کے ساتھ دیکھ کر اکثر لوگوں کو طمع دامن گیر رہتی اور چونکہ خود اتنی استطاعت و قابلیت نہیں رکھتے تھے کہ جائز حیثیت سے دنیا جہان کی بیش قیمت اشیاء پیدا کریں اس لئے نوجوان اور منچلے غفاری لوٹ مار کی طرف راغب ہو گئے اور کچھ ہی دنوں کے بعد ان کی ان غیر شریفانہ حرکتوں کی بدولت لوگ انہیں رہزن اور ڈاکو کے لقب ذلیل سے یاد کرنے لگے کیونکہ اب یہ چیز نوجوانوں سے گزر کر پورے قبیلہ کے افراد میں پھیل گئی تھی۔

اس امن شکن اور اخلاق سوز جرم کے اور جو کچھ نفسیاتی حیثیت سے نتائج رونما ہوئے آئندہ نسلیں اس بد اخلاقی کا ایسا شکار ہوئیں کہ جدا جدا ٹولیاں بن گئیں اور ہر ایک نے مختلف مقامات پر اپنے اڈے بنا لئے۔ غفاری نوجوانوں سے گزر کر غفاری لڑکوں کی ایک جماعت تھی جس نے اپنی عادت یہ ڈال رکھی تھی کہ رات کے پچھلے پہر جبکہ ساری دنیا مست پڑی ہوئی ہوتی تھی بچوں کا یہ مختصر دستہ اٹھتا اور سڑک پر جو قافلہ بھی جاتا ہوا ملتا اس کے تمام سامان و اسباب کو جا کر لوٹ لیتا۔

علم النفس کا یہ مسلم مسئلہ ہے کہ جب کوئی قوم یا جب کوئی شخص کسی فعل کا ارتکاب کرنے لگتا ہے تو فطرۃ اس کا قدم وہیں پر رک نہیں جاتا بلکہ اس سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اب اگر وہ فعل حسن ہے تو خیر دیگر باتیں اس کے ملحوظ خاطر ہونے لگتی ہیں اور اگر وہ جذبہ یا کسی امر شرعی کے زیر اثر پیدا ہوا ہے تو خباثت کی طرف اقدام و سبقت کی جانب سختی کے ساتھ طبیعت مائل ہو جاتی ہیں۔ غفار چونکہ رہزنی، بدکاری اور قتل و غارت گری میں بہت ہی اعلیٰ پیمانہ پر قدم بڑھائے چلے جا رہے تھے اس لئے ان سے روز بروز اعمال خیر سلب ہوتے جاتے تھے اور برائیاں بڑھتی جاتی تھیں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ جب ناپاک جذبات کے بھوت روحوں پر مسلط ہو جاتے ہیں تو پھر روح انسانیت وہیں پر جل کر ختم ہو جاتی ہے اور اس کا دل و دماغ بلا کسی زبردست معاہدہ اور صیقلی کے امور خیر کی طرف نہیں مائل ہوتا۔

پھر بھی بعض خوبیاں ان میں اب بھی ایسی تھیں جو ان کو زیور انسانیت سے اب تک آراستہ

کئے ہوئے تھیں۔ ورنہ شاید یہ لقب جلیل بھی ان سے اب تک کب کا چھن گیا ہوتا۔

لیکن بنو غفار نے عام عربوں سے وراء الوراء ہو کر کچھ اقدام اور کرنا چاہا اور وہ شہر حرم جن کی عظمت و جلالت صرف قریش ہی کے ساتھ عقیدۂ مخصوص تھی بلکہ اس میں بلا امتیاز رنگ و بو تمام عرب متفق الخیال تھے اور برسہا برس سے کرتے چلے آتے تھے۔ بنو غفار نے اس کو بھی حلال کر کیا اور اس کی وجہ وہی حرص طمع اور قتل و غارت گری کی بے تحاشا عادات کے سوا اور کچھ نہ تھی۔ الغرض قوم غفار انہیں بد مستیوں اور لیل و نہار کی انہیں تباہ کن گردشوں میں گرفتار تھی کہ اچانک جناب کی ولادت ہوئی۔ یقیناً جناب نے بھی ابتداء میں ان مشاغل میں شرکت کی ہوگی اور وہ چونکہ فطرۂ بہت ہی عالی دماغ، جری اور طبیعت کے اعتبار سے تیز واقع ہوئے اس لئے بہت جلد نمایاں حیثیت پیدا کر لی ہوگی۔

لیکن فطرت انسان کو ایک دن اپنے مرکز پر ضرور لوٹا کر لاتی ہے۔ جناب کو تنبیہ ہوئی اس قادر ذوالجلال کی طرف سے جو ڈوبتوں کو اچھالتا اور گرتوں کو سنبھالتا ہے۔ جناب کو ان افاعیل و اہیہ سے روکا اور اس کی بے نیازی کی سن کر ایسا اثر قبول کیا جس نے جناب کو قبیلہ غفار کیلئے ناصح مشفق اور مصلح کامل بنا کر بھیجا۔ وہ خود بھی اس قسم کے حرکات سے محرز ہوئے اور چپکے چپکے اپنے پاس بیٹھنے والوں اور ملنے جلنے والوں کو بھی روکتے رہے لیکن ان مہوں کا جو نتیجہ نکلا اس کا اندازہ صرف ایک واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ باوجود قوم میں بڑا رسوخ پانے اور سچائی و صداقت میں مشہور ہونے کے محض اتنی سی بات پر کہ انہوں نے لوگوں کو امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی تبلیغ کرتے ہوئے شہر حرم کی تعظیم اور فعل قبیح قتل و غارت گری سے منع فرمایا تھا۔ لوگ لکڑیاں لے کر چڑھ دوڑے اور خدا کے اس نیک بندے کا جس کا مقصد محض اصلاح اخوان تھا، گھونسوں اور لاتوں سے مار مار کر بھر کس نکال دیا تھا وہ تو کہتے کہ یوحنا کو کچھ رحم آ گیا اور اس نے لوگوں کو یہ کہہ کر نرم کر دیا کہ یہ مجنون مجذوب ہے اس کی ان فضول باتوں پر اثر بھی لینا فضول ہے، بلکہ ہے، بکنے دو۔ اسی کے ساتھ ہی اس نے جناب کی طرف پکار کر کہا کہ اے ابوذر وطن اور ہم وطن دشمن دونوں تمہارے دشمن ہو گئے ہیں، اب اگر تم زندہ رہنا چاہتے ہو تو مناسب یہی ہے کہ کسی دوسرے مقام کی طرف کوچ کر جاؤ۔

کسی کو کیا خبر تھی کہ ابوذر آگے چل کر کس مرتبہ جلیل اور کس قدر بلند شخصیت کو حاصل کرنے والے ہیں، کسے کیا معلوم تھا کہ ان کو مسیح الامت کا خطاب عظیم مرحمت ہوگا اور نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی کا شرف پا کر ان کی زبان فیض ترجمان سے سچائی اور صداقت کا شوقیت ان الفاظ میں حاصل کریں گے۔ زمین و آسمان نے آج تک کوئی ایسا بولنے والا نہیں دیکھا جو ابوذر

سے زیادہ صادق القول ہو۔

چنانچہ شاید یوحنا ہی کے مشورہ کے مطابق انہوں نے ترک وطن کا ارادہ مصمم کر لیا اور ہم وطنوں کے درو دیوار اپنی شکار گاہ اور لوٹ مار کے مواقع حسرت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔

راستہ میں ٹھہرتے ٹھہرتے عزیزوں اور دوستوں کے یہاں قیام کر کے مکہ کے قریب ایک گاؤں میں سکونت اختیار کی۔ اس وقت ابوذر کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنی کچھلی خطاؤں اور ظالمانہ و بے دردانہ قتل و غارت گریوں پر نادم ہو کر بنام خدا اپنے کو وقف کر چکے تھے۔ آپ کی آنکھیں اور قلب انتہائی بے چینی کے ساتھ ایک ایسے مربی کامل اور ہادی برحق کی تلاش کر رہا تھا جو آپ کو صحیح معنوں میں خدا کے سچے راستے کی ہدایت فرمائے۔ آپ عربوں کے عام عقیدہ کے خلاف فطرۃً یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ بت وغیرہ کچھ چیز نہیں، نہ لات و ہبل کوئی فائدہ و نقصان پہنچا سکتے ہیں اور نہ ان کا ہماری معزز گردنوں کے جھکنے سے کوئی نفع نقصان ہے۔ آپ ایک خدا کو مانتے تھے اور اسی کی تلاش میں حیران و پریشان رہا کرتے تھے۔

عین اسی زمانہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت کا دعویٰ کیا۔ اور چونکہ آپ نے بھی یہی اوعا فرمایا تھا کہ خدا ایک ہے اور میں اس کا آخری رسول ہوں۔ یہ بتوں اور دیوتاؤں کی پرستش محض مشرکانہ فعل ہے۔ اسی اثناء میں مکہ سے ایک قافلہ آیا اور اسی گاؤں میں جہاں ابوذر ٹھہرے ہوئے تھے آ کر مقیم ہوا۔ اس نے ابوذر کے خیالات معلوم کر کے ازراہ تعجب کہا: معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے دماغ میں بھی وہی جن سوار ہے جو ہمارے یہاں نعوذ باللہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اوپر ہے وہ بھی یہی کہتے ہیں جو تم کہتے ہو۔

اس واقعہ کے سنتے ہی ابوذر کے قلب پر بجلی سی کوند گئی اور معا یہ خیال دامنگیر ہوا کہ چلو اس سے چل کر ملیں اور پوچھیں کہ اس کے پاس اس کے دعوے کے کیا کیا دلائل ہیں۔ چنانچہ پہلے اپنے بھائی کو حالات کی تحقیقات کیلئے بھیجا، اس کے بعد خانوادہ غفار کا یہ تابندہ بخت فرزند اپنی پیٹھ پر ایک مختصر سے کالے مشکیزہ میں پانی اور زنبیل میں کچھ پھل رکھ تن تھا مکہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ جب حرم کے قریب پہنچتے ہیں تو اپنی سواری سے اتر پڑے اور پا پیادہ اپنے مقصود کو تلاش کرنا شروع کیا۔

مکہ میں ابوذر کے آنے کا آج پہلا اتفاق تھا۔ اس سے پہلے وہاں کے کسی آدمی سے ملاقات تھی اور نہ کسی کے یہاں بے بلائے ٹھہرنا گوارا کرتے تھے۔ اس لئے حرم ہی کے ایک گوشے میں اپنا

مختصر سا سامان حیات رکھ کر اقامت گزریں ہو گئے۔

غیرت مزاج اس قدر تھی کہ مکہ پہنچ کر دل میں یہ ٹھان لی کہ اس گوہر مقصود کو میں خود ہی کوشش ہے تلاش کروں گا، اسکے متعلق کسی غیر سے تحقیق و جستجو نہ کروں گا۔

چنانچہ اسی آن ہی آن میں ایک مہینہ گزر گیا، اتنے دنوں میں جو کچھ ساتھ لائے تھے وہ بھی ختم ہو گیا اور جو کچھ یہاں وقتاً فوقتاً پیدا کیا تھا ٹھکانے لگ گیا۔ فاقوں پر فاقے ہونے لگے مگر اللہ ری غیریت کہ پائے استقلال اور ارادہ صمیم میں مطلق جنبش نہ ہوئی۔ جس اطمینان و سکون کی ساتھ ارادہ کے وقت دل میں جذبات کی لہریں بلند ہوئیں تھیں اسی جوش کے ساتھ اب تک اسی سمندر میں طوفان برپا تھا۔ چنانچہ امام بخاری فرماتے ہیں کہ ابو ذر نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خود تلاش کر لیا، یہ گوارا نہیں کیا کہ کسی غیر سے آپ کا پتہ دریافت کیا جائے۔

اور اس کی صورت یہ ہوئی کہ ایک دن آپ اسی تلاش میں حیران سرگردان پھرتے پھرتے بالکل تنگ آ گئے تھے۔ اس لئے اس جذبہ کی ایک کڑی ٹوٹی اور معمولی پھٹے حال شخص سے جو اسی وقت حرم میں داخل ہوا تھا قریب پہنچ کر یہ خیال کرتے ہوئے کہ اس نبی مقدس کا یہ کوئی غریب چیلہ معلوم ہوتا ہے۔ دریافت کیا ”بھائی جان تم لوگ جس شخص کو صابی صابی کہہ کر پکارتے ہو اس کا گھر کہاں ہے؟ مخاطب یہ سمجھے کہ یہ شخص بھی شاید محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جماعت کا کوئی آدمی ہے، حیران ہو کر چیخنے لگا ”یہ صابی کہاں سے آ گیا، یہ صابی کہاں سے آ گیا“۔

اس نے زمین و آسمان سر پر اٹھا لیا۔ واقعہ یہ تھا کہ اس زمانہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کفر و قریش نے صابی (بے دین یا آج کل کی اصلاح میں ”لادین“ کہنا شروع کر دیا تھا) اور دعویٰ نبوت بتوں کی تردید کرنے کی وجہ سے آپ کے اس قدر دشمن ہو گئے کہ گویا آپ کا ان لوگوں نے بزم خود بایکاٹ کر کے دین و دنیا دونوں سے بیکار کر دیا تھا چنانچہ اسی سلسلہ میں آپ کے مقلدین پر بھی سخت ظلم و جفا کی بارشیں ہو رہی تھیں اور جہاں کہیں معلوم ہو جاتا کہ فلاں شخص آپ کا متبع ہے اس کے بھی ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ جاتے اور جو کچھ بھی اس کے خلاف کر سکتے اور جس قدر ہمت ہوتی کر گزرتے۔

چنانچہ حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ خود فرماتے ہیں کہ اس آدمی کے صابی صابی کہنے پر چاروں طرف سے کفار مجھ پر لکڑیاں و اینٹیں پتھر لے کر دوڑ پڑے۔ آپ کے الفاظ اس واقعہ کے متعلق یہ ہیں ”یہ وحشی ڈھیلے ہڈیاں (جو کچھ ہاتھ آیا) لے کر مجھ پر پل پڑے اور اس قدر مجھے مارا کہ میں بے

ہوش ہو گیا اور زمین پر گر گیا۔ (طبقات)

یہ وقت بھی عجیب وقت تھا یہ آذری ایک ابراہیمی پر بے تحاشہ ٹوٹے پڑ رہے تھے اور وہ باوجود بہادری اور شجاعت میں بے مثال ہوتے ہوئے اور دولت و سروری کے اعتبار سے غیور ہونے کے کفر و قریش کی ٹھوکروں میں آلود بہ خون تھا اور اس پر بھی سوائے خوشی اور سرمستی کے ساتھ اللہ واحد اللہ واحد کا نعرہ جگر گزار لگانے کے ایک حرف بھی زبان سے نہیں نکلتا تھا۔ حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ بے ہوش ہونے کے بعد پھر مجھے نہیں معلوم کہ ان لوگوں نے میرے ساتھ کیا اور وہ کیا سمجھ کر مجھے چھوڑ گئے۔ البتہ جب میری آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا کہ میرے کپڑے خون میں شرابور ہیں اور سارا بدن زخموں سے لہولہان ہو رہا ہے۔ اٹھے اور عشق و محبت کے راستہ میں یہ چوٹیں کھا کر زمزم پر آئے اور وہاں کپڑے دھو دھا کر پانی پیا اور پھر حرم کے ایک کونہ میں خاموشی کے ساتھ اپنے مقصود کی تلاش میں محو ہو گئے۔ اتفاقاً ایک رات کو جس کے متعلق خود ان کے الفاظ یہ ہیں:

”چاندنی چھٹکی ہوئی تھی اور اہل مکہ (کافر) اپنے اپنے کاموں سے فارغ ہو کر نرم نرم گدوں پر دراز ہو چکے تھے یہاں تک کہ بیت اللہ میں بھی سناٹا چھایا ہوا تھا۔ سوائے دو تین آدمیوں کے اور کسی کی پر چھانٹیں تک نہ نظر آتی تھی کہ اتنے میں ایک نور دوسرے نور کے بغل میں ہاتھ دیئے حرم میں داخل ہوا میں نے غور کر کے جو دیکھا تو میری نگاہ بے قابو ہو گئی۔ دل دھڑکنے لگا اور یہ محسوس ہونے لگا کہ جیسے کوئی مجھے اپنی طرف کھینچنے لئے لیتا ہے۔“

یہ نور مبارک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود گرامی تھا اور دوسرے آپ کے رفیق باوقا حضرت ابو بکر تھے۔ دونوں آدمی رات کی تاریکی میں بیت اللہ کے پاس تشریف لا کر معلوم نہیں بہت دیر تک کیا کرتے رہے نمازیں ادا کیں اور حجر اسود کو بوسہ دے کر رخصت ہو رہے تھے اور میرے منہ سے بانداز صد نیاز مندی یہ الفاظ ادا ہو رہے ہیں ”السلام علیک یا رسول اللہ“۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے الفاظ سن کر میری رودر ریافت کی اور یہ سن کر کہ میں مشہور غار نگر قبیلہ غفار کا آدمی ہوں مسکرا کر آگے بڑھ گئے۔

ابن سعد نے طبقات میں جہاں اس واقعہ کا ذکر لکھا ہے ابو ذر کی وارفتگی کا حال خود انہیں کی زبان سے باین الفاظ لکھا ہے ”میں بڑھا کہ جا کر حضور کا دست مبارک تمام لوگوں مگر ان کے ساتھی نے آپ کی طبع مبارک کا اندازہ کر کے مجھے روک دیا“

اس کے بعد حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے خود مخاطب ہو کر حالات دریافت کئے۔

انہوں نے شروع سے آخر تک اپنی داستان دہرائی اور بتایا کہ اتنے دنوں سے یہاں مقیم ہوں اور اس طرح مفلوک الحالی اور پریشانی گردی میں میری زندگی کے دن گزر رہے ہیں۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو ان کی حالت پر رحم آ گیا اور اپنے گھر لا کر کھانا کھلایا اور طائف کی تازہ کشمش مجھے دے کر اپنے یہاں سے رخصت کیا لیکن ابو ذر فرماتے ہیں مجھے اب تک یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ یہی وہ گوہر مقصود ہے جس کی میں تلاش کر رہا ہوں۔

صبح حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے پھر ملاقات ہوئی اور انہوں نے یہاں آنے کا سبب دریافت کیا۔ ابو ذر نے عہد لیا کہ وہ اگر سب واقعات بیان کر دیں گے تو پوری رہنمائی کریں گے۔ سرکار مرتضوی رضی اللہ عنہ نے وعدہ کیا اور پھر انہوں نے مکمل داستان بیان کر دی کہ میں اس نبی آخر الزمان کی تلاش میں ہوں جس کے متعلق سنا گیا ہے کہ مکہ میں مبعوث ہو کر لوگوں کو خدائے واحد کی طرف دعوت دے رہا ہے۔

حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ حسب وعدہ ان کو بارگاہ نبوت میں لے کر حاضر ہوئے اور اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک روئی دار چادر اوڑھے ہوئے صحن مکان میں ایک چبوترے پر فرش خاک پر لیٹے ہوئے محو خواب تھے۔ ابو ذر کے قدموں کے چاپ سے آنکھ کھل گئی۔ بیداری کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ نے ان باتوں کے متعلق دریافت کیا جو انہوں نے مختلف لوگوں کی زبانوں سے سنی تھیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت خندہ جبینی کے ساتھ ایک آیت سنائی جسے سنتے ہی حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ نے نہایت اخلاص مندی کے ساتھ اشہد ان لا الہ الا اللہ واشہد ان محمد رسول اللہ کہہ کر اپنے آپ اپنے غلامان کی محمدی صف میں شامل کر دیا۔ جو ابھی تک صرف ابو ذر اور جناب کے نام سے پکارا جا رہا تھا آج سے مسلمانوں کی اصطلاح میں سیدنا حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ کے نام سے یاد کیا جانے لگا اور صرف اس اقرار غلامی اور قبول اسلام کی بدولت رہتی دنیا تک ان کے نام کو خدا عزت و عظمت کے ساتھ تاریخ و سیر کے صفحات پر باقی رکھے گا۔ مسلمان ہو کر ابو ذر نے قریشی کافروں کے ہاتھ بہت سخت ایذائیں اور تکلیفیں اٹھائیں۔ دن رات اٹھتے بیٹھتے گھونسہ اور لاتوں سے ان کا استقبال کیا جانے لگا۔ بسا اوقات اس قدر اذیتیں پہنچائیں گئیں کہ دو دن تک ہوش نہیں آیا مگر اللہ ربے جوش محبت اور حسن عقیدت کہ دنیا بھر کے مصائب جھیلنا گوارا کئے لیکن وہ پیارا نام اور اس پیارے کی سچی تعلیمات اور شراب سے زیادہ مست کن محبت جاں نواز نہ چھوٹا تھی نہ چھوٹی۔

چند دن اسی طرح صحبت نبوی میں رہنے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ مکہ معظمہ سے عہدہ تبلیغ پر مامور ہو کر رخصت ہوئے۔ سب سے پہلے اپنے بھائی اور والدہ کو آکر مسلمان کیا۔ اس کے بعد ایک عرصہ تک آپ عسفان کی گھاٹیوں میں پوشیدہ طریقہ پر تبلیغ کرتے رہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند ہی روز کے عرصہ میں انہوں نے نہ صرف اپنے قبیلہ اور اپنے حلیف قبیلہ کو پوری طرح اسلام کی جانب مائل کر لیا بلکہ متفرق حیثیت سے بھی اسلام کی افراد کے ذریعہ سے بہت کچھ امداد اعانت پہنچائی۔

ان کی تبلیغی مساعی کا نتیجہ تھا کہ کل قبیلہ اسلم ایک روز آکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں کے نیچے آ کے بچھ گئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسرور ہو کر یہ دعا دی۔ خدا غفار پر اپنی مغفرت نازل کرے اور قبیلہ اسلم کو خدا سالم رکھے۔ یہ دعا صرف حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کی بدولت پورے قبیلہ کو ملی۔

کہاں وہ اور کہاں نکلت گل
نیم صبح تری مہربانی

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کا روز بروز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ جلیل میں اقتدار بڑھتا جاتا تھا یہاں تک کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ سے باہر سفر میں یا جہاد میں تشریف لے جاتے تو اکثر ابوذر ہی کو اپنا جانشین بنا جاتے۔

یہی ابوذر رضی اللہ عنہ سفر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے رفیق ہوا کرتے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت تو آپ کا گویا فرض عین تھی اور ایسی دلجوئی اور محبت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی تعمیل کرتے تھے کہ آپ ان کے کام کو دیکھ کر اکثر انتہائی مسرت کے ساتھ مسکرایا کرتے تھے۔ نمازوں کی کثرت دعاؤں اور وظائف کا ورد اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت بس یہی آپ کے مشاغل تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کو جس قدر ابوذر محفوظ رکھتے تھے اور جس پیارے انداز میں دین کی تبلیغ فرمایا کرتے وہ بس آپ ہی کا حصہ تھی۔

جب کبھی آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی قول بیان فرماتے تو پہلے آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوتے اس کے بعد آپ کی زبان مبارک سے یہ الفاظ ادا ہوتے او صافی حبیبی وعلیلی بغلان آپ کے اوپر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بہت شفقت رہتی تھی۔ بات بات پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کو اپنا مخاطب بنا لیا کرتے تھے اور اکثر دیکھا گیا کہ آنحضرت صلی اللہ

علیہ وسلم ان سے کچھ چپکے چپکے بھی راز کی باتیں کہا کرتے تھے جن کا علم سوائے ابوذر رضی اللہ عنہ کے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کسی کو نہیں ہوتا تھا۔ آپ کے اوپر ہمیشہ ایک قسم کی کیفیت جذب طاری رہتی تھی چونکہ آپ کے اسلام کی ابتداء ہی ایسے وقت اور ایسے ماحول میں ہوئی تھی جو خالص جذبات اور ارتکاب معاصی سے لبریز تھی۔

قبیلہ غفار اور خود حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ جو انسانیت سوز بد اخلاقی میں مبتلا تھے اس کا دہندہ لا سا خاکہ گذشتہ سطروں میں پیش کیا جا چکا ہے۔ وہ ستم رسیدہ مسافروں کو لوٹ لینا، ایک شب کی بیابانی دہنوں کو بیوہ کر دینا، دودھ پیتے بچوں کو یتیم بنا دینا، امیروں کو آنا فانا غریب کر دینا، یہ ان کا عام شیوہ تھا۔ اس کے علاوہ مذہبی حیثیت سے طرح طرح کی بدعتیں رائج کر رکھی تھیں۔ بتوں کی پرستش، بد اخلاقی کی تعلیم، حرام کو حلال اور حلال کو حرام کر دینا، روزمرہ اس کی مختلف قسم کے نظائر ان کی پرائیویٹ اور جماعتی زندگی میں نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کو انہیں حرکتوں کے درمیان قدرت الہی کی طرف سے کچھ تشبیہ ہوئی اور اسنات و نائلہ اور لات و عزیٰ کی پرستش چھوڑ کر ایک خدا کی تلاش میں ادھر ادھر مارے پھرنے لگے۔ پھر کچھ دنوں کے بعد از خود انہوں نے نماز پڑھنا شروع کر دی اور اس قدر زہد و ورع اور خشیت کا غلبہ ہوا کہ دو دو رکعت میں ایک رات ختم ہونے لگی۔ پھر جب اسلام لائے تو اس تخیل میں اور جلا پیدا ہو گئی۔ خدا کی تلاش کرنے والے کو خدا اگر مل جائے۔ صحیح تعلیمات الہی کو تحقیق کرنے والے کو اگر صحیح راستہ کی ہدایت ہو جائے تو یقیناً اس میں ایک عظیم الشان انقلاب پیدا ہو جائے گا۔

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ اسلام لانے سے پہلے ہی ایک طرح کے مجذوب تھے اور اسلام لا کر تو بالکل ہی مجذوب بن گئے اور ان کی مجذوبیت یہاں تک بڑھی کہ آج دنیا میں جتنی صوفیاء کی جماعتیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی کا دم بھر رہی ہیں ان میں اکثر جماعتیں اور گروہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کی ذات گرامی کے توسل کو باعث صد ناز و افتخار خیال کرتے ہیں۔ ہر بہلول اور ہر مجذوب ان کو اپنا پیشوا اور سرگروہ خیال کرتا ہے۔

آپ کی ظاہری شکل و صورت بالکل مجذوبانہ تھی آپ کے سر کے بال پریشان رہا کرتے۔ داڑھی اُبھی ہوئی، کپڑے پھٹے ہوئے، بدن میلّا، آخر آخر میں تو یہ حالت ہو گئی تھی کہ اگر لوگ پکڑ دھکڑ کے نہ ہلا دہلا دیتے تو خیرورنہ مہینوں اسی رنگ میں گذر جاتے۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ قافلہ میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ پیچھے رہ گئے اور اس قدر پیچھے رہ گئے کہ اب ان کے متعلق کسی طرح یہ امید

نہیں باقی رہی تھی کہ یہ لوٹ کر پھر آسکیں گے لیکن تھوڑی دیر کے بعد دور سے لوگوں نے دیکھا کہ دوڑے ہوئے بے تحاشہ چلے آ رہے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھے بے چینی کے ساتھ ان کا انتظار فرما رہے تھے اور یہ الفاظ اس وقت زبان مبارک پر جاری تھے۔

”اللہ ابوذر پر اتنا رحم فرما دے..... بے چارہ اکیلا چلتا ہے اکیلا ہی اٹھایا جائے گا اور اکیلا

رے گا“

حبیب خدا کا یہ جان نثار دنیا سے رخصت ہوا۔ جس وقت آپ کی روح نے اس قفس مخبری سے پرواز کیا ہے کوئی تنفس آپ کے پاس موجود نہ تھا۔ صرف ایک بیوی اور ایک لڑکی آنسو بہانے والی تھے۔ باقی پھر جس قدر لوگوں کو معلوم ہوتا گیا جوق در جوق آتے گئے اور شریک ہوتے گئے۔ مدینہ منورہ کے قریب ربذہ بستی کے آس پاس آپکا مزار مبارک ہے۔



صحابی رسول

حضرت سعد الاسود رضی اللہ عنہ کا ذوق شہادت

ہجرت کے تھوڑے ہی عرصہ بعد تاریخ نے نیا باب الٹا اور مورخ کے قلم ایک اچھوتی اور حیرت انگیز داستان رقم کرنے لگے۔ حضرت عبداللہ و آمنہ کے گھر جنم لینے والی عظیم شخصیت جو گمراہی و ضلالت کی جگہ حق کے فروغ کیلئے اس کرۂ ارضی پر تشریف لائی تھی اپنے ہم وطنوں کے ہاتھوں تنگ آ کر آبائی وطن خیر باد کہہ دینے کے بعد قریش کا زعم توڑ چکی تھی۔ اب اس محمد عربی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ذات قریش مکہ کے نزدیک ایک اہم حیثیت اختیار کر چکی تھی جس نے انہی کے قبیلہ میں جنم لے کر انہیں کے ماحول میں پروان چڑھ کر انہی کے خود ساختہ معبودوں کو جھٹلایا تھا۔ وہ سوچ رہے تھے کہ وہ شخص جس نے چالیس سال کی عمر تک کسی فوج کی کمانڈ کرنا تو کجا کسی جنگ میں ایک عام سپاہی کی حیثیت سے بھی حصہ نہیں لیا تھا۔ کس طرح اپنی مختصر سی فوج کے ساتھ ابو جہل عقبہ اور شبیبہ جیسے آزمودہ کاران کی قیادت میں لڑنے والی جنگجو فوج کو شکست دینے میں کامیاب ہو گیا۔

وہ شخص جس نے عمر کا ایک کثیر حصہ سیاسی معاملات سے الگ تھلگ رہ کر گزارا تھا کس طرح اس قابل ہو گیا کہ اپنے تحفظ اور وقار کیلئے ارد گرد کے قبائل کے ساتھ معاہدات کر سکے۔ وہ اس عظیم انسان کی زبان اقدس سے رشد و ہدایت کے فصاحت و بلاغت سے بھرپور خطبات سن کر سوچ رہے تھے کہ اس میں یہ جادو بیانی کہاں سے آگئی حالانکہ چالیس سال تک اسے سوائے لین دین اور تجارتی معاملات کے کسی اور مسئلہ پر گفتگو کرتے شاید ہی سنا گیا تھا۔ اب رشد و ہدایت کا یہ چشمہ معصیت کاروں کی صفائی کیلئے مدینہ میں پوری شدت سے بہ رہا تھا۔ یہ شخصیت مردہ دلوں کیلئے مسیحا پیاروں کیلئے طبیب اور مریض کیلئے معالجہ کا مقام حاصل کر چکی تھی۔ طاغوتی طاقتوں کے اندھا دھند جھکڑوں کے باوجود چراغ ایزدی پوری شان سے جل رہا تھا۔ دنیائے عرب میں ایک بہت بڑا انقلاب آچکا تھا اور دربار رسالت سے ہر سوالی کی ہر حاجت پوری ہو رہی تھی۔ ہر شخص بامر اولوٹ رہا تھا، ہر زخمی دل کی یشاداری کا سامان موجود تھا۔ ہر مایوس انسان کیلئے امید کی شمع جگمگا رہی تھی۔

Click For More Books

<https://archive.org/details/@zohaibhasanattari>

بٹی ہے کونین میں نعمت رسول اللہ کی

حضرت سعد الاسود رضی اللہ عنہ سلطان دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقتدر صحابہ میں سے تھے۔ آپ سچے دل سے فدائی اسلام اور عاشق رسول تھے۔ اسلام قبول کرنے سے قبل صاحب جائیداد تھے مگر اسلام لانے کے بعد جب عازم مدینہ ہوئے تو کفار نے ان کا سب کچھ چھین کر ہی ان کو مدینہ جانے دیا اور ان کا شمار ان اصحاب صفہ سے تھا جو سارا دن اسلام کی تبلیغ کرتے رہتے تھے اور جن کے خورد و نوش کا انتظام مدینہ کے رؤسا کے ذمہ تھا۔ بد قسمتی سے رنگ بھی کالا پایا تھا اسی بناء پر سعد کے ساتھ اسود کا لفظ مدینہ والوں کی زبان پر تھا، اعضا بے ڈول تھے اور غریب تو وہ یوں بھی تھے۔ طبیعت بھی ظریفانہ پائی تھی اس بناء پر بعض لوگ ان سے ناراض رہتے تھے مگر ان سب باتوں کے باوجود انہیں بھی شادی کی تمنا تھی، گھر بسانے کی خواہش تھی، اولاد کی خواہش تھی، تنہائی کا احساس دل میں کانٹے کی طرح کھٹکتا تھا۔ کاش میرا بھی گھر بس سکتا، کاش کوئی عورت مجھ سے بھی شادی کر سکتی، میری بھی نسل چلتی اور میں بھی ان مسرتوں سے ہمکنار ہو سکتا جو دوسروں کو حاصل ہیں۔ میرا قصور یہ ہے کہ میں بد صورت ہوں، یہ کتنا بڑا جرم ہے۔ اس جرم کا کفارہ کیونکر ہو سکے گا۔ وہ انسان جو ہر درد کا معالج ہے، جس نے میرے دل کو شمع اسلام سے منور کیا۔ کیا وہ بھی میرے دکھ کا مداوا نہیں بن سکے گا۔ انہوں نے کئی گھرانوں میں جا کر پیغام دیا مگر ہر جگہ سے صاف جواب ملا۔ ان کے دل میں شکایات کا طومار تھا، وہ دل کی بھڑاس نکالنا چاہتے تھے، دل کے پھپھولوں کو چھیڑنے کیلئے بے قرار تھے۔

ایک دن صبح کی نماز پڑھ کر جبکہ تمام مسلمان گھروں کو جا چکے تھے اور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم ابھی تک مسجد میں تشریف فرما تھے تو آپ نے اندازہ فرمایا کہ سعد رضی اللہ عنہ کچھ کہنا چاہتے ہیں، ہونٹ کھولتے ہیں مگر پھر رک جاتے ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کی حالت کو بھانپ گئے اور سب کے چلے جانے کے بعد سعد رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

”کیا بات ہے سعد؟ یا رسول اللہ میں آپ کے حضور ایک شکایت لے کر آیا ہوں۔“

”شکایت“ سرکارِ دو عالم نے تعجب سے فرمایا ”کس مسلمان کے خلاف۔“

کسی فرد واحد کے خلاف نہیں آقا، سعد نے رندھی ہوئی آواز میں عرض کیا۔ ”مجھے زمانے

سے شکایت ہے، رسم و رواج سے شکایت ہے، نام و نسب کی کھوکھلی تہذیب سے شکایت ہے۔“

”آخر کچھ کہو گے بھی؟“ بات اتنی سی ہے یا رسول اللہ کہ میں شادی کرنا چاہتا ہوں اور آپ

یہ تو دیکھ ہی رہے ہیں کہ میں بد صورت ہوں، غریب ہوں مگر اس غربت اور بد صورتی کے باوجود میں

اپنا گھر بسانا چاہتا ہوں، سعد نے رکتے رکتے عرض کیا۔

اچھا میں سمجھا۔ آقائے دو عالم زیر لب مسکرائے، مگر کسی سے کہا تو ہوتا؟

”میں گیا تھا میرے سرکار میں نے کئی گھرانوں میں جا کر پیغام دیا مگر سب نے میرا پیغام

ٹھکرا دیا اسی لئے تو مجھے اس زبانہ سے شکایت ہے۔ اسلام تو رنگ و نسل کو مٹانے کیلئے آیا تھا مگر مجھے ہر جگہ طعنے سننا پڑے۔“

”مطمئن رہو سعد، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تبسم خاص سے فرمایا۔ خدا کار ساز ہے۔“

اگلے دن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلہ بنو ثقیف کے سردار عمرو بن وہب سے فرمایا:

”عمرو..... میں تم سے تمہاری بیٹی کو مانگتا ہوں۔“

عمرو بن وہب کا چہرہ خوشی سے ٹٹٹھا اٹھا۔ زہے قسمت یا رسول اللہ۔ میرے نصیب آقا

بھلا میری اس سے بڑھ کر اور خوش قسمتی کیا ہو سکتی ہے کہ میری بیٹی آپ کی بیوی بنے۔“

”نہیں عمرو تم نے غلط مطلب اخذ کیا، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”مجھے شادی کی

ضرورت نہیں، میں تمہاری لڑکی ایک اور مسلمان کیلئے مانگ رہا ہوں“

”کس مسلمان کیلئے؟“ عمرو بن وہب نے سراپا استعجاب بن کر کہا۔

”سعد کیلئے ہے۔“

”کیا فرمایا آپ نے۔ سعد کیلئے۔“ معزز سردار کے پیروں تلے زمین کھسک گئی۔ وہ تو سمجھے

تھے کہ رسول کریم نے یہ رشتہ یا تو اپنے لئے مانگا ہے یا کسی اور معزز انصاری یا مہاجر کیلئے۔ جو میری

حیثیت کے مطابق ہو، سعد۔ بے ڈول چہرہ کالا رنگ، غریب و نادار، جس کے پاس رہنے کیلئے اپنا

مکان بھی نہیں، میں اپنی بیٹی ایسے شخص کے ساتھ کیونکر بیاہ سکتا ہوں، تصور نے پکارا۔ مگر نبی کریم کے

سامنے انکار کیونکر کر دوں۔

”دیکھئے تو ہی یا رسول اللہ! سعد عمرو بن وہب نے حواس مجتمع کرتے ہوئے ٹوٹی پھوٹی

زبان میں اپنا مدعا بیان کرنا چاہا۔“

”کچھ نہیں عمرو..... اسلام رنگ و نسل کے امتیاز کو مٹانے کیلئے آیا ہے۔ مولا کریم نے ان

اکرمکم عند اللہ اتقکم فرما کر ایک نئے معاشرے کی بنیاد رکھی ہے۔ ہمیں اس معاشرے کے

فروع کیلئے ابھی بہت کچھ کرنا ہے اور حسب و نسب کے لحاظ سے حضرت سعد کسی سے کم تر تو نہیں

ہے۔ رنگ کالا ہے تو یہ خدا کے اختیار میں ہے۔ اگر تم یہ کہنا چاہتے کہ وہ غریب ہے تو اس نے محض

اسلام کیلئے اس غربت کو خوشی سے قبول کیا۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہاری بیٹی کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔
”بہت بہتر یا رسول اللہ..... مگر مجھے بچی کی ماں سے بھی مشورہ کر لینے دیجئے گا۔“

ٹھیک ہے، فخر کونین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ تھوڑی دیر بعد حضرت سعد رضی اللہ عنہ تمہارے گھر آئے گا۔“

یہ واقعی ایک عظیم فرمان ہے۔ وہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ جسے غریب سے غریب گھرانہ بھی لڑکی دینا پسند نہیں کرتا اور جس پر راہ چلتے لوگ آوازے کسا کرتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اسے میرا داماد بنانے والے ہیں۔ میری اور اس کی نسبت کیا ہے مگر انکار کیونکر ممکن ہے۔ حکم رسالت مآب ﷺ بھی تو نہیں جاسکتا۔ عمرو بن وہب یہی سوچتے ہوئے گھر میں داخل ہوئے اور جاتے ہی بیوی سے علیحدگی میں کہا:

”رسول اللہ مجھ سے میری لڑکی کو مانگ رہے تھے۔“

”تو ہماری اس سے بڑھ کر اور خواہش کیا ہوتی، تم نے ہاں کر دی ہوتی۔“

”مگر نہیں..... عمرو نے بھجھتی بھجھتی آواز سے کہا: وہ اپنے لئے نہیں بلکہ سعد کیلئے یہ رشتہ طلب فرما رہے تھے۔“

”سعد کیلئے..... بیوی بلند آواز سے چلائی..... کس طرح ہو سکتا ہے۔“

”یہ کبھی نہیں ہو سکتا، کیا ہماری لڑکی کی قسمت اتنی ہی پھوٹ گئی ہے۔“

”مگر تم ہی کہو میں آخر رسول خدا کو کیا جواب دوں گا؟“

”ہاں..... تم کہہ دینا ہمیں یہ رشتہ منظور نہیں ہے۔ اس سے تو بہتر یہ ہے کہ اپنی لڑکی کا گلا

گھونٹ دیا جائے۔“

سوچو تو سہی..... میں دربار رسالت میں کیا منہ لے کر جاؤں گا۔ ان کا حکم کیونکر ٹال دوں۔

”جاؤ..... اور سعد کے آنے پر صاف جواب دے دینا۔“ بیوی نے کہا

تھوڑی دیر بعد سعد کی آواز سنائی دی۔ عمرو بن وہب اس کی طرف لپکے ہی تھے کہ پیچھے

سے ایک نسوانی آواز سنائی دی۔ جوان کی اپنی پیاری بیٹی کی آواز تھی۔

”ہاں ہاں، کہو بیٹی رک کیوں گئیں؟“ عمرو نے بیٹی کی طرف دیکھ کر کہا۔

”آپ باہر جا کر انکار نہ کیجئے ابا جان..... مجھے یہ رشتہ منظور ہے۔“

”یہ کیا؟ عمرو کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ تو کیا جانے سعد کو کالا رنگ بے ڈول جسم

اعضا غیر متناسب ماں نے نفرت سے ناک بھوں چڑھائی“ ”نہیں امی یوں نہ کہئے..... اسے بھیجنے والی ذات تو دو عالم سے ممتاز ہے۔“

”تم ابھی بچی ہو تم کیا جانو وہ انتہائی غریب ہے، منحوس صورت ہے، مقراض کی طرح زبان چلتی ہے۔ میں نے تو سنا ہے کہ اکثر مسلمان اس سے ناراض رہتے ہیں، تم نے بھلا کبھی پہلے دیکھا بھی ہے؟“

”میں دیکھ کر کیا کروں گی اماں..... میرے لئے تو اتنا ہی جان لینا کافی ہے کہ یہ انتخاب میرے لئے اس ہستی نے فرمایا ہے جو سرور کائنات ہے، نیر فاران ہے، یوسف ثانی ہے۔ سچ جاننا امی، مدینہ کی لڑکیاں مجھ پر رشک کریں گی کہ رسول اللہ یہ رشتہ طلب فرما رہے ہیں۔ ماں دم بخود تھی۔ باپ حیران تھا اور اسلام کی لاج رکھنے والی قابل فخر دختر کہہ رہی تھی۔ جائے ”ابا جان دیر نہ کیجئے، مجھے یہ رشتہ منظور ہے۔ مجھے رسول خدا کی خوشی منظور ہے۔ میں دنیا کی دولت لے کر کیا کروں گی، جائے۔“

بٹی، عمرو بن وہب نے بڑی مشکل سے سر اٹھایا ”تم نے میری لاج رکھ لی۔“

حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے قدم بے اختیار مسجد کی طرف اٹھ رہے تھے۔ ان کو اب کسی سے شکایت نہیں تھی، کوئی گلہ نہ تھا، کوئی شکوہ نہیں تھا۔ جب محبوب خدا کو معلوم ہوا تھا کہ رشتہ منظور ہو گیا ہے اور شادی کیلئے روپے کی ضرورت ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سعد رضی اللہ عنہ کو حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی طرف خاص پیغام دے کر روانہ کر دیا تھا۔ خاطر خواہ خرچ کا بندوبست ہو جانے پر حضرت سعد رضی اللہ عنہ بازار میں پہنچے تھے کہ کچھ سامان خرید لیں۔ انہوں نے سنا کہ ایک شخص پکار رہا تھا۔

مسلمانو! قریش مکہ ایک بار پھر عظیم الشان لشکر لے کر تم سے ٹکر لینے کیلئے مدینہ کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ مسجد نبوی میں جمع ہو جاؤ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاص اعلان فرمانے والے ہیں۔ یہ سن کر انہوں نے اپنا کام چھوڑ مسجد کا رخ کیا تھا کہ اسلام کو میری ضرورت ہے۔ وہ مسجد نبوی میں پہنچے، مسلمان بکثرت جمع ہو چکے تھے۔ ستاروں کے جھرمٹ میں چاند بھی رونق افروز تھا۔ آج اس چاند کی روشنی کچھ پھسکی پھسکی سی تھی۔ ہر وقت مسکرانے والا چہرہ فکر و تردد کی علامات سے پر تھا۔ پیشانی انور پر گہرے خطوط کسی خاص بات کی غمازی کر رہے تھے۔ حجرت سعد کا دل دھڑکنے لگا۔ رسول کریم نے حاضرین پر نگاہ دوڑائی اور با رعب آواز میں جس میں شان رسالت جھلکتی تھیں کہنا شروع کیا:

”انصار و مہاجرین! باطل ایک بار پھر حق سے ٹکرانے کیلئے میدان میں آ رہا ہے۔ قریش مکہ اپنی گذشتہ ہزیمت کا انتقام لینے کیلئے یلغار کرتے ہوئے آ ہی پہنچے ہیں۔ اسلام تم سے آج پھر قربانی کا مطالبہ کر رہا ہے۔ باطل کا سیلاب آج پھر مدینہ کے خس و خاشاک کو بہالینے کیلئے چلا آ رہا ہے۔ اس کا زور توڑنے کیلئے اس کے مقابلہ میں سد سکندری بننے کی ضرورت ہے۔“

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان اقدس سے نکلے ہوئے یہ الفاظ سعد رضی اللہ عنہ کے دل میں طوفان پکائے ہوئے تھے تو یہ بات تھی معرکہ حق و باطل اب پھر ہونے والا ہے۔ مجھے میدان جنگ میں جانا چاہیے یا شادی رچا لینی چاہیے۔ ہو سکتا ہے کہ میں میدان جنگ ہی میں کام آ جاؤں۔ تو پھر یہ شادی میری دیرینہ خواہش۔ اور یہ بھی کیونکر ممکن ہے کہ خطرہ کو سر پر منڈلاتے دیکھ کر آنکھیں بند کر لوں اسلام پر مشکل کے وقت منہ موڑ لوں یہ نہیں ہو سکتا۔ مجھے میدان جنگ میں جانا چاہیے ضرور جانا چاہیے سعد کے دل میں دین و دنیا کی یہ کشمکش جاری تھی اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے۔

یاد رکھو! اگر آج تم نے اسلام کی قربانی کے مطالبہ میں غفلت برتی تو کل کو تمہارا بھی کوئی پرسان حال نہ ہوگا نہ تمہاری جانیں محفوظ ہوں گی نہ مال۔ تمہاری بہو بیٹیوں کی عصمت ان درندوں کی بھینٹ چڑھ جائے گی اور وہ مثالی معاشرہ درہم برہم ہو جائے گا جس کیلئے ہم اب تک مثالی جدوجہد کرتے آئے ہیں۔ آج وقت ہے تم باطل پر ثابت کرو کہ مسلمان کی زندگی اور موت مثالی شان کی حامل ہوتی ہے۔ طاغوتی لشکر کے سامنے حق کی چٹان بن کر جم جاؤ شہادت کا رتبہ بہت بلند ہے۔ حورو ملائکہ ایسے خوش نصیبوں کے استقبال کیلئے ہر وقت تیار ہیں۔

سرور دو عالم اپنی مختصر سی تقریر ختم کر کے حاضرین کے تاثرات کا جائزہ لے رہے تھے۔ انہوں نے یک زبان ہو کر کہا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم آج بھی اسی طرح تیار ہیں جس طرح بدر کے موقع پر تھے ہماری جانیں خدا کا عطیہ ہیں اور اسی کے دین کے راستہ میں کام آئیں گی۔ جناب رسول خدا کا چہرہ کھل اٹھا چند لمحات کے اندر ہی غم و فکر کے بادل چھٹ گئے۔ خدایا تیرا شکر ہے۔ صحابہ یکے بعد دیگرے اٹھ کر جا رہے تھے۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ جو میدان جنگ میں جانے کو شادی پر جانے پر ترجیح دے چکے تھے آپ کے قریب آئے تاکہ اپنے ارادہ سے آپ کو آگاہ کر سکیں۔

”مبارک ہو سعد“ (رضی اللہ عنہ) آنحضرت نے سعد کو اپنے قریب آتے دیکھ کر فرمایا

حضرت سعد رضی اللہ عنہ خاموش رہے۔

”اچھا تو پھر کب کر رہے ہو شادی کس قدر بلند ہے وہ لڑکی مجھے اس پر فخر ہے امید ہے تم

نے سامان خرید لیا ہوگا' کوئی اور ضرورت ہو تو بے دریغ بتا دو'۔
رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سعد کو خاموش دیکھ کر فرمایا:
"شادی..... یا رسول اللہ..... سعد نے ہولے سے کہا۔" ابھی نہیں میدان جنگ سے واپسی
کے بعد ہوگی۔"

"یہ تم کہہ رہے ہو سعد (رضی اللہ عنہ) تمہیں تو شادی کا بڑا ارمان تھا' تمہاری دیرینہ
خواہش پوری ہونے والی ہے۔ میری طرف سے تمہیں خوشی سے اجازت ہے' نہیں یا رسول اللہ فدا و
امی وابی۔ سعد نے تڑپ کر کہا۔ ایسا نہ کہئے۔ قریش مکہ صرف آپ کے ہی دشمن نہیں ہیں بلکہ میرے
بھی خون کے پیاسے ہیں۔ میری تلوار لہو میں نہانے کو بے قرار ہے۔ باقی مسلمان تو حق کے فروغ
کیلئے کٹ مر رہے ہوں اور میں شادی رچاؤں مدینہ والے کیا کہیں گے۔ عورتیں مجھے طعنے دیں گی
اور میری پیشانی پر لگا ہوا یہ داغ تازیست نہیں مٹ سکے گا۔ مجھے جانے دیجئے۔" میں تمہارے جذبہ
کی قدر کرتا ہوں۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فخر سے سعد رضی اللہ عنہ کی پشت پر ہاتھ
پھیرتے ہوئے فرمایا:

خدا تمہارے ارادوں میں برکت دے۔"

اگلے دن احد کے میدان میں معرکہ حق و باطل گرم تھا۔ کفر و اسلام آپس میں ٹکرا چکے تھے۔
قریش مکہ اور مسلمانان مدینہ ایک دوسرے سے برسر پیکار ایک فیصلہ کن جنگ لڑ رہے تھے۔ طاغوتی
طاقتیں آج پھر چراغ ایزدی کو بجھانے کیلئے پوری تہمتی سے مصروف کار تھیں۔ مسلمان جانتے تھے
کہ اگر آج انہوں نے غفلت دکھائی تو کفر کا ریلا انہیں مدینہ سے بھی پرے دھکیل کر لے جائے گا اور
پھر ان کی موت پر ہی بس نہیں ہوگی بلکہ ان کی آئندہ نسلوں کو غلامی جیسی لعنت سے دو چار ہونا پڑے
گا۔ چنانچہ وہ جی توڑ کر لڑ رہے تھے۔ احد کی ریتیلی پیاسی سرزمین خون سے لالہ زار ہو کر اپنی پیاس
بجھا رہی تھی۔ تیر اندازوں کی غفلت کی بناء پر ایک بار مسلمانوں کے قدم اکھڑے۔ بھاری نقصان
اٹھانا پڑا اور پھر جم گئے۔ مگر اس غفلت میں بہت سے جلیل القدر صحابہ جام شہادت نوش کر چکے تھے۔
جنگ ختم ہو چکی تھی، قریش مکہ واپس جا چکے تھے۔ لاشوں سے میدان اٹا پڑا تھا۔ مسلمان
لاشوں کو شناخت کرتے جا رہے تھے۔ حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم نے ادھر ادھر دیکھ کر حضرت سعد کو
آواز دی۔

"وہ تو شہید ہو گیا' یا رسول اللہ۔ ایک صحابی نے بتایا' میں نے اسے شہید ہوتے دیکھا تھا۔"

اس نے بڑی بہادری سے جان دی ہے۔“

سعد شہید ہو گیا۔ رسالت مآب نے فرمایا ”میرا دوست جاؤ اس کی لاش کو تلاش کرو۔ ہم اسے شان سے دفن کریں گے۔“ تھوڑی دیر کے بعد سعد رضی اللہ عنہ کی لاش مل گئی مگر کسی حالت میں کہ جسم کا کوئی حصہ ایسا نہ تھا جہاں گہرا زخم نہ لگا ہوا اور ان کے گرد سات کافر کئے ہوئے پڑے تھے۔ کس قدر بلند تھی یہ شہادت۔ آپ کے حکم سے گڑھے کھودے گئے۔ آپ نے اپنے ہاتھوں سے صحابہ کے ساتھ مل کر حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو لحد میں اتارا۔ لحد کافی فاصلہ پر تھی۔ جب صحابہ ان کو اٹھاتے ہوئے لے جا رہے تھے تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سنبھل سنبھل کر قدم رکھ رہے تھے اور جب لحد قریب آگئی تو آپ مسکرا پڑے۔

”تو ہماری پہنچ سے بہت بلند تھا“ تو نے شہادت کو شادی پر ترجیح دی اور سرخرو ہو گیا۔“ صحابہ نے آواز کی سمت نگاہ دوڑائی یہ عمرو بن وہب تھے۔ آپ نے صحابہ سے فرمایا ”جب سعد کو قبر کی طرف لے جایا جا رہا تھا تو اس کے جنازہ کے ساتھ اس قدر فرشتے جا رہے تھے کہ میں قدم بچا بچا کر رکھ رہا تھا کہ ہمارا قدم ان پر نہ پڑ جائے اور پھر جب سعد کو قبر میں اتارنے لگا تو میں یہ دیکھ کر اپنی خوشی کر سکا کہ لاتعداد حورو ملائک آسمان پر اس شہید کے استقبال کیلئے موجود تھے۔ میں سعد رضی اللہ عنہ کی پہلی اور موجودہ حالت کا موازنہ کر رہا تھا کہ اسے دنیا میں کوئی رشتہ دینا بھی گوارا نہیں کرتا تھا مگر آج اس کو کس طرح ہاتھوں ہاتھ لیا جا رہا تھا۔ مسلمانو! یاد رکھو۔

ان اکرمکم عند اللہ اتقکم

زمین و آسمان دم بخود تھے۔ حورو ملائک ایک دوسرے سے اس شہید کی خوش بختی کے متعلق سرگوشیاں کر رہے تھے۔ قربانی کا فلسفہ ایک نئے مفہوم سے آشنا ہو رہا تھا۔ فضا میں رحمت ایزدی کا نور چھایا ہوا تھا اور تاریخ کا یہ ابدی فیصلہ گونج رہا تھا:

سہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

حضرت عمرو بن وہب رضی اللہ عنہ جب غزوہ احد کے اختتام پر دوسرے صحابہ کبار کے ساتھ گھر پہنچے تو ان کی صاحبزادی نے ان کا استقبال کرتے ہوئے کہا:

”ابا جان! اگرچہ بظاہر میری سعد الاسود کے ساتھ شادی نہ ہو سکی مگر میں اسے ہمیشہ اپنے قریب تصور کرتی رہوں گی، میں اپنی خوش بختی کبھی فراموش نہیں کروں گی کہ میں مدینہ طیبہ کی تمام

دخترانِ اسلام میں سے سب سے زیادہ خوش بخت ہوں کہ میرا رشتہ کائنات کے سردار اور دو عالم کے آقا حضور محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود طلب کیا تھا۔ میں اب ساری زندگی سعد الاسود کے نام پر اس کی یادوں کے حوالے سے گزار دوں گی۔

حضرت عمرو بن وہب رضی اللہ عنہ اور آپ کی اہلیہ نے آنسوؤں سے اوجھل آنکھوں میں اشکوں کو سمیٹتے ہوئے اپنے سر جھکا لئے، شاید کسی شاعر نے حضرت عمرو بن وہب کی عالی مرتبت صاحبزادی کے اسی جذبہٴ عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر کہا تھا:

رنگ کا کالا بھی ہے اور حسن میں بھی ماند ہے
بھیجنے والا تو اس کا چودھویں کا چاند ہے



دیدارِ حضور کا تمنائی

حضرت زیاد رضی اللہ عنہ

آج سے صدیوں پیشتر مورخ کا قلم عربوں کے حیرت انگیز عروج کی داستان رقم کر رہا تھا۔ یہ واقعی حیرت ناک بات تھی کہ وہ عرب جن کا حدود وطن سے باہر کوئی وقار نہ تھا اور جو اپنے دفاع پر ہی قادر نہ تھے، یکا یک اٹھ کر کشور کشائی اور جہانبانی کیلئے افریقہ، یورپ اور ایشیا کی طرف بڑھنے لگے۔ عکاظ کے ریگ زار جن کی گروہ بندیوں اور نسلی عصبیتوں کی بدولت بارہا لالہ زار ہو چکے تھے۔ وہی غیر متمدن وحشی ایک ہی پلیٹ فارم پر جمع ہو کر ایک ہی مقصد کے حصول کیلئے شانہ بشانہ میدان جنگ کی بھٹی میں کود پڑے۔ یہ سب اسی محمد عربی کا اعجاز تھا، جس نے حضرت عبد اللہ و حضرت آمنہ کے گھر جنم لے کر ان کی قسمتوں کو تبدیل کر دیا تھا۔ اس بناء پر ان کے دل میں ہادی دو عالم کا بے پناہ احترام موجود تھا۔ وہ کٹ سکتے تھے، مر سکتے تھے، تختہ دار پر لٹک سکتے تھے، ظلم و ستم کی چکی میں پس سکتے تھے مگر یہ ہرگز برداشت نہیں کر سکتے تھے۔

ع..... کہ ان کے پاؤں کے تلوؤں میں ایک کانٹا بھی چبھ جائے

یہی وہ عظیم جذبہ تھا اور یہی وہ بانی اسلام سے بے پناہ عشق تھا، جس نے انہیں سفر کے مصائب و وقت کی دشواریوں اور میدان جنگ کے خطرات سے بے نیاز کر دیا تھا۔ انہیں اپنی جان کی کوئی پرواہ نہیں تھی اور جان کی پرواہ ہو بھی کیوں۔ وہ تو تھی ہی خدا کی۔ اس لئے اگر شہید ہو گئے تو جب بھی کامیاب کہ امانت کو صاحب امانت تک پہنچا کر انعام کے مستحق ٹھہرے اور اگر بچ گئے تو تب بھی کامیاب کہ بچی ہوئی جان کسی اور موقع پر اللہ کے دین کے کام آئے گی۔

.....○.....

جنگ احد کا واقعہ ہے جمعہ کا دن ہے مسلمان ایک بار فتح یاب ہو کر تیر اندازوں کی غفلت کی بناء پر جیتی ہوئی بازی ہار چکے ہیں۔ چند سو نفوس حق کی سر بلندی کیلئے باطل سے برسر پیکار ہیں اور قریش اپنی گذشتہ ہزیمتوں کا انتقام لینے کیلئے بڑھ چڑھ کر حملے کر رہے ہیں۔ حق کے مقابلہ میں باطل

Click For More Books

<https://archive.org/details/@zohaibhasanattari>

اپنی پوری طاقتوں کے ساتھ موجود ہے۔ طاغوتی طاقتوں کے جھکڑ چراغ ایزدی کو بجھانے کیلئے سرگرم کار ہیں۔ ایک کثیر لشکر ہر قسم کے سامان حرب سے لیس ہے ہر ایک کے پاس گھوڑا، ہر شخص آہن پوش، ساتھ میں شعلہ نوا عورتیں جو پسپا ہونے پر انہیں غیرت دلانے کیلئے آئی ہیں۔

مسلمانوں کی ہزیمت کی اطلاع پا کر مدینہ سے آنے والی مسلمان عورتیں اس وقت زخمیوں کو پانی پلا رہی تھیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بھی ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ مشکیزہ کندھے پر لٹکائے یہی خدمت انجام دے رہی تھیں۔ اچانک ام المومنین کی نگاہ ایک ایسے مرد مومن پر پڑی جو زخموں سے چور چور خاک و خون میں لتھڑا ہوا درد کی شدت سے کراہ رہا تھا۔ اس کے جسم پر تیروں اور تلواروں کے بے شمار زخم تھے۔ ام المومنین اس کے قریب پہنچ گئیں اس کی سانس آہستہ آہستہ چل رہی تھی اور چند لمحوں کا مہمان معلوم ہو رہا تھا۔ ”پانی“..... زخمی کی درد میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دی۔ ام المومنین نے پیالہ اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ زخمی نے مشکل گھونٹ گھونٹ پی کر پیالہ خالی کیا۔ قدرے جان آئی، جان میں جان آئی۔ ایسا معلوم ہوا جیسے بجھتے ہوئے چراغ نے تیل کے چند قطرے پڑنے پر سنبھال لیا ہو اُس نے بے نور آنکھیں کھول دیں۔

ام المومنین..... اس نے حضرت عائشہ کو دیکھ کر اٹھنا چاہا مگر درد کی ٹیس نے بے حال کر دیا اور پھر شدت سے کراہا۔ نہیں، نہیں، تم لیٹے رہو، بیٹھنے کی کوشش نہ کرنا، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا اور ساتھ ہی اُس کے جسم سے تیر کھینچنے کی کوشش کی۔

”ٹھہریے ام المومنین“ خدا را ایسا ہرگز نہ کیجئے گا۔ تیر نکلتے ہی میں ختم ہو جاؤں گا، میں ابھی مرنا نہیں چاہتا، مجھے ابھی موت نہیں چاہیے۔ تم زندہ رہو گے، ام المومنین نے زخمی کو تسلی دینا چاہی۔ جواب میں زخمی کی دھیمی سنی آواز سنائی دی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے محسوس کیا کہ وہ کچھ کہہ رہا ہے، انہوں نے اپنا کان اس کے قریب کر دیا۔ وہ کہہ رہا تھا ”ام المومنین تسلی دینے کی کوشش نہ کیجئے، موت کو سامنے دیکھ کر آنکھیں بند کر لینے سے موٹ ٹل نہیں جایا کرتی مگر میں ابھی مرنا نہیں چاہتا تا وقتیکہ میں اللہ کے رسول کی زیارت نہ کر لوں۔ اے کاش! آپ خدا کے محبوب تک یہ پیغام پہنچا سکتیں کہ ان کا ایک غلام زیاد رضی اللہ عنہ دنیا سے رخصت ہو رہا ہے۔ شاید پھر کب ملاقات ہو اے کاش..... کاش۔“

.....O.....

ام المومنین کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور فوراً حضور کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی: یا رسول

اللہ زیاد کا آخری وقت ہے اور وہ آپ کو یاد کر رہا ہے اس کی آخری خواہش آپ کی زیارت ہے جلدی کیجئے۔ رحمۃ للعالمین نے فرمایا ”چلو عائشہ مجھے جلدی سے وہیں لے چلو“ اُم المومنین کے ہمراہ سرور دو عالم جاں بلب عاشق صادق کے قریب پہنچے۔ زیاد ابھی تک موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔

زیاد آنکھیں کھولو دیکھو تو میں آگیا ہوں۔ رحمت دو عالم نے شفقت سے زیاد کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے آواز دی۔

اس آواز کے کانوں میں پڑتے ہی جسے زیاد ہزاروں دفعہ سن چکا تھا اس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں نظریں سرور دو عالم کی نظروں سے ملیں اور پھر ایسے معلوم ہوا جیسے بے قرار آنکھوں کو قرار آ گیا ہو مگر ساتھ ہی پلکوں کی اوٹ سے اشکوں کے موتی جھلملانے لگے..... یہ غم کے آنسو نہیں تھے..... زخمی اپنی خوش نصیبی پر ناز کر رہا تھا۔

”زیاد..... کوئی آخری وصیت ہو تو..... سرور دو عالم نے دریافت کیا۔“

آخری وصیت زخمی کی آنکھوں میں عجیب سی چمک پیدا ہوئی۔ ”میرے آقا! میری خواہش یہ ہے کہ میں آپ کے قدموں میں جان دوں۔ زخمی نے بمشکل فقرہ ادا کیا“ اور خود کو گھسیٹتے ہوئے حضور اکرم کے قدموں میں پہنچانے کی کوشش کی۔ آپ نے اُس کے سر کو گود میں رکھ لیا۔ زخمی کے جسم سے بہنے والے خون نے آپ کے کپڑوں کو بھی رنگ دیا۔ زیاد تکلیکی باندھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھتے رہے۔

”کوئی اور خواہش رحمۃ للعالمین نے زخمی کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے آنسوؤں کو ضبط کرتے ہوئے کہا۔“

”نہیں آقا زیاد نے نفی میں سر ہلایا“ میں کس قدر بد بخت ہوں کہ آخری وقت آپ کو تکلیف دے رہا ہوں“

زیاد نے کپکپاتے ہوئے ہونٹوں سے کہا:

مرا دل ہو ترا گھر ہو ترا در ہو مرا سر ہو
تمنا مختصر سی ہے مگر تمہید طولانی

”نہیں، نہیں، رسول خدا نے اسے روک دیا، زیاد ایسا ہرگز نہ کہو اوپر دیکھو۔ زیاد نے اوپر نظریں اٹھائیں اور مسکرا پڑے۔ شاید مالک جنت نے کوئی نظارہ دکھا دیا تھا۔“

الوداع یا رسول اللہ زیاد کستائے بڑی کوشش سے جسم کی تمام قوتوں کو مجتمع کر کے ایک بار تڑپے آنکھیں کھولنے کی کوشش کی مگر ناکام رہے۔ ہونٹ آہستہ آہستہ ہل رہے تھے۔ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ پھر ایک ہچکی لی اور اپنی جان جان آفرین کے سپرد کر دی۔

.....O.....

ام المؤمنین مشکیزہ کندھے پر رکھے انگلی دانتوں میں دبائے ہوئے سوچ رہی تھیں کہ کس قدر عجیب تھی زیاد کی آخری خواہش۔ اُس شہید محبت کا چہرہ پرسکون اور صاف تھا۔ ایسا سکون صرف اسی وقت حاصل ہوتا ہے جب راہی منزل مقصود تک پہنچ جاتا ہے۔ زخموں سے خون رس رس کر اب بھی مٹی میں جذب ہو رہا تھا اور احد کی پیاسی ریتلی زمین اپنی لالہ زاری پرناز کر رہی تھی۔ آسمان کی رفعتیں جھک جھک کر اس کے جسد خاکی سے ہم کنار ہو رہی تھیں۔ شاید ایک دنیا کو الوداع کہنے والے مجاہد کے استقبال کی تیاریاں دوسرے جہان میں بڑی شان سے ہو رہی تھیں اور احد کے ذرے گنگنا رہے تھے

بنا کر دند خوش رسے بخاک و خون غلطیدن

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را!



حضرت سیدنا امام زین العابدین رضی اللہ عنہ

آبروئے اہل ایمان یہ امام ابن امام
فکر انساں سے فزوں تر بہت ہے بہت ان کا مقام
خالق کونین کی الفت میں یہ سرشار تھے
ان کی عظمت ان کی شوکت ہے مسلم لاکلام
جن کا ثانی ہی نہیں وہ عابد و سجاد ہیں
منبر و محراب کی زینت حبیب خاص و عام
نقش باطل بن کے آخر مٹ گئی شان یزید
اور امام پاک کے تذکار کی عظمت مدام
ان کے ارشادات سے گلزار دل مہکا ہوا
رفت افلاک پر ہے گونجتا ان کا ہی نام
سید السادات ہیں یہ شوکت دنیا و دیں
آج بھی بزم جہاں میں ان کا جاری ہے نظام
مرکز حسن عقیدت شاہ زین العابدین
غازی کرب و بلا کو اے رضا میرا سلام

(محمد اکرم رضا)

جگر گوشہ شبیر

سیدنا حضرت امام زین العابدین رضی اللہ عنہ

سیدنا امام زین العابدین سانحہ کربلا کا وہ کردار ہیں جنہوں نے کربلا میں ہزاروں پر مشتمل افواج یزید کو خاندان حسین رضی اللہ عنہ کے جگر پاروں کے ساتھ خون کی ہولی کھیلتے دیکھا۔ وہ مقدس افراد کہ جن کی نظیر بزم ہستی پھر کبھی نہ دیکھ سکے گی۔ یزید کی ہوس اقتداء کی بھینٹ چڑھ گئے۔ کربلا میں زمین لہو سے اٹ گئی۔ اہل بیت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا مقدس لہو پانی سے بھی زیادہ ارزاں ہو گیا۔ بچوں کے سر نیزوں پر اچھالے گئے۔ جوانان اہل بیت کو تہ تیغ کیا گیا۔ نواسہ رسول جگر گوشہ بتول کا سر اقدس حالت سجدہ میں ان کے جسم سے جدا کیا گیا۔ ان شہداء کے جسموں پر گھوڑے دوڑاتے گئے ان کو کئی روز بھوکا پیاسا رکھ کر موت کے حوالے کیا گیا لیکن سلام حضرت امام حسین اور آپ کے اہل خاندان اور رفقاء پر جنہوں نے اپنے قدموں میں ہلکی سی لرزش پیدا ہونے نہ دی بلکہ مسکراتے ہوئے عظمت اسلام کی رجز خوانی کرتے ہوئے لہو میں نہا گئے۔ پھر خاندان رسول کی عظیم المرتبت خواتین کے ساتھ نازیبا سلوک کیا گیا، خمیوں کو آگ لگائی گئی۔ ان کے رخساروں پر طمانچے مارے گئے، خاندان حسین رضی اللہ عنہ کے تمام اعزا شہید ہو چکے تھے۔ صرف امام زین العابدین زندہ بچ گئے، شدید ترین بیمار تھے، بار بار اٹھتے اور پھر گر پڑتے، کئی بار اٹھنے اور جنگی ہتھیار سجانے کا عزم کیا مگر نقاہت غالب آگئی اور سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ اور سیدہ زینت رضی اللہ عنہا نے روک لیا۔ یہ تھے حضرت امام زین العابدین، خاندان امام حسین رضی اللہ عنہ کے مردوں اور بچوں میں سے زندہ بچنے والے سانحہ کربلا کے واحد شاہد جو اس سانحہ فاجعہ کے بعد ہمیشہ ہمیشہ کیلئے مسکراہٹ سے محروم ہو گئے۔

حضرت امام زین العابدین کا نام نامی اسم گرامی سیدنا علی بن حسین رضی اللہ عنہ تھا۔ آپ امام زین العابدین کے نام سے مشہور ہوئے۔

آپ کو سجاد بھی کہا جاتا ہے۔ حضرت امام حسین کی اولاد میں سے صرف آپ اکیلے ہی زندہ

بچ گئے۔ بقیہ اولاد میدان کربلا میں راہ حق میں قربان کر دی تھی۔ آپ کی ذات گلستان مصطفوی کا تھا پھول تھی جو افتاد کربلا کے بعد باقی بچی اور آپ کی ہی اولاد آج دنیا کے کونے کونے میں آباد ہے۔ آپ ایران کے آخری بادشاہ یزدگرد کی بیٹی کے بطن سے تھے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں قیدی ہو کر آئیں تھیں۔ آپ کے والد حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ ابن علی شیر خدا ابن ابی طالب تھے۔ واقعات کربلا کے وقت آپ تپ میں مبتلا تھے اس لئے جنگ میں شریک نہ ہوئے اور قتل ہونے سے بھی بچ گئے مگر بعد قتل حسین رضی اللہ عنہ آپ پر جو مصیبتیں پڑیں ان کے تصور سے ہی دل کانپ جاتا ہے۔ آپ کو بھاری بیڑیاں پہنا کر اور تھیموں، بیواؤں اور مظلوموں کے قافلے کا سردار بنا کر کربلا سے کوفہ لے جایا گیا۔ وہاں ابن زیاد کے دربار میں حاضری دی گئی۔ ابن زیاد سے بیخ کلامی کے دوران آپ کے قتل کا حکم دیا گیا مگر جناب زینب جو کہ آپ کی پھوپھی اور حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی ہمیشہ تھیں، آپ سے لپٹ گئیں اور امام کے ساتھ اپنے قتل پر زور دیا۔ اہل دربار کے کہنے سننے سے ابن زیاد اس ارادہ سے باز رہا۔ پھر تمام قیدیوں کو بے کجاوہ اونٹوں پر بٹھا کر کوفہ سے دربار یزید میں دمشق روانہ کیا۔ بیمار کربلا نے مستورات پاکباز کے ساتھ یہ تقریبات سو میل کا سفر جس طرح کیا کچھ اس کا ہی دل جانتا ہوگا۔

روایت ہے کہ بے آب و گیاه لق و دق صحرا میں جبکہ سورج کی تپش سے ریت بھی بے انتہا گرم تھی، قافلہ کے اونٹوں کو بھگایا گیا، پیاس سے جان بلب بچے راہ میں اونٹوں سے گر گئے۔ قافلہ نہ رکا، چلتا رہا اور گرے ہوئے بچے گرم ریت پر ٹپ کر جان دیتے رہے۔

ایک مؤرخ کے بقول چالیس دن اور دوسرے کے بقول ستائیس دن میں دمشق پہنچے۔ دمشق پہنچنے پر قافلہ کو شہر سے باہر روک دیا گیا۔ شہر کو اچھی طرح سجایا گیا، قیدیوں کا تماشا دیکھنے کو لوگ جوق در جوق جمع تھے۔ حضرت امام زین العابدین کے منع کرنے کے باوجود اس قافلہ کو پہلے تمام شہر کے سبے سجائے راستوں پر پھرایا گیا، ان کا تماشا دکھایا گیا، پھر دربار یزید میں حاضری ہوئی۔ یزید ملعون نے سر امام حسین رضی اللہ عنہ کو طشت میں رکھ کر اپنے سامنے رکھا اور امام زین العابدین سے کہا کہ دیکھا یہ سزیہ دن تم کو اس لئے دیکھنا نصیب ہوا کہ حسین نے حکومت کے لالچ میں خودکشی کی۔ میرے ساتھ کوئی بہتر سلوک نہ کیا، آخر اپنے انجام کو پہنچا اور کیا خدا نے تم کو ہلاک نہیں کیا۔ امام پاک نے فرمایا ”یزید اتنا گھمنڈ نہ کر تو عنقریب اپنے انجام کو پہنچے گا۔ خداوند تعالیٰ نے ہمیں جس امتحان میں ڈالا، خدا کے فضل سے ہم اس میں پورے اترے مگر ہلاکت تمہارے واسطے ہے جو

تمہارے سر پر کھڑی ہے۔ یہ کلمہ سن کر یزید کو طیش آیا اور حکم دیا کہ اس کو قتل کر دیا جائے۔ مگر اس جگہ بھی جناب زینب رضی اللہ عنہا ہمیشہ امام حسین رضی اللہ عنہ رکاوٹ بنیں اور کسی وجہ سے یزید نے ان کو قتل نہ کیا بلکہ ایک تنگ و تاریک قید خانہ میں سب کو مقید کر دیا۔ جتنا عرصہ بھی آپ قید میں رہے آپ کا تمام وقت رونے میں اور عبادت میں گذرتا۔

بہر حال قید و بند کی سخت ترین صعوبتیں جھیل کر جب یہ قافلہ اپنے گھر مدینہ واپس آیا تو اپنے گھرانے کی تباہی اپنی بے بسی اور یزید شمر بن زیاد و عمر بن سعد کے ظلم و جور نے آپ کا دل ایسا توڑ دیا کہ واپس آنے کے بعد آپ نے مکمل گوشہ نشینی اختیار کر لی اور کسی قسم کی دنیاوی باتوں سے اپنا تعلق نہ رکھا۔

روایت ہے کہ آخر دم تک آپ کو کسی نے ہنستے ہوئے نہ دیکھا۔ آپ کی آنکھیں خوف خدا سے اور اپنے غموں کی وجہ سے ہر وقت پر نم رہتیں۔

آپ کے علم کے بارے میں سب علماء کا اتفاق ہے۔ چونکہ آپ خانوادہ رسالت کے چشم و چراغ تھے آپ کے جد امجد حضرت علی رضی اللہ عنہ علم کا دروازہ تھے اس لئے علم اس گھر کی دولت تھا۔ ایک امام کا قول ہے کہ مدینے میں امام زین العابدین رضی اللہ عنہ سے افضل کسی کو نہ پایا اور نہ اطراف میں کسی کو سنا۔

آپ اس گھر کے چشم و چراغ تھے جو زیرِ خنجر بھی عبادت کرتے رہے۔ آپ اس کے پوتے تھے جس کی تلوار کی ایک ضرب تمام عالم کی عبادت سے بہتر ہے۔ اسی لئے آپ دن رات عبادت الہی میں مشغول رہتے۔

روایت ہے کہ آپ ہر روز ایک ہزار رکعت نماز ادا فرماتے اور آخر دم تک اس معمول میں کوئی فرق نہ آیا۔ آپ پیکر عبادت تھے اسی وجہ سے ہاتف نے آواز دی۔ انت زین العابدین (یعنی بے شک یہ عابدوں کی زینت ہیں) عبادت میں محو تھے مگر گھر میں آگ لگ گئی لوگوں نے پکارا اور بار بار پکارا مگر آپ دنیا سے بے خبر اپنے مالک حقیقی کے روبرو سجدہ ریز تھے۔ آگ لگی بھی اور بجھا بھی دی گئی مگر آپ کو بالکل خبر نہ ہوئی۔ بعد فراغت نماز لوگوں نے پوچھا ”اے نواسہ رسول آپ کو کتنا پکارا“ آپ بالکل متوجہ نہ ہوئے آپ اس آگ کی گرمی اور تپش سے کس طرح بے خبر رہے۔ فرمایا ”میرے سامنے دوزخ کی آگ بھی ہے اور دوزخ کی آگ سے یہ آگ زیادہ نہیں۔“

آپ حد درجہ فیاض اور دریا دل تھے مدینے میں تقریباً ایک سو گھروں کی آپ غائبانہ کفالت

فرماتے۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی کہ کس طرح اور کہاں سے آتا ہے۔ مگر آپ کی رحلت کے بعد یہ عقدہ کھلا۔ آپ اتنے تحمل مزاج تھے کہ کسی کی سخت سے سخت گفتگو کا آپ پر اثر نہ ہوتا۔ بڑی بڑی ناگوار باتیں سن کر آپ صبر سے کام لیتے۔ حتیٰ کہ سخت کلمہ کہنے والا خود ہی پشیمان ہوتا۔ آپ کی جلالت کا یہ عالم تھا کہ کس قدر مجمع ہو آپ جدھر چاہیں نکل جائیں، تمام مجمع فوراً چھٹ جاتا اور آپ کو راستہ دے دیتا۔

ایک مرتبہ ہشام بن عبدالملک ولی عہدی کے عہد میں حج بیت اللہ کو آیا۔ طواف کے بعد حجر اسود کو بوسہ دینے کیلئے بڑھا مگر ہجوم کی وجہ سے راستہ نہ ملا اور واپس آ کر حجاج کا تماشہ دیکھنے ایک طرف ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اتنے میں امام زین العابدین تشریف لائے۔ طواف کعبہ کیا، پھر حجر اسود کی طرف بڑھے اور ان کو دیکھتے ہی تمام مجمع کائی کی طرح چھٹ گیا۔ آپ کو سب نے بصد شوق راستہ دیا۔ آپ نے حجر اسود کو بوسہ دیا، یہ منظر دیکھ کر دل میں آگ بگولا ہو گیا۔ انجان بن کر پوچھا ”یہ کون شخص ہے“ فرزوق نامی ایک شاعر جو موقع پر موجود تھا بولا کہ آپ نہیں جانتے تو میں بتاتا ہوں کہ یہ کون شخص ہے۔ یہ کہہ کر فرزوق نے ایک قصیدہ امام زین العابدین کی شان میں پڑھا۔ یہ قصیدہ سن کر ہشام ناراض ہوا اور فرزوق کو قید میں ڈال دیا۔ اس کے بعد امام نے فرزوق کو بارہ ہزار درہم انعام عطا فرمایا۔ فرزوق نے جواب دیا کہ میں نے انعام کے لالچ میں یہ قصیدہ نہیں پڑھا بلکہ میں نے کلمہ حق ادا کیا ہے، صرف خدا کی خوشنودی کیلئے۔

آپ نے فرمایا ”سچ ہے خدا تم کو اس کا اجر دے گا، یہ رقم بھی تم لے لو کہ ہم اہل بیت جو چیز کسی کو دیتے ہیں پھر واپس نہیں لیتے۔“

ایک درد مند شاعر نے میدان کربلا میں سب کے شہید ہو جانے پر امام زین العابدین کے تاثرات کا یوں اظہار کیا ہے:

مجرئی روتا نہ عابد تو بھلا کیا کرتا
کہ بندھے ہاتھوں سے دفن شہدا کیا کرتا
ماں کی چادر کو بچا کہ بہن کے گوہر
ایک بیمار مصیبت زدہ کیا کیا کرتا
جب خبر ہو گئی مارے گئے رن میں شبیر
پیمان بولیں کہ اب دیکھیں خدا کیا کرتا

دھجیاں باندھتا تلووں سے نہ کیونکر سجاد
دشت پر خار میں وہ آبلہ پاکیا کرتا

واقعہ کربلا میں آپ کی عمر مبارک ۲۳ سال کی تھی۔ ۳۸ھ میں پیدا ہوئے۔ ۹۵ھ میں وفات پائی۔ امام زین العابدین کی نسل دنیا میں چھ فرزندوں محمد باقر، عبد اللہ الباہر، زید الشہید، عمر الاشرف، حسین الاصغر اور علی الاصغر سے باقی ہے۔ دو بیٹیاں ام کلثوم اور خدیجہ تھیں۔

امام صاحب اکثر رونے لگتے، یاد خداوندی اور شہدائے کربلا کی یاد میں، ایک مرتبہ آپ مدینہ کے بازار سے گزر رہے تھے۔ ایک قصاب کی دوکان پر پہنچے جو جانور کو ذبح کرنے لگا تھا۔ آپ نے فرمایا کہ سچ کہو جب تم جانور ذبح کرنے لگتے ہو تو اسے پانی پلاتے ہو یا نہیں؟ اس نے ادب سے عرض کیا ”یا امام! ہم اسے پانی ضرور پلاتے ہیں اب یہ اس کی مرضی ہے پئے یا نہ پئے“ یہ جواب سنتے ہی امام زین العابدین کی آنکھوں سے آنسو کی چھڑی لگ اور جب آنسو ذرا تھمے تو فرمایا: ”تم تو جانور کو ذبح کرتے ہوئے پانی کا خیال رکھتے ہو مگر یزید کے لشکر نے میرے ابا جان اور خاندان اہل بیت کی اتنی سی تدر بھی نہ کی کہ انہیں ذبح کرنے سے پہلے پانی کیلئے پوچھ لیتے۔“

لوگ آپ کے گرد گھیرا ڈالے رہتے، آپ کو مدینہ کے تمام علماء و فقہاء کا سردار سمجھا جاتا تھا، کئی بار بعض اصحاب دانستہ کوشش کرتے کہ امام زین العابدین ان کی کسی بات پر مسکرا پڑیں مگر آپ کی آنکھیں مسکرانے کے بجائے آنسوؤں سے پُر ہو جاتیں، اور فرماتے ”جس نے سانحہ کربلا میں اپنے پورے خاندان کو خنجروں، تلواروں سے ذبح ہوتے ہوئے دیکھا ہو وہ کیسے مسکرا پائے گا۔“ آپ کا مقصود یہی ہوتا تھا

ع..... تو نہ دیدی واقعات کربلا من دیدہ ام

یعنی اے میرے دوست کربلا کے واقعات کو فقط میں نے دیکھا ہے تو نے تو نہیں دیکھا اگر تو بھی دیکھ لیتا تو تیرا بھی نجانے کیا حال ہوتا؟

سیدنا امام زین العابدین رضی اللہ عنہ کے کردار انور کی چند جھلکیاں ملاحظہ فرمائیے:

ایک مرتبہ آپ نے ایک غلام کو آزاد کر دیا پھر اس کو زمین کا ایک ٹکڑا کاشت کرنے کو دے دیا، کچھ عرصہ بعد آپ زمین کو دیکھنے خود تشریف لے گئے تو دیکھا کہ زمین آباد نہیں کی بلکہ بنجر ہو گئی ہے۔ یہ دیکھ کر آپ کو غصہ آ گیا، غلام کو بلایا اور ہاتھ میں جو چھڑی تھی وہ اس کے جسم پر ماری۔ اس غصہ کی حالت میں ہی اپنے مکان پر تشریف لے آئے۔ بعد میں اسی غلام کو پھر اپنے پاس بلایا، غلام

بہت خوف زدہ تھا۔ ڈرتا ڈرتا حاضر خدمت ہوا اس کو دیکھ کر آپ نے اپنے جسم پر سے قمیص کو اتار دیا اور وہی چھڑی غلام کو دے کر کہا میں غصہ کی حالت میں تھا مجھے افسوس ہے کہ تم کو مارا اب یہی چھڑی تم میرے جسم پر مارو۔ غلام دست بستہ گویا ہوا میری یہ مجال کہاں میں حضور کا غلام ہوں آپ نے مجھ کو جو سزا دی تھی میں اس کا مستحق تھا۔ جب وہ کسی طرح مارنے پر راضی نہ ہوا تو آپ نے وہ زمین اس کی کو بخش دی اور وہ دعائیں دیتا ہوا چلا گیا۔

ایک مرتبہ ایک کنیر سے کھانا لاتے ہوئے کھانے کے برتن ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑے اور ٹوٹ گئے وہ خوف سے کاہنے لگی۔ آپ نے اسکو خوف زدہ دیکھ کر فرمایا ”جا میں نے تجھ کو آزاد کیا“۔

.....O.....

ایک مرتبہ آپ زید بن اسامہ کی عیادت کو تشریف لے گئے۔ زید بن اسامہ آپ کو دیکھ کر رو پڑے۔ آپ نے پوچھا: کیوں روتے ہو کہنے لگے دنیا سے جا رہا ہوں مگر پندرہ ہزار دینار کا مقروض ہوں اور بعد میں کوئی جائیداد ایسی نہیں ہے کہ فروخت سے قرض اتر سکے۔ آپ نے فرمایا ”فکر نہ کرو تمہارا قرض میں ادا کروں گا“ لہذا زید کی موت کے بعد آپ نے اس کا تمام قرض چکا دیا۔

.....O.....

بہت سی روایتوں میں رقم ہے کہ شہادت حضرت امام حسین کے بعد محمد بن حنفیہ نے بھی امامت کا دعویٰ کیا اور امام زین العابدین بھی امام تھے۔ لہذا کچھ لوگ امام زین العابدین کو امام وقت مانتے اور کچھ محمد بن حنفیہ کو امام مانتے دونوں حضرات میں یہ جھگڑا کافی طول پکڑ گیا۔ آخر کار دونوں اس فیصلے پر رضامند ہو گئے کہ حجر الاسود سے فیصلہ کرایا جائے اور اس کا فیصلہ آخری ہو گا۔ لہذا دونوں حضرات کعبہ شریف میں تشریف لے گئے۔ ایک جم غفیر بھی فیصلہ سننے اور حجر الاسود کے کلام کرنے کا معجزہ دیکھنے ساتھ ہو گیا۔ وہاں پہنچ کر محمد بن حنفیہ نے حجر الاسود کو مخاطب کر کے کہا کہ اے حجر الاسود بتا کہ میں محمد بن حنفیہ امام وقت ہوں کہ نہیں پتھر خاموش رہا کوئی آواز نہیں آئی۔ اس کے بعد امام زین العابدین نے فرمایا: اے پتھر حکم خدا سے گویا ہو اور بتا کہ بعد از امام حسین امام کون ہے؟ پتھر کو جنبش ہوئی کانتا اور حکم خدا سے گویا ہوا کہ حسین بن علی (رضی اللہ عنہما) کے بعد امام زین العابدین ہی امام برحق ہیں۔ یہ سن کر محمد بن حنفیہ آپ کے ہاتھ پر بیعت کی اور آپ کو امام برحق مان لیا، بعض کتب میں لکھا ہے کہ سب کچھ محمد بن حنفیہ نے جان بوجھ کر کیا تھا کہ عام لوگ جان لیں کہ امام برحق میں نہیں ہوں بلکہ امام زین العابدین ہی ہیں۔

حضرت امام زین العابدین رضی اللہ عنہ بہت بڑے خطیب تھے۔ ابن زیاد اور پھر یزید کے دربار میں آپ کے خطبات نے کوفہ اور دمشق والوں کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر دی تھیں۔ خود یزید بھی آپ کے خطبات کی تاثیر سے لرز اٹھا تھا۔ اس کے علاوہ مدینہ منورہ میں آپ کے خطبات عالیہ شان خطابت اور تاثیر کا امتزاج لئے ہوئے ہیں۔ ہم فقط آپ کے ایک خطبہ کے اقتباسات پیش کر رہے ہیں جو آپ نے مدینہ طیبہ کے قریب ارشاد فرمایا:

قید کاٹ کر جب یہ لٹا ہوا قافلہ واپس مدینہ پہنچا تو امام زین العابدین نے تمام قافلے کو مدینہ کے باہر ہی پڑاؤ ڈالنے کا حکم دیا۔ ایک شخص کو شہر بھیجا کہ جا کر تمام اہل مدینہ کو خبر کر دے کہ امام حسین کا لٹا ہوا قافلہ آ گیا ہے اور مدینہ کے باہر خیمہ زن ہے۔

دیکھتے ہی دیکھتے تمام اہل مدینہ وہاں جمع ہو گئے۔ اپنے امام کے استقبال کیلئے شہر سے باہر آ گئے۔ آہ و بکا سے آواز سنائی نہ دیتی تھی، امام پاک نے اشارہ سے سب کو خاموش رہنے کو کہا اور بعد حمد و ثنا فرمانے لگے۔

شکر ہے اس خداوند کریم کا جس نے ہمیں بڑی سے بڑی آزمائشوں میں ڈالا اور کامیاب فرمایا۔

اے لوگو! راہِ خدا میں حسین شہید کر دیئے گئے۔ عورتوں اور بچوں کو قیدی بنا لیا گیا اور لشکر یزید نے سر حسین کو نوک نیزہ پر بلند کیا اور شہر شہر پھرایا۔

جو مصیبت ہم پر پڑی ہے اس کے برابر دنیا کی کوئی مصیبت نہیں ہے۔ کون انسان ایسا ہے جو ہماری مصیبت پر رونہ دے، کوئی ایسا دل نہیں جو اس اندوہناک واقع کے بعد خوش رہ سکے۔

کوئی ایسی آنکھ نہیں جو اپنے آنسو روک لے، حسین مظلوم کی شہادت پر ساتوں آسمان رو دیئے۔ سمندر اور ریگ زار روئے، زمین اور اس کے اطراف روئے، شجر و حجر روئے، آسمان والے اور ملائکہ مقررین روئے۔

اے لوگو! ہماری یہ حالت تھی کہ قیدی بنا کر طوق و زنجیر پہنایا گیا۔ ایک رسی میں سب خورد و کلاں کے گلے باندھے گئے پھر در بدر پھرایا گیا۔ ایسا سلوک زر خرید غلاموں اور لونڈیوں سے بھی روا نہیں تھا۔ ہم لوگ اس کڑی سزا کے سزاوار نہ تھے، بے جرم تھے، ہم خدا کیلئے ہی ہیں اور اس ہی سے ہماری فریاد ہے۔“

امیر المومنین

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ

عدل اسلام کی زندہ گواہی

فاران کی چوٹیوں سے اُبھرنے والا آفتابِ دنیائے ظلمت کو منور کر کے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ میں روپوش ہو چکا تھا۔ خلفائے راشدین یکے بعد دیگرے ہادی اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصولوں کی پیروی کرتے ہوئے تاریخ کے صفحات پر اپنی خلافت کے شاندار نقوش چھوڑ کر ابدی نیند سو چکے تھے۔ خلافت کی جگہ شہنشاہیت اور ملوکیت نے لے لی تھی۔ پہلے مسلمانوں کا ”امیر سید القوم خادہم“ کے سنہری اصول کا پابند تھا۔ اب اس کی زندگی بھی دنیا کے دوسرے شہنشاہوں کی طرح بسر ہوتی تھی۔ عہد بنو امیہ میں عبدالملک اور ولید کے بعد خلیفہ سلیمان بن عبدالملک اگر ساری زندگی میں کوئی بہتر کام کر سکا تھا تو یہی کہ اپنا جانشین سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کو مقرر کیا گیا تھا۔ خلافت سے قبل حضرت عمر بن عبدالعزیز کی زندگی بڑے شاندار طریق سے بسر ہوتی تھی۔ دیبا و حریر کا لباس، بیش قیمت جبہ عربی گھوڑا، جلو میں خدام رہنے کو محل، مگر خلافت کے بعد یہ سب کچھ ختم ہو گیا۔ اپنی ہر چیز کو بیت المال کی ملکیت قرار دے دیا۔ رشتہ داروں کی جاگیریں ضبط کر لیں، شاعروں اور خوشامدیوں کو دربار سے نکال باہر کیا، غرباء اور مساکین کے وظائف مقرر کئے، ان کے ان ہی کارناموں کی بدولت ان کا شمار خلفائے راشدین میں کیا جاتا ہے اور عمر ثانی بھی کہا جاتا ہے۔

سہ پہر کا وقت ہے، خلیفۃ المسلمین سیدنا عمر بن عبدالعزیز گھر میں موجود نہیں ہیں۔ سادہ سا مکان ہے جس کے صحن میں امیر المومنین کی زوجہ محترمہ ایک موٹھے پر تشریف فرما ہیں۔ یہ وہی زوجہ محترمہ ہیں جو اپنے خاوند کی خلافت سے قبل کروڑوں کی جاگیر اور محلات کی مالک ہیں مگر انہوں نے

اپنے خاوند کی تقلید میں سب کچھ چھوڑ دیا۔ ایک بڑھیا جس کے چہرے پر کچھ تو بڑھاپے نے اور کچھ غم روزگار نے جھریاں ڈال رکھی ہیں، جھجکتی ہوئی اندر داخل ہوتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ کسی خاص ضرورت سے آئی ہو۔ اس کے اندر آنے پر امیر المومنین کی زوجہ حضرت فاطمہ نے اسے یہ کہتے ہوئے ایک موٹھا پیش کیا۔ تشریف رکھو اماں۔ بڑھیا کی جھجک پھر بھی دور نہ ہوئی اور وہ اسی طرح آنکھیں پھاڑے مکان کے درود یوار کو دیکھتی رہی۔ حضرت فاطمہ نے اس کی محویت کو توڑا اور کہا ”اماں کیا دیکھ رہی ہو بیٹھو تو سہی، آخر کام کیا ہے؟“ اور پھر یکا یک بڑھیا کو جیسے کچھ یاد آ گیا ہو۔ ”معاف کرنا بیٹی! میں کسی اور گھر میں آگئی، میں امیر المومنین عمر کو ملنا چاہتی تھی اور عمر کے محل کا پتہ پوچھتے ہوئے یہاں تک چلی آئی تھی، کسی نے مجھے اس مکان کے اندر جانے کا اشارہ کیا اور میں چلی آئی، بیٹی جس کسی سے بھی میں نے امیر المومنین کے محل کا پتہ دریافت کیا وہی محل کا نام سن کر ہنس پڑا۔ اب تم نہ ہنسنا، مجھے ان کے محل کا پتہ بتا دو مجھے ان سے ایک بہت ضروری کام ہے۔“

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے کہا ”اماں! یہی امیر المومنین کا محل ہے، یہی قصر خلافت ہے۔“

”میرے اللہ میں کیا سن رہی ہوں، بڑھیا نے کہا، خدا جھوٹ نہ بلوائے، ابھی ایک ہی سال کی بات ہے میں اسی کام کے لئے جس کے لئے موجودہ خلیفہ کے پاس آئی ہوں، خلیفہ سلیمان کے محل میں بھی گئی تھی تو جس محل میں وہ خلیفہ رہتا تھا وہ تو بڑا شاندار تھا، دروازوں پر دربان کھڑے تھے، جنہوں نے مجھے اندر جانے نہ دیا، اور اگر خدا خدا کر کے ان کو میری گریہ زاری پر رحم آیا اور مجھے اندر جانے کی اجازت ملی تو خلیفہ نے مجھے بھکارن سمجھ کر چند درہم دے کر رخصت کر دیا، ہو سکتا ہے کہ.....“

”لیکن اماں سنو تو..... حضرت فاطمہ نے اسے ٹوکا، مگر بڑھیا اپنی ہی رو میں کہتی گئی۔ ”ہو سکتا ہے موجودہ خلیفہ کا دربان بھی مجھے دھکے دے کر نکال دے مگر مجھے ان کے محل کا پتہ تو بتا دو۔ اگر تم نہیں بتا سکتیں تو میں جاتی ہوں۔“

.....○.....

بڑھیا یہ کہہ کر جانے کو بڑھی۔ حضرت فاطمہ نے اسے اٹھ کر بازو سے پکڑا اور کہا ”چھوٹے بزرگوں سے مذاق نہیں کیا کرتے اماں۔ اور بھلا یہ بھی کوئی موقع ہے مذاق کا۔ خدا کی قسم یہی امیر المومنین کا مکان ہے، میں مذاق نہیں کرتی اور امیر المومنین کے محل کے متعلق تم نے اپنے دل میں جو کچھ سوچ رکھا تھا وہ غلط ہے، تم نے امیر المومنین کو غلط سمجھا ہے۔“ بڑھیا کو جیسے کچھ یقین آ گیا ہو، بیٹھ گئی اور کہنے لگی کیا امیر المومنین واقعی اس قدر سادہ زندگی بسر کرتے ہیں، دروازے پر کوئی دربان نہیں،

Click For More Books

<https://archive.org/details/@zohaibhasanattari>

خلافت کا بار اٹھانے سے قبل ان کی زندگی بہت ٹھاٹھ دار ہوا کرتی تھی۔

”اور تمہیں اس زندگی سے کوئی شکایت نہیں ہے، وہ تو بادشاہ ہیں، خزانہ تو ان کی ملکیت ہے۔“
شکایت کیسی اماں میں پہلی زندگی میں بھی خوش تھی اور اب بھی راضی ہوں۔ امیر المومنین کی
عین خوشی ہی میری رضا ہے، اور وہ خزانہ کو عوام کا روپیہ سمجھتے ہیں اور ان ہی پر خرچ کرتے ہیں، اپنی
ذات پر اور گھر میں وہ سوائے چند مقررہ درہموں کے ایک پائی بھی خرچ کرنا حرام سمجھتے ہیں۔“
”اور امیر المومنین اس وقت کہاں ہیں؟“

”وہ اس وقت بازار سے زیتون کا تیل لینے گئے ہیں۔“ حضرت فاطمہ نے جواب میں کہا۔
گھر کے سارے کام کاج بھی ان ہی کو کرنے پڑتے ہیں۔ معمولی سی تنخواہ اجازت نہیں دیتی کہ کسی
نوکر کا بار اٹھایا جاسکے۔ اتنے میں ایک شخص جس کے چہرے پر بڑھاپا غالب آ ہی چکا ہے اندر داخل
ہوا، ایک برتن حضرت فاطمہ کی طرف بڑھایا اور پھر باہر نکلنے ہی والا تھا کہ حضرت فاطمہ نے کہا:
”امیر المومنین ٹھہریے“..... امیر المومنین کے لفظ پر بڑھیا نے غور سے اس شخص کی جانب
دیکھا۔ یہ امیر المومنین ہے۔ خلیفہ وقت بیت المال کو جس طرح چاہے خرچ کر سکتا ہے مگر اس قدر
سادہ۔ حضرت فاطمہ کی آواز پر امیر المومنین ٹھہر گئے۔

کیا بات ہے فاطمہ؟ انہوں نے پھر قریب آ کر کہا:

”یہ اماں آپ کے پاس کسی ضروری کام کیلئے آئی ہیں۔“ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے چہرہ
بڑھیا کی طرف پھیرا اور پھر کہا ”آؤ اماں میرے ساتھ“ بڑھیا خاموشی سے اٹھی اور امیر المومنین کے
پیچھے چل پڑی۔ حضرت عمر اسے دو کمروں کے ساتھ والی ایک چھوٹی سی کوٹھڑی میں لے آئے جس
میں دن کے وقت بھی رات کا سماں دکھائی دیتا تھا۔ حضرت عمر نے خود ہی ایک مٹی کا دیا جلایا اور پھر
بڑھیا کی طرف دیکھ کر جو ابھی تک حیران و ششدر کھڑی تھی، نیچے بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ بڑھیا اسی
چٹائی پر جس پر امیر المومنین تشریف فرما تھے بیٹھ گئی۔ ”اب کہو اماں، تمہیں عمر سے کیا کام ہے؟“

.....O.....

بڑھیا سوچ میں پڑ گئی۔ بتائے یا نہ بتائے وہ تو اپنی دونوں جوان بیٹیوں کی شادی کیلئے روپیہ
لینے کیلئے آئی تھی۔ مگر یہاں معاملہ ہی اور تھا۔ جو شخص خود معمولی سے مکان میں رہتا ہے، نوکر رکھ نہیں
سکتا، گھر کا کام کاج خود کرتا ہے، تھوڑی سی تنخواہ لیتا ہے، وہ میری حاجت پوری کس طرح کر سکتا ہے
حضرت عمر نے اسے خاموش دیکھ کر پھر کہا:

”بتاؤ اماں! تمہاری تکلیف ہر ممکن طریقہ سے دور کرنے کی کوشش کی جائے گی۔“
”میں آئی تو ایک ضروری کام کیلئے تھی مگر دیکھ رہی ہوں کہ وہ کام نہیں ہو سکتا۔“
”بتلاؤ تو سہی وہ کام خدا مسبب الاسباب ہے۔“

”بات دراصل یہ ہے امیر المومنین کہ میں دو جوان لڑکیوں کی شادی کرنا چاہتی ہوں ان کا باپ بہت عرصہ ہوا فوت ہو چکا ہے گھر میں کوئی کمانے والا نہیں ہے۔ گھر میں دو چھوٹے بچے اور ہیں ایک لڑکی اور ایک لڑکا۔ بیٹیوں کی شادی کیلئے گھر میں پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے۔ شادی تو بہت عرصہ پہلے کی ہو چکی ہوتی مگر کس طرح؟ جہیز میں کیا دیتی اب میں دیکھ رہی ہوں کہ جو لوگ خود ہی امداد کے مستحق ہیں وہ بھلا میری امداد کیا کر سکیں گے۔“

امیر المومنین نے بڑھیا کی طرف دیکھا ”شاید تمہیں ابھی تک میرے متعلق کچھ بھی نہیں معلوم۔ کیا فاطمہ نے بھی کچھ نہیں بتایا۔“

”انہوں نے تو بتایا تھا امیر المومنین..... اسی پر تو میں حیران ہوں۔“

تمہارے ہی حیران ہونے والی بات نہیں ہے اس پر مستقبل کے مورخ بھی حیران ہوں گے۔ میرے پیشرو اپنی شان و شوکت کے مظاہرہ کے سلسلہ میں اس قدر آگے جا چکے تھے کہ لوگوں کو آج میری سادگی بھی کھٹک رہی ہے۔ ہمیں کچھ نہیں چاہئے، خزانہ تو رعایا کا ہے اور سوچو تو سہی بھلا وہ رعایا کی بہتری اور رعایا کی ضروریات پر خرچ نہیں ہوگا تو کس پر ہوگا۔ اطمینان رکھو تمہاری تکلیف دور کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جائے گی۔ یہ کہہ کر امیر المومنین اٹھے، کاغذات کے ڈھیر میں سے ایک سفید کاغذ نکالا اور اس پر مہر لگا کر شاہی فرمان لکھنا شروع کیا۔

امیر المومنین عمر بن عبدالعزیز کی طرف سے محاسب بیت المال کے نام

”یہ بڑھیا امداد کی مستحق ہے اس کی بیٹی کی شادی کیلئے اسے دو ہزار دینار دیئے جائیں۔“

ابھی وہ اتنا ہی لکھ پائے تھے کہ بڑھیا نے دریافت کیا۔ ”کیا لکھا آپ نے امیر المومنین؟“ امیر المومنین نے اسے عبارت سنادی۔ بڑھیا کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو ٹپک پڑے۔ ”خدا یا تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے تو نے میری سن لی، مگر امیر المومنین شادی تو میں نے دو لڑکیوں کی کرنی ہے..... حضرت عمر نے آگے لکھا

”اور اس کی دوسری بیٹی کی شادی کیلئے اسے تین ہزار دینار دیئے جائیں۔“ یہ عبارت سن کر

بڑھیا کے ہاتھ پھر بے اختیار آسمان کی طرف اٹھ گئے۔ ”میرے اللہ میں تیرا کس زبان سے شکر ادا

اکروں، تو واقعی مسبب الاسباب ہے۔“ میرے ایک چھوٹا لڑکا اور لڑکی بھی ہے۔ امیر المومنین! اگر ان کیلئے بھی کچھ ہو جائے تو.....“

امیر المومنین نے آگے لکھا

”چھوٹے لڑکے کی کفالت کیلئے اسے پچیس درہم ماہانہ دیئے جائیں۔“

”عین پریشانیوں، ناامیدیوں کے طوفان میں صرف تو ہی امید کے چراغ روشن کرتا ہے

میرے مولا..... اور لڑکی، امیر المومنین! بڑھیا نے کہا.....“

امیر المومنین نے آگے لکھا:

”اور لڑکی کی کفالت کیلئے اسے پندرہ درہم ماہانہ دیئے جائیں“

بڑھیا کا کام ختم ہو چکا تھا، اس کے نزدیک امیر المومنین ایک دیوتا سے کم نہ تھے۔ جب

انہوں نے لڑکی کے وظیفہ کے بارے میں لکھ کر اسے سنایا، بڑھیا نے کہا..... امیر المومنین! آپ

انسان کے روپ میں فرشتہ ہیں، بیواؤں کا سہاگ آپ کے دم سے قائم ہے، یتیموں کے سر پر سب

سے بڑا سایہ آپ ہیں، کمزور کی لاٹھی، بے یاروں کا یارا آپ ہیں، میں نے آج تک آپ جیسا سخی اور

دریا دل انسان نہیں دیکھا، پچھلے خلیفہ نے تو مجھے دھکے دے کر نکلوا دیا تھا، دنیا میں نیکی کا وجود آپ

کے دم سے ہی قائم ہے۔“

بڑھیا نے امیر المومنین کی شان میں یہ جملے کہہ کر ان کا اثر امیر المومنین کے چہرے سے معلوم

کرنے کی کوشش کی مگر یہ کیا؟

ان تعریفی جملوں کو سن کر امیر المومنین کا چہرہ یکا یک تبدیل ہو گیا، چہرے پر نرمی اور محبت کی

جگہ غصے اور درشتگی نے لے لی۔ اور یہ اس چہرے سے قطعاً مختلف تھا جب امیر المومنین نے شاہی

فرمان لکھنا شروع کیا تھا، انہوں نے قلم اٹھایا اور اس جگہ پر جس جگہ چھوٹی لڑکی کے وظیفہ کی بابت لکھا

تھا، سیاہی پھیر دی۔

”یہ کیا کیا آپ نے؟“ بڑھیا چلائی

امیر المومنین نے کرخت لہجے میں کہا ”اماں مجھے تم سے ایسی امید نہ تھی، میں نے پہلی لڑکی

کے بارے میں لکھا تو تم نے خدا کو یاد کیا، دوسری کے بارے میں لکھا تو بھی تم نے خدا کا شکر ادا کیا،

لڑکے کے وظیفہ کی باری آئی تو بھی تمہیں خدا ہی یاد تھا مگر جب بیٹی کے وظیفہ کے متعلق لکھا تو تم نے

خدا کو چھوڑ کر میری تعریف شروع کر دی، میں خوشامد پسند نہیں کرتا اسی لئے میں نے اس حصہ پر سیاہی

پھیر دی ہے جس میں خالق کے بجائے مخلوق کی تعریف کی گئی ہے یہ سب کچھ خدا کا ہے ہم تو صرف پاسبان ہے۔

بڑھیا کانپ گئی..... امیر المومنین!!

”میں اب کچھ نہیں کر سکتا اماں تم اب یہی کاغذ لے جاؤ صبح خزانچی کو دکھلا دینا تمہیں رقم مل جائے گی۔ ہاں چھوٹی لڑکی کیلئے کچھ تو بیٹیوں کی شادی سے بچا لینا اور کچھ لڑکے کے وظیفہ سے بس اب تم جا سکتی ہو“ یہ سن کر بڑھیا اٹھی اس کے ہاتھ میں وہ شاہی فرمان تھا جس نے اس کی تکالیف کا خاتمہ کر دیا تھا۔

.....O.....

بڑھیا گھر کو جا رہی تھی سوچتی ہوئی..... اس عجیب انسان کے متعلق جو اپنی تعریف کے بجائے خدا کی تعریف پسند کرتا ہے جو خلیفۃ المسلمین ہو کر معمولی سے مکان میں رہتا سادہ سے کپڑے پہنتا اور گھر کا سارا کام خود کرتا ہے جو بیت المال سے معمولی سی تنخواہ کے علاوہ ایک پائی بھی لینا حرام سمجھتا ہے مگر ایک بڑھیا کی امداد کیلئے ہزاروں روپے دے سکتا ہے۔ وہ اس فرمان کے آخر میں لڑکی کے وظیفہ کے بارے میں لکھی ہوئی تحریر پر سیادہ لکیر کو دیکھ کر دوزامویہ کے ماضی و حال کا موازنہ کر رہی تھی کہ اس کے پیشرو اموی خلفاء تو ایسے نہیں تھے۔



محدثین عظام

Click For More Books

<https://archive.org/details/@zohaibhasanattari>

امام ابو عبد اللہ محمد بن اسماعیل البخاری رحمۃ اللہ علیہ

فروغ دیں میں رتبہ ہے بہت اونچا بخاری کا
دلوں کی سلطنت پر حکم ہے چلتا بخاری کا
بخاری تھے امام وقت نور دین اسلامی
بہر سو ماہتاب علم ہے چکا بخاری کا
حدیث پاک کی تدوین میں گزری عمر ساری
خدا نے کر دیا ہے مرتبہ بالا بخاری کا
نجانے کتنے شہروں میں قدم پہنچے بخاری کے
اسی خاطر تو ہر سو نام ہے چھایا بخاری کا
بخاری کی بلندی کا ہوا اک آن میں قائل
خلوص دل سے جس نے مرتبہ سمجھا بخاری کا
بخاری کی لحد پر ہے نزول رحمت باری
زمانہ بہر الفت نام ہے لیتا بخاری کا
رضا اس کے مقدر میں بلندی ہی بلندی ہے
اسی خاطر تو ہر اک قول ہے پیارا بخاری کا

(محمد اکرم رضا)

امیر المؤمنین فی الحدیث

امام ابو عبد اللہ محمد بن اسماعیل البخاری رحمۃ اللہ علیہ

امام ابو عبد اللہ محمد بن اسماعیل البخاری کا شمار تاریخ حدیث وفقہ کے بہت بڑے محسنین میں ہوتا ہے۔ آپ کا یہ احسان بھلا کیا کم ہے کہ آپ نے تدوین حدیث کی ہر زمانے کیلئے عہد نبوی کی بہاروں کو تروتازہ کر دیا۔ ہر آدمی کیلئے کس طرح ممکن تھا کہ وہ ایک حدیث کی صحت اور سیاق و سباق کیلئے آئمہ کرام کا انتخاب کر کے ان کی جانب رُخ کرتا۔ یہ امام بخاری کا احسان عظیم ہے کہ انہوں نے امت اسلام کیلئے علمی دشواریوں کو آسان تر کر دیا۔ آپ نے ایک مصمم ارادہ کیا کہ احادیث کو جمع کریں گے پھر ان کا انتخاب امت اسلام کے سامنے پیش کریں گے۔ اس مقصد کی خاطر آپ نے دور دراز کے علاقوں کا سفر کیا۔ بعض اوقات ایک ایک حدیث کیلئے سینکڑوں میل طے کئے۔ ایک ایک حدیث کو کئی کئی راویوں سے سنا۔ ایک حدیث کی تصدیق کئی کئی ارباب علم و فن سے کروائی اور پھر کہیں جا کر اس قابل ہوئے کہ ”صحیح البخاری“ کے نام سے احادیث مصطفوی کا ایک انتہائی معتبر اور قابل قدر ذخیرہ رہتی دنیا تک کیلئے زمانے کے سامنے پیش کر سکیں۔ وقت آگے کی جانب صدیوں کا سفر طے کر چکا ہے لیکن امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے اس علمی احسان کی بدولت امت اسلام کا سران کے حضور ہمیشہ خمیدہ رہے گا۔

ولادت و سلسلہ نسب

ناصر الاحادیث النبویہ و انشر الہواریت الحمدیہ امیر المؤمنین فی الحدیث امام ابو عبد اللہ محمد بن اسماعیل البخاری الجعفی ۱۳ شوال المکرم ۱۹۲ھ میں ماوراء النہر کے مشہور شہر بخارا میں پیدا ہوئے۔ امام بخاری کے والد اسماعیل بن ابراہیم بن مغیرہ الجعفی عظیم محدث اور ایک صالح بزرگ تھے۔ ابن حبان نے ان کو طبقہ رابعہ کے ثقہ راویوں میں شمار کیا۔ امام ذہبی نے تاریخ اسلام میں اور امام بخاری نے تاریخ کبیر میں ان کا مفصل تذکرہ لکھا۔ انہیں امام مالک، عبد اللہ بن مبارک اور حماد بن زید جیسے

یکٹائے روزگار حضرات سے روایت حدیث کا شرف حاصل ہوا اور یحییٰ بن جعفر بیکندی، احمد بن جعفر، انصر بن حسین اور عراقیوں کی ایک بڑی جماعت نے ان سے احادیث کا سماع کیا۔ امام بخاری کے والد خوشحال اور دولت مند تھے اور جس قدر مالدار تھے اتنے ہی پرہیزگار تھے۔ احمد بن حفص کہتے ہیں کہ میں ابوالحسن اسماعیل بن ابراہیم کی موت کے وقت ان کی خدمت میں حاضر تھا وہ کہنے لگے میرے پاس جس قدر مال ہے اس میں ایک درہم بھی مشتبہ نہیں ہے۔

ایام طفولیت ہی میں امام بخاری کے والد کا انتقال ہو گیا تھا اور پرورش کی تمام ذمہ داری آپ کی والدہ نے سنبھال لی تھی۔ صغیر سن میں ہی امام بخاری نابینا ہو گئے اس وقت کے مشہور اطباء اور معالجین سے رجوع کیا گیا مگر کسی کی پیش نہ جاسکی۔ آپ کی والدہ بڑی عابدہ اور زاہدہ تھیں۔ انہوں نے رورو کر اللہ تعالیٰ سے فریاد کی اور دامن پھیلا کر اپنے لخت جگر کیلئے بصارت مانگی۔ بالآخر دریائے رحمت جوش میں آیا اور ایک رات انہیں خواب میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زیارت ہوئی اور آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری آہ وزاری اور دعاؤں کی کثرت کے سبب تمہارے بیٹے کی بصارت لوٹا دی ہے۔ صبح جب امام بخاری بستر سے اٹھے تو ان کی آنکھیں روشن تھیں۔

ابتدائی اور ضروری تعلیم حاصل کرنے کے بعد جب امام بخاری کی عمر دس سال کو پہنچی تو اللہ تعالیٰ نے آپ کے دل میں علم حدیث کی تحصیل کا شوق پیدا کیا اور آپ نے بخارا کے درس حدیث میں داخلہ لے لیا۔ علم حدیث کو آپ نے انتہائی کاوش اور محنت سے حاصل کیا۔ متن کو محفوظ رکھا اور سند کے ایک ایک راوی کو ضبط کیا حتیٰ کہ ایک سال بعد متن حدیث اور اس کی سند پر آپ کے عبور کا یہ عالم تھا کہ بسا اوقات اساتذہ بھی آپ سے اپنی تصحیح کرتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ کے استاذ داخلی نے حدیث بیان کرتے ہوئے کہا:

حدثنا سفیان عن ابی الزبیر عن ابراہیم۔

آپ نے فرمایا ”ابوالزبیر کی ابراہیم سے کوئی روایت نہیں ہے۔“

استاذ نے ناراض ہو کر امام بخاری کو تہدید کی۔ آپ نے کہا ”اگر آپ کے پاس اصل ہے تو اس میں دیکھ لیجئے۔“ استاذ نے اصل کی طرف رجوع کیا اور کہا ”اچھا پھر بتلاؤ یہ روایت کس طرح ہے۔“ آپ نے عرض کیا:

حدثنا سفیان عن زبیر بن عدی عن ابراہیم

اور بتلایا کہ یہ لفظ ابی الزبیر نہیں زبیر بن عدی ہے۔

Click For More Books

<https://archive.org/details/@zohaibhasanattari>

استاذ حیران رہ گئے اور انہوں نے بھری مجلس میں امام بخاری کی تحسین کی۔ امام بخاری یونہی تیزی اور مہارت سے علوم دینیہ حاصل کرتے رہے۔ یہاں تک کہ سولہ سال کی عمر میں امام بخاری نے عبد اللہ بن مبارک وکیع اور دیگر اصحابِ ابی حنیفہ کی کتابوں کو ازبر کر لیا تھا۔

اٹھارہ برس کی عمر میں امام بخاری اپنے بڑے بھائی احمد بن اسماعیل اور اپنی والدہ ماجدہ کے ساتھ حج کرنے کیلئے حرمین شریفین حاضر ہوئے۔ حج کے بعد انکے بھائی تو والدہ کو لے کر واپس چلے گئے اور امام بخاری مزید تعلیم کے حصول کیلئے وہیں رہ گئے۔ اسی دوران انہوں نے قضایا الصحابة والتابعین کے عنوان سے ایک کتاب لکھی اور اس کے بعد چاندنی راتوں میں روضہ انور کے پہلو میں بیٹھا کرتارخ کبیر تصنیف کی۔ امام بخاری کہتے ہیں میں نے تاریخ کبیر میں جتنے لوگوں کے اسماء ذکر کئے ہیں مجھے ان میں سے ہر ایک کے بارے میں کوئی نہ کوئی قصہ معلوم تھا لیکن اختصار کے سبب میں نے ان تمام قصوں کو درج نہیں کیا۔ تاریخ کبیر کی تکمیل ہوتے ہی اس کی نقل کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا جس زمانہ میں امام بخاری مکہ میں وارد ہوئے اس وقت یمن میں امام عبدالرزاق بقید حیات موجود تھے۔ امام بخاری نے ان سے روایت حدیث کیلئے یمن جانے کا قصد کیا لیکن کسی نے ان کو غلط خبر دی کہ امام عبدالرزاق کا انتقال ہو گیا۔ یہ سن کر انہوں نے سفر کا ارادہ ملتوی کر دیا اور ایک واسطہ کے ساتھ امام عبدالرزاق سے روایت حدیث کرنے لگے۔ امام بخاری نے روایت حدیث کے سلسلہ میں بارہا دور دراز شہروں کا سفر کیا اور برسہا برس وطن سے دور بیٹھے اکتساب علم کرتے رہے۔ انہوں نے خود بیان کیا ہے کہ میں طلب حدیث کیلئے مصر اور شام دو مرتبہ گیا۔ چار مرتبہ بصرہ گیا، چھ سال حجاز مقدس میں رہا اور ان گنت مرتبہ محدثین کے ہمراہ کوفہ اور بغداد گیا۔

امام بخاری بے پناہ قوت حافظہ کے مالک تھے جب ہم ان کی قوت حفظ کے کارنامے صفحات تاریخ پر دیکھتے ہیں تو یوں گمان ہوتا ہے جیسے وہ سر سے پیر تک حافظہ ہی حافظہ ہوں۔ ان کے حافظہ کو دیکھ کر لوگوں کے دلوں میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔ حاشد بن اسماعیل بیان کرتے ہیں کہ امام بخاری لڑکپن میں ہمارے ساتھ حدیث کے سماع کیلئے مشائخ بصرہ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ امام بخاری کے سوا ہم تمام ساتھی احادیث ضبط تحریر میں لے آتے تھے۔ سولہ دن گزر جانے کے بعد ایک روز ہمیں خیال آیا اور ہم نے بخاری کو ملامت کی اور کہا کہ تم نے احادیث ضبط نہ کر کے اتنے دنوں کی محنت ضائع کر دی۔ امام بخاری نے ہم سے کہا اچھا تم اپنے ضبط شدہ نوٹ لے آؤ۔ ہم اپنے اپنے نوٹ لے کر آئے اور امام بخاری نے سلسلہ وار احادیث سنائی

Click For More Books

<https://archive.org/details/@zohaibhasanattari>

شروع کر دیں۔ یہاں تک کہ انہوں نے پندرہ ہزار سے زیادہ احادیث بیان کر ڈالیں اور یہ سن کر ہمیں یوں گمان ہوتا تھا کہ گویا یہ روایات ہمیں امام بخاری نے لکھوائی ہیں۔

محمد بن ازہر سمستانی کہتے ہیں کہ میں امام بخاری کے ساتھ سلیمان بن حرب کی خدمت میں سماع حدیث کیلئے حاضر ہوتا تھا، میں احادیث لکھتا تھا اور امام بخاری نہیں لکھتے تھے کسی نے مجھ سے کہا بخاری احادیث کو نوٹ کیوں نہیں کرتے میں نے کہا ”تم سے کوئی حدیث اگر لکھنے سے رہ جائے تو بخاری کے حافظہ سے لکھ لیتا“۔

امام بخاری کی قوت حفظہ بیان کرنے کیلئے یہ امر کافی ہے کہ جس کتاب کو وہ ایک نظر دیکھ لیتے تھے وہ انہیں حفظ ہو جاتی تھی اور بعد میں جا کر یہ عدد تین لاکھ تک پہنچ گیا، جن میں سے ایک لاکھ احادیث صحیح اور دو لاکھ غیر صحیح تھیں۔ ایک مرتبہ بیخ گئے تو وہاں کے لوگوں نے فرمائش کی آپ اپنے شیوخ سے ایک ایک روایت بیان کریں تو آپ نے ایک ہزار شیوخ سے ایک ہزار احادیث زبانی بیان کر دیں۔

سلیمان بن مجاہد کہتے ہیں کہ ایک دن میں محمد بن سلام بیکندی کی مجلس میں بیٹھا ہوا تھا، محمد بن سلام نے کہا ”اگر تم کچھ دیر پہلے میرے پاس آتے تو میں تم کو وہ بچہ دکھلاتا جس کو ستر ہزار احادیث یاد ہیں“۔ سلیمان نے اس مجلس سے اٹھ کر امام بخاری کی تلاش شروع کر دی۔ بالآخر سلیمان نے امام بخاری کو ڈھونڈھ نکالا اور پوچھا کیا تم ہی وہ شخص ہو جس کو ستر ہزار احادیث حفظ ہیں؟ امام بخاری نے کہا ”مجھے اس سے بھی زیادہ احادیث یاد ہیں اور میں جن صحابہ سے احادیث روایت کرتا ہوں ان میں سے اکثر کی ولادت اور وفات کی تاریخ اور ان کی جائے سکونت پر اطلاع رکھتا ہوں۔ نیز میں کسی حدیث کو روایت نہیں کرتا مگر کتاب اور سنت سے اسکی اصل پر واقفیت رکھتا ہوں“۔

امام بخاری کے اساتذہ اور مشائخ کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ انہوں نے شہر در شہر اور قریہ در قریہ جا کر علم حدیث حاصل کیا۔ امام بخاری نے حصول روایت میں اکابر، امثال اور اصاغر کے فرق کا کبھی خیال نہیں رکھا۔ انہیں جہاں سے بھی روایت ملتی اخذ کر لیتے خواہ بیان کرنے والا ان سے برتر ہو، مساوی ہو یا کمتر۔ امام بخاری کے اساتذہ و مشائخ کی تعداد یوں تو ایک ہزار سے زائد ہے۔

امام بخاری کا ذہن بہت بیدار اور نکتہ رس تھا۔ وہ قرطاس و قلم پر اتنا اعتماد نہیں کرتے تھے جتنا انہیں اپنے حافظہ اور ذہن پر اعتماد تھا۔ لوگوں نے بارہا فن حدیث میں امام بخاری کی قابلیت کا امتحان لیا۔ لیکن وہ اپنی خداداد ذہانت اور بے شمار حافظہ کی وجہ سے ہمیشہ سرخرو رہے۔

حافظ احمد بن عدی بیان کرتے ہیں کہ جب اہل بغداد کو معلوم ہوا کہ امام بخاری بغداد آ رہے ہیں تو انہوں نے ایک ہزار سے زائد احادیث میں رد و بدل کر دیا اور ایک حدیث کی سند کو دوسرے کے ساتھ لگا دیا۔

امام بخاری جب بغداد میں داخل ہوئے تو اہل بغداد نے ان کے اعزاز میں ایک مجلس مذاکرہ منعقد کی جس میں علماء امراء اور عوام کی بہت بڑی اکثریت شامل تھی۔ طے شدہ پروگرام کے مطابق ایک شخص اٹھا اور اسے سند مقلوب کے ساتھ پہلی حدیث پڑھی۔ امام بخاری سے پوچھا تھا کیا آپ کو یہ حدیث معلوم ہے۔ آپ نے فرمایا نہیں اس نے پھر دوسری حدیث پڑھی پھر تیسری پھر چوتھی یہاں تک کہ اس نے دس احادیث پڑھ ڈالیں اور امام بخاری نے ہر بار نفی میں جواب دیا۔ جاننے والے اصل سبب سمجھ کر امام بخاری کے علم پر حیران ہو رہے تھے اور انجان لوگ اس جواب کو امام بخاری کا عجز سمجھ کر پریشان ہو رہے تھے۔ پہلے شخص کے سوالات کے بعد اسی طرح دوسرے شخص نے اٹھ کر سوالات کئے اور امام بخاری نے اسی طرح جواب دیئے پھر تیسرا اٹھا پھر چوتھا۔ یہاں تک کہ دس آدمیوں نے سو احادیث پوری کر ڈالیں اور امام بخاری نے ان تمام احادیث کے جواب میں یہی کہا کہ میں انہیں نہیں جانتا۔ جب امام بخاری نے دیکھا کہ یہ لوگ سوالات سے فارغ ہو گئے اور اب کوئی شخص نہیں اٹھتا تو آپ کھڑے ہو گئے اور فرمایا کہ پہلے شخص نے جو حدیث پڑھی اس کی اس نے یہ سند بیان کی تھی اور اسکی سند یہ ہے۔ اس طرح ان لوگوں کی پڑھی ہوئی سو کی سو احادیث کی غلط اسناد بھی پڑھ کر سنائیں اور ان کی اصل اسناد بھی بیان کر دیں اور ہر حدیث کو اس کی اصل سند کے ساتھ لاحق کر دیا۔ جیسے ہی امام بخاری نے اپنے بیان کو ختم کیا تمام مجلس میں تحسین و مرحبا کا غلغلہ اور آفرین آفرین کا شور اٹھا اور عوام و خواص سب نے امام بخاری کے فضل کا اعتراف اور ان کی عظمت کا اقرار کر لیا۔

حافظ ابوالازہر روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ سمرقند میں چار سو محدث جمع ہوئے اور انہوں نے امام بخاری کو مغالطہ دینے کیلئے شام کی اسناد عراق کی اسناد میں داخل کیں اور عراق کی شام میں۔ اسی طرح حرم کی اسناد یمن میں داخل کیں اور یمن کی حرم میں۔ وہ لوگ سات دن تک لگاتار اس قسم کے مغالطہ آمیز متون اور اسانید امام بخاری پر پیش کرتے رہے لیکن ایک بار بھی وہ امام بخاری کو نہ سند میں مغالطہ دے سکے نہ متن میں۔

یوسف بن موسیٰ مروزی بیان کرتے ہیں کہ میں بصرہ کی جامع مسجد میں بیٹھا ہوا تھا کہ منادی

کی آواز آئی ”اے علم کے طلبگارو! امام محمد بن اسماعیل یہاں آئے ہوئے ہیں، جس نے ان سے احادیث کی روایت لینی ہو وہ ان کی خدمت میں حاضر ہو جائے۔ مروزی کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا ایک دبلا پتلا جوان ستون کے قریب انتہائی سادگی اور خضوع و خشوع سے نماز پڑھ رہا ہے، یہی امام بخاری تھے۔ اعلان سنتے ہی چاروں طرف سے مشتاق امام بخاری کے گرد جمع ہو گئے۔ امام بخاری نے انہیں اگلے روز احادیث لکھوانے کا وعدہ کیا اور دوسرے روز صبح مجلس اطاء منعقد ہو گئی۔ آپ نے فرمایا ”میں تم کو وہی احادیث لکھواؤں گا جو تمہارے شہر کے محدثین بیان کرتے ہیں لیکن نئی سند کے ساتھ“ پھر آپ نے ایک حدیث منصور کی روایت سے پڑھی اور فرمایا تمہارے شہر والے اس حدیث کو منصور کے غیر سے روایت کرتے ہیں۔ اسی طرح امام بخاری نے ان کو کثیر تعداد میں احادیث لکھوائیں اور ہر حدیث کے بارے میں فرماتے تمہارے شہر والوں نے اس کو فلاں سے روایت کیا ہے اور میں اس کو فلاں سے لکھواتا ہوں۔

حافظ احمد بن حمدون بیان کرتے ہیں کہ میں نے ایک جنازہ کے موقعہ پر دیکھا کہ محمد بن یحییٰ ذہبی، امام بخاری سے اسما اور علل کے بارے میں سوال کر رہے تھے اور امام بخاری اس تیزی اور روانی سے جواب دے رہے تھے جیسے آپ کے منہ سے جواب نہیں کمان سے تیر نکل رہا ہو۔

امام بخاری کے والد محدث اسماعیل بن ابراہیم انتہائی امیر کبیر شخص تھے اور امام بخاری نے ان سے وراثت میں مال و دولت کا بہت بڑا حصہ حاصل کیا تھا۔ امام بخاری اپنا مال مضاربت پر دیتے تھے خود بنفسہ تجارت نہیں کرتے تھے۔ ایک شخص نے آپ کے پچیس ہزار درہم دینے تھے۔ آپ نے فرمایا ”تم دس درہم ماہانہ ادا کر دیا کرو“۔

ابوسعید بکر بن منیر کہتے ہیں ایک مرتبہ ابو حفص نے امام بخاری کے پاس کچھ سامان بھیجا، تجار کو پتہ چلا تو وہ اس سامان کو خریدنے کیلئے پہنچ گئے اور پانچ ہزار درہم کی پیشکش کی۔ آپ نے فرمایا رات کو آنا۔ شام کو تاجروں کا دوسرا گروہ آیا اور اس نے دس ہزار درہم کی پیشکش کر دی۔ آپ نے فرمایا پہلے گروہ کے ساتھ بیچ کی نیت کر چکا ہوں۔ اب پانچ ہزار درہم کی خاطر میں اپنی نیت بدلنا نہیں چاہتا۔

امام بخاری مزاج اور طبیعت کے اعتبار سے بہت سادہ اور جفاکش تھے۔ اپنی ضرورت کے تمام کام خود کر لیا کرتے تھے۔ مال و دولت اور جاہ مرتبت کے باوجود کبھی خدام اور غلاموں کا حشم قائم نہیں رکھا۔ محمد بن حاتم وراق آپ کے خصوصی شاگرد تھے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ امام

بخاری بخارا کے قریب سرانے بنا رہے تھے اور اپنے ہاتھوں سے اٹھا اٹھا کر دیوار میں اینٹیں لگا رہے تھے میں نے آگے بڑھ کر کہا ”آپ رہنے دیجئے یہ اینٹیں میں لگا دیتا ہوں“۔ آپ نے فرمایا ”قیامت کے دن یہ عمل مجھے نفع دے گا“۔

وراق کہتے ہیں کہ جب ہم امام بخاری کے ساتھ کسی سفر میں جاتے تو آپ ہم سب کو ایک کمرہ میں جمع کر دیا کرتے اور خود علیحدہ رہتے۔ ایک بار میں نے دیکھا امام بخاری رات کو پندرہ بیس مرتبہ اٹھے اور ہر مرتبہ خود اپنے ہاتھ سے آگ جلا کر چراغ روشن کیا۔ امام بخاری نہایت فیاض تھے جس قدر مال کے لحاظ سے غنی تھے اس سے زیادہ دل غنی تھا۔ بعض اوقات ایک دن میں تین تین بار صدقہ دیا کرتے تھے۔ عیش و عشرت کی زندگی سے کوسوں دور تھے۔ بعض اوقات طلب علم میں انہوں نے سوکھی ہوئی گھاس کھا کر بھی گزارا کیا ہے۔ ایک مرتبہ بیماری میں طبیب کو بتایا کہ وہ چالیس سال سے سوکھی روٹی کھا رہے ہیں اور اس عرصہ میں سالن کو بالکل ہاتھ نہیں لگایا۔

امام بخاری تقویٰ اور پرہیزگاری کے اعلیٰ درجے پر فائز تھے۔ ظاہر و باطن میں خدا سے بے حد ڈرتے تھے۔ مشتبہات سے بچتے، غیبت سے پرہیز کرتے اور لوگوں کے حقوق کا پورا خیال رکھتے تھے۔ انہیں تیر اندازی کا بے حد شوق تھا۔ ایک مرتبہ ان کا تیر نہر کے پل پر لگا اور اسکی کیل خراب ہو گئی۔ امام بخاری بے حد پریشان ہوئے اور پل کے مالک حمید بن اخضر کے پاس پیغام بھیجا کہ یا ہم کو کیل بدلنے کی اجازت دو یا کیل کی قیمت لے لو اور یا ہماری غلطی معاف کر دو۔ حمید بن اخضر نے سلام بھیجا اور کہا ”اے ابو عبد اللہ میں صرف یہ کیل نہیں بلکہ اپنی تمام املاک تمہارے تصرف میں دیتا ہوں جس طرح چاہے ان میں تصرف کرو۔ امام بخاری نے جب یہ جواب سنا تو ان کا چہرہ کھل اٹھا، اسی خوشی میں انہوں نے پانچ سو احادیث بیان کیں اور تین سو درہم صدقہ کر دیئے۔

امام بخاری بے حد عبادت گزار اور شب بیدار تھے۔ کثرت سے نوافل پڑھتے اور روزے رکھتے تھے۔ رمضان شریف میں ہر روز ایک قرآن پاک کا ختم کرتے اور روزانہ نصف شب کو اٹھ کر قرآن کریم کے دس پاروں کی تلاوت کرتے۔ تراویح میں ختم قرآن کرتے اور ہر رکعت میں بیس آیات کی تلاوت کیا کرتے تھے۔

ابوبکر بن مزیر کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ محمد بن اسماعیل نماز پڑھ رہے تھے نماز کے بعد انہوں نے قمیص کا دامن اٹھایا اور اپنے ایک شاگرد سے کہا ذرا دیکھنا میری قمیص کے نیچے کیا ہے۔ شاگرد نے

دیکھا تمہیں کے نیچے زنبور تھی جس نے ان کے بدن پر پندرہ سولہ جگہ ڈنگ لگایا ہوا تھا جس کی وجہ سے آپ کا بدن جگہ جگہ سے سوجھ گیا تھا۔ ابن منیر نے پوچھا ”جب آپ کو زنبور نے پہلی مرتبہ کاٹا تو اس وقت آپ نے نماز کیوں نہیں توڑی“۔ آپ نے فرمایا ”میں قرآن کریم کی جس آیت کی تلاوت کر رہا تھا اس میں اتنا ذوق و شوق پارہا تھا کہ میں اس وقت اس تکلیف کی طرف متوجہ نہ ہوسکا“۔

امام بخاری بڑے خلیق، انتہائی بردبار اور حلیم تھے۔ کسی شخص کی بدسلوکی پر وہ کبھی غیض و غضب میں نہ آتے اور برائی کا بدلہ ہمیشہ نیکی سے دیا کرتے تھے۔ کسی شخص کی اصلاح مقصود ہوتی تو اسے برسر مجلس کبھی ملامت نہ کرتے۔ ہر شخص کی عزت نفس کا خیال رکھتے اور کبھی کسی شخص کو شرمندہ نہ ہونے دیتے۔

عبداللہ محمد صیاء نی بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ امام بخاری لکھ رہے تھے ناگاہ کنیز آگے سے گزری اور اس نے پیر کی ٹھوکر سے دوات گرا دی۔ آپ نے فرمایا: دیکھ کر چلا کرو۔ اس نے تنک کر بدتمیزی سے جواب دیا ”جب راستہ نہ ہو تو کیسے چلوں“۔ آپ نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا اور کہا ”جاؤ تم آزاد ہو“۔

علی بن محمد منصور اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ امام بخاری مسجد کے اندر حلقہ احباب میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک شخص کی داڑھی میں کوئی گندی چیز لگی ہوئی تھی اس نے وہ گندی داڑھی سے نکال کر مسجد کے فرش پر پھینک دی۔ علی بن محمد کہتے ہیں ”میں نے دیکھا کہ امام بخاری نے لوگوں کی نظریں بچا کر چپکے سے وہ گندی اپنی آستین میں اٹھا کر رکھ لی اور بعد میں لوگوں کے جانے کے بعد وہ گندی مسجد کے باہر پھینک دی۔ اس طرح امام بخاری نے مسجد کے فرش کو بھی گندی سے صاف کیا اور اس شخص کو بھی برسر مجلس شرمندگی سے بچالیا۔

امام بخاری بے حد صابر و شاکر تھے اور اپنی ذات کا انتقام بالکل نہیں لیتے تھے۔ ان کے شیوخ میں سے محمد بن یحییٰ ذہلی نے نیشاپور میں الفاظ قرآن کو غیر مخلوق نہ کہنے پر امام بخاری کے خلاف محاذ قائم کر دیا اور امام بخاری کے درس پر پابندی لگا دی اور برسر عام کہہ دیا کہ بخاری اس شہر میں نہیں رہ سکتے جس کی وجہ سے امام بخاری نیشاپور چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ ذہلی کی اس بدسلوکی سے امام مسلم اس قدر برہم ہوئے کہ انہوں نے وہ تمام احادیث جو ذہلی سے املاء کی تھیں ایک بنڈل میں باندھ کر واپس ذہلی کو بھجوا دیں لیکن امام بخاری نے صحیح بخاری میں ذہلی کی روایت کو نہیں چھوڑا۔ امام بخاری کے اپنے کلام میں اس بات کی کوئی تصریح نہیں ہے کہ ان کا فقہی مسلک کیا

تھا۔ البتہ جامع صحیح میں امام بخاری ایسی احادیث بکثرت لائے ہیں جو مسلک شافعی کی موید ہیں اور غالباً اسی بناء پر بعض مشاہیر علماء نے ان کو امام شافعی کا مقلد گردانا ہے اور تاج الدین سبکی امام بخاری کے بارے میں لکھتے ہیں:

یعنی امام بخاری نے مکہ میں حمیدی سے سماع کیا اور انہیں سے فقہ شافعی پڑھی۔ ابو عاصم عبادی نے امام بخاری کا ذکر اپنی کتاب ”طبقات شافعیہ“ میں کیا ہے اور کہا ہے کہ امام بخاری نے زعفرانی ابو ثور اور کرابیسی سے سماع کیا ہے اور میں کہتا ہوں انہوں نے حمیدی سے فقہ پڑھی ہے اور یہ سب امام شافعی کے شاگرد تھے۔

امام تاج الدین سبکی نے یہ تمام ثبوت حافظ ابو عاصم کے اس قول کو تقویت پہنچانے کیلئے ذکر کئے ہیں کہ امام بخاری شافعی المذہب تھے۔ حافظ ابو عاصم ۳۵ھ میں یعنی امام بخاری کے وصال کے ٹھیک ایک سو ایک سال بعد پیدا ہوئے، ان کا زمانہ امام بخاری کے بہت قریب تھا اس لئے ان کی بات پر اعتماد کرنے کی وجوہ ہیں۔

بہر حال امام بخاری شافعی ہونے کی تقدیر پر بھی محض مقلد نہیں تھے بلکہ مجتہد فی المسائل تھے اور طبقات فقہاء میں تیسرے درجے پر فائز تھے یہی وجہ ہے کہ وہ بعض مسائل میں امام شافعی سے اختلاف کرتے ہیں اور ان مسائل میں خود اجتہاد کرتے ہیں۔ اسی لئے اہل علم کے نزدیک امام بخاری کی مثال شوافع میں ایسی ہے جیسے احناف میں امام ابو جعفر کی۔

امام بخاری کے استاذ ابو مصعب احمد بن ابی بکر نے کہا امام بخاری حدیث میں امام احمد بن حنبل سے زیادہ بصیرت رکھتے ہیں۔ کسی شخص نے اس بات پر تعجب کیا تو انہوں نے کہا اگر تم امام مالک کو دیکھتے تو ان میں اور بخاری میں سرمو فرق نہ پاتے۔ امام بخاری کے ایک اور استاذ قیقہ بن سعید نے کہا ”میرے پاس مشرق و مغرب سے بے شمار لوگ علم حدیث کی تحصیل کیلئے آئے لیکن ان میں بخاری جیسا کوئی نہ تھا“۔ امام احمد بن حنبل نے کہا ”ارض خراسان نے آج تک بخاری کی نظیر نہیں پیدا کی“۔ اسحاق بن راہوی نے کہا بخاری سے احادیث روایت کرو اور ان کو لکھ لیا کرو۔ بلا ریب اگر بخاری حسن بصری کے زمانہ میں ہوتے تو وہ علم حدیث میں ان کی طرف رجوع کرتے۔

اور تلامذہ میں سے امام ترمذی نے کہا ”میں نے اسانید اور علل کے علم میں امام بخاری سے بڑھ کر کسی کو نہیں پایا“۔ امام مسلم نے کہا ”میں شہادت دیتا ہوں کہ امام بخاری کا کوئی مماثل نہیں ہے اور سلیم بن مجاہد نے کہا میں نے ساٹھ سال سے امام بخاری جیسا کوئی شخص نہ علم میں دیکھا ہے نہ عمل

میں دیکھا ہے۔ امام بخاری سے ایک لاکھ اشخاص نے روایت کی ہے۔ غرض آپ کے اساتذہ ہوں معاصرین علماء و فقہاء تلامذہ ہوں یا اصحاب علم و فکر ہوں یا صاحبان بصیرت سب نے آپ کی عظمت کو تسلیم کرتے ہوئے آپ کیلئے تعریفی کلمات کہے ہیں۔

امام بخاری کی زندگی کا اکثر حصہ احادیث کی تلاش میں شہر در شہر سفر میں گزرا ہے اور انہیں کسی ایک جگہ سکون سے بیٹھ کر کام کرنے کا موقع بہت کم ملا ہے۔ اس کے باوجود انہوں نے خاطر خواہ تعداد میں تصانیف چھوڑی ہیں۔ حافظ ابن حجر عسقلانی اور دیگر حضرات نے جو امام بخاری کی تصانیف گنوائی ہیں وہ یہ ہیں:

۱۔ الجامع الصحیح	۲۔ التاريخ الكبير
۳۔ التاريخ الاوسط	۴۔ التاريخ الصغير
۵۔ کتاب الضعفا	۶۔ کتاب الکنی
۷۔ الادب المفرد	۸۔ جزر فح الیدین
۹۔ جز القراءة خلف الامام	۱۰۔ کتاب الاشریة
۱۱۔ کتاب الہبہ	۱۲۔ کتاب العلل
۱۳۔ بر الوالدین	۱۴۔ الجامع الكبير
۱۵۔ التفسیر الكبير	۱۶۔ المسند الكبير
۱۷۔ خلق افعال العباد	۱۸۔ قضایہ الصحابہ والتابعین
۱۹۔ کتاب الفوائد	۲۰۔ اسامی الصحابہ

۲۵۰ھ میں امام بخاری نے نیشاپور آنے کا پروگرام بنایا۔ اس خبر کو سنتے ہی اہالیان نیشاپور میں فرحت و مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ اس زمانہ میں محمد بن یحییٰ ذہلی نیشاپور کی علمی ریاست کے والی تھے۔ محمد بن یحییٰ ذہلی نے شہر کے لوگوں کو امام بخاری کے استقبال کی تلقین کی۔ چنانچہ لوگوں کے ایک انبوه کثیر نے محمد بن یحییٰ کی قیادت میں شہر سے تین مرحلہ آگے جا کر امام بخاری کا استقبال کیا اور انتہائی تزک و احتشام سے امام بخاری کو شہر میں لے کر آئے۔ امام مسلم بن حجاج کہتے ہیں ”میں نے اس سے پہلے اتنا عظیم الشان استقبال نہ کسی عالم کا دیکھا، نہ کسی حاکم کا“۔

امام بخاری نے نیشاپور میں درس حدیث دینا شروع کیا۔ ان کے درس میں ہر وقت اژدہام رہتا تھا اور بے حساب لوگ امام بخاری سے علم حدیث کا استفادہ کرتے تھے۔ بعض حاسدین کو امام

بخاری کی شہرت اور مقبولیت بری لگی اور انہوں نے محمد بن یحییٰ کو امام بخاری کا مخالف بنا دیا۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ محمد بن یحییٰ ذہلی قرآن کریم کے الفاظ کو بھی قدیم مانتے تھے۔ اس پر بڑی شدت سے قائم تھے کسی شخص نے جا کر امام بخاری سے پوچھا کہ قرآن مخلوق ہے یا غیر مخلوق۔ امام بخاری مالتے رہے جب اس نے زیادہ اصرار کیا تو آپ نے کہا: القرآن کلام اللہ غیر مخلوق۔ اس نے پھر اصرار کیا، قرآن کے الفاظ کا حکم بتلائیے تو آپ نے کہا: افعالنا مخلوقہ والفاظنا من افعالنا۔ (ہمارے افعال مخلوق ہیں اور الفاظ بھی ہمارے افعال ہیں) بس پھر کیا تھا شور مچ گیا کہ امام بخاری الفاظ قرآن کو مخلوق مانتے ہیں۔ جب ذہلی تک یہ خبر پہنچی تو وہ تمام عنایات منقطع کر کے یکر مخالف ہو گئے اور اعلان کر دیا کہ بخاری کے درس میں کوئی شخص نہ جائے چنانچہ مسلم بن حجاج کے سوا تمام لوگوں نے امام بخاری کے درس میں جانا بند کر دیا۔

بغض و حسد کا یہ عالم ہو گیا تو آپ کے دل میں نیشاپور کو چھوڑ کر اپنے وطن بخارا آنے کی آرزو نے جنم لیا۔ چنانچہ آپ بخارا لوٹ آئے۔ بخارا والوں کو آپ کی آمد پر بے حد مسرت ہوئی۔ انہوں نے آپ کا فقید المثال استقبال انتہائی عزت و تکریم کے ساتھ کیا۔ حضرت امام بخاری نے یہیں درس و تدریس اور پڑھانے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ دشمنوں اور بدباظنوں نے یہاں بھی چین سے رہنے نہ دیا اور وہ خالد بن احمد جو کہ خلافت عباسیہ کا نائب تھا اس کے پاس گئے اور اس سے کہا کہ امام بخاری کو حکم دیں کہ وہ آپ کے بیٹے کو گھر آ کر پڑھایا کرے۔ بخارا کے حکمران نے آپ سے فرمائش کی تو آپ نے یہ کہتے ہوئے نکال دیا کہ علم بہت بڑی دولت ہے میں اسے سلاطین کی چوکھٹ پر پہنچا کر علم کی تذلیل نہیں کرنا چاہتا۔

جس شخص کو پڑھنے کی ضرورت ہے اس کو میرے درس میں آنا چاہیے۔ والی بخارا نے کہا ”اگر میرا لڑکا درس میں آئے تو وہ عام لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر نہیں پڑھے گا آپ کو اسے علیحدہ پڑھانا ہوگا۔“ امام بخاری نے جواب دیا ”میں کسی شخص کو احادیث رسول کی سماعت سے روک نہیں سکتا۔“ یہ جواب سن کر حاکم ناراض ہو گیا اور اس نے ابن الوقت علماء سے امام بخاری کے خلاف فتویٰ حاصل کر کے انہیں شہر سے نکل جانے کا حکم دے دیا۔

امام بخاری اپنے وطن میں آ کر بے وطن ہونے پر بہت آزرده ہوئے۔ ابھی ایک ماہ بھی نہ گزرا تھا کہ خلیفہ نے والی بخارا خالد بن احمد ذہلی کو معزول کر دیا اور اسے گدھے پر سوار کرا کے محل سے نکالا گیا اور قید خانہ میں بند کر دیا گیا۔ جہاں وہ انتہائی ذلت اور رسوائی سے چند دن گزارنے

کے بعد ہلاک ہو گیا۔ اسی طرح جن لوگوں نے امیر بخارا کی معاونت کی تھی وہ سب بے پناہ ذلیل و خوار ہوئے۔

بخارا سے واپس ہونے کے بعد امام بخاری نے سمرقند جانے کا قصد کیا۔ ابھی سمرقند سے کئی منزل دور تھے تو آپ کو اطلاع ملی کہ اہل سمرقند میں آپ کے بارے میں دو آراء ہو گئی ہیں۔ یہ سن کر آپ وہیں راستہ میں خرتنگ نامی ایک بستی میں رک گئے اور اللہ تعالیٰ سے دعا کی۔ اے خدا یہ زمین اپنی وسعت کے باوجود مجھ پر تنگ ہوتی جا رہی ہے مجھے اپنے پاس واپس بلا لے۔ اس دعا کے بعد آپ بیمار پڑ گئے۔ اسی اثناء میں اہل سمرقند نے بلانے کیلئے آپ کے پاس قاصد بھیجا۔ آپ جانے کیلئے تیار ہوئے مگر طاقت نے ساتھ نہ دیا۔ چند دعائیں پڑھیں اور لیٹ گئے۔ جسم سے پسینہ بہنا شروع ہوا ابھی وہ پسینہ خشک نہ ہوا تھا کہ آپ نے جان جان آفرین کے سپرد کر دی۔

اس مرد خدا نے تمام زندگی احیائے دین اور فروغ دین کیلئے کیا کچھ نہیں کیا۔ سمرقند، بلخ، بخارا، مدینہ منورہ، مکہ مکرمہ، مصر و شام کہاں کہاں نہیں گئے۔ ان کے وصال پر ہر طرف صف ماتم بچھ گئی لیکن رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے آپ پر بعد از وفات وہ نوازشیں ہوئیں جن کا شمار ذہن کی حدود سے ماوریٰ ہے۔

کہتے ہیں میں نے خواب میں دیکھا کہ میں کسی جگہ جا رہا ہوں۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہاں جا رہے ہو میں نے عرض کیا: محمد بن اسماعیل کے پاس۔ آپ نے فرمایا ”جاؤ اور اسے جا کر میرا سلام کہنا“۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ عنایات جس طرح زندگی میں امام بخاری کے شامل حال تھیں اسی طرح وصال کے بعد بھی یہ توجیہات ان پر سایہ فلک رہیں۔ چنانچہ عبدالواحد بن آدم طواوسی کہتے ہیں کہ میں نے ایک رات خواب دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جماعت صحابہ کے ساتھ ایک جگہ کھڑے ہوئے ہیں۔ میں نے پوچھا حضور کس کا انتظار ہے۔ فرمایا بخاری کا۔ طواوسی کہتے ہیں ”چند دن بعد مجھے امام بخاری کے وصال کی خبر پہنچی میں نے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ امام بخاری کا اسی رات انتقال ہوا تھا جس رات میں نے خواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی تھی“۔

امام بخاری کی نماز جنازہ کے بعد جب ان کی قبر پر مٹی ڈالی گئی تو مدت دیر تک اس مٹی سے مشک کی مہک آتی رہی اور عرصہ دراز تک لوگ دور دور سے آ کر امام بخاری کی قبر کی مٹی کو بطور تبرک لے جاتے رہے۔

ابو الفتح سمرقندی بیان کرتے ہیں کہ امام بخاری کے وصال کے بعد دو سو سال بعد سمرقند میں خشک سالی کی وجہ سے قحط نمودار ہو گیا۔ لوگوں نے بارہا نماز استسقاء پڑھی، دعائیں مانگیں مگر بارش نہ ہوئی۔ پھر ایک مرد صالح قاضی شہر کے پاس گیا اور اس کو مشورہ دیا کہ تم شہر کے لوگوں کو لے کر امام بخاری کی قبر پر جاؤ اور وہاں جا کر اللہ تعالیٰ سے بارش کی دعا مانگو، شاید اللہ تعالیٰ تمہاری دعا قبول کرے۔ قاضی شہر نے یہ مشورہ قبول کر لیا اور شہر کے لوگوں کو لے کر امام بخاری کی قبر پر حاضر ہوا۔ لوگوں نے وہاں گریہ و زاری کا اظہار کیا اور اللہ تعالیٰ سے نہایت خضوع و خشوع سے دعا مانگی اور امام بخاری سے قبولیت دعا کیلئے سفارش کی درخواست کی۔ اسی وقت آسمان پر بادل اُٹھ آئے اور سات دن لگاتار اس قدر بارش ہوتی رہی کہ لوگوں کیلئے خرنگ سے سمرقند پہنچنا مشکل ہو گیا۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کو زمانے سے گئے ہوئے صدیاں بیت چکی ہیں۔ زمانہ ماہ و سال کے کتنے ہی جال بن چکا ہے۔ علمی تحقیقات کا کتنا بڑا کام ہے تمام اسلامی ممالک کے محققین، ریسرچ سکارلز، فضلاء اور دانشوران اسلام، سنت رسول اور احادیث رسول کے حوالے سے اعلیٰ سے اعلیٰ کام کرنے میں مصروف ہیں مگر حق تو یہ ہے کہ ان کی تمام تر کارگزاری کے پس پردہ امام بخاری کی کاوشیں کارفرما ہیں۔ اگر یہ عاشق رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم عظیم ترین کام کا بیڑا اٹھا کر اپنے وطن سے نکل کر دور دراز کا سفر نہ کرتا، وقت کے آئمہ کرام اور محدثین کے سامنے زانوئے تلمذ طے نہ کرتا تو فروغ حدیث کے سلسلہ میں کافی حد تک کمی واقعہ ہو چکی ہوتی لیکن اسلام اللہ کا دین ہے۔ قرآن خدا کا کلام ہے اور احادیث و سنت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عطا ہے۔ پھر کیسے ہو سکتا فروغ حدیث کا کام نہ ہوتا۔ امام بخاری نہ ہوتے تو کوئی اور امام یہ کام کر دیتا۔ آخر اور محدثین نے بھی تو ترتیب و تدوین کے کام کئے ہیں مگر سلام ہو امام بخاری پر آپ نے جو عظیم کام انجام دیا وہ خدا نے ان ہی سے لینا تھا اور واقعی انہوں نے وہ کر دکھایا جو خدا کی مشیت ان سے چاہتی تھی۔



حضرت امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ

رہبر دین متین تھے امام مسلمؒ امام مسلم
جلوۂ علم ابقین تھے امام مسلمؒ امام مسلم
ان سے پہلی چار جانب عظمت علم الحدیث
شارح فکر میں تھے امام مسلمؒ امام مسلم
وہ محدث تھے کہ نازاں ان پہ تھا علم حدیث
جان اور دل کے قرین تھے امام مسلمؒ امام مسلم
ان کے دل میں ایک ہی دھن تھی فروغ دین کی
پاک باز و پاک ہیں تھے امام مسلمؒ امام مسلم
ان کا ہر اک قول ہے شمع یقین نور ہدی
روح فطرت دل نشین تھے امام مسلمؒ امام مسلم
ان کے فرمودات عالی سے منور زندگی
زینت دنیا و دین تھے امام مسلمؒ امام مسلم
آپ نے بخشی رضا تاریخ کو "مسلم شریف"
مظہر حق بالیقین تھے امام مسلمؒ امام مسلم

محدث دوراں

حضرت امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ

وہ تمام شخصیات لائق صد تحسین ہیں اور تاریخ کا اعزاز ہیں جنہوں نے محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے سرشار ہو کر احادیث کو جمع کیا۔ ان کی ترتیب و تدوین کی اور انہیں اُمت اسلام کے سامنے پیش کیا۔ ان محدثین کے ذہن خداداد نے گھر میں بیٹھ کر لفظوں کے محل نہیں تراشے بلکہ زمان و مکان کی ہر مشکل پر قابو پایا۔ طویل اور دور دراز کے سفر کئے کہ عقل انسانی حیران رہ جاتی ہے۔ بعض اوقات ایک محدث کبیر کو ایک حدیث کی صحت کے بارے میں تحقیق کیلئے کئی کئی شہروں کا سفر کرنا پڑا۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ جانے والی شخصیت اس سے زیادہ وقیع ہوتی جس کے پاس وہ جا رہی ہوتی تھی مگر یہ شخصیت اپنے مقام و مرتبہ کو بالائے طاق رکھ کر صحت حدیث کیلئے جب مطلوبہ شخصیت کے پاس پہنچتی تو اسے سخت تعجب ہوتا مگر محدثین نے اپنی زندگیوں کی راحتوں کو بالائے طاق رکھ کر یہ صبر آزما اور شدید جدوجہد محض اس لئے کی کہ اُمت اسلام تک درست احادیث کا حسن پہنچے تا کہ فرمواتے مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم احسن ترین صورت میں پہنچیں۔ اُمت اسلام ایک مرکز پر جمع ہو جائے اور سیرت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اصل خدو خال تک عوام الناس کی راہنمائی ہو۔ بھم اللہ یہ انہی محدثین کا فیضان ہے چاروں طرف عظمت اسلام کے پھریرے لہرا رہے ہیں۔

حضرت امام مسلم کی شخصیت حد درجہ مسلمہ اور قابل صد احترام ہے۔ آپ نے اپنی پوری زندگی جمع احادیث کے مقدس ترین مشن میں گزار دی۔ شبوں کی نیند اور دنوں کا آرام اس کی نذر کر دیا۔ آپ کا مقام و مرتبہ تاریخ حدیث میں اس قدر بلند ہے کہ اُس کی عظمتوں کے بارے میں سوچ کر عقل انسانی دنگ رہ جاتی ہے۔ کیا آپ کا یہ رتبہ کم ہے کہ آپ کی صحیح مسلم موازنہ امام محمد اسماعیل بخاری کی صحیح بخاری شریف سے کیا جاتا۔ صحیح مسلم شریف اور صحیح بخاری شریف کے مقام و مرتبہ پر بحث کی جاتی کہ ان میں سے کس کا رتبہ بلند ہے اور یہ پڑھ کر آپ کی عظمت کو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ محدثین اور راویوں کا ایک بڑا گروہ صحیح مسلم شریف کو صحیح بخاری شریف پر ترجیح دے رہا ہے۔ ہم سے

Click For More Books

<https://archive.org/details/@zohaibhasanattari>

ادنیٰ و ناچیز اس بارے میں کیا کہہ سکتے ہیں ہمارے لئے تو دونوں آسمان حدیث کے ماہر پارے ہیں ہم تو فقط بڑوں کی آراء کا تذکرہ کر رہے تھے۔

حضرت علامہ غلام رسول سعیدی نے اس بارے میں خوب تجزیہ کیا ہے۔

صحیح مسلم کتب صحاح ستہ میں صحیح بخاری کے بعد شمار کی جاتی ہے۔ امام مسلم بن حجاج نے اس کی احادیث کو انتہائی محنت اور کاوش سے ترتیب دیا ہے۔ حسن ترتیب اور تدوین کی عمدگی کے لحاظ سے یہ صحیح بخاری پر بھی فوقیت رکھتی ہے اور زمانہ تصنیف سے لے کر آج تک اس کو قبولیت عامہ کا شرف حاصل رہا ہے۔

متقدمین میں سے بعض مغاربہ اور محققین نے صحیح مسلم کو بے حد پسند کیا ہے اور اس کو صحیح بخاری پر بھی ترجیح دی ہے۔ چنانچہ ابوعلی حاکم نیشاپوری اور حافظ ابوبکر اسماعیلی صاحب مدخل کا یہی قول ہے اور امام عبدالرحمن نسائی نے کہا کہ امام مسلم کی صحیح، امام بخاری کی صحیح سے عمدہ ہے اور مسلم بن قاسم قرطبی معاصر دارقطنی نے کہا کہ امام مسلم کی صحیح کی مثل کوئی شخص نہیں پیش کر سکتا۔

ابن حزم بھی صحیح مسلم کو صحیح بخاری پر ترجیح دیتے تھے اور خود امام مسلم نے اپنی کتاب کے بارے میں فرمایا تھا کہ اگر محدثین دو سو سال بھی احادیث لکھتے ہیں پھر بھی ان کا مدار اسی کتاب پر ہو گا۔ اور اب تو دو سو برس چھوڑ کر گیارہ سو برس ہونے کو آئے لیکن اس مرد خدا کے قول کی صداقت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اور شاہ عبدالعزیز بیان کرتے ہیں کہ ابوعلی زعفرانی کو کسی شخص نے وفات کے بعد خواب میں دیکھا اور ان سے پوچھا کہ تمہاری بخشش کس سبب سے ہوئی تو انہوں نے صحیح مسلم کے چند اجزاء کی طرف اشارہ کر کے فرمایا ان اجزاء کے سبب اللہ تعالیٰ نے مجھے بخش دیا۔ اس خواب سے معلوم ہوا کہ صحیح مسلم اللہ تعالیٰ کے نزدیک شرف قبولیت حاصل کر چکی ہے۔

امام مسلم نے اپنی صحیح کی تالیف کا سبب خود بیان فرمایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ مجھ سے میرے بعض تلامذہ نے درخواست کی کہ میں احادیث صحیحہ کا ایک ایسا مجموعہ تیار کروں جس میں بلا تکرار احادیث کو جمع کیا جائے۔ چنانچہ ان کی درخواست پر میں نے اپنی صحیح کی تالیف کی۔ امام مسلم نے تین لاکھ احادیث میں سے اپنی جامع کا انتخاب فرمایا اور جن مشائخ کی احادیث کو انہوں نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے ان سب سے انہوں نے بالمشافہ اور براہ راست سماع کیا ہے اور اس تصنیف میں انہوں نے صرف اپنی ذاتی تحقیق پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ مزید احتیاط کے پیش نظر اس مجموعہ میں صرف ان احادیث کو لائے ہیں جن کی صحت پر اس وقت کے اکابرین کا اتفاق تھا اور پھر اسی پر بس نہیں کی بلکہ

تحقیق مزید کیلئے کتاب کی تکمیل کے بعد اسے حافظ عصر ابو ذرہ کی خدمت میں پیش کیا جو اس زمانہ میں علل حدیث اور جرح و تعدیل کے فن میں امام گردانے جاتے تھے اور جس روایت کے بارے میں انہوں نے کسی علت کی نشاندہی کی، امام مسلم نے اس کو کتاب سے خارج کر دیا، اسی طرح پندرہ سال کی لگاتار جدوجہد اور شدید مشقت کے بعد صحیح مسلم کی صورت میں یہ مجموعہ احادیث تیار ہو گیا۔

حاجی خلیفہ اور دیگر مؤرخین نے صحیح مسلم کا نام الجامع الصحیح بیان کیا ہے مگر اس نام پر بعض حضرات نے یہ اعتراض کیا ہے کہ جامع حدیث کی اس کتاب کو کہتے ہیں جس میں تفسیر بھی ہو اور صحیح مسلم میں تفسیر سے متعلق احادیث بہت کم ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جامع کے تحقیق کیلئے کتاب میں نفس تفسیر کا لانا شرط ہے، قلت یا کثرت ملحوظ نہیں ہے۔ چنانچہ متقدمین میں سے سفیان ثوری اور سفیان بن عیینہ کی جو تصانیف جامع کے نام سے مشہور ہیں ان میں بھی تفسیر بہت کم ہے۔

صحیح مسلم میں تفسیر اس قدر کم لانے کا سبب یہ ہے کہ تفسیر سے متعلق اکثر روایات امام مسلم کتاب کے شروع میں لے آئے ہیں اور چونکہ اس کتاب میں انہوں نے حتی الامکان تکرار سے گریز کیا ہے اس لئے کتاب التفسیر میں ان روایات کو دوبارہ نہیں لائے۔

امام مسلم نے اپنی صحیح کی تالیف اور ترتیب میں انتہائی حزم و احتیاط اور کامل ورع اور تقویٰ سے کام لیا ہے۔ امام ابن شہاب زہری، امام مالک اور امام بخاری حدیث اور خبرنا کے درمیان فرق نہیں کرتے۔ اور ابن جریج، اوزاعی، امام شافعی، امام احمد بن حنبل، یحییٰ بن یحییٰ، عبد اللہ بن مبارک اور دیگر تمام محدثین حدیث اور خبرنا میں فرق کرتے ہیں۔ حدیث کا استعمال اس وقت کرتے ہیں جب استاذ حدیث کی قرأت کرے اور شاگرد سن رہے ہوں اور خبرنا کا استعمال اس وقت کرتے ہیں جب شاگرد پڑھے اور استاذ سن رہا ہو، چونکہ اکثر محدثین خبرنا اور حدیث میں ایک کا استعمال دوسرے کی جگہ جائز نہیں رکھتے۔ اس لئے احتیاط کے پیش نظر امام مسلم نے اپنی صحیح میں یہی طریقہ اختیار کیا ہے اور حدیث اور خبرنا کے فرق کو قائم رکھا ہے۔

امام مسلم نے سند حدیث میں راویوں کے اسماء کے ضبط کا بھی بڑا خیال رکھا ہے۔ جس راوی کا اصل سند میں صرف نام ذکر کیا گیا ہو اور نسب کا ذکر نہ ہو جس کے سبب ابہام پیدا ہو تو وہ اس کی وضاحت کرتے ہیں مگر اس احتیاط کے ساتھ کہ استاذ کے بیان کئے ہوئے الفاظ میں خلل نہ آئے۔

امام مسلم نے اپنی صحیح میں احادیث کو ترتیب دار ابواب کے لحاظ سے وارد کیا ہے لیکن تراجم اور عنوانات مقرر نہیں کئے۔ امام نووی فرماتے ہیں اس کا سبب یا تو اختصار تھا یا کوئی اور امر جس کو

امام مسلم ہی بہتر طور پر جانتے تھے۔ بہر حال بعد کے لوگوں نے ان ابواب کے تراجم مقرر کر دیئے ہیں جن کو صحیح مسلم کے حواشی میں ذکر کر دیا گیا ہے۔ ان تراجم میں بعض بہت عمدہ ہیں اور بعض میں رکاکت اور تقصیر ہے۔

آپ کا اسم گرامی امام مسلم بن حجاج القشیری ہے۔ تیسری صدی کے جن محدثین والاتباع نے حدیث کو جمع کرنے کی توضیح وضاحت کیلئے متعدد فنون ایجاد کئے اور علم احادیث کی اشاعت میں تاریخ ساز کردار ادا کیا ان میں امام مسلم نہایت ہی بلند مرتبہ رکھتے ہیں۔ امام ترمذی اور ابو بکر خزیمہ جیسے مشاہیر نے ان سے حدیث کی روایت کو اپنے لئے بہت بڑا اعزاز قرار دیا۔ ابو قریش کا قول ہے کہ دنیا میں علم حدیث کے فروغ و اشاعت کے سلسلہ میں چار شخصیات کا درجہ بہت ہی بلند ہے اور امام مسلم ان میں سے ایک ہیں۔ ان کے کہنے کے مطابق امام مسلم کے کچھ کہنے کے بعد مزید کچھ کہنے کی گنجائش نہیں رہتی۔

خراسان کے ایک وسیع اور خوبصورت شہر نیشاپور میں بنوقشیر کے خاندان میں پیدا ہوئے۔ امام مسلم کی ولادت کے سال میں مؤرخین کا اختلاف ہے۔ شاہ عبدالعزیز نے ان کا سال ولادت ۲۰۲ھ لکھا ہے۔ امام ذہبی نے ۲۰۴ھ بیان کیا ہے اور ابن اثیر نے ۲۰۵ھ کو اختیار کیا ہے۔ ابتدائی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد اٹھارہ سال کی عمر میں امام مسلم نے علم حدیث کی تعلیم شروع کی۔ فن حدیث کو انہوں نے انتہائی لگن اور محنت سے حاصل کیا۔ اور بہت جلد نیشاپور کے عظیم محدثین میں ان کا شمار ہونے لگا۔

امام مسلم سرخ و سفید رنگ، بلند قامت اور وجیہہ شخصیت کے مالک تھے۔ سر پر عمامہ باندھتے تھے اور شملہ کندھوں کے درمیان لٹکایا کرتے تھے۔ انہوں نے علم کو ذریعہ معاش نہیں بنایا۔ کپڑوں کی تجارت کر کے اپنی نجی ضروریات پوری کیا کرتے تھے۔ شاہ عبدالعزیز لکھتے ہیں کہ امام مسلم کے عجائبات میں سے یہ ہے کہ انہوں نے عمر بھر نہ کسی کی غیبت کی نہ کسی کو مارا اور نہ کسی کے ساتھ درشت کلامی کی۔

اب ہم امام مسلم کے اساتذہ کرام پر ایک نظر ڈالتے ہیں کیونکہ بسا اوقات اساتذہ کی عظمت اور فضیلت کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ شاگرد کتنا بلند قامت ہوگا۔ اگر شاگرد بلند فکر ہوگا تو حصول علم کیلئے انتہائی بلند درجہ اساتذہ کا انتخاب کرے گا اور اس سے بھی اس کی ذہانت اور علمی لگن کا احساس ہوگا اور اگر اساتذہ بلند فکر ہوں گے تو خود بخود اندازہ ہو جائے گا کہ انہوں نے اپنے

شاگرد کو کون علمی مدارج کا حامل بنانے کی کوشش کی ہے کیونکہ شاگرد اور اساتذہ کا باہمی رشتہ ایک قدرتی بلندی کا ضامن بن جاتا ہے۔

اب حضرت امام مسلم کے اساتذہ کرام کے اسمائے عالی پر ایک نظر ڈالئے۔

علم حدیث کی طلب میں امام مسلم نے متعدد شہروں کا سفر اختیار کیا۔ نیشاپور کے اساتذہ سے اکتساب فیض کے بعد وہ حجاز، شام، عراق اور مصر گئے اور ان گنت بار بغداد کا سفر کیا، انہوں نے ان تمام شہروں کے مشاہیر اساتذہ کے سامنے زانوئے تلمذتہ کیا۔ حافظ ابن حجر عسقلانی اور دیگر مورخین نے ان کے اساتذہ میں حضرت یحییٰ بن یحییٰ، محمد بن یحییٰ ذہلی، احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ، عبداللہ بن مسلمہ القعقلی، احمد بن یونس، ربیع، اسماعیل بن ابی اویس، سعید بن منصور، عون بن سلام، راؤ بن عمرو، یحییٰ بن یحییٰ بن یحییٰ، شیخان ابن فروخ اور امام بخاری رحمہم اللہ تعالیٰ اجمعین کا تذکرہ لکھا ہے۔

جہاں امام مسلم نے بلند مرتبہ علمی شخصیات اور اساتذہ کرام سے استفادہ کیا ہے وہاں ان سے احادیث کو روایت کرنے اور علم حدیث سیکھنے والوں کی بھی ایک بڑی تعداد سامنے آتی ہے۔ ان افراد کو آپ سے سلسلہ تلمذ کر رکھنے پر بے پناہ فخر کا احساس ہے اور ان میں سے بہت سے نام انتہائی بلند مرتبہ رکھتے ہیں۔ اس سے آپ کی علمی ہمالہ صفت شخصیت کی بلندیوں کا احساس ہوتا ہے۔

امام مسلم سے سماع حدیث کرنے والوں اور ان سے حدیث کی روایت کرنے والوں کی ایک طویل فہرست ہے۔ چند نام درج ذیل ہیں:

ابوالفضل احمد بن سلمہ، ابراہیم بن ابی طالب، ابو عمرو و خناف، حسین بن محمد قبانی، ابو عمرو مستملی، حافظ صالح بن محمد علی بن حسن، محمد بن عبدالوہاب، علی بن حسین بن جنید، ابن خزیمہ، ابن صاعد، سراج، محمد بن عبد بن حمید، ابو حامد ابن الشرقي، علی بن اسماعیل الصغار، ابو محمد بن ابی حاتم رازی، ابراہیم بن محمد بن سفیان، محمد بن مخلد دوری، ابراہیم بن محمد بن حمزہ ابو عوانہ، اسفرائی، محمد بن اسحاق فاکہی، ابو حامد اعمشی، ابو حامد بن حسویہ اور امام ترمذی۔

امام ترمذی نے اپنی جامع صحیح میں امام مسلم سے صرف ایک روایت ذکر کی ہے اور وہ یہ ہے: یحییٰ بن یحییٰ عن ابی معاویہ عن محمد بن عمرو عن ابی سلمہ عن ابی ہریرۃ، اخصوا ہلال شعبان بر رمضان۔

ایک نظر ذرا ان مشاہیر کو بھی دیکھئے جو امام مسلم کے مقام و مرتبہ سے بخوبی آگاہ ہیں۔ اپنی کتابوں میں ان کا تذکرہ کرتے ہیں اور اپنی تصانیف اور تحریروں میں ان کو بھرپور خراج تحسین ادا کرتے ہیں۔ امام مسلم کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان شخصیات معمولی نہیں بلکہ ان کا اپنا مقام و مرتبہ

بہت بلند ہے۔ ملاحظہ کیجئے:

امام مسلم کی خدمات اور ان کے کمالات کو ان کے اساتذہ اور معاصرین نے بے حد سراہا ہے۔ ابو عمرو مستملی بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہمیں اسحاق بن منصور احادیث لکھوار ہے تھے اور امام مسلم ان احادیث میں سے انتخاب کر رہے تھے۔ اچانک اسحاق بن منصور نے نگاہ اوپر اٹھائی اور کہہ ہم اس وقت تک کبھی خیر سے محروم نہیں ہوں گے جب تک ہمارے درمیان مسلم بن حجاج موجود ہیں۔ ان کے ایک اور استاد محمد بن عبدالوہاب فراد نے کہا کہ مسلم علم کا خزانہ ہے اور میں نے ان میں خیر کے سوا اور کچھ نہیں پایا۔ ابن اوزعم نے کہا نیشاپور نے تین محدث پیدا کئے۔ محمد بن یحییٰ، ابراہیم بن ابی طالب اور مسلم۔ ابن عقده نے کہا امام مسلم بالمشافہ سماع کے بغیر روایت نہیں کرتے تھے۔ ابوبکر جاردی نے کہا کہ مسلم علم کے محافظ تھے۔ مسلم بن قاسم نے کہا کہ وہ جلیل القدر امام تھے۔ بندار نے کہا دنیا میں صرف چار حفاظ ہیں۔ ابوزرعہ، محمد بن اسماعیل، داری اور مسلم بن حجاج۔

امام مسلم کو قدرت نے غیر معمولی علمی شکوہ عطا کیا تھا۔ یہ سب آپ کی محنت اور علمی ریاضت کا نتیجہ تھا۔ آپ نے ساری زندگی فروغ و اشاعت حدیث میں گزار دی اس لئے ہر ملک اور علاقہ کے محدثین، ماہرین فن اور مفسرین نے جی کھول کر آپ کے علمی جمال اور شکوہ کا تذکرہ کیا ہے۔ آپ کے علمی شکوہ کو مد نظر رکھتے ہوئے بہت سی نامور شخصیات کے سرفرط عقیدت سے جھک جاتے ہیں۔

امام مسلم فن حدیث میں عظیم صلاحیتوں کے مالک تھے۔ حدیث صحیح اور سقیم کی پہچان میں وہ اپنے زمانہ کے اکثر محدثین پر فوقیت رکھتے تھے۔ حتیٰ کہ بعض امور میں ان کو امام بخاری پر بھی فضیلت حاصل تھی کیونکہ امام بخاری نے اہل شام کی اکثر روایات ان کی کتابوں سے بطریق مناوہہ حاصل کی ہیں۔ خود ان کے مؤلفین سے سماع نہیں کیا۔ اس لئے ان کے رویوں میں امام بخاری سے بسا اوقات غلطی واقع ہو جاتی ہے کیونکہ ایک ہی راوی کا کبھی نام ذکر کیا جاتا ہے اور کبھی کیفیت ایسی صورت میں بعض دفعہ امام بخاری ان کو دو راوی خیال کر لیتے ہیں اور امام مسلم نے چونکہ اہل شام سے براہ راست سماع کیا ہے اس لئے وہ اس قسم کا مغالطہ نہیں کھاتے۔

امام مسلم صاحب تصانیف کثیرہ ہیں۔ کتب کی یہ تعداد ان کی علمی فضیلت کا ثبوت ہے۔ آپ نے اپنے علاقہ میں تو درس و تدریس کا نور پھیلا یا ہی تھا اور جن مقامات میں آپ مقیم ہے یا آپ کا گزر ہوا ان علاقوں کو بھی حدیث کے فیوضات سے بہرہ ور فرماتے رہے۔ خاص طور سے جمع حدیث اور فروغ حدیث کے ضمن میں جن طویل سفروں کو طے کیا اور درجنوں مشہور قصبات اور

شہروں سے بھی گزرے تو وہاں وہاں علم و حکمت کے فروغ کا سلسلہ جاری رکھا۔ درس و تدریس کو فروغ دیا تا کہ عوام الناس طلبہ علماء اور اہل فضیلت آپ کے سرچشمہ فیوض و برکات سے جی بھر کر خوش چینی کر لیں۔ آپ نے درس و تدریس کے علاوہ تصانیف کو بھی اپنی زندگی کا مرکز و محور بنائے رکھا۔ یہ اسی محنت شاقہ کا کمال تھا کہ دنیا سے جاتے ہوئے ایک بڑا علمی ذخیرہ علم و حکمت کے شیدائیوں کے حوالے کر گئے۔ آپ کی تصانیف درج ذیل ہیں:

- ۱۔ الجامع الصحیح
- ۲۔ المسند الکبیر
- ۳۔ کتاب الاسلام والکنی
- ۴۔ کتاب الجامع علی الباب
- ۵۔ کتاب العلل
- ۶۔ کتاب الوجدان
- ۷۔ کتاب الافراد
- ۸۔ کتاب سوالات احمد بن حنبل
- ۹۔ کتاب حدیث عمرو بن شعیب
- ۱۰۔ کتاب الانتفاع بابہ السباع
- ۱۱۔ کتاب مشائخ مالک
- ۱۲۔ کتاب مشائخ ثوری
- ۱۳۔ کتاب مشائخ شعبہ
- ۱۴۔ کتاب من لیس له الا راو واحد
- ۱۵۔ کتاب الخضر مین
- ۱۶۔ کتاب اولاد الصحابہ
- ۱۷۔ کتاب اوہام المحدثین
- ۱۸۔ کتاب الطبقات
- ۱۹۔ کتاب افراد الشامیین
- ۲۰۔ مسند امام مالک
- ۲۱۔ مسند الصحابہ

آپ کی بڑی آرزو تھی کہ مسند الصحابہ پر سیر حاصل تصنیف چھوڑ جائیں۔ بڑا مواد جمع کیا۔ ایک حصہ لکھا بھی۔ آپ کی زندگی نے وفاتہ کی ورنہ محدثین کا کہنا ہے کہ اگر یہ تصنیف مکمل ہو جاتی تو اپنے موضوع کے لحاظ سے نہایت تاریخی مقام کی حامل ہوتی اور زمانہ مدتوں اُس سے خوش چینی کرتا۔ آپ اس کو ضخامت اور علمی مواد دونوں لحاظ سے یادگار بنانا چاہتے تھے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے بھی اس کی طرف بطور خاص اشارا کیا ہے اور کہا کہ اگر عمر ساتھ دے دیتی اور یہ تصنیف مکمل ہو جاتی تو نہ جانے آنے والے کتنے ادوار اس سے خوش چینی کرتے رہتے اور کتنے محققین اس سے استفادہ کرتے۔ موت کا اکت دن معین ہے۔ ایک عام انسان ہو یا بندگان خاص سب نے موت کی زہرنا کیوں کا سامنا کرنا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ خاصانِ بارگاہِ خداوندی کیلئے موت اپنے محبوب حقیقی سے اوصال کا ایک بہانہ ہوتی ہے۔ ورنہ اہل اللہ کی موت کے بارے میں میر درد نے کیا خوب کہا ہے:

موت کیا آ کے فقیروں سے تجھے لینا ہے
موت سے پہلے ہی یہ لوگ تو مر جاتے ہیں
عالم اسلام کے محسن اور عظیم محدث حضرت امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کا سبب بھی
نہایت عجیب و غریب بیان کیا گیا ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں کہ ایک دن مجلس مذاکرہ میں
امام مسلم سے ایک حدیث کے بارے میں استفسار کیا گیا۔ اس وقت آپ اس حدیث کے بارے
میں کچھ نہ بتا سکے۔ گھر آ کر اپنی کتابوں میں اس حدیث کی تلاش شروع کر دی۔ قریب ہی کھجوروں کا
ایک ٹوکرا بھی رکھا ہوا تھا۔ امام مسلم کے استغراق اور انہماک کا یہ عالم تھا کہ کھجوروں کی مقدار کی
طرف آپ کی توجہ نہ ہو سکی اور حدیث ملنے تک کھجوروں کا سارا ٹوکرا خالی ہو گیا اور غیر ارادی
طور پر کھجوروں کا زیادہ کھا لینا ہی ان کی موت کا سبب بن گیا اور اس طرح ۲۳ رجب ۲۶۱ھ اتوار کے
دن شام کے وقت علم حدیث کا یہ درخشندہ آفتاب غروب ہو گیا اور اگلے روز پھر کے دن خراسان کے
اس عظیم محدث کو سپرد خاک کر دیا گیا۔

ہم نے امام محمد اسماعیل بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے تذکار کئے ہوئے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ کے
امام بخاری سے غیر معمولی تعلق خاطر کا ذکر کیا ہے۔ آپ امام بخاری کی فروغ حدیث کے سلسلہ میں
خدمات کو حد درجہ تسلیم کرتے تھے اور کسی کو اجازت نہیں دیتے تھے کہ ان سے اختلاف کرے۔

یہ حقیقت ہے کہ بخشش طرح امام بخاری ایمان کے مرکب ہونے کے مسئلہ میں تشدد تھے اور
اسی شخص سے روایت نہیں لیتے تھے جو بساطت ایمان کا قاتل ہو اسی طرح امام محمد بن یحییٰ ذہلی قدم
قرآن کے مسئلہ میں تشدد تھے اور اس معض سے سخت بیزار تھے جو الفاظ قرآن کو مخلوق ماننا ہو جب
امام بخاری اور امام محمد بن یحییٰ کا اس مسئلہ میں اختلاف ہوا تو ان میں اور امام بخاری میں سخت
منافرت پیدا ہو گئی حتیٰ کہ ایک دن محمد بن یحییٰ ذہلی نے اپنی مجلس میں اعلان کر دیا کہ جو شخص الفاظ
قرآن کے مخلوق ہونے کا قائل ہو وہ ہماری مجلس سے چلا جائے۔ یہ سن کر امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے
اپنا عمامہ سنبھالا اور امام ذہلی کی مجلس سے اٹھ کر چلے گئے اور امام ذہلی سے انہوں نے جس قدر
احادیث ضبط کی تھیں وہ سب انہیں واپس بھجوا دیں۔

رب العالمین بھی ایسے محبوب بندوں کو بے حد نوازتا ہے جو اس کیلئے زندہ رہتے اور زندگی
بھر اس کے اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کے فروغ کیلئے سرگرم عمل رہتے ہیں۔ رب
دو عالم کی امام مسلم پر بعد از وصال نوازشوں کے حوالہ سے ایک روایت درج ذیل ہے۔

امام مسلم سادہ دل درویش تھے اور محکم و عمل کی بہترین خوبیوں کے جامع تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کی خدمات کا بہترین صلہ عطا فرمایا۔ ابو حاتم رازی بیان کرتے ہیں میں نے امام مسلم کو خواب میں دیکھا اور ان کا حال دریافت کیا تو انہوں نے جواب دیا اللہ تعالیٰ نے اپنی جنت کو میرے لئے مباح کر دیا ہے اور میں اس میں جہاں چاہتا ہوں رہتا ہوں۔

حضرت امام مسلم علم و حکمت کا مینارہ نور تھے جس سے پھوٹنے والی روشنی دنیائے اسلام کو شام ابد تک منور کرتی رہے گی۔ آپ کا شمار اس محدود ترین طبقہ محدثین میں ہوتا ہے جنہوں نے کمال احتیاط اور علمی صحت کے ساتھ احادیث کو عوام الناس تک پہنچایا۔ امام مسلم ایک فرد نہیں ادارہ تھے بلکہ اپنے کارناموں کے لحاظ سے صدیوں کی آبرو تھے زمانے کا اعزاز تھے وقت کا افتخار تھے رحمت خداوندی تھے عنایت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔

آسمان تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزہ نور ستہ ترے گھر کی نگہبانی کرے



انتم کرام

Click For More Books

<https://archive.org/details/@zohaibhasanattari>

سراج الائمہ حضرت امام اعظم نعمان ثابت رحمۃ اللہ علیہ

یہ حج بیت اللہ کا زمانہ ہے۔

ایک بوڑھا جس کے چہرے سے علمی وجاہت اور فقہی سرفرازی ہویدا ہے بیت اللہ کے سامنے کھڑا ہے۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑیاں لگی ہوئی ہیں۔ آنسوؤں کی برسات سے اس مردِ ضعیف کی داڑھی بھیگ چکی ہے اور وہ کمال عاجزی و انکساری کے ساتھ بیت اللہ کے سامنے سر کو جھکائے ادب و احترام سے عرض کر رہا ہے کہ:

”یا الہی! آج میں نے طواف سے قبل دو رکعت میں قرآن حکیم ختم کیا ہے۔ خدایا! میں نے تیرا اور تیرے رسول کا پیغام پوری دنیائے اسلام میں پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ میں نے اپنا ذہن دماغ اور دل تیری رضا میں صرف کر دیئے لیکن پھر بھی خدایا یہ عبد ضعیف تیری عبادت کا حق ادا نہیں کر سکا، تیری معرفت کا جو حق تھا میں نے اس کو نہیں پہچانا، لہذا کمال معرفت کے سبب نقصان خدمت کو معاف کر دئے۔“

اس مردِ درویش کی اس رقت آمیز مناجات کے ساتھ ہی زاویہ بیت اللہ سے آواز آئی:

”ہم نے تجھ کو اور تا قیامت تمہارے مذہب اور راستے پر چلنے والوں کو بخش دیا۔“

یہ مردِ درویش کہ جس کی مناجات بارگاہِ خداوندی میں اس کی مقبولیت کا بہانہ بن گئی، سراج الائمہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ تھے جو اپنے آخری حج کے دوران بارگاہِ خداوندی میں رحمت خالق کے طالب تھے۔ آپ کا نام نعمان، کنیت ابوحنیفہ اور لقب امام اعظم ہے۔ نعمان کے لغوی معنی اس خون کے ہیں جس سے بدن کا قوام بنتا ہے۔ آپ کو اسی لئے نعمان کہتے ہیں کہ آپ کی علمی ثقاہت کی وجہ سے آپ کی فقہی سر بلندی علوم اسلامیہ کا قوام ہے۔ نعمان نعمت سے مشتق ہے چونکہ آپ مخلوقِ خدا پر ایک نعمتِ عظمیٰ تھے اور ہیں، اس لئے نعمان کہلائے۔ یہ غلط ہے کہ آپ کی لڑکی کا نام حنیفہ تھا، اس لئے آپ ابوحنیفہ کہلائے۔ حنیفہ حنیف کا مونث ہے جس کے معنی عابد کے ہیں۔ چونکہ آپ مائل بہ حق تھے اس لئے حنیف کہلائے۔ ہیں مشہور فقہاء کی کنیت ابوحنیفہ ہے، مگر سب سے

زیادہ شہرت آپ ہی کی حاصل ہوئی۔ آپ کا شجرہ نسب یوں ہے:

نعمان بن ثابت بن قیس بن یزدگرد بن شہریار بن پرویز بن نوشیرواں بادشاہ عادل
سیدنا امام اعظم ۸۰ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ثابت چھوٹی عمر میں حضرت علی رضی اللہ
عنه کی خدمت میں لائے گئے۔ آپ نے ان کے اور ان کی اولاد کیلئے برکت کی دعا فرمائی۔ یہ حضرت
علی ہی کی دعاؤں کا فیضان تھا کہ حضرت نعمان بن ثابت علوم دینیہ کے آسمان پر خورشید کامل بن چکے۔
آپ کے مقلدین میں بڑے بڑے اولیاء اصفیاء سلاطین روم اور ماوراءالنہر ہند و سندھ
ترک سمرقند داؤد طائی، معروف کرخی، شفیق بلخی، بایزید بسطامی، فضیل بن عیاض، مخدوم علی ہجویری داتا
گنج بخش، اور نگزیب عالمگیر، محمود غزنوی (رحمۃ اللہ علیہم اجمعین) وغیرہ گزرے ہیں۔

آپ نے پاپیادہ بچپن ہی کئے۔ حدائق الحنفیہ میں لکھا ہے کہ آپ کے زمانہ میں تقریباً ۱۹
صحابہ کرام زندہ موجود تھے۔ علامہ جلال الدین سیوطی نے چودہ صحابہ کرام کے حالات لکھے ہیں جن
کی عمریں ۱۲۰ سال یا اس سے زائد تھیں۔ اس سے بڑھ کر آپ کی اور کیا خوش قسمتی ہو سکتی ہے کہ
آپ نے خیر القرون صحابہ کا زمانہ پایا۔ داؤد طائی کہتے ہیں بیس سال امام موصوف کی خدمت میں
رہا، اس مدت میں میں نے کبھی ان کو خلوت و جلوت میں سربرہنہ اور پاؤں لپے کئے ہوئے نہیں
دیکھا۔ ایک دفعہ میں نے ان کو کہا کہ اے امام اگر آپ خلوت میں پاؤں دراز کر لیا کریں تو کیا
مضانقہ ہے۔ آپ نے کہا خلوت میں ادب نگاہ رکھنا اولیٰ تر ہے۔

جب آپ کے والد ماجد فوت ہوئے، آپ نے سیدنا امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کی آغوش
میں پرورش پائی۔ آپ نے امام عالی مقام کی خدمت میں رہ کر ظاہر و باطنی فیوض و علوم حاصل کئے۔
چنانچہ آپ فرماتے ہیں:

لولا السنن لهلك النعمان

اگر یہ دو سال نہ ہوتے تو نعمان ہلاک ہو جاتا۔

جب امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کی علمی سرفرازیوں کی شہرت چاروں طرف پھیلنے لگی تو آپ
کے حاسدین بھی کثرت سے ابھر کر سامنے آئے۔ یہ ایک فطری امر ہے کہ جب سورج چمکتا ہے تو
بادل اس پر سایہ کرنے کیلئے مچنے لگتے ہیں۔ چونکہ امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ نے اپنے غیر معمولی
فقہی کمالات کی بدولت بہت کم عرصہ میں شہرت عام حاصل کر لی تھی۔ اس لئے آپ کے معاندین
اور حاسدین آپ پر طرح طرح سے بہتان طرازی کرنے لگے۔ ان حاسدین نے آپ سے یہ بات

منسوب کر دی کہ آپ اپنی رائے کے مطابق فتویٰ دیتے ہیں جب حضرت امام تک یہ بات پہنچی تو واضح طور پر تردید کرتے ہوئے فرمایا:

”مجھے لوگوں کے اس قول پر تعجب ہے کہ میں اپنی رائے سے فتویٰ دیتا ہوں حالانکہ میں قرآن و حدیث اور معمولات صحابہ کے مطابق فتویٰ دیتا ہوں“

اس سلسلہ میں ایک مرتبہ وضاحت حال کیلئے جامعہ کوفہ میں بروز جمعہ حضرت سفیان ثوریؒ حضرت حماد بن سلمہؒ حضرت مقاتل بن جیان اور دوسرے فقہاء تشریف لائے اور کہا ہم نے سنا ہے کہ آپ دین میں اپنے قیاس سے کام لیتے ہیں اور آپ کیلئے اس بات سے ہم ڈرتے ہیں کہ سب سے پہلے یہ کام شیطان نے کیا تھا۔ آپ نے صبح سے دوپہر تک ان کے ساتھ دلائل قاہرہ سے مناظرہ کر کے اپنا مذہب پیش کیا اور ثابت کیا کہ میں قرآن کریم کو عمل میں سب سے مقدم کرتا ہوں۔ پھر حدیث پاک کو پھر اقصیٰ صحابہ کو جس پر سب متفق ہیں پھر بعد ازاں قیاس کرتا ہوں۔ تب سب نے کھڑے ہو کر آپ کے ہاتھ اور زانوؤں کو بوسہ دیا اور کہا انت سید العلماء (آپ علماء کے سردار ہیں) ہماری غلطی معاف فرمائیں جو آپ کے حق میں بغیر علم کے ہم سے ہو گئی ہے۔ آپ نے فرمایا: غفر الله لنا ولكم اجمعین۔

ایک بار حضرت امام باقر رضی اللہ عنہ کا بھی آپ کے ساتھ اسی نوعیت کا مکالمہ ہوا جس کے خوشگوار نتائج نے آپ کی قدر و منزلت میں اور اضافہ کر دیا۔ آپ حضرت امام باقر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے فرمایا:

”تم قیاس کی بناء پر ہمارے دادا کی حدیثوں سے انکار کرتے ہو۔“

آپ نے نہایت ادب سے عرض کیا:

”العیاذ باللہ حدیث کی کون مخالفت کر سکتا ہے“ پھر آپ نے امام باقر سے دریافت کیا

”محترم یہ ارشاد فرمائیے کہ مرد ضعیف ہے یا عورت؟“

امام باقر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا ”عورت“

آپ نے فرمایا ”وراقت میں مرد کا حصہ زیادہ ہے یا عورت کا؟“

امام باقر نے فرمایا ”مرد کا۔“

اس پر امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کہنے لگے ”اگر میں قیاس لگاتا تو کہتا کہ عورت کو زیادہ حصہ

دیا جائے کیونکہ ضعیف کو ظاہر قیاس کی بناء پر زیادہ حصہ ملنا چاہئے۔“

پھر امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ نے پوچھا:

”امام مکرم نماز افضل ہے یا روزہ؟“

امام باقر رضی اللہ عنہ نے فرمایا ”نماز“

امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس اعتبار سے حائضہ عورت پر نماز کی قضا واجب ہونی چاہیے نہ کہ روزہ کی۔ حالانکہ میں روزہ کی قضا کا فتویٰ دیتا ہوں۔

امام باقر آپ کی باتوں سے اس قدر خوش ہوئے کہ اٹھ کر اس سعید بخت امام کی پیشانی چوم لی۔

امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ نے احادیث نبوی کی ترتیب و تدوین اور روایت کے سلسلہ میں جو کام کیا ہے وہ تا ابد زندہ رہے گا۔ زرقاتی مالکی نے شرح موطا میں لکھا ہے کہ آپ سے پانچ سو یا سات سو یا ایک ہزار اور چند یا ایک ہزار سات سو چھ سو چھیا سٹھ احادیث مروی ہیں۔ (حدائق المحفیہ) سیدنا امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ نہایت پرہیز گار متقی اور عبادت گزار تھے۔ آپ کے ہزاروں تلامذہ تھے جن میں نامور علمائے دین بھی تھے۔ یہ تلامذہ اور دور دراز کے علاقوں سے آئے ہوئے تشنگان علم آپ کو سرچشمہ علوم جان کر آپ کو سارا دن گھیرے رہتے اور آپ بھی ہر ایک کو علمی اور روحانی طہ پر شاد کام کرنے کی کوشش کرتے مگر جو نہی رات ہو جاتی، آپ مصلیٰ پر کھڑے ہو جاتے اور تمام رات عبادت خداوندی میں بسر کر دیتے۔ آپ نے چالیس سال تک عشاء کے وضو سے صبح کی نماز پڑھی۔ تیس سال روزہ دار رہے۔ تیس برس ایک رکعت میں سارا قرآن ختم کرتے رہے۔ رمضان المبارک کا مقدس مہینہ آجاتا تو روحانی مشاغل بڑھ جاتے۔ آپ معمول کے مطابق ہر سال ماہ رمضان میں ۶۱ قرآن مجید ختم کیا کرتے تھے۔

حضرت امام اعظم کے شاگردوں میں ایسے عظیم انسان بھی کثرت سے ہوئے تھے جن میں سے ہر ایک کو تاریخ کا اعزاز ہونے کا استحقاق حاصل تھا۔ ان شاگردوں میں نامور محدثین، مفسرین اور عالی مرتبت علمائے کرام بھی شامل تھے۔ آپ کے شاگردوں میں جن حضرات نے دائمی شہرت حاصل کی، ان میں امام ابو یوسف اور امام احمد خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ امام ابو یوسف آپ کے وہ عظیم شاگرد ہیں جنہوں نے اپنے استاد مکرم کے فقہی کارناموں کو مزید تہ و تاب عطا کرنے کیلئے قابل توصیف کاوشیں کیں۔ امام ابو یوسف نہایت غریب والدین کے بیٹے تھے جبکہ ان کے استاد مکرم اور امام اعظم ابوحنیفہ نہایت متمول اور امیر تاجر بھی تھے جب امام ابو یوسف شروع شروع میں امام

عظم کے حلقہ شاگردی میں آئے تو ان کے والد نے انہیں سمجھایا کہ تمہارے اُستاد امیر کبیر ہیں، جبکہ تم انتہائی غریب ہو، اس لئے ان کے حلقہ درس میں نہ جایا کرو۔ امام ابو یوسف نے جانا چھوڑ دیا۔ اس پر امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ نے ابو یوسف رضی اللہ عنہ کو بلا کر غیر حاضری کا سبب دریافت کیا، جس پر امام ابو یوسف نے گھر کی تنگدستی اور والد کے حکم کے بارے میں عرض کیا۔ اس روز امام ابو حنیفہ نے امام ابو یوسف کو رخصت کرتے ہوئے سو درہم کی ایک تھیلی دی اور کہا روزانہ پڑھنے آیا کرو جب یہ ختم ہو جائیں تو اور لے لیتا۔ کچھ دن گزرنے کے بعد آپ نے خود ہی امام ابو یوسف کو سو درہم دے دیئے۔ یہ سلسلہ مدتوں چلتا رہا، استاد غریب شاگرد اور اس کے اہل و عیال کی پرورش کرتا رہا اور امام ابو یوسف کو کبھی خود طلب کرنے کا موقعہ ہی نہ ملا۔ امام ابو یوسف حضرت امام اعظم کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ سب سے پہلے آپ ہی نے اصول فقہ کو مرتب کیا۔ امام ابو یوسف حدیث و مغازی اور تاریخ عرب کے حافظ تھے۔ فقہ تو آپ کے گھر کی چیز تھی۔ امام احمد بن حنبل اور امام یحییٰ بن معین آپ کے شاگردوں میں سے ہیں۔ آپ کو عباسی خلیفہ ہارون الرشید نے سلطنت اسلامی کا قاضی القضاة مقرر کیا۔ امام ابن خلکان نے لکھا ہے کہ اپنے زمانے میں یہ پہلے شخص ہیں جنہیں یہ عظیم اسلامی و فقہی منصب عطا ہوا۔ امام ابو یوسف کی مشہور تصنیف ”کتاب الخراج“ ہے جو عربی زبان میں خلیفہ ہارون الرشید کی خصوصی فرمائش پر لکھی گئی۔

سیدنا امام اعظم کو خدائے کریم نے ان کی زندگی ہی میں وہ مقام و مرتبہ عطا کر دیا تھا کہ جس کیلئے بزم ہستی صدیوں ترستی رہتی ہے۔ عباسی خلیفہ منصور نے آپ کی عظمت اور فقہی ثقاہت سے متاثر ہو کر چاہا کہ آپ سلطنت اسلامی میں قاضی القضاة کا عہدہ قبول کر لیں۔ منصور ایک ظالم جابر اور سفاک حکمران تھا۔ وہ ہر معاملہ میں من مانی کرنے کا عادی تھا۔ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے اس پیش کش کے پس منظر پر غور کیا تو نظر آیا کہ ظالم عباسی حکمران امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی ہر دلعزیزی سے فائدہ اٹھا کر اسلامی قوانین کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنا چاہتا ہے۔ یہ سوچ کر آپ نے انکار کر دیا۔ خلیفہ مسلسل اصرار کرتا رہا مگر وہ آپ کے انکار کو اقرار میں نہ بدل سکا۔ ایک روز اس نے غصہ کے عالم میں امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے دربار میں طلب کیا اور کہا:

”میں آپ کو قاضی القضاة بنانا چاہتا ہوں تو آپ مسلسل انکار کیوں گئے جا رہے ہیں۔“

امام اعظم نے فرمایا:

”خلیفہ میں خود کو اس منصب کا اہل تصور نہیں کرتا۔ یہاں بڑے بڑے علماء اور فقہاء موجود

ہیں ان میں سے کسی کو یہ عہدہ سونپ دیں۔“

خلیفہ نے غصے سے کہا:

”ابوحنیفہ اس وقت روئے زمین پر تم سے زیادہ اس منصب کا اہل کوئی نہیں ہے۔“

امام اعظم نے نرمی سے جواب دیا:

”خلیفہ میں اس عہدہ کے لائق نہیں ہوں۔“

خلیفہ نے خفگی سے کہا:

”تم جھوٹ بولتے ہو تم قاضی القضاۃ کے عہدہ کے اہل ہو جھوٹ بول کر پیچھے ہٹ رہے

ہو۔“

اس پر سیدنا امام اعظم نے علمی حکمت سے فرمایا:

”خلیفہ اب تو فیصلہ ہو گا تم نے مجھے جھوٹا اور کاذب قرار دیا ہے۔ جھوٹا شخص قاضی القضاۃ

بننے کا اہل ہی نہیں ہوتا لہذا اصرار کیسا۔“

خلیفہ منصور سیدنا امام اعظم کی علمی منطق کے سامنے اس وقت تو عاجز ہو گیا مگر وہ آپ کی

شخصیت کو مٹانے کی تدبیریں سوچنے لگ گیا۔ بالآخر اس سفاک حکمران نے رجب المرجب ۱۵۰ھ

میں آپ کو زہر دے دیا۔ اس وقت آپ کی عمر ستر برس کی تھی۔ جس مقام پر آپ نے انتقال فرمایا

وہاں آپ نے سات ہزار قرآن مجید شتم کئے تھے۔ آپ کی نماز جنازہ پچاس پچاس ہزار آدمیوں نے

چھ بار پڑھی۔ آخری نماز آپ کے صاحبزادے امام حماد رحمۃ اللہ علیہ نے پڑھائی۔ تحفۃ الابرار میں

بحوالہ تاریخ الاولیاء لکھا ہے کہ آپ کے جنازہ کی نماز میں آٹھ لاکھ آدمی تھے اور ساٹھ ہزار عورتیں ان

کے علاوہ تھیں۔ اس روز میں ہزار یہود و نصاریٰ اور مجوسی مسلمان ہوئے۔

آپ کا مزار اقدس بغداد شریف میں مرجع خلافت ہے۔ پوری دنیائے اسلام سے ہر مسک

سے تعلق رکھنے والے بے شمار فرزندان توحید آپ کے مزار اقدس پر حاضر ہوتے اور آپ کی تعلیمات

کو عام کرنے کا عہد کرتے ہیں۔ آپ کے علمی احترام کا یہ عالم ہے کہ جب امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ

آپ کے مزار اقدس کی زیارت کو حاضر ہوتے تو حنفی فقہ کے مطابق نماز پڑھتے اور اپنے شاگردوں

کے استفسار پر فرماتے کہ مجھے صاحب قبر سے حیا آتی ہے۔“

خدا کی لاکھوں رحمتیں ہوں تاریخ اسلام کے اس محسن پر جس نے اپنی فقیہی بصیرت کا نور

زمانے بھر میں پھیلا دیا اور جس کے علمی کمالات کی لازوال مہک سے عالم اسلام کا گوشہ گوشہ آج بھی

مہک رہا ہے۔

حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ

تھے علوم وقت کے پیکر امام شافعی
آئیے ایمان کے مظہر امام شافعی
آپ نے ذرات کو انوار کی خیرات دی
بے کس و ناچیز کے یاور امام شافعی
آپ سے پائے جہاں بھر کے آئمہ نے فیوض
عظمت ایمان کے پیکر امام شافعی
گلستان دین کی پھیلائی دنیا میں مہک
کاروان شوق کے رہبر امام شافعی
عارف کامل امام وقت حسن زندگی
ظلمتوں میں پیکر انور امام شافعی
آپ کی تحریر ہر اک مہر و مہہ کی ترجمان
رفعت افلاک کے ہمسر امام شافعی
ہے رضا کی فکر بھی ضو بار ان کے فیض سے
آئیے ایمان کا منظر امام شافعی

Click For More Books

<https://archive.org/details/@zohaibhasanattari>

ماہتاب علوم حدیث

امام محمد بن ادریس شافعی رحمۃ اللہ علیہ

فروع حدیث اور تعلیم و تدریس میں امام شافعی کا رتبہ بہت بلند ہے۔ آپ کا شمار ان عظیم اصحاب علم و فضل میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنی زندگیاں فروغ علم حدیث کیلئے واروین دور دراز کے سفر کئے۔ مسافرت کی صعوبتوں سے واسطہ بڑا رنج و آلام نے ستایا۔ انقلابات زمانہ بھی پریشان کرتے تھے مگر انکے ذہن و فکر میں ایک ہی خیال چھایا ہوا کہ میں نے فروغ حدیث کیلئے لافانی کردار ادا کرنا ہے۔ ذہن و فکر میں یہ خیال اس شدت سے بیٹھ گیا تھا کہ اور کچھ سوچتا ہی نہیں تھا۔ آپ اس لحاظ سے خوش بخت تھے کہ آپ کو بڑے محدثین اور مفسرین کا زمانہ نصیب ہوا اور ان صاحبان کمال نے بھی آپ کو نوازنے میں کسی قسم کے بخل سے کام نہیں اور ان کا دامان مراد گوہر مقصود سے بھر دیا۔ کئی مرتبہ طویل فاقوں سے دوچار ہونا پڑا مگر آپ منزل مقصود سے دستبردار نہ ہوئے اور پھر قدرت بھی انہی کی مدد کرتی ہے جو اپنی مدد آپ کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ آپ نے تھکنا یا مصائب زمانہ سے ہراساں ہونا نہیں سیکھا تھا۔ بس یہ لافانی جذبہ انہیں اپنے مقاصد کے حصول میں کامیاب و کامگار کر گیا اور آپ کی حیثیت ایک مکتب فکر کے بانی کی ہے۔ طلب مقصد میں آغاز میں ان کے احوال کچھ یوں تھے:

نغمے بے تاب ہیں تاروں سے نکلنے کیلئے

طور مضطر ہے اس آگ میں جلنے کیلئے

اور پھر جب اکابرین فن حدیث سے مسلسل نوازے گئے اور عظیم المرتبت ہستیوں نے ان پر

دامان کرم دراز کر دیا۔ نامور محدثین نے آپ کو اپنے سایہ عاطفت میں لے لیا اور آہستہ آہستہ یہ خود بھی

اعلیٰ روحانی و دینی مقامات پر فائز ہو گئے تو طفیل رحمت رب علی سے ان بلند یوں کے وارث قرار پائے کہ

اب تک یاد ہے قوموں کو حکایت ان کی

لغش ہے صفحہ ہستی پہ صداقت ان کی

Click For More Books

<https://archive.org/details/@zohaibhasanattari>

تاریخ نگاروں کے نزدیک امام شافعی کا نسب نامہ یوں ہے:

ابوعبد اللہ محمد بن ادریس بن عباس بن عثمان بن شافع بن سائب بن عبید بن عبد یزید بن

ہاشم بن مطلب بن عبد مناف

آپ کی کنیت ابو عبد اللہ ہے جبکہ آپ کو شافعی کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ شافع بن

سائب نے جوانی کے ایام میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی سائب بن عبید بنی ہاشم کے

علمبردار تھے جب غزوہ بدر میں قید کر لئے گئے تو فدیہ دے کر رہائی حاصل کی، اس کے بعد اسلام

قبول کر لیا۔

عبد یزید بن ہاشم کی ماں ہاشم بن عبد مناف کی لڑکی ہیں جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے

دادا ہیں اور شافع کی ماں خلدہ بنت اسد بن ہاشم بن عبد مناف فاطمہ بنت اسد کی بہن ہیں جو امیر

المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کی والدہ ہیں۔

ام الحسن بنت حمزہ بن قاسم بن یزید بن حسن بن علی بن ابن ابی طالب اس طرح بھی

حضرت امام شافعی کی والدہ کا نسب مذکور ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ امام صاحب کی نسبت بیت

رسول سے ہے۔

حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں مقام غزہ میں ۵۱ھ میں پیدا ہوا اور

جب دو سال کا ہوا تو میری والدہ مجھے مکہ لے کر آئیں اور ربیع بن سلیمان کہتے ہیں کہ آپ کی

پیدائش غزہ یا عسقلان میں ہوئی۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اسی سال پیدا ہوئے جس سال امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا وصال ہوا

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اسی دن پیدا ہوئے جس دن آپ کا وصال ہوا۔ امام بیہقی فرماتے ہیں کہ دن

کا یہ اتفاق بعض روایات میں مذکور ہے جبکہ مورخین کے نزدیک اسی سال میں پیدا ہونا مسلم ہے۔

محمد بن حکیم فرماتے ہیں کہ امام شافعی جب شکم مادر میں تھے ان کی والدہ ماجدہ نے خواب

میں دیکھا کہ مشتری ستارہ ان کے شکم سے نکل کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا اور اس کے اجزاء ہر شہر میں بکھر

گئے۔ معبر نے تعبیر فرمائی کہ آپ کے شکم سے ایک زبردست عالم پیدا ہوگا۔

امام صاحب بیان کرتے ہیں کہ بچپن میں میری ساری توجہ دو باتوں کی طرف تھی تیر اندازی

اور تحصیل علم تیر اندازی میں مجھے اتنی مہارت ہو گئی تھی کہ دس میں دس نشانہ صحیح بیٹھتا تھا۔ اسی زمانے

میں گھوڑے کی سواری کا شوق تھا تیر اندازی اور شہ سواری کے موضوع پر ”کتاب السبق والرمی“ لکھی

جو اپنے موضوع پر پہلی کتاب تھی۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مجھے خواب میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کا شرف حاصل ہوا۔ آپ نے ارشاد فرمایا ”اے لڑکے تم کون ہو؟“ عرض کیا حضور کے خاندان کا ایک فرد ہوں۔ فرمایا میرے قریب آؤ۔ میں قریب ہو گیا اور منہ کھول دیا۔ آپ نے اپنا لعاب وہن میرے منہ ہونٹ اور زبان پر مل دیا اور فرمایا جاؤ اللہ تعالیٰ تمہیں خیر و برکت سے نوازے۔

امام صاحب اپنے بچپن کا ایک خواب بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو نہایت وجیہ انسانی صورت میں مکہ کے اندر دیکھا کہ آپ مسجد حرام میں لوگوں کی امامت فرما رہے ہیں جب نماز سے فارغ ہوئے تو لوگوں کی جانب متوجہ ہوئے اور تعلیم دینے لگے میں ان سے قریب ہوا اور عرض کیا مجھے بھی تعلیم فرمائیے آپ نے اپنی آستین سے ایک ترازو نکالی اور مجھے دیتے ہوئے فرمایا کہ یہ تمہارے لئے ہے۔ امام صاحب کا بیان ہے کہ میں نے ایک معبر سے اس کی تعبیر پوچھی تو اس نے بتایا کہ علم کے لحاظ سے آپ منصب امامت پر فائز ہوں گے اور سنت نبوی کی پیروی کریں گے کیونکہ مسجد حرام کا امام دیگر اماموں سے افضل ہوتا ہے اور ترازو سے مراد یہ ہے کہ اشیاء کی حقیقت تک آپ کی رسائی ہوگی۔

آپ بحر شریعت و طریقت کے شناور اور رموز حقیقت کے شناسا تھے۔ فراست و ذکاوت میں ممتاز اور مقلد فی الدین میں یکتائے روزگار تھے اور پورا زمانہ آپ کے محاسن و اوصاف سے بخوبی واقف ہے لیکن آپ کی ریاضت و کرامات کا اس تصنیف میں احاطہ نہیں کیا جاسکتا ہے۔

آپ نے تیرہ سال کی عمر میں ہی بیت اللہ میں فرما دیا تھا کہ جو کچھ پوچھنا چاہو مجھ سے پوچھو اور پندرہ سال کے سن میں فتویٰ دینا شروع کر دیا تھا۔ حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ آپ کا بہت احترام اور خدمت کیا کرتے تھے اور جب کسی نے یہ اعتراض کیا کہ آپ جیسے اہل علم کیلئے ایک کم عمر شخص کی مدارات کرنا مناسب نہیں۔ آپ نے جواب دیا کہ میرے پاس جس قدر علم ہے اس کے معانی و مطالب سے وہ مجھ سے زیادہ باخبر ہے اور اسی کی خدمت سے مجھے احادیث کے حقائق معلوم ہوتے ہیں اور اگر وہ پیدا نہ ہوتا تو ہم علم کے دروازے ہی پر کھڑے رہ جاتے ہیں اور فقہ کا دروازہ ہمیشہ کیلئے بند رہ جاتا اور اس دور میں وہ اسلام کا سب سے بڑا محسن ہے اور وہ فقہ معانی اور علوم لغت میں اپنا معانی نہیں رکھتا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول کے مطابق کہ ہر صدی کی ابتداء میں ایک ایسا شخص پیدا ہوگا کہ اہل علم اس سے دین کا علم حاصل کریں گے اور اس

صدی کی ابتداء امام شافعی سے ہوئی ہے۔

حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ امام شافعی کے دور میں ان سے زیادہ دانشور اور کوئی نہیں اور حضرت بلال خواص کا قول ہے کہ میں نے حضرت خضر علیہ السلام سے پوچھا کہ امام شافعی کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے۔ فرمایا ان کا شمار اوتاد میں ہوتا ہے

ابتدائی دور میں آپ کسی کی شادی یا دعوت میں شریک نہ ہوتے اور مخلوق سے کنارہ کش ہو کر ذکر الہی میں مشغول رہتے اور حضرت سلیم راعی کی خدمت میں حاضر ہو کر فیوض باطنی سے فیضیاب ہوتے اور آہستہ آہستہ ایسے عروج کمال تک رسائی حاصل کر لیا کہ اپنے دور کے تمام مشائخ کو پیچھے چھوڑ دیا۔ عبد اللہ انصاری کا قول ہے کہ گو میں شافعی مسلک سے متعلق نہیں لیکن امام صاحب کے بلند مراتب کی وجہ سے ان کے عقیدت مندوں میں ہوں۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ خواب میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدار سے مشرف ہوا تو آپ نے فرمایا کہ اے لڑکے تم کون ہو؟ میں نے عرض کیا کہ آپ ہی کی امت کا ایک فرد ہوں پھر حضور نے اپنے نزدیک بلا کر لعاب دہن میرے منہ میں ڈال دیا اور فرمایا کہ جا اللہ تجھے برکت عطا کرے پھر اسی شب خواب میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے انگلی میں سے اپنی انگشتری نکال کر میری انگلی میں ڈال دی۔

آپ کی والدہ بہت بزرگ تھیں اور اکثر لوگ اپنی امانتیں آپ کے پاس رکھ جاتے تھے۔ ایک دفعہ دو آدمیوں نے کپڑوں سے بھرا ہوا ایک بکس آپ کے پاس بطور امانت رکھ دیا۔ اس کے بعد ایک شخص آ کر وہ بکس لے گیا، پھر کچھ عرصہ کے بعد دوسرے شخص نے آ کر بکس طلب کیا تو آپ نے کہا کہ وہ بکس تمہارے ساتھی کو دے چکی ہوں۔ اس نے کہا کہ جب ہم دونوں نے ایک ساتھ رکھوایا تھا تو پھر آپ نے میری موجودگی کے بغیر اس کو کیسے دے دیا۔ اس جملہ سے آپ کی والدہ کو بہت غلامت ہوئی لیکن اسی وقت امام شافعی بھی گھر آ گئے اور والدہ سے کیفیت معلوم کر کے اس شخص سے کہا کہ تمہارا بکس موجود ہے لیکن تم تنہا کیسے آ گئے اپنے ساتھی کو ہمراہ کیوں نہیں لائے جاؤ پہلے اپنے ساتھی کو لے کر آؤ۔ یہ جواب سن کر وہ شخص ششدر رہ گیا۔

جس وقت آپ امام مالک کے پاس پہنچے تو ان کی عمر ستر سال تھی۔ چنانچہ آپ ان کے دروازے پر اس نیت سے کھڑے رہتے کہ جو شخص امام مالک سے فتویٰ پر دستخط لے کر نکلتا تو آپ بغور اس کا مطالعہ کرتے اور اگر جواب صحیح ہوتا تو اس شخص کو رخصت کر دیتے اور اگر کوئی خامی نظر آتی

تو واپس دوبارہ امام مالک کے پاس بھیج دیتے اور وہ غور کرنے کے بعد نہ صرف اس خامی کو دور کر دیتے بلکہ امام شافعی کے عمل سے بہت مسرور ہوتے۔

خلیفہ ہارون رشید اور اسکی بیوی میں کسی بات پر تکرار ہو گئی تو زبیدہ نے کہا کہ تم جہنمی ہو اور ہارون رشید نے کہا کہ اگر میں جہنمی ہوں تو تیرے اوپر طلاق ہے۔ یہ کہہ کر بیوی سے کنارہ کشی اختیار کر لی لیکن محبت کی زیادتی کی وجہ سے جب جرائی کی تکلیف برداشت نہ ہو سکی تو تمام علماء کو بلا کر پوچھا کہ میں جہنمی ہوں یا جنتی؟ لیکن کسی کے پاس بھی اس کا جواب نہ تھا اور امام شافعی بھی کسی کے باوجود ان علماء کے ساتھ تھے۔ چنانچہ آپ نے فرمایا کہ اگر اجازت ہو تو میں اس کا جواب دوں اور اجازت کے بعد خلیفہ سے پوچھا کہ آپ کو میری ضرورت ہے یا مجھے آپ کی۔ خلیفہ نے کہا کہ مجھے آپ کی ضرورت ہے۔ آپ نے فرمایا کہ تم تخت سے نیچے آ جاؤ کیونکہ علماء کا مرتبہ آپ سے بلند ہے۔ چنانچہ اس نے نیچے آ کر آپ کو تخت پر بٹھا دیا پھر آپ نے سوال کیا کہ تمہیں کبھی ایسا موقع بھی ملا ہے کہ گناہ پر قادر ہونے کے باوجود محض خوف الہی سے گناہ سے باز رہے ہو۔ اس لئے قسمیہ عرض کیا کہ ہاں ایسے مواقع بھی آئے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ تم جنتی ہو۔ اور جب علماء نے اس کی حجت طلب کی تو فرمایا کہ خدا تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے کہ

”قصد گناہ کے بعد جو شخص خوف خدا سے گناہ سے رک گیا اس کا ٹھکانہ جنت ہے۔“

یہ جواب سن کر تمام علماء نے داد دیتے ہوئے کہا کہ جس کا کم سنی میں یہ عالم ہو تو خدا جانے جوانی میں اس کے کیا مراتب ہوں گے۔

ابتدائی عمر میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ تنگ دست تھے۔ فرماتے ہیں کہ میں یتیم تھا اور میری والدہ کے پاس اتنے پیسے نہیں تھے کہ وہ میری تعلیم کے لئے معلم کی خدمت میں کچھ ہدیہ پیش کرتیں لیکن وہ اس بات پر راضی ہو گئے کہ جب میں کچھ دیر کیلئے کہیں چلا جاؤں تو یہ میری جگہ ان بچوں کو پڑھائے۔ فرماتے ہیں کہ جب میں نے قرآن ختم کر لیا، مسجد میں داخل ہوا، علماء کی مجلسوں میں بیٹھتا ان سے حدیثیں سنتا اور مسائل یاد کرتا، میرا گھر مکہ مکرمہ کے اندر شعب خیف میں تھا، کوئی چمکدار ہڈی دیکھتا اس پر حدیث اور مسئلہ لکھ لیتا، میرے پاس ایک پرانا برتن تھا، جب وہ ہڈی لکھتے لکھتے بھر جاتی تو اسے برتن میں محفوظ کر لیتا۔

امام شافعی ابتداءً مسلم بن خالد سے تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ اسی دوران انہیں معلوم ہوا کہ امام مالک اس وقت کے امام المسلمین اور سید العلماء ہیں۔ فرماتے ہیں کہ دل میں امام مالک

سے کسب فیض اور تحصیل کا شوق بیدار ہوا۔ میں نے ایک آدمی سے موطا عاریتالی اور اسے زبانی یاد کر لیا۔ اس کے بعد والی مکہ کی خدمت میں حاضر ہو کر وائی مدینہ اور امام مالک بن انس کے نام سفارشی خطوط حاصل کئے اور مدینہ منورہ میں حاضر ہو گیا۔ والی مدینہ کو خط دیا تو اس نے کہا صاحبزادے! اگر تم مجھ سے مدینہ منورہ سے مکہ تک پیدل چلنے کیلئے کہو تو یہ امام مالک کے دروازے تک جانے سے زیادہ آسان ہے۔ میں نے کہا اگر حضور والا چاہیں تو انہیں خود بلا لیں، انہوں نے کہا یہ تو بڑا مشکل ہے۔ بہتر یہی ہے کہ تم ان کی بارگاہ میں حاضر ہو اور خدمت میں رہو، اس صورت میں ممکن ہے کہ ہمارے لئے بھی ان کا درازہ کھل سکے۔

حاکم مدینہ امام مالک کی بارگاہ میں حاضری کی غرض سے سوار ہو گیا اور امام شافعی بھی ساتھ ہوئے۔ پہنچنے پر ایک شخص نے دروازے پر دستک دی۔ ایک سیاہ قام باندی باہر آئی۔ حاکم نے کہا کہ اپنے آقا سے عرض کر دو کہ میں حاضری کی غرض سے دروازے پر آیا ہوں۔ باندی اندر گئی اور بڑی دیر کے بعد واپس آئی اور کہا کہ آقا فرماتے ہیں کہ اگر کوئی مسئلہ پوچھنا ہے تو ایک کاغذ پر لکھ کر دے دیجئے تاکہ اس کا جواب دیا جائے اور اگر آپ کی حاضری کسی دوسرے معاملہ کی ہے تو باقی باتوں کے لئے جمعرات کا دن مقرر ہے، تشریف لے جائیے۔ اس روز آئیے گا۔

حاکم نے کہا کہ میں ایک اہم معاملہ میں والی مکہ کا خط لے کر حاضر ہوا ہوں، باندی اندر گئی اور ایک کرسی لے کر آئی جسے دروازے پر لگا دیا۔ امام مالک تشریف لائے آپ کشیدہ قامت، باوقار اور پرہیز آدمی تھے اور طیلسان کا لباس زیب تن کئے ہوئے تھے۔ والی مدینہ نے والی مکہ کا نوشتہ پیش کر دیا۔ آپ پڑھنے لگے اور جب اس جملے پر پہنچے کہ محمد بن ادریس ایک شریف اور لائق لڑکا ہے، اس کا معاملہ ایسا ایسا ہے (یعنی غربت کے ہاتھوں مجبور ہے اور آپ سے علوم دینیہ حاصل کرنے کا شائق ہے) یہ جملہ پڑھتے ہی امام کے ہاتھ سے خط گر گیا اور فرمایا سبحان اللہ! کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علم کی قدر و منزلت اتنی گھٹ گئی کہ اسے حاصل کرنے کیلئے سفارشی خط کی ضرورت پڑے۔

امام شافعی فرماتے ہیں کہ میں امام مالک کے نزدیک ہو کر عرض گزار ہوا، اللہ تعالیٰ آپ کے درجات اور بلند فرمائے۔ میں عبدالمطلب کی اولاد سے ہوں، میرے حالات ایسے ہیں اور میری تنہائی ہے۔ امام مالک فہم و فراست کے مالک تھے، جب انہوں نے میری بات سنی کچھ دیر میری طرف دیکھتے رہے اور فرمایا تمہارا کیا نام ہے؟ میں نے عرض کیا محمد بن ادریس۔ فرمایا: اے محمد! اللہ سے ڈرو اور گناہوں سے پرہیز کرو کیونکہ عنقریب تمہاری ایک شان ہونے والی ہے۔ اللہ تعالیٰ

تمہارے دل میں ایک نور رکھے گا، تم اسے معصیت سے ضائع نہ کر دینا۔ پھر فرمایا کہ کل تم آنا تو ایسے شخص کو ساتھ لیتے آنا جو موطا کی قرأت کر سکے۔ عرض کیا میں اسے زبانی پڑھ سکتا ہوں، اگلے روز حاضر ہوا اور موطا کی قرأت شروع کر دی۔ آپ کو میری قرأت پسند آئی، جب انکی اکتاہٹ کا احساس کر کے ختم کرنا چاہتا تو فرماتے بیٹے اور پڑھو، یہاں تک کہ میں نے چند ہی روز میں کتاب موطا مکمل کر لی اور آپ کی وفات تک میں مدینہ منورہ ہی میں مقیم رہا۔

حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ بغداد جا کر حضرت امام محمد بن حسن شیبانی کی درس گاہ میں حاضر ہوئے۔ امام محمد بن حسن، حضرت امام ابوحنیفہ کے تلمیذ رشید اور ان کے علم و فقہ کے ناشر و ترجمان تھے۔ امام شافعی فرماتے ہیں کہ میں امام مالک پھر امام محمد کے استاد ہونے کو تسلیم کرتا ہوں۔ حضرت امام محمد بن حسن شیبانی رحمۃ اللہ علیہ نے امام شافعی کی والدہ سے نکاح فرمایا تھا اور اپنا سارا مال و اسباب اور کتابیں امام شافعی کو سونپ دی تھیں۔ امام شافعی خود فرماتے ہیں کہ میں ایک اونٹ کے بوجھ کے برابر امام محمد کی کتابیں اپنے ساتھ لایا اور ان کی کتابوں سے برابر علمی استفادہ کرتا رہا۔ امام شافعی یہ بھی فرماتے تھے کہ علم فقہ میں مجھ پر سب سے بڑا احسان امام محمد کا ہے۔

امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے ذہن ترین اور بلند پایہ شاگرد حضرت امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے احسانات کا ذکر امام شافعی کی زندگی بھر کرتے رہے لیکن آپ کے علاوہ آپ نے مزید اساتذہ سے بھی اکتساب فیض کیا۔ قدرت کا اصول ہے کہ جب کسی جوہر کامل نے چمکنا ہو تو فطرت اس کی رہنمائی کیلئے اسباب مہیا کر دیتی ہے۔ آپ کے چند اساتذہ کے اسمائے گرامی ملاحظہ ہوں:

محمد بن علی بن شافع، مسلم بن خالد رنجی، سفیان بن عیینہ، ابراہیم بن سعد، سعید بن سالم القراح، عبدالوہاب بن عبدالمجید ثقفی، اسماعیل بن علیہ۔

آپ سادات کی بہت تعظیم کرتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ دو سید زادے آپ کے پاس آ رہے تھے اور جب وہ نزدیک آتے تو آپ تعظیماً کھڑے رہتے۔ ایک دن میں دس بارہ مرتبہ یہی صورت پیش آئی۔

کسی رئیس نے کچھ رقم اہل تقویٰ لوگوں میں تقسیم کرنے کیلئے مکہ معظمہ ارسال کی اور اس میں سے کچھ رقم لوگوں نے پیش کی لیکن آپ نے سوال کیا کہ یہ رقم کس کی ہے اور کن لوگوں میں تقسیم کرنے کو بھیجی گئی ہے۔ جواب ملا اہل تقویٰ درویش میں تقسیم ہونے کیلئے آئی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ میں تو اہل تقویٰ درویش نہیں ہوں، اس لئے یہ مجھ پر حرام ہے۔

حاکم روم کچھ رقم سالانہ ہارون رشید کے پاس بھیجا کرتا تھا لیکن ایک مرتبہ چند راہوں کو بھیج کر یہ شرط لگا دی کہ اگر آپ کے دینی علماء مناظرے میں ان راہوں سے جیت گئے جب تک تو میں اپنی رقم جاری رکھوں گا ورنہ بند کر دوں گا۔ چنانچہ خلیفہ نے تمام علماء کو جمع کر کے حضرت امام شافعی کو مناظرہ پر آمادہ کیا اور آپ نے پانی کے اوپر مصلیٰ بچھا کر فرمایا کہ یہاں آ کر مناظرہ کرو۔ یہ صورتحال دیکھ کر سب ایمان لے آئے اور جب اس کی اطلاع حاکم روم کو پہنچی تو اس نے کہا کہ یہ بہت اچھا ہوا اس لئے کہ اگر وہ شخص یہاں آجاتا تو پورا روم مسلمان ہو جاتا۔

آپ بیت اللہ کے اندر چاند کی روشنی میں مصروف مطالعہ تھے۔ لوگوں نے کہا کہ اندر شمع کی روشنی میں مطالعہ کیجئے۔ لیکن آپ نے جواب دیا کہ وہ روشنی بیت اللہ کیلئے مخصوص ہے اس میں مطالعہ میرے لئے جائز ہے ہی نہیں۔

آپ حافظ نہیں تھے اور کچھ لوگوں نے خلیفہ سے شکایت کر دی کہ امام شافعی حافظ نہیں ہیں تو اس نے بطور امتحان رمضان میں آپ کو امام بنا دیا۔ چنانچہ آپ دن بھر ایک پارہ حفظ کر کے رات کو تراویح میں سنا دیا کرتے تھے۔ اس طرح ایک ماہ میں پورا قرآن حفظ کر لیا۔

آپ ایک حسینہ پر فریفتہ ہو گئے اور اس سے نکاح کرنے کے بعد صرف صورت دیکھ کر اور مہر ادا کر کے طلاق دے دی۔ جب امام شافعی نے امام حنبل سے یہ مسئلہ دریافت کیا کہ آپ کے نزدیک عمداً نماز ترک کر دینے والا کافر ہو جاتا ہے تو اس کے مسلمان ہونے کی کیا شکل ہے۔ انہوں نے جواب دیا کہ نماز ادا کرے۔ امام شافعی نے جواب دیا کہ کافر کی تو نماز ہی درست نہیں، یہ سن کر آپ ساکت رہ گئے۔

امام صاحب کا علمی استفادہ کے بعد فیض رسانی کا دور شروع ہوا، آپ اس معاملہ میں لکھنیت اور خلوص نیت کے ساتھ علوم دینیہ کے فروغ میں لگ گئے۔ تلامذہ کے ساتھ شفقت اور محبت سے پیش آتے، جو علمائے سلف کا طرہ امتیاز رہا ہے۔

بغداد، مصر اور دوسرے علاقوں سے شائقین علم حضرت امام کی بارگاہ میں کشاں کشاں چلے آتے اور علمی تفتیشی بجاتے، جن میں حسن بن محمد زعفرانی بغدادی، امام احمد بن حنبل، ابو ثور، ابراہیم بن خالد، حسین بن علی کراہیسی، اسماعیل بن یحییٰ مزنی، ربیع بن سلیمان جیری، ربیع بن سلیمان مرادی، حرمہ بن یحییٰ، یونس بن عبدالاعلیٰ، یوسف بن یحییٰ، بہت مشہور ہیں، جن کی ذات سے امام صاحب کا مسلک دنیا میں پھیلا، ان کے علاوہ اور بہت سے تلامذہ ہیں، جن کے ذریعہ ان کی دینی اور علمی خدمات عام

ہوئیں، جن کا تذکرہ تہذیب التہذیب اور تاریخ ابن خلکان میں بڑی تفصیل کے ساتھ مذکور ہے۔

آپ تقویٰ شعاری اور پرہیزگاری نیز عبادت کثیرہ میں بھی اپنے دور کے بے مثال عابد و زاہد صاحب ولایت و باکرامت بزرگ تھے۔ ہمیشہ آپ کا معمول رہا کہ ایک تہائی رات سوتے اور ایک تہائی رات میں عبادت کرتے اور ایک تہائی رات میں تصنیفات تحریر فرماتے اور روزانہ بلا ناغہ ایک ختم قرآن مجید تلاوت فرماتے۔ زندگی بھر میں کبھی کوئی جھوٹ آپ کی زبان پر نہیں آیا، نہ کبھی قسم کھائی، سخت سے سخت سردیوں میں بھی کبھی غسل جمعہ نہیں چھوڑا اور سولہ برس تک لگاتار کبھی شکم بھر کر کھانا نہیں تناول فرمایا۔ فقہاء و محدثین کے علاوہ اپنے دور کے بہت سے مشائخ صوفیہ کی صحبت اٹھائی۔ آپ کے بھانجے ابو محمد اپنی والدہ ماجدہ سے روایت کرتے ہیں، وہ فرماتی ہیں کہ ہم ایک رات تیس مرتبہ یا کم و بیش امام موصوف کے پاس سے گزرے، تو ان کے سامنے چراغ جل رہا تھا، وہ لیٹے ہوئے کچھ سوچتے پھر باندی کو چراغ لانے کا حکم دیتے، وہ چراغ سامنے رکھ دیتی، کچھ لکھتے پھر کہتے لے جاؤ۔ ابو محمد سے پوچھا گیا کہ چراغ واپس کیوں کیا کرتے تھے، انہوں نے بتایا کہ تاریکی میں دل زیادہ روشن ہوتا ہے۔ نیز فرمایا کہ گفتگو میں جان پیدا کرنے کیلئے خاموشی اور قوت استنباط حاصل کرنے کیلئے غور و فکر کو کام میں لانا چاہیئے۔

نیز یہ بھی فرمایا جس نے چپکے سے اپنے بھائی کو نصیحت کی اس نے اخلاص کے ساتھ برتاؤ کیا اور جس نے لوگوں کے سامنے نصیحت کی اس نے اپنے بھائی کو بدنام کیا اور اس کے حق میں خیانت کی۔ ایک شخص نے آپ سے نصیحت کی درخواست کی تو فرمایا کہ دوسروں کے برابر دولت جمع کرنے کی سعی مت کرو بلکہ عبادت میں برابر کی کوشش کرتے رہو کیونکہ دولت تو دنیا میں رہ جاتی ہے اور عبادت قبر کی ساتھی ہے اور کبھی کسی مرد سے حسد نہ کرو کیونکہ دنیا میں سب مرنے کیلئے آئے، سب مردے ہیں۔ لہذا کسی سے بھی حسد نہ کرو۔

ایک مرتبہ آپ گزرے ہوئے وقت کی جستجو میں نکلے تو صوفیاء کی ایک جماعت نے کہا کہ گذرا ہوا وقت تو ہاتھ نہیں آتا۔ لہذا موجودہ وقت ہی کو غنیمت جانو۔ آپ نے فرمایا کہ مجھ کو مراد حاصل ہوگئی کیونکہ تمام دنیا کا علم مجھ کو حاصل نہیں ہوا اور میرا علم صوفیا کے علم تک نہیں پہنچا اور صوفیا کا علم انہیں کے ایک مرشد کے اس قول تک نہیں کہ موجودہ وقت شمشیر قاطع ہے۔

مزنی کا بیان ہے کہ میں نے امام شافعی سے بڑھ کر کسی اور کو سنی نہیں دیکھا، انہیں کا بیان ہے کہ ایک عید کی شب میں ان کے ساتھ مسجد سے نکلا اور راستے میں آپ سے محو گفتگو تھا، ان کا

مکان آ گیا۔ ایک غلام نے آپ کی خدمت میں ایک تھیلی پیش کی اور عرض کیا کہ میرے آقا نے آپ کی خدمت میں سلام عرض کیا ہے اور گزارش کی ہے کہ آپ اس تھیلی کو قبول فرمائیں۔ امام شافعی نے وہ تھیلی لے لی، تھوڑی دیر کے بعد ایک شخص آیا اور عرض گزار ہوا، اے ابو عبد اللہ! میرے گھر بچہ پیدا ہوا ہے اور میرے پاس ایک پیسہ بھی نہیں ہے۔ امام صاحب نے وہ تھیلی اس آدمی کو دے دی اور خالی ہاتھ مکان کے اندر تشریف لے گئے۔

ربیع بن سلیمان فرماتے ہیں کہ محمد بن ادریس شافعی رحمہ اللہ علیہ رمضان میں نماز کے اندر ساٹھ ختم قرآن فرماتے۔

آپ کی علمی فوقیت اور برتری کا اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ آپ کو ابتدائے تیسری صدی کے مجدد ہونے کا شرف حاصل ہے اس لئے کہ آپ ۱۵۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۰۴ھ میں انتقال فرمایا۔ اسی کے ساتھ ساتھ آپ کا علمی کمال اور دین کی خدمت سب پر عیاں ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ آپ منصب مجددیت پر فائز تھے۔ نیز حدیث کا یہ مضمون بھی آپ کی ذات پر صادق آتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ہر صدی میں اُمت کی اصلاح کیلئے ایک مجدد بھیجتا ہے۔ نیز آپ کے تذکرے میں یہ بھی مذکور ہے کہ امام ثوری علیہ الرحمۃ نے کہا کہ اگر امام شافعی کی عقل نصف مخلوق کی عقل کے ساتھ وزن کی جائے تو امام صاحب کی عقل ان سب پر بھاری ہوگی اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ جو امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے اجلہ تلامذہ میں شمار کئے جاتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ مجھے حدیث رسول میں ناسخ و منسوخ، خاص و عام اور مجمل و مفصل کی کوئی تمیز نہیں تھی، حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت نے ان میں تمیز کرنے کی صلاحیت بخشی۔

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے صالح بن احمد کا بیان ہے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ میرے والد ماجد کی عیادت کیلئے تشریف لائے۔ والد محترم انہیں دیکھ کر کھڑے ہو گئے۔ امام شافعی کو اپنی جگہ بٹھایا اور خود ان کے سامنے بیٹھ گئے۔ دیر تک دونوں حضرات کی گفتگو ہوتی رہی۔ جب امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ جانے کیلئے تیار ہوئے تو والد محترم نے رکاب تھام لی اور کافی دور تک ساتھ ساتھ پیدل چلے۔

امام یحییٰ بن معین کو اس بات کا پتہ چلا تو کہنے لگے آپ اتنے بیمار ہو کر امام شافعی کے ساتھ پیدل کیوں چلے تھے؟ فرمایا ابو زکریا! اگر انکی دوسری رکاب آپ نے تھامی ہوتی تو بہت فیوض و برکات

حاصل کر لیتے جو فقہ حاصل کرنے کی تمنا رکھتا ہو اسے امام شافعی کے خچر کی دم سوگھنا ہی پڑے گی۔
حضرت امام شافعی مکہ سے بغداد تشریف لے گئے۔ پھر مکہ آئے اور مصر تشریف لے گئے۔
آپ نے ماہ رجب ۲۰۴ھ شب جمعہ میں انتقال فرمایا۔

عالم نزع میں آپ نے وصیت نامہ میں تحریر کر دیا تھا اور زبانی بھی لوگوں سے کہہ دیا کہ فلاں شخص سے کہہ دینا کہ وہ مجھ کو غسل دے لیکن وفات کے بعد جب وہ شخص مصر سے واپس آیا تو لوگوں نے وصیت نامہ اور زبانی وصیت اس تک پہنچا دی۔ چنانچہ وصیت نامہ میں تحریر تھا کہ میں ستر ہزار کا مقروض ہوں یہ پڑھ کر اس شخص نے قرض ادا کیا اور لوگوں سے کہا کہ غسل سے آپ کی یہی مراد تھی۔
ربیع بن سلیمان نے امام صاحب کے انتقال کے بعد خواب میں دیکھ کر پوچھا کہ خدا تعالیٰ کا آپ کے ساتھ کیسا معاملہ ہے؟ فرمایا کہ سونے کی کرسی پر بٹھا کر موتی نچھاور کئے گئے اور اپنی رحمت بیکراں سے مجھے نوازا دیا۔

امام شافعی تو نہایت بامقصد زندگی گزار کر دنیا سے رخصت ہو گئے لیکن زندگی میں فقہ و حدیث کے ایسے چراغ روشن کر گئے جو ہمیشہ جھلملاتے رہیں گے۔ زمانہ حال سے ماضی کی جانب سفر کرتا رہے گا۔ تاریخ اپنے نقوش ثبت کرتی رہے گی۔ وقت نئے سے نئے فرزندگان روزگار کو جنم دیتا رہے گا لیکن اس نامور محدث امام شافعی کی فضیلت علمی میں کبھی کمی رونمانہ ہوگی بلکہ ہر آنے والا دن آپ کی سیرت اور کردار کے ستارے فروزاں کرتا رہے گا۔ آپ عجز و انکساری کا پیکر تھے۔ اتنے بلند پایہ محدث عالم دین، مفکر اور مدرس ہو کر بھی آپ کی عاجزی دیکھنے کے قابل تھی، کبھی کسی کو برا نہ کہا بلکہ بروں پر اپنی محبتوں کے پھول نچھاور کر کے انہیں اسلام کا دیوانہ بناتے رہے۔ بلاشبہ ان جیسے ہی محسنین اسلام کے کارناموں پر شوکت اسلام کی عمارت اپنی سر بلندی دکھلا رہی ہے۔

دل ہمارے یادِ عہد رفتہ سے خالی نہیں
محسنین دین کو اُمت بھولنے والی نہیں
ہو چکا گو قوم کی شانِ جلالی کا ظہور
ہے مگر باقی ابھی شانِ جمالی کا ظہور



امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ

انہیں عزم و شجاعت کی حسین تصویر کہتے ہیں
انہیں راہ وفا میں نور کی تنویر کہتے ہیں
محدث اور مجدد ہاں امام احمد حنبل
ہاں جن کی گفتگو کو علم کی تاثیر کہتے ہیں
مظالم وقت کے سارے سبب اسلام کی خاطر
انہی کی ہر ادا کو شوکت توقیر کہتے ہیں
خدا کے نام کے پرچم کو لہرایا بلندی پر
اس خاطر تو ان کو جلوۂ تقدیر کہتے ہیں
عزیمت اور استقلال کا پر نور پیکر ہیں
خدا کے لطف کی اک دلنشین تفسیر کہتے ہیں
عمل سے گلشن اسلام کو پھر حسن نو بخشا
انہیں اصحاب ایماں عشق کی تدبیر کہتے ہیں
امام احمد حنبل مثال شمع ایماں ہیں
رضا ان کے عمل کو جلوۂ تقدیر کہتے ہیں

(محمد اکرم رضا)

Click For More Books

<https://archive.org/details/@zohaibhasanattari>

امام السنہ

حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ

حق و صداقت کا راستہ انتہائی پر خطر اور جان لیوا ہے۔ یہاں قدم قدم پر دارورسن کی آزمائش ہوتی ہے، موت کو سینے سے لگانا پڑتا ہے، کوڑے کھانے پڑتے ہیں۔ جابر حکمران حق پرستوں کا راستہ روکتے، ان پر عرصہ حیات تنگ کر دیتے ہیں مگر وہ لوگ انتہائی خوش بخت ہوتے ہیں جو راہ حق و صداقت پر آزمائش کو قدرت کا انعام سمجھتے ہیں اور کسی بھی موقع پر انکے قدموں میں ہلکی سی لغزش بھی پیدا نہیں ہوتی۔ انہیں بجا طور پر احساس ہوتا ہے کہ:

یہ عشق نہیں آساں بس اتنا سمجھ لیجے

اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

سیدالمحدثین حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ بھی ایسی ہی بلند حوصلہ فراخ دل اور مستقل مزاج شخصیت ہیں، جنہوں نے ایک طرف تو فروغ حدیث کا فریضہ انجام دیا، درس و تدریس میں عمر بسر کر دی، بے شمار فرزندان توحید کو حدیث کی عظمت و فضیلت سے آگاہ کیا۔ دوسرے طرف آپ کے دور میں فرقہ معزلہ کو عروج حاصل ہوا اور اس راہ حق سے بھٹکے ہوئے افراد نے نئے نئے نظریات کو فروغ دیا۔ حدیث تو حدیث، قرآن پاک کو بھی نہیں بخشا، اور بڑا المیہ یہ تھا کہ عباسی خلفاء بھی یکے بعد دیگرے فرقہ معزلہ کی سرپرستی کرتے رہے۔ بس پھر کیا تھا اندھیروں نے روشنی کا روپ اختیار کیا۔ علماء، فقہاء اور محدثین کو مجبور کیا گیا ان کے باطل اور خلاف اسلام سرگرمیوں اور نظریات کا ساتھ دیں۔

اس پر آشوب دور میں بہت سے علماء نے حجرہ نشینی اختیار کر لی۔ اور مصلحت پسندی کے اسیر ہو گئے۔ ایسے عالم میں آپ نے فرقہ معزلہ کے ناپاک نظریات اور عباسی خلفاء کی گمراہی کے خلاف نعرہ حق بلند کیا۔ آپ کے مریدین حق پسندوں کی بڑی تعداد نے آپ کا ساتھ دیا۔ عباسی خلفاء نے آپ کی غیر معمولی علمی اور نظریاتی عظمت کا احساس بھی نہیں کیا بلکہ آپ کو قید و بند کی صعوبتوں سے گزارا کیا۔ برف کی سلوں پر لٹا کر برفیلے کوڑے برسائے گئے۔ زندگی تو زندگی، ان

Click For More Books

<https://archive.org/details/@zohaibhasanattari>

سزاؤں کی بدولت موت بھی آپ کیلئے مشکل بنا دی گئی۔ آج جب ہم آپ پر ہونے والے جبر و استبداد اور آپ کی پامردی و استقامت کے احوال پڑھتے ہیں تو دل و دماغ لرز اٹھتے ہیں کہ خدایا! یہ کیسے انسان تھے جنہوں نے موت کو قدموں کی ٹھوکر پر رکھ لیا تھا۔ آپ کو ہر قسم کے مناصب کی پیش کش کی گئی، اعزازات کا لالچ دیا گیا مگر آپ کا فرمانا تھا کہ میں قرآن مجید اور احادیث نبوی کی شان میں معمولی سی گستاخی بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ بالآخر آپ کا جذبہ استقامت رنگ لایا۔ شاہی سطوت درویش کے جذبہ ایمانی کے سامنے شکست کھا گئی۔ آج اسلام کا نوری پرچم آپ کا ممنون احسان ہے۔ اگر اس موقع پر آپ بھی مصلحت کیشی یا حجرہ نشینی سے کام لیتے تو آج نہ معلوم شعائرِ اسلامی کی کیا صورت ہوتی:

سلام اس پر کہ سچائی کا پرچم جس نے لہرایا
روایات خیب اور زید کو جس نے تھا دہرایا

.....○.....

آپ کا اسم گرامی احمد بن حنبل تھا اور آپ کا سلسلہ نسب حضرت اسماعیل اور حضرت ابراہیم علیہم السلام تک پہنچتا ہے۔ آپ کی کنیت ابو عبد اللہ تھی اور آپ شیخ الاسلام اور امام السنہ کے القاب سے یاد کئے جاتے تھے۔ آپ کی نسبتیں بغدادی، بصری، مروزی، ذیلی اور شیبانی تھیں۔ آپ کا خاندانی تعلق قبیلہ بنی شیبان سے ہے جو قبیلہ بنو عدنان کی شاخ سے جا ملتا ہے۔ آپ عالی نسب اور بلند رتبہ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ کے دادا ”حنبل“ امویوں کے عہد میں سرخس کے گورنر تھے۔ جب امام احمد صرف تین سال کے تھے تو آپ کے والد ماجد ”محمد“ (جو ایک بہادر سپاہی تھے) کا انتقال ہو گیا۔ آپ کے خاندان کو دینی عظمت کے ساتھ ساتھ دنیاوی شوکت بھی عطا ہوئی تھی۔ آپ کے والد کی وفات کے بعد آپ کی پرورش اور تعلیم کا تمام تر بوجھ آپ کی والدہ ماجدہ کے کندھوں پر آ پڑا اور انہوں نے اپنی خاندانی روایات کو مد نظر رکھتے ہوئے آپ کی تعلیم و تربیت کو بہت خوش اسلوبی سے آگے بڑھایا۔

حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ ۱۶۴ھ میں پیدا ہوئے۔ ربیع الاول یا ربیع الآخر کا مہینہ تھا۔ آپ ابھی ماں کی گود میں بھی نہیں آئے تھے کہ آپ کی والدہ مرو سے بغداد چلی آئیں۔ لیکن آپ پیدا ہوئے جبکہ ابن خلکان کا کہنا ہے کہ آپ مرو میں پیدا ہوئے اور آپ کی ولادت کے بعد آپ کی والدہ آپ کو لے کر بغداد تشریف لائیں۔

زہد و تقویٰ میں آپ کا مقام بہت بلند ہے۔ آپ انتہائی ذہین تھے۔ مستجاب الدعوات بھی تھے۔ آپ کے صاحبزادے ایک مرتبہ یہ حدیث بیان کر رہے تھے:

”خدا نے آدم کا ضمیر اپنے ہاتھ سے گوندھا“

یہ کہتے ہوئے آپ نے اپنا ہاتھ دراز کر دیا۔ لیکن امام حنبل نے منع کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ اللہ کا مفہوم بیان کیا کرو تو ہاتھ دراز کر کے نہ سمجھایا کرو۔ امام صاحب نے بہت سے مشہور جلیل القدر بزرگوں سے شرف نیاز حاصل کیا ہے اور بشرحانی کا قول تو یہ ہے کہ امام حنبل مجھ سے بدرجہا افضل ہیں کیونکہ میں تو صرف اپنے ہی واسطے اکل حلال کی کوشش کرتا ہوں لیکن وہ اپنے اہل و عیال کیلئے بھی حلال رزق حاصل کرتے ہیں اور حضرت سری سقطی کا قول ہے کہ معتزلہ نے آپ کے اوپر جتنی طعنہ زنی کی ہے۔ موت کے وقت آپ ان تمام چیزوں سے پاک تھے۔ مثلاً بغداد کے معتزلہ نے ہنگامہ کھڑا کر کے یہ چاہا کہ آپ کسی طرح یہ تسلیم کر لیں کہ قرآن مخلوق ہے اور اس سلسلہ میں دربار خلافت سے بہت کڑی سزائیں بھی دی گئیں۔

حتیٰ کہ جس وقت آپ کو ایک ہزار کوڑے لگائے جا رہے تھے تو اتفاق سے آپ کا کمر بند کھل گیا لیکن غیب سے دو ہاتھ نمودار ہوئے اور کمر بند باندھ کر غائب ہو گئے مگر اتنی شدید اذیتوں کے باوجود آپ نے قرآن کو مخلوق نہیں بتایا اور جب آپ چھوٹ گئے تو لوگوں نے پوچھا کہ جن فتنہ پردازوں نے آپ کو اس قدر اذیتیں پہنچائیں ہیں ان کیلئے آپ کی کیا رائے ہے؟ فرمایا کہ وہ مجھے اپنے خیال کے مطابق گمراہ تصور کرتے ہیں اس لئے تمام تکلیفیں صرف خدا کیلئے دی گئی ہیں اس لئے میں قیامت میں ان سے کوئی مواخذہ نہیں کروں گا۔ منقول ہے کہ کسی نوجوان کی ماں کے ہاتھ پیر شل ہو گئے تھے اور جب اس نے بیٹے کو دعا کیلئے آپ کے پاس بھیجا تو آپ نے حال سن کر وضو کر کے نماز شروع کر دی اور جب وہ نوجوان گھر پہنچا تو ماں صحت یاب ہو چکی تھی اور خود آ کر دروازہ کھولا۔ آپ دریا کے کنارے وضو فرما رہے تھے اور وہیں ایک شخص بلندی پر بیٹھا ہوا وضو کر رہا تھا لیکن آپ کو دیکھ کر تعظیماً نیچے آ گیا، پھر اس کے انتقال کے بعد کسی نے خواب میں دیکھ کر پوچھا کہ کس حال میں ہو؟ اس نے کہا کہ خدا تعالیٰ نے محض اس تعظیم کی وجہ سے جو میں نے امام حنبل کی وضو کرتے وقت کی تھی، مغفرت فرمادی۔

آپ فرمایا کرتے تھے کہ میں جنگل میں راستہ بھول گیا اور جب ایک اعرابی سے راستہ معلوم کرنا چاہا تو وہ..... پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ مجھے خیال ہوا کہ شاید یہ فاقہ سے ہے اور جب میں

نے کھانا دینا چاہا تو بہت ناراض ہو کر کہنے لگا کہ اے امام حنبل کیا تجھے خدا پر اعتماد نہیں جو خدا کی طرح مجھے کھانا دینا چاہتا ہے جبکہ تم خود گم کردہ راہ ہے۔ مجھے خیال آیا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نیک بندوں کو کہاں کہاں پوشیدہ کر رکھا ہے۔ وہ میری نیت کو بھانپ کر بولا کہ خدا کے بندے تو ایسے ہوتے ہیں کہ اگر وہ تمام سر زمین کو سونا بھی بن جانے کیلئے کہہ دیں تو پورا عالم سونے کا بن جائے اور میں نے جب نگاہ اٹھائی تو پورا صحرا سونے کا نظر آیا اور غیب سے یہ ندا آئی کہ یہ ہمارا محبوب بندہ ہے اگر یہ کہہ دے تو ہم پورے عالم کو زیر و زبر کر دیں۔ لہذا تجھے اس بات کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ تیری ملاقات ایسے بندے سے ہو گئی لیکن آج کے بعد اس کو کبھی نہ دیکھ سکے گا۔

امام صاحب کی تعلیم کا سلسلہ بچپن ہی میں شروع ہو گیا تھا۔ چار سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کر لیا تھا۔ سات سال کے ہوئے تو حدیث پڑھنا شروع کر دیا اور پندرہ سولہ سال کی عمر میں باقاعدہ طلب علم میں مشغول ہو گئے۔

امام صاحب عرصہ تک بغداد ہی میں رہ کر وہاں کے مشائخ سے سماع کرتے رہے اس کے بعد انہوں نے دوسرے مشہور مراکز حدیث، کوفہ، بصرہ، مکہ، مدینہ، یمن، شام اور جزیرہ وغیرہ کا رخ کیا۔ اپنے تعلیمی اسفار کے بارے میں امام صاحب خود ارشاد فرماتے ہیں کہ میں نے ۱۷۹ھ میں علی بن ہاشم بن برید سے حدیث کا سماع کیا۔ یہ میری حدیث کی تعلیم کا پہلا سال ہے اور اسی سال ہشیم بن بشیر سے پہلے سماع کیا۔ اسی سال عبد اللہ بن مبارک آخری بار بغداد آئے تھے، میں ان کی مجلس درس میں گیا تو معلوم ہوا کہ وہ طرسوس چلے گئے ہیں۔ ان کا انتقال ۱۸۱ھ میں ہوا۔

اس وقت میری عمر سولہ سال کی تھی اور ہشیم بن بشیر کے انتقال کے وقت میں بیس سال کا تھا۔ اسی سال حماد بن زید اور مالک بن انس کا انتقال ہوا۔ ہشیم کی مجلس درس میں ۱۸۲ھ تک رہا، اسی سال ان کا انتقال ہوا، میں نے ان سے کتاب الحج لکھی جو ایک ہزار احادیث پر مشتمل تھی۔ نیز کتاب القضاء، بعض تفاسیر اور مختصر کتابیں لکھیں۔ اسی طرح تقریباً تین ہزار احادیث جمع کیں، ہشیم مجھ کو کتاب الجائز کا املا کر رہے تھے۔ اسی دوران حماد بن زید کے انتقال کی خبر پہنچی، ہشیم کے انتقال سے پہلے میں نے عبد المومن بن عبد اللہ بن خالد عیسیٰ سے حدیث کا سماع کیا اور ۱۸۲ھ میں ”ترے“ کے عالم ابو مجاہد علی بن مجاہد کلبی سے حدیث کی روایت کی، اسی سال ملک ”ترے“ کا سفر کیا۔ ۱۸۶ھ میں بصرہ کا پہلا سفر کیا اور ۱۸۷ھ میں مکہ مکرمہ سفیان بن عیینہ کی خدمت میں حاضر ہوا، ہمارے مکہ پہنچنے سے کچھ پہلے فضیل بن ابن عیاض کا انتقال ہو چکا تھا، اسی سال میں نے پہلا حج کیا۔

ابراہیم بن سعد سے بھی حدیثیں لکھیں اور ان کے پیچھے کئی بار نماز ادا کی۔ ۱۸۶ھ کے آخری عشرہ میں عبادان گیا، اسی سال معتمر بن سلیمان کے یہاں گیا، ۱۹۵ھ میں عبدالرزاق کے پاس تھا کہ وہیں سفیان بن عیینہ، عبدالرحمن بن مہدی اور یحییٰ بن سعید قطان کی وفات کی خبر ملی۔ ۱۹۴ھ میں بصرہ جا کر سلیمان بن حرب، ابوالنعمان عازم اور ابو عمر حوضی سے حدیث کا سماع کیا۔ اگر میرے پاس پچاس درہم ہوتے تو میں جریر بن عبدالمجید کے یہاں ”رے“ جاتا۔ میرے بعض ساتھی گئے، مگر میں نہیں جاسکا، کوفہ گیا تو ایسے مکان میں قیام پذیر ہوا جس میں اینٹ کا تکیہ تھا وہاں مجھے بخار آ گیا تو والدہ کے پاس چلا آیا۔ کوفہ کا یہ سفر والدہ کی اجازت کے بغیر ہوا تھا۔ پانچ بار بصرہ گیا۔ پہلی بار رجب ۱۸۶ھ میں گیا اور معتمر بن سلیمان سے سماع کیا، دوسری بار ۱۹۰ھ میں گیا، تیسری بار ۱۹۴ھ میں گیا، اس وقت غندر کا انتقال ہو چکا تھا تو یحییٰ بن سعید کے پاس چھ ماہ قیام کیا، ان کے یہاں سے واسطہ میں یزید بن ہارون کی خدمت میں پہنچا، جب ان کو معلوم ہوا کہ میں یزید بن ہارون کے یہاں گیا ہوں تو کہا کہ واسطہ میں یزید بن ہارون کے یہاں کیا کریں گے۔

جس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت امام احمد بن حنبل علم میں یزید بن ہارون سے بڑھے ہوئے

ہیں۔

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا دور علوم دینیہ کا مرکز تھا۔ آپ کو اپنے عہد میں اعلیٰ سے اعلیٰ استاد میسر آئے۔ آپ کے اساتذہ کی تعداد تین درجن سے زائد ہے لیکن آپ کے اساتذہ میں سب سے زیادہ ممتاز اور باکمال ہستی امام شافعی کی ہے۔ آپ نے ان سے فقہ کے علاوہ حدیث اور انساب کا علم بھی سیکھا۔ امام شافعی جب تک بغداد میں رہے، امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ مسلسل انہی سے وابستہ رہے۔ امام ابن خلکان کہتے ہیں:

امام احمد بن حنبل، امام شافعی کے تلامذہ اور خواص میں سے تھے، وہ ان کے ساتھ برابر رہے۔ یہاں تک کہ امام شافعی مصر چلے گئے اور احمد بن حنبل کے بارے میں امام شافعی نے کہا کہ میں بغداد سے اس حال میں نکلا کہ احمد بن حنبل سے زیادہ متقی اور ان سے بڑا فقیہ نہیں چھوڑا۔

بغداد کے محدثین میں حضرت امام ابو یوسف کا ایک بلند مقام ہے، امام احمد بن حنبل کو آپ سے بھی شرف تلمذ حاصل ہے۔ سب سے پہلے آپ نے امام ابو یوسف کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے حدیثیں لکھیں۔

جیسا کہ آپ خود فرماتے ہیں:

”سب سے پہلے میں نے جس سے حدیث لکھی وہ ابو یوسف ہیں“
حضرت امام نے علوم و فنون کی تحصیل کے بعد درس دینا شروع کر دیا۔ ۲۰۴ھ میں آپ چالیس سال عمر پوری کر کے منصب تدریس و افتا پر فائز ہو گئے اور پورے حزم و احتیاط کے ساتھ خدمت میں مصروف ہو گئے۔

آپ کی مجلس درس بڑی باوقار، سنجیدہ اور شائستہ ہوتی تھی۔ لوگ ہمہ تن گوش رہتے اور مذاق و مزاح کا کوئی کلمہ زبان پر نہ لاتے۔ ابو عبیدہ بیان کرتے ہیں کہ میں امام ابو یوسف، محمد بن حسن شیبانی، یحییٰ بن سعید اور عبدالرحمن بن مہدی وغیرہ باکمال محدثین و فقہاء کے درس میں شریک رہا ہوں لیکن امام احمد کی طرح مجھ پر کسی کی ہیبت و دہشت طاری نہیں ہوئی، ان کی مجلس نہایت بارعب اور پر وقار ہوتی تھی، درس میں حاضرین اور شرکاء کا جم غفیر ہوتا تھا، علماء سیر کا بیان ہے کہ پانچ پانچ ہزار کی تعداد میں لوگ شریک ہوتے تھے۔

اب آپ کے علوم کے سرچشمے چاروں طرف بہہ رہے تھے۔ آپ سے بیشمار اہل علم نے اکتساب فیض کیا اور یہ اسی فیضان عام کا سبب ہے کہ باقاعدہ مذہب حنبلیہ کی بنیاد پڑی۔
آپ عالم بے ریا اور درویش پارسا تھے۔ زہد و تقویٰ اور دنیا سے بے تعلقی امام صاحب کا شعار تھا، خورد و نوش اور معاملات زندگی میں سادگی اور کفایت شعاری مد نظر رکھتے، امراء اور حکام سے نظریں ملاتے اور نہ ان کے تحائف قبول کرتے۔

محمد بن موسیٰ فرماتے ہیں کہ حسن بن عبدالعزیز کے پس ایک لاکھ دینار میراث میں پہنچے انہوں نے ایک ایک ہزار کی تین تھیلیاں امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں بھیج دیں اور التجاء کی کہ انہیں قبول فرما کر اپنے اہل و عیال پر خرچ کیجئے۔ کیونکہ یہ حلال میراث سے پیش کر رہا ہوں۔ امام صاحب نے وہ دینار قبول نہ فرمائے اور یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ مجھے ان کی ضرورت نہیں، میرے پاس بقدر ضرورت خدا کا دیا ہوا مال موجود ہے۔

تصانیف

امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیفات کئی ایک ہیں جن میں سے چند کے علاوہ سب ناپید ہیں۔ یہ تصانیف احادیث و آثار پر مشتمل ہیں، ذیل میں چند کتابوں کے نام درج ہیں۔
کتاب المسند، کتاب التفسیر، کتاب التاریخ، کتاب التاریخ، کتاب حدیث شعبہ، کتاب المقدم والمؤخر فی القرآن، کتاب جوابات القرآن، کتاب المناسک الکبیر، کتاب المناسک

الصغیر وغیرہ۔

ان مستقل تصانیف کے علاوہ آپ کے فتاویٰ اور مسائل بھی کتابی صورت میں موجود ہیں۔

مسند امام احمد

یوں تو امام صاحب کی تصانیف بکثرت موجود ہیں جو اپنے اپنے موضوع کے لحاظ سے ایک عظیم مرتبہ کی حامل ہیں لیکن جو مقبولیت اور شہرت آپ کی مسند کو حاصل ہے دوسری کتابوں کو نہیں اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ لگے ہاتھوں اس کی قدرے تفصیل پیش کر دی جائے۔

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

مسند امام احمد بن حنبل اگرچہ خود امام عالی مقام کی تصنیف اور آپ ہی کی لکھی ہوئی ہے لیکن اس میں بہت سے زیادات ان کے بیٹے عبداللہ کے ہیں اور بعض زیادات ابو بکر قطعی کے بھی ہیں جو اس کتاب کو ان کے بیٹے سے روایت کرتے ہیں۔ یہ کتاب مستطاب اٹھارہ مسندوں پر مشتمل ہے۔ اور تمام کتاب کو ۱۷۲ اجزاء پر تقسیم کیا گیا ہے۔

امام صاحب جب اس مسودے سے فارغ ہو گئے تو انہوں نے اپنی تمام اولاد کو جمع کیا اور ان کو یہ مسند سنا کر فرمایا کہ یہ وہ کتاب ہے جس کو میں نے جمع کیا ہے اور سات لاکھ پچاس ہزار روایتوں سے انتخاب کیا ہے۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں میں سے کسی حدیث میں مسلمانوں کا اختلاف ہو تو وہ اپنا مرجع اور معیار اس کتاب کو بنائیں۔ اگر اس کتاب میں اس کی اصل پائیں تو فبہا ورنہ اس کو غیر معتبر خیال کریں۔

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اس سے مراد وہی احادیث مراد ہیں جو درجہ شہرت یا تو اتر معنی کو نہیں پہنچیں، ورنہ ایسی احادیث بہت مشہور ہیں جو مسند میں نہیں ہیں۔ امام صاحب کی حیات مبارکہ میں ان کے فتاویٰ کے جمع و ترتیب کا کوئی کام عمل نہیں آیا۔ بلکہ ان کے بعد ان کے تلامذہ نے جمع و تدوین کا کام کرنا شروع کیا، جن میں خاص طور پر ابو بکر خلال کا نام آتا ہے انہوں نے اپنی کتاب الجامع الکبیر میں تقریباً بیس جلدوں میں حضرت امام موصوف کے مسائل و فتاویٰ مدون کئے اور جیش بن سندی نے دو جلدوں میں آپ کے نادر مسائل جمع کئے۔

اس دور میں اسلام پر مشکل ساعت بھی آئی، عباسی دور حکومت تھا، علم کلام کا زور تھا، علوم دین میں نئی نئی موٹکافیاں ہونے لگیں، نئے نئے نظریات کے اصنام تراشے جانے لگے، فرقہ معترکہ نے غضب کی قیامت ڈھائی اور فلسفہ و کلام کی بدولت اسلام کے اندر نئے نئے اور بے بنیاد مسائل

Click For More Books

<https://archive.org/details/@zohaibhasanattari>

یہاں کے۔ ان مسائل میں سے ایک مسئلہ ”خلق قرآن“ تھا جو محدثین علماء اور اہل ایمان پر قیامت خانے لگا۔ خلیفہ ہارون الرشید عباسی کے دور تک تو خیریت گزری اور لوگ کھلم کھلا عقائد کا اظہار میں کرتے تھے۔

لیکن ہارون الرشید کے بعد جب مامون، معتصم اور واثق کا دور آیا تو اس دور میں ”خلق قرآن“ کا مسئلہ ابھر کے سامنے آ گیا اور باضابطہ اس کی ترویج میں سرکاری تعاون حاصل ہوا۔ مامون نے دیگر ممالک سے فلسفہ اور منطق کی کتابیں جمع کیں اور ان کا ترجمہ کرا کر اشاعت کرایا۔ جس کی وجہ سے طرح طرح کے شبہات رونما ہونے لگے اور محدثین علماء ان کا دفاع کرتے رہے۔ ”فتنہ خلق قرآن“ کا بانی، قاضی احمد بن ابی داؤد تھا جو اپنی قابلیت اور لیاقت کی وجہ سے مامون کے دل و دماغ اس طرح چھا گیا کہ مامون کو اس کے علاوہ کچھ سوچتا ہی نہ تھا۔

علامہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ تاریخ الخلفاء میں تحریر فرماتے ہیں:

۲۱۲ھ میں مامون نے اعلان کیا کہ قرآن مجید مخلوق ہے (اور جو شخص قرآن کو مخلوق نہیں تسلیم کرے گا اسے سخت سے سخت سزا دی جائے گی) اور اسی کے ساتھ یہ بھی اعلان شامل تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہما، حضرت ابوبکر اور حضرت عمر فاروق سے افضل ہیں۔ (رضی اللہ تعالیٰ عنہم)

ان عقائد کی اشاعت کی وجہ سے لوگوں میں نفرت کی لہر دوڑ گئی اور قریب تھا کہ شہر میں ایک آگ برپا ہو جائے۔ اس ماحول کے پیش نظر مامون اپنے فاسد ارادے میں کامیاب نہیں ہوا، آخر سے اپنے ان عقائد کی عدم قبولیت پر صبر کرنا پڑا۔

۲۱۵ھ میں مامون نے جنگ کے ارادے سے روم کا سفر کیا اور سلطنت روم کے دو قلعوں ”قرہ“ اور ”ماجدہ“ کو فتح کر لیا۔ وہاں سے دمشق کی طرف روانہ ہوا اور ۲۱۶ھ میں روم پر حملہ آور ہوا اور بعد قلعہ جات فتح کرنے کے بعد دمشق واپس ہو کر مصر روانہ ہو گیا، عباسی حکمرانوں میں یہ پہلا شخص جو مصر میں داخل ہوا، مصر سے ۲۱۸ھ میں پھر دمشق آیا اور وہاں سے روم کی طرف عازم سفر ہوا۔

۲۱۸ھ میں مامون نے عقیدہ ”خلق قرآن“ کے سلسلہ میں لوگوں کی آزمائش کرنی چاہی کہ قرآن نے مخلوق ہونا تسلیم کیا یا نہیں۔ اس سلسلے میں اس نے بغداد میں اپنے نائب اسحاق بن ابراہیم خزاعی کے پاس علماء بغداد کے بارے میں لکھا کہ خلق قرآن سے متعلق علمائے بغداد سے ان کی رائیں طلب کی جائیں اور مجھے ان کی اطلاع دی جائے۔

اسحاق نے علماء اور محدثین کی ایک جماعت کے درمیان مامون کا خط پڑھا جس میں امام

احمد بن حنبل جیسے کئی بلند پایہ محدثین دانشور موجود تھے۔ جو بات سے انکار یا اقرار کا پتہ نہیں چلتا تھا اسحاق نے فرداً فرداً ایک ایک سے پوچھنا شروع کیا کہ کھل کر بتاؤ کہ قرآن مخلوق ہے یا غیر مخلوق۔ سب سے باتیں کر کے وہ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کی طرف متوجہ ہوا اور آپ کی رائے دریافت کی تو آپ نے فرمایا کہ وہ اللہ کا کلام ہے۔ اسحاق کے بار بار پوچھنے پر یہی فرمایا کہ وہ اللہ کا کلام ہے، مامون الرشید تک جب یہ کاروائی پہنچی تو وہ سخت جلال میں آ گیا۔ بعض کو قید و بند اور بعض کی موت کی دھمکیاں دے ڈالیں جب امام احمد بن حنبل کی باری آئے تو ان کے بارے میں لکھا کہ ”احمد سے کہہ دو کہ امیر المؤمنین اس کے جاہلانہ عقیدے سے واقف ہیں اور وہ جان لے گا کہ اُسے اس کا خمیازہ ضرور بھگتنا پڑے گا۔“

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں شدید سزا تجویز کرنے کیلئے اس نے انہیں روم روانہ کرنے کا حکم دیا مگر ابھی یہ لوگ وہاں پہنچے ہی تھے کہ مامون الرشید کا انتقال ہو گیا۔ مامون مرتے مرتے یہ وصیت بھی کر گیا کہ میرے بعد آنے والا خلیفہ لوگوں سے عقیدہ خلق قرآن کا اقرار کرائے اور قاضی احمد بن ابی داؤد کو اپنے دربار سے وابستہ رکھے۔ مامون کے بعد زمام حکومت رجب ۲۱۸ھ میں معتصم باللہ نے سنبھالی اور اس نے مامون کی بھرپور تقلید کی اور اپنی پوری عمر مسئلہ خلق قرآن کے سلسلہ میں لوگوں کے امتحان و آزمائش میں گزار دی۔ اس نے اپنے مقبوضہ ممالک میں یہ حکم نامہ بھجوا دیا کہ لوگ قرآن کو مخلوق ہونے کا اقرار کریں اور معلمین کو یہ حکم صادر ہو کہ بچوں کے ذہن میں یہ جاگزیں کر دیں کہ قرآن مخلوق ہے۔ اس مسئلہ کو لے کر لوگوں نے معتصم کے ہاتھوں بڑی بڑی مشقتیں جھیلیں اور بہت سے علماء اس کے ہاتھوں تہ تیغ کئے گئے اور ۲۲۰ھ میں حضرت امام احمد بن حنبل کو اسی سلسلہ میں دڑے بھی کھانے پڑے جس کا تذکرہ مختصر ادرج ذیل ہے۔ معتصم نے حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کو بغداد طلب کیا اور مسئلہ خلق قرآن پر بحث و مباحثہ کی ایک مجلس مناظرہ منعقد کی۔ حضرت امام کے مقابلہ میں عبدالرحمن بن اسحاق، قاضی احمد بن ابی داؤد اور دوسرے علماء کو کھڑا کیا۔ مناظرہ تین دن تک مسلسل چلتا رہا۔ حضرت امام کے دلائل و براہین کے سامنے سب کو عاجز اور خاموش ہونا پڑا۔ چوتھے دن بھی مناظرہ کی محفل گرم تھی کہ اسی دوران معتصم نے دڑہ زنی کا حکم دیا۔ حکم پاتے ہی جلادوں نے کوڑے لگانا شروع کر دیا۔ شدت تکلیف سے غش کھا کر زمین پر گر پڑتے، اس کے باوجود بھی آپ نے حق سے روگردانی نہ کی اور آخر دم تک عزیمت و ثابت قدمی پر کار بند رہے۔

ربہائی کے بعد اپنے گھر تشریف لے گئے، قید کی مدت کل اٹھائیس ماہ تھی، صحت یابی کے بعد مسجد میں حاضری دینے لگے اور درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا۔

میسون بن اصح کا بیان ہے کہ میں بغداد میں موجود تھا کہ شور و غل کی آواز سنائی دی، لوگوں سے پوچھنے پر پتہ چلا کہ امام احمد بن حنبل کا امتحان ہو رہا ہے۔ چنانچہ میں بھی وہاں جا پہنچا، جب امام صاحب کو پہلا کوڑا مارا گیا تو آپ نے کہا بسم اللہ جب دوسرا کوڑا مارا گیا تو کہا لا حول ولا قوۃ الا باللہ، تیسرے کوڑے پر کہا القرآن کلام اللہ غیر مخلوق، قرآن اللہ کا کلام ہے مخلوق نہیں، چوتھے کوڑے پر کہا لا یصیبنا الا ما کتب اللہ لنا، اللہ نے جتنی مصیبت ہمارے لئے لکھ دی ہے اتنی ہی ملے گی۔

بالآخر امام صاحب کو انتیس کوڑے لگائے گئے، آپ نے کپڑے کا ازار بند ڈال رکھا گیا۔ جو کوڑے کی ضرب سے کٹ گیا اور پانچامہ ناف کے نیچے آ گیا، آپ نے آسمان کی طرف نظر اٹھائی اور ہونٹوں کو حرکت دی، پانچامہ نیچے سرکنے کے بجائے ناف کے اوپر ہو گیا۔ ایک ہفتہ بعد میں نے خدمت امام میں حاضری دی اور عرض کیا کہ آزمائش کے وقت آپ نے آسمان کی طرف دیکھ کر ہونٹوں کو حرکت دی تھی تو اس وقت کیا پڑھا تھا: فرمایا کہ بارگاہ رب کریم میں یہ عرض کیا کہ اللہم انی استسئلك باسمك الذی ملات بہ العرش ان کنت تعلم انی علی الصواب فلا تہتک لی سترا۔ اے مولیٰ میں تیرے نام کے وسیلے سے دعا کرتا ہوں، جس سے تو نے عرش کو پُر کر رکھا ہے اگر تیرے نزدیک میں راہ راست پر ہوں تو میرا پردہ فاش نہ ہونے پائے۔

۱۹ ربیع الاول بروز دوشنبہ ۲۲ھ میں معتمم انتقال ہوا۔ اس کے بعد حکومت کی باگ ڈور اس کے بیٹے واثق باللہ کے ہاتھ میں آئی۔ وہ بھی اپنے پیشتر و حکمرانوں کے نقش قدم پر چلتا رہا اور مسئلہ خلق قرآن میں کافی سختی برتی۔ بہت سے محدثین اور علماء حق کو قید و بند اور قتل کی سزائیں دیں۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ اپنے گھر اور اس سے متصل مدرسہ تک محدود ہو کر رہ گئے تھے۔ ماہ ذی الحجہ ۲۳ھ میں واثق باللہ کے انتقال کے بعد متوکل خلیفہ ہوا۔ اس نے ان باطل خیالات و اعتقادات کو جو کتاب و سنت کے خلاف تھے، روک دیا اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کو ابتلاء و آزمائش سے نجات دلوائی اور اعزاز و اکرام کا فرمان بھی جاری کیا اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی اعلان کر دیا کہ قرآن مخلوق نہیں، اس کی خلافت سے معتزلہ کا عروج زوال میں تبدیل ہو گیا اور اس فتنے کا اثر بالکل ختم ہو گیا۔

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کی عزیمت و پامردی راہ حق میں استقامت قرآن حکیم کے نام پر شدید ترین سزائیں برداشت کرنے کے جذبے نے کام کر دیا۔ فتنہ خلق خدا قرآن دم توڑ گیا۔ آپ نے دوسروں کی طرح ”تقیہ“ اختیار نہیں کیا، کسی مصلحت سے کام نہیں لیا بلکہ ہر سزا کو رب دعو عالم کا انعام سمجھتے ہوئے برداشت کیا۔ عظیم محدث اور امام بخاری کے استاذ علی بن مدینی فرماتے ہیں:

”اللہ نے اس دین کو دو آدمیوں کے ذریعہ اعزاز بخشا۔ ارتداد کے موقع پر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ذریعہ اور فتنہ خلق قرآن کے سلسلہ میں آزمائش کے وقت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے ذریعہ۔“

آپ ۱۲ ربیع الاول ۲۴۱ھ بروز جمعہ المبارک اس دنیائے فانی سے انتقال فرما گئے۔ اس وقت آپ کی عمر ستر سال تھی۔ ایک تخمینہ کے مطابق نماز جنازہ میں نولاکھ افراد نے شرکت کی۔ آپ کا زہد و تقویٰ انتہاء کو پہنچا ہوا تھا۔ آپ کے فرزند ابوصالح اصفیان کے حاکم تھے۔ آپ کے ایک مرید نے ان کے مطبخ میں سے خمیر لے کر روٹی تیار کی اور جب روٹی امام صاحب کے سامنے پہنچی تو آپ نے پوچھا کہ یہ اس قدر گداز کیوں ہے۔ خادم نے پوری کیفیت بتادی تو آپ نے فرمایا کہ جو شخص اصفہان کا قاضی رہا ہو اس کے یہاں سے خمیر کیوں لیا۔ لہذا یہ روٹی میرے کھانے کے لائق نہیں رہی اور یہ کسی فقیر کے سامنے پیش کر کے پوچھ لینا کہ اس روٹی میں خمیر تو صالح کا ہے اور آٹا احمد بن حنبل کا۔ اگر تمہاری طبیعت گوارا کرے تو لے لو لیکن چالیس یوم تک کوئی سائل ہی نہیں آیا اور جب روٹیوں میں بو پیدا ہو گئی تو خادم نے دریائے دجلہ میں پھینک دیں لیکن امام صاحب کے تقویٰ کا یہ عالم تھا کہ آپ نے اس دن سے دریائے دجلہ کی مچھلی نہیں کھائی اور آپ لوگوں سے فرمایا کرتے تھے کہ جس کے پاس چاندی کی سرمہ دانی ہو اس کے پاس بھی مت بیٹھو۔

ایک مرتبہ امام حنبل سماعت حدیث کیلئے حضرت سفیان ثوری کی خدمت میں مکہ معظمہ پہنچ گئے اور روزانہ آپ کے یہاں حاضری دیتے۔ ایک دن اتفاق سے جب آپ نہیں پہنچے تو حضرت ابوسفیان نے خادم کو بھیج کر خیریت معلوم کی اور جب خادم پہنچا تو دیکھا کہ کپڑے دھو بی کو دیئے ہیں اور خود برہنہ ہیں اور جب خادم نے عرض کیا کہ آپ مجھ سے کچھ رقم لے کر لباس تیار کرائیں تو آپ نے منع کرتے ہوئے فرمایا کہ میرے ہاتھ کی تحریر کردہ ایک کتاب ہے اس کو فروخت کر کے دس گز ٹاٹ لا دو تا کہ میں کرتا اور تمہے بند تیار کروالوں اور جب اس نے کہا کہ اگر اجازت ہو تو کتان خرید لوں۔ آپ نے فرمایا کہ نہیں ٹاٹ کافی ہے۔

آپ ہمہ اوقات اللہ اللہ کا ورد جاری رکھتے اور عالم نزع میں بھی آپ کی زبان پر اللہ ہی کا نام تھا اور موت سے قبل آپ نے فرمایا کہ اے اللہ میں دنیا میں بر بنائے غفلت تیری عبادت سے محروم رہا اور اب آخری وقت میں بھی تیری عبادت سے غافل ہوں اس کے باوجود بھی تیرے رحمت کا متمنی ہوں۔ یہ کلمات زبان پر تھے کہ روح مبارک اعلیٰ علیین کی جانب پرواز کر گئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

انتقال کے وقت جب صاحبزادے نے طبیعت پوچھی تو فرمایا کہ جواب کا وقت نہیں ہے۔ بس یہ دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ ایمان پر خاتمہ فرمادے کیونکہ ابلیس لعین مجھ سے کہہ رہا ہے کہ تیرا ایمان ثابت لے جانا میرے لئے باعث ملال ہے۔ اس لئے دم نکلنے سے قبل مجھے سلامتی ایمان کے ساتھ مرنے کی توقع نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنا فضل فرمادے یہ کہتے کہتے روح پرواز کر گئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

تھے امام احمد حنبل بہار بے خزاں
جملہ افکار سعادت کا مہکتا گلستاں
ان کی تربت ہو ہمیشہ مرکز فکر و عمل
جگمگائیں ان کے فرمودات مثل کہکشاں



صوفیائے کرام

اور

اولیائے عظام

Click For More Books

<https://archive.org/details/@zohaibhasanattari>

تصوف اور صوفیائے عظام

چشم فلک نے ہمیشہ دو طرح کی بادشاہی دیکھی ہے۔ ایک وہ بادشاہ ہیں جو انسانوں سے اپنی ملوکیت کا خراج لیتے ہیں۔ مظلوموں اور بے کسوں کو اپنی تیغ ستم سے ڈرا کر ان پر حکومت کرتے ہیں۔ طاقت شاہی اور جبر و تشدد کا مظاہرہ کر کے اپنی فرمانروائی کا سکہ جاری کرتے ہیں۔ اپنے اقتدار کو قائم رکھنے کیلئے ہر قسم کی خود غرضی، حرص و ہوس، بے انصافی اور وحشت و بربریت کو روار کھتے ہیں۔ ان شاہان کجگلاہ کا ایک ہی مقصود ہوتا ہے کہ ان کی حکومت کسی صورت بھی غیر مستحکم نہیں ہونی چاہیے۔ زوال کا خوف انہیں ہر لحظہ جابرانہ عزائم بروئے کار لانے پر مجبور رکھتا ہے۔

ان گردن فرازان جہاں کے مقابلے میں دوسری بادشاہی ان درویشانِ خدا مست کی ہوتی ہے جو وحشت و بربریت کے صحراؤں میں محبت کے گلاب اُگاتے ہیں۔ ظلم و ستم کی چکی میں پستے ہوئے مظلوم انسانوں کو صبر و قرار کی دولت عطا کرتے ہیں۔ کفر و ضلالت کے ظلمت کدوں میں ایمان کے چراغ روشن کرتے ہیں۔ اجڑے ہوئے شہروں اور ویران ملکوں کو زندگی کا پیغام عطا کرتے ہیں۔ جبر و تشدد اور خود غرضی کی مسموم فضاؤں میں روحانی لطافتوں کی خوشبو تقسیم کرتے ہیں۔ بندوں کو خدا سے ملا کر انہیں آلائش دنیا اور حرص و ہوس سے بے نیاز کر دیتے ہیں۔

دنیاوی سلاطین انسانوں پر حکومت کرنے کا دعویٰ تو کرتے ہیں مگر ان کی حکومت انتہائی عارضی اور ناپائیدار ہوتی ہے۔ یہ جسموں، شہروں اور ملکوں میں حکومت کرتے ہیں مگر عوام کے دل و دماغ ان کے احترام سے بے نیاز ہوتے ہیں جبکہ اولیائے کرام شہروں میں نہیں بلکہ دلوں اور ذہنوں پر حکومت کرتے ہیں اور تاریخ شاید ہے کہ ہمیشہ اسی حکمران کی سلطنت کو پائیداری نصیب ہوتی ہے جس کے اقتدار کا تعلق عوام الناس کے ذہنوں سے ہو۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا پر قبضہ و اختیار رکھنے کا دعویٰ کرنے والے شہنشاہوں کا اقتدار حرفِ غلط کی طرح مٹ جاتا ہے مگر ان صوفیائے عظام کا قبضہ و اختیار کی کوئی حد نہیں ہے اور ہر آنے والا دن ان کی روحانی شان و شوکت اور فیض ایمانی کے عام ہونے کا پیغام لے کر آتا ہے۔

ان صوفیائے کرام کا دلوں پر قبضہ عارضی نہیں بلکہ دائمی ہوتا ہے۔ یہ تلواروں سے نہیں بلکہ نگاہوں کی قوتِ تسخیر سے دلوں کو فتح کرتے ہیں۔ ان کی زندگیاں خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے وقف ہوتی ہیں اس لئے تبلیغِ اسلام اور اشاعتِ دینِ مصطفوی کی خاطر جس طرف جاتے ہیں نصرتِ ایزدی ہر گام پر ان کے شامل حال ہوتی ہے۔ فقر غیور ان کا شعارِ زندگی اور صدق و خلوص ان کا سرمایہ ہوتا ہے۔ محبتِ خدا ان کا اعزاز اور اطاعتِ رسول ان کا افتخار ہوتی ہے۔ یہ اپنے لئے نہیں بلکہ دوسروں کیلئے جیتتے ہیں اور خدمتِ خلقِ خدا کو اپنا منصب سمجھ کر عالمِ انسانیت کو فلاح دارین کی منزل کی جانب گامزن کرنے کے لئے مصروفِ عمل رہتے ہیں۔

یہ نفوسِ قدسیہ روحانیت کے علمبردار اور تصوف کی عظمتوں کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ امتِ اسلام پر تصوف کے احسانات کا تذکرہ بلاشبہ اعترافِ حقیقت کے مترادف ہے۔ اس دور میں جبکہ بادشاہوں نے اقتدار کو اپنے گھر کی باندی سمجھ کر مخلوقِ خدا پر ظلم و تشدد کے سائے پھیلا دیئے تھے یہ اصحابِ تصوف ہی تھے جنہوں نے ان ظالم و قاہر سلاطین کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر انہیں عذابِ الہی سے ڈرایا اور احساسِ دلایا کہ اقتدار ڈھلتی چھاؤں ہے اور زیر دستوں پر ظلم و ستم کرنے والا بہت جلد خدا کے غضب کی زد میں آجاتا ہے۔

تصوف حقیقت میں عینِ اسلام ہے کیونکہ اصحابِ تصوف نے جس طور خلقِ خدا کی راہنمائی فرمائی وہ ہر لحاظ سے اسلام کی تعلیمات کا راستہ ہے۔ آج کا مادیت پسند ظاہر بین تصوف پر نکتہ چینی کرتے ہوئے اسے عجمی سازش سے تعبیر کرتا ہے حالانکہ اسلامی تصوف مکمل طور پر شعائرِ اسلام اور شریعتِ محمدی کی بالاتری کا دوسرا نام ہے اور اس کا مقصد اولیٰ ہی یہی ہے کہ فرزندِ انِ اسلام کو محض گفتار کا غازی نہ بنایا جائے بلکہ شریعتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے عملی تقاضوں سے آشنا کیا جائے۔ تصوف کی اصطلاح اور اس کے اسلامی عملی پہلوؤں پر غور کرنے کیلئے حضرت داتا گنج بخش سید علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ کے ارشادات بطور خاص مطالعہ کے قابل ہیں۔

آپ کشفِ المحجوب میں فرماتے ہیں:

”ایک جماعت تو کہتی ہے کہ صوفی کو صوفی اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ کمبلی اوڑھتا ہے۔ ایک جماعت کہتی ہے کہ صوفی کو صوفی اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ روزِ قیامت صفِ اول میں ہوں گے۔ ایک گروہ اس طرف گیا کہ صوفی وہ کہا جاسکتا ہے جو اصحابِ صفہ کے ساتھ محبت و لا کا رابطہ رکھے۔ ایک فرقہ کہنے لگا کہ صوفی ایک اسم ہے جو صفا سے مشتق ہے۔ یعنی جس کے اندر باہر صفائی

ہے وہ صوفی کہلانے کا حق دار ہے۔ اگرچہ بلحاظ طریقت ان توجہات سے بہت سے لطائف حاصل ہو سکتے ہیں لیکن آخری طبقہ کی تعریف کے اعتبار سے لغوی معنی اس کے علیحدہ ہی نکلیں گے۔

(کشف المحجوب، ترجمہ ابوالحسنات سید محمد احمد قادری ص ۱۱۳، اسلامک بک فاؤنڈیشن لاہور) انسانیت کیلئے سب سے بڑا نمونہ ہدایت آقا و مولیٰ حضور محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے کہ جن کا اسوۂ عالی قرآن کی ابدی صداقتوں کا شارح ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اصحاب آپ کے اسوۂ عظیم میں یوں ڈھل گئے کہ ان کا وجود سیرت مصطفیٰ کا ترجمان نظر آتا ہے۔ یہ اصحاب رسول چار دانگ عالم میں اسلام کی روشنی پھیلانے کا ذریعہ بن گئے۔ ان کیلئے سب سے بڑا معیار حق حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی تھی کہ جن کے کردار کو خدائے کریم نے ہمیشہ کیلئے باعث تقلید قرار دے دیا تھا۔

ان اصحاب رسول میں سے ایک گروہ بطور خاص خود کو تبلیغ دین اور ترویج تعلیمات مصطفیٰ کیلئے وقف کر چکا تھا۔ اس مقدس گروہ سے تعلق رکھنے والے اصحاب زیادہ سے زیادہ حضور کی صحبت میں بیٹھتے اور حکم مصطفیٰ کی تعمیل میں مسجد نبوی کے قریب ایک چبوترہ پر بیٹھ کر ارشادات خدا و مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں تک پہنچایا کرتے تھے۔ ان کا لباس انتہائی سادہ ہوتا، ان کے کپڑوں میں اس قدر پیوند ہوتے تھے کہ مزید پیوند لگنے کی گنجائش ہی نہیں رہتی تھی۔ کھانا میسر آ جاتا کھا لیتے، ورنہ پیٹ پر پتھر باندھ کر اور پانی پی کر گزارا کرتے۔ آندھیاں چلتیں، طوفان آتے، موسم اپنی شدت دکھاتا مگر یہ سرمست عشاق ہر قسم کے گرم و سرد سے بے نیاز ہو کر تبلیغ دین مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم کا فریضہ انجام دیتے۔ دوسرے صحابہ انہیں رشک کی نگاہوں سے دیکھتے اور ان کی روحانی مقامات کی مزید سر بلندیوں کیلئے دعا کرتے۔ یہی وہ چبوترہ نشین، فاقہ کش درویش و مستغنی مبلغین اسلام تھے جنہیں دنیا اصحاب صفہ کے نام سے یاد کرتی ہے اور جن کا روشن کردار ہر دور کے اصحاب تصوف کیلئے شمع عمل کی حیثیت رکھتا ہے۔

اسلام ایک مکمل دین فطرت۔ اس کی تعلیمات ابدی اور ہمیشہ کیلئے ہے۔ اسلامی اور قرآنی تعلیمات کو ہر زمانے کے طالبان شوق تک پہنچانے کیلئے فی الواقع ایسے اصحاب عمل کی ضرورت تھی جو اپنی زندگیاں خدا اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے وقف کر کے تبلیغ اسلام کا عملی مظاہرہ کریں۔ قرآن اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ:

”تم میں سے ایک ایسا گروہ بھی ہونا چاہیے جو بھلائی کی طرف بلائے، اچھی بات کا حکم

دے اور برائی سے روکے پس یہی لوگ ہیں جو فلاح پائیں گے۔“

(پارہ لن تالوا، سورہ آل عمران، آیت ۱۰۴)

تاریخ اسلام کا مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت ابھرتی ہے کہ ایسا گروہ اصحاب تصوف کا گروہ ہے جس نے ہر عہد میں امت اسلام کو برائی سے بچانے، جابر حکمرانوں کو لٹکانے، نیکی کی ترغیب دینے اور شعائر اسلام کی پابندی کرنے کا نمونہ پیش کیا ہے۔ یہی طبقہ فکر ہے جس نے تصوف کے نام پر اہل ایمان کی عملی و فکری راہنمائی کا حق ادا کیا ہے۔

تصوف کا مقصود کس حد تک خلق خدا کی رہبری اور راہنمائی تھا اور یہ کس طور قلب و روح کو ایمان کی لطافتوں سے ہمکنار کرتا ہے اس کا اندازہ سیدنا جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول مبارک سے ہو جاتا ہے۔ یہی وہی سیدنا جنید بغدادی ہیں کہ جو اولیاء کے سر تاج ہونے کی بناء پر ”سید الطائفہ“ کے لقب سے یاد کئے جاتے ہیں۔ ان کا انداز فکر ملاحظہ کیجئے:

”تصوف مخلوق کی موافقت کرنے سے دل کو پاک رکھنا، بشری صفات (مذمومہ) سے علیحدگی اختیار کرنا، نفسانی خواہشات سے اجتناب کرنا، روحانی نفوس سے میل جول رکھنا، علوم حقیقی سے تعلق رکھنا، ہر لحظہ ایسے کام بجالانا جو اولیٰ و افضل ہوں، تمام امت محمدیہ کی خیر خواہی کرنا، حقیقی طور پر اللہ سے وفا کرنا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کی پیروی کرنا ہے۔“ (رسالہ قشیریہ، و شیخ ابوالقاسم قشیری ترجمہ ڈاکٹر پیر محمد حسن مطبوعہ ادارہ تحقیقات اسلامی)

اس سلسلے میں پیر پیراں غوث الاعظم سیدنا عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد دلوں کو تصوف کی حقیقی پہچان عطا کرتا ہے۔ غوث الاعظم اپنی تصنیف لطیف ”فتوح الغیب“ میں ارشاد فرماتے ہیں:

”تصوف آٹھ خصلتوں پر مبنی ہے۔ سخاوت ابراہیم علیہ السلام، رضائے اسحاق علیہ السلام، صبر ایوب علیہ السلام، مناجات زکریا علیہ السلام، غربت یحییٰ علیہ السلام، خرقہ پوشی موسیٰ علیہ السلام، تجرد عیسیٰ علیہ السلام اور فقر محمد صلی اللہ علیہ وسلم“

(فتوح الغیب شیخ عبدالقادر جیلانی۔ ترجمہ سید محمد فاروق قادری۔ مطبوعہ المعارف لاہور)

عظیم مؤرخ اور صاحب فضیلت ابن خلدون کی رائے بھی ملاحظہ کیجئے۔

”تصوف کے مقاصد اصلیہ یہ ہیں کہ انسان عبادت الہی میں جاں کھپائے، پوری طرح اللہ کا ہو جائے اور دنیا اور دنیا کی لغویات اور خرافات سے بالکل منہ موڑ لے، عام دنیا دار جن چیزوں پر مٹے ہیں یعنی لذات دنیویہ اور حب مال و جاہ سے قطعی کنارہ کش ہو جائے، عبادت کیلئے عزت نشینی

اور گوشہ نشینی پسند کرے۔“

(مقدمہ ابن خلدون ترجمہ سعد حسن خاں یوسفی، مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب کراچی)
دنیاے تصوف کی ان نامور ہستیوں کے ارشادات کی روشنی میں یہ حقیقت واضح تر ہو جاتی ہے کہ تصوف اسلام کے خلاف نہیں بلکہ یہ عین اسلام ہے اور صوفیائے کرام کا وہی مقصود و مدعا رہا ہے جو خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی رضا ہے۔ یہ مکمل طور پر اسلامی تصوف ہے اس کا کسی خارجی تصوف یا قبل از اسلام کی باطل اصطلاحات سے کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ اس کی حیثیت اس صراط مستقیم کی ہے جس پر چل کر طالبان شوق خوشنودی خداوندی کے مصداق ٹھہرتے ہیں۔ تصوف کے پیش نظر فقط اور فقط شریعت محمدی کی بالاتری اور اسلام کا حقیقی نفاذ ہے۔“

تصوف پر شریعت کو کس طور پر بالاتری حاصل ہے اس کا اظہار سیدنا بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول مبارکہ سے ہوتا ہے۔

”اگر تم کسی آدمی کو دیکھو کہ اسے کرامات دی گئی ہیں یہاں تک کہ وہ ہوا میں اڑتا ہو پھر بھی تم اس سے دھوکا نہ کھانا۔ یہاں تک کہ تم یہ نہ دیکھ لو کہ وہ اوامر و نواہی کی پابندی، حدود اللہ کی محافظت اور شریعت کی پاسداری میں کیسا ہے۔“

(رسالہ قشیریہ۔ امام ابوالقاسم القشیری ترجمہ ڈاکٹر پیر محمد حسن ص ۴۲۔ مطبوعہ ادارہ تحقیقات اسلامی)
یہ تصوف ہر لحاظ سے تعلیمات اسلامی سے عبارت اور شریعت مطہرہ سے فیضیاب ہے۔ اس کی اساس فقر محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ وہ فقر کہ جسے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے لئے پسند فرماتے ہوئے ”الفقر فخری“ کا پیغام اپنے عشاق سرمست کے دلوں پر نقش کر دیا تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سرور سلاطین عالم تھے زینت ارض و سما تھے قاسم انعامات ربانی تھے دین و دنیا کی ان انتہائی سر بلندیوں پر فائز تھے کہ جہاں تک فکر و تخیل کی رسائی کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا مگر اس تمام تر شوکت و جلالت کے باوجود آپ نے یہ دعا فرما کر دنیا بھر کے بے بسوں، لاچاروں کے آنسو پونجھ دیئے کہ:

”اے اللہ! مجھے مسکینی میں زندہ رکھ اور مسکینی میں وفات دے اور مسکینوں کے ساتھ مجھے اٹھا۔“

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جاٹار صحابہ نے فقر کو متاع عزیز سمجھ کر سینے سے لگا لیا۔ بعد کے ادوار میں تابعین اور پھر تبع تابعین نے تصوف کو فقر کی حقیقی شان کے ساتھ قبول کیا۔ چنانچہ آہستہ آہستہ فقر نے تصوف کے ساتھ لازم و ملزوم کی حیثیت اختیار کر لی۔ چنانچہ جب ہم تصوف کو دل میں

جگہ دینے لگتے ہیں تو ذہن و فکر میں ایسے صوفی باصفا کا تصور ابھرتا ہے جو لذات دنیوی سے کنارہ کش ہو کر بندگانِ خدا کو عرفانِ خدا کی دولت عطا کر رہا ہے۔ اسی بناء پر حضرت سہل بن عبد اللہ تستری صوفی کی تعریف بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

”صوفی وہ ہے جو ہر قسم کی میل کچیل سے پاک ہو، ہمہ تن غور و فکر ہو، مخلوقِ خدا کو چھوڑ کر اللہ ہی کا ہو گیا ہو اور اس کے نزدیک سونا اور مٹی کا ڈھیلہ یکساں ہو۔“

اس کائنات کا ہر لحاظ سے حسین اور مثالی دور وہ تھا جو حضور محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مقدسہ کی بدولت بزمِ ہستی کو میسر آیا۔ یہ دور جملہ تواریخِ عالم میں سب سے بلند مقام اور اہمیت کا حامل ہے کہ اس امی لقب دانائے کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سیرت و کردار کی روشنی سے وقت کے ظلمت کدوں کو سراپا روشنی بنا دیا۔ یہ دور بھی کس قدر خوش بخت تھا کہ اس کی مقدس ساعتوں نے اس ہستی والا صفات کے حسن جہاں افروز کے جلوے دیکھے ہیں کہ آج جس کا نام لینے سے نبضِ ہستی تپش آمادہ ہونے لگتی ہے۔ خوش قسمت تھے وہ عشاق کہ جنہیں سرورِ دو عالم کی نگاہِ کرم کی جگمگاہٹ میسر آئی اور وہ ”صحابہ“ کے لقب سے بہرہ ور ہو کر مطلعِ ایمان پر ستاروں کی صورتِ روشنی بکھیرنے لگے۔

ملتِ اسلام پر آزمائش کا دور اس وقت آیا، جب خلافتِ راشدہ کے خاتمے کے بعد مسلم ریاست پر ملوکیت کے بھیانک سائے منڈلانے لگے۔ امویوں کے بعد عباسی آئے مگر چند مثالوں کو چھوڑ کر مجموعی طور پر شہنشاہت کا نقشہ نظر آتا تھا۔ کہنے کو تو یہ حکمران خلیفۃ المسلمین کے لقب سے یاد کئے جاتے تھے مگر یہ مطلق العنانی، آمریت اور جبر و قہر کی تصویر تھی۔ عوام الناس تو کجا خواص کی بھی جرات نہیں تھی کہ ان حکمرانوں کے کسی فعل کی مذمت کر سکیں۔ اختلاف رائے کا صلہ بدترین موت تھی۔ آہستہ آہستہ دوسرے امورِ ریاست کی طرح ان حکمرانوں نے مذہب کو بھی گھر کی لوٹھی سمجھ لیا کہ جو معانی اور مفہام چاہے مراد لے لیں۔ ان حکمرانوں کو سب سے زیادہ خطرہ شریعتِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے لاحق تھا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ان کے بیشتر افعال شریعت اور تعلیماتِ مصطفویٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی نفی کرتے ہیں۔ اپنے مذموم مقاصد کی ترویج اور مطلب براری کیلئے انہیں ایسے علمائے سو بھی میسر آنے لگے جو ان کے ہر فعل کو جائز اور درست قرار دینے کیلئے دوراں کار تاویلات کے انبار لگا دیتے تھے۔ اس طرح بہت جلد وہ سانحہ پیش آ گیا جسے دین و دنیا کی جدائی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ شاہانِ وقت نے یہ سمجھنا شروع کر دیا کہ دین کا تعلق فقط عبادات سے ہے اور

عبادات کا تعلق مساجد سے ہے۔ اس طرح ان کے محلات اور پُر شکوہ دربار دین مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم کے کڑے احتساب سے ماورئی ہیں۔ خلافت میں نیابت رسالت کا تصور ختم ہو گیا، بیت المال کو ذاتی ملکیت سمجھا جانے لگا۔ مسلمانوں کی اجتماعی زندگی پارا پارا ہو کر رہ گئی۔

ایسے پُر آشوب عالم میں تصوف کی تحریک پورے روحانی جلال اور ایمانی شکوہ کے ساتھ ابھری اور صوفیائے کرام نے وہ شاندار کردار ادا کیا کہ جس کی مثال نہیں ملتی۔ ان بندگانِ خدا نے ایک طرف خلقِ خدا کو بیدار کیا اور انہیں احساس دلایا کہ شریعت و سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے کٹ کر ہم اجتماعی بربادی کو دعوت دے رہے ہیں۔ دوسری طرف انہوں نے شاہانِ وقت ”کجکلاہانِ بدست“ سلاطین و خلفاء اور امراء کو ان کی مذہبی و دینی ذمہ داریوں کا احساس دلایا اور انہیں بجا اور کرایا کہ وہ کسی لحاظ سے بھی عام انسانوں سے برتر نہیں ہیں بلکہ خلیفہ کے منصب پر فائز ہونے کی بناء پر وہ ہر لحاظ سے شریعت رسول کے کڑے احتساب کی زد میں ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے دکھی اور ملول انسان ان اصحابِ طریقت کی طرف لپکے اور ان کی تعلیمات میں اپنے دکھوں کا مداوا تلاش کرنے لگے۔ اس دور کی تواریخ اور ان بزرگوں کے حالات کے مطالعہ سے یہ حقیقت اظہر من الشمس ہو جاتی ہے کہ یہ تصوف اہل اسلام کو پھر اس زمانے کی طرف لے جانا چاہتا تھا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ تھا اور جس زمانہ کی سعادتوں، برکات اور بلندیوں سے بڑھ کر کسی اور دور کے بارے میں سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ سیدنا جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”یہ راہ تو وہی پاسکتا ہے جس کے دائیں ہاتھ میں قرآن اور بائیں ہاتھ میں سنت رسول ہو اور وہ ان دو چراغوں کی روشنی میں راستہ طے کرے تاکہ نہ شبیے کے گڑھوں میں گرنے نہ بدعت کی تاریکی میں پھنسے“۔ (تذکرۃ الاولیاء ص ۸)

اس دور میں اہل تصوف کی تحریک کو ناکام بنانے کیلئے بعض حلقوں کی طرف سے شدید مخالفت کی گئی۔ علمائے سوء نے بطور خاص تصوف کے مقام کو گرانے کیلئے اسے دنیا سے فرار اور رہبانیت قرار دیا۔ حالانکہ اگر ایسا ہوتا تو صوفیائے کرام خانقاہوں سے نکل کر رسمِ شبیری ادا نہ کرتے۔ مشہور مستشرق پروفیسر ایچ اے آر گب کو بھی برملا اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑا کہ:

”تاریخ اسلام میں بارہا ایسے مواقع آئے ہیں کہ اسلام کے کلچر کا شدت سے مقابلہ کیا گیا ہے لیکن بائیں ہمہ وہ مغلوب نہ ہو سکا۔ اس کی بڑی وجہ یہی ہے کہ تصوف یا صوفیاء کا اندازِ فکر فوراً اس کی مدد کو آ جاتا تھا اور اس کو اتنی قوت و توانائی بخش دیتا تھا کہ کوئی طاقت اس کا مقابلہ نہ کر سکتی تھی“۔

(بحوالہ تاریخ مشائخ چشت خلیق احمد نظامی ص ۱۰)

صوفیائے کرام نے کس طرح سے خلق خدا کو عرفانِ خدا بخشا اور حکمرانوں کو کس طور رعایا کے حقوق کا ذمہ دار ہونے کا احساس دلایا، اس کا اندازہ تاریخ اسلام میں جگمگاتے ہوئے حقائق سے بخوبی کیا جاسکتا ہے۔ ان محترم اور برگزیدہ بندگانِ خدا کے نزدیک فقط خدا اور رسول خدا کی حیثیت مسلم تھی اور انہوں نے اپنی جان پر کھیل کر بھی عظمت اسلام اور محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے پرچم کو سترنگوں نہ ہونے دیا۔

غوث الاعظم سیدنا عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی ذات تمام سلاسل طریقت کے نزدیک انتہائی مقدم ہے۔ آپ کی حیثیت جملہ اولیاء میں وہی ہے جو ستاروں کے درمیان چاند کی ہوتی ہے۔ آپ کے مواعظ میں طالبانِ حقیقت نہایت کثیر تعداد میں شریک ہوا کرتے تھے بعض اوقات یہ تعداد ستر ہزار تک پہنچ جاتی تھی۔ عباسی خلفاء بھی کہ جن کی حکومت روز بروز وسیع سے وسیع تر ہو رہی تھی آپ کے مواعظ سے فیضیاب ہونے کیلئے ہجوم میں شامل ہوتے۔ غوث الاعظم کی نگاہ ان پر پڑ جاتی تو آپ کا لہجہ یکا یک سخت ہو جاتا، آواز پہلے سے بلند ہو جاتی اور نہایت پر زور لہجے میں حکمرانوں کو ڈانٹتے۔ عباسی خلفاء سنتے دل پر اثر ہوتا تو روتے روتے آپ سے اصلاح کے طالب ہوتے۔ آپ کسی قسم کی مرعوبیت کے بغیر زور دار انداز کے ساتھ انہیں تنبیہ فرماتے۔ خلفاء اور امراء زرو جواہر اور جاگیروں کی صورت میں شاہی احکام آپ کے لنگر کیلئے بھیجتے مگر آپ یہ کہتے ہوئے ان شاہی فرمانوں کو چاک کر دیتے کہ لنگر خلق خدا کا ہے اور خدا ہی اس کے اسباب کا ضامن ہے۔

سیدنا امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور سیدنا امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کو خلفاء کی طرف سے مسلسل ستایا گیا اور ایذائیں دی گئیں۔ ان کا تصور یہ تھا کہ یہ حکمرانوں کو احساس دلاتے تھے وہ خدا کی عام سی مخلوق ہیں اور انہیں انصاف، ایمان، قرآن اور سنت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے راستے پر گامزن رہنا چاہیے ورنہ وہ خدا کے نزدیک انتہائی سخت سزا کے حق دار ہوں گے۔

مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ نے جب دیکھا کہ مغل تاجدار اکبر اور جہانگیر اسلامی شعائر سے کھیل رہے ہیں اور دین مصطفوی کی سرعام توہین ہو رہی ہے تو آپ میدانِ عمل میں اتر آئے، خانقاہ سے نکلے اور وقت کے باجبروت شہنشاہوں سے لکری۔ حتیٰ کہ راہِ حق پر چلتے ہوئے قید و بند کی صعوبتوں سے بھی دوچار ہونا پڑا مگر کوئی سختی بھی آپ کے پائے استقلال میں لغزش پیدا نہ کر سکی اور بالآخر شوکت اسلام کا پھیرا چاروں طرف لہرا کر ہی رہا اور جلال بادشاہی کو

Click For More Books

<https://archive.org/details/@zohaibhasanattari>

درویش باصفا کے قدموں میں جھکنا ہی پڑا۔ جہانگیر کی حضرت مجدد الف ثانی کے حضور ندامت و شرمساری محض ایک بادشاہ کے اقتدار کی شکست نہ تھی بلکہ یہ اسلامی تعلیمات سے روگردانی کرنے اور ”انا ولا غیر“ کا جھوٹا نعرہ بلند کرنے والے باجبروت شاہان عالم کی اصحاب تصوف کے مقابلے میں شکست فاش تھی۔

علامہ اقبال نے اسی لئے حضرت مجدد کو خراج عقیدت پیش کیا ہے کہ:

گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے

ہے جس کے نفس گرم سے گرمی احرار

حضرت میاں میر بالا پیر لاہوری رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں مغل شہنشاہ نور الدین جہانگیر اور شہاب الدین شاہجہاں حاضر ہوتے رہے۔ ایک مرتبہ جہانگیر نے آپ کو بڑے اصرار سے اپنے بلایا اور نصیحت کا طالب ہوا۔ آپ نصیحتیں کر چکے تو وہ کہنے لگا آپ کچھ مانگئے جو مانگیں گے دے دوں گا۔ آپ نے فرمایا ”کیا واقعی دے دوں گے“۔ اس نے کہا ”بسر و چشم“۔ اس پر آپ نے فرمایا ”میری خواہش ہے کہ مجھے رخصت دے دے“۔ یہ فرمایا اور لاہور واپس تشریف لے آئے۔ اس طرح شاہجہاں بھی آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا اور آپ کے نصائح سے بہرہ ور ہوتا رہا۔

علامہ اقبال ”اسرارِ خودی“ میں لکھتے ہیں کہ:

”شاہجہاں گو لکنڈہ اور بیجا پور کی فتح کیلئے حضرت میاں میر رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں لاہور میں برائے دعا حاضر ہوا۔ اس وقت آپ کے مریدین بھی وہاں موجود تھے۔ آپ نے اس موقع پر خاموشی اختیار کی۔ اتنے میں ایک مفلوک الحال شخص حاضر ہوا جس نے ایک چاندی کا سکہ نذرانہ پیش کیا اور عرض کیا کہ حضرت یہ میری حلال کی کمائی ہے“۔ آپ نے فرمایا ”میں بھکاری نہیں ہوں غنی ہوں جس کا اللہ ہو وہ بھکاری نہیں ہوتا“ پھر فرمایا یہ سکہ بادشاہ کی نذر کر دو کہ وہ بھکاری ہے اور سارے ہندوستان کے خزانوں کا مالک ہونے کے باوجود حریص اور لالچی ہے اور ناحق مخلوق خدا کو قتل کرانا چاہتا ہے۔“

ان اصحاب تصوف کی اس حق گوئی اور صداقت کے پس پردہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث کا رفرما تھی کہ:

”سب سے بڑا جہاد جابر حکمران کے سامنے کلمہ حق کہنا ہے“

جابر حکمران کے سامنے کلمہ حق کہنا اور ملوکیت کو آداب اسلام سکھانا خود کو موت کے حوالے

کر دینے کے مترادف ہوتا ہے مگر یہ اولیائے کرام پر آزمائش سے گزر کر سرخرو رہے۔ انہوں نے فقر کو اپنا ملبوس حیات بنایا اور کبھی دنیاوی آلائشوں اور مادی مصلحتوں کی پرواہ نہ کی۔ بادشاہوں کو اپنے جبر و تشدد پہ ناز تھا جبکہ اہل اللہ کو اپنی بوریائیں عزیز تھی۔ یہ جانتے تھے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فقر کو اپنا افتخار قرار دیا ہے۔

داتا گنج بخش سید علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ فقیر کی تعریف یوں کرتے ہیں:

”فقیر وہی ہے جو اپنے پاس علل و اسباب سے کچھ نہ رکھے اور اس کے طمانیت قلب میں اس نہ ہونے سے کچھ خلل واقع نہ ہو اور اسباب کو دیکھ کر غمی نہ ہو اور اسباب نہ ہوں تو ان کی طرف احتیاج محسوس نہ کرے۔ گویا اسباب کا ہونا نہ ہونا اس کی نظر میں مساوی ہو بلکہ اسباب ظاہری نہ ہوں تو اسے فرحت زیادہ ہو۔ یہ بلند مرتبہ ہے یہی وجہ ہے کہ مشائخ کرام نے فرمایا کہ درویش جس قدر تنگ دست ہو اس کیلئے مفید ہے تاکہ حقیقت توکل و شان رزاق کے راز کا اس پر انکشاف ہو۔ اس لئے کہ درویش کیلئے علائق دنیاوی جس قدر زیادہ ہوں گے اسی قدر اس کو نقصان ہوگا۔ غرضیکہ محبوبانِ الہی کی زندگی محض الطافِ خفی اور اسرارِ بے نیازی کے ساتھ وابستہ رہنا ہی بہتر و افضل ہے۔“ (کشف المحجوب، حضرت سید علی بن عثمان ہجویری، ترجمہ ابوالحسنات سید محمد احمد قادری، ص ۹۷، ناشر اسلامک بک فاؤنڈیشن لاہور)

اہل تصوف نے فقر کی عظمتوں کو یوں دل و جان میں جگہ دی کہ شہنشاہی رعب و داب، امراء کی پیشکشوں اور اہل دول کے تحائف سے بے نیاز ہو گئے۔

علامہ اقبال نے اسی کیفیت فقر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ:

نگاہ فقر میں شان سکندری کیا ہے
خراج کی جو گدا ہو وہ قیصری کیا ہے
بتوں سے مجھ کو امیدیں خدا سے ٹومیدی
مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے

اہل تصوف اپنی متاع فقر کو کس قدر عزیز رکھتے ہیں اس کا اندازہ اس واقعہ سے بخوبی ہو جاتا ہے، جب سلطان محمود غزنوی فتح ہندوستان کے دوران میں مسلسل کشور کشائی کرتا اور نصرت و کامیابی کے پرچم لہراتا آگے بڑھ رہا تھا تو ایک سخت مقابلہ سے پہلے اسے کچھ گھبراہٹ سی محسوس ہوئی وہ ایک مستجاب الدعوات ولی اللہ حضرت ابوالحسن خرقانی رحمۃ اللہ علیہ کی بارگاہ میں دعا کیلئے

حاضر ہوا۔ حضرت نے دعا بھی فرمائی اور اپنا کرتا بھی عنایت فرمایا کہ جب وقت مشکل آئے تو اس کرتہ کے حوالے سے دعا کرنا۔ سلطان محمود نے اشرفیوں کی ایک بڑی تھیلی حضرت کی خدمت میں پیش کی۔ حضرت نے لینے سے انکار کر دیا، جب سلطان نے شدید اصرار کیا تو آپ نے اپنے پاس بڑی ہوئی سوکھی روٹی کا ایک ٹکڑا سلطان کو دیا اور کہا کہ اسے کھا لو۔ سلطان نے وہ ٹکڑا منہ میں ڈالا، چبانے اور نگلنے کی کوشش کی مگر وہ سوکھا ٹکڑا چبایا نہ جاسکا۔ کافی دیر اسی کشمکش میں گزر گئی۔ ٹکڑا چبایا نہیں جاتا تھا اور وہ ادب کے مارے تھوک بھی نہیں سکتا تھا۔ سلطان کا یہ حال دیکھ کر شیخ ابوالحسن رحمۃ اللہ علیہ خرقائی فرمانے لگے:

”اے سلطان جس طرح یہ ٹکڑا کوشش کے باوجود تمہارے حلق سے نیچے نہیں اُترتا، اسی طرح ہم درویشوں کیلئے مال شاہی برداشت کرنا محال ہو جاتا ہے۔ یہ زر و مال رعایا کا حق ہے اسی پر خرچ کرو۔“

اسی طرح ایک مرتبہ ایک حاجت مند حضرت بابا فرید الدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور اس وقت کے سلطان کے نام سفارشی چٹھی مانگی۔ وہ سلطان حضرت بابا صاحب سے عقیدت رکھتا تھا۔ بابا صاحب نے حاجت مند کو پہلے تو ٹالا مگر جب وہ نہ مانا تو اس مفہوم کی چٹھی سلطان کے نام لکھی کہ:

”اے سلطان! یہ ضرورت مند ہے اگر تو اس کا کام نہیں کرے گا تو خدا کے ہاں جواب دہ ہوگا اور اگر اس کام کو کر دے گا تو اس کام کا انجام دیا جانا منجانب اللہ ہوگا“

گویا اس عبارت کے ذریعے آپ نے سلطان کو باور کرایا کہ خلق خدا کے کام آنا، اس کا فرض اولین ہے۔ ان صوفیاء کا عمل ان کے صدق و خلوص کا آئینہ دار تھا اور ان کے الفاظ تقدیر خداوندی میں ڈھل کر دلوں میں اثر کرتے تھے۔

سچ ہے کہ:

نے تخت و تاج میں نہ لشکر و سپاہ میں ہے

جو بات مردِ قلندر کی بارگاہ میں ہے .

آج جب ہم اطراف و اکناف عالم میں تبلیغ اسلام کا اندازہ لگاتے ہیں تو بے اختیار ماننا پڑتا ہے کہ اسلام کی دنیا بھر میں تبلیغ و اشاعت کا فریضہ سب سے زیادہ ان صوفیاء نے ہی انجام دیا ہے۔ مسلمان سپہ سالاروں اور فاتحین اسلام کی کاوشیں بھی لائق صد تحسین ہیں مگر ان فاتحین کی

حیثیت آندھی اور طوفان کی سی تھی کہ جس کی آمد تو انتہائی شدت کی ہوتی ہے مگر وہ بہت جلد اپنے اثرات چھوڑ کر رخصت ہو جاتی ہے۔ ان مسلم فاتحین کے مقابلے میں یہ صوفیا کسی خلیفہ یا سلطان کے حکم کے پابند نہ تھے۔ یہ تو فقط رضائے الہی کی خاطر دین مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ کیلئے نکلے تھے۔ یہ جہاں گئے وہاں انہوں نے مستقل بسیرا کر لیا۔ عوام کے دل جیتے، ان کے ذہنوں کو اپنے کردار سے تسخیر کیا۔ قال اللہ اور قال الرسول کی مقدس محافل جمائیں۔ عوام کے فکر و عمل کو اپنی محبت بے کراں کی خوشبو بخشی۔ یہ ان کے بے مثال کردار کا کمال تھا کہ جو ایک بار ان کی محفل میں آیا وہ ہمیشہ کیلئے ان کا ہو کر رہ گیا۔

تصوف کو اسلام اور شریعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے علیحدہ کرنے کیلئے اعتراض کیا جاتا ہے کہ صحابہ کرام کے دور میں صوفیاء کا کوئی ذکر نہیں پایا جاتا۔ اس کے جواب میں مشہور صوفی بزرگ ابوانصر سراج کی یہ رائے خاص اہمیت کی حامل ہے:

”ہم اللہ کی توفیق سے یہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت پاک سے مشرف ہونے کی ایک اپنی عزت اور خصوصیت ہے اور جن نفوس قدسیہ کو یہ سعادت حاصل رہی انہیں صحابی کے نام سے ہٹ کر کسی اور نام سے موسوم کرنا تو کسی طرح بھی مناسب نہیں اور کیا آپ پر عیاں نہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم زاہدوں، عابدوں، اللہ پر توکل کرنے والوں، فقراء، مجاہدہ نفس کرنے والوں اور صابروں کے امام تھے اور انہوں نے جو مقام بلند مقام صحابیت حاصل کیا، وہ سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت ہی کا اثر تھا، اس لحاظ سے صحابی رسول ہونا خود سب احوال سے بڑھ کر ہے اور اس سے بڑی کوئی فضیلت نہیں اور ایسی صورت میں صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی اور نام سے یاد کرنا کسی طرح بھی درست نہیں۔ اسی بناء پر صحابی کو صوفی کے نام سے نہیں موسوم کیا گیا۔“

(کتاب اللمع از شیخ ابوانصر سراج ترجمہ سید اسرار بخاری ص: ۵۳۔ اسلامک بک فاؤنڈیشن لاہور)

اس کے بعد مصنف نے حضرت خواجہ حسن بھری رحمۃ اللہ علیہ کی روایت بیان کی ہے کہ جنہوں نے بعض صحابہ کا زمانہ پایا تھا، یہ درج کیا ہے کہ انہوں نے طواف کعبہ کرنے والے صوفیوں کو دیکھا ہے جو مال و زر سے مستغنی تھے۔

ایک ایک درویش اور متوکل علی اللہ صوفی کے حالات زندگی کا مطالعہ کریں تو حیرت ہوتی ہے کہ انہوں نے اس قدر کثیر تعداد میں مسلمانوں کی جمعیت کیسے پیدا کر لی۔ غوث الاعظم سیدنا عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے دست حق پرست ہر جگہ سینکڑوں کفار حلقہ بگوش اسلام ہوتے تھے۔

سلطان الہند حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں یہ تاریخی صداقت موجود ہے کہ آپ نے نوے لاکھ کافروں کو مسلمان کیا۔ اسی طرح خواجہ قطب الدین بختیار کاکی، حضرت بابا فرید الدین گنج شکر، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء، مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی (رحمۃ اللہ علیہم) سمیت بے شمار صوفیائے اسلام کی مبلغانہ کاوشوں کا ہر سطح پر اعتراف کیا جاتا ہے۔ داتا گنج بخش سید علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ نے لاہور کو مرکز بنا کر جس طرح پنجاب کو شمع اسلام کی روشنی سے منور کر کے بے شمار غیر مسلموں کو دامن توحید میں آباد کر دیا، وہ اپنی جگہ ایک مکمل ایمان آفریں حقیقت ہے۔ دوسرے ممالک اور علاقوں کی طرح برصغیر پاک و ہند میں اسلام بالخصوص اولیاء اللہ کی تعلیمات کی بدولت پھیلا ہے۔ یہ صوفیائے کرام طویل مواعظ اور طولانی تقاریر سے کام نہیں لیتے تھے بلکہ ان کی اصل قوت ظاہر و باطن کی یکسانیت تھی، ان کی نگاہ اس قدر کیمیا اثر ہوتی تھی کہ جس پر پڑ جاتی اسے توحید کے عملی تقاضوں سے آگاہ کر دیتی۔ صوفی کی اس صفت خاص کے بارے میں داتا گنج بخش سید علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ، حضرت ذوالنون مصری کے حوالے سے فرماتے ہیں:

”صوفی وہ ہے جب کلام کرے تو اس کا کلام اس کے حال کی حقیقت کا مظہر ہو اور کوئی ایسی بات نہ کہے جو اس میں نہ ہو اور جب وہ خاموش رہے تو اس کی خاموشی اس کے حال کی ترجمان ہو اور علاقہ دنیاوی سے بے تعلقیت کا ثبوت اس کے اعضاء سے واضح ہو۔ گویا گفتار صوفی اس کے حسب حال ہو اور کردار صوفی میں شان تجرید اس قدر ہو کہ قطع دنیا واضح نظر آئے۔ غرضیکہ اگر وہ کلام کرے تو ایسا کہ سب اس پر صحیح اتر آئے اور سچ نظر آئے اور خاموش رہے تو خاموشی سے اس کے فقر کی ادائیں نظر آئیں۔“

(کشف المحجوب تصنیف ابوالحسن سید علی بن عثمان ہجویری۔ مترجم ابوالحسنات سید محمد احمد قادری، ص ۱۲۱، اسلامک بک فاؤنڈیشن لاہور)

صوفیائے کرام کے نزدیک فقر کی کیا اہمیت ہے۔ اس کا اندازہ حضرت ابراہیم احمد غواص علیہ الرحمۃ کے اس قول سے ہوتا ہے:

”فقر عزت کا لباس، انبیاء علیہم السلام کا پہناوا، صالحین کا پیراہن، متقین کا تاج، مومنین کا جمال، عارفین کا سرمایہ، مریدین کی آرزو، اطاعت گزاروں کا قلعہ، گنہگاروں کا زندان، گناہوں کا مٹانے والا، نیکیوں کو بڑھانے والا، درجات بلند کرنے والا، منزل تک پہنچانے والا، اللہ کی خوشنودی کا باعث اور بندوں کی عزت کا باعث ہے۔“

(کتاب اللمع، از شیخ ابوالنصر سراج۔ مترجم: سید امیر بخاری ص ۸۴، اسلامک بک فاؤنڈیشن لاہور)

اس قولِ حسین کے پس پردہ حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مبارک جلوہ گر نظر آتا ہے:

”بندے کیلئے فقر کے گہنے سے بڑھ کر کوئی خوبصورت گہنا نہیں۔“

جب کوئی صاحب ایمان تصوف کے کٹھن مراحل سے گزر کر مقبول بارگاہِ خداوندی ٹھہرتا ہے تو پھر اس کی زندگی اہل کائنات کیلئے نمونہ عمل بن جاتی ہے۔ وہ ہمہ تن رضائے الہی میں فنا ہو جاتا ہے اور کوئی ایسا فعل انجام نہیں دیتا جو خدا اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے احکامات کے منافی ہو۔ جوں جوں اس کے روحانی مراتب و مدارج میں اضافہ ہوتا ہے اس کا سر بارگاہِ ایزدی میں فرطِ ائمان و تشکر سے ہمہ وقت جھکے رہنے کا عادی ہو جاتا ہے۔ وہ خدا کے انعامات کو اپنی عبادات کا صلہ نہیں بلکہ خدا کی عطائے خاص سمجھتا ہے۔

حضرت ذوالنون مصری علیہ الرحمۃ کہتے ہیں:

”عارف کی تین نمایاں خصوصیات ہیں۔ پہلی یہ ہے کہ اس کے سینے میں جب شیخ معرفت فروزاں ہوتی ہے تو وہ پرہیزگاری کے چراغ کو بجھا نہیں دیتی۔ دوسری یہ کہ وہ کسی ایسے باطنی علم کا قائل نہیں ہوتا جو اسے ظاہری احکام شریعت کی پابندی سے روکے اور تیسری یہ کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انعامات و اکرامات کی کثرت اسے حرام چیزوں کے قریب بھی نہیں جانے دیتی۔“

اہل تصوف کو ہم جس نام سے چاہے پکاریں، عارف خدا کہیں یا زاہد بے ریا، مومن باصفا کہیں یا فقیر گردوں نوا یہ حقیقت بہر حال واضح رہے کہ ان کا منہا و مقصد فقط خوشنودی خدا و رسول ہے۔ اور وہ اس حقیقت سے بجا طور پر بہرہ ور ہیں کہ اس خوشنودی کا حصول قرآن و سنت کے احکامات کی بجا آوری کے بغیر ممکن نہیں۔ انہوں نے تعمیل قرآن و سنت کو عملی طور پر یوں سچ کر دکھایا کہ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے انعامات و اکرامات خداوندی کے مظہر بن گئے اور ان کی بدولت ہر ممکن روحانی و باطنی سر بلندیوں کا ظہور اس طرح ہوا کہ چشم ہستی حیران رہ گئی۔ کردار اور گفتار میں اللہ کی برہان بن کر انہوں نے گمراہ بندگانِ خدا کو عرفانِ ذاتِ خدا عطا کر دیا۔

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن
گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان

فطرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے

دنیا میں بھی میزان قیامت میں بھی میزان

تصوف ایک اصطلاح ہی نہیں ایک تحریک بھی ہے جو صدیوں سے زنگ آلود ذہنوں کو روح کی بالیدگی عطا کر رہی ہے لیکن کوئی تحریک کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہو یہ تمام وکمال وقت کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ تصوف کی دنیا میں بعض ایسے عناصر گھس آئے جنہوں نے شریعت اور طریقت میں تفریق پیدا کرنا شروع کر دی دنیا سے فرار اور گریز کو مذہب کا نام دے دیا اور مجاز پرستی کے پردے میں تلاش حقیقت کے فسانے تراشنے لگے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تصوف کی مقبولیت میں کمی واقع ہونے لگی اور بعض حضرات نے تصوف کو اسلام کے خلاف ایک سازش کا نام دے دیا۔ بعض نے تصوف کی اقسام گنوانا شروع کر دیں۔ حالانکہ ان اقسام کا تصوف سے دور کا واسطہ بھی نہیں ہے۔ اکابر صوفیاء نے اپنے دور میں تصوف کی پاکیزگی کو مجروح کرنے والی برائیوں کے خلاف آواز بلند کی ہے۔ آخری دور میں حضرت مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہم اللہ کی مساعی اسی نوعیت کی ہیں۔ بلند فکر اصحاب تصوف نے واضح کیا کہ جو تصوف شریعت سے ہٹ کر ہو اس کا روحانیت یا تزکیہ نفس سے کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔ بلکہ وہ عین گمراہی ہے اور ایسے صوفیا بہرہ پیسے ہیں۔ ولی کامل شیخ شہاب الدین سہروردی رقمطراز ہیں:

”کچھ فتنہ کے مارے ہوؤں نے صوفیوں کا لباس پہن لیا ہے کہ صوفی کہلائیں حالانکہ ان کو صوفیا سے کچھ علاقہ نہیں بلکہ وہ غرورِ غلط میں مبتلا ہیں۔ جکتے ہیں کہ ان کے دل خالص خدا کی طرف مبتلا ہو گئے اور یہی مراد کو پہنچ جاتا ہے اور شریعت کی پابندی عوام کا مرتبہ ہے۔ ان کا یہ قول خالص الحاد اور زندقہ ہے۔ اس لئے کہ جس حقیقت کو شریعت رد کرے وہ حقیقت نہیں بے دینی ہیں۔“

حضرت شیخ کے قول سے معلوم ہوا کہ تصوف کے نام پر دھبہ لگانے والے نام نہاد صوفی ان کے دور میں بھی تھے جو تصوف کی پذیرائی اور طالبان شوق کے غیر معمولی رجوع کو دیکھ کر اپنی دوکانداری چمکانے لگ گئے لیکن ان بہرہ پ بدلنے والے جھوٹے صوفیوں کی تمام تر منافقانہ سرگرمیوں کے باوجود بھی عوام کا تصوف پر اعتماد بحال رہا۔ اس کی وجہ باکمال صوفیا کا کثرت سے موجود ہونا تھا۔ حقیقی اور بے ریا صوفیاء کی تعلیمات مہربانیاں کی صورت روشن تھیں اور فتنہ باز صوفی تصوف کی عظمت میں معمولی سی کمی بھی نہیں کر سکے تھے۔ اس حقیقت کی روشنی میں آج جب ہم عصر حاضر کی طرف دیکھتے ہیں تو ہمیں بہت سے ایسے غلط عناصر بھی نظر آ جاتے ہیں جو خلق خدا کو گمراہی کی طرف

لے جا رہے ہیں لیکن جس طرح ماضی کے نقلی صوفیوں کی غلط روش کے باوجود تصوف کا سورج گہنایا نہیں جاسکا تھا اسی طرح آج بھی تصوف خلق خدا کو آمادہ عمل کرنے کیلئے موجود ہے اور ہم جھوٹے صوفیوں کی غلط فکر کا مور و الزام دین کی خدمت بجالانے والے حقیقی صوفیا کو نہیں ٹھہرا سکتے۔

صوفیا کی حیثیت روشنی کے مینارہ عمل کی ہے کہ جس سے پھوٹنے والی کرنیں اہل نظر کو اسلامی ضابطہ حیات کیلئے عملی جدوجہد کا جذبہ عطا کرتی ہیں۔ اسلام کی جو پاکیزہ تعلیمات کتابوں میں درج ہیں اور مدارس دینیہ میں پڑھائی جاتی ہیں صوفیا نے اپنی خانقاہوں میں ان پر عمل کر کے دکھا دیا انہوں نے ہر زمانے میں تبلیغ اور تعمیر سیرت کا مقدس فریضہ انجام دیتے ہوئے اسلام کے اخلاقی اور روحانی نظام کو زندہ رکھا۔ باطنی اصلاح اور قلبی طہارت کا درس دے کر غیر اسلامی عقائد، شرک اور بدعت کی بیخ کنی کی۔ اس دور میں جبکہ مسلمان علماء عقلیت پسندی کے نام پر قرآنی تعلیمات کو عقل کی میزان پر تول رہے تھے انہوں نے محبت الہی اور عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا عملی درس دے کر عقلیت کے مضر اثرات کا ازالہ کیا، جب معتزلہ فقہاء اور متکلمین منطقی بحثوں میں الجھے ہوئے تھے اور امت کو فرقوں میں تقسیم کر رہے تھے ان صوفیا نے مسلمانوں کو توحید اور پیروی سنت محبوب خدا کا پیغام دے کر ایک مرکز پر جمع کر دیا۔ انہوں نے ہر قسم کی ترغیبات، مصالح اور حرص و ہوس سے دامن بچا کر دربار شاہی میں حاضری اور شہنشاہوں کی قربت سے خود کو بچائے رکھا اور بادشاہوں کے سامنے علی الاعلان کلمہ حق کہتے ہوئے عوام الناس اور مقربین دربار کو ملوکیت کے مفاسد سے آگاہ کرتے رہے جب علماء بادشاہوں کو خوش کرنے کیلئے اسلام کو ان کی مرضی کے تابع بنانے کیلئے من مانی تاویلات پیش کرنے میں مصروف تھے تو اس کڑے وقت میں ان صوفیائے کرام نے بادشاہوں کو خوف خدا کا درس دیا اور علمائے سو کو سمجھایا کہ چند روزہ دنیا میں دولت کمانے کیلئے کیوں دولت ایمان کو ستے داموں لٹا رہے ہو۔ اس تمام عمل کے ساتھ ساتھ انہوں نے جھوٹے صوفیوں اور نقلی زاہدوں کی قلعی کھول دی جو ان حقیقی صوفیا کی غیر معمولی پذیرائی سے فائدہ اٹھانے کیلئے وقت کی منڈی میں نئے نئے نظریات پیش کر کے اسلامی تصوف کے تقدس کو پارا پارا کر رہے تھے۔

اس مقصد کی خاطر ان صوفیائے کرام نے عوام میں دین کا گہرا شعور اور شریعت کی پاسداری کا وافر جذبہ پیدا کیا اور کھلے ذہن کے ساتھ تصوف میں در آنے والی خرافات کی تردید کی اور اہل صوفیا کے حوالے سے تصوف کی صحیح تصویر پیش کی۔ دنیائے اسلام کی محترم علمی و روحانی شخصیت حضرت الشیخ عبدالحق رحمۃ اللہ علیہ محدث دہلوی نے صاف طور پر اظہار کر دیا کہ:

“ہماری طریقت کی بنیادیں کتاب و سنت پر ہیں جو ان کی مخالفت کرتا ہے۔ ہمارے نزدیک وہ دائرہ اسلام سے خارج ہے اور ہم اسے منکر احکام رسول صلی اللہ علیہ وسلم جانتے ہیں۔ اگر ذکر الہی، نماز، تلاوت قرآن پاک، پاکیزہ ذوق، حضورِ قلب اور خشوع خضوع حاصل ہو تو فتح الباب کی امید رکھنی چاہئے۔ اگر یہ چیزیں حاصل نہیں تو کچھ بھی نہیں جو شخص قرآن و حدیث پر غور نہیں کرتا اور علماء و فقہاء کی صحبت سے دور رہتا ہے وہ بے ادب ہے اور تباہ ہوگا۔“ (ماخوذ از مرجع البحرین: شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ترجمہ پیرزادہ اقبال احمد فاروقی، مطبوعہ نبویہ لاہور)

ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

”جو صوفی شریعت اور طریقت میں فرق کرے وہ صوفی نہیں بلکہ فرقہ باطنیہ سے تعلق رکھتا

ہے“

اور پھر اس کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”یہ خیال بڑا ہی ناچختہ ہے کہ ہم طریق تصوف کو شریعت اور قرآن و سنت کے مخالف سمجھنے

لیں۔ حاشا وکلا ان دونوں چیزوں میں کوئی مغایرت یا اختلاف نہیں۔“

حضرت الشیخ کے اس قول مبارک کے بعد اس الزام میں کوئی حقیقت نہیں رہتی کہ صوفیائے

کرام طریقت اور شریعت میں امتیاز روار کھتے تھے اور ان کی خانقاہوں میں شریعت کے فکری اور عملی

تقاضوں کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا تھا۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ تصوف جہاں مذہب کی روح، اخلاق کی

جان اور ایمان کا حسن ہے وہاں اس کی بنیاد شریعت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہے اور اس کا سرچشمہ قرآن

مجید اور حدیث قدسی ہے۔

جیسا کہ ہم نے پہلے عرض کیا کہ جب کوئی تحریک اپنے برگ و بار پھیلاتی ہوئے زمانے بھر

میں اپنا تشخص قائم کر لیتی ہے تو پھر ایک وقت ایسا آتا ہے کہ اس تحریک میں ایسے عناصر داخل ہو

جاتے ہیں جو بنیادی طور پر اس تحریک کا حصہ نہیں ہوتے۔ ان عناصر کی بدولت تحریک ان راہنما

اصولوں سے کسی قدر ہٹی ہوئی معلوم ہوتی ہے جن کو دل میں بسا کر اس تحریک نے فروغ حاصل کیا

ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک ایسا وقت بھی آیا کہ اہل تصوف اپنے بنیادی اصولوں سے پہلو تہی کرتے

ہوئے غلط مباحث میں الجھ گئے۔ بعض اوقات ایسا معلوم ہوا کہ ان اہل تصوف پر جلال بادشاہی

غالب آ گیا ہو۔ انہوں نے اپنا سارا زور اس امر پر صرف کیا کہ دنیا دار اٹھن ہے اور اس سے فرار

بہتر ہے۔ درویش کیلئے مناسب یہی ہے کہ یہ بادشاہوں اور امراء کو ان کے حال پر چھوڑ کر کسی خلوت

کدے کو بسا کر اللہ کی یاد میں محو ہو جائے۔ شاعر مشرق نے اسی لئے کہا تھا:

تمدن تصوف شریعت کلام
تبان عرب کے پجاری تمام
حقیقت خرابیات میں گھو گئی
یہ امت روایات میں گھو گئی

یہ فکر مکمل طور پر تصوف کی بنیادی روح کے منافی تھی اس لئے سنت مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم کو عملی طور پر اپنانے والے سر بلند نفوس نے اسی غلط فکر کے خلاف جہاد کیا۔ عوام کے اندر یہ شعور پیدا کیا کہ جو فکر ہمیں جادہ مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء سے دور لے جائے وہ فکر باطل ہے۔ ان حق پرست صوفیاء نے عوام الناس اور پر تجمل شہنشاہوں کو یکساں طور پر فرائض و حقوق کا احساس دلا کر تاریخ کو یہ باور کرا دیا کہ ہر دور کی آبروائی اہل نظر سے وابستہ ہے۔

کائنات ارضی کے ہر گوشے اور خطے میں ان صوفیائے عظام کے فیوض و برکات کے چشمے اہل رہے ہیں۔ اس مردِ کامل کی عظمت کا تصور کیجئے جو فرعونیت کے نشے میں بدمست سلاطین کو خبردار کرتا ہے کہ تم اپنے افعال اور اعمال کیلئے قادر مطلق کو جواب دہ ہو اور تم سے مظلوموں اور بے کسوں کے ایک ایک آنسو کا جواب لیا جائے گا۔ بے کس و مجبور انسان تمہاری نسبت رب کائنات کے کہیں زیادہ قریب ہے۔

برس از آہ مظلوماں کہ ہنگام دعا کردن
اجابت از در حق بھر استقبال می آید

بادشاہوں نے ان مردانِ عزیمت کو ڈرانا چاہا، اپنی قوت بے پناہ سے خریدنا چاہا، دام حرص و آرز پھیلا کے مطمئن کرنا چاہا، درباری علماء سے مناظرے کروا کر انہیں ہمنوا بنانا چاہا، ان کی خانقاہوں کیلئے ”اعترافِ عظمت“ کے نام پر نذرانے اور جاگیریں بخش کر، ہر اسان کرنا چاہا، دارورسن کی آزمائش کا حوالہ دے کر مگر وہ درویش حق آگاہ کہ جس کی نگاہوں میں جمالِ خداوندی بس رہا ہو اور جس کے دل میں محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا چراغ روشن ہو، وہ تخریص و ترغیبِ حرص و ہوس، ڈر اور خوف اور غیر اللہ کے رعب کو کیا جانے۔ اس درویش نے ہر آزمائش کو حقیقت منتظر کا پیغام جانا اور ہر صعوبت کو راہِ استقامت پر چلنے کا اعزاز سمجھ کر سینے سے لگایا۔ ہر مصیبت کو مسکراتے ہوئے برداشت کر لیا مگر تصوف کے اسلامی اور روحانی تشخص کو لفظ بھر کیلئے بھی پامال نہ ہونے دیا۔ قدرت

کاملہ سے جب جلال بادشاہی درویش کے قدموں تلے جھک گیا تو یہ درویش اسلامی ریاست میں خلق خدا کی گردنوں سے جابر و قاہر بادشاہوں کی غلامی کا طوق اتار کر اور بادشاہوں کو خلفائے راشدین کے عدل و انصاف کے سرچشمے سے فیضیاب ہونے کی تلقین کر کے پھر اپنے حجرہ میں واپس لوٹ گیا اور اپنے عمل سے ثابت کر دیا کہ:

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے

وہ مرد درویش حق نے جس کو دیئے ہیں اندازِ خسروانہ

عالم اسلام میں جب بھی کوئی خلاف اسلام تحریک اُٹھی، کوئی خلاف ایمان فرقہ وجود میں آیا یا اسلام اور تعلیمات مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کوئی نیا نظریہ روشناس کرایا گیا تو تصوف نے پوری قوت کے ساتھ اس کا مقابلہ کیا۔ اموی اور عباسی خلافت ہو یا فاطمی دور حکومت، سلطنت عثمانیہ ہو یا برصغیر پاک و ہند میں مغل دور حکومت، اہل تصوف نے اندیشہ سود و زیاں سے بے نیاز ہو کر عقائد کی اصلاح، باطل رسوم و رواج کے خاتمہ کے ساتھ ساتھ کفر کے ظلمت کدوں میں اسلام کی شمع روشن رکھنے کا مقدس مشن جاری رکھا۔

اہل تصوف کا مقصد اولیٰ تبلیغ اسلام ہے، جسے انہوں نے کبھی بھی فراموش نہیں کیا۔ تاریخ تصوف پر طائرانہ نظر ڈالتے ہی احساس ہونے لگتا ہے کہ صوفیاء نے تبلیغ اسلام کی خاطر اپنے علاقوں کو چھوڑا، دور دراز کے سفر اختیار کئے، موسم اور سفر کے مصائب کے اٹھائے، کفار کی سازشوں کا مقابلہ کیا۔ تائید ایزدی کے سہارے یہ مسلسل آگے بڑھتے رہے اور بالآخر کامیاب و کامران رہے۔ داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ سید علی ہجویری غزنی سے چلے اور بالآخر لاہور میں مقیم ہوئے، خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ نہایت طویل سفر طے کر کے اجمیر میں آٹھہرے بابا فرید الدین مسعود گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ نے آخر کار اجودھن کو اپنا مستقر بنایا تو ان کے پاک قدموں کی برکت سے پاکستان کے نام سے شہرت عام حاصل کر گیا۔ بے شمار صوفیائے عظام ہیں کہ جنہوں نے اشاعت اسلام کی خاطر معروف شہروں اور علاقوں کو چھوڑا اور نہایت غیر آباد اور غیر معروف علاقوں میں اپنا تبلیغی مرکز بنایا۔ اس ضمن میں انہوں نے فقط یہی ترجیح مد نظر رکھی کہ یہ جہاں مقیم ہو رہے ہیں وہ جگہ کفر و شرک کا مرکز ہوتا کہ وہاں پوری شدت ایمانی کے ساتھ انوار اسلام پھیلائے جاسکیں۔ کیونکہ جس خطہ زمین میں ظلمتوں کا راج ہو، روشنی کی سب سے زیادہ ضرورت بھی وہیں محسوس کی جاتی ہے۔ قدرت کی طرف سے منجائے نبوت بھی یہی ہے۔ اس مقصد کی خاطر حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو مظہر انوار خدا

Click For More Books

<https://archive.org/details/@zohaibhasanattari>

بنا کر اس جگہ مبعوث فرمایا گیا تھا جو دنیا بھر میں کفر و شرک اور گمراہی و ضلالت میں اپنا ثانی نہیں رکھتی تھی۔ صوفیائے کرام بھی اسوۂ رسول کی تقلید میں ایسے مقامات کا رخ کرتے ہیں جہاں باطل اپنی پوری قوت کے ساتھ کار فرما ہو۔

ان صوفیائے کرام کے قدموں کی برکت اور فیوض روحانی کی بدولت گمراہی و ضلالت کے مراکز رشد و ہدایت کا مخزن بن جاتے ہیں۔ کفر و شرک سے بسی ہوئی فضا میں، نغمہ توحید سے معمور ہو جاتی ہیں۔ بتوں کے ماننے والے خدائے واحد کے حضور سجدہ ریز ہو جاتے ہیں، ویرانے بننے لگتے ہیں، اجڑے ہوئے حرماں نصیب دل زندگی کی حرارت سے بھرپور ہو جاتے ہیں۔ ان کی روشن کی ہوئی شمع توحید جب پوری تب و تاب سے بھڑکتی ہے تو دور دور سے آنے والے طالبان شوق پروانہ وار اس پر تصدق ہوتے ہیں اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے دل بھی بننے لگتے ہیں اور ویران علاقے بھی آبادی کا نقشہ پیش کرنے لگتے ہیں۔

بقول اقبال:

حسن بے پروا کو اپنی بے حجابی کیلئے

ہوں اگر شہروں سے بن پیارے تو شہر اچھے کہ بن

ان مردانِ کار کا اسلحہ تیرو سنان نہیں بلکہ خلق عالمگیر ہے جس کے بل پر وہ قلوب اہل عالم کو تسخیر کرتے ہیں۔ فقر ان کی ذرہ ہے تو سچائی ان کیلئے شمشیر کا کام دیتی ہے۔ ان کی جاں نواز مسکراہٹ ان کا ترکش ہے جس میں موجود دعاؤں کے تیر قضا و قدر کی آن بن کر تشنگان مئے شوق کے دلوں میں پیوست ہو جاتے ہیں۔ قناعت ان کا آسرا اور توکل ان کا سرمایہ ہے۔ بوریائیں ان کیلئے تخت شہی اور خرقة پوشی ملبوس سلطانی ہے۔ یہ مشکلات میں مسکراتے اور جفاؤں کو دارِ وفا سمجھ کر سینے سے لگاتے ہیں۔ ان کی سادگی رشک قیصری ہے تو بے ریائی جمال آگہی۔ اس شوکتِ علم و عمل کو دامن میں لئے جب یہ اصحاب تصوف اعلائے کلمۃ الحق کہتے ہیں تو زمانہ ان کے قدموں پہ سرکھی جھکاتا ہے اور دل بھی۔ یہیں پر ذوقِ یقین کی سر بلندی اور پختگی کا احساس ہوتا ہے کہ ایک صاحب نظر نے کیا خوب کہا ہے:

غلامی میں نہ کام آتی ہیں تدبیریں نہ شمشیریں

جو ہو ذوقِ یقین پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا

Click For More Books

<https://archive.org/details/@zohaibhasanattari>

نگاہِ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں
ولایتِ پادشاہی علمِ اشیا کی جہانگیری
یہ سب کیا ہیں فقط اک نکتہِ ایماں کی تفسیریں
تصوف بندے کو خدا تک پہنچانے کا نام ہے۔ اس کا مقصد ایک ایسی زندگی ہے جو خدا اور
سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع میں بسر ہو۔ اس میں مدارج یا مراتب نہیں ہوتے بلکہ ان
اکرمکم عند اللہ اتقکم کے مصداق جو صاحب ایمان زیادہ متقی اور پرہیزگار ہو جاتا ہے وہی خدا
کے نزدیک زیادہ سر بلند اور افضل ہے، جب تصوف کا دائرہ کار پھیل گیا تو بعض صوفیاء نے اس میں
مدارج اور مراتب مقرر کر دیئے حالانکہ تصوف عبادت و ریاضت اور زہد و تقویٰ کے مسلسل عمل کا نام
ہے اور انسان اس راہ میں جوں جوں آگے بڑھتا جاتا ہے، خدا کی رحمتوں اور عنایات کا حق دار بنتا
جاتا ہے۔ تصوف کسی درسگاہ کے مقرر کردہ نصاب کے مطابق نہیں ہے کہ جس جماعت میں چاہا
داخلہ لے لیا اور مقررہ نصاب پڑھ کر سند فضیلت حاصل کر لی۔ یہ تو خشوع و خضوع، پاکیزگی و پرہیز
گاری، روحانی مجاہدوں اور فکری ریاضتوں کا پیہم عمل ہے۔ اس میں کہیں جمود یا رکاوٹ نہیں ہے اس
لئے اس میں کسی قسم کی درجہ بندی یا تفریق مدارج ہر لحاظ سے نامناسب اور تصوف کے بنیادی
اصولوں کے منافی ہے اور اس نوعیت کی کاوشیں کرنے والے ہی تصوف کی روحانی یلغار کو متاخر کرنے
کا باعث بنے ہیں۔

شاعر مشرق کے لفظوں میں:

لبھاتا ہے دل کو کلامِ خطیب مگر لذتِ شوق سے بے نصیب
بیاں اسی کا منطق میں الجھا ہوا لغت کے بکھیڑوں میں سلجھا ہوا
بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے مسلمان نہیں راگھ کا ڈھیر ہے
شراب کہن پھر پلاساقی وہی جامِ گردش میں ساقی
تصوف میں کسی قسم کی درجہ بندی کو اقبال نے بتانِ عجم کی پوجا سے تعبیر کیا ہے کیونکہ اقبال
بخوبی سمجھتے ہیں کہ تصوف تو عشقِ خدا اور محبتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشبو کو عام کرنے کا نام ہے
اور اگر یہ عشق سے خالی ہو کر خود ساختہ درجہ بندیوں میں الجھ جائے تو پھر مسلمان پر راگھ کے ڈھیر کا
کمان گزرتا ہے۔

اقبال کی بات چلی ہے تو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ علامہ اقبال صوفیائے کرام کے حد درجہ نیاز مند

اور تصوف کے فیوض و برکات کے حد درجہ معترف تھے اور تصوف کے سرچشموں سے فیضیاب ہونے کیلئے وہ دور دراز کا سفر طے کر کے صوفیاء و اولیاء کی خدمت میں حاضری دینا اپنے لئے وجہ صد افتخار سمجھتے تھے۔ اقبال جانتے تھے کہ تصوف تبلیغ اسلام اور شعائر دین مصطفوی کی بالاتری اور ترویج کا نام ہے۔ وہ جانتے تھے کہ تصوف کلمہ حق بلند کرنے اور اسلامی تہذیب و تمدن کی حقیقی روح کو اجاگر کرنے کا پیغام دیتا ہے۔ اس لئے جب وہ اہل تصوف کو وقت کے تقاضوں سے مفاہمت کرتے اور مصلحت کوشی کو اپنا شعائر بناتے یا رہبانیت کو اپناتے دیکھتے ہیں تو بے اختیار چیخ اٹھتے ہیں:

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسم شبیری کہ فقر خانقاہی ہے فقط اندوہ و دلگیری
عہد بنو امیہ ملوکیت کے قصر کی پہلی اینٹ رکھے جانے سے لے کر برصغیر میں اشاعت
اسلام تک اور محمد بن قاسم کے ہاتھوں فتح سندھ سے لے کر قیام پاکستان تک صوفیائے کرام نے ہر
عہد میں مسلم قومیت اور جداگانہ نظریہ اسلام کی بالاتری کیلئے کبھی کسی قربانی سے دریغ نہیں کیا۔ حق
پرست صوفیائے ہمیشہ ملت اسلام کی راہنمائی کا مقدس فریضہ انجام دیا ہے اور دنیاوی نتائج و عواقب
کی پرواہ کئے بغیر اسلام کی حقیقی روح کو عوام الناس تک پہنچایا ہے۔ ان صوفیاء کا طرز عمل ظاہر بین
علماء اور فقہاء سے مختلف ہوتا ہے۔ یہ گفتار کے ظاہری شکوہ پر تکیہ نہیں کرتے بلکہ یہ دنیا کے سامنے
اپنی سیرت کا نمونہ پیش کرتے ہیں؛ جب تشنگان شوق ان کی بارگاہ میں حاضری دیتے ہیں تو یہ زیادہ
سے زیادہ وقت ان ارادت مندوں کے درمیان گزارتے ہیں تاکہ ان کی سیرت کا رنگ ان کے حلقہ
ارادت سے تعلق رکھنے والوں پر بھی چڑھ جائے۔ ان کے قول و فعل میں تضاد نہیں ہوتا، یہ جو کہتے
ہیں، کر کے دکھاتے ہیں۔ ان کا عمل ان کے علم کی گواہی ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام پر تاثیر
اور ان کے ارشادات سرمایہ بصیرت ہوتے ہیں۔ ان کا ہر لفظ عوام کے دلوں پر نقش جاوداں کی
صورت اپنا وجود چھوڑ جاتا ہے۔

منشائے ربانی بھی یہی ہے کہ جب بندہ اپنے خدا کی رضا میں ڈھل جاتا ہے۔ اس کا ہر عمل
ہر سوچ غرضیکہ زندگی کا ایک ایک پہلو رضائے الہی کی تعمیل کا نمونہ بن جاتا ہے تو پھر وہ بندہ عبد
خاص بن جاتا ہے اور اس کی ہر تدبیر تقدیر الہی کا پر تو بن کر انعامات خداوندی کا اظہار عام بن جاتی
ہے۔ قدرت اپنے احکامات صادر کرتے ہوئے اس کی تمناؤں کا رخ دیکھتی ہے۔ یہی وہ مقام ہوتا
ہے جس کے حصول کیلئے اہل تصوف اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ نذر عبادت کر دیتے ہیں کہ وہ اس
اعزاز کے مستحق قرار پائیں۔

ہاتھ ہے اللہ کا بندہ مومن کا ہاتھ غالب و کار آفرین کار کشا و کار ساز
آج جبکہ مادیت کے سائے چاروں طرف منڈلا رہے ہیں اور تشکیک و اوہام کی ظلمتیں
ایمان و یقین کے اُجالوں کو ننگے کیلئے پرتول رہی ہیں، مغربی علوم اور نظریات سے متاثر اور دانش
برہانی کے قائل دانشور عالم انسانیت کو امن و سکون کی دولت عطا کرنے کیلئے نئے نئے اسالیب فکر
تراش رہے ہیں مگر کوشش بسیار کے باوجود امن و راحت کے سوپروں اور ایمان و یقین کے اُجالوں کی
تمنا سراب بنتی جا رہی ہے۔ اس دور پر آشوب میں ہمارے تمام مصائب و آلام کا حل اکابرین اُمت
اسلام اور سربر آوردہ اصحاب تصوف کی سیرت اور تعلیمات کی پیروی ہی میں مضمر ہے۔ یہی وہ صوفیائے
کرام ہیں کہ جن کے طفیل انسانوں کو آداب انسانیت سے آگاہی، محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے
وابستگی اور عرفانِ خداوندی کی نعمت بے بہا عطا ہوئی۔

نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی ارادت ہو تو دیکھ ان کو یہ بیضا لئے بیٹھے ہیں اپنی استیوں میں
تمنا دردِ دل کی ہو تو کر خدمتِ فقیروں کی نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں
ہم عرض کر چکے ہیں کہ عالم انسانیت میں اشاعتِ اسلام کے سلسلے میں سب سے اہم کردار
صوفیائے عظام کا ہے۔ انہوں نے نہ صرف کفر و شرک کے مراکز کو عظمتِ اسلام کے مراکز میں
تبدیل کر دیا بلکہ جو مسلمان جادۂ حق سے بھٹک کر باطل رسم و رواج کے عادی ہو چکے تھے اور غیر
مسلموں کو دیکھا دیکھی اسلامی تعلیمات سے غاری ہو چکے تھے انہیں پھر سے شعائرِ اسلام کا پابند بنا
دیا۔ حکومت سے دور رہ کر کسی کا حلیف یا حریف بنے بغیر انہوں نے تزکیہٴ نفس اور اخلاقی تربیت کا
فریضہ اس حسن انجام کے ساتھ ادا کیا کہ گمراہی و ضلالت کے شکار مسلمان پھر سے شریعتِ مصطفوی
صلی اللہ علیہ وسلم کے پرستار بن گئے۔

ایک صاحبِ نظر کے بقول:

”فقراء کی ایک ایسی بے سروسامان جماعت اٹھی جس نے صفا کی چوٹی سے بلند ہونے
والے آوازہٴ حق کی گونج کو نسیم و صبا بن کر چمنستانِ دہر کے کونے کونے میں پھیلا دیا۔ آج کون اس
بات سے انکار کر سکتا ہے کہ دورِ دراز ممالک میں قلب و نظر کے سومنات کس گروہ نے فتح کئے تو وہ
یہی گروہ ہے جو اپنی درویشی، سادگی، قلب و نگاہ کی عفت اور حسن کردار کی بدولت ہر جگہ توحید
خداوندی کی داستانیں رقم کرتا گیا۔“



حضرت فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ علیہ

رکھ لیا خلاق نے ان کے گناہوں کا بھرم
ان کی کشت آرزو کو مل گیا یکبار نم
دفتر اعمال ان کا تھا گناہوں سے بھرا
کر رہے تھے اپنے قلب و جان پر پیہم ستم
رحمت رب دو عالم آگئی جب جوش میں
چھایا ان پر دیکھتے ہی دیکھتے ابر کرم
خاک کو اکسیر کر کے خالق دارین نے
توڑ ڈالے ان کے دل سے دنیا داری کے صنم
ایک آیت کی تلاوت نے بدل دی زندگی
راہ حق پر چل دیئے پھر روح و دل ہو کر بہم
ان کے دل میں ہر گھڑی رب علی کی ذات تھی
ایک پل کو بھی نہیں تھی دل میں فکر پیش و کم
صورت شمع ہدیٰ تھے اے رضا حضرت فضیل
ان کی درویشی کے آگے کیا بھلا تھا جاہ جم

(محمد اکرم رضا)

مردِ کامل

حضرت فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ علیہ

یہ صدیوں پہلے کا زمانہ ہے۔ ایک صحرا میں ایک درویش مصلیٰ بچھائے تسبیح پڑھ رہا ہے۔ اسی دوران میں ادھر سے ایک قافلہ گزرا جو تجارت کے کامیاب سفر سے واپس آ رہا تھا۔ راستے میں مسلح ڈاکوؤں نے آیا۔ ان میں سے ایک مالدار آدمی کے پاس بہت دولت تھی۔ اس نے دل میں سوچا کہ قبل اس کے کہ میں لوٹا جاؤں میں اپنی دولت مصلیٰ پر بیٹھے ہوئے درویش کے پاس بطور امانت رکھوا دیتا ہوں۔ چنانچہ اس نے درویش کے حوالے تمام دولت کر دی جو انہوں نے پاس رکھ لی۔ جب واپس آیا تو تمام قافلہ لوٹا جا چکا تھا لیکن اسے اطمینان تھا کہ کم از کم میری دولت تو محفوظ ہے۔ وہ اپنا مال و دولت واپس لینے کیلئے درویش کے پاس پہنچا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ جسے درویش سمجھا تھا وہ تو ڈاکوؤں کا سردار تھا اور اس وقت اپنے ہاتھوں سے لوٹا ہوا مال ڈاکوؤں اور لٹیروں میں تقسیم کر رہا ہے۔ وہ مالدار شخص یہ منظر دیکھ کر فرط غم سے رو پڑا کہ ہائے میری بد قسمتی میں نے اپنا مال خود اپنے ہاتھوں سے چوروں کے سردار کے حوالے کر دیا۔ چوروں کے سردار نے اسے پاس بلا لیا اور واپس آنے کے بارے میں پوچھا تو اس نے کہا ”مجھے دکھ ہے کہ میں نے اپنا مال خود اپنے ہاتھوں سے چوروں کے سربراہ کے حوالے کر دیا۔“

رہزنیوں کے سربراہ نے مسکرا کر کہا کہ تمہاری امانت وہیں پڑی ہے جہاں تم رکھ گئے تھے اٹھاؤ اور چلے جاؤ۔ اب وہ مالدار شخص اور متحیر ہوا کہ یہ کیسا قزاق ہے جو ہاتھ آئی ہوئی رقم واپس کر رہا ہے۔ وہ تو چلا گیا۔ ڈاکوؤں نے اس سردار سے پوچھا کہ آپ نے مال کیوں واپس کیا؟ اس درویش صفت شخص نے کہا اس لئے کہ وہ مال امانت تھا اور اس نے میری ذات پر بھروسہ کرتے ہوئے امانت میرے سپرد کر دی تھی۔

چند یوم گزرے تو ان قزاقوں نے ایک اور بڑا تجارتی قافلہ لوٹ لیا۔ اس قافلہ میں ایک نڈر اور دلیر آدمی بھی تھا۔ اس نے سب کچھ لٹانے کے بعد ان ڈاکوؤں سے پوچھا کہ کیا تمہارا کوئی

Click For More Books

<https://archive.org/details/@zohaibhasanattari>

لیڈر بھی ہے۔ ڈاکوؤں نے کہا ”ہمارا لیڈر نرالا آدمی ہے وہ دریا کے کنارے نماز پڑھ رہا ہے۔“ اس مرد دلیر نے پوچھا ”یہ نماز کا وقت تو نہیں؟“ تو قزاقوں نے کہا کہ وہ نفل پڑھ رہا ہے۔ وہ آدمی اور حیران ہو کر پوچھنے لگا کہ کیا وہ تمہارے مشغل قزاقی میں شریک نہیں ہوتا؟ اب تم کھانا کھانے کی تیاری کر رہے، کیا وہ تمہارے ہمراہ کھانا نہیں کھائے گا؟ ڈاکوؤں نے کہا: وہ دن کو روزہ رکھتا ہے۔ اُس آدمی کی حیرت اور بڑھ گئی اور کہا یہ رمضان المبارک کا مہینہ نہیں ہے۔ ڈاکوؤں نے جواب دیا وہ سارا سال نفلی روزے رکھتا ہے۔ وہ شخص حیرت میں گم ہو گیا اور مصلیٰ پر بیٹھے ہوئے رہنوں کے سربراہ کے پاس گیا اور کہا:

’اے رہنوں کے سربراہ! نمازوں اور چوری ڈکیتی کا تعلق کب سے ہے؟ اس ڈاکوؤں کے سردار نے کہا کہ کیا تم نے قرآن میں نہیں پڑھا:

”دوسروں نے اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہوئے عمل صالح کو اس کے ساتھ خلط ملط کر دیا۔“ ڈاکوؤں کے سربراہ سے بر محل آیت قرآن سن کر اس شخص کے تعجب کی انتہاء نہ رہی اور وہ سمجھ گیا کہ ڈاکوؤں کے اس سردار کو اپنے گناہوں کا اعتراف بھی ہے اور نیکیاں بھی کمانا چاہتا ہے۔ وہ کبھی خود کو دیکھتا اور کبھی اس سردار کو۔ بالآخر حیرت کے سمندر میں غوطہ زن ہو کر چلا گیا۔

یہ ڈاکوؤں کا حیرت انگیز سردار کون تھا، جو عبادت گزار تھا اور ڈاکوؤں کے بہت بڑے گروہ کی سربراہی سنبھالے ہوئے تھا۔

یہ کون تھا جو لوٹ کا مال بھی تقسیم کرتا ہے اور لوگوں کی امانتیں بھی واپس کرتا ہے، جو مصلیٰ پر بیٹھے رہتا مگر قزاق اس کے ہر حکم پر جان دیتے ہیں۔

قزاقوں کے یہ سردار فضیل بن عیاض تھے، جنہیں قدرت نے آنے والے دور میں ڈاکوؤں کی سربراہی کے بجائے ولیوں کی سرداری کے لئے منتخب کر لیا۔ بس ایک ضرب لگنے کی دیر تھی:

رومی ہو رومی ہو غزالی عطار یا رازی ہو

کچھ ہاتھ نہیں آتا بے رہبر فرزانہ

ڈکیتی اور قزاقی کے ان ایام میں بھی آپ کے انداز نرالے تھے۔ آپ غریبوں اور بیواؤں پر ترس کھاتے تھے۔ مفلوک الحال لوگوں تک رقوم پہنچاتے تھے۔ جس میں کوئی عورت ہوتی، ڈاکوؤں کو اسے لوٹنے سے منع کر دیتے۔ جس قافلے میں غریب زیادہ ہوتے اسے بھی جانے دیتے۔ کوئی محتاج ادھر سے گزرتا تو چپکے سے کچھ بتائے بغیر اس کی امداد کر دیتے۔ دنیا والے آپ کے نام سے خوف

کھاتے تھے مگر آپ شب و روز گریہ و زاری کرتے رہتے تھے۔ ان حالات میں آپ کی زندگی تضادات کا مجموعہ بنی ہوتی ہے۔

ایمان مجھے رو کے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر

کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

پھر مس خام کے کندن بننے کا وقت تھا۔ گناہوں اور نیکیوں کی بھول بھلیوں میں گم فضیل بن ریاض کیلئے رحمت خداوندی کے خزانے کھلنے کی ساعت آگئی۔ جو عصیاں کاریوں میں بھی خدا کو یاد رکھے ہوئے تھا اس کی تطہیر قلب و فکر کی گھڑی آ پہنچی۔

سبق آموز واقعہ

ایک مرتبہ رات میں کوئی قافلہ آ کر ٹھہرا اور اس میں ایک شخص یہ آیت تلاوت کر رہا تھا کہ
لَمْ يَأْنِ لِلَّذِينَ آمَنُوا أَنْ تَخْشَعَ قُلُوبُهُمْ لِذِكْرِ اللَّهِ۔

یعنی کیا اہل ایمان کیلئے وہ وقت نہیں آیا کہ ان کے قلوب اللہ کے ذکر سے خوفزدہ ہو جائیں۔
ان آیت کا فضیل کے قلب پر ایسا اثر ہوا جیسے کسی نے تیر مار دیا ہو اور آپ نے اظہار تأسف کرتے ہوئے کہا کہ یہ غارت گری کا کھیل کب تک جاری رہے گا اور اب وہ وقت آچکا ہے کہ ہم اللہ کی راہ میں چل پڑیں۔ یہ کہہ کر زار و قطار روتے رہے اور اس کے بعد سے مشغول ریاضت ہو گئے اور ایک ایسے صحرا میں جا نکلے جہاں کوئی قافلہ پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا اور اہل قافلہ میں سے کوئی کہہ رہا تھا کہ اس راستے میں ”فضیل“ ڈاکے مارتا ہے۔ لہذا ہمیں راستہ تبدیل کر دینا چاہیے۔ یہ سن کر آپ نے فرمایا کہ اب قطعاً بے خوف ہو جاؤ اس لئے کہ میں نے رہزنی سے توبہ کر لی ہے پھر ان تمام لوگوں سے جن کو آپ سے اذیتیں پہنچی تھیں، معافی طلب کر لی لیکن ایک یہودی نے معاف کرنے سے انکار کر دیا، اور یہ شرط پیش کی کہ اگر تم سامنے والی پہاڑی کو یہاں سے ہٹا دو تو میں معاف کروں گا۔ چنانچہ آپ نے اس کی مٹی اٹھانی شروع کر دی اور اتفاق سے ایک دن ایسی آندھی آئی کہ وہ پوری پہاڑی اپنی جگہ سے ختم ہو گئی اور یہودی نے یہ دیکھ کر اپنے قلب سے آپ کی دشمنی ختم کر دی اور عرض کیا کہ میں نے یہ عہد کیا تھا کہ جب تک تم میرا مال واپس نہیں کرو گے میں معاف نہیں کروں گا۔ لہذا اس وقت میرے تکیہ کے نیچے اشرافیوں کی ایک تھیلی رکھی ہوئی ہے وہ آپ اٹھا کر مجھے دیں گے تاکہ میری قسم کا کفارہ ہو جائے۔ چنانچہ وہ تھیلی اٹھا کر آپ نے اس کو دے دی۔ اس کے بعد اس نے یہ شرط پیش کی کہ پہلے مجھے مسلمان کر لو پھر معاف کروں گا اور آپ نے کلمہ پڑھا کر اس کو

مسلمان کر لیا۔ اسلام لانے کے بعد اس نے بتایا کہ میرے مسلمان ہونے کی وجہ یہ ہے کہ میں نے تورات میں پڑھا تھا کہ اگر صدق دلی سے تائب ہونے والا خاک کو ہاتھ لگا دیتا ہے تو وہ سونا بن جاتی ہے لیکن مجھے اس پر یقین نہیں تھا اور آج جبکہ میری تھیلی میں مٹی بھری ہوئی تھی اور آپ نے جب مجھ کو دی تو واقعی اس میں سونا نکلا اور مجھے کئی یقین ہو گیا کہ آپ کا مذہب سچا ہے۔

اب کیا تھا ایک گنہگار کے آنسو موتیوں میں ڈھل چکے تھے تو بہ کا دروازہ کھل چکا تھا رحمت خداوندی اس تائب شخصیت کو اپنی لپیٹ میں لے چکی تھی۔ وہ فضیل بن عیاض جو قزاقوں کے بہت بڑے گروہ کا سربراہ تھا اب اس کی توبہ ایسی سچی ثابت ہوئی کہ رحمت حق کی بارانِ کرم برسے لگی۔ اب دنیا اس شخصیت کو سلطان الفقراء اور امام الصوفیا کے القاب سے یاد کر رہی تھیں۔ اس کی دعائیں قبولیت سے ہمکنار ہو رہی تھیں۔

موتی سمجھ کے شانِ کریبی نے جن لئے

قطرے جوتھے مرے عرقِ انفعال کے

ایک مرتبہ آپ نے کسی سے استدعا کی کہ میں نے بہت جرائم کئے ہیں لہذا مجھے امیر وقت کے پاس لے چلو تا کہ وہ مجھ پر شرعی حدود نافذ کرے اور جب اس نے امیر وقت کے سامنے آپ کو پیش کر دیا تو اس نے انتہائی تعظیم و تکریم کے ساتھ آپ کو واپس کر دیا اور جب آپ نے اپنے گھر کے دروازے پر آ کر آواز دی تو بیوی نے اضمحلال سے بھری ہوئی آواز سن کر یہ تصور کیا کہ شاید آپ زخمی ہو گئے ہیں اور جب بیوی نے پوچھا کہ زخم کہاں آیا ہے تو فرمایا کہ آج میرے قلب پر زخم لگا ہے پھر بیوی سے کہا کہ میں سفر حج پر جانا چاہتا ہوں۔ لہذا اگر تم چاہو تو میں تم کو طلاق دے دوں۔ کیونکہ اس راستے میں تمہیں میرے ہمراہ بڑی بڑی اذیتیں جھیلنی پڑیں گی لیکن بیوی نے کہا کہ میں خادمہ بن کر تمہارے ہمراہ رہوں گی کیونکہ میرے لئے تمہاری فرقت ناقابلِ برداشت ہے۔ چنانچہ آپ نے انہیں بھی شریک سفر کر لیا اور اللہ تعالیٰ نے راستے کی تمام مشکلات دور فرما دیں اور آپ نے مکہ معظمہ پہنچ کر کعبۃ اللہ کی مجاورت اختیار کر لی اور مدتوں حضرت امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کی خدمت میں رہ کر علم حاصل کیا اور عبادت و ریاضت میں معراج کمال تک رسائی حاصل کی۔ اہل مکہ آپ کے گرد جمع رہتے اور آپ اپنے مواعظِ حسنہ سے انہیں مستفیض فرماتے رہتے۔ وریں اثناءِ آپ کے کچھ اعضاء بغرض ملاقات پہنچے تو آپ نے ان سے ملاقات نہیں کی۔ لیکن بے حد اصرار کے بعد چہت پر چڑھ کر فرمایا کہ اللہ تم لوگوں کو عقل سلیم عطا فرمائے تاکہ کسی اچھے کام میں مشغول ہو جاؤ۔

یہ الفاظ ان لوگوں پر کچھ ایسے مؤثر ہوئے کہ ان پر غشی طاری ہو گئی اور تمنائے ملاقات لئے وطن واپس ہو گئے۔

.....○.....

اب حضرت فضیل بن عیاض کا مرتبہ اتنا بلند ہو چکا تھا کہ مخلوق خداوندی دور دور سے آپ کے نصائح و مواعظ سننے کیلئے آتی۔ ان میں سلاطین بھی تھے اور امرائے وقت بھی۔ گنہگار بھی ہوتے اور عابد و پرہیزگار۔ یعنی آپ خلق خدا سے چھپتے پھرتے مگر خوشبو بھی کبھی کسی سے چھپی ہے۔ آپ حد درجہ بے نیاز اور استغنا کا مظاہرہ کرتے۔ ملنے سے انکار کر دیتے۔ جلوت کے بجائے خلوت گزینی کو پسند کرتے کیونکہ اسی صورت میں انہیں اپنے خالق سے استغفار اور عبادت کیلئے زیادہ سے زیادہ وقت مل سکتا تھا۔

آپ کو اپنے ماضی کی تلخ یادیں بہت ستاتی تھیں۔ مگر آپ کی توبہ نے قبولیت کی معراج کو اس شان سے چھوا تھا کہ زمانہ حیران رہ جاتا۔ عبادت و ریاضت اور زہد و تقویٰ کے علاوہ آپ برسوں امام اعظم حضرت ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ جیسے عظیم المرتبت محدث، فقیہ اور وارث علوم رسول کی بارگاہ میں رہ کر علوم دینیہ پر بھی عبور حاصل کر چکے تھے۔ آپ کے علم کا سکہ اب ایک زمانہ تسلیم کر رہا تھا۔ اس لئے لوگوں کی زیادہ سے زیادہ کوشش ہوتی تھی کہ آپ کے ارشادات عالیہ سنیں، آپ کے پسند و مواعظ سے مستفید ہوں، آپ سے مسائل سنیں، عوام الناس کو آپ کی فکر انگیز گفتگو سن کر روحانی تسکین کا احساس ہوتا تھا۔

اس دور میں اسلامی سلطنت کے سب سے بڑے حکمران ہارون الرشید عباسی کے دل میں کسی ایسے درویش کا بل سے ملاقات کا خیال آیا جو اس کے جلال شاہی سے مرعوب ہوئے بغیر اسے حقیقی نصائح سے نواز سکے۔ اس نے اپنے معتمد وزیر فضل برکی کو حکم دیا۔ فضل برکی سب سے پہلے انہیں حضرت سفیان کی خدمت میں لے گیا۔ سفیان ثوری نے پوچھا کون ہے۔ فضل برکی نے جواب دیا کہ امیر المؤمنین ہارون الرشید تشریف لائے ہیں۔

سفیان نے فرمایا کہ کاش مجھے پہلے سے علم ہوتا تو میں خود استقبال کیلئے حاضر ہوتا۔ یہ جواب سن کر ہارون الرشید نے فضل سے کہا کہ جیسے درویش کا متلاشی تھا ان میں وہ اوصاف نہیں ہیں اور تم مجھے یہاں لے کر کیوں آئے؟ فضل نے عرض کیا کہ آپ جس قسم کے بزرگ کی جستجو میں ہیں وہ اوصاف صرف فضیل بن عیاض میں ہیں۔ یہ کہہ کر ہارون کو فضیل بن عیاض کے یہاں لے گیا۔

Click For More Books

<https://archive.org/details/@zohaibhasanattari>

اس وقت آپ یہ آیت تلاوت فرما رہے تھے کہ ام حسب اللدین اجترجوا السیئات ان نجعلہم کالذین امنوا۔

یعنی کیا لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے برے کام کئے، ہم ان کو نیک کام کرنے والوں کے برابر کر دیں گے۔ یہ سن کر ہارون نے کہا کہ اس سے بڑی نصیحت اور کیا ہو سکتی ہے۔ پھر جب دروازے پر دستک دینے کے جواب میں حضرت فضیل رحمہ اللہ علیہ نے پوچھا کہ کون ہے؟ تو فضل برتکی نے کہا کہ امیر المؤمنین تشریف لائے ہیں۔ آپ نے اندر ہی سے فرمایا کہ ان کا میرے پاس کیا کام اور مجھے ان سے کیا واسطہ میری مشغولیت میں آپ لوگ حارج نہ ہوں۔ لیکن فضل نے کہا کہ اولاً امر کی اطاعت فرض ہے۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے اذیت نہ دو۔ پھر فضل نے کہا کہ آپ اندر داخلے کی اجازت نہیں دیتے تو ہم بلا اجازت داخل ہو جائیں گے۔

آپ نے فرمایا کہ میں تو اجازت نہیں دیتا ویسے بلا اجازت داخلے میں تم مختار ہو اور جب دونوں اندر داخل ہوئے تو آپ نے شمع بجھا دی تاکہ ہارون کو شکل نظر نہ آئے۔ لیکن اتفاق سے تاریکی میں ہارون کا ہاتھ آپ کے دست مبارک پر پڑ گیا تو آپ نے فرمایا کہ کتنا نرم ہاتھ ہے کاش جہنم سے نجات حاصل کر سکے۔ یہ فرما کر نماز میں مشغول ہو گئے اور فراغت نماز کے بعد جب ہارون نے عرض کیا کہ آپ کچھ ارشاد فرمائیں تو آپ نے فرمایا کہ تمہارے والد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا تھے اور انہوں نے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے استدعا کی کہ مجھے کسی ملک کا حکمران بنا دیجئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہیں تمہارے نفس کا حکمران بنانا ہوں کیونکہ دنیاوی حکومت تو روز محشر وجہ ندامت بن جائے گی۔

یہ سن کر ہارون نے عرض کیا کہ کچھ اور ارشاد فرمائیں۔ آپ نے فرمایا کہ جب حضرت عمر بن عبدالعزیز کو سلطنت حاصل ہوئی تو انہوں نے کچھ ذی عقل لوگوں کو جمع کر کے فرمایا کہ میرے اوپر ایک ایسا بارگراں ڈال دیا گیا ہے جس سے چھٹکارا کی کوئی سببیل نظر نہیں آتی۔ ان میں سے ایک نے مشورہ دیا کہ آپ سن رسیدہ مومن کو باپ کی جگہ تصور کریں اور ہر جوان کو بمنزلہ بھائی کے اور بیٹے کے تصور کریں اور عورتوں کو ماں، بیٹی اور بہن سمجھیں اور انہی رشتوں کے مطابق ان سے حسن سلوک سے پیش آئیں۔ ہارون الرشید نے پھر عرض کیا کہ کچھ اور نصیحت فرمائیں، تو آپ نے فرمایا کہ پوری مملکت اسلامیہ کے باشندوں کو اپنی اولاد تصور کرو، بزرگوں پر مہربانی کرو، چھوٹوں سے بھائیوں اور اولادوں کی طرح پیش آؤ۔

پھر فرمایا کہ مجھے خوف ہے کہ کہیں تمہاری حسین و جمیل صورت نار جہنم کا ایندھن نہ بن جائے کیونکہ محشر میں بہت سی حسین صورتیں نار جہنم میں حلیہ بگاڑ لیں گی اور بہت سے امیر اسیر ہو جائیں گے۔ اللہ سے خائف رہتے ہوئے محشر میں جواب دہی کیلئے ہمیشہ چوکس رہو کیونکہ وہاں تم سے ایک ایک مسلمان کی باز پرس ہوگی اور تمہاری قلمرو میں ایک غریب عورت بھی بھوکی سو گئی تو محشر میں تمہارا گریبان پکڑے گی۔

ہارون پر یہ نصیحت آمیز گفتگو سنتے سنتے غشی طاری ہو گئی اور فضل برکی نے حضرت فضیل سے کہا کہ جناب بس کیجئے آپ نے امیر المومنین کو نیم مردہ کر دیا۔ حضرت فضیل رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اے ہامان خاموش ہو جا، میں نے نہیں بلکہ تو نے اور تیری جماعت نے ہارون کو زندہ درگور کر دیا ہے۔ یہ سن کر ہارون پر مزید رقت طاری ہو گئی اور فضل برکی سے کہا کہ مجھے فرعون تصور کرنے کی نسبت سے تجھے ہامان کا خطاب دیا ہے پھر ہارون نے پوچھا کہ کسی کے آپ مقروض تو نہیں ہیں۔ فرمایا بے شک اللہ تعالیٰ کا قرض دار ہوں اور اس کی ادائیگی صرف اطاعت سے ہی ہو سکتی ہے لیکن اس کی ادائیگی بھی میرے بس سے باہر ہے کیونکہ محشر میں میرے پاس کسی سوال کا جواب نہ ہوگا۔ پھر ہارون نے عرض کیا کہ میرا مقصد دنیاوی قرض سے تھا۔ آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتیں ہی اتنی ہیں کہ مجھے قرض لینے کی ضرورت نہیں۔

اس کے باوجود ہارون نے بطور نذرانہ ایک ہزار دینار کی تھیلی پیش کرتے ہوئے عرض کیا کہ رقم مجھے اپنی والدہ کے ورثہ میں ملی ہوئی ہے اس لئے قطعاً حلال ہے۔ یہ سن کر آپ نے فرمایا کہ صد حیف میری تمام پند و نصائح بے سود ہو کر رہ گئیں کیونکہ تم نے ذرا سا بھی اثر قبول نہیں کیا، میں تو تمہیں دعوت نجات دے رہا ہوں اور تم مجھے قعر ہلاکت میں جھونک دینا چاہتے ہو کیونکہ جو مال مستحقین کو ملنا چاہئے وہ تم غیر مستحقین میں تقسیم کرنے کے خواہاں ہو۔ اسکے بعد ہارون نے رخصت ہوتے وقت فضل برکی سے کہا کہ یہ واقعی صاحب فضل بزرگوں میں سے ہیں۔

عاجزی کا یہ عالم تھا کہ میدان عرفات میں لوگوں کی گریہ وزاری کا منظر دیکھ کر فرمایا کہ اگر اتنی گریہ وزاری کے ساتھ کسی بخیل سے بھی دولت طلب کریں تو شاید وہ بھی انکار نہیں کر سکتا۔ لہذا اے مالک حقیقی اتنی گریہ وزاری کے بعد مغفرت طلب کرنے والوں کو تو یقیناً معاف فرما دے گا۔ عرفہ کی شب میں کسی نے آپ سے سوال کیا کہ عرفات کے متعلق جناب کا کیا خیال ہے؟ فرمایا کہ اگر فضیل ان میں شامل نہ ہوتا تو یقیناً سب کی مغفرت ہو جاتی۔

حضرت فضیل بن عیاض کے ملفوظات اور ارشادات بہت سے تذکروں میں ملتے ہیں۔ تصوف کی داستانوں کی ان کے وجود پاک سے زینت ہے۔ آپ چلتے تو زمانہ ہمراہ چلتا مگر آپ لوگوں کو دور ہٹا دیتے، مگر پھر بھی ایسے صوفیائے بے ریا اور آپ کے بچے چاہنے والے کسی نہ کسی صورت آپ کے ہمراہ ہو لیتے اور جو دیکھنے کو میسر آتا وہ لکھ لیتے۔ آپ کے روشن اقوال سے کتنی دینی کتب منور ہیں۔ چند اقوال و ارشادات نذر قارئین ہیں:

آپ سے کسی نے سوال پوچھا کہ خدا کی محبت معراج کمال تک کس وقت پہنچتی ہے؟ فرمایا کہ جب دنیا اور دین بندے کیلئے مساوی ہو جائے۔ پھر کسی نے سوال کیا کہ اگر کوئی فرد اس خوف سے لبیک نہ کہتا ہو کہ جواب منفی میں نہ مل جائے تو اسکے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟ فرمایا کہ اس سے بلند مرتبت کوئی نہیں۔ پھر اساس دین کے متعلق سوال کے جواب میں فرمایا کہ عقل دین کی بنیاد ہے اور عقل کی بنیاد علم اور علم کی بنیاد صبر ہے۔

حضرت امام احمد بن حنبل فرمایا کرتے تھے کہ میں نے اپنے کانوں سے حضرت فضیل کو یہ کہتے سنا ہے کہ طالب دنیا رسوا و ذلیل ہوتا ہے اور جب میں نے اپنے لئے کچھ نصیحت کرنے کے متعلق عرض کیا تو فرمایا کہ خادم بنو مخدوم نہ بنو، کیونکہ خادم بننا ہی وجہ سعادت ہے۔ ایک مرتبہ حضرت بشر حافی نے پوچھا کہ زہد و رضا میں افضل کون ہے؟ فرمایا کہ رضا کو فضیلت اس لئے ہے کہ جو راضی برضا رہتا ہے وہ اپنی بساط سے زیادہ طلب نہیں کرتا۔

سفیان ثوری فرمایا کرتے تھے کہ ایک مرتبہ رات کو آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور قرآن و حدیث کے بیان کے بعد میں نے عرض کیا کہ آج کی نشست اور رات دونوں مبارک ہیں اور خلوت سے کہیں زیادہ افضل ہیں۔ فرمایا کہ یہ نہ کہو آج کی شب تو تمام راتوں سے قبیح ہے کیونکہ آج کی شب ہم دونوں اسی تصور میں غرق رہے کہ گفتگو کا موضوع ایسا ہونا چاہیے جو ہم دونوں کا پسندیدہ ہو جبکہ اس تصور سے خلوت نشینی اور ذکر الہی میں مشغولیت کہیں زیادہ بہتر ہے۔

آپ نے حضرت عبداللہ کو سامنے سے آتا ہوا دیکھ کر فرمایا کہ جدھر سے آئے ہو ادھر ہی لوٹ جاؤ، ورنہ میں لوٹ جاؤں گا۔ کیونکہ تمہاری آمد کی غایت صرف یہ ہوتی ہے کہ ہم دونوں بیٹھ کر باتیں کریں۔ ایک مرتبہ آپ نے کسی سے حاضر خدمت ہونے کی وجہ دریافت کی تو اس نے عرض کیا کہ میری آمد کا مقصد آپ کی شیریں بیانی سے مظلوظ ہونا ہے۔ آپ نے قسم کھا کر فرمایا کہ یہ بات

میرے لئے بہت ہی وحشت انگیز ہے کیونکہ تمہاری آمد کا مقصد صرف اتنا ہے کہ ہم دونوں جھوٹ اور فریب میں مبتلا رہیں۔ لہذا یہاں سے فوراً چلے جاؤ۔

ایک مرتبہ آپ نے فرمایا کہ میری خواہش صرف اس غرض سے علیل ہو جانے کی ہے کہ باجماعت نماز ادا نہ کرنی پڑے اور کسی کی شکل تک نظر نہ آئے کیونکہ بندگی ایک ایسی خلوت نشینی کا نام ہے جس میں کسی کی صورت نظر نہ پڑے اور میں ایسے شخص کا بہت ممنون ہوتا ہوں جو نہ مجھے سلام کرے اور نہ مزاج پرسی کو آئے کیونکہ لوگوں سے میل ملاپ اور عدم تنہائی نیکی سے بہت دور کر دیتے ہیں اور جو شخص محض اعمال پر گفتگو کرتا ہے اس کی گفتگو لغو اور بے سود ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ سے خوف رکھتا ہے۔ اس کی زبان گنگ ہو جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ دوست کو غم اور دشمن کو عیش عطا کرتا ہے۔ پھر فرمایا کہ جس طرح جنت میں رونا عجیب سی بات ہے اسی طرح دنیا میں ہنسنا بھی تعجب انگیز ہے کیونکہ نہ تو جنت رونے کی جگہ ہے اور نہ دنیا ہنسنے کی جگہ اور جس کا قلب خشیت الہی سے لبریز ہوتا ہے اس سے ہر شے خوفزدہ رہتی ہے۔ پھر فرمایا کہ بندے کے زہد کی مقدار اسی قدر ہوتی ہے جتنا اسے آخرت سے لگاؤ ہوتا ہے۔

فرمایا کہ میں نے پوری اُمت محمدی میں ابن سیرین سے زیادہ بیم ورجا کے عالم میں کسی کو نہیں دیکھا۔ پھر فرمایا کہ اگر دنیا کی ہر لذت میرے لئے جائز کر دی جائے تو پھر بھی میں دنیا سے اتنا نادم رہتا جتنا لوگ حرام و مردود شے سے نادم ہوتے ہیں۔ پھر فرمایا کہ اللہ نے برائیوں کے مجموعہ کو دنیا کا نام دے دیا ہے اور دنیا سے بری الذمہ ہو کر لوٹنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا دنیا میں آنا آسان ہے۔ پھر فرمایا کہ لوگ دار الامراض میں پاگلوں کے مانند تنگ جگہ میں زندگی گزار دیتے ہیں۔ پھر فرمایا کہ اگر آخرت خاکی ہوتی اور دنیا زر خالص پھر بھی دنیا فانی رہتی اور لوگوں کی خواہش خاکی ہونے کے باوجود آخرت ہی جانب ہوتی لیکن دنیا خاکی ہے اور آخرت زر خالص۔ پھر بھی دنیا کی بجائے آخرت کی جانب لوگوں کی توجہ نہیں ہوتی۔ پھر فرمایا کہ دنیا میں جب کسی کو نعمتوں سے نوازا جاتا ہے تو آخرت میں اس کے سو حصے کم کر دیئے جاتے ہیں۔

جب مرد مومن اس قدر متقی اور پرہیزگار ہو جاتا ہے تو اس کے خون کے قطرات اور سانسوں میں رب کی رحمت سما جاتی ہے۔ وہ خدا کیلئے جیتا اور مرتا ہے۔ اس کا ایک ایک لمحہ یاد الہی میں بسر ہوتا ہے۔ خدا اس کا محبوب بن جاتا ہے اور وہ کسی اور کی محبت کو قبول ہی نہیں کرتا۔ ایک مرتبہ آپ اپنے چھوٹے سے بچے کو گود میں لئے بہت زیادہ پیار کر رہے تھے کہ محبوبیت خدا کی یاد آگئی اور کہا کہ یا اللہ

جہاں تو محبوب بن جائے کسی اور سے محبت کو جی ہی نہیں چاہتا۔ یہ کہا ہی تھا کہ بچے نے ہلکی سی چیخ ماری اور اپنی جان خدا کے سپرد کر دی۔ آپ کے آنسو ٹپ ٹپ کرنے لگے مگر کہا تو فقط یہی کہا:

”اے خدا یا میرے لئے تیری محبت ہی کافی ہے“

آپ خدا کی یاد میں اتنے محو ہو گئے کہ بیوی اور بچوں کی طرف سے دھیان ہی اٹھ گیا تھا۔ زندگی کا چراغ بجھ رہا تھا تو ایسے عالم میں بھی فرمایا کہ مجھے پیغمبروں پر اس لئے رشک نہیں آتا کہ وہ بھی نفسی نفسی کی منزل سے گزریں گے اور ملائکہ پر اس لئے رشک نہیں آتا کہ وہ انسانوں سے بھی زیادہ خوفزدہ ہیں۔

انتقال کے وقت آپ کی دو صاحبزادیاں موجود تھیں۔ چنانچہ آپ نے اپنی زوجہ محترمہ سے فرمایا کہ میرے بعد ان دونوں کو کوہ اہلبقیس پر لے جا کر اللہ تعالیٰ سے عرض کرنا کہ فضیل (رحمۃ اللہ علیہ) نے زندگی بھر انہیں پرورش کیا اور جبکہ وہ قبر میں جا چکا ہے تو یہ دونوں تیرے سپرد ہیں۔ چنانچہ بیوی نے وصیت پر عمل کیا اور ابھی دعا میں مشغول ہی تھیں کہ سلطان یمن ادھر آ نکلا اور اس نے دونوں صاحبزادیوں کو اپنی کفالت میں لے کر انکی والدہ سے اجازت کے بعد اپنے دو لڑکوں سے ان دونوں کی شادیاں کر دیں۔

حقیقت یہی ہے کہ جو خدا کو یاد کرتے ہیں خدا بھی انہیں بے حد یاد رکھتا ہے۔ اسی لئے تو اس نے فرمایا کہ

”تم میرا ذکر کرو میں تمہارا ذکر کروں گا“ میرا شکر ادا کرو اور کبھی نافرمانی نہ کرنا“

حضرت فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ علیہ کی پوری زندگی ظاہر کرتی ہے کہ انہوں نے خدا شنائی اور خدا کی یاد میں سرمست و محو رہنے کا حق ادا کر دیا۔ خدا نے بھی انہیں خوب خوب یاد رکھا اور جن بچیوں کو وہ بے سہارا چھوڑ کر جا رہے تھے رحمت الہی ان کا سہارا بن گئی۔ انہیں صوفیائے کرام کی پاکیزہ زندگی ہمیں صراط مستقیم پر چلنے اور رضائے الہی میں مسرت و بے خود رہنے کا پیغام دیتی ہے۔ حضرت فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ علیہ اور ان جیسے صوفیائے کرام کو رب العالمین کی جانب سے روحانی اور ایمانی درجات عطا ہوئے۔ ان کی بدولت زمانے پر یہ واضح ہو گیا کہ یہی وہ ہستیاں ہیں جن پر خدا کا انعام ہوا۔

زہے قسمت خدائے پاک کا انعام ہو جائے
عمل خالص ہو اور اللہ کا اکرام ہو جائے
انہی اللہ کے بندوں کا اُسوۂ شمع روشن ہے
کہ جس سے مستفید ہر ایک خاص و عام ہو جائے

حضرت مالک بن دینار رحمۃ اللہ علیہ

اللہ کے دلدار یہی ہیں
مالک بن دینار یہی ہیں
ان کا اسوہ نور کا مظہر
قدرت کا شہکار یہی ہیں
جن کی تعلیمات ہیں روشن
حکمت کا مینار یہی ہیں
رب کے ہر اک حکم پہ راضی
فطرت کا معیار یہی ہیں
جینا مرنا رب کی خاطر
قدیل انوار یہی ہیں
ان کا ہر انداز کرامت
رحمت کا اظہار یہی ہیں
بات رضا کیا ولیوں کی ہو
عظمت کے حق دار یہی ہیں

(محمد اکرم رضا)

امام الاصفیاء

حضرت مالک بن دینار رحمۃ اللہ علیہ

حضرت مالک بن دینار کا شمار ان صوفیائے عظام اور اولیائے کرام میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنے قول و فعل سے اپنے خدا کو راضی کر لیا تھا۔ آپ خدا کی یاد میں اس درجہ گم رہتے تھے کہ کسی اور طرف دھیان ہی نہیں تھا۔ آپ کے روشن کردار میں مس خام کو کندن بنانے والی تاثیر تھی۔ یعنی جو بھی آپ کی خدمت میں حاضری دیتا با خدا بن جاتا۔ عوام الناس آپ سے حد درجہ پیار کرتے تھے لیکن آپ شہرت و مشہوری سے گریزاں تھے اور خود کو پوشیدہ رکھنے کو ہی بہتر سمجھتے تھے۔ بعض اوقات ایک جگہ زیادہ مدت ہو جاتی تو آپ وہ جگہ ہی چھوڑ دیتے تھے کیونکہ اس جگہ عوام الناس کثرت سے آپ کی خدمت میں حاضری دینے لگتے تھے۔ آپ کی علمی شہرت اور روحانی سر بلندی کا یہ عالم تھا کہ ان کے دور کے نامور علماء و فقہاء اور درویش آپ کی خدمت میں حاضری دینا باعث سعادت سمجھتے تھے۔

لیکن آپ شروع ہی سے ایسے نہ تھے۔ بہترین لباس زیب تن کرتے، حج و حج کے ساتھ بازار میں نکلتے تھے۔ شکل و صورت بھی خوبصورت تھی۔ اگر کسی عورت کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھ لیتے تو وہ آپ کی گرویدہ ہو جاتی لیکن آپ نے کبھی اپنے وجود کو اس حسن و جمال کے باوجود بھی گناہ سے آلودہ نہ ہونے دیا اور پھر ان کی حالت بدلنے کا وقت آ گیا۔ تذکرہ نگار لکھتے ہیں:

ابتدائی دور میں آپ ایک کینر کی محبت میں گرفتار ہو گئے اور محبت کا عرصہ بہت طوالت پکڑ گیا۔ چنانچہ سردیوں کی ایک رات میں آپ صبح تک اس کے مکان کے سامنے انتظار میں کھڑے رہے اور جب سحر نمودار ہوئی تو رات کے بیکار جانے کا بے حد ملال ہوا اور قلب میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اگر میں یہ رات عبادت میں گزارتا تو اس بیداری سے وہ لاکھ درجہ بہتر تھا۔ بس اسی تصور سے آپ نے تائب ہو کر عبادت و ریاضت کو صدق دل کے ساتھ اپنا مشغلہ بنا لیا اور بہت قلیل عرصہ میں اعلیٰ و ارفع مراتب پر فائز ہوئے۔

آپ علوم ظاہری و باطنی سے مرصع اور شریعت و طریقت سے آراستہ تھے اور علماء صوفیاء

Click For More Books

<https://archive.org/details/@zohaibhasanattari>

دونوں ہی آپ کے مراتب کے پیش نظر بے حد تعظیم و احترام کرتے تھے اور عظیم تر مشائخ آپ کی صحبت سے فیضیاب ہوئے۔ اس کے علاوہ آپ کی تصانیف و کرامات کثرت سے ہیں۔ ایک مرتبہ حضرت سفیان ثوری اور حضرت فضیل بن عیاض نے آپ کو تشریف لاتے دیکھا تو حضرت سفیان ثوری نے کہا کہ اے مرد مشرق تشریف لائیے اور حضرت فضیل نے کہا کہ اے مرد مغرب اور جو مغرب و مشرق کے درمیان ہے آئیے حضرت مصنف فرماتے ہیں کہ جس کی تعریف میں حضرت فضیل جیسے بزرگ رطب اللسان ہوں ان کے اوصاف بھلا میں کیا بیان کر سکتا ہوں۔

ایک مرتبہ آپ کی والدہ آپ کی جستجو میں نکلیں تو دیکھا کہ ایک باغ میں گلاب کے پودے کے نیچے محو خواب ہیں اور ایک سانپ زگس کی ٹہنی سے نکھیاں اڑا رہا ہے۔ آپ مرد کے باشندے تھے اور سیر و سیاحت کے بے حد دلدادہ اور مدتوں بغداد میں مقیم رہ کر مکہ معظمہ تشریف لے گئے اور وہاں سے واپس ہو کر پھر اپنے وطن اصلی مرو میں سکونت پذیر ہو گئے۔

آپ فرمایا کرتے تھے کہ میں ایک مرتبہ بغرض حج روانہ ہوا لیکن راستے میں اتنی تاخیر ہو گئی کہ صرف چار یوم حج میں باقی رہ گئے اور مجھے یقین ہو گیا کہ اب میں حج سے محروم رہ جاؤں گا۔ لہذا کیا شکل اختیار کرنی چاہیے۔ اسی فراق میں ایک بڑھیا نے آ کر مجھ سے کہا میرے ہمراہ چل میں تجھے عرفات تک پہنچائے دیتی ہوں۔ چنانچہ میں چل پڑا اور جب راہ میں کوئی دریا آ جاتا تو وہ کہتی آنکھیں بند کر لو اور جب میں اس پر عمل کرتا تو ایسا محسوس ہوتا کہ میں صرف کمر تک پانی میں چل رہا ہوں اور جب دریا عبور کر لیتا تو وہ کہتی کہ آنکھیں کھول دو غرضیکہ اسی طرح اس نے مجھے عرفات تک پہنچا دیا اور فراغت حج کے بعد بڑھیا نے کہا کہ چلو میں اپنے بیٹے سے تمہاری ملاقات کراؤں اور جب میں وہاں پہنچا تو دیکھا کہ ایک بہت ہی کمزور سا نوجوان نورانی صورت کا بیٹھا ہوا ہے اور ماں کو دیکھتے ہی قدموں میں گر کر کہنے لگا کہ مجھے معلوم ہو چکا ہے تم دونوں کو میری تجھیز و تکفین کیلئے بھیجا ہے کیونکہ میری موت کا وقت بہت قریب ہے۔ یہ کہتے ہی وہ فوت ہو گیا اور میں نے غسل دے کر اس کو قبر میں اتار دیا لیکن بڑھیا نے مجھ سے کہا کہ اب تم رخصت ہو جاؤ کیونکہ میں اپنی زندگی بیٹے کی قبر پر گزارنا چاہتی ہوں اور آئندہ سال جب تم آؤ گے تو میں تمہیں نہ مل سکوں گی لیکن میرے لئے ہمیشہ دعائے خیر کرتے رہنا۔

جب رب کائنات اپنے بندہ خاص کو نوازتا ہے تو اس کیلئے اسباب بھی پیدا کر دیتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مبارک ہر وقت خدا کی رضا کی تلاش میں رہتے تھے اور پھر خدا نے آپ پر کسی

طور سے کرم فرمایا اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوتا ہے جو قربانی و ایثار کا روشن باب ہے۔

ایک مرتبہ آپ فراغت حج کے بعد بیت اللہ میں سو گئے اور خواب دیکھا کہ دو فرشتے باہم باتیں کر رہے ہیں اور ایک نے دوسرے سے سوال کیا کہ اس سال کتنے لوگ حج میں شریک ہوئے اور کتنے افراد کا حج قبول ہوا۔ دوسرے نے جواب دیا کہ چھ لاکھ لوگوں نے حج ادا کیا لیکن ایک فرد کا بھی حج قبول نہیں ہوا، مگر دمشق کا ایک موچی جو حج میں تو شریک نہیں ہوا لیکن خدا نے اس کا حج قبول فرما کر اس کے طفیل میں سب کا حج قبول کر لیا۔ یہ خواب دیکھ کر بیداری کے بعد موچی سے ملاقات کرنے دمشق پہنچے اور ملاقات کے بعد جب اس کا نام نسبت دریافت کر کے حج کا واقعہ دریافت کیا تو اس نے اپنا نام پیشہ بیان کرنے کے بعد جب آپ کا نام پوچھا تو آپ نے بتا دیا کہ میں عبد اللہ بن مبارک ہوں یہ سنتے ہی وہ چیخ مار کر بے ہوش ہو گیا اور ہوش میں آنے کے بعد اس طرح اپنا واقعہ بیان کیا کہ بہت عرصہ سے میرے قلب میں حج کی تمنا تھی اور میں نے اس نیت سے تین سو درہم بھی جمع کر لیے تھے لیکن ایک دن میرے پڑوسی کے یہاں سے کھانا پکنے کی خوشبو آئی تو میری بیوی نے کہا کہ اس کے یہاں سے تم بھی مانگ لاؤ تا کہ ہم بھی کھالیں۔ چنانچہ میں نے اس سے جا کر کہا کہ آج آپ نے جو کچھ پکایا ہے ہمیں بھی عنایت کریں لیکن اس نے کہا کہ وہ کھانا آپ کے کھانے کا نہیں ہے کیونکہ سات یوم سے میں اور میرے اہل و عیال فاقہ کشی میں مبتلا تھے تو میں نے مردہ گدھے کا گوشت پکا لیا ہے۔ یہ سن کر خوف خداوندی سے لرز گیا اور اپنی تمام جمع شدہ رقم اس کے حوالے کر کے یہ تصور کر لیا کہ ایک مسلمان کی امداد میرے حج کے برابر ہے۔ حضرت عبد اللہ نے یہ واقعہ سن کر فرمایا کہ فرشتوں نے خواب میں واقعی سچی بات کہی تھی اور خدا تعالیٰ حقیقتاً قضا و قدر کا مالک ہے۔

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ رب دو عالم کی آپ پر کس درجہ نوازشیں تھیں کہ آپ کی ایک نیکی لاکھوں حاجیوں کی بخشش کا سامان بن گئی اور پھر خدا ایسے بندوں کو اپنی رحمتوں کا نظارا اس طرح کرواتا ہے کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔

آپ فرمایا کرتے تھے کہ ایک شخص خانہ کعبہ میں داخل ہونا چاہتا ہے لیکن لرز کر بے ہوش ہو گیا اور ہوش میں آنے کے بعد جب میں نے اس کی کیفیت پوچھی تو اس نے بتایا کہ میں آتش پرست ہوں اور بھیس تبدیل کر کے کعبۃ اللہ میں داخلہ کی نیت سے آیا تھا لیکن جیسے ہی میں داخلہ کا قصد کیا تو ندا آئی کہ تو دوست کا دشمن بن کر دوست کے مکان میں کیسے داخل ہو سکتا ہے اور یہ آواز سنتے ہی میں نے صدق دل سے اسلام قبول کر لیا۔

موسم سرما میں نیشاپور کے بازار میں آپ نے ایک غلام کو دیکھا جو سردی میں سکڑا ہوا تھا۔ آپ نے پوچھا کہ تم اپنے مالک سے پوسٹین کا مطالبہ نہیں کرتے ہو؟ اس نے جواب دیا کہ اس کو نظر نہیں آتا جو میرے کہنے کی ضرورت پیش آئے۔ اس جملہ سے آپ کو ایسی عبرت ہوئی کہ آپ نے فرمایا کہ طریقت تو اس غلام سے حاصل کرنی چاہئے۔

ایک پادری عبادات و مجاہدات کرتے کرتے بہت کمزور ہو گیا تھا اور جب حضرت عبد اللہ نے دریافت کیا کہ خدا کا راستہ کیسا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ تم عارف ہونے کی وجہ سے یقیناً خدا اور اس کی راہوں سے ضرور واقف ہو گئے ہیں تو آج تک اللہ ہی کو نہیں پہچانا۔ پھر بھلا اس کا راستہ کیسے بتا سکتا ہوں۔ میں پہچانے بغیر ہی اس کی عبادت کرتے کرتے اس قدر ضعیف ہو گیا ہوں کہ سن نہ جانے تم کس قسم کے عارف ہو کہ خدا کا خوف بھی نہیں کرتے۔ یہ سن کر آپ کو ایسی عبرت ہوئی کہ ہر یوم آپ کے خوف خداوندی میں اضافہ ہی ہوتا چلا گیا۔

بزرگان دین کے ارشادات حکمت و موعظت سے پُر ہوتے ہیں۔ ان میں دنیا داری کی کوئی بات نہیں ہوتی، یہ اپنے عمل اور صالحیت کے ساتھ ساتھ اپنے اقوال اور گفتگو سے بھی عوام الناس کو نصیحتوں سے نوازتے رہتے ہیں۔ ان کے اقوال حسین درحقیقت لعل و جواہر ہوتے ہیں جنہیں خلق خدا چنتی اور اپنے دامان دل میں جگہ دیتی ہے۔ یہ اقوال اس لئے پُر اثر ہوتے ہیں کہ ان میں ان کے کردار کی خوشبو شامل ہوتی ہے۔ حضرت عبد اللہ بن مبارک کے اقوال و ارشادات بھی ایسے ہی پُر اثر اور دلوں میں اتر جانے والے ہیں اسی لئے لوگ انہیں غور سے سنتے اور اپنی عاقبت سنوارنے کی کوشش کرتے تھے کیونکہ

ع..... قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید

ایک نظر ادھر بھی ہو جائے۔

جب لوگوں نے یہ سوال کیا کہ خدا کے راستے میں چلنے والوں کی کیا کیفیت ہوئی۔ فرمایا کہ وہ ہمہ اوقات خدا کی طلب میں مشغول رہتے ہیں۔ فرمایا کہ ہمیں کثیر علم کے بجائے قلیل ادب کی زیادہ احتیاج ہے اور لوگ اس وقت ادب کے متلاشی ہیں جب اہل ادب دنیا سے رخصت ہو چکے۔ کوشش نے ادب کی بہت سی تعریفیں کی ہیں لیکن میرے نزدیک ادب نام ہے نفس شناسی کا۔ فرمایا کہ درم قرض حسنہ دینا ایک ہزار درم خیرات کر دینے سے زیادہ موجب ثواب ہے اور ناجائز مال کا ایک حصہ لینے والا بھی توکل سے محروم رہتا ہے اور توکل وہ ہے جس کو تمہارا نفس نہیں بلکہ خدا تعالیٰ تو

کل خیال کرنے اور توکل کسب کیلئے مانع نہیں ہے بلکہ کسب و توکل دونوں ہی داخل عبادت ہیں اور اہل توکل کو اتنا پسماندہ کر لینا کہ جو ان کے مرض و موت میں کام آسکے معیوب نہیں ہے۔ فرمایا کہ اگر عیالدار شخص بچوں کی نگرانی اور پرورش کے ساتھ علم دین بھی سکھاتا ہے تو اس کا اجر جہاد سے بھی فزوں ہے۔ فرمایا کہ جس کو دنیا والے عزت و رفعت کی نگاہوں سے دیکھتے ہوں اس کو چاہیے کہ وہ خود کو بے وقعت تصور کرتے ہوئے خود فریبی میں مبتلا نہ ہو۔

جب لوگوں نے سوال کیا کہ قلب کا معالجہ کس طرح کیا جائے۔ فرمایا کہ قرب الہی اور لوگوں سے کنارہ کش کرنے سے۔ فرمایا کہ تواضع کا مفہوم یہ ہے کہ انسان امراء سے غرور اور فقرائے سے عجز کے ساتھ پیش آئے۔ اور جو دنیاوی مراتب کے اعتبار سے تم سے برتر ہو اس کے ساتھ تکبر سے پیش آؤ اور جو تم سے کمتر ہو اس کے ساتھ عاجزی اختیار کرو۔ فرمایا کہ جس کی رضا میں خوف کا عنصر نہ ہو وہ بہت جلد ختم ہو جائے گا۔ فرمایا کہ ظاہری و باطنی و مراقبہ کا مطلب یہ ہے کہ جو قلب سے خوف دور کر کے سکون عطا کر دے۔

جب لوگوں نے آپ کی مجلس میں غیبت پر بحث کی تو آپ نے فرمایا کہ اگر انسان غیبت ہی کرنا چاہے تو پہلے اپنے والدین کی غیبت کرے کیونکہ ان کے گناہ اتنے زیادہ ہیں کہ اولاد کی نیکیاں ان کے اعمال نامے میں درج کی جاتی ہیں۔

کسی نے آپ سے عرض کیا کہ ایسے گناہ کا مرتکب ہو گیا ہوں جس کو بوجہ ندامت آپ مجھے سامنے نہیں بتا سکتا لیکن اصرار کے بعد اس نے کہا کہ میں زنا کا ارتکاب کر بیٹھا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ میں تو اس خیال میں تھا کہ شاید تو نے غیبت کا گناہ کیا ہے کیونکہ زنا کا تعلق تو خدا کے گناہ سے ہے جو توبہ کے بعد معاف بھی ہو سکتا ہے لیکن غیبت بندے کا گناہ ہے جس کو اللہ معاف نہیں کرتا۔

آپ کے یہاں کوئی مہمان آگیا اور اس وقت آپ کے یہاں کچھ بھی موجود نہ تھا لیکن آپ نے اپنی بیوی سے فرمایا کہ مہمان خدا کا بھیجا ہوا ہوتا ہے لہذا مہمان داری میں کسی قسم کی کوتاہی نہ کرنا، مگر اس نے آپ کے حکم کی تعمیل نہیں کی چنانچہ اس حکم شرعی کے مطابق کہ جو عورت شوہر کا حکم نہ مانے اس کو طلاق دے دینی چاہیے۔ آپ نے بھی مہر ادا کر کے اپنی بیوی کو طلاق دے دی۔

آپ فرمایا کرتے تھے کہ ایک مرتبہ روم کے گرد و نواح میں میں نے دیکھا کہ کچھ لوگ ایک شخص کو ہتکینہ میں کس کر مار پیٹ رہے ہیں اور ایک شخص دور سے کھڑا کہہ رہا ہے کہ اس کو اچھی طرح مارو دور نہ بڑا بت خفا ہو جائے گا۔ اور جب میں نے پٹنے والے سے پوچھا کہ یہ لوگ تجھے کیوں مار رہے

اس نے کہا کہ ہمارا یہ مذہبی عقیدہ ہے کہ گناہوں سے پاک ہوئے بغیر بڑے خلل پڑنے کی وجہ سے فرائض سے بھی محرومی ہو جاتی ہے اور ایسا شخص خدا کی معرفت سے کبھی بہرہ ور نہیں ہو سکتا۔

آپ کے پاس ایک ایسا غلام تھا جس سے آپ نے شرط رکھی تھی کہ اگر تم محنت مزدوری کر کے اتنی رقم مجھے دے دو تو میں تم کو آزاد کر دوں گا۔ ایک دن آپ سے کسی نے کہہ دیا کہ آپ کا غلام سرقہ کرتے ہوئے کفن چرا کر فروخت کرنے کے بعد آپ کی رقم ادا کرتا ہے۔ یہ سن کر آپ کو بے ملامت ہوا اور رات کو چھپ کر اس کے پیچھے پیچھے قبرستان پہنچ گئے۔ قبرستان میں جا کر غلام نے قبر کھولی اور نماز میں مشغول ہو گیا اور جب آپ نے قریب سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ ٹاٹ کے کپڑے پہنے اپنے گلے میں طوق پہنے ہوئے گریہ و زاری کر رہا ہے۔ یہ دیکھ کر آپ رو پڑے اور کئی رات آپ نے باہر اور غلام نے قبر میں عبادت کرنے میں گزار دی۔ پھر صبح کو غلام نے قبر کو بند کیا اور فجر کی نماز مسجد میں جا کر ادا کی اور یہ دعا کرتا رہا کہ اللہ اب رات گزر چکی ہے اور میرا آقا کی رقم طلب کرے گا۔ لہذا اپنے کرم سے تو ہی کچھ انتظام فرما دے۔ اس دعا کے بعد ایک نور نمودار ہوا اور اس نے درم کی شکل اختیار کر لی۔ چنانچہ آپ یہ واقعہ دیکھ کر غلام کے قدموں میں گر پڑے اور فرمایا کہ کاش تو آقا اور میں غلام ہوتا۔ یہ جملہ سن کر غلام نے پھر دعا کی کہ اے اللہ اب میرا راز فاش کیا ہے اس لئے مجھے دنیا سے اٹھالے اور آپ کی ہی آغوش میں دم توڑ دیا۔ پھر آپ نے غسل لے کر ٹاٹ ہی کے لباس میں دفن کر دیا لیکن رات کو خواب میں دیکھا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابراہیم علیہ السلام دو براتوں پر تشریف لائے اور فرمایا کہ اے عبد اللہ تو نے ہمارے دست کو ٹاٹ کے لباس میں کیوں دفن کیا۔

آپ جہاد بالنفس پر سختی سے پابند تھے۔ اپنے جذبات کو کبھی بھی شرع مصطفوی سے بھٹکنے نہ دیا جو کام کیا اس میں خدا کی مرضی کو ملحوظ رکھا لیکن اس کے ساتھ آپ مرد مجاہد بھی تھے۔ جہاد اسلامی کا شریک ہوتے بہادری اور دلیری کے جوہر دکھائے۔ ”تذکرہ الاصفیاء“ میں لکھا ہے:

آپ کا یہ معمول تھا کہ ایک سال حج کرتے اور دوسرے سال شریک جہاد رہتے اور تیسرے سال تجارت کر کے جو کچھ بھی نفع حاصل کرتے وہ سب مستحقین میں تقسیم فرما دیتے اور فقراء کو کھجوریں ملاتے تو گٹھلیاں شمار کرتے جاتے اور جو شخص جس قدر کھجوریں کھاتا اسی حساب سے ہر شخص کو اتنے کھجوریں دیتے تھے۔

کچھ عرصہ ایک نہایت بدطینت شخص آپ کی صحبت میں رہا اور جب وہ رخصت ہو گیا تو

آپ نے روتے ہوئے فرمایا کہ صد حیف! وہ تو مجھ سے رخصت ہو گیا لیکن اس کی بری خصلتیں اس سے رخصت نہ ہو سکیں۔ ایک مرتبہ کہیں تشریف لے جا رہے تھے کہ راستہ میں بعض لوگوں نے ایک نابینا سے کہا کہ عبد اللہ بن مبارک تشریف لا رہے ہیں جو کچھ طلب کرنا چاہے طلب کر لے۔ چنانچہ اس نے آپ کو ٹھہرا کر یہ دعا کرنے کی درخواست کی کہ میری بصارت واپس آجائے اور جب آپ نے دعا فرمائی تو فوراً ہی اسکی بصارت واپس آگئی۔

آپ کس درجہ معاملہ فہم تھے اور خدا و رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے کس درجہ آپ کو نواز رکھا تھا اس کا اندازہ اس روایت سے ہوتا ہے:

ایک مرتبہ آپ بہت وجاہت کے ساتھ چل رہے تھے کہ ایک نادار سید نے کہا کہ میں سید ہونے کے باوجود آپ سے مرتبہ میں کم ہوں۔ فرمایا کہ میں تو تیرے جد امجد کا اطاعت گزار ہوں لیکن تو ان کے اقوال و اعمال پر عمل پیرا نہیں ہے۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ آپ نے یہ جواب دیا کہ یہ تو ایک حقیقت ہے کہ تیرے جد اعلیٰ خاتم الانبیاء تھے اور میرا باپ گمراہ مگر تیرے جد اعلیٰ نے جو ترکہ چھوڑا اس کو میں نے حاصل کر لیا جس کی وجہ سے یہ مرتبہ مجھے عطا کیا گیا اور میرے باپ کی گمراہی تو نے ترکے میں حاصل کی اس لئے تو رسوا ہو گیا۔ لیکن اسی شب آپ نے خواب میں حضور اکرم کو غصہ کی حالت میں دیکھا اور جب وجہ دریافت کی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تو نے میری آل کے عیوب کی پردہ دری کیوں کی؟ چنانچہ آپ بیدار ہونے کے بعد اس سید کی جستجو میں نکل کھڑے ہوئے اور ادھر اس سید نے خواب میں دیکھا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یہ فرما رہے ہیں کہ اگر تیرے اعمال و افعال بہتر ہوتے تو عبد اللہ تیری اہانت کیوں کرتا، چنانچہ وہ بھی بیداری کے بعد آپ کی تلاش میں چل دیا اور جب راستہ میں دونوں کی ملاقات ہوئی تو دونوں اپنا اپنا خواب سنانے کے بعد تائب ہوئے۔ جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ آپ نے اپنی بیوی کو اس لئے طلاق دے دی تھی کہ وہ خدا کے بھیجے ہوئے مہمانوں کی ضیافت نہیں کر سکی۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت عبد اللہ بن مبارک کو اس کا اجر یوں دیا۔

ایک دن آپ کی مجلس وعظ میں کوئی امیر زادی شریک ہوئی اور وعظ سے اس درجہ متاثر ہوئی کہ اپنے والدین سے کہہ دیا کہ میرا نکاح عبد اللہ بن مبارک سے کر دو اور والدین نے بھی خوش ہو کر نکاح کر کے لڑکی آپ کے ہمراہ کر دی۔ اس کے علاوہ پچاس ہزار دینار بھی لڑکی کو دیئے۔ پھر نکاح کے بعد آپ نے خواب میں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے تو نے ہماری خوشنودی میں بیوی کو طلاق

دے دی تھی لہذا ہم نے اس سے بہتر تجھ کو دوسری بیوی عطا کر دی تا کہ تو بخوبی اندازہ کر سکے کہ خدا کے خوش کرنے والے کبھی نقصان میں نہیں رہتے۔

حضرت عبداللہ بن مبارک جیسے اصحاب یقین جب رضائے الہی میں فنا ہو جاتے ہیں تو ان کے سامنے سے غیب کے پردے اٹھا دیئے جاتے ہیں۔ ایک واقعہ نذر قارئین ہے:

حضرت سہیل بیشتر آپ کے پاس تشریف لایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ چلتے ہوئے کہنے لگے کہ اب میں کبھی آپ کے پاس نہیں آؤں گا۔ اس لئے کہ آج چھت پر سے آپ کی کنیریں مجھے اے سہیل اے سہیل کہہ کر آواز دے رہی تھیں اور یہ بات میرے لئے بار خاطر ہو گئی۔ یہ سن کر حضرت عبداللہ نے کہا کہ آؤ سہیل کی نماز جنازہ ادا کریں چنانچہ اسی وقت ان کا انتقال ہو گیا اور تجھیز و تکلفین کے بعد جب لوگوں نے سوال کیا کہ موت سے پہلے ہی آپ کو ان کی موت کا علم ہو گیا تھا۔ فرمایا کہ انہوں نے یہ کہا تھا کہ تیری چھت پر سے کنیریں مجھے اے سہیل کہہ کر آواز دے رہی تھیں حالانکہ میرے یہاں کوئی لوٹھی نہیں ہے اور وہ یقیناً حوریں تھیں جو آواز دے رہی تھیں اسی وجہ سے میں نے ان کی موت کا یقین کر لیا۔

ایک بار ایک کافر آپ سے ملا اور کہا ہمارے لئے مصیبت یہ ہے کہ کوئی دکھ آ جائے تو حکایت کرنے کیلئے بت کا نام زبان سے نہیں نکال سکتے اور اس کے ڈر سے میں گریہ وزاری بھی نہیں کر سکتا۔ یہ سن کر آپ نے فرمایا کہ خدا کا احسان عظیم ہے کہ اس نے مجھے وہ دین عطا کیا جس میں خدا کا نام لیتے ہی بندہ گناہوں سے پاک ہو جاتا ہے اور جب اس کی معرفت حاصل کرتا ہے تو سکونت اختیار کر لیتا ہے۔ جیسا کہ خدا کا ارشاد ہے کہ خدا کو شناخت کرنے والوں کی زبان گنگ ہو جاتی ہے۔

ایک مرتبہ جہاد میں آپ ایک کافر سے برسر پیکار تھے تو نماز کا وقت آ گیا اور آپ نے اس کافر سے اجازت لے کر نماز ادا کر لی اور جب اس کی عبادت کا وقت ہوا تو وہ بھی آپ سے اجازت لے کر اپنے بت کی جانب متوجہ ہوا لیکن آپ کے دل میں اس کو قتل کر دینے کی خواہش پیدا ہوئی۔ چنانچہ اسی وقت ندائے غیبی آئی کہ ہماری اس آیت کے مطابق اولوا بالعہد ان العہد کان مستولاً۔ یعنی تم سے قیامت میں عہد شکنی کی باز پرس ہوگی۔ لہذا اپنے قصد سے باز آ جاؤ۔ یہ ندا سننے ہی آپ رو پڑے اور جب اس کافر نے رونے کا سبب دریافت کیا تو آپ نے پورا واقعہ بیان کر دیا۔ یہ سن کر اس کافر کو یہ خیال آیا کہ جو خدا اپنے دشمن کی وجہ سے اپنے دوست پر ناراض ہو اس کی اطاعت نہ کرنا بزدلی ہے اور اس خیال کے ساتھ ہی وہ سچے دل سے مسلمان ہو گیا۔

ایک پریشانی کے وقت کچھ لوگ آپ کے پاس بطور دلداری کے حاضر ہوئے اور ان میں ایک آتش پرست بھی تھا اور اس نے یہ کہا کہ دانشور وہی ہے جو اوّل دن ہی وہ کام انجام دے جس کو نادان تیسرے دن پورا کرتے ہیں۔ یہ جملہ سن کر آپ نے لوگوں سے فرمایا کہ اس قول کو یاد رکھنا بہت عظیم نصیحت ہے۔

جب لوگوں نے آپ سے سوال کیا کہ کون سی عادتیں سود مند ہیں! فرمایا کہ عقل کامل ہونا۔ لوگوں نے کہا کہ اگر عقل کامل نہ ہو؟ فرمایا کہ حسن ادب ہو۔ لوگوں نے کہا کہ اگر یہ بھی نہ ہو؟ فرمایا کہ اتنا شفیق بھائی بن جائے کہ لوگ اس سے مشورہ کریں۔ لوگوں نے کہا کہ اگر یہ بھی ممکن نہ ہو سکے؟ فرمایا سکوت اختیار کرو۔ اور اگر یہ بھی نہ ہو تو پھر مرگ ناگہاں بہت سود مند ہے۔ ایک مرتبہ فرمایا کہ جو ادب کی اہمیت سے واقف نہیں اس کی مثال ایسی ہے جیسے سنت میں بے ادبی۔

بہتر ہے کہ اپنے آقا و مولیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک ایک سنت کو بجالایا کرو۔ آپ نے تمام زندگی کوئی اثاثہ جمع نہیں کیا جو کچھ بھی امراء یا عوام کی طرف سے آتا خدا کی راہ میں خیرات کر دیا کرتے تھے۔ لوگ کہتے کہ اتنی جلدی کیا ہے؟ تو فرماتے کہ موت کوئی پوچھ کر آتی ہے اس کا کیا بھروسہ کہ کب آ جائے۔ لہذا موت کی آمد سے قبل ہی اپنے اعمال اور ایثار کے ذریعہ اس کی تیاری کر چھوڑنی چاہئے۔ یہی وجہ ہے آپ کے پاس جو اثاثہ تھا اسے آپ نے حاجت مندوں اور فقیروں میں تقسیم کر دیا۔

یہ صورتحال دیکھ کر آپ کے ایک دیرینہ ارادت مند نے سوال کیا کہ آپ کی تین صاحبزادیاں ہیں۔ ان کیلئے کیا چھوڑا؟ فرمایا کہ ان کیلئے خدا چھوڑ دیا ہے کیونکہ جس کا کفیل خدا ہو اس کو عبد اللہ کی حاجت نہیں۔ موت سے پہلے آپ نے آنکھیں کھول کر مسکراتے ہوئے فرمایا کہ ”عمل کرنے والوں کو ایسے ہی عمل کرنے چاہئیں“ اس کے بعد آپ کا انتقال ہو گیا۔

کسی نے حضرت سفیان کو خواب میں دیکھ کر پوچھا کہ اللہ تعالیٰ کا آپ کے ساتھ کیسا معاملہ رہا۔ فرمایا کہ اس نے میری مغفرت فرمادی پھر اس نے سوال کیا کہ عبد اللہ بن مبارک کس حال میں ہے؟ فرمایا کہ ان کا شمار تو اس جماعت میں ہے جو دن میں دو مرتبہ حضوری کا شرف حاصل کرتی ہے۔

تاریخ تصوف کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا قول برحق تھا کہ میں نے اپنی بیٹیوں کو خدا کیلئے چھوڑ دیا ہے۔ خدا بھی اپنے نیک بندوں کو کبھی مایوس نہیں کرتا اور پھر حضرت عبد اللہ بن مبارک تو امام الاولیاء تھے۔ خدا نے کرم فرمایا اور انکی بیٹیوں پر دامن رحمت دراز کر دیا۔ ان کے ہاں مال اس قدر وافر انداز سے آیا کہ معلوم ہی نہ ہو سکا کہ سب کچھ کیسے ہو گیا اور پھر امیر گھرانوں سے

ان بیٹیوں کیلئے رشتے آئے۔ گویا خدا نے دنیا والوں کو جتلا دیا کہ عبد اللہ بن مبارک ہمارے لئے جینا اور مرنا ہے۔ اس کا ہر عمل ہمارے لئے ہے تو ہماری تمام رحمتیں بھی اس کیلئے ہیں۔
خدا کے نام پر جینا عبادت اس کو کہتے ہیں
خدا کے نام پہ مرنا سعادت اس کو کہتے ہیں
دلوں میں خوفِ رب العالمین ہر پل جو پیدا ہو
تو پھر رحمتِ خدائے پاک کی کیوں نہ ہو پیدا ہو



سید الطائفہ

حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ

حضرت جنید بغدادی تاریخ تصوف کا روشن ترین باب ہیں۔ آپ سلطان الاولیاء تھے امام الاصفیاء تھے رہنمائے اصحاب طریقت تھے دل و جان کا اعزاز تھے۔ آپ نے لاکھوں گمراہوں کو راہ ہدایت پر گامزن کیا۔ آپ نے ظلمت و ادبار کے اندھیروں میں ٹھوکریں کھانے والوں کو ایک خدا کا پرستار بنا دیا۔ سیدنا جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کو ”سید الطائفہ“ کہتے ہیں کہ آپ کی چشم کرم نے زمانے کا مقدر بدل دیا۔ آپ کے مواعظ کی تاثیر سے امیر و غریب یکساں فیضیاب ہوتے تھے۔ آپ نے پیغام حق کو پھیلانے میں کسی صاحب تخت و تاج کی پرواہ نہیں کی بلکہ آپ سمجھتے تھے کہ سب سے بڑا جہاد یہی ہے کہ جابر حکمرانوں کے سامنے کلمہ حق کہہ کر انہیں صراطِ مستقیم پر چلنے کا راستہ بتایا جائے۔ آپ اس حقیقت کی تفسیر تھے کہ:

ہزار خوف ہو لیکن زباں ہو دل کی رفیق

یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق

زیر نظر مضمون میں آپ کے کردار کی عظمت اور آواز کی تاثیر کا ایک پہلو بیان کیا جا رہا ہے تا کہ اندازہ ہو سکے کہ بندگانِ خدا کا فیض عالمگیر کس طرح دلوں کو ایمان کی روشنی سے ہمکنار کرتا ہے۔

.....O.....

رات اپنی تاریکیوں سمیت آہستہ آہستہ خوبصورت ہو رہی تھی ستارے ماند پڑ چکے تھے۔ اسے صاف فضا میں سانس لیتے ہوئے کافی مدت ہو چکی تھی۔ کل وہ جیل سے دس برس کی سزا کاٹ کر رہا ہوا تھا۔ اس شہر کے گلی کوچے اسے مانوس دکھائی دے رہے تھے۔ اس نے اپنی عمر کا معقول حصہ اسی شہر میں گزارا تھا۔ اگرچہ کئی قسم کی تبدیلیاں رونما ہو چکی تھیں اور ان دس سالوں میں کئی قسم کے تغیر و تبدل اپنی حشر سامانیوں کا دامن پھیلا چکے تھے مگر پھر بھی اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ یہاں کے ذرے ذرے سے آشنا ہو۔ نئی عمارتوں میں اسے مانوسیت جھلکتی دکھائی دے رہی تھی اس

نے اپنے آپ پر نگاہ دوڑائی، داڑھی بڑھ چکی تھی، سر کے بال اُلجھے ہوئے تھے، جسم پر لباس نہیں بچھترے تھے۔ ان باتوں سے قطع تعلق کر کے جب اس نے پیٹ کے تنور میں جھانکا تو اس کے چہرے پر مایوسی اور غم کی ایک لہر دوڑ گئی۔ وہ آٹھ پہر سے بھوکا تھا، اسے کہیں سے بھی کھانا نہیں دستیاب ہو سکا تھا۔ اب اس کے سامنے سب سے پہلا اور بڑا سوال یہ تھا کہ پیٹ کو کیونکر بھرنے، پھر اس کی مٹھیاں بھیج گئیں، اس کا چہرہ تن گیا، اس کی آنکھوں سے شعلے لپکنے لگے، جسم میں بجلی سی دوڑ گئی۔ وہ بڑبڑایا۔

”دُنیا میں روٹی صرف جرم سے حاصل ہو سکتی ہے میں بھوکا نہیں مروں گا۔“

اس کی یہ بڑبڑاہٹ اتنی شدید تھی کہ وہ خود ہی چونک پڑا۔ کسی نے سن تو نہیں لیا، وہ شہر کے بیرونی حصے کی طرف تھا اور جس گلی سے گذر رہا تھا، وہاں سناٹا طاری تھا۔ ایک خطرناک عزم کے ساتھ وہ آگے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ معا اس کی نظر اپنے کٹے ہوئے ہاتھ پر پڑی، اسے اپنی مجبوری کا احساس ہوا اور اس کی بھنجی ہوئی مٹھیاں کھل گئیں۔ ساتھ ہی مؤذن نے پکارا ”اللہ اکبر اللہ اکبر“ اس نے محسوس کیا کہ لوگ تو بیدار ہونے لگے ہیں اور وہ دن کے اُجالے میں اپنے خطرناک عزم کو عملی جامہ نہیں پہنا سکے گا۔ اس کا کٹا ہوا ہاتھ پھٹا ہوا لباس اور وحشیانہ سراپا اور مجرموں سی ہیئت، لوگ لازمی طور پر اس کی طرف متوجہ ہو جائیں گے اور اس کی معمولی سی حرکت کو بھی کسی عظیم جرم پر محمول کیا جائے گا اور پھر وہ گرفتار ہو جائے گا جیل کا خیال آتے ہی اس کے دل میں نفرت کے جذبات اُبھر آئے۔ اب وہ شہر کی آخری عمارت کے قریب سے گذر رہا تھا۔ کیوں نہ وہ چھپ رہے اور پھر رات کو مقصد براری کیلئے نکلے، ذہن کی اس تجویز پر جسم نے اظہارِ خوشنودی کیا اور ہولے ہولے چلتا ہوا شہر کے باہر ایک سمت ہولیا۔

○

یہ ابن سابط تھا..... بغداد کا شیطان..... مشہور و معروف ڈاکو تاریخی قاتل، اب کے پندرہ سال کی سزا بھگت کر جیل سے رہا ہوا تھا۔ سزا تو بیس سال کی تھی مگر خلیفہ کے گھرولی عہد کی پیدائش کی خوشی میں اس کی سزا پانچ سال کم کر دی گئی تھی۔ اس کے آباؤ اجداد رباط کے رہنے والے تھے، بچپن میں ہی اس کی ماں مر گئی، مالی پریشانیوں کے ہاتھوں مجبور ہر کر باپ نے اسے ساتھ لیا اور ایک قافلے کے ساتھ ہولیا جو بغداد جا رہا تھا۔ اس کا باپ راستہ کے گرم و سرد کو برداشت نہ کر سکا اور ابھی جبکہ نصف منزل باقی تھی تو اس نے داعی اجل کو لبیک کیا۔

Click For More Books

<https://archive.org/details/@zohaibhasanattari>

ابن سابط کی عمر اس وقت پانچ سال کی تھی جب قافلہ والے اس کے باپ کی تجھیز و تکلفین سے فارغ ہوئے تو ان کی نظر روتے ہلکتے اور ایڑیاں رگڑتے ہوئے بچے پر پڑی۔ ایک امیر شخص نے اسے اٹھا لیا اور اپنا بیٹا بنا کر بغداد لے آیا۔ ماحول ہر انسان کا استاد ہے۔ ابن سابط کو گھر میں کوئی تکلیف نہ ہونے پائی مگر اس کی دوستی برے لڑکوں سے ہو گئی۔ اس برے ماحول سے اس نے بھی اثر قبول کیا اور چھوٹی چھوٹی چیزیں چرانا شروع کر دیں۔ چونکہ اسے پالنے والوں کی کوئی اولاد زینہ نہ تھی لہذا وہ اسے معمولی سرزنش کر کے چھوڑ دیا کرتے تھے۔ اس پر وہ اور دلیر ہوا اور اس کا مجرمانہ ہاتھ بڑی بڑی چیزوں تک پہنچنے لگا ایک بار وہ پکڑا گیا مگر کو تو ال شہر نے اسے رحم کھا کر پندرہ کوڑے لگا کر چھوڑ دیا۔

اس سزا کے بعد اس کے دل سے سزا اور قانون کا ڈر جاتا رہا۔ اب اس نے خود ہی گھر کو چھوڑ دیا تھا۔ چوری میں اسے نرالی ہی لذت نظر آئی تھی۔ اب یہ کوئی بچہ نہیں تھا بلکہ تندرست و توانا نوجوان تھا۔ ایک گھر میں چوری کرنے پر اسے پانچ سال کی سزائے قید ہوئی۔ جیل میں اس کی بڑے بڑے عادی مجرموں سے ملاقات ہوئی اور بجائے تائب ہونے کے اس کے دل سے رہا سہا خوف بھی رخصت ہو گیا۔ جس وقت وہ رہا ہوا تو جرم و گناہ کا ایک اور ہی تصور لئے ہوئے تھا۔ اب اس نے گروہ بنا لیا اور اس کے وہ ہجولی جو بچپن میں اس کے دوست تھے اور جنہوں نے اسے غلط راہ دکھائی تھی اب اس کے ساتھ ہی جوانی کے حدود کو چھو کر اس کے بہترین رفیق بن چکے تھے۔ اس گروہ کا سرغنہ و سردار یہی تھا۔ اس گروہ نے دنیائے جرم کی میں نئی ظالمانہ روایات کو جنم دیا تھا۔

○

شرافت، محبت اور نیکی و خلوص کی ان کے نزدیک کوئی وقعت نہ تھی۔ ان کے نزدیک شرافت سے رہنا خود کو بھوکوں مارنا تھا۔ گو یہ راستہ دشوار اور خار دار تھا مگر وہ انجام سے بے پرواہ تھے۔ وہ سماج کی ہر سفید پوشی سے قطع تعلق کر کے سماج کی ہر نعمت سے بہرہ اندوز ہو سکتے تھے۔ قانون ان کی نظر میں بے کار سا کھلونا تھا۔ جب گروہ کا کوئی آدمی گرفتار ہو جاتا تو سیم و زر کی چمک دمک اسے جیل کی کال کوٹھڑی سے بھی نکال لاتی۔

ایک روز انہوں نے ایک بہت بڑی جگہ ڈاکہ ڈالا۔ عین وقت پر پولیس آ پہنچی باقی تو فرار ہو گئے مگر ابن سابط گرفتار ہو گیا۔ اس نے پولیس سے کہا کہ اسے سزا موت نہ دی جائے تو وہ باقی ساتھیوں کا پتہ بتا سکتا ہے۔ پولیس مان گئی باقی ساتھی اس کے بتلائے ہوئے ٹھکانوں سے گرفتار کر

لئے گئے اور اس کا ہاتھ کاٹ کر اسے چھوڑ دیا گیا۔ گویہ دائیں ہاتھ کے کٹ جانے کی وجہ سے معاشرہ کی نظروں میں بیکار ہو گیا تھا مگر اس نے ایک ہاتھ سے دونوں ہاتھوں کا کام لیا اور اس طرح کہ اس کے دل سے رحم کی آخری رمت بھی دور ہو گئی، ضمیر جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر مردہ ہو گیا۔ اب اس نے گروہ بنانے کے بجائے اکیلے ہی کام شروع کر دیا تھا۔ اب وہ وحشت و بربریت کی تصویر تھا، کسی کی عزت کی قیمت اس کی نظروں میں دو کوڑی بھی نہ تھی۔ اس نے ڈاکے ڈالے اور ظلم و ستم کا وہ طوفان بپا کیا کہ بغداد کی سرزمین میں ہاتھ کٹے شیطان کے نام سے مشہور ہو گیا۔ آخر ایک دن پھر گرفتار ہو گیا۔ اب اس کے خلاف ایک نہیں بلکہ بیسوں مقدمات تھے یہ چور تھا، ڈاکو تھا، قاتل تھا، معاشرہ کا مجرم تھا، قانون کا ملزم تھا۔ نتیجتاً اسے بیس سال کی قید بامشقت کا حکم سنایا گیا اور یہ خوش قسمتی سے پانچ سال پہلے ہی مجرمانہ زندگی کا اعادہ کرنے کیلئے جیل سے رہا کر دیا گیا۔

.....○.....

دن کا اُجالا رخصت ہو چکا تھا۔ رات نے دن بھر کی حشر سامانیاں اور ہنگاموں کو اپنے سیاہ دامن میں سمیٹ لیا تھا اور ہر نشیب و فراز اور پست و بالا پر اپنے دامن کو پھیلا دیا تھا۔ تاریکی بڑھتے ہی ابن سابط اس جگہ سے چل کر بغداد کی طرف آیا، جہاں وہ صبح چلا گیا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا شہر کے قریب آیا، اب اُس کے دل میں خطرناک عزائم انگڑائیاں لے رہے تھے۔ شہر کے قریب پہنچ کر وہ بے ساختہ ایک گلی میں مڑ گیا۔ تھوڑا سا آگے جا کر اسے ایک شاندار مکان دکھائی دیا۔ وہ چند ثانیے اس مکان کے دروازے پر کھڑا فیصلہ کرتا رہا کہ اس کے اندر جائے یا نہ جائے، پھر اس نے دروازے پر ہاتھ رکھ کر تھوڑا سا زور لگایا، دروازہ کھل گیا۔ ذرا کی ذرا اس نے پیچھے مڑ کی گلی میں دیکھا کہ کوئی گذر تو نہیں رہا مگر اسے گلی میں کوئی بھی دکھائی نہ دیا اور وہ اپنے خطرناک عزائم کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کیلئے صحن میں داخل ہو گیا، مکان وسیع تھا، وہ صحن کو عبور کرتا ہوا آگے بڑھا۔ کمروں کی ایک رو کچھ دور تک چلی گئی تھی، بڑے کمرے میں اسے چراغ جلتا ہوا محسوس ہوا کیونکہ اس کی روشنی چمن چمن کر دروازے سے باہر آ رہی تھی۔ اس نے قریب جا کر دروازے سے اندر جھانکا، اندر کوئی بھی نہیں تھا۔ ہاتھ لگانے سے دروازہ فوراً کھل گیا تو اندر داخل ہوا۔

اور پھر کمرے کا جائزہ لیا۔ اسے کمرے کے ایک طرف کپڑوں کے بہت سے تھان پڑے دکھائی دیئے۔ مالک مکان یقیناً کوئی بہت بڑا کپڑوں کا تاجر تھا کیونکہ یہ سارے تھان ریشمی اور قیمتی کپڑوں کے تھے۔ اس کا چہرہ مسرت سے کھل اٹھا کیونکہ پہلے ہی روز قسمت نے یاوری کی تھی مگر پھر

اپنے کٹے ہوئے ہاتھ پر نظر پڑتے ہی اس کی ساری خوشی کا نور ہو گئی اس کا ایک ہاتھ بیکار تھا۔ مال بھی وافر اور قیمتی ہاتھ لگا تھا مگر سب سے بڑا مسئلہ اس بوجھ کو باندھنے کا تھا۔ اس نے ایک پورے تھان کو کھول ڈالا اور باقی اچھے اچھے تھان اس میں رکھنے شروع کئے۔ کافی بوجھ رکھ کر اس نے باندھنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا وہ مایوس ہوتا جا رہا تھا، کنوئیں پر پہنچ کر بھی وہ پیاسا ہی رہا تھا۔ امید کا چراغ ناامیدی کے جھکڑوں سے ٹٹمارہا تھا۔ ”میں کیا کروں“ وہ سوچ ہی رہا تھا کہ کھڑاک کی ہلکی سی آواز کے ساتھ دروازہ کھلا اس نے فوراً ہی پیچھے پلٹ کر دیکھا کیونکہ دروازہ کی طرف اس کی پیٹھ تھی اور ہوشیار ہو کر کھڑا ہو گیا۔ اندر داخل ہونے والا ایک سفید ریش ضعیف آدمی تھا سر پر بھاری عمامہ تھا۔ ابن سباباط نے تھوڑی دیر بوڑھے کی طرف خاموش ہو کر گھورنے پر اکتفا کیا۔ اس بوڑھے میں اسے کوئی خاص بات دکھائی دی مگر جلد ہی شیطنت اس جذبے پر غالب آ گئی اور اس نے اسے بھی اپنی طرح کوئی چور ہی سمجھ لیا۔ یہ سوچتے ہوئے کہ کہیں یہ حصہ دار نہ بن جائے اس نے آگے بڑھ کر بوڑھے کا ہاتھ پکڑا اور سختی سے دباتے ہوئے کہا ”خبردار جو کوئی حرکت کی تو.....“

”مطمئن رہو اجنبی..... اس کے جواب میں بوڑھے نے آہستہ سے کہا۔ میں وہ نہیں ہوں

جو تم سمجھ رہے ہو۔“

”تم جو کوئی بھی ہو مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں مگر تم کسی چیز کو بھی ہاتھ نہیں لگاؤ گے ابن

ساباط نے اسی لہجے میں کہا۔“

بوڑھے نے اپنا ہاتھ اس کے کندھے پر رکھ کر نرم لہجے میں کہا ”فکر نہ کرو اجنبی! تم یہاں

محفوظ ہو ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔“ بوڑھے کے اس جواب کو بھی ابن سباباط نے فریبی

ہتھکنڈے پر محمول کیا اور اس کا ہاتھ پرے جھٹک دیا۔

”تم یہیں ٹھہرو میں ابھی آتا ہوں۔“ بوڑھا یہ کہہ کر دروازے کی طرف بڑھا اور قبل اس

کے کہ ابن سباباط اسے پکڑتا یا باز رکھتا وہ کمرے سے باہر نکل چکا تھا۔ ابن سباباط کسی آنے والے

خطرہ کا احساس کر کے ہوشیار ہو گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ بوڑھا پھر نمودار ہوا۔ اب اس کے ہاتھ میں

ایک بڑا سا دودھ بھرا پیالہ تھا۔ بوڑھے نے وہ پیالہ اسے پیش کرتے ہوئے کہا:

”میرا خیال ہے تم بھوکے بھی ہو مجھے افسوس ہے کہ جلدی میں صرف دودھ ہی مل سکا۔“

ابن سباباط اس پر چونک سا گیا کہ یہ دودھ کہاں سے لے آیا، کہیں یہ اس گھر کا مالک تو نہیں، مگر اس

نے خود ہی اس کی تردید کر دی کہ اگر وہ مالک مکان ہوتا تو کمرے سے باہر جا کر اکیلا واپس کیوں

آتا۔ اسے تو ساتھ محلے داروں کو لے کر آنا چاہئے۔

یہ بوڑھا یقیناً چور ہے مجھ سے پہلے آیا ہوگا مجھے داخل ہوتے دیکھ کر چھپ گیا ہوگا اور اب اس طرح مجھے خوش کرنا چاہتا ہے..... یہ خیال آتے ہی وہ مسکرایا۔ دل میں برتری کا احساس آتے ہی اس نے بوڑھے کی طرف ناک سکوڑ کر دیکھا اور پیالہ اس طرح اس کے ہاتھ سے چھنتے ہوئے جیسے وہ اس کا غلام ہو دودھ غٹا غٹ پی گیا۔ بوڑھے نے اس کی طرف غور سے دیکھا تو سہی مگر کوئی خاص تاثر نہ لیا بلکہ آگے بڑھ کر گٹھڑ کے کونوں کو پکڑتے ہوئے کہا ”آؤ اسے مل کر باندھ لیں“

”مگر تم کون ہو؟“ ابن سبابا نے یہ سوچ کر کہ کہیں یہ بعد میں تکرار کرنے نہ لگ جائے اس سے کہا۔

”میں کوئی بھی ہوں تمہیں اس سے سروکار نہیں رکھنا چاہئے میں ہر حالت میں تمہارا مددگار ہوں۔“

”ہوں ابن سبابا نے کندھوں کو جھٹکا دے کر ہونٹوں کو سکوڑتے ہوئے کہا۔

”میرے مددگار کہاں میں اور کہاں تم..... ابن سبابا تو تم جیسوں کو چٹکیوں میں مسل سکتا ہے جانتے ہو ابن سبابا کو۔“

ابن سبابا کا نام سن کر بوڑھا چونک پڑا۔

”اچھا تو تم ابن سبابا ہو خیر کوئی بھی ہو مجھے کیا غرض میں تمہیں پریشان دیکھ رہا ہوں آؤ گٹھڑ باندھ لیں۔“

ابن سبابا نے ایک بار پھر جائزہ لیا۔ واقعی وہ بوڑھے کی امداد کا طلبگار تھا۔ بوڑھے کی یاد دہانی پر اس نے اسے گھور کر دیکھا اور پھر اس کے ساتھ مل کر گٹھڑ باندھنا شروع کر دیا۔ گٹھڑ باندھ گیا اب وہ اسے اکیلا اٹھا نہیں سکتا تھا۔

”گھبرانے کی ضرورت نہیں تم یہ گٹھڑ میری پیٹھ پر لاؤ تم جہاں کہو گے میں وہیں پہنچا دوں گا۔“ بوڑھے کی پیشکش ابن سبابا کو بہت غنیمت محسوس ہوئی مگر پھر اس نے سوچا کہ کہیں یہ بوڑھا اسے فریب تو دینا نہیں چاہتا۔ تو پھر کیا ہے یہ بھلا فریب کیا دے سکتا ہے۔ اس نے بوڑھے کی طرف دیکھا اور چہرے کو پڑھنے کی کوشش کی مگر اس کا چہرہ کسی قسم کے جذبات سے بھی عاری نظر آیا۔ یہ بھی تو چور ہے کیا اسے اپنا ڈر نہیں ہے اور اس نے فریب کے خیال کو دل سے نکال دیا۔

”کیا سوچ رہے ہو اجنبی! دیر نہ کرو“ ابن سبابا نے پھر اس غیبی مددگار کی طرف دیکھا۔

میں منزل پر پہنچ کر اسے بھی دو چار تھان دے دوں گا۔ اس نے اپنا ایک ہاتھ گٹھڑ کی طرف بڑھایا اور بوڑھے نے اس کی مدد سے یہ گٹھڑ اپنی پیٹھ پر لاد لیا۔ بوڑھا آگے آگے جا رہا تھا اور ابن سباباط پیچھے پیچھے چلتا ہوا اسے راستہ بتاتا جا رہا تھا۔ اب وہ گھر سے باہر نکل کر ایک گلی سے گزر رہے تھے۔ بوڑھا ایک جگہ ٹھوکر کھا کر گرتے گرتے بچا تو ابن سباباط نے غصے سے کہا:

”ہوش سے چلو سیدھا راستہ دیکھتے جاؤ۔“

”میں تو صحیح راہ پر چل رہا ہوں“ بوڑھے نے بدقت کہا ”تم بھی تو صحیح راہ دیکھ کر چلو بعض راہیں تو انسان کو سچ مچ ختم کر دیتی ہیں۔“

ابن سباباط کو جلدی تھی وہ بھلا ان باتوں پر کیونکر غور کرتا اس نے کہا:

”باتیں بنانا خوب جانتے ہو“

”ناراض نہ ہو اجنبی! میں یہ بوجھ ہر صورت تمہاری منزل پر پہنچا کر ہی دم لوں گا۔“ یہ کہہ کر بوڑھے نے اپنی رفتار پہلے کی نسبت تیز کر دی مگر شہر سے نکل کر تھوڑا سا آگے جا کر ہی اس کی ہمت نے جواب دینا شروع کر دیا۔ ایک تو بڑھاپے اور ضعف کا تقاضا تھا دوسرا بوجھ بھی زیادہ تھا۔ آخر ایک جگہ ٹھوکر کھا کر وہ لڑکھڑایا اور گر پڑا تو ابن سباباط نے ایک ہاتھ اسے رسید کر دیا اور ساتھ ہی زبان سے مغالطات کا طوفان اُبل پڑا۔

”بس اتنے ہی برتے پر چوریاں کرتے ہو کچھ دم خم تو ہونا چاہیے مجھے دیکھ کر تم اپنی چوری بھول گئے تھے میں اگر چاہتا تو وہیں تمہارا گلا گھونٹ سکتا تھا۔“

”خفا نہ ہو اجنبی“ بوڑھے نے دوبارہ بوجھ کو کمر پر اٹھاتے ہوئے کہا ”بوڑھا آدمی تھا گر پڑا اب ایسی غلطی نہ ہوگی۔ بوڑھے سے چلا نہیں جاتا تھا مگر وہ چل رہا تھا۔ جہاں ذرا بھی اس کی رفتار سست ہو جاتی یا وہ لڑکھڑانے لگتا تو ابن سباباط گالیاں بکنے لگتا۔ وہ بوڑھے پر اس طرح رعب جما رہا تھا جیسے یہ اس کا پیدائشی حق ہو۔ بعض اوقات وہ دو چار ہاتھ بھی جھاڑ دیتا۔ بوڑھا کانپ رہا تھا سانس پھولی ہوئی تھی قدم ڈمگائے جا رہے تھے اور اٹھائے سے نہیں اٹھتے تھے مگر ابن سباباط اسے آگے بڑھنے اور تیز ہونے کی تلقین کر رہا تھا۔ آخر اس کی منزل آگئی یہ ایک چھوٹا سا مکان تھا جو کسی زمانہ میں ابن سباباط اور اس کے گروہ کا اڈا رہا تھا۔ یہاں پہنچ کر اس کے اشارے پر بوڑھے نے بوجھ کو اتار دیا۔ ابن سباباط نے دو تین تھان گٹھڑ کھول کر نکالے اور بوڑھے کی طرف بڑھا دیئے

”لو یہ ہے تمہارا انعام!“

”نہیں تم انہیں بھی اپنے پاس ہی رکھو مجھے افسوس ہے کہ میں اور کوئی تمہاری خدمت نہ کر سکا، تم پہنچے ہی اس وقت تھے جب میں کسی خدمت سے قاصر تھا۔ خیر میرے پاس جو کچھ بھی تھا، میں نے وہ تمہیں دینے سے گریز نہیں کیا۔ ہاں اگر میری ذات سے تمہیں کوئی تکلیف پہنچی تو معاف کر دینا، میں بوڑھا آدمی تھا۔“

بوڑھا یہ سب کچھ کہے جا رہا اور ابن سابط حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے خاموش ہوتے ہی کہا ”تو کیا تم.....!“

بوڑھے نے بات کاٹ دی۔ ہاں میں ہی مالک مکان ہوں، فکر نہ کرو، یہ تھان تمہارے ہیں اور تمہارے ہی رہیں گے، میں نے یہ خود تمہیں دیئے ہیں، ہو سکتا ہے تم مجھ سے زیادہ ضرورت مند ہو گے۔ چلو خدا نے تمہاری ضرورت پوری کر دی۔ اچھا اب میں جاتا ہوں میری کوتاہیوں کو معاف کر دینا۔“

یہ کہہ کر قبل اس کے کہ ابن سابط کچھ کہتا، بوڑھا تیزی سے واپس مڑا اور تھوڑا سا آگے جا کر رات کی تاریکی میں گم ہو گیا۔



ابن سابط رات بھر نہیں سو پایا تھا، وہ رات بھر خیالات کی وادیوں میں بھٹکتا رہا تھا، اس کا ضمیر جسے مجرمانہ زندگی نے بے حس کر دیا تھا اب پھر بیدار ہو رہا تھا۔ اس کے دل میں ایک کشمکش سی جاری تھی، نور و ظلمت، حق و باطل، نیکی و بدی، اچھائی اور برائی کی انوکھی کشمکش، اس کا دل سلگ رہا تھا۔ بوڑھے کے طرز عمل نے ابن سابط کو بیدار کر دیا تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ اس دنیا میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو اپنے ہاتھوں سے ہی اپنا مال دوسروں کے حوالے کر دیں۔ دوسروں کو مسکراتے دیکھنے کیلئے اپنے لبوں کی مسکراہٹ چھین لیں، دوسروں کو خوش و خرم دیکھنے کیلئے اپنی کائنات پر سے ہاتھ اٹھا لیں، دوسروں کی ضروریات کو اپنی حاجات پر مقدم رکھیں۔ اس کے اندر جوار بھانا سا اٹھ کھڑا ہوا تھا، پر وہ اس کے سامنے سے ہٹ چکا تھا۔ گذشتہ مجرمانہ زندگی کا ایک ایک لمحہ اور ایک جزئیہ اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم رہا تھا، اسے اپنی گذشتہ زندگی قابل نفرت دکھائی دے رہی تھی۔ گذشتہ کردار قابل مذمت معلوم ہو رہا تھا، وہ جس مقام پر تھا وہ مقام نیچے سے کھسکتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اب اس نے بوڑھے کو تلاش کرنے کا ارادہ کر لیا تھا تا کہ اس سے معافی مانگ سکے۔ چنانچہ نور کے تڑکے ہی وہ شہر کی جانب روانہ ہو گیا۔

شہر کے قریب پہنچ کر اسے ایک بڑی سی مسجد دکھائی دی اور اس کے قدم بے اختیار مسجد کی

طرف اٹھ گئے مگر یہ کیا اسے اپنی قوت بصارت پر دھوکا ہو رہا تھا۔ اس نے آنکھیں مل مل کر دیکھا وہی رات والا بوڑھا اب منبر پر کھڑا تھا اسکی حیرانی کی کوئی انتہاء نہ رہی۔ اس نے پاس بیٹھے ہوئے ایک شخص سے دریافت کیا۔

”یہ کون شخص ہے؟“

”کیا تم نہیں جانتے باہر سے آرہے ہو کیا؟ انہیں تو سارا علاقہ جانتا ہے یہ قاضی القضاة شیخ وقت سیدنا جنید بغدادی (رحمۃ اللہ علیہ) ہیں“ اس شخص نے کہا۔

”کیا کہا سیدنا جنید بغدادی افوہ توبہ“

”ہاں ہاں خاموش بیٹھو سننے بھی دو گے یا نہیں“۔ وہ شخص یہ کہہ کر وعظ سننے میں مشغول ہو گیا۔

سیدنا جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے ابن سابط کو مسجد میں داخل ہوتے دیکھ لیا تھا وہ کہہ رہے تھے:

”ہر انسان بدی کا ارتکاب کے وقت کچھ نہ کچھ شرم ضرور محسوس کرتا ہے لیکن ایک شخص گناہ

کا ارتکاب ثواب سمجھ کر اسی وقت کرتا ہے جب اس کا ضمیر اس کے ناپاک خیالات کے ہاتھوں دم توڑ

چکا ہو مگر ضمیر کی یہ موت دائمی نہیں بلکہ عارضی ہوتی ہے جس طرح ساکن اور پرسکون سمندر میں

ایک پتھر پھینکنے سے دور دور تک ہلچل مچ جاتی ہے اسی طرح بعض اوقات ایک چھوٹا سا واقعہ ہی غیر

معمولی بن کر ضمیر کی بیداری کا باعث بن کر اس کی زندگی میں ہلچل مچا دیتا ہے۔ ضمیر کی موت اس

وقت ہوتی ہے جب انسان معاشرہ اور قانون کی نظروں میں ذلیل ہو چکا ہو مگر ضمیر کی دوبارہ بیداری

اسی انسان کو اپنی نظروں میں ذلیل کر دیتی ہے اب وہ خود کو سب سے بڑا مجرم تصور کرنے لگتا ہے۔“

شیخ کے یہ الفاظ ابن سابط کے دل میں اترتے جا رہے تھے یہ الفاظ اس کی ساری زندگی کی

تفسیر تھے اس کی کائنات کی تصویر تھے اور اس کے جرم و گناہ کا آئینہ تھے اسے یوں محسوس ہو رہا تھا

جیسے دل کی کثافت دور ہوتی جا رہی ہو گناہوں کی سیاہیاں دھل رہی ہوں اور ضمیر جلا پارہا ہو۔

.....○.....

ادھر شیخ فرما رہے تھے:

”ہر طرف سے ذلیل ہو جانے پر اسے کوئی سہارا دکھائی نہیں دیتا جو اس کی مایوس زندگی کو

تسکین دے سکے اور اس کے درد کا درماں بن کر اس کے زخموں پر مرہم رکھ سکے مگر ایک سہارا ہے اور

وہ ہے رب اکبر کا جو ٹھکرائے ہوئے انسانوں کو بھی قوت اعجاز عطا فرما دیتا ہے جو مایوس انسانوں کی

میسائی کرتا ہے۔ لا تقنطوا من رحمۃ اللہ۔ خدا کی رحمت کے دروازے ہر وقت کھلے ہیں ہر کوئی

وہاں جا کر پناہ لے سکتا ہے، ہر گنہگار احساس گناہ سے چھٹکارا پا سکتا ہے، ہر مجرم احساس جرم کو بھول سکتا ہے خواہ وہ کوئی سیاسی مجرم ہو یا سماجی، قانونی مجرم ہو یا غیر قانونی اور خواہ..... وہ ابن سباباط ہی نہ ہو۔
”بس کیجئے شیخ بس کیجئے“۔ اب ابن سباباط میں یارائے ضبط نہ رہا تھا، شیخ نے اسے اپنی منزل سے آشنا کر دیا تھا، اب وہ وہی سے پھٹ پڑا تھا، اس کی زوردار آواز میں لرزش تھی، وہ آہستہ آہستہ بڑھتا ہو شیخ کے قریب پہنچ گیا اور اس نے شیخ کے دامن کو پکڑ لیا، جیسے مجرم نے عدالت میں کھڑے ہو کر عصائے انصاف کو تھام رکھا ہو.....

تمام حاضرین کی نظریں اس کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ یہ ابن سباباط تھا۔ بغداد کا ہاتھ کٹا شیطان جسے معاشرہ کی نفرت راہ راست پر نہ لاسکی تھی، جسے قانون کا خوف ارتکاب جرم سے باز نہ رکھ سکا تھا، جسے جیل کے شدائد صحیح انسان نہ بنا سکے تھے، جسے وحشیانہ ظلم و ستم بھی منزل آشنا نہ کر سکے، اب وہ شیخ کے قدموں پر پڑا ہوا سسک رہا تھا جیسے معصوم بچہ ماتا کا متلاشی ہو کر ماں کے قدموں میں لوٹ رہا ہو۔

”میں کیا کروں، شیخ! میں کیا کروں“ ابن سباباط کے آنسو آنکھوں سے نکل فرش پر بہ رہے تھے۔

”صبح کا بھولا شام کو گھر واپس آ جائے تو وہ بھولا نہیں ہوتا اور خدا کا دامن رحمت تو بھی تنگ نہیں ہے“۔ شیخ نے یہ کہتے ہوئے ابن سباباط کو فرش سے اٹھا کر گلے سے لگا لیا اور ابن سباباط کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کی بے قرار زندگی کو قرار آ گیا ہو۔

یہ دُکھ درد کی برکھا پیارے دین ہے تیرے داتا کی
شکر نعمت بھی کرتا جا، دامن بھی پھیلاتا جا



شمع ولایت

حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ

حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ کا شمار ان فرزندان روزگار میں ہوتا ہے جو زبان کی تاثیر اور کردار کی عظمت سے بے شمار انسانوں کو خدا شناسی کا شعور عطا کر گئے۔ عوام الناس آپ کے مواعظ حسنہ سنتے اور ان کی تاثیر سے خدا اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں گم ہو جاتے۔ آپ دنیا میں رہے مگر دنیا سے بیگانہ رہے، آپ کا کردار عظمت اسلام کی تصویر تھا، آپ کی ایک ایک بات شوکت اسلام کا حسن لئے ہوتے تھے، جو بھی آپ کی مجلس میں آتا ہمیشہ ہمیشہ کیلئے آپ کا ہو جاتا۔ اعلائے کلمۃ الحق کیلئے آپ نے شاہوں کے جلال کی پرواہ نہ کی بلکہ جگہ جگہ خدائے کریم کی عظمت و جلالت کا درس دیا۔

یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ جو خدا کا ہو جاتا ہے خدا بھی اسی کا ہو جاتا ہے۔ خدائے کریم کی رحمت و عنایات کی بدولت اس کا شمار بندگان خاص میں ہونے لگتا ہے۔ حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ نے اس طرح اپنے خالق سے محبت کی کہ رب دو عالم کی عنایات کی تصویر بن گئے۔ آپ سے درجنوں کرامات مروی ہیں۔ کوئی بھی تاریخ تصوف آپ کے ذکر جمیل اور آپ کے محاسن کا تذکرہ کئے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔

اصحاب سیر و تاریخ کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ ایک ویرانہ سے گزر رہے تھے کہ انہوں نے ایک شخص کو درخت پر ٹکلتا ہوا دیکھا، یہ شخص کہہ رہا تھا ”اے نفس اطاعت حق میں میری مدد کر ورنہ میں تجھے بھوک اور پیاس سے دم توڑنے پر مجبور کر دوں گا“۔ یہ حال دیکھ کر حضرت پر گریہ و بکا کا عالم طاری ہو گیا۔ اُس شخص نے حضرت کے رونے کی آواز سنی تو کہا ”کون ہے جو ایسے شخص پر رحم کھاتا ہے جسے شرم کم ہے اور جس کے گناہ زیادہ ہیں“۔

آپ نے آگے بڑھ کر اسلام کرنے کے بعد دریافت کیا ”یہ کیا حال ہے؟“ اُس نے جواب دیا ”میرا جسم اب حق تعالیٰ کی عبادت میں میرا ساتھ نہیں دیتا بلکہ لوگوں کے ساتھ میل جول کا

خواہش مند رہتا ہے۔ یہ سن کر حضرت نے فرمایا ”آپ بہت بڑے زاہد ہیں۔“ اُس شخص نے کہا ”مجھ سے بڑا زاہد دیکھنا چاہتے ہیں تو پہاڑ پر تشریف لے جائیں۔“

حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ پہاڑ پر چڑھے تو وہاں ایک نوجوان کو اس حال میں دیکھا کہ اُس کا ایک پاؤں کٹیا سے باہر تھا اور دوسرا کٹیا کے اندر تھا اور کٹیا سے باہر والے پیر میں کیڑے پڑے ہوئے تھے۔ دریافت کرنے پر اُس نوجوان نے بتلایا ”میں اس کٹیا میں تیس سال سے مصروف عبادت تھا کہ اچانک ایک روز ایک عورت ادھر سے گزری جسے دیکھ کر میں کٹیا سے باہر نکلا۔ لیکن ابھی کٹیا سے ایک ہی پاؤں باہر رکھا تھا کہ آواز آئی ”کیا تجھے شرم نہیں آتی کہ تیس سال اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے کے بعد اب شیطان کی اطاعت کرنا چاہتا ہے۔“ یہ آواز سن کر میں نے اپنا پاؤں کاٹ ڈالا۔“ میں گنہگار ہوں لیکن اگر آپ کسی مرد با خدا سے ملنا چاہتے ہیں تو سامنے والے پہاڑ پر چڑھ جائیے۔“

حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ میں بلندی کے پیش نظر پہاڑ پر تو نہ چڑھ سکا لیکن جب اُس نوجوان سے اُس بزرگ کا حال دریافت کیا تو اُس نے بتلایا ”اُس شخص نے عہد کیا تھا کہ وہ کوئی ایسی چیز نہ کھائے گا جس میں مخلوق کی محنت شامل ہو چنانچہ اللہ کے حکم سے شہد کی کھیاں آکر اُس کے منہ میں شہد پکا جاتی ہیں۔“ حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ اُس واقعہ کو سن کر اس نتیجے پر پہنچے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کا ہو رہتا ہے اور اس پر بھروسہ کرتا ہے اللہ تعالیٰ خود اس کی کار بر آری فرماتا ہے۔

کچھ مدت کے بعد ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ ایک ندی کے کنارے پہنچے جہاں ایک قصر عالی شان بھی تھا۔ آپ وضو کر رہے تھے کہ محل کی چھت پر ایک حسین عورت کھڑی ہوئی نظر آئی۔ آپ نے اُس سے دریافت کیا ”تو کون ہے؟“ اُس نے جواب دیا ”اے ذوالنون! جب میں نے دور سے تجھے دیکھا تھا تو سمجھی تھی کہ کوئی دیوانہ ہے جب تو قریب پہنچا تو میں نے تجھے کوئی عالم سمجھا لیکن جب تو اور بھی قریب آ گیا تو خیال کیا کہ تو کوئی عارف ہے لیکن اب معلوم ہوا کہ نہ تو دیوانہ ہے اور نہ عالم و عارف ہے کیونکہ دیوانے وضو نہیں کیا کرتے عالم نامحرم کو نہیں دیکھتے اور عارف غیر اللہ کی طرف رجوع نہیں کرتے۔“ یہ کہہ کر وہ حسینہ نظروں سے غائب ہو گئی۔ حضرت سمجھ گئے یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی جانب سے تھا۔

اس واقعہ نے حضرت کو دنیا سے بیزار کر دیا، آپ اسی وقت دریائے نیل کی طرف روانہ ہو گئے، دریا میں ایک کشتی پر متعدد لوگ سوار تھے، آپ بھی اس پر سوار ہو گئے۔ راستے میں معلوم ہوا کہ

کسی سوداگر کا ایک موتی گم ہو گیا ہے۔ لوگوں نے حضرت پر چوری کا شبہ کر کے مذاق اڑانا شروع کر دیا اور جب بات حد سے گزر گئی تو آپ نے فرمایا ”پروردگار! تو حقیقت حال اچھی طرح جانتا ہے“ ابھی زبان مبارک سے اسی قدر نکلا تھا کہ بے شمار مچھلیاں اپنے منہ میں آبدار موتی لئے کشتی کے ارد گرد تیرنے لگیں اور آپ نے ایک موتی لے کر اُس شخص کو دے دیا۔

ایک نوجوان ہمیشہ صوفیائے کرام کے اعلیٰ مراتب اور ناشناسی سے انکار کیا کرتا تھا، اس کے باوجود حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں اکثر حاضر ہوا کرتا تھا۔ ایک روز حضرت نے اُسے ایک انگٹھی دے کر فرمایا ”نان بانی کی دکان پر ایک دینار میں رہن رکھ کر روٹیاں لے آؤ“۔ وہ نوجوان جب نان بانی کی دکان پر گیا تو اُس نے اُس انگٹھی کو ایک درم دینے سے زیادہ قیمت میں رہن رکھنے سے انکار کر دیا۔ نوجوان نے جب واپس آ کر اطلاع دی تو آپ نے فرمایا ”اسے کسی جوہری کے پاس لے جا کر اس کی قیمت کا اندازہ کر کے اطلاع دو“۔ جوہری نے اُس کی قیمت کا تخمینہ ایک ہزار دینار کیا اور جب یہ نوجوان دوبارہ حاضر خدمت ہوا تو حضرت نے فرمایا ”صوفیوں کی حقیقت شناسی کے سلسلہ میں تیری حالت بھی نان بانی جیسی ہے“۔ وہ نوجوان حضرت کے اس ارشاد سے بے حد متاثر ہوا اور اسی وقت اپنے انکار سے تائب ہو گیا۔

جب حقیقت شناسی میں آپ کے مراتب بلند ہوئے اور آپ پر جذب کی کیفیت طاری رہنے لگی تو اہل مصر نے آپ کو بے دین قرار دے کر خلیفہ وقت کے پاس آپ کی شکایت کی اور اُس نے آپ کو پایہ زنجیر دربار میں لانے کا حکم دیا۔ اس حال میں جب آپ کو خلیفہ کے روبرو حاضر کیا گیا تو ایک ضعیف خاتون نے آگے بڑھ کر کہا ”ذوالنون مصری (رحمۃ اللہ علیہ) خبردار اس آدمی سے بالکل نہ ڈرنا، یہ بھی تیری ہی طرح خدا کا بندہ ہے اور جب تک اللہ تعالیٰ نہیں چاہتا کوئی شخص کسی کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا“۔

خلیفہ وقت متوکل علی اللہ نے حضرت کو قید خانہ بھجوا دیا جہاں آپ چالیس روز تک قید رہے۔ ان دنوں میں حضرت بشرحانی رحمۃ اللہ علیہ کی ہمیشہ روزانہ ایک روٹی قید خانہ میں پہنچا دیتی تھیں لیکن چالیس روز کے بعد آپ کو باہر نکالا گیا تو تمام روٹیاں موجود تھیں اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ روٹیاں حلال روزی سے تیار کی گئی ہیں اور بے منت حاصل ہوئی ہیں آپ نے انہیں صرف اس لئے نہیں کھایا تھا کہ انہیں سپاہیوں کے ہاتھ لگے تھے۔

حضرت نے ایک بار یہ واقعہ بیان فرمایا ”میں نے ایک اعرابی کو ایک ایسی حالت میں بیت

کا طواف کرتے ہوئے دیکھا اُس کے جسم کی ہڈیاں ہی ہڈیاں نظر آتی تھیں۔ میں نے اُس دریافت کیا کیا ”آپ کا محبوب آپ کے نزدیک ہے۔“ جواب دیا ”بے شک“ پھر میں نے پوچھا کیا وہ موافق ہے؟“۔ انہوں نے کہا ”ہاں موافق ہے۔“ میں نے کہا ”سبحان اللہ۔ تمہارا محبوب نزدیک بھی ہے اور موافق بھی ہے اور تم اس قدر نحیف و کمزور ہو“ یہ سن کر انہوں نے ترش روئی سے کہا ”واقف انسان کیا تمہیں معلوم نہیں ہے کہ قرب اور موافقت کی گرمی بعد اور مخالفت کے عذاب سے ہزار گنا زیادہ ہوتی ہے۔“

اسی طرح آپ نے یہ واقعہ بھی بیان فرمایا ”میں نے ایک بار ایک عورت سے محبت کے بارے میں سوال کیا تو اُس نے کہا ”محبت کی کوئی حد اور انتہا نہیں ہے کیونکہ محبوب کی بھی کوئی انتہا نہیں ہے۔“ ایک مرتبہ حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ سفر کرتے ہوئے جنگل میں پہنچ گئے جو برف سے ڈھکا ہوا تھا اور وہاں ایک آتش پرست سر پر کپڑا ڈالے دانہ بکھیر رہا تھا۔ حضرت کے دریافت کرنے پر اُس نے کہا ”برف باری کے باعث آج پرندوں کو دانہ نہیں ملے گا“ میں اُن کیلئے دانہ بکھیرا ہوں۔“ حضرت نے فرمایا ”وہ غیر کا بکھیرا ہوا دانہ کیوں منظور کریں گے؟“۔ اُس نے کہا ”اگر منظور نہیں کریں گے تو دیکھیں گے تو ضرور اور میرے لئے اسی قدر کافی ہے۔“

پھر فرمایا اسی سال جب میں حج بیت اللہ کو گیا تو میں نے دیکھا کہ وہی آتش پرست نہایت شوع و خضوع کے ساتھ طواف بیت اللہ میں مصروف ہے۔ اُس نے مجھے دیکھ کر کہا ”ابوالفیض! آپ نے دیکھا کہ اُس نے کس طرح میرے بکھیرے ہوئے دانہ کو دیکھا اور قبول کیا“ وہ بیچ پھل لایا ہے اُس نے مجھے اپنی قبولیت سے نوازا ہے اور اپنے گھر تک پہنچایا ہے۔ حضرت نے فرمایا ”مجھے یہ حال دیکھ کر خوشی ہوئی لیکن میں نے کہا ”اللہ تعالیٰ! تو نے ایک مٹھی دانہ کے عوض میں اُس آتش پرست کو اپنی قبولیت کا شرف بخشا“ یہ سودہ بہت سستا نظر آتا ہے۔“ فوراً ہی غیب سے آواز آئی ”اللہ تعالیٰ جس شخص کو اپنے قریب بلاتا ہے تو کسی سبب اور علت سے نہیں بلاتا ہے۔ وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے اور تمہاری عقل اُس کی کارساز یوں تک نہیں پہنچ سکتی۔“

آپ کا قول تھا ”سب سے سخت حجاب نفس کی دید ہے۔“

”حکمت اس معدہ میں قرار نہیں پکڑتی جو طعام سے پر ہو۔“

”گناہ سے باز رہے بغیر استغفار کرنا“ جھوٹوں کی توبہ کی طرح ہے۔“

”بدن کی صحت تھوڑا کھانے اور روح کی صحت تھوڑا گناہ کرنے پر موقوف ہے“

”ایسے شخص پر تعجب نہیں کرنا چاہئے جو مصیبت پر صبر کرتا ہو بلکہ تعجب اُس پر کرنا چاہئے کہ جو مصیبت پر رضا مند ہو۔“

”لوگ جب تک ڈرتے رہتے ہیں تو کام کرتے ہیں اور جب دلوں سے ڈرنکل جاتا ہے تو گمراہ ہو جاتے ہیں۔“

”بندہ پر اللہ تعالیٰ کے ناراض ہونے کی علامت یہ ہے کہ وہ درویشی سے ڈرنے لگتا ہے۔“

”آدمی پر چھ باتوں سے تباہی آتی ہے۔“

۱۔ آخرت کے عمل میں نیت کی کمزوری سے۔

۲۔ تنہائی میں شیطان کی اطاعت سے

۳۔ موت پر یقین رکھنے کے باوجود لمبی چوڑی امیدیں قائم کر لینے سے

۴۔ مخلوق کی رضا جوئی کو اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی پر ترجیح دینے سے

۵۔ حرص میں مبتلا ہونے اور سنت نبوی کو ترک کر دینے سے

۶۔ اور گذشتہ لوگوں کی لغزشوں کو اپنی لئے حجت قرار دینے سے آدمی تباہ ہو جاتا ہے۔

حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ جب مرض الموت میں مبتلا ہوئے تو آپ سے دریافت کیا گیا ”آپ کو کس چیز کی آرزو ہے؟“۔ تو ”فرمایا موت سے پہلے اگر ایک لمحہ کی بھی فرصت مل جائے تو میں اسی کو غنیمت سمجھوں گا۔“

اسی عالم میں ایک روز بیہوش رہنے کے بعد آپ کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ کا جب جنازہ اٹھایا گیا تو شدید گرمی تھی لیکن اللہ تعالیٰ کے حکم سے پرندوں کا ایک جم غفیر نمودار ہوا اور اپنے پروں کے سایہ میں حضرت کے جنازہ کو قبرستان پہنچایا۔ کہا جاتا ہے کہ راستے میں جب مؤذن نے کسی مسجد میں اذان دی اور کلمہ شہادت پر پہنچا تو حضرت نے انگشت شہادت اٹھائی۔ لوگوں کو شبہ ہوا کہ حضرت بقیہ حیات ہیں لیکن جب پوری کوشش کے باوجود زندگی کی کوئی علامت دریافت نہ کی جاسکے تو حضرت کے جسمِ خاکی کو سپرد خاک کر دیا گیا۔

آپ کی وفات کے بعد جب اہل مصر کو آپ کا حقیقی مرتبہ معلوم ہوا تو انہیں بے حد ہمت ہوئی؟

موت کو سمجھے ہیں غافل اختتامِ زندگی ہے یہ شامِ زندگی صبحِ دوامِ زندگی



حضور داتا گنج بخش سیدنا علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ پانچویں صدی ہجری کئی سالوں کا سفر طے کر چکی ہے۔

غزنی کے نواح میں ایک بستی ہجویر کا رہنے والا مرد درویش سید علی ہجویری اپنے راہنمائے
طریقت سلطان المشائخ ابوالفضل الختلی رحمۃ اللہ علیہ کے حضور حاضر ہے۔ دیگر اصحاب ایمان بھی وہاں
جمع ہیں۔ اچانک حضرت ابوالفضل الختلی نے سعادت آثار سید علی ہجویری سے مخاطب ہو کر کہا:
”ہم نے تمہاری روحانی تربیت کا اہتمام کر دیا ہے۔ چند درویشوں کو ہمراہ لو اور ہندوستان
کے شہر لاہور میں جا کر وہاں ڈیرا لگاؤ اور اس مقام کو مرکز تبلیغ بنا کر چار سو ایمان و یقین کی روشنی سے
اجالا کر دو۔“

سید علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ نے مرشد کے حکم پر ادب سے سر جھکایا مگر ساتھ ہی یہ بھی عرض
کیا: ”بندہ نواز! خطہ لاہور میں ہی آپ مجھے کیوں بھیج رہے ہیں۔ وہاں تو میرے بزرگ روحانی
بھائی اور مرد کامل حضرت سید میراں حسین شاہ زنجانی رحمۃ اللہ علیہ پہلے ہی فرائض تبلیغ انجام دے
رہے ہیں۔“

حضرت ابوالفضل الختلی نے روحانی تمکنت سے جواب دیا:

”علی ہجویری! بحث چھوڑو اور لاہور کو منزل بنا کر روانہ ہو جاؤ، ہم تمہیں وہاں کیوں بھیج
رہے ہیں اس کا احساس تمہیں لاہور جا کر ہی ہوگا۔“

سید علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ نے پیر و مرشد کے حکم پر فوراً لبیک کہا۔ چند درویشوں کو ہمراہ لیا
اور لاہور کی جانب روانہ ہو گئے۔ جب لاہور کی شہر پناہ کے قریب پہنچے تو رات ہو چکی تھی۔ شہر پناہ
کے باہر ہی قیام کیا۔ صبح جب شہر پناہ کا مرکزی دروازہ کھلا تو اندر داخل ہوئے۔ دیکھا کہ سامنے سے
ایک جنازہ آرہا ہے جس کے ساتھ بڑی تعداد میں غمزوہ اور سوگوار اہل ایمان چل رہے ہیں۔ آپ

نے فوراً جنازے کو کندھا دیتے ہوئے جنازہ کے ساتھ چلنے والے ایک مرد ایمان سے پوچھا۔
”حضرت یہ کس کا جنازہ ہے؟“

اس صاحب ایمان نے کہا:

”یہ ولی کامل سید میراں حسین شاہ رحمۃ اللہ عنہ کا جنازہ ہے۔ گذشتہ روز آپ کا انتقال ہوا تھا اور آج ہم تدفین کیلئے انہیں قبرستان کی جانب لے جا رہے ہیں۔“
یہ جواب سنتے ہی سید علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ فرط حیرت سے گنگ ہو گئے۔ اپنے مرشد کامل کی بات یاد آگئی کہ حقیقت کا علم تمہیں لاہور جا کر ہی ہوگا۔ تقدیر اپنے فیصلے خود رقم کرتی ہے۔ مردانِ حق آگاہ سے تقدیر کے فیصلے مخفی نہیں ہوتے۔

.....O.....

لاہور تشریف لانے والے یہی سید علی ہجویری تھے جو آنے والے ادوار میں سلطان اقلیم ولایت مرکز جوڈوسخا اور داتا گنج بخش جیسے القاب سے مشہور ہوئے۔ آپ کا اسم گرامی سید ابوالحسن علی ہجویری تھا۔ آپ کی ولادت باسعادت ۱۰۴۰ھ میں غزنی کے نواح میں واقع ایک بستی ہجویر میں ہوئی۔ آپ نے ابتدائی تعلیم ہجویر میں حاصل کرنے کے بعد اعلیٰ دینی و روحانی تعلیم کی تکمیل کیلئے دُور دراز کے سفر کئے۔

.....O.....

علوم دینیہ کی تکمیل کر چکے تھے۔ تزکیہ نفس کیلئے باطنی اور روحانی توجہات کا احساس شدت سے ہونے لگا۔ غزنی میں آپ کا خاندان وہاں کے عوام و خواص کی عقیدت کا مرکز تھا۔ آپ کی والدہ ماجدہ بڑی خدارسیدہ خاتون تھیں۔ ان کا تعلق حسینی سادات سے تھا۔ والد محترم حسنی سادات سے تعلق رکھتے تھے۔ گویا آپ حسینی بھی تھے اور حسنی بھی۔ آپ کے ماموں تاج الاولیاء کے معزز لقب سے مشہور تھے۔ تذکرہ نگاروں نے آپ کے ذاتی اور خاندانی حالات کے بارے میں بڑے اختصار سے کام لیا ہے۔ آپ کی پیدائش اور تعلیم کا دور سلطان محمود غزنوی کی حکومت کا دور تھا۔ آپ نے اپنے زمانے کے جلیل القدر علماء و فضلاء اور مشائخ کی بارگاہ میں حاضری دی اور ان سے اکتساب فیض کیا۔ شام، عراق، بغداد، مدائن، فارس، کوہستان، آذربائیجان، طبرستان، خورستان، خراسان اور ماوراء النہر کے

Click For More Books

<https://archive.org/details/@zohaibhasanattari>

اسلامی مراکز سے اپنی علمی پیاس بجھائی۔ علوم و معارف کے سمندر پی جانے کے باوجود شوق علم کی بے تائیاں کم نہ ہوئیں۔

مرشد کامل کی تلاش میں آپ نے طویل سفر کئے۔ بالآخر آپ کی رسائی سلطان الاولیاء حضرت ابوالفضل بن حسن ختلی تک ہوئی جو سلسلہ جنیدیہ کے مردِ کامل تھے۔ اپنے شیخ ختلی کے بارے میں داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

”وہ صوفیاء متاخرین میں زینت اوتاد اور شیخ عباد ہیں۔ طریقت میں میری بیعت انہی سے ہے۔ تصوف میں حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب رکھتے تھے اور حضرت شیخ حضری کے رازدار مرید تھے۔“

حضور داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کا سلسلہ نسب و طریقت یوں ہے۔ آپ کا سلسلہ نسب آٹھویں پشت میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے جا ملتا ہے۔ شجرہ نسب یوں ہے:

سید علی ہجویری بن سید عثمان بن سید علی بن سید عبدالرحمن بن شاہ شجاع بن ابوالحسن علی بن حسن اصغر بن سید زید بن امام حسن بن علی المرتضیٰ حیدر کرار رضوان اللہ علیہم اجمعین۔

داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کا سلسلہ طریقت اس طرح سے ہے:

شیخ علی ہجویری مرید حضرت ابوالفضل الختلی مرید حضرت شیخ حضری، مرید شیخ ابوبکر شبلی، مرید حضرت جنید بغدادی، مرید حضرت شیخ سری سقطی مرید حضرت داؤد طائی، مرید حضرت حبیب عجمی مرید حضرت علی کرم اللہ وجہہ۔

”کشف المحجوب“ جو آپ کی تصنیف لطیف اور تعلیمات تصوف کے لحاظ سے ابدی شہرت رکھتی ہے، کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے مرشد کامل نے آپ کو اپنی نگاہ لطف و رحمت سے خوب خوب نوازا۔ شریعت میں آپ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مقلد تھے جس کا آپ نے متعدد مقامات پر ذکر فرمایا ہے۔ آپ جب لاہور تشریف لائے تو آپ کے ہمراہ آپ کے دو دوست شیخ احمد سرخسی اور شیخ ابوسعید ہجویری بھی تھے۔ جمعیت مختصر تھی، مقابلے میں کفر کی قوتیں صف آراء تھیں، جنہوں نے اپنے جادو اور باطل ہتھکنڈوں سے کام لے کر پنجاب بھر کو مرعوب کر رکھا تھا مگر داتا گنج بخش لفظ بھر کو بھی ہراساں نہ ہوئے، بلکہ لطف و رحمت سے کام لیتے ہوئے کفر زار ہند میں آوازہ حق بلند کرنے

کیلئے آمادہ عمل ہو گئے۔ ظاہری طور پر بے سرو سامان مگر عزائم میں سمندروں کی وسعت۔
ہوا تھی گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا تھا
وہ مردِ درویش جس کو حق نے دیئے ہیں اندازِ خسروانہ

.....O.....

تاریخ انسانیت ہو یا تاریخ تصوف، اشرارِ باطل ہمیشہ انوارِ مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم سے معرکہ
آرائی کیلئے میدان عمل میں اترتے رہے ہیں لیکن فتح انہی مردانِ حق کو نصیب ہوتی ہے جو رضائے الہی
کو اپنی سب سے بڑی قوت سمجھ کر میدان عمل میں اترتے ہیں۔ داتا گنج بخش سید علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ
نے دریائے راوی کے کنارے ڈیرہ جمایا، مسجد تعمیر کی، حجرہ بنایا، مصروف عبادت ہو گئے۔ اشرارِ باطل
آپ کو نقصان پہنچانے کے درپے ہو گئے، عوام الناس آپ کے حلقہٴ درس میں جوق در جوق آنے لگے۔
اسلام کے اُجالے پھیلنے لگے تو ہندو اور غیر مسلم قوتیں کھلم کھلا آپ کی دشمنی پر اتر آئیں۔

ان دنوں رائے راجو نامی جوگی نائب حاکم پنجاب تھا اور شعبدہ بازی میں بھی کمال درجہ مہارت
رکھتا تھا۔ حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ نے لاہور میں قیام فرمایا تو حسن اخلاق و کردار سے بہت
سے غیر مسلموں کو اسلام کی دولت سے مالا مال کر دیا۔ رائے راجو بھی آپ کا علم و عمل اور زہد و تقویٰ دیکھ
کر اسلام کی عظمت کا دل سے قائل ہوا اور آپ کے دست مبارک پر اسلام قبول کیا۔ رائے راجو کے
اسلام قبول کرنے کا واقعہ یوں ہے:

ایک دن ایک بوڑھی عورت حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کے پاس سے گزری۔ اس
عورت نے اپنے سر پر دودھ سے بھرا ہوا ایک برتن اٹھایا ہوا تھا۔ آپ نے اس عورت کو بلا کر فرمایا
کہ تم دودھ کی قیمت لے لو اور دودھ ہمیں دے دو۔ وہ عورت کہنے لگی کہ میں یہ دودھ نہیں دے سکتی۔
اس لئے کہ ہمیں یہ دودھ مجبوری کے باعث رائے راجو جوگی کو دینا پڑتا ہے۔ اگر اس کو نہ دیں تو پھر
اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہمارے جانوروں کے تھنوں سے دودھ کے بجائے خون نکلنے لگتا ہے۔ آپ
نے عورت کی یہ بات سنی تو مسکرائے اور فرمایا ”اگر تم یہ دودھ ہمیں دے دو گی تو اللہ تعالیٰ کے فضل و
کرم سے تمہاری گائے بھینس پہلے سے زیادہ دودھ دے گی اور جانوروں کے تھنوں سے خون نہیں
آئے گا“ چنانچہ اس عورت نے دودھ کا برتن آپ کے حوالے کر دیا۔ آپ نے اس دودھ میں سے

تھوڑا سا نوش فرمایا اور باقی دریا میں ڈال دیا۔ وہ بوڑھی عورت واپس اپنے گھر چلی گئی اور پھر جب شام کے وقت اس نے اپنے جانوروں کو دودھا تو جانوروں نے اس قدر زیادہ دودھ دیا کہ عورت کے گھر میں موجود تمام برتن دودھ سے بھر گئے۔ لیکن دودھ پھر بھی ختم نہ ہوا۔ آپ کی اس کرامت کی خبر جنگل میں آگ کی طرح ارد گرد کے تمام دیہات میں پھیل گئی اور لوگ دُور دراز کے دیہات سے اپنے جانوروں کے دودھ آپ کی خدمت میں لے کر آنا شروع ہو گئے۔ آپ یہ کرتے کہ جو بھی آپ کی خدمت میں دودھ لے کر آتا۔ آپ تھوڑا سا دودھ اس برتن سے پی لیتے اور باقی دودھ دریا میں ڈال دیتے پھر جب دودھ لانے والے گھر واپس جا کر اپنے اپنے جانوروں کو دوتے تو ان کے جانور پہلے سے بھی زیادہ دودھ دینا شروع ہو جاتے۔ اب کوئی بھی دودھ والا رائے راجو جوگی کے پاس دودھ لے کر نہ جاتا اور آپ کی خدمت میں حاضری دینے والوں کا تانتا بندھ گیا۔

اس بات کی خبر جب رائے راجو جوگی کو ہوئی تو وہ بہت پریشان ہوا اور آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا کہ آپ نے ہمارا دودھ تو بند کر دیا ہے۔ اب میں اسی لئے آپ کے پاس آیا ہوں کہ آپ کا کوئی اور کمال دیکھوں۔ آپ نے فرمایا میں کوئی جادوگر تو نہیں ہوں جو کمالات دکھاؤں۔ اس پر جوگی نے آپ کے سامنے کئی شعبدے اور کرشمے دکھائے۔ حتیٰ کہ وہ ہوا میں اُڑنے لگا۔ وہ ہوا میں اُڑ رہا تھا تو آپ نے اپنے نعل مبارک اس کی طرف پھینکے جو اوپر جا کر اس کے سر پر برسے لگے اور اسے لہولہان کر کے نیچے لے آئے۔ اس پر وہ آپ کے قدموں پر گر پڑا اور آپ کے دست حق پرست پر بیعت کر کے مسلمان ہو گیا اور آپ کے مریدین کی صف میں شامل ہو گیا۔ رائے راجو کا نام ”شیخ ہندی“ رکھا گیا۔ حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت میں رہ کر حضرت شیخ ہندی نے بہت سے فیوض و برکات سمیٹے اور ان کی اولاد حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کے مزار مبارک کی خدمت بجالاتی رہی۔ شیخ ہندی کی اولاد کا آپ کے مزار مبارک کا مجاور ہونا صدیوں تک جاری رہا۔ رائے راجو کا مسلمان ہونا تھا کہ آپ کے اسلامی فیوضات کے چشمے چاروں طرف اُبلنے لگے اور اسلامی پرچم پوری شان روحانیت کے ساتھ لہرانے لگا۔ یہ آپ کی نگاہ کیمیا اثر ہی کا فیضان تھا جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ:

آن ولی اک نظر سے خاک بھی اکسیر ہوتی ہے

ولی کی ہر ادا میں نور کی تاثیر ہوتی ہے

.....O.....

اور پھر چشم عالم نے اس مردِ خدا کی روحانی سرفرازی کا ایک اور حسین منظر دیکھا۔ آپ نے لاہور تشریف لاتے ہی دریائے راوی کے کنارے ڈیرا لگایا تھا۔ ساتھ ہی مسجد بھی تعمیر کی، سادہ اور دلکش مسجد کا اصل حسن تو ان سجدہ ہائے نیاز سے عبارت ہے جو عشاقِ سرمست کی پیشانیوں سے ٹپکتے ہیں۔ کچھ علماء نے اعتراض کیا کہ مسجد کا قبلہ درست نہیں ہے۔ آپ نے اس مسجد کی تعمیر کے وقت مزدوروں کی طرح کام کیا تھا۔ جوش و جذبے کے ساتھ سامانِ تعمیر کو اٹھاتے رہے تھے، مسجد ایک بڑے کمرے پر مشتمل تھی جس پر لکڑی کی چھت ڈالی گئی تھی۔

اس زمانے میں قطب نما نہیں تھے، جن سے سمت کے درست ہونے کا فوراً تعین ہو جاتا۔ اصحابِ تعمیر اور اہل علم کے اپنے اپنے پیمانے ہوتے تھے۔ چند ایک نے قبلہ کے درست نہ ہونے پر اعتراض کیا تو بات سرگوشیوں سے بڑھتے بڑھتے پھیلنے لگی۔ آپ بے خبر نہیں تھے، لوگوں کی زبانوں کا رُخ دیکھ رہے تھے۔ آپ ناراض بھی نہیں تھے، آپ کے خیال کے مطابق اگر لوگ اعتراض بھی کر رہے تھے تو حسن نیت کی بناء پر کر رہے تھے۔ آپ کے چند مریدوں نے عرض کیا ”یا حضرت! اب بات زیادہ پھیلنے لگی ہے“۔ آپ نے مسکرا کر فرمایا:

”جس شدت سے پھیل رہی ہے اس سے بھی زیادہ برق رفتاری سے بات ختم بھی ہو جائے گی“۔

جب مسجد ہر لحاظ سے مکمل ہو گئی تو آپ نے لاہور میں منادی کرا دی کہ تمام مسلمان ایک نماز اس نو تعمیر شدہ مسجد میں ادا کریں۔ لوگ جمع ہو گئے۔ علماء بھی تھے اور عوام الناس بھی، اذان ہوئی۔ اس کے بعد جماعت کھڑی ہوئی تو آپ نے خود امامت فرمائی۔ اختتام نماز کے بعد آپ نے فرمایا:

”کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ اس مسجد کا قبلہ درست نہیں ہے، دیکھو قبلہ کس طرف ہے“۔

آپ کے فرمان کے موجب تمام نمازیوں نے قبلہ کی طرف نگاہ اٹھائی تو مسجد سے کعبۃ اللہ صاف نظر آ رہا تھا۔ قدرت نے خطہ لاہور کی اس مسجد سے بیت اللہ تک کے تمام حجابات اٹھا دیئے تھے۔ لوگ انتہائی متعجب ہوئے کہ یہ کیسا باکمال ولی ہے کہ جس کے دعوے اور قول کی لاج رکھنے

Click For More Books

<https://archive.org/details/@zohaibhasanattari>

کیلئے رب کریم نے تمام حجابات اٹھا دیئے تھے۔ لوگوں نے معذرت کی تو آپ نے رب کریم کی عنایتوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے فرمایا:

ان اللہ علی کل شیء قدیر

بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے

آپ کی اس کرامت کی شہرت ایک آن میں ہر طرف پھیل گئی تو پہلے ہی گرویدہ تھے۔ اب ان کی عقیدت انتہاء کو چھونے لگی اور وہ بجا طور پر محسوس کرنے لگے کہ اس ولی حق آشنا کے بتلائے ہوئے راستے پر چل کر ہی وہ فلاح دارین کے حق دار بن سکتے ہیں۔

سچ ہے کہ:

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی آن نئی شان
گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان
فطرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے
دنیا میں بھی میزان قیامت میں بھی میزان

.....O.....

داتا گنج بخش سیدنا علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ کا پیغام چاروں طرف شمع نور کی طرح پھیلنے لگا۔ آپ نے عوام الناس کو جہالت کے اندھیروں سے نکال کر حق و صداقت کے راستے پر گامزن کیا۔ بتوں کے پوجنے والوں کو خدائے واحد کی عظمت کا شعور دیا۔ عشق مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم کی لازوال شمعیں روشن کیں۔ بتوں کے پرستاروں کو بتایا کہ تم ان کی بوجا کیوں کرتے ہو جو خود تمہارے ہاتھوں کے تراشے ہوئے ہیں۔ داتا گنج بخش ایک طرف تو کفرستان میں اسلام کی اذان سر بلند کر رہے تھے اور دوسری طرف ان جھوٹے صوفیوں اور دنیا کمانے والے علماء کے چہروں سے نقاب نوح رہے تھے اور انہیں سمجھا رہے تھے کہ حقیقی فقر وہی ہے جو قرآن اسلام اور اسوۂ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم سے عبارت ہے۔ اس طرح جو علم قرآن حکیم کے جلوۂ نور سے بھٹکا دے وہ علم نہیں عین جہالت ہے۔ فقر تصوف اور علم کے تمام راستے انوار خداوندی تک رسائی کے تمنائی ہیں اگر اس منزل حق سے منہ موڑ لیا جائے تو پھر جاہ طلبی اور دنیا پرستی ہی رہ جاتی ہے۔ آپ نے اپنے مواعظ اور ایمان

Click For More Books

<https://archive.org/details/@zohaibhasanattari>

آفریں تحریروں کے ذریعے علمائے حق اور حقیقی صوفیوں کو ایمان سے جنم لینے والے تصوف کے آداب سکھائے۔

سیدنا داتا گنج بخش صاحب تحریر و تصنیف بھی تھے۔ آپ نے متعدد کتب لکھیں جن کے نام درج ذیل ہیں:

۱۔ دیوان (جو آپ کے اشعار کا مجموعہ تھا)

۲۔ کتاب فقا و بقا

۳۔ اسرار الخلق والمؤفات

۴۔ کتاب البیان لاہل الحیان

۵۔ بحر القلوب

۶۔ الرعاۃ لحقوق اللہ

۷۔ منہاج الدین

۸۔ شرح کلام منصور الخلاج

لیکن ان گراں قدر کتب میں سے کوئی کتاب بھی اس وقت موجود نہیں۔ بعض کتابوں قلمی چوروں نے سرقہ کر لیں اور انہیں اپنی طرف منسوب کر دیا۔ اس کا ذکر داتا صاحب نے کشف المحجوب میں بڑی حسرت اور تاسف کے ساتھ کیا ہے اور دوسری کتب ویسے ہی ناپید ہو گئیں۔ اس وقت آپ کی تصانیف میں سے صرف ایک ہی یگانہ روزگار تصنیف موجود ہے جس کا نام ”کشف المحجوب“ ہے۔

”کشف المحجوب“ کی روحانی عظمت و فضیلت کے بارے میں یہی کہہ دینا کافی ہے کہ یہ حضور داتا گنج بخش سیدنا علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ جیسے عظیم المرتبت مردِ کامل کی تصنیف لطیف ہے۔ وہ سید علی ہجویری جو علم میں یگانہ اور عمل میں بے مثال تھے۔ ہر دور کے تذکرہ نگاروں مورخین، محققین، صوفیائے عظام اور علمائے کرام نے ”کشف المحجوب“ کی سر بلندیوں کو تسلیم کیا ہے اور اسے روحانیت و طریقت کا لازوال چشمہ تسلیم کرتے ہوئے اس کے مطالعہ کو اہل ایمان کیلئے سرمایہ نجات سے تعبیر کیا ہے۔

حضرت مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ اپنی مشہور کتاب ”نجات الانس“ میں حضرت داتا گنج بخش

رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

آپ عالم بھی تھے اور رموز حقائق کے عارف بھی تھے۔ کثیر التعداد مشائخ کی صحبت سے فیضیاب ہوئے اور آپ کشف المحجوب کے مصنف تھے۔ یہ کتاب فن تصوف کی متغیر اور مشہور کتب میں سے ہے۔ آپ نے اسی کتاب میں بے شمار لطائف و حقائق کو جمع کر دیا ہے۔

حضرت شیخ علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ کی بہت سی تصانیف ہیں۔ ان میں سے زیادہ مشہور و معروف کشف المحجوب ہے اور کسی کی جمال نہیں کہ اس پر اعتراض کر سکے یا تنقید کر سکے۔ علم تصوف میں یہ پہلی کتاب ہے جو فارسی زبان میں لکھی گئی ہے۔

”کشف المحجوب“ کے بارے میں سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے جو رائے دی ہے وہ تصوف و روحانیت کے حوالے سے اس شہرہ آفاق تصنیف کی سب سے بڑی گواہی ہے۔ آپ ”نوائد الفوائد“ میں لکھتے ہیں:

”جس کا کوئی مرشد نہ ہو اُسے اس کتاب کے مطالعہ کی برکت سے مرشد مل جائے گا۔“

.....O.....

برصغیر کی تاریخ پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام کا سورج جس وقت مشرق و مغرب دونوں طرف اپنی ضیا پاشیاں کر رہا تھا اس وقت ہندوستان کی فضا مہیب بادلوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ رب کریم نے داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ جیسی شخصیت کا انتخاب کر کے برصغیر کے مہیب بادلوں کو نور سحری میں تبدیل کر دیا۔ آپ نے لاہور وارد ہو کر ایک روحانی مرکز قائم کیا جہاں سے علم و فضل کی ایسی بارش ہوئی کہ پورا ہندوستان سیراب ہو گیا۔ سید علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ نے روحانیت کا درس زبانی اور تحریری ہر دو طریق سے دیا۔ آپ ایسا کیوں نہ کرتے آپ نے جن مخصوص سیاسی حالات اور معاشرتی پس منظر کو تبدیل کرنا تھا ان کیلئے دونوں ذرائع کا ہونا بہت ضروری تھا۔ آپ اپنے ان مقاصد کے حصول کیلئے جب لاہور کی جانب عازم ہوئے تو آپ کے پاس کھکتے سکے نہ تھے کہ ان کی جھنکار سنا کر کفار کو اپنی طرف مائل کر سکتے۔ مگر تاریخ گواہ ہے کہ آپ نے تھوڑے ہی عرصہ میں ہزاروں بلکہ لاکھوں غیر مسلموں کو حلقہ بگوش اسلام کیلئے وہ کام کیا جو سبکتگین کے حملے بھی نہ کر سکے۔ محمود غزنوی جیسے بلند حوصلہ انسان کی شمشیر خارا شکاف جس کی تکمیل نہ کر سکی۔ کیونکہ اسلام کی

اشاعت تلوار کی نہیں بلکہ عمل صالح کی مرہون منت ہے۔ وہی کام داتا گنج بخش جیسے درویش خدا مست نے کر دکھایا، خالی ہاتھوں کے ساتھ۔ فقط اپنے اسوۂ حسنہ اور علم و عمل کی شمشیر کے ساتھ کیونکہ:

وہی ہیں اولیاء جذبات و تسخر کرتے ہیں
عمل کے نور سے انسان کی تعمیر کرتے ہیں

.....O.....

سیدنا علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ اپنے اصل نام کے بجائے داتا گنج بخش کے لقب سے زیادہ مشہور ہیں۔ ”کشف المحجوب“ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ سے علم و حکمت کے جواہر چننے والے اصحاب فضیلت نے آپ کو آپ کی حیات ظاہری ہی میں اس لقب سے پکارنا شروع کر دیا تھا۔ اہل تحقیق نے اسی لقب کی وجہ یہ بھی بیان کی ہے حضرت سلطان الہند خواجہ خواجگان معین الحق والدین خواجہ محمد معین الدین چشتی اجمیری رحمۃ اللہ علیہ حضرت داتا گنج بخش کے مزار پر انوار پر حاضر ہوئے۔ اور ایک حجرہ میں چالیس دن تک مصروف عبادت و ریاضت رہے۔ اس عرصہ میں حضرت ہجویری رحمۃ اللہ علیہ نے آپ پر اپنے لطف و عنایت کی وہ بارش کی جس کا اندازہ حضرت غریب نواز ہی لگا سکتے ہیں۔ آپ نے جب اس آستانہ عالیہ سے رخصت ہونے کا ارادہ فرمایا تو بے ساختہ آپ کی زبان پر حضرت ہجویری رحمۃ اللہ علیہ کی مداح میں یہ شعر جاری ہو گیا:

گنج بخش فیض عالم مظہر نورِ خدا

ناقصاں را پیر کامل کمالاں را رہنما

مردِ خدا کی زبان سے نکلا ہوا یہ شعر زبان زدِ خاص و عوام ہو گیا۔ یوں آپ جو پہلے ہی داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کہلاتے تھے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ”گنج بخش“ کے معزز لقب سے مشہور ہو گئے۔ آپ کے بعد ہر زمانہ میں اولیائے کرام آپ کے درِ اقدس پر حاضر ہوتے رہے اور آپ کے دستِ خوانِ جود و کرم سے جھولیاں بھر بھر کر لے جاتے رہے۔ اس زمانے میں بھی جبکہ مادیت پسندی الحاد پرستی اور تصوف دشمنی کی مسموم ہواؤں نے انسانی اذہان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کی ذات پر انوار کی دلکشی کا یہ عالم ہے کہ رات دن طالبانِ حق کا تانا بندھا رہتا ہے۔ گرمی ہو یا سردی، بارش ہو یا دھوپ، دن ہو یا رات کوئی لمحہ ایسا نہیں جبکہ بندگانِ خدا کا ہجوم اللہ

Click For More Books

<https://archive.org/details/@zohaibhasanattari>

تعالیٰ کے اس محبوب اور برگزیدہ بندے کے آستانہ عالیہ پر حاضری کا شرف حاصل نہ کر رہا ہو۔ وہاں پہنچ کر اس آیت کریمہ کا مفہوم سمجھ میں آتا ہے:

”اے میرے بندو! تم مجھے یاد کرو، میں تمہیں یاد کروں گا، تم میری پیہم نعمتوں اور احسانات کا شکریہ ادا کرتے رہو اور ناشکری کا انداز مت اختیار کرو۔“

بلاشبہ حضور داتا گنج بخش سیدنا علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ نے زندگی بھر عبادت و ریاضت، علم و عمل، زہد و تقویٰ، تبلیغ و اشاعت کے ذریعے اپنے اللہ کا ذکر کیا اور اللہ نے اپنے اس انتہائی بزرگ بندے کو یہ اعزاز بخش دیا کہ اس کا نام ہمیشہ ہمیشہ کیلئے لوح وقت پر کندہ کر دیا۔ اس کا سکھ دلوں کی سلطنت پر یوں بٹھا دیا کہ کوئی بھی انقلاب اس مردِ خدا آگاہ کے مقام و مرتبہ میں معمولی سی کمی لانے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ بلکہ ہر آنے والا دن اس مردِ خدا کی چوکھٹ کو چوم کر اس پیغام کے ساتھ طلوع ہوتا ہے کہ:

داتا ترا دربار ہے رحمت کا خزانہ
قدموں کو ترے چومنے آتا ہے زمانہ

.....O.....

حضرت سید علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ جب حیات فانی کی پینسٹھ (۶۵) منزلیں طے کر چکے تو پانچ سو لاکھ عمر لبریز ہو گیا اور آپ نے ۱۲۶۵ھ میں اپنی جانِ جان آفریں کے سپرد کر دی۔ آپ کے فیوض باطنی کا سلسلہ مزار پُر انوار پر مسلسل جاری ہے اور تا قیامت جاری رہے گا۔ حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کا مزار آپ کے وصال کے تقریباً آٹھ سال بعد سلطان ابراہیم غزنوی نے تعمیر کرایا تھا۔ سلطان کو آپ سے بہت عقیدت تھی اور بچے پاؤں چل کر آپ کے روضہ پر حاضری دیتا تھا۔ مغل بادشاہوں کو بھی سید علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ سے بہت عقیدت تھی چنانچہ آپ کے مزار کا تابوت جو کہ سنگ مرمر کی ایک ہی سہل کا بنا ہوا ہے شہاب الدین شاہجہان کے بیٹے داراشکوہ نے بنوایا تھا۔ زمانے بدلتے رہے، حالات نئی سے نئی کروٹیں بدلتے رہے، حکومتیں تبدیل ہوتی رہیں، قیام پاکستان کے بعد کئی حکمرانوں نے سیاست کی بساط پر اپنا سکہ جمایا لیکن اپنے تمام تر سیاسی کروفر کے باوجود وہ داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کے آستانہ عالیہ پر انتہائے عاجزی کے ساتھ حاضر ہوتے رہے۔ یہی نہیں

Click For More Books

<https://archive.org/details/@zohaibhasanattari>

بلکہ ہر حکمران نے داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پاک اور ملحقہ مسجد کی وسعت اور دلکشی میں اضافہ کرنے کیلئے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کی۔ شاعر مشرق علامہ محمد اقبال نے جس طور اس سلطان اقلیم ولایت کو خراج عقیدت پیش کیا وہ اپنی مثال آہ ہے۔ علامہ کہتے ہیں:

سید	ہجویر	مخدوم	اُم
مرقد	اُو	پیر	سخر
بندہائے	کو	ہزار	آساں
در	زمین	ہند	ختم
عہد	فاروق	از	ہمالش
حق	زحرف	اُو	بلند
پاسبان	عزت	اُم	الکتاب
از	نگاہش	خانہ	باطل
خاک	پنجاب	ازدم	اُو
صبح	ما	از	مہر
عاشق	دہم	قاصد	طیار
از	جنہش	آشکار	سرائے

.....O.....

آج داتا گنج بخش سید علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ کا نام اطراف و اکناف عالم میں گونج رہا ہے۔ افغانستان، ایران اور برصغیر پاک و ہند سمیت بہت سے ممالک سے تعلق رکھنے والے متلاشیان حق صداقت آپ کی بارگاہ میں حاضری دینا باعث سعادت سمجھتے ہیں۔ زمانے بھر کے کجگلاہ شہروں کو فتح کر سکتے ہیں، انسانی کھوپڑیوں کے مینار تعمیر کر کے اپنی ہیبت اور کجگلاہی کا سکہ بٹھا سکتے ہیں۔ گمران شاہان وقت کا قبضہ ان کے آنکھوں بند کرنے سے پہلے ہی دم توڑ دیتا ہے مگر مردان حق جسموں کو نہیں بلکہ دلوں اور دماغوں کو تسخیر کرتے ہیں۔ ان کی سلطنت کو فنا نہیں، ان کا سکہ ہمیشہ جاری و ساری ہے۔ ان کے قبضے کو دوام ہے، داتا گنج بخش بھی ایسے عظیم محسن اسلام ہیں جو آج اپنی قبر انور کے اندر آرام

Click For More Books

<https://archive.org/details/@zohaibhasanattari>

فرما ہو کر کروڑوں انسانوں کے دلوں پر حکومت کر رہے ہیں۔ چلچلاتی ہوئی دھوپ میں قیامت کی گرمی میں برف برساتی سردی میں طوفان باد و باراں میں جب بھی اور جس وقت بھی جائے ہزاروں بندگانِ خدا تلاوت قرآن حکیم اور عبادتِ خداوندی میں مشغول نظر آئیں گے جو کچھ بھی پڑھا جا رہا ہے وہ بعد عقیدت داتا کی بارگاہ میں نذر کیا جا رہا ہے۔ خالی جھولیاں اور ہاتھوں کے کشکول پھیلا کر رب کریم سے اس برگزیدہ ہستی کا واسطہ دے کر مرادوں کے جواہر طلب کئے جا رہے ہیں۔ تمام تذکرہ نگار اس پر متفق ہیں کہ روضہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جو مزار اقدس سب سے زیادہ مرجعِ خلافت ہے اور جہاں سے انوار و تجلیات تقسیم ہو رہے ہیں وہ سید داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کا روضہ اقدس ہے۔ اللہ اللہ کہاں وہ عالم کہ قریباً ایک ہزار پہلے غزنی کے علاقہ ہجویر سے ایک گنام مبلغ لاہور وارد ہو کر دریائے راوی کے کنارے کو اپنے مسکن بناتا ہے۔ خاموشی کے ساتھ عبادات میں گم رہتا ہے، مگر تبلیغ و اشاعت اسلام کے سلسلے کو ایک لحظہ کیلئے بھی فراموش نہیں کرتا اور کہاں یہ شہرت اور قبولیت و مرجعیت کہ ہر لحظہ اور ہر آن داتا داتا پکارنے والے منکوں کا ہجوم تسبیح و تہلیل کی صدائیں بلند کرتے ہوئے داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پاک کو اپنے حصار میں لئے ہوئے ہے۔

.....○.....

سید علی ہجویری کی تعلیمات عشق و عقیدت کا ایک ایسا گلدستہ ہیں جس کے ہر پھول کی خوشبو الزوال ہے۔ ہر غنچہ عطر بیز اور ہر کلی معنبر ہے۔ آپ سے صرف عوام الناس نے ہی نہیں بلکہ علمائے کرام اور صوفیائے کرام نے بھی استفادہ کیا۔ ”کشف المحجوب“ اپنے موضوعات کے لحاظ سے ایمان آفرین گنجینہ حکمت ہے جس سے ہر دور کے صوفیا فیضیاب ہوتے رہے۔ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے اور تا ابد جاری رہے گا۔ آپ نے ”کشف المحجوب“ میں طریقت، شریعت، معرفت، فقر درویشی، اخلاق و کردار، رحمت خداوندی، محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم اسلامی عقائد و نظریات، دنیا و آخرت، بے ریائی و بارگاہی اور ترک دنیا سمیت بے شمار موضوعات پر دلکش پیرائے میں اظہار خیال کیا ہے۔

فقر کا تذکرہ کرتے ہوئے آپ فرماتے ہیں:

”فقر پر ہمیشہ صبر کرنا، فقیر کا درجہ کمال ہے۔ ایسے شخص کو صوفی یا درویش کہتے ہیں اور درویش وہی ہے جو ضروریات زندگی سے اسی قدر واسطہ رکھے جس قدر زندہ رہنے کیلئے ضروری ہے“

۔ اللہ کی رفاقت ایسی دولت ہے جس کے مقابلے میں ساری دنیا کا مال متاع بھی کوئی حقیقت نہیں رکھتا اور سچا درویش ہر حالت میں اللہ کی رفاقت کو ترجیح دیتا ہے۔

تصوف کی مختلف تشریحات ہر زمانے میں کی گئی ہیں۔ مادیت پسندوں نے اسے بدنام کرنے کیلئے کبھی ایرانی تصوف، کبھی عجمی تصوف اور کبھی ہندومت تصوف کی تلمیحات گھڑ کر ثابت کرنے کی کوشش کی کہ تصوف کا اسلام اور بانی اسلامی صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ نے تصوف کو بطور خاص اپنا موضوع بنایا۔ قرآن و حدیث اور مختلف حوالوں سے ثابت کیا ہے کہ تصوف کی روح عین روح اسلام ہے۔ چند غلط عناصر کے غلط رویے کی بناء پر آپ دبستانِ روحانیت و تصوف کے لازوال چشمے کی برکات سے انکار نہیں کر سکتے۔ تصوف کی تشریح کرتے ہوئے آپ فرماتے ہیں:

”دل کا صرف اللہ کی طرف رجوع کرنا اور دنیا کی محبت سے خالی ہونا تصوف ہے۔ صوفی وہ شخص ہے جس کا دل دنیاوی آلائشوں اور نفسانی خواہشات سے پاک صاف اور مصطفیٰ ہو، کوئی ایسی بات نہ کہے جو اس میں نہ ہو اور جو ہر معاملہ میں انصاف پسند ہو۔“

خرقہ پوشی کے متعلق ارشاد فرمایا:

”خرقہ پوشی کیلئے ضروری ہے کہ باطن کی صفائی، دل کی روشنی، مزاج کی پاکیزگی، خواہشات کا اعتدال اور خاصانِ بارگاہِ رب العزت کا تقرب اس کا مقصود ہو، خرقہ پوشی سے گروہ صوفیا کی مراد صرف یہ ہے کہ دنیاوی زیب و زینت سے نجات پائیں اور اپنے فقر میں حق تعالیٰ سے ہی رابطہ رکھیں۔“

آداب صحبت کے متعلق فرمایا:

”انسان جن لوگوں کے پاس بیٹھے اچھے اخلاق کا مظاہرہ کرے۔ بوڑھوں کا ادب کرے، بچوں کے ساتھ شفقت کرے، ہم عمروں کو بھائی کی طرح خیال کرے، ہر گناہ سے اجتناب کرے، حسد سے بچے، عداوت سے روگردانی کرے، دوسروں کی غیبت کرنا، خیانت کرنا، دوسرے کی عقل اور اہل کے فعل پر حرف زنی کرنا بھی آداب صحبت کے خلاف ہے۔“

سید علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ اپنے کمالات روحانیہ کی بدولت بے شمار دلوں میں مکین ہیں۔ دلوں کی بجز بستیاں آپ کی تعلیمات قدسیہ کے سحابِ رحمت سے سیراب ہو رہی ہیں۔ آپ کا اثر

عالیہ دنیا و آخرت میں سر بلندی حاصل کرنے والوں کیلئے آوازہ فطرت بنا ہوا ہے۔ آپ ایسے ماہتاب طریقت ہیں جس کی ابدی کرنوں کو زوال نہیں اور رحمت خداوندی کی بدولت ہر آنے والا دور آپ کی عظمت و مقبولیت میں اضافہ کرنے کا باعث بن رہا ہے۔

ہر گز نیمرو آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما

.....O.....

خدائے لم یزل کا دست قدرت تو زبان تو ہے
یقین پیدا کر اے غافل کہ مغلوب گمان تو ہے
میرے ہے چرخ نیلی قام سے منزل مسلمان کی
ستارے جس کی گردِ راہ ہوں وہ کارواں تو ہے
کیں فانی، مکاں آئی، ازل تیرا، ابد تیرا
خدا کا آخری پیغام ہے تو جاوداں تو ہے
تری فطرت اس سے ممکناتِ زندگانی کی
جہاں کے جوہر ممکن کا گویا امتحاں تو ہے
سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا



غوث الاعظم

محبوب سبحانی سیدنا عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ

عین اس وقت جب گمراہی و ضلالت اور فسق و فجور کی تاریکیاں کائنات انسانی کا مقدر بننے لگتی ہیں، قدرت کی فیاضی کسی ایسے دانائے روزگار کو رشد و ہدایت کا فریضہ سونپتی ہے جو اپنے سیرت و کردار کی شمع لازوال کی روشنی سے ظلمت زدہ ماحول کو منور کر دیتا ہے۔ اس یگانہ عالم شخصیت کی زندگی عظمت قرآن کا پر تو اور اس کی سیرت کا ہر نقش تعلیمات مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم کی ضولے ہوئے ہوتا ہے۔ پیران پیر غوث الاعظم حضرت الشیخ سید عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ بھی ایسے ہی صاحب اسرار حق تھے جنہوں نے اپنے کردار کی ضو باریوں اور اپنے مواعظ حسنہ کی نور افشانیوں کی بدولت عرصہ کائنات کو شریعت و روحانیت کے غیر فانی نقوش بخش دیئے۔ آپ نے عباسی ملوکیت کے سائے میں کملائے ہوئے فحل اسلام کو پھر سے تروتازہ کر دیا۔ آپ کی باطل شکن لکار نے وقت کی سب سے بڑی استبدادی قوت کو یوں لرزہ بر اندام کر دیا کہ شاہان کجکلاہ اپنی خلافت کو عامۃ المسلمین کی بخشی ہوئی امانت سمجھنے لگے۔

آپ ایسے پیران پیر تھے کہ تمام روحانی سلاسل آپ کی عظمت و بزرگی کے قائل ہیں، آپ وہ راہنمائے کامل و سبگیر تھے کہ جس نے ملت اسلامیہ کے نفس مردہ کی مسجائی کا فریضہ انجام دیا۔ آپ غوث الاعظم تھے کہ بے شمار بندگان حق آپ کے فیوض و برکات کی بدولت جادہ ہدایت پر گامزن ہو گئے۔ آپ محبوب سبحانی تھے کہ آپ کے محاسن و مناقب بیان کرنے لگیں تو قلم دریائے حیرت میں ڈوب ڈوب جائے، آپ قطب ربانی تھے کہ جب آپ نے خود کو مامور من اللہ سمجھے ہوئے اصلاح امت مسلمہ کا فریضہ انجام دینا شروع کیا تو عامۃ الناس تو ایک طرف باجبروت خلفاء

بھی آپ کی باز پرس کے احساس سے لرزلرز اٹھتے تھے کہ:

۔ نہ تخت و تاج میں نے لشکر و سپاہ میں ہے

جو بات مردِ قلندر کی بارگاہ میں ہے

آپ کا اسم گرامی عبدالقادر اور کنیت ابو محمد ہے۔ آپ کے القاب و اوصاف بے شمار ہیں۔

دنیا آپ کو حضرت شیخ المشائخ، قطب الاقطاب، غوث الاعظم، امام اولیاء، محی الملت والدین کے

القاب سے یاد کرتی ہے۔ آپ ۴۰ھ یا ۴۲ھ میں بلادِ عجم کے ایک چھوٹے گاؤں نیف میں پیدا

ہوئے جو گیلان کے متعلقات سے ہے۔ اہل عرب گاف کو جیم سے بدل لیتے ہیں اس لئے گیلان کو

جیلان بولتے ہیں اسی بناء پر آپ جیلانی مشہور ہوئے۔ بعض اصحاب نے جیلانی کہلانے کی اور

وجوہات بھی بیان کی ہیں۔ آپ کی والد ماجد حضرت سید ابوصالح موسیٰ جنگی دوست انتہائی متقی و پرہیز

گار اور صاحب ایمان شخصیت تھے جبکہ آپ کی والدہ محترمہ حضرت ام الخیر فاطمہ نہایت صالحہ اور

عبادت گزار خاتون تھیں۔ والد محترم کی طرف سے آپ کا سلسلہ نسب امام حسن رضی اللہ عنہ اور والدہ

ماجده کی طرف سے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ سے جا ملتا ہے۔ اس طور پر صحیح النسب حسنی حسینی سید

ہیں۔ جب آپ پیدا ہوئے تو آپ کی والدہ حضرت ام الخیر فاطمہ کی عمر ساٹھ برس کی تھی۔ رمضان

المبارک کا مہینہ تھا، آپ نے ابھی زندگی کی چند منزلیں ہی طے کی ہوں گی کہ آپ کے والد محترم

حضرت سید ابوصالح رحمۃ اللہ علیہ جنگی دوست کا انتقال ہو گیا اور اس صالح یتیم فرزند کی تعلیم و تربیت

کا تمام بوجھ آپ کی والدہ کے کندھوں پر آ پڑا۔ آپ کے نانا حضرت سید عبداللہ صومعی رحمۃ اللہ علیہ

بھی آپ پر غایت درجہ شفقت فرماتے ہوئے آپ کی تعلیم و تربیت کے سلسلہ میں آپ کی والدہ کی

راہنمائی فرماتے تھے جب آپ کی عمر دس سال کی ہوئی تو آپ اپنے شہر کے مکتب کے اندر پڑھنے

جایا کرتے تھے۔ ”بیچہ الاسرار“ کے مطابق جب آپ سے دریافت کیا گیا کہ آپ کو اپنے ولی ہونے

کا علم کب ہوا تو آپ نے فرمایا کہ جب میں دس سال کا تھا تو اپنے شہر کے مکتب میں پڑھنے جایا

کرتا تھا۔ راستہ میں ملائکہ میرے پیچھے پیچھے چلتے دکھائی دیتے تھے جب میں مدرسے پہنچتا تو ان کو بار

بار یہ کہتے سنتا کہ ”اللہ کے ولی کو بیٹھنے کیلئے جگہ دو اللہ کے ولی کو بیٹھنے کیلئے جگہ دو“۔

جب آپ کی عمر اٹھارہ سال کی ہوئی، تو ایک دفعہ عرفہ کے دن اپنے گاؤں سے باہر نکلے

اتفاقاً راستہ میں کسی زمیندار کا بیل چلا جاتا تھا۔ اچانک بیل نے مڑ کر ان کی طرف دیکھا اور کہنے لگا: ما لہذا خلقت ولا بہذا امرت۔ (اے عبدالقادر تو اس واسطے پیدا نہیں کیا گیا اور نہ ہی تجھے اس کا حکم دیا گیا ہے) یہ سن کر آپ کے سینے پر محبت الہی اور ذوق و شوق کا بحر بیکراں ٹھاٹھیں مارنے لگا اور گھر آ کر اپنی والدہ محترمہ کو تمام ماجرا سنا کر تحصیل علوم شریعت و طریقت کی خاطر بغداد جانے کا عزم ظاہر کیا۔ والدہ محترمہ نے اجازت عطا فرما کر چالیس دینار آپ کی گڈری میں سی دیئے اور دعا فرماتے ہوئے ہمیشہ سچ بولنے کی تلقین فرمائی۔ والدہ کی یہ تلقین اس وقت بھی آپ کے پیش نظر تھی جب ڈاکوؤں کے ایک گروہ نے راستہ میں حملہ کر کے تمام مسافروں کا مال و اسباب چھیننا شروع کر دیا۔ بالآخر آپ کی یہی صداقت شعاری قزاقوں کے اس گروہ کو صراطِ مستقیم پر گامزن کرنے کا باعث بنی اللہ کا یہ ولی جدھر رُخ کر رہا تھا رشد و ہدایت کے جواہر بے بہا لٹاتا جا رہا تھا۔

جب آپ ۲۸۸ھ میں مرکز علوم و فنون اور گہوارہ تہذیب اسلامی بغداد پہنچے تو سب سے پہلے حضرت شیخ حماد بن مسلم دباس رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے جو اپنے وقت کے عظیم شیخ الفقہ تھے۔ انہوں نے اس شہباز طریقت کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ علوم دینیہ اور علوم متداولہ کی تحصیل کیلئے حضرت قاضی ابوسعید المبارک الحزومی جیسے شیخ کبیر اور حضرت لابوذکریا تہریزی رحمۃ اللہ علیہ جیسے عالم یگانہ سے اکتساب فیض کرنے کے ساتھ ساتھ متعدد دوسرے علماء و فقہاء کے فقہی کمالات سے بھی ایک عرصہ تک خوشہ چینی کی۔ ان میں سے ابوالغنائم محمد بن علی میمون الخراسی، ابوالبرکات طلحہ العاقونی، ابو عثمان اسماعیل بن محمد الاصبہانی، ابوطاہر محمد عبدالرحمن بن احمد، ابوالمنصور عبدالرحمن، ابوالنصر محمد بن المختار ہاشمی، شیخ ابوالخطاب محفوظ الکلوزانی، ابوالوفا علی بن عقیل حنبلی، ابوالحسن محمد بن قاضی محمد بن الحسین القادری السراج جیسے نامور محدثین اور فقہاء خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ حدیث شریف پر آپ کی ژرف نگاہی اور وقت نظر کا یہ عالم تھا کہ آپ کے اساتذہ کرام آپ کو سند دیتے وقت فرمایا کرتے تھے:

”اے عبدالقادر ہم تم کو الفاظ حدیث کی سند دے رہے ہیں ورنہ حدیث کے معانی میں تو ہم تم سے استفادہ کرتے ہیں کیونکہ بعض احادیث کے مطالب جو تم نے بیان کئے ہیں ان تک ہماری فہم کی رسائی نہیں۔“

درس و تدریس سے فراغت ہوئی تو محبت خداوندی اور معرفت ربانی کے اسرار کو سمجھنے کیلئے

سرگرداں رہنے لگے۔ عراق کے ویرانوں اور جنگلوں کی طرف ہنکل جاتے اور کئی کئی روز واپس نہ آتے۔ تلاش حق کا جذبہ راسخ تھا، قدرت آپ کو ایک بڑے مقصد کی تکمیل کیلئے تیار کر رہی تھی۔ اپنے استاد محترم قاضی ابوسعید رحمۃ اللہ علیہ المبارک الخزومی کے حکم پر ان کے مدرسہ ”باب الازج“ میں فرائض تدریس انجام دینے لگے۔ دور دور سے طالبان علم آپ کی شوکت علمی کا شہرہ سن کر حاضری دینے لگے۔ طلبہ کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیش نظر مدرسہ کی عمارت نا کافی محسوس ہونے لگی۔

بغداد کے ارباب خیر مدرسہ کی عمارت کی توسیع کی خاطر زکیر صرف کرنے لگے۔ بالآخر ۱۵۲۸ھ میں یہ مدرسہ ایک عظیم الشان اسلامی درسگاہ کی شکل اختیار کر گیا۔ اب یہ درسگاہ مدرسہ قادریہ کے نام سے چاروں طرف مشہور ہو چکی تھی۔ عام طالبان علم ہی آپ کی خدمت اقدس میں حاضری نہ دیتے تھے بلکہ نامور علمائے کرام اور مشائخ بھی اس سلسلہ میں آپ کے سامنے زانوئے تلمذ طے کرنا سعادت خیال کرتے تھے۔ آپ کے جذبات میں عشق خداوندی کی طلب صادق جلوہ فگن تھی۔ طریقت کی وادیوں کی طرف رجوع کیا تو مجاہدہ اور ریاضت کی طرف رغبت پیدا ہونے لگی۔

علم طریقت و معرفت کے سلسلہ میں آپ نے حضرت ابوالخیر حماد بن مسلم دباس رحمۃ اللہ علیہ کی نگہ فیض رسان کے انعامات باطنی سے فیوض حاصل کئے جو کہ بغداد کے عظیم المرتبت مشائخ میں سے تھے۔ روحانی اور باطنی کمالات کے حصول کیلئے آپ نے قریباً پچیس برس ایمان افروز مجاہدوں اور ریاضتوں میں صرف کئے۔ جب آپ نے عبادات ریاضات اور مجاہدات شاقہ کے بعد پورا پورا تزکیہ نفس حاصل کر لیا تو حضرت شیخ ابوسعید مبارک الخمری رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت کی اور ان کے حلقہ ارادت میں داخل ہو گئے۔ شیخ ابوسعید نے آپ کو اپنے حلقہ بیعت میں لیتے ہوئے اپنے ہاتھ سے کھانا کھلایا۔ حضرت غوث الاعظم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جو لقمہ ان کے ہاتھ سے میرے شکم میں جاتا تھا وہ میرے باطن میں ایک نور بھر دیتا ہے۔ آہستہ آہستہ سیدنا عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت علوم معرفت کے مہر عالم تاب میں ڈھلتی گئی۔

آپ روحانی سر بلند یوں پر فائز ہوئے تو تقاضائے قدرت کی تعمیل میں وہ وقت آپہنچا کہ ایک زمانہ آپ کے انوار و تجلیات معرفت سے مستنیر ہوا۔ اس وقت خلافت عباسیہ کا آفتاب اقتدار نصف النہار پر تھا۔ ملوکیت کے سائے انوار شریعت کو اپنی لپیٹ میں لے رہے تھے۔ بغداد میں خلیفہ

مستنصر باللہ سریر آرائے سلطنت تھا۔ بغداد جو کہ عروس البلاد بھی تھا اور عظیم الشان مسلم سلطنت کا دار الخلافت بھی اب تاجدار اقلیم ولایت حضور غوث الاعظم رحمۃ اللہ علیہ کی فکری و روحانی سرگرمیوں کا مرکز لازوال بننے والا تھا۔ اس دور کے امراء حکومت کے نشے ہی بدست اور رعایا کے حقوق سے غافل تھے۔ علماء اپنے فریضہ ایمانی سے بے بہرہ ہو کر آپس میں الجھ رہے تھے۔

جاہل صوفیوں نے طریقت کو شریعت سے علیحدہ اور آزاد ٹھہرا رکھا تھا۔ اسلام جو کہ عالم انسانیت کا چارہ ساز تھا، ارباب اقتدار کے فیصلوں کا پابند بنا دیا گیا تھا۔ یہ تھے وہ حالات جن کا مشاہدہ فرماتے ہوئے حضور غوث الاعظم رحمۃ اللہ علیہ نے درس و تدریس کا فریضہ انجام دینے کے ساتھ ساتھ وعظ و نصیحت، اشاعت اسلام، اصلاح خلق خدا، تجدید دین اور علاقے کلمۃ الحق کا بیڑا اٹھایا۔ رشد و ہدایت کے سلسلہ کو دراز کرنے میں آپ کی زبان حارج تھی۔ بغداد عربی ادب کا گہوارا اور فصحاء عرب کا مرکز تھا، جبکہ حضور پیران پیر رحمۃ اللہ علیہ کی مادری زبان فارسی تھی۔ تمام تر علمی و فقہی اور روحانی و نظری کمالات و فضائل کے باوجود آپ جھجک کا شکار تھے۔ ایک رات آپ خواب میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو وعظ و نصیحت کی تلقین فرمائی تو انہوں نے اپنے عجمی نژاد ہونے اور عربی دانی کی مہارت نہ رکھنے پر معذوری کا اظہار کیا، جس پر سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے سات مرتبہ کچھ پڑھ کر ان کے منہ پر دم کیا اور لعاب دہن ان کے منہ میں ڈالا اور وعظ کا حکم دیا۔ بس پھر کیا تھا در علم و حکمت وا ہو گیا، رشد و ہدایت کا سرچشمہ سرمدی پھوٹ پڑا۔

متعدد تذکرہ نگار حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عطاءے خاص کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ غوث الاعظم پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عالم بیداری میں کرم فرمایا۔“
آپ اس واقعہ کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”دوسرے روز میں بعد نماز ظہر کہنے کے ارادے سے منبر پر بیٹھا اور سوچتا رہا کہ کیا کہوں۔ میرے ارد گرد خلقت کا ہجوم تھا اور ہر ایک میرا وعظ سننے کا مشتاق تھا، ہر چند کہ میرے سینے میں دریائے علم موجزن تھا مگر زبان نہیں کھلتی تھی کہ اس وقت میرے جد امجد حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم تشریف لائے اور چھ مرتبہ کچھ پڑھ کر میرے منہ پر دم کیا اور اپنا لعاب دہن میرے منہ میں

ڈالا۔ میری زبان فوراً کھل گئی اور میں نے وعظ شروع کر دیا۔ اب میری طلاق لسانی کی سارے بغداد میں دھوم مچ گئی۔ خود میرے دل میں جوش سخن کا یہ عالم تھا کہ اگر کچھ عرصہ خاموش رہتا اور وعظ نہ کہتا تو میرا دم گھٹنے لگتا تھا۔ اول اول میری محفل تذکیر میں تھوڑے لوگ ہوا کرتے تھے مگر آخر میں نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ ہجوم کی مسجد میں گنجائش ناممکن ہو گئی۔ بالآخر عید گاہ میں منبر رکھا گیا اور میں نے وہاں وعظ کہنا شروع کیا۔“

آپ نے ۱۲۵۲ھ میں پہلی تقریر فرمائی۔ ابتداء میں تعداد کم تھی لیکن آپ کی پہلی تقریر نے بغداد میں تہلکہ مچا دیا۔ تشنگان شوق کا دریا اُٹھ آیا۔ بغدادیوں نے آپ کی خطابت و مواعظت سے متاثر ہو کر بغداد کے باہر ایک طویل و عریض رباط تعمیر کرائی اور یہ سلسلہ اس قدر وسیع ہوتا چلا گیا کہ مدرسہ باب الازج کی تعمیرات اس رباط کی تعمیرات سے متصل و ملحق ہو کر ایک عالی شان زاویہ یا خانقاہ کی شکل میں نظر آنے لگیں۔ آپ یہاں جمعہ یکشنبہ اور دو شنبہ کو وعظ و تلقین فرمایا کرتے تھے۔ بعض اوقات ستر ہزار سے زائد طالبان راہ حق آپ کے وعظ میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ سواراتے آتے تھے کہ ان کی گرد سے عید گاہ کے گرد ایک حلقہ بن جاتا تھا اور دور سے تو وہ نظر آتا تھا۔ حضور غوث الاعظم رحمۃ اللہ علیہ کے پُر تاثیر مواعظ حسنہ کا تذکرہ فرماتے ہوئے حضرت شاہ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ ”اخبار الاخیار“ میں رقمطراز ہیں:

”حضرت کے کلام معجز بیان میں وہ تاثیر تھی کہ جب آپ آیات و عید کے معانی ارشاد فرماتے تھے تو تمام لوگ لرز جاتے تھے۔ چہروں کا رنگ فق ہو جاتا تھا۔ گریہ و زاری کا یہ عالم ہوتا تھا کہ اہل محفل پر بے ہوشی طاری ہو جاتی تھی، جب آپ رحمت الہی کی تشریح و توضیح اور اس کے مطالب بیان فرمانے لگتے تو لوگوں کے دل غنچوں کی طرح کھل جاتے تھے۔ اکثر حاضرین تو بادۂ ذوق و شوق سے اس طرح مست و بے خود ہو جاتے تھے کہ بعد ختم محفل ان کو ہوش آتا تھا اور بعض تو محفل ہی میں جاں بحق تسلیم ہو جاتے۔“

علمائے یگانہ اور مشائخ عصر بھی کثیر تعداد میں حاضر ہوتے۔ آپ کی محفل میں چار سو افراد قلم دوات لے کر بیٹھتے تھے اور جو کچھ آپ ارشاد فرماتے اسے جواہر بے بہا کی صورت دامن قرطاس پر سیٹ لیتے۔ آپ کے مواعظ کی تاثیر سے گمراہوں کو منزل مقصود کا نشان میسر آتا، تاریک دلوں کو

ایمان کی روشنی عطا ہوتی، فاسق و فاجر حق آشنا بن جاتے، ہر مجلس میں ایک بڑی تعداد میں یہود و نصاریٰ دولت اسلام سے بہرہ یاب ہوتے۔ عامۃ الناس کے علاوہ بادشاہ، وزراء، سلطنت اور امرائے دربار بھی آپ کی مجالس میں نیاز مندانہ طریق سے حاضر ہوتے۔ آپ کی مجلس وعظ میں رجال الغیب، ملائکہ اور جنات بھی بکثرت آیا کرتے تھے۔ آپ کا ہر وعظ ربانی فتوحات، یزدانی الہامات اور سبحانی ارشادات و ہدایات کا بحر ذخار تھا۔ حکیمانہ انداز کی جھلک بھی تھی اور روحانی جلال کی چمک بھی۔ یہ آپ کی کرامت تھی کہ آپ کی مجلس میں دور و نزدیک بیٹھنے والے یکساں آپ کی آواز سنتے تھے۔ آپ اہل مجلس کے خطرات قلبی کے موافق کلام فرماتے تھے۔ ایک اندازے کے مطابق آپ کے ہاتھ پر پانچ ہزار سے زیادہ یہود و نصاریٰ نے اسلام قبول کیا اور لاکھوں کی تعداد میں فساق و فجار تائب ہوئے۔

آپ نے مذہب اسلام کو اس طور نئی زندگی دی کہ اسلام پھر سے اپنی حقیقی عملی تعبیر و توضیح کے ساتھ عوام الناس کی زندگی میں جاری و ساری ہو گیا۔ آپ نے علمائے سو کو ان کی فرض ناشناسی پر ٹوکا، جاہل صوفیوں کو عظمت تصوف سے آشنا کیا۔

دنیاداروں کو روز قیامت کی سختیوں کا احساس دلایا، عمال حکومت کو ان کی بدعنوانیوں پر سخت ملامت کی، حتیٰ کہ خلیفہ وقت بھی آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا تو آپ اسے بھی ڈانٹ دیتے۔ ایک مرتبہ خلیفہ المستعجد باللہ نے دعائے خیر کی غرض سے آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر دس توڑے اشرفیوں کے نذر کئے۔ آپ کے انکار پر جب خلیفہ نے قبول فرمانے پر اصرار کیا تو آپ نے دونوں ہاتھوں میں چند اشرفیوں کو لے کر رگڑا تو ان سے خون بہنے لگا۔ آپ نے خلیفہ سے فرمایا:

”تمہیں اللہ سے شرم آنی چاہیے کہ انسانوں کا خون کھاتے ہو اور اسے جمع کر کے میرے پاس لاتے ہو۔“

خلیفہ وقت اور وزراء امراء آپ کے دربار میں حاضری دینا باعث اعزاز سمجھتے تھے جب وہ آتے تو آپ اٹھ کر گھر میں چلے جاتے، جب وہ آپ کے پیچھے آتے تو آپ دولت خانہ سے نکلتے تا کہ ان کیلئے اٹھنا نہ پڑے۔ آپ انہیں نصیحت کرتے ہوئے لہجہ سخت کر لیتے جب آپ خلیفہ وقت کو لکھتے تو یوں تحریر فرماتے:

”عبدالقادر تجھے یوں حکم دیتا ہے اور اس کا حکم نافذ ہے۔ اس کی اطاعت تجھ پر واجب ہے۔ وہ تیرا پیشوا اور تجھ پر حجت ہے۔“

جب خلیفہ وقت کو آپ کے خط مبارک کے مضمون سے آگاہی ہوتی تو اسے بوسہ دیتا اور کہتا کہ سیدنا شیخ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ نے سچ فرمایا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاہ جیلانی جلالت روحانیت کے کس مقام پر فائز تھے۔

شاہ شاہاں شیخ عبدالقادر است
دل نشین و دلربا و دلبر است

خدائے کریم نے آپ سے اصلاح احوال عالم کا وہ فریضہ عظیم انجام دلوانا تھا جو انبیائے کرام کا خاصہ ہے۔ آپ نے شعائر اسلامی کو جس طور نئی زندگی بخشی اور اسلام کی ابدی تعلیمات کو جس شاندار طریق سے اسلامیان عرب و عجم کے دلوں میں راسخ کیا اس کی بناء پر آپ کو محی الدین و اہلسنت کے مقدس خطاب سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس خطاب کی وجہ تسمیہ یوں ہے کہ ۵۱۱ھ میں آپ بغداد کی طرف آ رہے تھے کہ ایک بیمار اور نحیف البدن شخص نے راستے میں آپ کا نام لے کر سلام کیا اور قریب آنے کو کہا۔ جب آپ قریب پہنچے تو اس نے آپ سے سہارا دینے کی استدعا کی۔

آپ نے سہارا دیا تو دیکھتے ہی دیکھتے اس کا جسم صحت مند ہونے لگا اور رنگ و صورت میں تازگی نمایاں ہونے لگی۔ آپ کے استعجاب پر اس نے کہا کہ میں دین اسلام ہوں۔ میں قریب لڑک ہو گیا تھا اللہ تعالیٰ نے مجھے تمہاری بدولت از سر نو زندہ کیا۔ شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ اس شخص سے جدا ہو کر جامع مسجد پہنچے تو ایک شخص نے ملاقات کی اور آپ کے جوتے پکڑ کر یا سیدی محی الدین کہہ کر پکارا۔ پھر جب یہ نماز پڑھنے لگے تو چاروں طرف سے لوگ آ کر ان کے ہاتھ جوڑنے لگے ہر شخص کی زبان پر یا محی الدین کا قدسی زمزمہ گونج رہا تھا۔

تو حسینی حسنی کیوں نہ محی الدین ہو
اے خضر مجمع بحرین ہے چشمہ تیرا

میران میر سیدنا عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ جس مقام غوثیت پر فائز تھے وہ جملہ اولیائے کرام میں سے کسی اور کو نصیب نہیں ہوا۔ آپ علم و عمل، عشق و سرمستی، سوز و گداز اور روحانی شوق کی

جن رفعتوں کے ہمراز تھے وہ کسی اور صاحب حال کا مقدر نہ بن سکیں۔ تمام معتبر تذکار میں رقم ہے کہ ایک روز سیدنا عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ بغداد کے محلہ حلبہ میں جہاں آپ کا مہمان خانہ تھا مجلس سے خطاب فرما رہے تھے اس مجلس میں پچاس جلیل القدر مشائخ عظام موجود تھے۔ دورانِ وعظ آپ نے فرمایا:

قدمی ہذہ علی رقبۃ کل ولی اللہ

میرا یہ قدم ہر ایک ولی اللہ کی گردن پر ہے

یہ سن کر حضرت شیخ علی ابن ابیہتی اٹھے اور منبر کے قریب جا کر آپ کا قدم مبارک اپنی گردن پر رکھ دیا۔ بعد ازیں تمام حاضرین نے آگے بڑھ کر اپنی گردنیں جھکا دیں۔ اس دور کے تین سو تیرہ اکابر اولیاء اللہ نے دنیا کے مختلف مقامات پر حضرت غوث الاعظم رحمۃ اللہ علیہ کے اس ارشاد کی تعمیل میں اپنی گردنیں خم کر دیں۔ آپ کے اس ارشاد برحق کے وقت سلطان الہند حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رحمۃ اللہ علیہ خراسان کی پہاڑیوں میں مجاہدوں اور ریاضتوں میں مصروف تھے۔ آپ نے غوث پاک رحمۃ اللہ علیہ کا یہ اعلان سنتے ہی اپنا سر مبارک زبان حال سے یہ کہتے ہوئے زمین پر رکھ دیا کہ حضور والا! گردن پر کیا بلکہ میرے سر پر آپ کا مبارک قدم ہے۔

واہ کیا مرتبہ اے غوث ہے بالا تیرا

اونچے اونچوں کے سروں سے قدم اعلیٰ تیرا

سر بھلا کوئی کیا جانے کہ ہے کیسا تیرا

اولیا ملتے ہیں آنکھیں وہ ہے تلوا تیرا

حضور غوث الاعظم رحمۃ اللہ علیہ کی کرامات بے شمار ہیں۔ ان کا شمار کرنے بیٹھیں تو ایک طویل دفتر درکار ہوگا۔ آپ کے روحانی تصرفات اور ایمانی کمالات کے ایسے ایسے ایمان افروز واقعات مطالعہ کو ملتے ہیں کہ دیدہ و دل فکر آفریں حیرت میں کھو جاتے ہیں۔ آپ کی ذات مجمع البرکات صفات جمیلہ اور خصائل حمیدہ کی جامع تھی۔ آپ انتہائی غریب نواز، خدا ترس، سخی، رقیق القلب، وسیع حوصلہ، شیریں زباں، رحمدل، خلیق اور حد درجہ بامروت اور پابند قول و اقرار تھے۔ آپ کی خدمت میں ہدیے نذرانے اور تحائف اس کثرت سے آتے کہ شمار نہیں ہو سکتا تھا مگر آپ سب کچھ

خدا کی راہ میں خیرات کر دیتے۔ روزانہ شب کو آپ کا دسترخوان بچھایا جاتا، جس پر آپ مہمانوں کے ہمراہ کھانا تناول فرماتے۔ غرباء و مساکین کے ساتھ آپ زیادہ بیٹھا کرتے تھے۔ ان کے ساتھ بیٹھ کر کھانا بھی تناول فرماتے۔ طلبہ بھی کثیر تعداد میں آپ کے دسترخوان سے ہی کھانا کھاتے

آپ کی سب سے بڑی کرامت یہ ہے کہ آپ نے اسلام کو نئی زندگی عطا کی، آپ کے ارشادات اور مواعظ حسنہ روشنی کے مینار تھے جن سے پھوٹنے والی کرنیں آج بھی دلوں کو روحانیت آشنا کر رہی ہیں۔ آپ کے ان مواعظ حسنہ کے تین مجموعے ہیں یعنی الفتح الربانی، فتوح الغیب، الغنیۃ لطالب طریق الحق (غنیۃ الطالبین) ان کتب میں آپ کے ارشادات حکیمانہ کو ضبط تحریریں لایا گیا ہے۔ یہ مواعظ اپنی افادیت اور اثر آفرینی کی اس منزل پر ہیں کہ آپ کی فضیلت اور فیضان معرفت پر دلیل قاطع ہیں۔ عرب ہو یا عجم، برصغیر پاک و ہند ہو یا ممالک شام و عراق تمام دنیا آپ کے کمالات علمی اور فضائل باطنی کی معترف ہے۔ آپ جادۂ حق سے بھٹکے ہوئے بے نصیب انسانوں کے لئے صراط مستقیم کا عملی پیغام سرمدی تھے۔ آپ نے اپنی زندگی میں جس عالمگیر دعوت حق کا آغاز کیا تھا، وہ آپ کے سلسلہ عالیہ قادریہ کی صورت میں آج بھی پورے روحانی تزک و احتشام کے ساتھ جاری و ساری ہے۔ یہ وہی دعوت حق ہے جس کیلئے آپ فرمایا کرتے تھے:

”اے لوگو! دعوت حق قبول کرو، بے شک میں داعی الی اللہ ہوں کہ تم کو اللہ کے دروازے اور اس کی طاعت کی طرف بلاتا ہوں۔ اپنے نفس کی طرف نہیں بلاتا کہ منافق ہی اللہ کی طرف مخلوق کو نہیں بلاتا بلکہ اپنے نفس کی طرف بلاتا ہے۔“

اس دور کے علماء اور اصحاب تصوف آپس میں برسر پیکار تھے۔ شرافت اور طریقت کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا گیا تھا لیکن سیدنا غوث الاعظم رحمۃ اللہ علیہ کی بے مثال شخصیت شریعت اور طریقت کے امتزاج کا حسین نمونہ تھی۔ آپ افتاء و درس کی مسند پر فائز تھے۔ وقت کا کوئی قاضی اور مفتی آپ کے علم و عمل پر اعتراض کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ صاحبان طریقت کیلئے آپ کی ذات گرامی سپر بن گئی اور اہل شریعت آپ پر اور آپ کے متوسلین پر بدعتی یا غیر شرع ہونے کا الزام نہیں لگا سکتے تھے۔ صوفیاء اور علمائے شریعت دونوں فقہی و روحانی امور میں راہنمائی کیلئے آپ کے محتاج تھے۔ اس یکجہتی کی بذولت اشاعت اسلام کی رفتار تیز ہو گئی۔ آپ کے دور میں

فرقہ معزلہ اسلام میں مادیت کا نمائندہ تھا۔ وہ عقل کو چراغ رہ گزر نہیں بلکہ درونِ خانہ کے ہنگاموں میں دخیل سمجھتا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ محبت و ذوق کی شمع ٹٹمانے لگی۔ سیدنا عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے وجود میں ایک ایسی شخصیت ظہور پذیر ہو گئی کہ محض اس کا دیکھنا ہر سوال کا جواب اور ہر مشکل کا حل تھا۔ آپ گفتگو فرماتے تو آپ کے الفاظ شمع روشن کی طرح ضو بار ہونے لگتے اور جب آپ خاموش ہوتے تو علم و عرفان کی خوشبو قلوب انسانی کو مہکانے لگتی۔ آپ کے وجود سے مادہ پرستی کا خاتمہ ہو گیا اور معزلہ اس طرح سمٹ گئے کہ ان کا نشان تک باقی نہ رہا۔ جس وقت حضرت شیخ جیلانی رحمۃ اللہ علیہ محراب و منبر کی زینت بنے رافضیت عروج پر تھی، آپ کا وجود محبت الہی اور آیت الہی ثابت ہوا اور آپ کے فیوض سے سرشار قادری درویشوں نے ہر مقام پر اسماعیلی داعیوں کا تعاقب کیا اور عوام کو معرفت الہی کے پُر سرور اور بیٹھے پانی کے چشموں سے سیراب کر کے فریب و مکر اور ضلالت و گمراہی کے سراب سے محفوظ کر دیا۔

حضرت سیدنا غوث الاعظم رحمۃ اللہ علیہ کا بدن لاغر تھا، قد درمیانہ تھا، آپ کا سینہ کشادہ تھا، ریش مقدس طویل و عریض گھنی اور خوشنما تھی۔ آواز بلند و لہلہ اور گفتار خوش تر تھی، رنگ گندمی تھا، ابرو باریک اور باہم پیوستہ تھے۔ آپ کا علم کامل تھا، اخلاق شیریں تھے، مزاج میں تواضع تھی، شخصیت جلال و جمال کا مرقع تھی۔ آپ بہت خلوت پسند تھے۔ راست گوئی میں آپ کا شہرہ تھا، قرآن حکیم کی طرح احادیث نبوی کے بھی حافظ تھے، جب آپ وعظ کیلئے منبر پر تشریف فرما ہوتے تو کوئی بھی ادب کے باعث نہ کھٹکھارتا تھا، نہ کھانتا تھا۔ آپ نے ۵۲۸ھ سے ۵۵۷ھ تک قریباً تینتیس سال درس و تدریس اور فتاویٰ نویسی کے فرائض انجام دیئے۔ علمائے عراق اور دوسرے علاقوں کے علماء آپ کی خدمت میں اپنے سوالات بغرض جواب ارسال فرماتے اور جب آپ کے فتاویٰ ان تک پہنچتے تو انہیں آپ کی علمی قابلیت پر سخت تعجب ہوتا تھا اور وہ پکار اٹھتے تھے کہ وہ ذات پاک ہے جس نے ان کو ایسی علمیت سے نوازا ہے۔ آپ نے ۵۲ سال کی عمر تک متاہل زندگی اختیار نہ کی، اس کے بعد سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے خیال سے آپ نے مختلف زمانوں میں چار شادیاں کیں اور ان چاروں سے آپ کی اولاد کثرت سے تھی، ان میں سے مندرجہ ذیل صاحبزادگان زیادہ مشہور ہوئے۔

سیدنا شیخ عبدالوہاب، سیدنا شیخ عیسیٰ، سیدنا شیخ عبدالعزیز، سیدنا شیخ عبدالجبار، سیدنا شیخ عبدالرزاق

سیدنا شیخ محمد سیدنا شیخ عبداللہ سیدنا شیخ یحییٰ سیدنا شیخ موسیٰ سیدنا شیخ ابراہیم رحمۃ اللہ علیہم اجمعین صوفیائے کرام اور بزرگان دین کی شاعری ذاتی تشہیر یا فنی صلاحیتوں کے اظہار کیلئے نہیں ہوتی بلکہ وہ اسے اپنے سوز و ساز قلبی اور واردات روحانی کی نمود کا ذریعہ بناتے ہیں۔ غوث الاعظم رحمۃ اللہ علیہ کے کلام میں خوبصورت شاعری کے نہایت خوبصورت نمونے ملتے ہیں۔ آپ کی تمام تر شاعری چند حمدیہ قصیدوں پر مشتمل ہے۔ ان میں سے قصیدہ غوثیہ آپ کی روحانی قدر و منزلت اور آپ کے منصب جلیل کا ترجمان ہے۔ مولانا جلال الدین رومی رحمۃ اللہ علیہ اس قصیدے کے بارے میں کہتے ہیں:

”قصیدہ غوثیہ بھی اسی مقام قرب کے ایک خود دار اور سکر یافتہ کی آواز ہے جس کو سیدنا غوث الاعظم کے باطنی حال کی اجتماعی تفسیر سمجھنا چاہیے۔“

قصیدہ غوثیہ کے بارے میں مولانا روم کی رائے مبنی برحقیقت ہے۔ نگاہ ظاہر بین اس قصیدہ کی روح میں جھانک کر حضرت غوث الاعظم رحمۃ اللہ علیہ کی عظمتوں کا ادراک نہیں کر سکتی۔ ایک فارسی دیوان بھی آپ سے منسوب ہے۔ آپ کی دیگر تصنیفات میں سے مندرجہ ذیل خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ الغنیۃ الطالب طریق الحق (المعروف غنیۃ الطالبین) فتوح الغیب، الفتح الربانی، حزب النساء الخیرات، ایواقیت الحکم، الفیوضات الربانیۃ، المواہب الرحمانیۃ، الفتوحات الرحمانیۃ، جلاء الخاطر فی الباطن والظاہر، سر الاسرار، رد الراضیہ وغیرہ۔

حضرت سیدنا غوث الاعظم رحمۃ اللہ علیہ کے فیوض و برکات فقط سلسلہ عالیہ قادریہ ہی کی بلادت تقسیم نہیں ہو رہے بلکہ جملہ روحانی سلاسل آپ کی شوکت روحانی کے سامنے جبین نیاز خم کرتے ہوئے آپ کی غوثیت عظمیٰ سے مستفیض ہو رہے ہیں۔ شہنشاہ نقشبندیہ حضرت بہاؤ الدین محمد نقشبند رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت اور بلند روحانی مقام کی خبر آپ کی پیدائش سے قریباً ڈیڑھ سو سال پہلے سیدنا غوث الاعظم رحمۃ اللہ علیہ نے یہ کہہ کر دی تھی کہ بخارا شریف میں پیدا ہونے والا یہ مرد کامل میری شاہین نعمت سے فیضیاب ہوگا اور واقعی جس طرح غوث الاعظم رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تھا ویسا ہی ہوا۔

بادشاہ ہر دو عالم شاہ عبدالقادر است

سرحد ۔ اولادِ آدم شاہ عبدالقادر است
آفتاب و ماہتاب عرش و کرسی و قلم
نوقلب از نورِ اعظم شاہ عبدالقادر است

امام ربانی حضرت شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ مکتوبات شریف میں سیدنا غوث الاعظم رحمۃ اللہ علیہ کی روحانی بلند مرتبتی کا تذکرہ کرتے ہوئے طریقت و روحانیت کا پیشوا حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کو قرار دیتے ہیں۔ ان کے فرمان کے موجب یہ روحانی فیض حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بعد آپ کے صاحبزادگان اور پھر بارہ اماموں کے ذریعہ دنیا تک پہنچتا رہا۔ حتیٰ کہ سیدنا غوث الاعظم رحمۃ اللہ علیہ کا زمانہ آ پہنچا جو روحانی سر بلندیوں کے لحاظ سے انہی بارہ اماموں کے فیض یافتہ ہیں۔ اس تفصیل کے بعد حضرت شیخ احمد سرہندی فرماتے ہیں:

”یہاں تک کہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہ اس مرتبہ تک پہنچ گئے اور یہ آپ کو مل گیا۔ مذکورہ بالا اماموں اور حضرت شیخ قدس سرہ کے درمیان کوئی شخص اس مرتبہ پر نہیں ہے اور اب اس راستے میں جتنے فیوضات و برکات جملہ اقطابِ نجباء اور ولیوں تک پہنچتے ہیں ان کے ذریعے ہی پہنچتے ہیں کیونکہ فیض کا یہ مرکز ان کے بغیر اور کسی کو نہیں ملا اسی جگہ غوث الاعظم رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے:

افلت شمس الاولین و شمسنا
ابدا علی الفق العلی لا تغرب
سچ ہے کہ:

سورج اگلوں کے چمکتے تھے چمک کر ڈوبے

افق نور پہ ہے مہر ہمیشہ تیرا

سلطان الہند حضرت خواجہ سید محمد معین الدین سنجری چشتی اجمیری رحمۃ اللہ علیہ تو باقاعدہ حضور غوث الاعظم رحمۃ اللہ علیہ کی روحانی صحبتوں اور ایمان افروز مجالس کے فیض یافتہ تھے۔ آپ کئی ماہ تک حضرت غوث الاعظم کی خدمت اقدس میں دن رات رہے اور آپ کے فیوضات اور حمیہ باطن و کمال سے مستفیض ہوئے اور دربارِ غوثیت سے ہی ہندالوی رحمۃ اللہ علیہ کو ہندوستان کی ولایت عطا ہوئی تھی۔ شاہ اجمیر حضور غوث الاعظم رحمۃ اللہ علیہ کو یوں ہدیہ عقیدت پیش کرتے ہیں:

یاغوث معظم نور ہدی مختار نبی مختار خدا

سلطان دو عالم قطب علی حیراں زجلالت ارض و سما
چوں پائے نبی شد تاج سرت تاج ہمہ عالم شد قدمت
اقطاب جہاں در پیش درت افتادہ چو پیش شاہ گدا

شیخ الشیوخ حضرت شہاب الدین عمر سہروردی نور اللہ مرقدہ اپنے عالم شباب میں علم کلام کی وسعتوں میں الجھے رہتے تھے۔ آخر ایک روز ان کے چچا انہیں بارگاہ سیدنا غوث الاعظم رحمۃ اللہ علیہ میں لے گئے اور ان کی روحانی تربیت کیلئے عرض گزار ہوئے تو حضرت غوث الاعظم رحمۃ اللہ علیہ نے ان کے دل پر ہاتھ رکھ کر چند لمحوں ہی میں علم کلام کی تاریکیاں دھو ڈالیں اور اسے علوم نورانی سے بھر پور کر دیا۔ شیخ الشیوخ سہروردی اس واقعہ کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”اور اللہ تعالیٰ نے اسی وقت میرے سینہ میں علم لدنی بھر دیا اور جب میں آپ کے آستانہ عالیہ سے واپس ہوا تو علم و حکمت کا کمال میری زبان پر تھا۔ نیز آپ نے مجھے ارشاد فرمایا کہ تم عراق کے متاخرین میں سے شہرہ آفاق شخصیت ہو گے۔“

مختلف سلاسل روحانی کے ان عظیم پیشواؤں کا دربار غوثیہ میں یہ خراج عقیدت فی الواقع حضور غوث الاعظم رحمۃ اللہ علیہ کے عالمگیر پیغام کی ابدی گواہی ہے۔ آپ نے ۹ سال میں علوم شریعت حاصل کئے اور پھر باقی عمر تعلیمات اسلامی کی ترویج میں بسر کر دی۔ اس سلسلہ میں خدائے کریم نے آپ کو روئے زمین کی سلطانی عطا کر دی۔ یہ سلطانی وقتی اور عارضی نہیں بلکہ دائمی اور پائیدار ہے کیونکہ بالاتفاق آپ غوث اعظم اور قطب مدار ہیں جن کے فیض روحانی اور قیادت و سیادت باطنی ہمیشہ باقی رہتی ہے۔

غوث اعظم درمیان اولیاء چوں محمد درمیان انبیاء
آپ نے اپنی عمر کے ابتدائی اٹھارہ سال اپنے مولود مسکن میں گزارے۔ ۹ سال بغداد شریف کے اندر علوم ظاہری و باطنی کی تحصیل و تکمیل کی خاطر مصروف رہے۔ پچیس سال عراق کے جنگلوں، بیابانوں اور ویران مقامات پر ریاضات کاملہ اور مجاہدات شاقہ سے منازل سلوک طے کیں پھر چالیس برس تک ارشاد و تلقین اعلائے کلمۃ الحق اور اصلاح خلق کا فریضہ انجام دیا۔

۱۵۵ھ کو آپ کی عمر اکانوے برس ہو چکی تھی کہ آپ کی صحت گرنا شروع ہوئی، مرض الموت

نے آلیا، آپ کو وفات سے پیشتر ہی اپنے ارتحال کا پتہ چل گیا تھا۔ علالت کے دوران میں بھی آپ نے تبلیغ دین اور اشاعت اسلام کا فریضہ ترک نہیں کیا۔ گیارہ ربیع الثانی کو وفات سے کچھ عرصہ پیشتر آپ نے اپنے عزیزوں اور عقیدت مندوں سے فرمایا:

”میرے آس پاس سے ہٹ جاؤ کیونکہ میں ظاہراً تمہارے ساتھ مگر باطناً تمہارے سوا کے ساتھ یعنی اللہ کریم کے ساتھ ہوں۔ بیشک میرے پاس تمہارے علاوہ کچھ اور حضرات بھی تشریف لائے ہوئے ہیں ان کے لئے جگہ فراغ کر دو۔ ان کے ساتھ ادب سے پیش آؤ اور ان پر جگہ تنگ نہ کرو۔“ جن تشریف لانے والوں کی طرف حضور غوث الاعظم رحمۃ اللہ علیہ نے اشارہ کیا تھا اور ملائکہ اور ارواح مقربین تھے۔ آپ بار بار آنے والوں کو سلام کا جواب دے رہے تھے۔ آپ بار بار ہاتھ مبارک اٹھاتے تھے اور ان کو دراز کرتے ہوئے زبان مبارک سے فرماتے تھے: **وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔** توبہ کرو اور صف میں داخل ہو جاؤ، میں ابھی تمہاری طرف آتا ہوں اس کے ساتھ ہی موت کے آثار شروع ہو گئے۔ کلمہ طیبہ اور آیات قرآنی کی تلاوت فرماتے ہوئے آپ کی آواز مبارک مٹنی ہو گئی، زبان تالو سے مل گئی اور روح مبارک نفس عنصری سے پرواز کر گئی۔

اور پھر اسلام تعلیمات کی روشنی پھیلانے والا وہ مہر عالم تاب خاک بغداد میں روپوش ہو گیا جس کی علمی و روحانی تجلیات ہر دور کے اصحاب فکر کے قلب و فکر کا اعزاز بنی رہیں گی۔ آپ کی وفات کی خبر سن کر لوگ آپ کے چہرے کی ایک جھلک دیکھنے کیلئے بے تابانہ آپ کی جائے قیام کی طرف دوڑتے، لوگوں کے اژدہام کا یہ عالم ہوا کہ دن میں آپ کی تدفین عمل میں نہ لائی جاسکی بلکہ آپ کو دوسری شب میں دفن کیا گیا۔ آپ کا مزار مبارک بغداد شریف کے مشرق میں واقع ہے۔ یہ وہی جگہ ہے جہاں آپ درس دیتے اور وعظ و ارشاد کی روحانی مجالس آباد کیا کرتے تھے۔ یہ وہی جگہ ہے جہاں بلاد عالم سے آنے والے بے شمار زائرین عقیدت و احترام کی ڈالیاں نذر کرتے اور آپ کے فیوض و برکات کی دولت بے بہا کو اپنے دامن میں سجا کر لوٹتے ہیں۔

مآخذ و مراجع

۱۔ بہجت الاسرار۔ نور الدین ابوالحسن علی بن یوسف بن جریر اللخمی الشطرنوی

۲۔ فلاند الجواہر۔ شیخ محمد بن یحییٰ التادنی الحسینی

Click For More Books

<https://archive.org/details/@zohaibhasanattari>

- ۳۔ نزہۃ الخاطر الفاتر۔ ملا علی بن سلطان محمد القاری
- ۴۔ طبقات الکبریٰ۔ علامہ عبدالوہاب شعرانی
- ۵۔ اخبار الاخیار۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی
- ۶۔ نجات الانس۔ ابوالعباس احمد بن محمد القسطلانی
- ۷۔ الروض الظاہر۔ ابوالعباس احمد بن محمد القسطلانی
- ۸۔ انوار الناظر۔ ابوبکر عبداللہ بن نصر التیمی
- ۹۔ مناقب الشیخ عبدالقادر۔ قطب الدین موسیٰ بن محمد نحسبیلی
- ۱۰۔ اسنی المفاخر۔ امام عبداللہ بن اسعد الیافعی
- ۱۱۔ روضۃ الناظر۔ مجد الدین ابوالطاہر محمد بن یعقوب
- ۱۲۔ جامع کرامات الاولیاء۔ علامہ یوسف نبہانی
- ۱۳۔ تفریح الخاطر۔ علامہ عبدالقادر الاربلی
- ۱۴۔ روض الریاحین۔ علامہ عبداللہ بن اسعد
- ۱۵۔ تذکرہ قادریہ۔ حضرت شیخ طاہر علاؤ الدین
- ۱۶۔ سیرت غوث اعظم۔ مولانا محمد داؤد فاروقی
- ۱۷۔ سیرت غوث الثقلین۔ مولانا محمد ضیاء اللہ قادری
- ۱۸۔ غوث اعظم۔ مولانا محمد احتشام الحسن
- ۱۹۔ سیرت غوث اعظم۔ مولانا نور بخش توکلی
- ۲۰۔ حضرت غوث الاعظم۔ پروفیسر محمد عنایت اللہ
- ۲۱۔ مقدمہ غنیۃ الطالبین۔ شمس بریلوی
- ۲۲۔ تحفہ میراں۔ حضرت میاں محمد بخش
- ۲۳۔ تحفہ قادریہ۔ حضرت ابوالعالی محمد بن سلیمی قادری
- ۲۴۔ خزینۃ الاصفیاء۔ مولانا غلام سرور لاہوری



حضرت خواجہ بہاؤ الدین زکریا ملتانی رحمۃ اللہ علیہ

رحمت خلاق ہیں ملتان کے یہ تاجدار
شوکت اسلام ہیں یہ معرفت کے رازدار
ان کی تعلیمات سے روشن ہے بزم زندگی
ہے مسلم قلب و جاں پر ان کی فکر پُر وقار
ان کا کردار حسین ہے صورت شمع یقین
ان کے افکار منور ہیں دل و جاں کا قرار
ان کی باتوں ان کی یادوں سے ہے دل کی زندگی
ان کے ملفوظات میں گلزار فطرت کی بہار
سہروردیت کے ایوانوں کی ہیں یہ روشنی
ان کا اُسوہ جان حکمت بزم فطرت کا نکھار
جو بھی انکے در پہ آیا کامرانی پا گیا
ان کا ہے دربار یا کہ رحمت پروردگار
ہیں رضا خواجہ بہاؤ الدین جان اولیاء
زینت تاریخ فطرت ہیں یہ مرد افتخار

(محمد اکرم رضا)

شیخ الاسلام

حضرت بہاؤ الدین زکریا ملتانی رحمۃ اللہ علیہ

اسلام کی تبلیغ و اشاعت اور فروغ دین کیلئے تمام سلاسل روحانیت کی خدمات اپنی جگہ مسلم ہیں۔ ان سلاسل روحانیت کے اکابرین اور ان کے بعد ان سلاسل روحانیت سے تعلق رکھنے والے بزرگوں نے فروغ اسلام کیلئے جدوجہد میں کوئی کسر اٹھا نہیں چھوڑی۔ حضرت بہاؤ الدین زکریا ملتانی رحمۃ اللہ علیہ سلسلہ عالیہ سہروردیہ کے عظیم شیخ طریقت تھے۔ آپ کو بلند علمی اور روحانی مرتبہ کی بناء پر شیخ الاسلام اور شیخ الشیوخ کے القاب سے یاد کیا جاتا ہے۔ آپ نے علوم دینیہ کی جی بھر کر تحصیل کی۔ محض ایک دو شہروں کے علماء اور اساتذہ تک ہی خود کو محدود نہیں رکھا بلکہ علم کی پیاس بجھانے کیلئے ہر اس جگہ اور شہر میں گئے جہاں آپ کو کسی سرچشمہ حکمت کی اُمید تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب آپ نے علوم دینیہ کی بلندیوں کو چھولیا تو زمانہ آپ کو شیخ الاسلام کے لقب سے پکارتے ہوئے آپ کے دامان علم کی طرف لپکنے لگا۔

علم و حکمت کی سر بلندی اپنی جگہ صاحب دل کو کسی ایسے مردِ رویش کی آرزو رہتی ہے جس سے وابستہ ہو کر وہ طریقت و روحانیت کے سفر کو بھی جاری رکھ سکے اور بالآخر معرفت الہی کی منزل عطا ہو جائے۔ حضرت شیخ بہاؤ الدین زکریا ملتانی رحمۃ اللہ علیہ اس لحاظ سے انتہائی خوش بخت تھے کہ جہاں آپ کو علوم دین کے حصول کیلئے دنیائے اسلام کے نامور فقیہ اور استاد میسر آئے وہاں آپ معرفت الہی کی تلاش میں آگے بڑھے تو فیاضی قدرت سے سلطان سہروردیت حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت میسر آگئی۔ شیخ کامل کی روحانی بلندیاں اپنی جگہ مرید صادق کا جذبہ طلب حق بھی دیدنی تھا۔ آپ نے سہروردیت کے انوار سمیٹنے شروع کئے تو فاصلے بہت جلد طے ہونے لگے۔ شیخ شہاب الدین سہروردی نے حضرت خواجہ بہاؤ الدین زکریا ملتانی کو اس قدر اور اس تمیزی سے نوازا کہ زمانہ حیران رہ گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے دینی اور روحانی علوم میں آپ کی شہرت برصغیر سے نکل کر دوسرے اسلامی ممالک تک پھیل گئی اور مخلوق خداوندی ہجوم در ہجوم آپ کی بارگاہ

رحمت پناہ میں حاضری دینے لگی۔

جنہیں میں ڈھونڈتا تھا آسمانوں میں زمینوں میں
جو دیکھا تو نکل آئے مرے دل کے مکینوں میں
تمنا درو دل کی ہے تو کر خدمت فقیروں کی
نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں

.....○.....

ممتاز تذکرہ نگاروں کے بقول شیخ الاسلام والمسلمین دین حق کی آبروتھے۔ آپ کی علمی جگمگاہوں سے بے شمار دل روشن ہوئے۔ فقط سرزمین ملتان ہی کو آپ پر ناز نہیں تھا بلکہ ملک کا کونہ کونہ آپ کے فیوض باطنی کی روشنی سے جگمگا رہا تھا۔ آپ علوم دین کے آفتاب اور علوم معرفت کے ماہتاب تھے۔ حضرت شیخ وحید الدین محمد غوث بن شیخ کمال الدین ابوبکر آپ کے والد ماجد تھے۔ آپ قریشی ہاشمی سلسلہ خاندان رکھتے تھے۔ آپ کا نسب تیرہویں پشت میں حضور آقائے دو عالم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے یعنی سردار مکہ حضرت ہاشم بن عبدمناف سے جا ملتا ہے۔

آپ کی ولادت ۱۵۶۶ھ مطابق ۱۷۱۷ء میں خطہ کوٹ کروڑ ضلع ڈیرہ غازی خاں میں ہوئی۔ جب ذرا بڑے ہوئے تو والد مکرم نے مولانا نصیر الدین بلخی کے پاس پڑھنے کیلئے بٹھایا اور سات سال کی عمر میں ہی قرآن مجید حسن قرأت کے ساتھ حفظ کر لیا۔ زان بعد علوم متداولہ کی طرف متوجہ ہوئے اور درسی کتب پڑھنے لگے والد گرامی شیخ محمد غوث ۱۷۷۷ھ میں انتقال فرما گئے تو آپ ان کے جانشین مقرر ہوئے۔

کچھ عرصہ بعد اسلامی ممالک کی سیر و سیاحت اور حج حرمین شریفین کیلئے گئے کئی سال بعد جب واپس آئے تو ملتان شریف میں اپنی مستقل سکونت اختیار کر لی۔ اس زمانہ میں آپ کو دارالسلطنت دہلی کی طرف سے شیخ الاسلام کا منصب ملا تھا۔

چونکہ آپ نہایت امیر کبیر رئیس تھے اس لئے آپ نے اپنا لاکھوں روپے کا خزانہ مال تجارت پر لگا دیا تھا۔ یہ تجارت عام طور پر دریاؤں کے ذریعے کشتیوں میں ہوا کرتی تھی۔ اس زمانہ میں دریائے راوی قلعہ ملتان اور قلعہ لاہور کے نیچے سے بہتا تھا اس لئے آپ کا مال لاہور بھی آتا جاتا تھا اور حضرت شیخ الاسلام مدینۃ الاولیاء لاہور کی عظمت سے بخوبی واقف تھے۔ تذکرہ حضرت بہاؤ الدین زکریا ملتانی میں لکھا ہے کہ آپ کا ایک مرید بدرجستانی لاہور میں رہتا تھا۔ ایک سال وہ

Click For More Books

<https://archive.org/details/@zohaibhasanattari>

نماز عید ادا کرنے کے لئے عید گاہ میں گیا تو بعد ادائے نماز عید اس نے دعا کی کہ اے باری تعالیٰ میں تیرا ایک ادنیٰ خادم ہوں اور تجھ سے عیدی چاہتا ہوں۔ دعا مانگنے کی دیر تھی کہ حریر کا سبز ٹکڑا خط سے لکھا ہوا آسمان سے اس کے ہاتھوں میں آٹکا کھول کر دیکھا تو اس میں تحریر تھا۔

”ہم نے اس عید سعید کی خوشی میں تم پر آتش دوزخ حرام کر دی۔“

بے شمار حضرات نے حضرت بہاؤ الدین زکریا ملتانی کے اس لاہوری مرید کی کرامت دیکھی تو اس کے ہاتھوں کو بوسہ دینے لگے۔ بلکہ ایک شخص نے آگے بڑھ کر کہا کہ یہ عیدی مجھے دے دیجئے چنانچہ بدرجہتانی نے یہ ٹکڑا اس کے حوالے کر دیا اور کہا کہ انشاء اللہ دوزخ تجھے نہیں چھوئے گی۔

ایک دوسرے موقع پر لکھا ہے کہ حضرت شیخ الاسلام کا ایک مرید لاہور میں دریائے راوی کے کنارے رہتا تھا اور اُسے کچھ اراضی بطور معافی ملی ہوئی تھی۔ ایک دفعہ حاکم لاہور کا کارندہ اُدھر سے گذرا تو اس درویش کی زمین کی پیمائش کرنے لگا اور کہا کہ تمہاری شکایت سرکار میں پہنچی ہے کہ تم نے کئی سالوں سے لگان ادا نہیں کیا۔ اس نے شاہی کارندہ کی بہت منت سماجت کی مگر وہ نہ مانا بلکہ اُلٹا کہا کہ اگر تمہارا پیر اتنا کامل ہے تو کوئی کرامت دکھا اور دریائے راوی کے پانی پر چل، درویش بر لب دریا کھڑا ہو گیا اور بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھ کر اور اپنے مرشد کو یاد کر کے دریا پر سے ایسے گزر گیا جیسے کوئی خشکی پر چلتا ہے۔ اس موقع پر دریائے راوی کے کنارے پر بے شمار افراد موجود تھے جنہوں نے یہ کرامت دیکھی تھی۔

ابتدائی تعلیم و تربیت سے فراغت حاصل کر کے آپ خراسان چلے گئے۔ جہاں اس زمانہ میں بڑی بڑی درسگاہیں تھیں۔ سات سال تک یہاں کے مشائخ سے علوم ظاہری و باطنی کی تکمیل کی۔ اس کے بعد بخارا چلے گئے اور متواتر کئی سال تک وہاں مقیم رہ کر اکتساب علم کیا۔ اس طرح آپ نے اس سفر میں تقریباً چار سو چالیس باکمال شیوخ سے فیضان حاصل کیا اور سند فضیلت حاصل کی۔

”سیر العارفين“ میں لکھا ہے کہ بخارا سے تکمیل علوم کے بعد آپ حرین شریفین کی طرف روانہ ہوئے اور مناسک حج ادا کرنے کے بعد مدینہ منورہ حاضر ہوئے۔ جہاں آپ پانچ سال تک قیام پذیر رہے۔ یہ مدت آپ نے مولانا کمال الدین محمد یمنی کی خدمت میں حدیث کا علم حاصل کرنے کیلئے گزار دی جو کہ اس زمانہ کے بہت بڑے محدث اور حرم نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں حدیث شریف کا درس دیا کرتے تھے۔ ہر سال آپ مولانا کے ساتھ مدینہ منورہ سے مکہ معظمہ تشریف لے جاتے اور حج ادا کر کے واپس لوٹ آتے۔

مدینہ منورہ میں کافی عرصہ گزارنے کے بعد حضرت غوث العالمین رحمۃ اللہ علیہ بیت المقدس کی طرف روانہ ہوئے۔ یہاں انبیائے کرام کے مزارات کی زیارت کی اور اس علاقہ میں بھی کافی پھرے۔ اس کے بعد آپ دمشق پہنچے پانچ سال تک وہاں کے مشائخ کرام سے فیضان حاصل کیا۔ دمشق سے آپ دن رات سفر کرتے کئی ماہ میں سمرقند پہنچے یہاں بھی آپ نے کئی ایک اساتذہ کے آگے زانوئے تلمذتہہ کر کے سند فضیلت و برکت حاصل کی اور علم و فضل کے لحاظ سے ایک یگانہ روزگار ہستی بن گئے۔

اب آپ تمام علوم ظاہری و باطنی کی تکمیل کے بعد پیر و مرشد کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے اور جنگلوں، بیابانوں، پہاڑوں، دریاؤں کو عبور کر کے بغداد شریف تشریف لے گئے۔ جہاں شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردی بھولی بھنگلی اور گمراہ مخلوق کو راہ ہدایت پر لانے کیلئے کوشاں تھے۔ چنانچہ آپ نے انتہائی ذوق و شوق سے چند ہی دنوں میں آپ سے خرقہ خلافت حاصل کیا اور وطن کی طرف روانہ ہوئے۔ آپ بغداد سے بخارا پہنچے اور پھر وہاں سے نیشاپور آئے۔ شیخ جلال الدین ترمیزی رحمۃ اللہ علیہ نے نیشاپور میں شیخ فرید الدین عطار سے ملاقات کی تھی۔ سفر بغداد میں شیخ فرید الدین مسعود گنج شکر آپ کے ساتھ تھے۔ کئی بار اجودھن تشریف لے گئے اور وہاں کئی کئی روز حضرت بابا صاحب سے صحبت رہی۔ اس صحبت میں شیخ جمال الدین ہانسوی رحمۃ اللہ علیہ بھی شریک صحبت رہے۔

اسی طرح آپ دنیائے جہاں کی سیر و سیاحت کر کے اور علم و حکمت اور فیوض و برکات حاصل کر کے ملتان تشریف لے آئے اور پھر ساری عمر اس شہر میں اھیائے اسلام کیلئے کام کرتے رہے۔ ظاہری علوم و فنون کی تکمیل کے بعد آپ تزکیہ نفس میں مشغول ہوئے اور متواتر بیس سال تک اس قدر سخت مجاہدات کئے اور اس قدر کٹھن منازل طے کیں کہ پڑھ کر حیرت ہوتی ہے۔ صاحب ”خلاصۃ العارفين“ لکھتے ہیں کہ ایک دفعہ جب آپ سے دریافت کیا گیا کہ آپ اپنے مجاہدات کا کوئی واقعہ بیان فرمائیں تو آپ نے فرمایا کہ ان کا تذکرہ بیان کرنا مناسب نہیں ہے کیونکہ اس سے غرور پیدا ہوتا ہے۔ بہر حال آپ کی دل شکنی مناسب نہیں اس لئے مجھے فقط اتنا کہنے میں باک نہیں کہ یہ فقیر کامل بیس سال ایک چھٹانک پانی اور ایک چھٹانک طعام پر روزہ افطار کرتا رہا ہے۔

جب آپ حج بیت اللہ کیلئے تشریف لے گئے تو ہر قدم پر دوگانہ ادا کیا۔ شیخ نظام الدین اولیاء فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت بہاؤ الدین زکریا ملتانی سراندیپ کی طرف تشریف لے گئے تو آپ کا قیام ایک پہاڑ ہر سال پر رہا اور وہاں آپ مجاہدہ میں مصروف رہے۔

جب آپ ملتان تشریف لائے تو آپ نے دیکھا کہ حاکم بدرآہ ہے اور قرامطہ کے بدعقائد کا بہت زور ہے۔ اس پر آپ نے قرامطہ کے غیر اسلامی نظریات کے اثر و نفوذ کو یکسر مٹانے کیلئے تبلیغی جماعتیں تیار کیں جن میں واعظ، مبلغ، عالم، مجذوب، صوفی اور فقیہ سبھی شامل ہوا کرتے تھے۔ ایک جماعت کو سندھ اور مکران کے علاقہ جات میں تبلیغ کیلئے بھیجا تو دوسری کو کشمیر روانہ کیا۔ دہلی کی طرف بھی ایک جماعت بھیجی گئی۔ علاوہ ازیں جہاں ضرورت محسوس کرتے خود اپنے موقر حضرات کے ساتھ تشریف لے جاتے۔ بالعموم موسم گرما میں سرحد، کشمیر، افغانستان، بخارا، نیشاپور کی طرف دورہ فرماتے اور سردی کے ایام میں راجپوتانہ، سندھ اور پنجاب کا سفر کرتے۔ یہ ایک ایسا تبلیغی مشن تھا جس سے ہزار ہا لوگوں نے راہ ہدایت اختیار کی۔ جہاں انجناب بابا فرید، حضرت لال شہباز قلندر، حضرت سید جلال بخاری رحمہم اللہ علیہم کے ساتھ ہندوستان کے دشوار گزار راستوں کو طے کر کے راجپوتانہ کے تپتے ہوئے ہلاکت خیز ریگستانوں میں خدا کا آخری پیغام پہنچانے کیلئے گئے۔ وہاں آپ دریائے سندھ، چناب، ستلج اور راوی کی تلامخیز موجوں سے بھی بے خوف و خطر آگے بڑھے اور سرگانے، ہراج، ہنپال، دولتانے، مرالی، چنڑ، لیارے، متبلے، کھوکھر، یومن، جوئے وغیرہ قبائل کو دائرہ اسلام میں شامل کیا۔ وہ علاقے جو کفر و الحاد کے گہوارے بنے ہوئے تھے آپ کی نظر سے اسلام کے دامن رحمت میں آ گئے۔

درویش خدا مست کبھی بھی کرامات کا سہارا نہیں لیتا، وہ کسی شعبہ بازی یا نظر بندی سے کام نہیں لیتا، اس کا مقصد تو فقط دین حق کی سرفرازی ہوتا ہے۔ وہ اسلام اور قرآن کے فروغ اور اشاعت کیلئے مصروف عمل رہتا ہے اور اس سلسلہ میں کسی قربانی سے دریغ نہیں کرتا۔ احیائے دین محمدی صلی اللہ علیہ وسلم اس کا مقصد اولیٰ ہوتا ہے۔ وہ اس سے حقیقت سے آگاہ ہوتا ہے کہ:

مری زندگی کا مقصد ترے دین کی سرفرازی

میں اسی لئے مسلمانوں میں اسی لئے نمازی

حضرت نظام الدین اولیاء دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ آپ شریعت کے معاملے میں بڑے سخت گیر تھے اور کسی صورت بھی شریعت کے برخلاف کوئی فعل یا عمل پسند نہ فرماتے تھے۔ یوں تو مختلف تذکروں میں آپ کی بے شمار کرامات و خوارق عادات تحریر کی گئی ہیں مگر یہاں صرف ایک ہی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

لکھا ہے کہ ایک دفعہ حضرت شیخ الاسلام نے غلبہ، ذوق و شوق میں ملتان شہر میں منادی کرا دیا

ی کہ آج جو شخص میرا منہ مبارک دیکھ لے گا میں قیامت کے دن اسے دوزخ کی آگ سے بچانے کی ضمانت دیتا ہوں۔“

جب لوگوں نے یہ ڈھنڈورا سنا تو گروہ درگروہ لوگ آپ کی زیارت کیلئے جمع ہو گئے۔ یہاں تک کہ خانقاہ عالیہ کا صحن کثرت ہجوم سے بھر گیا۔ یہ دیکھ کر آپ نے عوام کی سہولت کیلئے سواری کا گھوڑا طلب کیا اور سوار ہو کر شہر کی طرف روانہ ہوئے۔ تمام شہر اپنا اپنا کاروبار چھوڑ کر آپ کی طرف امنڈ پڑا۔ آپ ایک ایک سے ملتے مصافحہ کرتے اور فرماتے ”اے بھائی! خدا کی قسم قیامت کے دن تم دوزخ میں نہیں جاؤ گے باوجود کبرسنی اور ضعیفی کے آپ نے شہر کے تمام گلی کوچوں کا چکر کاٹا اور تمام لوگوں کو اپنی زیارت سے مستفید فرمایا۔

شیخ الشیوخ حضرت شہاب الدین ابو حفص عمر سہروردی جو آپ کے پیر و مرشد تھے کی رائے گرامی ملاحظہ فرمائیں۔

جب حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی بغداد شریف میں اپنے پیر و مرشد کی خدمت میں مکہ معظمہ مدینہ منورہ بیت المقدس اور شام و عراق کے مشائخ سے مستفید ہو کر بغداد شریف پہنچے تو جو حضرات ان کی خدمت میں بہت عرصہ سے حاضر تھے اور خلافت سے سرفراز نہ ہو سکے تھے۔ حضرت شیخ الاسلام بہاء الدین پر رشک کرنے لگے اور عرض کی کہ ”اس ہندی نے تو چند ہی دنوں میں خلافت کا شرف حاصل کر لیا لیکن ہم مدت سے اس آستانہ عالیہ پر پڑے ہیں لیکن ابھی تک محروم ہیں۔“ اس پر آپ نے ارشاد فرمایا کہ ”اے دوستو تم گیلی لکڑیوں کی مانند ہو جسے آگ فوری طور پر قبول نہیں کرتی۔ بہاء الدین خشک لکڑی کی طرح تھا جسے عشق الہی کی آگ نے جلد ہی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔“

آپ اپنے زمانے کے شیخ الاسلام تھے اور اس منصب پر فائز ہوئے۔ آپ کئی دفعہ دہلی تشریف لے گئے کئی سفروں میں حضرت بابا فرید الدین گنج شکر بھی ہمراہ ہوتے تھے۔ کئی دفعہ سلطان ٹمس الدین التمش کے دربار میں اس زمانہ کے علماء و مشائخ سے بحث مباحثہ بھی ہوا جس میں ہمیشہ آپ ہی کی جیت ہوا کرتی تھی۔ شیخ نظام الدین اولیاء دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ آپ حضرت خواجہ بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس وقت محفل سماع ترتیب دی گئی جس میں ان دونوں حضرات پر وجد طاری رہا۔ قیام دہلی میں شیخ حمید الدین رحمۃ اللہ علیہ سے بھی شرع کے دقیق مسائل پر کلام ہوا کرتی تھی۔ ایک دفعہ جب آپ دہلی گئے تو سلطان ٹمس الدین التمش سینکڑوں علماء اور مشائخ کو ساتھ لے کر آپ کے استقبال کیلئے نکلا۔ گھوڑے سے اتر کر

سلام کیا اور پیچھے پیچھے دہلی میں آپ کو لے کر داخل ہوا۔

درویش کے ارشادات دین اسلام کی تشریح و توضیح پر مبنی ہوتے ہیں۔ اس کے اقوال اس کے افعال کے ترجمان ہوتے ہیں اس لئے اہل نظر ان ارشادات عالیہ کو تاریخ کے اوراق کی زینت بنا کر رکھتے ہیں، دل و جان میں جگہ دیتے ہیں، انہیں اپنے لئے مشعل راہ بناتے ہیں۔ حضرت خواجہ بہاء الدین زکریا ملتانی رحمۃ اللہ علیہ کے اقوال عالی، علم و حکمت کا نچوڑ ہیں۔ راہ حق کے طلبگاروں کیلئے پیغام ہدایت ہے۔ اصحاب سلوک کے لئے سرمایہ ایمان و یقین ہیں۔

آپ نے ایک کتاب ”اوراد“ کے متعلق لکھی تھی جو اب موجود نہیں مگر اس کی شرح موجود ہے جس کا نام ”کنز العباد فی شرح الاوراد“ ہے جو حضرت رکن الدین رکن عالم ملتانی کے ایک مرید مولانا علی بن احمد غوری کی محنت کا ثمر ہے۔ یہ کتاب صوفیانہ رنگ کی فقہی کتاب ہے جس میں نماز، روزہ، طہارت وغیرہ کے مسائل لکھے گئے ہیں اور انہی مسائل کی مزید تشریح اس شرح میں کی گئی ہے۔ آپ کے دست مبارک کا ایک تحریر شدہ قرآن مجید کروڑ لال عیسن میں حضرت مخدوم لال عیسن رحمۃ اللہ علیہ کے مرقد منور کے سرہانے رکھا ہے۔ آپ نے حضرت داتا گنج بخش سید علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ کی مشہور زمانہ تالیف کشف المحجوب کو بھی اپنے دست مبارک سے تحریر فرمایا تھا جو اب چھپ چکی ہے۔

اب آپ کے چند ایک فرمودات و ارشادات ملاحظہ فرمائیں جو کہ ”شروط اربعین“ سے

ماخوذ ہیں۔

- ۱۔ سالک کو لازم ہے کہ ایسی نیت سے غسل کرے گویا یہ اس کا آخری غسل ہے۔
- ۲۔ سالک کو لازم ہے کہ اپنے دل میں نیت کرے کہ اُس نے خدا کی مخلوق کو بہت تکلیف دی ہے۔
- ۳۔ سالک کیلئے لازم ہے کہ ہمیشہ کلمہ طیبہ کا ذکر جاری رکھے۔
- ۴۔ سالک کیلئے لازم ہے کہ قدرت الہی کا مشاہدہ کرے۔
- ۵۔ سالک کیلئے لازم ہے کہ ہمیشہ رزق حلال کی طرف مائل رہے۔
- ۶۔ سالک کیلئے لازم ہے کہ پانچ وقت کی نماز باجماعت ادا کرے۔
- ۷۔ سالک کیلئے لازم ہے کہ اپنا پہلو زمین پر نہ لگائے۔

حضرت غوث الاعلیٰ شیخ الاسلام اپنے زمانے کے بہت بڑے عابد و زاہد تھے۔ لاکھوں کروڑوں کا مال ہونے کے باوجود آپ ساری عمر اخلاق محمدی کا پیکر کامل بنے رہے۔ تلاوت کلام

پاک آپ کا سب سے بڑا شغل تھا۔ ہر رات قرآن مجید کا ایک دور ختم کرتے تھے۔ اپنے زمانہ کے بڑے عارف کامل اور سالک راہ حقیقت تھے۔ یادِ الہی سے ایک لمحہ بھی غافل نہ ہوتے تھے۔ مادر زاد ولی تھے لاکھوں روپیہ حاجت مندوں، مسکینوں، یتیموں اور بیواؤں پر صرف کرتے تھے اور ان کی ہر ممکن امداد کیا کرتے تھے۔

آپ کی وفات ۷ صفر ۱۲۶۱ھ کو بھرم ۹۶ برس ملتان شریف میں ہوئی۔ اس دن آپ ظہر کی نماز پڑھ کر حجرہ میں تشریف لے گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد آپ کے صاحبزادہ حضرت صدر الدین عارف حجرہ کی طرف آئے تو ایک نورانی چہرہ کے مقدس بزرگ نے ان کو سبز رنگ کا ایک سر بمبر لٹافہ پیش کیا کہ اسے حضرت شیخ الاسلام کی خدمت اقدس میں پہنچا دیجئے۔ چنانچہ آپ خط اندر پہنچا کر باہر واپس نکل آئے تو قاصد وہاں موجود نہ تھا۔ اس دوران حجرہ کے چاروں کونوں سے آواز بلند ہوئی ”دوست بدوست رسید“

جب حضرت عارف باللہ رحمۃ اللہ علیہ گھبرا کر اندر گئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ آپ سجدے میں ہیں اور روحِ اعلیٰ علیین کو پرواز کر چکی ہے۔

آپ کا مقبرہ پرانے قلعہ ملتان کے روبرو واقع ہے۔ گذشتہ دنوں جب دقام الحروف اس آستانہ عالیہ پر حاضری کیلئے گیا تو عمارت کی ہیبت دیکھ کر لرزہ بر اندام ہو گیا۔ اس کے بڑے عظیم الشان دروازے پر لکھا ہے ”خانقاہ غوث العالمین حضرت غوث بہاء الحق والدین زکریا ملتانی رحمۃ اللہ علیہ تاریخ وفات ۷ صفر ۱۲۶۱ھ مقدس“ پاکستان میں اس قدر بلند اور عالیشان و رفیع الشان کوئی اور مقبرہ نہیں ہے۔ ایک روایت کے مطابق یہ مقبرہ سلاطینِ دہلی میں سے ایک بادشاہ نے اپنے لئے بنوایا تھا مگر اس کی قسمت میں یہ جگہ نہ ہو سکی اور آنحضرت کا مرقد منور یہاں بن گیا۔ آپ کے ساتھ مقبرہ کے نیچے اور بے شمار مزارات ہیں جو کہ آپ کے خاندان کے ہی افراد تھے اور بعد از وفات یہاں دفن ہوئے۔

روضہ مرجع خاص و عام ہے۔ لاکھوں کی تعداد میں لوگ حاضری دیتے ہیں اور فیوض و برکات اب بھی حاصل کرتے ہیں۔

ہر گز نیمرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

آج حضرت شیخ الاشیوخ حضرت خواجہ بہاؤ الدین زکریا ملتانی رحمۃ اللہ علیہ ظاہری وجود

کے ساتھ ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں بلکہ مدینۃ الاولیاء ملتان کی سرزمین پاک میں آرام کر رہے ہیں مگر آپ کا ہر پیغام آج بھی زندہ ہے۔ آپ کی سیرت اور کردار کی مشعلیں آج بھی جگمگا رہی ہیں کہ اے دنیا کے پرستارو کب تک ظلمت میں بھٹکے رہو گے کب تک مادیت کے صحرا میں گم رہو گے کیا ابھی تک تمہارے دل خدا کے خوف سے لرزنے پر آمادہ نہیں ہوئے۔ اگر تمہارے اندر معرفت کی طلب ہے مجھ سے محبت و عقیدت رکھتے ہو تو میری جانب چلے آؤ۔ میرا کردار دیکھو میرے عمل کے جگمگاتے ستارے دیکھو ان کی چمک دمک میں کبھی کمی نہیں آئے گی ان سے روشنی لو میرا اُسوہ وہی ہے جو سلطان دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا اُسوہ ہے۔ اسی کو اپنا لو دنیا کی سرخروئی بھی ملے گی اور عقبی کی کامیابی بھی۔



مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ

جہاں پہ نقش ہے عظمت مجدد الف ثانی کی
جمال فکر ہے حکمت مجدد الف ثانی کی
وہ جس کو دیکھ کر اہل یقین نے حوصلہ پایا
وہی ہے صورت و سیرت مجدد الف ثانی کی
ملا کر خاک میں ناز و غرور بادشاہی کو
ہے زندہ نقشبندیت مجدد الف ثانی کی
غرور اکبر و شانِ جہانگیری مٹے آخر
شکوہ دین تھی سطوت مجدد الف ثانی کی
نہیں دین محمد سے کوئی بھی برتر و بالا
یہی تھی ہند میں دعوت مجدد الف ثانی کی
جو کوئی دین کی تذلیل کرنے پر ہو آمادہ
تو پھر تازہ کرو سنت مجدد الف ثانی کی
مثال یوسفِ کنعان جب زنداں میں آئے
تو پھیلی چار سو شہرت مجدد الف ثانی کی
طریقت کا گلستاں ان کے مکتوبات نورانی
ہویدا جن سے ہے رفعت مجدد الف ثانی کی
نہ آئے رشک کیوں اس پر سلاطین زمانہ کو
میسر جس کو ہو نسبت مجدد الف ثانی کی
رضا بھی منقبت خواں ہے بصد اخلاص ایمانی
بسا کر قلب میں عظمت مجدد الف ثانی کی
(محمد اکرم رضا)

Click For More Books

<https://archive.org/details/@zohaibhasanattari>

تاجدار سرہند شریف

مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ

مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کا شمار برصغیر کے ان صوفیاء مشائخ میں ہوتا ہے جنہوں نے طریقت و معرفت کے گلستان کی آبیاری کرنے کے ساتھ ساتھ شریعت مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم کی بالاتری کیلئے ناقابل فراموش کردار ادا کیا۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ شاہنشاہوں سے ٹکرا کر آپ نے سنت شبیری زندہ کر دی بلکہ زندان میں مقید ہو کر سنت یوسفی علیہ السلام کی طرح نوڈالی۔ اسلام کا یہ عظیم فرزند تاریخ عالم اسلام کا اعزاز ہے۔ آج جب بھی باطل کی تاریکیاں قبضہ جاتی ہیں اور جلال پادشاہی اسلامی اقدار پامال کرنے کی کوشش کرتا ہے تو آپ کا اُسوہ شمع روشن بن کر ملت اسلامیہ کی راہنمائی کرتا ہے۔ آپ نے ایمانی عزیمت کا جو مظاہرہ مغل تاجداروں کے مقابلہ میں برصغیر کی فضاؤں میں کیا آج اس کی صدائے بازگشت پورے عالم اسلام میں گونج رہی ہے۔ آپ فقط نقشبندیہ کا ہی اعزاز نہیں بلکہ جملہ سلاسل روحانی سے نسبت رکھنے والے آپ کے فرمودات سے حیات نو حاصل کرتے ہیں۔ حکیم الامت علامہ محمد اقبال نے آپ کی جرأت ایمانی مد نظر رکھتے ہوئے ہی کہا تھا:

حاضر ہوا میں شیخ مجدد کی لحد پر
وہ خاک کہ ہے زیر فلک مطلع انوار
اس خاک کے ذروں سے ہیں شرمندہ ستارے
اس خاک میں پوشیدہ ہے وہ صاحب اسرار
گردن نہ جھکی جس کی جھانگیر کے آگے
جس کے نفس گرم سے ہے گرمی احرار
وہ ہند میں سرمایہ ملت کا نگہبان
اللہ نے بر وقت کیا جس کو خبردار

Click For More Books

<https://archive.org/details/@zohaibhasanattari>

آپ کا سلسلہ نسب حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔ حضرت شاہ کمال کیسقلی علیہ الرحمۃ نے آپ کے والد ماجد حضرت شیخ عبدالاحد رحمۃ اللہ علیہ کو آپ کی ولادت کی خوشخبری دیتے ہوئے فرمایا کہ تمہارے ہاں ایسا فرزند پیدا ہوگا جس کی برکت سے کفر و الحاد اور بدعت کی ظلمتیں دور ہو جائیں گی۔

چنانچہ چودہ شوال جمعہ کے روز ۱۷۹۹ھ میں بمقام سرہند آپ بزم آرائے عالم امکان ہوئے۔ چھوٹی عمر میں قرآن مجید حفظ کر لیا اور سترہ سال کی عمر میں تمام علوم معقول و منقول سے فارغ ہو گئے اور درس کی مسند پر بیٹھ گئے۔ فقر کی نسبت ابتداء میں اپنے والد بزرگوار سے حاصل کی۔ حضور رحمۃ اللہ علیہ کے والد چشتیہ سلسلہ کے مجاز اور اپنے وقت کے متقی عالم اور مجاہد صوفی تھے اور تھوڑے وقت میں کمالات حاصل کر کے سند اجازت حاصل کی۔

حضور رحمۃ اللہ علیہ کو حج بیت اللہ کا بڑا شوق تھا لیکن والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کی کبر سنی اس شوق کی راہ میں مانع تھی۔ ۱۸۰۸ھ میں ان کا وصال ہوا تو آپ رحمۃ اللہ علیہ ۱۸۰۸ھ میں حج کے ارادہ سے چل پڑے۔ جب دہلی پہنچے تو حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات ہوئی۔ حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ نے آپ رحمۃ اللہ علیہ کی باطنی استعداد ملاحظہ فرمائی اور نقشبندی سلسلے میں حضور رحمۃ اللہ علیہ کے کمال اشتیاق کو دیکھا اور داخل سلسلہ فرمایا۔ تھوڑے عرصے میں آپ رحمۃ اللہ علیہ نے وصال الی اللہ کے تمام مراتب طے کئے۔

حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کے حوالہ سے فرمایا کہ میں نے جو دکان کھولی تھی وہ بجز اللہ ان کے داخل سلسلہ ہونے اور حصول نسبت سے فائدہ میں رہی اور حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے دونوں بیٹوں خواجہ عبد اللہ اور خواجہ عبید اللہ کی کم سنی کے باوجود حضور رحمۃ اللہ علیہ کی توجہ میں دے دیا۔ جب دوسری مرتبہ حضرت مجدد علیہ الرحمۃ اپنے پیر و مرشد سے رخصت ہوئے تو سرہند شریف چند روز قیام فرمایا، پھر لاہور تشریف لائے اور یہاں بھی کسب فیض کرنے والے ہزاروں پروانے تھے۔ سرہند ہی میں حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ کی خبر وفات ملی ۱۲۰۸ھ تھا، آپ نے اکتالیس سال کی عمر پائی لیکن کام وہ کر گئے کہ صدیوں زندہ رہ کر بھی اتنا بڑا کام مشکل ہوتا ہے۔ آپ نے ایک مجدد بنایا اور ایک صدی کا مجدد نہیں۔ ایک ہزار سال کا مجدد بنایا۔ خبر وفات سن کر حضرت مجدد دہلی تشریف لے گئے۔ سب اہل سلسلہ اور حضور کی اولاد امجاد نے آپ کی تشریف آوری اور آپ کے وجود کو غنیمت سمجھا گویا موسم بہاراں پھر واپس آ گیا۔

قیام دہلی میں اکبر کے دین الہی اور اس کی خرابیوں کی اطلاع ملی اور اکبری امراء میں خان خانان صدر جہان خان اعظم جیسے مقتدر حضرات کو حضور مجدد کی بیعت کا شرف بھی حاصل تھا اور وہ اکبر کی بے دینی سے سخت پریشان تھے۔ ابوالفضل اور فیضی جیسے علماء دنیا پرست اکبر کے مشیر مذہبی تھے اس لئے اکبر کے سامنے ذہنی رکاوٹیں ختم تھیں اور اس نے دین الہی کے سلسلے میں اپنی من مانیوں کیں۔ کفر کو اسلام بنایا اور ترک اسلام کو اسلام ثابت کیا۔ اعاذنا اللہ

ایسی صورت میں بعض صالح امراء حضرت مجدد علیہ الرحمۃ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ سے درخواست کی کہ حضور! ہمیں اس بلا سے نجات دلائیں۔ حضرت نے بلا کسی کھٹکے کے اکبر کو پیغام بھیجا کہ آپ اپنی اس تمام بے دینی سے توبہ کریں۔ ورنہ خدا کے غضب کا انتظار کریں۔ کامل کی نظر اوپر کو بھی اٹھتی ہے اور کبھی نیچے کو بھی گرتی ہے۔ کام بنانے پہ آجائے تو بگڑی بن جاتی ہے اور غضب آلود ہو جائے تو بنا بنایا کھیل بگڑ جاتا ہے۔

نظر کی جولانیاں نہ پوچھو نظر حقیقت میں وہ نظر ہے
اٹھے تو بجلی پناہ مانگے گرے تو خانہ خراب کر دے

اکبر کی وفات کے بعد جہانگیر تخت سلطنت پر بیٹھا۔ یہ نوجوان اپنے طور طریقوں سے وہی کچھ تھا جو ناز پروردہ شاہزادے ہوتے ہیں۔ دین کے معاملے میں بھی یہ اپنے باپ کا پیرو تھا اور انہی طور طریقوں کو رواج دینا شروع کیا۔ بارگاہ جہانگیری میں حضور رحمۃ اللہ علیہ کے غلاموں کا بھی کافی اثر و رسوخ تھا جس کی بناء پر آصف جاہ وغیرہ اندرونی طور پر حضور رحمۃ اللہ علیہ کے دشمن تھے اور بادشاہ کو بھڑکانے کا موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتے۔ بادشاہ اپنے معتمد امراء کے مبالغہ آمیز بیانات سے متاثر ہوا اور ملک بھر میں جاسوس پھیلا دیئے کہ مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات کی اطلاع ہر وقت بارگاہ میں پہنچتی رہے۔

جہانگیر نے سازشی امراء کے مشورے پر طے کیا۔ حضرت علیہ الرحمۃ کو مع خلفا اور ہمراہیان و معتقدین دین الہی پیش کیا جائے وہ نہ مانیں تو شہید کر دیا جائے۔ بادشاہ نے لطائف الحیل سے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو دار الخلافہ میں بلایا۔ آداب شاہی کا طالب ہوا، مثلاً سجدہ وغیرہ تو حضور رحمۃ اللہ علیہ نے انکار کر دیا اور بعض امور پر تو خاصہ بحث مباحثہ ہوا لیکن ہر بات میں حضور رحمۃ اللہ علیہ کو فتح ہوئی۔ بڑے آدمی چڑے چڑے بھی ہوتے ہیں، جہانگیر اپنی ذہنی شکست سے چڑے چڑا ہوا تو حضور رحمۃ اللہ علیہ کے دشمنوں کو موقع ملا۔ انہوں نے بادشاہ کو بھڑکایا اور حضور رحمۃ اللہ علیہ کو بمعہ خلفا اور تمام

ہمراہیان و معتقدین و غلامان نظر بند کر دیا اور دربار کے ایک امیر الامراء کے سپرد آپ کی نگرانی ہوئی لیکن وہ امیر حضور کے استقلال کے علاوہ آپ کی تاثیرات سے متاثر ہوا اور حضور کی عزت و حرمت اور آرام و راحت کا خیال رکھا۔ بلکہ خدام و خلفا کو بھی کسی قسم کی اذیت نہ پہنچی اور وہ خود حضور رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہوا، لوگوں کو حصول فیض کی اجازت عام تھی۔ جب بادشاہ کو اس حال کا علم ہوا تو اس نے حضور کو گوالیار کے قلعہ میں قید کر دیا۔

گوالیار کے قلعہ میں ابتداء میں جو رو اذیت ہوئی اور حضور کے خلفا خدام شاہی پر ناراض ہوئے کہ ہم بادشاہ کی قید میں نہیں، ہم اپنے شہنشاہ کی قید میں ہیں۔ اگر تم باز نہ آئے تو تمہارے قلعوں کی اور تمہاری حکومت کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے اور کئی قسم کی کرامات ظاہر ہونے لگیں۔ حضور رحمۃ اللہ علیہ کو جب اپنے خلفا کی اس بے صبری کا علم ہوا تو آپ ناراض ہوئے کہ ہم یہاں کرامات دکھلانے نہیں آئے، ہم تو یہاں اپنے صبر اور اپنی برداشت کا امتحان دینے آئے ہیں۔ کچھ دنوں بعد گوالیار کے قلعہ والے بھی متاثر ہوئے۔ عفوِ تقصیرات کی اور حضور رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہو گئے اور وہاں رہ کر اس فیض مجسم نے ہزاروں کو فیضیاب کیا بلکہ قیدیوں کی روحانی اصلاح فرمائی اور چوروں کو قطب بنایا۔

جہانگیری امرا جو حضرت مجدد علیہ الرحمۃ کے فیض یافتہ تھے جب اپنے پیرو مرشد کی اس قید و بند سے مطلع ہوئے تو سخت غضبناک ہوئے اور جہانگیر سے بغاوت کی ٹھانی، کابل کے گورنر مہابت خان کو اپنا امیر تسلیم کیا۔ اُس نے بدخشاں، توران، خراسان وغیرہ کے بادشاہوں سے امداد لی اور ایک بھاری لشکر لے کر جہانگیر کے مقابلے میں آیا۔ جہانگیر کو جب خبر ملی تو اُس نے پہلے تو ایک ہزار افسر گوالیار کے قلعے کی حفاظت کیلئے متعین کئے اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے عقیدت مند امرا کو دھمکی دی کہ میں تمہارے پیرو مرشد کو قتل کر دوں گا۔ ادھر امرا کو حضرت نے تسلی دی تھی کہ بادشاہ قید کے سوا کوئی دوسری زیادتی نہیں کر پائے گا اور حضرت کے تصرف سے تمام محافلین قلعہ بھی حضور کی عقیدت میں شامل ہو گئے تھے۔ اس لئے بھی بادشاہ کی دھمکی کی پرواہ نہ کی گئی۔ ادھر مہابت خان برابر بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ جہانگیر ایک بھاری لشکر لے کر اس کے مقابلے میں گیا۔ دریائے جہلم کے کنارے دونوں فوجیں آمنے سامنے تھیں۔ بادشاہ کی جنگ میں مصروفیت کو دیکھ کر حضور کے وہ غلامان جو اپنے اپنے علاقے کے گورنر تھے انہوں نے اتفاق کیا اور بادشاہ کے طرفداروں کو الگ کر دیا اور حضرت کی خدمت میں لکھا کہ حضور رحمۃ اللہ علیہ مند سلطنت خالی ہے۔ آپ اس کو زینت بخشیں۔ حضور نے

امراء کی اس درخواست کو دیکھا اور فرمایا کہ:

”مجھے سلطنت کی کوئی خواہش نہیں اور میں تمہارے اس فتنہ و فساد کو بھی پسند نہیں کرتا“ میری قید و بند کی یہ تکلیف کسی اور (روحانی) مقصد کیلئے ہے جب وہ مقصد حل ہو جائے گا تمہاری کوششوں کے بغیر میں آزاد ہو جاؤں گا اور تمہارا یہ فساد میرے اس کام میں حرج پیدا کر رہا ہے۔ بہتر ہے کہ تم لوگ بغاوت سے باز آ جاؤ اور اپنے بادشاہ کی اطاعت قبول کر لو اور میں انشاء اللہ جلدی رہا ہو جاؤں گا۔“

شاہی لشکر جب مہابت خان کے مقابلے میں آیا تو حضرت مجدد کے وہ غلام جو لشکر میں شامل تھے مہابت خان کے ساتھ مل گئے اور جہانگیر کو قید کر لیا۔ اس کا وزیر اور بیگم نور جہاں بھی قید ہو گئے۔ مہابت خان ان کو قتل کرنا ہی چاہتا تھا کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا خط مہابت خان کو ملا۔

چونکہ حکمت اور قدرت خداوندی جہانگیر کو حضور کی غلامی کا شرف بخشنا چاہتی تھی اس لئے مہابت خان بادشاہ کے پاس خود آیا اور حضور رحمۃ اللہ علیہ کا خط سنایا اور کہا کہ میں تعمیل ارشاد میں آپ لوگوں کو رہا کرتا ہوں۔ پھر اسی طرح دست بستہ آداب شاہانہ بجا لایا۔ بادشاہ تخت پر بیٹھا مہابت خان کا قصور معاف کیا اور اس پر عنایات کیں پھر کشمیر کی طرف چلا گیا۔ ادھر شاہزادہ شاہجہان اور خود نور جہاں حضور کی رہائی کی کوشش میں لگ گئے لیکن وزیر بے تدبیر مانع آیا۔ دراصل اس تاخیر کی وجہ بھی وہی تھی کہ ابھی جلال الہی کے مراتب کی سیر باقی تھی اور مقصد اعلیٰ کی تکمیل ابھی ہو رہی تھی۔ آخر وہ وقت بھی آ گیا کہ یہ رحمت خداوندی آزادی کے ساتھ ہر طالب مولیٰ کے دل پر برسے۔ حضور کو القا ہوا کہ جن اہم امور کیلئے تم کو قید میں رکھا گیا تھا وہ ہم نے اب اپنے فضل و کرم سے پورے کر دیئے ہیں اب زندان سے نکلنے کا وقت آ پہنچا ہے۔“

حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے فوراً نماز شکرانہ ادا فرمائی اور اپنے غلاموں کو یہ خوشخبری سنائی جہانگیر کشمیر میں تھا وہاں وہ عالم خواب میں سخت خوفزدہ ہوا جب دیکھا کہ حضرت امام مجدد آئے ہیں اور تخت سمیت اوندھا ہو گیا ہے۔ جہانگیر پر غشی طاری ہو گئی پھر کمزور ہو گیا پیشاب بند ہو گیا اور طرح طرح کی پریشانیوں میں گرفتار شاہزادہ شاہجہان نے کہا کہ یہ سب بلائیں ایک ہی وجہ سے ہیں اور وہ قید ہے مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی۔ بادشاہ متنبہ ہوا اور ایک درخواست لکھی اور اپنے قصور سے معافی چاہی اور گوالیار کے افسروں کو لکھا کہ حضرت مجدد کو فوراً رہا کر دو۔ حضور رحمۃ اللہ علیہ نے جواب میں لکھا کہ میں ان چند شرطوں پر قلعہ سے باہر آؤں گا۔

بادشاہ کو سجدہ کرنا باطل قرار دیا جائے۔

۲۔ سارے ملک میں مسلمانوں کو گاؤ کشی کی اجازت ہو اور بادشاہ اپنے ہاتھ سے ایک گائے ذبح کرے۔

۳۔ سارے ملک میں جہاں جہاں مسجدیں شہید ہوئیں وہ دوبارہ تعمیر ہوں۔

۴۔ ایک جامع مسجد دربار عام کے مقابلے میں بنائی جائے جہاں عام مسلمان نماز پڑھیں۔

۵۔ مفتی، قاضی، محتسب وغیرہ حکام شریعت کے قواعد کے مطابق مقرر ہوں۔

۶۔ کفار سے جزیہ لیا جائے جیسا کہ حکم شرع ہے۔

۷۔ تمام خلاف شریعت قانون منسوخ کئے جائیں۔

۸۔ بدعت کی تمام رسوم کو بند کر دیا جائے۔

۹۔ ہندوستان بھر میں تمام قیدی رہا کئے جائیں۔

ادھر بادشاہ نے خواب دیکھا کہ تمام بیماریوں کا دفتیہ اور سلطنت کا قرار و قیام حضرت مجدد الف ثانی کی دعا و توجہ سے وابستہ ہے۔ بادشاہ نے تمام شرائط منظور کر لیں۔ بادشاہ نے ایک خاص جماعت مقربین حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو لینے کو بھیجی۔ ہندوستان بھر میں تمام قیدی رہا ہو گئے لیکن گوالیار کے قلعہ کے قیدی حضور رحمۃ اللہ علیہ کے ایسے فریفتہ ہوئے کہ وہ پھر عمر بھر حضور رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ رہے اور سر ہند آ گئے۔

۔ آگیا اب تو مجھے لطف اسیری صیاد

ذبح کر ڈال مگر قید سے آزاد نہ کر

حضور رحمۃ اللہ علیہ نے سر ہند شریف میں چند یوم قیام فرمایا پھر کشمیر تشریف لے گئے۔ بادشاہ بیمار پڑا تھا اپنے ولی عہد شاہجہان کو اور وزیروں کو استقبال کیلئے بھیجا اور صحت کی دعا کیلئے درخواست کی۔ حضور رحمۃ اللہ علیہ نے وٹو کیلئے برتن طلب فرمایا تو سونے کا کوزہ اور چالچی لائے گئے۔ حضور نے فرمایا یہ برتن حرام ہیں بادشاہ شریعت سے بے خبر تھا اس کو حلال و حرام کی اصطلاحیں آتی نہ تھیں۔ پوچھا کہ حضور رحمۃ اللہ علیہ حرام کس کو کہتے ہیں؟ نور جہاں نے شیشے کے برتن بھیج دیئے۔ آپ نے وضو فرمایا:

حضور رحمۃ اللہ علیہ نے نماز پڑھی اور فرمایا میں دعا کرتا ہوں اور تو بھی بارگاہ الہی میں گریہ و زاری کر۔ بادشاہ نے کہا: حضور! مجھے رونا نہیں آتا میں سر نہکا کر دیتا ہوں اور عاجزی پیش کرتا

ہوں۔ الحمد للہ حضور کی دعا و توجہ سے جہانگیر کی دنیا بدل گئی، اُس نے توبہ کی اور شرائط کے بموجب احکام شرعیہ جاری کر دیئے اور بدعت کے دروازے بند ہو گئے۔ پھر اُس نے بیعت ہونے کی درخواست کی جو منظور ہو گئی۔ اب بادشاہ بادشاہ نہیں حضور رحمۃ اللہ علیہ کا غلام ہے اور صف درویشاں میں بٹھائے جانے کے قابل۔ اسلام کا بول بالا ہوا اور کفر و شرک کی رسوم عملاً باطل قرار دی گئیں۔ شریعت کے احکام کو رونق ہوئی۔ بادشاہ مع امراء دربار عام کے سامنے مسجد میں نماز کیلئے جاتا اور حضور رحمۃ اللہ علیہ کے پیچھے نماز پڑھتا۔

بادشاہ نے درخواست کی کہ حضور آپ کچھ مدت میرے ہمراہ رہیں۔ درخواست قبول ہوئی، بادشاہ روزانہ خدمت اقدس میں حاضر ہوتا، ندامت کا اظہار کرتا اور خاتمہ بالخیر کی دعا چاہتا۔ حضور رحمۃ اللہ علیہ بھی بہت مہربانی فرماتے اور تسلی دیتے، بادشاہ مع لشکر حضور رحمۃ اللہ علیہ کے ہمراہ سرہند شریف آیا، چار ماہ یہاں قیام کیا اور ہر شہر اور ہر قصبہ میں مسجدیں تعمیر کرائیں۔ اس کے بعد حضور رحمۃ اللہ علیہ دہلی، بنارس اور اجمیر شریف شاہی لشکر کے ساتھ گئے پھر واپس سرہند کی سر زمین پاک میں تشریف لے آئے۔

اب کفر و ضلالت کی تاریکیاں مٹ چکی تھیں۔ آپ نے تمام توجہات عبادات اور خلق خدا کی راہنمائی کی جانب مبذول کر دیں۔ آپ نے رشد و ہدایت کا سلسلہ حضرت خواجہ محمد معصوم رحمۃ اللہ علیہ کے سپرد کر کے فرمایا کہ اب ہمیں چالیس پچاس دن کے اندر سفر کرنا ہو گا اور پھر اپنی قبر کی جگہ کے بارے میں واضح ارشاد فرما دیا۔ آپ کے خدام دن رات آپ کے ہمراہ رہتے۔

۲۷ صفر المظفر کی شب کو حضور رحمۃ اللہ علیہ نے خدام سے فرمایا کہ آپ لوگوں نے بڑی تکلیف اٹھائی، بس آج کی رات ہے۔ تیسرا حصہ رات کو اٹھ کر وضو فرمایا، تہجد ادا کی اور فرمایا کہ یہ آخری تہجد ہے۔

پھر حضور رحمۃ اللہ علیہ اپنے وظیفہ اسم ذات میں مشغول ہو گئے۔ صبح نماز پڑھی، اشراق ادا کئے پھر روئے جاناں کی دید میں مشغول ہوئے، تھوڑے وقت کے بعد فقر و تصوف کا یہ آفتاب اور احیائے شریعت کا یہ مسیحا اور سنت سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ شیدا جس کی ساری عمر تجدید شریعت و طریقت میں گزری تھی واصل بحق ہوا۔ آپ کی تاریخ وصال ۲۹ صفر المظفر ۱۰۲۳ھ ہے۔

آپ نے احیائے دین حق کیلئے جہاں اکبر اعظم کے جلال بادشاہی اور نور الدین جہانگیر کے تکبر کو خاک میں ملا کر عظمت اسلام کے چراغ روشن کر دیئے وہاں آپ نے دیکھا کہ جاہل صوفیوں

اور نام نہاد درویشوں نے اسلام کی صورت ہی مسخ کر دی ہے۔ اس مقصد کی خاطر آپ نے مسلمانوں میں پھیلی ہوئی خلاف اسلام غلط رسوم اور بدعات کے خلاف جہاد کیا اور مسلمانوں کو صراطِ مستقیم پر گامزن کرنے کی کوشش کی۔

آپ نے اکثر شرکیہ افعال کی نشاندہی کی اور واضح دلائل کے ساتھ ثابت کیا کہ امتدادِ زمانہ سے جو امور جہالت سے اسلام میں داخل کئے جا چکے ہیں اور جن سے اسلام اور مسلم معاشرے کی صورت غبارِ آلود ہو چکی ہے ان کو قبول کرنا اسلام کی حقانیت پر گہرے یقین کے منافی اور دانش و بینش کے قطعی خلاف ہے۔

آپ نے ابنِ العربی کے نظریہ وحدت الوجود (ہمہ اوست) پر تنقید کی اور اس کے مقابلہ میں وحدت الشہود (ہمہ از اوست) کے نظریے کی بنیاد رکھی جو شریعتِ محمدی کے اصولوں کے خلاف تھا، نہ عوام کی ذہنی سطح سے بلند تھا۔ اس مقصد کی خاطر آپ کے مکتوبات عالیہ نے اہم کردار ادا کیا۔ آپ نے فرمایا: بعض لوگ اس بات سے تو عار رکھتے ہیں کہ تختِ شاہی کو تعلقات کی گندگیوں سے ملوث کریں لیکن اس سے نہیں شرماتے کہ حق تعالیٰ کے ملک میں لات و عزیٰ کو شریک کریں۔ بھائیو! یہاں تو دینِ خالص طلب کیا جاتا ہے (جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا) خبردار! دین صرف اللہ ہی کے لئے ہونا چاہیے اور خدا کے ساتھ ذرا سی شرکت کی بھی اجازت نہیں ہے۔ (اللہ تعالیٰ فرماتا ہے) اگر تم نے شرک کیا تو تمہارا سارا عمل حبط ہو جائے گا، ایک گھڑی اپنی حالت پر غور کرو اگر یہ دینِ خالص حاصل ہو چکا تو تمہارے لئے بشارت ہے ورنہ واقعے کے پیش آنے سے پہلے راہِ حق پر گامزن و جانا جہاں معمولی سی بدعت یا گمراہی کی اجازت بھی نہیں ہے۔“

(مکتوبات جلد ۱، نمبر ۱۷۶)

جاہل صوفیاء نے یہ مشہور کر رکھا تھا کہ کاملوں کیلئے سنن تو درکنار فرائض تک ترک کر دینے میں کوئی قباحت نہیں لیکن رسول اکرم اور صحابہ کرام سے زیادہ ولی اللہ تو کوئی نہیں ہو سکتا اور اگر انہوں نے فرائض و نوافل کو نہیں چھوڑا تو پھر کس کی ہمت ہے کہ جو ولایت کا دعویٰ کرے لیکن اللہ اور اس کے رسول کے احکامات کو پس پشت ڈالے..... بعض صوفیہ نے کشف و کرامت ہی کو معیارِ ولایت قرار دے لیا تھا۔ آپ نے واضح کیا کہ کشف و کرامت سے حاصل شدہ نتائج ظن و تخمین پر مبنی ہوتے ہیں اس لئے ان پر ولایت اور بزرگی کا دار و مدار نہیں اور نہ ہی ان کے ماننے پر کسی کو مجبور کیا جاسکتا ہے اور نہ ان کے صین حقیقت ہونے کا دعویٰ درست ہے۔

آپ نے کشف و کرامت کی بجائے اتباع سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر زور دیتے ہوئے فرمایا:

اسی میں تمہاری دنیاوی سرخروئی اور اخروی نجات ہے۔ آپ اتباع مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ایمان سمجھتے تھے۔
ایک جگہ فرماتے ہیں:

بنیاد اتباع سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ یہ فقیر خاص اپنی حالت کا جائزہ لے کر لکھتا ہے کہ ایک مدت تک علوم و معارف و احوال و مقامات کی بارشیں ابر نیساں کی طرح برسائی گئیں اور جو کام مجھے کرنا چاہیے تھا وہ خدا کی مہربانی سے ہو گیا۔ اب اس کے سوا کوئی آرزو باقی نہیں رہی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں میں سے کوئی سنت زندہ کی جاسکے اور حال کی باتیں اہل ذوق کے سپرد کی جائیں۔

آپ کی مشہور تصانیف مکتوبات شریف، معارف الدنیا، مکاشفات غیبیہ ہیں۔ شرح رباعیات حضرت باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ بھی ایک وقیع تالیف ہے۔

حضرت امام ربانی شرک و طغیان کے تاریک دور میں دین حنیف کی تجلیاں بکھیرتے رہے۔ قرآن حکیم ایسے ہی علمائے حق کو اولیاء اللہ کے معزز لقب سے نوازتا ہے۔ تاریخ مسلمانان ہند و پاک آپ کی تجدید توحید و دین کی گراں قدر مساعی پر حشر تک ناز کرے گی۔



حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ

سرورِ دین کی دعا میرے معین الدین ہیں
سرگروہِ اولیاء میرے معین الدین ہیں
ہند کے ظلمت کدوں کو آپ نے روشن کیا
شمعِ ایماں کی ضیاء میرے معین الدین ہیں
توڑ ڈالا آپ نے باطل خداؤں کا طلسم
رہنمائے اصفیا میرے معین الدین ہیں
ہر طرف لہرا دیا پرچمِ شہِ کونین کا
منبعِ جود و سخا میرے معین الدین ہیں
آپ کے فیضان کے جاری ہیں ہر سو سلسلے
نورِ فطرت کی ضیاء میرے معین الدین ہیں
آپ کے دم سے طریقت اور شریعت کو فروغ
مخزنِ لطف و عطا میرے معین الدین ہیں
رہبرِ عشاق احمد مظہرِ اسرارِ حق
جانِ تسلیم و رضا میرے معین الدین ہیں
نذر کرتا ہے رضا بہر عقیدت چند پھول
پیکرِ صدق و صفا میرے معین الدین ہیں

(محمد اکرم رضا)

Click For More Books

<https://archive.org/details/@zohaibhasanattari>

خواجہ خواجگان

حضرت خواجہ محمد معین الدین چشتی اجمیری رحمۃ اللہ علیہ

دُنیا کا شاید ہی کوئی ایسا خطہ ہو جہاں مبلغین اسلام کے قدم نہ پہنچے ہوں اور جہاں انہوں نے اشاعت اسلام کا پرچم نہ لہرایا ہو۔ زمانے بھر پھیلتی ہوئی تعلیمات اسلامی کی روشنی انہی صوفیائے کرام اور اولیائے عظام کا صدقہ ہے جن کا ہر عمل قرآن حکیم اور سنت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا آئینہ دار تھا۔ اس لئے ان کے قدم جہاں بھی پہنچے وہیں شمع اسلام کی لافانی روشنی نے عوام الناس کے دلوں میں گھر کر لیا اور زمانے کا زمانہ حلقہ بگوش اسلام ہوتا گیا۔ انہی محسنین اسلام میں خواجہ خواجگان حضرت خواجہ محمد معین الدین چشتی اجمیری کا رحمۃ اللہ علیہ کا نام نامی ماہتاب ہدایت کی صورت جگمگا رہا ہے۔

جلوۂ حق کی ضیاء خواجہ معین الدین ہیں شاہِ بطحا کی دُعا خواجہ معین الدین ہیں ہند میں اسلام کے پرچم کو اونچا کر دیا سرگروہِ اولیاءِ خواجہ معین الدین ہیں ہند کا برطانوی وائسرائے لارڈ کرزن کہا کرتا تھا کہ میں نے اپنی زندگی میں دو ایسے بزرگ دیکھے ہیں جو اپنی وفات کے بعد بھی لوگوں کے دلوں پر اس طرح حکمرانی کر رہے ہیں کہ جیسے بہ نفس نفیس اُن کے یہاں موجود ہوں۔ اُن میں سے ایک تو مغلیہ حکمران اورنگ زیب عالمگیر ہے اور دوسرے خواجہ معین الدین اجمیری۔

اورنگ زیب عالمگیر کی مقبولیت و ہر دل عزیز کی بارے میں لارڈ کرزن کا کہا سچ ہو یا نہ ہو لیکن اس میں کوئی کلاء نہیں۔ صرف معین الدین چشتی کی مقبولیت کے بارے میں اُس کا قول حرفِ بحرف حقیقت ہے۔

سلطانِ ہند خواجہ معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ جو برصغیر کے عوام کے دلوں پر خواجہ غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے حکمرانی کرتے ہیں۔ ایک..... کمال میں یکتا، قطب المشائخ بزرگِ کامل درویش تھے۔ عمر کے پہلے پندرہ سولہ سال کا عرصہ اپنے حال میں مست و سرشار ہو..... نہ حال پر نظر نہ مستقبل کی فکر باب فوت ہو چکا تھا۔ منزل مقصود میں تھے۔ لہذا باب کا چھوڑا ہوا ترکہ جو

کہ ایک اور پن چکی پر مشتمل تھا، کو سنبھالا۔ صبح سے شام تک باغ کی نگہداشت کرنا، پرندوں سے پودوں کو بچانا یا پھر بن چکی سے یہی مشاغل تھے یہی روزگار تھا۔

ایک دن معمول کے مطابق باغ کے درختوں کو پانی دے رہے تھے۔ سورج سوائیزے پر تھا، سخت گرمی میں، محبت شفقت اس کام سے جسم پسینہ پسینہ ہو جا رہا تھا، چہرہ دھوپ کی غارت سے سرخ تھا۔ اپنے آپ مگن دل تہی سے دل میں مشغول تھے۔ اچانک مرد قلندر نام جن کا ابراہیم قدوزی تھا، باغ میں داخل ہوئے۔ نوجوان کو باغ کی نگہداشت میں یوں جو مصروف پایا تو اسے پر ہلا سا تبسم پھیل گیا۔ پھر چپ چاپ خاموشی سے ہی ایک درخت کے سائے میں بیٹھ کر غور سے اُسے دیکھنے لگے۔

ایک نوجوان کی جو نظر شہر کے مشہور قلندر پر پڑی تو سب کام چھوڑ کر فرط محبت و عزت و احترام سے آگے بڑھ کر ادب سے سلام کیا۔ ابراہیم قلندری نے قلندرانہ انداز میں جواب دیا اور پھر اسی خاموشی سے سر جھکا کر بیٹھ گئے، جس طرح باغ میں داخل ہوئے۔ نوجوان قلندر کی معراج سمجھتا تھا۔ تصوف کی اصطلاح میں قلندر اُسے کہتے ہیں جو تصوف میں منتہی ہوتا ہے، نوجوان کم عمر تھا لیکن اتنا کم علم نہیں۔ وہ قلندر کے مرتبے کو کچھ نہ کچھ تو جانتا ہی تھا۔ سو دو بار پہ پلٹا انگوروں کی بیل سے ایک رس بھرا خوشہ انگوروں کا توڑ کر فرط عقیدت سے بزرگ کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے ادب سے بولا

حضرت! انگور نوش فرما کر اس خادم کو شرف بخشیں۔

قلندر نے ایک نگاہ نوجوان پر ڈالی، جس میں نہ جانے کیا تاثیر تھی کہ وہ بے خود سا ہونے لگا۔ بزرگ نے اُس کے بڑے ہاتھوں سے انگوروں کا خوشہ لیا اور چند انگور توڑ کر کھالے۔ نوجوان وہیں عقیدت سے اُن کے سامنے بیٹھ گیا پھر اُس بزرگ نے اپنی بغل سے کوئی چیز نکالی کچھ خود پیمائی اور باقی جو بچی وہ نوجوان کی طرف بڑھاتے ہوئے بولے لے تو بھی کھا۔

نوجوان جھوٹی چیز کو بے چوں و چرا لے کر کھانے لگا۔ نجانے وہ شے کیا تھی کہ جس کا خلق سے اُترنا ہی تھا کہ نوجوان کی دنیا ہی بدل گئی۔ وہ باغ جو کل تک اُسے اپنے درخشاں مستقبل کا امین نظر آتا تھا، خاردار بھاڑیوں سے زیادہ اہم نہ لگا۔ ہرگز حقیر سی نظر آنے لگی۔ طبیعت میں ایک بے چینی سی پیدا ہو گئی۔ دل عشق الہی اور رسول کی محبت سے معمور ہو گیا۔ نگاہوں میں دنیا کی ہرگز حقیر لگی۔ قلندر تو اپنا کام کر کے چلتا بنا، نوجوان کا سکون غارت ہو گیا۔ دل ہر چیز سے اُچاٹ ہوا تو سب کچھ چھوڑ کر تحصیل علم اور ماہ نجات کی خاطر سمرقند و بخارا کی راہ لی۔ قرآن حفظ کیا۔ ظاہری علوم حاصل کئے پھر دل تو آتش سوزاں میں اسی بڑی طرح پھینکنے لگا کہ کسی پل چین نہ رہا جب کچھ علم نہ تھا تو سب ٹھیک

تھا۔ جب علم اصل ہوا تو طبیعت میں ایک بے نام سی بے چینی بڑھ گئی۔ راہ نوردی عشق کی تلاش تھی، مردِ کامل کی راہنمائی چاہتے تھے، مردِ کامل کی تلاش میں کوچہ گردی و صحرا گردی شروع کر دی۔

یہی نوجوان تھا جسے اکک دن شہنشاہ اقلیم حیثیت کا لقب پانا تھا۔ جسے ولی الہند، خواجہ غریب نواز رہنمائے سالکان اعزاز ملتا تھا۔ جس کے فیوضِ چشتیت سے ایک زمانے کو علم و حکمت کی ضیاء ملتی تھی۔ اس مردِ قلندر نے جو آگ ان کے سینے میں لگائی تھی اس آتشِ عشقِ روحانی نے انہیں دنیا و آخرت میں سرخرو کرنا تھا۔ آج زمانے میں جدھر دیکھئے اس مردِ خدا جس کا پورا تذکرہ ہو چکا ہے عطاءئے رسول صلی اللہ علیہ وسلم خواجہ محمد معین الدین چشتی اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے ڈنکا بج رہا ہے۔

۱۲ رجب المرجب ۵۳۷ھ کو دوشنبہ (پیر) کے دن صبح صادق کے وقت سحر کے تمام پرکٹم عدم سے منصفہ شہود پر جلوہ گر ہوئے۔ شاعر نے آپ کی تاریخ ولادت یوں لکھی ہے۔

سید معین الدین ولی
سال تولدش بگو بدرالمنیر
مقتدائے دین شہ ہندوستان
از سرور عارف صوفی بخواں
۵۳۷

علوم ظاہری پر دسترس حاصل کرنے کے بعد آپ کے قلبِ معانی میں معارفِ باطنی کے حصول کا جذبہ صادق پیدا ہوا اور آپ تلاشِ مرشد میں بخارا سے نکل کھڑے ہوئے اور بغداد میں پہنچ کر حضرت خواجہ عثمان ہارونی رحمۃ اللہ علیہ کے حلقہ ارادت میں داخل ہو گئے۔ انہیں الارواح میں آپ نے اپنی بیعت کا ایمان افراز واقعہ خود بیان کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مردِ کامل نے آپ کو پہلی صحبت ہی میں کمالات و فیوضاتِ روحانی سے مالا مال کر دیا تھا اور تمام مدارج سلوک یک لخت طے کرا کے فرمایا:

”ترا نجد ارسا نیدم و مقبول حضرت اور اگر داشام“

میں نے تجھے خدا تک پہنچا دیا ہے اور مقبول بارگاہ بنا دیا ہے۔

حضرت عثمان ہارونی رحمۃ اللہ علیہ نے بیعت اور حصولِ فیض کی تفصیل خود خواجہ غریب نواز اس طرح تحریر فرماتے ہیں:

مسلمانوں کا یہ دعا گو معین الدین سنجری بمقام بغداد شریف خواجہ جنید کی مسجد میں دولت پابوسی حضرت خواجہ عثمان ہارونی قدس سرہ سے مشرف ہوا۔ اس وقت مشائخ کبار حاضر خدمت اقدس تھے جب اس درویش نے سر نیاز زمین پر رکھا، پیر و مرشد نے ارشاد فرمایا:

دو رکعت نماز ادا کرو میں نے ادا کی۔

پھر فرمایا..... قبلہ رو بیٹھو..... میں بیٹھ گیا..... حکم دیا کہ سورہ بقرہ پڑھو..... میں نے پڑھی..... فرمان ہوا کہ..... اکیس بار درود شریف پڑھو..... میں نے پڑھا..... پھر آپ کھڑے ہو گئے اور میرا ہاتھ پکڑ کر آسمان کی طرف منہ کیا اور فرمایا آج تجھے خدا تک پہنچا دوں۔ بعد ازاں مقراض لے کر دعا لو کے سر پر چلائی اور کلاہ چہارتی کی اس درویش کے سر پر رکھی، گلیم خاص عطا فرمائی۔ پھر فرمایا بیٹھ جاؤ، میں بیٹھ گیا پھر فرمایا ہمارے خانوادہ میں ایک شبانہ روز کے مجاہدہ کا معمول ہے تو آج رات مشغول رہ۔ یہ درویش بحکم محترم مشغول رہا۔ دوسرے دن جب حاضر خدمت ہوا ارشاد فرمایا بیٹھ جاؤ اور ہزار بار سورہ اخلاص پڑھو میں نے پڑھی۔ فرمایا آسمان کی طرف دیکھو میں نے دیکھا استفسار فرمایا کہاں تک دیکھا ہے، عرض کیا عرش اعظم تک۔

خواجہ عثمان ہارونی نے فرمایا ”زمین کی طرف دیکھو میں نے دیکھا

دریافت فرمایا: کہاں تک دیکھا ہے؟

عرض کیا..... تحت العرش تک

پھر فرمایا..... ہزار بار سورہ اخلاص پڑھو میں نے پڑھی

فرمایا..... پھر آسمان کی طرف دیکھو میں نے دیکھا

پوچھا..... اب کہاں تک دیکھا ہے

عرض کیا..... جو اب عظمت تک

فرمایا..... آنکھیں بند کرو..... میں نے بند کر لیں

فرمایا: کھول..... میں نے کھولیں

پھر مجھے اپنے انگلیاں دکھا کر استفسار فرمایا..... کیا دیکھتا ہے؟

میں نے عرض کیا..... ستر ہزار عالم دیکھتا ہوں۔

بعد ازاں سامنے بڑی ہوئی ایک اینٹ کے اٹھانے کیلئے فرمایا

میں نے اٹھایا تو مٹھی بھر دینار برآمد ہوئے۔

فرمایا..... ان کو لے جا کر فقراء میں تقسیم کر..... میں نے حکم کی تعمیل کی۔

بعد ازاں حاضر خدمت ہوا ارشاد ہو چند روز ہماری صحبت میں رہو۔ عرض کیا فریق عالی سر

اور آنکھوں پر (معین الدین ص ۳۶، ہند کے راجہ، انیس الارواح ص ۱۷)

بیعت کے بعد حضرت خواجہ معین الدین رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مرشد طریقت کی خدمت میں کوئی رقیقہ فرو گذاشت نہ کیا۔ بیس سال کا طویل عرصہ سفر و حضر میں مرشد کمال کے ساتھ رہے اور سخت ریاضتیں اور مجاہدات کئے۔ مسلسل ایک ایک ہفتہ روزہ رکھتے اور اٹھویں دن پانچ..... کی ایک لکیر پانی میں بھگو کر روزہ افطار کرتے۔ بدن پر صرف ایک دو تائی جامہ ہوتا جب پھٹ جاتا تو اسے پیوند لگا لیتے۔ دوران سفر پیر و مرشد کا سارا سامان سر پر اٹھاتے اور ساتھ چلتے ریاضت شاقہ اور خدمت مسلسل کے باعث آپ حضرت خواجہ عثمان ہارونی کے منظور نظر بن گئے۔ ایک دفعہ انہوں نے فرمایا ”معین الدین محبوب خدا است و مرا فخر است بر مریدی“ (یعنی معین الدین خدا کے محبوب ہیں مجھے ان کی مریدی پر فخر ہے)

حج بیت اللہ

جب حضرت خواجہ عثمان ہارونی نے حج کا عزم کیا تو آپ بھی ہمراہ ہوئے۔ بیت اللہ شریف کے طواف سے فارغ ہو کر میزاب رحمت کے نیچے حضرت عثمان ہارونی رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کا ہاتھ پکڑا اور بارگاہ الہی میں آپ کی مقبولیت کیلئے دعا مانگی۔ اسی وقت غیب سے آواز آئی۔

معین الدین دوست است اور قبول کردم و برگزیدم
معین الدین ہمارا دوست ہے ہم نے اسے قبول کیا اور عزت بخشی۔

بارگاہ رسالت میں مقبولیت

حج بیت اللہ سے فارغ ہو کر حضرت خواجہ عثمان ہارونی اور حضرت خواجہ غریب نواز مدینہ منورہ گئے اور سرکار ابد قرار صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ اقدس پر حاضری دی۔ حضرت خواجہ غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ نے آقائے دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں بصد ادب و احترام سلام عرض کیا۔

الصلوة والسلام علیکم یا سید المرسلین و خاتم النبیین
روضہ اقدس سے آواز آئی:

وعلیکم السلام یا قطب المشائخ

اس رات خواب میں آپ کو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب ہوئی جس میں آپ کو ہندوستان کی ولایت عطا فرمائی اور وہاں پہنچ کر تبلیغ و اشاعت اسلام کا حکم ہوا۔

حصول خرقہ خلافت

بارگاہ الہی اور دربار رسولی سے مقبولیت کا پروانہ حاصل ہو جانے کے بعد مرشد طریقت نے آپ کو خرقہ خلافت سے سرفراز فرمایا اور اپنا خرقہ مصلیٰ، نعلین، چوپی اور عصا عنایت فرما کر ارشاد فرمایا۔

ہندوستان میں تشریف آوری

حضرت خواجہ غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ نے ۱۵۸ھ میں سرزمین ہند کو اپنے قدم سیمت لزوم چومنے کا شرف بخشا۔ اس کے بعد ولایت ہند سے باہر کبھی تشریف نہیں لے گئے، پرتھوی راج کا ستارہ اقبال آپ کے سامنے غروب ہوا۔

ورود لاہور

حضرت خواجہ خواجگان غزنی سے سیدھے لاہور آئے اور مخدوم الاولیاء حضرت داتا گنج بخش سید علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ کے آستانہ عالیہ پر چالیس دن معتکف رہ کر عبادت الہی اور ذکر و فکر میں مشغول رہے۔ مزار سے رخصت ہوتے وقت حضرت غریب نواز نے یہ شعر پڑھا جو آج زبان زد خاص و عام ہے۔

گنج بخش فیض عالم مظہر نور خدا ناقصاں را پیر کامل کاملاں را رہنما
لاہور سے دو ماہ کا سفر پیدل طے کر کے اجمیر شریف پہنچے جو اس زمانہ میں ہندوستان کا سب سے بڑا سیاسی اور مذہبی مرکز تھا۔ لاہور سے اجمیر تک تمام راستے میں حضرت خواجہ تبلیغ کا فریضہ سرانجام دیتے رہے۔ ولی اور بتیہ کے راستے میں سات سو ہندوؤں نے آپ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔
آپ ہندوستان میں تبلیغ اسلام کیلئے کس طرح تشریف لائے اسی کا پس منظر بھی ملاحظہ کیجئے، جب آپ کا قیام مدینہ منورہ میں تھا تو اکثر مسجد قبا میں چلے آتے اور عبادت میں مشغول ہو جاتے۔ مسجد قبا میں آپ عبادت کرتے اور عشق الہی میں سرشار رہتے۔ اسی طرح وقت گزرتا رہا، آخر کار وہ خوش بخت ساعت آپہنچی کہ جب آپ کو دربار رسالت سے نوازا گیا۔ آپ کو وہ مژدہ ملا کہ جس سے آپ کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ آپ کو دربار رسالت سے بشارت ہوئی کہ اے معین الدین! تو میرے دین کا معین ہے۔ میں نے ولایت ہندوستان تجھ کو عطا کی وہاں کفر و ظلمت پھیلی ہوئی ہے تو اجمیر جا تیرے وجود سے ظلمت کفر دور ہوگی اور اسلام کا نور ہدایت پھیلے گا۔ دربار رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس بشارت سے خواجہ صاحب پر وجدانی کیفیت طاری ہوئی۔ آپ کی خوشی کی

کوئی انتہاء نہ تھی مگر ایک بات آپ کی سمجھ میں نہ آئی کہ اجمیر کہاں ہے کس ملک میں ہے کیسی جگہ ہے کون سا مقام ہے مدینہ سے کتنی دور ہے۔ ان ہی خیالات میں خواجہ کی آنکھ لگ گئی، نہیں نہیں بلکہ قسمت کا ستارہ چمکا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی۔

سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو اجمیر کا تمام شہر قلعہ دکوشان دکھایا۔ سرور عالم علیہ السلام نے خواجہ غریب نواز کو جنت کا ایک انار عطا فرمایا اور آپ کو رخصت فرمایا۔

(مسائلک السالکین جلد دوم ص ۲۷۸، معین الدین ص ۵۶)

اگلے دن خواجہ چشتی نے اپنا یہ خواب عثمان ہارونی کو سنایا۔ عثمان ہارونی کو بھی خواب میں اس قسم کی ہدایت مل چکی تھی۔ اس نے بعد خوشی اجازت دی۔ عثمان نے جن کا چہرہ اپنے مرید کی اس عزت افزائی سے خوشی سے ٹمٹما رہا تھا۔ خواجہ سے نے ہندوستان نہیں دیکھا۔ ذرا آنکھیں بند کرو تا کہ تمہیں اس اجنبی سرزمین کی سیر کرا سکیں۔

حضرت خواجہ رحمۃ اللہ علیہ نے آنکھیں بند کر لیں اور اپنے مرشد عثمان کے فیض روحانی سے ہندوستان کے ان مقامات کو دیکھا جہاں پر تشریف لے جانا تھا۔

ہندوستان اُس زمانے میں دنیا بھر میں بت پرستی کا سب سے بڑا گہوارہ تھا۔ کفر کے اندھیروں میں ڈوبی اس سرزمین پر اسلام کی روشنی خواجہ چشتی سے پہلے پہنچ چکی تھی مگر ابھی تک اسلام کو وہ غلبہ حاصل نہ ہوا تھا جو ہونا چاہیے تھا۔

سلطان جو آندھی و طوفان کی طرح ہندوستان کے باطل خداؤں اور ان بت پرستوں پر خدا کے قہر کی طرح ٹوٹا تھا اور جس نے سرزمین پر اسلام اور بت پرستی کا عظیم الشان معرکہ سوغات کے علاقہ میں جیتا تھا اب اس دنیا میں نہیں تھا۔ اُس نے باپ کی فتوحات کو صحیح طور پر سنبھالا اور محمود غزنوی جس کے دم قدم سے ہندوستان کے بت پرستوں کے کلیجے کا پتے کے منظر سے بنتے ہی ہندوؤں نے پھر پر نکالنا شروع کر دیئے اور جلدی وہ غزنی کی مسلمان کے دائرہ سے اپنا بڑا سکنے میں کامیاب ہو گئے بعد کے مسلمان حکمرانوں نے ہندوؤں کے ساتھ لاتعداد جنگیں لڑیں مگر کوئی خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ ہوئی۔

خواجہ ہند الولی نے اجمیر پہنچ کر شہر کے باہر پھیل کے درخت کے نیچے قیام کیا۔ اجمیر کے راجہ کے ساربانوں نے آپ کو وہاں بیٹھنے سے منع کیا اور کہا یہ جگہ راجا کے اونٹوں کے بیٹھنے کی ہے۔ آپ یہاں سے چلے جائیں۔ آپ نے فرمایا: اچھا ہم چلے جاتے ہیں لیکن تمہارے راجا کے اونٹ

بیٹھے ہی رہیں گے۔ آپ نے چالیس خدام کو ساتھ لیا اور حوض انا ساگر کے کنارے قیام پذیر ہو گئے۔ اب اسی جگہ آپ کا روضہ مبارکہ ہے جب راجا کے اونٹ آئے تو وہ ایسے بیٹھے کہ اٹھنے کا نام ہی نہ لیتے تھے۔ ساربانوں نے اٹھانے کی بہت کوشش کی مگر ناکام ہوئے۔ آخر راجا کو سارا ماجرا بیان کیا اس نے کہا درویشوں کی منت سماعت کرو یہ انہی کی وجہ سے ہوا ہے۔

جب ان کو اپنی گستاخی کا علم ہوا تو تمام ساربان آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے، قصور کی معافی چاہی۔ آپ نے فرمایا ”جس کے حکم سے اونٹ بیٹھ گئے تھے اسی کے حکم سے کھڑے ہو جائیں گے۔ ساربان واپس آئے تو تمام اونٹوں کو کھڑا پایا۔ شہر بھر میں اس واقعہ کی شہرت ہو گئی لوگ آپ کی طرف متوجہ ہونے لگے۔ (سلطان الہند ص ۲۴)

اس واقعہ کے بعد حضرت خواجہ محمد معین الدین چشتی اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کا شہرہ چاروں طرف پھیل گیا۔ عوام الناس ہندو راجاؤں کے ستائے ہوئے تھے۔ انہیں جب امن و راحت اور سفرونی کا گہوارا نظر آیا تو جوق در جوق آپ کی بارگاہ میں حاضر ہو کر اسلام کی دولت سے بہرہ ور ہونے لگے۔ ایک ایک دن میں سینکڑوں ہندو حلقہ بگوش اسلام ہو جاتے۔ پرتھوی راج کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا کہ اس ہندوستان کوئی مسلمان درویش اس کے پاؤں تلے سے زمین نکال دے اور اس کی حکمرانی کیلئے خطرہ بن جائے۔

پرتھوی راج نے حضرت خواجہ رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں اپنا ایک سردار بھیجا، میں نے آپ کو پرتھوی راج کی طرف سے یہ پیغام دیا کہ آپ کی بہتری اسی میں سے کہ آپ جتنی جلد ہو سکے اجمیر چھوڑ کر کہیں بھی تشریف لے جائیں۔

خواجہ رحمۃ اللہ علیہ نے راجہ کا پیغام سنا مگر اثر کوئی نہ لیا لیکن جب نامہ بر مسلسل آپ کے چہرے کی طرف جواب کی امید لئے دیکھا۔ آپ نے ارشاد فرمایا ”ہم نے ہتھورا کو زندہ گرفتار کر کے مسلمانوں کے حوالے کر دیا۔“

پرتھوی راج کو یہ جواب ملا تو اس کا مفہوم ہی سمجھ سکا۔ چنانچہ جھنجلا کر اس نے خواجہ پر یہ الزام لگایا کہ انہوں نے ہتک عزت کی ہے کیونکہ مہاراجہ نے جب ایک شخص کو ان کے پاس اسلام قبول کرنے بھیجا تو خواجہ نے اس کی نیت پر شک کیا۔ اگرچہ بعد میں انہوں نے اسے مسلمان تو کر لیا لیکن پہلے انکار کر کے راجہ کی ایانت ضرور کی۔ چنانچہ وہ اور ان کے رفقاء اسی..... کی حدود چھوڑ کر چلے گئے۔

حضرت خواجہ معین الدین رحمۃ اللہ علیہ نے اس حکم پر ذرا بھی توجہ نہ دی اور ایک شان بے

نیازی سے گویا ہوئے تین دن کیا ہے جو ہونا ہے ہو کر رہے گا۔

مہاراجہ کا ایلچی اس گول مول جواب کو لے کر جب پرتھوی راج کے سامنے پہنچا تو فوراً راجہ بھی اس کا مفہوم نہ سمجھ سکا، دل میں خیال کرنے لگا کہ شاید خواجہ نے تین دن کی مہلت مانگی ہے۔

ہندوستان سے دور شکست خوردہ شباب الدین غوری راجہ پرتھوی کے ہاتھوں شکست کے بعد انتہائی افسردہ مستقبل کیلئے لائحہ عمل تیار کر رہا تھا، اُسے اپنی ناکامی کا انتقام لینا تھا مگر اپنے وسائل پر نظر ڈال کر پھر رہ جاتا کہ اس سے ہندو راجہ لی کتیر سپاہ سے ان کی اپنی زمین پر لڑنے جانا خود کشی ہی کہی جائے گی۔ اسی غمزدگی اور معمولی کیفیت اُس نے رات ایک خواب دیکھا کہ ایک بزرگ اُسے کہہ رہے ہیں، غوری اٹھ ہندوستان کا تخت و تاج تیرا انتظار کر رہا ہے۔

شہاب الدین غوری جو پہلے ہی انتقام کی آگ میں بھڑک رہا تھا، اس خوش کن خواب کو دیکھ کر ہمت و جذبہ کے ساتھ ہندوستان پر حملے کی تیاری کا حکم دیا اور جوق رفتاری سے ہندوستان کی طرف کوچ کرنے لگا۔

اُدھر پرتھوی راج جو ابھی خواجہ معین الدین چشتی کے اسلام قبول کرنے کے پیغام کو پا کر غصے سے کھول رہا تھا اور اہانت آمیز پیغام موصول ہوا۔ یہ شہاب الدین غوری کی طرف سے اُس کا قاصد لے کر آیا تھا، جس میں سلطان نے لکھا۔

”سر ہند اور تھا بنر کا علاقہ مسلمانوں کی ملکیت ہے تم اسے خالی کر کے اسی طرح اطاعت گزار بن کر رہو جیسے سلطان اور اُس کی اولاد کے گز رہن کر رہے ہو۔ ورنہ دوسری صورت میں تم سے بڑور شمشیر یہ علاقے لئے جائیں گے اور انہیں انجام سے دوچار ہونا پڑے گا۔“

پرتھوی راج اس پیغام کو پا کر غم و غصہ سے آگ بگولا ہو گیا اور حقارت سے شہاب الدین غوری کے فرمان کو لانے والے کے ہاتھ کھلوا بیجا ”اگر تم سرزمین ہند سے اسی وقت نہ نکل کھڑے ہوئے تو میرے قہر سے نہ بچ سکو گے۔“

حضرت خواجہ رحمۃ اللہ علیہ کے بموجب تیرے دن ترائن کے مقام پر پھر ایک خوفناک کھسمان کا رن پڑا اور پرتھوی راج مسلمانوں کے غیض و غضب کا شکار ہو کر فرار ہو گیا۔ مگر مسلم لشکر نے اُس کا پیچھا کیا اور گرفتار کر کے قتل کر دیا۔

شہاب الدین غوری ایک فاتح کی حیثیت سے اجمیر میں داخل ہو اور جب اُسے معین الدین چشتی سے شرف ملاقات ہوئی تو انہیں دیکھ کر حیرت سے اُچھل پڑا اور بے ساختہ اُسکے منہ سے

”کلا“ آپ..... آپ ہی وہ بزرگ کامل ہیں جنہوں نے مجھے ہندوستان کیلئے فتح کی بشارت دی تھی۔ آپ نے اسے دعاؤں سے نوازا اور سمجھایا کہ حکمرانی کے آداب کیا ہوتے ہیں۔

آپ نے فرمایا کہ اللہ کی مخلوق پر ظلم نہ کرو کہ مصیبت کے وقت ہی تمہاری سپاہ اور مشکل میں تمہاری مددگار ثابت ہوگی۔ اس نے نصحیح پر عمل کیا اور اسی کی بدولت اسی نے ہندوستان میں مستقل اسلامی سلطنت کی بنیاد ڈالی۔

حضرت سیدنا خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رحمۃ اللہ علیہ اپنی ستانوے برس کی عمر میں پچانوے لاکھ ہندوؤں کو کلمہ شریف پڑھا کر پورے ہندوستان میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دین اسلام کا جھنڈا لہرانے کے بعد آخر کار چھ رجب شریف ۶۲ھ کو اجمیر شریف کی مقدس زمین پر اپنی جان اللہ خالق کائنات کے حوالے کر کے ہمیشہ کیلئے دنیا سے پردہ فرما گئے۔ بظاہر پردہ فرما گئے لیکن حقیقت میں خواجہ معین الدین رحمۃ اللہ علیہ کل بھی زندہ تھے آج بھی زندہ ہیں اور تاقیامت زندہ رہیں گے۔ کیونکہ اللہ کے ولی اس دنیا سے پردہ فرمانے کے بعد بھی اپنے روضوں میں زندہ ہیں۔ (ماہ اجمیر ص ۴۰۳)

آپ کی شخصیت میں بلا کی تاخیر تھی۔ جو ایک مرتبہ آپ کی بارگاہ میں آتا آپ ہی کا ہو جاتا۔ آپ کی ذات وہ چشمہ فیض تھی جس سے رشد و ہدایت کے کئی دریا جاری ہوئے اور حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی، حضرت خواجہ فرید الدین مسعودی، شکر، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء اور حضرت خواجہ نصیر الدین محمود چراغ دہلی وغیرہ ایسے اکابر آپ ہی کے خوان کرم کے خوشہ چین ہیں۔ آپ نے مبلغین اسلام کی عظیم جماعت تیار کی اور اسے ملک ہند کے مختلف حصوں میں پھیلا دیا۔ صاحب سیر العارفین نے بجا طور پر لکھا ہے کہ حضرت خواجہ کا احسان یہاں کے مسلمانوں پر حد سے زیادہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قیامت تک برصغیر میں جو بھی مسلمان ہوں گے ان کا حق اسلام حضرت خواجہ رحمۃ اللہ علیہ ہی کو پہنچتا ہے۔

وصال

حضرت خواجہ رحمۃ اللہ علیہ نے سالہا سال تک ہندوستان میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت کا کارنامہ سرانجام دیا اور لاکھوں گم کردہ ماہوں کو اسلام کی صراط مستقیم پر گامزن کر دیا۔ بالآخر وہ گھڑی بھی آ پہنچی جب اللہ تعالیٰ نے اپنے اس محبوب بندے کو اپنے پاس بلا لیا، آپ نے ۲۳۳ھ میں وصال فرمایا۔ سرد کی اس رباعی سے آپ کی تاریخ وفات نکلتی ہے۔

شد زدینا چود بہشت بریں مرشد متقی معین الدین

گفت تا رنج و حلقش سرد محرم دل ولی معین الدین
آپ کہا کرتے تھے ”لوگو! تم میں ضعیف ترین شخص وہ ہے جو ایک بات کہے اور پھر اُس پر
ثابت قدم رہ نہ سکے۔“

ایک بار آپ نے فرمایا ”بت پرستی کا دوسرا نام خود پرستی اور نفس پرستی ہے جب تک انسان
ان سے چٹکارا پاتا وہ خدا پرستی کی منزل سے دور رہتا ہے۔“

”متوکل وہ ہے جو مصائب اور تکالیف سے بے حال ہو جائے مگر حرف شکایت زبان پر نہ
لائے“



زُہد الانبیاء حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ

ایک روز خواجہ خواجگان حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ کے جلیل القدر خلیفہ قطب الاقطاب حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ ملتان کی سرانے حلوائی والی مسجد میں تشریف لائے۔ اس مسجد میں اپنے دور کے ممتاز عالم دین مولانا منہاج الدین اطراف و جوانب سے آنے والے طالبان علم کو قرآن و حدیث کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی اس مسجد میں ادائے نماز کر چکے تو خیال آیا کہ مولانا منہاج الدین کے شاگردوں کو ایک نظر دیکھ لوں۔ آپ کی نظر کریمانہ دوسرے شاگردوں سے ہوتی ہوئی ایک طالب علم پر پڑی جو دوسرے طلباء سے ذرا ہٹ کر مسجد کے ایک کونے میں مصروف مطالعہ تھا۔ اس نوجوان طالب علم کی پیشانی پر جستجوئے علم کے آثار جگمگا رہے تھے۔ حضرت قطب الاقطاب کی نگہ انتخاب نے اس نوجوان کے روشن مستقبل کی آب و تاب کو پرکھ لیا اور پھر خود ہی اس کے پاس تشریف لے گئے۔ اس خوش بخت طالب علم نے جب علوم معرفت کے اس مہر عالم تاب کو اپنے قریب دیکھا تو فرط احترام سے کتاب ہاتھ میں لئے ایستادہ ہو گیا۔ حضرت قطب الاقطاب نے دریافت فرمایا ”نوجوان کیا پڑھ رہے ہو؟“ طالب علم نے عرض کیا ”نافع الصلوٰۃ کا مطالعہ کر رہا ہوں۔“

حضرت قطب الاقطاب نے دوبارہ دریافت فرمایا ”اس کتاب کے پڑھنے سے تمہیں کیا نفع

ہوگا؟“

طالب علم نے آپ کے چہرہ اقدس پر ایک نظر ڈالی اور فوراً محسوس کر لیا کہ اس کی منزل اس کے قریب آ پہنچی ہے۔ چنانچہ بصد احترام عرض کیا ”مجھے انشاء اللہ آپ کی نگہ سعادت بخش سے فیض پہنچے گا۔“ پھر قدم بوسی کی سعادت حاصل کرتے ہوئے یہ رباعی پڑھی:

مقبول تو جز مقبل جاوید نشد و زلف تو بچ بندہ نومید نشد
لطف یکدام وزہ پیوست سے کاں وزہ بہ از ہزار خورشید نشد
یہ نوجوان طالب علم کہ جن پر خوش بختی سایہ نکلن ہو چکی تھی حضرت بابا فرید الدین مسعود نے

Click For More Books

<https://archive.org/details/@zohaibhasanattari>

جنہیں دنیا حضرت گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کے لقب سے پکارتی ہے اور آپ کی تعلیمات سے ظلمت قلب و نظر کو مستنیر کرتی ہے۔ اس ساعت سعید پر آپ نے حضرت قطب الاقطاب سے حلقہ ارادت میں داخل ہونے کی استدعا کی جسے انہوں نے قبول فرمایا۔ اس وقت بابا فرید الدین مسعود کی عمر صرف پندرہ سال تھی۔ حضرت قطب الاقطاب نے جتنے روز ملتان میں قیام فرمایا، حضرت بابا فرید زیادہ سے زیادہ وقت آپ کی خدمت میں بسر کرتے رہے۔ جب حضرت قطب الاقطاب ملتان سے وہلی کی طرف روانہ ہوئے تو حضرت بابا فرید بھی ہمراہ چل پڑے۔ ابھی چند میل ہی سفر کیا ہوگا کہ حضرت قطب الاقطاب نے ارشاد فرمایا:

”میرے عزیز ابھی کچھ مدت اور علوم ظاہری کی تکمیل میں صرف کرو جب تحصیل علم سے فراغت ہو جائے تو میرے پاس آ جانا۔ انشاء اللہ اپنی مراد کو پہنچو گے۔“

حضرت بابا فرید رحمۃ اللہ علیہ نے حکم شیخ سن کر سر تسلیم خم کر دیا اور پوری تندہی اور ذوق و شوق کے ساتھ علوم ظاہری کی تکمیل کیلئے مصروف ہو گئے۔

.....O.....

اب ہم تاریخ کے ایوانوں سے گزرتے ہوئے حضرت بابا فرید الدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کہ جن کی منزل مقصود ان کی جستجوئے کمال کو مد نظر رکھتے ہوئے خود ان تک آ پہنچی تھی، کے حالات زندگی پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔ تمام تذکرہ نگار اس پر متفق ہیں کہ حضرت بابا صاحب صحیح النسب فاروقی ہیں اور آپ کا سلسلہ نسب سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے اس طرح جا ملتا ہے۔

- | | |
|--------------------------------|--|
| ۱۔ حضرت بابا فرید الدین | ۲۔ حضرت شیخ جمال الدین سلیمان (والد) |
| ۳۔ شیخ شعیب | ۴۔ شیخ احمد |
| ۵۔ شیخ یوسف | ۶۔ شیخ محمد |
| ۷۔ شیخ شہاب الدین | ۸۔ شیخ احمد معروف بہ فرخ شاہ بادشاہ کابل |
| ۹۔ شیخ نصیر الدین | ۱۰۔ محمود شاہ |
| ۱۱۔ سامان شاہ | ۱۲۔ شیخ سلیمان |
| ۱۳۔ شیخ مسعود | ۱۴۔ شیخ عبدالشواعظ الاکبر |
| ۱۵۔ شیخ ابوالفتح | ۱۶۔ شیخ اسحاق |
| ۱۷۔ حضرت خواجہ ابراہیم شاہ بلخ | ۱۸۔ خواجہ ادہم |

۱۹۔ شیخ سلیمان

۲۰۔ شیخ ناصر

۲۱۔ حضرت عبداللہ

۲۲۔ امیر المومنین سیدنا فاروق اعظم

.....O.....

دنیا نے عجم میں بارہویں صدی عیسوی جنگ وجدل اور شور و ہنگامہ کا دور تھا۔ اس طوائف الملوکی میں حضرت بابا صاحب کے دادا حضرت شیخ محمد شعیب نے اپنے اہل و عیال کو ہمراہ لیا اور لاہور تشریف لے آئے۔ لاہور میں قیام راس نہ آیا تو قصور چلے گئے۔ مقامی قاضی نے آپ کا پر تپاک خیر مقدم کیا اور سلطان کو ان حالات سے آگاہ کیا جن کی بناء پر یہ خاندان اس علاقہ میں پناہ لینے پر مجبور ہوا۔ سلطان نے بڑی ہمدردی اور شائستگی سے دریافت کیا کہ وہ اس خاندان کی کیا خدمت کر سکتا ہے۔ قاضی شعیب نے جواب دیا کہ انہیں کسی عہدے یا مرتبے کی ضرورت نہیں اور پھر کمال استغناء سے فرمایا:

”ہم اس چیز کے پیچھے نہیں دوڑنا چاہتے جو ہم سے چھن گئی ہو۔“

اس کے باوجود سلطان نے انہیں کھتوال کا قاضی مقرر کر دیا اور قاضی شعیب اپنے خاندان کے ہمراہ کھتوال میں آباد ہو گئے۔ قاضی شعیب کے تین فرزندوں میں سے ایک کا نام جمال الدین سلیمان تھا، جن کی شادی کھتوال میں شیخ وجیہہ الدین جندی کی صاحبزادی مریم بی بی سے ہوئی۔ جمال الدین سلیمان کے ہاں تین فرزند تولد ہوئے۔ پہلے اعز الدین محمود دوسرے بابا فرید الدین مسعود اور تیسرے نجیب الدین محمد متوکل۔ بابا فرید الدین مسعود کا سن پیدائش ۵۷۱ھ / ۱۱۷۵ء کے لگ بھگ ہے۔ حضرت بابا صاحب کی ایک بہن تھیں، حضرت بی بی ہاجرہ ملقب بہ جمیلہ خاتون، یہی خاتون محترم حضرت مخدوم سید علاء الدین علی احمد صابری رحمۃ اللہ علیہ کی والدہ ماجدہ تھیں۔

.....O.....

حضرت بابا فرید الدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ نے ابتدائی تعلیم اپنی والدہ ماجدہ سے حاصل کی جو شب بیدار اور عارفہ کامل خاتون تھیں۔ بیشتر تذکرہ نگاروں کا کہنا ہے کہ بی بی مریم خاتون اپنی عبادت گزاری اور زہد و تقویٰ کی بناء پر ولایت کے مرتبہ پر فائز تھیں۔ حضرت بابا صاحب ابھی کم سن ہی تھے تو آپ کے والد محترم انتقال فرما گئے۔ اب ان کی تعلیم و تربیت کی تمام تر ذمہ داری ان کی والدہ محترمہ کے کندھوں پر آ پڑی جسے انہوں نے بصد حسن و خوبی انجام دیا۔ حضرت بی بی مریم خاتون سے کئی کرامات بھی منسوب ہیں۔ حضرت بابا صاحب رحمۃ اللہ علیہ مادر زاد ولی تھے جب آپ

Click For More Books

<https://archive.org/details/@zohaibhasanattari>

کی ولادت ہوئی تو اس سال رمضان کے چاند کے بارے میں شک تھا۔ لوگوں نے ایک بزرگ سے دریافت کیا کہ روزہ رکھا جائے یا نہیں تو انہوں نے فرمایا کہ قاضی صاحب (آپ کے والد) کے ہاں ایک بچہ پیدا ہوگا اگر اس نے دودھ پی لیا تو روزہ نہیں رکھنا چاہئے۔ اسی رات آپ کی ولادت ہوئی۔ آپ نے دودھ نہیں پیا چنانچہ لوگوں نے روزہ رکھ لیا۔

آپ کی والدہ محترمہ نے نہایت توجہ سے اپنے لخت جگر کی پرورش کی۔ سات سال کی عمر ہی میں انہوں نے تمام ابتدائی دینی کتب ختم کر لیں۔ اب ان کی والدہ کو کسی ایسے استاد کامل کی جستجو ہوئی جو اس جوہر قابل کو علوم متداولہ سے مالا مال کر سکے۔ چونکہ علاقہ میں کوئی ایسا بڑا عالم نہیں تھا جو انہیں مزید پڑھا سکے۔ اس لئے آپ کی والدہ ماجدہ نے آپ کو علوم و فنون کے مرکز عظیم ملتان میں بھیج دیا۔ ملتان پہنچ کر حضرت بابا فرید الدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ سرانے حلوائی والی کے قریب مسجد میں مقیم ہو گئے اور یہیں حضرت مولانا منہاج الدین سے علوم متداولہ کی تکمیل کی۔

مولانا نے آپ کو دو تین سالوں میں تفسیر، حدیث، اصول، معانی، فقہ، منطق، ریاضی اور ہیئت سے متعلق تمام مروجہ کتب پڑھا دیں۔ اسی مسجد میں آپ کی قطب الاقطاب حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی سے ملاقات ہوئی، جن کی نگاہ کیمیا اثر نے آپ کو ڈرے سے آفتاب بنا دیا، جب حضرت قطب الاقطاب نے دہلی جاتے ہوئے حضرت بابا صاحب کو ملتان میں رہتے ہوئے علوم ظاہری کی تکمیل کی تلقین کی تو پھر آپ نے حکم کی تعمیل میں تکمیل علوم کے بعد قندھار، بغداد، سیستان اور بدخشاں وغیرہ میں گزارے اور وہاں کے علماء و مشائخ سے ملاقات کر کے اپنی ظاہری و باطنی صلاحیتوں کو جلا بخشنے کا اہتمام کیا۔ اب آپ فکری طور پر اس قدر لطافت آشنا ہو چکے تھے کہ جب دہلی میں حضرت قطب الاقطاب کے دربار میں حاضری دی تو وہ دیکھتے ہی پکار اٹھے کہ ”یہ خوب ہوا“ تم اپنے کام کی تکمیل کے بعد میرے پاس آئے ہو۔“

.....O.....

حضرت قطب الاقطاب رحمۃ اللہ علیہ کی بارگاہ اقدس میں حاضری کے ساتھ ہی بابا فرید الدین مسعود گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کی روحانی تعلیم و تربیت کے ایمان آفریں مرحلے شروع ہو گئے۔ اگرچہ روحانی و نظری کیفیات آپ کو ورثے میں عطا ہوئی تھیں مگر ان کی حیثیت ابتدائی تھی۔ اب بابا فرید کے روپ میں ایک کامل عالم دین روحانی سر بلند یوں کی منزل کی طرف گامزن ہو رہا تھا۔ ریاضت و عبادت آپ کے خاندان کا طرہ امتیاز تھی، حضرت قطب الاقطاب کی صحبت سونے پر سہاگہ

Click For More Books

<https://archive.org/details/@zohaibhasanattari>

ثابت ہوئی اور آپ کٹھن مجاہدوں اور ریاضتوں کے مرحلہ ہائے شوق کو طے کرنے لگے۔ ایک مرتبہ حضرت بابا صاحب نے مرشد کے ارشاد کے موجب طے کا روزہ رکھا۔ یہ روزہ تین دن کا ہوتا ہے اور افطاری کے وقت صرف دو تین تولہ پانی پیا جاتا ہے۔ روزہ کے آخری روز افطاری کے وقت ایک شخص آپ کیلئے کھانا لایا، آپ نے اسے غیبی امداد جان کر قبول کیا مگر کھانا نوش فرماتے ہی فوراً تے ہو گئی اور معدہ صاف ہو گیا۔ آپ نے مرشد سے تمام واقعہ کہہ سنایا تو انہوں نے فرمایا کہ وہ کھانا ایک شرابی کی طرف سے آیا تھا جسے تمہارا معدہ قبول نہیں کر سکتا تھا۔ دوبارہ طے کا روزہ رکھو اور غیب سے جو چیز میسر آئے اس سے افطار کرو۔ آپ نے اس بار بھی اس روزے کے ایام پورے کر لئے مگر افطاری کے وقت کہیں سے کوئی چیز میسر نہ آئی۔ ضعف و نقاہت نے غلبہ کر لیا، بے قراری بڑھنے لگی تو ادھر ادھر ہاتھ مارنے لگے، چند کنکر ہاتھ لگے وہی اٹھا کر منہ میں ڈال لئے، مگر حکمت ایزدی دیکھتے کہ وہی کنکر منہ میں جاتے ہی شکر بن گئے۔ اس عالم میں بھی تقویٰ دامنگیر رہا اور فوراً وہ شکر منہ سے نکال دی اور ذکر خداوندی میں مصروف ہو گئے۔ بے چینی کا پھر غلبہ ہوا تو کنکر منہ میں ڈال لئے جو فوراً شکر ہو گئے، آپ نے وہ شکر پھر نکال دی۔ تیسری مرتبہ پھر ایسا ہی ہوا تو آپ نے اسے انعام خداوندی سمجھ کر اس سے روزہ افطار کر لیا، بعد میں حضرت قطب الاقطاب کی خدمت میں تمام ماجرا عرض کیا تو انہوں نے فرمایا کہ تم نے غیب کے تحفہ سے روزہ افطار کیا، اب تم تمام عمر یونہی اپنے کردار کی شیرینی تقسیم کرتے رہو گے۔ دوسرے واقعات کے ساتھ یہ واقعہ بھی آپ کے گنج شکر کے لقب سے مشہور ہونے کا باعث ثابت ہوا۔

عبادت و ریاضت اور روحانی مجاہدوں کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ آپ کو حضرت قطب الاقطاب کی طرف سے ایک حجرہ خاص عطا ہوا تھا۔ یہ حجرہ آپ کا مسکن اور آپ کی عبادت و ریاضت کا امانت دار تھا۔ مختلف تذکروں میں آپ کی کٹھن ریاضت کے اس قدر حیرت انگیز واقعات ملتے ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ مرشد گرامی کی طرف سے آپ کو نماز معکوس ادا کرنے کا حکم ہوا تو آپ نے وہ بھی ادا کی۔ دہلی کے علاوہ مختلف مقامات پر بھی عبادت و ریاضت میں مصروف رہے۔ آپ نے اس دوران میں متعدد شہروں میں چلے کاٹے اور مجاہدات کئے۔ آپ کے مرید بھائی رشک آمیز نظروں سے آپ کی طرف دیکھتے جبکہ حضرت قطب الاقطاب فخر کرتے کہ انہیں ایسا مرید عطا ہوا تھا۔ آپ کی عبادت و ریاضت بارگاہِ خداوندی میں مقبول ہو رہی تھی جس کا اظہار مختلف بشارتوں سے ہوتا تھا۔ مس خام کندن بن چلا تھا، اس شدید محنت کے بعد اب جزا اور عطا کا وقت آنے والا تھا۔

○

اور پھر وہ ساعت سعید بھی آ پہنچی۔ ایک روز خواجہ خواجگان سلطان الہند حضرت خواجہ محمد معین الدین چشتی اجمیری رحمۃ اللہ علیہ دہلی میں اپنے خلیفہ خاص حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کی خانقاہ میں تشریف لے آئے۔ اس روز جشن عید کا سماں تھا۔ اپنے خلیفہ خاص کی خانقاہ میں اصحاب طریقت کا ہجوم اور حضرت قطب الاقطاب کی روحانی تربیت کا کمال دیکھ کر حضرت خواجہ خواجگان کا دریائے رحمت جوش میں آ گیا اور فرمانے لگے:

”قطب الدین! آج ہم تمہارے مریدین باصفا سے ملنا چاہتے ہیں۔“ حضرت قطب الاقطاب نے اپنے شیخ کے اس حکم کو سعادت عظیم تصور کیا اور اپنے مریدین کو باری باری خواجہ خواجگان کے حضور پیش کرنے لگے۔ سب مرید پیش ہو چکے تو خواجہ خواجگان نے پوچھا ”کوئی مرید باقی رہ تو نہیں گیا۔“ حضرت قطب الاقطاب نے عرض کیا ”پیر و مرشد! ایک مرید کہ جس کا نام مسعود ہے، اپنے حجرے میں مصروف عبادت ہے اور کثرت ریاضت کی بدولت اس قدر کمزور ہو چکا ہے کہ اس کیلئے یہاں حاضری دینا ممکن نہیں رہا۔“

حضرت خواجہ خواجگان نے فرمایا ”تو چلئے ہم چلتے ہیں“

چنانچہ حضرت خواجہ خواجگان حضرت قطب الاقطاب کی معیت میں بابا فرید الدین مسعود رحمۃ اللہ علیہ کے حجرے میں داخل ہوئے۔ بابا فرید نے جب ان جلیل القدر بزرگ شخصیات کو اپنے حجرے میں داخل ہوتے دیکھا تو فرط اشتیاق سے آگے بڑھ کر قدم بوسی کرنا چاہی مگر کمزوری و نقاہت کے باعث اٹھنے کا یارا بھی نہ رہا۔ دونوں شیوخ جب بابا فرید کے بالکل قریب آ گئے تو انہوں نے اپنی بے زبانی کو ترجمان شوق بناتے ہوئے اپنا سر ان کے قدموں میں رکھ دیا۔ حضرت خواجہ خواجگان نے فرمایا:

”قطب الدین اس جوان کو کب تک مجاہدے کی آگ میں جلاؤ گے اس کو کچھ عطا کرو۔“

حضرت قطب الاقطاب نے عرض کیا ”آقا میں تو آپ کا غلام ہوں، میری کیا مجال کہ حضور کی موجودگی میں کچھ دے سکوں۔“ یہ سن کر حضرت خواجہ خواجگان نے مسکراتے ہوئے ارشاد فرمایا:

”تو آؤ اسے ہم دونوں مل کر عنایت کریں۔“

حکم شیخ کی تعمیل میں حضرت قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ آگے بڑھے۔ حضرت خواجہ خواجگان بابا فرید الدین مسعود کے دائیں طرف کھڑے ہو گئے اور حضرت قطب الاقطاب کو بابا فرید کے بائیں طرف کھڑا کر دیا۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے دونوں بزرگوں نے حضرت بابا فرید الدین کا دامن مراد

باطنی فیوض و برکات سے بھرپور کر دیا۔ پھر خواجہ خواجگان نے بارگاہ خداوندی میں دعا فرمائی:
”خدا یا ہمارے فرید کو قبول فرما“ اور اسے اکمل درویش کے مرتبے پر پہنچا۔
غیب سے آواز آئی ”ہم نے فرید کو قبول کیا“۔

ع..... یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

حضرت بابا فرید رحمۃ اللہ علیہ کو جس طور حضرت خواجہ خواجگان اور قطب الاقطاب نے
روحانی تصرفات اور غیر معمولی فیوض و برکات سے نوازا، اس کی مثال نہیں ملتی کہ کسی مرید باصفا کو اس
کے مرشد اور پھر مرشد کے مرشد نے بیک وقت اس حد تک نوازا ہو، امیر خورد نے اس رباعی میں اسی
خوش بختی کو نظم کیا ہے:

بخشیش کونین از شیخین شد درباب تو
پادشاہی یافتی زیں پادشاہانِ زماں
مملکت دنیا و دیں گشتہ مسلم برترا
عالم کن گشتہ اقطاع تو اے شاہِ جہاں

اس کے بعد حضرت خواجہ خواجگان نے اپنا پیرہن مبارک اور حضرت قطب الاقطاب نے
اپنی دستار مبارک حضرت بابا فرید کو عطا فرمائی اور منصب خلافت سے سرفراز کیا۔ حضرت خواجہ
خواجگان حضرت بابا فرید سے غیر معمولی شفقت فرمایا کرتے تھے اور اس امر سے آگاہ تھے کہ مستقبل
میں یہی خوش بخت نوجوان زہد الانبیاء اور سلطان الاتقیاء کے القاب سے پکارا جائے گا اور پھر اسی کی
بدولت سلسلہ عالیہ چشت کو برصغیر میں غیر معمولی فروغ حاصل ہوگا۔ اسی لئے ایک مرتبہ آپ نے
حضرت قطب الاقطاب سے مخاطب ہو کر بابا فرید کے متعلق ارشاد فرمایا:

”قطب الدین تم نے ایک عظیم شہباز کو گرفتار کیا ہے جو سدرۃ المنتہی کے علاوہ اور کہیں اپنا
آشیانہ نہ بنائے گا۔ فرید ایک ایسا چراغ ہے جو خانوادہ درویشاں کو منور کرے گا۔“

.....○.....

حضرت بابا فرید الدین رحمۃ اللہ علیہ خلافت عطا ہونے کے بعد بھی کافی عرصہ تک اپنے
مرشد کامل کی خدمت میں رہے اور اپنے مرشد سے اجازت طلب کر کے ہانسی تشریف لے گئے۔ بابا
فرید کا خیال تھا کہ وہ یہاں آرام و سکون کے ساتھ عبادت و ریاضت میں مصروف رہ سکیں گے مگر
اچانک ان کی شہرت دور دور تک پھیل گئی۔ ہوا یوں کہ مولانا ترک جو ایک معروف صوفی اور دلاویز

خطیب تھے ہانسی کی جامع مسجد میں وعظ فرمانے لگے تو بابا فرید بھی ان کا وعظ سننے کیلئے چلے گئے۔ بابا فرید کے کپڑے جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے تھے اور ان کی ظاہری حالت سے ان کے غیر معمولی علم و فضل کا اندازہ نہیں ہوتا تھا۔ آپ کی مولانا ترک سے شناسائی بھی نہیں تھی مگر جو نہی آپ مسجد میں داخل ہوئے مولانا ترک بول اٹھے:

”اے مسلمانو! صرف حق آپہنچا ہے“

ہر ایک کی نظر بابا صاحب کی طرف اٹھ گئی۔ مولانا ترک نے بابا صاحب کی بے حد مدح و تحسین کی۔ اس سلسلہ میں بابا فرید اپنے مریدوں سے فرمایا کرتے تھے کہ مولانا ترک نے ایسے الفاظ میں میری تعریف کی کہ کسی بادشاہ کی تعریف میں ایسے الفاظ نہیں کہے گئے ہوں گے۔ بابا فرید کا تذکرہ عام ہوا تو لوگ کثرت سے آپ کے پاس آنے لگے۔ آپ متواتر کئی سال ہانسی میں مقیم رہے اور خلق خدا کو خدا آشنا کرتے رہے۔

ہانسی میں قیام کے دوران ہی میں حضرت خواجہ بختیار کاکی نے اس دنیائے فانی سے منزل آخرت کی طرف کوچ کیا، جس رات آپ کا وصال ہوا، حضرت بابا فرید نے ایک پریشان کن خواب دیکھا کہ حضرت قطب الاقطاب آپ کو بلا رہے ہیں۔ صبح سویرے آپ دہلی روانہ ہو گئے۔ وہ قاصد جو آپ تک حضرت قطب الاقطاب کی وفات کی خبر لے کر آ رہا تھا، آپ کو راستے میں ملا۔ دہلی پہنچ کر آپ سب سے پہلے اپنے مرشد کے مزار پر حاضر ہوئے اور فاتحہ خوانی کی۔ اگلے روز قاضی حمید الدین ناگوری نے حضرت قطب الاقطاب کی وہ امانت بابا فرید کے سپرد کر دی جسے ان کے سپرد کرتے وقت قطب الاقطاب نے فرمایا تھا:

”میرا خرقہ جو مجھے مرشد گرامی سے ملا ہے، میرا مصلیٰ خاص نعلین چو بی اور میرا عصا فرید الدین مسعود کو پہنچا دیا جائے وہی میرا جانشین ہوگا۔“

آپ نے مرشد گرامی کا عطا کردہ خرقہ زیب تن کیا، مصلیٰ پر دوگانہ نماز ادا کی۔ اب سلسلہ عالیہ چشت کی قیادت کا تاج آپ کے زیب سر تھا۔ دہلی والے جوق در جوق آپ کی خدمت میں حاضری دینے لگے۔ آپ کو جلوت کی نسبت خلوت زیادہ پسند تھی، اس لئے زیادہ وقت اپنے حجرے میں مقیم رہ کر عبادت و ریاضت میں گزارتے مگر اس کے باوجود خلق خدا کے ہجوم کے باعث آپ سکون سے عبادت نہیں کر سکتے جو آپ کو ہانسی میں میسر تھا۔ انہی دنوں ہانسی کا ایک شخص جس کا نام سرہنگ تھا آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کیلئے آیا کئی روز جد و جہد کے بعد اسے حاضری نصیب

ہوئی تو قدموں میں گر گیا اور رو رو کر کہنے لگا:

”جب آپ ہانسی میں تھے تو آپ تک رسائی ممکن تھی مگر یہاں بہت مشکل ہے“

حضرت بابا فرید الدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ اس صاحب شوق کی یہ بات سن کر از حد متاثر ہوئے۔ دل تو دہلی سے پہلے ہی اچاٹ ہو چکا تھا، فوراً دہلی چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ آپ کے مریدوں اور نیاز مندوں کو اس فیصلہ پر حیرت ہوئی اور انہوں نے عرض کیا:

”حضرت شیخ قطب الدین بختیار کا کی نے یہ جگہ آپ کیلئے خاص کر دی ہے، آپ دوسری جگہ کیوں جاتے ہیں۔“

بابا فرید نے جواب میں فرمایا:

”میں جہاں جاؤں گا میرے مرشد کی دعائیں میرے ساتھ جائیں گی، چاہے میں اس شہر

میں ہوں یا بیابان میں۔“

یہ سن کر لوگ خاموش ہو گئے اور یہ مہر عالم تاب ولایت ہانسی کے مطلع پر ضو فلکن ہو گیا۔



حضرت بابا فرید الدین رحمۃ اللہ علیہ کا دہلی چھوڑنے کا فیصلہ جذباتی یا ہنگامی نوعیت کا نہیں تھا، وقت نے ثابت کر دیا کہ آپ کا فیصلہ بالکل درست صائب اور برحق تھا۔ سلطان التمش کی وفات کے بعد دہلی کی معاشرتی زندگی کی قدریں اس تیزی سے بدلنے لگیں کہ آہستہ آہستہ حق و باطل کا امتیاز اٹھ گیا اور علماء صوفیاء بھی کسی نہ کسی امیر کے دربار سے وابستگی میں عافیت تلاش کرنے لگے۔ اس بد نظمی، افراتفری اور اخلاقی زوال کے دور کے آغاز سے پہلے ہی آپ کا دہلی سے چلے جانا، آپ کی روشن ضمیری پر مبنی تھا۔ ہانسی میں آپ ایک مدت تک مقیم رہے، وہاں کے عوام الناس نے حضرت بابا فرید کے وجود مسعود سے خوب فیض اٹھایا۔ طالبان شوق آپ کے در دربار پر حاضری دیتے اور مرادوں کی جھولی بھر کر جاتے تھے۔ ہانسی میں آپ کی شہرت اس قدر پھیل چکی تھی کہ ہر وقت عقیدت مندوں کا ایک ہجوم آپ کی نگہ کرم کا جو یار رہتا تھا۔ آپ اب پھر کسی ایسے گوشہ عافیت کی تلاش میں تھے جہاں لوگ آپ کو تنگ نہ کریں۔ بالآخر آپ نے شیخ جمال الدین ہانسوی کو سند خلافت سے سرفراز فرمایا اور انہیں ہانسی میں ہی مستقل قیام کی تلقین کر کے اجودھن کی طرف چل پڑے۔ وہ اجودھن جو آج پاک پتن شریف کے نام سے مشہور ہے اور جس کا نام زباں سے ادا ہوتے ہی اصحاب طریقت کے دلوں کی دھڑکن تیز ہونے لگتی ہے۔



اجودھن کہ جہاں کفر و شرک اور گمراہی و ضلالت کے سائے منڈلا رہے تھے اس مردِ کامل کی بدولت مرکزِ حق و صداقت بننے والا تھا۔ تاریکیوں کے مٹنے کا وقت آ پہنچا تھا کیونکہ بابا فرید تبلیغ اسلام کی شمعِ ایمانی جلا کر اس ظلمت کدے کو منور کرنے کا تہیہ کر چکے تھے۔ اجودھن ان دنوں ایک جنگل کا نقشہ پیش کر رہا تھا، جہاں انسانوں کی نسبت حشرات الارض کثرت سے بستے تھے۔ اس کے اطراف و جوانب میں کفار اور مشرکین کی بستیاں تھیں۔ خدا کی رحمت کا بھی عجیب عالم ہے۔ رحمت ایزدی اپنے ظہور کیلئے ان علاقوں کو منتخب کرتی ہے جہاں گمراہی و جہالت کا سب سے زیادہ زور ہوتا ہے۔ مردانِ خدا انہی پسماندہ علاقوں میں ڈیرے ڈالتے ہیں اور پھر یہی غیر آباد اور غیر معروف علاقے ان اصحابِ فکر و عمل کی نسبت سے مرجعِ خلافت بن جاتے ہیں۔

بقول شاعر مشرق:

حسن بے پروا کو اپنی بے حجابی کے لئے

ہوں اگر شہروں سے بن پیارے تو شہر اچھے کہ بن

اجودھن کے ظلمت کدوں کا مقدر جاگ اٹھا تو قدرت نے یہاں حضرت بابا فرید کی معرفت تبلیغ دین مصطفوی کا اہتمام کر کے اسے پاکپتن کے مقدس نام سے موسوم کر دیا۔ اجودھن میں مستقل قیام سے پیشتر بابا صاحب کھتوال میں اپنی والدہ محترمہ کی خدمت میں حاضر ہوئے مگر خلقِ خدا کے اثر و دام کے باعث زیادہ عرصہ وہاں ٹھہر نہ سکے تھے۔ اجودھن میں عوام ان پڑھ، گھٹیا، بد مزاج اور ضعیف الاعتقاد تھے۔ ایک ولی اللہ کیلئے ریاضت و عبادت اور مجاہدہ کی خاطر اس سے بہتر پُر سکون جگہ اور کہاں ہو سکتی تھی، قصبہ سے باہر درختوں کے جھنڈ کے نیچے آپ نے مصلیٰ بچھا لیا۔ کچھ عرصہ تک آپ کی عبادت و ریاضت میں کوئی شخص مخل نہ ہوا۔ جلد ہی آپ کا مجاہدہ پایہ تکمیل کو پہنچ گیا، عزتِ صحبت میں بدل گئی، آپ کے گھر کا دروازہ ہر کس و ناکس کیلئے کھول دیا گیا۔ آپ نے زائرین کا ہجوم دیکھ کر ارشاد فرمایا:

”میرے پاس اکیلے اکیلے آؤ تا کہ میں ہر شخص کو توجہ دے سکوں۔“

حضرت بابا فرید الدین مسعود کی شہرت اب چاروں طرف پھیل رہی تھی، گمراہی و جہالت کے سائے سمٹنے لگے تھے، دلوں کو انوارِ ایمانی کی بدولت روشنی عطا ہو رہی تھی، کافر حلقہ بگوشِ اسلام ہو رہے تھے اور جو مسلمان جاوہِ حق سے بھٹک چکے تھے وہ صراطِ مستقیم پر گامزن ہو رہے تھے۔ دیکھتے ہی

دیکھتے اس علاقہ میں حیرت انگیز انقلاب رونما ہو رہا تھا۔ یہ عظمت اسلام اور شعائر دین سے محبت کا انقلاب تھا۔ توحید اور عشق رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے زمزمے بلند ہو رہے تھے لیکن جہاں ایک زمانہ آپ کے فیضان نظر سے اپنا مقدر سنوار رہا تھا وہاں کچھ حاسدین بدباطن بھی آپ کے در پے آزار ہو رہے تھے مگر آپ نے جوابی کارروائی کے بجائے معاملہ خدا پر چھوڑ دیا تھا۔

نور خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن

پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

اغیار کی ریشہ دوانیوں کی بدولت وہ چراغ یقین کیونکر بجھ سکتا تھا جسے قدرت نے اس علاقہ کے ظلمت کدوں کو منور کرنے کیلئے جگمگایا تھا۔ آپ کو سماع کا بہت شوق تھا، سماع چونکہ آپ کے مرشد اور جملہ شیوخ چشت کا پسندیدہ عمل رہا ہے۔ اس لئے آپ نہایت ذوق و شوق سے محافل سماع کا اہتمام فرمایا کرتے۔ اس ضمن میں آپ ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ ”سماع انہی لوگوں کیلئے جائز ہے جو اس میں ایسے مستغرق ہوں کہ ایک لاکھ تکواریں ان کے سر پر ماری جائیں یا ایک ہزار فرشتے ان کے کان میں کچھ کہیں تو انہیں خبر نہ ہو۔“

ایک روز بابا فرید نے سماع کی خاطر قوال کو بلایا تو قوال موجود نہ تھا۔ آپ نے مولانا بدر الدین اسحاق کو قاضی حمید الدین ناگوری کا خط پڑھنے کا حکم دیا۔ خط میں حمد و نعت کے بعد لکھا تھا:

بندہ حقیر نحیف ضعیف۔ بندۂ درویشاں دریدہ خاکپائے ایشاں محمد عطا المعروف حمید الدین ناگوری۔

یہ سنتے ہی حضرت بابا فرید پر کیفیت طاری ہو گئی، جب مولانا نے خط میں درج یہ رباعی پڑھی تو حضرت بابا فرید پر وجد طاری ہو گیا۔

آں عقل کجا کہ در کمال تو رسد

آں روح کجا کہ در جلال تو رسد

گیرم کہ تو پردہ گرفتگی ز جمال

آں دیدہ کجا کہ در جمال تو رسد

علمائے ظاہر اور بد اعمال افسران کیلئے حضرت بابا صاحب کو برداشت کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ کبھی سماع کو بہانہ بتاتے اور کبھی آپ کے در پر زائرین کے ہجوم پر اعتراض کرتے۔ انہیں احساس ہو رہا تھا کہ ان کی نام نہاد برتری کا طلسم خاک میں ملنے کو ہے۔ بابا فرید کی شہرت برصغیر پاک و ہند

کو عبور کر کے دور دراز کے ملکوں سے لوگوں کو کھینچ لائی تھی۔ اجودھن کے قاضی آپ کی شہرت اور ہر دل عزیز ی سے جلتے تھے اور ان کی انگلیت پر جاگیرداروں اور دوسرے سرکاری افسروں نے بابا صاحب کے افرادِ خاندان کو پریشان کرنا شروع کر دیا۔ بابا صاحب سب کچھ صبر و تحمل سے برداشت کر گئے، جب قاضی صاحب کی ہر کوشش بابا صاحب کی متحمل مزاجی کے سامنے ناکام ہو گئی تو انہوں نے علمائے ملتان سے بابا صاحب کے بارے میں ان الفاظ میں فتویٰ مانگا:

”ایک تعلیم یافتہ شخص جو وجد میں رہتا ہے۔ گانا سنتا ہے او ناچتا بھی ہے۔ آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے۔“

علمائے ملتان نے قاضی صاحب سے اس شخص کا نام دریافت کیا ہے، جب انہوں نے بابا فرید کا نام لیا تو وہ بیک زبان پکار اٹھے:

”تم نے ایسے بزرگ کے بارے میں پوچھا ہے جس کے خلاف کوئی مجتہد انگلی تک نہیں اٹھا سکتا۔“

قاضی اجودھن کے حسد کی آگ پھر بھی ٹھنڈی نہ ہوئی۔ اس ذلت و رسوائی نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور اس نے بابا صاحب کو شہید کرانے کیلئے کرائے کے قاتل کی خدمات حاصل کیں جو کپڑوں کے نیچے خنجر چھپا کر بابا صاحب کے آستانے پر جا پہنچا۔

شیخ نظام الدین اولیاء علیہ الرحمۃ بیان فرماتے ہیں:

”ایک دن شیخ الاسلام فرید الدین صبح کی نماز کے بعد سجدے میں گر گئے۔ وہ اکثر اسی طرح سجدے میں کچھ وقت گزارا کرتے تھے۔ چونکہ موسم سخت سرد تھا، آپ پر ایک پوسٹین ڈال دی گئی۔ اس وقت بابا صاحب کے پاس میرے سوا کوئی خادم موجود نہ تھا۔ اچانک ایک آدمی آیا اور اس نے زور سے السلام علیکم کہا۔ بابا صاحب بھی چونک پڑے اور پوچھا کون ہے؟ میں (نظام الدین اولیاء) نے جواب دیا حضور میں ہوں۔ اس پر بابا صاحب نے فرمایا جو شخص آیا ہے وہ درمیانے قد اور ہلکے زرد رنگ کا ترک ہے، جب میں نے اس شخص کی طرف دیکھا تو وہ ہو بہو ایسا ہی تھا، جیسا بابا صاحب نے فرمایا تھا، میں نے عرض کیا کہ ہاں حضور یہ شخص ایسا ہی ہے۔ پھر بابا صاحب نے پوچھا اس کی کمر پر زنجیر ہے، جب میں نے دیکھا تو اس کی کمر پر زنجیر بھی تھی، میں نے جواب دیا حضور زنجیر بھی موجود ہے، پھر آپ نے پوچھا کیا اس نے کانوں میں کچھ پہن رکھا ہے، چنانچہ میں نے جواب دیا حضور اس کے کانوں میں بالیاں ہیں۔ چنانچہ بابا صاحب نے فرمایا کہ اس سے کہو ذلیل ہونے سے پیشتر چلا

جائے۔ آپ کا یہ کہنا تھا کہ وہ شخص سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ اٹھا اور آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔
کرائے کا یہ قاتل سیدھا قاضی کے پاس پہنچا اور کہنے لگا ایسے مردِ خدا کو قتل کرنا میرے بس
میں نہیں ہے۔ اس کوشش میں ناکام ہونے کے بعد بھی قاضی حضرت بابا صاحب کے فرزندوں کو تنگ
کرتا رہا، جب انہوں نے بابا صاحب سے شکایت کی تو آپ نے فرمایا ”تم عنقریب دشمنوں سے
نجات پا لو گے، کچھ عرصے بعد دشمن تتر بتر ہو گئے اور جو رہ گئے وہ آپ کے حلقہٴ ارادت سے وابستہ
ہو گئے۔ مذکورہ قاضی کا جانشین بھی اپنے پیشرو کی طرح ظالم، حاسد اور کینہ پرور تھا، اس نے اجودھن
کے حاکم کو بھی بابا صاحب کے خلاف کارروائی پر ابھارا۔ حاکم نے بابا صاحب کے صاحبزادگان کو تنگ
کرنا شروع کیا تو ایک روز آپ کے بڑے فرزند نے انتہائی بے بسی کے عالم میں آپ سے کہا:
”آپ کے روحانی فضل و کرم کا ہمیں صرف اتنا فائدہ پہنچا ہے کہ حاکم نے ہمارا ناک میں
دم کر رکھا ہے۔“

آپ سے صاحبزادے کی آزر دگی دیکھی نہ گئی، طبیعت میں جلال آ گیا اور اپنا عصا زمین پر
دے مارا، ادھر عصا زمین پر لگا ادھر حاکم کے پیٹ میں شدید درد اٹھا اور شدت کرب سے چلانے لگا
”مجھے شیخ فرید الدین کے پاس لے چلو“۔ لوگ اسے چار پائی پر ڈال کر بابا صاحب کی طرف لا رہے
تھے کہ راستے ہی میں انتقال کر گیا۔

.....O.....

اب سازشوں، ریشہ دوانیوں، حاسدانہ کارروائیوں اور ستم کاریوں کا دور لد چکا تھا۔ آپ کے
علم و فضل اور غیر معمولی ہر دلعزیزی سے جلنے والے یا تو اپنے آتشِ حسد میں جل کر خاک ہو چکے تھے
اور یا تائب ہو کر آپ کے دامانِ شفقت سے منسلک ہو چکے تھے۔ خلقت تھی کہ اکنافِ عالم سے کھینچی
چلی آرہی تھی۔ سخت عبادت و ریاضت اگرچہ آپ کا خاصہ حیات تھا مگر آپ مجلسِ آرائی کیلئے وقت
نکالتے۔ آپ کے ارشادات عالیہ سن کر اصحابِ علم کو یوں محسوس ہوتا کہ علم و فضل کے جواہر بے بہا
لٹائے جا رہے ہیں۔ طالبانِ شوق آگے بڑھتے اور ان جواہر پاروں کو اپنے دامانِ ادراک میں محفوظ
کر لیتے۔ سماع کی محفلیں آراستہ ہوتیں تو قوال پاکیزہ کلام پیش کرتے۔ آپ سماع کی حالت میں
عالم جذب و تخیر میں کھو جاتے اور کئی کئی روز اسی عالم کیف و سرمستی میں گزر جاتے مگر اس حالت میں
بھی نماز باقاعدگی سے ادا فرماتے تھے۔ ایک بار آپ سے سماع کے حلال و حرام ہونے کے بارے
میں سوال کیا گیا تو آپ نے ارشاد فرمایا ”سبحان اللہ ایک تو جل کر خاک ہو گیا اور دوسرا حلال و حرام

Click For More Books

<https://archive.org/details/@zohaibhasanattari>

کے چکر میں ہے۔ سماعِ راحتِ قلوب ہے اور اہل دل کے دلوں میں حرکت پیدا کرتا ہے اور عشقِ الہی کی آگ کو بھڑکاتا ہے۔“

اجودھن میں ان دنوں ایک جوگی بشمب ناتھ کا بہت شہرہ تھا مگر وہ حضرت بابا صاحب فرید کی شانِ جلالت کی تاب نہ لا کر حلقہ بگوشِ اسلام ہو گیا اور شیخ کمال کا نام پا کر بابا صاحب کی نسبت سے صاحبانِ بصیرت میں شامل ہو گیا۔ اس جیسے بے شمار خلقِ خدا کو گمراہ کرنے والے شعبدہ باز آپ کے سامنے آئے تو پھر ہمیشہ ہمیشہ کیلئے آپ کے لطفِ کریمانہ کے اسیر ہو گئے۔ پنجاب کے جو قبیلے آج مسلمان نظر آتے ہیں ان سب نے حضرت بابا فرید کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا ہے۔ ان میں میو، سیال، وٹو، وڑائچ، چیمے، گوندل، جھب، رانجھے، ٹوانے، کھوکھر، ڈوگر اور کبوتہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ اگر آپ حکمتِ ایزدی کے مطابق دہلی سے نہ نکلتے تو شاید یہ علاقہ اس طور انوار و تجلیاتِ چشتیہ سے فیضیاب نہ ہو پاتا۔

آپ کے کم و بیش بائیس خلفاء ایسے ہوئے ہیں جو دنیا سے معرفت میں اپنا مفرد مقام رکھتے ہیں۔ آپ کے سلسلہ تبلیغ کی بدولت مشرق و وسطیٰ میں اسلام کی اشاعت کی اتنی سعادت شاید ہی کسی اور بزرگ کے حصے میں آئی ہو۔ جملہ تذکرہ نویس اس امر پر متفق ہیں کہ آپ اگر پاکستان میں شمعِ معرفت روشن نہ کرتے تو یہ علاقے نجانے کب تک کسی دانائے راز کی آرزو میں کفر و ضلالت کی آماجگاہ بنے رہتے۔

.....○.....

حضرت خواجہ خواجگان خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت بابا فرید الدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کو شہباز طریقت قرار دیا تھا۔ آپ کی روحانی پرواز لاہوتی تھی۔ صبر و رضا اور خودی و استغناء کمال کو پہنچے ہوئے تھے۔ اپنے مریدین کو بھی انہی صفات کی تلقین کیا کرتے تھے اور امرائے وقت کو بھی ان کے فرائض کا احساس دلانے میں کسی ہچکچاہٹ سے کام نہیں لیا کرتے تھے۔ تحمل، بردباری، قناعت، توکل، تقویٰ، ورع، عشق، ذوق و شوق میں آپ بے نظیر تھے۔ حسب ذیل رباعی بڑے شوق سے پڑھا کرتے تھے:

خواہم کہ ہمیشہ درِ رضائے تو زیم خاکی شوم و بزیر پائے تو زیم
مقصود من خستہ ز کونین توئی از بہر تو میرم و برائے تو زیم
مریدوں کی روحانی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دیتے۔ اس ضمن میں شریعت کے اصولوں

کی بالادستی کا خیال رکھتے۔ ایک روز مولانا جلال الدین ہانسوی جنگل سے ڈیلے اور مولانا بدر الدین اسحاق لکڑیاں لائے۔ حضرت نظام الدین اولیاء نے ان کو اُبانے کیلئے چولہے پر چڑھا دیا اور بازار جا کر بقال سے نمک ادھار حاصل کر کے ڈیلوں میں ڈال دیا، جب دسترخوان بچھایا گیا اور جملہ مریدین کھانے بیٹھے تو حضرت بابا فرید نے لقمہ اُٹھایا اور یہ کہتے ہوئے واپس رکھ دیا کہ لقمہ طبیعت پر گراں گزرتا ہے، کوئی شبہ والی بات معلوم ہوتی ہے۔ یہ سن کر حضرت نظام الدین اولیاء نے جنگل سے ڈیلے لانے اور اُبانے کی بابت ماجرا عرض کیا تو حضرت بابا فرید نے ایک لمحہ تامل کے بعد فرمایا ”نمک کہاں سے آیا۔ حضرت نظام الدین اولیاء نے دست بستہ عرض کیا ”یہ خطا مجھ سے سرزد ہوئی ہے کہ ڈیلوں کو ذائقہ دار بنانے کیلئے نمک قرض لا کر ڈال دیا۔“

حضرت بابا فرید نے ارشاد فرمایا کہ یہ کھانا دوسرے فقراء میں تقسیم کر دو، پھر ارشاد فرمایا:

”درویش چاہے فاقے سے مر جائے
لذت نفس کیلئے قرض نہیں لے گا“

حضرت نظام الدین اولیاء نے اسی وقت دل میں عہد کیا کہ آئندہ قرض نہیں لوں گا۔ حضرت بابا فرید نے فوراً ان کی دلی کیفیت کا مشاہدہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ”انشاء اللہ اب تم کو قرض لینے کی ضرورت بھی نہیں پڑے گی۔“

یہ تو مریدین اور فقراء کی روحانی و فکری تربیت کی جھلک ہے۔ آپ کو جب کبھی سلاطین سے مراسلت کرنا پڑی تو اس میں بھی عظمت استغناء اور شان فقر کا نمونہ پیش کر دیا۔ ایک مرتبہ ایک ضرورت مند آپ کی خدمت میں سلطان بلین کے نام سفارشی خط لکھ کر دینے کیلئے حاضر ہوا، اس ضرورت مند کی حاجت درست تھی۔ آپ انکار نہ کر سکے اور آپ نے سلطان بلین کے نام یہ خط لکھ کر اس کے حوالے کیا۔

میں نے اس شخص کی ضرورت کو اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کیا پھر تیرے پاس بھیج دیا۔ اگر تو نے اس کو کچھ دے گا تو دین اللہ تعالیٰ کی ہوگی اور یہ تیرا شکر گزار ہوگا اور اگر کچھ نہ دے گا تو روک خدا کی طرف سے ہوگی اور تو معذور سمجھا جائے گا۔“

ایک بار سلطان ناصر الدین محمود کی طرف سے اس کا معتمد الخ خاں پانچ گاؤں کا پروانہ اور رقم لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے رقم تو فقراء میں تقسیم کر دی مگر پانچ گاؤں کا پروانہ یہ کہتے ہوئے واپس کر دیا کہ فقیروں کو ان چیزوں سے کیا واسطہ یہ انہیں دے دو جو اس کے

ضرورت مند ہیں۔ سچ ہے:

نگاہ فقر میں شانِ سکندری کیا ہے
خراج کی جو گدا ہو وہ قیصری کیا ہے
آپ نے گنج شکر کا لقب پایا اور زندگی بھر خلق خدا کو شیرینی حیات کی چاشنی عطا کرتے رہے۔ گنج شکر کے لقب کی شہرت کے کئی واقعات ہیں جن میں سے ایک واقعہ طے کے روزہ کے ضمن میں بیان ہو چکا ہے۔ ایک واقعہ ان کے بچپن کا ہے۔ آپ کی والدہ نماز کی پابندی کروانے کیلئے آپ کے مصلی کے نیچے شکر کی پڑیا رکھ دیا کرتی تھیں۔ آپ نماز پڑھ چکے تو وہ فرماتیں کہ جو بچے نماز پڑھتے ہیں انہیں غیب سے شکر عطا ہوتی ہے۔ ایک دن والدہ شکر رکھنا بھول گئیں مگر آپ نے مصلی اٹھایا تو شکر کی پڑیا موجود تھی جب آپ نے والدہ کو یہ واقعہ سنایا تو وہ سمجھ گئیں کہ یہ سامان غیب تھا انہوں نے اپنے بیٹے کو اسی دن سے گنج شکر کہنا شروع کر دیا۔

اسی طرح ایک مرتبہ ایک سوداگر گاڑی پر شکر لادے اجودھن (پاکپتن) کے قریب سے گزرا تو راستے میں بابا فرید کھڑے تھے۔ آپ نے پوچھا کہ کیا لدا ہے؟ تو اس نے کہا کہ نمک ہے۔ آپ نے فرمایا ”اچھا نمک ہی ہوگا“ سوداگر نے منزل پر پہنچ کر بورے کھولے تو ان میں شکر کے بجائے نمک تھا۔ پریشانی کے عالم میں واپس آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور جھوٹ بولنے پر معافی کا خواستگار ہوا جس پر آپ نے مسکراتے ہوئے فرمایا ”اچھا شکر تھی تو بوروں میں شکر ہی ہوگی“۔ سوداگر نے گھر پہنچ کر دیکھا کہ بوروں میں شکر بھری ہوئی تھی۔ شاعر نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے:

کانِ نمک جہاں شکر شیخ بحر و بر
آں کز شکر نمک کند و از نمک شکر

غرضیکہ تلخابہ حیات کو زندگی کی حقیقی مٹھاس عطا کرتے ہوئے حضرت بابا فرید نے دلوں کو معرفت کا ذوق بھی بخشا اور فقر و استغناء کے انداز بھی سکھائے کہ جب فقیر اس مقام پر آجائے کہ اس کی زبان تقدیر الہی کا پرتو بن جائے تو شاہانِ کجگاہ کی طرف وہ آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا بلکہ بادشاہ تو خود اس کی رضا جوئی کے طفیل وارثِ تخت و تاج بنتے ہیں۔ الخ خاں کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ ادھر اس کے دل نے آرزو کی ادھر بابا فرید نے مستقبل کی سلطانی کا مژدہ سنا دیا۔ یہی الخ خاں تھا جو بعد میں غیاث الدین بلبن کے نام سے تخت نشین ہوا۔



Click For More Books

<https://archive.org/details/@zohaibhasanattari>

برہان الواصلین سلطان العارفين حضرت سلطان باہو رحمۃ اللہ علیہ

سلطان العارفين حضرت سلطان باہو رحمۃ اللہ علیہ کا شمار ان جلیل القدر صوفیائے کرام میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنی زبان کی تاثیر اور نظر کی قوت تسخیر سے اہل نظر کی تقدیر بدل کر رکھ دی۔ آپ قادری سروری سلسلہ طریقت کے نامور بزرگ تھے۔ آپ مادر زاد ولی اور سیدنا غوث الاعظم رحمۃ اللہ علیہ کی فکری و روحانی وراثت کے امین تھے۔ تمام تذکرہ نگاروں نے آپ کے مقامات قدسینہ اور محاسن دل کھول کر بیان کئے ہیں۔ آپ گفتار اور کردار میں اللہ کی برہان اور اپنے ارشادات کے حوالے سے احکام مصطفوی کے ترجمان تھے۔ آپ جب تک حیات رہے ایک زمانہ آپ کے روحانی فیوض و برکات سے اپنے دامانِ عمل کو بھر پور کرتا رہا اور آج جبکہ آپ آسودہ لحد ہیں تو آپ کے مزار اقدس پر شب و روز عقیدت مندوں کا ہجوم آپ کے مرجع خواص و عوام ہونے کا ثبوت ہے۔ آپ کی یہ مقبولیت آپ کے روحانی مدارج کی سر بلندی کا ثبوت ہے جس کی طرف آپ کے ایک بیت میں یوں اشارہ ملتا ہے:

ظاہر باطن عین عیانی ہو ہو پیا سنیوے ہو
نام فقر تھا ندا باہو قبر جہاں دی جیوے ہو

ولادت باسعادت

آپ ۱۰۳۹ھ میں ضلع جھنگ کے قصبہ شورکوٹ میں عظیم صوفی بزرگ حضرت سلطان بازید محمد رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد محترم حضرت بازید محمد پابند صوم و صلوة صاحب شریعت و طریقت بزرگ اور زہد و تقویٰ کی بلندیوں پر فائز تھے۔ آپ کی اماں محترمہ حضرت بی بی راستی بھی زہد و عبادت میں یکتا بے ریائی و پرہیزگاری میں بے مثال اور تذکرہ نگاروں کے بقول ولیہ خاتون تھیں۔ آپ کے والد عالم فاضل ہونے کی بناء پر سلطنت مغلیہ کے عہدیدار تھے۔ حضرت

سلطان باہو رحمۃ اللہ علیہ کو مادر زاد ولی کہا جاتا ہے۔ کیونکہ آپ کی پیدائش کے ساتھ ہی بہت سے ایمان افروز مناظر دیکھتے میں آئے۔ آپ کی روحانی تربیت میں آپ کے عظیم والد کے ساتھ ساتھ آپ کی ولیہ مادر محترم کا خاص دخل ہے کہ جن کی آغوش نے انہیں بچپن ہی سے منفرد و یکتا بنا دیا۔ انہوں نے آپ کو بچپن ہی میں وہ تمام مقامات سلوک طے کروا دیئے جو بہت سے صوفیاء کو پیری میں بھی نصیب نہیں ہوتے۔ آپ نے اپنی والدہ محترمہ کی عنایات کریمانہ اور روحانی تربیت کا اپنی کتابوں میں متعدد مقامات پر ذکر کیا ہے۔

لقب باہو

آپ کی والدہ ماجدہ آپ کے بچپن کو ایک نظر دیکھتے ہی سمجھ گئی تھیں کہ ان کا یہ فرزند ایک روز آسمان طریقت و معرفت پر صورت شاہباز پرواز کرے گا۔ وہ جان چکی تھیں کہ ان کا یہ لخت جگر دنیاوی علاقے سے بے گانہ ہو کر اپنے خدا سے لو لگائے ہوئے ہے۔ اس لئے انہوں نے آپ کا اسم گرامی ”باہو“ رکھا۔ یہ ایک منفرد اور نیا نام تھا جو اس سے پہلے کسی ولی کو نصیب نہیں ہوا تھا۔ آپ کو بھی اپنی والدہ ماجدہ کی طرف سے عطا کردہ نام اس قدر عزیز ہوا کہ آپ نے نثری کتب اور خاص طور پر اپنی معجزانہ شاعری میں نہایت شدت اور تواتر کے ساتھ اس نام کو استعمال کیا۔ خود فرماتے ہیں:

ع..... فقیر باہو فنا فی عین ذات باہو

اور ایک جگہ اپنے نام کی اہمیت یوں واضح کرتے ہیں:

ع..... تو نے دانی کہ باہو با خدا است

آپ کو اپنے نام کے تقدس اور اس کی انفرادیت کا احساس تھا اور تاریخ شاہد ہے کہ آپ اس طرح سے فنا فی اللہ کے مقام پر فائز ہوئے کہ آپ کا نام اپنی پوری معنویت اور روحانی جامعیت کے ساتھ زبان زد عام ہو گیا۔

مادر زاد ولی

جیسا کہ ہم نے پہلے بھی عرض کیا ہے کہ آپ مادر زاد ولی تھے۔ آپ کی ولایت کے شاہد آپ کے والدین ہی نہیں بلکہ اہل قصبہ بھی تھے۔ بچپن میں ہی آپ کی ذات بابرکات سے جو غیر معمولی روحانی امور ظہور پذیر ہوئے وہ آنے والے ادوار میں آپ کی سلطنت ولایت پر حکمرانی کی نوید سنار ہے تھے۔ آپ کے بچپن میں جب پہلی مرتبہ رمضان المبارک آیا تو آپ نے اپنی والدہ

ماجدہ کا دودھ نہ پیا۔ سحری سے لے کر افطاری تک دودھ نہ پیتے۔ گویا آپ دوسرے مسلمانوں کے ساتھ روزہ دار ہونے کا حق ادا کر رہے تھے۔ اگلے رمضان المبارک میں بھی آپ نے ایسا ہی کیا۔ آپ کا چہرہ روشن آنکھیں منور اور پیشانی نور ایمان سے ضو قلم تھی اور بچپن ہی میں آپ کی ایمانی تجلیات کی یہ تاثیر تھی کہ جب دایہ کے ساتھ باہر نکلتے اور آپ کے چہرہ انور پر کسی غیر مسلم کی نظر پڑ جاتی تو وہ فوراً حلقہ بگوش اسلام ہو جاتا۔ آپ کا ارشاد ہے:

رحمت حق بر روان راستی راستی از راستی آراستی

سلسلہ کتب اور بیعت

چونکہ آپ بچپن ہی سے فیض ازلی سے بہرہ مند تھے اس لئے بچپن ہی میں آپ پر روحانی واردات و جذبات الہی طاری ہونے لگے۔ آپ فرماتے ہیں مجھے ان تجلیات الہیہ کی کثرت کے سبب علم ظاہری حاصل کرنے کا کوئی وقت نہیں پتا تھا لیکن علم باطن کی فتوحات اس قدر تھیں کہ تخیل و تصور میں نہ سما سکیں۔

اگرچہ نیست ماری علم ظاہر
علم باطنی جاں کشتہ طاہر

علم تصوف اور سلوک طریقت کے موضوع پر آپ نے علوم باطن کے کشف سے فارسی اور عربی زبان میں ایک سو چالیس کتابیں لکھیں جن کی تاثیر کا یہ عالم ہے کہ اگر یقین کامل کے ساتھ ان کا مطالعہ کیا جائے تو راہ سلوک میں طالبان حق کے لئے رہبر کامل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ باطنی طور پر آپ کی بیعت سب سے پہلے سلطان دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہوئی چنانچہ خود فرماتے ہیں:

دست بیعت کرد ماری مصطفیٰ
فرزند خود خواندست ماری مجتبیٰ

پھر نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے باطن ہی میں آپ کو حضور غوث الاعظم سیدنا عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے سپرد کر دیا اور باطنی تلقین فرمائی۔ ان باطنی فیوض کے باوجود آپ کی والدہ کی فرمائش تھی کہ ظاہری مرشد کی بیعت بھی ضروری ہے۔ ایک طویل عرصہ تک مرشد کامل کی تلاش میں سرگرداں رہنے کے بعد آخر کار آپ کو سلطان الاولیاء حضرت پیر عبدالرحمن قادری دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی صورت میں وہ مرد کامل نظر آیا جو ان کی روحانی تعلیمی کا ازالہ کر سکے۔ چنانچہ حضرت سلطان باہو

Click For More Books

<https://archive.org/details/@zohaibhasanattari>

رحمۃ اللہ علیہ نے اسی درویش خدا مست کے ہاتھ پر بیعت کر کے نئے روحانی سفر کا آغاز کر دیا۔

صاحب کرامات کثیرہ

چونکہ آپ مادر زاد ولی تھے اس لئے آپ کی ذات سے بچپن ہی سے کرامات کا ظہور ہو رہا تھا۔ بچپن سے لے کر لحد میں آرام فرما ہونے تک آپ سے بے شمار کرامات ظاہر ہوئیں۔ آپ کی عادت مبارکہ تھی کہ اپنے مریدین کے ہمراہ پہاڑوں اور جنگلوں کی طرف نکل جاتے اور مدتوں وہاں نحو عبادت رہتے۔ ایک مرتبہ آپ سیر و سیاحت کرتے ہوئے زر خیز پہاڑی علاقہ کلر کبار پر تشریف لے گئے اور وہاں ایک عرسہ تک عبادت و ریاضت میں مصروف رہے۔ آپ کے ساتھیوں پر بھوک پیاس کا غلبہ ہوا تو آپ سے شکایت کی۔ آپ نے مراقبہ سے سر اٹھا کر فرمایا:

”برات عاشقان بر شاخ آہو“

آپ کی زبان مبارکہ سے یہ الفاظ ادا ہوتے ہی فوراً ایک ہرن اپنے سینگوں پر کھانے کا دسترخوان اور پانی سے بھرا آبخورہ لٹکائے آ حاضر ہوا۔ آپ نے ساتھیوں کو کھانا کھانے اور پانی پینے کا حکم فرمایا، جب سب ساتھی اپنے شیخ کی سرکردگی میں کھانے سے فارغ ہو چکے تو ہرن غائب ہو گیا۔ آپ کے مرید حضرت سلطان نورنگ نے جب اپنے شیخ کامل کے باطنی تصوف اور روحانی کمالات کا یہ عالم دیکھا تو بے ساختہ حضرت سلطان باہو رحمۃ اللہ علیہ کے مصرع پر گرہ لگا دی کہ:

عجب دیدم تماشہ شیخ باہو..... برات عاشقان بر شاخ آہو

حضرت سلطان باہو رحمۃ اللہ علیہ کی بے شمار کرامات اور کمالات پاکیزہ تذکروں اور سوانحی حالات میں مذکور ہیں۔ آپ نے گمراہوں کو نشان منزل عطا کیا۔ بے یقینیوں کو ایمان کی دولت بخشی، دکھ درد کے ماروں کو ابدی سکون سے ہمکنار کر دیا اور اصنام کے پرستاروں کو عشق مصطفیٰ اور توحید خداوندی کی دولت سے بہرہ ور کر دیا۔ آپ کی سب سے بڑی کرامت یہ ہے کہ آپ نے مردہ دل زندہ کر دیئے۔ کفر کی تاریکیاں چھٹنے لگیں، ایمان کے اُجالے چاروں طرف توحید خداوندی کے انوار لٹانے لگے اور زمانہ پکار اٹھا کہ:

نگاہ ولی میں یہ تاثیر دیکھی بدلتی ہزاروں کی تقدیر دیکھی

شاعری حقائق کا گنجینہ

سلطان العارفین قبلہ عالم حضرت سلطان باہو رحمۃ اللہ علیہ کی شاعری فقط شاعرانہ کمالات کا

مرقع ہی نہیں ہے بلکہ یہ شاعری محبت الہی، عشق مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم اور تصوف و معرفت کا گنجینہ ہے۔ آپ کی شاعری گلہائے معرفت کا ایسا سدا بہار گلدستہ ہے کہ جس کا ہر پھول روحانی لطافت سے معطر ہے۔ آپ کے وصال کو صدیاں گزر گئیں اور شام ابد تک زمانہ اپنا سفر جاری رکھے گا مگر آپ کی لازوال شاعری بدرکمال کی صورت میں ہمیشہ جگمگاتی رہے گی۔ آپ کی شاعری میں ”باہو“ کی تکرار نہ صرف ایک ایمان آفریں تاثر بخشی ہے بلکہ بندوں کو خدا سے واصل ہونے کے آداب بھی بخشی ہے۔ اس لفظ کے ادا کرنے سے زبان کو چاشنی، فکر کو لذت اور ذوق کو حلاوت عطا ہوتی ہے۔ آپ کی شاعری ہمیشہ اہل ایمان کے لئے چراغ منزل ایمان بنی رہے گی اور اہل دل آپ کی سیرت کے ساتھ ساتھ آپ کی شاعری کے انوار سے بھی دلوں کو منور کرتے رہیں گے۔ خود فرماتے ہیں:

جتنے ہو کرے رُشنائی اوتھوں چھوڑا اندھیرا دیندا ہو

دوئیں جہان غلام اس باہو جیہڑا ہو نوں صحیح کریندا ہو

سلطان العارفین کی تاریخ وصال یکم جمادی الثانی ۱۰۱۱ھ ہے۔ آپ کا مزار اقدس شورکوٹ ضلع جھنگ میں صدیوں سے مرجع خلائق ہے۔ طالبان شوق آپ کے مزار پر حاضر ہوتے اور حاجت براری کا سامان حاصل کرتے ہیں۔ آپ بلاشبہ سلطان العارفین ہیں کہ آپ نے معرفت خداوندی کی شمع کے اُجالوں سے تاریک قلوب کو انوارِ خداوندی سے اس طرح معمور کر دیا کہ یہی دل عرفان ذات الہی کے مظہر بن گئے۔ آپ کے مزارِ انور پر شب و روز اصحاب نظر کا ہجوم آپ کے لفظوں کے مطابق آپ کی حیات دوام کی دلیل ہے کہ اس مقام کا حقدار وہی ٹھہرتا ہے جو اللہ سے لوگا لیتا ہے۔

چوداں طبق کرن رُشنائی انھیان کجھ نہ دتے ہو

باہجھ وصال اللہ دے باہو ہو ر سب کہانی قصے ہو



حضرت سخی سرور رحمۃ اللہ علیہ

حضرت سخی سرور بلاشبہ برصغیر پاک و ہند خصوصاً پنجاب کے اولیائے کبار اور صوفیائے عظام میں سے ہیں۔ تقسیم ہند سے قبل آپ کا حلقہ اثر اتنا وسیع تھا کہ بلا امتیاز مذہب و ملت سب قوموں کے لوگ اس میں نظر آتے ہیں۔ مسلم ہندو سیکھ سبھی آپ کی عقیدت کا دم بھرتے ہیں۔ حضرت سخی سرور نے عبادت و ریاضت کے دوران میں پاک و ہند کے بہت سے شہروں کو نوازا ہے۔ ضلع گوجرانوالہ کے کئی شہروں مثلاً دھونکل، گوجرانوالہ، ایمن آباد اور سوہدرہ سے بھی آپ کا تعلق رہا ہے۔ اسی حوالے سے آپ کے سوانح حیات رقم کرتے ہوئے ہم اس ضلع میں آپ کا قیام کا خصوصی تذکرہ کریں گے۔

بر زمینے کہ نشان کف پائے تو بود

سالہا سجدہ صاحب نظراں خواہد بود

حضرت سخی سرور رحمۃ اللہ علیہ کے آباؤ اجداد عرب کے رہنے والے تھے۔ آپ کے والد ماجد حضرت سید زین العابدین بغداد سے برصغیر پاک و ہند میں تشریف لائے اور ملتان سے گیارہ میل کے فاصلہ پر ایک گاؤں میں سکونت اختیار کی جو آج کل شاہ کوٹ کے نام سے مشہور ہے۔ علاقہ کے دوسرے عوام کی طرح وہاں کا نمبردار پیرا رہاں بھی آپ کا مرید ہو گیا۔ اور اس نے اپنی بیٹی بی بی عائشہ کی شادی آپ سے کر دی۔ شادی سے کوئی سال دو سال بعد ان کے ہاں ایک فرزند پیدا ہوا جس کا نام سید احمد سلطان تھا اور جس نے آگے چل کر سید سخی سرور کے نام سے شہرت پائی۔ مگر ہمیشہ تمام تذکرہ نگار متفق الرائے ہیں کہ حضرت سخی سرور کا اصل نام سید احمد سلطان ہے اور آپ کو کوئی ایک القاب سے پکارا جاتا ہے۔ مثلاً سخی سرور، لکھی خان، لالانوالہ، روہیانوالہ، پیر خانو، وغیرہ ان سب القاب سے عقیدت مندوں کو آپ کی سخاوت و دریا ولی کا اظہار مقصود ہوتا ہے۔

آپ حسینی سید تھے۔ آپ کا سلسلہ نسب چند واسطوں سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے جا ملتا ہے۔ آپ کی تاریخ ولادت کے بارے مختلف بیانات ہیں۔ تاہم زیادہ تر تذکرہ نگار اس امر پر

متفق ہیں کہ آپ ۵۲۳ھ کے لگ بھگ پیدا ہوئے۔ آپ کم عمری میں اپنے والد سے علوم شرعی سیکھتے رہے۔ اور پھر ان کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کیلئے لاہور تشریف لائے۔ یہاں ان دنوں مولانا سید محمد اسحاق کا علم و فضل کا بڑا چرچا تھا۔ حضرت سخی سرور نے بھی ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا اور ایک ہونہار شاگرد کی طرح بتدریج علوم شریعت کے ارتقائی مراحل طے کئے۔

حضرت سخی سرور رحمۃ اللہ علیہ کی شادی حاکم ملتان گھنوخان کی بیٹی بی بی بانی سے ہوئی تو آپ کی بیوی جھیز میں بہت زیادہ سازو سامان لے کر آئی۔ تمام امیروں کبیروں نے نذریں گزاریں لیکن حضرت سخی سرور رحمۃ اللہ علیہ نے چند دنوں میں ہی تمام سامان بے شمار دولت اور گھوڑے جوڑے غرباء میں تقسیم کر دیئے۔

حضرت سخی سرور رحمۃ اللہ علیہ کو باطنی تعلیم کے حصول کا بے حد شوق تھا۔ والد کی وفات کے بعد آپ کو اپنے وطن شاہوٹ سے کوئی دلچسپی نہ رہی۔ والد کی وفات عزیزوں کی اموات اور خالہ زاد بھائیوں کی بے مروتی اور چیرہ دستی کو دیکھ کر آپ مجبور ہو گئے کہ وطن سے کہیں دور جائیں۔ اس کے علاوہ علوم باطنی کی تحصیل کا جذبہ دل میں گھر کر چکا تھا۔ اس لئے وطن سے نکلے تو بغداد میں غوث الاعظم سید عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے دربار پر انوار میں جا کر دم لیا اور کئی برس ان کی صحبت میں رہ کر کتاب فیض کیا اور جب وہاں سے وطن واپس لوٹے تو اپنے ہمراہ سلسلہ قادریہ بھی لائے۔ واپسی پر آپ نے اجمیر شریف میں حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی ملاقات کی اور پھر پاک و ہند کے دوسرے علاقوں کی سیر و سیاحت کرتے ہوئے بالآخر کوہ سلیمان کے دامن میں اس جگہ رہائش اختیار کی جو آج کل آپ کے نام پر سخی سرور کہلاتی ہے۔

آپ نے شیخ الشیوخ حضرت شہاب الدین سہروردی سے بھی روحانی فیض پایا تھا۔ اس کے علاوہ آپ نے حضرت خواجہ قطب الدین مودود چشتی رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ پر سلسلہ چشتیہ میں بیعت کی اور انہی کے دست مبارک سے خرقہ خلافت حاصل کیا۔ غرض آپ ولی کامل بن گئے اور آپ سے خارق عادت افعال اور کرامات کا ظہور ہونے لگا۔

حضرت سخی سرور رحمۃ اللہ علیہ نے بغداد سے واپسی پر جن مقامات سے قیام کیا ان میں پاک و ہند کے دوسرے مقامات کے علاوہ ضلع گوجرانوالہ کے مقامات دھونکل، سوہدرہ، ایمن آباد اور گوجرانوالہ بھی شامل ہیں۔ اب ہم ان مضامین کا فرداً فرداً ذکر کرتے ہیں۔

سوہدرہ میں قیام

حضرت سخی سرور بغداد سے واپس آئے تو پہلے لاہور میں مقیم ہوئے اور یہاں پر علوم ظاہری کی تکمیل کے بعد سوہدرہ تشریف لائے جو گوجرانوالہ سے چند میل کے فاصلہ پر شمال مغرب کی طرف وزیر آباد کے متصل واقع ہے۔ یہاں پہنچ کر آپ نے دریائے چناب کے کنارے اپنا ڈیرہ جمایا۔ آپ شب و روز یادِ الہی اور ہدایتِ خلق میں مشغول رہتے تھے۔ نواحی علاقوں میں آپ کی ولایت کا جرجا ہوا تو گروہ کے گروہ فیض حاصل کرنے کیلئے آپ کے پاس آنے لگے۔ بے اندازہ روپیہ آپ کی خدمت میں بطور نذرانہ لایا جاتا تھا لیکن آپ ساری رقم غریبوں محتاجوں اور مسکینوں میں تقسیم کر دیتے تھے۔ خدا نے آپ کو بڑی قبولیت عطا کی تھی۔ خلقت کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ آتے تھے لیکن کوئی ناکام و نامراد نہ جاتا۔ آپ گویا شمع معرفت تھے اور عقیدت مندوں کا ہجوم پروانہ وار آپ کے گرد جمع ہوتا اور اپنی مراد حاصل کر کے روانہ ہوتا۔ یہی وہ دور ہے جس میں آپ نے اپنی غریب پروری کا مظاہرہ کیا اور سخاوت کے ایسے دریا بہائے کہ لوگ آپ کو سلطان سخی سرور اور لکھ داتا کہہ کر پکارنے لگے۔

جب تک آپ سوہدرہ میں مقیم رہے۔ خلق خدا آپ کی روحانی تعلیمات سے برابر بہرہ اندوز ہوتی رہی۔ ہزاروں کی تعداد میں لوگ آپ کے حلقہ ارادت میں شامل ہوئے اور دین و دنیا کی نعمتوں سے مالا مال ہوئے۔

دھونگل میں ورود

تذکرہ نگاروں کے مطابق یہ قصبہ سلطان محمود غزنوی کے عہد میں ایک راجہ نے آباد کیا تھا۔ اس نے ایک قلعہ بھی تعمیر کرایا تھا۔ جب اس راجہ کی حکومت جاتی رہی تو حضرت سخی سرور اس جگہ تشریف لا کر مصروف عبادت ہوئے۔ آپ کی برکت سے یہاں پانی کا ایک چشمہ جاری ہو گیا۔ شاہجہان کے زمانہ میں مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی نے آپ کے عبادت خانہ پر ایک پختہ مسجد بنوائی اور چشمہ کی جگہ کنواں تیار کرایا۔ سکھوں کے عہد میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے پانی کی حفاظت کیلئے اس کنوئیں پر ایک گنبد تعمیر کرایا۔ حضرت سخی سرور رحمۃ اللہ علیہ کی عبادت گاہ پر ہر سال ہاڑ کے مہینے کی پہلی جمعرات سے ساون کے مہینے کی پہلی جمعرات تک ایک میلہ لگتا ہے جس میں اطراف ملک کے لوگ شریک ہوتے ہیں۔ آپ کی کرامت سے پانی کا جو چشمہ جاری ہوا تھا وہ کوڑھ کیلئے مفید بتایا

جاتا ہے جس جگہ آپ نے یہاں عبادت کی تھی اس کو شاہجہان کے عہد میں ایک عظیم الشان دربار میں منتقل کر دیا گیا اور اس چشمے کو جس پر کنواں بنایا گیا۔ دلکش اور نظر افروز بنا دیا گیا۔ پہلے حضرت سخی سرور رحمۃ اللہ علیہ کے دربار کا چڑھاوا اٹھائیں کنوؤں کے مالکوں میں مساوی طور پر تقسیم کیا جاتا تھا لیکن اب یہ دربار محکمہ اوقاف کی تحویل میں آچکا ہے اور اس کا نظم و ضبط اسی محکمے کے سپرد ہے۔

حضرت سخی سرور رحمۃ اللہ علیہ کے قیام دھونگل سے متعلق کئی واقعات مختلف کتابوں میں درج ہیں۔ ایک دن دھونگل کا نمبردار جو نندہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا یا حضرت میرا لڑکا دھونگل جس کے نام پر میں نے یہ گاؤں آباد کیا ہے۔ چند روز سے مفقود الخمر ہے۔ براہ کرم دعا کیجئے وہ میرے پاس آجائے آپ نے کہا جاؤ اور اطمینان رکھو لڑکا انشاء اللہ آج تمہارے پاس آجائے گا۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ لڑکا اسی روز باپ کے پاس آ گیا۔

آپ چند سال دھونگل میں مقیم رہے۔ تواریخ میں مرقوم ہے کہ دھونگل میں ایک جگہ سلطان سخی سرور کے نام سے منسوب ہے۔ یہ جگہ اگرچہ ہمیشہ زیارت گاہ خلائق رہی ہے لیکن موسم گرما میں برصغیر پاک و ہند کے مختلف گوشوں سے لوگ جوق در جوق یہاں آتے ہیں نذریں گزارتے اور یہاں عبادت کرتے ہیں۔ کوئی دو مہینے تک اس جگہ زائرین کا ہجوم رہتا ہے۔ وہ لوگ جو آپ کے عرس میں شرکت کیلئے ڈیرہ غازی خان جاتے ہیں وہ پہلے دھونگل میں آپ کی جائے قیام پر حاضری دیتے ہیں۔

گوجرانوالہ میں ایمن آباد میں آمد

اگرچہ سوہدرہ اور پھر دھونگل کی طرح آپ کا بیان زیادہ قیام تو نہیں رہا لیکن جس طرح ابر رحمت کسی جگہ کھل کر نہ برے تو بھی گزرتے گزرتے چند چھینٹے ضرور برسا جاتا ہے۔ اسی طرح آپ جب ان علاقوں سے گزرے تو یہاں کے عوام نے بھی آپ کے دامان رحمت سے خوشہ چینی کی اور اس ابر گوہر بار سے کچھ گہرہائے تابدار چن کر اپنے دامن تقدیر میں سجائے۔ آپ جب بھی ان علاقوں سے گزرتے تو گرد و نواح کے لوگ آپ کی راہوں میں دیدہ و دل فرس راہ کرتے ہوئے آپ کے استقبال کو موجود ہوتے۔ آپ کی شہرت برصغیر پاک و ہند میں اس قدر پھیل چکی تھی کہ شہر شہر قریہ قریہ گاؤں گاؤں آپ کی کرامات مقدسہ کے چرچے ہوتے تھے اور دور دور سے متلاشیان منزل ایمان و عرفان آپ کی خدمت عالیہ میں حاضری دینا ایک بہت بڑی سعادت تصور کرتے تھے۔

آپ اگرچہ اپنے خالہ زاد بھائیوں کی دشمنی سے تنگ آ کر اپنی زمینوں کو خیر باد کہہ کر اپنے

اہل و عیال سمیت ڈیرہ غازی خاں کے کوہ سلیمان کے دامن میں ڈیرہ جما چکے تھے۔ لیکن ان بھائیوں نے یہاں بھی آپ کو چین سے نہ رہنے دیا، جس جگہ آپ نے قیام کیا وہ جگہ پہلے نگاہہ کہلاتی تھی لیکن بعد میں آپ کی نسبت سے سخی سرور کے نام سے مشہور ہوئی۔

آپ کے خالہ زاد بھائیوں نے اپنی قوم یعنی کھوکھر قبیلے کے بہت سے آدمیوں کو آپ سے بدظن کر دیا اور بالآخر اس قبیلے کے ہزاروں افراد نے آپ پر لشکر کشی کی تاکہ آپ کو شہید کر دیں۔ آپ کے چند وفادار مرید آپ کے ناموس پر داد شجاعت دیتے ہوئے شہید ہو گئے۔ آپ خود مردانہ وار گھوڑے پر سوار ہو کر مقابلے پر نکلے اور کوئی بہتر آدمی موت کے گھاٹ اتار دیئے۔ آخر دشمنوں نے آپ پر قابو پا کر بڑی بے رحمی سے شہید کر دیا۔ حضرت سخی سرور رحمۃ اللہ علیہ کی تاریخ وفات میں اختلاف پایا جاتا ہے لیکن بیشتر تذکرہ نویسوں کے مطابق آپ کی تاریخ شہادت ۷۵۷ھ ہے۔

سید سرور و سخی احمد بود سلطان عالم و والی
گفت سرور چو سال تاریخش ہاتفش گفت سرور عالی

۵۵۷۷

آپ کی یاد میں دھونگل کے میلے کے علاوہ پشاور میں جھنڈا میلہ لاہور میں قدموں کا میلہ اور پارکا میلہ کے علاوہ ڈیرہ غازی خاں میں سالانہ عرس بھی ہوتا ہے۔ جس میں ملک کے اطراف و اکناف سے آپ کے لاکھوں عقیدت مند شریک ہوتے ہیں۔



سلطان الاولیاء

حضرت میاں میر بالا پیر قادری لاہوری رحمۃ اللہ علیہ

برصغیر پاک و ہند میں جن اولیائے کرام نے روحانی عظمتوں کے چراغ روشن کئے ہیں ان میں سلطان الاولیاء حضرت میاں میر قادری رحمۃ اللہ علیہ کا نام خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ آپ نے اس وقت دلوں کو ذوق معرفت خداوندی سے آشنا کیا جب مغل ملوکیت کا دور دورہ تھا اور عوام الناس ملوکیت کی چوکھٹ پر جبیں سائی کو اپنے لئے سعادت تصور کرتے تھے۔ حضرت میاں میر قادری وہ درویش خدا آگاہ تھے جنہوں نے عوام کو بتایا کہ جو پیشانی خدا کے حضور جھکتی ہے وہ کسی کجگلاہ کے حضور خم نہیں ہو سکتی۔ انہوں نے اپنے عمل سے ثابت کر دیا کہ اصل سلطانی اس بوریائشین کی ہوتی ہے جس کے سامنے تاج و تخت کے وارث جھکتے ہیں۔

آپ کی پوری زندگی اس حقیقت کی شاہد تھی کہ اصحاب فقر کی عظمت و جلالت کا نقش کبھی بھی مٹ نہیں پاتا کیونکہ ان کا احترام ارادت مندوں کے دلوں میں نقش ہوتا ہے۔ حضرت میاں میر قادری رحمۃ اللہ علیہ نے برصغیر پاک و ہند کے اہل یقین کے دلوں پر عظمت توحید و رسالت کا نقش ہمیشہ ہمیشہ کیلئے یوں اُجاگر کر دیا کہ آج جب تاریخ تصوف کا تذکرہ چھڑتا ہے حضرت میاں میر رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیمات قدسیہ کی خوشبو پھیلنے لگتی ہے۔

سچ ہے کہ:

ہر گز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

خاندان

آپ کا اسم گرامی شیخ میر محمد ہے۔ دنیائے طریقت میں آپ حضرت میاں میر اور شاہ میر کے القاب سے مشہور ہیں۔ عقیدت و احترام سے ارادت مند آپ کو میاں جی بھی کہتے تھے۔ آپ کا

Click For More Books

<https://archive.org/details/@zohaibhasanattari>

پیدائشی علاقہ ٹھٹھہ اور بھکر کے درمیان سیوستان ہے۔ آپ کے والد ماجد قاضی سائیں دتہ تھے جبکہ آپ کے دادا کا نام قاضی قلندر تھا۔ آپ فاروقی نسب ہیں آپ کے اور سیدنا عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے درمیان اٹھائیس واسطے پائے جاتے ہیں۔ والدہ محترمہ کا نام بی بی فاطمہ ہے۔ حضرت میاں میر رحمۃ اللہ علیہ کے تین بھائی اور دو بہنیں تھیں۔ تین بھائیوں کے نام یہ ہیں: قاضی یونس، قاضی عثمان، قاضی طاہر اور قاضی محمد۔ ہمشیرگان کے نام جمال خاتون اور بی بی باوی ہیں۔ حضرت میاں کے نانا قاضی قارن اپنے دور کے نامور عالم دین اور صاحب ولایت بزرگ تھے۔

ولادت باسعادت

حضرت میاں میر قادری رحمۃ اللہ علیہ کا سن ولادت ۹۵ھ بمطابق ۱۵۵۰ء ہے۔ جب آپ کی عمر سات برس کی تھی تو آپ کے والد محترم انتقال کر گئے۔ آپ کی پیدائش اپنے نانا جان قاضی قارن کے ہاں ہوئی۔ آپ کی والدہ محترمہ فاطمہ بی بی نے حصول معرفت کیلئے اپنے والد سے بیعت کی تھی۔ زہد و تقویٰ کے لحاظ سے وہ اپنے زمانہ کی رابعہ بصری تھیں۔ جب حضرت میاں میر رحمۃ اللہ علیہ کے بڑے بھائی پیدا ہوئے تو ان کی والدہ نے کشف سے معلوم کر لیا کہ یہ لڑکا معرفت کے اعلیٰ مراتب کو حاصل نہیں کر سکے گا۔ پھر انہوں نے تہجد کی نماز کے بعد اللہ کریم سے دعا کی کہ یا الہی میں ایسا بیٹا مانگتی ہوں جو عارف، عبادت گزار اور شب و روز تیری یاد میں محور بنے والا ہو۔ اس دعا کے بعد اس نیک خاتون کو آواز غیبی سنائی دی کہ تو نے ایک بیٹا مانگا ہے ہم ایک بیٹا اور ایک بیٹی تجھے اس صفت خاص کا دیں گے چنانچہ ایسا ہی ہوا اور حضرت میاں میر محمد پیدا ہوئے جس بہن کے ولیہ ہونے کی خوشخبری عطا ہوئی تھی ان کا نام جمال خاتون تھا اور وہ ایک بھائی کے ساتھ توام پیدا ہوئی تھیں۔

تعلیم و تربیت

جب حضرت میاں میر کی عمر بارہ سال کی ہوئی تو آپ نے اپنی والدہ محترمہ سے علم باطنی سیکھنا شروع کر دیا۔ اس سلسلہ میں روحانی سر بلندیوں سے ہمکنار ہوئے تو والدہ سے عرض کیا کہ مجھے اجازت دیجئے کہ مشاہدات اور مجاہدہ و ریاضت کیلئے دوسرے علاقوں کا سفر کر سکوں۔ والدہ سے رخصت عطا ہوئی تو آپ سیوستان کے پہاڑوں میں کسی مرد کامل کی تلاش میں گھومنے لگے۔ والدہ محترمہ کی جلالتی ہوئی شمع حق تھی جس نے آپ کو مسلسل تلاش حق و صداقت اور تلاش شیخ کامل میں مصروف عمل رکھا۔ یہاں تک کہ عارف باللہ فنا فی اللہ حضرت خضر سیوستانی (متوفی ۱۵۸۶ء/۹۹۳ھ)

سے ملاقات ہوئی۔ شیخ خضر سیوستانی سلسلہ قادریہ میں یگانہ آفاق اور ترک و تجرید میں منفرد تھے۔ حضرت میاں میر نے فوراً بیعت کی درخواست کی جو قبول کر لی گئی۔ حضرت خضر سیوستانی طریقت و روحانیت میں بے نظیر تھے۔ حضرت میاں میر رحمۃ اللہ علیہ آپ کو غوث وقت کہا کرتے تھے۔ حضرت خضر سیوستانی تارک الدنیا شخصیت تھے مال و دنیا کی کوئی چیز جس پر علائق کا شبہ ہوتا تھا قبول نہیں کرتے تھے۔ جنگلی پھل ان کی خوراک تھی۔ لباس ایسا ہوتا تھا جو آپ کے جسم کو زانوں سے ناف تک ڈھانپتا تھا۔ سردیوں کے موسم کیلئے انہوں نے تنور تیار رکھا تھا۔ جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لاتے اور انہیں جلا کر تنور گرم کر لیتے۔ راتیں تنور ہی میں بسر کرتے۔ شہر کا رخ نہیں کرتے تھے۔ تاہم سال میں ایک دو مرتبہ گھومنے پھرنے کیلئے شہر آیا کرتے تھے مگر اللہ کے سوا کسی سے آشنائی نہیں رکھتے تھے۔

ایک دن سیوستان کا حاکم ملاقات کی غرض سے حاضر ہوا تو دیکھا کہ دھوپ میں ایک پتھر کے اوپر یا دِ خدا میں مستغرق بیٹھے ہیں۔ حاکم وقت کے قریب ہونے پر اس کا سایہ ان پر پڑنے لگا۔ آپ نے سر اٹھایا تو حاکم وقت نے عرض کیا کہ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو ارشاد فرمائیں۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ پہلی خدمت تو یہ ہے کہ اپنا سایہ مجھ سے دور کر دو اور دھوپ مجھ تک آنے دو اور دوسری بات یہ ہے کہ خدا وہ وقت نہ لائے کہ اس کے سوا کسی دوسرے کا خیال دل میں پیدا ہو۔

حضرت شیخ خضر رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت میں آپ نے بہت جلد بلند روحانی مقامات حاصل کر لئے اور دل کو پوری طرح غیر اللہ سے جدا کر کے صرف اللہ کے ہو گئے۔ حضرت شیخ خضر سے روحانی فیوض آپ کو باقاعدہ مرید ہو کر حاصل ہوئے تھے۔ جبکہ آپ کو سیدنا غوث الاعظم حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی بلا واسطہ روحانی فیوض و برکات حاصل ہوئے۔ حضرت غوث الاعظم نے آپ کو اپنی روحانی برکات سے مشرف فرما کر مرتبہ کامل پر فائز کر دیا۔ حضرت میاں میر رحمۃ اللہ علیہ خود فرماتے ہیں کہ سیدنا غوث الاعظم نے حضور محمد مصطفیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے جسم پاک سے بلا واسطہ صورت ظاہری میں تربیت حاصل کی تھی۔

ورودِ لاہور

جب حضرت میاں میر کو شیخ خضر علیہ الرحمۃ سے روحانی کمالات حاصل ہو گئے تو انہوں نے حضرت میاں میر رحمۃ اللہ علیہ سے فرمایا کہ اب آپ جہاں جی چاہے جا کر رہیں آپ کامل ہیں چنانچہ شیخ سے اجازت حاصل کر کے حضرت میاں میر رحمۃ اللہ علیہ لاہور چلے آئے۔ بعض تذکرہ نویس لاہور میں آپ کی آمد کا سلسلہ آپ کے شیخ کی وفات سے ملاتے ہیں کہ حضرت خضر واصل

باللہ ہوئے تو اس وقت آپ عازم لاہور ہوئے تھے۔ لاہور آ کر آپ حضرت مولانا سعد اللہ کے حلقہ درس میں شامل ہو گئے جو اکبر بادشاہ کے زمانہ میں بڑے جید عالم اور علوم ظاہری و باطنی سے بہرہ ور تھے۔ حضرت میاں میر رحمۃ اللہ علیہ نے فاضل استاد کے زیر سایہ بہت جلد علوم معقول و منقول میں کمال حاصل کر لیا اور اپنے زمانہ کے تمام علماء پر بازی لے گئے۔ حضرت میاں میر رحمۃ اللہ علیہ نے مولانا سعد اللہ کے علاوہ مولانا نعمت اللہ سے بھی علوم کی تحصیل فرمائی۔ مولانا نعمت اللہ فرمایا کرتے تھے کہ حضرت میاں میر رحمۃ اللہ علیہ میرے پاس کئی سال تک پڑھتے رہے۔ آپ نے ہمارے تمام علوم حاصل کر لئے لیکن ہم پھر بھی آپ کے حالات سے واقف نہ ہو سکے اور یہ کمال راز داری آپ کے کمال ہونے کی دلیل ہے۔ لاہور میں آمد کے وقت آپ کی عمر ۲۵ سال تھی جبکہ بعض تذکرہ نگاروں نے اس وقت عمر ۲۸ سال بتائی ہے۔ یہ جلال الدین اکبر ۱۵۵۰ء/۹۶۳ھ تا ۱۶۰۵ء/۱۰۱۳ھ کا دور حکومت تھا۔

عبادت و ریاضت

حضرت میاں میر قادری رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی زہد و تقویٰ اور عبادت و ریاضت کا نمونہ تھی۔ آپ کا معمول تھا کہ لاہور میں آمد کے بعد دن کے وقت مشہور بزرگوں کے مزارات پر تشریف لے جاتے یا پھر ایسی جگہوں پر چلے جاتے جو سنسان اور ویران ہوں اور جہاں لوگوں کا گزر نہ ہو۔ اس طرح آپ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر یادِ الہی میں محو ہو جاتے۔ بعض اوقات مریدین اور معتقدین بھی ہمراہ ہوتے تو وہ بھی شیخ کی تقلید میں علیحدہ علیحدہ مقامات پر محو عبادت خداوندی ہو جاتے اور ذکرِ الہی میں اپنا وقت گزارتے لیکن جونہی نماز کا وقت ہو جاتا یہ سب حضرات ایک مقام پر جمع ہو کر نماز یا جماعت ادا کرتے۔

حضرت میاں میر رحمۃ اللہ علیہ کو تنہائی بہت پسند تھی۔ اکثر آپ رات جاگتے ہوئے گزار دیتے اور حق تعالیٰ کے ذکر میں محو رہتے۔ آپ قبلہ رخ ہو کر بیٹھا کرتے اور یہ اشعار اپنی زبان مبارک سے ادا فرماتے:

کے غافل از حق یک زبان است
دراں عدم کافر است انا نہاں است
کزیں غفلت بجاں پیوستہ بودے
در اسلام پہ ہر وقت بستہ بودے

Click For More Books

<https://archive.org/details/@zohaibhasanattari>

ترجمہ: جو شخص ایک لمحہ بھی خدا کی یاد سے غافل ہوتا ہے تو اس کا تمام وقت کافری میں گزرتا ہے۔ یہ وہ حقیقت ہے جس سے عوام غافل ہیں۔ اگر اسی غفلت میں جان نکل گئی تو اسلام کا دروازہ اس پر بند ہو جاتا ہے۔

حضرت میاں میر رحمۃ اللہ علیہ کئی سال تک بالکل نہیں سوئے۔ رات دن اللہ کے ذکر میں بسر ہوتے۔ حضرت میاں محمد مراد مفتی کی روایت کے مطابق جب حضرت میاں میر رحمۃ اللہ علیہ قادری کی عمر اسی سال سے زیادہ ہو گئی تو پوری رات میں صرف چار سانس لیتے تھے۔ خدا کی ذات پر آپ کا توکل انتہا کو پہنچا ہوا تھا۔ رات کے وقت کوزے سے پانی گرا دیتے تاکہ پانی پر سے توکل اٹھ جائے۔ آپ کو خطرات قلبی کے علاج بہت یاد تھے۔ آپ کا دل اللہ کی یاد میں ہمہ وقت مصروف رہتا تھا۔ اس میں اتنی گنجائش ہی نہیں تھی کہ خدا کے علاوہ کوئی اور سما سکے۔ جب نگاہوں کے سامنے اور قلب و جاں میں اللہ اللہ ہی کی تکرار ہو اور ماسوا اللہ سے مکمل لا تعلقی ہو تو پھر اس دل میں توکل کی عملی تفسیر جس قدر بھی دکھائی دے کم ہے۔

”خزینۃ الاولیاء“ کے مطابق آپ عابد شب زندہ دار تھے۔ ساری ساری رات عبادت میں گزر جاتی۔ ”تحقیقات چشتی“ میں لکھا ہے کہ حضرت ایسے قابل فقیہ تھے کہ کوئی ہم عصر آپ کی برابری نہیں کر سکتا تھا۔

شہنشاہی فقیر کی چوکھٹ پر

تاریخ شاہد ہے کہ جن شاہان وقت نے اولیاء اللہ کی چوکھٹ پر حاضری کو اپنے لئے سعادت سمجھا ہے وہی بقائے دوام کے حق دار ٹھہرے ہیں۔ مختلف اوقات میں کئی سلاطین، شہنشاہ اور امرائے سلطنت آپ کے حضور حاضر ہوتے رہے ہیں۔ آپ نے کبھی آنکھ اٹھا کر بھی ان سلاطین کے کروفر کو نہیں دیکھا اور ایک لحظہ کیلئے بھی ان کے جاہ و حشمت اور شان و شوکت سے مرعوب نہیں ہوئے بلکہ جب بھی ضرورت پیش آئی، آپ نے ان بادشاہوں کے سامنے اعلانِ حق کہا، انہیں خلقِ خدا کی خدمت اور حقوق العباد پہنچانے کی تلقین کی۔

داراشکوہ ”سکینۃ الاولیاء“ میں لکھتا ہے:

”جہا نکیر بادشاہ اولیاء و صوفیاء کا معتقد نہ تھا۔ اس نے حضرت میاں میر رحمۃ اللہ علیہ کا شہرہ سنا تو آپ سے اپنے ہاں تشریف لانے کی گزارش کی۔ آپ نے دعوت قبول فرمائی اور چلے گئے۔ بادشاہ نے کمال عزت و تعلیم سے آپ کا استقبال کیا اور وعظ و نصیحت کا خواستگار ہوا۔ آپ نے دنیا

کی بے ثباتی اور آخرت کی عظمت پر اس قدر موثر وعظ فرمایا کہ وہ مال و دولت شہنشاہی سب کچھ چھوڑنے پر آمادہ ہو گیا۔ آپ نے فرمایا کہ اے بادشاہ! اپنے دل کی طرف توجہ کرو۔ حکومت اہم نہیں دل اہم ہے اگر دل فقیر ہو جائے تو تصوف کا علم عطا ہو جائے گا۔ بادشاہ نے بیعت کی درخواست کی تو آپ نے فرمایا کہ پہلے آپ عدل و انصاف اور اپنے جانشین پر توجہ دیں پھر دیکھا جائے گا۔ بادشاہ نے عرض کیا حضور میرے لائق کوئی خدمت؟ آپ نے فرمایا کہ کیا میں جو کچھ مانگوں کا تم دے دو گے۔ بادشاہ نے عرض کیا جی جناب..... اس پر آپ اٹھ کھڑے ہوئے اور شانِ استغناء سے فرمایا کہ:

”اب مجھے اجازت دو آئندہ مجھے تکلیف نہ دینا۔“

آپ تو یہ فرما کر چلے آئے مگر جہانگیر بادشاہ کے دل میں آپ کی عقیدت دو چند ہو گئی اور اس نے حضرت میاں میر قادری رحمۃ اللہ علیہ کو خطوط لکھے جن میں ملاقات کا اشتیاق ظاہر کیا اور اپنے لئے دعا کی بطور خاص درخواست کی تا کہ وہ دشمنوں اور فساد یوں کے شر سے محفوظ رہے۔

اور اسی طرح علامہ محمد اقبال نے حضرت میاں میر رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ نظم کیا ہے کہ:

آپ کے ارادت مندوں میں ہندوستان کا ایک بادشاہ جب دکن میں مصروف جنگ تھا تو کامیابی کی دعا کے لئے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے اس کی درخواست سن کر خاموشی اختیار کر لی۔ تھوڑی دیر بعد ایک مرید نے چاندی کے کچھ سکہ آپ کی خدمت میں پیش کئے۔ آپ نے جو کچھ فرمایا وہ ایسے لوگوں کیلئے خصوصاً قابل توجہ ہے جو حصولِ دنیا کو منزل مراد سمجھتے ہیں۔ مرید سے ارشاد ہوا کہ یہ سکہ اس بادشاہ کو دے دو جو بادشاہی کے لباس میں گداگر ہے۔ سورج چاند ستاروں پر حکومت کرتا ہے مگر اپنی حرص کی بدولت دنیا کے مفلس ترین لوگوں میں سے ہے۔ یہ دوسروں کے دسترخوان پر اپنی نظریں جمائے ہوئے ہے۔ اس نے اپنی فکر خام کی وجہ سے لوٹ مار کا نام تسخیر رکھا ہے۔ خود اس کا لشکر اور اس کے غنیم کا لشکر اس کی بھوک کی تلوار سے ٹکڑے ٹکڑے ہیں۔ فقیر کی بھوک کی آگ تو اسی تک محدود رہتی ہے لیکن بادشاہ کی بھوک کی آگ ملک و ملت کو فنا کر دیتی ہے۔ یہ نہیں جانتا کہ جو غیر اللہ کیلئے تلوار اٹھاتا ہے وہ خود اپنے سینے میں خنجر مارتا ہے۔

سلطان نور الدین جہانگیر کے بعد شہاب الدین محمد شاہ جہاں بھی آپ کے آستانہ پر حاضری کی سعادت حاصل کرتا رہا۔ شاہ جہان دو مرتبہ آپ کے حجرہ پر حاضر ہوا۔ دونوں مرتبہ اس کا بیٹا دارالشکوہ (مصنف سکیتہ الاولیاء) اپنے باپ کے ہمراہ تھا۔ حضرت میاں میر رحمۃ اللہ علیہ نے ہر بار بادشاہ شاہ جہان کو عدل و انصاف، خلق و مروت، صلہ رحمی، صلح جوئی اور انسانیت نوازی کی تلقین فرمائی۔

شاہجہان کہا کرتا تھا کہ میں نے حضرت میاں میر رحمۃ اللہ علیہ کی طرح کا درویش اس دنیا میں عبادت گزار ہوتے نہیں دیکھا۔ ایک بار جب شاہجہان ملاقات کو حاضر ہوا تو حضرت نے نصیحت کرتے ہوئے فرمایا

بادشاہ عادل کا فرض ہے کہ رعایا کے حالات سے باخبر رہے۔ ملک کو ہر طرح کے دشمنوں سے بچائے اور سرحدوں کی خبر گیری رکھے۔ اپنی تمام ہمت رعایا کی بھلائی اور ملک کو آباد کرنے پر صرف کرے۔

اس کے علاوہ حضرت نے معرفت، طریقت اور دین اسلام کی تعلیمات ارشاد فرمائیں۔ حضرت نصیحت فرما چکے تو بادشاہ نے داراشکوہ کی چار ماہ کی پرانی بیماری کا تذکرہ کیا اور بڑی عاجزی اور منت سماجت سے بیماری کو دور کرنے کی طرف توجہ دلائی۔ داراشکوہ کی بیماری ایسی پختہ تھی کہ ملک کے اعلیٰ درجہ کے حکیموں اور معالجین کے علاج کے باوجود بھی جان نہ چھوڑتی تھی۔ حکیموں نے داراشکوہ کو لا علاج قرار دے دیا تھا۔ بادشاہ کی درخواست کے جواب میں حضرت میاں میر قادری رحمۃ اللہ علیہ نے داراشکوہ کا ہاتھ پکڑا اور ایک پیالہ مٹی کا پانی سے بھرا ہوا منگایا اور اپنے ہاتھ میں پکڑ کر دم فرمایا اور داراشکوہ کو پینے کو کہا۔ اس پانی کو پینے سے ایک ہفتہ میں بیماری بہت حد تک جاتی رہی۔ کامل شفاء کیلئے آپ نے فرمایا کہ فلاں وقت فلاں دن اور فلاں ساعت کامل شفا ہوگی اور واقعی اس دن اور ساعت کو داراشکوہ کو کامل شفا نصیب ہوئی۔

دوسری مرتبہ ملاقات پر شاہجہان نے عرض کیا کہ آپ توجہ فرمائیں تاکہ ہمارے دل سے دنیا کی محبت ختم ہو جائے۔ آپ نے جواب میں ارشاد فرمایا:

”بادشاہ! نیک عمل کرو اور مسلمانوں کے دلوں کو خوش رکھو، نیک اعمال کے بعد اپنے لئے دعا کیا کرو اور خدا سے خدا تعالیٰ ہی کو مانگو، خدا سے غیر خدا کو نہ مانگو۔“

ہم خدا خواہی و ہم دنیائے دوں
ایں خیال است و محال است و جنوں

بادشاہ نے ایک دستار مبارک اور تسبیح پیش کی۔ حضرت میاں میر رحمۃ اللہ علیہ نے دستار تو واپس کر دی اور تسبیح رکھ لی اور پھر وہی تسبیح داراشکوہ کی عقیدت مندی کے پیش نظر اسے عطا کر دی۔

داراشکوہ کی عقیدت مندی

داراشکوہ کی حضرت میاں میر سے عقیدت اثناء کو پہنچی ہوئی تھی۔ بالمشافہ ملاقات سے قبل

بھی داراشکوہ آپ سے غائبانہ عقیدت رکھتا تھا، جب بادشاہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ حضرت جی سے ملاقات کیلئے بالاخانہ کی طرف چڑھنے لگا تو داراشکوہ نے آپ کے آستانہ کو وادی مقدس جان کر اپنے جوتے اتار دیئے اور ننگے پاؤں حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا۔ دوران گفتگو میں حضرت میاں میر صاحب لونگ چبا کر تھوک رہے تھے اور درباریوں کو تو یہ ادا ناگوار گزری لیکن داراشکوہ کو حضرت کے دہن مبارک کے چبائے ہوئے لونگ اس قدر پسند آئے کہ کمال ارادت سے اٹھا اٹھا کر کھانے لگا۔ لونگ چباتے ہی داراشکوہ کی عقیدت و اخلاص میں اضافہ ہونے لگا، روحانی برکات عطا ہونے لگیں حتیٰ کہ داراشکوہ خود کہتا ہے کہ:

”میں نے جو پایا سو پایا، یہ چیز بیان سے باہر ہے کہ میں نے کیا حاصل کیا، ان لوگوں کے چبانے سے میری زبان کو بیان کی قوت عطا ہوئی اور طبیعت کو کلام میں موزونیت حاصل ہو گئی اور میں امید رکھتا ہوں کہ قیامت کو حضرت میاں میر رحمۃ اللہ علیہ کے دربار کے گداگروں میں اٹھایا جاؤں۔“

بعد میں داراشکوہ تنہا آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنے سر کو آپ کے مبارک قدموں پر رکھ کر انہیں چومتا رہا۔ آپ نے اپنا دست شفقت اس کے سر پر رکھا اور اسے اپنی عنایات اور فیوض سے نوازنے لگے۔ داراشکوہ کا یہ رشتہ عقیدت زندگی بھر آپ سے استوار رہا۔ آپ کے در کی گدائی کو اس نے ہمیشہ اپنے لئے دنیا کی بہت بڑی سعادت تصور کیا۔ یادگار تصنیف ”سکیمہ الاولیاء“ بھی داراشکوہ کے اسی حسن عقیدت کا شاہکار ہے۔

اصلاح و تربیت

آپ کے دور میں امت مسلمہ اخلاقی و روحانی طور پر انحطاط کا شکار ہو چکی تھی۔ دنیا کی محبت میں عاقبت کا تصور رخصت ہو چلا تھا۔ اکبر اعظم کا دین الہی اگرچہ ایک قصہ پارینہ بن چکا تھا لیکن بعض مادیت زدہ ذہنوں پر ابھی تک اس کے اثرات بدظالم تھے۔ آپ نے اپنے کردار کی شمع روشن کر کے دلوں کو خدا آشنا کر دیا اور اہل طلب کو معرفت خداوندی کی دولت سے بہرہ ور فرمایا۔ آپ نے غیر شرعی رسوم اور جاہلانہ عادات و اطوار کو ختم کرنے کیلئے عوام کو شریعت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم پر چلنے کی سختی سے تلقین کی۔

ایک مرتبہ آپ نے خدا شناسی کے ضمن میں مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی سے فرمایا کہ اللہ تک پہنچنے کے دو طریقے ہیں۔ پہلا طریقہ جذب ہے کہ اللہ تعالیٰ یک لخت اپنی جانب کسی کو کھینچ لے اور اپنے فضل سے کسی بندہ کو اپنا عرفان عطا فرمادے۔ دوسرا طریقہ سلوک ہے جس میں بندہ ریاضت و

مجاہدہ کے علاوہ کسی صاحب نظر سے ارادت مندی کا رشتہ جوڑتا ہے اور اس طرح طویل واسطوں سے اللہ تعالیٰ کا وصل حاصل کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ پیرانِ طریقت کا فرض ہے کہ اپنے ارادت مندوں کو مخلوق سے علیحدگی، خلوت گزینی اور دنیاوی لذات سے دستکش ہونے کی ترغیب دیں۔

آپ ریاکاری کی عبادت اور تصنع سے نفرت فرماتے تھے۔ اپنے نیاز مندوں کو بھی یہی نصیحت فرماتے کہ عبادت و ریاضت محض خدا کیلئے ہوتی ہے، خلق خدا میں ناموری حاصل کرنے کیلئے نہیں ہوتی۔ آپ کا لباس بھی عام درویشوں اور فقیروں کی طرح نہیں ہوتا تھا۔ گدڑی یا پیوند لگے ہوئے لباس نہیں پہنتے تھے کہ اس طرح فقیری کا غرور آتا ہے۔ کم قیمت دستار مبارک زیب سر رکھتے تھے۔ کھدر کے موٹے کپڑے پہنتے تھے۔ آپ فرمایا کرتے کہ ہمارے زمانے میں بہت سے لوگوں نے گودڑی کا استعمال اور کرامات کے اظہار کو مخلوق میں عزت و جاہ اور حصول مال کا ذریعہ بنا رکھا ہے کہ لوگ دیکھتے ہی کہیں کہ وہ درویش ہے۔ یہ محض خود ستائی اور ریاکاری ہے۔

آپ بہت کم لوگوں کو بیعت کیا کرتے تھے لیکن جو ایک بار آپ کے دامانِ رشد و ہدایت سے وابستہ ہو گیا اسے ذرہ سے آفتاب بنا دیا۔ آپ فرماتے تھے کہ صوفی وہ ہے جس کا وجود فنا ہو جائے کسی وزیر نے آپ کی خدمت میں عرض کیا کہ حضور جب خاص وقت قبولیت ہو تو ایسے عالم میں مجھے بھی اپنی دعا میں یاد فرمائیے گا۔ آپ نے جواب میں فرمایا کہ اس وقت پر خاک پڑے کہ جس وقت ماسویٰ اللہ کا خیال کروں اور خدا کی یاد دل میں نہ ہو۔

آپ خود بھی سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر سختی سے عمل پیرا تھے اور مریدین پر بھی سختی سے توجہ فرماتے تھے۔ شریعت کے خلاف ایک قدم بھی باہر نہ نکالتے اور جلوت و خلوت میں کسی وقت بھی اپنی زبان سے کوئی ایسا کلمہ نہ نکالتے جو شریعت کے خلاف ہوتا۔ اپنے مریدین کو مرید کہہ کر نہیں بلکہ دوست اور رفیق کہہ کر بلاتے۔

حضرت میاں میر رحمۃ اللہ علیہ نے عوام الناس کی اصلاح اور روحانی تربیت کیلئے انہیں سمجھایا کہ تمہاری نجات اسی صورت ہے کہ تم دین اسلام پر اس طور پر کاربند ہو جاؤ کہ تمہاری زندگیاں تعلیمات قرآن و اسلام کا عملی نمونہ بن جائیں۔

حضرت کے حسن اخلاق نے عوام کے دلوں کو تسخیر کر لیا تھا۔ کوئی شخص حاضر خدمت ہوتا تو آپ اس پر اس قدر مہربانی فرماتے کہ وہ سوچنے لگتا کہ مجھ جیسی شفقت آپ نے کسی اور پر نہیں

فرمائی ہوگی۔ حالانکہ آپ کی شفقت ایک سمندر کی صورت تھی کہ جس سے ایک زمانہ سیراب ہو رہا تھا۔ آپ نے جہاں حکمرانوں کو ان کے فرائض اور خلق خدا کی خدمت کا پیغام دیا وہاں عوام کو ان کے فرائض اور اخلاقی و روحانی ذمہ داریوں کا احساس دلایا۔ یہی وجہ تھی کہ آپ کے فیض عام سے لاکھوں انسانوں کو صراطِ مستقیم پر چلنے کی توفیق عطا ہو گئی۔ آپ نے اہل ایمان کو سمجھایا کہ انسان نفس، دل اور روح کا مجموعہ ہے۔ ان میں سے ہر ایک کی اصلاح مقصود ہے۔ نفس کی اصلاح شریعت سے دل کی طریقت سے اور روح کی حقیقت سے ہوتی ہے۔

حضرت میاں میر رحمۃ اللہ علیہ سماع بھی سنتے تھے اور ہندوستانی زبان میں کہے گئے تمام اشعار کو خوب سمجھتے تھے۔ اگر کوئی قوال آجاتا تو آپ قوالی سن لیتے نہ آتا تو قوالی کا اہتمام نہ کرتے تھے اور نہ ہی قوالوں کو ہمیشہ ساتھ رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ بطور خاص سماع سننے کیلئے بھی کہیں نہیں جاتے تھے جب قوالی سنتے تو شریعت کی اتباع میں کوئی وجد رقص وغیرہ نہیں فرماتے تھے۔ جب کسی شعر میں طبیعت میں خوشی آتی تو اس خوشی کا اظہار آپ کے چہرے پر اس طرح ظاہر ہوتا کہ چہرہ نور کا ٹکڑا معلوم ہوتا۔

کرامات

حضرت میاں میر قادری رحمۃ اللہ علیہ صاحب کرامت بزرگ تھے۔ جب کوئی صاحب ایمان رضائے خداوندی میں ڈھل جاتا ہے اور اس کی زندگی مکمل طور پر منٹائے ربانی کی تصویر بن جاتی ہے تو پھر اس کی زبان قدرت کی ترجمان بن جاتی ہے اور اس کی تدبیر تقدیر کا پر تو لے لیتی ہے۔ حضرت میاں میر رحمۃ اللہ علیہ کی پوری زندگی رضائے الہی کے تابع تھی اس لئے خدا نے آپ کو اس قدر نوازا کہ آپ جو کچھ زبان سے کہتے وہ رضائے الہی سے ہو جاتا۔ حضرت میاں میر رحمۃ اللہ علیہ کرامتوں کے اظہار کو مناسب نہیں سمجھتے تھے بلکہ اسے درویشی کی تشہیر خیال کرتے تھے۔ آپ حتی الامکان کرامتوں کو پوشیدہ رکھتے تھے پھر بھی وہ ظاہر ہو کر رہتی تھیں۔

ایک مرتبہ آپ مزار کامران کے باغ کے سامنے دریا کے کنارے لیٹے تھے اور خدام پاؤں دبا رہے تھے۔ اچانک سامنے سے ایک بڑا سانپ آتا ہوا دکھائی دیا۔ آپ نے فرمایا اسے آنے دو۔ سانپ قریب آیا تو آپ اٹھ کر بیٹھ گئے۔ سانپ آپ کے حضور میں بلند ہو کر بیٹھ گیا اور کچھ کہا۔ آپ نے جواب میں فرمایا ”خوب ایسا ہی سہی“ سانپ اٹھا تین مرتبہ حضرت کے گرد پھرا اور چلا گیا۔ خدام کے استفسار پر آپ نے فرمایا کہ سانپ نے کہا کہ تمہیہ کر رکھا ہے کہ میں نے آپ کو دیکھوں گا

تو آپ کے گرد طواف کروں گا۔ جواب میں میں نے کہا ”بہتر ایسا ہی سہی“۔

ایک بار آپ زین خاں کے باغ میں تشریف فرما تھے۔ اس درخت پر ایک فاختہ چمک رہی تھی جس پر آپ بہت مسرور ہوئے۔ اسی دوران میں ایک شکاری نے آکر غلہ پھینکا تو فاختہ مر گئی۔ شکاری چلا گیا تو آپ کے کہنے پر ایک مرید مردہ فاختہ کو اٹھا لیا۔ آپ نے اس پر ہاتھ پھیرا تو وہ زندہ ہو گئی اور درخت کی اسی شاخ پر بیٹھ کر پھر چمکنے لگی۔ وہی شکاری پھر ادھر چلا آیا اور فاختہ کے دوبارہ شکار کیلئے ارادہ کیا تو حضرت نے منع فرمایا، وہ نہ مانا اور پھینکنا چاہا تو غلہ پوری شدت کے اس کی اپنی انگلی پر لگ گیا اور وہ شدت کرب سے زمین پر گر پڑا۔ آپ ازراہ شفقت قریب تشریف لائے اور اس شخص کو نصیحت کی کہ اگر تو فاختہ کو دوبارہ نہ مارے تو تیری انگلی ٹھیک ہو سکتی ہے۔ شکاری نے فوراً توبہ کر لی جس پر حضرت نے خصوصی توجہ فرمائی تو اس کا درد ایک آن میں جاتا رہا۔

حضرت میاں میر قادری رحمۃ اللہ علیہ کی کرامات تعداد میں کافی ہیں۔ آپ کے روحانی تصرفات کی شاہد کئی کرامات کا مطالعہ ذوق ایمانی کو تازہ کرنے کا باعث بنتا ہے لیکن آپ کی سب سے بڑی کرامت یہی ہے کہ آپ نے مردہ دلوں کو زندہ کر دیا، گمراہوں کو جاہد حق پر گامزن کر دیا، بے یقینیوں کو ایمان و یقین کی دولت عطا کی، جاہ پرستوں اور مال و دولت کے پرستاروں کو خدا اور رسول خدا کی محبت بخشی، دل و جان کو معرفت آشنا کیا۔ غرضیکہ آپ نے اپنی تعلیمات اور کردار کی بدولت ایک ایسا انقلاب پیا کر دیا کہ جس کی بدولت بے شمار انسانوں کی زندگیاں ہدایت اور فوز و فلاح کے سانچے میں ڈھل گئیں۔ اصلاح احوال کیلئے آپ نے جو کردار ادا کیا ہے حقیقت میں یہی آپ کی سب سے بڑی کرامت ہے۔

سرہند کا سفر اور ظلالیت

لاہور کے اندر رہتے ہوئے جب آپ کا ذکر خیر عوام میں پھیل گیا اور عوام جوق در جوق آپ کی خدمت میں حاضری دینے لگے تو آپ کو خلوت گزینی کے متاثر ہونے کا خدشہ پیدا ہو گیا اور آپ سرہند شریف چلے گئے، لیکن وہاں پہنچ کر آپ بیمار ہو گئے۔ پہلے گھٹنوں میں درد پیدا ہوا پھر سخت بیماریوں نے گھیر لیا۔ ایک شب آپ نے پیران پیر سیدنا غوث الاعظم رضی اللہ عنہ کی روحانی مدد چاہی۔ اسی رات سیدنا غوث الاعظم اور جناب خضر علیہ السلام کی تشریف آوری ہو گئی۔ آپ نے بیماری کی بابت عرض کیا تو حضرت غوث الاعظم نے اپنا ہاتھ میاں میر صاحب کے بدن مبارک پر پھیرا اور کشتی نما پیالہ جو پانی سے بھرا ہوا تھا آپ کو پینے کو دیا۔ آپ نے پی لیا تو (مکاففہ کے بعد)

آپ صحت یاب ہو گئے۔ بیماری کے ان طویل دنوں میں کوئی شخص آپ کی عیادت کیلئے حاضر نہ تھا۔ سرہند شریف میں ایک بزرگ حاجی نعمت اللہ رہتے تھے۔ ان کو آپ کی صورت میں ایک مردِ کامل کی تشریف آوری کا احساس ہوا تو آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور حضرت میاں میر کی تیمارداری میں مصروف رہنے لگے۔

حاجی نعمت اللہ نے اس توجہ سے آپ کی تیمارداری کی کہ آپ کے فضلات اور بول براز اپنے ہاتھوں سے اٹھایا کرتے تھے۔ جب حضرت میاں میر رحمۃ اللہ علیہ صحت یاب ہو گئے تو حاجی نعمت اللہ کی عقیدت اور محبت دیکھ کر دریائے رحمت جوش میں آ گیا اور ان پر خصوصی توجہ فرمائی اور ایک ہفتہ میں اعلیٰ مقام اور بلند درجہ پر پہنچا دیا۔ جب آپ سرہند شریف سے لاہور واپس آئے تو اہل شہر کو یوں معلوم ہوا کہ جیسے موسم بہار کی بہاریں لوٹ آئی ہیں۔

کہتے ہیں کہ آپ غوث الاعظم کا نام نامی بے وضو نہیں لیتے تھے۔ یہ آپ کی سیدنا غوث الاعظم سے عقیدت کا کمال تھا اور اسی عقیدت کا اثر تھا کہ سیدنا غوث الاعظم نے آپ کو بلا واسطہ روحانی سر بلندیوں سے بھی نوازا اور جب آپ سرہند شریف میں بیمار ہوئے تو یہاں بھی آپ کی صحت یابی سیدنا غوث الاعظم کی خصوصی توجہ کے باعث ہوئی۔

وفات

جب لاہور شہر میں رہتے ہوئے آپ کو ساٹھ سال ہو گئے تو اسہال کی تکلیف شدت سے شروع ہو گئی۔ یہ تکلیف آپ کو پانچ دن تک برابر رہی۔ پانچویں دن ۷ ربیع الاول ۱۰۲۵ھ بمطابق ۱۶۳۵ء کو آپ کی روح مقدس نے جسم ناسوتی کی قید سے آزادی حاصل کر لی۔ اس روز منگل کا دن تھا اور محلہ خانی پورہ آبادی میاں میر رحمۃ اللہ علیہ کے جس حجرہ مبارک میں آپ کی سکونت تھی وہیں آپ کا وصال ہوا۔ ایک عظیم المرتبت درویش کامل کی روح اپنے مقام حقیقی کی جانب پرواز کر گئی۔ قطرہ سمندر سے ہم آغوش ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ۵

دورانِ علالت میں لاہور شہر کا حاکم وزیر خاں ایک نامور طبیب کو لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عیادت کے بعد علاج کیلئے عرض کیا۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ حکیم مطلق اللہ کریم کافی ہے۔ یہ کہہ کر وزیر خاں کو رخصت کر دیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مرض الموت میں بھی آپ کے پیش نظر اللہ ہی اللہ تھا۔

آپ نے فرمایا تھا کہ مجھے میرے دوستوں کے درمیان دفن کرنا۔ یہ جگہ ہے جہاں میاں

صاحب ن تھا اور حاجی سلمان اور بعض دوسرے حضرات کو دفن کیا گیا تھا۔ چنانچہ اسی جگہ آپ کے وجود اقدس کو سپرد خاک کر دیا یا۔ آپ کے جنازہ میں عوام و خواص اور شہر و اطراف کے بے شمار مسلمانوں نے شرکت کی۔

مزار پاک

آپ کا مزار علاقہ میاں میر میں ہے۔ آپ کے مزار پر ایک خوبصورت گنبد ہے، مغرب کی جانب مسجد ہے، احاطہ مزار کافی کھلا ہے اور احاطہ کے ارد گرد چار دیواری ہے۔ آپ کے مزار مقدس کو داراشکوہ نے بنوانا شروع کیا تھا کہ وہ اس دار فانی سے کوچ کر گیا۔ کچھ عرصہ تک مزار کی عمارت نامکمل رہی لیکن بعد میں اورنگزیب عالمگیر ایک مرتبہ آپ کے مزار پر حاضر ہوا تو اس نے عمارت کو مکمل کروا دیا۔ آپ کے گنبد کے دروازے پر یہ تاریخ درج ہے:

سفر جانب شہر جاوید کرد..... چوں زیں لخت آباد دلگیر شد

خرد بہر سال و فائش نوشت..... بفر دوس والا میاں میر شد

آپ کا مزار مرجع خلافت ہے۔ اہل دل یہاں حاضر ہوتے اور اپنی حاجت براری کا اہتمام

کرتے ہیں۔

مآخذ

شہزادہ داراشکوہ

شہزادہ داراشکوہ

عالم فقری

مراد حسین قادری

سکینۃ الاولیاء

سفینۃ الاولیاء

گلزار صوفیاء

حضرت میاں میر



خواجہ محمد سلیمان تونسوی رحمۃ اللہ علیہ

سلیمان تونسوی کے فیض کا اظہار دیکھا ہے
شہ اجمیر کی رحمت کو ہی ضو بار دیکھا ہے
سلیمان تونسوی نے یوں اندھیروں کو ضیاء بخشی
کہ مردان خدا کو رحمت رب علی بخشی
زمانے کو انہوں نے لطف سے پر نور فرمایا
دلوں سے ظلمت اشرار کو ہے دور فرمایا
مریدوں کو نوازا اور جینے کی ادا بخشی
قلوب معرفت کو عظمت حق کی نوا بخشی
جو ان کے سامنے آئے انہی کا ہو کے رہ جائے
مرادیں جو بھی ہیں دل میں نہاں سرکار سے پائے
انہوں نے نور حق بخشا عطا کی رحمت باری
انہی سے ہو گیا پھر معرفت کا سلسلہ جاری
رضا بھی ان کے الطاف و کرم کا ہے تمنائی
جو آیا ان کے در پر اس نے دل کی آواز پائی

(محمد اکرم رضا)

مخدوم المشائخ

حضرت خواجہ محمد سلیمان چشتی تونسوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

جب بھی برصغیر پاک و ہند اور خاص طور پر خطہ پنجاب میں تبلیغ اسلام کے حوالے سے سلسلہ عالیہ چشتیہ کی خدمات کا تذکرہ چھڑتا ہے تو حضرت خواجہ محمد سلیمان تونسوی رحمۃ اللہ علیہ کا اسم گرامی خصوصی اہمیت کا حامل نظر آتا ہے۔ آپ نے خواجہ خواجگان حضرت محمد معین الدین چشتی اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کے تبلیغی مشن کو آگے بڑھایا۔ آپ کو خدائے کریم نے حسن صورت سے نوازا تھا۔ سیرت و کردار کی بلندیاں بھی کمال درجہ کی عطا ہوئی تھیں اس لئے جو بھی جو سندرہ معرفت تونسہ شریف کا رخ کرتا آپ کا جلوہ اقدس دیکھتا تو پھر یہیں کا ہو کہ رہ جاتا۔ اس پر شاہ سلیمان تونسوی کا رنگ چڑھنے لگتا اور پھر وقت ایسا آتا کہ اسے وہ سب کچھ یہیں سے عطا ہو جاتا جس کا وہ متمنی تھا۔ یہ ایک سو یا ایک ہزار کی بات نہیں یہاں تو علاقے کے علاقے آپ کی روحانی پناہ میں آچکے تھے اور دنیاوی و روحانی فیوض سے بہرہ ور ہو رہے تھے۔

دلوں کی سلطنت پر فیض جاری تھا سلیمان کا

کہ نشہ فکر ایمانی کا طاری تھا سلیمان کا

شاہ سلیمان تونسوی رحمۃ اللہ علیہ کے خلفاء میں ایسے جلیل القدر نام دکھائی دیتے ہیں کہ عقل حیرت میں گم ہو جاتی ہے۔ سرزمین میرا شریف کے حضرت خواجہ احمد میروی سیال شریف کے حضرت خواجہ شمس الدین سیالوی جلال پور شریف کے حضرت حیدر علی شاہ رحمۃ اللہ علیہ سیال شریف کے توسط سے حضرت پیر مہر علی شاہ گولڑوی ایسے نام ہیں کہ جن میں سے ایک ایک سے ہزاروں لاکھوں نے توحید و رسالت کے گہرہائے گراں مایہ کے ساتھ ساتھ ولایت و معرفت کی کرنوں کے انوار حاصل کئے۔

خواجہ ترا دربار بھی کیا عالی نشان تھا

جو شخص بھی آیا تھا وہی شاہ جہان تھا

مخدوم چشتیاں حضرت خواجہ محمد سلیمان تونسوی رحمۃ اللہ علیہ 1183 ھ بمطابق 1764ء میں موضع گڑگوجی میں جو تونسہ شریف سے تیس میل مغرب کو ہے پیدا ہوئے والد ماجد کا اسم گرامی محمد زکریا خان تھا جو نیک اور صالح افغان تھے اور رمدانی سالارانی قبیلہ کے سردار تھے۔ والدہ ماجدہ کا نام نامی بی بی زلیخا تھا جو حضرت محمد زکریا کے اپنے خاندان کی ایک خاتون اور نہایت متقی اور پرہیزگار تھیں۔ آپ کی پیدائش کے متعلق کئی بزرگوں نے بہت پہلے ہی بشارتیں دیں۔ مشہور ہے کہ ایک گوشہ نشین درویش دور سے آپ کی والدہ ماجدہ کے سامنے آ کر تعظیم کرتا اور جھکتا۔ دریافت کرنے پر فرمایا کہ اس بی بی کے شکم سے وہ فرزند ارجمند تولد ہوگا جس کا نور مشرق سے مغرب تک دنیا کو روشن کرے گا۔

پیدائش کے تھوڑے دنوں بعد ہی آپ کے والد ماجد کا انتقال ہو گیا اور آپ در یتیم ہو کر ماور مہربان کی گود میں پلنے لگے۔ چار سال کے ہوئے تو والدہ محترمہ نے مولوی یوسف جعفر کے سپرد کیا اور آپ نے ابتدائی پندرہ سیپارے ان سے حفظ کئے۔ پھر ایک عالم دین جو حاجی صاحب کے لقب سے مشہور تھے سے باقی پندرہ پارے اور فارسی کی ابتدائی کتابیں کریم پند نامہ شیخ عطار وغیرہ پڑھیں۔ آٹھ سال کی عمر میں علاقہ سانگھڑ تشریف لے گئے اور فارسی نثر کی کتابیں میاں حسن علی سے ختم کیں۔ پھر تونسہ چھوڑ کر فارسی نظم کی کتابی پڑھنے کے لئے میاں ولی محمد ارائیں کے حلقہ درس میں داخل ہوئے جو ان دنوں دریائے سندھ کے کنارے لانگہ نام بستی میں پڑھایا کرتے تھے۔ آخر کار علم کا شوق آپ کو کوٹ مٹھن شریف لے گیا جہاں حضرت قاضی محمد عاقل خلیفہ اجل حضرت خواجہ نور محمد مہاروی کا بہت بڑا درس تھا۔ آپ نے عربی وہاں پڑھی اور قطبی تک تعلیم حاصل کی۔

حضرت شاہ فخر الدین دہلوی نے اپنے خلیفہ اعظم حضرت خواجہ نور محمد مہاروی سے فرمایا تھا کہ ایک شہباز بلند پرواز کو ہستان سلیمان سے اترے گا وہی ملک سلیمان کا وارث ہوگا۔ اس کو تلاش کرو اور جتنی جلدی ہو سکے اسے شکار کرو۔ اس لئے خواجہ مہاروی ہر سال اس شہباز طریقت کی تلاش میں مغرب کی طرف سفر کرتے تھے جو اس وقت کوٹ مٹھن میں انہی کے خلیفہ کے پاس علم دین حاصل کر رہا تھا۔ ادھر حضرت شاہ سلیمان نے سن رکھا تھا کہ مہار شریف میں قبلہ عالم کے لقب سے مشہور ایک بلند پایہ بزرگ ہیں جو عام مجالس میں راگ سنتے ہیں اور ان کے مرید رقص کرتے ہیں۔ آپ کے خیال میں یہ فعل غیر شرعی تھا اس لئے انہوں نے ارادہ کیا کہ جب کبھی ملاقات کا موقع ملا لائیں اس سے روکنے کی کوشش کریں گے۔

انہی دنوں کا ذکر ہے کہ حضرت قبلہ عالم مہاروی اچ شریف آئے اور حضرت قاضی محمد عاقل اپنے شاگردوں کے ہمراہ اُچ شریف روانہ ہوئے۔ حضرت شاہ سلیمان نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور امر بالمعروف کے ارادہ سے دوسرے طالب علموں کے ساتھ چل پڑے۔ ایک چھری ساتھ لیتے گئے کہ اگر نہ مانیں گے تو ان کا کام تمام کر دوں گا۔ شکار کرنے گئے تھے لیکن خود شکار ہو گئے۔ حضرت قبلہ عالم رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھتے ہی ہیبت زدہ ہو گئے۔ جب خواجہ صاحب ان کے روبرو ہوتے تو وہ آپ کو غور سے دیکھتے تھے اور قاضی صاحب سے آپ کے بارے میں پوچھتے تھے۔ کئی دن خدمت بابرکت میں رہے مگر اپنا ارادہ پورا کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ آخری دن جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے رخصت ہونے کے لئے سلام کے ارادے سے ہاتھ بڑھایا تو خواجہ صاحب نے بڑھ کر آپ کا ہاتھ پکڑ لیا اور ایسی توجہ فرمائی کہ آپ کے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا۔ چھری ہاتھ سے گر پڑی۔ خواجہ صاحب دیر تک آپ کا ہاتھ پکڑے رہے اور اسی حالت میں آپ کو روضہ شریف کے اندر لے گئے اور بہت دیر تک چپ چاپ کھڑے رہے۔ پھر دروازہ بند کر دیا، خود بھی بیٹھ گئے اور ان کو بھی بٹھا دیا لیکن ہاتھ نہ چھوڑا اور کچھ پڑھ کر آپ کے سینے پر پھونکا اور دونوں ہاتھ آپ کے سینے پر ملے اس کے بعد ہاتھ چھوڑ دیئے اور علم حاصل کرنے کی تاکید کی۔

حضرت قبلہ عالم رحمۃ اللہ علیہ سے پہلی ملاقات ہی نے آپ کی طبیعت میں انقلاب پیدا کر دیا تھا۔ جب حضرت قبلہ عالم سوار ہو کر چلے گئے تو بڑی دیر تک وہاں حیران ہو کر کھڑے رہے۔ چاہا کہ دوڑ کر ان کے پیچھے چلے جائیں لیکن ہیبت نے دامن پکڑا اور بلا اجازت جانا مناسب نہ سمجھا۔ اس کے بعد اپنے ساتھیوں کے ہمراہ کوٹ مٹھن چلے آئے اور تحصیل علم میں مشغول ہو گئے لیکن دل ہر لمحہ بے قرار رہنے لگا حتیٰ کہ حضرت قبلہ عالم کے عشق میں بیتاب ہو گئے اور ایک ماہ کے بعد مہار شریف روانہ ہو گئے۔ ہفتہ تک قیام کیا تو پیر و مرشد نے واپس ہونے اور علم حاصل کرنے کا حکم دیا۔ آپ کوٹ مٹھن واپس آ گئے لیکن طبیعت میں عشق کی شدت بڑھتی گئی۔ آپ کا معمول تھا کہ ایک ماہ کوٹ مٹھن رہتے اور پھر مہار شریف چلے جاتے۔ مگر حضرت قبلہ عالم آپ کو ایک ہفتہ سے زیادہ اپنے پاس نہیں ٹھہرنے دیتے تھے۔ ایک بار کوٹ مٹھن کو خیر باد کہہ کر مہار شریف مستقل قیام کا ارادہ کیا تو حضرت قبلہ عالم نے روک دیا اور واپس جا کر علم حاصل کرنے کی تلقین کی اور یہ شعر پڑھا:

بچے علم چوں شمع باید گداخت
کہ نبے علم نتواں خدایا شناخت

تحصیل علم سے فارغ ہو کر آپ نے سلوک الی اللہ کی تکمیل کے سلسلہ میں سخت مجاہدات اور ریاضتیں کیں۔ اگرچہ آپ مراد تھے یعنی حضرت قبلہ عالم مہاروی رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کو خود تلاش کیا تھا اور بیعت سے مشرف کیا تھا لیکن آپ کے شوق کو ہمیز لگانے کے لئے آپ کو طرح طرح کی آزمائشوں میں ڈالا گیا۔ آپ بفضلہ تعالیٰ ہر آزمائش میں پورا اترے ہر مصیبت کو خندہ پیشانی سے قبول کیا اور ہمت و استقلال سے وادی محبت کی بادیہ پیمائی کی۔ یاد رہے کہ بیعت کے وقت آپ کی عمر پندرہ سال تھی اس سے یہ بتلانا مقصود ہے کہ اس چھوٹی سے عمر میں ہی قدرت آپ پر اس درجہ مہربان ہو چکی تھی کہ آپ اپنے روحانی راہنما کا دست عقیدت تھام کر ریاضت باطنی اور مجاہدات کی کٹھنائیوں سے گزرنے کے قابل ہو چکے تھے۔

الغرض آپ مجاہدات کی بھٹی سے کندن بن کر نکلے۔ پیر و مرشد کی نظر میں آپ کی بڑی وقعت تھی۔ اسی دوران میں آپ کے بھائی یوسف خان کی مرگ ناگہانی آپ کی والدہ پر برق سخت بن کر گری اور آپ حضرت قبلہ عالم کے ارشاد کے مطابق اپنی مصیبت زدہ ماں کا کلیجہ ٹھنڈا کرنے وطن مالوف واپس آئے۔ صرف بیس دن گھر رہے تھے کہ معشوق حقیقی کی تڑپ نے دل کو بے قرار کیا اور آپ اپنی شفیق ماں سے اجازت لے کر پھر مہار شریف آ پہنچے۔ اس کے بعد یہ معمول ہوا کہ والدہ محترمہ کو ملنے کے لئے کبھی کبھی وطن مالوف لوٹتے اور مہار شریف چلے آتے۔ اس عشق اور وارفتگی کی مثال مشکل سے ملے گی۔ بالآخر حضرت قبلہ عالم نے جب ہر طرح سے اپنے اس محبوب مرید کو کامل مکمل کر دیا تو خلافت و اجازت کی نعمت عظمیٰ سے سرفراز فرمایا۔ یہ حضرت قبلہ عالم کی حیات ظاہری کے آخری لمحات تھے۔ جب امانت الہی کا بارگراں آپ کے تفویض کیا گیا تو روانگی کے وقت پیر روشن ضمیر نے چند وصیتیں کیں جن پر آپ زندگی بھر عمل پیرا رہے۔ تبلیغ دین کے لئے ایک عرصہ کڑکڑ کوئی ٹھہرے۔ آپ کی ولایت کا شہرہ چار دانگ عالم میں پھیل گیا۔ پہاڑ کا محدود میدان طالبان کمال اور مشتاقان وصال کے لئے تنگ معلوم ہوا تو تونہ شریف آ کر آباد ہو گئے یہی وہ مقدس قریہ ہے جسے آپ کے مدفن ہونے کا شرف حاصل ہے۔

آپ کے فیض کا سلسلہ لامتناہی ہے۔ پنجاب میں سلسلہ چشتیہ کی بڑی بڑی گدیاں آپ ہی کے خوان کرم کی خوشہ چمین ہیں۔ آپ بہت بڑے صاحب کرامات بزرگ تھے۔ آپ سے بے شمار خوارق عادات ظہور میں آئے لیکن آپ کی سب سے بڑی کرامت احیائے سنت، تعمیر سیرت اور اصلاح امت ہے آپ کی زندگی اب بھی ہمارے لئے مشعل راہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

شب جمعہ ۷ صفر ۱۲۶۷ھ آسمان ولایت کا یہ آفتاب جہانتاب ظاہری نظروں سے پوشیدہ ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ آپ کی کئی تاریخجائے وفات نکالی گئی ہیں سب سے عمدہ مادہ غربا نواز ہے۔ جو آپ کے مرید با اخلاص ابو الوفا محمد یار خواجہ کے ذہن کی تخلیق ہے۔ مولوی محمد حسین پشاوری نے تاریخ وصال اس طرح نکالی ہے۔

خواجه	ما	آں	امام	المسلمین
شہ	سلیمان	رحمت		للعالمین
ہفتم	ماہ	صفر	روز	خمیس
جاں	بچاناں	داد	آ	نفس
روح	ہائے	اولیاء	گرد	آمدند
بہر سبال	نقل	او	آ	ہے
زاناں	بیاں	نالہ	کناں	باہو
روح	مولاناے	گفتا	ہائے	ہائے
اے	دریغا	اے	دریغا	اے
گشت	پہاں	آفتابے	زیر	میخ

.....O.....

اب ایک نظر آپ کے مشاغل عالیہ کو دیکھتے ہیں۔

ایک عرصہ تک شب و روز عبادت و ریاضت میں مشغول رہنے کی وجہ سے آپ پر محبت الہی کا غلبہ ہوا، اس دوران میں کئی دفعہ سماع کی مجالس میں (جیسا کہ مشائخ چشتیہ کا معمول رہا ہے) شرکت کا اتفاق ہوا، تو آپ پر وجد کی غیر اختیاری حالت طاری ہوئی، اور بعض اوقات گھنٹوں بے خودی اور بیہوشی کی حالت میں پڑے رہے۔

جب آنجناب پر محبت الہیہ کا غلبہ ہوتا تھا اسی میں جذب ہو جاتے تھے حتیٰ کہ آپ کی آنکھوں سے خون آمیز آنسو جاری ہو جاتے تھے اور بعض اوقات دو دو گھڑی تک بے حس و حرکت پڑے رہتے تھے گویا کہ جان نہیں ہے اور نبض بھی بند ہو جاتی تھی اور جب اس حالت سے ہوش میں آتے تھے، آہ یا اف تک زبان پر نہیں لاتے تھے۔

اس عرصہ میں آپ نے منازل سلوک کو طے کیا، حضرت خواجہ نور محمد مہاروی کی توجہ اور

شفقت بھی آپ کے حال پر بہت تھی اور آپ کو اپنے پیر و مرشد سے ربط معنوی حاصل تھا۔ ادھر آپ کی والدہ ماجدہ بھی آپ کی جدائی میں بے قرار تھیں کیونکہ زمانہ طالب علمی سے اس وقت تک وطن واپس نہیں گئے تھے۔ چنانچہ آپ 1202ھ / 1784ء میں اپنے پیر و مرشد کے حکم سے اپنی والدہ سے ملنے گڑگوجی آئے لیکن تین ہفتہ سے زیادہ نہیں رہے۔ اس کے بعد 1205ھ / 1790ء تک آپ صرف تین دفعہ اپنی والدہ سے ملنے وطن گئے۔ آخری مرتبہ جب والدہ سے ملنے کے لئے وطن جانے لگے اس وقت حضرت خواجہ نور محمد مہاروی موضع ماڑی شوق شاہ (بہاولپور) میں مقیم تھے۔ خواجہ محمد سلیمان کو الوداع کہنے کے لئے بستی سے باہر دور تک تشریف لائے اور رخصت کرتے وقت آپ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر یہ شعر پڑھا

ہر دو عالم قیمت خود گفتہ
نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنود

ادھر خواجہ محمد سلیمان تو نسوی وطن پہنچے ادھر حضرت خواجہ نور محمد مہاروی مرض الموت میں مبتلا ہوئے۔ جب علاج معالجہ سے مایوسی ہوئی تو بھری مجلس میں اپنے محبوب مرید خواجہ محمد سلیمان کو روہیلہ کے نام سے یاد کیا۔ آپ کے صاحبزادے نور الصمد نے عرض کیا اگر فرمان ہو تو میں خود جا کر ان کو لے آؤں۔ اس پر حافظ محمد جمال ملتانی نے صاحبزادے صاحب سے کہا کہ آپ اس علاقہ میں کبھی نہیں گئے مجھے اجازت ہو تو جاؤں۔ لیکن خواجہ نور محمد نے یہ دیکھ کر کہ وقت کم ہے منع فرما دیا۔ ادھر خواجہ محمد سلیمان کی بیقراری بڑھی ہوئی تھی خود بخود مہار شریف روانہ ہو گئے اور شب و روز طویل مسافت طے کر کے چوتھے روز صبح کو مہار شریف پہنچ گئے۔

حضرت خواجہ محمد سلیمان، حضرت خواجہ نور محمد مہاروی کی خدمت میں پہنچے تو خواجہ مہاروی کے ارد گرد خلفاء اور مریدین کا مجمع تھا۔ صاحبزادہ نور الصمد نے حضرت خواجہ کو اطلاع دی ”محمد سلیمان آگیا“ آپ نے فرمایا الحمد للہ حاضر خدمت ہوئے تو وطن اور والدہ کی خیریت دریافت کی۔ اس کے بعد تمام لوگوں کو رخصت کیا اور خواجہ محمد سلیمان سے فرمایا میرے سامنے بیٹھو۔ آپ نے تعمیل حکم کی چنانچہ یکم ذی الحج 1205ھ / 1790ء کی صبح سے 2 ذی الحج 1205ھ کی نماز عصر تک سامنے بیٹھا کر توجہ فرماتے رہے۔ اس کے بعد حضرت خواجہ نور محمد مہاروی نے فرمایا:

تم آزاد منشی آدمی ہو اگر حق سبحانہ تعالیٰ تم کو اپنے خزانہ کا مالک بھی بنا دے کہ اسباب ظاہری و باطنی کے لحاظ سے سارا جہاں بھی فیض یاب ہونے لگے تو بھی اپنی آبائی زمین کے قطعات

کو ضائع نہ کرنا بلکہ اپنی ملکیت رکھنا۔ اپنے دروازے پر آنے والوں کو خواہ کیسے بھی ہوں ظاہری و باطنی امداد کے بغیر خالی واپس نہ کرنا۔ جس کسی کا ہاتھ پکڑنا اس کو ضائع نہ کرنا، اگرچہ اس کی طرف سے تمہارے حق میں کیسی بھی ناشائستگی ظاہر ہو۔

دنیا داروں سے زیادہ میل جول نہ رکھنا، ہاں اگر ضرورت ہو تو مضائقہ نہیں، کیونکہ فقراء کا دروازہ خدا کا دروازہ ہوتا ہے، عاجزوں اور سائلوں کو محروم نہ کرنا اور ہمیشہ غریبوں اور علماء کا مددگار رہنا، جو کچھ ہم سے اور بزرگان سلسلہ سے اور جناب حق سبحانہ و تعالیٰ سے حاصل ہوا ہے اس کی حفاظت و اشاعت کے لئے بزرگوں کے طریقہ کے مطابق کوشش کرتے رہنا۔

جب تک آپ کی صحت اچھی رہی آپ کا یہ معمول رہا کہ آپ ہر سال تونسہ شریف سے مہار شریف حضرت خواجہ نور محمد مہاروی کے عرس پر حاضر ہوتے۔ آپ کے ہمراہ سینکڑوں درویش اور فقراء ہوتے، آپ وہاں دو ماہ تک قیام کرتے۔ اس کے علاوہ ہر دوسرے سال حضرت شیخ فرید الدین گنج شکر کے عرس پر پاک پتن شریف حاضر ہوتے لیکن اس دور کے اعراس آج کل کے عرسوں کی طرف خرافات و منکرات کے مجامع نہیں ہوتے تھے بلکہ صلحا و علماء و مشائخ کے بابرکت اجتماع ہوتے تھے۔

عمر کے آخری چند سالوں میں بہ سبب ضعف بدنی آپ نے مہار شریف اور پاکپتن شریف کے سفر موقوف کر دیئے اور ان آخری چند سالوں میں حضرت خواجہ نور محمد مہاروی کا عرس تونسہ شریف میں منعقد کرتے رہے۔ انہی ایام میں آپ نے ایک روز صاحبزادہ خواجہ محمود مہاروی نبیرہ حضرت خواجہ نور محمد مہاروی سے بڑی حسرت سے فرمایا

اگر اس غلام کو بڑھاپے کا عارضہ نہ ہوتا تو پرندوں کی طرح اڑ کر حضرت قبلہ عالم کے مزار مبارک اور آپ لوگوں کی زیارت کرتا۔ کیا کروں کہ بدن میں طاقت نہیں اور ضعف بہت ہو گیا۔

شاہ صاحب کا علمی تبحر

شاہ محمد سلیمان صاحب کا مطالعہ نہایت وسیع اور نظر بہت گہری تھی۔ قرآن، حدیث اور فقہ پر ان کو پورا عبور تھا۔ ملفوظات میں جگہ جگہ آیات قرآنی اور احادیث نبوی نقل کرتے ہیں۔ تصوف کی اعلیٰ کتابوں کا مطالعہ نہایت بالغ نظری سے کیا تھا۔ عوارف المعارف اور فتوحات مکیہ نوک زبان پر تھیں اور شیخ سہروردی اور امام اکبر کے بنیادی خیالات پر کافی غور و فکر کیا تھا۔ حدیث و فقہ پر عبور کا یہ عالم تھا کہ جب کوئی مسئلہ آپ سے دریافت کیا جاتا تو برجستہ اسناد

نقل کر دیتے۔ ایک مرتبہ قبلہ عالم کے عرس میں تشریف فرما تھے ایک عالم نے کچھ مسائل دریافت کئے۔ آپ نے برجستہ ان کا شافی و کافی جواب عنایت فرمایا۔ اس مجلس میں مولوی خدا بخش صاحب (خلیفہ حافظ محمد جمال ملتانی) بھی موجود تھے۔ انہوں نے اپنے برادر زادہ اور شاگرد مولوی عبدالغفار سے فوراً کہا کہ ان ارشادات کو ایک رسالہ کی شکل میں لکھ لو چنانچہ وہ سوالات اور جوابات جمع کر لئے گئے۔ خاتم سلیمانی میں اس رسالہ کا کچھ حصہ نقل کیا گیا ہے۔ اس سے شاہ صاحب کی وسعت نظری اور وسعت معلومات اور تبحر علمی کا اندازہ ہوتا ہے۔ شاہ صاحب فقہ اسلامی کے مطالعہ پر خاص زور دیتے تھے۔

حضرت شاہ محمد سلیمان صاحب کا لنگر نہایت وسیع اور باقاعدہ تھا۔ کھانے کے علاوہ درویشوں اور طلباء کو ہر قسم کی سہولتیں فراہم کی گئی تھیں۔ لنگر کے اہتمام کے لئے ایک پورا محکمہ تھا۔ پیارا نامی بلیہ بیٹے مودی مقرر کیا گیا تھا، میاں علی محمد ہوتانی لائگری تھے۔ مستوفی حساب برخوردار خاں چاکی تھا، نور خان گرمائی، وکیل اور صلاح کا کام انجام دیتے تھے۔ منشی گری کا عہدہ صدیق محمد کاسی کو ملا تھا۔ یہ پورا محکمہ لنگر کا انتظام کرتا تھا۔ لنگر میں کھانے کے علاوہ ضرورت کی ہر چیز موجود رہتی تھی۔ حجام، لوہار، موچی، دھوبی، آب کش وغیرہ ماہانہ تنخواہ پاتے تھے۔ اور وہاں موجود رہتے تھے اور بقول مصنف خاتم سلیمانی درویشوں کو کسی قسم کی کوئی تکلیف اور احتیاج باقی نہ رہتی تھی۔ بیمار ہوتے تو دوائیں لنگر سے مفت ملتی تھیں۔ مودی کو حکم تھا کہ جو شخص نسخہ لائے بغیر پوچھے اس کو دوا دے دی جائے۔ ایک مرتبہ خدا بخش لائگری نے عرض کیا ”غریب نواز اس مہینے میں مودی نے پانچ سو روپے درویشوں کی دواؤں کے سلسلہ میں درج کیا ہے“۔ آپ کو یہ سن کر سخت غصہ آیا فرمایا اگر پانچ ہزار بھی دوا پر خرچ ہو تو مجھے اطلاع نہ دی جائے، کیا درویشوں کی جان کے مقابلہ میں روپے کی کچھ حقیقت ہے۔ لنگر کا یہ قاعدہ تھا کہ ہر درویش کو تین پاؤ پختہ روٹی ملا کرتی تھی۔ چھ مہینے کے بعد کپڑے اور جوتے ملتے تھے۔ علاوہ ازیں ایک سیر تیل اور کچھ گھی ملا کرتا تھا۔ ان مدرسین کے لئے جو رات دن درس و تدریس میں مشغول رہتے تھے ان کو اس کے علاوہ بھی کچھ مراعات حاصل ہوتی تھیں۔ ان کا کام چونکہ دماغی محنت کا تھا اس لئے ان کو ایک سیر پختہ روزینہ سیر بھر گھی ماہانہ اور ایک سیر تیل ملا کرتا تھا۔ لباس ان کو بھی چھ مہینے میں ہی ملتا تھا لیکن ایک سفید لنگی اور ایک گوسفند بھی عطا ہوتا تھا۔

خواجہ صاحب کے لنگر کی حیثیت بہت ہمہ گیر تھی۔ یہ بات قابل لحاظ ہے کہ اس لنگر میں زیادہ تر علماء مدرسین شامل تھے۔ خواجہ صاحب نے ان کو تمام ضروریات زندگی سے بے فکر کر کے پوری ذہنی مرکزیت کے ساتھ درس و تدریس کے کام کے لائق بنا دیا تھا۔ علماء کی ایک کثیر تعداد اس

طرح دینی کام کے لئے تیار ہو جاتی تھی۔ اصحاب تاریخ اس عظیم الشان لنگری نظام کے دور رس اثرات اور نتائج پر معلومات کی کمی کی بناء پر تفصیلی بحث کرنے سے قاصر ہیں لیکن اس کی افادیت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ ویسے تو اس زمانہ میں ہندوستان کی کئی خانقاہوں میں بڑے بڑے لنگر قائم تھے اور سینکڑوں آدمیوں کا مجمع رہتا تھا۔ مثلاً دہلی میں شاہ غلام علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خانقاہ میں پانچ سو فقیر رہتے تھے اور ان کے خوردونوش کا انتظام ہوتا تھا۔ خواجہ محمد عاقل رحمۃ اللہ علیہ کی خانقاہ میں بھی لنگر کا بڑا اہتمام تھا لیکن جو باقاعدگی اور جو مقصد شاہ محمد سلیمان صاحب کے لنگری نظام میں ملتا ہے وہ کسی اور جگہ نہیں تھا۔ شاہ محمد سلیمان کا یہ کل نظام ایک مقصد کے ماتحت تھا، وہ اس طرح کی سہولتیں بہم پہنچا کر علماء کو درس و تدریس اور مشائخ کو تبلیغ و اصلاح کے لئے تیار کرتے تھے۔ شائقین علم فیض جگہ جگہ سے تونسہ میں آ کر جمع ہوتے تھے اور شاہ صاحب ان کی صلاحیتوں کو کارآمد بنانے کے لئے ہر ممکن کوشش کرتے۔

حضرت شاہ محمد سلیمان نہایت ہر دل عزیز بزرگ تھے۔ عقیدت مندوں کا اس قدر ہجوم ہوتا تھا کہ مکان کے شمالی اور جنوبی دروازے کھول دیئے جاتے تھے۔ لوگ ایک دروازے سے داخل ہوتے اور دوسرے سے نکلنے رہتے۔ جب شاہ صاحب تونسہ سے باہر جاتے تو اسٹیشنوں پر معتقدین کے ہجوم لگ جاتے تھے۔ ایک مرتبہ بٹھنڈہ کے اسٹیشن پر اس قدر خلقت جمع ہو گئی کہ گاڑی کو بہت دیر تک رکنا پڑا۔

شاہ صاحب کی خانقاہ میں جگہ جگہ سے لوگ آتے تھے۔ قریبی ریاستوں کے نواب اور جاگیردار ان کے آستانہ پر اپنی حاضری کو باعث فخر و مباہات سمجھتے تھے۔ افغانستان سے شاہ شجاع ان کی خانقاہ میں عقیدت سے حاضری دیتا تھا۔ جاگیرداروں اور والیان ریاست کا یہ معمول تھا کہ تخت نشینی کے وقت آپ سے دستار بند ہوا یا کرتے تھے اور ان کی دعاؤں کو اپنے لئے سعادت تصور کرتے تھے۔ اپنے وصال تک حضرت خواجہ نور محمد مہاروی کی پیش از پیش توجہات آپ پر مبذول رہیں حتیٰ کہ ایک روز حضرت خواجہ نور محمد مہاروی نے فرمایا:

”اس لڑکے نے ہم سے معارف الہیہ کے حاصل کرنے میں ہم کو حیران کر دیا ہے۔ حق تعالیٰ نے اس کو کتنا وسیع ظرف و حوصلہ دیا ہے کہ جو کچھ حاصل کرتا ہے اس کی استعداد و قابلیت اس سے زیادہ کی متقاضی ہوتی ہے۔“

یہ پیر و مرشد کی نگہ کرم اور ان کے کمال اطاعت ہی کا صدقہ تھا کہ آپ کی شہرت نے

زندگی میں ہی انتہاؤں کو چھو لیا۔ آپ کی شہرت سن کر ہندوستان، سندھ، عرب، عجم، عراق، خراساں سے عوام آ آ کر بیعت ہونے لگے۔ اور گناہوں سے تائب ہو کر عارف باللہ کے مقام تک پہنچنے لگے۔ آپ سے بے شمار کرامات، تصرفات اور خوارق کا ظہور ہوا جن کا چرچا دنیا بھر میں ہے۔ کسی دوسرے بزرگ کو ایسا قبول عام نصیب نہیں ہوا۔ شاہان وقت اور نوابین ریاست عرض گزار رہتے تھے کہ آپ ان کے ہاں تشریف لے جائیں مگر اس صاحب فقر نے اپنی خانقاہ میں ہی زندگی گزار دی۔ دور آخر میں آپ کی طرف مخلوق خدا کا اتنا رجوع ہوا کہ مشائخ متقدمین کی خانقاہوں اور ان کے رجوع عام کا نقشہ آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ آپ کے خلیفہ خواجہ شمس الدین سیالوی فرماتے ہیں۔ جس قدر خواجہ محمد سلیمان تونسوی کی بیعت کی گئی اور آپ کی بزرگی کی شہرت ہوئی اتنی خواجہ نور محمد مہاروی کی نہیں ہوئی۔ چنانچہ بلخ، بخارا، ایران، ہرات اور ہندوستان، سندھ اور حرمین شریفین تک سے لوگ حاضر ہو کر اپنی اپنی استعداد کے مطابق فیضیاب ہوئے۔

آج کے سجادہ نشینوں کے لئے آپ کا اسوہ شمع ہدایت کی حیثیت رکھتا ہے۔ انہیں چاہیے کہ جس والا مرتبت ولی کامل کا ذکر وہ کرتے ہیں اس کے کردار و سیرت کی جھلک ان کے اندر نظر آنے لگے۔ اگر ایسا ہو جائے تو خانقاہیں ایک مرتبہ پھر احیائے دین مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم کا گہوارہ بن جائیں۔

حوالہ جاتی کتب

- ۱۔ منتخب المناقب
- ۲۔ مناقب سلیمان
- ۳۔ نافع السالکین
- ۴۔ قصر عارفاں
- ۵۔ مرآة العاشقین
- ۶۔ مناقب المحبوبین
- ۷۔ سیارہ ڈائجسٹ اولیائے کرام نمبر
- ۸۔ ماہنامہ سلسبیل اولیاء نمبر
- ۹۔ خواجہ محمد سلیمان اور ان کے خلفاء
- ۱۰۔ راحۃ العاشقین
- ۱۱۔ تاریخ مشائخ چشت

زبدۃ العارفین حضرت

سید جماعت علی شاہ ثانی لاٹھانی رحمۃ اللہ علیہ
علی پور سیداں شریف

تاریخ اس ایمان افروز حقیقت کی شاہد ہے کہ برصغیر پاک و ہند میں اسلام کی شمع ان مشائخ کرام اور صوفیائے عظام نے روشن کی ہے جنہوں نے دلوں میں عظمت و شان مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم کے چراغ روشن کر کے ظلمت کدہ برصغیر پاک و ہند کے گوشے گوشے کو نور ایمان سے جگمگا دیا۔ ان مشائخ و صوفیاء میں ایک سر بلند اور تاریخ تصوف کے حوالے سے روشن نام سراج الاولیاء حضرت پیر سید جماعت علی شاہ ثانی لاٹھانی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے کہ جنہوں نے اپنے زہد و تقویٰ عبادت و ریاضت اور جذبہ تبلیغ اسلام کی بدولت اسلاف کی یاد تازہ کر دی۔

اقلیم ولایت کے شہر یار حضرت پیر سید جماعت علی شاہ ثانی لاٹھانی رحمۃ اللہ علیہ ۱۹ محرم الحرام ۱۲۷۲ھ بمطابق ۱۰ اگست ۱۸۴۹ء بروز جمعرات علی پور سیداں شریف کے ایک مردِ درویش حضرت سید علی شاہ رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں پیدا ہوئے۔ آپ کا سلسلہ نسب بتیس واسطوں سے سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے جا ملتا ہے۔ آپ کے بزرگ ۱۵۴۰ء میں تبلیغ اسلام کے سلسلہ میں ایران سے ہندوستان تشریف لائے اور کچھ عرصہ بعد علی پور شریف کو اپنی روحانی توجہات کا مرکز بنا کر یہیں سے اسلام کی روشنی پھیلانے لگے۔ پھر اسی خانوادے میں قطب یگانہ حضرت سید جماعت علی شاہ رحمۃ اللہ علیہ نے جنم لیا جن کے کردار کی عظمت شخصیت کی دلاویزی اور اخلاص مومنانہ نے بے شمار انسانوں کو جادہ حق پر گامزن کر دیا۔ سرکار لاٹھانی کا ہر عمل اور سیرت و کردار کا ہر پر تو اس حقیقت کا مظہر تھا کہ:

میں ظلمت شب میں لے کے نکلوں گا اپنے در ماندہ کا رواں کو

شرر فشاں ہوگی آہ میری نفس مرا شعلہ بار ہو گا

آپ کی دینی تعلیم اپنے گاؤں کے معروف عالم حضرت مولانا عبدالرشید رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھوں ہوئی۔ یہ ظاہری تعلیم کا اہتمام تھا مولانا آپ کو قرآن و حدیث اور فقہ و تصوف کی تعلیم دیا

کرتے۔ آپ کی رغبت آہستہ آہستہ تصوف و روحانیت کی طرف زیادہ ہوتی گئی۔ اب آپ صوفیائے کرام کے احوال و واقعات کا مطالعہ فرمانے لگے اور آہستہ آہستہ آپ کا دل کسی مردِ کامل کی زیارت اور اس کی صحبت سے فیضیاب ہونے کیلئے مچنے لگا۔ تصوف کے گہرے مطالعہ نے آپ کو قال کی منزلوں سے نکال کر صاحبِ حال کر دیا۔ آپ آغازِ شباب سے قبل ہی عرفانِ الہی کی ان کیفیات سے بہرہ اندوز ہو چکے تھے جن کے حصول کیلئے بعض صوفیاء کو اس وادی پر خار میں مدتوں مجاہدات کے دور سے گزرنا پڑتا ہے۔

رہبر صادق کی تلاش ہوئی تو چورہ شریف کے مرکزِ رشد و ہدایت سے ایک عالم کو فیضیاب کرنے والے ممتاز صوفی بزرگ سلطان الاتقیاء حضرت خواجہ فقیر محمد چورہی رحمۃ اللہ علیہ کی بارگاہِ قدس میں حاضر ہو گئے جو اصحابِ طریقت کے نزدیک ”باوا جی سرکار“ کے لقب سے یاد کئے جاتے ہیں۔ کیا حسن اتفاق ہے کہ انہی دنوں علی پور سیداں شریف سے آپ کے ہم نام، ہم فکر اور ہم ذوق سید بزرگ امیر ملت حضرت قبلہ پیر سید جماعت علی شاہ محدث علی پوری رحمۃ اللہ علیہ بھی ”حضور باوا جی سرکار“ کے آستانہ عالیہ پر جبینِ عجز و نیاز خم کئے حاضر ہو چکے تھے۔

خواجہ خواجگان حضرت فقیر محمد چورہی علیہ الرحمۃ نے ایک نظر دیکھا تو فوراً پہچان لیا کہ یہ مردِ صالح ایک روز شاہباز طریقت بن کر فقر و استغناء اور زہد و تقویٰ کی انتہائی بلندیوں پر اپنا بسیرا کرے گا۔ چنانچہ بارگاہِ فقیر محمد چورہی سے آپ کو ثانی اور لاثانی کے خطابات عطا ہوئے اور بہت جلد آپ نے ثابت کر دیا کہ آپ صحیح معنوں میں وہ مردِ لاثانی ہیں جو ظلمت زدہ دلوں کو معرفت آشنا کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ کچھ عرصہ کے بعد باوا جی سرکار رحمۃ اللہ علیہ نے آپ سے فرما دیا کہ علی پور سیداں میں مستقل قیام کرو اور اس پورے علاقہ کو معرفتِ الہی کے انوار سے ضوئین کر دو۔ اس سے قبل باوا جی سرکار آپ کو خرقہٴ خلافت اور بے پناہ روحانی نوازشات سے نواز چکے تھے۔

جب حضرت قبلہ پیر سید جماعت علی شاہ لاثانی رحمۃ اللہ علیہ نے علی پور سیداں کو اپنی روحانی توجہات کا مرکز بنایا تو غیر منقسم ہندوستان کے گوشہ گوشہ سے طالبانِ شوق آپ کی خدمت میں حاضری دینے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے علی پور سیداں کا غیر معروف قصبہ لاکھوں دلوں کی دھڑکن اور بے شمار نگاہوں کا نور بن گیا۔ یہاں کے ویرانے آبادیوں میں بدل گئے اور علوم ظاہری و باطنی کے ستارے آپ کی صحبت کی تمنائے معروف شہروں سے نکل کر علی پور سیداں کی فضاؤں میں سرکارِ لاثانی کے ابدی و جاودانی فیوض ڈھونڈنے لگے۔ اب علی پور سیداں محض ایک قصبہ نہ تھا بلکہ مردہ دلوں کے

لئے مسیحا کی غمزدوں کیلئے روحانی قرار اور خستہ جانوں کیلئے اُمید و سرخوشی کا مرکز بن چکا تھا۔ اقبال نے شاید اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے:

حسن بے پروا کو اپنی بے حجابی کے لئے ہوں اگر شہروں سے بن پیارے تو شہراچھے کہ بن سرکار لاثانی کی نگاہِ کیمیا اثر نے مردہ دلوں کو حیات نو بخش دی، نامراد مایوس انسانوں کو جینے کے آداب عطا کئے۔ بے یقینیوں کو یقین کا ادراک عطا کیا، راہ ہدایت سے بھٹکے ہوؤں کو صراطِ مستقیم پر گامزن کیا۔ دلوں کو خود شناسی اور پھر خدا شناسی کی لذت بخش دی۔ دکھ درد کے مارے ہوؤں کو زندگی کا سلیقہ و دیعت کر دیا۔ آپ کی گفتگو میں غضب کی تاثیر تھی، جو ایک بار آپ کی گفتار سے فیضیاب ہوتا ہمیشہ ہمیشہ کیلئے آپ کا ہو کر رہ جاتا۔

آپ کا کردار شرعِ مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم اور احکاماتِ قرآنی کی عملی تفسیر تھا۔ آپ احکاماتِ شرعیہ پر سختی سے عمل پیرا تھے اور اپنے مریدوں، ارادت مندوں اور چاہنے والوں کو بھی سنتِ رسول کے سانچے میں ڈھلا ہوا دیکھنا چاہتے تھے۔ آپ کا دل لطف و کرم سب کیلئے تھا۔ عوام بھی حاضر ہوتے اور خواص بھی، علماء بھی حاضر ہوتے اور مشائخ بھی۔ امراء بھی حاضر ہوتے اور فقیرانِ فاقہ مست بھی۔ سب کو بقدر ظرف عطا ہوتا۔ گویا آپ کی عنایات اس سحابِ کرم کی صورت تھیں جو گلشنوں اور ویرانوں کو یکساں وسیع الظرفی سے سیراب کرتا ہے۔

آپ نے اپنی روشن کی ہوئی شمعِ ہدایت کی بدولت لاکھوں تاریک دلوں کو عرفانِ الہی کا نور بخش دیا۔ ایک زمانہ آپ کے فیوضِ ظاہری و باطنی سے خوشہ چینی کر رہا تھا۔ آپ کی خدمت میں اکابرینِ اُمتِ اسلامیہ بھی حاضر ہو کر نگاہِ لطف کے امیدوار ہوتے۔ شاعر مشرق علامہ محمد اقبال کہ جن کا آبائی شہر سیالکوٹ اسی علاقہ میں آباد تھا، کئی مرتبہ اس مردِ کامل کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ علامہ فرمایا کرتے تھے کہ اگر کسی نے وقت کا غوث اور ولی اپنی نگاہوں سے دیکھنا ہو تو سیدِ جماعت علی شاہ لاثانی رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھ لے۔ یہ انہی صوفیائے کرام کا فیضان تھا کہ اقبال کو کہنا پڑا کہ:

نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی ارادت ہو تو دیکھ ان کو، یہ بیضا لئے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں ایک مرتبہ حضرت پیر سید مہر علی شاہ گولڑوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ بعض لوگ شہنشاہِ ولایت حضرت پیر جماعت علی شاہ لاثانی رحمۃ اللہ علیہ کے کپے اور سادہ حجرے کو دیکھ کر چلے آتے ہیں حالانکہ وہاں پر ذاتِ باری تعالیٰ کی جلوہ نمائی ہوتی ہے۔ آفتابِ ولایت شاہِ سراج الحق چشتی صابری رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ سرکارِ لاثانی کو اللہ تعالیٰ نے ولایت و معرفت میں لامتناہی مقامات عطا

کئے ہیں۔ شیر ربانی حضرت میاں شیر محمد شر قپوری رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ تصوف کے نام پر دکانداریاں تو بہت لوگ کر رہے ہیں مگر صحیح معنوں میں ولی تو سرکار لاٹھانی پیر جماعت علی شاہ ہیں۔ والا قدر حضرت امیر ملت پیر جماعت علی شاہ محدث علی پوری رحمۃ اللہ علیہ آپ کا از حد احترام کرتے تھے۔ جب کوئی ارادت مند آتا اور آپ کا ذکر چھڑ جاتا تو امیر ملت بڑی محبت سے سرکار لاٹھانی کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے کہ ”اس دور میں اگر کسی کامل صاحب فقر کی تلاش ہے تو پھر پیر لاٹھانی کے پاس جاؤ۔“

پیر جماعت علی شاہ لاٹھانی رحمۃ اللہ علیہ صاحب کرامات کثیرہ تھے۔ دراصل جب مرد مومن رضائے الہی میں فنا ہو جاتا ہے تو اس کی ہر ادا حکم خداوندی کا پرتو بن جاتی ہے۔ بے شمار لوگ آپ کی کرامات کے راوی ہیں مگر ہمارے نزدیک آپ کی سب سے بڑی کرامت یہی ہے کہ آپ نے مردہ دل زندہ کر دیئے۔ اُمت اسلام کو پھر سے جادۂ حق پر گامزن کر دیا۔ آپ نے اپنے ہم نشین، درویشوں کی ایک ایسی جماعت تیار کی جس نے باطل قوتوں کا منہ پھیر کر رکھ دیا۔ آپ کے حلقہٴ صحبت میں جانے والے کو پہلا خوشگوار احساس بھی ہوتا تھا کہ وہ قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کے زمانہ میں پہنچ گیا ہے۔ آپ نے خدا اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام کو عام کیا اور قرآنی تعلیمات کو اپنے چاہنے والوں کے دلوں کی خلوتوں میں ہمیشہ ہمیشہ کیلئے بسا دیا۔

ایک عرصہ تک طریقت و معرفت اور شریعت مطہرہ کی خوشبو لٹانے کے بعد بالآخر یہ ماہتاب ولایت ۱۶ شعبان المعظم ۱۳۵۸ھ بمطابق یکم اکتوبر ۱۹۳۹ء لحد کی خلوتوں میں آسودہ خواب ہو گیا۔ آپ کے وصال سے زمانے کو یوں احساس ہوا جیسے اس کی متاع عزیز اس سے جدا ہو گئی ہو۔ آپ کی تاریخ وصال یوں نکالی گئی:

بایزید عصر حاضر سید والا نسب
از سر ایمان لکھ سال وفات ان کا رخصتی
یعنی وہ سید جماعت شاہ لاٹھانی لقب
شاہ جماعت بایزید عصر لاٹھانی لقب
۱۹۳۹ء

آپ کا مزار پاک مرجع خلاق ہے۔ آپ کا مزار نہایت حسین و جاذب نظر ہے۔ اسلامی فن تعمیر کا نادر نمونہ ہے۔ آپ کا مزار پُر انوار آپ کے پوتے پیر سید علی اکبر شاہ رحمۃ اللہ علیہ کی نگرانی میں تعمیر ہوا۔

ہندوستان کے اس وقت کے معروف ماہر تعمیرات مسز می حبیب اللہ کو بطور خاص بلایا گیا

جنہوں نے نہایت عقیدت، جذباتی لگن اور روحانی انہماک کے اس مزار پاک کی تعمیر مکمل کی۔ مزار اقدس کے ساتھ ہی خوبصورت مسجد ہے۔ دربار پاک کا ماحول نہایت پاکیزہ اور مقدس ہے۔ اس کی ایمان افروز فضاؤں میں پہنچتے ہی بے اختیار روحانی پاکیزگی کے قلب و جان میں رچ جانے کا احساس ہونے لگتا ہے۔

سرکار لاٹھانی رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی علم و عمل کا مرقع تھی، آپ کے ارشادات اور فرمودات نے ارادت مندوں کے دلوں کی بنجر کھیتوں کو گلزار کی صورت بہار سماں کر دیا۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ دنیا فانی ہے۔ اس سے دوستی بے فائدہ ہے۔ دوست اس کو بناؤ جو لافانی ہے اور وہ صرف خدا تعالیٰ کی ذات ہے۔ آپ فرماتے کہ دنیا ایک زہریلا سانپ ہے، پہلے اس کا علاج سیکھو پھر ساتھ رکھو۔ آپ فرماتے کہ علم کی مجالس جنت کے باغیچے ہیں۔ عقوبتی کو بھول جانا دل کو زنگ آلود کرنے کے مترادف ہے۔ نماز کی پابندی کرنا قبر کے اندھیروں میں چراغ روشن کرنا ہے۔ آپ ارشاد فرماتے سچائی چہرے کا نور ہے۔ تنہائی بری صحبت سے بہتر ہے۔ نیک بخت فکر آخرت کرتا ہے اور بد بخت کو دنیا کی فکر ہوتی ہے۔ ہرزخم کی دوا ہے مگر بد اخلاقی کا کوئی علاج نہیں۔ آپ کی تعلیمات تواضع اور عجز پر مبنی تھیں۔ فرمایا کرتے کہ مایوس ہو کر فقر اختیار کرنے سے بہتر ہے کہ انسان اس سے پہلے ہی خدا کی طرف رجوع کر لے۔ ریاکاری سے پرہیز کرنا، صداقت کا سورج روشن کرنا ہے۔ آپ کا ہر ارشاد آپ کے عمل کی تاثیر سے زندگی پرور اور ایمان آفریں صداقت میں ڈھل چکا ہے۔

ہزار خوف ہو لیکن زباں ہو دل کی رفیق یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق
حضرت قبلہ پیر جماعت علی شاہ لاٹھانی رحمۃ اللہ علیہ کے تین فرزند تھے۔ پیر سید فدا حسین شاہ، پیر سید خادم حسین شاہ اور پیر سید غلام رسول شاہ۔ آپ نے بڑے بیٹے پیر سید فدا حسین شاہ کو جانشین نامزد کرتے ہوئے ان کی طرف خصوصی توجہ فرمائی مگر وہ سرکار لاٹھانی کی زندگی ہی میں فوت ہو گئے۔ اب سرکار لاٹھانی کی پوری توجہ سید فدا حسین شاہ کے فرزند حضرت پیر سید علی اکبر شاہ کی طرف مبذول ہو گئی۔ آپ نے اس کو ہونہار پوتے کی پیشانی پر طریقت کے چمکتے ہوئے انوار و آثار دیکھ لئے تھے اس لئے سرکار لاٹھانی نے اپنی نگرانی میں حضرت سید علی اکبر شاہ کی دینی دنیاوی اور روحانی تربیت کا اہتمام کیا۔ آپ ہر لحاظ سے اس مرد حقیقت آشنا کو اپنی روحانی امتگوں کا ترجمان اور سراپا فیضان دیکھنا چاہتے تھے۔ ایک زمانہ شاہد ہے کہ سرکار لاٹھانی نے جیسا چاہا تھا ویسا ہی ہوا اور حضرت قبلہ پیر سید علی اکبر شاہ رحمۃ اللہ علیہ صحیح معنوں میں اپنے عظیم المرتبت جد اعلیٰ کی روحانی

عظمتوں کے امین ثابت ہوئے اور جب سرکارِ لاٹھانی وصال فرما گئے تو دیکھنے والوں کو پیر سید علی اکبر شاہ رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں آ کر وہی روحانی لطف عطا ہوتا تھا جو سرکارِ لاٹھانی کی روحانی مجالس کا امتیاز تھا۔ ارادت مندوں کو آپ کی شخصیت میں سرکارِ لاٹھانی کی جلوہ نمائی محسوس ہوتی اس لئے چاہنے والے دور دور سے حاضر ہوتے آپ کی زیارت سے شاد کام ہوتے روحانی فیوض حاصل کرتے اور آپ کی پاکیزہ مجالس سے اصلاحِ قلوب اور روحانی بالیدگی کا سامان حاصل کرتے۔

حضرت قبلہ پیر سید علی اکبر شاہ نے تحریک پاکستان میں بھرپور حصہ لیا۔ ضلع سیالکوٹ اور ان تمام اضلاع اور قصبات میں پہنچے جہاں آپ کے مریدین اور ارادت مند آباد تھے۔ ان پر پاکستان کی اہمیت اور حضرت قائد اعظم کی عظمت واضح کی۔ آپ کے مریدوں میں ایک خاص تعداد کانگریس نواز مسلمانوں کی تھی۔ آپ نے ان کی نظریاتی اصلاح فرما کر انہیں تحریک پاکستان کیلئے سرگرم عمل کر دیا۔ اس ضمن میں آپ نے کانگریس اور کانگریس کی ہمنوا مسلم جماعتوں کے طلسم کو بھی پارا پارا کر دیا۔ جب پاکستان بن گیا تو آپ پھر سے حجرہ نشینی کی زندگی بسر کرنے لگے۔ آزادی کشمیر کیلئے جدوجہد کا دور چلا تو آپ نے پھر بھرپور دورے کئے چندے جمع کئے مجاہدین کی بھرپور امداد کی اور اپنے مریدین کو رضا کارانہ طور پر جہاد کشمیر کیلئے آمادہ کیا۔ اس طرح جب ستمبر ۱۹۶۵ء میں پاک و ہند جنگ ہوئی تو آپ نے لٹے ہوئے قافلوں کو ٹھہرانے کا انتظام کیا اور اپنے مریدین کو حکم دیا کہ جہاں بھی کسی مسلمان کو تکلیف میں دیکھو اس کی مصیبت کو رفع کرنے کیلئے اپنے تمام وسائل صرف کر دو۔

حضرت قبلہ پیر سید علی اکبر شاہ حضرت سرکارِ لاٹھانی کے باطنی فیوض کا عملی نمونہ تھے۔ آپ نے مدتوں اس شمع معرفت کو روشن رکھا جو آپ کے جد امجد نے روشن کی تھی۔ آپ نے شریعت اور طریقت کے امتزاج سے اپنے ارادت مندوں کی ظاہری و باطنی کایا پلٹ کر رکھ دی۔ آپ کی تاریخ وصال ۳ شعبان المعظم ۱۹۶۵ء ہے۔

آپ کو سرکارِ لاٹھانی رحمۃ اللہ علیہ کے روضہ اقدس کے جنوب مشرقی کونہ میں تقریباً ایک سو گز کے فاصلہ پر سپرد خاک کیا گیا۔ آپ کی تدفین کے بعد آپ کے صاحبزادگان حضرت قبلہ پیر سید محمد افضل شاہ جماعتی اکبری اور حضرت قبلہ پیر سید محمد فیاض حسین شاہ جماعتی اکبری کی نگرانی میں آپ کا خوبصورت مزار پاک تعمیر کرایا گیا جو فن تعمیر کا اعلیٰ نمونہ اور تمام تر معنوی و صوری حسن لئے ہوئے ہے۔ سرکارِ لاٹھانی پیر سید جماعت علی شاہ رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت قبلہ پیر سید علی اکبر شاہ کے سالانہ عرس مبارک کی تقریبات ۱۲، ۱۵ جون کی تواریخ میں پورے روحانی تزک و احتشام سے منعقد کی جاتی ہیں جن کی نگرانی آپ کے صاحبزادگان والا شان فرماتے ہیں۔

حضرت امیر ملت محدث علی پوری رحمۃ اللہ علیہ

اور تحریک پاکستان

برصغیر پاک و ہند کے ظلمت کدوں کو نورِ اسلام سے منور کرنے کیلئے صوفیائے کرام کا کردار ہمیشہ باعثِ صداقت و افتخار رہا ہے۔ یہ صوفیائے کرام چونکہ خود شریعتِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کی عملی تفسیر اور عظمتِ ایمان و یقین کی فکر افروز تنویر تھے اس لئے ان کا اندازِ تبلیغ اس قدر متاثر کن اور طریقِ رشد و ہدایت اس قدر فکر افروز تھا کہ جو ان کے پیغام کو سنتا ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ان کے دامِ محبت کا اسیر ہو جاتا۔ ان اولیائے کبار اور صوفیائے عظام نے ہر نازک مرحلہ پر امتِ مسلمہ کی راہنمائی کا حق ادا کیا۔ معاملہ تزکیہٴ قلوب کا ہو یا اصلاحِ احوال کا اپنے ارادت مندوں کی فکری و نظری راہنمائی کا مرحلہ ہو یا کفر و اسلام کی آویزش کا سلسلہ ان فرزندِ انِ اسلام نے ہر دور میں اپنی روحانی بصیرت اور ایمانی صلاحیتوں کی بدولت سفینہٴ اسلام کی اس طور ناخدائی کی کہ انسانی قلوب و اذہان مسخر ہوتے گئے اور اسلام کی روشنی سے ماحول کے ظلمت کدے ہی نہیں بلکہ دلوں کے تاریک ایوان بھی جگمگانے لگے۔

امیر ملت حضرت پیر سید جماعت علی شاہ محدث علی پوری رحمۃ اللہ علیہ کا شمار بھی ان صوفیائے عظام میں ہوتا ہے جو علمی لحاظ سے اسلاف کی یادگار اور عملی لحاظ سے دنیائے ایمان کا افتخار تھے۔ آپ ایک بے مثال فقیہ نامور محدث صاحب تدبیر قائد علم و عمل کی عظمتوں سے بہرہ ور روحانی پیشوا اور بے شمار انسانوں کے دلوں پر حکومت کرنے والے شیخ طریقت تھے۔ آپ کی صلاحیتوں کا ایک زمانہ معترف تھا جس طرف بھی گئے اپنی خداداد روحانی و نظری صلاحیتوں کے نقوش جاوداں ثبت کرتے گئے۔ آپ کی کس کس صفت خاص کا تذکرہ کیا جائے رب دو عالم نے آپ کو کتنے ہی خصائص عالیہ اور اوصاف حسنہ سے نواز رکھا تھا۔ آپ علم و حکمت کا ماہِ تاباں تھے اور ایک زمانہ مدتوں آپ کے فیض و برکات سے مستفیض ہوتا رہا۔ اس وقت درج ذیل مضمون میں ہمیں تحریکِ پاکستان کے حوالے سے آپ کے یادگار کردار کا تذکرہ مقصود ہے۔

حضرت امیر ملت رحمۃ اللہ علیہ محدث علی پوری نے جب اسلامیانِ ہند کی راہنمائی کیلئے

میدانِ عمل میں آنے کا فیصلہ کیا تو اس وقت مسلمان سیاسی اور سماجی طور پر بے پناہ محرومیوں کا شکار تھے۔ سات سمندر پار سے آنے والے سفید فام انگریز آقا برصغیر پاک و ہند کی قسمت کے مالک بن بیٹھے تھے۔ پوری دنیائے اسلام میں سے بیشتر مسلمان ممالک یا تو سامراجی طاقتوں کے غلام تھے یا ان کی پالیسیاں غیر ملکی سامراجیت کی مصلحتوں کی اسیر تھیں۔ برصغیر پاک و ہند پر انگریز کے طویل دور حکومت نے آہستہ آہستہ اسلامیانِ ہند کے دلوں سے احساسِ زیاں ختم کرنا شروع کر دیا تھا مگر پھر بھی آزادی کے متوالے تھے کہ موت کی ابدی شاہراہوں پر دیوانہ وار رقص کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ برصغیر پاک و ہند کو برطانوی تسلط سے آزادی دلانے کیلئے مختلف ادوار میں کئی تحریکات نے جنم لیا۔ تحریکِ خلافت، تحریکِ مسجد شہید گنج، مجلس اتحاد و ملت، سمیت کتنی ہی تحریکات تھیں جو عشاقِ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خون کا نذرانہ لے کر تاریخِ آزادی کا بیش بہا سرمایہ بن گئیں اور آزادی کی روشن راہوں کے مسافر یہ عزم لئے پروانہ وار شمعِ حریت پر نثار ہوتے گئے کہ:

اگر عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے
کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

ان ادوار میں لیلائے آزادی کی محبت کا دعویدار کوئی بھی حریت پسند خود کو ان تحریکات سے علیحدہ نہیں رکھ سکتا تھا۔ حضور امیر ملت رحمۃ اللہ علیہ محدثِ علی پوری کی نگاہِ دور بین یہ دیکھ رہی تھی کہ یہی تحریکات جو ظلماتِ کفر کے خاتمے کیلئے منظر عام پر آ رہی ہیں ایک دن یقیناً تحریکِ پاکستان کے عظیم نصب العین میں ڈھل جائیں گی اس لئے آپ نے انگریزی استبدادیت کے خاتمے اور سامراجی عزائم کی قلعی کھولنے کیلئے نہ صرف ان تحریکات کو کامیاب بنانے کیلئے مکمل اور بھرپور تعاون کیا بلکہ آزادی و حریت کے ہر اول دستے کے قائد کی حیثیت سے فرزندِ ان حریت کی ہر مقام پر درست اور صائب راہنمائی فرمائی۔

اسلامیانِ برصغیر آپ کو اپنا روحانی ہی نہیں بلکہ فکری و نظری راہنما تسلیم کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ۱۹۳۵ء میں راولپنڈی میں منعقد ہونے والی ایک عظیم الشان کانفرنس میں آپ کو اتفاق رائے سے امیر ملت منتخب کر لیا گیا۔ اس کانفرنس میں برصغیر کے ہر شہر سے مشائخ و علماء اور قومی سطح کے تمام قابل ذکر مسلم سیاسی قائدین جمع ہوئے تھے۔ آپ کا یہ انتخاب بلاشبہ اس امر کی دلیل تھا کہ زمانہ آپ کو قیادت و سیادت کا حق دار تصور کر رہا تھا۔ آپ کو بھی اپنی قائدانہ ذمہ داریوں کا بخوبی احساس تھا۔ اس لئے آپ زندگی بھر اسلام دشمن قوتوں کے خاتمے اور برطانوی سامراج سے آزادی

کے حصول کیلئے پوری ایمانی تب و تاب کے ساتھ کوشاں رہے۔

پاکستان بلاشبہ اولیائے عظام کا فیضان ہے۔ سنی مشائخ و علمائے کرام نے اس کے حصول کی خاطر جو لازوال قربانیاں پیش کی ہیں وہ ہمیشہ تاریخ کے اوراق پر زریں الفاظ کی صورت میں فروزاں رہیں گی۔ حضرت سیدی امیر ملت محدث علی پوری کے علاوہ صدر الافاضل حضرت مولانا نعیم الدین مراد آبادی، حجتہ الاسلام حضرت مولانا حامد رضا خاں، حضرت مولانا عبدالقادر بدایونی، پیر صاحب مانگی شریف، پیر صاحب زکوڑی شریف، حضرت پیر فضل شاہ جلال پور شریف، مولانا شاہ عبدالعلیم میرٹھی، مولانا عبدالحامد بدایونی، مولانا سید غلام بھیک نیرنگ، حضرت خواجہ محمد قمر الدین سیالوی، حضرت مولانا ابوالحسنات محمد احمد قادری، حضرت مولانا ابوالحامد سید محمد محدث کچھوچھوی، حضرت سید پیر غلام محی الدین گولڑہ شریف، مولانا غلام محمد ترنم، مولانا عبدالغفور ہزاروی، مولانا عبدالستار خاں نیازی، حضرت خواجہ نظام الدین تونسہ شریف، مولانا سید احمد سعید کاظمی، حضرت خواجہ غلام سدید الدین تونسہ شریف، مولانا محمد عارف اللہ میرٹھی، صاحبزادہ محمد شاہ گجراتی، مولانا مفتی صاحبزادہ خاں، حضرت پیر عبدالرحمن بھڑچوندی شریف، مولانا امجد علی اعظمی سمیت کتنے ہی مشائخ و علماء تھے جو تحریک پاکستان کے سلسلہ میں مدتوں کوشاں رہے۔ کس کس کا نام لیا جائے یہاں تو بے شمار نام ہیں جو تاریخ کے یادگار الم میں شہرت دوام کی خلعت زیب تن کئے اپنے بھرپور وجود کا احساس دلا رہے ہیں۔ ان تمام مشائخ و علماء میں حضرت امیر ملت پیر سید جماعت علی شاہ رحمۃ اللہ علیہ محدث علی پوری کی ذات والاصفات مہر منور کی صورت آزادی و حریت کے اُجالے بکھیرتی نظر آتی ہے۔

کوئی بھی تحریک اپنے ساتھ مختلف عوامل لے کر چلتی ہے۔ یہ عوامل اپنی اپنی جگہ جامعیت کے حامل ہونے کے باوجود بالآخر ایک انتہائی جامع تحریک میں ڈھل جاتے ہیں۔ تحریک پاکستان کو ان عوامل کے حوالے سے دیکھا جائے تو حضرت امیر ملت رحمۃ اللہ علیہ مختلف محاذوں پر قیادت و سیادت اور قربانی و ایثار کا مظاہرہ کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ عوامل یا قومی و سیاسی محاذ حضرت امیر ملت رحمۃ اللہ علیہ کی قائدانہ صلاحیتوں کے امین اور ان کی ایمان افروز یادوں کے پاسدار ہیں۔ حضرت امیر ملت رحمۃ اللہ علیہ کے پیش نظر جو عوامل کارفرما تھے وہ یہ تھے:

اولاً: ان تمام سیاسی و قومی تحریکات سے تعاون کیا جائے جو عظمت اسلام کی نقیب اور انگریز و ہندو سمیت تمام باطل قوتوں کے غلبے کے خلاف مصروف عمل ہوں۔

ثانیاً: مذہبی محاذ پر انتہائی سرگرمی سے کام کیا جائے اور تبلیغ اسلام کا فریضہ انجام دیتے ہوئے

اسلامیوں ہند کے دلوں میں آزادی کی شمع روشن کی جائے۔
حالیہ: تعلیمی و تدریسی اور علمی و روحانی مراکز (سکول، کالج، مساجد اور اشاعتی ادارے وغیرہ) اس انداز سے وجود میں لائے جائیں کہ ان سے بہرہ یاب ہونے والے مسلمان عظمت توحید اور شان رسالت سے بہرہ ور ہو کر میدانِ عمل میں آئیں۔

رابعاً: تحریک پاکستان کی کامیابی کیلئے مشائخ و علماء کو ایک مرکز پر جمع کیا جائے تاکہ حصول پاکستان کی جدوجہد تیز سے تیز تر ہو سکے۔

تحریک آزادی اور تحریک حصول پاکستان کے پس منظر میں کارفرما ان عوامل پر ایک نظر ڈالتے ہی احساس ہونے لگتا ہے کہ حضرت امیر ملت رحمۃ اللہ علیہ محدث علی پوری نے ان تمام عوامل کو موثر بنانے کیلئے شایانِ شان کردار ادا کیا ہے۔ سیاسی و قومی تحریکات کے ضمن میں آپ نے تحریک خلافت، مجلس اتحاد ملت، مسجد شہید گنج سمیت ہر اس تحریک سے تعاون کیا اور اپنی روحانی راہنمائی کے علاوہ مالی امداد و تعاون سے بھی نوازا جو انگریز کے تسلط کے خلاف مصروف عمل تھی اور جس کا اولین مقصد احیائے عظمت اسلام تھا، آپ نے لاکھوں روپے کے زیر تعاون سے ان تحریکات کو مالی استحکام بھی بخشا اور ملک گیر دوروں میں اپنے ایمان آفریں خطابات کے ذریعہ بھی دلوں کو عظمت ایمان سے گرمادیا۔

حضرت امیر ملت رحمۃ اللہ علیہ چونکہ بنیادی طور پر عظیم المرتبت شیخ طریقت اور برصغیر کے مسلمانوں کے دلوں پر حکومت کرنے والے بے تاج بادشاہ تھے اس لئے آپ نے تبلیغ اسلام کے مقدس فریضہ کو ایک لمحہ کیلئے بھی فراموش نہ کیا۔ شاروا ایکٹ شدھی تحریک، فتنہ ارتداد سمیت آپ نے تمام خلاف اسلام یورشوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور مسلمانوں کے دلوں میں انگریز دشمنی، ہندو بالادستی کے خلاف جدوجہد کی شمع یوں روشن کی کہ آنے والے ادوار میں مسلمانوں کو تحریک پاکستان کے پلیٹ فارم پر جمع کرنا آسان ہو گیا۔

عظمت اسلام، فروغ دین اور اسلامی تشخص کو عام کرنے کیلئے آپ نے بیسیوں روحانی علمی تہذیبی اور تدریسی مراکز قائم کئے۔ حصول پاکستان کے دلاویز نعرے کی اصل روح بھی یہی اسلامی تشخص تھا، جسے نظریہ اسلام یا دو قومی نظریہ پاکستان بھی کہتے ہیں۔ آپ نے بہت سی مساجد تعمیر کروائیں، مدارس کھلوائے، کتب خانے قائم کرائے، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، جہاں سے حصول پاکستان کی جنگ لڑنے والے نامور فدائین نے جنم لیا، حضرت امیر ملت رحمۃ اللہ علیہ کی مالی امداد کے سہارے روشن مستقبل کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اسلامیہ کالج لاہور اور متعدد دوسرے کالج اور تعلیمی ادارے حضرت

امیر ملت کی روحانی سرپرستی، فکری راہنمائی اور مالی امداد سے مستفیض ہو رہے تھے۔ اس تمام راہنمائی اور تعاون کے پس پردہ امیر ملت رحمۃ اللہ علیہ کے پیش نظر یہی مقصود تھا کہ مستقبل کی قیادت کیلئے ایک ایسی نسل سامنے آئے جو مذہب اسلام کے بنیادی شعائر سے بہرہ ور اور قومی تقاضوں سے پوری طرح باخبر ہو کیونکہ اسی طور ہی تحریک پاکستان کے محاذ پر فیصلہ کن جنگ لڑی جاسکتی تھی۔

چنانچہ جب تحریک حصول پاکستان کے سلسلہ میں فیصلہ کن قدم اٹھانے کا مرحلہ آیا تو حضرت امیر ملت رحمۃ اللہ علیہ اپنی پوری علمی و عملی توانائیوں اور روحانی و نظریاتی صلاحیتوں کے ساتھ مسلم لیگ کی صف اول کی قیادت میں اپنے مؤثر وجود کا احساس دلاتے نظر آتے ہیں۔ حصول پاکستان کے باقاعدہ مطالبہ سے پیشتر بھی آپ کی تمامی مساعی برصغیر میں مسلمانوں کی عظمت رفتہ کو پھر سے بحال کرنے کیلئے وقف تھیں۔ چنانچہ جب تحریک پاکستان کے نام سے باقاعدہ جدوجہد کا آغاز کیا گیا تو آپ کو یوں محسوس ہوا جیسے دیرینہ آرزوئیں رنگ لارہی ہوں اور برصغیر میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے خواب تعمیر سے ہمکنار ہو رہے ہوں۔ آپ امیر ملت تھے۔ قائد اسلامیان ہند تھے سنوسی ہند کا لقب بھی پا چکے تھے اسلامیان ہند راہنمائی کی خاطر آپ کی طرف دیکھ رہے تھے مگر آپ کی مستقبل بین نظریں محمد علی جناح کی صورت میں مسلمانان برصغیر کے قائد اعظم کو منصب سیاست پر بعدشان ابھرتے ہوئے دیکھ چکی تھیں۔ چونکہ آپ کو سیاسی و قومی محاذ کے علاوہ روحانی و فکری محاذ پر بھی سرگرم عمل رہنا تھا اور پھر آہستہ آہستہ صحت بھی کمزور ہو رہی تھی اس لئے آپ نے قائد اعظم محمد علی جناح کو ہر ممکن تعاون سے نوازتے ہوئے قیادت کے سلسلہ میں ان کی بھرپور حوصلہ افزائی فرمائی۔

۱۹۴۳ء میں جب قائد اعظم پر قاتلانہ حملہ ہوا تو آپ نے اپنے پوتے جو ہر ملت حضرت پیر سید اختر حسین کے ہاتھ بہت سے قیمتی تحائف اور ایک مکتوب قائد اعظم کے پاس بھجوائے۔ آپ نے اپنے مکتوب میں تحریر فرمایا تھا:

”قوم نے مجھے امیر ملت مقرر کیا ہے اور پاکستان کیلئے جو کوششیں آپ کر رہے ہیں وہ میرا کام ہے مگر میں اب سو سال سے زیادہ عمر کا ضعیف و ناتواں شخص ہوں۔ میرا بوجھ جو آپ پر آپڑا ہے اس میں آپ کی مدد کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ آپ مطمئن رہیں نمرود کی دشمنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین کی فرعون کی دشمنی حضرت کلیم اللہ کے دین کی، ابوجہل کی دشمنی ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کی ترقی کا باعث ہوئی ہے..... جس شخص کو اللہ تعالیٰ کامیاب فرمانا چاہتا ہے اس کے دشمن پیدا کر دیتا ہے، میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کے دشمنوں کو ذلیل و خوار کرنے ہم

سب آپ کے معاون و مددگار رہیں گے۔ آپ بھی عہد کریں کہ آپ اپنے مقصد سے ذرہ بھر بھی نہیں ہٹیں گے۔“

چند روز بعد قائد اعظم کا خط آپ کے نام آیا جس میں انہوں نے لکھا تھا: ”جب آپ جیسے بزرگوں کی دعا میری شامل حال ہے تو میں اپنے مقصد میں ابھی سے کامیاب ہوں اور آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ میری راہ میں کتنی تکلیفیں کیوں نہ آئیں، میں اپنے مقصد میں کبھی پیچھے نہیں ہٹوں گا۔ آپ نے قرآن شریف اس لئے عنایت فرمایا ہے کہ میں مسلمانوں کا لیڈر ہوں جب تک قرآن اور دین کا علم نہ ہو، کیا میں لیڈری کر سکتا ہوں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ قرآن شریف پڑھوں گا، انگریزی ترجمے میں نے منگوا لئے ہیں۔ ایسے عالم کی تلاش میں ہوں جو مجھے انگریزی میں قرآن کی تعلیم دے سکے۔ جانماز آپ نے اس لئے عطا کیا ہے کہ جب میں اللہ تعالیٰ کا حکم نہیں مانتا تو مخلوق میرا حکم کیوں مانے گی۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ نماز پڑھا کروں گا۔ تسبیح آپ نے اس لئے ارسال کی ہے میں اس پر درود شریف پڑھا کروں۔ جو شخص اپنے پیغمبر پر اللہ تعالیٰ کی رحمت طلب نہیں کرتا، اس پر اللہ کی رحمت کیسے نازل ہو سکتی ہے، میں اس اشارے کی بھی تعمیل کروں گا۔“

یاد رہے کہ آپ نے قائد اعظم کو تحفوں میں قرآن شریف، تسبیح، جانماز، شال، دھسہ اور دوسری قیمتی اشیاء ارسال کی تھیں۔

یہ حقیقت ہر شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ اگر حضرت امیر ملت محدث علی پوری قائد اعظم اور مسلم لیگ کو اپنے بھرپور تعاون اور راہنمائی سے نہ نوازتے تو شاید حصول پاکستان کی منزل اتنی جلدی قریب نہ آتی۔ آپ نے برصغیر کے طول و عرض میں بے شمار دورے کئے، تحریک پاکستان کے مقاصد کو عام کرنے کیلئے اور مسلم لیگ کو عوام کے دلوں کی دھڑکن بنانے کیلئے آپ نے بیسیوں عظیم الشان اجتماعات سے خطاب کیا۔ کانفرنسیں منعقد کروائیں اور مشائخ و علمائے اہلسنت سے ایک مرکز پر جمع ہونے کی اپیل کی۔ اپنے لاکھوں ارادت مندوں کو پاکستان کی حمایت کیلئے خود کو وقف کر دینے کی تلقین کی۔ آپ نے قائد اعظم محمد علی جناح اور مسلم لیگ کے پیغام کو جو فی الحقیقت آپ کا اپنا پیغام تھا، ہر شہر قریہ اور قصبہ میں پہنچانے کیلئے تمام ممکنہ وسائل سے کام لیا۔ اس سلسلہ میں رئیس احمد جعفری کی کتاب ”قائد اعظم اور ان کا عہد“ سے یہ اقتباس پاکستان کیلئے امیر ملت رحمۃ اللہ علیہ کی جذباتی وابستگی کے اظہار کا خوبصورت نمونہ ہے۔

اور مشائخ و علمائے پنجاب کے ایک اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے الحاج میر سید جماعت

علی شاہ محدث علی پوری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ”حکومت اور کانگریس دونوں کان کھول کر سن لیں کہ اب مسلمان بیدار ہو چکے ہیں۔ انہوں نے اپنی منزل مقصود متعین کر لی ہے۔ اب دنیا کی کوئی طاقت ان کے مطالبہ پاکستان کو ٹال نہیں سکتی۔ بعض دین فروش نام نہاد لیڈر مسٹر جناح کو برملا گالیاں دے رہے ہیں لیکن انہوں نے آج تک کسی کو برا نہیں کہا۔ یہ ان کے سچا راہنما ہونے کا ثبوت ہے۔ خاکساروں نے مجھے قتل کی دھمکیاں دی ہیں، میں انہیں بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں سید ہوں اور سید موت سے کبھی نہیں ڈرتا، اس کے بعد موصوف نے اپنے مریدوں اور حلقہ بگوشوں سے فرمایا کہ وہ مسلم لیگ کے امیدواروں کو ووٹ دیں۔“

حصول پاکستان کی جنگ بلاشبہ ایک نظریاتی جنگ تھی، جس میں ایک طرف تو کروڑوں شیدائیان رسول کریم تھے جو اسلام کو عالم اسلام کی شوکت ایمانی کا مرکز بنانے کیلئے مصروف عمل تھے اور دوسری طرف ہندو سکھ اور دوسری غیر مسلم قوتیں تھیں، جن کی پشت پناہی برطانوی سامراج کر رہا تھا۔ اس جنگ نے اس وقت شدت اختیار کر لی، جب کئی جبہ پوش مسلم علماء اپنے تمام تر علمی تبحر کے باوجود ہندو کے نظریہ وطنیت کا شکار ہو کر کانگریس کی صفوں میں جا بیٹھے تھے اور مطالبہ پاکستان کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے۔ اب امیر ملت رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے مشائخ و علماء کو نہ صرف انگریزوں اور ہندوؤں سے نبرد آزما ہونا تھا بلکہ نظریہ قومیت کی فریب کاری کے شکار ان مسلم علماء کے پروپیگنڈے کی قلعی بھی کھولنا تھی جو ہندو مسلم سمیت تمام ہندوستانی اقوام کو ایک قوم قرار دے رہے تھے۔ شاعر مشرق حضرت علامہ اقبال نے ایسے حالات میں دو قومی نظریہ اسلام کی حمایت میں مسلمانوں کو یہ پیغام عمل دیا:

۔ اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر

خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی

حضرت امیر ملت محدث علی پوری اس صورتحال سے بے خبر نہ تھے۔ آپ مسلم لیگ اور کانگریس کے معرکے کو کفر و اسلام کی جنگ قرار دے رہے تھے۔ اس سلسلہ میں آپ ہر جگہ فرمایا کرتے: ”مسلمانو! یہاں دو جھنڈے ہیں۔ ایک اسلام کا دوسرا کفر کا۔ بتاؤ کس جھنڈے کے نیچے جانا چاہتے ہو؟ لوگ جواب میں کہتے ”اسلام کے جھنڈے کے نیچے“ اس خوبصورت طرز استدلال نے اسلامیان ہند کے دل موہ لئے اور قیام پاکستان کیلئے فضا انتہائی تیزی سے ہموار ہونے لگی۔ قائد اعظم محمد علی جناح کو بھی حضرت امیر ملت رحمۃ اللہ علیہ کی یادگار مساعی کا بے پناہ

احترام تھا اس کا ثبوت وہ خطوط ہیں جو قائد اعظم نے حضرت امیر ملت رحمۃ اللہ علیہ کے نام ارسال کئے۔ قائد اعظم کے متعلق آپ کے مخلصانہ جذبات کا اندازہ لگانے کیلئے ۱۹۴۳ء میں سری نگر میں آپ کی قائد اعظم سے ملاقات کا تذکرہ کرنا ضروری ہے۔ اس ملاقات کا اہتمام قائد کشمیر چودھری غلام عباس مرحوم نے کیا تھا کہ جو حضرت امیر ملت کے مرید تھے۔ حضرت امیر ملت سری نگر میں تشریف فرما تھے۔ قائد اعظم وہاں کے دورے پر آئے تو چودھری غلام عباس قائد اعظم کو لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے قائد اعظم کی پُر تکلف دعوت کی تھی۔ مختلف اقسام کے ۴۵ کھانے دسترخوان پر چن دیئے گئے۔ قائد اعظم سے آپ نے بستر پر بیٹھنے کی فرمائش کی مگر انہوں نے خلاف ادب جانا اور آپ کے ساتھ ہی قالین پر بیٹھ گئے۔ آپ بصد اصرار قائد اعظم کو ہر کھانے سے تھوڑا تھوڑا کھلاتے رہے۔ قائد اعظم نے سب کھانوں کو پسند فرمایا اور کہا ”میں نے ایسی پُر تکلف دعوت ساری عمر نہیں دیکھی میرا بس چلے تو میں باورچی کو اڑالے جاؤں۔“

جب یہ اکابرین ملت کھانا کھا چکے تو آپ نے قائد اعظم کو دو جھنڈے عطا کئے۔ ایک سبز تھا دوسرا سیاہ نقد روپیہ بھی عطا کیا۔ ان میں سے سبز جھنڈا اسلام اور مسلم لیگ کا تھا جبکہ سیاہ جھنڈا کفر کا تھا۔ آخر میں آپ نے قائد اعظم کو اپنے عظیم مقصد کے حصول میں کامیابی کی نوید بھی سنائی۔ رخصت کے وقت قائد اعظم نے دوبارہ اٹھ کر آپ سے معافیہ کیا۔ قائد اعظم کو حضرت امیر ملت کے تعاون اور امداد کا بہت زیادہ احساس تھا۔ امیر ملت کے تعاون اور روحانی نوازشات کا اعتراف کرتے ہوئے قائد اعظم نے قیام پاکستان سے کئی سال پہلے لاہور کے ایک بہت بڑے جلسہ عام میں کہا تھا ”میرا ایمان ہے کہ پاکستان ضرور بنے گا کیونکہ امیر ملت مجھ سے فرما چکے ہیں کہ پاکستان ضرور بنے گا اور مجھے یقین واثق ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی زبان مبارک کو ضرور سچا کرے گا۔“

حضرت امیر ملت نے قد آور اشتہارات کے ذریعہ مسلم لیگ کے پیغام کو عام کرنے کیلئے

اعلان فرمایا:

”مسلمانو! مسلم لیگ کے جھنڈے تلے جمع ہو جاؤ میرا جو مرید مسلم لیگ کی حمایت نہیں کرے گا وہ مسلمان نہیں ہے۔ اس وقت دو جھنڈے ہیں۔ ایک ہلالی پرچم مسلم لیگ کا اور دوسرا کفر کا۔ اب فیصلہ کرو کہ تم کس کے ساتھ ہو۔“

تاریخ پاکستان رقم کرنیوالا کوئی بھی مؤرخ ”سنی کانفرنس“ کے انعقاد اور اس کے ہمہ گیر اثرات سے پہلو تہی نہیں کر سکتا۔ مشائخ و علمائے اہلسنت کی یہ نمائندہ ”سنی کانفرنس“ تحریک پاکستان

کی جدوجہد کو تیز تر کر دینے کا باعث ثابت ہوئی۔ اس کے عظیم اجتماعات دس سال بعد ہوتے تھے۔ پہلی سنی کانفرنس مراد آباد میں ۱۹۲۵ء میں منعقد ہوئی۔ دوسری بار ۱۹۳۵ء میں بدایوں کے مقام پر منعقد ہوئی جبکہ تیسری سنی کانفرنس کا انعقاد ۱۹۴۵ء میں بنارس کے مقام پر ہوا۔ حضرت امیر ملت کے حصے میں یہ سعادت بھی آئی کہ تینوں تاریخ ساز کانفرنسوں میں صدارت آپ نے فرمائی۔ ان کانفرنسوں میں لاکھوں عوام اور ہزاروں علماء و مشائخ نے شرکت فرمائی۔ صدارت کیلئے امیر ملت کا انتخاب ان کے تبحر علمی اور روحانی عظمت کے اعتراف کا غیر معمولی ثبوت تھا۔ آپ نے ان کانفرنسوں میں اپنے موقف کا کھل کر اظہار کیا اور عوام کو مسلم لیگ کے پرچم تلے جمع ہونے اور پاکستان کے حصول کی خاطر قائد اعظم کی قیادت کو تسلیم کرنے کی تلقین کی۔ ان سنی کانفرنسوں کے خاطر خواہ مثبت نتائج برآمد ہوئے اور سنی مشائخ و علماء تمام اختلافات فراموش کر کے حصول پاکستان کیلئے سرگرم کار ہو گئے۔

تحریک پاکستان کو ناکام بنانے کیلئے باطل قوتیں اپنے تمام ہتھکنڈے استعمال کر رہی تھیں۔ پاکستان کے بنیادی محرکات پر اعتراضات کئے جا رہے تھے۔ قائد اعظم کی شخصیت پر الزامات کی بوچھاڑ کی جا رہی تھی۔ حضرت امیر ملت نے ہر جگہ مقاصد پاکستان کی وضاحت کرنے کے علاوہ قائد اعظم کی ذات پر کئے جانے والے اعتراضات کو بھی رڈ کیا۔ ایک دفعہ امرتسر میں مسجد جان محمد میں جلسہ ہو رہا تھا۔ حضرت امیر ملت کی تقریر کے دوران میں بعض مخالفین نے سوال کیا ”جناب کافر ہے یا مسلمان“ آپ نے برجستہ فرمایا ”تم نے کون سی ان کے ساتھ رشتہ داری کرنی ہے جو ان کا مذہب دریافت کرتے ہو۔ ہم نے جناب صاحب کو اپنا امام ”قاضی یا نکاح خواں مقرر نہیں کیا بلکہ وہ ہمارے وکیل ہیں۔ یہ ہم سب کا کام ہے جس کو وہ کر رہے ہیں۔ یہ پوچھنے سے کیا حاصل کہ ان کا مسلک کیا ہے۔“

اعتراض کرنے والے لاجواب ہو گئے تو آپ نے زوردار لہجے میں فرمایا:

”مسٹر جناب پاکستان بنانے کی کوشش کر رہے ہیں اور اس میں انہیں کامیابی ہوگی۔ پاکستان کے مخالفین کان کھول کر سن لیں کہ پاکستان بن کر رہے گا۔ بارگاہ رب العزت سے اس کی منظوری ہو چکی ہے۔ پاکستان ہم سب کا ہے اکیلے مسٹر جناب کا نہیں ہے۔ وہ ہمارا کام کر رہے ہیں اور ہمارے وکیل ہیں۔“

ایک بار آپ مسلم لیگ اور پاکستان کیلئے فضا ہموار کرنے اور اعتراضات کو باطل کرنے کیلئے

کوہاٹ تشریف لے گئے۔ وہاں احرار کا زور تھا، کارکنان مسلم لیگ نے درخواست کی کہ اپنے ارادت مندوں کو مسلم لیگ میں شمولیت کی تلقین کیجئے۔ آپ نے ان کی درخواست کو شرف پذیرائی بخشا اور حاضرین پر زور دیا کہ وہ بلا تاخیر مسلم لیگ کے پرچم تلے جمع ہو جائیں۔ اس پر کسی نے اعتراض کیا تو آپ نے جوش میں آ کر فرمایا ”کہ اگر مسلم لیگ میں شامل نہ ہوں تو کیا کفر لیگ میں شامل ہوں گے“۔

پھر اعتراض ہوا کہ ”مسلم لیگ پر تو خاکسار چھائے ہوئے ہیں“۔ اس پر آپ نے فرمایا ”تم مسلم لیگ میں شامل ہو جاؤ، وہ بھی مسلم لیگ کے جھنڈے تلے رہیں گے یا اپنا الگ ٹھکانہ ڈھونڈ لیں گے“۔

وہاں کے عوام نے آپ کے حکم کی تعمیل میں مسلم لیگ میں شمولیت کر لی اور دیکھتے ہی دیکھتے مسلم لیگ کی عظمت اس طور مسلم ہو گئی کہ دوسری تمام سیاسی جماعتیں اس کی یلغار کی تاب نہ لا کر مقبولیت سے محروم ہو گئیں۔

تحریک پاکستان کی حمایت اور قائد اعظم کے مشن کی وکالت کیلئے حضرت امیر ملت محدث علی پوری نے صدر آل انڈیا بمبئی کانفرنس کی حیثیت سے جو بیان دیا وہ بھی آپ کی بصیرت ایمانی اور حق و صداقت کی پاسداری کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

”اس بناء پر فقیر جمیع مسلمانان ہند سے اپیل کرتا ہے کہ جس طرح فقیر نے شملہ کانفرنس کے موقع پر اعلان کیا تھا کہ مسلم لیگ ہی مسلمانان ہند کی واحد سیاسی جماعت ہے۔ اب چونکہ جدید انتخابات ہونے والے ہیں۔ اس موقع پر جیسا کہ قائد اعظم محمد علی جناح صاحب نے مسلمانان ہند سے اپیل کی ہے کہ ہر ایک مسلمان کو مسلم لیگ کے امیدوار کو ووٹ دینا چاہیے اور اپنی حیثیت سے زیادہ چندہ دینا چاہیے۔ فقیر بحیثیت امیر ملت، قائد اعظم محمد علی جناح کی اس اپیل کی پر زور تائید کرتا ہے اور جمیع مسلمانان ہند سے عموماً اور اپنے یازان طریقت سے خصوصاً جو لاکھوں کی تعداد میں ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں ہیں۔ مکرر پر زور اپیل کرتا ہے کہ اس موقع پر ہر طرح سے مسلم لیگ کی امداد کریں اور میرے متوسلین انشاء اللہ تعالیٰ مسلم لیگ کی امداد کرتے رہیں گے“۔

حضرت محدث علی پوری رحمۃ اللہ علیہ کا مسلم لیگ کے ساتھ تعلق اور اس کے مقاصد سے اتفاق اس وقت سے تھا جبکہ ابھی مسلم لیگ نے علیحدہ مسلم مملکت کا نام ”پاکستان“ استعمال کرنا شروع نہیں کیا تھا۔ قرارداد لاہور سے مدتوں پیشتر ہی حضرت امیر ملت نے مومنانہ فراست اور روحانی بصیرت کو کام میں لاتے ہوئے مسلم لیگ کی حمایت اور اس کی امداد شروع کر دی تھی۔ ۱۹۳۹ء میں

کانگریسی وزارت کے خاتمے پر قائد اعظم کی اپیل پر پورے ملک میں یوم نجات منایا گیا۔ اس سلسلہ میں علی پور سیداں (ضلع سیالکوٹ) میں آپ کے ایماء پر بہت بڑا جلسہ ہوا۔ ”یوم نجات“ کے سلسلہ میں منعقد ہونے والے اس جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے حضرت امیر ملت رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

’دو جھنڈے ہیں ایک اسلام کا ایک کفر کا‘ جو کفر کے جھنڈے کے نیچے کھڑے ہوں گے ان میں سے اگر کوئی مر جائے تو کیا تم اس کے جنازے کی نماز پڑھو گے؟ سب نے انکار کیا پھر دریافت فرمایا ”کیا تم مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کرو گے؟ سب نے اقرار کیا کہ نہیں ہرگز نہیں! پھر ارشاد فرمایا کہ اس سیاسی میدان میں اسلامی جھنڈا مسلم لیگ کا ہے ہم بھی مسلم لیگ کے ساتھ ہیں اور سب مسلمانوں کو بھی مسلم لیگ میں شامل ہونا چاہیے۔“

حضرت محدث علی پوری رحمۃ اللہ علیہ کا یہ بیان نظریہ پاکستان کی کتنی خوبصورت تشریح ہے۔ اس بیان سے آپ کی جرأت ایمانی کا اظہار بھی ہوتا ہے اور مطالبہ پاکستان کیلئے آپ کی جذباتی وابستگی کا پتہ بھی چلتا ہے۔

امیر ملت کے صاحبزادے سراج الملت سید محمد حسین شاہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنے عظیم والد کی اتباع میں تحریک پاکستان کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کیلئے شدید کام کیا۔ انہوں نے والد محترم کے ہمراہ اور علیحدہ بھی بھرپور اور وسیع و عریض دورے کئے اور اپنے دوسرے بھائیوں کے ہمراہ تمام وابستگان طریقت اور اسلامیان برصغیر کو مسلم لیگ کا ہمنوا بنانے کی کوشش کی۔ پیر صاحب مانگی شریف نے قائد اعظم کو سپاس عقیدت پیش کرنے کیلئے مانگی شریف میں عظیم الشان جلسہ کا انعقاد کیا تو اس میں بطور خاص حضرت امیر ملت کو بھی شرکت کی دعوت دی۔

حضرت امیر ملت رحمۃ اللہ علیہ ناسازی طبع کے باعث خود تو نہ جا سکے البتہ اپنے فرزند ارجمند حضرت سید محمد حسین شاہ کو اپنی جگہ ایک سونے کا تمغہ تین سو روپے کی تھیلی اور کئی دوسرے تحائف دے کر بھیج دیا۔ حضرت پیر صاحب مانگی شریف نے خیر مقدمی جذبات کے ساتھ سراج الملت حضرت سید محمد حسین شاہ کا استقبال کیا اور جلسہ کی صدارت بھی انہی سے کروائی۔ جب قائد اعظم سٹیج پر تشریف لائے تو حضرت سید محمد حسین شاہ نے آپ سے کہا کہ:

”حضرت امیر ملت رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کیلئے کامیابی کا سونے کا تمغہ بھیجا ہے۔“
قائد اعظم اس پر بہت خوش ہوئے کرسی سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور سینہ تان کر بولے:
”پھر تو میں کامیاب ہوں، آپ تمغہ میرے سینے پر آویزاں کر دیجئے۔“

حضرت امیر ملت کا اپنا علاقہ اگرچہ صوبہ پنجاب تھا، مگر چونکہ پورے ہندوستان میں آپ کے لاکھوں ارادت مند بستے تھے اس لئے تحریک پاکستان کو نئی زندگی عطا کرنے کیلئے آپ نے برصغیر کے ایک ایک شہر کا دورہ کیا۔ قیام پاکستان کی منزل قریب آنے لگی اور صوبہ سرحد میں ریفرنڈم کا فیصلہ ہوا، تو آپ پیر صاحب مانکی شریف کی خصوصی درخواست پر صوبہ سرحد میں تشریف لے گئے۔ مسلم لیگ اور پاکستان کے حق میں عوامی فضا ہموار کرنے کیلئے خوب کام کیا اور جا بجا جلسے کر کے عوام کو بتایا کہ صرف اور صرف پاکستان کے قیام کی صورت ہی میں ان کے حقوق کا تحفظ ممکن ہے۔ دوسرے مشائخ اور علماء بھی اس طویل دورہ میں آپ کے ہمراہ تھے۔ بالآخر آپ کی یہ تگ و دو رنگ لائی اور وہاں عوام نے غالب اکثریت سے پاکستان کے حق میں فیصلہ دے دیا۔

۱۹۴۶ء کا سال تحریک پاکستان کے سلسلہ میں خاص اہمیت کا حامل ہے کیونکہ اس سال مرکزی اور صوبائی انتخابات کے ذریعہ مسلمانوں نے برطانوی سامراج اور ہندو مہا سبھائیوں پر یہ واضح کرنا تھا کہ ہندوستان میں صرف انگریز اور ہندو ہی نہیں بستے بلکہ مسلمان قوم بھی اپنا موثر وجود رکھتی ہے۔ حضرت امیر ملت رحمۃ اللہ علیہ محدث علی پوری نے پیرانہ سالی کے باوجود ملک کے طول و عرض میں دورے کئے۔ آپ کے ہمراہ بہت سے نامور مشائخ اور علمائے کرام نے بھی شانہ روز سفر کر کے کروڑوں فرزندوں کو حید کو پاکستان کی اہمیت و عظمت سے آگاہ کیا۔ ان انتخابات کے نتائج نے طاغوتی طاقتوں کو یہ باور کرا دیا کہ اب ان کیلئے مسلم قوت کے طوفان کے سامنے سازشوں کے بند باندھنا ممکن نہیں رہا۔

کوئی بھی تحریک صرف زبانی دعوؤں، لفظی جمع خرچ یا پر جوش تقاریر کے سہارے ہی کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکتی بلکہ اسے کامیاب بنانے کیلئے عظیم منصوبہ بندی، خلوص نیت اور جذباتی لگن کے ساتھ ساتھ مادی تعاون کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔ حضرت امیر ملت نے مسلم لیگ کو جتنا چندہ دیا، اس کا صحیح اندازہ اگرچہ دشوار ہے مگر آپ نے مسلم لیگ کو چندے کے طور پر لاکھوں روپے دیئے اور انتخابات پر بھی لاکھوں روپے خرچ کئے۔ آپ نے اپنے طویل و عریض سیاسی دوروں کیلئے مسلم لیگ سے کبھی کرایہ بھی طلب نہ کیا۔ اپنے تمام ہمراہیوں کے کرایہ کی رقم سے لے کر خور و نوش کے اخراجات تک تمام اخراجات خود برداشت کرتے۔ بعض اوقات جلسوں سے جملہ اخراجات بھی اپنی جیب سے ادا کرتے۔ یہ اس بطل جلیل کے جذبہ قربانی و ایثار کی ایک جھلک ہے جس نے کبھی اپنے پاس کچھ نہیں رکھا بلکہ جو کچھ آتا خدا کی راہ میں خیرات کر دیتے تھے۔ آپ کی عظمت فقر کا اندازہ اس

امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ تمام زندگی آپ کے پاس کبھی اتنا اجاشہ جمع نہ ہوا کہ اس پر زکوٰۃ فرض ہوتی۔
۱۹۴۶ء کے انتخابات میں مسلم لیگ کو شاندار کامیابی نصیب ہوتی تو حضرت امیر ملت رحمۃ اللہ علیہ کو بے پناہ خوشی و مسرت کا احساس ہوا کیونکہ اب وہ منزل قریب نظر آ رہی تھی جس کے حصول کیلئے یہ ملک بھر کے علماء و مشائخ کو ہمراہ لے کر برسوں سے مصروف جدوجہد تھے۔ آپ نے اس موقع پر قائد اعظم کو مبارکباد کا پیغام ارسال کیا جس میں اسلامیان ہند کی جدوجہد آزادی کی کامیابی کا تذکرہ کر کے حضرت قائد اعظم کو ہدیہ تریک پیش کرتے ہوئے نیک تمناؤں کا اظہار کیا گیا تھا۔
قائد اعظم نے اس کے جواب میں یہ پیغام آپ کے نام ارسال کیا:
محترم پیر صاحب!

آپ کی نیک تمناؤں اور مبارکبادوں کا بہت بہت شکریہ اور مجھے یقین ہے کہ مسلمان خوش ہیں کہ آخر کار ہم نے دو سو سال کی غلامی کے بعد خود اپنے پاکستان کی آزاد اور خود مختار مملکت بنا لی۔
پاکستان بن گیا تو حضرت امیر ملت رحمۃ اللہ علیہ نے کبھی سیاسی عزائم یا ذاتی مفادات سے سروکار نہ رکھا۔ آپ کی حیثیت اس قافلہ سالار کی سی تھی جو کارواں کو آشنائے منزل کرنے کیلئے طویل عرصہ تک مصروف عمل رہا اور جب کارواں کامیابی کے مراحل طے کرتا ہوا منزل سے ہمکنار ہوا تو میر کارواں کو ستانے کی سوچنے لگی۔ اب ان کا کام ختم ہو چکا تھا۔ نیا دور نئے تقاضے لئے پاکستان کے روشن مستقبل کی نوید بن کر حالات کے افق سے ابھر رہا تھا۔ آپ کے جذبات کامیابی کی سرخوشی سے سرشار تھے مگر ایسے عالم میں بھی آپ نے حب الوطنی کے تقاضوں کو فراموش نہ کیا اور قائد اعظم محمد علی جناح کو قیام پاکستان پر مبارکباد کا برقیہ ارسال کرتے ہوئے تحریر فرمایا:
”ملک گیری آسان ہے۔ ملک داری بہت مشکل ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ملک داری کی توفیق عطا فرمائے۔“

حصول پاکستان کیلئے آپ کی جدوجہد ایک طویل عرصے پر محیط ہے۔ آپ تحریک پاکستان کو اپنا جزو ایمان تصور کرتے تھے۔ اس لئے آپ قائد اعظم کو سپاسِ محبت پیش کرتے ہوئے یہی فرمایا کرتے تھے کہ ”قائد اعظم ہمارا کام کر رہے ہیں“ آپ نے قیام پاکستان کے بعد اپنی اولاد کیلئے کوئی عہدہ طلب نہیں کیا اور بلاشبہ بے شمار اصحاب ایمان کے دلوں پر بھد شان روحانیت حکومت کرنے والا سلطانِ اقلیم یقین دنیاوی اعزازات یا عہدوں کا محتاج کیسے ہو سکتا تھا۔ کیونکہ:
نگاہِ نقر میں شان سکندری کیا ہے خراج کی جو گدا ہو وہ قیصری کیا ہے

قیام پاکستان کے فوری بعد ہی آپ اس احساس سے شاد کام ہو چکے تھے کہ ہمارے حصے کا کام ختم ہو چکا۔ پاکستان وجود میں آچکا۔ اب اسے تعمیر و ترقی کے مراحل سے گزارنا آنے والے دور کی ذمہ داری ہے۔ پیر صاحب مانگی شریف کے نام آپ کا پیغام بھی اسی حقیقت کی عکاسی کرتا ہے۔ آپ نے تحریر فرمایا:

”پیر صاحب پاکستان بن گیا، اب ہمارا کام ختم ہوا، اب ملک چلانے والے جانیں اور ان کا کام۔“

حضرت قبلہ عالم امیر ملت محدث علی پوری رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت اتنی ہمہ گیر اور جامع الخصال تھی کہ آپ کی زندگی کے کسی بھی پہلو پر خامہ فرسائی کیلئے چند صفحات نہیں بلکہ دفتر درکار ہیں۔ آپ کی عبادت و ریاضت، زہد و تقویٰ، دلوں پر اثر کرنے والی تکلم باریاں، اصحاب فکر کیلئے رشد و ہدایت کی مہک باریاں، طالبان حقیقت پر کرم نوازیوں، رہ نور دان، کوچہ شوق پر عنایات بے کراں، دامادگان ہستی کیلئے لطف و رحمت کا نیر تاباں، غرضیکہ کس کس ادائے خاص کا تذکرہ کیا جائے۔

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می بینم کرشمہ دامن دل میکشد کہ جا اینجا ست
پاکستان کا وجود حضرت امیر ملت کے بے مثال تدبیر، غیر معمولی فراست، ایمان افروز راہنمائی، فکر آفرین قیادت، عہد آفریں سیادت اور غیر معمولی جذبہ خلوص و یقین کا مرہون منت تھا۔ پاکستان کا کوئی بھی صاحب نظر دانشور تحریک پاکستان پر قلم اٹھاتے ہوئے حضور امیر ملت رحمۃ اللہ علیہ محدث علی پوری کے زندہ جاوید کردار کو فراموش نہیں کر سکے گا۔ جب بھی تاریخ کے اُفق کے اس پار جھانکتے ہیں تو حضرت امیر ملت رحمۃ اللہ علیہ کا روشن سراپا محسوسات کے مطلع تاباں پر بصد آب و تاب روحانی زندگی بخش کر نہیں لٹاتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ پاکستان خدائے کریم اور محبوب خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا ہم یہ احسان بھی ہے اور محبان ملک و ملت کا ارمان بھی۔ یہ نظریاتی مملکت خداداد حضرت امیر ملت رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے اولیائے کرام کا فیضان بھی ہے اور اہل نظر کیلئے قرار جسم و جان بھی۔ وطن عزیز کی آزاد فضاؤں کا ایک ایک لمحہ حضرت امیر ملت رحمۃ اللہ علیہ کو ہدیہ سلام عقیدت نذر کرتا اور زبان حال سے یہی کہتا ہوا محسوس ہوتا ہے:

عمر با در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات تاز بند عشق یک دانائے راز آید بروں



زینتِ دنیائے تصوف

حضرت پیر سید علی اکبر شاہ نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ

شوکتِ اقلیم معرفت، رمزِ آشنائے طریقت، حضرت قبلہ عالم پیر سید علی اکبر شاہ نقشبندی جماعتی رحمۃ اللہ علیہ کا شمار ان عظیم نفوسِ قدسیہ میں ہوتا ہے، جن کی زندگی کا مقصد اولیٰ خلق خدا کی اصلاح اور خدمتِ انسانیت ہوتا ہے۔ یہ لوگ اپنے لئے نہیں بلکہ دوسروں کیلئے جیتے ہیں۔ ان کے افکار سر بلند اور ان کا کردار شمعِ روشن کی صورتِ ضوئیں ہوتا ہے۔ ان کا وجود ظلمتِ شب میں تاریکیوں کا پردہ چاک کرنے والے ستاروں کی صورت ہوتا ہے جو تمام راتِ ضوفشاں رہتے ہیں اور ظلمتوں کی یورش کو اپنی ایمانی تب و تاب سے مٹا کر رہتے ہیں۔ یہ اقبال کے لفظوں میں اس عزمِ مصمم سے آراستہ ہوتے ہیں کہ:

میں ظلمتِ شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو

شرِ رفساں ہو گی آہ میری نفسِ میرا شعلہ بار ہو گا

سید علی اکبر شاہ رحمۃ اللہ علیہ سرکارِ لاٹانی، قطبِ ربانی حضرت سید جماعت علی شاہ رحمۃ اللہ علیہ کے پوتے اور آپ کے فیوض و برکات سے ایک عرصہ تک فیضیاب ہونے والے خوش قسمت انسان تھے۔

سرکارِ لاٹانی کی صحبت تو ناقصوں کو کامل بنا دیتی تھی، جس پر ان کی نگاہِ لطف پڑ جاتی وہی شخص رشد و ہدایت کی دنیا کا درخشندہ ستارا بن جاتا تھا اور پھر حضرت سید علی اکبر تو سرکارِ لاٹانی کے لاڈلے پوتے تھے۔ وہ سعیدِ قسمت پوتے کہ جنہیں اس ولیِ کامل کا فیض بھی عطا ہوا اور سرکارِ لاٹانی کی آغوشِ رحمت میں پرورش بھی پائی۔ جسے سرکارِ لاٹانی کی گود میسر ہو جائے اس کے مقدر کا کیا کہنا اور پھر سید علی اکبر اپنے مقدر پر ناز کیوں نہ کرتے کہ:

یہ فیضانِ نظر بھی رحمتِ ربِ تعالیٰ ہے

کہ جس سے اہلِ ایمان کے دل و جان ہیں اُجالا ہے

بلاشبہ یہ فیضان نظر ہی تھا کہ جس نے حضرت سید علی اکبر کو آداب فرزندگی ہی نہیں بلکہ آداب طریقت و معرفت کی رفعتوں سے بھی بہرہ ور کر دیا۔

حضرت قبلہ سید علی اکبر شاہ رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح معنوں میں اصلاح احوال اُمت اسلام اور اہل نظر کے قلوب و اذہان کی تطہیر کا فریضہ انجام دیا۔ آپ کی روحانی عظمت اور ایمانی سر بلندی کا احساس ایک زمانے کو تھا۔ آپ حضرت قبلہ پیر سید فدا حسین شاہ رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے اور سرکارِ لاٹانی کے پوتے تھے۔ سرکارِ لاٹانی نے آپ کے بچپن کے دوران ہی میں آپ کو اپنی روحانی توجہ کا مرکز بنا لیا تھا اور جب آپ کے والد ماجد قبلہ سید فدا حسین شاہ کا انتقال ہو گیا تو سرکارِ لاٹانی نے اس یتیم پوتے کو ہر طرح سے اپنی روحانی لطافتوں سے نوازا شروع کر دیا۔ آپ پر اپنے نامور دادا جان اور مرشد کامل سرکارِ لاٹانی رحمۃ اللہ علیہ کی کرم فرمائیاں یوں اثر انداز ہوئیں کہ آپ اپنے اعمال اور افعال کے لحاظ سے دادا جان کی روحانی تفسیر بن گئے۔ ایسی تفسیر کہ جس کا مطالعہ کرتے ہوئے ہر ورق پر سرکارِ لاٹانی کی عظمت دل و جان پر اُجاگر ہونے لگے۔ آپ نے فنا فی الشیخ کے درجے پر فائز ہو کر وہ بلند مقام حاصل کر لیا کہ عوام اور خواص آپ کو ہر لحاظ سے سرکارِ لاٹانی کا جانشین ماننے لگے۔ عام ارادت مندوں کی تو بات ہی کیا، معروف شیوخ طریقت بھی آپ ہی کو سرکارِ لاٹانی کی روحانی متاع کا وارث سمجھتے تھے۔ اس سلسلہ میں ایک واقعہ کا تذکرہ یقیناً اہل نظر کیلئے روحانی جلا کا باعث بنے گا۔

علی پور شریف کی غیر معمولی شہرت کا ایک سبب حضور سرکارِ لاٹانی کے علاوہ حضرت لاٹانی کے ہم نام پیر بھائی امیر ملت حضرت پیر حافظ سید جماعت علی شاہ محدث علی پوری رحمۃ اللہ علیہ کا وجود بھی ہے جن کے فیوض سے ایک زمانہ فیضیاب ہوتا رہا۔ ایک مرتبہ ریاست حیدرآباد دکن کا ایک رئیس حضرت محدث علی پوری رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ:

”شیخ محترم میں نے علی پور کے دوسرے آفتاب طریقت حضرت پیر سید جماعت علی شاہ لاٹانی کے روحانی کمالات کا بہت شہرہ سن رکھا ہے۔ وہ آپ کے ہم نام اور برادر طریقت ہیں۔ ان پر حالت فقر کا غلبہ زیادہ رہتا ہے۔ میری خواہش ہے کہ ان کی زیارت کا شرف بھی حاصل کر لوں حضور قبلہ محدث علی پوری رحمۃ اللہ علیہ نے مرید کی زبان سے سرکارِ لاٹانی رحمۃ اللہ علیہ کا نام سنا تو دل مسوس کر رہ گئے اور پھر چند منٹ خاموش رہنے کے بعد نہایت کرب کے ساتھ فرمایا ”بیٹا جن کی تو بات کرتا ہے وہ تو اس دنیا سے پردہ فرما چکے ہیں۔ البتہ میں تمہیں ان کی جیتی جاگتی تصویر دکھا سکتا

ہوں جس کو دیکھ کر تم میرے برادر معظم کے سراپا کا تعین کر سکو گے۔ اس رئیس نے جب سنا کہ قبلہ عالم سرکارِ لاٹانی وصال فرما چکے ہیں تو نہایت غم کا اظہار کیا۔ حضرت قبلہ محدث علی پوری نے فرمایا کہ بیٹے خدا کی رضا کو تسلیم کئے بغیر چارہ ہی نہیں ہے۔ البتہ میں تمہیں اپنے بھائی کی ایک ایسی نشانی کی زیارت کروا سکتا ہوں جو اپنے دادا جان کی طرح سادگی کا پیکر ہے۔ یہ سن کر اس رئیس نے عرض کیا کہ میرے آقا اگر ایسی ہی بات ہے تو آپ مجھے ان کی زیارت ضرور کرائیں اور یہ بھی فرمائیں کہ ان کا اسم گرامی کیا ہے۔ حضرت محدث علی پوری نے فرمایا ”اس کا نام صاحبزادہ علی اکبر شاہ ہے اور وہ میرے برادر گرامی سرکارِ لاٹانی رحمۃ اللہ علیہ کے سب سے بڑے پوتے ہیں۔“ حضرت قبلہ محدث علی پوری اس وقت نحیف اور کمزور تھے۔ چنانچہ آپ کے حکم پر بیل گاڑی میں پیال وغیرہ بچھا کر اوپر نرم و گداز گدا ڈال دیا گیا اور آپ صاحبزادہ پیر سید اختر حسین شاہ اور اس رئیس کو ساتھ لے کر بیل گاڑی میں سوار ہوئے اور اہل طریقت کی سنت کے مطابق آپ نے تحفے کے طور پر دیسی گنے کی شکر کا ایک تھیلا بھی ساتھ رکھوا لیا۔ شکر کا وزن ایک من کے قریب ہوگا۔

حضرت محدث علی پوری رحمۃ اللہ علیہ جب دربار عالیہ لاٹانیہ کے قریب پہنچے تو حضور قبلہ پیر سید علی اکبر شاہ صاحب والہانہ انداز میں آپ کے استقبال کیلئے تشریف لے گئے اور نہایت اعزاز کے ساتھ آپ کو بیت اشرف میں لا کر آپ کی شان کے لائق خاطر و مدارت کا فریضہ سرانجام دیا۔ اسی دوران میں حضرت قبلہ محدث علی پوری نے اپنے پوتے حضرت پیر سید اختر حسین شاہ کو ارشاد فرمایا ”اختر حسین مجھے خدشہ تھا کہ کہیں علی پور سیداں سے ولایت ختم ہی نہ ہو جائے مگر بھگد لہ یہ سلسلہ ہمیشہ جاری و ساری رہے گا اور میرے بعد اگر تمہیں مجھے دیکھنے کی ضرورت پیش آئے تو صاحبزادہ سید علی اکبر شاہ رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت کر لیا کرنا۔“

علاوہ ازیں حضور قبلہ محدث علی پوری نے پیر سید علی اکبر شاہ کی سادگی تو واضح، محبت و اخلاص اور انکساری کو دیکھا تو حیدرآباد دکن سے آئے ہوئے رئیس نے برملا عرض کیا کہ حضور میں نے جو کچھ سرکارِ لاٹانی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق سنا تھا وہ سب کچھ میں نے صاحبزادہ صاحب میں دیکھ لیا ہے اور مجھے اطمینان ہو گیا ہے کہ میں سرکارِ لاٹانی رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت سے محروم نہیں رہا۔

حضرت قبلہ سید علی اکبر نے تمام اسلامی تحریکات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اس سلسلہ میں کبھی کسی قربانی سے دریغ نہیں کیا۔ اس ضمن میں تحریک پاکستان خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ یہ دور اہل ایمان پر انتہائی کٹھن تھا۔ غلامی کی تاریکیاں چاروں طرف چھائی ہوئی تھیں۔ ایسے دور پر

آشوب میں قائد اعظم محمد علی جناح آزادی کے سورج بن کر ابھرے اور آپ کی بے مثال قیادت نے غلامی پر رضا مند مسلمانوں کو آزادی کا متوالا بنا دیا۔ قائد اعظم کی بے مثال جدوجہد کا ثمر تھا کہ سواد اعظم اہلسنت و جماعت نے بالخصوص تحریک پاکستان کے سلسلہ میں قائد اعظم سے بھرپور تعاون کیا۔ سنی مشائخ اور علمائے کرام نے قائد اعظم کی آواز پر لبیک کہا اور اپنے ارادت مندوں کو تحریک پاکستان کیلئے بھرپور کردار ادا کرنے کی تلقین کی۔

حضرت سید علی اکبر شاہ نے دوسرے صاحبزادگان کے ہمراہ مسلم لیگ کے حق میں رائے عامہ ہموار کرنے کیلئے بڑی تندہی اور جانفشانی سے دورے کئے۔ بالخصوص تحصیل شکر گڑھ میں جہاں آستانہ عالیہ علی پور شریف کے ارادت مند کثرت سے آباد ہیں، آپ نے تحریک پاکستان کی حقیقی روح پھونک دی۔

ان دوروں کے دوران میں انگریزوں کے چند پٹھوؤں نے جب آپ کو سیاست سے الگ رہنے کا مشورہ دیا تو آپ نے جرأت رندانہ سے اس مشورے کو ٹھکرا دیا۔ ۴۶-۱۹۴۵ء کے دوران میں آپ مسلم لیگ کو مزید مستحکم اور مضبوط بنانے کیلئے مسلسل تبلیغی دورے فرماتے ہوئے ضلع امرتسر تشریف لے گئے اور وہاں جلسہ عام میں اپنے آستانہ سے وابستہ اصحاب ایمان کو پاکستان کی اہمیت سے آگاہ کیا۔

اتفاق کی بات کہ ان دنوں وہاں مجلس احرار کا جلسہ بھی تھا اور سید عطا اللہ شاہ بخاری کی تقریر تھی جس میں انہوں نے حسب معمول پاکستان کے خلاف زہر اگلنا تھا، لوگوں نے بخاری صاحب کو بتایا کہ یہاں پر پیر سید جماعت علی شاہ لاثانی علی پوری رحمۃ اللہ علیہ کے پوتے بھی تشریف لائے ہوئے ہیں اور وہ لوگوں کو مسلم لیگ کو کامیاب کرنے کی ترغیب دے رہے ہیں۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے کہا میں ان سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔ چنانچہ وہ چند لوگوں کے ساتھ پیر سید اکبر علی شاہ رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور کہنے لگے:

”حضور صاحبزادہ صاحب شاید آپ کو معلوم ہی ہو کہ میں کسی پیر کا قائل نہیں مگر آپ کے جد امجد حضرت پیر سید جماعت علی شاہ لاثانی کی بزرگی کا پورے طور سے معترف ہوں۔ ایک دفعہ وزیر آباد کے اسٹیشن پر اچانک میری ان سے ملاقات ہو گئی تھی۔ میں ان کی شخصیت اور گفتگو سے شدید متاثر اور مرعوب ہوں۔ وہ بلاشبہ مشائخ سلف کا نمونہ تھے۔“

حضرت قبلہ صاحبزادہ سید علی اکبر شاہ نے بخاری صاحب کی گفتگو سنی تو فرمایا:

”مولانا صاحب! میرے جد امجد کی تعریف کر کے آپ مجھے مسلم لیگ کی حمایت سے نہیں روک سکتے اور پاکستان کے خلاف آپ کا خواب کبھی شرمندہ تعبیر نہیں ہوگا۔“

بخاری صاحب یہ صاف جواب سن کر مایوس ہو کر واپس چلے گئے۔

صاحبزادہ پیر سید علی اکبر شاہ رحمۃ اللہ علیہ نے مسلم لیگ کا پیغام گھر گھر پہنچانے کیلئے دوسرے مشائخ اور صوفیاء کے ہمراہ اپنے ایمانی مشن کو پوری شدت سے جاری رکھا۔ بالآخر پاکستان برصغیر کے مسلمانوں کی امیدوں کا مرکز بن کر تاریخ کے افق پر عالمگیر حقیقت بن کر ابھر آیا۔ آہستہ آہستہ جب وطن عزیز کے حکمران پاکستان کی نظریاتی بنیادوں سے روگردانی کرنے لگے تو آپ نے سیاست سے مکمل طور پر کنارہ کشی اختیار کر لی اور اپنی تمام تر توجہ آستانہ عالیہ سے تعلق رکھنے والے ارادت مندوں کی اصلاح اور روحانی سر بلندی پر صرف کر دی۔

حضرت قبلہ عالم کی زندگی فقر و استغناء اور درویشی و پاکبازی کا نمونہ تھی۔ ایسا حسین نمونہ کہ جسے دیکھنے کیلئے زمانہ مدتوں ترستا ہے۔ آپ کی گفتگو دلاویز اور جاذب فکر تھی۔ بات کرتے تو آپ کے الفاظ بے اختیار دل کی گہرائیوں میں جگہ بنا لیتے۔ آپ طویل گفتگو سے اجتناب کرتے مگر اس مرد درویش کے اقوال کی یہ تاثیر تھی کہ جو کچھ کہتے ارادت مند فوراً اسے اپنے عمل کا اعزاز بنا لیتے۔ شاید آپ جیسے مقبول زمانہ کے بارے میں شاعر نے کہا تھا کہ:

پڑھتے پھریں گے گلیوں میں ان رینتوں کو لوگ

مدت رہیں گی یاد یہ باتیں ہماریاں

آپ عام پیران طریقت کے برعکس خود بھی صاحب عمل تھے اور عقیدت مندوں سے بھی توقع رکھتے تھے کہ وہ بھی صاحب عمل ہوں۔ آپ کے اعمال پاکیزہ میں شوکت اسلاف کی جھلک تھی۔ آپ کا مقصد دولت کا حصول کبھی نہیں رہا بلکہ آپ نے اپنے محترم اور عظیم المرتبت جد امجد حضور سرکار لاٹانی رحمۃ اللہ علیہ کے اسوہ پر عمل کرتے ہوئے۔ یوریا نشینی کو اپنا افتخار حیات بنائے رکھا۔ آپ تو اقبال کے اس شعر کی تفسیر مجسم تھے کہ:

۔ نہ تخت و تاج میں نے لشکر و سپاہ میں ہے

جو بات مرد قلندر کی بارگاہ میں ہے

نذرانوں کی وصولی سے احتیاط فرماتے۔ ایک مرتبہ آپ بغرض تبلیغ بھٹیاں گوجراں تحصیل

شکر گڑھ تشریف لے گئے تو بٹھالی کے نمبردار نے عرض کیا کہ آپ ہمارے گاؤں میں تشریف لائیں

سرکارِ لاٹانی کے بہت سے ارادت مند بستے ہیں۔ آپ تشریف لائیں گے تو وہاں کے اہل ثروت کثیر تعداد میں نذرانے آپ کی نذر کریں گے۔ اس پر آپ نے شانِ استغناء کے ساتھ فرمایا:

”نمبردار جی ہم شہر شہرِ قریہ قریہ اس لئے نہیں گھوم رہے کہ اپنے خاندانی مریدوں سے نذرانے وصول کرتے پھریں ہم دعوتِ الی الحق اور تبلیغِ دین کیلئے آتے ہیں۔ اگر آپ ہمیں نذرانے دینے کے بجائے خدا و رسول کی اتباع و پیروی کریں تو یہ ہمارے لئے خوشی کا باعث ہوگا۔ آپ لوگ سرکارِ لاٹانی رحمۃ اللہ علیہ کی سیرت کو اپنالیں، قیامت کے دن یہی چیز آپ کے کام آئے گی۔“

حق تو یہ ہے کہ آپ کی یہی راست بازی بے ریائی، پاکبازی اور روحانی بلند پردازی اہل شوق کے دلوں کو ایمان کی منزل پر فائز کرنے کا باعث بن گئی۔ آپ نے اپنے افکار اور نگاہوں کی پاکیزگی سے بے پناہ قوتِ تسخیر کا کام لیا اور جدھر جدھر بھی گئے، محبتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشبو لٹاتے رہے۔ آپ صحیح معنوں میں فنا فی الرسول تھے جب تک یہ زمانہ اپنا وجود رکھتا ہے ہر صاحب ایمان اس حقیقت کا اعتراف کرتا رہے گا کہ:

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا

نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

آپ کی تاریخِ وصال ۳ شعبان المعظم ۱۳۸۵ھ ہے۔ اس تاریخ کو ملک کے اطراف و

اکناف سے عقیدت مند آپ کے مزارِ پُر انوار پر حاضر ہوتے اور روحانی فیوض و برکات حاصل کرتے ہیں۔

ع..... خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را



حضرت شاہ رحمن نوشاہی رحمۃ اللہ علیہ (بھڑی شاہ رحمن)

پنجاب کے مشہور مذہبی اور معاشرتی تہواروں میں سے ایک عرس بھڑی شاہ رحمن رحمۃ اللہ علیہ ہے۔ یہ سالانہ عرس اس جگہ پر منایا جاتا ہے جہاں عظیم روحانی شخصیت حضرت شاہ رحمن رحمۃ اللہ علیہ کی آخری آرام گاہ ہے۔ حضرت شاہ رحمن وہ برگزیدہ صوفی تھے کہ جن کے فیوض روحانی کی بدولت اس علاقہ کے ہزاروں انسانوں کے تاریک دل ایمان کی روشنی سے منور ہو گئے۔ ان کی تمام زندگی علم و عمل کا نمونہ تھی۔ وہ خود بھی ایک صوفی باعمل تھے اور اپنے مریدوں سے بھی اسی اخلاص ایمانی پابندی شریعت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور سر بلندی کردار کی توقع رکھتے تھے۔ ان کی تعلیمات نہایت سادہ اور دلوں میں گھر کرنے والی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے ارادت مند بھی شعائر اسلامی کی پاسداری کے پیکر بن گئے جو بھی ایک بار ان کے حلقہ تربیت میں آیا وہ ہمیشہ کیلئے انہی کا ہو کر رہ گیا۔

بچپن کے زمانے میں ایک بار حضرت رحمن شاہ رحمۃ اللہ علیہ اپنے ہم عمر ساتھیوں کے ساتھ بمقام بچہ چٹھہ کھیل رہے تھے کہ ادھر سے حضرت حاجی محمد قادری عرف حضرت نوشہ گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ گزرے اور کچھ دیر قیام کیلئے اس گاؤں میں ٹھہر گئے۔ حضرت پاک رحمن کھیلتے کھیلتے ان کے پاس آئے تو انہوں نے ان پر نگاہ عنایت فرمائی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ حضرت پاک رحمن بے ہوش ہو گئے۔ دوسرے لڑکے فوراً ان کے گھر پہنچے اور والدہ کو تمام ماجرا سنایا، والدہ اپنے بیٹے کی بے ہوشی کا سن کر وہاں پہنچیں اور لڑکے کو اٹھا کر حضرت نوشہ گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں پیش کر کے اس کی بیہوشی پر اپنی بے قراری کا اظہار کیا تو حضرت نوشہ گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ بچہ بالکل ٹھیک ہے آپ اس کو گھر لے جائیں جب یہ سن بلوغ کو پہنچے تو ہمارے پاس لے آئیے گا۔

سن بلوغ کو پہنچنے تک آپ کی یہی کیفیت مدہوشی رہی۔ آپ کی والدہ کو شیخ سے کیا ہوا وعدہ یاد آیا اور وہ انہیں لے کر حضرت نوشہ گنج بخش کی خدمت میں لے گئیں۔ انہوں نے مسکرا کر ان کی طرف دیکھا تو یہ فوراً ٹھیک ہو گئے اور اپنی عمر کا ایک عرصہ پھر اس شیخ کابل کی صحبت میں گزار دیا۔ شیخ

نے بیعت کرنے کے فوری بعد ہی اس خاص توجہ سے نوازا کہ یہ معرفت اور طریقت کی منازل بڑی تیزی سے طے کرنے لگے اور جلد ہی فنا فی الشیخ کا رتبہ حاصل کر لیا۔ آپ کا طریق یہ تھا کہ یہ روزانہ ساہن پال (جہاں شیخ کی قیام گاہ تھی) سے شام کو اپنے گاؤں چلے آتے کہ کہیں وہاں قیام سے مجھ سے بے ادبی نہ ہو جائے دو سال یہی معمول رہا۔ امتحان کی ابتدائی منازل طے ہو گئیں تو شیخ نے ہر روز آنے کی تکلیف اٹھانے سے روک دیا اور آپ کو چھ مہینے اپنے پاس اور چھ مہینے اپنے گاؤں میں رہنے کا حکم دے دیا۔

آپ ریاضت نفس کے بڑے قائل تھے اور اسے نجات کا باعث سمجھتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ نفس کے ساتھ جہاد کرنا جہاد اکبر ہے۔ اسی عبادت و ریاضت کے سلسلہ میں آپ نے شیخ کی راہنمائی کی بدولت کئی چلے کاٹے اور تزکیہ نفس اور تربیت روحانی کے مراحل ایمانی سے گزرتے رہے۔ جب حضرت نوشہ گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کے عالم فانی سے کوچ کا وقت آیا تو انہوں نے سب مریدوں سے ان کی خواہشیں دریافت کیں۔ کسی نے مال و زر مانگا تو کسی نے دولت اور امیری مگر آپ نے عرض کیا کہ ”حضرت میری تو یہی خواہش ہے کہ مجھے قیامت کے روز اللہ تعالیٰ آپ کے قدموں میں اٹھائے“ آپ کا ساتھ بخشے اور امیری سے بچائے کیونکہ امیری سے آدمی سرکش ہو جاتا ہے میرے لئے وال روٹی ہی کافی ہے۔“ حضرت نوشہ گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اے عبدالرحمن جا تو نے سب کچھ لے لیا دنیا تیرے قدموں میں ہوگی اور تو اس کی پرواہ تک نہ کرے گا اور فقر کی شاخ کی خدمت کرے گا۔“

اپنے شیخ کامل کی وفات کے بعد آپ کچھ عرصہ بچہ چٹھہ میں رہے اور پھر تقریباً تیس سال کی عمر میں موجودہ گاؤں بھڑی شاہ رحمن تشریف لے آئے۔ آپ کے آنے سے پیشتر اس جگہ ایک شہر موسوم بہ اورنگ پور ڈھلہ تھا۔ یہ شہر زلزلے کی وجہ سے غرق ہو گیا۔ آپ کے اس جگہ پر قیام پذیر ہونے سے یہ ویران جگہ پھر بھڑی شاہ رحمن کے نام سے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے آباد ہو گئی۔

ان دنوں بھڑی شاہ رحمن میں ایک بزرگ سید محمود شاہ نامی رہا کرتے تھے۔ وہ اپنی والدہ کو کندھوں پر اٹھا کر جنگل میں پھرایا کرتے تھے۔ ایک بار وہ والدہ کو جنگل میں بٹھا کر دور چلے گئے کہ تاریک بادل اُمنڈ آئے۔ شاہ عبدالرحمن کا ادھر سے گزر ہوا تو ان کی والدہ کو بارش سے بچانے کیلئے محفوظ مقام پر لے آئے اور سردی سے بچانے کیلئے آگ روشن کر دی جب سید محمود شاہ اپنی والدہ کی تلاش میں وہاں پہنچے تو پہلے تو ناراض ہوئے اور پھر اپنی والدہ کی زبانی حضرت عبدالرحمن رحمۃ اللہ علیہ

کی خدمت گزاری کا پتہ چلا تو غصہ کا نور ہو گیا اور فرمایا کہ جو کچھ مجھے اللہ نے عطا کیا ہے وہ سب آپ کی نذر کرتا ہوں اور ہم چاروں بھائی بعد از مرگ بھی آپ کے چاروں طرف پہرا دیا کریں گے۔ چنانچہ آپ کے مزار کے مغرب میں سید محمود شاہ کا مزار ہے اور ان کے بقیہ تین بھائیوں کے مزارات باقی تین سمتوں میں ہیں۔

حضرت شاہ عبدالرحمن رحمۃ اللہ علیہ اگرچہ تارک الدنیا تھے مگر پھر بھی شریعت کے اہم فریضہ کی ادا یگی کیلئے دو مرتبہ شادی کی۔ آپ کی دوسری اہلیہ محترمہ سے تین صاحبزادیاں پیدا ہوئیں جن میں سے ایک کی شادی حضرت عبدالرحیم سے ہوئی جو آپ کے رشتہ دار تھے اور آپ ہی سے بیعت بھی تھے۔

ایک دن حضرت عبدالرحیم نے حضرت شاہ عبدالرحمن رحمۃ اللہ علیہ سے عرض کیا کہ حضرت آپ کے بعد کون آپ کے سلسلہ روحانی کو آگے بڑھائے گا تو حضرت شاہ عبدالرحمن رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ خداوند کریم آپ کو ایک نیک بخت فرزند عطا کریں گے جو ہمارے فقر کے سلسلہ کی توسیع کریں گے اور وہ درحقیقت دوئم عبدالرحمن ہوں گے۔ چنانچہ آپ کی دعا پوری ہوئی حضرت عبدالرحیم کو خدا نے تین بیٹے دیئے جن میں سے سب سے چھوٹے کا نام دولہا محمد زمان تھا یہی محمد زمان آگے چل کر اپنی عبادت و ریاضت زہد و تقویٰ اور فقر و استغناء کی بدولت دوئم عبدالرحمن مشہور ہوئے۔ حضرت محمد زمان اپنے والد سے بیعت تھے ابتدائی تعلیم کے بعد لاہور آ کر نیویں مسجد میں آپ نے درس حاصل کیا اور علوم ظاہری کی تکمیل کی۔ آپ کمال درجہ کے عالم تھے اور عالم بھی باعمل شریعت کے حامی اور اس پر سختی سے کار بند تھے۔ ان سے پہلے دربار شاہ رحمن رحمۃ اللہ علیہ کی کوئی زمین نہ تھی۔ آپ نے زمین خرید کر دربار کے نام وقف کی لنگر کا سلسلہ جاری کیا۔ حجرے تعمیر کروائے آپ فی الحقیقت دوئم عبدالرحمن تھے اور حضرت شاہ عبدالرحمن رحمۃ اللہ علیہ کا تمام سلسلہ روحانیت آپ ہی کی وجہ سے پھیلا اور آپ ہی نے سلسلہ قادریہ نوشاہیہ کی شاخ ڈالی اور اس سلسلہ کو پورے برصغیر پاک و ہند میں پھیلا دیا۔

حضرت شاہ عبدالرحمن رحمۃ اللہ علیہ اس دنیا میں زندگی کے لیل و نہار اللہ تعالیٰ کی مرضی میں گزار کر ۱۱۲۵ھ کو عالم فانی سے عالم بقا کو سدھارے۔ آپ کے روضہ کی اولین تعمیر برخوردار ہرل کے ہاتھوں ہوئی جو آپ کی بیعت سے شرف یاب ہونے سے قبل مغل فوج میں کسی اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ بادشاہ نے کسی کام پر خوش ہو کر انہیں انعام دینا چاہا تو برخوردار ہرل نے کہا کہ اگر آپ انعام دینا ہی چاہتے ہیں تو میرے پیشوا حضرت شاہ عبدالرحمن رحمۃ اللہ علیہ کا مزار پر انوار موضع بھڑکی

شاہ میں شاہی خزانہ سے تعمیر کروا دیجئے۔ چنانچہ شاہی خرچ پر یہ مزار آپ کی وفات کے تقریباً بارہ برس بعد تعمیر ہوا یہ مزار چھوٹی اینٹوں اور سیمنٹ سے اس خوبی سے بنایا گیا کہ خوبصورتی کے لحاظ سے اپنی مثال آپ تھا۔ اس مزار کو پھر دوبارہ سیمنٹ وغیرہ کیا گیا۔

تیسری دفعہ ۱۳۶۲ھ میں مزار پر سفید سنگ مرمر لگایا گیا۔ مزار کے اندر ایک آب شفا ہے جو کہ شاہجہان سلطان ہندوستان نے عرب سے منگوا کر دیا۔ نیز یاد رہے کہ آپ کو مقبرہ کے اندر ایک صندوق میں بند کر کے دفن کیا گیا ہے اور صندوق زنجیروں سے شک رہا ہے۔ پہل روضہ پر جانے کیلئے سات میٹھیوں سے گزرنا پڑتا تھا اور نیچے آپ کی قبر تک پہنچنے کیلئے ایک چھوٹا سا دروازہ تھا جس سے گزر کر صندوق کے پاس پہنچا جاتا تھا مگر اب اس دروازہ کو بند کر دیا گیا ہے اور میٹھیاں اب صرف تین رہ گئی ہیں اور باقی میٹھیاں زمین میں دب گئی ہیں۔

آپ کا مزار مرجع خلافت ہے۔ آپ کے عرس کے ایام میں لاکھوں عقیدت مند دور دراز کے شہروں سے حاضر ہوتے ہیں اور فیوض روحانی حاصل کرتے ہیں۔ آپ کے دربار کا تمام انتظام اب محکمہ اوقاف نے سنبھال رکھا ہے اور حکومت کی زیر نگرانی آپ کے عرس کی تقریبات پر وقار اور شایان شان طریقے سے منعقد کی جاتی ہیں۔



حضرت سائیں توکل شاہ انبالوی رحمۃ اللہ علیہ

توکل شاہ کے جلوؤں سے دل معمور دیکھا ہے
انہی کے فیض سے افکار کو پُر نور دیکھا ہے
تمام اقوال ان کے بزم ہستی کا ہیں آئینہ
انہی کے لطف سے ہر قلب کو مخمور دیکھا ہے
اماں ملتی ہے جن کو ایسے درویشوں کی چوکھٹ پر
سدا رنج و الم کو ہم نے ان سے دُور دیکھا ہے
خدا کے ذکر میں شاغل اسی کے نام پر واصل
خدائے پاک کی الفت میں ان کو پُور دیکھا ہے
ہمیشہ مشکلوں میں مسکراتے ان کو پایا ہے
پریشاں حالیوں میں ان کو ہی منصور دیکھا ہے
فنا فی اللہ ہو جانا سعادت ہی سعادت ہے
جو خواہش انکی ہو رب کو وہی منظور ہوتا ہے
رضا جو ان خدا والوں کا رستہ چھوڑ دیتا ہے
اسے بے راہ پایا اس کا دل بے نور دیکھا ہے

(محمد اکرم رضا)

درویش باخدا

حضرت سائیں توکل شاہ انبالوی رحمۃ اللہ علیہ

حضرت سائیں توکل شاہ انبالوی رحمۃ اللہ علیہ درویش خدا مست تھے۔ ہر حال میں خدا کی رضا پر راضی رہنے والے مجذوب صفت شخصیت تھے۔ بہت حد تک کوشش فرماتے کہ آپ کی شخصیت عوام الناس سے پوشیدہ رہے۔ طالبین خدمت میں حاضری دیتے تو کسی اور طرف بھیج دیتے لیکن خوشبو تو خوشبو ہوتی ہے اسے جتنا چھپاؤ گے اتنا ہی زیادہ اس کا ظہور ہوگا۔ یہی حال مشک و عنبر کا ہے جو اپنے وجود کے اظہار کیلئے کسی عطار کی توصیف کے محتاج نہیں ہوتے۔

۔ بزم ہستی میں چھپے گا کس سے حسن لا جواب

مشک اور عنبر کی خوشبو آپ ہے اپنا جواب

ویسے بھی اولیاء اللہ اپنی شان کے ظہور کیلئے سہاروں کے محتاج نہیں ہوتے، وہ تو معرفت الہی کے تمنائی ہوتے اور جب یہ دولت ان کا مقدر بن جاتی ہے تو ان کی خلوت بھی جلوت کا روپ اختیار کر لیتی ہے اور وہ جہاں بھی ہوتے ہیں زمانہ ان کے قدموں کے نقوش تلاش کرتا ہوا ان کی تلاش میں ہوتا ہے۔ مردِ خدا حضرت قبلہ سائیں توکل شاہ انبالوی رحمۃ اللہ علیہ بھی ایسے ہی مردِ روزگار کہ جن سے ایک دنیا نے فیض حاصل کیا۔

آپ موضع بکھو کے ضلع گورداسپور میں ۱۲۵۵ھ میں پیدا ہوئے۔ ابھی چھوٹی عمر ہی تھی کہ والدین کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ آپ کی پرورش آپ کے نانا جان نے کی، جن کا اسم گرامی جناب الہ دین شاہ مست تھا۔ حضرت الہ دین شاہ مست سلسلہ نوشاہیہ کے ایک بزرگ سے نسبت بیعت رکھتے تھے اور ان کی اجازت سے اسی سلسلہ کا فیض آگے کو پہنچا رہے تھے۔

حضرت سائیں توکل شاہ انبالوی کو بچپن ہی سے بزرگوں کی صحبت کا شوق دامن گیر تھا۔ اس جذبہ نے سن بلوغ سے پہلے ہی آپ کو ترک وطن پر مجبور کر دیا تھا۔ یہ جستجو نہ جانے کہاں کہاں لئے بھری، پھرتے پھرتے اجمیر شریف جا پہنچے۔ خانقاہ عالیہ میں ایک چشتی نظامی بزرگ قیام پذیر

تھے۔ ان پر محویت و استغراق کا یہ عالم تھا کہ صبح سے اپنے حجرے کا دروازہ بند کر کے ظہر تک مراقبے میں رہتے تھے حتیٰ کہ سماع میں بھی شریک نہ ہوتے آپ اکثر اوقات ان کی صحبت میں گزارتے۔ ایک روز اُس مرد خدا نے حضرت کو بطریق چشتیہ نفی اثبات کی تلقین فرمائی۔ آپ فرماتے ہیں اُسی وقت میرے قلب میں کلمہ شریف جاری ہو گیا اور عجیب کیفیت کا درود ہوا۔ نہ کچھ عرصہ بعد خواجہ غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے حکم ہوا کہ تم سلسلہ نقشبندیہ میں صاحب ارشاد ہو گے۔ تمہارا پیر پنجاب میں ہے وہاں چلے جاؤ۔ آپ تلاش مرشد میں واپس پنجاب آئے۔ راستہ میں ایک مجذوب ملا اُس نے کہا تم جہاں خیلاں چلے جاؤ۔ جب آپ جہاں خیلاں کے قریب پہنچے تو ایک مجذوبہ عورت نے کہا: آگے ہو آفتاب ہدایت غروب ہونے والا ہے جلدی سے اپنا حصہ لے لو۔ الغرض آپ شمس العرفان خواجہ قادر بخش رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ بوقت تلقین شیخ کامل نے مرید صادق سے فرمایا ”اکو واری یا کیاری کیاری“ آپ نے عرض کیا کہ ”اکو واری“۔ شیخ نے آپ کو اپنے سینہ مبارک سے لگایا اور نسبت نقشبندیہ کا القا کرتے ہوئے انوار و لطائف سبعہ اور فیوض اور واردات ولایت ثلاثہ سے مالا مال کر دیا۔ فیض کا اس قدر غلبہ ہوا کہ ناک سے خون بہنے لگا اور بے ہوش ہو گئے۔

ع..... نہ تو تو رہا نہ ہی میں رہا جو رہی سو بے خبری رہی

کچھ عرصہ شیخ کامل کی خدمت میں رہنے کے بعد شہر انبالہ رہنے کی اجازت ہو گئی۔ آپ انبالہ چلے آئے اور ہمیشہ کیلئے انبالہ شریف وطن مالوف بن گیا۔ البتہ گاہے گاہے شیخ کی خدمت میں حاضر ہوتے رہتے۔ کچھ عرصہ بعد حضرت شمس العرفان نے خلافت سے مشرف فرما کر منشا ارشاد پر بٹھا دیا۔ سائیں تو کل شاہ انبالوی خلافت کی حقیقت اور حیثیت سے آگاہ تھے۔ وہ کہتے تھے کہ دنیاوی جاہ پسندی زمانے کو متاثر کرنے کیلئے نہیں ہوتی بلکہ اس سے دلوں کو گداز اور روح کو بلندی پر واز عطا ہوتی ہے۔ خلافت چھینی نہیں جاتی، مال و دولت جاہ و حشمت سے عطا نہیں ہوتی اور جو خلافت کسی دنیا دار پیر کو اپنے عہدے اور رتبے سے متاثر کر کے عطا ہوتی ہے اس کا مقام و مرتبہ کچھ بھی نہیں ہوتا۔ وہ فقط ایک دھوکا ہے اور کتنا بد قسمت ہے وہ انسان جو تصوف کے راستے پر دھوکا دینا پسند کرے۔ ایسے ہی لوگ ہیں جن کیلئے کہا گیا ہے کہ دنیا و آخرت کے خسارے میں رہتے ہیں۔ جناب سید ظہور الدین اس بارے میں آپ کے خیالات کے حوالے سے کہا کرتے تھے کہ حضور اکثر فرمایا کرتے کہ خلافت آسمان سے خدا کی طرف سے آتی ہے۔ حضور کا ارشاد

ہے کہ ہم اپنے پیر و پیغمبر کے چہلم پر گئے۔ تمام خلفاء کی دستار بندی ہوئی مگر مجھے کسمن سمجھ کر دستاری بندی نہ کرائی گئی۔ میں اسی فکر میں جنگل کی طرف چلا گیا اور ذکر الہی میں مشغول ہو گیا۔ عالم سکرات میں دیکھا کہ ایک بہت بڑی لمبی دستار کا پتہ عرش سے میرے پاس آیا، آواز آئی اس کو باندھ لو۔ یہ دستار اللہ کی طرف سے آئی ہے، میں نے اُسے باندھنا شروع کر دیا۔ دستار اتنی لمبی تھی کہ میں اُسے باندھے گیا اور باندھتے باندھتے تھک گیا مگر وہ ختم نہ ہوئی۔

طریقت کی بنیاد ہی مجاہدہ پر ہے۔ جذب و محبت، سوز و گداز، پھر شیخ کامل کی نظر کیسیا اثر، مجاہدات و ریاضات آپ کا مزاج بن گیا تھا۔ آپ پر ہر وقت جذب طاری رہتا۔ علاوہ دیگر اوراد و مشاغل کے سلطان الاذکار کا اکثر مشغل رکھتے۔ تالاب میں غوطہ لگا کر جس دم کے ساتھ یہ مشغل کرتے اور دو دو گھنٹہ کے بعد سر نکالتے۔

درود شریف آپ کے وظائف میں امتیازی حیثیت رکھتا ہے، جس خوبی سے آپ نے نبھایا وہ آپ ہی کا حصہ تھا۔ اس ورد کے دوران کسی سے کلام نہ فرماتے، جب آپ درود شریف کا ورد فرماتے تو اپنے لب ہائے مبارک کو یوں ملا کر چوستے جیسے رس چوس رہے ہوں۔ پوچھنے پر فرمایا ”جب درود شریف پڑھتا ہوں تو منہ میں مٹھائی سی کھل جاتی ہے۔ متوسلین کو اس ورد کی تلقین فرماتے اور اکثر اس کے فضائل اور فوائد بتاتے۔“

اس عرشی دستار والے نے اپنے پیر و پیغمبر حضرت خواجہ قادر بخش قدس سرہ کے وصال کے بعد دیر تک سلسلہ بیعت جاری نہیں کیا۔ جو کوئی بیعت ہونے آتا، آپ اُسے حاجی محمود جالندھری رحمۃ اللہ علیہ سے یا اپنے پیر بھائی خلیفہ عالم شاہ رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت کرا دیتے اور اپنے پاس کسی کو نہ بیٹھنے دیتے اور نہ ہی اللہ کا نام بتاتے۔ پھر عالم کشف میں جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہوا اور سلسلہ جاری فرما دیا۔ پھر تو یہ خلون فی دین اللہ افواج کا منظر سامنے آ گیا۔ آپ کی صحبت میں عجیب اثر تھا، اپنوں کا تو کیا ذکر بیگانے بھی آپ کو دیکھتے تو بے ساختہ بول اُٹھتے کہ یہ ولی اللہ ہے۔ ایسے پاکیزہ قدسی نفوس اپنوں سے بڑھ کر بیگانوں کے محبوب بن جاتے ہیں۔ اسی لئے آپ کی ولایت مسلم اور غیر مسلم سب پر یکساں چھائی ہوئی تھی اور سب حسب مرتبہ مقصد کو پہنچتے۔

مصنف ”ذکر خیر“ خواجہ محبوب عالم قدس سرہ فرماتے ہیں ”حضور اکثر فرماتے کہ اب تو ہمارا ذریعہ ہی حقیقت محمدیہ میں ہو گیا۔“ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اتباع سنت میں آپ کا کیا مقام تھا اور یہ اعمال بلا تکلف آپ سے صادر ہوتے اور زندگی کا ہر شعبہ سنت نبوی کا نمونہ تھا۔ عمر بھر میں

آپ ایک چپہ زمین کے مالک نہ بنے۔ فرماتے کہ یہ فساد کی جڑ ہے۔ پلنگ پر کبھی آرام نہ فرمایا۔ فرماتے دو جہاں کے سردار تو زمین پر بستر کریں اور ہم پلنگوں پر آرام کریں۔ فرماتے اتباع سنت کی بناء پر نکاح بھی کیا ہے ورنہ اس کا خیال تک بھی نہ تھا، حجرہ شریف کچا ہی رہا، بجائے دری یا قالین کے کسیر کا گھاس بچھا رہا۔

جیسا کہ ہم کئی مقامات پر تحریر کر چکے ہیں کہ ان اللہ والوں کے اقوال آب زر سے لکھنے کے قابل ہوتے ہیں۔ یہ عام آدمی کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ نہیں ہوتے بلکہ یہ کسی مرد کامل کی عمر کا حاصل ہوتے ہیں۔ ان اقوال میں ان کا روحانی مشاہدہ اور عرفانی تجربہ شامل ہوتا ہے۔ اس حوالے سے آپ کے چند اقوال ملاحظہ کیجئے۔

۱۔ فرمایا: علم ظاہر کے بغیر فقر میں قدم رکھنا گمراہی ہے۔ رہا علم لدنی سو یہ محض خدا کا فضل اور انعام ہے جو ہر کسی کا حصہ نہیں۔

۲۔ ایک روز حیات و ممات کے مسئلہ میں گفتگو ہو رہی تھی کہ ایک شخص نے عرض کیا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوا اور مدینہ منورہ میں مدفون ہیں لیکن ہم سنتے آ رہے ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم حیات النبی ہیں۔ اس حیات کے کیا معنی ہیں۔ حضور رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا کہ بے شک حضور صلی اللہ علیہ وسلم واقعی حیات النبی ہیں۔ حیات کے یہ معنی ہیں کہ جیسے تصرفات و اختیارات حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بوقت حیات ظاہری جاری تھے وہ اب روح مبارک صلی اللہ علیہ وسلم سے بدستور جاری ہیں۔ پھر فرمایا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان تو بہت ہی اعلیٰ ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے تمام اولیاء اللہ بھی زندہ ہیں۔ ان کی قبور میں ان کی ارواح سے فیض جاری ہے۔

۳۔ تصور شیخ کا تذکرہ تھا، کسی نے کہا کہ تصور شیخ کو علما نے شرک لکھا ہے۔ حضرت علیہ الرحمۃ نے فرمایا کہ پتھر کا بت ہو یا تصویر وغیرہ وہ سب مصنوع انسان ہیں، ان کا تصور کرنا عین شرک ہے اور بے حاصل ہے مگر مرشد خاص خداوند تعالیٰ کی صنعت ہے اس کا تصور شرک نہیں ہو سکتا۔

۴۔ ارواح بزرگان کو ایصالِ ثواب کے بارہ میں آپ نے فرمایا ”ایک دفعہ ہم نے اپنے خواجہ صاحب کا ختم دلایا اور رکابیوں میں کھانا ڈال کر سب کے سامنے جن کر ان پر فاتحہ کہلائی تو بحالت مکاففہ یہ کیفیت دیکھی کہ ان رکابیوں کی نوری شکل بن گئی ہے۔ طعام سے بھری ہوئی وہ نوری شکل کی رکابیاں آسمان پر چڑھ رہی ہیں۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد دیکھا کہ آسمان سے بھری ہوئی وہی نوری شکل

کی رکابیاں اتر کر حضرت خواجہ صاحب کی قبر پر جا رہی ہیں۔ پھر فرمایا: ”مرنے کے بعد بدن کو غذا کی ضرورت نہیں رہتی کیونکہ وہ فنا ہو جاتا ہے البتہ روح کو غذا کی ضرورت ہے اور چونکہ یہ دنیاوی کھانے روح کی غذا نہیں بن سکتے۔ اس لئے ضروری ہوا کہ ان کھانوں کو نور سے بدلا جائے اور نور سے بدلنے کا یہی طریقہ ہے۔“

اس کائنات میں ہر چیز فانی ہے۔ بڑے بڑے مصلحین، روحانی شخصیات، مدبرین کو بالآخر اس کائنات سے چلنا ہی ہوتا ہے لیکن عام لوگوں اور ان مردان خدا میں یہ امتیاز ہوتا ہے عام لوگوں کے جانے کے بعد ان کا نام بہت جلد دنیا والوں کے دلوں سے محو ہو جاتا ہے مگر ان مردان حق کا پیغام اور کام شام ابد تک زندہ رہتا ہے۔ یہ خدا کے ہو کر زندہ رہتے ہیں اور خدا اپنے پیاروں کا نام نامی کبھی مٹنے نہیں دیتا۔ ان کا جانا اس شان سے ہوتا ہے کہ:

عرش پر دھو میں مچیں وہ مومن و صالح ملا

فرش سے ماتم اٹھے وہ طیب و طاہر گیا

آخر عمر حضور (رحمۃ اللہ علیہ) کو طرح طرح کی بیماریاں لاحق ہوئیں۔ حضور رحمۃ اللہ علیہ کی عمر اٹھاون سال کی ہوئی تو قرب و وصال کی باتیں کرنے لگے۔ چنانچہ ۱۳۱۳ھ میں فرمایا ”اب ساڈا وقت نیڑے آ گیا اے“ ہم نے دیکھا کہ ہماری روح سبز کا ہی کا عمامہ باندھے بدن سے جدا تیار بیٹھی ہے۔ ۱۳۱۵ھ تک مرض بڑھتا ہی رہا۔ آپ اکثر دعا میں فرماتے ”خدا یا مجھے شہادت کی موت عطا فرما“۔ یہ اسی دعا کی برکت تھی کہ وصال سے ایک ماہ قبل اسہال کبدی شروع ہو گئے۔ دوا پیتے ہوئے فرماتے کہ ہم صرف سنت سمجھ کر دوا پی رہے ہیں۔ آخر نہ ٹلنے والی گھڑی آن پہنچی۔ ۴ ربیع الاول ۱۳۱۵ھ چہار شنبہ کا دن تھا۔ آپ نے فجر کی نماز اول وقت چار پائی پر لیٹے ہوئے اشارہ سے باجماعت ادا کی۔ یہ آپ کی آخری نماز تھی، کرب و بے چینی برابر بڑھتی جا رہی تھی۔ کبھی اٹھتے اور کبھی لیٹ جاتے۔ آخر میں شہد کا شربت نوش فرمایا اور پوچھا کیا وقت نماز ہے۔ عرض کیا گیا نہیں۔ فرمایا وقت مراقبہ تو ہے۔ عرض کیا گیا ہاں۔ یہ سن کر دو زانو تشریف فرما ہوئے۔ دس بجے دن کا وقت تھا کہ جس دم کے ساتھ سلطان الاذکار شروع کیا۔ دو دفعہ جس دم کر کے سانس لیا۔ تیسری دفعہ جس دم کیا تو روح اعلیٰ علیین پرواز کر گئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ۵

آپ کے خلفاء اور مریدین کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اختصار کے مد نظر صرف چار خلفاء کا ذکر کیا جاتا ہے۔

- ۱۔ خلیفہ اعظم حضرت خواجہ محبوب عالم قدس سرہ (مزار سید الشریف ضلع گجرات) وفات ۲۱ رمضان المبارک ۱۳۳۵ھ بمطابق ۱۹۱۷ء
- ۲۔ حضرت خلیفہ حاجی مظفر علی خاں مراد آبادی (مزار شہر حصار بھارت) ۹۱ برس کی عمر میں وصال ہوا۔ ۲۳ جمادی الاول ۱۳۳۸ھ بمطابق ۱۹۲۰ء
- ۳۔ حضرت سائیں عبدالکریم شاہ صاحب اپنے پیر و مرشد کے در پاک کے عین سامنے آسودہ خاک ہیں۔
- ۴۔ حضرت خلیفہ میر یوسف علی شاہ دہلوی (مزار اقدس انبالہ شریف) خدائے کریم کی لاکھوں رحمتیں ہوں اس مرد قلندر پر جو آج اپنے مزار پر انوار میں آسودہ لحد ہے مگر جس کی روحانی تجلیات اب بھی بے شمار دلوں کو فکر و عمل کی روشنی سے صوبار کر رہی ہیں۔



شیر ربانی میاں شیر محمد شرقپوری رحمۃ اللہ علیہ

بہار بے خزاں ہے گلستاں شیر محمد کا
پیام زندگی ہے آستان شیر محمد کا
میاں شیر محمد قطب عالم شیر یزدانی
ہے دریائے کرم ہر سو رواں شیر محمد کا
پو دو گھونٹ تم بھی چشمہ رحمت کے متوالو
کہ ہے زوروں پہ لطف بے کراں شیر محمد کا
دلوں نے روشنی لی آپ کے افکار عالی سے
چراغ معرفت ہے ضوفشاں شیر محمد کا
وہ شاہ شرقپور مرد یقین قذیل برہانی
فروع دین ہے حسن بیان شیر محمد کا
جہان نقشبندیت کا اس کو حکمران کہیے
دلوں پر راج ہے اب بے گماں شیر محمد کا
غلامان مجدد کے لئے وہ نازش عالم
بہر انداز ہے رتبہ عیاں شیر محمد کا
نزالی زندگی پھر سے رضا اسلام نے پائی
اڑا جب پرچم عالی نشان شیر محمد کا

(محمد اکرم رضا)

شیر ربانی حضرت میاں شیر محمد شرقپوری رحمۃ اللہ علیہ

حضرت میاں شیر محمد شرقپوری رحمۃ اللہ علیہ انتہائی خوش قسمت انسان تھے جنہوں نے تعلیمات قرآن کے نور سے بے شمار دلوں میں اجالا کر دیا۔ بے شمار دلوں میں اس شان سے نقشبندی کے حوالے سے پابندی شریعت کو فروغ دیا کہ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے روشن دور کی یاد تازہ ہو گئی۔ آپ نے خلفائے کرام کا ایک ایسا گروہ پیدا کیا جس نے برصغیر پاک و ہند میں سلسلہ نقشبندی کے فروغ کے لئے اہم کردار ادا کیا۔ آپ کو ”شیر ربانی“ کہا جاتا ہے کیونکہ کلمہ حق آپ کا شعار تھا اور آپ اس سلسلہ میں کسی مصلحت یا رعایت کے قائل نہیں تھے۔

یہی حسن صداقت جہاں میں نور پھیلاؤ

شریعت کے علم کو دہر میں ہر سمت لہراؤ

آپ 1865ء میں بمقام شرقپور شریف حضرت میاں عزیز الدین کے گھر پیدا ہوئے۔ آغاز ہی سے نہایت متقی اور پرہیزگار تھے۔ سکول میں بھی ظاہری علوم سے زیادہ روحانی علوم پر توجہ مائل تھی۔ خوش نویسی کی مشق کی اور اپنے چچا حافظ حمید الدین سے فارسی کی کتب پڑھیں۔ نقشبندی سلسلہ میں آپ نے حضرت خواجہ امام علی شاہ مکان شریف کے خلیفہ حضرت خواجہ امیر الدین کوٹلہ شریف والوں سے بیعت کی۔ بیعت کے ساتھ ہی آپ پر بے قراری، اضطراب اور استغراق کا جذبہ طاری ہو گیا۔ مسجدوں کے دروازوں پر کھڑے ہو جاتے اور رب کریم کو آوازیں دے دے کر پکارتے۔ آپ نے اشاعت اسلام کے لئے ہوشیار پور، دیپال پور، حجرہ شاہ مقیم، مکان شریف، کوٹلہ شریف، فیروز پور، لاہور، بیربل شریف، کشمیر، پانی پت، کلیر شریف، شاہ پور، امرتسر، ملتان، اور سرہند شریف سمیت درجنوں مقامات کے سفر کئے۔ درجنوں شیوخ اور بزرگان دین سے اکتساب فیض روحانی کیا اور بے شمار لوگ آپ کے الفاظ کی تاثیر سے راہ حق پر گامزن ہوئے۔ لاہور سے آپ کو خصوصی پیار تھا۔ صاحبزادہ محمد عمر بیربلوی و ”انقلاب الحقیقت“ میں لکھتے ہیں کہ لاہور کے عوام میں آپ کا تذکرہ اور آپ کے حالات بہت سنے ہیں۔ لاہور میں آپ کے بہت ڈیرے اور مقام تھے جن میں آپ

ارادت مندوں سے ملاقات کے لئے قیام فرما ہوتے۔ لاہور میں درج ذیل بزرگوں سے آپ کے خصوصی تعلقات تھے۔ حضرت آغا شاہ جو حضرت شاہ محمد غوث کی اولاد سے تھے۔ حضرت سید میر جان کابلی نقشبندی، حضرت خواجہ غلام مرتضیٰ لاہوری، حضرت مولانا غلام محمد بھیروی اکثر جمعرات اور جمعہ کو آپ کے ارشادات سننے کے لئے حاضری دیتے۔

نام سید ذوالفقار حسین تھا، مولانا یار محمد سہارن پوری چشتی صابری سے بیعت تھے۔ حضرت میاں صاحب شرپوری سے والہانہ عقیدت رکھتے تھے۔ حضرت میاں صاحب شرپوری کے متعلق آپ جب سنتے کہ وہ لاہور میں کہیں آئے ہیں تو آپ فوراً حاضری دیتے۔ شرپور شریف بھی حاضر ہوتے۔ مولانا مظفر شرپور شریف میں واقع حضرت میاں صاحب کی کچی رہائش گاہ کا ذکر کرتے ہوئے اکثر اشکبار ہو جاتے اور فرمایا کرتے کہ درویشوں کی طرح ہی رہنا چاہیے جس طرح حضرت میاں صاحب اپنی زندگی بسر کرتے ہیں۔

حافظ فتح محمد اچھروی المتوفی ۱۹۱۶ء

حضرت میاں صاحب شرپوری لاہور میں کثرت سے آپ کے پاس آیا کرتے تھے اور آپ سے مخلصانہ محبت رکھتے تھے، اچھرہ میں جامعہ فتحیہ آپ کے نام سے ہی قائم ہے۔

علامہ ڈاکٹر محمد اقبال لاہوری المتوفی ۱۹۳۸ء

حکیم الامت علامہ محمد اقبال بھی آپ کی خدمت میں شرپور شریف حاضر ہوتے تھے۔ تفصیل ”ذکر اقبال“ مؤلف عبدالمجید سالک اور ”حیات اقبال“ تاج کمپنی میں دیکھی جاسکتی ہے۔ علامہ ڈاکٹر محمد اقبال کے ساتھ میاں محمد شفیع، میاں فضل حسین اور ایک اور صاحب شرپور گئے تھے۔

علامہ اصغر علی روحی لاہوری المتوفی ۱۹۵۴ء

پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور تھے، آپ اکثر حضرت میاں صاحب کی خدمت اقدس میں حاضری دیا کرتے تھے۔

حافظ فخر الدین لاہوری

آپ مسجد حضرت شاہ محمد غوث قادری لاہوری کے امام تھے، حضرت میاں صاحب آپ کی تدارک میں نماز ادا کرتے۔

مزید برآں حضرت میاں شہاب الدین قادری، حضرت شاہ ابوالخیر نقشبندی، حضرت شیخ ابراہیم جیلانی بغدادی (اولاد حضرت غوث الاعظم)

آپ پر حضرت داتا گنج بخش کی خصوصی نظر کرم تھی۔ میاں صاحب خود فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ حضرت داتا گنج بخش کے مرقد منور کے پاس سے گزر رہا تھا کہ درگاہ سے ایک آواز آئی۔ میں نے کہا جو کچھ دینا ہے میرے پیچھے پیچھے دیجئے چنانچہ آپ کی نسبت میرے ساتھ چلی آئی۔ نواب رام پور، میاں محمد شفیع، خان بہادر کرنل ڈاکٹر محمد یوسف، میاں افتخار، میاں قمر الدین اجمیری جیسے لوگ آپ کی خدمت میں حاضری دیتے۔

حضرت میاں محمد اسماعیل کرمانوالے فرماتے ہیں کہ حضرت میاں صاحب شرقپوری کا ارشاد تھا کہ آپ کے ہاتھوں اللہ کریم لاہور میں ایک مسجد آباد کرائیں گے اور مسجد نور مغلوپورہ لاہور آباد ہوئی۔ یہ وہ مسجد ہے جو ویرانگی کی حالت میں تھی اور جس میں حضرت خواجہ محمد باقی باللہ نقشبندی دہلوی، امام ربانی، حضرت مجدد الف ثانی اور حضرت سائیں توکل شاہ انبالوی نے نمازیں ادا کی تھیں۔

آپ سنت نبوی پر اتنی سختی سے عمل کرتے اور کراتے تھے کہ باید و شاید اپنی مجلس میں کسی داڑھی منڈوانے والے کو کچھ سنانے کے لئے کھڑا نہ ہونے دیتے۔ نماز کے وقت پہلی صف میں داڑھی منڈوانے والے کو کھڑا نہ ہونے دیا جاتا خواہ وہ کس قدر امیر ہی کیوں نہ ہو۔ ساری عمر رسول اکرم ﷺ کے نقش قدم پر چلتے رہے اور اتباع سنت کی مکمل تعمیل کرتے رہے۔ پابندی شریعت پر آپ بہت زور دیتے تھے فرمایا کرتے تھے کہ شریعت کی پابندی نماز، روزہ کے فرائض کی تکمیل ہی نہیں، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ حسن معاملہ بھی لازمی ہے۔ حضرت میاں صاحب جلال و جمال کی ہر دو صفات کمال سے آراستہ تھے۔ حضور نبی کریم ﷺ کے عشق میں غرق رہتے تھے۔ اگر کسی کو سنت کے خلاف کام کرتے دیکھتے تو فوراً تنبیہ فرماتے۔ انگریزی بود و باش اور طرز معاشرت کے شدید مخالف تھے۔ مروجہ تصوف کے بھی خلاف تھے جس میں بے عمل صوفی شامل ہوتے۔ اگر کوئی شخص حاجت روائی کے لئے آتا تو فرماتے کہ تم میرے پاس کس لئے آتے ہو نماز، بیخگانہ باقاعدگی سے ادا کر لیا کرو۔ اگر کوئی نمازی ہوتا تو اسے تہجد ادا کرنے کی تلقین فرماتے۔ حق گوئی میں شمشیر برہنہ تھے۔ انگریزی تہذیب کے دلدادہ یا کالجوں اور دفاتر کے جو اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات ہوتے ان سے بر ملا اسلام کی حقانیت بیان فرماتے۔ معاشرتی برائیوں کے انسداد کے لئے بے پایاں خدمات سرانجام دیں، بلکہ آپ نے ان کو ختم کرنے کے لئے جہاد کیا۔ جو لوگ حاضر ہوتے ان کو سماجی برائیوں سے

اجتناب برتنے کی ترغیب دیتے نذرانوں سے نفرت کرتے تھے۔ دسترخوان نہایت وسیع تھا۔ نہایت متواضع، راست گو، خوش خلق اور سلیم الطبع تھے، سادہ لباس زیب تن فرماتے۔

اللہ اللہ کرنے کا شوق تو حضور کو بچپن سے تھا اور تعلیم کے زمانے میں فارغ وقت گوشہ مسجد میں اللہ اللہ کرنے میں گزارتے۔ اور رقت طبیعت میں اس قدر تھی کہ محبوب حقیقی کی یاد میں رونا گویا آپ کی گھٹی میں تھا۔ طبیعت کے اس زور نے وجد و ذوق کی ایسی حالت پیدا کر لی کہ زمانہ تربیت میں حضور کی طبیعت کا یہ خاصہ بن گیا اور معمولی سے وعیہ سے طبیعت بے قابو ہو جاتی اور وجد طاری ہو جاتا۔ آپ نے اپنے پیرو مرشد کی خدمت میں کثرت سے حاضری دی اور گاہے گاہے حضرت بابا امیر الدین بھی شرفیور شریف تشریف لاتے اور آتش محبت کو اور بھڑکاتے۔ مادر زاد اولیاء اللہ کو بھی ظاہری رسوم سے گزرنا پڑتا ہے حضرت میاں صاحب نے جذب باطن اور سلوک الی اللہ دونوں منازل طے کر لیں تو حضرت مرشد نے اجازت طریقت عنایت فرمائی اور سلسلہ کی ذمہ داریاں آپ کے سپرد فرمائیں۔

آپ خود تو مادر زاد ولی اللہ تھے جذب و سلوک کے دونوں شہر آپ صنایع قدرت سے بنوا کر لائے تھے لیکن آپ جب تربیت کی مسند پر بیٹھے تو ہزاروں کی بگڑی بنا دی۔ مجرم جرم سے لتھڑے آتے اور نور کا لباس پہن کر جاتے۔ ایک ہی نظر میں دل کے سارے کھوٹ ڈھل جاتے اور بندہ اپنی حقیقت بندگی سے آشنا ہو جاتا۔

حاجی فضل احمد مدیر ماہنامہ سلسبیل آپ کے حوالے سے لکھتے ہیں

گستاخ اور بے باک آنکھیں آتیں اور حیا سے بھرپور ہو کر جاتیں۔ سنگ دل اپنی سنگ دلی کے پھر لاتے اور آنسوؤں کے موتیوں کی جھولیاں بھر بھر لے جاتے۔ غافل اپنی غفلت کے نشے سے چور مجبور و بے نصیب ہو کر آتے اور ذکر و فکر کے آسمانی نغمے زبان حال و قال سے الاپتے جاتے اور ایک دفعہ تو ایسے دھل جاتے کہ گویا مدینہ رسول سے ہو کر آئے ہیں اور رسالت کے نور کی تازہ شعائیں اپنے سینوں میں بھر لائے ہیں۔

حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: □ من احياء سنتی عند فساد امتی لہ اجر مائة شهید (جس نے میری سنت کو اس وقت زندہ کیا جب امت فتنہ و فساد کی نذر ہوگی اس کے لئے ایک سو شہید کا ثواب ہے)

حضرت میاں صاحب کو سنت رسول اکرم سے عشق تھا۔ آپ کی عادات و اطوار حرکات

وسکنت، سنت کا عین عکس تھیں۔ گفتار، رفتار، لباس، پوشاک، کھانے پینے میں سنت کی خوشبو آتی تھی اور سنت کا نقشہ ہر مقام پہ دیکھنا پسند فرماتے تھے۔ خلاف سنت امور سے آپ کو سخت نفرت تھی اپنے والہانہ جذبہ محبت سے اور عشق رسالت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک ایسا ذوق شوق اور ایسا سوز و درد اور ایسی اتباع کامل کا ماحول پیدا ہو گیا تھا کہ شرقپور شریف آنے جانے والے اور حضرت اقدس سے تعلق رکھنے والے چہرے اپنی مثال آپ تھے۔ نور کی تصویریں آسمانی ڈھانچوں میں ڈھل کر زمین پہ اتری تھیں، سفید لباس، ٹوپی اور دستار باوقار وجود کم بولنے والے اپنی غرض سے غرض رکھنے والے سینکڑوں نہیں ہزاروں بلکہ لاکھوں مقبولان بارگاہ الہی پنجاب کے گوشے گوشے میں پھیلے ہوئے تھے۔ شرقپور شریف کا سکہ اتنا مقبول و معروف تھا کہ کوئی نگاہ مغالطہ نہ کھاتی تھی اور اس فیض میں گندھے ہوئے اثر کی پائیداری کا اندازہ اس سے لگائیں کہ بہار کے ان موسموں کو گزرے ہوئے بھی سالہا سال ہو گئے لیکن عرس مبارک کے اجتماع کو ایک نظر دیکھ جائیں۔ ایسا عجب نقشہ کہیں ڈھونڈے نہیں ملتا۔ سنت کے مطابق داڑھیاں، نور سے بھرپور چہرے خندہ پیشانیاں، اطاعت کا رنگ لئے ہوئے برکت بھرے وجود ادھر ادھر نظر آئیں گے اور موسم گل کی یاد آنکھوں کو دکھلائیں گے۔

چونکہ گل رفت و گلستان شد خراب بوئے گل را از کہ جویم از گلاب
تربیت روحانی میں آپ کو یدِ طولیٰ حاصل تھا اور آپ کا کوئی وارخطا نہ جاتا تھا۔ عوام کو اپنی زبان سے کچھ فرماتے تھے اور باتوں ہی باتوں میں دنیا کا نقشہ بدل جاتا۔ ساری دنیا فنا ہی فنا نظر آتی، لامذہبی کی جگہ مذہب اپنا نورانی چہرے دکھاتا۔ رسوم بد کی حقیقت آنکھوں کے سامنے آ جاتی۔ آپ کو دولت دنیا سے محبت نہ تھی اور دولت کو خدا سے دور ہونے کا ذریعہ سمجھتے۔ آپ سمجھایا کرتے کہ فقر و درویشی ہمارا سرمایہ ہے اور اگر ہم اس سرمایہ کو چھوڑ کر مال و دولت اور حرص میں کھو گئے تو پھر نہ ہم دین کے رہیں گے اور نہ ہی دنیا میں اعزاز و سر بلندی حاصل کر سکتے ہیں۔ انگریزوں اور انگریزی تہذیب و تمدن سے نفرت کرتے۔ مسلمانوں کو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اسوہ حسنہ پر عمل پیرا ہونے کی تلقین فرماتے۔ باطل قوتوں سے نفرت فرماتے اور اہل ایمان کو بھی شیطانی شر سے بچنے کی تلقین فرماتے اور آپ کے فرمودات کا مفہوم کچھ یوں تھا۔

باطل دوتی پسند ہے حق لاشریک ہے

شرکت میاں حق و باطل نہ کر قبول

مجلس شریف میں اکثر موجودہ تمدن کی حقیقت ظاہر فرماتے کہ پیسوں کے بتوں نے ہمارے

اندر بھی بت پیدا کر دیئے ہیں۔ (دنیا کی محبت ہر برائی کی جڑ ہے) انگریزی کلون نے ہمیں تباہ کر دیا وغیرہ وغیرہ تاثر اور روحانیت سے بھرے بھرے الفاظ سن کر آنکھیں برس پڑتیں اور دنیا کی حقیقت سامنے آ جاتی۔ کبھی اپنا دست شفقت طالب کے جسم پر رکھتے اور برقی لہریں سائل کو گھیر لیتیں۔ ظاہر و باطن کا سارا نقشہ فی الفور بدل جاتا۔

خواص کے لئے اکثر آپ یہ مبارک عمل فرماتے کہ طالب علم کے زانو پر ہاتھ رکھا اور مراقبانہ صورت میں ہو گئے۔ آپ کے وجود سے روحانی لہریں اٹھتیں اور ہاتھ مبارک کو آہستہ آہستہ جھکے لگتے اور دل کے یہ جذب معمول کے رگ وریشہ میں اتر جاتے۔

مجدد طریقت، غوث زمان، جذب و سلوک کے مجمع البحرین حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تربیت عمومی کے نشانات تو شرق و غرب میں پھیلے ہوئے تھے لیکن خلافت اور جانشینی کا مرتبہ تو ذلك فضل الله يؤتيه من يشاء والله ذو الفضل العظيم کے مصداق خاص الخاص موہبت ربانی ہے جس کو چاہیں نواز دیں۔

حضرت اعلیٰ غوث زمان میاں صاحب نے باغ جہاں میں آ کر عجب بوٹے لگائے۔ فیض کے دریا بہائے اور سنت سید الانام صلی اللہ علیہ وسلم کو زندہ کیا۔ 65 سال کی عمر تھی کہ آپ بیمار ہوئے اور چھ جمعے کمزوری کی وجہ سے مسجد میں نہ آ سکے۔ غلامان کو اس حال میں بھی باریابی ہوتی تھی۔ وعظ تلقین، ذکر و فکر اور دعا و نصیحت فرماتے تھے بعض اطباء نے تبدیلی ہوا کے لئے سفر کشمیر کا مشورہ دیا۔ آپ کشمیر تشریف لے گئے تین روز وہاں ٹھہرے پھر واپس تشریف لائے۔ طبیعت زیادہ علیل ہو گئی۔ لاہور علاج کے لئے لایا گیا لیکن اس محبوب الہی کے لئے عالم لاہوت میں جانا اس عالم ناسوت کی رہائش سے زیادہ ضروری قرار پایا اور عرش کی فضاؤں میں پرواز کرنے والے شہباز کے لئے اپنی خاص فضا میں مقرر ہو گئیں۔

تین ریح الاول 1347ء دو شنبہ کا دن تھا، شام کے پانچ بجے سکرات کے آثار ہو گئے اور رات کے ساڑھے دس بجے اللہ کا یہ محبوب اور اللہ کا یہ عاشق زار اپنے محبوب کے وصال سے سرفراز ہوا اور اپنے حقیقی وطن میں جا اقامت گزیرا ہوا۔

انا لله وانا اليه راجعون

ولی اللہ کی موت، موت نہیں ہوتی، یہ محبوب حقیقی سے وصال کا ایک ذریعہ ہے۔ الموت جسیر یوصل العیب الی المعجب (موت ایک پل ہے جو ایک دوست کو دوسرے دوست سے

ملا دیتا ہے۔)

رات کے وقت حضور رحمۃ اللہ علیہ کو غسل دیا گیا، صبح آپ کا جنازہ اٹھایا گیا سات ہزار کے قریب مخلصین نے جنازہ میں شرکت کا شرف حاصل کیا۔

حضرت صاحبزادہ محمد مظہر قیوم صاحب نے نماز جنازہ پڑھائی۔ ساڑھے چھ بجے شام حضور کو لحد مبارک میں اتار دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ آپ کی روح مبارک پر کروڑوں رحمتیں برسائے۔

آپ نے اپنے مریدوں کی اس طرح تربیت فرمائی کہ محبت رسول اور اوصاف اولیاء کا اعلیٰ ترین نمونہ بن گئے۔ خصوصاً آپ کے خلفا اور جانشینوں کا کیا کہنا جنہوں نے آپ کے حلقہ تربیت میں بیٹھ کر محبت خدا و رسول ﷺ کے آداب سیکھے اور آپ کے بعد اپنے مواعظ، تقاریر، خطبات اور مجالس کے ذریعہ آپ کے پیغام کو زندہ رکھتے رہے۔ آپ کے خلفائے گرامی میں سے چند کے نام یہ ہیں۔

حضرت ثانی میاں غلام اللہ شرقپوری المتوفی ۱۹۵۷ء

حضرت سید محمد اسماعیل شاہ کرمانوالہ شریف المتوفی ۱۹۶۶ء

حضرت سید نور الحسن شاہ کیلیانوالہ شریف المتوفی ۱۹۵۲ء

حضرت صاحبزادہ محمد عمر پیرل شریف ضلع سرگودھا المتوفی ۱۹۶۷ء

حضرت صاحبزادہ سید مظہر قیوم مکان شریف المتوفی ۱۹۳۳ء

حضرت میاں رحمت علی گھنگ شریف المتوفی ۱۹۷۰ء

ابوالرضا سید حاکم علی لاہوری المتوفی ۱۹۴۰ء

آپ کا روضہ مبارک شرقپور شریف میں ہے جو مرجع خاص و عام ہے۔ عرس مبارک ہر سال یکم، دوم، سوم ربیع الاول کو نہایت تزک و احتشام سے منعقد ہوتا ہے جس میں پاکستان کے گوشہ گوشہ سے لاکھوں عقیدت مند شرکت کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔ یہ خانقاہ عالیہ پنجاب کی عظیم ترین خانقاہوں میں سے ایک ہے۔

آپ کے بعد ثانی لاٹانی حضرت میاں غلام اللہ سجادہ نشین مقرر ہوئے جنہوں نے اپنے مرشد اعلیٰ کی تعلیمات اور پیغامات کو عام کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ آپ کا فیض روحانی ایک عرصہ تک دلوں کو عقیدت آشنا کرتا رہا۔ آپ کے بعد آپ کے صاحبزادگان حضرت میاں غلام احمد اور حضرت میاں صاحبزادہ جمیل احمد نے آپ کے پیغام کو جاری رکھا۔ خصوصاً سجادہ نشین حضرت میاں جمیل احمد کی ادبی، علمی، روحانی، نظریاتی خدمات آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں۔ آپ نے

درجنوں کتب شائع کیں۔ رسائل و جرائد کا سلسلہ جاری کیا۔ یہ کتب اور رسائل و جرائد آپ کی وساطت سے حضرت شیر ربانی کے افکار کو عام کر رہے ہیں اور کرتے رہیں گے۔ (انشاء اللہ)

بادشاہوں سے مراتب میں سوا دریاں تیرا
کیما سے بھی فزوں تیرے درکی خاک ہے
غیرت کحل البصر ہے خاک پاک آستان
آنکھ میں رکھنے کے قابل ہر خس و خاشاک ہے



حضرت شاہ محمد اسماعیل بخاری رحمۃ اللہ علیہ

رنج ہستی کا مداوا شاہ اسماعیل ہیں
رحمت خالق کا دریا شاہ اسماعیل ہیں
پیشوائے مقبلاں ہیں رہنمائے اولیاء
گلشن حق جن سے مہکا شاہ اسماعیل ہیں
زندگی ان کی تھی تنویر شہ ہر دوسرا
ابر لطف و جود چھایا شاہ اسماعیل ہیں
ان کا ہر انداز تھا تبلیغ دین مصطفیٰ
دین حق کا ہر تقاضا شاہ اسماعیل ہیں
نقشبندیہ کی تعلیمات حق کا بے گماں
ایک بحر نور اٹھا شاہ اسماعیل ہیں
روح کی تسکین اور دل کی تسلی کیلئے
دہر نے ہے جس کو مانا شاہ اسماعیل ہیں
اے رضا راہ یقین میں کامرانی کیلئے
رہنما ہے جن کو سمجھا شاہ اسماعیل ہیں

(محمد اکرم رضا)

راہِ حق کا مسافر

حضرت سید محمد اسماعیل شاہ بخاری

کرمانوالہ شریف رحمۃ اللہ علیہ

آستانہ عالیہ کرمانوالہ شریف کے تاجدارِ فخر سادات حضرت سید محمد اسماعیل شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ شیر ربانی میاں شیر محمد شر قپوری کے انتہائی مقبول مرید اور محبت خاص تھے۔ کہتے ہیں زمین جس قدر نرم ہو بارانِ رحمت کا اثر اتنا ہی زیادہ ہوتا ہے۔ کوئی صاحبِ دل جب روح کا گداز اور ایمان کی تفتنگی لے کر کسی مردِ کامل کی بارگاہ میں پہنچتا ہے تو پیرِ کامل کے فیوض و برکات اس پر لطف و کرم کی بارش کی صورت بے تحاشا نازل ہوتے ہیں۔ اب دل کا گداز اور فکر و نظر کی تفتنگی اُس بارانِ نور کے ایک ایک قطرے کو چوس لیتے ہیں۔ دلوں میں طریقت و معرفت کے غنچے مہکنے لگے ہیں اور حیرانِ کامل کی نظر کرم سے نئی زندگی کی نوید حاصل کر لیتے ہیں۔ حضرت شیر ربانی بھی ایسے ہی پیرِ کامل تھے جو مسِ خام کو کندن اور ذرے کو آفتابِ ہدایت بنانے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ اس لئے ان کے فیوضات نے کتنے ہی صاحبِ دلوں کو اپنے رنگ میں اس طرح رنگ دیا کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے تاریخِ تصوف کا حصہ بن گئے۔

فخر سادات حضرت سید محمد اسماعیل شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ بھی ایسے ہی خوش بخت صاحبِ فکر تھے جنہیں شیر ربانی کی نگاہ کرم نے نوازا اور خوب خوب نوازا۔ آپ کو زمانے بھر کی آنکھ کا ستارا بنا دیا۔ آپ کی اس طور تربیت فرمائی کہ آپ بے شمار دلوں کی دھڑکن بن گئے۔ پیرِ کامل نے مریدِ صادق کو ایک زمانے کا راہنما بنا دیا۔

بے بسوں کے درد کا چارا تھے اسماعیل شاہ
بے کسوں کے کی آنکھ کا تارا تھے اسماعیل شاہ
آج بھی ان کے لحد ہے مرکزِ اصحابِ دل

ہر دل پر درد کا یارا تھے اسماعیل شاہ
ان کا پیغام حسین ہر دور میں ہے جاوداں
ان کے فرمودات ہیں اسرار حق کے رازداں

حضرت سید اسماعیل شاہ کرمانوالے موضع کرموں والے تحصیل فیروز پور کے رہنے والے تھے۔ والد بزرگوار کا نام سید علی شاہ تھا جو آپ کے بچپن ہی میں وفات پا گئے تھے۔ آپ شروع ہی سے علم کی تمنائی تھے اس لئے دہلی اور سہارن پور بغرض تعلیم مقیم رہے اور سبھی بھر کر علم کی پیاس بجھائی۔ فیروز پور کے مشہور صوفی بزرگ مولوی شرف الدین رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ پر بیعت فرمائی۔ پیر و مرشد کے انتقال کے بعد آپ کھوئے کھوئے رہتے تھے۔ آپ کو بہت سے بزرگوں کی طرف سے اشارا ہوا اور شرقپور شریف جا پہنچے۔ شیر ربانی حضرت میاں شرقپوڑی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت قبلہ نے فرمایا ”آپ کچھ پڑھے لکھے بھی ہیں“ بولے ”کچھ ہوں تو سہی مگر سمجھ نہیں ہے۔“

حضرت قبلہ نے فرمایا ”اللہ تعالیٰ سمجھ بھی دے دیں گے“ اور انہیں خصوصی توجہ سے نوازا۔ کہتے ہیں اس روز ان کی موجودگی میں حضرت قبلہ کے پاس ایک شخص چاولوں کا ایک تھال لے کر حاضر ہوا، حضرت نے قبول فرمایا اور مدوح کے آگے رکھ کر بولے ”شاہ صاحب! انہیں پانی سے دھو ڈالئے“ جب یہ دھو چکے تو فرمایا ”میں نے آپ کی تمام گذشتہ کمزوریاں دھو ڈالی ہیں یہ چاول کھا لیجئے اور آگے کھلاتے رہئے“۔ گویا پہلی ہی ملاقات پر حضرت قبلہ نے ان کی بلند استعداد کے پیش نظر بھرپور طریقہ سے نوازا۔ اس کے بعد آپ ہمہ تن اللہ اللہ میں لگ گئے دراصل حضرت قبلہ کا یہی مقصود تھا۔ یہ حضرت قبلہ کا بے حد احترام فرماتے تھے۔ جب شرقپور کی سرزمین میں قدم رکھتے تو پاس اس ادب سے خاموشی اختیار کر لیتے۔ فرماتے ہیں اس خاموشی نے بڑا کام کیا ہے۔

چپ چاپ حضرت قبلہ کے روبرو دوزانو بیٹھے رہتے برسوں کے عقدے چند لمحوں میں حل ہو جاتے۔ فرماتے ہیں ”جب ان کے روبرو ہوتا تھا تو حاضرین میں سے ہر ایک کے حالات منکشف ہو جاتے تھے اور گاہے حضرت قبلہ مجھے لے کر کہیں سے کہیں پہنچ جاتے تھے“۔ سبحان اللہ! شیخ کی نظر کرم ہو تو ایسی ہو۔

فرماتے ہیں ”ایک مرتبہ میں نے انہیں خط میں زبدة العارفين اور قدوة السالکين کے رواجی القاب لکھ دیئے تھے۔ حضرت قبلہ بہت خفا ہوئے، کیونکہ وہ شہرت کو سخت ناپسند فرماتے تھے دراصل

شہرت کی انہیں ضرورت بھی نہ تھی، حق سبحانہ و تعالیٰ نے بہ طفیل حضور صلی اللہ علیہ وسلم ولایت میں انہیں وہ بلند مقام عطا کیا تھا کہ شہرت کو خود ان کی ضرورت تھی۔ فرماتے ”جس طرح حضرت قبلہ ہدایت فرماتے میں اس پر عمل کرتا تھا“ حضرت قبلہ سے ایثار و محبت کا یہ عالم تھا کہ جب حاضر خدمت ہوتے تو روپیہ پیسہ جو پاس ہوتا پوٹلیا میں باندھ لیتے اور حضرت قبلہ کی خدمت میں پیش کر دیتے۔ عموماً فیروز پور سے رائے ونڈ تک ریل گاڑی میں سفر کرتے اور رائے ونڈ سے پیدل شہر قیور شریف پہنچ جاتے۔

فرماتے ”ایک مرتبہ میری طبیعت کو بڑی گھبراہٹ تھی، چپکے سے ریلوے اسٹیشن پر آیا اور وہاں سے حضرت قبلہ کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ معلوم ہوا، آج حضرت قبلہ کی والدہ ماجدہ رحلت فرما گئی ہیں، حضرت قبلہ نے انہیں دیکھ کر فرمایا ”ہاں اگر اتنا بھی معلوم نہ ہو سکے تو اللہ اللہ سے فائدہ!“

قصور اور فیروز پور کے اکثر لوگ جو حضرت قبلہ کی خدمت میں حاضر ہوتے، انہیں فرماتے ”میرے پاس کیوں آتے ہو، کرموں والے سید محمد اسماعیل شاہ صاحب کے پاس چلے جایا کرو“۔

ایک مرتبہ فرمایا ”حضرت قبلہ حقہ پینے والوں کو میرے پاس زیادہ بھیجا کرتے تھے۔ فرماتے کہ انہیں حقہ چھڑوانے کی اچھی ترکیب آتی ہے، یہ کہتے ہیں کہ اصل چابی تو حضرت قبلہ ہی کے ساتھ میں ہوتی تھی، میرے پاس تو لوگوں کو یوں ہی بھیج دیتے تھے“۔

فرماتے ہیں ”حضرت قبلہ مجھے مکان شریف اور سرہند شریف بھی لے گئے تھے۔ فرمایا کہ سرہند شریف میں فیضان ایک سمندر کی طرح موج تھا“۔

تقسیم ملک کے بعد کچھ عرصہ پاکپتن شریف میں رہے، پھر اوکاڑہ کے پاس پکے چک میں مقیم ہو گئے۔ اب یہی جگہ کرمانوالہ شریف کے نام سے موسوم ہے۔ ریلوے اسٹیشن بھی ہے جس سے عقیدت مند کثرت سے حاضر ہوتے رہتے ہیں۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ میاں صاحب آپ کے پہلے گاؤں کو بھی کرمانوالہ پکارا کرتے تھے، خدا نے نئے علاقہ کو بھی کرمانوالہ شریف بنا دیا۔

حضرت ممدوح کی صحبت پاک اور مجلس میں یہ خاص بات تھی کہ وہاں دین حق اور شریعت مطہرہ کے بجز کوئی بات چیت نہیں ہوتی۔ سائل بیعت کیلئے حاضر خدمت ہو، زیارت کے لئے آئے یا کسی جسمانی عارضے کیلئے چل کر آئے، ان سب سے ممدوح دین ہی کی باتیں کرتے تھے، وہ بھی ہر نماز کے بعد اکثر بیماروں کو صرف نماز کی تاکید فرماتے اور بعض کو فرماتے کہ داڑھی رکھ لو، کٹانی یا منڈانی چھوڑ دو، اللہ پاک صحت دے دیں گے، چنانچہ حضرت ممدوح کے ان ”مجوزہ نسخوں“ کے استعمال سے عموماً مریض صحت یاب ہو جاتے ہیں۔ دراصل ممدوح کی توجہ آنے والے کے روحانی عوارض پر ہوتی

تھی، جس کے علاج پر آپ بہت زور دیتے تھے۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ حرص و آز اور لالچ انسان کی روح کو ناپاک کر دیتے ہیں۔ ان سے چھٹکارا پانے کی ایک ہی صورت ہے، دل کا تعلق رب دو عالم سے قائم کیا جاتا ہے۔ خدا سے محبت کی بدولت تمام بیماریوں سے چھٹکارا ہو جاتا ہے۔

فرماتے تھے ”حق سبحانہ و تعالیٰ سے اس وقت تک انس پیدا نہیں ہوتا جب تک ان کاموں سے جو اللہ تعالیٰ کی عبادت سے غفلت دلانے اور روکنے والے ہیں، چھٹکارا نہ ہو۔“ فرمایا ”ایسی عبادت اور ذکر و فکر بھی مفید ثابت نہیں ہوتے جب تک آدمی نیک چلن اور امر و نہی پر کار بند نہ ہو۔“ فرمایا ”اکل حلال کے بغیر عبادت میں حظ اور لطف محسوس نہیں ہوتا، لقمہ حلال کے بغیر کوئی عبادت کارگر نہیں ہوتی، گویا حضرت قبلہ کی صحبت پاک اور مجلس ایک ایسی روحانی یونیورسٹی تھی جہاں تھوڑی ہی دیر کے قیام سے ”مریض“ پر نہ صرف اس کی بیماریاں آشکار ہو جاتیں بلکہ ان کا مداوا بھی مل جاتا تھا۔ بحمد اللہ حضرت مدوح کی یہ بابرکت صحبتیں مولانا روم کے بقول:

یک زمانہ صحبت با اولیاء

بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

کا مصداق ثابت ہوئیں۔ سبحان اللہ

ان بابرکت مجالس کے علاوہ حضرت والا جمعہ کے روز منبر پر کھڑے ہو کر مجمع کثیر کو جس میں لاہور، اوکاڑہ اور مظفرگڑی تک سے لوگ آکر شامل ہوتے تھے، دین حقا کی طرف راغب کرتے۔ آپ کے واعظ پُر تاثیر ہوتے تھے۔ شریعت اور دین حق پر عمل پیرا ہونے کی خصوصی تلقین فرماتے۔ درود پاک کی تلاوت اور قرآن پاک کثرت سے پڑھتے رہنے پر زور دیتے، پانچ وقت کی نماز کی تلقین فرماتے۔

ایک مرتبہ ایک میجر صاحب حاضر خدمت ہو کر بولے ”مجھے غصہ زیادہ آتا ہے“ فرمایا ”اگر نفس کیلئے آتا ہے تو برا ہے اور اگر اللہ تعالیٰ کیلئے ہے تو اچھا ہے۔“ وہ بولے ”کوشش کے باوجود انسان بدی سے باز نہیں رہتا۔“ فرمایا ”اللہ اللہ کرتا رہے اور اور نیکی کی طرف راغب رہے اللہ تعالیٰ خود ہی ایک روز نیکی کو غالب کر دیں گے۔“ بولے ”حضرت توجہ فرمائیں کہ میں نیکی کی طرف راغب ہو جاؤں۔“ فرمایا ”نیکیوں کی صحبت رکھئے اللہ پاک نیک کر دے گا۔“ بولے یہ جو کہتے ہیں:

ع..... نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

اس کی اصلیت کیا ہے؟ فرمایا ”ایک مرتبہ جلال پور کے پیر صاحب حیدر شاہ صاحب کے

پاس تشریف رکھتے تھے کہ کسی نے ان سے یہی سوال دریافت کیا تھا، انہوں نے یہ جواب دیا تھا کہ
"گاہے گاہے"۔

حضرت ممدوح کے کشف کا یہ عالم تھا کہ جوں ہی کوئی شخص حضرت موصوف کے روبرو مجلس
پاک میں آ کر بیٹھتا ہے، ممدوح سر سے پاؤں تک اس کا جائزہ فرما لیتے ہیں اور حضرت قبلہ کا یہ
خداداد جوہر کوئی ڈھکی چھپی چیز نہیں بلکہ مجلس پاک میں محض چند منٹ بیٹھنے سے نئے سے نیا آدمی بھی
یہ چیز آنکھوں سے دیکھ اور کانوں سے سن لیتا تھا، مریض یا حاجت مند جن کا ہر وقت تانتا سا لگا رہتا
تھا جب ممدوح کی خدمت میں حاضر ہوتے اور بوجہ موجودگی حاضرین بعض باتیں صیغہ راز میں
رکھنے کی کوشش کرتے اور سب کے روبرو بیان کرنے سے گھبراتے، حضرت ممدوح وہ خود بخود ان پر
ظاہر کر دیتے بلکہ بعض اوقات تو ان سے باتیں اُگلوائی جاتیں۔

ایک شخص حاضر خدمت ہو کر معروض ہوا کہ اس کا بیل چوری ہو گیا ہے۔ فرمایا "تم نے بھی
چوری کی ہوگی یہ اس کی سزا ہے" وہ بولا "نہیں حضور" فرمایا "یاد کرو بولا! اچھی طرح یاد ہے" ارشاد
کیا "بچپن میں ایک مرتبہ" وہ کچھ سوچ کر بولا ہاں میں بھول گیا تھا....."

اسی طرح ایک مریض سے دریافت فرمایا: تم نے کبھی شراب پی ہوگی۔ ایک آدھ مرتبہ ہی
..... وہ بولا "ہرگز نہیں" حاضرین میں سے ایک سے فرمایا "اُس شخص سے معلوم کرو میں صحیح کہتا
ہوں۔ آخر کار وہ شخص مان گیا کہ ہاں ایک مرتبہ تھوڑی سی اس نے پی تھی"۔

ایک شخص ملاقات کیلئے حاضر ہوا، فرمایا "کیسے آئے ہو کہاں سے آئے ہو" اس نے اتہ پتہ
بتایا، فرمایا "کام بھی بتاؤ" بولا کچھ نہیں، فرمایا: اچھا تو باہر بیٹھو جا کر یا چلے جاؤ، وہ شخص اٹھ کر چلا گیا،
ممدوح نے سب کے روبرو ایک صاحب سے مخاطب ہو کر کہا "یہ عورت کے چکر میں ہے اور میرے
پاس تعویذ دھاگے کے لئے آیا ہے اس سے جا کر دریافت کرو" وہ شخص گیا اور تھوڑی دیر کے بعد
لوٹ آیا کہ حضرت وہ تو انکاری ہے، فرمایا: پھر جا کر معلوم کرو چنانچہ اس نے حضرت کے فرمودہ کی
تائید کی، فرمایا: اسے کہہ دو میں اس کام کیلئے یہاں نہیں بیٹھا ہوں"۔ اس قسم کے سینکڑوں واقعات
ہیں جو ہر روز مجلس پاک میں حاضر ہونے سے مشاہدہ میں آتے ہیں۔ سبحان اللہ

اللہ پاک فرماتے ہیں "مومن کی فراست سے ڈرو یہ میری آنکھ سے دیکھتا ہے"۔ حضرت
ممدوح کو اللہ تعالیٰ نے بطفیل حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور بحرمت حضرت میاں صاحب قبلہ نگاہ
حق میں وحق آگاہ عطا فرمائی تھی جس سے ممدوح اکثر تالیف القلوب کا کام بھی لیتے تھے۔

مولانا عبدالحق صاحب خطیب جامع مسجد حضرت بابا صاحب رحمۃ اللہ علیہ پاکپتن شریف فاضل دیوبند تھے شروع میں اولیائے کرام کے متعلق ان کے خیالات کچھ اچھے نہ تھے ایک مرتبہ یوں ہی حضرت ممدوح کی خدمت میں موضع کرموں شریف پہنچ گئے اور مختصر ملاقات کے بعد اجازت لے کر واپس چلے گئے حضرت ممدوح نے ایک خط انہیں لکھا کہتے ہیں اس خط کو مولانا صاحب کا دیکھنا تھا کہ ان کی حالت غیر ہو گئی پھر کیا تھا خط لئے ہوئے ممدوح کی خدمت میں پہنچ گئے۔ ادھر خادمان کو ہدایت تھی کہ ان کے پاس انہیں نہ جانے دیا جائے چنانچہ یہ تین روز وہاں پڑے رہے روتے تھے اور آہیں بھرتے تھے۔ آخر خدمت اقدس میں اجازت ہوئی تین یوم کی گریہ و زاری سے ان کے پہلے تمام خیالات ڈھل چکے تھے پہلے کیا تھے اور اب کیا ہیں حضرت ممدوح نے توجہ خصوصی سے نوازا اور اسی توجہ پاک کے طفیل وہ حضرت ممدوح کے مقبولوں میں شمار ہوتے تھے۔

برادر م قربان علی شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ ابتداء میں وہ آیت پاک ”الا ان اولیاء اللہ لا ینوف علیہم ولا ہم یحزنون“ پر غور کر رہے تھے اور اللہ تعالیٰ سے دعا گو تھے کہ یا باری تعالیٰ مجھ پر اس آیت کی وضاحت ہو جائے۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ ایک شب عالم خواب میں دیکھتا ہوں کہ ایک قبر کھلی ہے اور اس میں ایک بزرگ آنکھیں بند کئے چت لیٹے ہوئے ہیں۔ یہ پہلے تو سمجھے کہ شاید بے حس و حرکت پڑے ہیں کہ انہوں نے آنکھیں کھول کر ان کی جانب دیکھا اور انکی آنکھ کھل گئی چنانچہ اس واقعہ کے کافی عرصہ کے بعد جب لوگوں نے انہیں کرموں شریف میں حضرت موصوف کا اتہ پتہ دیا تو یہ حاضر خدمت ہوئے ممدوح حجرہ شریف میں چت لیٹے ہوئے تھے اور شکل و صورت بھی بالکل ان ”قبر“ والے بزرگوں سے ملتی جلتی تھی جب یہ پاس گئے تو گھوم کر ان کی طرف دیکھا بھی بالکل اسی طرح اور فرمایا کیوں بھائی میں وہی ہوں نا یہ جی ہی جی میں خدا کا شکر بجالائے۔

غرض آپ کی کس کس کرامت کا ذکر کیا جائے۔ تذکار آپ کی کرامت سے بھرپور ہیں۔ جناب محمد امین شرقیوری نے کئی کرامت کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔

اللہ کے بندے جو بات بھی زبان سے نکالتے ہیں وہ سب اٹل ہوتا ہے کیونکہ وہ نہ ہونے والی بات زبان سے ہی نہیں نکالتے اور جب کہہ دیتے ہیں تو وہ بحکم ربی ہو جاتا ہے۔

حضرت موصوف کے ایک اور خادم بیان کرتے ہیں کہ وہ ایک مرتبہ موصوف کی خدمت میں جا رہے تھے گاڑی میں بڑی بھیڑ تھی یہ جگہ چاہتے تھے۔ آخر ایک شخص کے پاس انہوں نے بیٹھنے کی کوشش کی تو اس نے ان کے طمانچہ جڑ دیا۔ خادم نے فی الفور حضرت قبلہ سے رجوع کیا کیونکہ

انہی کی خدمت میں حاضری کیلئے جا بھی رہے تھے اگلے اسٹیشن پر اس شخص نے اترنا تھا، جب گاڑی رکی تو نیچے اُترا اور پلیٹ فارم پر گاڑی کے دروازے سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا جیسے کسی دوسرے شخص کے آنے کا منتظر تھا، گاڑی نے حرکت کی وہ پاندان سے ٹکرا کر گرا اور درد سے بلبلا اُٹھا کیونکہ اس چوٹ سے اسکی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی، اب ان کی سنئے جب حضرت ممدوح کے پاس حاضر ہوئے تو فرمایا ”ظالم نے تجھے بڑے زور کا طمانچہ مارا تھا کہ مجھے بھی تکلیف ہوئی تھی، کیا وہ جان سے مر گیا یا زندہ ہے؟“ یہ بولے ہے ”تو زندہ البتہ ٹانگ ٹوٹ گئی ہے“۔ فرمایا ”لوگ بڑے ظالم ہیں“ سبحان اللہ! کیا بروقت امداد فرمائی کہ ظالم کو بھی کئے کی سزا مل گئی۔

یہ کرامات اپنی جگہ۔ ان سے واقعی کسی صاحب ولایت انسان کے کامل ہونے کا احساس ہوتا ہے کہ:

وہ فرماتے ہیں جو اللہ کی تقدیر ہوتی ہے
کہ ان کی گفتگو تقدیر کی تنویر ہوتی ہے

ان کی بڑی کرامت یہ تھی کہ آپ نے خدا ناشناسوں کو خدائے کریم کے انوار سے آشنا کر دیا۔ ان کے پاس آنے والوں کے دل جو حرص و آرزو لالچ، خود غرضی، دنیا داری اور بے یقینی کے اندھیروں سے تاریک تھے۔ ان میں شمع ایمان کچھ اس طرح روشن کی کہ ان کے دل انوار خداوندی کا آئینہ بن گئے جہاں خدا خود اپنی تجلی دکھاتا ہے۔ انہوں نے بندگان خدا کو الطاف خداوندی کا مظہر بنا دیا۔ ان کی بارگاہ مصائب و آلام کے ستارے ہوئے انسانوں کیلئے دارالامان تھی، جہاں نور ہی نور تھا، رحمت ہی رحمت تھی، رب دو عالم کا کرم ہی کرم تھا، آپ نے بندگان خدا کو عشق خداوندی کی لذتوں سے بہرہ ور فرمایا۔

بندۂ عشق شہی ترک نسب کن جامی
کا اندریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

آپ کے مرشد حضرت شیر ربانی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تھا کہ وہ حضرت سید محمد اسماعیل شاہ کے ہاتھوں اللہ کے فضل و کرم سے ایک مسجد تعمیر کروائیں گے۔ حضور شیر ربانی کے وصال کو دس بارہ سال ہو چکے تھے کہ حضرت شاہ صاحب ایک روز مغل پورہ ریلوے اسٹیشن کے پاس (نزد بستی کھارداں) جہاں اکثر مال گاڑیاں کھڑی رہتی ہیں، تشریف لے گئے۔ وہاں ایک پرانی مسجد افتاد زمانہ سے زمین میں دب گئی تھی اور لوگ اس جگہ پر گدھے باندھتے تھے۔

حضرت ممدوح نے نور باطن سے دیکھا کہ حضرت قبلہ نے جس مسجد کے آباد کرنے کا اشارہ فرمایا تھا وہ یہی مسجد ہے چنانچہ حضرت ممدوح نے کھدوا کر اسے باہر نکلوایا اور جگہ کی صفائی کرادی اور ایک درویش مولوی چراغ دین نامی کو وہاں بٹھا دیا۔ یہ جگہ محکمہ ریلوے کے تصرف میں تھی جب انہوں نے مسجد میں لوگوں کی آمد و رفت دیکھی تو بطور حد بندی مسجد کے گرد آہنی سلاخیں لگا دیں گویا مسجد کی عمارت کو محدود کر کے آنے جانے کا راستہ بند کر دیا۔ مولوی صاحب حضرت ممدوح کے پاس پہنچے فرمایا ”تم فکر نہ کرو چپ چاپ وہیں بیٹھے رہو“ چنانچہ اسی رات ریلوے کا افسر جو انگریز تھا اور جس کے حکم سے حد بندی اور ناکہ بندی کی گئی تھی کے ہاں عجیب واردات ہوئی۔ رات کو جب وہ لوگ سوئے تو چار پائی سے گر گر پڑتے آخر جوں توں رات کٹی صبح سویرے وہ مولوی صاحب کے پاس بھاگا چلا آیا کہ ہمیں معلوم نہ تھا کہ یہاں جو ”پادری“ رہتے ہیں وہ بڑے بزرگ ہیں۔ اس نے آہنی سلاخیں اکھاڑنے کا حکم دے دیا اب مسجد کیلئے راستہ صاف تھا حضرت موصوف کے حکم سے یہاں دبے ہوئے دو تین کنوئیں بھی صاف کئے گئے فرمایا کہ یہ مسجد بڑی بابرکت ہے یہاں حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ ایسے بزرگان عظام اور سائیں توکل شاہ انبالوی ایسے درویش کامل اللہ اللہ کرتے رہے ہیں اور ان کے انوار و فیوض و برکات ہنوز وہاں پائے جاتے ہیں۔ ایک بڑے کنوئیں کے متعلق فرمایا کہ اس کا پانی ہر مرض کیلئے شفا کا حکم رکھتا ہے فرمایا کہ یہ جگہ شہر سے دور تہائی میں یاد اللہ کیلئے بہت عمدہ ہے اس مسجد کا نام ”مسجد نور“ رکھا گیا اور یہاں نمازیوں کا ہجوم رہتا ہے۔

آپ جہاں بھی قیام پذیر رہے، لنگر کا انتظام باقاعدگی سے رہا آپ کے دربار میں جو بھی آیا لنگر کھائے بغیر نہ گیا۔ لنگر کی روٹی خواہش اور بھوک کے بغیر بھی جس قدر چاہو کھا لو کوئی تکلیف نہیں ہوتی بلکہ اگر کسی صاحب سلوک کو سلوک کی منزل میں کوئی رکاوٹ پیش آئی تو لنگر کے کھانے سے فوراً رفع ہوگئی۔

شاہ صاحب اپنی عمر شریف کے آخری برسوں میں اکثر بیمار رہنے لگے تھے۔ میوہسپتال میں داخل ہوئے آپ ۱۰ جنوری ۱۹۶۶ء کو واپس کرمانوالہ تشریف لے آئے۔ بالآخر ۲۷ رمضان المبارک ۱۳۸۵ھ مطابق ۲۰ جنوری ۱۹۶۶ء بوقت عصر حکمت و دانش اور رشد و ہدایت کا یہ آفتاب ڈوب گیا۔

ایک ہی قانون عالم گیر کے ہیں سب اثر
بوئے گل کا باغ ہے گل چین کا دنیا سے سفر

آپ کو اپنے پیرخانے سے بہت محبت تھی۔ ایک دفعہ چند بلی آپ کی مجلس میں بیٹھے کوئی تسبیح دیکھ رہے تھے۔ تسبیح کے امام کے سوراخ کو پیش نظر رکھ کر مدینہ منورہ کا نقشہ دیکھتے تھے۔ آپ نے فرمایا ”ذرا مجھے دو میں بھی دیکھوں“ اور پھر فرمایا کہ آپ کو کیا نظر آ رہا ہے۔ ایک بلی نے کہا مدینہ منورہ۔ حضرت قبلہ نے فرمایا ”مجھے تو شرقپور شریف نظر آ رہا ہے“ یہ فرمانا تھا کہ کئی صاحب دل وجد میں آگئے۔

آپ کی زبان فیض ترجمان از حد پُر تا شیر تھی جس کی بدولت دینی تعلیمات سے بے بہرہ پابند شریعت بن جاتے تھے۔ حکیم شیر محمد (بہاولنگر) راوی ہیں کہ میں نے کامل طب و حراحت کا چار سالہ کورس پاس کیا اور میری تعیناتی منجن آباد کے سرکاری دوخانے میں ہو گئی۔ اس دوخانہ میں ایک ملازم عبدالرحمن، حضرت محمد اسماعیل شاہ کا مرید تھا۔ مجھے بھی شاہ صاحب کی زیارت کا شوق ہوا، میں اس وقت نہایت خوش پوش نوجوان تھا اور جدید وضع قطع کے لباس کے ساتھ قبلہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو بعد از عشاء آپ نے مجھے بلایا اور اپنے پاس بٹھا کر اپنا دست مبارک میرے سینے اور قلب پر پھیرا۔ بس پھر جو ہوا بیان سے باہر ہے۔ میں کئی دن عالم حیرت میں رہا۔ دنیا کی لذتوں سے دل برداشتہ ہو گیا اور جلدی جلدی حضرت قبلہ کی خدمت میں آنا جانا شرع کر دیا۔ میں نے رسالہ

”الفراق بین اولیاء الرحمن و اولیاء الشیطان“

میں جو صفات ایک ولی کامل کی دیکھی تھیں وہ حضرت صاحب میں بدرجہ اتم پائیں۔ آپ کی مجلس میں بیٹھتے ہی اللہ اللہ اس کے حبیب کی محبت دل میں سما جاتی اور لذت آشنائی سے آگاہی ہو جاتی ہے۔

سرزمین حضرت کرمانوالہ شریف مدتوں سے اہل دل کیلئے قبلہ شوق بنی ہوئی ہے اور ہمیشہ بنی رہے گی۔ علوم روحانیت کے قافلے اس بارگاہ میں حاضری دے کر اپنا مقصود حاصل کرتے رہیں گے۔ پروانے جھوم جھوم کر اس شمع شوق پر نچھاور ہوتے رہیں گے سچ ہے کہ جو خدا کا ہو جائے خدا بھی اس کا ہو جاتا ہے اور سید محمد اسماعیل شاہ رحمۃ اللہ علیہ کی بعد از وفات روحانی پذیرائی اسی حقیقت کا اعلان ہے۔



آفتاب معرفت حضرت سید نور الحسن شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ کیلیا نوالہ شریف

قبلہ اہل طریقت حضرت سید نور الحسن شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا شمار ان عظیم فرزند ان گیتی میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنے علم و عمل اور فکر خدا آگاہ سے کاروان عشق و عقیدت کو منزل حق سے ہمکنار کر دیا۔ آپ کی حیات مقدسہ احکامات ربانی اور ارشادات مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم کی جگہگاتی تفسیر تھی۔ آپ نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ رضائے خداوندی اور منشائے قدرت کی خاطر وقف کر کے ثابت کر دیا کہ محبان مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا مرنا اور جینا فقط اسلام اور قرآن کیلئے ہوتا ہے۔ نرم دم گفتگو اور گرم دم جستجو کی زندہ مثال بن کر آپ نے ظلمت حیات کو انوار ایمان سے ضو فلن کر دیا۔ سید نور الحسن شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ تاریخ تصوف کا ایک روشن نام دلوں میں اُجالے بکھیرتا نظر آتا ہے۔ آپ بلاشبہ وہ مردِ کامل تھے کہ رضائے الہی میں غرق ہو کر ”عبد خاص“ کے مقام سے نوازے گئے۔ وہ ”عبد خاص“ کہ جس کی زبان فیض ترجمان تقدیر خداوندی کا پرتو بن جاتی ہے اور جس کا ایمان توحید و رسالت کی برہان بن جاتا ہے۔ سید نور الحسن شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ ایسے ہی دانائے رموز فطرت تھے کہ جن کیلئے شاعر مشرق نے کس شان سے اظہار صداقت کیا ہے کہ:

عبد دیگر عبدہ چیزے دگر
ایں سراپا انتظار او منتظر

وہ علاقے اور بستیاں خوش بخت ہوتے ہیں کہ جہیں کسی مردِ کامل سے نسبت ہوتی ہے۔ حضرت قبلہ سید نور الحسن شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ایک غیر معروف قصبے ”حضرت کیلیا نوالہ“ میں جنم لیا، اس صاحب اسرار کی نسبت سے آج یہ بستی بالخصوص ارادت مند ان نقشبندیہ کے حوالے سے مرجع عقیدت بن چکی ہے۔ آپ نے صفحہ حیات پر کردار و سیرت کے لازوال نقوش یوں ثبت

کئے کہ ایک طویل عرصہ گزر جانے کے باوجود حالات کی گردشیں ان کی روحانی تہ و تاب کو گہنا نہیں
سکیں بلکہ ہر آنے والا دور ان کی لازوال جگمگاہٹ سے اپنے دامانِ فکر و تدبیر کو دلآویز بنانے کا اہتمام
کرتا ہے۔ آپ کا سلسلہ نسب اڑتالیس پشتوں تک پہنچ کر حضور محمد مصطفیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام سے جا
ماتا ہے۔ ۱۸۸۹ء کو سید غلام علی شاہ رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں جنم لینے والے اس طفلِ معصوم کے مقدر کا
ستارا یوں جگمگایا کہ خطہ پنجاب ہی نہیں برصغیر کا گوشہ گوشہ اس کی تجلیات سے منور ہو گیا۔

سید نور الحسن شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا تعلق ایک زمیندار گھرانے سے تھا۔ آپ دل لگا کر
کھیتی باڑی کرتے اور پھر ایک وقت وہ آیا کہ زمینوں کو نم بخش کر گل گلزار اُگانے والا یہ سید زادہ بے
شمار بجز دلوں کی کیفیتوں کو عقیدت و محبت کا نم بخش کر وہاں محبت خدا و رسول کے گلاب کھلانے لگا۔
زمینداری اور کاشتکاری سے لے کر مخدوم ملت اسلام کے مقام پر فائز ہونے تک آپ نے جو سفر
طریقت طے کیا اس کا تذکرہ ایمان آفریں بھی ہے اور اصحابِ فقر کیلئے شمعِ راہ بھی۔ آپ شیر ربانی
حضرت قبلہ عالم میاں شیر محمد شرقپوری رحمۃ اللہ علیہ کے دامانِ لطف و کرم سے وابستہ ہوئے تو ایک
آن میں کائنات بدل گئی۔

اگر کوئی شعیب آئے میر
شہانی سے کلیسی دو قدم ہے

سید نور الحسن شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی ظاہری تعلیم اگرچہ زیادہ نہ تھی مگر علم لدنی سے بہرہ
درتھے۔ آپ کے پاکیزہ خصائل و اوصاف کا مشاہدہ کرنے والوں کا کہنا ہے کہ قدرت آپ کو کسی
بڑے روحانی مشن کی انجام دہی کیلئے تیار کر رہی تھی۔ والد محترم کی نگاہ باطن انہیں مستقبل کی
کامیابیوں کی جانب گامزن کرتی رہی۔ آپ زہد و ریاضتِ پاکیزہ اطوار و کردار اور روشن روشن
اوصاف کا پیکر تھے۔ آپ کی طلبِ صادق کا کمال تھا کہ خدا نے علم لدنی کی صورت میں جو کچھ آپ
کو عطا کر دیا اس کی مثال نہیں ملتی۔ بہت جلد وہ وقت آ گیا کہ آپ کا دل کاشتکاری اور زمینداری
کے موروثی پیشے سے اکتانے لگا۔ امورِ دنیا سے نفرت ہونے لگی امورِ دنیا سے نفرت نے آپ کے
دل کو پاک کر دیا اور آہستہ آہستہ یہی قلبِ پاکیزہ یادِ الہی کا گنجینہ بن گیا۔

آپ کو محبت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی دولت اور ذکر خداوندی کی لگن ورشہ میں ملی تھی۔
والد محترم خدا شناس انسان تھے ان کے ہند و نصائح نے اس سعید بخت فرزند کو بھی محبت خدا و رسول
خدا کی نعمت لازوال سے فیضیاب کر دیا۔ آپ کی عمر کا قافلہ ذرا آگے بڑھا تو یادِ الہی میں لذت اور

زیادہ محسوس ہونے لگی۔ اب کس طرح ممکن تھا کہ فیاضی قدرت سید نور الحسن شاہ کو خدا شناسی کے مقام پر فائز نہ کرتی۔ آپ کے والد محترم سید غلام علی شاہ مرحوم نے اپنے ارد گرد ایسا ماحول تخلیق کر رکھا تھا کہ جو بھی آپ کے پاس آتا، آپ کے رنگ کو قبول کر لیتا۔ بیٹے کو عظیم والد کی صحبت پاکیزہ نے طبیعت کا نکھار عطا کر دیا۔ آپ کے حالات زندگی پر ایک نظر ڈالتے ہی بے اختیار یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اگر آپ کو آغازِ حیات سے ہی والد قبلہ گاہی کی مجلس پاکیزہ نصیب نہ ہوتی تو شاید آپ وہ کچھ نہ بن سکتے جو قدرت آپ کو بنانا چاہتی تھی۔ راہنمائے فطرت نے اس شان کے ساتھ آپ کی راہنمائی کی کہ آپ خود بخود طریقت کی راہوں پر گامزن ہویت گئے۔

نہیں مشاطگی کی کچھ ضرورت حسن معنی کو

کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالے کی حنا بندی

سید نور الحسن شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ اپنے والد محترم کی راہنمائی میں عبادات اور تذکارِ خداوندی کے ساتھ ساتھ روحانی مجاہدوں کے ذریعہ اپنی ایمانی صلاحیتوں اور باطنی خوبیوں کو جلا بخشنے رہے۔ عبادت و ریاضت میں حد درجہ توجہ کے باوجود آپ نے رزقِ حلال کے سلسلہ میں محنت شاقہ کے مراحل کو فراموش نہ کیا اور رزقِ حلال کی جستجو میں کئی جگہ کاشتکاری کے سلسلہ پر بھرپور توجہ سے کام کیا۔ اس سلسلہ روزگار میں ٹھیکیداری بھی کی۔ خوش نویسی بھی سیکھی اور چند ایک کتب بھی تحریر فرمائیں مگر جلد ہی اس کام کو خیر آباد کہہ دیا۔ البتہ جب آپ شیر ربانی حضرت قبلہ میاں شیر محمد شرقپوری رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہوئے تو حکمِ مرشد کی تعمیل میں دو کتب لکھیں جو فنِ خوش نویسی کا قابلِ قدر نمونہ ہیں۔ ان کتب کے نام ”حکایات الصالحین“ اور ”مرآة المحققین“ ہیں، جب آپ نے یہ کتب لکھ کر حضور شیر ربانی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں پیش کیں تو وہ بے حد خوش ہوئے اور ان کی طباعت کا حکم صادر فرمایا۔

سرکارِ کیلانی صحیح معنوں میں مرادِ مرشد تھے۔ روایت ہے کہ جب کبھی شیر ربانی حضرت میاں شیر محمد شرقپوری رحمۃ اللہ علیہ کو ثلہ شریف کو جاتے ہوئے سید نور الحسن شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے قصبہ ولادت سے گزرتے تو فرمایا کرتے کہ:

”اس جگہ سے ایک عزیز کی خوشبو آتی ہے“

اس سے معلوم ہوتا ہے آپ حضرت میاں صاحب شرقپوری کی مراد تھے اور نسبت حضور علیہ

الصلوة والسلام سے معمور۔

حضرت قبلہ عالم میاں شیر محمد شرقپوری رحمۃ اللہ علیہ سے آپ کی نسبت روحانی کا واقعہ دلچسپ بھی ہے اور ایمان آفریں بھی۔ ایک بار سید نور الحسن شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ اپنے برادر اکبر کے ہمراہ شرقپور شریف میں زمین کے تبادلے کیلئے پہنچے۔ وہاں پہنچ کر اس مرد قلندر کی بارگاہ میں حاضری کا خیال آیا جسے سلطان شرقپور کے نام سے پہچانا جاتا تھا جب شیر ربانی کی بارگاہ میں حاضر ہوئے تو شیر ربانی نے سید نور الحسن بخاری کو ایک نظر دیکھتے ہی اس شہباز کے مقام و مرتبہ کو پہچان لیا اور آپ کے سامنے کے رخ سے گرتے سے پکڑ لیا اور ان کے بھائی سے دریافت کیا:

”اس نوجوان کا کیا نام ہے؟“

انہوں نے ادب سے عرض کیا ”نور الحسن“!

یہ سن کر شیر ربانی نے فرمایا کہ ”نام نور الحسن ہے، نور نہ بنا دوں؟“

سید نور الحسن شاہ بخاری فرمایا کرتے تھے کہ:

”میں کبھی بڑے سے بڑے افسر سے بھی مرعوب نہیں ہوا لیکن حضرت میاں صاحب شرقپوری کا رعب اس قدر چھایا کہ میں لب کشائی نہ کر سکا۔“

شیر ربانی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کے قلب پر ہاتھ سے ٹھیس لگا کر فرمایا:

”مربعوں کے تبادلے کی اتنی ضرورت نہیں ہے اگر چاہو تو ہم تمہاری قسمت کا تبادلہ کر

دیتے ہیں“

ع..... یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

اس وقت تو سید نور الحسن شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ حضرت میاں شیر محمد شرقپوری رحمۃ اللہ علیہ سے اجازت لے کر اپنے گاؤں چلے آئے مگر گھر آتے ہی کیفیت یہ ہو گئی کہ رات رات بھر نیند نہ آتی تھی اور فرط اشتیاق سے یوں محسوس ہوتا تھا کہ سینہ پھٹ جائے گا۔ کچھ دنوں سرکار شرقپور کی خدمت میں حاضری دی اور باقاعدہ شرف بیعت سے نوازے گئے۔ آپ بہت جلد مرشد کی صحبت کے بحر بے کراں میں غرق ہو گئے۔ وارنگی شوق غالب آتی گئی، آہستہ آہستہ مرشد اور مرید کا تعلق اور ارتباط روحانی اس قدر بڑھا کہ یہ مہینوں شرقپور شریف میں رہتے تھے۔ مرشد کی فرقت ایک دن کیلئے بھی گوارا نہ ہوتی تھی اس لئے گھر والوں کے اصرار پر چند یوم کیلئے بھی گاؤں آنا منظور نہ کرتے جب میاں صاحب گاؤں جانے کا حکم دیتے تو اسے بھی مرشد کا حکم سمجھ کر گاؤں چلے آتے مگر دل شرقپور شریف کے تاجدار روحانیت کے قدموں تلے ہی لوٹتا رہا۔

مرشد بے مثال اور مرید عقیدت آفریں میں اس درجہ عشق و عقیدت کا نتیجہ یہ نکلا کہ روحانی مدارج بہت تیزی سے طے ہوتے گئے۔ سلوک کی راہ یقین کا سفر بھی جاری رہا اور اس کے ساتھ ساتھ دنیاوی و ظاہری تعلیم و تربیت کا انتظام بھی ہوتا رہا۔ غرض مرشد کی نگہ کرم سے محبت و ارادت کی بھٹی سلگتی رہی اور مس خام کو کندن کی تابناکی میسر آتی رہی۔ سرکارِ شرقپوری نے اپنی خصوصی چشم عنایت سے آپ کو غیر معمولی طور پر نواز کر ثابت کر دیا کہ:

یک زمانہ صحبت باولیاء

بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

حضرت میاں صاحب شرقپوری کی نگاہِ کیمیا اثر سید نور الحسن شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ کو یوں سرفرازِ منزل کر گئی کہ آپ جب سرکارِ شرقپوری علیہ الرحمۃ کے حلقہٴ ارادت میں آئے تھے تو وہی تعلیمات و نیوی سے بہرہ ور تھے مگر اب یکا یک علم و حکمت اور ایمان و یقین کی گھتیاں سلجھانے لگے۔ ایک وقت وہ بھی آیا کہ آپ نے اپنے روحانی مشاہدات اور علمی کمالات کا نچوڑ ایک ایمان افروز تصنیف ”الانسان فی القرآن“

کی صورت میں اہل بصیرت کے سامنے پیش کیا تو دنیا آپ کی روحانی عظمت کے ساتھ ساتھ آپ کی فقہی بصیرت اور علمی رفعت کی بھی قائل ہو گئی۔ یہ سب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سچی اتباع اور طلب صادق کا فیضان تھا کہ آپ کی روشن تحریر اور مواعظِ حسنہ دلوں کی تاریک وادیوں کو نورِ بصیرت سے منور کرنے لگے اور طالبانِ راہ حق آپ کے فیوض و برکات کو اپنے دامنِ طلب میں سمیٹنے لگے۔ حضرت صاحبزادہ محمد عمر پیر بلوی جو کہ سید نور الحسن شاہ بخاری کیلانی کے پیر بھائی اور شیر ربانی کے خلیفہ مجاز تھے اپنی معرکہ الآراء تصنیف ”انقلاب الحقیقت“ میں سید نور الحسن شاہ بخاری اور سرکارِ شرقپوری کے ارتباطِ روحانی کا تذکرہ یوں فرماتے ہیں:

”حضرت شاہ صاحب کو ماہِ الامتیاز جو خاصہ حضرت شرقپوری سے عنایت ہوا ہے وہ سوز ہے آپ کی طبیعت عاشقانہ ہے۔ ان کے اور حضرت قبلہ کے راز و نیاز کے تعلقات تھے۔ پیری مریدی کا تعلق نہ تھا۔ گاہ ان سے ناراض معلوم ہوتے تھے اور گاہ ان پر فدا۔ اس والہانہ طبیعت نے آپ کو ایسا بے اعتماد کر رکھا تھا کہ بعض وقت خلاف ارشادِ دامنِ محبت نہ چھوڑتے۔ کئی بار حضرت شرقپوری نے فرمایا کہ اپنی حیاتی میں تمہارا اثر دیکھوں گا۔ گاہ شاہ صاحب کو محبت سے رخصت کیا اور گاہ خفگی سے مگر ہفتہ گزرنے نہ پاتا تھا کہ شاہ صاحب آدھکتے۔ پہلے تو حضرت قبلہ رومی فداہ دیکھ کر

ناراض ہوتے لیکن بعد میں ان کی جبلی طبیعت پر نظر فرماتے ہوئے پیر و مرید شیر و شکر ہو بیٹھتے۔
جو لوگ حضرت شرقپوری رحمۃ اللہ علیہ کی جلالت روحانی، سطوت ایمانی اور فقہی سرفرازیوں سے آگاہ ہیں وہ اس اقتباس سے حضرت سید نور الحسن شاہ بخاری کی اس خوش قسمتی کا اندازہ کر سکتے ہیں جو انہیں دنیائے شریعت و معرفت کے اس باجروت فرمانروا یعنی سرکار شرقپوری کی خصوصی کرم فرمائی کی صورت میں میسر آئی تھی۔

حضرت میاں صاحب شرقپوری نے آپ کو خلافت عطا فرما کر حضرت کیلیا نوالہ شریف کے عوام کی تربیت روحانی کا حکم دیا تو آپ اپنے گاؤں چلے آئے۔ شیخ طریقت سے فرقت قلب و جگر پر گراں گزرتی تھی اس لئے کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈھ کر شیخ کابل کے قدموں میں پہنچ جاتے تھے۔ آہستہ آہستہ علاقہ بھر کے عوام جوق در جوق آپ کی خدمت میں حاضری دینے لگے اور اس طرح حضرت شرقپوری کی جلائی ہوئی شمع ایمانی فقط اور خطہ پنجاب کے قصبات و دیہات کے عوام کے دلوں کو ہی منور نہ کرنے لگے بلکہ اس سے برصغیر کے مختلف علاقوں اور شہروں کے متلاشیان حق بھی ایمان و آگہی کے اُجالے حاصل کرنے لگے۔

آپ کی عظمت کردار اور خاندانی نجابت و وجاہت تو ویسے ہی مسلم تھی۔ حضرت شیخ کی دعاؤں اور روحانی نوازشات نے آپ کو تبلیغ اسلام اور ترویج و اشاعت سنت نبوی کے سلسلے میں علم و عمل کا کرنی بکھیرتا ہوا آفتاب بنا کر مطلع ایمان پر جگمگا دیا تھا۔

حضرت سید نور الحسن شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ صاحب کشف و کرامت بزرگ تھے۔ آپ کی بیسیوں کرامات مشہور ہیں جن سے آپ کی روحانی قدر و منزلت اور ایمانی وقار کا اندازہ ہوتا ہے۔ مگر آپ کی سب سے بڑی کرامت یہ تھی کہ آپ نے حضرت شرقپوری کا روحانی مشن زندہ رکھا۔ عقیدت مندوں کو سنت مصطفوی کے سانچے میں ڈھالنے اور انہیں شریعت نبوی کے روشن اصولوں کا پابند بنانے کے سلسلہ میں آپ کی مساعی بلاشبہ تاریخ روحانیت میں آب زر کے ساتھ لکھے جانے کے قابل ہیں۔ آپ زندگی کے ہر پہلو میں خلوت ہو یا جلوت، حلقہ ارادت منداں ہو یا محفل احباب کسی موقع پر بھی احکامات قرآنی اور ارشادات نبوی کو جاری و ساری کرنے میں کبھی کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے تھے۔

سرکار کیلانی سید نور الحسن شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ کو قدرت نے ذوق شاعری بھی ودیعت کر رکھا تھا۔ آپ باقاعدہ طور پر شاعر نہیں تھے مگر شاعری چونکہ ابتداء ہی سے دلوں کی ترجمان اور شرح

احوالِ محبت کا عنوان رہی ہے اس لئے آپ بھی بعض اوقات اپنے جذبات اور روحانی تاثرات کو اشعار کی صورت میں قلم بند فرماتے تھے۔ ایک بار اپنے پیر و مرشد حضور شیر ربانی کو اپنی فرقت و مہجوری کا افسانہ بصورت اشعار یوں سناتے ہیں:

پڑی ہے قعرِ طوفاں میں بچا لو میری کشتی کو
مناہی میں تباہی ہو رہی ہے میری ہستی کو
مرے مولیٰ مری بگڑی بنا دو نظرِ شفقت سے
ہوتی جاتی ہے طغیانی سہا لو میری کشتی کو
نہ مونس ہے نہ ہمد ہے نہ ہے یاور کوئی میرا
سوا تیرے مرے آقا جو بدلے تیرہ بختی کو
سراسر ڈوبنے کو ہوں میں اب طوفانِ عصیاں میں
چھپا لو اپنے دامن میں مری بیداد پستی کو
اسی طرح آپ کے کلام سے انتخاب کی صورت میں مزید چند اشعار قارئین کی نذر ہیں:

مشہور ہے جہان میں اُلفت حضور کی
قدرِ حضور پوچھیے حضرت بلال سے
نہ تو درد ہی میں مزا رہا نہ کوئی دل لگی کو مزار ہے
ہے عجب طرح کا یہ ماجرا نہ تو درد ہے نہ قرار ہے
سامنے ہوتے ہی جب اعراض کر کے چل دیئے
میری جاں حیرت میں ڈوبی تختہ تقدیر تھی
میں تو سمجھا تھا اسے مرہم یہ آنکھیں کھل گئیں
تحریر تھی یا کیا غضب تھا کلک کی شمشیر تھی
دب گئے تھے زخم جو وہ آج تازہ ہو گئے
دم کے دم میں نامہ ہمد میں یہ تاثیر تھی

قبلہ عالم سید نور الحسن شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی تاریخ وصال ۲۱ نومبر ۱۹۵۳ء بمطابق ۱۲ رجب الاول ۱۳۷۲ھ ہے۔ اس وقت آپ کی عمر تریسٹھ برس گیاہ مہینے تھی۔ اس سلسلہ میں یہ امر خاص طور سے قابل ذکر ہے کہ عمر تاریخ وصال اور وقت وصال میں آپ کی مطابقت اپنے شیخ طریقت

سرکار شرقپوری کے ساتھ انتہائے کمال پر ہے۔ آپ نے اپنے مرشد کامل کی ظاہری و باطنی اتباع کا حقیقی نمونہ خواص و عوام کے سامنے اس شان کے ساتھ پیش کیا کہ اس کی مثال نہیں ملتی۔ یہ سب فنا فی الشیخ کے درجات اولیٰ ہیں۔ آپ کی اور آپ کے شیخ کی تاریخ وصال عمر اور وقت وصال میں ایک منٹ کا فرق بھی رونما نہیں ہوا۔ اپنی عمر اور اقوال و اعمال میں بھی آپ اپنے شیخ طریقت سے پوری طرح مطابقت رکھتے تھے۔ اسی لئے تو حضرت شیر ربانی اپنی حیات قدسیہ میں اس مرید باصفا کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ:

”جس نے مجھے دیکھا ہے وہ سید نور الحسن کو دیکھ لے“

اور ایسا کیوں نہ ہوتا۔ آپ تو اپنے شیخ کی دعائے مستجاب اور مراد تھے۔

آپ کے جنازہ میں ہزاروں ارادت مندوں نے شرکت کی۔ ہر مسلک طریقت کے مشائخ اور علماء بھی کثیر تعداد میں جنازہ میں شریک ہوئے۔ آپ کی وفات کی خبر ارادت مندوں اور آپ کے سلسلہ روحانیت سے وابستگان کیلئے رنج و الم کی شدت کا باعث ہوئی۔ آپ کے وصال پر ملال پر بہت سے شعراء نے اپنے جذبات الم مرثیٰ کی صورت میں اور قطعہ ہائے وصال کی صورت میں پیش کئے۔ مولانا محمد عبداللہ کنجاہی نے آپ کا قطعہ تاریخ وصال یوں رقم کیا:

سید السادات فرزند رسول O جامع الحسنات دلہند رسول

نور کامل آفتاب شرقپور O بے شبہ بد ماہتاب شرقپور

۱۳۷۲

رفت خضر راہ دعا گو در جناں O پیر نور الحسن شاہ عارف زماں

۱۳۷۲

ذاکر حق پیر نور الحسن شاہ O رحمت حق صلہ یافت از بارگاہ

آج قبلہ عالم سیدی نور الحسن شاہ ظاہری طور پر ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں مگر آپ نے علم و حکمت کے جو چراغ فروزاں کئے تھے وہ زمانے کی باوصصر کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے ہمیشہ روشنی بکھیرنے کا باعث بنتے رہیں گے۔ جس طرح چاند کی روشنی اس کی کرنوں سے ہوتی ہے اور سید نور الحسن شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ ماہتاب علوم معرفت تھے۔ آپ کے فرزند ان ارجمند حضرت پیر سید محمد باقر علی شاہ بخاری صحیح معنوں میں اس ماہتاب لازوال کی نورانی کرن ہیں۔ وہی اپنے والد بزرگوار کا اُسوۂ وہی ان کا انداز تبلیغ، وہی ان جیسی محبت و شفقت، وہی ان کی طرح فیوض و برکات کی خیرات کا انداز، غرضیکہ پیر سید محمد باقر علی شاہ کا حسن تبلیغ متلاشیان منزل صداقت کو خود شناسی سے

لے کر خدا آگاہی تک کی منازل سے ہمکنار کر رہا ہے۔ آپ مریدوں کے دلوں کی دھڑکن اور آستانہ عالیہ سے وابستہ بے شمار ارادت مندوں کی آنکھوں کا تارا ہیں۔ آپ نے اپنی زندگی کا بہت بڑا حصہ اپنے عظیم والد اور مرشد سیدنا نور الحسن شاہ بخاری کی صحبت میں گزارا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی مجلس ایمانی میں چند ساعتیں گزار کر ہی اندازہ ہونے لگتا ہے کہ ہم سیدنا نور الحسن شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس قدس کے مزے لوٹ رہے ہیں۔

سجادہ نشین آستانہ عالیہ کیلیا نوالہ شریف حضرت سید باقر علی شاہ کے فرزند ارجمند اور جانشین جناب پیر سید عظمت علی شاہ بخاری کو رب کریم نے جوان العمری میں ہی روحانی صفات سے نواز رکھا ہے۔ آپ اپنے والد محترم سے بیعت اور طریقت میں انہی کے جانشین ہیں۔ آپ کو عقیدت کیشن محبت سے ”چن جی سرکار“ کہتے ہیں۔

بلاشبہ آپ سے مل کر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے قلب و نظر میں جمال معرفت کی چاندنی اتر آئی ہو۔ ”چن جی سرکار“ رمز آشنائے معرفت ہیں۔ آپ کو تبلیغ اسلام کا جذبہ غیر معمولی طور پر عطا ہوا ہے۔ صرف ملک بھر میں ہی تبلیغی دورے نہیں فرماتے بلکہ بلاد عرب اور بلاد یورپ میں بھی عظمت اسلام اور محبت رسول کا پرچم لہرانے کی سعادت حاصل کر چکے ہیں۔ تبلیغی دوروں کے دوران ہی میں کئی مرتبہ حج بیت اللہ اور زیارت مدینہ منورہ کی سعادت سے بہرہ ور ہو چکے ہیں جب منزل حق اور خدا شناسی کی طلب صادق رکھنے والے آپ سے ملتے ہیں اور پھر حضور پیر سید محمد باقر علی شاہ بخاری علیہ الرحمۃ کی خدمت میں حاضری دیتے ہیں تو قبلہ عالم سید نور الحسن شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے فیوض پیہم کی رم جہم برستی محسوس ہوتی ہے۔

آستانہ عالیہ حضرت کیلیا نوالہ شریف صرف معرفت و طریقت کا گہوارا ہی نہیں بلکہ یہاں مکمل طور پر شریعت خداوندی، ارشادات مصطفوی اور تعلیمات اسلاف کو بطور خاص ملحوظ خاطر رکھا جاتا ہے۔ یہاں غیر شرعی رسوم اور باطل روایات سے مکمل طور پر اجتناب کیا جاتا ہے کیونکہ اس خانوادہ طریقت کے پاسبان سمجھتے ہیں کہ سلطان مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے راستے سے ہٹ کر دینی اور دنیاوی طور پر فوز و فلاح کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ شریعت مطہرہ کی سر بلندی اور تمام امور میں بالادستی کا جو تصور سیدنا نور الحسن شاہ بخاری کے پیش نظر تھا، وہی مقصد اولیٰ آج ان کے محترم جانشینوں کی دینی اور روحانی مساعی کا مرکز و محور بن چکا ہے۔

قبلہ عالم سید نور الحسن شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا سالانہ عرس مبارک ۲۲/۲۳ نومبر بمطابق

۸/۷ مکھڑ روحانی تزک و احتشام سے منعقد ہوتا ہے۔ عرس کی تقریب میں ملک کے طول و عرض سے ہزاروں عقیدت مند شریک ہوتے ہیں۔ وطن عزیز کے ممتاز علمائے دین اور مشائخ کثرت سے شرکت کرتے ہیں۔ آپ کا مزار پاک بلاشبہ مرجع خلافت ہے۔ یہ مزار حسن تعمیر کے لحاظ سے سادگی و پرکاری کا حسین نمونہ ہے۔ اس مزار انور کی ایک جھلک دیکھتے ہی بے قراروں کو سکون و قرار کی دولت نصیب ہونے لگتی ہے۔ یہ مزار نشان منزل اور صاحب مزار منزل طریقت کا درجہ رکھتے ہیں۔ مزار کی ایک جھلک دیکھتے ہی اس مرد قلندر کی پاکیزہ زندگی کا ایک ایک لمحہ نگاہوں کے سامنے گھومنے لگتا ہے جس کا ہر عمل سنت رسول کی عملی تصویر اور جس کا ہر فعل حکم خداوندی کی تفسیر تھا۔ اس مرد حق آگاہ کی پاکیزہ سیرت کا ایک ایک لمحہ ہمیں اس حقیقت کا ادراک بخش رہا ہے کہ:

یہی لوگ ہیں جن سے دُنیا ہے قائم
انہی سے ہی ایمان کی روشنی ہے



حضرت محمد عمر پیر بلوی شریف رحمۃ اللہ علیہ

پیر بل کی سر زمیں سے وہ ولی کامل اٹھا
بن گیا جو شیر ربانی کے دل کا مدعا
حضرت شیر محمد نے نوازا اس طرح
مل گئی خواجہ عمر کو بزم ہستی میں بقا
ان کا جو فرمان عالی ہے وہی ہے مستند
ان کے ہیں اقوال یا گلزار دین مہکا ہوا
حضرت خواجہ عمر وہ پیر بل کے تاجدار
جن سے ہے ہر اک دل غمگین تبسم آشنا
شیر ربانی سے قربت ان کی تھی کچھ اس طرح
جس طرح کہ آشنا سے مل رہا ہو آشنا
طالبان شوق کی خاطر جلا دی آپ نے
بزم فکر و عمل میں مشعل راہ ہدی
جس سے ملتا ہے عمل کا نور دل کی روشنی
منقبت خواں ہے رضا اس صاحب کردار کا

(محمد اکرم رضا)

فدائے شیر ربانی

حضرت محمد عمر بیر بلوی رحمۃ اللہ علیہ

شیر ربانی حضرت میاں شیر محمد شرچپوری رحمۃ اللہ علیہ انتہائی خوش بخت شیخ طریقت تھے۔ آپ نے اپنی تربیت خاص سے متوسلین اور خلفائے عظام کی ایک ایسی جماعت تیار کی جس نے ان کے پیغام رشد و ہدایت کو چاروں طرف پہنچا دیا۔ ان پاکیزہ نفوس میں سے پر ایک ایمان و یقین میں پختہ اور عشق و عقیدت کی منزلوں سے بہت آگے کا مسافر تھا۔ وہ خلفائے عظام جنہوں نے شیر ربانی کے پیغام کو وسعت دی۔ اپنے علم و عمل سے زمانے کو ظلمتوں سے نکال کر راہ ہدایت پر گامزن کرنے کی کوشش کی اور اس میں بڑی حد تک کامیاب و کامران رہے۔ ان میں ایک نام فخر نقشبندی، مظہر اسرار طریقت حضرت محمد عمر بیر بلوی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے جو اپنے افکار اور اعمال سے اپنے پیرومرشد کی تصویر تھے۔ روحانیت آپ کے چہرے سے اس شان کے ساتھ ہویدا تھی کہ ان کو دیکھ کر خدا یاد آتا تھا۔

اللہ اللہ گفتن اللہ می شود

ایں سخن حق است واللہ می شود

یعنی یاد خدا میں سرمست ہو کر مرد و مومن اللہ کا قرب خاص حاصل کر لیتا ہے۔ یہ قول بالکل برحق ہے اور خدا گواہ ہے کہ ایسا ہی ہوتا ہے۔

یوں تو ہر ولی اللہ کی نسبت کا ایک خاص نقشہ ہوتا ہے لیکن غوثِ زمان حضرت میاں شیر محمد شرچپوری رحمۃ اللہ علیہ نے فقر و تصوف کا وہ نقشہ پیش کیا جو انبیاء علیہم السلام کے نقشے سے ملتا جلتا ہے اور اللہ کے بندوں کی ایسی تربیت فرمائی کہ جو ہدایت کے نور کا خاص نمونہ تھی۔ جو بھی جتنا ظرف لایا اس کا برتن بھر دیا۔ اور بعض ایسی ہستیاں اس مقدس خانقاہ سے فیض تربیت پا کر نکلیں جن کی نگاہ کیمیا اثر سے ہزاروں بندگان خدا کو ہدایت کی دولت مل گئی اور وہ دین و دنیا میں انسانیت کیلئے نمونہ قرار پائے۔ ان مقدس مقبولان بارگاہ میں قطب العالم حضرت محمد عمر بیر بلوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک خاص مقام ہے آپ کی زندگی فقر کا نمونہ اور ہر قسم کے اعتدال کا مجسمہ تھی۔

علم و عمل میں آپ لامثنائی تھے۔ علوم ظاہری و باطنی میں ایک فرد کامل۔ ولی ابن ولی ابن ولی کو دیکھ کر اللہ یاد آتا تھا۔ حسن ظاہر اور تاثیر باطن مل کر طالب کو محبت کی چوٹی پر بٹھا دیتی تھیں۔ آپ قیوم عالم حضرت غلام مرتضیٰ رحمۃ اللہ علیہ کے پوتے تھے اور علم و عمل کے پیکر ولی کامل حضرت احمد سعید رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادہ۔ حضور ذی الحجہ ۱۳۵۵ھ میں تولد ہوئے۔ ولایت کا گھرانہ نور سے بھرپور خانقاہ و مدرسہ دونوں گھر میں موجود پڑھانے والے بھی گھر میں اور تربیت دینے والے بھی گھر میں۔ پڑھانے والے بھی اولیاء اللہ اور تربیت دینے والے بھی اولیاء اللہ۔ بچپن کے نقوش دیرپا ہوتے ہیں اور طبیعت کی رہنمائی میں یہ اپنا مقام رکھتے ہیں۔ پاکیزہ بچپن مقدس اور ذہین طبع کو ظاہر میں صحیح راستے پر آگے بڑھنے میں اپنے اندر سے محرک مل جاتا ہے۔ اپنے گھر میں حضور نے حفظ قرآن کیا اور ۱۲ سال کی عمر میں حضرت قیوم عالم غلام مرتضیٰ بیر بلوی رحمۃ اللہ علیہ مقتدی بنے اور آپ نے رمضان کی تراویح میں امامت کے فرائض انجام دیئے۔

کیا کہنے ہیں اس امامت کے اور کیا کہنے ہیں اس اقتداء کے۔ خانقاہ فقر کے ساتھ ساتھ علوم دینی کا دریا گھر میں بہہ رہا تھا۔ فقر کے انوار بھی لئے اور شرح جامی تک کتابیں بھی اپنے والد ماجد سے پڑھیں۔ اس کے بعد پنجس اور مبارک طبع سفر پر آمادہ ہوئی۔ عقوان جوانی میں لاہور تشریف لائے پھر دہلی میں بھی مدت تک قیام کیا اور حصول تعلیم میں مستغرق رہے۔ پھر اورنٹیل کالج لاہور سے مولوی فاضل کیا، منشی فاضل کیا اور ادیب فاضل کیا۔ انگریزی کے امتحانات بھی دیئے۔ اس کے بعد اسلامیہ کالج پشاور میں پروفیسر مقرر ہوئے۔ سات سال تک وہاں تعلیم دی، اس سات سال کی داستان بھی عجب داستان ہے۔ سبحان اللہ۔ ادھر حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کا وصال ہو گیا۔ کالج اور کالج کا سب ماحول یک دم چھوٹ گیا۔ اور کرسی کی بجائے فرش اختیار ہوا۔ خانقاہ کا ماحول دیکھا بھالا ماحول تھا اور کامل ولی دیکھے ہوئے تھے۔ اس لئے کالج نے اپنی ہر قسم کی جدتوں کے باوجود کوئی مغالطہ پیدا نہ کیا۔ سجادہ نشین مقرر ہونے پر اگرچہ آباؤ اجداد کے مخلصین کا جھگھٹا ارد گرد رہنے لگا۔ تاہم مرشد کامل اور ہادی اکمل کی تلاش اور جستجو ایک منٹ کیلئے بھی جدا نہ ہوئی اور کامل بننے کی پہلی سیڑھی یہی ہے۔

تلاش بسیار کے بعد اور جستجو کے مجاہدہ عظیم کے بعد مقصد کی کلید ہاتھ آگئی۔ حضرت شیر محمد میاں صاحب شرقپوری رحمۃ اللہ علیہ کے دربار میں حاضری دی ہی تھی کہ حضور رحمۃ اللہ علیہ کی نگاہ کیسیا اثر نے ظاہر و باطن کے سارے حجابات دور کر دیئے۔ اور پہلی مجلس میں القائے نسبت کے بعد

تلقین فیوض کا باب بھی کھول دیا۔ یہ باب جب کھلتا ہے تو باقی دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ آزمائش پر آزمائش اور امتحان پر امتحان نے دنیا کی حقیقت پر گاہ کے برابر بھی نہ رہنے دی۔ اور یہی وہ مقام ہے جس کو فنا کہتے ہیں اور جو موتوا قبل ان تموتوا کی ایک بولتی ہوئی تصویر ہوتا ہے۔ انوار و تجلیات کی کثرت نے وحدۃ لا شریک سے محبت اور محبت میں استغراق کا غلبہ پیدا کر ڈیا اور مدت تک جلوت میں خلوت رہی۔ متوسلین آتے جاتے تھے خانقاہ کی رسوم بھی جاری تھیں لیکن اللہ کا یہ مرد اپنے فکر میں محو اور دنیا و مافیہا سے الگ، انقطاع اور تجمل کے حقیقی گوشے میں بوریا نشین تھا۔ ۱۹۲۸ء میں حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا وصال ہوا۔ اس وقت حضرت رحمۃ اللہ علیہ اسی محویت اور تجمل میں تھے۔ اتنے بڑے حادثے اور جدائی کے اتنے بڑے صدمے نے احساس فنا کو خاص متاثر نہ ہونے دیا۔ اس فراق و وصال اور فقر کی ذمہ داریاں اور بڑھ گئیں اور زندگی نے نئی کروٹ لی۔

حضرت محمد عمر پیر بلوی کی زیارت کا جس کو بھی شرف حاصل ہوا یا خدا بن گیا۔ آپ جذب و سلوک کا ایک خوبصورت مجسمہ اور محبوبیت کی ایک دلنشین تصویر تھے۔ آپ فنا فی اللہ کے مدارج عالیہ پر فائز تھے۔ لوگ جوق در جوق آپ کی بارگاہ اقدس میں حاضری دیتے اور جن خوش بختوں پر آپ کی نظر کر پڑ جاتی وہ کچھ سے کچھ ہو جاتے۔ فیض عام کا چشمہ تھا کہ ہر وقت سیراب کرتا رہتا تھا۔

اخلاق نہایت بلند تھے اپنے تو اپنے ہوتے ہی ہیں بیگانوں کو اپنا بنانے کا ڈھنگ آپ کو خوب آتا تھا۔ نگاہ کی تاثیریں اتنی غالب تھیں کہ جس کو محبت بھری نگاہوں سے دیکھا اُس کو پھر ہمیشہ کیلئے اپنا بنا لیا۔ اگر پہلی صحبت میں آنکھوں کے راستے دل میں بیٹھ جاتے اور پھر دل اپنا نہ رہتا تھا، ان کا ہو جاتا تھا، جدھر چاہتے لے جاتے جو کام چاہتے لے لیتے۔ مذہبی تفرقہ بازیوں سے حضور کو بہت نفرت تھی۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ عموماً اولیاء کاملین کو تفرقہ بازی سے نفرت ہوتی ہے۔ وہ اس لئے کہ فقر محبت کی سرزمین میں پھلتا پھولتا ہے اور جزوی اختلافات ذاتی جذبات بن کر نفرت پیدا کرتے ہیں اور ولایت کو تفرقے سے نفرت ہے۔

نمود اور مظاہرہ سے آپ کو سوں بھاگتے تھے بلکہ اکثر ایسا ہوتا کہ اگر ساتھی زیادہ ہو گئے ہیں تو آپ ان کو الگ چھوڑ کر راستہ بدل لیتے۔ لباس سادہ، خوراک سادہ، ادائیں دلکش اور دلربا، مجلس میں بولنے میں حکمت کے دریا بہتے اور خاموشی پر ازل کے راز کھلتے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ پاس بیٹھے والے دنیا میں رہ کر آخرت کے بنے ہوتے اور مافیہا کا خیال بھول جاتا۔ ہر صاحب فن کو اس کے فن کی اصطلاحوں میں فیض کی تاثیریں مہمانی کے طور پر دیتے۔ درجوں کی پہچان بہت ضروری تھی

ہر شخص کو اس کے مرتبے کے مطابق جانتے پہچانتے اور پھر فیض دیتے۔ جو بھی آیا کچھ بن کے گیا یہ بننا اور بننے کو سلامت رکھنا آسان اور مشکل کا مشکل جوڑ ہے۔ ولی اللہ کی صحبت دل کی دنیا بدل دیتی ہے لیکن استقامت میں تو بدلنے والے کا اپنا ووٹ بھی کام کرتا ہے۔

قالوا ربنا اللہ۔ بے شک مشکل ہے لیکن ”نعم استقاموا“ مشکل تر ہے۔

حضرت میاں محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کیا اچھا فرماتے ہیں:

ہر مشکل دی کنجی یارو مرداں دے ہتھ آئی

مرد نگاہ کرے جس ویلے مشکل رہے نہ کائی

یہ پیر کامل کی خوب تعریف ہے لیکن مرید صادق کی استقامت کا باب اس کے بعد شروع ہوتا ہے اور وہ آہ سحر گاہی سے کھلتا ہے۔ آپ فرمایا کرتے، پیر کا کام تیلی لگانا ہے نگاہ اول کی بہت تعریفیں ہیں اور یہ بڑی مشکل کشا ہے لیکن طرف سالک فیض ازل کا کرشمہ ہے جس کو چاہا دے دیا۔ بے حد نازک طبع اور بے حد برداشت والے آپ (رحمۃ اللہ علیہ) کا احساس ہر چھوٹی سے

چھوٹی چیز کو عیاں کر دیتا، اکثر دیکھا گیا کہ بولتے چینتے آئے اور خاموش دیدہ گریاں لے کر لوٹے۔

آپ قلمی تبلیغ کو بڑا درجہ دیتے تھے اور اہل قلم کے بارے ارشاد ہوتا کہ خیال ہمارے ہوں

اور قلم ان کے پھر کام بنتا ہے۔ آپ نے جو کچھ لکھا حقیقت کے راز کھولے اور حقائق کو گوشوں سے

نکالا۔ اور وضاحت نہ سمجھنے والے کا گلا پکڑ لیتی کہ یہاں بھی کم نہیں میں مبتلا ہوا اور آفتاب کو نہیں دیکھتے۔

تربیت کا طریقہ بالکل حضرت میاں صاحب سے ملتا جلتا تھا۔ جیسا کوئی مریض آیا ویسی ہی

دوا دی۔ کسی کو اللہ ہو کا سبق دیا۔ اس کی تھوڑی سی تشریح فرمادی جو طریق ادا سے متعلق ہوتی لیکن یہ

سبق صاحب استعداد سالک کو دیا جاتا۔ ورنہ یا کریم یا رحیم یا حی یا قیوم یا سلام یا سلام اور جو صفائی

نام مناسب سمجھا اس کا سبق دے دیا۔ یہ فیض ظاہر و باطن کی ابتداء ہوتی تھی۔ سلسلے میں داخل ہونے

والے کو نماز کی پوری پابندی کی تاکید کے بعد فرماتے کہ ہر نماز کے بعد ۱۱ مرتبہ قل هو اللہ شریف پڑھا

کرو۔ صبح کی نماز کے بعد ۱۱ مرتبہ الم نشرح پڑھا کرو اور مغرب کی نماز کے بعد الحمد شریف الحمد

شریف کی تعداد میں اور طریقہ ادا میں صاحب نسبت کی نسبت کا خیال فرماتے اور ہر وظیفہ کو سمجھ بوجھ

کر پڑھنے کی تاکید ہوتی۔

تلاوت کلام اللہ کے سلسلے میں آپ رحمۃ اللہ علیہ تاکید فرماتے کہ قرآن کریم بے شک تھوڑا

پڑھو، مگر سمجھ کر پڑھو، سمجھ اپنی اپنی ادا اپنی اپنی۔ آپ کے لفظوں سے نتیجہ فیض کی صورت میں پہنچتا اور

حقائق قرآنی مجسم بن کر سامنے آتے اور ہر حقیقت اپنا چمکتا چہرہ دکھلا جاتی۔ دعا کا مخصوص طریقہ تھا۔ اٹھے ہوئے ہاتھ آہستہ آہستہ لمبے ہونا شروع ہو جاتے اور توجہ الی اللہ اس قدر بڑھ جاتی کہ گویا دنیا و مافیہا سے الگ ہیں اور جب دعا مانگتے محسوس ہوتا کہ اب اس دعا نے عرش کے کنگرے تھامے ہوئے ہیں۔ آپ کی دعا سے اور توجہ سے ہزاروں کی ہگڑی بن گئی جو مقصد بھی کوئی لایا وہ بفضلہ تعالیٰ فائز المرام ہو کر لوٹا۔

سنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سلسلے میں آپ کا یہ ارشاد آپ زر سے لکھنے کے قابل ہے کہ بعض لوگ سنت کو عبادات میں مخصوص سمجھتے ہیں اور اس پر بحث کرتے ہیں کہ تراویح آٹھ رکعت پڑھیں کہ بیس رفع یدین اور رفع سبابہ دوامی سنت ہیں یا وقتی سنت وغیرہ اور یہ نہیں سمجھتے کہ سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ساری زندگی مقدس سنت ہے ہمارے ہر لمحہ کی ہر ادا میں یا سنت ہے یا غیر سنت۔

لباس پوشاک، گفتگو، مہمان نوازی، سفر، حضر، احباب کے ساتھ برتاؤ، مسئلہ مسائل، تشریحات دین میں کوئی عمل کوئی قول سنت کے خلاف نہ ہوتا تھا۔

آپ کے مرید خاص اور روحانی طور پر خصوصی تربیت یافتہ مدیر ماہنامہ سلسبیل حاجی فضل احمد لکھتے ہیں۔ ۱۹۵۵ء میں حضور نے حج بیت اللہ اور زیارت روضہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے سفر اختیار کیا۔ یہ غلام بھی حضور کے ہمراہ تھا۔ سبحان اللہ کیا حج تھا اور کیا زیارت تھی۔ کعبۃ اللہ کے سامنے حضور کئی مرتبہ آہستہ آہستہ گنگنارہے ہوتے اور آنکھیں پُر نم ہوتی تھیں۔ ع..... ہم اس کے

پاسباں ہیں یہ پاسباں ہمارا

مسجد نبوی میں جب حاضری دی تو عجب سماں تھا۔ میں نے اکیلے ۱۹۳۳ء میں بھی حج و زیارت کا شرف حاصل کیا ہوا تھا لیکن وہ سماں کچھ اور تھا، یہ سماں کچھ اور تھا۔ جب حضور قبلہ مرشد رحمۃ اللہ علیہ مواجہ شریف کے سامنے پہنچے تو میری آنکھوں نے وہ نظارہ دیکھا جو قلم میں یارائے تحریر نہیں۔ سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات نور مجسم مواجہ شریف سے باہر تشریف لائے اور اس سارے سفر مبارک میں قدم قدم پر کرامات کا ظہور تھا۔ دراصل کرامت کو دیکھنے والی آنکھ مشکل سے ملتی ہے، ورنہ اولیاء اللہ کا سارا وجود اور زندگی کا لمحہ لمحہ کرامات سے لبریز ہوتا ہے۔ میں کس کس کرامت کا ذکر کروں۔

ع..... وقت کوتاہ و قصہ طولانی

آپ (رحمۃ اللہ علیہ) کا ایک ایک لفظ حقائق کی تصویر ہوتا تھا۔ حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کے بعد فراق کے سوز میں اور وصال کی لگن میں ”انقلاب الحقیقت“ لکھی جس میں فکر کی مشکل اور عمیق اصطلاحات کو نہایت آسان لفظوں میں بیان فرمایا۔ دوسری طباعت کیلئے آپ کا خیال تھا کہ بہترین کاغذ عمدہ لکھائی اور نفیس چھپائی ہو۔

افسوس کہ بعض مشکلات اور ذرائع نے یہ کام جلدی سرانجام نہ ہونے دیا اور آپ (رحمۃ اللہ علیہ) وصال فرما گئے۔ لیکن ”انقلاب الحقیقت“ ۳۰۰ صفحات میں شایان شان طریقے سے طبع ہوئی۔ گرمی کا اثر آپ کی طبع مبارک پر بہت ہوتا تھا۔ گرمی کے روزے ہمیشہ ٹھنڈے مقامات پر رکھتے تھے۔ پاکستان بننے سے قبل دو مرتبہ سری نگر تشریف لے گئے۔ پاکستان بننے سے پہلے ہی ہمیشہ کیلئے علاقہ سون کے قصبہ کھوڑہ تحصیل خوشاب کو موسم گرما کیلئے منتخب فرمایا تھا۔ ملک حبیب الرحمن صاحب آپ کے نہایت مخلص خادم ہیں، ہمیشہ انہی کے مکان میں آپ کا قیام ہوتا تھا۔ اپنا کھانا اپنا پکانا، ایک ایک وقت میں بیس بیس پچیس پچیس مہمان ہوتے تھے جو لنگر سے ضروریات حاصل کرتے تھے۔ اکثر مقبول غلامان ہمیشہ ہمراہ ہوتے تھے۔ جب آپ کھوڑہ میں ہوتے تھے تو کھوڑہ کے درو دیوار بھی ذکر کرتے ہوئے محسوس ہوتے اور ان میں نور کی چمک دکھائی دیتی تھی، مسجدوں میں رونق ہوتی، گلیوں میں رونق ہوتی اور محفل دو وقت لگتی تھی۔ ولی اللہ کی محفل کا کیا کہنا، اللہ یاد آتا تھا۔ جولائی ۱۹۶۱ء میں آپ کو دائیں پسلی پر ایک ورم نکل آیا۔ کمزوری بڑھتی گئی، کھانا چھوٹ گیا، کھوڑے ہی میں تشریف رکھتے تھے۔ نوشہرہ کے سول ہسپتال سے ڈاکٹر صاحب آئے، معائنہ کیا، علاج شروع کیا۔ تین چار روز علاج کے بعد مجھے کہا کہ مولوی صاحب! امراض خطرناک ہے۔ آپ حضور رحمۃ اللہ علیہ کو لاہور لے جائیے۔ لاہور کی تیاری ہو گئی۔ ۱۶ اگست کو لاہور پہنچ گئے۔ سرسبز ہسپتال میں داخلہ مل گیا لیکن مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ ۲۳ اگست کو بائیں طرف فالج کا حملہ ہو گیا۔ ڈاکٹروں کے بورڈ بیٹھے، حکماء نے معائنہ کئے۔ ڈاکٹر محمد یوسف، ڈاکٹر کرنل ضیاء اللہ، ڈاکٹر عبدالقوی ہسپتال تشریف لے گئے۔ علاج میں کوئی کمی اور کچی نہیں ہے۔ یہ فیصلہ دے کر آگئے لیکن قضا و قدر کے قاضی نے کچھ اور فیصلہ لکھ لیا تھا۔

ہسپتال میں ایک بیماری کے علاج کیلئے گئے تھے۔ وہاں پہنچ کر تین بیماریوں نے گھیرا ڈال دیا جن میں سے ہر بیماری بڑی بیماری تھی۔ صدقات خیرات کی بھی کوئی کسر نہ چھوڑی، ختم کلام اللہ کئے گئے۔ لاکھ مرتبہ درود شریف پڑھا گیا، بیماری کے دفعیہ کیلئے یہ اکیسری نسخہ ہے یا سلام کا ختم پڑھا

گیا۔ ہزاروں مریدین رو رو کر ہر وقت اور ہر لمحہ دعا مانگ رہے تھے لیکن قدرت کا اٹل فیصلہ یہ تھا کہ اب اپنے محبوب کو ہم اپنے پاس بلا ہی لیں گے۔

تقدیر کا قلم چل چکا تھا، طیب اپنی دانش بھول چکے تھے۔ دعاؤں کا اثر ملتوی کر دیا گیا۔ وہ جن کی ایک نظر مردہ دلوں کو زندہ کر دیا کرتی تھی، وہ جو غریبوں کا سہارا تھے، وہ جن کی دعاؤں سے تقدیریں بدلی جایا کرتی تھیں، وہ جن کا جسم گلاب کا پھول تھا، وہ جن کی خوشبو میں عطر بسا ہوا تھا، محبت کا وہ مجسمہ الفت کا وہ دریا، رحمت، شفقت کا وہ بے مثال آفتاب ۲۶ اگست ۱۹۶۷ء مطابق ۱۹ جمادی الاول ۱۳۸۷ھ ایک بچے دن کے نوری فرشتوں کی جماعت میں انبیاء و اولیاء کی معیت میں اپنے حقیقی محبوب سے جا ملا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ۵

کئی تاریخجائے وفات لکھی گئیں، حضرت سید شریف احمد شرافت نوشاہی سجادہ نشین درگاہ عالیہ حضرت نوشہ گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ ساہن پال شریف، ضلع گجرات نے یہ تاریخ وصال لکھی۔

وانك لعلى خلق عظیم

۱۹۶۷ء

الغرض حضرت محمد عمر پیر بل شریف کی زندگی ہر لحاظ سے مرد کامل کی زندگی تھی، جنہوں نے اپنا مرنا جینا رضائے الہی کے مطابق کر لیا تھا۔ مریدوں کیلئے سراپا رحمت، گمراہوں کیلئے شمع ہدایت، اتحاد بین المسلمین کی عمدہ ترین تصویر انہوں نے جہاں روحانی اور عملی اقدار کو فروغ دیا، وہاں علم و شریعت کے فروغ کیلئے بھی خاص کردار ادا کیا۔ آپ جہاں کسی صاحب تصنیف بزرگ کو دیکھتے، اس کی بھرپور راہنمائی فرماتے۔ ”انقلاب الحقیقت“ اس کی زندہ جاوید تصویر ہے۔ آپ ہی کے فیوضات کے سہارے ماہنامہ سلسبیل نے مدتوں تعلیمات تصوف کو عام کرنے کا فریضہ ادا کیا۔ آج جب بھی آپ کا تذکرہ چھڑتا ہے تو آپ کی روحانی خدمات کو خراج عقیدت پیش کرنے کے ساتھ ساتھ آپ کے علمی اور نظریاتی مقام و مرتبہ کو بطور خاص اُجاگر کیا جاتا ہے۔ حق تو یہ ہے کہ:

نور حق تھا، عظمت ایمان کی پہچان تھا
غم کے ماروں کیلئے ہر درد کا درمان تھا
علم و حکمت اور طریقت کا نمونہ تھا عمر
شیر ربانی کی تعلیمات کا عرفان تھا



شمس العارفین حضرت خواجہ شمس الدین سیالوی رحمۃ اللہ علیہ

شمس العارفین حضرت خواجہ شمس الدین سیالوی رحمۃ اللہ علیہ کا شمار ان برگزیدہ اولیائے عظام میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنی ساری زندگی دین مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ اور اسلامی نظریات کی ترویج میں بسر کر دی تھی۔ قدرت کو جب کسی خاص خطے یا علاقے کی راہنمائی اور ظاہری و باطنی احوال کی اصلاح مقصود ہوتی ہے تو اس علاقے کو کسی دانائے راز اور مردِ کامل کے وجود سے نواز دیتی ہے۔ ایسا دانائے راز جو فطرت کے اسرار کو بے حجابانہ دیکھنے اور گم گشتگانِ منزل کی راہنمائی کے آداب جانتا ہو ایسا مردِ کامل جس کی اداؤں میں بوئے اسد اللہی اور نواؤں میں جمال فقر پوشیدہ ہو۔ حضرت خواجہ شمس الدین سیالوی رحمۃ اللہ علیہ کی صورت میں پنجاب کو ایک ایسا مردِ کامل میسر آیا جس نے دیکھتے ہی دیکھتے خلق خدا کو یوں خدا شناس بنا دیا کہ چاروں طرف توحید خداوندی اور عشق مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم کے قدسی زمزمے گونجنے لگے:

عمر با باید تا یک مردِ دل پیدا شود

بایزید اندر خراساں یا اولیں اندر قرن

حضرت خواجہ شمس الدین سیالوی رحمۃ اللہ علیہ ۱۲۱۴ھ کو سیال شریف ضلع سرگودھا میں پیدا ہوئے۔ یہ دور برصغیر اور خصوصاً پنجاب کے مسلمان کیلئے انتہائی صبر آزما تھا۔ پنجاب پر سکھوں کی حکومت تھی اور دوسری طرف انگریز مسلمانوں کے پایہ تحت دہلی کے خلاف دن رات ریشہ دوانیوں میں مصروف تھے۔ حضرت خواجہ شمس الدین سیالوی رحمۃ اللہ علیہ کے والد ماجد میاں محمد یار اپنے زہد و تقویٰ اور عبادت و ریاضت کی بناء پر علاقہ بھر میں ممتاز حیثیت کے حامل تھے۔ اس دور کے مسلمان صاحبان علم و عمل جس سیاسی و تمدنی بے چارگی اور محرومی سے دوچار تھے میاں محمد یار اس سے لاتعلق نہیں رہ سکتے تھے۔ آپ کو حق و صداقت کی پاسداری کی بناء پر کئی بار سکھوں کے مظالم سے دوچار ہونا پڑا۔ آپ کی انتہائی آرزو تھی کہ آپ کا فرزند شمس الدین دینی تعلیم کو بخشن کمال حاصل کرے تاکہ اس دور کے خوابیدہ مسلمانوں کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کا فریضہ انجام دے سکے۔

خواجہ شمس الدین سیالوی رحمۃ اللہ علیہ نے سات سال کی عمر میں قریبی مدرسے میں قرآن پاک ختم کر لیا، پھر علاقہ پنڈی گھیب میں میکی ڈھوک کے مقام پر تشریف لے گئے، جہاں آپ نے ابتدائی دینی کتب کی تعلیم حاصل کی، پھر مکھڑ کے صاحب کمان مولوی علی محمد کے حلقہ درس میں شامل ہو گئے۔ مکھڑ میں قریباً تیرہ برس قیام کر کے آپ نے علوم دینیہ کی تدریس مکمل کی۔ اسی دوران میں آپ کو ایک تاجر محمد امین کے ہمراہ افغانستان جانے کا اتفاق ہوا، جہاں کافی عرصہ مقیم رہ کر آپ نے کابل کے محترم عالم دین حافظ دراز سے ہدایہ شریف پڑھی اور حدیث شریف کی سند بھی حاصل کی۔ تحصیل علوم دین سے فارغ ہو چکے تو آپ کو کسی مرشد کمال کی جستجو نے آ لیا تا کہ قلبی و روحانی تسکین کا سامان مہیا آسکے۔ آپ کے استاد مولوی علی محمد بھی کسی شیخ طریقت کی تلاش میں تھے۔ ان دنوں سلطان الفقراء حضرت خواجہ محمد شاہ سلیمان تونسوی رحمۃ اللہ علیہ کی معرفت شناسیوں کی شہرت آپ تک پہنچی تو اپنے استاد محترم کے ہمراہ تونسہ شریف میں حضرت شاہ سلیمان تونسوی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت تونسوی کی زیارت کرتے ہوئے انہیں احساس ہوا کہ وہ گوہر کمال میسر آ گیا ہے جس کی تلاش انہیں عرصہ سے بے چین کئے ہوئے تھی۔ فوراً دونوں نے حضرت تونسوی رحمۃ اللہ علیہ کے دست حق پرست پر بیعت کی سعادت حاصل کی اور شیخ کمال کی نگاہ فیض ترجمان کی بدولت مقامات جذب و سلوک سے بہرہ ور ہونے لگے۔

قریباً چھ ماہ تک آستانہ عالیہ تونسہ شریف میں قیام کے بعد آپ حضرت مولوی علی محمد کی معیت میں مکھڑ واپس آئے تو مولوی صاحب کے اپنا تمام اثاثہ آپ کے سپرد کر کے مدرسہ کا انتظام بھی آپ کی نگرانی میں دے دیا۔ چونکہ مولوی صاحب کی اولاد نہ تھی اس لئے انہوں نے جملہ توقعات اپنے اس ہونہار شاگرد ہی سے وابستہ کر رکھی تھیں۔ آپ کو اپنے استاد محترم سے اس درجہ محبت تھی کہ ایک لمحہ بھی ان کی جدائی گوارا نہ کرتے تھے۔ آپ کے والدین آپ کی شادی کرنا چاہتے تھے مگر آپ کو استاد کی فرقت گوارا نہ تھی۔ بالآخر اپنے مرشد حضرت خواجہ محمد سلیمان تونسوی رحمۃ اللہ علیہ کے حکم کی تعمیل میں سیال شریف روانہ ہوئے اور پھر باقی عمر سیال شریف میں بسر کر دی۔

سیال شریف میں آپ کی مستقل تشریف آوری اس علاقہ کیلئے نہایت باعث برکت و سعادت ثابت ہوئی۔ آپ مرشد کے حسب ہدایات اوراد و اذکار پوری پابندی سے انجام دیتے رہے۔ فرصت کے وقت تدریس کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ سال میں کئی کئی مرتبہ پاپیادہ تونسہ شریف حاضری دیتے اور کم سے کم چالیس روز قیام کرتے، جب بتقاضائے عمر جسم میں استحلال اور کمزوری

رونما ہوئی تو بامر مجبوری سوار ہو کر تونسہ شریف حاضری دینے لگے۔ مرشد کی خدمت میں حاضری آپ کیلئے بے پناہ مسرت و شادمانی کا باعث بنتی۔ آپ نے چودہ مرتبہ حضرت پیر پٹھان شاہ محمد سلیمان تونسوی کی قیادت میں تونسہ شریف سے مہار شریف کا سفر اس شان سے کیا کہ حضرت پیر پٹھان تونسوی ایک تیز گھوڑی پر سوار ہوتے اور حضرت شمس الدین سیالوی اپنے مرشد کا قرآن کریم مع رحل اور دیگر وظائف سر پر رکھے پانی کا بھرا ہوا کوزہ دائیں ہاتھ میں حضور کا عصا اور مصلیٰ بغل میں لئے بادۂ عقیدت سے مخمور ہو کر حضرت کی گھوڑی کے آگے آگے دوڑتے۔ لوگ دیکھتے تو پہچان لیتے کہ شہباز معرفت روحانی سر بلندیوں کی جانب پرواز کرنے کیلئے پرتول رہا ہے۔ اس ضمن میں یہ امر خاص طور سے قابل ذکر ہے کہ تونسہ شریف سے مہار شریف قریباً ایک صد پچاس میل کی طویل مسافت پر واقع ہے اور اُس دور میں یہ علاقہ ریگستان کا نمونہ پیش کیا کرتا تھا۔

ایک مرتبہ آپ یونہی پابرنہ شیخ کی گھوڑی کے آگے چل رہے تھے تہتی ہوئی ریت پر چلتے ہوئے کانٹوں اور کنکروں نے پاؤں کو اس قدر زخمی کیا کہ چلنے کا یارا نہ رہا مگر فوراً محبت دیکھتے کہ چلے جاتے تھے مرشد کمال کی نگاہ پڑی تو اپنی پاپوش مبارک اُتار کر عطا کی کہ پہن لو آپ نے تحفہ تو قبول کر لیا مگر چوم کر اپنے سر پر رکھ لیا۔ شیخ کی عطا کردہ جوتیاں پاؤں میں نہ پہنیں۔ کچھ وقت پر شیخ کمال نے آپ کو پھر ننگے پاؤں دیکھا تو اپنے عطا کردہ پاپوش مبارک کے بارے میں سوال کیا۔ حضرت شمس الدین سیالوی نے بصد ادب عرض کیا کہ میں نے ان جوتیوں کو وہاں سجا لیا ہے جو ان کیلئے مناسب ترین مقام ہے۔

حضرت پیر پٹھان اپنے مرید کی سعادت مندی اور حسن عقیدت سے از حد متاثر ہوئے۔ گھوڑی سے نیچے اترے اور سعید بخت مرید کو سینے سے لگا لیا۔ اس وقت شیخ کا دریائے کرم جوش پر تھا، خوش قسمت مرید کو اس موقع پر جو کچھ عطا ہوا وہ اس قدر قابل رشک تھا کہ حضرت سیالوی زندگی بھر اس ساعت سعید پر ناز فرماتے رہے۔

جب حضرت شمس الدین رحمۃ اللہ علیہ سیالوی کی عمر چھتیس برس کی ہو گئی اور عبادت و ریاضت کی بدولت آپ پر اسرار معرفت منکشف ہونے لگے تو حضرت شاہ محمد سلیمان تونسوی رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کو خرقہ خلافت عطا فرمایا اور فرمایا کہ میں تمہیں اس احساس کے ساتھ بیعت و خلافت کی اجازت دے رہا ہوں کہ تم زندگی بھر راہ صداقت کی تلاش میں بھٹکنے والوں کو جادۂ حق پر گامزن کرتے رہو گے۔ آپ نے اس عظیم منصب کی قبولیت سے معذوری ظاہر کی تو حضرت پیر پٹھان رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ہچکچاہٹ کیسی؟ اب تم ہم سے جدا نہیں ہو تمہاری بیعت حقیقت میں ہماری ہی

بیعت ہوگی۔ میں تجھے حکم خداوندی سے بیعت کا مجاز کر رہا ہوں۔ شیخ کامل کی نظر عنایت سے آپ کے روحانی کمالات کا شہرہ چاروں طرف پھیل گیا اور لوگ جوق در جوق کسب فیض کیلئے آپ کی خدمت عالیہ میں حاضری دینے لگے۔

حضرت سیالوی رحمۃ اللہ علیہ کا اندازِ تبلیغ حد درجہ موثر اور سادہ تھا، نہ مناظرہ، نہ مباحثہ، پیار و محبت کی فراوانی تھی، شفقت و عنایات کا بحر بے کراں اٹھا رہتا۔ ساٹھلان طریقت پروانہ دار آپ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوتے اور دامان مقصود کو بھر کر لے جاتے۔ بڑے بڑے عالم اس توقع پر حاضر ہوتے کہ ہم اس شیخ کو اپنی علمی صلاحیتوں سے زچ کر دیں گے مگر جونہی وہ آپ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوتے، اپنا علمی غرور فراموش کر کے آپ کے دامانِ فیض سے وابستگی کو سعادت تصور کرنے لگتے۔ نامور فضلاء حاضر ہوتے تو انہیں احساس ہوتا کہ اس صاحبِ حکمت و فضیلت کے سامنے ان کی حیثیت ابجد خواں سے زیادہ نہیں ہے۔ حضرت کی خدمت اقدس میں ہر قسم کے لوگ آیا کرتے تھے، فقیر بھی، امیر بھی، گدا بھی اور نواب بھی، عالم و فاضل بھی اور ان پڑھ اور جاہل بھی، ہر شخص حسب ظرف و ضرورت اس شہباز طریقت کے فیوض و برکات روحانی سے فیضیاب ہوتا۔ آپ کے حضور حاضری سے قبل ہر ایک کا علیحدہ رنگ ہوتا مگر جب وہ آپ کی خدمت عالیہ میں حاضری دیتا تو ہر بہت جلد اس پر آپ کا رنگ طریقت غالب آ جاتا اور وہ سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرتے ہوئے تبلیغ اسلام کی خاطر اپنا تن من دھن وقف کر دیتا۔ سچ ہے کہ:

نگاہِ ولی میں یہ تاثیر دیکھی
بدلتی ہزاروں کی تقدیر دیکھی

حضرت خواجہ شمس الدین سیالوی قدس سرہ کے عہد ولایت میں جس کثرت سے علمائے ظاہر نے آپ کی خدمت میں حاضری دی، اس پائے کے علماء کی اتنی بڑی تعداد ہمیں اور کہیں نظر نہیں آتی۔ یہ حقیقت ہے کہ اس دور میں جبکہ کفر و ضلالت کے تاریک سنائے چاروں طرف منڈلا رہے تھے، مسلم سلطنت کا چراغ گل ہو چکا تھا اور مسلمان احساس زیاں سے عاری ہو کر خواب غفلت میں رہ بھوش ہو چکے تھے، اگر آپ اپنے علاقہ میں تبلیغ اسلام کا فریضہ انجام نہ دیتے تو نہ معلوم اس علاقہ میں ان دنوں مذہبی صورتحال کیا ہوتی۔ انیسویں صدی کے تاریک ماحول میں اس رہبر کامل نے جو شمع روشن کی اور جس طرح اپنی مسیحا نفسی سے مردہ دلوں کو ایمانی حرارت عطا کی اس کا تذکرہ باعث برکت بھی ہے اور وجہ افتخار بھی۔ آپ اپنے روحانی تصرفات اور باطنی توجہات سے بندگانِ خدا کا

ٹوٹا ہوا رشتہ خالق سے جوڑتے رہے۔ آپ کی تقلید میں آپ کے خلفاء برصغیر پاک و ہند میں چاروں طرف پھیل گئے اور ملک کے اطراف و اکناف کو ایمانی روشنی سے منور کر دیا۔

حضرت پیر مہر علی شاہ گولڑوی رحمۃ اللہ علیہ کہ جنہیں آپ کی روحانی صحبت و تربیت میسر آئی تھی، آپ کو یوں خراج عقیدت پیش کرتے ہیں:

شمس نورانی کہ نور مطلق است
درہمان آفاق نورش مطبق است
گرندادے نام پاکت دست را
کس ندیدے در جہاں این مست را
ہر دو عالم وز ہر ایش باختہ
پائے از دیدہ برائش ساختہ
آں کہ سروے از گلستان ہدی
شاہبازِ قدس آں شمس العلوی

چونکہ آپ کا حقیقی مقصود سنت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دلوں میں اُجاگر کرنا تھا، اس لئے آپ خود بھی احکام شریعت کی انتہائی پابندی فرماتے اور مریدوں اور ارادت مندوں کو بھی احکام شریعت پر عمل پیرا ہونے کی سختی سے تلقین فرمایا کرتے۔ نماز باجماعت پر بطور خاص زور دیتے۔ مسلمانوں کو اتحاد و یگانگت سے زندگی بسر کرنے کی ہدایت فرماتے۔ آپ کی کرامات بہت زیادہ ہیں جن سے آپ کے روحانی تصرف اور باطنی سر بلندیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کرامات کی عظمت اپنی جگہ مسلم لیکن حقیقت ہے کہ آپ کی سب سے بڑی کرامت یہ تھی کہ آپ نے صراطِ مستقیم سے بھٹکنے والوں کو پھر سے خدا کی پہچان کرا دی، عصیاں کاروں کو ذوقِ عبادت عطا کیا، تاریکیوں میں بھٹکنے والوں کو ایمان کا اُجالا بخشا اور اہل نظر کو خدا شناسی کی وہ لذت عطا کی کہ وہ خلاق سے بیگانہ ہو کر یادِ خدا میں ہمیشہ کیلئے مشغول ہو گئے۔

حضرت خواجہ کی تاریخ وصال ۲۴ صفر ۱۳۰۰ھ ہے۔ وفات سے پیشتر آپ نے اپنے صاحبزادہ اور جانشین حضرت خواجہ محمد دین ثانی کو بلایا اور فرمایا کہ ”مجھے دو چیزوں سے پیار ہے اور یہ دونوں چیزیں مجھے پیرانِ عظام سے مرحمت ہوئی ہیں۔ اول محبت درویشاں اور دوم اطاعت مرشد تم توکل تسلیم اور صبر و قناعت کو اپنا معمول بنانا اور خلقِ خدا کی راہنمائی سے کبھی غافل نہ ہونا۔ صاحبزادہ

صاحب نے گزارش کی کہ ”میری دعا ہے کہ آپ مزید چالیس برس تک یونہی راہنمائی کا فریضہ انجام دیتے رہیں۔“ آپ یہ سن کر پہلے تو خاموش ہو گئے اور پھر فرمانے لگے کہ ”مجھے تو چالیس دن کا بھی اعتبار نہیں ہے کیونکہ میں نے خدا سے التجا کی ہے کہ میری عمر اپنے پیر و مرشد خواجہ تونسوی رحمۃ اللہ علیہ کی عمر کے موافق ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ میری عمر کا پیمانہ لبریز ہونے والا ہے کیونکہ حضرت تونسوی نے ماہ صفر میں انتقال فرمایا تھا شاید ہماری رحلت بھی اسی ماہ صفر میں ہو جائے۔ یہ سن کر صاحبزادہ صاحب شدت غم سے بے قرار ہو کر رونے لگے۔ آپ نے فرمایا کہ نور چشم میں چاہتا تھا کہ اسرارِ یزدانی سے تم کو آگاہ کروں مگر تم تھوڑی سی بات پر بے خود ہو گئے۔ دنیا کی فانی زندگی کا کوئی اعتبار نہیں ہر شخص نے ایک دن جام اجل پینا ہے اس لئے حق تعالیٰ کی یاد میں زیادہ سے زیادہ مصروف رہو۔ وفات کے روز آپ دست مبارک میں تسبیح لے کر درود شریف پڑھتے رہے اور پاس انفاس میں مشغول ہو گئے۔ پھر حاضرین کی طرف الوداعی نظروں سے دیکھ کر قبلہ رو ہو گئے اور مطلع رشد و ہدایت کا وہ بدر کامل جو قریباً نصف صدی تک دلوں کو سنت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی سے منور کرتا رہا تھا موت کے دامن میں روپوش ہو گیا۔

مفتی غلام سرور لاہوری نے بھی آپ کی تاریخ وفات یوں لکھی ہے:

دریغاً	صد	دریغاً	صد	دریغاً
کہ	شمس	الدین	امام	العارفین
ہزار	افسوس	کیں	مہر	جہاں
بہ	اوج	عرش	ز	فرش
چوں	سرور	جست	تار	مخمش
بگفتا	شمس	اوج	علم	دین

۱۳۰۰ھ

حضرت خواجہ شمس الدین سیالوی قدس سرہ نے اپنے علاقہ میں تبلیغ و ترویج اسلام کے جس عظیم مقصد کا بیڑا اٹھایا تھا تائید ایزدی کی بدولت وہ مقصد عام ہو کر رہا۔ آپ کے ظاہری و باطنی فیوض نے نہ صرف اپنے علاقہ کو نور ایمان سے منور کیا بلکہ برصغیر پاک و ہند کے اطراف و اکناف میں آپ کا روحانی فیض ایک بحر بے کراں کی صورت پھیل گیا۔ حق تو یہ ہے کہ آج ہم دین مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم کی جن برکات سے فیضیاب ہو رہے ہیں ان کو عام کرنے میں حضرت خواجہ شمس

الدين سيالوي رحمۃ اللہ علیہ کی خدمات جلیلہ آب زر سے لکھنے جانے کے قابل ہیں۔ حضرت خواجہ شمس الدین سیالوی رحمۃ اللہ علیہ کے بعد آپ کے وارثین علم و حکمت نے آپ کے مقدس مشن کو جاری رکھا۔ آپ کے خلفاء نے برصغیر میں سلسلہ عالیہ چشتیہ کی اشاعت کے سلسلے میں خاص کردار ادا کیا۔ زمانہ روزِ ازل سے محو سفر ہے لیکن شمس العارفین حضرت خواجہ شمس الدین سیالوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سیرت و کردار اتباع سنت مصطفویٰ اشاعت اسلام اور خدمت خلق خدا کے جولا زوال نقوش چھوڑے ہیں وہ وقت کی پیشانی پر ہمیشہ جگمگاتے رہیں گے اور اہل ایمان ان کی بدولت قلب و نظر کی روشنی کا اہتمام کرتے رہیں گے۔ سچ ہے:

صاحبانِ عشق مثل مہر حق تابندہ ہیں
آبروئے زندگی میں تا ابد پائندہ ہیں



خواجہ محمد دین سیالوی رحمۃ اللہ علیہ

وقارِ علم روحانی، محمد دین خواجہ ہیں
جمالِ بزمِ ایمانی، محمد دین خواجہ ہیں
فقیری دیکھ کر جن کی سلاطین رشک کرتے تھے
وہی تو جانِ سلطانی، محمد دین خواجہ ہیں
فیوضِ خواجہ شمس العارفین کو تازگی بخشی
ضیائے شمعِ نورانی، محمد دین خواجہ ہیں
دلوں کو کر دیا روشن جمالِ معرفت دے کر
کمالِ حسنِ ایمانی، محمد دین خواجہ ہیں
زمانے میں فیوضِ چشتیہ کو روشنی بخشی
پیامِ فکرِ برہانی، محمد دین خواجہ ہیں
یہی وہ لوگ ہیں جن سے دلوں کو چین ملتا ہے
بہارِ حکمِ یزدانی، محمد دین خواجہ ہیں
شریعت کو عطا کی سربلندی اس زمانے میں
فروغِ نورِ قرآنی، محمد دین خواجہ ہیں
لحد ان کی رضا ہو عظمتِ ایمان کی مظہر
جہاں میں حسنِ روحانی، محمد دین خواجہ ہیں

اشرف الاولیاء

حضرت خواجہ محمد دین ثانی (رحمۃ اللہ علیہ)

﴿سیال شریف﴾

سیال شریف کی سر زمین معرفت کو یہ اعزاز حاصل رہا ہے کہ یہاں یکے بعد دیگرے ایسی شخصیات نے جنم لیا ہے جنہوں نے نہ صرف اپنے اسلاف کے فیوض کے سلسلے کو جاری و ساری رکھا بلکہ سلسلہ عالیہ چشتیہ نظامیہ کو پنجاب میں بہار جاوداں بخشنے کیلئے لاٹانی کردار ادا کرتے رہے۔ حضرت خواجہ محمد دین ثانی رحمۃ اللہ علیہ بھی ایسی ہی نادر روزگار شخصیت تھے جنہوں نے عظیم المرتبت پدر بزرگوار کی روحانیت کے چراغوں کی لو کو تیز تر کر دیا۔ آپ کی بصیرت افروز راہنمائی نے خلق ہدایت کو راہ مستقیم پر چلنے کا شعور بخشا۔ آپ کے کردار عالی اور فیوض و برکات کو دیکھ کر بے اختیار کہنا پڑتا ہے:

الہی تابود خورشید و ماہی
چراغ چشتیاں را روشنائی

ولادت سراپا سعادت

سیدی خواجہ محمد الدین ثانی رحمۃ اللہ علیہ ۱۲۵۳ھ / ۱۸۳۷ء میں آستانہ قدسیہ سیال شریف میں حضور شمس معرفت خواجہ محمد شمس الدین سیالوی رحمۃ اللہ علیہ کے کاشانہ اقدس میں دنیائے ظاہری میں تشریف فرما ہوئے۔

تعلیم و تربیت

ابتدائی فارسی درسیات اپنے عظیم المرتبت والد گرامی سے پڑھیں۔ حضور شمس معرفت ظاہری علوم کے بھی محقق و مدقق عالم تھے اور اپنے شیخ گرامی حضرت سلیمان دوراں تونسوی کی سنت کو جاری رکھتے ہوئے تدریس بھی اختیار فرما رکھی تھی۔ اپنے لخت جگر اور نور نظر کو بھی ابتدائی فارسی درسیات کا

خود سبق دیا۔ دراصل ہماری ابتدائی فارسی درسیات میں اخلاق اسلامی اور تصوف کی تعلیم کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ آپ کریم اور چند نامہ عطار پر سرسری سی نظر ڈالیں تو آپ اسلامی اخلاق اور نبوی تصوف کا مہکتا گلشن اپنی نظروں کے سامنے پائیں گے۔ آج جدید تعلیمی نصابات میں اخلاقیات کا کہیں مستقل درس نہیں ہے۔ ہمارے قدیم نصاب کے مرتبین کے سامنے یہی حقیقت تھی کہ اگر طالب علم ابتدائی درسیات میں اخلاق اسلامی اور تصوف محمدی سیکھ لے گا تو عملی زندگی میں ”سراپا خیر“ بن جائے گا۔ اسی بناء پر آغاز ان کتب سے کرایا جاتا تھا اور اس گئے گزرے دور میں بھی ہمارے دینی مدارس میں یہ کتب شامل نصاب ہیں۔

جب ان کتابوں کے پڑھانے والے شمس معرفت ہوں اور طالب علم ثانی لاٹانی سیالوی ہوں تو واضح بات ہے کہ یہ اشعار مجسمہ عمل بن کر حیات ثانی میں داخل ہو گئے ہوں گے اور انھیں شمس نے اپنے بیٹے کے دل و دماغ میں عشق رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم بھر دیا ہو گا جسے اخلاق اسلامی نے مزید جلا دی ہوگی اور یہی چیز آگے چل کر ہم حضرت ثانی کی زندگی میں پاتے ہیں۔

ابتدائی فارسی درسیات کے بعد آپ نے علوم دینیہ مولانا محمد سلیمان اور کچھ عرصہ مولانا فتح محمد آف لیانہ ضلع جھنگ سے پڑھے۔ اعلیٰ کتب اور تکمیلی مرحلہ حضرت خواجہ معظم الدین مردلوی رحمۃ اللہ علیہ سے طے فرمایا۔

حضرت شمس العارفین کے حلقہ معرفت میں درجنوں ایسے علماء تھے جن پر زمانہ ناز کرتا تھا۔ خواجہ مردلوی تو اپنی نظیر آپ تھے۔ پھر پیر سید گولڑوی جیسی شخصیات جو اس آستانے سے وابستہ تھیں انہوں نے بھی آپ کو مسلسل نوازے رکھا۔ آپ کے اساتذہ گرامی کی طویل فہرست جنہوں نے اس مرد لاٹانی کو سیال شریف کا اعزاز بنانے کیلئے بھرپور کردار ادا کیا۔ آپ کے فیض عام کی ایک جھلک آپ کے تذکار سے ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

حضرت خواجہ غریب نواز ثانی تو نسہ شریف کے سفر میں واپسی پر علاقہ دھنی کی بستیوں میں تشریف لے گئے۔ گاؤں کے پیر بھائی ایک دو منزلیں پہلے ہی پاکی لے کر پہنچ جاتے، کیونکہ بوجہ ضعف اور کبر سنی بغیر پاکی کسی اور سواری سے آپ سفر نہیں کر سکتے تھے۔ آپ نے اپنے سفر کا حال اپنی زبان سے حضرت مولانا محمد ذاکر بگوی رحمۃ اللہ علیہ کو سنایا جب مولانا محمد سعید مرحوم بھی مجلس میں موجود تھے۔ آپ نے بتایا کہ ایک گاؤں سے جانے کیلئے آپ پاکی میں سوار تھے اور مریدین اسے اٹھائے ہوئے تھے۔ اتفاق سے اس روز محرم کی پانچویں تھی، جب پاکپتن شریف میں بہشتی دروازہ

کھلنے کا دن ہوتا ہے۔ ایک نے کہا:

”ہمارے لئے بہشتی دروازہ یہی ہے جو بہشتی بنا چاہتا ہے اس پاکی کے نیچے سے گزر جائے۔“
یہ کہنا تھا کہ ہندو مسلمان پیر بھائی اور دوسرے سبھی لوگوں نے نیچے سے گزرنا شروع کر دیا۔
حضرت خود رقت قلب سے پانی پانی ہو رہے تھے اور بارگاہ الہی میں عرض کر رہے تھے:

”یا اللہ! میں عاجز بندہ جو کچھ ہوں تو اچھی طرح جانتا ہے ان (بندوں) کے نیاز و اخلاص کی داد تو خود ہی دینا۔“ (تذکار بگوئیہ، ص ۲۳۲، ۲۳۳)

عظیم محدث، مفسر اور سیرت نگار ضیاء الامت جسٹس پیر کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ آپ کے حوالے سے رقمطراز ہیں:

آپ کے عہد میں سلسلہ چشتیہ کو بڑی ترقی ہوئی۔ ملک کے دور دراز گوشوں سے بندگان خدا فقیر کے آستانہ عالیہ کی طرف کھنچے چلے آ رہے تھے۔ قافلوں کے قافلے حاضر خدمت ہوتے اور مئے محبت سے مخمور و سرشار ہو کر اپنے گھروں کو واپسی لوٹتے۔ اس جاہ و جلال شاہی کے باوجود تواضع و انکسار کی کوئی انتہاء نہ تھی اور شان و نوازی کی جلوہ سامانیاں ہر دیکھنے والے کو محو حیرت کر دیا کرتی تھیں۔ آستانہ عالیہ کے ادنیٰ سے ادنیٰ نیاز مند کے ساتھ بھی وہ لطف و کرم فرماتے کہ وہ نیاز مند اپنی خاکساری پر ناز کرنے لگتا۔ اعلیٰ حضرت کے خلفاء کے ساتھ بڑی شفقت سے پیش آتے اور ان کی روحانی تربیت اور ظاہری سرپرستی میں کمال فیاضی فرماتے۔ دیکھنے والے شمس العارفین کے عہد میں اور حضرت ثانی کے عہد میں بڑی مشکل سے تمیز کر سکتے تھے۔

حضرت کا لنگر بڑا وسیع تھا، سینکڑوں درویش جو ذکر الہی سیکھنے کیلئے یہاں فروکش ہوتے ان کی خاطر مدارت میں پوری کوشش کی جاتی۔ آستانہ عالیہ پر حاضر ہونے والے مہمانوں کے آرام و آسائش کیلئے آپ ہر ممکن اہتمام فرماتے اور کوئی بعد از وقت آنے والا مہمان اور مسافر بھی بھوکا نہ رہتا۔ حضرت کا معمول تھا کہ رات کا کھانا نماز عشاء ادا کرنے کے بعد تناول فرماتے اور اس میں حکمت یہ تھی کہ اگر کوئی مہمان تاخیر سے آئے اور لنگر میں کھانا ختم ہو گیا ہو تو حضرت اپنا کھانا پیش کر دیتے۔ وسیع لنگر کے انتظامات کے ساتھ ساتھ دارالعلوم کی ترقی کیلئے بھی خصوصی توجہ فرماتے۔ سینکڑوں کی تعداد میں طلباء اکتساب علم کیلئے موجود رہتے۔ ان کی رہائش، خوراک اور تعلیم کا مفت انتظام کیا جاتا۔ آستانہ عالیہ پر جو عظیم الشان عمارات نظر آ رہی ہیں ان میں سے بیشتر حضرت کے ذوق لطیف اور ہمت بلند کا شاہکار ہیں۔ روضہ مقدسہ معنوی حسن و خوبی کے علاوہ صوری جاہ و جلال

میں بھی عدیم النظیر ہے۔ اس کی بلندی اس کی پختگی اور اس کے اندر ماہر کاریگروں نے جو نقش و نگار اور گلکاری کی ہے اسے دیکھ ایک عجیب قسم کی روحانی آسودگی محسوس ہونے لگتی ہے۔ اس کو تعمیر ہوئے ایک سو سال سے زائد عرصہ گزر گیا ہے لیکن نقش و نگار کی تابناکی میں ذرا فرق نہ آیا۔

تحصیل خوشاب میں انکے ایک مشہور قصبہ ہے۔ قاضی سلطان محمود کا زمانہ تھا جن کی شہرت ایک زمانے تک پہنچ چکی تھی۔ قاضی صاحب کو پتہ چلا کہ ان کے ضلع شاہ پور میں سیال کے مقام پر ایک درویش جو سماع سنتا ہے لوگ کثرت سے اس کے مرید بنتے جا رہے ہیں۔ قاضی صاحب کی رگ مناظرہ پھڑکی۔ ایک جانور پر کتابوں کا گٹھڑا لادا۔ ان کے معتقدین کی بڑی تعداد بھی ہمراہ تھی۔ اب اتفاق دیکھئے کہ قاضی سلطان محمود سیال شریف میں اس وقت پہنچے جب خواجہ محمد دین کے والد عالی مقام خواجہ شمس العارفین قوالی کی محفل سجائے ہوئے تھے۔

مجلس آراستہ بھی معرفت کے موتی لٹ رہے تھے۔ قاضی صاحب نے آؤ دیکھا نہ تاؤ آداب مجلس کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے کہنے لگے کہ میں نے سنا ہے کہ آپ شریعت کی خلاف ورزی کرتے ہیں اور ایسے کام کرتے ہیں جو شریعت میں ممنوع ہیں۔ حضرت نے قاضی صاحب کی بات سن کر بڑے تحمل سے فرمایا۔ قاضی صاحب میری گردن بلکہ میری سات پشتوں کی گردن شریعت کے سامنے جھکی ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ مجھے خلاف شریعت کام کرنے سے بچائے۔ یہ جواب سننے کے بعد قاضی صاحب تھوڑی دیر خاموش بیٹھے رہے پھر وضو کرنے کیلئے شرقی کنواں پر تشریف لے گئے۔ ان کے چلے جانے کے بعد حضرت نے قوالوں کو اشارہ کیا تو انہوں نے پنجابی کے ان بولوں سے محفل سماع کا آغاز کیا:

جھنگ کنوں دل تنگ پیوسے پچھاں ہزارے دیاں دانان

میرے ماہی دیاں مٹھیاں باتاں جیوں کھنڈ شکر بناتاں

قاضی صاحب سماع کی آواز سن کر غصے سے دوڑتے ہوئے آئے۔ بار بار کہہ رہے تھے پھر بھی آپ باز نہ آئے۔

جب قاضی صاحب قریب پہنچے تو حضرت نے ایک بار نگاہ بھر کر دیکھا ان پر وجد کی کیفیت طاری ہو گئی اور غش کھا کر گرے اور ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگے۔ اور قوال برابر ان بولوں کو دہرا دہرا کر قاضی صاحب کی آتش شوق کو بھڑکا رہے تھے۔ قاضی صاحب بہت بڑی دستار باندھا کرتے تھے جو ان کے علم و فضل کی گواہی دیتی تھی۔ اس مستی و شوق میں اپنی دستار سر سے اتاری اور

قوالوں کو جا کر نذر کر دی۔ اس محفل پر مستی و کیف کا جو رنگ چڑھا ہوگا اس کی ماہیت کیونکر بیان کی جاسکتی ہے۔ قوال جب اس بول کا تکرار کرتے تو آپ تڑپتے اور یہ نعرہ لگاتے:

حق او یارو حق! حق اور یارو حق

حضرت ثانی غریب نواز اس محفل پاک میں حاضر تھے۔ جب قاضی صاحب نے اپنی دستار قوالوں کو نذر کی تو آپ چپکے سے اٹھ کر گھر تشریف لے گئے۔ گھر میں سونے چاندی کے جتنے زیورات تھے سب اٹھا کر لائے اور قوالوں کو پیش کر کے ان کے عوض قاضی صاحب کی دستار ان سے لے لی اور فرمایا یہ عالم کی دستار ہے اور اسی کے سر پر زیب دیتی ہے پھر قاضی صاحب کے سر پر وہ دستار باندھ دی۔ اعلیٰ حضرت غریب نواز اپنے فرزند دلہند کی اس ادا شناسی پر بڑے مسرور ہوئے اور آپ کو دعاؤں سے نوازا۔ مردان خدا مناظرہ کے اکھاڑوں کو یوں اپنی چشم کرم سے عشق و محبت کے خیاباں میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ اس قسم کے واقعات شاذ و نادر ہی نہیں بلکہ ہر روز کا معمول تھے۔ خدنگ ناز کی زد میں جو آیا جانے نہیں دیا۔

صاحبزادہ محمد معظم الحق معظم آبادی آپ کے بارے میں فرماتے ہیں:

۱۳۰۰ھ میں حضرت شمس العارفین رحمۃ اللہ علیہ کا وصال مبارک ہوا۔ اب گلستان سیال کو زیب و زینت کس طرح عطا ہوگی اور چمنستان طریقت کی رکھوالی کرنا، اس دبستان محبت کی شگفتگی قائم رکھنا اور اس میخانہ عشق کی بھیڑ کو برقرار رکھنا خواجہ محمد دین سیالوی کی اولین ذمہ داری تھی۔ حضرت اعلیٰ سیالوی کے وصال سے ایک مرتبہ بلا کشان محبت ہر سو اندھیرا اندھیرا محسوس کرنے لگے جن لوگوں نے عرفان خداوندی کو سینوں میں مچلتے دیکھا تھا، جبینوں میں انوار خداوندی کو چمکتے دیکھا تھا، ہر خاص و عام کیلئے پیر سیال کو سراپا مہر و فابنتے دیکھا تھا تو وہ اپنی دنیا اجڑتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ عین اس لمحہ میں حضرت خواجہ محمد دین سیالوی نے اپنے اعلیٰ اخلاق و دلکش اور من موہنی اداؤں اور اپنے والد گرامی کے نور نسبت اور اپنے مرشد عظیم پیر پٹھان کی توجہ کاملہ سے اس مسند کو وہ رونق بخشی کہ گلشن پیر سیال میں ایک رنگ، ایک بہار آگئی۔ فیض پیر سیال پہلے سے دوگنا ہو گیا۔ بقول ارباب طریقت ”صاحب مزار بزرگ کا فیض اس لئے زیادہ ہوتا ہے کہ دنیا میں اس کی نوحے توجہ خالق کی طرف اور ایک حصہ مخلوق کی طرف ہوتی ہے، اور قبر میں معاملہ اس کے برعکس ہو جاتا ہے۔ نوحے توجہ مخلوق کو نصیب ہوتی ہے تو اعلیٰ حضرت سیالوی کی اسی توجہ کا ظہور حضرت ثانی کی ذات انور سے شروع ہو گیا۔“

بروایت منشی امیر بخش صاحب مؤلف انوار شمسیہ (یہ کتاب حضرات سیالوی کے تذکرہ میں ایک معتبر نام ہے) حضرت ثانی نے فیض شمس کو اس زور سے تقسیم فرمایا کہ انوار شمس کی ضیاء پاشیاں چہار دانگ عالم میں پھیل گئیں۔ کچھ روحانی مقامات اور باطنی کیفیات میں حضرت ثانی اپنے والد بزرگ سے بھی سبقت لیتے نظر آنے لگے۔

ہونہار بروہ کے چکنے چکنے پات بچپن ہی سے آپ کی طبیعت میں وہ کل باتیں موجود تھیں جن سے ایک انسان کامل کی طبیعت دوسرے افراد سے بالکل الگ اور ممتاز ہوا کرتی ہے۔ آپ کریم ابن کریم تھے۔ اسی لئے تو یہ حال تھا کہ گھر سے روٹی باہر اٹھالاتے اور چھوٹے چھوٹے ہم عمر کم سن بچوں سے بانٹ کھاتے اور کہتے کہ میں تمہیں لنگر تقسیم کر رہا ہوں۔ حضرت صاحب اعلیٰ کو محبت تو آپ سے بہت تھی مگر اس کا اظہار ظاہری طور پر بہت کم ہوا اور نہ گود میں لے کر بہت پیار کیا۔ مگر توجہ عنایت یہ تھی کہ ایک دفعہ جبکہ آپ صرف سات آٹھ سال کی عمر میں صاحب فراش ہوئے تو حضرت صاحب اعلیٰ نے چار پائی کے قریب کھڑے ہو کر آپ کی طبیعت کا حال دریافت فرمایا۔ اس عاشق شیدانے جواب میں عرض کیا ”غریب نواز“ اوپری اوپری پرسش میں ہی نہ رکھے گا بندہ تو آپ کی توجہ باطنی کا بھوکا ہے۔ یہ عشق تھا نوخیز جو ازل ہی سے آپ کے حصے میں آیا اور یہ درد تھا روز افزوں جو عنایات وہی ہی سے آپ کو ملا اور ہمیشہ آپ کے دل پر قربان رہا۔

قصہ دارورسن بازئی طفلانہ دل
النجائے ارنی سرخی افسانہ دل

مولوی صاحب مولوی رحمۃ اللہ علیہ مہتمم لنگر خانہ تھے اور حضور کم سن تھے۔ خراماں خراماں تشریف لائے اور مولوی صاحب سے چند روپے مانگے۔ انہوں نے انکار کیا اور عرض کیا کہ لنگر کا روپیہ بغیر منظوری حضرت صاحب میں کسی کو نہیں دے سکتا۔ حضور نے چپکے سے مٹھی بھری اور بھاگ گئے مولوی صاحب بہ بیچ و تاب بسیار حضرت صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس واقعہ کو عرض کرنے کے بعد کہنے لگے کہ غریب نواز اس طرح مجھ سے کام نہیں ہو سکتا، آپ فرمانے لگے ”خیر“ اس لفظ کے فرماتے ہی معاً مولانا موصوف کی جملہ نسبتیں سرد ہو گئیں جب تک خود ہمارے حضرت صاحب نے معافی کی مرہم مولوی صاحب کے سینہ پر نہیں لگائی درد دور نہیں ہوا۔

”بہ کمال حسن و خوبی تو مسیح جان مائی“

جو ہاتھ لگا، حتیٰ کہ زیور تک بھی اکثر اوقات دولت خانہ سے اٹھالائے اور درویشوں کے

کھانے اور کپڑے میں صرف کر دیئے۔ مولانا محمد ذاکر بگوی تونسہ شریف آپ کی معیت میں جانے کے خواہش مند تھے مگر ایسا نہ ہو سکا۔ اتنے میں خواجہ محمد دین روانہ ہو گئے۔

ایک روز شام کی نماز پڑھنے لگے سجدہ سے سر اٹھاتے ہی اسی طرح بیٹھے رہ گئے آخر سلام پھیر دیا۔ کئی درویشوں نے بھی ساتھ ہی نیت توڑ دی اور خیال کیا کہ شاید آپ کا وضو جاتا رہا۔ عرض کرنے پر فرمانے لگے کہ وضو تو بہت بری طرح ٹوٹا ہے آپ جلد اسباب اٹھاؤ گاڑی آنے والی ہے۔ تونسہ شریف کا ارادہ ہو گیا، نماز ریل ہی میں پڑھیں گے۔ خدام کو کھٹ گئی کہ ضرور کوئی غیر معمولی واقع پیش آیا ہے لیکن پاس ادب زبان نیاز کو روکے رکھا اور کسی کو جرأت نہ ہوئی۔ ریل میں سوار ہوئے اور دوسرے روز شام کے قریب محلات حضوری میں پہنچ گئے۔ خواجہ اللہ بخش تونسوی تشریف فرما تھے پشت مبارک دروازے کی طرف تھی اور حافظ صاحب کے جلو میں جانے والوں کی فہرست تیار کر رہے تھے۔ عین جبکہ حضرت صاحب آپ کے قریب پہنچ گئے تو خواجہ صاحب نے بغیر ادھر دیکھے فرمایا کیا ہی اچھا ہوتا کہ مولوی صاحب بھی یہیں آجاتے۔ آپ نے فوراً ہی عرض کیا غریب نواز فقیر حاضر ہے۔ خواجہ صاحب مظلوظ اور نہایت خوشی اور محبت سے بغل گیر ہوئے۔

خوشا روزے و خرم روزگارے

کہ یارے برخوردار وصل یارے

جب آپ اجمیر شریف سے مراجعت فرمائے سیال شریف ہوئے تو ایک روز کسی درویش نے موقع پر اس واقع کی نسبت دریافت کیا۔ ارشاد ہوا کہ جب میں نے سجدہ سے سر اٹھایا تو حضرت صاحب اعلیٰ سیالوی کا یہ ارشاد صاف آواز میں سنا کہ یہاں سے ان کے ساتھ ہو لینا کیا نیاز ہے۔ ادب اور محبت کا تو یہ تقاضا تھا کہ تونسہ شریف پہنچتا میں دل میں نہایت شرمندہ ہوا اور چپ چاپ اسی طرح اٹھ کھڑا ہوا۔

زباں سے میں خاموش اب اس لئے ہوں

تیری بات دل سے سنا چاہتا ہوں

ایک روز آپ فرمانے لگے ”ایک انگریز نے مجھ سے پوچھا کہ تم پیروں کے انتقال کی تاریخ کو عرس کیوں کہتے ہو؟ اور عرس کے لفظی معنی کیا ہیں؟“ میں نے کہا: عرس کے معنی ہیں شادی اور یہ اس لئے کہتے ہی کہ بزرگان دین کی وفات سے ان کی ایک قسم کی نئی زندگی کا آغاز ہوتا ہے اور ان کے انتقال کا دن بے حجابانہ وصل کا مطلع انوار اور ان کو بے انتہاء درجات انعام دیئے جاتے ہیں اور یہ

حالات پس ماندگان کیلئے باعث خوشی و خرمی ہیں نہ کہ مایہ آلام۔ میرا یہ جواب سن کر حیران سا رہ گیا اور پھر کچھ دیر تامل کے بعد کہنے لگا لیکن عورت کی تاریخ وقات کو تم عرس کیوں نہیں کہتے۔ میں نے جواب دیا کہ کہنے میں حرج بھی کوئی نہیں اور وہ تو خود ہی عروس ہے وہ خاموش ہو گیا اور پھر کچھ نہ کہا۔ ایک روز کسی بات میں فرمانے لگے ان خشک ملاؤں کا بھی عجب دستور ہے خود جھوٹ بولتے ہیں تو اس کا نام مبالغہ رکھ لیتے ہیں اور جو کوئی اور غریب بھولے سے بھی بول دیتا ہے تو بڑی صحت سے لعنة الله على الكاذبين پڑھنے لگتے ہیں۔

ایک دفعہ شیعوں کے اعتقادات کا تذکرہ حضور میں تھا فرمانے لگے ”شاہ دو جہاں تخت ناز پر جلوہ گر ہو اور دائیں بائیں وزرائے باکمال رونق افروز ہوں اور اگر کوئی شخص حاضر ہو کر یہ کہے کہ میں ان وزرائے اربعہ میں سے صرف ایک ہی کو مانتا ہوں تو سخت بے ادبی ہے اور قسمت کی گردش ہم تو دربار میں حاضر ہو کر ہر ایک کو سلام کرنا اور سب سے نیاز برتنا عین دین و ایمان سمجھتے ہیں اور حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کی بابرکت جناب میں تو نیاز عرض کرنے کے بھی قابل نہیں، پھر یہ مصرعہ پڑھا:

”غلامی داد عویٰ کہا تیری گولیاں دی پڑ گولی اے میں“

ایک دفعہ صابزادہ محمد امین نے عرض کیا ”غریب نواز! حضرات چشتیہ میں بھی توجہ ہوتی ہے“ فرمانے لگے ہوتی ہے انہوں نے پھر دریافت کیا کہ توجہ اور عنایت میں کیا فرق ہے؟ ارشاد ہوا ”توجہ عام ہوتی ہے اور عنایت خاص۔ خواہ عنایت سے ہو یا خفگی سے“

شاہی مسجد لاہور میں قیام تھا ایک نو وارد نے حاضر ہو کر عرض کیا کہ حضرت میں تو نسہ شریف بھی ہو آیا ہوں اور جلال پور شریف اور گولڑہ شریف بھی، مگر مجھے تو ان سب جگہ کوئی اللہ والا نظر نہیں آیا۔ فرمانے لگے تو پھر میرے پاس کیا لینے آیا ہے۔ پھر یہ شعر پڑھا:

گرنہ بیند بہ روز شہرہ چشم

چشمہ آفتاب راچہ گناہ

(سعدی)

آپ کے ایک محرم راز لکھتے ہیں:

ایک بار کسی نے ایک کتاب میرے ہاتھ میں رکھ کر کہا کہ سیال شریف جا کر اسے پڑھو میں نے پوچھا آپ کون ہیں جواب میں جو کچھ فرمایا میں نہیں سمجھا ساتھ ہی وہیں وہ روپوش ہو گئے ان کے جانے کے بعد میں نے کتاب کھول کر جو دیکھا تو اس میں سراسر توحید و جود کے رموز نظم و نثر میں تھے۔

ایک محفل میں پہنچا بہت سے حضرات تشریف فرما تھے، مسند صدر میں تکیہ لگائے ایک سن رسیدہ بزرگ بیٹھے تھے۔ توحید و جودی کے بارے میں کچھ گفتگو ہونے لگی۔ میں نے بھی کچھ کہا لیکن معاً خیال آیا کہ ایسی بزرگ محفل میں کوئی کلام کرنا پرلے درجے کی بے ادبی ہے۔ میں خاموش ہو گیا اور چپ چاپ ان سب کی آپس میں بحثیں سنتا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد چند نقیبوں نے آکر بہت سے آدمیوں کو باہر نکال دیا۔ بعد ازاں قوال بلائے گئے اس وقت میں کیا دیکھتا ہوں کہ صدر میں وہی تکیہ لگائے خود حضور اشرف الاولیاء تشریف فرما ہیں۔ میں اشتیاق کے عالم میں قدم بوسی کیلئے آگے بڑھا لیکن ایک غیر معمولی شور سے اس وقت میری آنکھ کھل گئی۔ بد نصیبی اور محرومی ہی ہو تو کیا ہو سکتا ہے؟ اکثر سیال شریف حاضری سے قاصر رہتا ہوں اور یہی بڑی بھاری وجہ ہے فیضان عام سے محرومی کی۔

۔ اُس کے الطاف تو ہیں عام شہیدی لیکن

تجھ سے کیا ضد تھی اگر تو کسی قابل ہوتا

مگر مشکل تو یہی ہے کہ اس محفل میں جا کر قابلیت ہی بھول جاتی ہے اور اس کی شرط بھی گم

ہو جاتی ہے۔ اسی لئے تو کئی ایک مجھ سے لوگوں کے دلوں میں جسارت پیدا ہو جاتی ہے چنانچہ ایک

موقعہ پر عرس مبارک کی حاضری سے اسی جسارت کی وجہ سے محروم رہا۔

کہ ام من بیدلے بے اعتبارے

غریبے بے نصیبے خاکسارے

(جامی)

مولوی محمد اکرم ریاست بہاولپور والے سے روایت ہے کہ ایک روز حضرت صاحب نے

خود ارشاد فرمایا کہ ایک دفعہ ایک مولوی صاحب نے مجھ سے، ”تم خواجگان کی وجہ دریافت کی، چونکہ

مجھے معلوم نہیں تھا“ میں نے حضرت صاحب ثانی تونسوی کی خدمت مبارک میں عرض کیا ”ارشاد ہوا

کہ ہمارے پیران عظام اسی طرح کرتے آئے ہیں ہم بھی کر لیتے ہیں“ بعد ازاں مدت مدید جب میں

اجمیر شریف حاضر ہوا ایک روز اکیلا میں ہی صرف روضہ کے اندر تھا اور خواجہ بزرگ کی بانیں کی

طرف کھڑا تھا کہ یکا یک ایک شخص نے اندر آ کر بہ آواز بلند جیسے کہ بالکل ظاہری حیات میں زندہ

شخص سے پوچھا کرتے ہیں، خدمت خواجہ بزرگ سے یہی بات پوچھی۔ مزار مبارک سے آواز آئی

آواز عین حضرت شمس العارفین کی آواز سے ملتی ہوئی تھی کہ یہ ختم الہامی ہے اور جس طرح ارشاد ہوا

پڑھا جاتا ہے اور ہم ہی نے شروع کیا تھا۔

یہی مولوی کہتے ہیں:

ایک شب آپ بہت جلد پلنگ پر دراز ہو گئے اور مولوی صاحب قبلہ نے اسی کمرے میں عین آپ کے سرہانے میر و اور شبیر قوالاں کو بلا کر سماع شروع کرادیا۔ مزا میر نالہ کرنے لگے اور رنگ محفل خوب گرم ہوا۔ میں نے آپ کی طرف دیکھا نہ اضطراب تھا نہ سکون نہ تھیز چپ چاپ لیٹے رہے مگر آہ چپ چاپ بھی تو نہیں تھے خدا جانے کہاں تھے کیا کر رہے تھے ایک گھنٹہ سے بھی زیادہ راگ ہوتا رہا۔ ار آپ سنتے رہے لیکن جل شانہ ہی کو خبر ہے کہ کس طرح سنتے رہے، خوب یاد آیا، ایک دفعہ محبوب الہی رحمۃ اللہ علیہ کی محفل سماع میں شاہ رکن عالم بھی تشریف فرما تھے۔ محبوب پاک بحالت وجد کھڑے ہوئے تو رکن عالم نے پکڑ کر آپ کو بٹھا دیا اور دوسری دفعہ پھر آپ کھڑے ہوئے پھر انہوں نے بٹھا دیا۔ تیسری بار جب آپ نے قیام فرمایا تو شاہ صاحب نے ایک کونے میں ہو کر نوافل کی نیت باندھ لی۔ کسی نے دوسرے روز شاہ صاحب موصوف سے عجیب واقعہ کی نسبت عرض کیا، فرمانے لگے کہ پہلی دفعہ جب آپ کھڑے ہوئے ملکوت میں تھے دوسری بار لاہوت میں لیکن تیسری دفعہ تو میں نے ہر ایک جگہ ڈھونڈا حتیٰ کہ لامکان میں بھی مگر آپ کہیں نہیں تھے۔ آہ کجائی امیر بیاو بگو

در ملک جاں خسرو چہ خسرو خسرو خواہاں
بود محفل قدرت فتنہ چہ فتنہ فتنہ دوراں
دہانت غنچہ باشد چہ غنچہ غنچہ دلکش
چہ دلکش دلکش خرم چہ خرم خرم خنداں
جمالت مجہء باشد چہ مجمع مجمع خواہاں
چہ خوبی خوبی یوسف چہ یوسف یوسف کنعاں

حسن کو امیر صاحب نے تشبیہات اور استعارات کے پیراہن میں دکھانے کی کوشش تو فرمائی مگر حسن کجا اور اس کے معنی کجا۔ وہی بات ہے کہ الفاظ ختم ہو گئے وصف کی ابتداء بھی پوری نہ ہوئی۔ اس دور کے معروف خطیب مولوی ولی محمد چاندھری ایک دفعہ عرس مبارک پر وعظ کیلئے سیال شریف آئے۔ آپ نے دلنوازی فرماتے ہوئے علیحدہ کمرہ عنایت فرمایا اور خاص اپنے کمرہ کا فرش گاؤ تکیہ ان کیلئے روانہ کر دیا۔ ان کے وعظ کیلئے آپ نے ایک روز محفل جلد ختم کروادی اور محفل خانہ میں ان کے لئے تخت بچھوا کر انہیں وعظ کہنے کا اشارہ کیا۔ آپ کے صاحبزادہ سعد اللہ صاحب کو گراں گزرا کہ روضہ شریف کے قریب انہیں اونچی جگہ بٹھایا گیا ہے۔ انہوں نے حضور سے عرض کر

دی۔ آپ فرمانے لگے تو طلبہ سارنگی کا سماع سن چکا ہے اب احادیث کا سماع سن لے۔ اختتام پر دست مبارک میں کچھ روپے لے کر ان کے تخت کے قریب گئے اور کمال نیاز سے نذر گزاری۔ مولانا موصوف بہت خوش ہوئے۔ آخری ایام میں وہ آپ کے بیعت ہو گئے تھے۔

ایک دفعہ ایک سپرنٹنڈنٹ پولیس وردی پہنے حاضر ہوا اور اپنے ساتھ ایک پادری کو بھی لایا جس کے ساتھ کچھ انگریز بھی تھے۔ آپ نے ان کو عزت دیتے ہوئے چارپائی پر بٹھایا۔ سپرنٹنڈنٹ نے کہا کہ ہمارے پادری صاحب کچھ خدا کی باتیں کرنا چاہتے ہیں۔ آپ نے دلنوازی سے فرمایا شوق سے کریں۔ لوگ جمع ہو گئے پادری صاحب نے لمبی تقریر کی۔ آپ نے دوران تقریر کچھ ارشاد نہ فرمایا۔ لوگوں کو اس بات کا برا خیال ہوا اور آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے اور بار بار ادھر ادھر کتکھیوں سے دیکھنے لگے۔ اس اثناء میں نماز عصر کا وقت ہو گیا۔ آپ اس سے فرمانے لگے: پادری صاحب آپ کے خدا کی باتیں تو ہم نے بہت سن لیں اجازت ہو تو اپنے خدا کی باتیں سن لیں۔ اس نے حیرت سے پوچھا یہ کیا ہے؟ آپ کا اور ہمارا خدا علیحدہ علیحدہ ہے؟ فرمانے لگے ہاں آپ کا خدا بیوی بچے والا اور ہمارا خدا وحدہ لا شریک۔ اس طرح آنے والے لوگ آپ کی وسعت ظرفی سے بھی متاثر ہوئے کہ آپ نے پادری کی گفتگو پوری طرح سنی۔ بعد ازاں آپ نے مذکورہ جملہ بول کر عیسائی چالبازوں کے نظریہ وحدت ادیان کی قلعی کھول کر رکھ دی نیز عیسائیت اور اسلام کے آپس میں ڈانڈے ملانے کو بھی ناکام کر دیا۔

حضور ثانی لاٹانی غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ کے جاہ و جلال شاہی کے باوجود تواضع و انکساری کی کوئی حد نہ تھی اور شان و دلنوازی کی جلوہ سامانیاں ہر دیکھنے والے کو حیرت زدہ کر دیا کرتی تھیں جس کی بناء پر بندگان خدا فقیر کے آستانہ کی طرف کھنچے کھنچے آ رہے تھے جہاں انہیں روحانی تربیت اور ظاہری سرپرستی میں کمال فیاضی دیکھنے کو ملتی۔

اپنے سجادہ نشین کے نامزد کرنے میں آپ نے وہی معیار سامنے رکھا جس کی بنیاد پر آپ کو والد گرامی حضور شمس العارفین رحمۃ اللہ علیہ نے نامزد فرمایا تھا۔ آپ کے بڑے صاحبزادے خواجہ محمد امین صاحب زہد و تقویٰ، علم و فضل اور اوراد و وظائف میں کمال رکھتے تھے لیکن خانقاہ کے انتظام اور غلاموں کی دلجوئی میں برتری کی بنیاد پر آپ نے اپنے دوسرے صاحبزادے خواجہ محمد ضیاء الدین رحمۃ اللہ علیہ کو اپنا جانشین نامزد فرمایا۔

الہی تا ابد آستان یار رہے..... آسرا ہے غریبوں کا برقرار رہے

حضرت خواجہ محمد دین سیالوی رحمۃ اللہ علیہ کے وصال انور پر متعدد تعزیتی منظومات کہی گئیں جن میں عشق و عقیدت کا اظہار کیا گیا اور آپ کے اوصاف و محاسن کو بھرپور خراج عقیدت ادا کیا گیا۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

چھپ رہا ہے خاک میں اے گوہر شب تاب تو
پہلے دلکش تھا بنا اب دلبر نایاب تو
دل کی منزل سے نشان پائے مہماں گم ہوا
جاں کو تنہا چھوڑ کر وہ رونق جاں گم ہوا
بے زبانی کا گلہ ہے اک بیان زندگی
بے نشان ہو کر ہی ملتا کچھ نشان زندگی
زندگی کہتے ہیں جس کو عمر بھر کی قید ہے
طارِ دل یاں سراپا آرزو کا صید ہے
محفل الفت سراپا خامشی کا نام ہے
موت یعنی زندگی کا آخری انعام ہے
التجائے دید بھی اک پردہ دیدار ہے
یہ تو بلکہ اور الٹا جان کا آزار ہے
مولوی محمد سعید صاحب نے آپ کی تاریخ وصال یوں رقم طراز کی ہے:

ملاذ دین و ملت قطب عالم شاہ محمد دین
پناہ بے پناہاں غوث اعظم شاہ محمد دین
چورخ پوشید از عالم نیازے بے نیازی اش
جہاں برہم زد از گیسوئے پرخم شاہ محمد دین
سعید زار گفتہ سالی آں بانا لہائے زار
بہ ہجر جان عالم فخر آدم شاہ محمد دین
”باوج چشت آمد آفتابے“ سال پیدائش

۱۲۵۳ھ
وصال رحمتہ دینی مجسم شاہ محمد دین
۱۳۲۷ھ

مجاہد ملت

حضرت خواجہ محمد ضیاء الدین سیالوی رحمۃ اللہ علیہ

کسی ایک عظیم خاندان میں یکے بعد دیگر عظیم المرتبت شخصیات کا وجود نعمت خداوندی سے کم نہیں ہے۔ اس لحاظ سے آستانہ عالیہ سیال شریف کو دیکھیں تو اس خانوادہ معرفت میں ادوار کی ترتیب سے ایسی سر بلند شخصیات کا وجود سامنے آتا ہے جنہوں نے اپنی خداداد علمی و روحانی صلاحیتوں اور ایمانی تب و تاب کی بدولت نہ صرف اپنے اسلاف کے معیار کو جاودانی عظمت عطا کی بلکہ ان کے روحانی پروگرام کو اپنے اپنے عہد کے تقاضوں کے مطابق زیادہ سے زیادہ آگے بڑھانے کی کوشش کی۔

سیال شریف کے آستانہ عالیہ کو جو لاقانی عظمت حضرت شمس العارفین خواجہ شمس الدین علیہ الرحمۃ کے فیضان نظر کی بدولت حاصل ہوئی تھی۔ آپ کے بعد آپ کی آنے والی نسلوں نے اس سر بلندی کو قائم رکھنے کی بدرجہ اتم کوشش کی۔ خواجہ شمس الدین سیالوی علیہ الرحمۃ کے فرزند ارجمند حضرت قبلہ محمد دین رحمۃ اللہ علیہ اور پھر آپ کے پوتے حضرت خواجہ محمد ضیاء الدین سیالوی رحمۃ اللہ علیہ نے جس شان کے ساتھ اپنے جلیل القدر جد امجد کے روحانی سلسلے کو آگے بڑھایا اس کا تذکرہ ہر لحاظ سے ایمان افروز ہے۔ حضرت خواجہ محمد ضیاء الدین سیالوی رحمۃ اللہ علیہ کہ زمانہ جنہیں ضیاء الملت والدین کے لقب سے یاد کرتا ہے اوصاف حسنہ اور عادات عالیہ کے لحاظ سے اپنے دادا کی تصویر تھے۔ وہی جلال قلندرانہ وہی جمال معرفت وہی روحانی ادائیں وہی ایمانی جگمگائیں۔ آپ کی زندگی کا قریب سے مشاہدہ کرنے والوں کا کہنا ہے کہ آپ صورت و سیرت کے لحاظ سے عظمت ایمان کا مکمل نمونہ تھے اور روحانی جلال و جمال کے امتزاج سے چہرے پر ہر وقت فکری و نظری شکوہ کی علامات نظر آتی تھیں اور ایک نظر دیکھتے ہی اندازہ ہونے لگتا تھا کہ:

مقامات سعادت کے امیں ہیں یہ مراحل

حضرت خواجہ حافظ محمد ضیاء الدین رحمۃ اللہ علیہ ۱۷ رمضان المبارک ۱۳۰۲ھ بروز جمعہ المبارک پیدا ہوئے۔ آپ کے والد محترم حضرت خواجہ ثانی لاثانی محمد دین رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کی تعلیم و تربیت کی طرف خصوصی توجہ فرمائی۔ اس سلسلہ میں حفظ کی خاطر آپ کی بھرپور رہنمائی کی گئی۔ چنانچہ حضرت خواجہ محمد ضیاء الدین نے بہت جلد قرآن مجید حفظ کر لیا اور حصول سعادت کی خاطر تیس برس تک خود مصلیٰ سنایا۔ بعد میں کتب فارسی اور عربی مولانا غلام محمد سے پڑھیں۔ درس نظامی کی تکمیل کی۔ اسی دوران میں حضرت ثانی صاحب نے آپ کو تونسہ شریف میں حضرت حافظ محمد موسیٰ صاحب کی خدمت میں پیش کر کے بیعت سے سرفراز کرایا، جب حضرت حافظ محمد موسیٰ کے جانشین حضرت خواجہ محمد حامد مسند نشین ہوئے تو آپ بدستور ان کی صحبت میں آستانہ عالیہ تونسہ شریف سے فیوض روحانی کی دولت سمیٹتے رہے۔

حضرت مجاہد ملت خواجہ محمد ضیاء الدین رحمۃ اللہ علیہ حضرت خواجہ محمد حامد تونسوی رحمۃ اللہ علیہ سے عشق کی حد تک ارادت رکھتے تھے۔ حضرت تونسوی رحمۃ اللہ علیہ بھی آپ پر غایت درجہ شفقت فرماتے۔ ایک مرتبہ آپ کی درخواست پر شہزادہ تونسہ شریف حضرت خواجہ محمد حامد رحمۃ اللہ علیہ سیال شریف تشریف لائے تو جشن مسرت کا سماں بندھ گیا۔ حضرت ثانی رحمۃ اللہ علیہ حضرت تونسوی رحمۃ اللہ علیہ کی تشریف آوری پر وجد میں آ کر رقص فرمانے لگے۔ چاروں جانب ارادت و عقیدت کی خوشبو کی برسات ہوئی۔ یوں گماں ہوتا تھا جیسے آسمان سے ستارے زمین پر اتر آئے ہوں۔ ہر طرف سے ارادت مندوں کے ہجوم بارگاہ شہزادہ تونسہ شریف کی خدمت میں حاضر ہوتے اور جبین عقیدت تم کر کے نیاز مندی کا اظہار کرتے۔

حضرت خواجہ محمد ضیاء الدین سیالوی رحمۃ اللہ علیہ محض رمز آشنائے معرفت ہی نہیں تھے بلکہ سیاست کی خاردار وادیوں کے بھی شہسوار تھے۔ آپ صحیح معنوں میں مرد مومن تھے اور ایمان کے اس تقاضے سے بخوبی آشنا تھے کہ اسلام میں دین اور سیاست کا وجود الگ الگ نہیں ہے بلکہ دونوں کے امتزاج ہی سے اسلام کی عملی تفسیر مکمل ہوتی ہے۔ آپ کی نظر برصغیر کے سیاسی و معاشرتی حالات پر تھی اور آپ سمجھتے تھے کہ حالات کا تقاضا یہی ہے کہ کھل کر آزادی پسند تحریکات کا ساتھ دیا جائے اور برطانوی سامراج کی بیخ کنی کیلئے ہر اس ادارہ اور تحریک سے تعاون کیا جائے جس کا مقصود بالخصوص عظمت اسلام کا احیاء ہے۔ یہ وہ دور تھا جبکہ بہت سے سجادہ نشین مصلحت کے دام کے اسیر ہو کر اطاعت حکمران وقت کا فتویٰ دینے رہے تھے۔ ان نازک حالات میں ہی شاعر مشرق علامہ محمد اقبال

نے بیتاب ہو کر کہا تھا کہ:

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسم شبیری
کہ فقر خانقاہی ہے فقط اندوہ و دلگیری

حضرت خواجہ محمد ضیاء الدین رحمۃ اللہ علیہ نے خانقاہی ماحول سے باہر آ کر آزادی پسند تحریکات سے جس طور عملی اور مالی طور پر تعاون کیا، اس کی نظیر نہیں ملتی۔ اس دور میں تحریک خلافت کا دور دورہ تھا، اس تحریک کا مقصد برصغیر پاک و ہند سے انگریزوں کو نکالنا اور خلافت اسلامیہ کو پھر سے زندہ کرنا تھا۔ تمام قابل ذکر علماء و مشائخ اور بیشتر مسلم سیاستدان اس تحریک سے تعاون کر رہے تھے۔ بالخصوص مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی کی جادو بیانی نے اس تحریک میں حیرت انگیز حد تک نئی روح پھونک دی تھی۔

مجاہد ملت خواجہ محمد ضیاء الدین رحمۃ اللہ علیہ نے تحریک خلافت کے پلیٹ فارم پر جدوجہد آزادی کا پرچم لہرا کر اس تحریک کو بے پناہ قوت عطا کر دی، جب ولایتی کپڑے کے بائیکاٹ کا وقت آیا تو آپ نے کھدر استعمال کرنا شروع کر دیا اور جب ترک مجاہدین کی مالی امداد کا وقت آیا تو پہل اپنے گھرانے سے کی اور اپنے گھر کی محترم خواتین کے زیورات امداد فنڈ میں جمع کروانے کے علاوہ ہزاروں روپے کا چندہ بھی دیا۔ یہی نہیں بلکہ یہ فتویٰ بھی جاری فرما دیا کہ:

”جہلم مسلمانوں بالخصوص سیال شریف کے متعلقین کیلئے انگریز کی نوکری حرام ہے۔ جو فوجی انگریز کی نوکری چھوڑنا نہیں چاہتا وہ سیال شریف کی مقدس حدود میں قدم نہ رکھے۔“

آپ کے اس مجاہدانہ اعلان سے برطانی سامراج بوکھلا اٹھا۔ گورنر کے نمائندوں نے بار بار آپ سے ملاقات کی، آپ کے نیاز مندوں کو آپ کی خدمت میں بھیجا گیا کہ آپ کسی طور پر اس اعلان سے دستبردار ہو جائیں۔ اس مقصد کی خاطر انگریز حکومت کے ایک نمائندے نے آپ کو اٹھارہ مربع اراضی کی پیشکش بھی کی مگر آپ نے کمال استغناء سے جو جواب دیا وہ تاریخ آزادی میں آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ:

”انگریز تو مجھے میرے ہی وطن کی زمین دے کر مجھے خریدنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ خدا کی قسم اگر انگریز بہادر مجھے اپنے وطن لندن سے بھی اتنا رقبہ دے دیں تو میرا جواب یہی ہوگا۔ حق اور باطل ایک مقام پر جمع نہیں ہو سکتے۔ انگریز کے خلاف ہمارا جہاد جاری رہے گا۔“

باطل دوئی پسند ہے حق لا شریک ہے
شرکت میاں حق و باطل نہ کر قبول

صوبہ پنجاب کی تحریک کے متفقہ صدر حضرت خواجہ محمد ضیاء الدین رحمۃ اللہ علیہ ہی تھے۔ اس سلسلہ میں ایک اجلاس کا حال قلمبند ہوتے کرتے حکیم علی محمد یوں رقمطراز ہیں:

”لاہور میں ایک شاندار علماء کانفرنس منعقد ہوئی، اس میں مولانا ابوالکلام آزاد نے عربی میں خطاب فرمایا۔ مولانا حسرت موہانی (تحریک آزادی کے نامور مجاہد) نے کئی دفعہ اٹھنا چاہا۔ اس وقت حضرت مجاہد ملت نے فرمایا ہاں ہاں کچھ فرمائیے، حسرت رہ نہ جائے۔ مولانا حسرت موہانی نے غور سے حضرت کو دیکھ کر بصورت شکر یہ سلام کیا۔ اس کانفرنس کے بعد تحریک خلافت کا عملاً کام شروع ہو گیا۔ رضا کاروں کے جلوس نکلنے لگے اور ہر طرف اللہ اکبر کے نعرے بلند ہونے لگے۔“

مجاہد ملت نے پوری شدت کے ساتھ تحریک خلافت کی سرپرستی فرمائی اور اس سلسلہ میں انگریز کی کسی وارننگ یا کسی مصلحت کی ذرا برابر بھی پروا نہ کی۔ دارالعلوم سیال شریف کے صدر مدرس مولانا محمد حسین اور آپ کے طلبہ حضرت مجاہد ملت کے مجاہدانہ پیغام کو عام کرنے کیلئے سرگرم عمل ہو گئے۔ پنجاب بھر میں جلسے منعقد کئے گئے، حضرت مجاہد ملت اور آپ کے خلفاء اور مدرسین ان جلسوں سے خطاب کرتے۔ انگریز حکومت آپ کو گرفتار کرنا چاہتی تھی مگر یہ خوف دامنگیر تھا کہ آپ کی گرفتاری آستانہ عالیہ سیال شریف کے بے شمار متعلقین میں بغاوت کی آگ بھڑکا دے گی۔ اس لئے برطانوی حکومت کوشش اور خواہش کے باوجود آپ کو گرفتار نہ کر سکی۔

حضرت مجاہد ملت مولانا محمد ضیاء الدین سیالوی رحمۃ اللہ علیہ کی جدوجہد آزادی کو دیہات و قصبات تک پہنچانے کیلئے دارالعلوم کے صدر مدرس مولانا محمد حسین کے علاوہ جو حضرات سرگرم کار تھے ان میں حضرت مولانا محمد ذاکر رحمۃ اللہ علیہ بانی جامعہ محمدی شریف، خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ان کے ساتھ ساتھ حکیم علی محمد، مولوی ظہور احمد بگوی اور کوزی خان محمد کی مساعی بھی تحریک کا حصہ ہیں۔ انگریز حکومت نے ان مجاہدین تحریک آزادی کو گرفتار کر لیا اور مولانا محمد حسین کو اڑھائی سال، مولانا محمد ذاکر کو ڈیڑھ سال اور حکیم علی محمد کو دو سال قید کی سزا سنائی۔ ان حضرات نے کمال صبر و استقامت کے ساتھ جیل کے شدائد اور صعوبتوں کا سامنا کیا۔ ہر مشقت برداشت کی مگر ایک لمحہ کیلئے بھی ہراساں نہ ہوئے۔ حضرت مجاہد ملت اپنے جاٹاروں کا برابر خیال رکھتے رہے۔ انہیں اپنی دعا سے نوازتے رہے اور ایک مرتبہ جہلم جیل میں ان سے ملاقات کیلئے تشریف لائے تو فرمایا کہ:

”حضرت علامہ مولانا فضل حق خیر آبادی کو بڑی اذیتیں دے کر تمام عمر کالے پانی میں رکھا گیا اور وہ وہیں شہید ہو گئے۔ لہذا آپ سب کو ہر مشکل اور پریشانی کو صبر و تحمل سے برداشت کرنے کیلئے تیار

رہنا چاہیے۔ آپ کو ثابت قدم دیکھ کر میں بہت خوش ہوں اللہ تعالیٰ آپ کے اس جہاد کو قبول فرمائے۔
حضرت خواجہ محمد ضیاء الدین رحمۃ اللہ علیہ نے تمام عمر انگریز کو مالیہ اراضی ادا نہ کیا۔ آپ ہر لحاظ سے مجاہد ملت تھے۔ شہسواری نشانہ بازی، تیغ زنی کی خاص مشق تھی۔ کئی کئی دن شکار گاہ میں بھوکے پیاسے گزار دیتے۔ اس غیر معمولی مجاہدانہ شان کے ساتھ زندگی بسر کرنے سے آپ کا مقصد یہ تھا کہ اگر فرنگی سے دو بد و مقابلہ کی نوبت آجائے تو اسلاف کی شجاعت کی یاد تازہ کی جاسکے۔

انگریز سے آپ کی نفرت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ انگریز کا ملازم اگر لنگر شریف کے برتن میں کھانا کھا لیتا یا ہاتھ لگاتا تو آپ اس برتن کو تڑوا دیتے۔ ایک فوجی ملازم نے آپ کی گھوڑی کی پشت ہر ہاتھ پھیرا تو آپ نے فرمایا کہ اب یہ میرے کسی کام کی نہیں رہی کیونکہ فرنگی ملازم کا ہاتھ اس کو لگ چکا ہے۔ آپ کو رائل فل کے لائسنس کی ضرورت پیش آئی تو حکومت نے رائل فل کی ضرورت دریافت کی۔ آپ نے جواب میں فرمایا:

”تلوار سے جنگ کا زمانہ نہیں رہا، دل کی آرزو ہے کہ موقع ملے اور کسی انگریز کے سینہ میں گولی اُتار دوں“ سچ ہے کہ:

آئین جوانمرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں رو باہی

حضرت مجاہد ملت خواجہ محمد ضیاء الدین سیالوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک بہت بڑا کارنامہ سیال شریف میں عظیم دینی درس گاہ کا قیام ہے جسے ”زمانہ دارالسلام ضیاء الشمس الاسلام“ کے نام سے جانتا ہے۔ حضرت مجاہد ملت خود بہت بڑے عالم دین تھے۔ مدرسہ کی سرپرستی، نگرانی اور جملہ انتظامات آپ نے خود اپنے ذمہ لے رکھے تھے۔ تدریس کیلئے انہوں نے نامور عالم دین حضرت مولانا محمد حسین کا انتخاب کیا جو اجیر شریف کے عظیم مدرسہ معینیہ عثمانیہ کے فارغ التحصیل تھے اور بحر العلوم حضرت علامہ معین الدین اجیری کے فیوض علمی کی روشن تصویر تھے۔ حضرت مجاہد ملت کی سرپرستی اور مولانا محمد حسین کے تبحر علمی اور شدید محنت کی بدولت ”دارالعلوم ضیاء الشمس الاسلام“ بہت جلد طالبان علم کیلئے مرجع عقیدت بن گیا اور تشنگان علوم دینیہ چاروں طرف سے کھنچے کھنچے اس دارالعلوم کا رخ کرنے لگے۔ جب مولانا محمد حسین جرم آزادی کی پاداش میں پابند زندان ہوئے تو مدرسہ کسی قدر زوال کا شکار ہو گیا مگر آپ کے جیل سے رہا ہوئے ہی وہی پرانی رونقیں پھر لوٹ آئیں۔ حضرت شیخ الاسلام خواجہ محمد قمر الدین سیالوی رحمۃ اللہ علیہ کے دور میں اس عظیم دارالعلوم کو حیات نو عطا ہوئی اور

یہ دارالعلوم آج پھر وطن عزیز کے دینی مدارس میں ممتاز مقام کا حامل ہے
خواجہ محمد ضیاء الدین کی زندگی مجاہد اسلام کی زندگی تھی۔ آپ نے اسلام اور ناموسِ مصطفیٰ
صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف برپا ہونے والی ہر شورش کا پامردی سے مقابلہ کیا۔ آپ کے دور میں
ایک طرف عیسائی مشنری مسلمانوں سے ایمان کی دولت چھین کر مختلف ترغیبات کے ذریعے غریب
اور جاہل مسلمانوں کو عیسائیت کی طرف راغب کر رہے تھے تو دوسری طرف انگریز کا خود کاشتہ پودا
قادیانیت اپنے برگ و بار پھیلا رہا تھا۔

اہل ایمان پر یہ وقت بہت کٹھن تھا، ان باطل تحریکات کو حکومت وقت کی مکمل سرپرستی حاصل
تھی۔ حضرت خواجہ محمد ضیاء الدین سیالوی رحمۃ اللہ علیہ نے شمشیرِ براں کی صورتِ باطل کا مقابلہ کیا۔
آپ نامور عالم دین تھے۔ مبلغ اسلام اور عیسائیت کا تقابلی جائزہ اہل ایمان کے سامنے پیش کیا،
عیسائیت کی کمزوریوں کو عوام الناس کے سامنے پیش کیا، علم اور تحقیق پر دسترس کا یہ عالم تھا کہ آپ کو
بائبل کے کئی کئی صفحات زبانی یاد تھے۔ آپ نے عیسائی پادریوں سے مناظرے کئے اور انہیں ان کے
مذہب کی خرافات سے باخبر کر کے راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔ اسی طرح آپ نے قادیانیت
کا بھی بھرپور تعاقب فرمایا اور عشاقِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس فتنہ کے مفاسد سے خبردار کیا۔ اپنے
مریدین، متعلقین اور جملہ اہل اسلام کو سمجھایا کہ قادیانیت ایک لعنت سے کم نہیں۔ اس سلسلہ میں
آپ نے قادیانیت کے سد باب اور اپنے علاقہ کے مسلمانوں کو خبردار کرنے کیلئے کئی خطبات ارشاد
فرمائے اور مختلف مقامات پر جلسوں کا انعقاد فرمایا۔

آپ کے فرزند ارجمند شیخ الاسلام حضرت خواجہ محمد قمر الدین سیالوی رحمۃ اللہ علیہ کی تربیت
خاص آپ کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ آپ نے مستقبل کے سجادہ نشین کی اس طور روحانی و فکری
راہنمائی فرمائی کہ خواجہ صاحب آنے والے ادوار میں تحریک پاکستان کے مطلعِ عمل پر روشن ستارے کی
صورت جگمگاتے رہے۔ اس سلسلہ میں ایک واقعہ کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ اس واقعہ سے
جہاں شیخ الاسلام کی استقامت ایمانی کا اظہار ہوتا ہے وہاں یہ علم بھی ہوتا ہے کہ شیخ الاسلام اپنے
والد بزرگوار سے کسی طور ذہنی و فکری طور پر متاثر اور ان کے جذبہ حریت سے کس طور فیضیاب تھے۔
رائفل کے لائسنس کے حصول کے سلسلہ میں انگریز حکومت کو حضرت خواجہ محمد ضیاء الدین علیہ الرحمۃ
کے دو ٹوک جواب کا تذکرہ ہم پہلے ہی کر چکے ہیں۔ اسی طرح ایک مرتبہ شیخ الاسلام خواجہ محمد قمر
الدین سیالوی علیہ الرحمۃ کو رائفل کے لائسنس کی ضرورت محسوس ہوئی تو:

”سرگودھا کے ڈپٹی کمشنر نے آپ کے لائسنس کی درخواست پر لکھ بھیجا کہ آپ انگریزی حکومت کی خدمات لکھیں تاکہ ان خدمات کے استحقاق پر آپ کو لائسنس دیا جاسکے تو آپ نے جواب میں تحریر فرمایا کہ آپ شاید میرے والد محترم حضرت خواجہ محمد ضیاء الدین کے نام نامی اور کارناموں سے واقف ہوں گے، جس قسم کی خدمات انہوں نے حکومت انگلشیہ کی انجام دی ہیں انہی خدمات کو مجھ سے توقع رکھیں۔ آپ فرماتے ہیں یہ جواب تو میں نے لکھ دیا کیونکہ یہ میرے ایمان کی پکارتھی مگر میں لائسنس سے مایوس ہو گیا۔ اسی رات جناب والد بزرگوار خواجہ محمد ضیاء الدین رحمۃ اللہ علیہ خواب میں ملے اور فرمایا کہ قمر الدین تم کیوں مایوس ہوتے ہو اور ایک مکان کی طرف اشارہ کر کے فرمایا جس میں ہر قسم کی رائفلوں کا انبار تھا، اس میں سے جو چاہو جن لو چند روز ہی گزرے تھے کہ انگریز ڈپٹی کمشنر نے خود لائسنس بھیج دیا۔ حق تو یہ ہے کہ:

شرطیت شر مرا کہ نگیرم بجز تو دوست

عہد لیست مر مرا کہ نگیرم بجز تو بیچ

ضیاء المہلت خواجہ محمد ضیاء الدین سیالوی رحمۃ اللہ علیہ مکمل طور پر محبت اسلامی کے جذبہ سے سرشار تھے جس کا اعتراف برصغیر کے بیشتر مسلم زعماء علماء و مشائخ اور اصحاب سیاست کو تھا۔ ایک مرتبہ آپ ۱۹۲۸ء کے وسط میں دہلی تشریف لائے، دہلی اسٹیشن پر آپ کے استقبال کیلئے رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی سمیت بہت سے مسلم قائدین موجود تھے۔ مولانا محمد علی جوہر آپ کو اپنے ہاں لے گئے وہاں نادر شاہ (بعد میں افغانستان کے تخت پر بیٹھے) اس کے بیٹے ظاہر شاہ حکیم اجمل خاں اور دیگر معززین نے آپ کا پر تپاک خیر مقدم کیا۔ ایک دن قیام کے بعد آپ درگاہ حضرت محبوب الہی خواجہ نظام الدین اولیاء پر حاضر ہوئے۔ عرس کا موقع تھا، فوجیوں کو پتہ چلا کہ پیر سیال تشریف لائے ہیں تو جوق در جوق فوجی افسروں اور سپاہیوں کی حاضری شروع ہو گئی، سب نذرانے رکھتے تھے جب سب بیٹھ گئے تو آپ نے کمال جلال کے ساتھ فرمایا:

”یہ وہی مقام ہے جہاں انگریزوں نے مسلمان شہزادوں کا خون بہایا تھا، اب بھی خون کے چھینٹے گنبد کی دیواروں پر موجود ہیں۔ تم اسی انگریز کے نوکر ہو اور میرے زخموں پر نمک پاشی کرنے آئے ہو، اٹھو اپنے نذرانے اٹھا لو اور میری آنکھوں سے دور ہو جاؤ۔“

غرضیکہ حضرت خواجہ محمد ضیاء الدین سیالوی رحمۃ اللہ علیہ ہر لحاظ سے صاحب فضیلت اور روحانی و نظری رفعتوں کے امین تھے۔ آپ زاہد شب زندہ دار بھی تھے اور میدان معرفت کے مرد

انفار بھی۔ اسلاف کی عظمتوں کے پاسدار بھی تھے اور بے شمار بندگانِ خدا کے لئے روشنی فکر و عمل کا مینار بھی۔ آپ کی نواؤں میں بوئے اسد اللہی کی جھلک تھی تو آپ کا کردار صورت آفتاب معرفت فروزاں تھا۔ آپ کا روانِ حریت کے رکن رکین بھی تھے اور صاحب اسرار یقین بھی۔ آپ کی سیرت خواجہ شمس العارفین کی روحانی جلالوں کا پرتولنے ہوئے تھے اور صورت کی دل نشینی کا یہ عالم تھا کہ جو ایک مرتبہ آپ کے حلقہٴ تربیت میں حاضر ہوتا پھر ہمیشہ ہمیشہ کیلئے آپ ہی کا ہو کر رہ جاتا۔ یہ آپ کی بے مثال جدوجہد آزادی ہی کا ثمر ہے کہ انگریزی سامراج کا سورج برصغیر کے مطلع اقتدار سے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے غروب ہو گیا اور ہمیں پاکستان کی صورت میں آزادی کی لازوال دولت نصیب ہوئی۔ خدائے بزرگ و برتر کی بے شمار رحمتیں ہوں اس مردِ کامل پر کہ جس نے اپنی ایمانی استقامت اور جرأت و پامردی کی بدولت جدوجہد آزادی کو نئے ولولوں سے سرشار کیا۔ زمانہ صدیوں کے افق پر سفر کرتا رہے گا اور حضرت خواجہ محمد ضیاء الدین سیالوی شمع ایمانی کی صورت دلوں میں ایمان آفریں یاد بن کر فروزاں رہیں گے۔

دلوں کو زندگی احساس کو نور یقین بخشا
زمانے بھر کو آزادی کا پیغام حسین بخشا



شیخ الاسلام والمسلمین

حضرت خواجہ محمد قمر الدین سیالوی رحمۃ اللہ علیہ

شیخ الاسلام والمسلمین حضرت خواجہ محمد قمر الدین سیالوی رحمۃ اللہ علیہ آسمانِ رشد و ہدایت پر ضوِ فکرنِ ماہِ عالمتاب تھے کہ جس کی کرنوں سے صرف زمان و مکاں کے ظلمت کدے ہی منور نہیں ہوئے بلکہ ظلماتِ قلب و نظر کو بھی فکری و روحانی روشنی میسر آتی ہے۔ آپ کی شخصیت اس قدر جامع الصفات ہے کہ تذکرہ نگار کو بہت جلد اپنی ادبی کوتاہ سامانی کا احساس دامنگیر ہونے لگتا ہے۔ آپ عالم بے نظیر تھے کہ زمانہ مدتوں آپ کی نکتہ طرازیوں سے فیضیاب ہوتا رہا۔ فقیہ کامل تھے کہ آپ کے علمی و فقہی کمالات ارادت مندوں کے دلوں کو ہمیشہ اُجالے بخشتے رہیں گے۔ شیخ العصر تھے کہ آپ کی ایک ایک ادا چاہنے والوں کیلئے پیغام شوق تھی۔ پاسبان ناموس رسالت تھے کہ آپ نے کسی لحظہ مقام مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمتوں کو نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے دیا، بوریا نشین تھے کہ شہنشاہی آپ کی خدمت میں حاضری کو سعادت تصور کرتی تھی، غلامانِ شہ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے قافلہ سالار تھے کہ آپ کی زندگی کا ایک ایک لمحہ خوشنودی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے وقف تھا، تحریک پاکستان کے نڈر مجاہد تھے کہ کاروانِ حریت آپ کے جذبہ شوق سے نئی زندگی حاصل کرتا تھا، دنیائے عشق و سرمستی کے تاجدار تھے کہ دلوں کو آپ کی توجہ سے قرار اور نگاہوں کو بصیرت ایمانی عطا ہوتی تھی۔

ایسے مردانِ حق کیلئے ہی اقبال نے کہا ہے:

خیرہ نہ کرسکا مجھے جلوۂ دانش فرنگ

سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف

آپ نے ۱۳۳۳ھ میں سیال شریف کے مشہور خانوادہ روحانیت کے سربراہ ضیاء المملکت والدین حضرت خواجہ محمد ضیاء الدین رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں جنم لیا، آپ کے جد امجد شمس العارفین حضرت خواجہ شمس الدین سیالوی رحمۃ اللہ علیہ وہ بے نظیر شیخ طریقت تھے کہ جن کے فیض روحانیت سے برصغیر کا ایک ایک شہر مستفیض ہوتا رہا۔ حضرت شمس العارفین قبلہ عالم حضرت خواجہ سلیمان تونسوی

رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ خاص تھے۔ قبلہ شمس العارفین کے بعد آپ کے صاحبزادے حضرت ثانی صاحب خواجہ محمد دین سیالوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے خاندان کے سلسلہ معرفت کو اپنی خداداد صلاحیتوں کی بدولت جلا بخشی۔ حضرت ثانی رحمۃ اللہ علیہ صاحب کے بعد ان کے صاحبزادے حضرت خواجہ محمد ضیاء الدین رحمۃ اللہ علیہ آستانہ عالیہ شریف کے سجادہ نشین مقرر ہوئے۔ آپ اپنے وقت کے بے مثال شیخ طریقت تھے۔ آپ ایک عظیم المرتبت روحانی خاندان کے سربراہ ہونے کے ساتھ حربی و جنگی فنون میں بھی مہارت کامل رکھتے تھے۔ نشانہ بازی، نیزہ بازی، تیر اندازی، شمشیر افگنی اور شہسواری میں آپ کا ثانی دور دور تک نہیں ملتا تھا۔ آپ بے پناہ جذبہ جہاد اور شوق حریت و آزادی سے بہرہ ور تھے۔ ان فنون سپہ گری کے حصول سے آپ کا مقصود یہی تھا کہ اگر انگریزوں سے مقابلہ کی نوبت آجائے تو پھر داد شجاعت دیتے ہوئے عظمت ایمان کا ثبوت بہم پہنچایا جاسکے۔ آپ نے اپنے صاحبزادے حضرت خواجہ محمد قمر الدین کو جو آنے والے دور میں شیخ الاسلام و المسلمین کے لقب سے شہرت دوام کے مستحق ٹھہرے، روحانی و نظری علوم کے ساتھ ان کو فنون دلاوری میں بھی فرد کرنے کی کوشش فرمائی شروع کر دی۔ ان کی غیر معمولی توجہ، حضرت شیخ الاسلام کی خداداد علمی صلاحیت اور اکابرین سلسلہ عالیہ کی روحانی توجہ کے سبب حضرت شیخ الاسلام مستقبل کے میدان روحانیت کی ممتاز ترین شخصیت بن کر وارد ہوئے۔

آپ کو خدائے کریم نے نابغہ روزگار کی صفات عطا کی تھیں۔ ۹ سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کر لیا۔ فارسی اور عربی فنون کی کتابیں مدرسہ ضیاء الشمس الاسلام سیال شریف میں پڑھیں۔ آپ کے اساتذہ میں بہت سے معروف نام بھی شامل ہیں جن میں سے حضرت علامہ معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ علامہ اجمیری مدرسہ صوفیہ اجمیر شریف کے شیخ العلم تھے۔ آپ تحصیل علم کیلئے اجمیر شریف لے گئے اور علامہ اجمیری سے سلسلہ فیض استوار کیا۔ ابھی ایک ماہ ہی گزرا تھا کہ حضرت خواجہ ضیاء الدین رحمۃ اللہ علیہ نے علامہ اجمیری کو سیال شریف بلا لیا۔ چنانچہ حضرت خواجہ سیالوی بھی علامہ اجمیری کے ساتھ اپنے گھر چلے آئے اور پھر استاذ محترم کی نگرانی میں آپ نے جملہ علوم دینی حاصل کئے۔ آپ نے ان علوم کے حصول میں اس قدر کمال حاصل کیا کہ جب ۱۳۵۶ء میں حج بیت اللہ کیلئے ملک حجاز تشریف لے گئے تو وہاں کے علمائے حرین نے بھی آپ کو سندت عطا کیں۔

آپ کے والد ماجد حضرت خواجہ محمد ضیاء الدین رحمۃ اللہ علیہ ایک عظیم المرتبت روحانی پیشوا

نہیں تھے بلکہ تحریک آزادی کے سلسلہ میں بھی ان کا کردار ناقابل فراموش رہا ہے۔ حضرت خواجہ محمد ضیاء الدین انگریز دشمنی میں اپنی نظیر آپ تھے۔ آپ نے مختلف تحریکات آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ان کی انگریز دشمنی کا یہ عالم تھا کہ جب انہوں نے حکومت انگلشیہ کو رائلٹل کے لائسنس کے حصول کیلئے خط لکھا تو حکومت نے رائلٹل کی ضرورت دریافت کی۔ خواجہ محمد ضیاء الدین رحمۃ اللہ علیہ نے جواب میں لکھا ”تلوار کا زمانہ نہیں، دل کی آرزو ہے کہ موقع ملے تو کسی انگریز کے سینہ میں گولی پار کروں۔“

یہی انگریز دشمنی حضرت خواجہ محمد قمر الدین رحمۃ اللہ علیہ کو ورثہ میں عطا ہوئی تھی۔ آپ کی بیدار مغزی، درد مندی و دلسوزی نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا اور آپ اپنی جملہ علمی و فکری صلاحیتوں سے کام لیتے ہوئے میدان سیاست میں اس شان سے داخل ہوئے کہ تھوڑے ہی عرصہ میں حالات کا رخ پلٹ کر رکھ دیا۔ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ حضرت خواجہ محمد قمر الدین رحمۃ اللہ علیہ کو رائلٹل کے لائسنس کی ضرورت پیش آئی۔ سرگودھا کے انگریز ڈی سی کو خط لکھا تو اس نے ضروری کارروائی کرتے ہوئے فرنگی حکومت کیلئے آپ کی خدمات دریافت کیں۔ غیرت ایمانی کے اس مظہر عظیم نے کمال جلالت یقین کے ساتھ جواب دیا:

”تم کو میرے والد کی خدمات کا علم ہوگا جس قسم کی خدمات انہوں نے حکومت انگلشیہ کی انجام دی ہیں، انہی کی مجھ سے توقع رکھو۔“

آپ نے اپنے والد محترم کی جن خدمات کا حوالہ دیا تھا ان کے تذکرہ سے ہی فرنگی استبدادیت کو لرزہ محسوس ہونے لگتا تھا۔ حضرت خواجہ محمد قمر الدین میدان سیاست میں مجاہدانہ شان کے ساتھ اپنی صلاحیتوں کا جادو جگاتے ہوئے نمودار ہوئے تو علاقہ کے فرزند ان حریت جوق در جوق آپ کی قیادت میں جمع ہونے لگے۔ آپ سرگودھا مسلم لیگ کے صدر منتخب ہو گئے۔

قائد اعظم محمد علی جناح کے پیغام کو عام کرنے اور پاکستان کی اہمیت و افادیت کو اجاگر کرنے کے لئے آپ نے برصغیر پاک و ہند کے تمام قابل ذکر شہروں اور قصبات کے دورے کئے۔ آپ کے خانوادہ علمی سے نسبت روحانی رکھنے والے امراء اور سیاستدان جو مصلحت پسندی کی چادر اوڑھے انگریز کی سیاست کے نقیب بن کر زندگی گزار رہے تھے، آپ کی مجاہدانہ یلغار سے گھبرا اٹھے اور انہوں نے آپ کو جہاد عشق سے باز رکھنے کیلئے عرض کیا کہ چونکہ ہم سب آپ کے نیاز مند اور مرید ہیں۔ اس لئے خدارا آپ غیر جانبدار رہیں مگر آپ نے ان کی استدعا کو ٹھکراتے ہوئے واضح

طور پر اعلان فرمایا کہ ”مسلم لیگ اور کانگریس کی جنگ کفر اور اسلام کی جنگ ہے اور میں اس جنگ میں اسلام کے پرچم کو سرنگوں نہیں رکھ سکتا“ پاکستان یقیناً وجود میں آکر رہے گا۔“

انگریز آمریت نے آپ پر حرص و آرزو کا جال پھیلانے کی کوشش کی۔ یہ وہ جال تھا جس نے کتنے ہی صاحبانِ سجادہ کو مصلحت پسندیوں کا اسیر بنا رکھا تھا۔ حکومتِ برطانیہ کی طرف سے آپ کو سب سے بڑا دینی و روحانی اعزاز ”ہزہولی نس“ عطا کرنے کی سفارش کی گئی، جب یہ چشمی حضرت خواجہ تک پختی تو آپ نے کمال استغنا سے اس کے پزے پزے کر کے اسے نذر آتش کر دیا اور فرمایا:

”حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی اور پیر پٹھان بادشاہِ رحمۃ اللہ علیہ سے وابستگی ہی میرے لئے سب سے بڑا اعزاز ہے جب حرص اور آرزو لالچ سے آپ کو جرأتِ ایمانی سے باز نہ رکھا جاسکا تو پھر آپ کو عبرت دلانے کیلئے ساڑھے گیارہ مربع اراضی ضبط کر لی گئی اور آپ کے وروں اور تقاریر پر پابندی لگا دی گئی مگر آپ نے اپنا مشن جاری رکھا۔ کمپنی باغ سرگودھا کے درو دیوار آپ کی ایمانی استقامت، یقینِ محکم اور عظمتِ قیادت سے بخوبی آگاہ ہیں۔ آپ جدھر جاتے شمعِ آزادی کے پروانے آپ کے پسینہ پر خون چھا اور کرتے ہوئے پابہ رکاب ہوتے۔ انگریز حکومت نے آپ کو گرفتار کر کے گوبر اور گندے پانی سے بھری ہوئی کوٹھڑی میں بند کر دیا جس میں نہ بیٹھا جاسکتا تھا اور نہ ہی نماز پڑھی جاسکتی۔ لیکن یہ تمام سزائیں، جرمانے، پابندیاں اور ابتلائیں آپ کے شوقِ آزادی کو کچلنے میں ناکام رہیں اور اس جذبہٴ غیرتِ اسلام سے سرشار پاکستان کی منزل کی جانب گامزن رہے کہ:

کہاں سے تو نے اسے اقبال سیکھی ہے یہ درویشی

کہ چرچا بادشاہوں میں ہے تیری بادشاہی کا

۱۹۴۶ء میں آل انڈیا سنی کانفرنس بنارس میں آپ نے اپنے عقیدت مندوں کی کثیر تعداد کے ساتھ شرکت کی اور اس کانفرنس کو کامیاب بنانے کیلئے بھرپور کردار ادا کیا۔ آپ کو اس کانفرنس کی رابطہ کمیٹی کا رکن مقرر کیا گیا۔ اس طور آپ کو سنی کانفرنس کے مقاصد کو جو تحریکِ پاکستان کی فکری قوت بخشنے عام کرنے کا موقع میسر آیا اور یہ آل انڈیا سنی کانفرنس تحریکِ پاکستان کیلئے مشائخ و علمائے اہلسنت کو انتہائی طور پر سرگرم کار کرنے کا باعث ثابت ہوئی۔ ۱۹۴۶ء میں صوبہ سرحد میں ریفرنڈم کا موقع آیا تو آپ پیر صاحب مانگی شریف اور پیر صاحب زکوڑی شریف کے ساتھ صوبہ سرحد کے عوام کو پاکستان کی روحانی و دینی اہمیت سے آگاہ کرنے کیلئے مصروف عمل ہو گئے اور چند روز میں ہی مخالفتوں کا زور یوں ٹوٹا کہ سرحد کے جیالے مسلمان پاکستان کے پرچمِ آزادی کی چھاؤں میں

مستقبل کی روشنی ڈھونڈنے لگے۔

پاکستان اسلامیان برصغیر کے خوابوں کی تعبیر بن کر صفحہ ہستی پر نمودار ہو گیا تو آپ نے حضرت قائد اعظم کو مبارک باد دیتے ہوئے اسلامی آئین کے نفاذ اور اسلامی اصولوں کی ترویج کیلئے خط لکھا جس کے جواب میں قائد اعظم نے تحریک آزادی کے سلسلہ میں آپ کی یادگار کوششوں کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھا کہ:

”پاکستان کی تحریک میں مشائخ عظام کی خدمات بڑی عظیم اور قابل قدر ہیں۔ آپ اطمینان رکھیں پاکستان میں یقینی طور پر اسلامی قانون ہی نافذ ہوگا۔“

حضرت خواجہ محمد قمر الدین سیالوی رحمۃ اللہ علیہ بہت بڑے مفکر، مدبر اور مبلغ اسلام تھے۔ خدائے کریم نے آپ کو عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی دولت عظیم اس شان سے عطا کر رکھی تھی کہ حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شان اقدس میں معمولی سی گستاخی بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ توہین رسالت کا ارتکاب کسی فرد کی طرف سے ہوتا یا گروہ کی طرف سے آپ گستاخانِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف شمشیر بے نیام بن جاتے۔ اس سلسلہ میں آپ ظاہری نتائج سے بے نیاز ہو کر میدانِ عمل میں مردانہ وار کود پڑنے کے قائل تھے۔ آپ نے گستاخانِ بارگاہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی تحریروں اور تقریروں کا اس طرح ابطال کیا کہ مقام مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی رفعتیں اہل نظر کیلئے بصیرت آفرین بن گئیں۔ فرنگی کے ظلِ عاطفت میں پروان چڑھنے والے قادیانیت کے نخلِ باطل کی بیج کئی کیلئے آپ کی خدمات جلیلہ آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔ آپ نے خانہ ساز نبوت کے دعویدار مرزا غلام احمد قادیانی کے نظریات کی تردید کیلئے برصغیر کے طول و عرض میں دورے کئے اور زندگی کے آخری ایام تک قادیانیوں کا تعاقب ترک نہ کیا۔

۱۹۵۲ء میں تمام مکاتب فکر کے علماء کا ایک کنونشن برکت علی اسلامیہ ہال لاہور میں منعقد ہوا جس میں آپ کو خصوصی طور پر مدعو کیا گیا۔ آپ نے اس کنونشن میں فرمایا کہ ”قادیانیوں کا مسئلہ باتوں سے حل نہیں ہوگا۔ آپ مجھے حکم دیں میں قادیانیوں سے نیٹ لوں گا اور چند دنوں میں ربوہ کو صفحہ ہستی سے ناپید کر دوں گا۔“

آپ اور جملہ علمائے حق کی ولولہ انگیز مساعی کا ہی اثر تھا کہ ۱۹۷۲ء میں حکومت وقت کو قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینا پڑا۔ آپ کو استحکام پاکستان دل و جان سے عزیز تھا چونکہ قیام پاکستان کے سلسلہ میں آپ نے لازوال خدمات انجام دی تھیں اس لئے پاکستان کے معرض وجود

میں آجانے پر آپ کو کسی صورت بھی گوارا نہیں تھا کہ وطن عزیز کی عظمت و سلطنت پر معمولی سی آنچ بھی آئے۔ پاکستان کو نقصان پہنچانے کیلئے اندرونی اور بیرونی حملہ آوروں نے جب بھی یورش کی آپ ان کے مقابل پوری ایمانی قوت کے ساتھ سرگرم عمل ہو گئے۔ آپ کی حب الوطنی کی ایک جھلک حضرت پیر جسٹس پیر محمد کرم شاہ الازہری کے الفاظ میں ملاحظہ کیجئے۔

”اپنے رب کریم کی بارگاہ میں آپ شہادت کیلئے ہمیشہ دست بدعا رہا کرتے، جب کشمیر کو آزاد کرانے کیلئے جہاد شروع ہوا تو آپ نے اپنے عقیدت مندوں کو اس جہاد میں حصہ لینے کی ترغیب دی جو سینکڑوں کی تعداد میں سب سے اگلے مورچوں پر بھارت کی فوجوں سے برسر پیکار رہے اور ان کے چھکے چھڑا دیئے۔ مجاہدین کشمیر کی مالی خدمت کرنے کے علاوہ آپ نے بے شمار سپاہیوں کو اسلحہ اور بارود اپنی گرہ سے خرید کر مہیا کیا اور اس کی کبھی نمائش نہ کی، جب ۱۹۶۵ء کی جنگ شروع ہوئی تو آپ نے اپنے کاشانہ اقدس کی خواتین کے تمام زیورات افواج پاکستان کی خدمت میں نذر کر دیئے اور اس بے مثال قربانی کا کبھی اظہار نہ ہونے دیا۔“

آپ نظریہ پاکستان کے زبردست فدائی اور عظمت اسلام کے نقیب تھے۔ اسلامی اقدار کا فروغ اور اسلامی تعلیمات کی ترویج آپ کو ہر حال میں عزیز تھی۔ آپ پاکستان کو اسلام کا قلعہ اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فیضان تصور کرتے اور آپ کو یہ گوارا نہیں تھا کہ اس ملک میں جو صرف اور صرف اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا ہے۔ کوئی باطل نظام پرورش پائے۔ ۱۹۷۰ء میں اشتراکیت کے پرستاروں نے اسلام پر ضرب کاری لگانے کی ٹھان لی اور تمام اسلام دشمن طاقتیں ایک ہو کر پاکستان میں سرخ سویرا لانے کے خواب کو عملی تعبیر بخشنے کیلئے اشتراکیت کے فروغ کیلئے اپنی تمام توانائیاں صرف کرتے ہوئے میدان عمل میں اتر آئیں اور ٹوبہ ٹیک سنگھ کو پاکستان کا لینن گراڈ بنانے کی تیاریاں کرنے لگیں۔

عشاق رسول صلی اللہ علیہ وسلم بے چین ہو گئے اور ٹوبہ ٹیک سنگھ میں کل پاکستان سنی کانفرنس منعقد ہوئی، جس میں غلامان رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم لاکھوں کی تعداد میں جمع ہوئے۔ ہزاروں علماء و مشائخ نے متفقہ طور پر آپ کو جمعیت العلمائے پاکستان کا صدر منتخب کر کے آپ سے ان مشکل ساعتوں میں ملت اسلامیہ کی راہنمائی کی درخواست کی۔ آپ پیرانہ سالی کے باوجود ایک بار پھر میدان عمل میں اس شان سے باطل قوتوں کے مقابل صف آراء ہوئے کہ بہت جلد عظمت اسلام کا پرچم ایمان و یقین کی سر بلندیوں پر لہرانے لگا۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ کو دارالسلام کا نام دے دیا گیا اور اسلام

دشمنوں کے وہ عزائم خاک میں مل گئے جو اس گلشن اسلام کو ویران کر کے اشتراکیت کا مرکز بنانا چاہتے تھے۔ آپ نے جمعیت العلمائے پاکستان کو مجاہد محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہوں کا تارا بنا دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ مذہبی جماعت اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا سبز پرچم لہراتے ہوئے ”الدین والسیاست“ کے عملی تقاضوں کو پورا کرنے لگی۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت و عقیدت خاصانِ خدا کا امتیاز ہے۔ یہ محبت حاصل ایمان بھی ہے اور شوکت انسان بھی۔ حضرت خواجہ محمد قمر الدین سیالوی کا دل حب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشبوئے جاں نواز سے ہمہ وقت مہکبار رہتا تھا۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم گرامی سنتے تو آپ پر وجدانی کیفیت طاری ہو جاتی۔ تشہد میں السلام عليك ايها النبي اور اشہد ان محمد عبده ورسوله پر پہنچتے تو آپ کا وجود اقدس لرزتا ہوا معلوم ہوتا اور یہ منظر ایسا دلگداز ہوتا کہ دیکھنے والوں کو اپنے احساسات پر لرزیدگی طاری ہوتی ہوئی محسوس ہوتی۔ کوئی عرب ملاقات کو آیا تو اس کے ہاتھ چوم لیتے۔ سادات کا غیر معمولی احترام کرتے اور متعلقین کو آل رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے احترام و عقیدت کا رشتہ استوار کرنے کو فرمایا کرتے کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی آل سے محبت ہی مسلمان کا توشہ آخرت ہے۔ گنبد خضریٰ کے سبز رنگ کو ادراک میں بسائے رکھتے۔ سبز چیز پر پاؤں رکھنا خلاف ادب تصور کرتے۔ آپ نے پوری عمر ایسا جوتا نہ پہنا اور نہ ہی پسند فرمایا جس پر ذرا بھی سبز رنگ کا نشان موجود تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ اقدس یا آپ کے نعلین مبارک کا فریم کہیں آویزاں دیکھتے تو وہیں سر جھکا کر کھڑے ہو جاتے اور آنکھیں آنسوؤں کی مالائیں پرونے لگتیں۔ مدینہ منورہ حاضری دیتے تو وہاں کے سادات کے گھرانوں میں حاضری دیتے اور سید زادوں کی ہر ممکن امداد کرتے۔ خاک طیبہ کے ذرے ذرے کو چومتے، خشک خاشاک را ہگزار شہر مدینہ کو آنکھوں سے لگاتے وہاں کے کتوں سے بھی پیار کرتے۔ مدینہ منورہ میں قیام کے تمام ایام میں آپ عظیم المرتبت عاشق رسول سیدنا امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی سنت عقیدت حضور صلی اللہ علیہ وسلم ادا کرتے کہ:

ادب گاہست زیر آسماں از عرش نازک تر

نفس گم کردہ می آید جنید و پایزید اینجا

آپ کی شخصیت محاسن و اوصاف کے لحاظ سے اسلاف کی آئینہ دار تھی۔ آپ کا خانوادہ

چشت دنیائے طریقت و معرفت میں غیر معمولی قدر و منزلت کا حامل ہے۔ اس لئے برصغیر کے

اصحاب ایمان آپ سے اس خانوادہ کے شایانِ شان کردار کی توقع رکھتے تھے۔ آپ نے اپنے افعال اور اقوال کے ذریعہ یہ ثابت کر دیا، انسانی سیرت و کردار کی سر بلندیوں کو مجسم کر دیا جائے تو پھر مطلع افکار پر خواجہ محمد قمر الدین کا نام ہی ابھرتا ہے۔ ایک عظیم سجادہ نشین کی حیثیت سے، ایک قائدِ عالی مرتبت کی حیثیت سے، کاروانِ حریت کے سالار کی حیثیت سے، عاشقِ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت سے، علماء و مشائخ کے افتخار کی حیثیت سے، تعلیماتِ اسلامی کے مبلغ کی حیثیت سے، عقیدہٴ ختمِ نبوت کے پاسدار کی حیثیت سے، جمعیتِ علمائے پاکستان کے صدرِ عالی وقار کی حیثیت سے، تحریکِ پاکستان کے ہر اول دستے کے صفِ شکن مردِ عز و وقار کی حیثیت سے، آپ نے حق و صداقت کی پاسداری اور انسانی اقدار کی سرفرازی کیلئے کبھی بھی کسی قربانی سے دریغ نہ کیا، جب بھی گردشِ آپ کا راستہ روکتیں اور طوفانِ آپ کی مجاہدانہ یلغار کے مقابلے میں امنڈتے تو آپ کے چہرے پر ملکوتی تبسمِ رقصاں ہوتا اور کمالِ شانِ استغنا کے ساتھ فرمایا کرتے:

”عزت صرف اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، اگر میں نے ایک لمحہ کیلئے بھی یہ سوچا کہ مجھے اللہ کے سوا کوئی مٹا سکتا ہے تو میں کافر ہو جاؤں گا۔“

میرادل گواہی دیتا ہے کہ ایسے ہی رمزِ آشنائے اسرارِ خودی کے بارے میں علامہ اقبال نے

کہا تھا:

اللہ کو پامردی مومن پہ بھروسا

اپلیں کو یورپ کی مشینوں کا سہارا

خوشی و مسرت کے گہواروں میں جھولتے ہوئے اقدارِ اسلامی کے تحفظ کی بات کرنا آسان ہے مگر اسلامی اقدار کی سر بلندی و پاسداری کا اس وقت امتحان ہوتا ہے جب انسان جسمانی طور پر معذوری و لاچارگی کی کیفیت سے گزر رہا ہو، شریعتِ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پاسداری کی معراجِ کھینی ہو تو حضرت خواجہ محمد قمر الدین سیالوی کے وقتِ آخر کا تصور کیجئے۔

رمضان المبارک چودہ تاریخ کو آپ آستانہ عالیہ سیال شریف سے لاہور روانہ ہوئے۔ سرگودھا لاہور سڑک پر سرگودھا سے چند میل کے فاصلے پر ایک ٹرک سامنے سے آتا دکھائی دیا جو غلط سمت سے آرہا تھا۔ آپ کے جانشین ڈرائیور غلام حیدر نے جو پینتالیس برس سے آپ کے سفر کا رفیق تھا، گاڑی کو اور بائیں جانب کر لیا اور پھر آہستہ آہستہ کچے راستہ پر اتار دیا لیکن ٹرک ڈرائیور نشہ میں تھکا اپنے ٹرک کو غلط سمت آگے بڑھا رہا۔ قیامت خیز دھماکہ ہوا اور ٹرک نے آپ کی گاڑی کو پس

کر رکھ دیا۔ آپ کا ڈرائیور وہیں موقع پر ہی نذرانہ حیات پیش کر کے حیات ابدی کا مستحق ٹھہرا۔ ایک دوسرا خادم اللہ بخش بھی جو کار کی کچھلی سیٹ پر تھا آپ کے قدموں پر نثار ہو گیا۔ دو اور رفیقان سفر کو شدید چوٹیں آئیں۔

حضرت قبلہ خواجہ محمد قمر الدین سیالوی ڈرائیور کے ساتھ پہلی سیٹ پر تشریف فرما تھے۔ آپ کی دائیں ٹانگ کی پنڈلی کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ چہرہ اقدس اور جسم کے باقی اعضاء صحیح سلامت تھے۔ آپ کی استقامت و پامردی کا اندازہ کیجئے جانثار جام شہادت نوش کر چکے خود زخمی ہیں، حالت روزہ میں ہیں، شدت کی گرمی پڑ رہی ہے، اطراف و اکناف سے آپ کے عقیدت مند جمع ہو رہے ہیں، آپ کو چار پائی پر لٹایا جا چکا ہے۔ ایک عقیدت مند ادب سے پانی کا گلاس پیش کرتا ہے مگر تاریخ اسلام کا یہ بطل جلیل اپنے جسم کی تمام توانائیوں کو سمیٹے ہوئے ہاتھ کے اشارے سے گلاس کو پرے ہٹاتے ہوئے فرما رہا ہے:

”میں پانی نہیں پیوں گا، میرا روزہ ہے“

وقت کے تپتے ہوئے دشت کربلا میں صبر حسین رضی اللہ عنہ کی یاد تازہ کر دینے والے اس ولی کامل کے یہ الفاظ داستان صبر و رضا کا جگمگانا ہوا باب حیات آفریں ہیں جن کی ایمانی چمک دمک سے دلوں کے ظلمت کدے روشنی پاتے رہیں گے۔

دو روز تک آپ ڈسٹرکٹ ہسپتال سرگودھا میں زیر علاج رہے۔ سترہ رمضان المبارک ۱۹۸۱ء کو آپ کو ڈاکٹروں کے مشورے پر سی ایم ایچ لاہور لے جایا گیا، لیکن ڈاکٹروں کی تمام تر مساعیٰ پیشہ ورانہ جدوجہد اور بے شمار عقیدت مندوں کی دعاؤں کے باوجود اجل کا وارنہ ٹل سکا اور وہ شخصیت دار فانی سے دار البقا کی طرف کوچ کر گئی جسے دنیا شیخ الاسلام والمسلمین، قمر الملت والدین حضرت خواجہ محمد قمر الدین سیالوی کے اسم گرامی سے پہچانتی تھی۔

موت ہے ہنگامہ آراء قلزم خاموش میں

ڈوب جاتے ہیں سفینے موت کی آغوش میں

نے مجال شکوہ ہے نے طاقت گفتار ہے

زندگانی کیا ہے اک طوق گلو افشار ہے

آج حضرت خواجہ محمد قمر الدین سیالوی رحمۃ اللہ علیہ اگرچہ جسمانی طور پر ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں مگر آپ کا روشن کردار زمانے کی گردشوں کو شکست دیتا ہوا رہ نور دان جاوہ شوق کو حیات

جاودانی کی نوید دے رہا ہے۔ آپ کی کس کس ادائے خاص کا تذکرہ کیا جائے اور سیرت و کردار کی عظمتوں کو کس کس زاویہ ہائے خرد سے دیکھا اور محسوس کیا جائے۔ آپ تو سراپا روشنی ہیں۔ انوار لٹاتا ہوا قمر اسلام ہیں، آفتاب رشد و ہدایت ہیں۔ جلالت روحانیت کا یہ عالم کہ کجکلاہان وقت آپ کے آستانہ پر جبیں سائی کو حاضری دیتے دیکھتے اور فقر غیور کو یہ عالم کہ جسم کا لباس انتہائی سادہ جس میں بعض اوقات پیوند لگے ہوتے، سخاوت و کشادہ چشمی کا یہ عالم کہ جو بھی آپ کے دروازے پر حاضر ہوا، جھولی بھر کر لے گیا اور استغنا کا یہ عالم کہ ایک بار جب سرکاری حکم پر نوٹ بدلوانے کیلئے بینکوں پر ساری خلقت اٹھ پڑی تھی تو سیال شریف کی اقلیم روحانیت کے تاجدار کے پاس فقط آٹھ آنے تھے۔ قیادت و سیادت کا یہ عالم کہ جدھر کا رخ کیا، زمانہ پابہ رکاب چلتا رہا، مگر بے نیازی کا یہ عالم خلوت نشینی اور حجرہ گزینی کو ہی اصل حیات تصور کرتے رہے۔ اولوالعزمی اور جرأت و پامردی کا یہ عالم کہ وقت کے فرعونوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر انہیں پیغام حق سناتے رہے اور علائق دنیوی سے بیزاری کا یہ عام ذاتی مقصد براری کیلئے تمام زندگی کسی صاحب اقتدار سے ایک لفظ بھی نہ کہا۔

ہو کوئی بادشاہ یا کوئی وزیر ہو

اپنی بلا سے بیٹھ رہے جب فقیر ہو

حضرت خواجہ محمد قمر الدین سیالوی وہ نابغہ روزگار شخصیت تھے جو زندگی کے اُفق سے کاروان شوق کو ولولہ تازہ بخشنے کیلئے نمودار ہوتی ہے۔ آپ علم و عمل کا پیکر تھے، صدق و صفا کے مخزن تھے، زندگی پائندگی کا بہاریں بکھیرتا ہوا گلشن تھے، گلستانِ چشت کی بہار تھے، قلمزم معرفت کا گوہر تابدار تھے، بزم ہستی کی آرزو تھے، قافلہ ذوق و شوق کا حاصل جستجو تھے، عرصہ عالم میں رفعت ایمان کی نمود تھے، زینت سرائے بزم شہود تھے، فقر غیور کی مجسم تنویر تھے، رشد و ہدایت کی عملی تصویر تھے، عشق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مظہر صد آفرین تھے، محفل ارباب ولایت کی تزئین تھے، انوار بکھیرنے والے قمر الملت والدین تھے، دلوں کو ذوق یقین بخشنے والے شیخ الاسلام و المسلمین تھے۔ آپ ہر گام پر عقیدت مندوں کے دلوں میں مہر و مہ کی صورت کر نہیں لٹاتے اور ظلمات عصر میں محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی جوت جگاتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔

ہر گز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق

ثبت است بر جریدۂ عالم زوام ما



قطب عالم حضرت خواجہ احمد میروی رحمۃ اللہ علیہ کی ایمان آفریں شخصیت سے حضرت قبلہ محبوب احمد رحمۃ اللہ علیہ تک

بزم ہستی نے ہمیشہ یہی ایمان آفریں نظارہ دیکھا ہے کہ جہاں کفر و شرک کی تاریکیاں مسلط ہونے لگتی ہیں وہیں ایک ایک انوارِ خداوندی جلوہ ریز ہونے لگتے ہیں اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے انوارِ خداوندی ظلمتوں اور تاریکیوں کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے نیست و نابود کر دیتے ہیں۔ اولیائے کرام اور صوفیائے عظام انہی انوارِ خداوندی کی نورانی چھاؤں میں آگے بڑھتے ہیں اور عظمتِ خداوندی اور شانِ رسالتِ مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اصحابِ نظر کے دلوں میں جاگزیں کر دیتے ہیں۔ یہی وہ مبلغینِ اسلام ہیں جن کے کارناموں سے تاریخِ عالم کا ہر گوشہ جگمگاتا ہے۔ خطہٴ جنتِ نظیر ”میرا شریف“ (ضلع اٹک) ایسا ہی روحانی مرکز ہے جہاں سید الاولیاءِ قطب عالم حضرت خواجہ احمد میروی رحمۃ اللہ علیہ نے گلستانِ معرفت یوں کھلایا کہ آج تک زمانہ اس کی خوشبوئے طریقت سے دلوں کو معطر کر رہا ہے۔ آپ کے روحانی کمالات کی صدائے بازگشت مدتوں بعد بھی یہی اعلان کر رہی ہے کہ:

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زور بازو کا

نگاہِ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

حضرت قبلہ خواجہ احمد میروی رحمۃ اللہ علیہ خواجہ خواجگانِ سلطانِ اقلیم ولایت حضرت خواجہ محمد سلیمان تونسوی رحمۃ اللہ علیہ کے مرید خاص تھے۔ آپ کے والد گرامی نے بھی اسی مردِ کامل سے فیض اٹھایا تھا۔ خواجہ خواجگان نے حضرت خواجہ احمد میروی رحمۃ اللہ علیہ کو بھی اپنی توجہاتِ خصوصی کا مرکز بنا لیا۔ خواجہ خواجگان سے جب آپ شروع میں بیعت ہوئے تو انہیں ایک نظر دیکھتے ہی اعلان فرما دیا کہ یہ طفل ہونہار روحانیت کے آسمان کی بلندیوں پر پرواز کرے گا اور اس شاہبازِ معرفت سے ایک زمانہ فیضیاب ہوگا۔ پہلی ہی ملاقات میں ایک عقیدت مند خراسان سے حاضر ہوا اور اس نے چار سیبِ خراسانی پیش کئے۔ خواجہ تونسوی نے آدھا سیب خود کاٹ کر حضرت احمد میروی کو دیا اور بقیہ سیبوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے حاضرین میں تقسیم کر دیئے۔ اس سیب کی تاثیر نے خواجہ احمد میروی

کے دل کی کایا ہی پلٹ دی اور پھر آپ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے اسی آستانہ عالیہ چشتیہ کے ہو کر رہ گئے۔
حضرت خواجہ احمد میروی رحمۃ اللہ علیہ نے شیخ کامل کے حکم کی تعمیل میں جی بھر کر دینی علوم حاصل کئے۔ عربی اور فارسی پر بھرپور دسترس حاصل کی۔ قرآن حکیم کی تفسیر اور علوم دینیہ پر گرفت حاصل کی۔ ساتھ ساتھ شیخ کامل کے انوار رحمت و معرفت سے بھی فیضیاب ہوتے رہے۔ بالآخر وہ لمحہ قدسی آ پہنچا جب ذرے آفتاب اور قطرے سمندر کا روپ اختیار کرتے ہیں؛ جب آپ نے سخت مجاہدوں، روحانی ریاضتوں اور خواجہ خواجگان کے حکم کی تعمیل میں عبادات کثیرہ کے بعد روحانی سرفرازیوں کو چھو لیا تو پھر خواجہ خواجگان حضرت سلیمان تونسوی رحمۃ اللہ علیہ کا دریائے رحمت جھوم اٹھا اور آپ کو خرقہ خلافت سے سرفراز فرما دیا۔ آپ نے خلافت کے حصول کے بعد بھی مرشد کامل کا آستانہ چھوڑا کیونکہ آپ کا مقصد تو شیخ کامل کی صحبت ایمانی سے جی بھر کر فیضیاب ہونا تھا۔ آپ اگر ان کے حکم کی تعمیل میں چلے بھی جاتے تو جلد واپس لوٹ آتے کہ آپ کو مرشد کو دیکھے بغیر ایک پل بھی قرار نہیں آتا تھا؛ جب خواجہ خواجگان وصال فرما گئے اور آپ کے نور نظر سلطان الواصلین حضرت قبلہ اللہ بخش تونسوی رحمۃ اللہ علیہ سجادہ نشین ہوئے تو انہوں نے فرمایا کہ آپ جائیں اور خواجہ خواجگان سے حاصل کی ہوئی تعلیم کو چاروں طرف پھیلا دیں۔

فیضانِ چشتیت کو عام کرنے کیلئے آپ نے ایک مقام ”میرا“ انتخاب کیا جو پہاڑی علاقہ تھا، ریت ہی ریت تھی، بے آباد بنجر اور ویران علاقہ، پانی کوسوں دور سے لانا پڑتا، رات کو شیروں اور درندوں کا راج ہوتا۔ آپ ایک ٹیلہ کے اوپر جھونپڑی بنا کر ایک مرید کے ساتھ بیٹھ گئے پھر کیا تھا چاروں طرف سے خلق خدا کا ہجوم اُٹھ آیا۔ بے آباد علاقہ آباد ہونے لگا آج بھی جبکہ یہ علاقہ آباد ہو چکا ہے تو شام کو مضافات کی ویرانی اور نہایت کم آبادی دیکھ کر حیرت ہوتی کہ قبلہ عالم خواجہ احمد میروی نے کس روحانی ولولہ کے ساتھ مرشد کامل کے حکم کی تعمیل کی۔ یہاں ڈیرا لگایا ہوگا، آپ نے شدائد زمانہ اور مشکلات کی پروانہ کی اور پھر زمانے نے دیکھا کہ:

حسن بے پروا کو اپنی بے نقابی کے لئے

ہوں اگر شہروں سے بن پیارے تو شہر اچھے کہ بن

آپ کی اس روحانی ثابت قدمی کو دیکھ کر ہی شاہ سلیمان رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اب یہ ”میرا“ نہیں بلکہ میرا ہے۔ یہ جملہ زبان زد عام ہو گیا اور ”میرا شریف“ دیکھتے ہی دیکھتے برصغیر پاک و ہند کے اہل اللہ کی نگاہوں کا مرکز بن گیا۔ علم و حکمت کے متوالے روحانیت کے سرچشمے سے

اپنی پیاس بجھانے کیلئے حاضری دینے لگے۔ نوابین اور امراء آپ کے قرب کے تمنائی تھے مگر آپ تو غریب نواز اور صاحب فقر تھے۔ آپ نے ہمیشہ غریبوں سے پیار کیا، ایک مرتبہ نواب آف کالا باغ (نواب امیر محمد خاں مرحوم کے والد) مدتوں اصرار کے بعد آپ کے راستے میں کھڑے ہو گئے مگر آپ نے راستہ بدل لیا اور فقط یہی پیغام بھیجا کہ ہماری دنیا اور ہے اور تمہاری دنیا اور ہے۔ آپ کی سادگی، سادہ دلی اور درویشی بے مثال تھی۔ ہر کام خود کرتے۔ مریدوں اور ارادت مندوں کو ہر ممکن سہولت بہم پہنچانے کی کوشش کرتے اور پھر آپ ہی کا فیضان تھا کہ بنجر سر زمین رحمت خداوندی کی مظہر بن گئی۔ پہاڑوں سے رحمت کے چشمنے اُبلنے لگے۔ ذراتِ راہ ستاروں میں ڈھلنے لگے اور پھر تو ”میرا شریف“ میں حاضری دینے والوں کو ہر لمحہ یہ احساس ہونے لگا کہ:

نہ اس میں گھاس اُگتی تھی نہ اس میں پھول کھلتے تھے

مگر اس سر زمین سے آسمان بھی جھک کے ملتے تھے

آپ صاحب کرامات کثیرہ تھے۔ آپ نے چوروں کو قطب بنایا، گمراہوں کو راہ حق پر گامزن کیا، بے یقینیوں کو ایمان کی دولت دی، احکامات دین سے دور رہنے والوں کو دین اسلام سے آگاہی بخشی۔ آپ کا سال وصال ۱۳۳۰ھ ہے۔ آپ نے اپنی زندگی ہی میں اپنے حلقہ ارادت سے فیضیاب ہونے والے مردِ کامل حضرت خواجہ احمد خان رحمۃ اللہ علیہ کو اپنا جانشین نامزد فرما دیا تھا۔ حضرت خواجہ احمد خان نے حضرت خواجہ احمد میروی رحمۃ اللہ علیہ کے فیوض عام کی دولت روحانیت کو جی بھر کر تقسیم کیا۔ حجرے بنائے، عمارات میں اضافہ کیا۔ آپ صحیح معنوں میں اپنے مرشد کامل کے نقش ثانی تھے۔

آپ کے تذکار سے آج بھی اہل اللہ کے قلب و نظر آباد ہیں۔ آپ کے بعد آپ کے عظیم المرتبت بھتیجے حضرت خواجہ فقیر محمد عبد اللہ میروی چشتی رحمۃ اللہ علیہ سجادہ نشین کی مسند علمی پر فائز ہوئے۔ حضرت خواجہ فقیر محمد عبد اللہ زہد و تقویٰ، روحانیت اور عبادت ریاضت میں اپنے عظیم المرتبت اسلاف کی تصویر تھے۔ آپ حسن و جمال کے مرقع تھے، صورت و سیرت کا دل نشین پیکر تھے، آپ نے ویران دلوں کو آباد کیا، بے قراروں کو روحانی قرار کی دولت تقسیم کی۔ دربار عالیہ کے سلسلے کو وسعت دی۔ عمارات میں اضافہ کیا، سڑکیں بنوائیں، حجرے بنوائے، مسجد کو وسیع کیا۔ دینی مکتب کے نظام کو وسعت دی، آپ کا دور اس خانقاہ عالیہ چشتیہ سلیمانہ میرا شریف کا انتہائی سنہری دور تھا۔ آپ کو رب کریم نے نہایت صالح اور سعید بخت فرزندوں سے نوازا، جنہوں نے آپ کے بعد آپ کے

پیغام قدسیہ کی اشاعت کیلئے تمام صلاحیتیں وقف کر دیں۔ آپ کے صاحبزادگان کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

حضرت قبلہ خواجہ منظور احمد رحمۃ اللہ علیہ

حضرت قبلہ خواجہ محبوب احمد رحمۃ اللہ علیہ

حضرت قبلہ خواجہ مقبول احمد

حضرت قبلہ خواجہ ظفر احمد رحمۃ اللہ علیہ

حضرت قبلہ خواجہ شہزاد احمد

حضرت قبلہ خواجہ فخر احمد

حضرت قبلہ خواجہ منظور احمد اور حضرت قبلہ خواجہ ظفر احمد صاحب ایک عرصہ تک رشد و ہدایت کا فریضہ انجام دیتے ہوئے خالق حقیقی کی بارگاہ میں حاضر ہو گئے۔ ان کے وصال کے بعد ان کے صاحبزادگان والا تبار روحانیت و معرفت کے انوار کی اشاعت کیلئے اپنا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ تیسرے بھائی مخدوم و مکرم مرشدی و مولائی حضرت قبلہ خواجہ محمد محبوب احمد گذشتہ سال رب کریم کی بارگاہ میں حاضر ہو گئے۔ آپ کے وصال انور سے ایک زمانہ آنسوؤں میں ڈوب گیا، ہر طرف طوفان الم برپا ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ۰

حضرت مرشدی و مولائی خواجہ محبوب احمد رحمۃ اللہ علیہ کو رب کریم نے غیر معمولی صفات سے نوازا تھا۔ آپ نے تبلیغی دورے کثرت سے کئے تھے۔ یہ تبلیغی دورے بھی اہل طریقت کے روحانی اسلوب کا ایک حصہ ہوتے ہیں کہ وہ لوگ جو دور دراز سے یہاں آ نہیں سکتے، ان تک معرفت کا پیغام پہنچایا جائے۔ آپ علوم دینی و دنیاوی سے بہرہ ور تھے۔ جہاں جاتے وہاں لوگوں کو راہ حق پر کامزن کرنے کیلئے اپنے مواعظ سے نوازتے۔ آستانہ عالیہ ”میرا شریف“ سے خصوصی طور پر برکات حاصل کرنے والے معروف عالم دین حضرت مولانا غلام محمد صاحب اکثر آپ کے ہمراہ ہوتے۔ ان کے وائٹس مواعظ اور تقاریر سے بے شمار دلون کو روحانی آسودگی حاصل ہوتی۔ آپ جہاں جاتے وہاں پہلے ہی سے مطلع فرما دیتے تاکہ ارد گرد کے لوگ جمع ہو کر فیضیاب ہو سکیں۔ آپ صحیح معنوں میں مبلغ اسلام تھے۔ آپ کو دیکھ کر خدا یاد آتا تھا اور آنکھوں میں اس آستانہ عالیہ کے بزرگوں کا تصور روشنی دینے لگتا تھا۔ آپ کی محفل میں بیٹھ کر بجا طور پر احساس ہوتا تھا کہ:

یک زمانہ صحبت با اولیاء

بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

حضرت خواجہ محبوب احمد دین اسلام کی تعلیمات کا حسین عکس تھے۔ آپ کی تعلیمات دلوں میں گھر کر لیتیں اور دلوں کی بنجر کھیتیوں پر سحاب نور برسنے لگتا۔ آپ اپنے اسلاف سے روشناس کرواتے۔ ان کے کارناموں سے آگاہ کرتے اور عوام الناس تک پیغام پہنچاتے کہ اگر فلاح دارین کے تمنائی ہو تو دامانِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم میں پناہ ڈھونڈ لو۔ اولیائے کرام کے اسوۂ حسنہ کو اپنا لو کیونکہ ہم فقط اسی صورت ہی روحانی سرفرازی کے حق دار بن سکتے ہیں۔ آپ اپنے مریدوں اور ارادت مندوں سے نہایت شفقت سے پیش آتے۔ دراصل آپ کا کردار عظیم اس قدر جاذب فکر تھا کہ اس کے نقوش دلوں میں جاگزیں ہو جاتے۔ آج مخدومی و مرشدی حضرت قبلہ خواجہ محبوب احمد ہم میں نہیں تو ایک زمانہ درہم برہم دکھائی دیتا ہے۔

اب کہاں سے لائیں گے اس سا شفیق و مہرباں

چھوڑ کر کشتی بھنور میں چل دیئے سوئے جناں

حضرت خواجہ محبوب احمد رحمۃ اللہ علیہ بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ○ ایک مہر عالم تاب غروب ہو گیا۔ عظیم مردِ درویش آسودہ لحد ہو گیا۔ اس خانوادہ عالیہ کی شان ہی نرالی ہے جسے بھی دیکھیں وہی آفتاب معرفت دکھائی دیتا ہے۔ راقم (محمد اکرم رضا) کا تعلق کوٹلی نواب گوجرانوالہ سے ہے۔ میں اس تصور کو اب تک دل و جان میں بسائے ہوئے ہوں جب حضرت قبلہ خواجہ منظور احمد رحمۃ اللہ علیہ برادر کبیر مولانا محمد انور چشتی نظامی خلیفہ میرا شریف کی دعوت پر میرے گاؤں تشریف لائے تھے اور راقم کو خصوصی توجہ اور رحمتوں سے نوازا تھا میں تو ہمیشہ ہی سے اس خانقاہ عالیہ کے ٹکڑے کھانے والا گدا ہوں میں نے تو آستانہ عالیہ ”میرا شریف“ پر حاضر ہو کر رات رات بھر دربار عالیہ کے اندر پُر انوار ماحول میں رہ کر عبادات کی لذتیں لوٹی ہیں بہت سے مناقب کہے ہیں آج یہی لذات روحانی میرے لئے خضر راہ بنی ہوئی ہیں۔

حضرت قبلہ خواجہ محبوب احمد رحمۃ اللہ علیہ مجھے خصوصی دعاؤں سے نوازتے رہے۔ حضرت مولانا غلام محمد تو خطاب فرماتے ہی تھے مجھے خصوصی طور پر خطاب کرنے کی دعوت دی جاتی اور فرمایا کرتے کہ ”پروفیسر صاحب حضرت اعلیٰ خواجہ احمد میروی کی زندہ کرامت ہیں۔ اس سے بڑھ کر کوئی اور اعزاز میرے لئے کیا ہو سکتا ہے۔ مجھے ہر درگاہ اور آستانہ سے عزت ملی ہے اور یہ سب حضرت اعلیٰ خواجہ احمد میروی اور حضرت مرشدی خواجہ محبوب احمد کی دعاؤں کا صدقہ ہے۔“

ہمارا خاندان کئی پشتوں سے اس درگاہ عالیہ کا نیاز مند رہا ہے۔ موکل سندھواں میں بھی آپ کا خصوصی دورہ ہوتا تھا۔ موکل سندھواں پر خاندان عالیہ میرا شریف نے کئی پشتوں سے فیضان فرمایا اور خلافتیں عطا فرمائیں۔ راقم (محمد اکرم رضا) کو جب حضرت قبلہ خواجہ محمد محبوب احمد رحمۃ اللہ علیہ نے خلافت سے نوازا اور دستار بندی فرمائی تو برسوں سے راقم کی آنکھوں میں پوشیدہ آنسوؤں کے چشمے چھلک اُٹھے۔ حضرت قبلہ خواجہ صاحب نے لطف کمال سے فرمایا کہ ”رب کریم آپ سے آستانہ عالیہ میرا شریف کے پیغام کی اشاعت کا کام لے گا اور لگتا ہے کہ حضرت اعلیٰ خواجہ احمد میروی رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کو منتخب فرمایا ہے۔“ حضرت قبلہ مولانا غلام محمد اور برادرِ مکرم مولانا محمد نور صاحب چشتی بھی اس روحانی کیفیت کو دیکھ کر اشک بار ہو گئے۔

آج مخدوم و مکرم حضرت قبلہ خواجہ مقبول احمد مدظلہ العالی کی شخصیت چراغ طور کی صورت نظر آتی ہے۔ آپ کو دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ جیسے ”میرا شریف“ کی عظمت رفتہ لوٹ آئی ہے۔ حضرت خواجہ مقبول احمد کا روحانی سراپا دلنشین اور ایمان افروز ہے۔ آپ سب پر نظر کرم کئے ہوئے ہیں۔ بے شمار ارادت مندوں کے پہلو بہ پہلو مجھ خاکسار کو بھی فیضان خصوصی سے نوازا رہے ہیں۔

خواجہ مقبول احمد اپنے نام کی طرح مقبول زمانہ ہیں۔ ایک زمانہ آپ سے پیار کرتا ہے اور آپ کی روحانی توجہ کا منتظر رہتا ہے۔ آپ دربار عالیہ کے جملہ انتظامات میں مصروف رہتے ہیں اور ہماری دعا ہے کہ رب کریم اس کاروانِ طریقت کے قائد کا سایہ رحمت مدتوں ہمارے لئے سکون قلب کا باعث بنائے رکھے۔ آمین

اس کے ساتھ ساتھ ہم ان تمام صاحبزادگان والا تبار کو سلام عقیدت پیش کرتے ہیں جو آج بھی اپنے اسلاف کی شمعِ روحانیت کو جلانے ہوئے ہیں۔ مضمون کی طوالت اجازت نہیں دیتی۔ ورنہ تمام صاحبزادگان کے حالات تفصیل سے لکھتا۔ تفصیل کیلئے کتاب درکار ہے۔ میں دعا گو ہوں کہ رب کریم مجھے آستانہ عالیہ ”میرا شریف“ کے روحانی اور فکری و نظری کارناموں کے حوالے سے سیر حاصل کتاب کی تصنیف کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

الہی تابود خورشید و ماہی
چراغ چشتیاں را روشنائی



رمز آموز معرفت

خواجہ محبوب احمد چشتی میروی رحمۃ اللہ علیہ

آستانہ عالیہ چشتیہ میرا شریف

اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے سلسلہ میں ان صوفیائے کرام اور اولیائے عظام کے کردار کو مؤرخ کبھی فراموش نہیں کر سکتا جو ہر دور میں شوکت ایمان کے چراغ روشن کرتے رہے۔ کفر و الحاد کی کتلی ہی آندھیاں چلتی رہیں لیکن ان چراغوں کی روشنی کبھی مدہم نہ ہونے پائی۔ علوم معرفت کے ان چراغوں کی روشنی کا سرچشمہ تعلیمات مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم کا آفتاب لازوال ہے۔ اس آفتاب نور کی صو پاشیوں کو دل میں سمو کر یہ خوش بخت فرزند ان اسلام جدھر بھی گئے زمانہ مسخر ہوتا چلا گیا۔ انہی سعید بخت صوفیائے عظام میں ایک ہستی ممتاز روحانی شخصیت حضرت خواجہ محبوب احمد کی ہے جو درگاہ عالیہ چشتیہ میرا شریف کے سجادہ نشین تھے اور ۶ جولائی ۲۰۰۳ء کو بے شمار عقیدت مندوں کو غمزدہ چھوڑ کر وصال فرما گئے۔ آپ کی روحانی تبت تاب اب بھی یہ اعلان کر رہی ہے کہ:

سہرگز نیرد آنکہ دلش زندہ شد بحق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام را

خواجہ محبوب احمد رحمۃ اللہ علیہ خانقاہ چشتیہ میرا شریف کے بانی قبلہ عالم خواجہ احمد میروی کی روحانی عظمت کے امین تھے۔ قبلہ عالم خواجہ احمد میروی رحمۃ اللہ علیہ خواجہ خواجگان شاہ سلیمان تونسوی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت تھے۔ شہباز ولایت شاہ سلیمان تونسوی رحمۃ اللہ علیہ کی ذات گرامی اس گھرانے کیلئے مدتوں پہلے سے مرغ فیوض تھی۔ کیونکہ آپ کے والد گرامی بھی شاہ سلیمان تونسوی سے بیعت تھے۔ جب احمد میروی حضرت قبلہ شاہ سلیمان تونسوی کی بارگاہ میں پہلی مرتبہ اپنے ماموں علی خاں کے ساتھ پہنچے تو شاہ سلیمان تونسوی جمال و جلال کا مظہر بنے تشریف فرما تھے۔ خواجہ احمد میروی کی نگاہ فرط عقیدت سے جھک گئی۔ اچانک خواجہ خواجگان حضرت تونسوی اٹھے اور دونوں ہاتھ ان کی طرف بڑھائے۔ یہ سرنہ اٹھائے تو لوگوں

نے متوجہ کیا کہ چشتیت کا آفتاب اپنی کرنیں لٹا رہا ہے۔ اے لڑکے آگے بڑھو چنانچہ یہ ہمت کر کے آگے بڑھے اور حضرت تونسوی کے ہاتھ پاؤں کو بوسہ دیا۔ اسی دوران میں ایک عقیدت مند خراسان سے حاضر ہوا اور چار سبب خراسانی پیش کئے۔

خواجہ تونسوی رحمۃ اللہ علیہ نے آدھا سبب خود کاٹ کر احمد میروی کو دیا اور باقی سببوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے حاضرین میں تقسیم کر دیئے۔ بس پھر کیا تھا حضرت احمد میروی کے دل کی کایا پلٹ گئی، گھر لوٹ آئے مگر محسوس ہوتا تھا کہ دل و دماغ شاہ سلیمان تونسوی رحمۃ اللہ علیہ کے قدموں میں نچھاور کر آئے ہیں۔ قرار ہی نہیں آتا تھا، تھوڑے ہی عرصہ بعد پھر تونسہ شریف جا پہنچے۔ شاہ تونسوی نے مسکرا کر فرمایا کہ ہم اسی شاہباز کے منتظر تھے اور پھر نظر کرم سے نواز کر بیعت سے سرفراز فرما دیا۔

خواجہ احمد میروی کے پیر بھائی شمس العارفین حضرت خواجہ شمس الدین سیالوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی تونسہ شریف میں ڈیرا جما رکھا تھا۔ ان پیر بھائیوں میں کیا کیا باتیں نہ ہوئی ہوں گی اور عشق و ارادت کے مرحلے کس طور دیوانہ وار طے نہ ہوتے ہوں گے۔ تذکار میں مرقوم ہے کہ ان دونوں محترم شخصیات میں بے پناہ محبت تھی اور خواجہ تونسوی بھی ان شاہبازوں کو خصوصی نگاہ کرم سے نوازا کرتے تھے۔

حضرت احمد میروی نے تونسہ شریف میں خواجہ عالم شاہ سلیمان تونسوی کے حلقہ ارادت میں ہی علم و حکمت اور سلوک و معرفت کے تمام مراحل طے کئے۔ آپ نے مختلف علماء سے علوم دین کی تحصیل کی۔ اپنے شیخ کامل سے اجازت لیتے اور نامور علمائے وقت کے سامنے زانوئے تلمذ طے کر کے علوم دینیہ کے انوار سے قلب و نظر روشن کرتے۔ حصول علم کے سلسلہ میں آپ کو دور دراز کے علاقوں کے سفر کرنے پڑے۔ مہینوں فائقے کاٹنے پڑنے کپڑوں کو پیوند لگاتے، جوتا خود گانٹھتے اور جونہی مہلت میسر آتی شاہ سلیمان تونسوی رحمۃ اللہ علیہ کی بارگاہ اقدس میں حاضر ہو جاتے۔

جب خواجہ احمد میروی رحمۃ اللہ علیہ بارگاہ تونسوی سے خرقہ خلافت سے نوازے گئے تو آپ کو دوسرے علاقوں میں جا کر رشد و ہدایت کا سلسلہ عام کرنے کا حکم عطا ہوا۔ آپ بارگاہ شاہ تونسوی سے کہیں دور جانا نہیں چاہتے تھے۔ حتیٰ کہ شاہ تونسوی رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کے بعد جنید وقت حضرت اللہ بخش تونسوی رحمۃ اللہ علیہ کا زمانہ آ پہنچا۔ انہوں نے حکماً چشتیت کے فیض کو آگے بڑھانے کا حکم دیا اور اس کے ساتھ ہی یہ دل نشین حکم بھی صادر فرمایا کہ میرے سامنے تونسہ شریف میں ہی بیعت کا آغاز کرو۔ بس پھر کیا تھا ایک زمانہ ان کے قدموں میں اُٹ پڑا۔ آپ بیعت کرتے تھے اور مریدوں کو حضرت قبلہ اللہ بخش تونسوی

کی بارگاہ اقدس میں پیش کر دیتے تھے۔

فیض چشتیت کو عام کرنے کیلئے مقام کے انتخاب کا مسئلہ درپیش ہوا تو آپ نے دور دراز کے ایک علاقہ کا انتخاب فرمایا جہاں چاروں طرف ریتیلی زمین تھی، ریت اور پتھر کے ٹیلے اور پہاڑ تھے، پانی کو سونے دور سے لانا پڑتا تھا، جنگل بیابان، ماحول سہا دینے والا تھا مگر خواجہ احمد میروی اپنے آقا و مولا صلی اللہ علیہ وسلم کے الطاف بے باباں کا تصور کر کے وہیں بیٹھ گئے۔ راتوں کو شیروں، درندوں اور حشرات الارض کا دور دورہ ہوتا مگر یہ مرد درویشی ایک کٹیا بنا کر اپنے ایک مرید کے ساتھ وہیں بیٹھ گیا۔ حوادث زمانہ نے راستہ روکا مگر آپ نے تبلیغ اسلام کا کام جاری رکھا۔ شاعر مشرق کے لفظوں میں:

ہوا تھی گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا تھا

وہ مردِ درویش جس کو بخشے تھے حق نے انداز خسروانہ

درندے اور حشرات الارض تو ایک طرف اس علاقہ میں دین اسلام سے بے بہرہ چوروں اور ڈاکوؤں نے اندھیر مگری مچا رکھی تھی، نہ کوئی راستہ نہ سڑک۔ آپ نے فیض عام کا سلسلہ جاری فرما دیا، مشکلات نے راستہ روکا مگر یہ دلی اللہ کمال استقامت سے دین اسلام پھیلاتا رہا۔ بالآخر ظلمت کدوں میں ہدایت کے چراغ روشن ہونے لگے۔ باطل کے ایوانوں میں نغمہ توحید گونجنے لگا۔ اس درویش خدا مست کی آواز دلوں میں گھر کرنے لگی۔ جو ایک مرتبہ آپ کی بارگاہ میں آیا، ہمیشہ ہمیشہ کیلئے آپ کا ہو گیا۔ غیر مسلم دامن اسلام میں پناہ ڈھونڈنے لگے اور اسلام کے راستے سے بھٹکے ہوئے صراطِ مستقیم پر گامزن ہونے لگے۔ وہاں دور دراز تک پانی کا کنواں نہیں تھا کیونکہ پانی کے حصول کیلئے عوام کی تمام کوششیں ناکام ہو چکی تھیں۔ آپ نے سو فٹ گہرا کنواں کھدوایا اور وہاں نوافل ادا کر کے اپنا لعاب دہن اس کنویں میں گرایا۔ وہیں سے پانی کا سرچشمہ پھوٹ نکلا۔ یہ سرچشمہ رشد و ہدایت تھا جس سے بھوکے پیاسے انسان سیراب ہونے لگے اور عظمت اسلام کے نم سے محروم بنجر و ویران دل بھی معرفت الہی سے سیراب ہونے لگے۔ بس پھر کیا تھا یہی جگہ جو اجاڑ اور ویران تھی اور جسے ”میرا“ کہتے تھے رحمت خداوندی کی مظہر بن گئی اور زمانہ ”میراث شریف“ کے نام سے پکارنے لگا۔ وہی ”میراث شریف“ آج ہر علاقے میں انوار معرفت کی سوغات تقسیم کر رہا ہے۔

تذکروں میں حضرت خواجہ احمد میروی رحمۃ اللہ علیہ سے کرامات کثیرہ مذکور ہیں۔ دراصل جب مرد مومن رضائے الہی سے ڈھل جاتا ہے رضائے مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم کے عملی تقاضوں کو شعار حیات بنا

لیتا ہے تو پھر اس کی تدبیر تقدیر الہی کا پرتو بن جاتی ہے۔ خواجہ احمد میروی ایسے ہی مقام پر فائز تھے۔ آپ کی سب سے بڑی کرامت یہ ہے کہ آپ نے ویرانے کو اپنا مسکن بنایا اور جب ایک طویل عرصہ تبلیغ اسلام میں صرف کر کے وصال فرمایا تو وہی ویرانہ گلشن معرفت میں تبدیل ہو چکا تھا۔ راہزن اور قزاق یاد الہی میں سر مست ہو چکے تھے اور چاروں طرف شوکت اسلام کا پرچم لہرا رہا تھا۔ خواجہ احمد میروی کا سال وصال ۱۳۳۰ھ ہے۔ آپ کی تاریخ وصال یوں ہے:

اندریں قحط الرجال این بود یک فرد الوجود

نقرا مصداق صادق شاکھاں را راہنما

۱۳

۳۰

حضرت خواجہ احمد میروی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے زندگی ہی میں اپنے حلقہ تربیت سے فیضیاب ہونے والے شاہباز خواجہ احمد خاں کو اپنا جانشین نامزد کر کے سلسلہ چشتیہ کے تمام امور کی نگرانی ان کے سپرد کر دی تھی۔ خواجہ احمد خاں نے اپنے فرائض اس حسن و خوبی سے انجام دیئے کہ ان کے دور میں یہ سلسلہ چاروں طرف پھیل گیا۔ آپ کے وصال کے بعد آپ کے بھتیجے حضرت خواجہ فقیر محمد عبد اللہ سجادہ نشین مقرر ہوئے۔ اسلاف کی روایات کے مطابق آپ کی دستار بندی بھی تونہ شریف کے مرکز روحانیت پر ہوئی۔ خواجہ فقیر محمد عبد اللہ نے خانقاہ عالیہ کی عمارات کو وسعت دی۔ حجرے سڑکیں اور مریدوں کیلئے قیام گاہوں کی تعمیر کا سلسلہ وسیع کیا۔ آپ کے وصال کے بعد آپ کے فرزند ان عظیم خواجہ منظور احمد، خواجہ محبوب احمد، خواجہ مقبول احمد، خواجہ ظفر احمد نے اس سلسلہ کے پیغام روحانیت کو آگے بڑھانے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ بالخصوص حضرت قبلہ خواجہ محبوب احمد رحمۃ اللہ علیہ کی تبلیغی مساعی لائق صد تحسین ہیں۔

خواجہ محبوب احمد ۱۹۲۰ء میں میرا شریف میں پیدا ہوئے اور اسی مرکز روحانیت سے علوم معرفت کی دولت سمیٹ کر زمانے بھر میں عام کرنے لگے۔ آپ کے جملہ اسلاف علوم دینیہ سے مکمل طور پر بہرہ ور ہوئے۔ اس لئے حضرت خواجہ فقیر محمد عبد اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے جملہ فرزند ان کی طرح آپ کی دینی تعلیم کا خصوصی اہتمام کیا۔ آپ کی طبیعت دنیاوی علائق سے دور تھی۔ خلوت نشین رہنا پسند کرتے تھے۔ سعید سختی کے آثار بچپن ہی سے آپ کے چہرے سے ہویدا تھے۔ چونکہ دربار عالیہ میرا شریف میں تدریس قرآن اور درس نظامی کا پورا پورا اہتمام تھا اس لئے آپ نے پہلے قرآن حکیم پڑھا ترجمہ و تفسیر کے بعد دارالعلوم چشتیہ سلیمانہ میرا شریف ہی میں علوم دینیہ کی تحصیل کی سعادت حاصل کی۔ بعد ازاں آپ چکوال اور راولپنڈی

کے دینی مدارس اور دنیاوی تعلیم کے اداروں میں بھی پڑھتے رہے جہاں سے آپ نے دینی اور دنیاوی علوم میں مہارت خاص حاصل کر لی۔ آپ شروع ہی سے تبلیغی ذہن رکھتے تھے اس لئے تحصیل علم کے بعد آپ نے سلسلہ عالیہ کے فروغ اور علوم روحانیہ کی ترویج کے ایمان آفریں دوروں کا آغاز کر دیا۔

حضرت قبلہ خواجہ محبوب احمد صحیح معنوں میں مبلغ اسلام تھے۔ آپ مہینوں تک دور دراز کے شہروں اور دیہات کی جانب محو سفر رہتے۔ سفر میں علمائے کرام اور نعت خواں بھی آپ کے ہمراہ ہوتے۔ آپ بالخصوص ان علاقوں میں پہنچتے جہاں آستانہ عالیہ میرا شریف سے روحانی نسبت رکھنے والے موجود ہوتے۔ آپ کی تشریف آوری سے سیرت مصطفیٰ کی محافل سج جاتیں۔ عظمت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے انوار بکھرنے لگتے، دلوں کو ایمان و یقین کی دولت عطا ہوتی، الحاد اور بے دینی کی ظلمات میں بھٹکنے والوں کو معرفت الہی کی روشنی عطا ہوتی اور خدا و رسول سے بے گانہ گمراہوں کو اسلام کی حقانیت اور عشق مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی سوغات عطا ہونے لگتی۔ یہ اجتماعات کیا تھے خوشنودی رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا بہانہ تھے جن کے طفیل وقت کے ظلمت کدوں میں خدائے کریم کے عرفان کے چراغ جگمگا اٹھتے۔

خواجہ محبوب احمد کی زندگی اپنے اجداد کی پاکیزہ سیرت کا نمونہ تھی۔ قیاضی قدرت نے حسین خدوخال عطا کئے تھے۔ سادہ لباس زیب تن کرتے، بزرگوں کی سنت کے مطابق سبز پٹکا گلے میں حائل ہوتا، سر پر سفید ٹوپی، کبھی عصر حاضر کے نمود و نمائش کے شوقین سجادہ نشینوں کی طرح پُر تکلف یا مرصع لباس زیب تن نہیں کیا۔ سفر میں ہوں یا حضر میں مصلیٰ ہمراہ ہوتا، نماز قضا نہ ہونے دیتے۔ حتیٰ الامکان کوشش کرتے کہ نماز باجماعت ادا کریں۔ عالم باعمل تھے، درویش بے ریا تھے، صاحب فکر و گداز تھے۔ ایک بہت بڑے روحانی خاندان کی نظریاتی سطوتوں کے امین تھے مگر لباس میں حد درجہ سادگی کو کبھی ترک نہ کیا۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ سادگی ہی ان کی دلاویز شخصیت کی پہچان بن گئی تھی۔

تکلف سے بری ہے حسن ذاتی

قبائے گل میں گل بوٹا کہاں ہے

کسی بھی روحانی شخصیت کی عظمت کا اندازہ اس امر سے ہوتا ہے کہ وہ اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر کس قدر عمل پیرا ہے۔ راقم تحریر جب بھی آستانہ عالیہ میرا شریف میں حاضر ہوا تو جس چیز نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ ہر جماعت میں تمام صاحبزادگان والا تیار کا پہلی صف میں بکیر اولیٰ سے پہلے موجود ہونا تھا۔ موسم سرما میں گرم پانی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ٹھنڈے پانی کے حوض سے کھرا توڑ کر وضو کیا

جانا اور نماز میں شرکت کی جاتی۔ یہاں بھی کسی قسم کی سجادگی کا احساس دیکھنے کو نہ ملا۔ بندہ و صاحب و محتاج وغنی کے ایک ہونے کا حسین تاثر ملا جس نے دل کی کیفیات کو زیر و زبر کر ڈالا۔

خانقاہ عالیہ میرا شریف پنڈی گھیب سے بیس میل جانب مغرب واقع ہے۔ ایک مدت پہلے اونٹوں پر یا پیدل سفر ہوتا تھا۔ اونٹوں کے قافلے قطار در قطار میرا شریف کی جانب رواں نظر آتے تو روحانی کہکشاں کے اترنے کا سماں نظر آنے لگتا۔ پیر پٹھان شاہ سلیمان تونسوی رحمۃ اللہ علیہ کے فیوض عام نے اس آستانہ کی صورت میں خواجہ محمد معین الدین چشتی اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کے انوار معرفت کو عام کرنے کیلئے اس سرزمین کے صحراؤں کو گلزار بے خزاں میں تبدیل کر دیا تھا۔ حضرت مخدومی قبلہ خواجہ محبوب احمد اسی گلزار بے خزاں کے گل سرسبد تھے جن سے مل کر اور جن سے باتیں کر کے روحانی لذت کی خوشبو کے دل و جان میں اتر جانے کا احساس ہونے لگتا تھا۔

موسم سرما ہو یا موسم گرما خواجہ محبوب احمد اپنے تبلیغی مشن کو کبھی فراموش نہ کرتے۔ حتیٰ کہ بیمار بھی ہو جاتے مگر سفر کو ملتوی نہ کرتے۔ عقیدت مند تبلیغی سفر کو ملتوی کرنے کا مشورہ دیتے تو فرماتے کہ ”کسی صورت نہ رکھو چلتے چلو میرے پیر بھائی انتظار کر رہے ہوں گے وہ کیا خیال کریں گے“۔ ایک مرتبہ شدید حادثہ میں ٹانگ ٹوٹ گئی چلنا مشکل تھا مگر اس عالم میں بھی آپ راقم کے گاؤں تشریف لے آئے اور شدید تکلیف اور علالت کے باوجود تبلیغی عمل میں ایک لحظہ کو بھی رکاوٹ پیدا نہ ہونے دی۔

خواجہ محبوب احمد راقم تحریر سے بے پناہ شفقت کریمانہ سے پیش آتے تھے۔ نعت خوانوں کے علاوہ ممتاز عالم دین حضرت مولانا غلام محمد ہمراہ ہوتے۔ میرے متعلق آپ ازراہ عنایت فرمایا کرتے کہ ہم آپ کے مضامین اور منظومات دربار عالیہ پر آنے والے رسائل و جرائد میں پڑھتے رہتے ہیں۔ ہم آپ کو حضور شاہ سلیمان تونسوی رحمۃ اللہ علیہ اور قبلہ عالم خواجہ احمد میروی کی عطائے خاص سمجھتے ہیں۔ یہ فقرات بلاشبہ میرے لئے حاصل حیات ہیں۔

جب خواجہ محبوب احمد مرض الموت میں مبتلا ہوئے تو اس وقت بھی آپ کا تبلیغی سفر جاری تھا۔ مختلف علاقوں سے ہوتے ہوئے اپنے متعلقین خاص کے ہمراہ لاہور پہنچے تو گھٹنے میں درد کا آغاز ہوا۔ آہستہ آہستہ یہی تکلیف بڑھتی گئی، حکیموں اور ڈاکٹروں کا علاج جاری رہا۔ ”ایوب میڈیکل سنٹر“ میں پندرہ دن داخل رہے پھر احسان میڈیکل سنٹر میں داخل ہوئے۔ رب کریم کی طرف سے بلاوا آچکا تھا۔ لہذا

ع..... مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

بالآخر خود ہی اصرار فرمایا کہ علاج وغیرہ ترک کر دو۔ ہمیں رب کریم کی طرف سے بلاوا آ چکا ہے۔ دربار شریف میں تشریف لا کر مکمل طور پر ذکر الہی میں مصروف ہو گئے۔ غذائینی بالکل بند کر دی مگر اس کے باوجود چہرہ انتہائی تروتازہ اور ہشاش بشاش نظر آتا تھا۔ خود ہی قبر کی تیاری کیلئے ہدایات دینے لگے اور وقفہ وقفہ سے قبر کے بارے میں سوال کرتے۔ چہرے سے کسی قسم کی گھبراہٹ یا پریشانی ہویدا نہیں تھی۔ یوں نظر آتا تھا جیسے محبت اپنے محبوب حقیقی سے ملاقات کیلئے بے قرار ہے۔ آخر وقت میں کچھ دیر کیلئے آنکھیں بند کیں۔ رشتہ داروں اور ارادتمندوں کا ہجوم ہو گیا تو آنکھیں کھولیں اور فقط اتنا فرمایا ”کل نفس ذائقۃ الموت“ آیات قرآنی، درود شریف اور کلمہ طیبہ کا ورد مسلسل جاری رکھا۔ بات چیت موقوف کر دی، سوال کرتے تو فقط یہی کہ وقت کیا ہے اور قبر کی تیاری کن مرحلوں میں ہے۔ ۶ جولائی کو ادھر فجر کی اذان گونجی اور ادھر آپ نے اپنی جان جان آفرین کے سپرد کر دی۔

آپ کے وصال پر ملال کی خبر آنا فانا چاروں طرف پھیل گئی۔ عشاق سرمست کا ٹھانٹھیں مارتا سمندر جمع ہو گیا۔ چونکہ اس آستانہ عالیہ کی رشتہ داریاں بڑے بڑے روحانی خانوادوں سے ہیں اس لئے بیشتر روحانی مراکز کے پیران عظام پہنچ گئے۔ جہاں تک نظر جاتی اہل شوق کا آنسوؤں اور رنج و الم میں ڈوبا ہوا جم غفیر دکھائی دیتا۔ اتنا بڑا تعزیتی ہجوم اور اتنی بڑی تعداد میں ارادت مندوں کا بہت بڑا مجمع کم ہی دیکھنے میں آیا ہے اور وہ بھی اتنے دور دراز علاقے میں۔ آپ کو غسل کے بعد جب کفن پہنایا گیا تو چہرہ ماہ تاباں کی صورت روشن تھا۔ آپ کی نماز جنازہ مکہ شریف کے سجادہ نشین پیر محمدی الدین صالح گل محمد نے پڑھائی۔ عصر کے وقت آپ کو قبر میں اتارا گیا تو عوام الناس کا سیل اشک بہہ نکلا۔ حق تو یہ ہے کہ مرد کامل کو زمانے سے اسی شان کے ساتھ جانا چاہئے کہ:

عرش پر دھوئیں مچیں وہ مومن و صالح ملا فرش سے ماتم اُنھیں وہ طیب و طاہر گیا
حق تعالیٰ رحمت خاص سے نوازے اس مرد مومن کو جس نے تمام زندگی عظمت اسلام کی بندر
کردی جو فنا فی الرسول (ﷺ) سے گزر کی فنا فی اللہ کی منزل پر فائز ہو چکا تھا۔ آج خواجہ محبوب احمد
ہمارے درمیان موجود نہیں مگر آپ کا روشن کردار ہمیں احيائے اسلام اور غلبہٴ دین مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم
کیلئے مسلسل آگے بڑھنے کا پیغام دے رہا ہے۔ آپ کی برگزیدہ شخصیت ہمیں اس احساس سے آشنا کرتی
محسوس ہوتی ہے۔

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک پرسوں تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

تحریک پاکستان اور مشائخ و علمائے کرام

جب بھی شرارِ باطل نے سر اٹھایا ہے تو انوارِ خداوندی کی لازوال چمک ہی اس کے طلسم کو پارا پارا کرنے کا باعث بنی ہے۔ خیر و شر کا تصادم تو ازل سے جاری ہے مگر فیصلہ کن معرکہ میں فتح کامل ہمیشہ ان مردانِ حق کا مقدر بنی ہے جنہوں نے حق و صداقت، فکر و عمل اور ایمان و ایقان کے چراغِ روشن کئے ہیں۔ برصغیرِ پاک و ہند کی تاریخ ان صوفیائے کرام، مشائخِ عظام اور علمائے حق کے کارناموں سے جگمگا رہی ہے جنہوں نے برصغیر میں تبلیغِ اسلام سے لے کر قیامِ پاکستان تک ہر میدان میں ایمانی استقامت اور روحانی و نظریاتی پامردی کا مظاہرہ کر کے عظمتِ اسلام اور دو قومی نظریہ کے پرچم کو افقِ تاق عرصہ حیات کی انتہائی بلندیوں پر لہرایا ہے۔ ان کے پیش نظر ہمیشہ یہ حقیقت رہی ہے کہ:

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی
تاج محل کی تعمیر کا تذکرہ کرتے ہوئے اگرچہ تاریخ فقط شاہجہان کا نام یاد رکھتی ہے مگر ہم ان معماروں کو فراموش نہیں کر سکتے جن کی شبانہ روز محنت، غیر معمولی لگن، پسینے میں خون جگر کی آمیزش اور جذباتی انہماک سے یہ شاہکار تعمیر کے آخری مراحل سے ہمکنار ہوا۔ اسی طرح تحریکِ پاکستان سے لے کر قیامِ پاکستان تک جہاں ہر گام پر حضرت علامہ اقبال اور قائدِ عظیم محمد علی جناح کی دور اندیشی اور ولولہ انگیز قیادت کا تذکرہ ملتا ہے وہاں ہم ان عظیم المرتبت مشائخ اور علمائے اہلسنت کے کارناموں سے صرف نظر نہیں کر سکتے جنہوں نے فرداً فرداً نہیں بلکہ من حیث الجماعت مکمل طور پر قائدِ عظیم اور مسلم لیگ کا ہر گام پر بھرپور ساتھ دیا۔ یہ داستانِ عزیمت ایک طویل دور پر پھیلی ہوئی ہے۔ ۱۹۸۸ء کی جنگِ آزادی کے حوالے سے دیکھیں تو حضرت مولانا فضل حق خیر آبادی، مولانا فضل الرحمن گنج مراد آبادی، مولانا کفایت علی کافی مراد آبادی، مولانا رحمت اللہ کیرانی، حاجی امداد اللہ مہاجر کی، مولانا احمد اللہ شاہ مداری، مفتی عنایت احمد کوروی، مولانا امام بخش صہبائی، مولانا رضی الدین بدایونی، مولانا تقی علی خان بریلوی، مولانا لیاقت علی الہ آبادی، مفتی صدر الدین آزرود، مولانا فیض احمد بدایونی سمیت کتنے ہی نام ہیں جو مطلعِ آزادی پر ستاروں کی صورت جگمگا کر تاریخِ اہلسنت کے

ہر باب کو زنگا بنا رہے ہیں۔ ۱۸۵ء کے فتویٰ جہاد کا سہرا مکمل طور پر مشائخ و علمائے اہلسنت کی جبین پر سجتا نظر آتا ہے۔ یہ وہ دور تھا جب انگریزوں کے کاسبہ لیس علماء خوشامدی، مصلحت اندیش اور ابن الوقت دانشور انگریزی اقتدار کی راہیں ہموار کرنے کیلئے فتوے جاری کر رہے تھے۔ علمائے اہلسنت کو پابند زنداں کر دیا گیا، انہیں باغی قرار دے کر گولی سے اڑا دیا گیا۔ کالے پانی کے جس دوام سے لے کر پھانسی کے تختے تک یہ اصحاب ایمان مسکراتے ہوئے پہنچے اور قربانیوں کے افق سے طلوع ہونے والے روشن مستقبل کے امانت داروں کو یہ باور کرا دیا کہ:

۔ جس دھج سے کوئی مقتل کو گیا وہ شان سلامت رہتی ہے

یہ جان تو آنی جانی ہے اس جان کی کوئی بات نہیں

انگریزی استبداد کے دور میں مسلک اہلسنت و جماعت سے تعلق رکھنے والا ہر شیخ طریقت عالم دین اور فقیہ اپنی تمام فقہی علمی اور روحانی توانائیاں تحریک پاکستان کی نذر کر رہا تھا۔ یہ کوئی وقتی مصلحت نہیں تھی بلکہ یہ تو برصغیر میں دو قومی نظریہ اسلام کے احیاء کا مرحلہ تھا۔ یہ وہی دو قومی نظریہ تھا جس کی اساس کلمہ طیبہ تھی اور جس کا وطنیت کے تصور، جغرافیائی لسانی اور رنگ و نسل سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اسی نظریہ کی بدولت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خون کے رشتہ داروں کو ٹھکرا کر روم کے صہیب، حبش کے بلال، فارس کے سلمان سمیت ہر اس مسلمان کو سینے سے لگایا تھا جس کی دھڑکنوں میں کلمہ طیبہ کی ایمان آفریں صدا گونج رہی تھی۔ اس دو قومی نظریہ اسلام کی بدولت دنیا بھر کے مسلمان افریقہ کے تپتے صحراؤں سے لے کر ایشیا کی پرسکون وادیوں تک ایک ہی قوم کی مرکزیت اور وحدت کا جزو لاینفک بن چکے تھے۔ برصغیر پاک و ہند میں اس دو قومی نظریہ کو نئی زندگی سیدنا مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ نے جلال الدین اکبر کے غیر اسلامی نظام کے خلاف اعلائے کلمہ حق بلند کر کے عطا کی۔ مختلف ادوار میں مختلف حق پرست علماء اور حق شعار مشائخ اپنے خون جگر سے نخل اسلام کو پہنچ کر دو قومی نظریہ کی بہار جاودانی کے سامان پیدا کرتے رہے۔ اسی نظریہ کی اساس پر حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے افغانستان کے حکمران احمد شاہ ابدالی سے اسلامیان ہند کو غلبہ ہند سے رہائی دلانے کی درخواست کی۔ غرضیکہ ہندوستان کی ایک مظلوم مسلمان خاتون کی آواز پر لبیک کہنے والے عرب سپہ سالار محمد بن قاسم سے لے کر تحریک آزادی پاکستان تک یہی دو قومی نظریہ عظمت اسلام کا ترجمان بن کر دلوں کو ولولہ شوق عطا کرتا دکھائی دے رہا ہے۔ اسلامیان برصغیر کیلئے سب سے کٹھن وقت وہ تھا جب انگریزوں کے غلبہ و اقتدار کے بعد بعض

مفتیان دین اور علماء نے ہندو کے سایہ عاطفت میں پناہ ڈھونڈنا شروع کر دی۔ ان علماء کی نگاہوں سے دو قومی نظریہ کے خدو خال اوجھل ہوئے تو جدوجہد آزادی کے نام پر انہوں نے ہندو سیاست کی بالاتری کو قبول کرتے ہوئے ہندو مسلم اتحاد کا نعرہ بلند کر کے اسلامی اقدار کے منافی قومیت کے آثار ہویدا کرنے شروع کر دیئے اور پھر چشم عالم نے وہ منظر بھی دیکھا کہ دہلی کی شاہی مسجد کے منبر پر متعصب ہندو سیاستدان گاندھی کو بٹھا کر اس کی قیادت کو سلام کیا گیا۔ ایسے عالم میں عشاق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے دل اس احساس کے ساتھ سلگ رہے تھے:

وائے ناکامی متاع کارواں جاتا رہا کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا
یہی ”احساس زیاں“ امام احمد رضا خاں فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی تحریروں اور تقریروں میں نعرہ مستانہ بن کر گونج اٹھا۔ آپ نے برصغیر کے فرزند ان توحید کو مخاطب کرتے ہوئے انہیں عظمت اسلاف کا احساس دلایا۔ اسلامی قومیت کی علمی و عملی تشریح کرتے ہوئے انہیں خواب غفلت سے جھنجھوڑتے ہوئے فرمایا کہ:

”انگریز تمہارا دشمن ہے تو ہندو کب سے تمہارا دوست بنا ہے۔ یہ ہندو مسلم مخلوط اجتماعات ہندوؤں کے تہواروں اور رسوم میں شرکت، ہندوؤں سے تعلق داری کس عقیدہ اسلام کی رو سے جائز ہے اور انگریز سے ترک موالات ضروری ہے تو ہندو سے بھی ترک موالات لازمی ہے۔ ہندو نہ تو مسلمان کا ساتھی بن سکتا ہے اور نہ ہی غمخوار۔“

اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اسلامیان ہند کے علیحدہ قومی تشخص پر زور دیتے ہوئے فرمایا:

”سودی کاروبار کو کسی صورت بھی جائز قرار نہ دیا جائے تاکہ ہندو ساہوکار غریب مسلمانوں کا خون چوسنے والی جو تک نہ بن سکے۔ مسلمان اپنا بینک قائم کریں تاکہ ان کا قومی تشخص بھی ابھرے اور وہ سرمایہ لگا کر اپنے غریب بھائیوں کے کام بھی آسکیں۔ مسلمان صرف مسلمان سے لین دین کرے تاکہ تجارت کے میدان میں وہ اپنا مقام پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی مالی قوت میں بھی استحکام پیدا کرے۔ ایسی تعلیم حاصل کرو جو انگریز اور ہندو کے فکری تغلب سے نجات دلا سکے۔ مذہب سے تعلق قائم ہو اور مستقبل کے عظیم مسلمان ابھر سکیں۔“

کیا یہ نکات دو قومی نظریہ کی فکری توضیح نہیں ہیں۔ اسی نظریہ کے لئے علمائے حقانی میں سے اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ نے سب سے زیادہ تحریری کام کیا ہے۔ انہوں نے اپنی فکر

رسا سے سمجھ لیا تھا کہ انگریز کدھر جا رہا ہے اور ہندو کیا چاہتا ہے۔ آپ کی علمی و فکری کاوشوں کو دیکھ کر علامہ اقبال جیسے مفکر نے بجا طور پر ارشاد فرمایا تھا کہ:

”ہندوستان کے دورِ آخر میں ان جیسا طباع اور ذہین فقیہ پیدا نہیں ہوا، وہ اپنے دور کے بوحفیہ ہیں۔“

فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی انگریز سے نفرت کا یہ عالم تھا کہ تمام عمر کسی انگریز کی عدالت میں حاضری نہیں دی۔ لفافے پر ڈاک ٹکٹ الٹا چسپاں کرتے کیونکہ اس پر شاہ انگلستان کی تصویر تھی۔ آپ نے صرف دو قومی نظریہ کی علمی تشریح و تعبیر پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ اپنا وسیع حلقہ عقیدت پیدا کیا جس سے تعلق رکھنے والے بیسیوں علماء و مشائخ نے تحریک پاکستان کے دوران میں حضرت قائد اعظم کی بھڑپور اعانت کی۔

اس دور میں جبکہ ہندو مسلم اتحاد کے داعی مسلم علماء اپنی تاویلات کے زور سے برصغیر میں بسنے والی تمام اقوام کو ملت واحدہ کا نام دے کر مسلم قومیت کے حقیقی تصور کو مسخ کر رہے تھے۔ علمائے حق اپنی پوری ایمانی قوت اور فکری و روحانی صلاحیت کو بروئے کار لاتے ہوئے ہندو نواز مسلم علماء کی اسلام دشمن کوششوں کو ناکام بنا رہے تھے۔ حضرت علامہ اقبال نے اسلامیوں کو ان کا فراموش کردہ سبق یاد دلاتے ہوئے کہا:

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر خاص ہے ترکیب میں قوم رسولِ ہاشمی
برصغیر میں علمائے حق کی نمائندہ مذہبی تنظیم ”آل انڈیا سنی کانفرنس“ کے نام سے مسلم قومیت کا
حقیقی تصور عوام کے سامنے پیش کرتے ہوئے پاکستان کی عظمت و اہمیت واضح کر رہی تھی۔ مسلمانان
ہند کی اس عظیم مذہبی تنظیم نے مختلف ادوار میں عظیم الشان کانفرنسوں کا انعقاد کر کے کاروانِ حریت کی
رفتار کو تیز سے تیز کر دیا۔ مراد آباد، اجیر، بدایوں اور پھر بنارس میں منعقد ہونے والی سنی کانفرنسوں کے
ذریعہ علماء و مشائخ کو تحریک پاکستان کے دوران میں پاکستان کے بنیادی محرکات کو عام کرنے اور
اسلامی قومیت کی حقیقی تصویر عوام کے سامنے پیش کرنے کا موقع ملا۔ ان سنی کانفرنسوں کو اعلیٰ مقاصد کی
ترویج کیلئے کارآمد بنانے کا سہرا اعلیٰ حضرت کے دستِ راست صدر الافاضل حضرت محمد نعیم الدین مراد
آبادی کے سر ہے جنہوں نے حضرت سید محمد محدث کچھوچھوی، حجتہ الاسلام حضرت حامد رضا خاں
بریلوی اور امیر ملت حضرت پیر سید جماعت علی شاہ محدث علی پوری جیسے مشائخ عظام کے تعاون سے دو
قومی نظریہ کی آبیاری کا فریضہ انجام دیا۔

آخری اور سب سے بڑی آل انڈیا سنی کانفرنس بنارس کے مقام پر قرارداد پاکستان (۱۹۴۰ء) کے ثمرات کو عام کرنے اور پاکستان کو اسلامیان ہندوستان کے دلوں کی مشترکہ آواز بنانے کیلئے منعقد ہوئی تھی۔

یہ کانفرنس ۲۷ تا ۳۰ اپریل ۱۹۴۶ء کو منعقد ہوئی، اس کے ناظم اعلیٰ صدر الافاضل حضرت مولانا سید محمد نعیم الدین مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ پورے برصغیر کے اصحاب علم و حکمت اس کانفرنس میں شرکت کیلئے امنڈ پڑے۔ کانفرنس میں پانچ صد مشائخ، سات ہزار علمائے کرام اور تین لاکھ کے قریب عوام نے شرکت کی۔ صدر الافاضل نے وزارتی مشن لارڈ کرپس وغیرہ کو بھی دعوت دی کہ وہ بطور گورنمنٹ کے نمائندہ وفد کے مسلمانان ہند کی شوکت اور ان کے سیاسی موقف کو پچشم خود دیکھ لیں۔ سواد اعظم کے اجتماعی موقف اور مسئلہ پاکستان کی حمایت میں اتنا عظیم الشان اجتماع اس دور میں ایک تاریخی مثال تھا۔ مشائخ اہلسنت کا شوقی عمل ملاحظہ ہو کہ پیرانہ سالی، ضعف اور نقاہت کے باوجود امیر ملت پیر سید جماعت علی شاہ محدث علی پوری رحمۃ اللہ علیہ نے کانفرنس میں کرسی صدارت کو زینت بخشی۔ اس آل انڈیا کانفرنس میں شریک ہونے والے کس کس شیخ طریقت اور صاحب کمال عالم کا تذکرہ کیا جائے۔ متذکرہ بالا شخصیات کے علاوہ چند اسمائے گرامی درج ذیل ہیں:

مجاہد اسلام پیر امین الحسنات مانگی شریف، حضرت پیر عبدالرحمن بھر چوٹھی شریف، مبلغ اسلام مولانا عبدالعلیم میرٹھی، شیخ الاسلام حضرت خواجہ محمد قمر الدین سیالوی، شیخ القرآن حضرت مولانا عبدالغفور ہزاروی، مفتی اعظم مولانا مصطفیٰ رضا خاں بریلوی، غزالی زماں مولانا سید احمد سعید کاظمی، صدر الشریعت مولانا امجد علی اعظمی، مولانا عبدالحماد بدایونی، حضرت سید دیوان آل رسول علی خاں اجمیر شریف، مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد، مولانا ابوالبرکات سید احمد، محدث اعظم مولانا سردار احمد، حضرت حاجی مصطفیٰ علی بخش۔

سواد اعظم کے سیاسی لائحہ عمل کی نمائندہ آل انڈیا سنی کانفرنس میں جس جماعتی موقف کا اعلان کیا گیا وہ یہ تھا:

”پاکستان ہماری زندگی ہے، اس کا حاصل کرنا ضروری ہے۔ اس سلسلہ میں (خدا نخواستہ) مسلم لیگ اگر مطالبہ پاکستان سے دستبردار ہو جائے تو آل انڈیا سنی کانفرنس اس مطالبہ سے دستبردار نہ ہوگی۔“

پاکستان کے متعلق جو قرارداد بالاتفاق منظور ہوئی وہ یہ تھی:

”آل انڈیا سنی کانفرنس کا یہ اجلاس مطالبہ پاکستان کی پر زور حمایت کرتا ہے اور اعلان کرتا ہے کہ علماء و مشائخ اہلسنت اسلامی حکومت کے قیام کی تحریک کو کامیاب بنانے کیلئے ہر امکانی قربانی کے واسطے تیار ہیں اور یہ اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ ایک ایسی حکومت قائم کریں جو قرآن کریم اور حدیث نبویہ کی روشنی میں فقہی اصول کے مطابق ہو“

اس کانفرنس کی قرارداد کی روشنی میں علمائے حقانیہ کا وہ کارواں جو پہلے ہی سے راست روی کا مظہر تھا اب اور زیادہ شدت خلوص کے ساتھ پاکستان کی منزل کے حصول کیلئے سرگرم کار ہو گیا۔ یہ علمائے حق ایک طرف تو انگریز اور ہندو کی سازشوں کے خلاف نبرد آزما تھے اور دوسری طرف انہیں کانگریس نواز علماء سے مقابلہ درپیش تھا، ان کانگریس نوازوں کا فکری ماحصل کچھ اس تلخ حقیقت کا آئینہ دار تھا:

کانگریسی مولوی کو کیا پوچھتے ہو کیا ہے گاندھی کی پالیسی کا عربی میں ترجمہ ہے علمائے حق میں سے حضرت امیر ملت محدث علی پوری کا کردار خاص اہمیت کا حامل ہے۔ آپ شیخ وقت محدث عصر اور نامور عالم دین تھے۔ آپ نے پاکستان کے موقف کو برصغیر پاک و ہند کے گوشے گوشے میں پہنچا دیا۔ علامہ اقبال اور حضرت قائد اعظم بھی آپ کی خدمات جلیلہ کے معترف تھے۔ آپ نے ۱۹۴۰ء میں قائد اعظم کے نام تہنیتی پیغام میں فرمایا:

”فقیر نو کروڑ جمیع اہل اسلام ہند کے ساتھ دل و جان سے آپ کے ساتھ ہے۔ آپ کی کامیابی پر مبارکباد دیتا ہے اور آپ کی ترقی مدارج کیلئے دعا گو ہے۔“

قائد اعظم سے ملاقات پر امیر ملت نے انہیں دو جھنڈے عطا فرمائے ایک جھنڈا سیاہ تھا جو کفر کا تھا اور دوسرا سبز جھنڈا مسلم لیگ کا تھا۔ آپ نے فرمایا کہ اگر سبز جھنڈے کو تھامے رکھیں گے تو کامیابی ہمیشہ آپ کے قدم چومتی رہے گی۔ امیر ملت نے تحریک پاکستان کو قوت عطا کرنے کیلئے مسلم لیگ کی دل کھول کر مالی امداد کی۔ آپ کی نوازشات کا اعتراف کرتے ہوئے قائد اعظم نے ایک بار لاہور کے جلسہ عام میں کہا تھا

”میرا ایمان ہے کہ پاکستان ضرور بنے گا کیونکہ امیر ملت مجھ سے فرما چکے ہیں کہ پاکستان ضرور بنے گا اور مجھے یقین واثق ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی زبان مبارک کو ضرور سچا کرے گا۔“

مشائخ کی فہرست میں ایک روشن نام حضرت خواجہ حسن نظامی سجادہ نشین درگاہ خواجہ نظام الدین اولیاء دہلی کا ہے جنہوں نے اپنے بے شمار مریدین کے ساتھ تحریک پاکستان میں پوری فکری و عملی دلچسپی

کا مظاہرہ کیا۔ آپ کا شہرہ آفاق ہفت روزہ ”منادی“ مسلم لیگی موقف کی تبلیغ کیلئے وقف تھا۔ آپ نے کل ہند بنیادوں پر چشتی برادری قائم کی۔ اس میں اپنے تمام عقیدت مندوں کے علاوہ اہم سیاسی شخصیات کو بھی شمولیت کی دعوت دی۔ شرط یہ تھی کہ اس برادری کا ہر فرد مسلم لیگ کی حمایت کرے۔ ابوالکلام آزاد نے ان کی دعوت پر لکھا کہ چشتی برادری کا رکن تو بن سکتا ہوں مگر مسلم لیگ کی حمایت نہیں کر سکتا۔ خواجہ حسن نظامی نے ہی (۱۹۳۷ء) پہلی بار قائد اعظم کے نام خط میں انہیں ایک مسلم نیوز ایجنسی کے قیام پر آمادہ کرتے ہوئے ایک انگریزی روزنامہ کے اجراء کی ترغیب دی تا کہ مسلم لیگ مخالف پروپیگنڈا کا موثر جواب دیا جاسکے۔ آپ نے ہی قائد اعظم کو اردو میں دستخط کرنے کی مشق کروائی۔ تقسیم برصغیر کے بعد آپ کو بھارتی حکومت نے پاکستان نوازی کے الزام میں گرفتار کر لیا۔ کچھ عرصہ کی نظر بندی کے بعد رہا کر دیئے گئے۔ ۱۹۵۶ء میں دہلی وفات پائی جب تک زندہ رہے پاکستان کیلئے دعا گورہے۔“

حضرت سید محمد محدث کچھوچھوی بیک وقت عالم فاضل، ادیب خطیب صوفی شاعر پیر طریقت اور محدث تھے۔ عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم آپ کے رگ و پے میں سمایا ہوا تھا۔ دیگر مشائخ کے ساتھ آپ نے تحریک پاکستان میں قائدانہ حیثیت سے کام کیا۔ بنارس اور اجمیر کی آل انڈیا سنی کانفرنسوں میں آپ کے خطبات تحریک پاکستان کی حمایت کا منہ بولتا ثبوت تھے۔ اجمیر کانفرنس کے خطبہ صدارت کے دوران میں آپ نے کہا ”پاکستان کا نام بار بار لینا جس قدر ناپاکوں کی چڑ ہے اسی قدر پاکوں کا وظیفہ ہے اور اپنا وظیفہ کون سوتے جاگتے اٹھتے بیٹھنے کھاتے پینے ادا نہیں کرتا۔ حقیقت میں پاکستان کا رستیاں است۔ آپ کے یہ الفاظ اس قدر عام ہوئے کہ پوری ملت اسلامیہ کے لائحہ عمل کی صورت اختیار کر گئے۔ مولانا شاہ عبدالعلیم میرٹھی حضرت فاضل بریلوی کے شاگرد رشید اور خلیفہ خاص تھے۔ آپ متعدد زبانوں کے ماہر نامور مبلغ اسلام اور تحریک پاکستان کے بے لوث مجاہد تھے۔ آپ نے اپنے ہم مسلک دوسرے علماء کی طرح تحریک آزادی کا پورا پورا ساتھ دیا۔ بیرون ملک مصر، فلسطین، شام، لبنان، اردن اور عراق کا دورہ کیا اور وہاں کے سیاستدانوں اور دانشوروں کو تحریک آزادی ہند کے تقاضوں سے آگاہ کیا۔ آپ نے پوری دنیا کے تبلیغی دورے کئے۔ پاکستان بننے کے بعد حضرت قائد اعظم نے انہیں اسلامی ممالک میں پاکستان کا نمائندہ بنا کر بھیجا۔

پنجاب میں آستانہ عالیہ سیال شریف کے سجادہ نشین شیخ الاسلام حضرت خواجہ محمد قمر الدین سیالوی رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے خانوادہ روحانیت سے وابستہ مشائخ چشت نے تحریک پاکستان کیلئے

اپنی تمام قوتیں وقف کر دیں۔ شیخ الاسلام سیالوی نے برطانوی استبدادیت کو لٹکارا اور اپنی قائدانہ جدوجہد کی بدولت صفحہ تاریخ پر لازوال داستان رقم کر دی۔ اس جدوجہد میں حضرت پیر غلام محی الدین گواڑہ شریف، حضرت پیر محمد فضل شاہ، امیر حزب اللہ جلال پور شریف، حضرت پیر محمد شاہ بھیرہ شریف، امیر جند اللہ، حضرت خواجہ غلام سدید الدین تونسوی خاص طور سے آپ کے شریک کار تھے۔ پنجاب کے بزرگان دین ہی میں سے شیخ القرآن مولانا عبدالغفور ہزاروی ۱۹۳۶ء میں مسلم لیگ سے وابستہ ہوئے اور پھر قیام پاکستان تک اس کی معاونت فرماتے رہے۔ آپ نے تمام تحریکات آزادی میں حصہ لیا۔ جیلیں کاٹیں مگر پائے استقلال نہ ڈگمایا، جب ۱۹۴۰ء میں اقبال پارک لاہور میں قرارداد پاکستان منظور ہوئی تو آپ مولانا عبدالحامد بدایونی کے ساتھ اہلسنت کی نمائندگی کرتے ہوئے اگلی صف میں تشریف فرما تھے۔ آپ کے ساتھی مولانا عبدالحامد بدایونی نے جو کہ برصغیر کے نامور عالم دین اور تحریک پاکستان کے صف اول کے زاہنما تھے اس تاریخ ساز اجتماع عام میں پُر جوش تقریر فرما کر نہ صرف اس قرارداد کی تائید کی بلکہ سواد اعظم کے فکری و عملی جذبات کی ترجمانی کا حق بھی ادا کر دیا۔

برصغیر پاک و ہند کے پیران عظام میں سے پیر سید امین الحسنات مانگی شریف اپنے غیر معمولی حلقہ اثر کی بناء پر ممتاز حیثیت کے حامل تھے۔ آپ نے صوبہ سرحد میں کانگریس اور سرخ پوشوں کا زور توڑنے کیلئے طوفانی دورے کئے اور بالآخر ان کے طلسم کو پارا پارا کر کے رکھ دیا۔ اسی طرح پیر عبدالرحیم بھر چوٹھی شریف اور آپ کے والد گرامی پیر عبدالرحمن کی گراں قدر خدمات بھی اظہر من الشمس ہیں۔ ان حضرات نے عملی طور پر قائد اعظم کا ساتھ دیا۔ انہوں نے ایک جماعت احياء الاسلام کی بنیاد رکھی اور پھر مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ کراچی میں قائد اعظم کی موجودگی میں مع پانچ ممبران اسمبلی کے جو احياء الاسلام کے ٹکٹ پر منتخب ہوئے تھے اس جماعت کو مسلم لیگ میں ضم کر دیا۔

ان کے علاوہ مفتی سید غلام محین الدین نعیمی، سید مغفور القادری، پیر غلام مجدد سرہندی، مولانا عارف اللہ قادری میرٹھی کی خدمات کا اعتراف کئے بغیر تاریخ پاکستان پر قلم اٹھانے کا حق ادا نہیں کیا جاسکتا۔ حضرت مولانا سید ابوالحسنات احمد قادری اور مفتی اعظم مولانا ابوالبرکات سید احمد قادری جو کہ حضرت مولانا سید دیدار علی شاہ محدث الوری کے فرزند ان دلہند تھے۔ تحریک پاکستان کا افتخار اور اعزاز تھے۔ یہ محترم شخصیات جو کہ علم و فکر کا محور اور قیادت و سیادت کی خوبیوں سے بہرہ ور تھیں، ہمیشہ دو قومی نظریہ کی تبلیغ و تعمیر اور قیام پاکستان کے فکری محرکات کو عام کرنے کیلئے مصروف عمل رہیں۔ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ دو قومی نظریہ کی پاسداری کا حق جس طریق سے مشائخ

و علمائے حق نے انجام دیا۔ تاریخ برصغیر میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ ان کے دلوں میں عشق رسالت مآب رحمۃ اللہ علیہ کی شمع روشن تھی اور منزل مقصود عظمت اسلام تھی۔ وہ انگریز ہندو سمیت تمام غیر اسلامی قوتوں کے خلاف جہاد اپنا فرض اولین خیال کرتے تھے۔ اس کماری سے خیبر تک شمع مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ کروڑوں پروانے متحد ہو کر تحریک پاکستان کی مخالف قوتوں کے خلاف صف آراء ہو گئے۔ مشائخ اپنے حجروں سے اور علمائے کرام اپنے فکری خلوت کدوں سے باہر نکل کر رسم شبیری کی ادائیگی کے مظہر بن کر اس شان سے پاکستان کے نظریاتی تشخص کی محافظت کا حق ادا کرنے لگے کہ پاکستان تصورات کے دھندلکوں سے نکل کر حقائق کی کرنیں لٹانے لگا۔ یہ انہی مشائخ و علمائے حق کی بخشی ہوئی قوت تھی کہ قائد اعظم رحمۃ اللہ علیہ برصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کے سب سے بڑے مسلمہ راہنما کے طور پر یہ باطل شکن اعلان کرنے کے قابل ہو گئے کہ:

”مسٹر گاندھی ونہرو اور ان کے ہم نوا یہ کہہ رہے ہیں کہ برصغیر میں صرف دو طاقتیں بستی ہیں انگریز اور ہندو۔ وہ تاریخ کی زبان سے سن لیں اور پہچان لیں کہ اس ملک میں ایک تیسری طاقت بھی بستی ہے اور وہ ہے مسلمان۔“

جس طرح رات کے سناٹوں میں سفر کرنے والے قافلے کے مسافر صرف ایک چاند کی روشنی کا تذکرہ کرتے ہوئے لاتعداد ستاروں کی ضیا باریاں فراموش کر دیتے ہیں اور جس طرح تاج محل کی تعمیر کو فقط شاہجہان کا شہکار قرار دینے والے ان بے شمار مزدوروں اور معماروں کو بھول جاتے ہیں جن کی ہڈیوں اور خون نے اس عمارت کیلئے اینٹوں اور گارے کا کام دیا تھا۔ اسی طرح ہمارے نام نہاد مورخین پاکستان کے وجود کو دو تین قائدین کا کارنامہ قرار دے کر ان محسنین کو فراموش کر دیتے ہیں جنہوں نے اپنی فکری و روحانی اور عملی جدوجہد کی بدولت حضرت قائد اعظم محمد علی جناح کو یہ قوت عطا کی کہ وہ انگریز ہندو اور کانگریس نواز علماء کی مشترکہ طاقت کے سامنے خود کو ناقابل تسخیر قائد اسلامیان ہند کی حیثیت سے پیش کر کے ان کے سحر باطل کا خاتمہ کر سکیں۔ آج ضرورت ہے کہ تحریک پاکستان کے مختلف ادوار کو قلم بند کرتے ہوئے ان مشائخ و علمائے حق کی خدمات کو فراموش نہ کیا جائے جنہوں نے ہر وقت امت اسلامیہ کی ناخدائی کرتے ہوئے اپنے عظیم اسلاف کی داستانِ جرأت و عزیمت کی یاد تازہ کر دی اور مسلم قومیت کے محل ایمان کو اپنے خون و جگر سے سینچتے ہوئے اسے بہار جاودانی کا مظہر بنا دیا۔ زندہ قومیں اپنے محسنوں کو فراموش نہیں کیا کرتیں۔ ان مشائخ و علمائے حق کی بے مثال جدوجہد آزادی کا اعتراف ہماری زندگی کا ثبوت بھی ہے اور ہماری پائیدگی کی ضامن بھی۔

ماخذ و مراجع

- ۱۔ خطبات آل انڈیا سنی کانفرنس: محمد جلال الدین قادری
- ۲۔ اکابر تحریک پاکستان: محمد صادق قصوری
- ۳۔ تعارف علمائے اہلسنت: محمد صدیق ہزاروی
- ۴۔ تحریک و تاریخ پاکستان: پروفیسر شیخ محمد رفیق
- ۵۔ اسلام اور قائد اعظم: محمد حنیف شاہد
- ۶۔ تاریخ نظریہ پاکستان: پیام شاہ جہان پٹوری
- ۷۔ تحریک پاکستان اور نیشنلسٹ علماء: چوہدری حبیب احمد
- ۸۔ تذکرہ اکابر اہلسنت: مولانا عبدالحلیم شرف قادری
- ۹۔ شاہراہ پاکستان: چوہدری خلیق الزماں
- ۱۰۔ قائد اعظم کے ۷۲ سال: خواجہ رضی حیدر
- ۱۱۔ سات ستارے: محمد حسین بدر
- ۱۲۔ تاریخ پاکستان سے تحریک پاکستان تک: پروفیسر محمد اکرم رضا
- ۱۳۔ سیرت امیر ملت: پروفیسر محمد طاہر فاروقی
- ۱۴۔ تحریک پاکستان اور علمائے دیوبند: محمد فاروق القادری
- ۱۵۔ فاضل بریلوی اور ترک موالات: پروفیسر مسعود احمد
- ۱۶۔ مشاہیر جنگ آزادی: مفتی انتظام اللہ شہانی
- ۱۷۔ حیات صدر الافاضل: مولانا غلام معین الدین نعیمی
- ۱۸۔ الخطبات الاشرافیہ: سید محمد محدث کچھوچھوی
- ۱۹۔ آزادی ہند: رئیس احمد جعفری
- ۲۰۔ آئی وٹنیس آف ہسٹری (انگریزی): مختار مسعود
- ۲۱۔ اسلام ان انڈیا پاکستان (سب کنسٹیٹینٹ) (انگریزی) میاں عبدالرشید



حضرت علامہ امجد علی اعظمی رحمۃ اللہ علیہ

جہاں ان پہ نازاں تو نازاں ہے حکمت
ہیں امجد علی اعظمی جان حکمت
”بہار شریعت“ کا تحفہ دیا ہے
بڑی شان والے ہیں صدر شریعت
نبی کی غلامی کو اعزاز سمجھا
یہی ان کی سب سے بڑی ہے سعادت
مفسر، محدث، مصنف تھے امجد
خدا کی ہے ان پر ہر اک آن رحمت
ہیں شاگرد ان کے ستاروں کی صورت
جو روشن ہوئے صورت شمع فطرت
قلم سے کبھی اپنا رشتہ نہ توڑا
دلوں پہ ہے نقش ان کی شان عزیمت
رضا ان کی توصیف کیا کر سکے گا
سمجھتے تھے قدر ان کی خود اعلیٰ حضرت

(محمد اکرم رضا)

صدر الشریعت

حضرت علامہ محمد امجد علی اعظمی رحمۃ اللہ علیہ

یہ کائنات اس حقیقت کی شاہد ہے کہ شہرت کی دیوی کسی پر بلاوجہ راتوں رات مہربان نہیں ہوتی۔ عزت، شہرت اور ناموری حاصل کرنے کیلئے جگر کو خون کرنا پڑتا ہے، برسوں تک نیند حرام کرنا پڑتی ہے، غیر معمولی مطالعہ اور فکری عمل جاری رکھنا پڑتا ہے۔ قرآن و حدیث سے جواہر ہائے صد زنگ چننا پڑتے ہیں۔ اسلامی فقہ اور دینی مسائل کی انتہاؤں کو چھونا پڑتا ہے، پھر کہیں وہ وقت آتا ہے کہ علم و ادب کا شیدائی عزت و وقار کی دنیا میں مہر منور کی صورت چمکنے لگتا ہے کیونکہ:

نامی کوئی بغیر مشقت نہیں ہوا
سوار جب عقیق کٹا تب نگلیں ہوا

صدر شریعت اور اسلامی فقہ کے انتہائی مقتدر عالم ہیں۔ حضرت علامہ مولانا امجد علی اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کا شمار بھی ایسے ہی عظیم لوگوں میں ہوتا ہے جو اپنی غیر معمولی علمی فضیلت اور دینی ریاضت اور تدریسی مہارت کی بدولت آفتاب جہاں تاب بن کر چمکے اور اس شان سے چمکے کہ ایک زمانہ گزر جانے کے باوجود ان کی شان اور عزت و توقیر میں کمی نہیں آئی بلکہ اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ یوں تو آپ نے متعدد فقہی تصانیف پیش کیں۔ ایک بہت بڑا کارنامہ حضرت امام احمد رضا خاں سے قرآن مجید کا تاریخی مقام رکھنے والا ترجمہ لکھوانا ہے اور دوسرا کارنامہ ”بہار شریعت“ کے نام سے متعدد حصوں پر مشتمل فقہ اسلامی کی ایسی تاریخ دستاویز پیش کرنا ہے جس کی نہ پہلے مثال موجود تھی اور نہ اب تک نظر آتی ہے۔ ”بہار شریعت“ کا مقام اس قدر سر بلند ہے کہ اس کا نام لیتے ہی مصنف اور کتاب دونوں دلوں کے ایوانوں میں جگمگانے لگتے ہیں۔

”بہار شریعت“ کا سبب تالیف حضرت مولانا امجد علی اعظمی کی اپنی تحریر سے ملاحظہ کیجئے:

”فقیر بارگاہ قادری ابوالعلا امجد علی اعظمی رضوی رحمۃ اللہ علیہ عرض کرتا ہے کہ زمانہ کی

حالت نے اس طرف متوجہ کیا کہ عوام بھائیوں کیلئے صحیح مسائل کا ایک سلسلہ عام فہم زبان میں لکھا

جائے جس میں ضروری روزمرہ کے مسائل ہوں، باوجود بے فرصتی اور بے مائیگی کے ”توکل علی اللہ“ اس کام کو شروع کیا۔ ایک حصہ لکھنے پایا تھا کہ یہ خیال ہوا کہ اعمال کی درستی عقائد کی صحت پر متفرع ہے اور بہترے (بہت سے) مسلمان ایسے ہیں کہ اصول مذہب سے آگاہ نہیں۔ ایسوں کیلئے سچے عقائد ضروری کے سرمایہ کی بہت شدید حاجت ہے۔ خصوصاً اس پُر آشوب زمانہ میں کہ گندم نما جو فروش بکثرت ہیں کہ اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں بلکہ عالم کہلاتے ہیں اور حقیقتاً اسلام سے ان کو کچھ علاقہ نہیں۔ عام ناواقف مسلمان ان کے دام تزویر میں آکر مذہب اور دین سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ لہذا اس حصہ یعنی کتاب الطہارۃ کو اس سلسلہ کا حصہ دوم کیا اور ان بھائیوں کیلئے اس پہلے حصہ میں اسلامی سچے عقائد بیان کئے۔ امید کہ برادران اسلام اس کتاب کے مطالعہ سے ایمان تازہ کریں اور اس فقیر کیلئے عفو و عافیت دارین پر خاتمہ کی دعا فرمائیں۔

حضرت علامہ کا اسم گرامی محمد امجد علی اعظمی تھا۔ والد محترم کا نام حکیم جمال الدین بن مولانا خدا بخش تھا۔ آپ بمقام گھوسی پیدا ہوئے۔ آپ کا سال ولادت ۱۲۹۶ھ بمطابق ۱۸۷۶ء ہے جبکہ ۲ ذی قعد ۱۳۶۷ھ بمطابق ۶ ستمبر ۱۹۴۸ء کو ہوئے۔ آپ بلاشبہ حجۃ العصر تھے۔ شریعت سرور کو نین صلی اللہ علیہ وسلم کے عصر حاضر میں موثر ترین ترجمان تھے۔ آپ علمی لحاظ سے ایسے بلند قامت تھے کہ آپ پر صرف آپ کے ماں باپ یا شہر اور علاقہ کو ہی فخر نہیں ہوتا بلکہ آپ جیسی شخصیت ہر خطہ اور ہر ملک کا اعزاز بن جاتی ہے۔

چودھویں صدی ہجری کا دامن ان کی علمی و دینی خدمات سے لبریز ہے۔ انہوں نے اپنی مساعی جلیلہ سے ایک عہد کو روشن کیا ہے اور خدمات جلیلہ کے لافانی نقوش سے دامن گیتی کو مالا مال فرمایا ہے۔ ان کا عہد آفریں کارنامہ علوم اسلامیہ کے انحطاطی دور میں صاحبان کمال پیدا کرنا ہے جو مستقبل کے ہندو پاک میں اسلام و سنیت کے معمار ثابت ہوئے اور جن کے دم سے مذہب حقہ کا مہر قائم رہا۔

صدر الشریعہ کے آباؤ اجداد علوم و فنون اسلامیہ کے ولدادہ تھے۔ والد ماجد اور جد امجد کو علم طب میں بھی مہارت حاصل تھی۔ آپ کی ابتدائی تعلیم گھر ہی پر ہوئی اس کے بعد اپنے چچا زاد بھائی حضرت مولانا صدیق علیہ الرحمۃ سے عربی فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں اور پھر استاذ الاساتذہ حضرت مولانا ہدایت اللہ خان رامپوری متوفی ۱۳۲۶ھ / ۱۹۰۸ء کی درسگاہ میں حاضر ہوئے۔ ان دنوں مدرسہ حنفیہ جونپور سے حضرت استاذ الاساتذہ کے فیضان علمی کا باڑا بٹ رہا تھا اور علوم شرقیہ

کے متلاشی دور دراز سے شیراز ہند کا رخ کر رہے تھے۔ استاذ الاساتذہ کی فیض رساں درسگاہ سے اس دور کے ماہرین علوم برآمد ہوئے۔ ایک سے ایک یکتائے روزگار نے استفادہ کیا۔ حصول علم کی راہ میں تلمیذ کی سعادت مندی بڑی اہم چیز ہوتی ہے جو مشفق اساتذہ کو بخوشی اپنے سینے کے علمی جواہر تلمیذ کے دامن میں انڈیلنے پر آمادہ کر دیتی ہے۔

صلاحیت فکر ذہن رسا، محنت شاقہ اور لگن کے ساتھ ساتھ جن طلبا کو اساتذہ کی بارگاہ میں سعادت مند باادب اور خدمت گذاری کی توفیق مل گئی وہ اپنے زمانے میں آفتاب بن کر چمکتے ہیں۔ صدر الشریعہ کو حضرت استاذ الاساتذہ اور اپنے تمام مرہبوں سے ایسی ہی نسبت تھی۔ استاذ الاساتذہ کا صدر الشریعہ کے بارے میں یہ فرمان نہایت اہم ہے:

”شاگرد ایک ہی ملاؤ وہ بھی بڑھاپے میں“

صدر الشریعہ نے استاذ الاساتذہ سے تمام علوم و فنون کی تکمیل کی۔ مدرسہ حنفیہ امام بخش جو پور میں آپ ۲ شوال ۱۳۱۲ھ کو داخل ہوئے تھے۔ اپنے وطن گھوسی سے اعظم گڑھ تک پیدل چل کر اور وہاں سے اوٹ گاڑی کے ذریعہ جو پور تک کا سفر ہوا کرتا تھا۔

صدر الشریعہ نے جس چشمہ علم و آگہی سے سیرابی حاصل کی۔ علامہ سلیمان اشرف سابق صدر شعبہ دینیات علی گڑھ (متوفی ۱۳۵۸ھ) اس بارے میں اس طرح فرمایا کرتے:

”استاذ گرامی حضرت علامہ ہدایت اللہ خاں صاحب قدس سرہ یوں تو تمام طلبہ پر عنایت فرمایا کرتے تھے لیکن تین اشخاص مولانا صدیق (برادر بزرگ صدر الشریعہ) مولانا محمد علی اور سلیمان اشرف پر حضرت کی خاص الخاص نظر کرم تھی چاہتے تھے کہ جو کچھ میرے سینے میں ہے نکال کر ان سب کو بخش دوں۔“

جو پور سے فارغ ہونے کے بعد آپ کو علم حدیث وغیرہ کی تکمیل کا اشتیاق ہوا اور پہلی بھیت کے محدث وقت کی طرف رغبت پیدا ہوئی۔ اس سفر کیلئے استاذ الاساتذہ نے حافظ الحدیث حضرت علامہ وصی احمد محدث سورتی (متوفی ۱۳۳۳ھ/۱۹۱۶ء) کے نام تعارفی خط تحریر فرمایا جس کا مفہوم یہ تھا:

”میں اپنا ایک مخصوص عزیز طالب علم آپ کے پاس بھیجتا ہوں اس کی تعلیم پر توجہ فرمائیں“

حضرت محدث سورتی قدس سرہ ہم نے بھی اس کو ہر شب تاب کو قدر کی نگاہ سے دیکھا اور علوم نبویہ کے نختانہ سے خوب خوب سیراب فرمایا اور اپنے اس تلمیذ کے کمال حصول کی داد خود محدث سورتی نے ان الفاظ میں دی ہے:

”مجھ سے اگر کسی نے پڑھا تو امجد علی“

”صدر الشریعہ“ نامی کتابچہ مطبوعہ دائرہ المعارف الامجدیہ گھوسی مطبوعہ ۱۹۷۶ء میں ہے کہ:
”حجۃ العصر شیخ الحدیث مولانا شاہ وحی احمد محدث سورتی کی خدمت میں مدرسۃ الحدیث
(پہلی بھت) میں حاضر ہو کر درس حدیث لیا اور سند فراغت حاصل کی۔ زمانہ طالب علمی میں آپ کی
علمی صلاحیت و حسن لیاقت کا اندازہ ذیل کی تحریر ہو سکتا ہے جو مہتمم مدرسۃ الحدیث پہلی بھت نے
تحفہ حنفیہ پٹنہ میں شائع کی تھی۔ ۶ ذی الحجہ کو بجمہ تعالیٰ طلبہ کا امتحان حضرت مولانا مولوی شاہ محمد
سلامت اللہ صاحب رامپوری دام فیضہ نے لیا۔ مولوی امجد علی صاحب نے بعد فراغ کتب درسیہ
کے نہایت جانفشانی و کمال مستعدی سے سال بھر میں صحاح ستہ، مسند شریف، کتاب الآثار شریف،
موطا شریف، طحاوی شریف کا قرآن و سماعتہ درس حاصل کر کے اعلیٰ درجہ کا امتحان دیا۔ جس کے باعث
امتحان صاحب و حاضرین نہایت شاداں اور ان کی حسن لیاقت و فہم و ذکاوت سے بہت فرحاں ہوئے
اور دستار فضیلت زیب سر کی گئی۔ (ضیاء الدین مہتمم مدرسہ)

محدث سورتی کی درسگاہ سے فراغت کے بعد لکھنؤ محلہ جھوائی ٹولہ کے حکیم عبدالولی صاحب
سے علم طب کا درس لیا۔ کم و بیش تین سال تک حضرت محدث سورتی کے مدرسہ میں خدمت درس پر
مور رہے۔ ایک سال پٹنہ میں رہ کر مطب کیا، مگر قدرت کو ان سے معالج امراض جسمانی کا نہیں
بلکہ امراض روحانی و قلبی کے علاج اور ملت بیمار کی مسیحتی کا کام لینا مقصود تھا۔ امام احمد رضا فاضل
بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے دارالعلوم منظر اسلام کیلئے قابل مدرس کی ضرورت تھی۔

حضرت محدث سورتی نے ان کا نام پیش کر دیا اور انہیں پٹنہ سے بریلی شریف جانے کا حکم
دیا۔ علم اپنے اندر جو حرارت رکھتا ہے، صدر الشریعہ کی ذات پر اس کے اثرات ظاہر تھے، صدر الشریعہ
نے طب کا علم حاصل کر کے پٹنہ میں مطب اس ارادہ سے کھولا تھا کہ وہ علم کو کسب معاش کا ذریعہ
نہیں بنانا چاہتے تھے۔ یہ ان کے گونا گوں صفات اور علمی حمیت کا اثر تھا۔ بریلی پہنچ کر علم سے تپیدہ
مہینہ کو عرفان و احسان کا سایہ کرم مل گیا اور صدر الشریعہ نے اعلیٰ حضرت کا دست مبارک تھام کر اپنا
مقصود حیات پالیا۔ علم و فضل کے پیکر پر معرفت و حقیقت کا رنگ چڑھنے لگا اور صدر الشریعہ کی
شخصیت دو آئینہ بن گئی۔ بریلی شریف میں صدر الشریعہ منظر اسلام کے معلم و مدرس کی حیثیت سے
آئے تھے مگر اس دور کی شہرہ آفاق درسگاہوں سے باعزاز فراغت کے باوجود صدر الشریعہ نے اعلیٰ
حضرت کے حضور روحانی و قلبی علوم کے حصول کے واسطے طفل مکتب کی حیثیت اپنائی۔ ادب شناس

آسودہ علم امجد علی کو امام اہلسنت کی صحبت نے گوہر شب تاب بنا کر عشق و آداب رسول کا معلم بنا دیا اور ”صدر الشریعہ“ کا لقب مرحمت فرمایا۔ شیخ کامل نے فیوض و برکات کی داد و دہش سے فقیہ عصر کے منصب پر لا کھڑا کیا۔ فخر سے خود فرمایا:

میرا امجد امجد کا پکا

اس سے بہت کجیاتے یہ ہیں

علامہ بدر القادری لکھتے ہیں:

اسلام و سنت کی انتھک خدمت اور بارگاہ شیخ کامل کے فرائض کی ادائیگی میں صدر الشریعہ کے غایت انہماک نے انہیں کام کی مشین بنا دیا تھا۔ منظر اسلام میں خدمت تدریس، مطب اہلسنت کا انتظام، جماعت رضائے مصطفیٰ کے فرائض مفوضہ کی ادائیگی، فتویٰ نویسی، رسائل و کتب کی پروف ریڈنگ اور خدمت مرشد میں حاضری صدر الشریعہ کی ذمہ داریاں تھیں۔

صدر الشریعہ کو امام احمد رضا فاضل بریلوی قدس سرہ کی بارگاہ میں تقرب خاص کا مقام حاصل تھا۔ وہ امام وقت کے عرفان کی دولت سے مالا مال تھے۔ امام احمد رضا کے پیکر میں پوشیدہ عبقری شخصیت کو انہوں نے پہچان لیا تھا، اس لئے خلوت و جلوت میں حاضری اور اکتساب فیوض میں پیش پیش رہتے، اسی لحاظ سے آپ پر اعلیٰ حضرت کی چشم التفات بھی تھی۔

فاضل بریلوی کا فقید المثال ترجمہ قرآن ”کنز الایمان فی ترجمہ القرآن“ ۱۳۳۰ھ/۱۹۱۱ء صدر الشریعہ کی سعی بلیغ کا نتیجہ ہے۔ آپ نے اس ترجمہ کی تحریک کی اور بات یہ طے ہوئی کہ روزانہ وقت فرصت صدر الشریعہ حاضر ہوتے۔ آیات قرآنیہ کی تلاوت ہوتی اور فاضل بریلوی برجستہ ترجمہ ارشاد فرماتے جاتے اور یہ لکھتے جاتے:

اعلیٰ حضرت کے اخیر ایام تک حضرت صدر الشریعہ لیہائے امام سے جھڑنے والے درو موئی کو سمیٹتے رہے۔

مولانا حسنین رضا خاں مرتب وصایا لکھتے ہیں:

”مولانا امجد علی صاحب نے چھ وصایا شریف قلمبند کئے تھے جو حضور اقدس نے القا فرمائے تھے“

صدر الشریعہ نے اعلیٰ حضرت کی خدمت میں اٹھارہ سال کا زمانہ گزارا اور تفقہ فی الدین میں کمال حاصل کیا۔ بہار شریعت حصہ سوم پر اپنے قابل فخر خلیفہ کے بارے میں امام احمد رضا

فرمان ہے:

”امجد علی کو درس نظامی کے تمام فنون میں کافی دسترس حاصل ہے اور فقہ میں تو ان کا پایہ بہت بلند ہے“

امام احمد رضا قدس سرہ نے حالات اور ضرورت دینی کے پیش نظر بریلی شریف میں پورے ملک ہندوستان کیلئے (جس میں موجودہ پاکستان و بنگلہ دیش بھی شامل تھا) شرعی دارالقضاء قائم فرمایا تھا اور اس کیلئے تمام مشاہیر علماء ہندو مفتیان عصر میں سے صدر الشریعہ علیہ الرحمۃ کو احکام شرعی کے نفاذ اور مقدمات کے فیصلہ کے واسطے قاضی شرع مقرر فرمایا تھا۔ اس اہم کام کے سلسلہ میں اعلیٰ حضرت نے کتنا اہتمام فرمایا۔ حضرت برہان الملت (علیہ الرحمۃ) کی زبانی ملاحظہ کیجئے:

”ایک دن صبح قریب نو بجے اعلیٰ حضرت مکان سے باہر تشریف لائے۔ تخت پر ایک قالین بچھانے کا حکم فرمایا، ہم سب حیرت زدہ تھے کہ حضور یہ اہتمام کس لئے فرما رہے ہیں پھر حضور امام اہلسنت ایک کرسی پر تشریف فرما ہوئے اور حضرت صدر الشریعہ مولانا امجد علی صاحب علیہ الرحمۃ کو مخاطب کر کے فرمایا:

”میں آج بریلی میں دارالقضاء شرعی کے قیام کی بنیاد رکھتا ہوں۔“

اور انہیں اپنی طرف بلا کر ان کا داہنا ہاتھ اپنے دست مبارک میں لے کر قالین پر انہیں بٹھا کر فرمایا ”میں آپ کو ہندوستان کیلئے قاضی شرع مقرر کرتا ہوں۔“

مسلمانوں کے درمیان اگر ایسے کوئی مسائل پیدا ہوں جن کا شرعی فیصلہ قاضی شرع ہی کر سکتا ہے وہ قاضی شرع کا اختیار آپ کے ذمہ ہے۔ پھر دعا پڑھ کر کچھ کلمات فرمائے جن کا اقرار حضرت صدر الشریعہ نے کیا۔ اس کے بعد حضور نے اس خادم برہان کو بلایا اور اپنے دست مبارک میں میرا داہنا ہاتھ لے کر اس مسند پر حضرت صدر الشریعہ کے متصل بٹھا کر مجھ سے فرمایا میں نے تمہارے فتوے دیکھے افتاء کیلئے تمہارے دماغ کو بہت مستعد پایا ہے میں تمہیں مسند افتاء پر بٹھا کر دارالقضاء شرعی کیلئے مفتی مقرر کرتا ہوں اس کے بعد حضرت مفتی اعظم ہند علیہ الرحمۃ کے ہاتھ کو اپنے دست مبارک میں لے کر میرے پہلو میں بٹھایا اور یہی کلمات جو مجھ سے فرمائے تھے ان سے فرما کر پھر ہم دونوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ:

”دارالقضاء شرعی کیلئے قاضی شرع مولانا امجد علی اعظمی کو اور آپ دونوں کو ان کی اعانت اور فتویٰ دینے کی اجازت دیتا ہوں۔ آج سے تم دونوں ہندوستان کے دارالقضاء شرعی مرکز بریلی میں“

مفتی شرع کی حیثیت سے مقرر کئے جاتے ہو ہم دونوں سے کچھ کلمات فرمائے اور ہم دونوں نے اس سعادت عظیم پر سر نیا زخم کیا اور اٹھ کر ہم نے اعلیٰ حضرت کی قدم بوسی کی۔ اعلیٰ حضرت نے دست مبارک اٹھا کر بہت دیر تک دعا فرمائی۔ حضرت امجد علی اعظمی نے دوسرے روز ہی کام شروع کر دیا۔ حضرت صدر الشریعہ علیہ الرحمۃ نے عنوان شباب ہی سے تدریسی خدمات شروع کی تھیں اور آخری دور تک کرتے رہے۔ بریلی شریف منظر اسلام کے زمانے میں دارالعلوم معینیہ عثمانیہ اجمیر شریف کی ضرورت نے پکارا۔ آپ مرشد کا آستانہ چھوڑ کر کہیں اور نہیں جانا چاہتے تھے مگر ضرورت دینی سے جانا پڑا۔ ۱۳۲۳ھ / ۱۹۲۲ء میں اجمیر شریف گئے اور ۱۳۵۱ھ / ۱۹۳۳ء میں بریلی شریف آ گئے۔ تین سال بعد دارالعلوم حافظیہ سعیدیہ ریاست دادوں علی گڑھ کی دعوت پر تشریف لے گئے اور وہاں سات سال تک علم و فن کے موتی لٹاتے رہے۔

نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن شیروانی، جو نہایت تبحر علمی شخصیت کے مالک تھے اور ایک دور میں حیدرآباد دکن میں وزیر برائے مذہبی امور کے درجہ پر فائز تھے اور درس و تدریس کی اعلیٰ قدروں سے آگاہ تھے۔ صدر الشریعہ کے تلامذہ نے ۱۳۵۶ھ / ۱۹۳۷ء میں جب امتحانات میں اپنی صلاحیتوں اور قابلیتوں کا ثبوت دیا تو نواب صدر یار جنگ نے مدرسہ کے سالانہ جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے صدر الشریعہ کے تدریسی ملکہ کا اعتراف کیا۔

تقریر کی ابتداء اس طرح کی کہ خطبہ کے بعد سب سے پہلے حضرت صدر الشریعہ کو مخاطب کیا۔ پھر حاضرین علماء و طلبہ و دیگر حضرات کی جانب متوجہ ہوئے۔ بانی مدرسہ اور منظمہ کے بارے میں چند جملے کہنے کے بعد آپ نے اس زمانے کے فارغین و مدرسین میں استعداد کی قلت اور سطحیت کو شکوہ کیا۔ پھر ملک کے عربی مدارس اور ان کے سرکاری بورڈ کے ذریعہ ہونے والے امتحانوں پر سخت تنقید کی اور اس کے خلاف صحیح رُخ پر اسلامی علوم کا احیاء کرنے والی چند شخصیتوں میں حضرت صدر الشریعہ کے وقار علمی کا زبردست خطبہ پڑھا، فرمایا

”مدارس عربیہ میں یہ جو امتحانات، مولوی، مولوی فاضل، منشی، منشی فاضل، یونیورسٹیوں کے دلائے جاتے ہیں آپ یقین کیجئے کہ وہ ایک بلاء ہے اور طاعون کی طرح ایک وبائے عظیم ہے۔ یہ چیز علوم دینیہ کی بربادی کا سبب ہے، جس سے گریز اشد ضروری ہے۔ یہاں سے جو چند طلبہ کی دستار بندی کی گئی اور اسناد عطا کی گئیں وہ قابل شکر ہے۔ حضرات! آج کل مدارس بہت ہیں، مدرس بہت طلبہ بہت ہیں، ہندوستان کے مختلف مدارس میں پھرا اور دیکھا مگر واقعہ یہ ہے کہ ملک کے ایک گوشہ

سے دوسرے گوشے تک پھر جائیے اور مدرس تلاش کیجئے۔ صحیح معنوں میں مدرس نہیں ملیں گے۔ میرا جو ذاتی تجربہ ہے وہ یہ کہ جس کو مدارس کہتے ہیں وہ ہندوستان میں چار پانچ سے زائد نہیں۔ ان چار پانچ میں سے ایک مولوی امجد علی صاحب ہیں ان کے ہاتھ سے طلبہ کا فاضل ہونا اور اسناد پانا صاف بتلا رہا ہے کہ ان میں ضرور استعداد ہے نام کے مولوی نہیں ہیں

(روداد مدرسہ حافظیہ سعیدیہ دادوں ضلع علی گڑھ ۱۳۵۷ھ/۱۳۵۸ھ)

دادوں کے اسی مدرسہ میں مولانا عبدالشاہد خان شیروانی نائب مدرس تھے انہوں نے صدر

الشریہ کے بارے میں اظہار خیال کیا:

”مولانا محمد امجد علی اعظمی سات سال سے صدر مدرس تھے بریلی اجمیر اور دوسرے مدرسوں کے صدر مدرس رہ چکے تھے۔ کہنہ مشقی کی بنیاد پر درسیات پر پوری مہارت رکھتے تھے۔“

۱۳۲۷ھ/۱۹۴۳ء میں دادوں سے اپنے وطن کے قریب بنارس کچی باغ کے مدرسہ مظہر العلوم میں ایک سال قیام کیا مگر شیخ کی ڈیوٹی چھوڑ کر کہیں قرار نہ ملا۔ بالآخر ۱۳۳۶ھ/۱۹۴۵ء میں پھر بریلی شریف لوٹ آئے اور درس و تدریس، تصنیف و تالیف میں مصروف ہوئے۔

مہارت تدریس

حضرت صدر الشریہ صرف ایک کامل مدرس ہی نہیں بلکہ تدریسی و دینی اخلاص مندی کا عظیم مرقع تھے۔ اپنے طلبہ کو علم و آگہی کے ساتھ ساتھ خلوص و للہیت کے سانچے میں ڈھال دیتے تھے۔ علم کے ساتھ ساتھ عمل بھی پڑھاتے اور سکھاتے تھے۔ ذہن و دماغ کو علم کی روشنی تو دیتے ہی تھے اخلاق و کردار کو قرآن و سنت کا پیکر محسوس بنانا بھی جانتے تھے۔ ان کی درسگاہ کے باوقار فضلاء اس بات کی منہ بولتی تصویر ہوتے تھے اور ان روشن میناروں کو ہندو پاک کے لاکھوں کروڑوں بسنے والوں نے چشم خود دیکھا ہے۔ صدر الشریہ کے نام اور تلامذہ جن کے دیکھنے سے نگاہیں روشن اور دل دولت ضمانت پاتے ہیں۔ آپ کے شاگردوں میں ایسے ایسے نامور علمائے دین اور فقہاء سامنے آتے جنہوں نے دنیائے علم و عمل کو مالا مال کر دیا۔ ان میں سے ہر فرد ایک لائبریری اور دبستان حکمت کی حیثیت رکھتا تھا۔ اظہار تبرک کیلئے فقط چند کے نام تحریر ہیں:

محدث اعظم پاکستان حضرت مولانا سردار احمد لاکل پور حضرت علامہ غلام جیلانی گھوسی براؤن شریف، حضرت مولانا حبیب الرحمن اڑیسوی، حضرت علامہ مولانا حشمت علی پبلی بھیت، شیخ الحدیث مولانا عبدالمصطفیٰ گھوسی، حضرت علامہ مولانا عبدالمصطفیٰ ازہری، حضرت مولانا شمس الدین جونپوری

حضرت مولانا اعجاز ولی کراچی، مولانا تقدس علی خاں سندھ، حضرت مولانا سید آل مصطفیٰ اور وی۔ ایک طویل فہرست تھی جس میں ہم چند اسمائے گرامی پراکتفا کر رہے ہیں

صدر الشریعہ علیہ الرحمۃ نے پہلا حج قیام بریلی کے دوران ۱۳۳۷ھ / ۱۹۲۲ء میں کیا اور وہاں سے فارغ ہو کر زیارت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سرفراز ہوئے۔ اسی سفر حرمین کے دوران آپ کی ملاقات حضرت علامہ الشیخ سلیمان جزولی علیہ الرحمہ سے ہوئی۔ علامہ جزولی عظیم ترین فاضل اور صاحب نسبت بزرگ تھے انہوں نے صدر الشریعہ کو دلائل الخیرات کی اجازت دی اور اجازت نامہ میں انہیں عالم و فاضل تحریر فرمایا۔

جب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا قیام ہوا اور اس کو مسلمانوں کے لئے ایک تدریسی و تہذیبی ادارہ کی حیثیت دی جانے لگی تو ضروری تھا کہ علوم اسلامیہ کیلئے بھی اس میں باقاعدہ انتظامات ہوتے۔ یہ تو نہ ہو سکا البتہ شعبہ دینیات کے نام سے ایک شعبہ کی منظوری عمل میں آئی اور اس کے نصاب تعلیم کے بارے میں فروری ۱۹۲۶ء میں ملک بھر کی علوم آگاہ شخصیتوں کا ایک اجتماع ہوا۔ اس سلسلہ میں حضرت صدر الشریعہ کو بھی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ارباب حل و عقد کی جانب سے دعوت ملی اور آپ بھی نصاب تعلیم مرتب کرنے والے اس اجتماع میں تشریف لے گئے۔

اس شعبہ کے ارکان ذیل حضرات تھے ”نواب صدر یار جنگ، مولانا حبیب الرحمن خاں شیروانی، مولانا سلیمان اشرف صاحب صدر علوم مشرقیہ مسلم یونیورسٹی، مولانا مناظر احسن صاحب استاذ دینیات جامعہ عثمانیہ حیدرآباد و مولانا امجد علی صدر مدرس مدرسہ معینیہ عثمانیہ اجمیر اور خاکسار اور مولانا عبدالعزیز صاحب میمن راجکوٹی استاذ ادبیات عربی مسلم یونیورسٹی نے بھی خاص خاص موقعوں پر شرکت کی۔“

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے صدر علوم مشرقیہ علامہ محمد سلیمان اشرف صاحب علیہ الرحمۃ صدر الشریعہ کے تبحر علمی کے دل سے معترف تھے صدر الشریعہ کے نام اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں ”میرے علم میں مولانا محدث سورتی رحمۃ اللہ علیہ اور استاذ علیہ الرحمۃ

(علامہ ہدایت اللہ رامپوری) کی صرف آپ ہی یادگار ہیں“

بہار شریعت

صدر الشریعہ کو رب تعالیٰ نے تصنیف کی اعلیٰ صلاحیتوں سے بھی نوازا تھا۔ قیام بریلی کے زمانے سے کثرت مشاغل سے کچھ وقت نکال کر ۱۹۱۵ء سے ۱۹۲۳ء تک کے زمانے میں آپ نے شریعت کے مسائل مفتی بہ اور جزئیات پر محتوی ۶۷۷ صفحات پر مشتمل عظیم فقہی انسائیکلو پیڈیا ”بہار

شریعت“ تیار فرمادیا جس کے چھ حصوں کو امام احمد رضا فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ نے حرف حرف سنا تھا اور بعض پر تقریظ لکھی تھی۔

فتاویٰ امجدیہ

متوسط سائز کے سترہ سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں ۱۳۴۰ سے شوال ۱۳۶۷ھ تک کے اہم فتاویٰ درج ہیں۔ دو جلدیں طبع ہو کر منظر عام پر آ چکی ہیں۔ بحمد اللہ اب چاروں جلدوں میں شائع ہو چکی ہیں۔

حاشیہ شرح معانی الآثار

امام ابو جعفر طحاوی (متوفی ۳۲۱ھ) کی عظیم تصنیف جامع حدیث وفقہ مقبول ترین کتاب کا حاشیہ ہے۔ علامہ طحاوی کی اس کتاب کی عظمت کا اعتراف ان کے ہم عصر اور بعد کے علماء نے جی بھر کر کیا ہے۔

صدر الشریعہ نے ۱۳۶۲ھ/۱۹۴۳ء میں اس کے تحشیہ کا کام (بزبان عربی) شروع کیا اور سات ماہ کے قلیل عرصہ میں نصف اول پر حاشیہ لکھ ڈالا جو باریک قلم سے ۲۵۰ صفحات پر مشتمل ہے اور ہر صفحہ ۵۳-۳۶ سطریں لئے ہوئے ہے۔

جامع الواہیات فی جامع الجزئیات

صدر شریعت نے یہ رسالہ عربی زبان میں تحریر کیا ہے جو ان کی علمی عظمت کا زندہ ثبوت ہے۔ غرض صدر الشریعت حضرت علامہ محمد امجد علی اعظمی کی شخصیت ایک بحر العلوم کی سی تھی۔ وہ بحر العلوم کہ جب کناروں سے اچھلتا ہے تو بنجر زمینوں کو سیراب کر کے وہاں گل و لالہ کا اہتمام کر دیتا ہے۔ اس بحر العلوم نے دینی علوم کے فیوض سے محروم دلوں کو اسلامی علوم اور تعلیمات ایمانی و قرآنی سے جگمگا دیا۔ آپ کی کس کس حیثیت اور ادا کا ذکر کیا جائے۔ آپ شیخ طریقت تھے یگانہ روزگار عالم دین اور محدث و مفسر تھے شاگردوں کو اوج ثریا سے زیادہ بلند پر پہنچا دینے والے استاد محترم تھے رہبر راہ عمل تھے مرکز طالبان شوق، ایک فرد واحد کی حیثیت سے زمانے کو اتنا کچھ دے گئے کہ بڑی بڑی جامعات بھی نہیں دے سکتیں۔

وقار علم میرکارواں صدر الشریعت
فروغ علم کی روح رواں صدر الشریعت تھے

دلوں کو عظمتوں کے رازداں صدر الشریعت تھے
دلوں کو زندگی بخشی جہاں کو نور حق بخشا

محدث اعظم پاکستان

حضرت مولانا سردار احمد قادری رحمۃ اللہ علیہ

ایک یاد..... ایک ایمان افروز خطاب

محدث اعظم پاکستان، دانائے راز حضرت مولانا محمد سردار احمد فیصل آبادی رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر کیا چھڑا، قرطاس و قلم خوشبو سے مہکنے لگے، جذبات کو عنبر بیز ہونے کا احساس ہوا تو احساسات اس رجل رشید کے ذکر جاں نواز سے مشکبو ہو گئے۔ میں نے حضور محدث اعظم کی دو مرتبہ زیارت کی اور یہ شرف زیارت میری زندگی کی عظیم ترین سعادت میں ڈھل چکا ہے۔ محدث اعظم پاکستان کا ذکر میرے لبوں سے ادا ہونے سے پہلے ہی میرے صفحہ دل پر ان کی علمی و فقہی لحاظ سے ہمالہ صفت شخصیت کے حسین و جاذب نظر خدو خال اُجاگر کرنے لگتا ہے۔ آج کی اس تحریر میں ایک دلاویز یاد کی چند جھلکیاں قارئین کی نذر کر رہا ہوں۔

یہ غالباً اپریل ۱۹۶۱ء کی بات ہے۔ میں نویں جماعت کا طالب علم تھا، اچانک گھر میں ذکر چھڑا کہ محدث اعظم مدرسہ حنفیہ رضویہ سراج العلوم سے فارغ التحصیل ہونے والے حفاظ اور علماء کی دستار بندی کیلئے مرکزی جامع مسجد زینت المساجد گوجرانوالہ میں تشریف لا رہے ہیں۔ دل زیارت کیلئے چل اٹھا، حضرت محدث اعظم کو دیکھا نہیں تھا مگر مجدد دین و ملت مولانا احمد رضا خاں فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ سے غیر معمولی عقیدت و ارادت کے سبب آپ کے دبستان علم و حکمت سے فیضیاب ہونے والا ہر شاہباز علم و حکمت میرے لئے لائق صد تعظیم تھا۔ اعلیٰ حضرت سے محبت مجھے ورثہ میں عطا ہوئی تھی۔ ہمارا گاؤں شہر سے سولہ میل دور تھا۔ راستے میں میلوں تک سیلاب کے پانی کی حکمرانی، ذرائع سفر نہ ہونے کے برابر مگر محدث اعظم کی محبت نے کسی مشکل کا احساس نہ ہونے دیا اور مجھ سا طالب علم سر شام ہی زینت المساجد پہنچ گیا۔

اس دوروز سالانہ جلسہ تقسیم اسناد کے بہت سے مقررین تھے۔ مناظر اہلسنت مولانا عنایت

اللہ مرحوم حضرت قبلہ مفتی اعجاز ولی مرحوم سلطان الواعظین مولانا محمد بشیر کوٹلی لوہاراں سرمایہ سنیت مولانا محمد عمر اچھروی مرحوم سمیت بہت سی شخصیات اس تقریب کی زینت تھیں مگر نگاہیں ان بزرگوں کے حضور ارمغان عقیدت پیش کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے محبوب و مطلوب محدث اعظم علیہ الرحمۃ کو ڈھونڈ رہی تھیں کہ:

ع..... عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں

رات دس بجے کے قریب حضور محدث اعظم زینت المساجد پہنچے تو چاروں طرف عقیدت و احترام کی کہکشاں بکھرنے لگی۔ ہر سوانسوں کا ہوم اُٹھا ہوا تھا۔ یہ عشاق کی بارات تھی۔ اس وسیع و عریض مسجد کا اندرونی حصہ برآمدے صحن چھت اور گلیاں حضرت محدث اعظم کے عقیدت مندوں سے اٹی ہوئی تھیں۔ ہر شخص بے چین و مضطرب تھا کہ اس بطل جلیل کی ایک جھلک دیکھ لے جس نے ایک قلیل مدت میں خطہ پنجاب کو عشق مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے عملی تقاضوں سے بہرہ ور کر دیا تھا۔ محدث اعظم تشریف لاتے ہی سٹیج پر جلوہ افروز ہو گئے۔ سٹیج پر علماء کا ہجوم تھا، محدث اعظم کرسی پر تشریف فرماتے۔ چہرے پر نور ایمان رقصاں تھا، سفید لباس زیب تن تھا، سر پر نسواری رنگ کی کلاہ تھی اور اسی رنگ کا ایک کپڑا گلے میں جمائل تھا۔ حسین و جمیل چہرہ جس میں پنجاب کی قدرتی ملاحت بھی شامل تھی، ریش مبارک چہرے کے حسن کو دو چند کرتی ہوئی، آنکھیں اسرارِ فطرت کی گہرائیوں میں جھانکتی ہوئیں۔ علمائے کرام باری باری اپنے خیالات کا اظہار فرماتے رہے مگر سامعین کی بے قراری حضور محدث اعظم کے اعجاز نطق کی منتظر تھی۔ نظامت و نقابت کے فرائض میزبان محفل امیر جماعت رضائے مصطفیٰ حضرت مولانا ابو داؤد محمد صادق اپنے مخصوص انداز میں انجام دے رہے تھے۔

بالآخر وہ ساعت سعید آ پہنچی جس کیلئے سب ہمہ تن گوش تھے۔ ساڑھے گیارہ بجے شب قبلہ محدث اعظم کا خطاب شروع ہوا تو سامعین نے سانسیں روک لیں۔ احترام آمیز سکوت چھا گیا، ایک بے کراں خاموشی جس میں فقط محدث اعظم پاکستان کی آواز گونج رہی تھی۔ آپ نے خطبہ مسنونہ کے بعد یہ آیت قرآنی تلاوت کی:

محمد رسول اللہ والذین معہ اشداء علی الکفار رحماء بینہم۔

(پارہ ۲۶، سورہ الفتح، آیت ۲۹)

اس کے بعد آپ نے آیت کریمہ کی تشریح فرمائی اور پھر فرمایا کہ ”میرا موضوع ”حیات مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء“ ہے اور میں اس آیت مقدسہ کی روشنی میں یہ ثابت کروں گا کہ میرے حضور

پُر نور صلی اللہ علیہ وسلم زندہ ہیں۔ آپ کی تقریر کا انداز منفرد تھا، جوشِ خطابت میں دونوں ہاتھوں کو اوپر اٹھاتے اور پھر نیچے لے آتے۔ آپ کا خطاب کیا تھا، اسرار و معانی کا گلدستہ تھا۔ فکر و عظمت کا گنجینہ اور انوارِ مصطفوی کا خزینہ تھا، الطافِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی بادِ بہاری تھی، مسیحِ مقفی اور مرصع الفاظ کی عملداری تھی، ہر فقرہ عظمت حضور کا آئینہ دار اور ہر لفظ کانِ لطافت کا درِ تابدار تھا۔ عوام الناس تقریر بھی سن رہے تھے اور آپ کے رُبخِ انور پر نظریں بھی گاڑے ہوئے تھے۔ میری اپنی بھی یہی کیفیت تھی۔ میں آپ کے چہرے کے پس منظر میں حضورِ اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کے خدو خال تلاش کر رہا تھا۔ آپ کے خطاب میں لفظی شعریت بھی تھی اور بلا کی روانی بھی، دلوں کو گداز بخشنے والی تاثیر بھی تھی اور عقیدت و ارادت کی کہانی بھی، ہر آن یہ احساس ہو رہا تھا کہ:

ع..... بلبل چمک رہا ہے ریاضِ رسول میں

آپ نے فرمایا ”پھول کو دیکھنا ہو تو اس کی پنکھڑیوں کی لطافت کو دیکھو، سمندر کو دیکھنا ہو تو اس کی لہروں کی شدت کو دیکھو، چاند کو دیکھنا ہو تو اس کی کرنوں کو دیکھو، سورج کو دیکھنا ہو تو اس کی شعاعوں کا نور ملاحظہ کرو۔ اسی طرح دو عالم کے تاجدار کی مدنی افتخار، سید البرازِ رحمت کردگار حضور محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھنا ہو تو آپ کے عشاق اور جانثاروں کو دیکھو۔ یہ جانثار اس ماہِ رسالت کی کرنیں ہیں اگر کرنیں موجود ہوں تو چاند کے موجود ہونے کا یقین ہوتا ہے۔ اگر شعاعیں روشنی لٹا رہی ہوں تو آفتاب کے وجود کا احساس ہوتا ہے۔ اگر لہریں موج ہوں تو سمندر کی روانی کو ماننا پڑتا ہے۔ اگر کلیاں شاداب ہوں تو پھول کے وجود کا اعلان کرنا پڑتا ہے۔ اسی طرح آج بھی عشاقِ مصطفیٰ کا وجود آپ کے چاہنے والوں کا مجمع، آپ پر جان لٹانے والوں کی کثرت، پوری دنیا میں ہر ساعت ہر آن لا الہ الا اللہ کے ساتھ محمد رسول اللہ کی ابھرتی ہوئی آوازیں اس حقیقت کا اعلان ہیں کہ میرے سرکار موجود ہیں، میرے حضور زندہ ہیں، میرے بچاؤ و ماویٰ ہماری دستگیری فرما رہے ہیں، میرے آقا و مولا خستہ حال غلاموں کے آنسو پونچھ رہے ہیں۔ آج جو شخص حیاتِ مصطفیٰ کا منکر ہے وہ فقیر کے پاس آئے، فقیر اسے چند لمحوں میں حیاتِ سرور کو نین صلی اللہ علیہ وسلم کا قائل کر دے گا۔ آپ کی تقریر اس قدر پر جوش و ولولہ انگیز، دلائل و براہین سے آراستہ آیاتِ قرآنیہ اور احادیث سے مرصع تھی کہ ہزاروں سامعین بار بار نعرہٴ تکبیر اللہ اکبر، نعرہٴ رسالت یا رسول اللہ اور حیاتِ مصطفیٰ زندہ باد کے نعرے بلند کرتے۔ ہر شخص چپ تھا، ہر زبان گنگ تھی۔ حیاتِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے عقیدہ پر تقریر کرتے کرتے آپ کی آواز بھرا گئی، آنکھوں سے آنسو ابل پڑے، جنہیں آپ

نے دستار کے پلو سے پونچھا یہ سماں ایسا رقت انگیز تھا کہ سامعین اشکبار ہو گئے۔ آنسوؤں کی لڑیاں لگ گئیں، محدث اعظم نے فرمایا:

”ارے ارے تم کس قدر گستاخ اور ناشکرے ہو! انہی کا کھاتے ہو اور انہی پر غراتے ہو! غضب خدا کا جس آقا کے صدقے میں سب کچھ عطا ہو رہا ہے اسی کی توہین کرتے ہو جس کے وجود کے صدقے میں تمہیں وجود عطا ہوا اسی کے وجود کا انکار کرتے ہو! رب کعبہ کی قسم اگر تم امت مصطفویٰ میں نہ ہوتے اور کسی اور نبی کی امت ہوتے تو اب تک قہر خداوندی تمہیں اپنی لپیٹ میں لے چکا ہوتا مگر تم تو حضور رحمۃ للعالمین کے امتی ہو، حضور شفیع المذنبین کے نام لیوا ہو اس کا کلمہ پڑھتے ہو جو جان کے دشمنوں کو امان دیتا رہا، جو پتھر کھا کر جنت کے پھولوں کی بشارت دیتا رہا، جو کانٹوں پر چل کر رحمت عام کی خوشبو لٹاتا رہا، جو خود پیاسا رہ کر پیاسوں کی پیاس بجھاتا رہا، وہ کب چاہے گا کہ تمہاری شکلیں مسخ ہو جائیں۔“

اسے کب گوارا ہے کہ تم عذاب الہی کا شکار ہو جاؤ، وہ تو سراپا رحمۃ للعالمین ہے۔ ازل میں بھی رحمت تھا اور ابد تک رحمت رہے گا۔ ماضی ہو عہد حال ہو یا دور مستقبل اس کی رحمت ہر دور کو اپنی پناہ میں لئے ہوئے ہے۔ پناہ میں وہی لیتا ہے اور امان وہی دیتا ہے جو زندہ اور موجود ہو۔ منکرو! یہ کتنا برا ستم ہے کہ تم نے جس کی کالی کالی کی چھاؤں میں پناہ لے رکھی ہے، جو رو کر تمہیں بخشواتا ہے، جو روضہ اطہر میں بھی امت کی بد حالی پر بے چین و مضطرب ہے، تم اسی کو نعوذ باللہ مردہ قرار دے رہے ہو، سن لو میرے حضور زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے۔“

تو زندہ ہے واللہ تو زندہ ہے واللہ
مرے چشم عالم سے چھپ جانے والے
ترا کھائیں تیرے غلاموں سے اُلجھیں
ہیں منکر عجب کھانے غرانے والے

یہاں پہنچ کر قبلہ محدث اعظم علیہ الرحمۃ پر عجیب بے خودی و سرشاری سی چھا گئی، آپ نے ”زندہ نبی، زندہ نبی“ کی تکرار شروع کر دی۔ آپ بار بار یہی فرما رہے تھے اور ہزاروں کا اجتماع آپ کے اس انداز میں کھو کر زندہ نبی، زندہ نبی کی تکرار کئے جا رہا تھا۔ آپ نے قریباً آٹھ منٹ تک یہی ورد کیا۔ آپ خود بھی بے خود تھے اور مجمع کو بھی بے خود بنا دیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ آپ کی آنکھیں بہت سے اسرار سے پردے اٹھتے ہوئے دیکھ رہی ہیں، کسی شخص کو دوسرے کا خیال نہیں تھا، ہر ایک پر یہی

ایمان افروز احساس طاری ہو چکا تھا کہ میرے حضور زندہ ہیں، میرے سرکار زندہ ہیں۔
”زندہ نبی، زندہ نبی“ کی تکرار کرتے کرتے آپ پر کھانسی کا حملہ ہوا (بعد میں معلوم ہوا کہ
آپ شدید بیمار تھے) مگر آپ نے تکرار نہ چھوڑی۔ بالآخر آواز بیماری کی بدولت کمزور پڑتی گئی، آپ
نے وما علینا الا البلاغ المبین کہا اور یوں یہ ایمان افروز خطاب اپنے اختتام کو پہنچا۔ آپ کا
خطاب ایک گھنٹہ چالیس منٹ تک جاری رہا۔ میں نے یہ سب کچھ اپنے تخیل کو ماضی کے نہاں
خانوں میں لے جا کر لکھا ہے۔ قلم اور بھی بہت کچھ لکھنے کو بے قرار ہے مگر ”رضائے مصطفیٰ“ کی تنگ
دامانی آڑے آرہی ہے، میں جب خوشبو کی وادیوں میں سفر کرنا چاہتا ہوں تو یہ کہتا ہوا حضور محدث
اعظم پاکستان کے اس عقیدت آفریں خطاب میں کھوجاتا ہوں کہ:

دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو
ہاں دکھا دے اے تصورِ پھر وہ صبح و شام تو



حضرت علامہ مفتی محمد ضیاء الدین قادری مدنی

منظہر لطف و عطا حضرت ضیاء الدین تھے
صورت شمع ہدیٰ حضرت ضیاء الدین تھے
عمر بھر تبلیغ عشق مصطفیٰ کرتے رہے
مذہب حق کی صدا حضرت ضیاء الدین تھے
صاحب کردار تھے وہ منبع انوار دیں
پیکر صدق و صفا حضرت ضیاء الدین تھے
فقر و استغناء و درویشی شعار زیت تھا
کامرانی کی صدا حضرت ضیاء الدین تھے
دیکھ کر ان کو خدا کی یاد آتی تھی بہت
صاحب حق آشنا حضرت ضیاء الدین تھے
ان کے ہر انداز میں مظہر تھا خالق کی عطا
منظہر حلم و حیا حضرت ضیاء الدین تھے
منظہر اسلاف تھے وہ مصدر علم یقین
نائب احمد رضا حضرت ضیاء الدین تھے
اے رضا شہر مدینہ میں رہے وہ عمر بھر
جاٹار مصطفیٰ حضرت ضیاء الدین تھے

(محمد اکرم رضا)

قطب مدینہ

حضرت علامہ مفتی محمد ضیاء الدین احمد مدنی قادری رحمۃ اللہ علیہ

حضرت علامہ مفتی محمد ضیاء الدین مدنی رحمہ اللہ علیہ کا شمار ان عظیم فرزند ان اسلام میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنی تمام زندگی محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں گزار دی۔ آپ کے تذکار عام اور آپ کے فیوض زبان زد ملت اسلام ہیں۔ آپ سے فیض یاب ہونے والوں کا سلسلہ کروڑوں تک پہنچا ہوا ہے۔ آپ کا خوانِ رحمت انتہائی کشادہ تھا، جو بھی آیا اس سے خوشہ چینی کئے بغیر نہ رہ سکتا۔ آپ اپنوں اور بیگانوں کو یکساں طور پر نوازتے تھے۔ آپ کا سحاب کرم ہر ایک پر یکساں انداز سے برستا تھا۔ آپ کو رب کریم نے ایک طویل عرصہ مدینہ منورہ کی ضو بار فضاؤں میں زندگی گزارنے کا شرف عطا کیا۔ اسی نسبت سے آپ قطب مدینہ اور شیخ العرب و العجم کے القاب سے یاد کئے جاتے ہیں۔

آپ کا سلسلہ نسب خلیفہ اول سیدنا صدیق اکبر سے ملتا ہے۔ آپ ۱۲۹۲ھ (۱۸۷۷ء) پاکستان کے قصبہ کلاس والا (نزد سیکلکوٹ) پیدا ہوئے۔ شروع کی تعلیم مولانا محمد حسین نقشبندی پسروری اور مولانا غلام قادر بھیروی سے حاصل کی۔ پھر برصغیر کے محدث کبیر علامہ وصی احمد محدث سورتی رحمۃ اللہ علیہ کی بارگاہ میں پبلی بھیت (یو۔ پی) حاضر ہوئے۔ ساڑھے تین سال وہاں تعلیمی مدارج طے کئے اور پھر بریلی میں امام احمد رضا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ امام احمد رضا نے ان کی دینی اور فکری صلاحیتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے آپ پر خصوصی کرم فرمایا اور اٹھارہ سال کی عمر میں ہی ان کو سلسلہ عالیہ قادریہ میں اجازت و خلافت سے نواز دیا۔

مفتی ضیاء الدین مدنی کے استاد محترم حضرت علامہ وصی احمد محدث سورتی نے انہیں سلسلہ نقشبندیہ میں خلافت عطا فرمادی۔ جب حضرت علامہ محمد ضیاء الدین مدنی کے علمی و روحانی کمالات کا آفتاب جگمگایا تو برصغیر ہی نہیں مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کی بہت سی مقتدر روحانی شخصیات نے بھی آپ کو اجازت و خلافت عطا فرمادی۔

حضرت مدنی نے جو بیس سال کی عمر میں امام احمد رضا سے اجازت لی۔ بغداد آئے اور

وہاں نو برس قیام کیا۔ ۱۹۱۰ء میں مدینہ منورہ چلے آئے۔ اس وقت ترکوں کی حکومت تھی۔ عشاق رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ستم ڈھانے کا سلسلہ شروع نہیں ہوا تھا۔ بعد میں نجدی حکومت نے شریعت کے نام جس طرح مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی، صحابہ کرام، انبیاء اور اہل بیت کے قبے اور مزارات زمین بوس کئے وہ الگ سے ایک لہو رنگ داستان ہے۔ پھر مفتیوں اور علماء سے ان بد اعمالیوں کے جواز کیلئے زبردستی فتوے لئے جانے لگے جن کا تذکرہ بین الاقوامی جاسوس ہمفرے کی یادداشتوں میں ملاحظہ فرمائیں۔ آپ کے سامنے بھی فتویٰ پیش کیا گیا مگر آپ نے دستخط سے صاف انکار کر دیا۔ ڈرایا دھمکایا گیا مگر آپ نے کہا، جسے میں غلط سمجھتا ہوں اس کو حق کس طرح کہہ دوں۔

حضرت مفتی محمد ضیاء الدین مدنی نے قریباً ۷۵ برس مدینہ منورہ میں قیام کیا۔ اس طویل مدت میں سوائے حج کے صرف تین مرتبہ مدینہ منورہ باہر تشریف لے گئے۔ پہلی بار ترکوں کے زمانے میں ترکی گئے۔ دوسری بار دربار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے اشارہ پا کر امام احمد رضا کی عیادت کیلئے بریلی آئے۔ تیسری مرتبہ اپنے صاحبزادے مولانا محمد فضل الرحمن مدنی کے علاج کیلئے حیدرآباد دکن گئے۔ ان مواقع کے علاوہ آپ نے شہر رسول صلی اللہ علیہ وسلم نہیں چھوڑا۔ آپ کی مدینہ سے اس قدر والہانہ عقیدت دیکھ کر حضرت امام مالک کی مدینہ منورہ سے محبت کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ آپ صورت و سیرت کے لحاظ سے اسلاف کی تصویر تھے۔ آپ کو دیکھ کر اور آپ کی گفتگو سن کر دل و جان عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سرشاری میں ڈوب جاتے تھے۔ شاید ہی کوئی عالم مفتی محدث، مفسر، سجادہ نشین، شیخ طریقت، مرد درویش ہو گا جو مدینہ منورہ حاضر ہوا ہو اور آپ کی محفل میں شرکت کی سعادت حاصل نہ کی ہو۔

آپ نے مدینہ طیبہ سے اس قدر والہانہ عشق کیا کہ آخری سانس تک اسی شہر عنبر بار کی خوشبو کو دل و جان میں بساتے رہے اس کو دیکھ کر بیدم وارثی کے یہ اشعار نوک قلم کا اعزاز بن جاتے تھے:

تیرا در چھوڑ کے جاؤں تو کہاں جاؤں میں
میرے آقا میرے سلطان مدینے والے
سگ طیبہ مجھے سب کہہ کے پکاریں بیدم
یہی رکھیں مری پہچان مدینے والے

حضرت مفتی ضیاء الدین مدنی فاضل بریلوی کی ایمان آفریں مجالس کے خوشہ چین تھے۔ وہاں تو ہر وقت نعت و مدحت رسول کے ستارے بکھرے نظر آتے تھے۔ یہ فاضل بریلوی ہی کا فیض

تھا کہ آپ کے ارادت مندوں میں نعت کے حوالے سے بڑی بڑی شخصیات منظر عام پر آئیں۔ اب کیسے ممکن تھا کہ مفتی ضیاء الدین مدنی ایک عرصہ فاضل بریلوی کے قدموں میں گزارتے اور نعت کے فیضان سے محروم رہتے۔ آپ نعت گو شاعر تو نہ بن سکے مگر نعت فہمی اور نعت شناسی کا ذوق اس شان سے ودیعت ہوا تھا کہ آپ نے مدینہ طیبہ میں اپنی رہائش گاہ کو نعت نگر بنا دیا جہاں ہر وقت نعت کی رم جھم برستی رہتی تھی۔ ہندوستان، پاکستان، مصر، شام، مراکش، تونس، لیبیا سمیت درجنوں ممالک کے ارادت مند وہاں حاضری دینا قابل فخر سمجھتے تھے۔ ان محافل میں مختلف ممالک اور زبانوں سے تعلق رکھنے والے نعت گو شاعر اپنا کلام سناتے۔ نعت خوان اپنی آواز کا حسن بکھیرتے۔ حضرت مدنی بہت سی زبانیں یکساں مہارت کے ساتھ بول اور سمجھ لیتے تھے اس لئے خوب خوب داد دیتے اور نعت خوانوں کو بھی خوب خوب نوازتے۔ ہندو پاک کا شاید ہی کوئی نامور نعت گو ہوگا جس نے حضرت مدنی کی محفل میں نعت سنا کر آپ کی دعاؤں کا تحفہ حاصل نہ کیا ہو۔

ایک بار آپ کے ہاں منعقدہ محفل نعت میں امجد حیدر آبادی نے یہ نعت پڑھی:

کس چیز کی کمی ہے مولا تیری گلی میں
دنیا تیری گلی میں عقبی تری گلی میں
سورج تجلیوں کا ہر دم چمک رہا ہے
دیکھا نہیں کسی دن سایہ تیری گلی میں
دیوانگی پہ میری ہنستے ہیں عقل والے
رستہ تری گلی کا پوچھا تری گلی میں

حضرت مدنی فرماتے تھے کہ امجد حیدر آبادی نے یہ نعت مدینہ منورہ میں میرے گھر میں لکھی۔ شاید آپ کی نگاہ کرم نواز نے نواز دیا ہو تبھی یہ نعت شہرت و قبولیت کی اس معراج کو پہنچی کہ آج تک محافل نعت کی جان بنی ہوئی ہے۔

اپنے پیر و مرشد سرکار اعلیٰ حضرت محدث بریلوی رحمۃ اللہ علیہ سے آپ کو بڑی والہانہ محبت تھی۔ مشائخ عظام اور اکابر کے تذکرے کے وقت ان کی رفعت شان بیان کر کے فرماتے تھے کہ ان کا مقام اپنی جگہ لیکن میرا شیخ میرا شیخ ہے اور میں نے حضور فاضل بریلوی جیسا کسی کو نہیں پایا۔ آپ نے مدینہ طیبہ میں مسلسل ۵۷ سال تک محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے چراغ اس شان سے روشن کئے کہ تعلیمات اعلیٰ حضرت کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

مولانا ضیاء الدین مدنی قوت تاثیر اور علمی تبحر کا بحر بے کراں تھے۔ آپ کے تحمل بردباری، تواضع و انکساری، ایثار و اخلاص، اعتدال و وسعت نظری، جذب و کیف کا چاروں طرف چرچا تھا۔ جو شخص آپ کے قریب آتا، آشنائے درود و محبت ہو جاتا اور آپ کی صحبت کیمیا اثر سے اس کی دنیا ہی بدل جاتی۔ آپ نے مدینہ منورہ میں قیام کے بعد حجاج کرام کو دوران حج سہولتیں فراہم کرنے کی جانب خصوصی توجہ فرمائی۔ قیام و طعام سے لے کر آمد و رفت کی دشواریوں کے خاتمہ کیلئے فنڈ قائم کئے۔ خصوصاً حجاز ریلوے اسٹیشن کی ریلوے لائن کی تعمیر کے سلسلہ میں آپ کی خدمات کو عالم اسلام میں قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔ آپ کی قربت میں انس و محبت کے دریا بہتے تھے۔ سلف صالحین کی تمام خصوصیات آپ میں بدرجہ اتم موجود تھیں۔

گذشتہ صدی ہجری میں جو علماء و مشائخ شبانہ روز تبلیغ اسلام اور تحفظ مقام مصطفیٰ میں مصروف رہے، ان میں حضرت مدنی کی خدمات تا قیامت روشن رہیں گی۔ انہوں نے ایسے ماحول میں عشق مصطفیٰ کی شمع روشن رکھی جس میں بظاہر یہ بات ممکن نظر نہیں آتی۔ دنیا بھر میں آپ کے مریدوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچتی ہے۔ مملکت حجاز میں بھی آپ کے مرید ہر شہر میں موجود تھے۔ سال بھر میں کوئی دن ایسا نہ گزرتا جبکہ مختلف ممالک کے زائرین و حجاج آپ کے پاس نہ آتے اور درود و سلام کی محفل میں شریک نہ ہوتے۔

۷۵ برس تک ایسے ملک میں درود و سلام کی محفلیں سجائے رکھنا کہ جہاں ان کو شرک و بدعت سے تعبیر کیا جاتا ہے، بلاشبہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا خصوصی فیضان ہے۔ بڑے بڑے علماء و مشائخ ان کے قدموں میں جگہ پانے کو باعث افتخار سمجھتے تھے۔ روایتی پیروں اور ظاہر پرست علماء جیسی ان میں کوئی بات نہیں تھی۔

حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”آپ نہ صرف خود عشق مصطفیٰ کے بادۂ گلگام سے مخمور رہتے تھے بلکہ جس کو بھی اس مردِ حق کی محبت نصیب ہوئی اس کے دل میں بھی عشق مصطفوی کے چراغ روشن کر دیئے۔ جب میں ان کے ایک سادہ سے حجرے میں داخل ہوا تو مجھے ایک سجادہ پر بیٹھا ہوا مردِ خدا نظر آیا جس کے چہرے پر انوارِ الہی کی تجلیاں بکھر رہی تھیں، جس کی سادگی اور پرکاری دلوں کو اپنا متوالا بنا رہی تھی۔ میری یہ پہلی ملاقات تھی لیکن اس کریم النفس ہستی نے مجھے وہ پذیرائی بخشی کہ ساری اچھلتیں کا فور ہو گئیں اور مجھے یوں محسوس ہونے لگا کہ میں اس محفل کے دیرینہ حاضر باش لوگوں میں سے ہوں۔“

حضرت مدنی فرماتے ہیں کہ شروع میں مجھ پر بڑی سختی ہوئی۔ میرے خلاف پہرے لگ گئے، مجھے بدعتی اور مشرک مشہور کیا گیا، مجھ سے مناظرہ کیلئے لوگوں کو بھیجا گیا۔ ایک مرتبہ کچھ لوگ وسیلہ پر مناظرہ کرنے آئے اور مجھ سے پوچھا کہ کیا آپ اللہ تک رسائی کے لئے غیر اللہ کو وسیلہ بنانے کے قائل ہیں؟ میں نے کہا: وسیلہ تلاش کرنے کا حکم قرآن میں موجود ہے۔

ياايهاالدين امنوا اتقواالله وابتغوااليهالوسيلة

انہوں نے کہا اس وسیلہ سے مراد نماز اور نیک کام ہیں۔ میں نے سوال کیا کہ صلوٰۃ (نماز) اللہ ہے یا غیر اللہ؟ اس پر سب ساکت ہو گئے۔ جواب نہ بن پڑا اور واپس چلے گئے۔ اس طرح متعدد مسائل پر گفتگو کیلئے آتے رہے۔ مجھ سے لوگوں کا ملنا جلنا بند کرتے رہے۔ اسی طرح ایک مرتبہ مدینہ طیبہ کے انتہائی سخت مزاج امیر ابن ابراہیم نے آپ کو بلا کر غیض و غضب کے ساتھ گفتگو شروع کر دی۔ وہاں بھی امیر مدینہ نے وسیلہ کے بارے میں پوچھا: آپ نے متذکرہ بالا آیت پڑھی۔ امیر مدینہ نے کہا کہ یہ تو ہماری دلیل ہے نہ کہ انبیاء و اولیاء ہیں۔ آپ نے سوال کیا کہ ہمارے یہ نیک اعمال بارگاہ خداوندی میں مقبول ہیں یا مردود؟ اس نے کہا مجھے کیا معلوم؟ اس پر آپ نے کہا کہ اعمال وسیلہ بن سکتے ہیں جن کے بارے میں ہمیں نہیں معلوم کہ مقبول ہیں یا مردود تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کیوں وسیلہ نہیں بن سکتے جو کہ بارگاہ خداوندی میں از حد مقبول و محبوب ہیں۔ اس پر امیر مدینہ کا سارا غصہ نرمی اور محبت میں بدل گیا۔ آپ کو چائے پلائی اور عزت و تکریم سے رخصت کیا۔

برصغیر پاک و ہند کے نامور سجادوں کے شیوخ جب مدینہ طیبہ جاتے تو آپ کی خدمت میں حاضری اور قیام کو اپنے لئے لازم قرار دے لیتے۔ اگر اپنی اولاد کو بھیجتے تو انہیں بھی یہ تلقین کر کے بھیجتے کہ قطب مدینہ رحمۃ اللہ علیہ کی بارگاہ میں ضرور حاضر ہونا تاکہ تم محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے عملی مظاہر کو دیکھ سکو۔ کس کا نام لیجئے، شاید ہی کوئی ایسا سجادہ نشین، پیر طریقت اور عالم اکمل ہوگا جس نے آپ کی بارگاہ میں حاضری کا شرف حاصل نہ کیا ہوگا۔ آپ کا لطف و کرم اسباب عطا بن کر سب پر برستا رہا۔ یہی وجہ ہے کہ عوام و خواص آپ کے مریدوں کی تعداد لاکھوں میں بتا کر خاموش ہو جاتے ہیں۔ ورنہ سرزمین عرب میں ہی آپ کے مریدین کی تعداد ہزاروں میں ہوگی۔ اب یہ سلسلہ تمام رکاوٹوں کو پھلانگ چکا ہے۔ آپ کی محافل کے شرکاء کی روزانہ تعداد میں بہت زیادہ اضافہ ہوتا رہا ہے۔ آج اگرچہ آپ بظاہر موجود نہیں ہیں مگر آپ کی اولاد کی مقبولیت و محبوبیت میں کمی نہیں آئی اور لاکھوں زائرین آپ کی اولاد میں آپ کے انوار کو تلاش کرتے ہیں۔

آپ نے مدینہ طیبہ ہی میں دو نکاح کئے۔ پہلی اہلیہ کا تیرہ برس کی رفاقت کے بعد انتقال ہوا اور آپ کی تمام اولاد پہلی اہلیہ ہی سے ہوئی۔ اس کی وفات کے بعد آپ نے دوسرا نکاح کیا۔ آپ کے صاحبزادہ حضرت علامہ مولانا فضل الرحمن مدنی آپ کے جانشین تھے جنہوں نے آپ کی زندگی میں اور آپ کے وصال کے بعد آپ کے فیوض کا سلسلہ جاری رکھا۔ علامہ فضل الرحمن مدنی عظیم المرتبت عالم دین فاجل اجل اور عظمت اسلاف کی تصویر تھے۔

وصال سے دو دن قبل آپ کی طبیعت علیل ہوئی۔ بالآخر ۱۲ اکتوبر ۱۹۸۱ء کو جب جمعہ کا روز تھا اور مؤذن اذان کہہ رہا تھا تو آپ نے کلمہ شریف پڑھ کر اپنی جان خالق اکبر کے سپرد کر دی۔ آپ کے وصال کی خبر مدینہ طیبہ مکہ مکرمہ پاک و ہند اور دوسرے ممالک کے مسلمانوں میں نہایت تیزی سے پھیل گئی بعد نماز ظہر اذان عصر سے پہلے آپ کو غسل دیا گیا اور پھر نماز عصر کے بعد درود و سلام اور قصیدہ بردہ شریف کی گونج میں جنازہ اٹھایا گیا۔ محراب نبوی میں منبر شریف کے قریب جنازہ رکھ دیا گیا۔ آپ کے خلیفہ فضیلہ الشیخ مفتی محمد علی مراد شامی نے نماز جنازہ پڑھائی اور دعا کی گئی۔ آپ کا جنازہ تین منٹ تک مواجہ شریف میں رکھا گیا۔ ہر چہار طرف سے کلمہ طیبہ کا ذکر ہو رہا تھا۔ اعلیٰ حضرت کی مشہور نعت

”کعبہ کے بدرالدجی تم پہ کروڑوں درود“

پڑھی جا رہی تھی۔

آپ کا جنازہ جنت البقیع کی طرف لے جایا گیا۔ جنت البقیع میں کسی کو اندر جانے کی اجازت نہیں لیکن حضرت مولانا فضل الرحمن مدنی کے کنبے پر وہاں کی انتظامیہ نے دروازہ کھول دیا۔ حالانکہ وہاں حکومت کے مقرر کردہ حکام ہی تدفین کراتے ہیں۔ جنازہ کے ساتھ ہی تمام اصحاب بھی جنت البقیع میں داخل ہو گئے۔ مولانا فضل الرحمن نے خود آپ کو لحد میں اتارا۔ بعد میں تدفین کے دوسرے دن محفل میلاد آراستہ ہوئی جس میں ان گنت نیاز مند شریک تھے۔ قل شریف میں دنیا بھر سے آئے ہوئے علماء و مشائخ زائرین مدینہ طیبہ اور ارادت مند شریک ہوئے۔

آپ کی تاریخ وصال ۴ ذوالحجہ ۱۴۰۱ھ بمطابق ۱۲ اکتوبر ۱۹۸۱ء ہے۔ آپ کا مزار مبارک سیدہ فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کے مزار پاک سے دو گز کے فاصلے پر ہے۔ آپ کی قبر سے گنبد خضریٰ صاف نظر آتا ہے۔ دید گنبد خضریٰ کی آرزو بعد از وصال پوری ہونے کے اسباب خدا نے پورے کر دیئے۔ مرنے کے بعد بھی مری آنکھیں کھلیں رہیں عادت جو پڑی گئی تھی ترے انتظار کی

شیخ القرآن

مولانا عبدالغفور ہزاروی رحمۃ اللہ علیہ

تحریک پاکستان کے ولولہ انگیز دور میں جن علماء و مشائخ نے مسلم لیگ کی تائید و حمایت کی خاطر تاریخ ساز کردار ادا کیا اور اسلامیان ہند کو لیلائے آزادی سے ہمکنار کرنے کیلئے مسلسل راہنما یا نہ بصیرت سے کام لیتے رہے ان میں شیخ القرآن مولانا عبدالغفور ہزاروی رحمۃ اللہ علیہ کا نام خاص اہمیت کا حامل ہے۔ آپ کو اس ضمن میں یہ شرف حاصل ہے کہ جب تیس مارچ ۱۹۴۰ء کو منٹو پارک لاہور میں قائد اعظم محمد علی جناح کی صدارت میں مولوی اے کے فضل الحق نے قرارداد پاکستان پیش کی تو مختلف صوبوں کے راہنماؤں کے پہلو بہ پہلو پنجاب سے اس قرارداد کی تائید کرنے والوں میں مولانا ظفر علی خاں کے ساتھ آپ کا نام خاص اہمیت کا حامل ہے۔ مسلم لیگ کی جنرل کونسل نے ان دو مسلم لیگی راہنماؤں کو قرارداد کی تائید کے سلسلہ میں پنجاب کی نمائندگی کرنے کا اعزاز بخشا تھا۔

مولانا عبدالغفور ہزاروی رحمۃ اللہ علیہ کے والد محترم کا نام عبدالحمید تھا۔ آپ ضلع ہزارہ کے ایک دور افتادہ گاؤں موضع چنبہ میں ۱۹۱۵ء کو پیدا ہوئے۔ حصول تعلیم کیلئے لاہور کی مختلف درسگاہوں میں تعلیم حاصل کرنے کے باوجود جب تحصیل علم کا شوق بڑھتا گیا تو دارالعلوم دیوبند کا رخ کیا مگر وہاں امتحان شروع ہونے کی بناء پر داخلہ سے محروم رہے۔ پھر دہلی چلے گئے اور وہاں کی مختلف درسگاہوں میں علم حاصل کرتے رہے۔ وہاں سے برصغیر کی ممتاز درسگاہ جامعہ رضویہ منظر اسلام بریلی پہنچے اور حجۃ الاسلام مولانا محمد حامد رضا خاں علیہ الرحمۃ کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا اور اسی درسگاہ سے بقیہ تمام دینی علوم کی تحصیل کی۔ فارغ التحصیل ہونے پر اسی درسگاہ میں مسند درس و تدریس پر فائز کر دیئے گئے۔ اسی دوران میں استاد محترم سے ابوالحقائق کا لقب پایا۔ ۱۹۳۵ء میں وزیر آباد تشریف لائے اور یہاں ”جامعہ نظامیہ غوثیہ“ قائم کر کے باقی عمر اسی علاقے کو علم و حکمت کی خوشبو سے مہکاتے گزار دی۔

آپ کو بچپن ہی سے قبلہ عالم پیر سید مہر علی شاہ گولڑوی رحمۃ اللہ علیہ کے دست حق پرست پر

بیعت کی سعادت حاصل ہو چکی تھی۔ سرکار گولڑوی نے آپ کو اجازت و خلافت سے نوازا، جب آپ کے سامنے سرکار گولڑوی کا نام لیا جاتا تو دیوانہ دار جھومنے لگتے۔ مولانا ہزاروی عالم اکمل، فاضل اجل، صوفی باصفا اور مفسر قرآن ہی نہیں تھے بلکہ اپنے وقت کے نامور نکتہ دان، دینی گھتیاں سلجھانے والے استاد اور معروف سیاستدان بھی تھے۔

آپ کا شمار تحریک پاکستان کے ممتاز قائدین میں ہوتا ہے۔ آپ نے ۱۹۴۶ء میں مسلم لیگ میں شمولیت کی اور پھر قیام پاکستان تک اپنی جادو بیانی سے مسلم لیگ کے ولولہ انگیز پیغام کو عوام الناس کے دلوں کی دھڑکنوں میں بساتے رہے۔ آپ نے تحریک مسجد شہید گنج، تحریک ختم نبوت، تحریک خلافت اور تحریک نیلی پوش میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، مولانا ظفر علی خاں کی اتحاد ملت پارٹی میں بھی شریک رہے پھر آپ نے آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ ۱۸ اپریل ۱۹۴۸ء میں اتحاد ملت پارٹی کو مسلم لیگ میں ضم کر دیا تو اس پر قائد اعظم بہت خوش ہوئے۔

مسلم لیگ کے پیغام کو مقبول بنانے کیلئے آپ نے پشاور سے کلکتہ تک سینکڑوں اجتماعات سے خطاب کیا۔ راہ آزادی میں ہر صعوبت کو برداشت کیا اور ہر آزمائش سے سرخرو ہو کر نکلے۔ آپ کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ آپ نے قائد اعظم علیہ الرحمۃ کو وزیر آباد میں مدعو کیا اور اپنی مسجد سے ملحقہ وسیع و عریض گراؤنڈ میں تاریخی اجتماع کا اہتمام کیا۔ اس سے مسلم لیگ کے مخالفین میں سراسیمگی پھیل گئی اور ان کا زور ٹوٹ گیا۔

تحریک پاکستان کے مقتدر قائدین، راہنماؤں اور عوام کو یکساں طور پر آپ کی خدمات جلیلہ کا اعتراف تھا۔ آپ کا شمار صف اول کے مسلم قائدین میں ہوتا تھا۔ منٹو پارک لاہور میں قرار داد پاکستان کی منظوری کے دوران میں آپ کو مولانا ظفر علی خاں کے برابر جگہ ملی اور آپ نے مولانا عبدالحامد بدایونی کے ساتھ اہلسنت کی نمائندگی کی۔ جنوری ۱۹۴۰ء میں جب انگریز گورنر پنجاب نے قیام پاکستان کی راہ میں روڑے اٹکانے کیلئے پاکستان کے حامی مسلم قائدین کی گرفتاری کا عام حکم دے دیا تو گوجرانوالہ میں تحریک پاکستان کے سلسلہ میں گرفتاری کی سعادت سب سے پہلے شیخ القرآن مولانا عبدالغفور ہزاروی کے حصے میں آئی۔ ۱۹۴۶ء میں بنارس کی آل انڈیا سنی کانفرنس جو صدر الافاضل اور حضرت محدث کچھوچھوی کی مساعی سے ہوئی اس میں کم و بیش پانچ ہزار علماء و مشائخ اور دو لاکھ عوام نے شرکت کی اس میں مولانا عبدالغفور ہزاروی نے تحریک پاکستان اور قائد اعظم کی اعانت کا اعلان کیا۔

مولانا ہزاروی نے برصغیر پاک و ہند بالخصوص پنجاب اور سرحد میں کاروان آزادی کو منزل بکنار کرنے کیلئے خاص کردار ادا کیا۔ گوجرانوالہ، وزیر آباد اور دوسرے شہروں اور قصبات میں نظریہ پاکستان کو مقبول و معروف بنانے کیلئے آپ کی خدمات آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہیں جن دنوں اس علاقہ میں کانگریس یونینسٹ پارٹی اور ان کے ہموا پاکستان مخالف جماعتیں اپنے پروپیگنڈے سے عوام میں اپنا اثر و نفوذ جما رہی تھیں تو آپ نے بے پناہ قوت ایمانی سے سرشار ہو کر مخالفین کی قوت کو خاک میں ملا دیا۔

قدرت نے آپ کو غیر معمولی خطیبانہ صلاحیت بخشی تھی۔ قیام پاکستان سے عرصہ پیشتر ایک بار آپ وزیر آباد میں ایک عظیم الشان جلسہ عام سے خطاب کر رہے تھے۔ آپ نے اس تاریخی اجتماع میں تحریک پاکستان کے مضمرات کو اس خوبی سے اجاگر کیا اور پاکستان کو اسلامیان ہند کیلئے لازم و ملزوم قرار دیتے ہوئے اس خوبصورت اور دل نشیں انداز میں قائد اعظم کا پیغام عوام تک پہنچایا کہ حاضرین جن میں بہت سی قومی نوعیت کی مسلم لیگی شخصیات بھی شامل تھیں، دم بخود رہ گئیں۔ بابائے صحافت مولانا ظفر علی خاں نے اس موقع پر ہزاروی کی سحر انگیز خطابت سے متاثر ہو کر فی البدیہہ یہ شعر آپ کی نذر کیا:

چشمہ اہل رہا ہے محمد کے نور کا
میں آج سے مرید ہوں عبدالغفور کا

مولانا ظفر علی خاں اور مولانا عبدالغفور ہزاروی کے قابل رشک حد تک خوبصورت تعلقات کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ یہ دونوں قائدین تمام انگریز دشمن تحریکوں میں اکٹھے رہے۔ ایک بار مولانا ہزاروی حج بیت اللہ کیلئے روانہ ہونے لگے تو ان کے اعزاز میں دی جانے والی ضیافت میں احباب کے پُر زور اصرار پر مولانا ظفر علی خاں نے فی البدیہہ ایک نظم مولانا ہزاروی پر کہی جس کے دو شعر نذر قارئین ہیں:

حج کو جانے والے ہیں عبدالغفور
آسماں برس رہا ہے ان پہ نور
کس زباں سے ہو بیاں وصف آپ کا
آپ موسیٰ ہیں وزیر آباد طور

تحریک پاکستان کے دوران میں آپ کو شدید مشکلات اور تکالیف سے دوچار ہونا پڑا۔ آپ

پر قاتلانہ حملہ بھی ہوا مگر آپ بال بال بچ گئے، جن دنوں تحریک پاکستان زوروں پر تھی، وزیر آباد کے ہندوؤں نے متحد ہو کر ایک گوردوارہ کو اپنی ناپاک سازشوں کا مرکز بناتے ہوئے مسلمان راہگیروں پر حملہ کر کے ایک مسلمان عورت کو شہید کر دیا۔ اس پر مسلمانوں میں سخت اشتعال پیدا ہوا۔ آپ نے مسلمانوں کی غیرت کو جھنجھوڑتے ہوئے ان کی قیادت کی اور غیور مسلمانوں کو ساتھ لے کر باقاعدہ لڑائی لڑتے ہوئے ہندوؤں کی مذموم سازشوں کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ختم کر دیا۔ پاکستان کے قیام کے ساتھ ہی لٹے پٹے مسلمان مہاجرین کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا، تو آپ نے ان مہاجرین کی آباد کاری اور امن و امان کی بحالی کے سلسلے میں ضلعی انتظامیہ سے بھرپور تعاون کیا اور مسلسل کئی ماہ تک فوجی افسروں کے اشتراک سے مہاجرین کی آباد کاری کا فریضہ انجام دیتے رہے۔

قیام پاکستان کے بعد آپ استحکام پاکستان کیلئے ہمیشہ سرگرم عمل رہے۔ ملک میں اسلامی نظام کا نفاذ آپ کا مطمح نظر تھا۔ ۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوت میں بھی آپ کا کردار فدا کارانہ ناموس محمدی کیلئے باعث صدا افتخار تھا۔ آپ نے ملک کے طول و عرض میں اپنی ولولہ انگیز تقاریر کے ذریعہ تحریک ختم نبوت کے حقیقی مقاصد اجاگر کئے۔ آپ کو داخل زنداں کر دیا گیا اور سات ماہ کا عرصہ آپ نے راولپنڈی جیل میں بڑے صبر و استقلال کے ساتھ گزارا۔

حضرت مولانا عبدالغفور ہزاروی رحمۃ اللہ علیہ کی طبیعت میں حد درجہ استغنا اور خودداری تھی۔ جب تک تحریک پاکستان وقت کے سخت ترین مراحل سے گزرتی رہی، آپ نے ہر گام پر اہلسنت کے پلیٹ فارم سے قائد اعظم، مسلم لیگ اور مسلمانوں کی آزادی کی تمام تحریکات کا ساتھ دیا مگر جب پاکستان معرض وجود میں آ گیا تو آپ نے سیاست کی خاردار وادیوں سے منہ موڑ کر منبر و محراب کو تبلیغ اسلام اور فروغ عشق مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم کا ذریعہ بنا لیا۔ آپ عالم اجل اور علوم حدیث و قرآن کے سلسلہ میں سند کا درجہ رکھتے تھے، پاکستان بھر کے علماء اور مشائخ آپ کو قدر و قیمت اور عزت و وقار کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ آپ نے قیام پاکستان سے مدتوں پیشتر وزیر آباد میں ”جامعہ نظامیہ غوثیہ“ کے نام سے ایک عظیم الشان دینی درسگاہ قائم کی تھی، جس میں برصغیر کے مختلف علاقوں سے طلبہ تحصیل علم کیلئے حاضری دینا سعادت تصور کرتے تھے۔ تحریک پاکستان کے دوران میں بھی آپ نے جامعہ نظامیہ غوثیہ کے تدریسی منصب کو فراموش نہ کیا، جب پاکستان معرض وجود میں آ گیا تو آپ نے پوری توجہ اس جامعہ کے علمی و تدریسی معیار کو بہتر سے بہتر بنانے پر صرف کر دی۔

آپ نے سرکاری اداروں اور درباری مناصب سے ہمیشہ گریز کیا۔ ”جامعہ نظامیہ غوثیہ“ سے آپ کی دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ آپ کو اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور میں ڈاکٹر بلگرامی کی طرف سے شیخ القرآن کے منصب کی پیشکش کی گئی، اس منصب کے ساتھ معقول تنخواہ اور رہائش کی سہولت کے علاوہ دیگر مراعات بھی شامل تھیں مگر آپ نے یہ سوچ کر صاف انکار کر دیا کہ اس منصب کی قبولیت کی صورت میں ”جامعہ نظامیہ غوثیہ“ متاثر ہوتی تھی۔ آپ نے اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور میں شیخ القرآن کا منصب تو قبول نہ کیا مگر شیخ القرآن کا لقب آپ کے نام کا اس شان سے حصہ بنا کہ جب بھی شیخ القرآن کا لفظ ادا کیا جاتا ہے تو اس سے مراد آپ ہی کا اسم گرامی ہوتا ہے۔ شیخ القرآن کے لقب کے پس پردہ آپ کی غیر معمولی علمی ثقاہت، فکری سرفرازی، علمی سربلندی اور دینی عظمت کا فرما ہے۔ اپنی دینی و روحانی صفات نے آپ کو وطن عزیز کے اصحاب علم و دانش کی نگاہوں کا تارا بنا دیا۔

مولانا ہزاروی کردار و گفتار کے لحاظ سے سنت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا نمونہ اور صحیح معنوں میں عاشق رسول تھے۔ آپ کو قدرت نے موزونی طبع کی بنا پر شعر گوئی کا ملکہ بھی عطا کیا تھا۔ آپ نے متعدد نعتوں کی صورت میں محبت رسول کا ارمغان بھی ورثہ کے طور پر چھوڑا ہے۔ ان نعتوں سے آپ کی علمی پختگی اور شعری راست روی کا واضح اظہار ہوتا ہے۔ یہ بھی اتباع سنت مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم کا فیضان تھا کہ آپ نے کلمہ حق کہنے سے کبھی گریز نہ کیا۔ آپ کا جملگاتا کردار گواہ ہے کہ آپ نے کبھی کسی حکمران وقت کی کاسہ لیسلی نہیں کی بلکہ علماء و مشائخ کو ہمیشہ یہ تلقین فرماتے تھے کہ انہیں اپنے مقام و مرتبہ کو پہنچانتے ہوئے تقرب سرکار سے احتراز کرتے ہوئے ہمیشہ حق و صداقت کی پاسداری کرنی چاہیے۔ شاعری میں آپ چشتی تخلص فرماتے تھے۔ آپ فارسی اور اردو میں یکساں مہارت فن کے ساتھ نعت کہتے تھے۔ ایک فارسی نعت کے شعر ملاحظہ ہوں:

نارت	شدم	قاصد	کجکلا ہے
پیامے	ببراز	گدائے	بشا ہے
اے	سلطان	خوباں	دو عالم پنا ہے
خدارا	سوئے	بد نصیباں	نگاہے
چہ می	پرسی	از حال	بے چارہ چشتی
سراپا	خطائے	مجسم	گناہے
دو عالم	فروزاں	چوں	شمس الضحائے

دو زلف درازش چو ماریا ہے
چینش منور چو صبح سعادت
بقدر سرو سیمیں بہ رخ ہچوما ہے

آپ ایسی نادر روزگار علمی شخصیت تھے کہ اہل شوق علوم دینیہ کی طلب مٹانے کیلئے آپ کو مرکز توجہ جان کر دیوانہ وار آپ سے رجوع کرتے۔ آپ بھی انہیں غیر معمولی توجہ سے نوازتے۔ بڑی تعداد میں اطراف و اکناف سے آنے والے طلبہ کی خورد و نوش کا اہتمام اور ان کو تعلیمی تقاضوں سے بہرہ ور کرنے کیلئے اچھے اساتذہ اور علماء کا تقرر آپ کی خصوصی توجہ کا محور بنے رہے۔ یوں تو جامعہ نظامیہ غوثیہ میں تمام سال علم و فکر کی بارات اتری ہوئی محسوس ہوتی تھی مگر رمضان المبارک میں تو خاص طور سے روحانی جشن کا سماں نظر آتا۔ آپ رمضان المبارک میں اپنی جامعہ میں خصوصی طور پر دورہ قرآن کروایا کرتے تھے جس میں جامعہ کے طلبہ کے ساتھ ساتھ ملک بھر کے علماء و فضلاء بھی شرکت کرتے اور آپ کے علمی فیوض سے استفادہ کرتے۔ آپ قرآن حکیم کے رموز و نکات اس احسن طریق سے بیان فرماتے کہ دلوں پر نقش ہو جاتے۔ یوں تو ماہ رمضان المبارک میں ملک کی دوسری بڑی دینی درسگاہوں میں بھی دورہ قرآن کا اہتمام کیا جاتا تھا مگر آپ کے ہاں علماء و فضلاء جس کثرت سے آتے اس سے صاف ظاہر ہوتا کہ آپ کا وجود علوم دینیہ کے میدان میں سند کا درجہ رکھتا ہے۔

آج جب ہم تاریخ کے آئینہ خانے میں جھانک کر جامعہ نظامیہ غوثیہ سے علمی فیوض سمیٹنے والے علماء و فضلاء کی فہرست پر ایک نگاہ دوڑاتے ہیں تو خوشگوار حیرت ہوتی ہے کہ ملک بھر میں شاید ہی کسی ایک شخصیت کے سرچشمہ معلوم سے اتنی بڑی تعداد میں علماء نے خوشہ چینی کی ہو۔ اس سلسلہ میں ہم چند ایسے نام پیش کرنا چاہیں گے جو مستقبل میں بذات خود ایک علمی ادارہ بن گئے۔ مولانا عبدالرشید جھنگوی، پیر محمد فاضل ڈھاگری آزاد کشمیر، صاحبزادہ سید محمود شاہ گجراتی، پیر سید خادم حسین چورہ شریف، صاحبزادہ غلام جیلانی چورہ شریف، پیر سید عابد حسین شاہ علی پور شریف، پیر علاؤ الدین صدیقی نیریاں شریف، پیر جمال الدین میانوالی، مولانا غلام جیلانی ہزاروی، مانسہرہ، شیخ الحدیث مولانا محمد اشرف سیالوی، مفتی حبیب الرحمن شاہ کوٹلی آزاد کشمیر، مولانا شمس الزمان محمد قادری لاہور، علامہ عبدالحکیم شرف قادری لاہور، مولانا سید منظور احمد شاہ ہمدانی، استاذ العلماء مولانا عبدالحق بنڈیالوی، مولانا معین الدین دسک، مولانا عبدالستار انصاری حافظ آباد، مولانا احمد علی قصوری، شیخ الحدیث مولانا محمد شریف رضوی، مولانا مفتی عبداللطیف گوجرانوالہ، مولانا غلام رسول سمندری، مولانا محمد سلیم فیصل آباد، صاحبزادہ سید خورشید احمد

شاہ گوجرانوالہ، مولانا غلام سیرانی مدرسہ غوثیہ رحیم یار خاں، مولانا محمد عبدالصبور منشور بیگ ہزاروی، مفتی ہدایت اللہ پسروری، مولانا سید محمد عبداللہ ملتانی، مولانا سید مراتب علی شاہ، مولانا عبدالخالق شمس لاہور، مولانا محمد صدیق سالک سیالکوٹ، مولانا سعید احمد مجددی، مولانا خالد حسن مجددی، مولانا ریاض الدین انک شہر۔ غرضیکہ کس کس کا ذکر کیا جائے آپ نے علماء و فضلاء کی روحانی و نظری اور علمی و فکری تربیت کر کے انہیں آسمان رشد و ہدایت پر نجوم تاباں کی صورت جگمگا دیا۔ آپ کے شاگرد آج آپ کی شمع ایمانی کو روشن رکھے ہوئے ہیں اور ان میں سے بیشتر معروف و مشہور دینی درسگاہوں کے مہتمم اور آپ کی بخشی ہوئی علمی امانت کے امین ہیں۔ آپ کے فیوض سے بہرہ ور ہونے والے بہت سے علماء بیرون ملک کفر کے مراکز میں نورِ اسلام کی شمع روشن کئے ہوئے ہیں۔

شیخ القرآن مولانا عبدالغفور ہزاروی رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی ایک مجاہد کی زندگی تھی۔ وہ مجاہد جو باطل قوتوں سے پوری طاقت کے ساتھ نبرد آزما ہوتا ہے اور شکست تسلیم نہیں کرتا۔ تحریک پاکستان سے قیام پاکستان تک اور تحریک نفاذ اسلام سے تحریک ختم نبوت تک آپ کا کردار چاند کی صورت اجلا اجلا اور ضو فلکن نظر آتا ہے۔ آپ کی موت بھی ایک مجاہد کی موت تھی، صبح کی سیر آپ کے معمولات کا حصہ تھی۔ ۹ اکتوبر ۱۹۷۰ء بمطابق ۷ شعبان المعظم ۱۳۹۰ھ بروز جمعہ المبارک آپ سیر کرتے ہوئے جی ٹی روڈ پر سے گزر رہے تھے کہ اچانک ایک تیز رفتار ٹرک کی زد میں آ گئے۔ آپ کو فوراً ہسپتال لے جایا گیا۔ آپ کے زخمی ہونے کی خبر فوراً ارد گرد کے دیہات اور قصبات میں پھیل گئی۔ وزیر آباد میں کھل ہڑتال کر دی گئی، لوگ شدت غم سے چیختے ہوئے ہسپتال کی طرف بھاگے۔ ہسپتال میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ ہر طرف لوگ اشکبار آنکھوں سے دست بدعا تھے۔ مولانا ایسے عالم میں بھی صبر و تحمل کی تصویر بنے ہوئے تھے۔ آخری لمحات میں آنکھیں کھول کر فرمایا کہ ”میں نے اپنے مجرم کو معاف کیا، پھر کلمہ طیبہ کا ورد کرتے ہوئے اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔ اسی اثناء میں آپ کی وفات کی خبر ملک بھر میں پھیل چکی تھی۔ دوسرے دن تین بجے نہ پہر دو لاکھ سے زائد عقیدت مندوں نے آہوں اور سسکیوں کے درمیان آپ کو سپرد خاک کر دیا۔ آپ کے وصال پر وطن عزیز کے تمام موقر اخبارات و جرائد نے اپنے اداریوں اور کالموں میں آپ کو زبردست خراج تحسین پیش کیا۔ بعض اخبارات نے خصوصی ضمیمے شائع کر کے شیخ القرآن کی موت کو عالم اسلام کیلئے زبردست نقصان قرار دیا۔ آپ کے وصال سے دنیا علم و حکمت کے ایک ایسے مرکز سے محروم ہو گئی جس کا فیض عام مدتوں اصحاب ایمان کے دلوں کو عشق رسول کی دولت بے بہا عطا کرتا رہا۔

تری یادیں تری باتیں ہمارے دل کی زینت ہیں
ترے افکارِ عالی ہی زمانے بھر کی عظمت ہیں
تری تقریر کیا تھی شوکت احمد کی ضووباری
تری تفسیر کیا تھی سر بسر تھی رحمت باری
تو پاکستان کی تاریخ کا اک رکنِ اعظم تھا
ہمارے واسطے ہر پل مکرم تھا معظم تھا
ترے افکار کی تاثیر سے دل میں اجالا ہے
ترے افکارِ عالی کا ہر اک پہلو نرالا ہے
رضا کے جملہ اساسات تیرے دم سے روشن ہیں
تری باتوں سے بزمِ فکر کے آباد گلشن ہیں



معروف خطیب اور تحریک پاکستان کے ممتاز راہنما

مولانا محمد بخش مسلم رحمۃ اللہ علیہ سے

ایک فکر انگیز انٹرویو

تحریک پاکستان کا تصور ابھرتے ہی ذہن و فکر میں وہ شخصیات سامنے لگتی ہیں جن کے بے مثال جذبہ ایمانی کی بدولت کاروان آزادی منزل مقصود سے ہمکنار ہوا۔ ان محترم شخصیات میں سے ایک اہم نام مولانا محمد بخش مسلم کا ہے جنہوں نے تحریک پاکستان کے انتہائی نازک مراحل میں اپنی فراست، تدبیر و لیاقت اور نظریاتی پاسداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس حقیقت کی تائید کر دی کہ حصول پاکستان کے سلسلہ میں علماء و مشائخ حق کا کردار تاریخ ساز بھی ہے اور قابل صد افتخار بھی۔

مولانا محمد بخش مسلم رحمۃ اللہ علیہ تحریک پاکستان میں اپنے روشن کردار کے علاوہ مسلم مسجد لاہور کے خطیب ہونے کے حوالے سے بھی جانے پہچانے جاتے ہیں۔ مسلم مسجد اتحاد بین المسلمین کی علامت اور مختلف دینی تحریکات کا مرکز رہی ہے۔ آپ اس وقت اپنے کردار اور عمر کی بناء پر پاکستان اور لاہور کی تاریخ کا وہ تابندہ باب بن چکے ہیں جس کا عصری مطالعہ کئے بغیر مقاصد پاکستان سے حقیقی آگاہی ممکن نہیں۔ آپ ۱۸ فروری ۱۸۸۷ء کو لاہور میں جناب میاں پیر بخش کے ہاں پیدا ہوئے۔ قدرت سے ذہن رسا عطا ہوا تھا۔ محلے میں ایک نیک سیدہ خاتون مسماۃ چراغ بی بی سے قرآن پڑھنے جایا کرتے تھے۔ ایک دن ان کے والد اپنے بیٹے کو لینے کیلئے ان کے ہاں پہنچے تو اس خاتون نے کہا کہ میرے پاس پڑھنے والے تمام بچے بچیوں میں سے تمہارا بیٹا سب سے زیادہ ذہین اور لائق ہے اسے ضرور تعلیم دلانا۔ ان کے والد نے ان کی نصیحت کا پاس کیا۔ مولانا محمد بخش مسلم نے میٹرک کے بعد منشی عالم اور پھر منشی فاضل کا امتحان پاس کر کے نمایاں حیثیت سے بی اے کا امتحان پاس کیا اور ملازمت اختیار کر لی۔

آپ ایک نامور خطیب عالم دین اور تحریک پاکستان کے قابل قدر راہنما ہی نہیں بلکہ کامیاب مصنف بھی ہیں۔ آپ نے طبع زاد کتب بھی تصنیف کیں اور تراجم بھی کئے جن پر اصل کا گمان ہوتا ہے۔ آپ کی کتب کی تعداد ساٹھ کے قریب ہے جن میں سے رسول مقبول، بیان الاخلاق، ختم رسالت، مساوات، پیام اسلام، بیت الاسلام، مقروض قوم، آزاد پاکستان، اسلام اور پاکستان، قائد اعظم اور پاکستان، جہاد و وحدت اسلام، برہان القرآن، وحدت اسلام وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

ہم نے سوال کیا ”مولانا! آپ ایک غریب خاندان کے فرد تھے جس کا سب سے بڑا مسئلہ فکر معاش ہے۔ آپ کے اندر یہ تصور کس طور جاگزیں ہوا کہ مجھے خدمت اسلام اور نظریہ پاکستان کی ترویج کیلئے میدان عمل میں آنا چاہیے۔“

مولانا نے فرمایا ”مجھے اپنے افلاس پر فخر ہے۔ میرے پاس کتب خریدنے کیلئے پیسے نہیں تھے۔ سب سے پہلی کتاب جو مجھے والد محترم نے عطا کی وہ روح اسلام تھی۔ ایک بار میں تمام رات جاگ کر مطالعہ کرتا رہا تو صبح والد صاحب نے کہا کہ تم تو تمام شب پڑھتے رہے مگر ہمارا دو پیسے کا تیل ختم ہو گیا۔ اس طرح پڑھتے رہے تو پیسے کہاں سے آئیں گے۔ والد صاحب بھی درست کہتے تھے مگر میرا مطالعہ کا شوق مسلسل جلا پاتا رہا۔ اس دور میں میں نے بیشتر کتب لوگوں سے مانگ کر پڑھیں۔ مجھے یاد ہے کہ ان دنوں تاریخ اسلام اور مذاہب کے تقابلی جائزے میں مصروف تھا کہ اکبر الہ آبادی کا یہ شعر پڑھا:

کیا کہیں احباب کیا کارِ نمایاں کر گئے

بی اے ہوئے نوکر ہوئے پنشن ملی اور مر گئے

یہ شعر میرے دور کے بے عمل مسلمانوں پر بہت گہرا طعن تھا جس کی کاٹ میرے احساسات کو شدید مجروح کر گئی اور میرے اندر کا مسلمان بیدار ہو گیا۔ فوراً تہیہ کر لیا کہ بے مقصد اور رائیگاں زندگی نہیں گزاروں گا اور مقدور بھر خدمت اسلام کا فریضہ انجام دوں گا۔ اس دور میں قادیانیت اور تحریک پاکستان دو ایسے مسائل تھے جن سے کوئی صاحب ایمان بے تعلق نہیں رہ سکتا تھا۔ اس لئے ایمان کے تقاضوں پر لبیک کہتے ہوئے قادیانیت کے استیصال اور نظریہ پاکستان کی تبلیغ و اشاعت کیلئے مصروف عمل ہو گیا چونکہ میں سرکاری ملازم تھا اس لئے حتی المقدور کوشش کیا کرتا تھا کہ قانون کے دائرے میں رہ کر اپنے مقاصد کو انجام دوں۔“

”تحریک پاکستان کے حوالے سے ارشاد فرمائیے کہ وہ کون سا آفاقی جذبہ تھا جو برق کی

صورت میں اصحاب ایمان کے دل و دماغ پر اثر انداز ہو گیا تھا اور جس نے اسلامیان ہند کو یہ احساس بخشا تھا کہ وہ ایک الگ مملکت کیلئے جدوجہد کریں۔ ہم نے سوال کیا۔

مولانا نے فکری توانائیوں کو یکجا کرتے ہوئے جذباتی انہماک سے جواب دیا:

”وہ جذبہ دو قومی نظریہ اسلام کا عطا کردہ تھا۔ یہ وہی دو قومی نظریہ تھا جس نے الگ مسلم قومیت کی بنیاد ڈالی تھی اور حضور محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار مکہ سے جو آپ کے ہم وطن اور رشتہ دار تھے منہ موڑ کر ان مسلمانوں سے قومیت کا رشتہ استوار کیا تھا جو اگرچہ مختلف علاقوں اور قبائل و ممالک سے تعلق رکھتے تھے مگر ان کے دلوں میں لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی عظمت جاگزیں ہو چکی تھی۔ یہیں سے دو قومی نظریہ کو فروغ حاصل ہوا۔ اسلام کے مقابلہ میں کفر ملت واحدہ ہے تو پھر اسلام کے ماننے والے ملت واحدہ کیوں نہیں۔ تحریک آزادی کا رخ تحریک پاکستان کی طرف موڑنے کیلئے سب سے اہم کردار شاعر مشرق حضرت علامہ محمد اقبال کی شاعری اور افکار نے ادا کیا تھا۔ انہوں نے ہمیں باور کرایا تھا کہ:

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر

خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی

اور یہ قوم رسول ہاشمی اس وقت تک اپنی ترکیب میں خاص نہیں ہو سکتی تھی جب تک اس کے اذہان اور قلوب میں عشق رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا جذبہ راسخ نہ ہو جائے۔ مسلمان کے عقیدہ کی معراج ہی عشق رسول ہے۔ اسی لئے تو اقبال کہتے ہیں:

بمصطفیٰ برسائے خویش را کہ دیں ہمہ اوست

اگر باو نہ رسیدی تمام بولہبی است

اقبال کا یہ پیغام دلوں کی دھڑکنوں میں ڈھل گیا اور اسلامیان ہند اپنے دلوں سے محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی شمعیں روشن کرتے ہوئے حصول پاکستان کیلئے سرگرم عمل ہو گئے۔ علماء و مشائخ حق نے اس سلسلہ میں تاریخی کردار ادا کیا اور برصغیر پاک و ہند کے طول و عرض میں نظریہ پاکستان کے پیغام کو عام کرنے لگے۔

”محترم! علمائے حق کے تذکرہ سے یاد آیا، آج یہ حقیقت اپنا وجود منوا چکی ہے کہ تحریک پاکستان کے دوران میں سواد اعظم اہلسنت و جماعت سے تعلق رکھنے والے علماء و مشائخ نے من حیث الجماعت حصول پاکستان کیلئے کام کیا ہے۔ آپ اس بارے میں کیا فرماتے ہیں؟ ہم نے پوچھا۔

”اس بارے میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں کہ پاکستان بنانے میں مشائخ و علمائے اہلسنت نے فی الواقع من حیث الجماعت قائد اعظم محمد علی جناح کا ساتھ دیا ہے۔ تحریک پاکستان کے جس ہنگامہ خیز دور میں دوسرے مکاتب فکر کے علماء اپنے تمام تر علمی مقام کے باوجود گاندھی و نہرو کے متحدہ قومیت کے سحر کے اسیر ہو کر قائد اعظم کو کافر اعظم اور پاکستان کو پلیدستان ثابت کرنے کیلئے مصروف تھے، صرف اور صرف علماء و مشائخ اہلسنت ہی تھے جو اپنے تمام تر لسانی و فکری اور علمی و عملی وسائل بروئے کار لاتے ہوئے نظریہ پاکستان کو اسلامی تعلیمات کی حقیقی روح ثابت کرنے کیلئے میدانِ عمل میں مجاہدانہ کام کر رہے تھے۔ یہ انہی کی کوششوں کا ثمر تھا کہ نہ صرف کانگریس کے ہمنوا علماء کے پروپیگنڈے نے دم توڑ دیا بلکہ اسلامیان ہند ایک نئے جذبے سے سرشار ہو کر پاکستان کے قیام کو تقاضائے ایمانی سمجھنے لگے۔“

”جناب والا! تحریک پاکستان کے دوران میں علمائے حق کی عملی کاوشوں سے آگاہ فرمائیے تاکہ ہمارے قارئین گردشِ ایام کو پھلانگتے ہوئے اس دور کی ایک جھلک دیکھ سکیں؟“۔ ہم نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

مولانا فرمانے لگے ”تحریک پاکستان کے ضمن میں امام اہلسنت حضرت مولانا احمد رضا خاں فاضل بریلوی علیہ الرحمۃ کے نظریات اور افکار کی عظمت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ آپ ہی کے افکار اور تعلیمات کا فیضان تھا کہ علمائے حق بیک زبان مسلم لیگ اور قائد اعظم کے ہمنوا ہو گئے۔ آپ کے صاحبزادگان، خلفاء اور تلامذہ کے علاوہ آپ کے حلقہ اثر سے تعلق رکھنے والے بے شمار اصحابِ علم و فضیلت پاکستان کے پیغام کو عام کرنے کیلئے سرگرم عمل ہو گئے۔“

آل انڈیا سنی کانفرنسیں اس سلسلہ میں بے پناہ مفید ثابت ہوئیں۔ حضرت فاضل بریلوی کے علاوہ آپ کے صاحبزادگان حضرت حامد رضا خاں بریلوی، حضرت مولانا مصطفیٰ رضا خاں بریلوی اور حضرت مولانا نعیم الدین مراد آبادی (رحمۃ اللہ علیہم) کی مساعی قابلِ صد ستائش ہیں۔ دوسرے علماء و مشائخ میں حضرت مولانا عبدالعلیم میرٹھی، حضرت پیر سید جماعت علی شاہ علی پوری، حضرت پیر غلام محی الدین گولڑہ شریف، حضرت پیر خواجہ محمد قمر الدین سیالوی، حضرت مولانا عبدالقدیر بدایونی، حضرت مولانا عبدالحامد بدایونی، حضرت سید محمد محدث کچھوچھوی، پیر صاحب زکوڑی شریف، پیر صاحب مانگی شریف، دیوان صاحب اجمیر شریف، حضرت مولانا عبدالغفور ہزاروی، حضرت مولانا سید محمد ابوالحسنات، حضرت خواجہ پیر حسن نظامی دہلوی، حضرت مولانا سید احمد سعید شاہ کاظمی اور حضرت مولانا

عبدالستار خاں نیازی (رحمۃ اللہ علیہم) خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ یہ تذکرہ فقط ان چند ناموں تک محدود نہیں ہے بلکہ سواد اعظم سے تعلق رکھنے والے تمام مشائخ و علماء اسے کفر و اسلام کی فیصلہ کن جنگ سمجھ کر اسلام اور پاکستان کا ساتھ دے رہے تھے۔

ہم نے اگلا سوال کیا ”محترم آپ کے حوالے سے ہمیں موقع میسر آ رہا ہے کہ تحریک پاکستان پر ایک نظر ڈال سکیں۔ اس دور میں اپنی مصروفیات سے بھی ہمیں آگاہ فرمائیے تاکہ یہ معلومات بھی حوالہ تاریخ بن سکیں؟“۔

مولانا نے کچھ دیر توقف کیا اور اپنی یادوں کے گلستان سے خوشہ چینی کرتے ہوئے کہنے لگے ”انجمن تبلیغ الاسلام چونڈہ کے زیر اہتمام ہر سال بڑے پیمانے پر ختم نبوت کانفرنس ہوا کرتی تھی۔ میں وہاں بطور مقرر کے جایا کرتا تھا۔ اپنی تقاریر میں قادیانیت کے خلاف دلائل دیتا اور پھر آہستہ آہستہ اپنی تقریر کا رخ تحریک پاکستان کی طرف موڑ دیا کرتا، میرا یہ انداز نہایت موثر ہوا کرتا۔ انگریز حکومت عام جلسوں کی اجازت بہت کم دیتی تھی اور پھر میری ملازمت بھی آڑے آئی۔ اس لئے میں میلاد ختم نبوت اور اس نوعیت کی دوسری اسلامی تقریبات میں شریک ہوتا اور اپنی تقریر کو بالترتیب دو قومی نظریہ کی طرف لے آتا۔ میرا یہ انداز اتنا مقبول ہوا کہ لوگ میری تقریر سننے کے مشتاق رہنے لگے۔ ان دنوں بمبئی میں تحریک پاکستان کے مقاصد کیلئے سرگرم شخصیت حاجی محمد یوسف کی ایسے مقررین کی تلاش میں تھے جو پاکستان کے پیغام کو اس علاقہ میں عام کر سکیں۔ انہیں چٹی شیخاں والے مولانا غلام فرید نے مشورہ دیا کہ میں تمہیں ایک ایسے عالم کا نام بتاتا ہوں جو جیل میں بھی نہ جائے اور کام میں بھی کما حقہ انجام دے۔ وہ عالم دین محمد بخش مسلم ہے۔ چنانچہ ان کے مشورہ کے مطابق مجھ سے رابطہ قائم کیا گیا اور میں ۱۹۴۶ء تک کم و بیش ۱۲-۱۵ سال اس تمام علاقہ میں حضرت قائد اعظم اور مسلم لیگ کی آواز کو پہنچاتا رہا۔ ان دنوں بمبئی میں مولانا شاہ احمد نورانی کے سکے تیا مولانا نذیر احمد خجندی ایک جامع مسجد کے خطیب و امام تھے۔

مولانا نذیر احمد خجندی اپنے بھائی مولانا عبدالعلیم میرٹھی کی طرح قیام پاکستان کیلئے انتہائی تنگ و دو کر رہے تھے۔ آپ کو اس علاقہ میں قائد اعظم کا وکیل سمجھا جاتا تھا۔ انتخابات میں آپ قائد اعظم کے پولنگ ایجنٹ ہوا کرتے تھے۔ آپ قائد اعظم کی شخصیت پر اس طور اثر انداز تھے کہ وہ آپ کے ہر مشورے اور رائے کو خلوص دل سے سنا کرتے تھے۔ یہ انہی کا فیضان تھا کہ قائد اعظم جو پہلے آغا خانی اور پھر اثنا عشری شیعہ تھے آہستہ آہستہ سنی اعتقادات کا رنگ قبول کرنے لگے۔ قائد اعظم

عید کی نماز عام مسلمانوں کی طرح ان کے پیچھے پڑھا کرتے تھے۔ بمبئی میں اپنے مقاصد کی ترویج کیلئے مولانا نذیر احمد خجندی کی شخصیت میرے لئے بہت زیادہ معاون و مددگار ثابت ہوئی۔

یادوں کے اہم کے اوراق اٹتے ہوئے مولانا مسلم ذرا دیر کیلئے رکے اور پھر گویا ہوئے۔ بمبئی شہر کے تمام مقامات کے علاوہ صوبہ بمبئی کے تمام قابل ذکر شہروں سے خطاب کرنے کے مواقع بھی مجھے بارہا میسر آئے۔ میں پونا میں جاتا رہا جو اچھوتوں کا مرکز تھا، کلیان میں پنڈتوں کی کانفرنس میں اپنے نصب العین کی ترویج کی۔ آہستہ آہستہ اس تمام علاقہ میں مجھے ترجمانِ پاکستان کا لقب حاصل ہو گیا۔ دراجی کے علاقہ میں اپنے مقصد کی تبلیغ میں نے دل کھول کر کی، اسی طور مجھے کاٹھیا واڑ میں مسلم لیگ کے پیغام کو پہنچانے کا موقع بھی میسر آیا۔ برصغیر میں کاٹھیا واڑ واحد علاقہ تھا جہاں کے مسلمان انتہائی امیر اور ہندو انتہائی غریب تھے۔ قائد اعظم کو مسلم لیگ کے فنڈز کیلئے بیشتر رقوم وہیں سے حاصل ہوتی تھیں، جب قائد اعظم کی سرپرستی میں انگریزی روزنامہ ”ڈان“ جاری ہوا تو قائد اعظم نے مختلف صوبہ جات سے اس کی امداد کی اپیل کی۔ کاٹھیا واڑ کے مسلم عوام سے کہا گیا کہ آپ ڈان اخبار کی امداد کیلئے تین لاکھ روپے جمع کر دیں۔

اس سلسلہ میں راہنماؤں نے قائد اعظم سے عرض کیا کہ آپ چندہ کی اپیل نہ کریں، یہ آپ کے شایان شان نہیں ہے، ہم خود ہی حسب توفیق رقم آپ کی خدمت میں پیش کر دیں گے۔ قائد اعظم مان گئے، جلسہ ختم ہوا تو وہاں کے مسلم عوام کی طرف پانچ لاکھ روپوں کی تھیلی قائد اعظم کی خدمت میں پیش کی گئی۔ قائد اعظم نے تھیلی وصول کرنے سے انکار کر دیا اور کہا ”میں نے آپ سے تین لاکھ طلب کئے تھے، پانچ لاکھ نہیں، دو لاکھ روپے میری اپیل سے زائد ہیں۔ اس لئے آپ واپس لے لیں۔“ مقامی راہنماؤں نے عرض کیا ”قائد اعظم ہم امداد کے نام پر یہ رقم دے چکے ہیں اس لئے ہم دو لاکھ روپیہ واپس لے کر اپنی ذات پر خرچ نہیں کر سکتے۔“

قائد اعظم نے فرمایا ”تو پھر اس رقم کو کسی اور نیک کام میں خرچ کر دو۔“ قائد اعظم کے حکم کی تعمیل میں یہ طے پایا کہ یہ دو لاکھ روپے کی زائد رقم دراجی کی جامع مسجد فاروقیہ کی تعمیر و توسیع پر خرچ کر دی جائے۔ اس واقعہ سے قائد اعظم کی عظمت کردار کا نہایت روشن پہلو ہمارے سامنے آتا ہے اور یہ پتہ چلتا ہے کہ قائد اعظم اپنی قوم سے اتنی ہی قربانی طلب کرتے تھے، جس قدر ضرورت ہوتی تھی۔ قائد اعظم نے دو لاکھ روپے کی زائد رقم لوٹا کر دوسرے قائدین کو جتلا دیا کہ عوام کے روپے کی کیا اہمیت ہوتی ہے اور اس روپے کو تصرف میں لانے کیلئے

کس خلوص نیت اور احساس ذمہ داری کی ضرورت ہوتی ہے۔ قائد اعظم کی سیرت کا یہ تابندہ پہلو آج تک میری یادوں کو منور کئے ہوئے ہے۔ ہم لوگ فخر کیا کرتے تھے کہ ہم قائد اعظم کی عسا کر آزادی کے سپاہی ہیں۔ یہی افتخار آج بھی ہمارا سرمایہ حیات ہے۔ قائد کی عظمت کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے میں یہ بھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ مجھے یہ اعزاز بھی حاصل ہوا کہ مسٹر گاندھی کے آبائی علاقہ میں تقاریر کروں۔ بجز اللہ مجھے وہاں بھی نہایت کامیابی حاصل ہوئی۔ مختلف علاقوں کے انگریز افسران میری گرفتاری کے درپے رہتے تھے مگر ہمیشہ تائید ایزدی آڑے آئی اور میں گرفتاری سے محفوظ رہا۔

ہم نے عرض کیا ”محترم! اب قائد اعظم کی بات چھڑی ہے تو اپنی یادوں کے حوالے سے تاریخ اسلام کے اس بطل جلیل کے بارے میں کچھ ارشاد فرمائیے۔ ان کے مخالفین انہیں امر مرزوم گریز اور سخت مزاج کہا کرتے تھے۔ آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے؟

”قائد اعظم محمد علی جناح جیسی شخصیات بلاشبہ صدیوں بعد جنم لیتی ہیں۔ ان کا وجود تاریخ کے ایوانوں میں اس وقت ابھرتا ہے جب قدرت کو کسی قوم کی بھلائی مقصود ہوتی ہے۔ قائد اعظم علامہ اقبال کے مرد مومن اور اسلامیان ہند کے نجات دہندہ تھے۔ آپ کا کردار بے داغ اور صاف ستھرا تھا۔ آپ کے مخالفین اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود اس صاحب ایمان کے کردار میں معمولی سی خامی بھی تلاش نہ کر سکے۔ قائد اعظم امر نہیں تھے وہ تمام معاملات میں مشورت کے قائل تھے۔ تاہم اتفاق رائے سے جب کوئی فیصلہ کر لیتے تو بڑی سے بڑی طاقت بھی انہیں اس فیصلہ سے انحراف پر مجبور نہیں کر سکتی تھی۔ وہ سخت مزاج تھے تو صرف اصولوں اور نظم و ضبط کے معاملے میں۔ آپ مردم بیزار ہرگز نہیں تھے۔ اگر آپ مردم بیزار ہوتے تو انتہائی پیرانہ سالی اور جسمانی انحطاط کے باوجود کس طرح لاکھوں عوام کے بے شمار اجتماعات سے خطاب کر سکتے تھے۔ آپ بڑے لیڈروں کے پہلو بہ پہلو چھوٹے کارکنوں کا خیال بھی رکھا کرتے تھے جن دنوں پاکستان مخالف علماء قائد اعظم اور پاکستان کی مخالفت میں ہر ممکن ہرزہ سرائی کر رہے تھے اور میں ان کے تمام اعتراضات کے تار و پود بکھیر رہا تھا تو قائد اعظم تک میری مساعی اور کامیاب جدوجہد کی رپورٹ پہنچی۔ میاں فیروز الدین مرحوم نے قائد اعظم کو میری کاوشوں کے بارے میں بتایا تو انہوں نے فرمایا کہ ان پاکستان دشمن مولویوں نے میرا ناک میں دم کر رکھا ہے۔ اب میں خوش ہوں کہ اس نوعیت کے علماء میرے مشن کو آسان تر کر رہے ہیں پھر آپ نے میاں فیروز الدین سے کہا کہ اس آدمی کو میرے پاس لے کر آؤ، میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔ قائد اعظم ان دنوں نواب افتخار حسین ممدوٹ کی کوشی میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ میاں

فیروز الدین نے کہا کہ جناب یہ وہی شخص ہے جسے آپ نے نواب زادہ رشید علی خاں کی کوٹھی پر ملاقات کے لئے پندرہ منٹ دیئے تھے۔ اس پر قائد اعظم کو یاد آ گیا اور آپ نے فرمایا کہ ان جیسے علماء یقیناً تحریک پاکستان کی کامیابی کا باعث بنیں گے۔

اسی طرح ایک بار مسلمانوں کے ایک جلسہ میں دوران تقریر ایک ایسا ریزولیشن پیش کیا گیا جس میں شہریوں کو زیادہ اور زمینداروں کو کم فوائد حاصل ہو رہے تھے۔ اس پر زمینداروں میں بے چینی پیدا ہو گئی میں نے اپنی تقریر میں ثابت کیا کہ اس ریزولیشن سے زمینداروں کو بھی بہت زیادہ فائدہ پہنچے گا۔ حاضرین میرے استدلال سے مطمئن ہوئے اور قائد اعظم نے اس پر مسرت کا اظہار کیا۔

”علامہ محمد اقبال اسلامی نشاۃ ثانیہ کے بہت بڑے علمبردار تھے۔ آپ نے یقیناً اپنی قومی جدوجہد کے دور میں انہیں قریب سے دیکھا ہوگا۔ ان کی محافل میں گئے ہوں گے اور ان کے کلام اور خطبات سے مستفیض ہوئے ہوں گے؟“ ہم نے سوال کیا

”علامہ محمد اقبال شاعر مشرق تھے ترجمان خودی اور محرم اسرار بے خودی تھے۔ آپ کی تمام تعلیمات اور افکار کا محور حضور ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی تھی۔ یہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے عشق ہی کا کمال تھا کہ زمانہ انہیں سلام کرتا تھا میں تو رہنے والا ہی لاہور کا ہوں اس لئے مجھے ان کی خدمت میں حاضری کے متعدد مواقع میسر آئے۔ انہیں اجتماعات سے بھی سنا اور ان کے دولت کدے پر بھی حاضری دی۔ ان کا کلام انہی کا زبانی سنا اور یہ اسی کی تاثیر ہے کہ آج تک اس کلام کی لذت میں کھویا ہوا ہوں۔ ابتداء میں اقبال کے ہاں حاضری دی تو ان کے اصرار کے باوجود دو مرتبہ نیچے بیٹھا لیکن جب تیسری مرتبہ حاضر ہوا تو انہوں نے فرمایا کہ میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ کرسی پر بیٹھو۔ چنانچہ ان کے حکم کی تعمیل میں کرسی پر بیٹھا علامہ اقبال میری سیاسی اور نظریاتی جدوجہد سے بہت خوش تھے جب علامہ اقبال مجلس قانون ساز کے الیکشن میں کھڑے ہوئے تو مجھے ان کی خدمت کا بھرپور موقع میسر آیا۔ انتخاب کی اس مہم کے دوران میں ان کے تمام اشتہارات پوسٹر پمفلٹ اور انتخابی نعرے تک میرے تحریر کردہ تھے میں کوشش کیا کرتا تھا کہ جہاں تک ممکن ہو پس پردہ رہ کر کام کروں۔ علامہ اقبال میرے کام کے انداز سے نہایت مطمئن تھے بلکہ میرا یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ وہ مجھ پر فخر کیا کرتے تھے۔ مجھے ان سے غیر معمولی محبت و عقیدت تھی اگر کبھی اختلاف کرنے کی نوبت آتی تو بڑے پیار سے دوسروں سے فرماتے ”دیکھو یہ میرا چاہنے والا مجھ سے اختلاف کر رہا ہے۔ ابھی مولانا کی گفتگو جاری تھی کہ ہم نے سوال کیا ”مولانا! علامہ اقبال کو نظریہ

پاکستان کا تصور کہاں سے عطا ہوا، نیز یہ بھی فرمائیے کہ پاکستان کا قیام کس طور ناگزیر تھا؟ مولانا مسلم ذرا دیر کو ر کے پھر فرمانے لگے میں انسی موضوع کی طرف آ رہا تھا۔ اقبال کو مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ سے غیر معمولی عقیدت تھی۔ اُن کی اس عقیدت کی بنیاد حضرت مجدد کی وہ مجاہدانہ تگ و تاز تھی جس نے نام نہاد دین اکبری کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا تھا۔ اقبال چونکہ قرآن و احادیث کا گہرا علم رکھتے تھے اور سمجھتے تھے کہ حضرت مجدد علیہ الرحمۃ نے جو کچھ بھی کیا اور کہا ہے اور عین تعلیمات مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق ہے اس لئے اقبال سمجھتے تھے کہ دو قومی نظریہ کی بدولت ہی ہم برصغیر میں احیائے اسلام کا مقدس فریضہ انجام دے سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں اقبال دوسرے صوفیا اور اولیاء سے بھی روحانی ارادت رکھتے تھے اور تمام اولیائے برحق نے ہند میں آ کر اسلامی تشخص کو اُجاگر کیا تھا، اس لئے اقبال کے نزدیک ہماری کامرانی اسی صورت ممکن تھی کہ ہم جداگانہ تشخص کے نام پر علیحدہ اسلامی مملکت تخلیق کریں۔

اور پھر یہ بھی ناقابل تردید حقیقت ہے کہ ہند میں مسلمانوں کی اقتصادی حالت نہایت زبوں اور دردناک تھی اور تاریخ شاہد ہے کہ جب تک کسی قوم کی اقتصادی حالت بہتر نہ ہو وہ شاہراہ حیات پر شایانِ شان سفر نہیں کر سکتی۔ اقبال نے ایک جگہ اسی طرف اشارہ کیا ہے:

”مسلمانوں کی اقتصادی حالت اسلامی ضابطے کے بغیر درست نہیں ہو سکتی اور اسلامی ضابطہ مسلم حکومت کے قیام کے بغیر نافذ نہیں ہو سکتا۔“

اتنے بڑے مفکر کی یہ بات جب میں نے پہلی بار سنی تو مجھے اپنی وہ سوچ یاد آ گئی جس کی بدولت میں نے متعدد کتب بھی تصنیف کی تھیں اور اپنے خطبات میں اس امر کو عام بھی کیا تھا کہ جب تک مسلمان اقتصادی لحاظ سے سر بلند نہ ہوں گے۔ وہ دوسری اقوام کے شانہ بشانہ نہیں چل سکیں گے۔ اقبال اور قائد اعظم نے ہمیں عملی صورت دکھائی کہ پاکستان کے نام پر علیحدہ مملکت حاصل کر کے ہی ہم مسلمانوں کی اقتصادی حالت کو درست کر سکتے ہیں۔ وقت نے ان کے فیصلے کو درست ثابت کر دیا کہ انگریز یا ہندو سامراج کے زیر تسلط رہ کر ہم خوشحال مسلم معاشرہ کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ انگریز کی مسلم دشمنی اور ہندو کے غیر معمولی تعصب نے ہماری جدوجہد کو تیز سے تیز تر کر دیا اور ہمارے قدم ثابت قدمی کے ساتھ منزل پاکستان کی جانب اُٹھتے چلے گئے۔ ہم اپنی تقاریر میں علی الاعلان کہا کرتے تھے کہ ”پاکستان کیلئے فقط اس لئے کام نہیں کر رہے کہ اس کا تصور اقبال نے دیا ہے یا قائد اعظم ہمارے راہنما ہیں بلکہ ہم تو اس لئے میدانِ عمل میں آئے ہیں کہ پاکستان کا قیام

قرآن اور احادیث سے ثابت ہے۔ میں چار امور کی سند پیش کیا کرتا تھا۔ قرآن حدیث صحابی کا قول اور حضرت امام اعظم ابوحنیفہ کی دلیل۔ علامہ اقبال بھی اسی خیال سے اتفاق فرمایا کرتے تھے کہ ان سے ہٹ کر ہماری قومی سیاسی اور دینی فوز و فلاح ممکن ہی نہیں۔

ہم نے عرض کیا ”حضرت! آپ نے ابتداء میں قادیانیت کے تعاقب کا تذکرہ کیا ہے کچھ اس پر بھی روشنی ڈالئے؟“

مولانا کہنے لگے ”آج تو خیر قادیانیوں کو اقلیت قرار دیا جا چکا ہے لیکن تقسیم برصغیر سے قبل انہیں اس وقت کے حکمرانوں کی پوری پوری سرپرستی حاصل تھی۔ خراج عقیدت کے مستحق ہیں وہ علماء و مشائخ جنہوں نے انتہائی نامساعد حالات میں بھی ان کا احتساب جاری رکھا، میں کتابیں خرید نہیں سکتا تھا اور مانگ کر پڑھا کرتا تھا، جب میں مناظرہ کرتا تو مخالف فریق کو زیچ کر دیتا لیکن جب کتابوں سے حوالے دکھانے کی ضرورت پیش آتی تو کتابیں میرے پاس نہیں ہوا کرتی تھیں۔ چنانچہ کتابیں منگوانی جاتیں اور میں میدان جیت جاتا۔ لوگ حیران ہوتے کہ یہ کیسا حیرت انگیز عالم ہے کہ کتابیں اس کے پاس نہیں ہیں مگر اس کے تمام حوالے درست اور تمام دلائل برحق ہوتے ہیں۔ ختم نبوت کے سلسلہ میں میرا انجمن تبلیغ الاسلام چونڈہ کے اجتماعات میں مسلسل جانا ہو گیا اور پھر تو زمانہ شاہد ہے۔

ع..... عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں

ملازمت کے دوران میں بااثر قادیانی میرے درپے آزار رہتے تھے۔ ترغیب و تحریص غرضیکہ ہر طریق سے مجھے خریدنے یا خاموش کرنے کی کوشش کی گئی لیکن یہ تو عشق محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا نشہ تھا، جسے دنیا کی کوئی ترشی اتار نہیں سکتی تھی۔ مشہور قادیانی راہنما سر ظفر اللہ خاں نے جو میری اقتصادی زبوں حالی سے آگاہ اور میری تبلیغ سے سخت نالاں تھے۔ بارہا مجھے کیا ”مولوی صاحب آپ یہاں کیا کر رہے ہیں ہم آپ کو لندن بھجوادیتے ہیں۔ شیخ اعجاز احمد (برادر زادہ اقبال) نے بھی کئی بار ایسی ہی خواہشات کا اظہار کیا لیکن میں نے اپنے موقف سے دستبردار ہونا قبول نہ کیا اور ایسی ہر ایک پیشکش کو ٹھکرا دیا جو مجھے مصلحت کا اسیر کر کے عشق رسالت مآب کے تقاضوں سے غافل کر سکتی تھی۔

ہم نے دریافت کیا ”ایک عالم دین، خطیب اور ادیب ہونے کے علاوہ آپ صحافت سے بھی متعلق رہے تھے اور شاعری بھی فرماتے رہے ہیں۔ اس میں کس حد تک صداقت ہے؟“
مولانا فرمانے لگے ”آپ کی دونوں باتیں درست ہیں۔ مجھے صحافت سے متعلق رہنے کا

اعزاز بھی حاصل ہے اور شاعری بھی کی ہے۔ سید حبیب کے روزنامہ ”سیاست“ میں پانچ برس تک اسٹنٹ ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کرتا رہا ہوں۔ اتنا ہی عرصہ روزنامہ زمیندار میں بھی کام کیا ہے۔ ملازمت بھی جاری رکھی اور کام بھی کرتا رہا، خضر حیات کی وزارت اعلیٰ کے دوران میں میں روزنامہ زمیندار میں تھا۔ خضر حکومت نے مجھے قید کر لیا اور پھر کہا گیا کہ اگر توبہ کر لیں تو ہم رہا کر دیں گے لیکن میں تو معذرت کی بابت سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ بہر حال یہ وقت بھی بیت گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اسلامیان ہند لیلائے آزادی سے ہمکنار ہو گئے۔ شاعری کے ضمن میں میں وجاہت حسین جھنجانوی سے باقاعدہ اصلاح لیا کرتا تھا اور انہیں اپنا استاد کہا کرتا تھا، وجاہت حسین مرزا داغ دہلوی کے معروف تلامذہ میں سے تھے۔

”مولانا! تحریک پاکستان کے حوالے سے تو بہت باتیں ہو چکیں، یہ فرمائیے قائد اعظم اور علامہ اقبال کس قسم کا پاکستان چاہتے تھے۔ آج بعض نام نہاد دانشور دعویٰ کر رہے ہیں کہ قائد اعظم پاکستان کو سیکولر سٹیٹ بنانا چاہتے تھے؟“

ہم نے سوال کیا۔

مولانا کہنے لگے ”اس پروپینڈا میں کوئی حقیقت نہیں کہ قائد اعظم پاکستان کو سیکولر سٹیٹ بنانا چاہتے یا علامہ اقبال لادینیت پسند ہے۔ کسی بھی شخص کی حقیقی تصویر اس کے افکار، تعلیمات اور کردار ہی میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔ علامہ اقبال کی تو شاعری ہی عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور عظمت اسلام سے عبارت ہے۔ دو قومی نظریہ کا تصور ہی عین اسلام ہے۔ قائد اعظم نے بارہا یہ اعلان فرمایا تھا کہ پاکستان میں قرآن اور اسلام کو بالادستی حاصل ہوگی۔ ایک بار انہوں نے یہاں تک فرما دیا تھا کہ میں کون ہوتا ہوں، پاکستان کا آئین بنانے والا، پاکستان کا آئین تو چودہ صدیوں قبل ترتیب پا چکا ہے۔ سیکولر اسٹیٹ بنانے کی الزام تراشی دراصل وہ لوگ کر رہے ہیں جنہوں نے پاکستان کو دل سے نہیں بلکہ صرف مصلحت کے تحت قبول کیا تھا۔ ان کی نظریں کبھی ماسکو کی طرف اٹھتی ہیں اور کبھی نئی دہلی کی طرف۔ ان کی عقل و دانش مارکس اور لینن کی فلاسفی کی اسیر ہے۔ یہ صرف اور صرف اسلام ہی ہے جو پاکستان اور اس کے عوام کی حقیقی ترقی کی بنیاد بن سکتا ہے۔

ہم جب مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے تو عصر ہونے کو تھی، انٹرویو پچھل کر گئی گھنٹوں پر محیط ہو چکا تھا۔ داستان شوق و راز تھی، ہوش کا کس کو یارا تھا، ماضی کے اوراق اُلٹے جا رہے ہوں تو حال کی رفتار تھمنے لگتی ہے، رات کی تاریکیاں ماحول کو اپنی لپیٹ میں لے رہی تھیں لیکن مولانا محمد بخش

مسلم نے تحریک پاکستان اور عظمت اسلام کے حوالے سے جو کرنیں لٹائیں تھیں وہ مسلسل فکر و نظر کو اُجالا بخشنے کا اہتمام کر رہی تھیں۔ اس طویل انٹرویو کے دوران میں مولانا کے کتنے ہی ملاقاتی آئے مگر مولانا ہماری وجہ سے انہیں ٹالتے رہے۔ مولانا پر خدائے تعالیٰ کا یہ بہت بڑا انعام ہے کہ اس پیرانہ سالی میں ان کی ایمانی بصیرت کے علاوہ بصارت بھی سلامت ہے اور سماعت بھی۔ ان کا حافظہ اس قدر تیز اور یادداشت اس قدر بر محل ہے کہ بات چھڑتے ہی احساس ہونے لگتا ہے کہ

ع..... میں گلستاں میں گیا گویا دبستاں کھل گیا

ہم نے آخر میں مولانا سے عرض کیا کہ وہ ”ضیائے حرم“ کی وساطت سے مہمان ملک و ملت کے نام کیا پیغام دینا چاہتے ہیں تو انہوں نے کہا ”میرا پیغام فقط یہی ہے کہ اسلام کو دلوں میں راسخ کیجئے اور مسلمان کہلائے۔ ایسا مسلمان جو شانِ توحید کا علمبردار ہو اور عظمت و شانِ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا فدائی بھی۔ ایک قابل فخر مسلمان بن کر ہی ہم اسلام اور پاکستان کی حقیقی معنوں میں خدمت کا حق ادا کر سکتے ہیں۔“

اس کے ساتھ ہی ہم نے مولانا کا شکریہ ادا کیا اور ان کی تاریخ ساز یادوں کو قرطاس و قلم کی زینت بنانے کیلئے اُن سے رخصت کی اجازت طلب کی۔

نوٹ: جب ہم نے مولانا محمد بخش مسلم سے انٹرویو کیا تو اس وقت ان کی عمر سو سال سے تجاوز کر چکی تھی اور اس کے کچھ ہی عرصہ بعد آپ کا انتقال ہو گیا۔ یہ تاریخی انٹرویو ماہنامہ ”ضیائے حرم“ لاہور (بھیرہ شریف) میں شائع ہوا تھا۔



وادی نور کا مسافر

ضیاء الامت حضرت جسٹس پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ

(یہ مضمون آپ کی شہرہ آفاق تصنیف ”ضیاء النبی“ کی تعارفی تقریب میں پڑھا گیا)

زمانہ ماہ و سال کی گردش کے جال بنتا ہے۔ کاروان حیات ہر سنگ میل کو ٹھکراتا ہوا منزل ابد کی جانب رواں دواں رہتا ہے۔ زندگی لمحوں کے بطن سے مہینوں، سالوں اور صدیوں کے پیکر تراشتی ہوئی پائندگی کی تلاش میں سرگرداں رہتی ہے۔ تاریخ کی اوٹ سے جھانکتا ہوا وقت کا گراں پیکر پہیہ مسلسل حرکت کرتا ہوا لیل و نہار کی مسافت جاری رکھتا ہے۔ فطرت کا یہ تمام تر عمل کسی ایسے دانائے روزگار کی تلاش کیلئے ہے جو اپنے نقوشِ عمل سے سفر حیات کے ہر سنگ میل کو منزل ایمان کا حسن عطا کر سکے۔ ضیاء الامت حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ کا وجود بھی ایک ایسے ہی دانائے حیات کی حیثیت رکھتا ہے جس نے پامردی سے آگے بڑھتے ہوئے پیچھے مڑ کر دیکھنا نہیں سیکھا بلکہ جس کی کبند شوقِ علوم فطرت کی انتہائی سر بلندیوں کو ٹنچیر بنانے کی آرزو رہتی ہے کہ:

ع..... یزداں بکند آوراے ہمت مردانہ

حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ ایک نام ایک تابندہ حقیقت، ایک نام ابدی سچائی، ایک نام رشد و ہدایت کا روشن استعاراً، ایک نام جمالِ تحریر اور کمالِ تقریر کی آبرو، ایک نام تحقیق و جستجو کے نام پر ازلی حقائق کیلئے محو آرزو۔ ایک فرد تنہا اپنی ذات میں انجمن کی شان لئے ہوئے، فرد یکتا فکری و نظریاتی کوہِ پیائی کی آن لئے ہوئے، خطیب و لہذا، یزداں و انشاء کا مہکتا ہوا گلستان لئے ہوئے، رہبر طریقت کہ سلوک و معرفت کی پہچان لئے ہوئے، صاحبِ اسلوب ادیب کہ جس کا قلم تحقیق کے جواہر لٹانا جانتا ہو، مفسر قرآن کہ جو معارف قرآن کی رفعتوں کو پہچانتا ہو، رہبر بے مثال کہ جو راہِ تحقیق میں منزل کو بھی نشانِ منزل مانتا ہو، جس کی نوکِ قلم کہت ہی کہت، جس کی فکر سر بلند

ثنائے رسول کیلئے مدحت ہی مدحت، جو گفتگو ہو تو مدحت مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پھول جھڑیں، جو جلوہ آرائے خطابت ہو تو اسرار حیات کے ساز چھڑیں۔

جس کے لفظوں میں بیان کی قدرت، جس کے تکلم میں تاثیر کی قدرت

ہاں وہ یعنی ضیاء الامت ضیاء الامت

زفرق تابہ قدم ہر کجا کہ می نگرم

کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجا ست

آج جسٹس پیر محمد کرم شاہ الازہری کا نام ایک تابندہ روایت میں ڈھل چکا ہے۔ ضیاء القرآن کی صورت میں یگانہ روزگار تفسیر قرآن سے لے کر ”ضیاء النبی“ کے نام سے پیش کی جانے والی سیرت رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم تک پیر محمد کرم شاہ الازہری نے علم و عرفان اور تبلیغ دین کا جو سفر طے کیا ہے وہ بہار آفریں بھی ہے اور فکر انگیز بھی۔ ”ضیاء القرآن“ کی مقبولیت کے بارے میں یہی کہہ دینا کافی ہے کہ یہ اہل ایمان کے قلوب کی زینت بن چکی ہے۔

امام احمد رضا خاں فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے ”کنز الایمان“ کے بعد ایک عرصہ تک عشاق سرور کونین کو جس فکری تہی سامانی کا شکار ہونا پڑا، ضیاء القرآن نے اسے علوم معارف قرآن کے حوالے سے ایمان و یقین کی بہار ابد قرار میں بدل دیا ہے۔

تفسیر ”ضیاء القرآن“ نے ضیاء الامت کو مفسرین عالم کی صف اول میں لا کھڑا کیا ہے۔ اطراف و اکناف عالم میں اس کی خوشبو پھیلتی چلی گئی۔ اصحاب شوق ایک مدت سے تفسیر ”ضیاء القرآن“ کی فکری موٹھکافیوں میں کھو کر اس تھیر آفریں شخصیت کو خراج عقیدت پیش کرنے میں ابھی محو ہی تھے کہ آفتق ادب سے سیرت سلطان دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی تب و تاب لئے ہوئے ایک مہر منور طلوع ہوا، اس مہر منور کا نام ”ضیاء النبی“ تھا اور اس مہر منور کے طلوع کے پیش منظر میں کوہ فاران کی بلندیوں سے ابھرنے والے آفتاب عالم تاب صلی اللہ علیہ وسلم کی لازوال محبت کی جگمگاہٹیں جلوہ گر تھیں۔

”ضیاء النبی“ جناب ضیاء الامت کا دوسرا بڑا کارنامہ۔ حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ کی خوش بختیاں کس قدر ضیائیں شامل ہیں۔ ضیاء القرآن پہلی کیشنز، تفسیر ضیاء القرآن، ضیاء النبی، ماہنامہ ضیاء حرم اور ان کے پس پردہ خود میرے ممدوح ضیاء الامت اسلامیہ۔ معلوم نہیں ابھی اور کتنی ضیاء باریاں دور مستقبل کے حوالے سے امت اسلام کا مقدر بنیں گی۔

اسلام کی ضیا ترا جب کہ خطاب ہو

ایسا کہاں سے لاؤں جو تیرا جواب ہو

اس وقت ہمارے زیر تبصرہ سیرت مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے پیر محمد کرم شاہ الازہری کی رقم کردہ ”ضیاء النبی“ ہے جس کی تین جلدیں (اب سات ضخیم جلدیں) منظر عام پر آچکی ہیں۔ یہ تین جلدیں ولادت حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پیشتر کی شب و بچور سے لے کر ولادت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صبح نور تک اور ہجرت سلطان دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر غزوة اُحد تک محیط ہیں۔

عربی اور پھر فارسی میں سیرت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے بہت کچھ لکھا گیا۔ یہ تو ”ورفعنا لك ذكرك“ کا زمزمہ قدسی ہے جو سماعتوں اور بصارتوں کا اعزاز بن کر ہر عہد کے اصحاب تحقیق سے عظمت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خراج لیتا رہا ہے۔ اردو ادب میں فضائل و کمالات رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حوالے سے بہت کچھ لکھا ہے لیکن اس ضمن میں یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ سیرت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مروجہ اسالیب کے حوالے سے بہت کم کتب دستیاب ہیں۔ اس وقت جو تذکار سیرت دستیاب ہیں وہ کچھ یوں ہیں:

رحمۃ للعالمین:- از: قاضی محمد سلیمان منصور پوری

سیرت النبی: از: شبلی نعمانی و سید سلیمان ندوی

سیرت رسول عربی: از نور بخش توکلی

سیرت المصطفیٰ: از: محمد ادریس کاندھلوی

ہم نے صرف طبع زاد کتب سیرت کی بات کی ہے۔ تراجم یا فضائل و مناقب کے حوالے سے تعداد کتب کے بیش بہا سرمایہ کا تذکرہ نہیں کیا۔ ان کتب سیرت کے درمیان سے ”ضیاء النبی“ کا علمی و تحقیقی انفرادیت کے ساتھ منصفہ شہود پر ابھرنا ایک کارِ عظیم ہے جسے پیر محمد کرم شاہ الازہری جیسی تابغہ روزگار شخصیت ہی انجام دے سکتی تھی۔

پیر صاحب شبلی نعمانی کی طرح ”خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا“ کہہ کر اواخر عمر میں سیرت نگاری کی وادی نور میں داخل نہیں ہوئے بلکہ ان کی نثر نگاری کا آغاز ہی شانے مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوا تھا اور یہ بھی:

ع..... نصف صدی کا قصہ ہے دو چار برس کی بات نہیں

اپنی طویل علمی ریاضت، تحقیقی لگن اور مطالعہ کی بناء پر اس حقیقت کا بلا خوف تردید اعلان

کرنا تحدیثِ نعمت سمجھتا ہوں کہ ”ضیاء النبی“ کی تصنیف و تکمیل کے بعد پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ عصر حاضر کی واحد شخصیت ہیں جو بیک وقت مفسر قرآن بھی ہیں اور سیرت نگار رسول بھی۔ تفسیر قرآن اور سیرت نگاری کیلئے الگ الگ اسلوب اور پیمانے ہوتے ہیں۔ تفسیر قرآن جلالتِ خداوندی کے احسان سے لرزیدہ کر دیتی ہے تو سیرت نگاری کا احساس و فورِ شوق کے چشمہ نور میں غوطہ زن ہونے کا ادراک عطا کرتا ہے۔ اسلوب جدا جدا ہیں تو اندازِ نگارش بھی جدا جدا۔ یہی وجہ ہے کہ نامور مفسرین جب تفسیر قرآن سے عہدہ برآ ہوئے تو پھر معارفِ قرآن ہی میں گم ہو کر رہ گئے اور جنہیں سیرت نگاری کی سعادت عطا ہوئی وہ زندگی بھر اسی قلزمِ نور کے غواص بنے رہے۔ مگر ہاشمی خاندان کے مقدس لہو کو رنگوں میں موجزن رکھنے والے

..... پیر محمد کرم شاہ الازہری!

آپ تو روحِ عصر بن کر جگمگا رہے ہیں کہ آپ مفسر بھی ہیں اور سیرت نگار بھی۔ آپ مدبر بھی ہیں اور لوح و قلم کا افتخار بھی۔ آپ محقق بھی ہیں اور ادب و انشاء کا وقار بھی۔ نامور مؤرخ بھی ہیں اور ظلماتِ وقت میں آگہی کا روشن مینار بھی۔ لفظوں کے جوہری بھی ہیں اور سراسر شوکتِ اظہار بھی۔

تو مفسر تو محدث اور تو سیرت نگار
اہلِ حق کے واسطے تو رحمت پروردگار
ہے تو وہ دانائے فطرت جس کی خاطر بالیقین
بزمِ ہستی مدتوں رہتی ہے محوِ انتظار
(رضا)

ضیاء النبی کی پہلی جلد کا عنوان ”شب و بجز“ ہے جس میں سلطانِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت مقدسہ سے قبل اقوامِ عالم کی نام نہاد تہذیبوں پر روشنی ڈالی گئی ہے یہ جملہ انتہائی محققانہ ہے کہ ذہن بار بار ہزاروں سال پہلے کے ظلمتِ کدوں میں بھٹکنے لگتا ہے جہاں شمعِ مصطفوی کے اُجالے بکھرنے کو تھے۔ دوسری جلد ”صبحِ نور“ ہے۔ اس میں تحقیق اور تلاشِ حق کو خضرِ راہ بنا کر عشق و عقیدت کا راہوار منزلِ ایمان کی جانب جاہ پیا نظر آتا ہے۔ تیسری جلد ہجرت سے لے کر غزوہٴ احد کی تاریخ ساز ساعتوں تک کا احاطہ کرتی ہے۔ اور ابھی قاری کا ذہن تیسری جلد کے اختتام پر پہنچ کر آگے بڑھنے کیلئے پر تزلزل رہا ہوتا ہے کہ اسے یکبارگی رُک جانا پڑتا ہے اور وہ اقبال کے اس شعر کو وسیلہٴ اظہار بنا کر مستقبل میں زیورِ اشاعت سے آراستہ ہونے والی جلدوں کیلئے سراپا دعا ہو جاتا ہے

کہ:

ہر لحظہ نیا طور نئی برقی تجلی
اللہ کرے مرحلہ شوق نہ ہو طے

ضیاء النبی

بلاشبہ مرحلہ ہائے شوق کو سر کرنے کی داستان ایمان آفریں ہے۔ اس مرحلہ شوق سے گزرتے ہوئے ہمارے ممدوح پیر صاحب خدا کے حضور کس طرح حسن طلب کی چاندنی بکھیرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

”الہی جوشان، جو فضل و کمال، جو حسن و جمال، جو صوری محاسن اور معنوی خوبیاں تو نے اپنے حبیب مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا فرمائی ہیں ان کا صحیح عرفان اور پہچان بھی نصیب فرما اور ان کو اس طرح بیان کرنے کی توفیق مرحمت فرما، جس کے مطالعہ سے تاریک دل روشن ہو جائیں، مردہ روحیں زندہ ہو جائیں، ذوق و شوق کی دنیا آباد ہو جائے، جہاں غفلت کی تاریکیاں پھیلی ہوئی ہیں وہاں تیرے ذکر پاک اور تیرے محبوب مکرم کی مبارک یاد کی قدیلیں فروزاں ہو جائیں۔“

ضیاء النبی

محبت رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کا گل کدہ ہے جس کا ہر پھول عطر پیز ہے تو ہر کلی عنبر فشاں۔ ہر جملہ مہکبار ہے تو ہر لفظ جان بہار۔ دیگر کتب سیرت کی نسبت اس کو کئی انفرادیتیں حاصل ہیں۔ ولادت حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کے دور ظلمات کا تفصیلی جائزہ ولادت مصطفوی کا ذکر کرتے ہوئے خاتمہ عنبر فشاں کی جولانیاں، یوم ولادت حضور صلی اللہ علیہ وسلم ۱۲ ربیع الاول کا تفصیلی اور تحقیقی جائزہ جو قول فیصل کی حیثیت رکھتا ہے۔ میلاد کی محافل کے انعقاد کے بارے میں بعض مدعیان علم و دانش کی غلط اندیشیوں کا مدلل جواب، عظمت و شان حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے معترضین اور گستاخان بارگاہ نبوت کے اعتراضات کا قرآن و احادیث کی روشنی میں جواب، عشاق سرور کوئین کا ذکر حسین کہ جس کے مطالعہ سے روح فکر کو بالیدگی عطا ہو۔

فاضل مصنف ایک عظیم محقق ہی نہیں بلکہ بہت بڑے انشاء پرداز اور قابل فخر محبت رسول بھی ہیں۔ انہوں نے تحقیق انشاء اعلیٰ اور عشق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پھولوں کو جن کر ”ضیاء النبی“ کی صورت میں جو گلدستہ بارگاہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں نذر کیا ہے، اس کی بدولت پیر محمد کرم

شاہ الازہری بلاشبہ شہرت عام بقائے دوام کے حق دار قرار پائیں گے۔
تحقیقی و جستجو کی خاردار وادیوں سے گزرتے ہوئے ادب عالیہ کے شہ پارے تخلیق کرنا پیر
صاحب ہی کا اعزاز ہے۔ میں ضیاء النبی کو پیر صاحب کے معجز نگار قلم سے پھوٹنے والے خورشید تازہ
سے تعبیر کرتا ہوں۔ وہ خورشید تازہ کہ جس کی ہر شعاع و لٹمس و طہ کی تابانیاں لئے ہوئے ہے۔
میری دعا ہے کہ ضیاء الامت کا قلم تاریخ و تحقیق کے پیرائے میں سیرت حضور صلی اللہ علیہ
وسلم کے ایوان نور میں یونہی روشنی بکھیرتا رہے۔

خدائے کریم اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلہ سے ہماری دعاؤں کے نام پر خصوصاً
ضیاء الامت کو صحت کاملہ فرصت اور سازگاری حالات سے نوازتا رہے تاکہ ہم سے خستہ سامانوں کو
وادی نور کے اس مسافر کا اثاثہ فکر و قلم میسر آتا رہے۔ ضیاء النبی کی عظمتوں کے حضور اپنی کوتاہ نظری
اور فکر محدود کا اعتراف کرنے کیلئے پھر علامہ محمد اقبال کا سہارا مستعار لوں گا کہ:
سنائی کے ادب سے میں نے غواصی نہ کی ورنہ
ابھی اس بحر میں باقی ہیں لاکھوں لولوئے لالہ

نوٹ: درج ذیل مضمون اس وقت رقم کیا گیا تھا جب حضرت ضیاء الامت بقید حیات تھے۔ ”ضیاء
النبی“ سات تحقیقی جلدوں پر محیط ہے۔ ”مخیم جلدیں آپ کی زندگی میں اور آخری دو جلدیں (جنہیں
آپ ترتیب دے گئے تھے) آپ کے وصال کے بعد منظر عام پر آئی تھیں۔ ہمارا یہ مضمون اگرچہ
ابتدائی تین جلدوں کا جائزہ ہے مگر غور کیا جائے تو اس میں ”ضیاء النبی“ کی تمام جلدوں کے ایمان
افروز نقوش جلوہ گر ملتے ہیں۔

یہ تمام جلدیں حیات و سیرت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر انتہائی قابل قدر انسائیکلو پیڈیا کی
حیثیت رکھتی ہیں۔ جب تک بزم ہستی اپنے وجود کا احساس دلاتی رہے گی ”ضیاء النبی“ کی تحقیقی و
نظریاتی جگمگاہٹ اہل ایمان کیلئے نشان منزل بنی رہے گی۔ آج اگرچہ ضیاء الامت حضرت پیر کرم
شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ اپنے ظاہری وجود کے ساتھ ہمارے درمیان جلوہ آرا نہیں ہیں۔ ”ضیاء
القرآن“ اور ”ضیاء النبی“ کا فکری اور معنوی حسن آپ کے وجود کا بدستور احساس دلاتا رہے گا۔

خدا کی رحمتیں نازل ہوں اس دانائے یکتا پر
قلم کی عظمتیں جس کی سدا دیکھیں گے جلوہ گر

قائد ملت اسلامیہ

حضرت مولانا شاہ احمد نورانی صدیقی رحمۃ اللہ علیہ

بہت سی شخصیات زمانے کے معیار پر پورا اُترنے کی دُھن میں عمر گزار دیتی ہیں مگر بعض ایسے خوش بخت نفوس بھی ہوتے ہیں جن کے فکر و عمل کی بلندی اور سیرت و کردار سے زمانے کا تعین ہوتا ہے۔ ممتاز اسلامی مفکر، عالمی مبلغ اور تحریکات اسلامی کے رکن رکین علامہ شاہ احمد نورانی (رحمۃ اللہ علیہ) کا شمار ان انسانوں میں ہوتا ہے جو حالات کی گردشوں کے سامنے سینہ سپر ہو کر حاصل انتخاب بن جاتے ہیں۔ علامہ نورانی نے اپنی صداقت شعاری، حق گوئی و بے باکی، حسن قیادت، پاسداری ناموس رسالت اور دو قومی نظریہ کی سرفرازی کے حوالے سے وقت کی رہ گزار پر ایسے انمٹ نقوش ثبت کئے جو مدتوں ان کی عظمت کا احساس دلاتے رہیں گے۔

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

حضرت شاہ احمد نورانی نے ۱۹۲۶ء میں میرٹھ میں ایک ایسے عظیم گھرانے میں آنکھ کھولی جہاں عظمت اسلام کی خوشبو رچی ہوئی تھی۔ محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سرچشمے پھوٹ رہے تھے۔ تبلیغ اسلام کا بے کراں جذبہ اپنی بہار دکھا رہا تھا۔ آپ کے والد گرامی عظیم مبلغ اسلام علامہ شاہ عبدالعلیم میرٹھی رحمۃ اللہ علیہ کی تبلیغی مساعی سے متعدد ممالک میں ساٹھ ہزار سے زائد غیر مسلموں کو دولت اسلام عطا ہو چکی تھی۔ شاہ عبدالعلیم میرٹھی کو دو قومی نظریہ کے عظیم داعی امام احمد رضا خان محدث بریلوی رحمۃ اللہ علیہ سے خلافت عطا ہوئی تھی۔ تحریکات اسلامی میں حصہ لیتے لیتے آپ مسلم لیگ اور قائد اعظم کے اس قدر قریب آ گئے کہ قائد اعظم محمد علی جناح نے آپ کو قیام پاکستان سے قبل کے مشکل ادوار میں اسلامی ممالک میں پاکستان کا غیر سرکاری ترجمان اور سفیر مقرر کر دیا۔ شاہ عبدالعلیم میرٹھی رحمۃ اللہ علیہ تازیت تبلیغ اسلام کے ساتھ ساتھ تبلیغ پیغام پاکستان کا فریضہ بھی انجام دیتے رہے۔ آپ کی جلیل القدر شخصیت کی نظریاتی کاوشوں کا اعتراف قائد اعظم اور مسلم لیگ کے تمام زعماء کو تھا۔

تمام زعماء کو تھا۔

شاہ احمد نورانی رحمۃ اللہ علیہ نے ایسے ایمان آفریں ماحول میں جنم لیا تو والد گرامی آئیڈیل کی صورت میں سامنے نظر آئے، انہوں نے بھی تبلیغ اسلام، دو قومی نظریہ کی ترویج اور عشق مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء کی مہک کو چار سو عام کرنے کا فریضہ سنبھال لیا۔ بچپن ہی میں حفظ قرآن کا شرف حاصل کیا۔ پھر دینی اور دنیاوی علوم کی طرف متوجہ ہوئے۔ نیشنل عربک کالج میرٹھ سے گریجویشن کی ڈگری حاصل کی۔ الہ آباد اور میرٹھ کی دینی درسگاہوں سے علوم دینیہ کی تکمیل کی۔ اس دوران میں چاروں طرف مسلم لیگ اور پاکستان کے نعرے گونج رہے تھے۔ مسلم لیگ سے فکری یکجہتی کی بناء پر اس کے پیغام کو لے کر چلے۔ پاکستان کا وجود ان کے خوابوں کی تعبیر تھا۔ اس لئے تعلیمی امور سے نمٹتے ہی پاکستان کے قیام کیلئے سرگرم قوتوں کے ہمنوا بن گئے۔ ۱۹۴۶ء میں قیام پاکستان کے حوالے سے بنارس میں منعقد ہونے والی آل انڈیا سنی کانفرنس میں شرکت کی۔

آپ جانتے تھے کہ تبلیغ دین کا فریضہ مختلف زبانوں پر عبور حاصل کئے بغیر صحیح معنوں میں ادا نہیں ہو سکتا۔ آپ نے سترہ زبانوں پر عبور حاصل کیا، جن میں اردو اور فارسی کے علاوہ عربی، انگریزی، جرمن، سواحلی زبانیں خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ آپ قیام پاکستان کے بعد کراچی میں مقیم ہوئے اور تبلیغی سرگرمیوں میں مصروف ہو گئے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق آپ نے ڈیڑھ لاکھ سے زیادہ غیر مسلموں کو مشرف بہ اسلام کیا۔ ”ورلڈ اسلامک مشن“ کا قیام آپ کا تاریخی کارنامہ ہے۔ اس بین الاقوامی تبلیغی ادارہ کی شاخیں متعدد ملکوں میں کام کر رہی ہیں۔

علامہ نورانی کثیر الصفات شخصیت تھے۔ آپ نے پہلی مرتبہ نو سال کی عمر میں مصطفیٰ سنایا اور تمام زندگی کراچی میں قرآن سناتے رہے۔ آپ وصال تک ستر مرتبہ رمضان المبارک میں قرآن حکیم سنانے کی سعادت حاصل کر چکے تھے۔ ہر سال رمضان المبارک میں نماز تراویح تہجد اور اشراق میں الگ الگ ختم قرآن کرتے تھے۔ ایک انتہائی مصروف بین الاقوامی مذہبی سکالر، نامور سیاستدان اور تبلیغ دین کو شعار زندگی بنانے والے عظیم مفکر کیلئے ہر سال اہتمام سے ختم قرآن کی سعادت حاصل کرنا بلاشبہ کار عظیم ہے۔ اسلام میں دین اور سیاست میں جدائی کی گنجائش نہیں ہے۔ آپ تحریک پاکستان کے نامور راہنما علامہ شاہ عبدالعلیم میرٹھی رحمۃ اللہ علیہ کے فرزند ہونے کے علاوہ خود بھی تحریک پاکستان کے عظیم رکن اور نظریاتی اقدار کے پاسدار تھے۔ اس لئے آپ نے جوئی پاکستان میں سیاست کے نام پر لادینیت اور حکومتی ایوانوں میں غیر اسلامی روایات کو پختے دیکھا تو بے اختیار

کھل کر میدان عمل میں اتر آئے۔ شاعر مشرق کے تفکر کی تصویر بن کر:

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسم شبیری کہ نقر خانقاہی ہے فقط اندوہ دگیری

آپ نے جمعیت العلمائے پاکستان کے پلیٹ فارم سے آوازہ حق بلند کیا۔ آغاز میں آپ کی سرگرمیوں کا مرکز کراچی تھا۔ مگر خوشبو زمان و مکان اور حدود و قیود کی پابند نہیں ہوتی اس لئے جلد ہی آپ کے اعلائے کلمۃ الحق کی صدائے بازگشت ملک کے قریہ قریہ شہر شہر میں گونجنے لگی۔ ۱۹۶۰ء سے ۱۹۷۰ء تک آپ نے اپنی صلاحیتوں کو منوایا اور ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں پوری طرح سے سیاسی دم خم کے ساتھ میدان سیاست میں اپنے موثر وجود کا احساس دلایا۔ آپ کی جماعت جمعیت علمائے پاکستان کو قومی اسمبلی میں سات سیٹیں ملیں۔ آپ اپنی پارٹی کے پارلیمانی لیڈر تھے۔ یہ وقت کڑے امتحان کا تھا۔ ایک طرف ذوالفقار علی بھٹو کے سوشلزم سے ٹکراؤ تھا، دوسری طرف وقت کے حکمران جنرل یحییٰ خان کی عیش پرستی بوالہوسی اور ہر قیمت پر اقدار کی ہوس سے ٹکرانا تھا۔ آپ چاہتے تھے کہ پاکستان کسی صورت بھی تقسیم نہ ہونے پائے۔ آپ کا کہنا تھا کہ مصلحت کا تقاضا یہی ہے کہ پاکستان کو بچانے کیلئے شیخ مجیب الرحمن کو اقتدار منتقل کر دیا جائے۔

اس ضمن میں آپ نے مجاہد ملت عبدالستار خاں نیازی مرحوم کے ہمراہ جنرل یحییٰ خان کی خواہش پر اس سے ایوان صدارت میں ملاقات کی تو وہ اس وقت جنرل عبدالحمید خاں کے ساتھ جام و سبور کھے ناؤ نوش کی محفل سجائے بیٹھا تھا۔ آپ کی رگ صدیقیت بھڑک اٹھی اور بر ملا کہا کہ ملک ڈوب رہا ہے اور کشتی کا نگہبان نشے میں بدمست ہے۔ جب تک یہ جام و سبو نہ اٹھاؤ گے تم سے بات نہیں ہو سکتی۔ یحییٰ خاں نے مجبور ہو کر کمرہ ملاقات سے آلات عشرت ہٹائے تب ملاقات کا آغاز ہوا۔ اپنے وقت کے آمر مطلق کو ایسا ہی مرد صفا لکار سکتا ہے جو امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کی جرأت ایمانی کا وارث ہو۔

آئین جواں مرداں حق گوئی و بے باکی اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی
پاکستان دولخت ہو گیا، مغربی پاکستان نے پاکستان کا تشخص اختیار کر لیا۔ آپ نے جمعیت
العلمائے پاکستان کے پارلیمانی لیڈر کی حیثیت سے پیپلز پارٹی کی آمریت کے سامنے جس طور
جرأت ایمانی کا مظاہرہ کیا وہ بلاشبہ پاکستان کی تاریخ سیاست کا انتہائی روشن باب ہے۔ آپ کی
تقریریں مختلف امور پر مباحثہ انٹرویوز، حریروں پر تا بڑ توڑ حملے اخبارات کے ریکارڈ کا حصہ ہیں۔
اس دور میں کئی سعادتیں آپ کے حصے میں آئیں۔ ۱۹۷۰ء میں آپ کی کوششوں سے آئین میں

”اسلامی جمہوریہ پاکستان“ کے الفاظ کا اضافہ ہوا۔ ۱۹۷۳ء میں ملک گیر سطح پر ختم نبوت کی تحریک چلی تو آپ نے قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دلوانے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ مرزا ناصر احمد (لیڈر جماعت احمدیہ) جب اسمبلی کی مقرر کردہ کمیٹی کے روبرو پیش ہوا تو دلائل و براہین کے لحاظ سے قادیانیت کو غیر مسلم ثابت کرنے والوں میں آپ پیش پیش تھے۔ اسی وجہ سے اسے راہ فرار اختیار کرتے بنی۔ شہداء کی قربانیاں رنگ لائیں اور قادیانی غیر مسلم قرار پائے۔ آپ نے متفقہ آئین میں مسلمان کی تعریف کا تعین کیا اور تمام مسلم اکابر کے سامنے تحریر پیش کر کے اس تیزی سے دستخط کروا کر اسے متفقہ طور پر مسلمان کی تعریف کا درجہ دلوا دیا کہ اپنے اور بیگانے حیران رہ گئے۔

۱۹۷۳ء کے متفقہ آئین کی منظوری کے بعد نو تشکیل شدہ سینیٹ کے بانی ممبر بنے۔ ۱۹۷۳ء میں بھٹو کی دھاندلیوں کے باوجود قومی اسمبلی کے دوبارہ ممبر منتخب ہوئے۔ اس سے قبل جب ذوالفقار علی بھٹو نے (جو اس وقت صدر تھے) وزیر اعظم کا الیکشن لڑا تو اپوزیشن نے متفقہ طور پر آپ کو وزیر اعظم کے عہدہ کیلئے نامزد کیا۔ اگرچہ بھٹو جیت گئے مگر آپ نے بلا مقابلہ کا اعزاز اس سے چھین لیا۔ قومی اسمبلی اور پھر سینیٹ کے ممبر کی حیثیت سے آپ نے قدم قدم پر جمہوری آمریت اور جبر و استبداد کا مقابلہ کیا۔ اسمبلی کے ایوانوں میں آپ کے نعرہ حق سے لرزہ طاری ہوتا رہا۔

جب بھٹو کی انتخابی دھاندلیوں کے خلاف تحریک نظام مصطفیٰ چلی تو آپ کی جمعیت العلمائے پاکستان نے ہر اول دستہ کا کردار ادا کیا جب بھٹو کو معزول کر کے جنرل ضیاء الحق نے اقتدار سنبھالا تو آپ کو سخت مایوسی ہوئی کہ ہم نے یہ قربانیاں ایک آمر کے خیر مقدم کیلئے تو نہیں دی تھیں۔ آپ کی حلیف تمام جماعتوں کو جنرل ضیاء الحق نے اقتدار کا اسیر بنا لیا مگر حضرت شاہ احمد نورانی نے آمریت کی چھتری تلے کام کرنے سے انکار کر دیا۔ پھر بھی آپ کو امید تھی کہ شاید جنرل ضیاء الحق ۹۰ دن میں انتخابات کا وعدہ پورا کرے مگر جب دیکھا کہ جنرل ضیاء الحق کا مقصد اول تو محض بھٹو کو پھانسی دینا تھا اور وہ اقتدار کی تمام بلندیاں سمیٹ کر بھی نفاذ نظام مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وسلم) کیلئے مخلص نہیں ہے تو آپ ایک مرتبہ پھر میدان عمل میں اتر آئے۔ اس کی منتخب کردہ مجلس شوریٰ کو اسلام کے ساتھ مذاق قرار دیا اور ۱۹۸۵ء کے غیر جماعتی انتخابات کو جمہوری اقدار کی جہاں سے تعبیر کیا۔ آپ کو یہ اعزاز حاصل ہے آپ نے جنرل ضیاء الحق سے ملاقات میں اس کے اقدامات کو منافقت سے تعبیر کیا۔ آپ کا یہ جملہ بالا غر قول لیصل بن گیا کہ

”اگر ضیاء الحق اسلام سے مخلص ہوتے اور ان کے دور میں اسلام اگر اونٹ پر بیٹھ کر سر زمین

حجاز سے چلا ہوتا تو اب تک کراچی کے ساحلوں تک پہنچ چکا ہوتا۔

آپ ضیاء الحق کے دام اقتدار کے اسیر مختلف جماعتوں کے اکابر کے بارے میں مختصر سا مگر فیصلہ کن تبصرہ کیا کرتے تھے کہ جنہیں اسلام آباد عزیز تھا وہ اقتدار میں چلے گئے اور نفاذ اسلام والے اب تک میدان عمل میں موجود ہیں۔

تاریخ گواہ ہے کہ آپ کا ہر خدشہ درست نکلا۔ غیر جماعتی انتخابات نے براوری ازم لسانی اور صوبائی تعصبات کو ہوا دی۔ اس دور میں مہاجر قومیت کا بت بوتل سے برآمد ہوا اور آنے والے ادوار میں کئی سیاسی پیچیدگیوں میں اضافے کا باعث بنا۔ بالآخر جنرل ضیاء الحق ایک حادثے میں خدا کو پیارے ہو گئے۔ یکے بعد دیگرے بے نظیر بھٹو اور نواز شریف کی حکومتیں برسراقتدار آتی رہیں مگر ہر حکومت ۱۹۷۳ء کے متفقہ آئین سے اغماض برتی رہی۔ جب دنیا والے پاکستان کو سرزمین بے آئین کا نام دے رہے تھے تو ایسے عالم میں مسلح افواج کے سالار جنرل پرویز مشرف سیاسی لیوانوں میں داخل ہوئے اور سیاستدانوں کی بساط لپیٹ کر بلدیاتی اور پھر قومی و صوبائی اسمبلیوں کا ڈول ڈالا۔ ریفرنڈم کے ذریعہ مسند صدارت سنبھال لی۔ یہی وہ دور تھا کہ امریکن ٹاور گرنے کے بعد بین الاقوامی منظر نامہ تبدیل ہونے لگا۔ سماجی عفریت مسلم ممالک میں پھنکارنے لگا۔ کشمیر، بوسنیا، فلسطین اور چینیا کے سانحے ہی کیا کم تھے کہ افغانستان اور عراق بھی زد میں آ گئے۔ علامہ شاہ احمد نورانی نے ایک مرتبہ پھر حالات کی نزاکت کو محسوس کیا۔ دینی جماعتوں کے اکابرین کو ایک مقام پر جمع کر کے متحدہ مجلس عمل کی بنیاد ڈالی۔ سینیٹ کے انتخاب کا مرحلہ آیا تو آپ سینئر منتخب ہوئے۔ آپ نے تادم آخر اپنی قومی سیاسی اسلامی اور نظریاتی ذمہ داریوں کو محسوس کیا۔ آپ متحدہ مجلس عمل کے سربراہ مقرر ہوئے اور رحلت تک یہ اعزاز آپ ہی کا مقدر بنا رہا۔

حالانکہ یہ عہدہ بدل بدل کر تمام جماعتوں کے حصے میں آتا ہے مگر سب نے متفق اللسان ہو کر یہ عہدہ آپ ہی کے پاس رہنے دیا جس سے آپ کی قائدانہ صلاحیت، جمہوری انداز فکر اور دوسروں کو ساتھ لے کر چلنے کی صلاحیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ قدرت کا تقاضا یہی تھا کہ جب یہ بطل جلیل دنیا سے رخصت ہو تو دوسری بے شمار خوبیوں اور عظمتوں کے ساتھ ساتھ تمام دینی جماعتوں کی قیادت کا علم بھی اس پر سایہ کناں ہو۔

حضرت شاہ احمد نورانی رحمۃ اللہ علیہ رخصت ہوئے تو ایک طوفان الم پھا ہو گیا۔ ہر درد مند دل لرز اٹھا۔ محبت اسلام اور عشق رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تجلیات رکھنے والی ہر آنکھ پر نم ہو گئی۔ ایک سیل

اشک پھوٹ نکلا، رنج و الم نے علمی اور سیاسی افق پر سیاہ چادر پھیلا دی۔ حکومتی سربر آوردہ شخصیات، علمائے اُمت اسلام، فقہائے دین محمدی، دینی اور سیاسی جماعتوں کے اکابرین آنسوؤں کی مالا میں پروتے ہوئے بہترین الفاظ کا ارمغان آپ کی نذر کرنے لگے۔ قومی اخبارات نے علامہ نورانی کے بارے میں فیچرز، مضامین، شہ سرخیوں، تصاویر اور کالموں کی صورت میں اتنا کچھ لکھا کہ قائد اعظم اور قائد ملت کے وصال کے بعد شاید ہی کسی پر اس قدر شدت اور تواتر سے تحریر کیا گیا ہو۔ نوابزادہ نصر اللہ خاں کی وفات ایک بہت بڑا قومی المیہ تھی۔ حضرت شاہ احمد نورانی رحمۃ اللہ علیہ کے وصال نے اس قومی المیہ کی شدت میں غیر معمولی اضافہ کر دیا۔

نشر پارک سے جب آپ کا جنازہ اٹھایا گیا تو آنسوؤں اور سسکیوں کو دامن میں لئے لاکھوں سوگوار تاریخ اسلام کے اس رجل رشید کو الوداع کہنے کیلئے اُٹھ آئے تھے۔ نشر پارک کے چاروں طرف سڑکیں، مکانات کی چھتیں، تمام رہ گزاریں، نماز جنازہ پڑھنے والوں سے پڑتھیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے آج تمام راستے نشر پارک کو جا رہے ہوں۔ چشم فطرت نے بھی یہ ایمان آفریں منظر دیکھ کر گواہی دی ہوگی کہ واقعی عالم کی موت ایک زمانے کی موت ہوتی ہے۔ جنازہ ہو چکا تو بھی جنازہ میں شرکت کرنے والوں کے قافلے نشر پارک کی جانب بڑھ رہے تھے:

ع.....عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

عشاق سرور کونین کا رہنما آسودہ لحد ہو گیا۔ جمہوری اقدار کا پاسبان اپنی آخری آرام گاہ میں ابدی نیند سو گیا۔ نظام مصطفیٰ کے نفاذ اور مقام مصطفیٰ کے تحفظ کی دہائی دینے والا ملت اسلامیہ سے جدا ہو گیا۔ دو قومی نظریہ کا عظیم داعی ایک زمانے کو نظریاتی روشنی عطا کر کے رپ کونین کی رحمتوں کی انان میں چلا گیا۔ آمروں سے ٹکرانے والا غاصبوں کے خلاف کلمہ حق بلند کرنے والا پاکستان کو بے داغ اسلامی ریاست بنانے کا تصور رکھنے والا نگاہوں سے ہمیشہ کیلئے اوجھل ہو گیا۔ اتنی مقبولیت، اس قدر ہر دلعزیزی، اس درجہ شہرت عام اور بقائے دوام کی نوید شاید ہی کسی اور کو ملی ہو۔ میں تاریخ پاکستان کے پس منظر میں جھانک کر سوچنے لگتا ہوں کہ وہ کیا اسباب تھے جو فکر و عمل کے ستارے کو کبیر نے والے شاہ احمد نورانی رحمۃ اللہ علیہ کو حیات دوام کی خلعت عطا کر گئے۔

علامہ نورانی کی فکر اور عمل میں یکسانیت تھی، جو کہا وہ کر کے دکھایا۔ اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ان کا راہنما، جابر حکمرانوں کے سامنے کلمہ حق کہنا ان کا جادہ عمل تھا۔ بیچی خان، ذوالفقار علی بھٹو اور ضیاء الحق جیسے آمروں کے منہ پر سچی بات کہی ان کی خامیوں پر ٹوکا۔ آپ کی خواہش ہوتی تھی کہ

وقت کے حکمرانوں سے نہ ملا جائے مگر جب بھی قوم و وطن پر مشکل وقت آیا تو جلسہ گاہوں کے علاوہ ان کجکلاہوں کے سامنے بیٹھ کر انہیں جمہوری اقدار کا درس دیا۔

شاہ احمد نورانی رحمۃ اللہ علیہ عصر حاضر میں عظمت اسلاف کی تصویر تھے۔ سادہ صاف ستھرا لباس، تمام زندگی کرائے کے ایک چھوٹے سے مکان میں بسر کی۔ ایک کمرہ آپ کی نشست گاہ تھا۔ سادہ سی دری پچھی ہوتی۔ ایک طرف دو تین کرسیاں پڑی ہوتیں۔ وقت کے حکمران، غیر ملکی اکابرین، قومی اور بین الاقوامی شخصیات ملنے آتیں تو اسی فرش نشست گاہ پر آپ کے ساتھ بیٹھ جاتیں۔ اتنی سادگی، اس قدر منکسر المزاجی جس پر زمانے بھر کا تکلف قربان جائے۔ یہ اس شخصیت کے رہنے سہنے کا انداز ہے جو لاکھوں عقیدت مندوں کے دلوں پر حکومت کرتا تھا، جو بین الاقوامی اور بین الاسلامی شخص رکھتا تھا، جو سوادِ اعظم کا راہنما تھا، جس کے ایک اشارے پر اصحاب دولت اپنا سیم و زر اس کے قدموں پر نثار کرنے کو بے قرار تھے مگر ان کیلئے ”ورلڈ اسلامک مشن“ ہی سب کچھ تھا، عشقِ مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے نام پر جیتے تھے اور اسی کے سایہ نور میں آخری سفر طے کیا۔

اس مردِ جلیل کی زندگی کا مرکز و محور نظامِ مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا نفاذ تھا۔ وہ ایک پل کیلئے بھی اپنے فریضہ سے غافل نہ ہوئے کیونکہ آپ سمجھتے تھے کہ پاکستان فقط اور فقط اسلام کے نام پر قائم ہوا ہے۔ اس سلسلہ میں وہ سمجھوتہ کے قائل نہیں تھے۔ یحییٰ خاں اور بھٹو سے اور نہ ہی ضیاء الحق، نواز شریف، بے نظیر یا موجودہ حکمرانوں سے۔ وہ اسلام کو پاکستان کی اساس سمجھتے تھے اور اساس پر سمجھوتہ کیسا؟ آپ عالمی مبلغِ اسلام تھے، تبلیغِ دین آپ کا عظیم مشن تھا، اس لئے جب تبلیغ کیلئے بیرونی دنیا کا سفر کرتے تو گھر بار سب کچھ بھول جاتے مگر اپنے وطن کو کبھی فراموش نہ کرتے۔ ان کے ہم سفر کہتے ہیں کہ ان کے نزدیک ملک میں اسلام اور نظامِ مصطفیٰ کا نفاذ بھی تبلیغِ دین کا حصہ تھا۔ کسی بھی وطن میں ہوتے اپنے ملک کے حالات کی پوری پوری خبر رکھتے۔ ان کے بیانات اور افکار سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بیرون وطن رہ کر بھی اپنے وطن ہی میں ہیں۔

شاہ احمد نورانی رحمۃ اللہ علیہ غیر ممالک میں اپنے عظیم والد شاہ عبدالعلیم مینرشی رحمۃ اللہ علیہ کی طرح پاکستان کے غیر سرکاری سفیر تھے۔ کبھی کوئی ایسا کام نہ کیا، جس سے وطن کی سبکی ہو، کوئی ایسا بیان جاری نہ کیا جس سے اہل وطن کی توہین ہو، ہر جگہ اور ہر مقام پر پاکستان کے اسلامی تشخص کو اجاگر کرنے کی کوشش کی۔

رب کریم نے ایسا قابلِ رشک کردار عطا کیا تھا کہ جس کی بلندیوں کو دیکھ کر ایک زمانہ

غیر اللہ کے سامنے جھک نہیں سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ وقت کا کوئی سیاسی بیوپاری، جھوٹے نظریات کا تاجر یا کوئی آمر مطلق انہیں جھکانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔

نورانی میاں کا نام بھی نورانی تھا تو شکل بھی نورانی پائی تھی۔ دل بھی انوار مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء سے ضو بار تھا۔ لہجہ پُر تاثیر تھا۔ بات کرتے تو منہ سے پھول جھڑتے۔ خلوص فکر ان کا سرمایہ تھا، حب الوطنی ان کی قوت تھی، اسلامی اقدار کی عظمت اور بالادستی ان کا سرمایہ افتخار تھی۔

آپ اتحاد بین المسلمین کی علمی تفسیر تھے۔ آپ کا فرمانا تھا کہ اپنا مسلک مت چھوڑو اور کسی کے مسلک کو نہ چھیڑو۔ یہ دراصل تصوف کی تعلیم تھی، یہی روح تصوف آپ کو اپنے والد کے علاوہ عالم اسلام کے نامور صوفی بزرگ حضرت قبلہ ضیاء الدین مدنی رحمۃ اللہ علیہ اور والا قدر سر حضرت فضل الرحمن مدنی سے عطا ہوئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب متحدہ مجلس عمل وجود میں آئی تو بہت سے لوگوں نے مخالفت کی مگر بالآخر اپنے پرانے سبھی مان گئے اور آپ کی قائدانہ صلاحیتیں ایک مرتبہ پھر نکھر کر سامنے آ گئیں۔

آپ نے دو قومی نظریہ کی چھاؤں میں پرورش پائی تھی اس لئے آپ نے ہمیشہ اسی نظریہ کو اپنانے پر زور دیا۔ آپ ان طاقتوں کے خلاف پوری قوت ایمانی کے ساتھ میدان عمل میں اترتے تھے جو دو قومی نظریہ کے تقدس پر ضرب لگانے کیلئے تیار رہتی تھیں۔

(بار چہارم، جمعہ ۲ ذیقعدہ ۱۴۲۲ھ / ۲۰۰۶ء)

آپ نے آٹھ برس کی عمر میں حفظ قرآن کے بعد پہلی مرتبہ ماہ رمضان میں قرآن سنایا۔ آپ انگریزی، انگریزوں کی طرح اور عربی عربوں کی طرح بولتے تھے۔ قرآن حکیم کا نور آپ کے رگ و پے میں بسا ہوا تھا۔ تعلیمات قرآنی سے سینہ منور تھا، افکار قرآنی ان کی زندگی کا مرکز و محور تھے۔ سیرت سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم ان کیلئے حاصل حیات تھی۔ فکر میں غزالی کا حسن تھا تو عمل میں رازی کی تڑپ۔ کلمہ حق کہنے میں امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا جذبہ تھا تو تبلیغ دین میں امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کی پیروی کا لپکا۔ آپ عشاق مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے صورت بریشم تھے تو شاتمان رسالت کیلئے صورت فولاد۔ آج آپ ہم میں موجود نہیں مگر آپ کا بے داغ کردار ہمیں پیغام دے رہا ہے کہ عظمت و سر بلندی کے بلند ترین معیار کو چھونے کیلئے تخت و تاج یا جاہ و جلال شاہی کی ضرورت نہیں بلکہ یہ بلندیاں تو ان اصحاب فقر کا مقدر بنتی ہیں جو چٹائی پر بیٹھ کر دلوں پر حکومت کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔

عطار ہوزومی ہوزازی ہو غزالی ہو..... کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہ سحر گاہی

بحر العلوم مولانا محمد فیض قادری رحمۃ اللہ علیہ

بحر العلوم حضرت مولانا مولوی محمد فیض صاحب ولایت حضرت شیر محمد غازی رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے تھے۔ حضرت شیر محمد غازی نے آپ کو خصوصی توجہ سے نوازا اور بچپن ہی سے آپ کی تربیت اس انداز سے کی کہ بڑے ہو کر اس عظیم خانقاہ کا نظام سنبھال سکیں۔ حضرت شیر محمد غازی خود بڑے عالم دین اور صاحب تقویٰ بزرگ تھے اس لئے انہوں نے اپنے لخت جگر کو جہاں علوم دینیہ کی دولت عطا کی وہاں روحانی لحاظ سے بھی مسلسل نوازتے رہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب مولانا محمد فیض عنقوان شباب کو پہنچے تو نہ صرف علوم دین میں طاق ہو چکے تھے بلکہ روحانیت اور طریقت میں بھی منفرد مقام حاصل کر چکے تھے اور اس اعزاز کے مستحق ٹھہر چکے تھے کہ خانقاہ قادریہ نوریہ کے روحانی دینی سلسلہ کے نظم و نسق کو سنبھال سکیں۔

جب حضرت شاہ شیر محمد غازی رحمۃ اللہ علیہ کو شہادت کا رتبہ نصیب ہوا تو مسند ارشاد پر ان کے صاحبزادے مولانا مولوی محمد فیض متمکن ہوئے۔ حضرت مولانا محمد فیض اپنے وقت کے جید عالم دین، صوفی کامل اور اور نعت گو شاعر تھے۔ شاعری میں آپ ملاحظت تخلص کرتے تھے۔ آپ نے بہت کثرت سے فارسی کلام لکھا۔ ایک ممتاز استاذ علوم دینیہ ایک نامور شاعر اور جلیل القدر فقیہ کی حیثیت سے ان کا مقام اس قدر سر بلند ہے کہ ہر صاحب نظر آپ کے سوانح حیات کی ایک جھلک دیکھ کر ہی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ علم و حکمت میں غیر معمولی دسترس رکھنے کی بناء پر آپ بحر العلوم کہلائے جانے کے مستحق تھے۔

مشہور کتاب چار باغ پنجاب کے مصنف کنیش داس وڈیرہ نے آپ کا تذکرہ یوں کیا ہے
”میاں محمد فیض ملاحظت تخلص کہ کتاب مراۃ الحساب تصنیف لطیف و شرح مکاتبات علامی“

(۱) چار باغ پنجاب مصنفہ کنیش داس وڈیرہ مرتبہ: پروفیسر کربال سنگھ ایم اے ناشران: سکھ ہسٹری ریسرچ ڈیپارٹمنٹ خالصہ کالج امرتسر ہے۔ (۲) ”شرح مکاتبات علامی ابوالفضل“ ڈاکٹر قریشی احمد حسین قلعداری کی لاہوری میں محفوظ ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے دادا کے بھائی مولوی گل احمد نے ۱۲۸۲ھ میں نقل کی۔

ابوالفضل وگل گشتی خوب کردہ است۔“

مولوی محمد صالح کنجاہی کتاب ”سلسلۃ الاولیاءؑ“ میں حضرت محمد فیض رحمۃ اللہ علیہ کے شاگردوں کے حوالے سے رقمطراز ہیں:

”شیخ محمد ابراہیم طیب اللہ تراہ جعل اجتہ شواہ عالم و عامل و زہد و تحمل رفیع الشان بود علم ظاہری بسیار اساتذہ حاصل نمود بود۔ چنانچہ از خدمت حضرت میاں محمد فیض (کھیالی والا) و حضرت مرزا مقصود بیگ و حضرت حافظ محمد یونس و حضرت میاں محمد صالح گجراتی رحمۃ اللہ علیہم در علم باطنی مرید حضرت سید شاہ میر است۔“

ان حقائق کے اظہار سے ہمارا مقصود یہ ہے کہ اہل نظر کو باور کرایا جاسکے کہ مولانا محمد فیض کس پائے کے استاد اور عالم دین تھے اور آپ سے ظاہری و باطنی فیوض حاصل کرنے والوں نے کس درجہ بلند مقام حاصل کیا، جس طرح شاگرد کو دیکھ کر استاد کی عظمت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے اسی طرح پیش کردہ اقتباس سے مولانا محمد فیض کے غیر معمولی تبحر علمی کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔

مولانا محمد فیض اپنے والد بزرگوار اور عظیم اسلاف کی بخشی ہوئی رشد و عرفان کی روشنی میں خانقاہ قادریہ نوریہ میں درس و تدریس کو مستقل طور پر اپنا شعار حیات بنا کر عوام الناس کو علم و حکمت کی روشنی سے فیضیاب کرنے لگے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب پرانی علمی یادگاریں ایک ایک کر کے ٹٹی جا رہی تھی۔ کھیالی دروازہ گوجرانوالہ کی یہ خانقاہ قادریہ اس وقت علم و حکمت کے عظیم مرکز میں تبدیل ہو چکی تھی۔

دور دراز سے طالبان شوق آتے اور مولانا محمد فیض کی بارگاہ علمی میں بیٹھ کر علم کی پیاس بجھاتے اور رشد و ہدایت کی دولت سے مالا مال ہوتے۔ اس دور میں عوام الناس ہی نہیں بلکہ اکابر علمائے کرام بھی اس درسگاہ سے فیضیاب ہوتے، جس کا ذکر مختلف تذکار میں ملتا ہے۔ اس زمانہ میں آج کل کے سکولوں اور کالجوں کی طرح رجسٹر حاضری تو نہیں ہوا کرتے تھے جن سے اس زمانہ میں مولانا کے شاگردوں کی تعداد دیکھی جاسکے۔ اس دور کے علماء و فضلاء کو طلبہ کے اعداد و شمار یا ان کی تعداد کے کم اور زیادہ ہونے سے کوئی غرض نہیں ہوتی تھی۔ تمام محنت علوم اسلامیہ کی ترویج کیلئے کی جاتی تھی۔ اس لئے مولانا محمد فیض کے شاگردوں کی فہرست پیش نہیں کی جاسکتی۔ البتہ ان کے ایک شاگرد کا تذکرہ نمونہ کے طور پر شامل کیا جاتا ہے، جس سے اس دینی و روحانی درسگاہ کی اہمیت اور نمایاں ہو جاتی ہے۔

(۱) سلسلۃ الاولیاء۔ سال تصنیف ۱۲۲۷ھ

مولوی محمد ابراہیم کنجاہی اپنے وقت کے صوفی کامل اور بہت بڑے عالم دین تھے۔ کسی وقت انہوں نے مولانا محمد فیض سے اکتساب فیض کیا تھا۔ اس سلسلہ میں مولوی محمد صالح کنجاہی نے اپنی کتاب میں جو اقتباس دیا ہے اس کا اوپر تذکرہ ہو چکا ہے۔

عملی طور پر درس و تدریس کے ساتھ ساتھ مولانا محمد فیض نے ابدی و دائمی تدریس کا بھی اہتمام کیا۔ ہمارا اشارہ ان تصانیف کی طرف ہے جو آپ کی وفات کے بعد بھی اہل تحقیق کی راہنمائی کرتی ہیں۔ حضرت مولانا محمد فیض نے متعدد اہم تصانیف یادگار چھوڑی ہیں جنہیں ظالم وقت کے بے رحم ہاتھوں نے وقت کی گرد میں گم کر دیا ہے۔ منشی گنیش داس وڈیرہ نے اپنی کتاب ”چہار باغ پنجاب“ میں آپ کا ذکر کرتے ہوئے آپ کی تحقیقی کاوشوں کا ذکر بھی کیا ہے جس کا حوالہ ہم پہلے ہی نقل کر چکے ہیں۔

ان تصانیف میں سے ”مرآت الحساب“ اور ”شرح گل گشتی“ دستیاب ہیں۔ البتہ شرح ”مکاتباتِ علامی“ کے دو نسخے پروفیسر احمد حسین قلعداری کے کتب خانہ میں محفوظ ہیں۔ شرح نویسی آسان کام نہیں ہوتا بلکہ شارح کیلئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ اصل متن کے حقیقی جزئیات تک رسائی رکھتا ہو اور یہ خوبی مولانا محمد فیض کی سراپا فضیلت شخصیت میں بدرجہ اتم موجود تھی۔

حضرت مولانا محمد فیض کا زمانہ سکھا شاہی کا بھرپور زمانہ تھا جس سے سوائے تباہی و بربادی کے اور کوئی آثار نظر نہیں آتے۔ اس مردِ کامل کا کمال یہ ہے کہ اس نے سکھا شاہی کے ہاتھوں ہراساں اہل ایمان کو خانقاہی ماحول میں لا کر روحانی سکون عطا کیا اور ہر قسم کے انقلابات دہر سے بیگانہ ہو کر خدمتِ علم و ادب میں مصروف عمل رہے۔ آپ کے زمانہ میں پنجاب میں اور بھی علماء و فضلاء موجود تھے مگر افسوس کہ آپ کے معاصرین کی خاص فہرست تیار نہیں کی جاسکتی جس سے اندازہ ہو سکے کہ آپ نے کن کن صاحبانِ علم و حکمت کے درمیان رہ کر عقل و دانش کے گلاب مہکائے ہیں۔ آپ کے شاگرد عزیز مولوی محمد ابراہیم کنجاہی کے احوال کے سلسلہ میں مولوی محمد صالح کنجاہی نے مرزا مقصود بیگ ولانوالیہ مفتی محمد یونس شادیوالیہ اور حضرت مولوی محمد صالح گجراتی کا ذکر کیا ہے کہ ان کی معاصر درسگاہوں سے مولوی محمد ابراہیم کنجاہی نے اکتساب فیض کیا ہے۔

”شرح مکاتباتِ علامی“ میں مولوی محمد امین سودہرے والا اور مولوی محمد افضل ساکن تلونڈی موسیٰ خاں کے گاؤں کا ذکر کیا ہے۔ ان کے علاوہ مولوی غلام رسول ساکن قلعہ قاضی فضل حق وزیر آبادی حافظ خاں احمد قلعہ داری بھی سنین کے لحاظ سے ان کے معاصر تھے۔

مولانا محمد فیض اولیاء و صوفیاء کے از حد قدر شناس تھے جب بھی علم ہوتا کہ فلاں مقام پر کوئی صاحب ولایت تشریف لائے ہیں تو فوراً ان کی زیارت کو چلے جاتے۔ وہ مرد فقیر انہیں پہچانتے ہی فرط عقیدت سے اٹھ بیٹھتا۔ آپ کی علم نوازی اور فقر و درویشی کو دیکھ کر آپ کی روحانی شہرت سے متاثر ہو کر پنجاب اور بلاد ہند کے دوسرے علاقوں سے درویش اور صوفیاء آپ کی خدمت میں حاضری دینا وجہ سعادت سمجھتے تھے۔ آپ کی رہائش موضع کھیالی میں تھی اور روزانہ علی الصبح کھیالی سے خانقاہ قادریہ نوریہ (بیرون کھیالی دروازہ گوجرانوالہ) تشریف لایا کرتے تھے۔ شام کو بعض اوقات رات گئے گھر کو واپسی ہوتی تھی۔ عمر بھر یہی معمول جاری رہا۔ کھیالی سے گوجرانوالہ کی جانب آتے تو مرد درویش حضرت مبارک شاہ رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر ضرور رکتے۔ فاتحہ خوانی کرتے اور پھر وہاں عرصہ سے مقیم ایک صوفی نور احمد سے ملاقات کرتے اور بعض اوقات یہ ملاقات بہت طویل ہو جاتی۔ اس محبت اور خلوص باہمی کا ہی نتیجہ تھا کہ جب آپ کے ہاں بیٹے کی ولادت ہوئی تو آپ نے اس کا نام نور احمد ہی کے کہنے پر اظہار محبت کے طور پر نور احمد رکھا۔ یہ نور احمد تھے جو بعد میں مولانا نور احمد کے نام سے غیر معمولی روحانی شہرت کے حقدار قرار پائے۔ اس واقعہ کا تفصیلی تذکرہ مولانا نور احمد رحمۃ اللہ علیہ کے باب میں آئے گا۔

غیر معمولی علمی مہارت اور فقہی دسترس کی بناء پر معاصر علماء کی نظروں میں آپ کی رائے کو قول فیصل کا درجہ حاصل تھا اور جید علماء و فضلاء آپ کی علمی آراء اور فقہی فیصلوں کو قدر و قیمت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ بلاد ہند کے عوام مختلف اسلامی و فقہی امور پر آپ کی رائے دریافت کرنے کیلئے آپ سے رجوع کرتے اور آپ سے فقہی مسائل کے حل کیلئے فتاویٰ کے طالب ہوتے۔ آپ اس ضمن میں فتویٰ جاری کرتے تو اس فتویٰ کو معاصر علماء کی نگاہوں میں توقیر و احترام کا مقام حاصل ہوتا اور بہت سے علماء آپ کے فتویٰ پر مہر تصدیق مثبت کر کے آپ کی فقہی عظمت کی بالاتری کا اعتراف کر لیتے۔ مختلف علمی و تحقیقی تذکروں میں آپ کی فتویٰ نویسی اور اس سلسلہ میں قبولیت عام کا سراغ تو ملتا ہے مگر فتاویٰ کے سلسلہ میں ہم مثالیں پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ فتویٰ نویسی اور اس کی قبولیت عام آپ کی علمی عظمتوں کی دلیل ہے۔ آپ نے فتویٰ نویسی کے ضمن میں جس قابل فخر روایت کی بنیاد رکھی اس کی شان آپ کے صاحبزادے مولانا نور احمد رحمۃ اللہ علیہ اور پھر مولانا محبوب عالم رحمۃ اللہ علیہ کے فتاویٰ اور علمی رفعتوں میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔ آپ کے فتاویٰ سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ قرآن مجید احادیث نبویہ اور اقوال آئمہ کرام کا غیر معمولی علم رکھتے تھے۔ ان علوم کی

سر بلندیوں کا ادراک کئے بغیر علوم دیدیہ میں قول فیصل کا درجہ حاصل نہیں کیا جاسکتا اور مولانا محمد فیض رحمۃ اللہ علیہ کو بلاشبہ اس میدان میں قول فیصل کا درجہ حاصل تھا۔

قدرت نے آپ کو بہت سے دوسرے صوفیائے کرام کی طرح شاعرانہ ذوق سے بھی نواز رکھا تھا۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ قدرت کی طرف سے صوفیاء کو طبع موزوں عطا ہوتی ہے جس کی بدولت وہ اپنی شاعرانہ صلاحیتوں سے اہل نظر کی اصلاح کا کام لیتے ہیں۔ مولانا محمد فیض شاعری میں ملاحظت تخلص کرتے تھے۔ فارسی اور عربی زبان پر بھرپور گرفت تھی۔ آپ کا بیشتر کلام فارسی میں ہے۔ آپ نے اپنے کلام کا کوئی باقاعدہ مجموعہ نہیں چھوڑا، بلکہ مختلف بکھرے ہوئے اوراق پر آپ کی شعری صلاحیتیں جلوہ گر نظر آتی ہیں۔ شعر و سخن کا یہ ذوق آپ کی ادبی و علمی رفعتوں کا عطیہ تھا۔ افسوس کہ ان کے شعر و سخن کا تمام کا تمام قیمتی سرمایہ دستبرد زمانہ کی نذر ہو گیا۔ معروف شاعر اور صوفی بزرگ مولانا غلام قادر شائق کی بیاض خطی سے آپ کا درج ذیل قطعہ دستیاب ہوا ہے جو شامل کتاب کیا جاتا ہے۔

بعد زیں در عوض آہ و اشک دل آید بروں
آب چوں زان کم شود از چشمہ گل آید بروں
عشق آمد بہر دل برون دُر سینہ نیافت
دزد از خانہ مفلس چوں نخل آید بروں
ایک اور قطعہ میں یوں شعری جواہر پارے بکھیرتے ہیں۔

در مدرسہ کہ بر سر کا رم من
چوں لالہ بداع دل بگلزارم من
من خود نہ مدرسم دریں مدرسہ بل
دیوانہ بطفلگاں گرفتارم من

سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی منقبت میں یوں ارمغان عقیدت پیش کرتے ہیں:

دل غم از لبریز شد سویم نگاہ یا علیؑ
جز جناب تو نمیدارم پناہ یا علیؑ
من نہ تنہا باشم از ورد علی رطب اللسان
ہست ورد ہر ملک و دہر بگاہ یا علیؑ
فخر با فقرم ہمیں بشاہاں کز ازل

شونے درگاہ تو بختم داد راہ یا علیؑ
درجہاں از بخت خود نازم کہ می باشد مرا
بر سر خاشاک درکاہت کلاہ یا علیؑ
گر مدد نشود شود کارم تباہ کیں چرخ دویں
رابطہ بر ملک و لم از غم سیاہ یا علیؑ
گر گدائے را نوازی از نگاہ التفات
خود چہ کم گردد زجاہ چوں تو شاہ یا علیؑ
می طپد ہر سطر انشایم ز بیتابی چو برق
ہست درہر بیت مضمون آہ یا علیؑ
گردش گردوں بمن از جور چیزی کم مکن
یک نظر فرما سونے این داد خواہ یا علیؑ
مشہور شعری تصنیف "سکندر نامہ" کے اختتام کی تاریخ یوں کہتے ہیں

چوں از فیض فضل خداوند عالم
شد این نامہ در وقت اسعد ختم
سروشم بفرمود تاریخ سانش
شرفنامہ در درج محبوب عالم
۱۲۸۸ھ

تاریخ نویسی کے سلسلہ میں ان کا ایک اور قطعہ ملاحظہ ہو:

از روزی نقل حضرت ما نور احمد
بگریست آسمان دمہ و مہر و ماہ و میخ
تاریخش از خود جو بختم گریست زار
درین گریہ آہ زد و گفت بس دریغ
۱۲۶۶ھ

مولانا محمد فیض کی ایک فارسی غزل کے چند اشعار نذر قارئین ہیں:

کیست کارم پیش او فریاد از دست شما
اے ہلاکتیاں ظالم داد از دست شما

کس نہ دیدم در جہاں بسیار کس را دیدہ ام
شاد از دست شما ناشاد از دست شما
ماہاں بنیم شیریں لبان تلخ کور
آنچہ آمد بر سر فرہا از دست شما
باعث اعزاز ما باشد گر آب روئے ما
پیش ہم چشمہ نہ زو بر باد از دست شما
گرچہ بارد تیغ در کوئے شماہاں لائحہ
سرنہادم ہرچہ بادا باد از دست شما

جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ ”شرح مکاتبات علامی“ مولانا محمد فیض کی غیر معمولی علمی فضیلت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ شرح وہی کر سکتا ہے کہ جو موضوع متعلقہ پر مکمل دسترس رکھتا ہو جس کی جزئیات اور کلیات پر گہری نظر ہو جو علمی تقاضوں اور فقہی امور سے آشنا ہو جو مختلف النوع علوم پر حاوی ہو جس کا مطالعہ وسیع اور جس کی علمی حیثیت بجائے خود سند کا درجہ رکھتی ہو۔ مولانا محمد فیض ان تمام علمی و فکری تقاضوں سے بخوبی آگاہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی شرح آپ کے علمی کمالات اور گہرے مطالعہ کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ”شرح مکاتبات علامی“ سے ایک اقتباس پیش کر رہے ہیں تا کہ قارئین اس کی روشنی میں حضرت مولانا کا علمی و فقہی مقام متعین کر سکیں۔

”بر آنکہ نفس ہر چہارم قسم است۔ اول مطمئنہ کہ قرار گرفتہ است بہ ذات حق و مشاہدہ و معائنہ و این نفس پیغمبران علیہم السلام است۔ دوم لواہ کہ صاحب خود را ملامت کنندہ است و این نفس مومناں است۔ سوم ملہمہ کہ الہام کنندہ است۔ یا الہام کردہ شدہ است و این نفس اولیاء است قدس سرہ۔ چہارم امارہ کہ صاحب خود را میری می کشد و این نفس کافراں است علیہم اللعینہ“

اس طرح کی مختلف العلوم کی تشریحات ”شرح مکاتبات علامی“ میں درج ہیں جو حضرت میاں محمد فیض کے پایہ علمی کی وضاحت کرتی ہیں کہ آپ کن کن علوم کے ماہر استاد تھے۔ یہ شرح انہوں نے کسی مولوی سلطان احمد کے کہنے پر تحریر کی۔ اس سلسلہ میں ان کی تحریر کا ترجمہ درج ذیل ہے:

ابوالفیض محمد ملاحظت کہتا ہے کہ اس نے یہ کتاب بعض ادب و انشاء کے آشناؤں کی فرمائش پر رقم کی۔ خصوصاً فضیلت پناہ عالم بے نظیر مولوی سلطان احمد جو کہ اعلیٰ درجہ کے سخن شناس ہیں ان کی فرمائش کو مد نظر رکھا ہے۔“

پھر آپ ایک قطعہ رقم کرتے ہیں:

از کلک ملاحظت میں سواد دلکش
در وقت نکوچہ نقش تربیت بست
سربسکہ بجیب فکر ہر دم جوں صدف
بانعمیہ سال جوں درآفتاد بدست
گرچشم بہم زنی ز آہو سانش
میں شرح مکاتبات نہامی دست

”شرح مکاتبات علای“ کے دیباچہ میں ایک شعر حمدیہ اور ایک شعر نعتیہ درج ہے۔ حمد باری

تعالیٰ کا شعر ملاحظہ ہو:

تعالیٰ اللہ زہے بے شبہ و بے چوں
زہر چون و چرا کی عقل پیروں
سرور کائنات محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت یوں بیان کرتے ہیں:
در اسم احمد آں میسی کہ پیدا است
کی آئینہ روئی احد را است

غرضیکہ مولانا محمد فیض ایک صاحب عمل صوفی، درویش باصفا، عالم نکتہ داں اور محقق دوراں تھے۔ آپ کے شاگردوں نے بہت نام کمایا۔ آپ اپنے معاصرین کی نگاہوں کا تارا تھے۔ اصحاب علم و فضل کے دلوں کا قرار تھے۔ آپ نے ایک طویل عرصہ تک خانقاہ قادریہ نوریہ کو اپنا مرکز بنا کر رشد و ہدایت کی شمع جلانے رکھی۔ آپ نے عیسیٰ میں وفات پائی اور موضع کھیالی میں مدفون ہوئے۔

آہاں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
بہرہ نورستہ ترے گھر کی نگہبانی کرے



شمس العلماء حضرت مولانا محبوب عالم قادری رحمۃ اللہ علیہ

سرزمین گوجرانوالہ کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ یہاں مختلف ادوار میں ایسی جلیل القدر شخصیات نے جنم لیا جو اپنی خداداد صلاحیتوں کی بدولت بزم ہستی کا وقار بن گئیں۔ اس حوالے سے ممتاز علمی اور سیاسی شخصیت حضرت علامہ شمس العلماء مولانا محبوب عالم قادری رحمۃ اللہ علیہ کا کردار آفتاب حکمت کی صورت جگمگا رہا ہے آپ حضرت داتا شاہ جمال نوری رحمۃ اللہ علیہ (مدفون خانقاہ قادریہ نوریہ کھیالی دروازہ) کے خاندان تصوف کے رکن رکین تھے۔ آپ نے کھیالی دروازہ گوجرانوالہ میں خانقاہ عالیہ قادریہ نوریہ کے مرکز تجلیات کو وسعت بخشی اور اس روحانی اور علمی مشن کو جاری رکھا جس کی گوجرانوالہ میں داتا شاہ جمال نوری نے بنیاد رکھی تھی۔ اس خانوادہ روحانیت میں حضرت شیر محمد غازی، مولانا بحر العلوم محمد فیض اور سلطان العلماء مولانا نور احمد رحمۃ اللہ علیہم جیسی عظیم المرتبت شخصیات اصحاب نظر کی آنکھوں کا ستارا بن کر ابھریں، مولانا محبوب عالم کا سن پیدائش ۱۲۴۰ھ بمطابق ۱۸۲۳ء ہے۔

حضرت مولانا محبوب عالم مولانا غلام قاسم رحمۃ اللہ علیہ کے فرزند اور سلطان العلماء مولانا نور احمد رحمۃ اللہ علیہ کے پوتے تھے۔ مولانا محبوب عالم نے خانقاہ قادریہ نوریہ کے مرد کامل مولانا نور احمد رحمۃ اللہ علیہ کے فکری و عملی فیوضات سے جی بھر کر خوشہ چینی کی اور اس مرکز علم و حکمت سے بھرپور استفادہ کرتے رہے۔ مولانا نور احمد رحمۃ اللہ علیہ جیسے صاحب کمال عالم نے اپنی نگرانی میں مولانا محبوب عالم رحمۃ اللہ علیہ کو علوم دینیہ کا فیضان عطا کیا، ان کی مستقبل شناس نظریں دیکھ رہی تھی کہ یہ فرزند ہونہار ایک روز علم و جان سے حصول علم کے علاوہ دہلی سمیت مختلف شہروں سے بھی علوم دینیہ کی تحصیل کا سلسلہ جاری رکھا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے آپ کا شمار اپنے دور کے انتہائی معروف علماء و فضلاء میں ہونے لگا۔

جب روحانی و نظری فیوضات کی تحصیل کا وقت آیا تو حضرت مولانا نور احمد رحمۃ اللہ علیہ نے جو خود شہباز طریقت تھے انہیں روحانی تربیت کیلئے اپنے خلیفہ خاص ممتاز نظریاتی شخصیت اور علمی

اقدار کے امین فخر الاسخیا، حضرت خواجہ سخی احمد یار رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے کیا۔ انہوں نے مولانا محبوب عالم کو خوب خوب نوازا اور پھر روحانی تربیت فرمائی۔ اس حوالے سے غوث العصر خواجہ محمد عمر (درگاہ معلیٰ قادریہ بازار خراواں) آپ پر خصوصی لطف فرماتے رہے۔ دونوں خانقاہوں کے درمیان قائم ہونے والا روحانی سلسلہ آج تک اپنی نظریاتی بہار لٹا رہا ہے۔ مولانا محبوب عالم رحمۃ اللہ علیہ کے روحانی اور علمی کمالات نے درگاہ عالیہ قادریہ کھیالی دروازہ کو علم و حکمت کا عظیم مرکز بنا دیا۔

فکری و علمی اور روحانی و نظریاتی علوم میں کمال درجہ دسترس کے بعد حضرت مولانا محبوب عالم قادری رحمۃ اللہ علیہ کی ذات مرجع خلافت بن گئی۔ آپ کا جاری کردہ مدرسہ بہت جلد طالبان شوق کی نگاہوں کا مرکز بن گیا، صرف پنجاب اور ہندوستان ہی نہیں بلکہ کئی ہمسایہ ممالک کے اہل شوق آپ کی بارگاہ میں حاضر ہو کر علوم دینیہ میں کمال حاصل کرنے لگے۔ مسلم مورخین نے ہی نہیں بلکہ انگریز تذکرہ نگاروں نے بھی آپ کے علمی فیوضات کے عام ہونے کا ذکر کیا ہے اور برملا اعتراف کیا ہے کہ آپ کا مدرسہ عالیہ پنجاب بھر میں دینی تعلیمات کا عظیم مرکز تھا، جس سے ایک زمانہ فکری روشنی حاصل کر رہا تھا۔ عہد حاضر کی نامور شخصیت حضرت خواجہ محمد بشیر قادری عباسی رحمۃ اللہ علیہ آپ کے حوالے سے 'سیرت الفقراء' میں یوں رقمطراز ہیں "آپ علوم شریعت کے مفتی، علم طریقت کے قاضی، سنت نبوی کے حامل اور ملت احمد کے عالم کامل، مقتدائے دین، ہادی دوران اہل علم کے استاذ و ولایت قلب کے حکمران صاحب علم اہل زمانہ کے پیشوا اور اہل تصوف کے راہنما گزرے ہیں۔"

یہ کہنا بالخصوص حقیقت کا الزام ہے کہ:

عالم کامل فقیہ عصر مروا بے نظیر
فخر ہستی، کاروان عشق و مستی کے امیر
ہیں رضا محبوب عالم شمع بزم معرفت
پیکر زہد و ریاضت، جان جان، مرد شہیر
(از جمال فقر)

ایک عظیم سجادہ روحانیت کے پیشوا اور عظیم علمی درسگاہ کے سربراہ کی حیثیت سے آپ نے ناقابل فراموش خدمات انجام دیں۔ طالبان شوق چاروں طرف سے جوق در جوق آنے لگے، جب شمع علم و آگہی روشن ہو جائے تو پروانے سرمایہ جان و تن لے کر کیوں حاضر نہ ہوں گے۔ آپ سرزمین پنجاب کے نابغہ روزگار محدث، مفسر اور فقیہ تھے۔ آپ کے ناخن تدبیر سے علم و حکمت کی

گتھیاں سلجھتی تھیں۔ عقدے حل ہوتے تھے مسائل کی تفسیر اور تدبیر ممکن ہوتی تھی، آپ کی زبان فیض ترجمان اذہان کو علمی بلندیاں اور دلوں کو روحانی لطافتیں عطا کرتی تھی، اس علاقہ میں آپ کی علمی روحانی اور نظریاتی شخصیت اس قدر قد آور تھی کہ ممتاز ترین شخصیات آپ سے جھک کر ملتی تھیں اور آپ کی ایمان آفریں گفتگو میں اپنے مسائل کا حل تلاش کرتی تھیں۔ یہی نہیں بلکہ جب آپ دور دراز کے علاقوں کا سفر کرتے تھے تو وہاں کے روحانی شیوخ اور سماجی اکابرین آپ کی راہوں میں آنکھیں بچھا دیتے تھے۔

آپ نے شیخ الفقہ اور شیخ القرآن والحدیث کی حیثیت سے جو خدمات انجام دیں، وہ مطلع ایمان پر بصد آب و تاب جگمگاتی رہیں گی، ممتاز مصنفین، شعراء اور ادباء آپ سے رجوع کرتے، آپ کی خدمت میں اپنی گراں قدر تحریریں پیش کرتے، آپ کی رائے ان کیلئے قول فیصل کا درجہ رکھتی تھی، آپ کے فیوض روحانیت کے سرشمے کناروں سے یوں اچھلے کہ برصغیر کے بے شمار علمی حلقوں کو سیراب کرنے لگے اور آپ کے علمی اور فقہی مقامات کا تذکرہ ہر سو پھیل گیا۔ آپ کا درس شریف حقیقی معنوں میں عظیم دبستان حکمت تھا، جس سے فیضیاب ہونے کیلئے عوام الناس ہی رجوع نہیں کرتے تھے بلکہ نامور مذہبی، روحانی اور علمی شخصیات بھی اس عظیم درسگاہ سے خوشہ چینی کرتے ہوئے فخر محسوس کرتی تھیں۔ نامور محدثین اور مفسرین آپ کے ارشادات عالیہ کو سونے میں تولتے تھے۔ آپ کے علمی کمالات اور فکری محاسن کی شہرت چاروں طرف اس شان سے پھیل چکی تھی کہ آپ کے وصال تک آپ کو سرزمین گوجرانوالہ کی علمی اور سماجی پہچان سمجھا جاتا تھا اور آج بھی جبکہ آپ کو وصال فرمائے ایک صدی سے زائد کا عرصہ بیت چکا ہے آپ کا اسم گرامی تاریخ گوجرانوالہ کے علمی اعزاز کی حیثیت سے پہچانا جاتا ہے۔

جس طرح کسی درخت کی قدر و قیمت کا اندازہ اس کی گھنی چھاؤں اور پھل سے لگایا جاتا ہے اسی طرح استاد کی علمی سرفرازی کا تعین اس کے تلامذہ اور اس کے سرچشمہ حکمت سے خوشہ چینی کرنے والوں کو دیکھ کر کیا جاسکتا ہے، مولانا محبوب عالم رحمۃ اللہ علیہ کے شاگردوں کی طویل فہرست میں فقط چند پر ہی نظر ڈالیں تو آپ کی علمی فضیلت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ آپ کے ارشد تلامذہ میں سے حضرت خواجہ محمد کریم اللہ عباسی قادری رحمۃ اللہ علیہ (مخدوم العصر کے لقب سے معروف نامور شاعر اور اپنے دور میں دربار قادریہ بازار خراداں کے سجادہ نشین)، حضرت پیر سید غلام حیدر شاہ نقشبندی (سجادہ نشین دربار کروتو پنڈوریاں)، سید غلام بھیک نیرنگ (نامور شاعر انشاء پرداز عالم)، غلام قادر زیرک

(عربی، فارسی اور اردو کے ماہر، معروف عالم اور ممتاز شاعر) ایسی شخصیات ہیں جن کے علمی کارنامے اپنے استاد کامل کی حقیقی فضیلت کے راز دار ہیں۔ آپ کی شادی ماڑی کلاں کے ہاشمی خاندان کی نیک خاتون رمضان بی بی سے ہوئی تھی جنہوں نے اپنے صد افتخار شوہر کی کاوشوں کو آگے بڑھانے کیلئے امور خانہ داری کے ساتھ ساتھ خواتین کی تعلیم کے لحاظ سے بھی یادگار کردار ادا کیا۔

ایک معروف سجادہ کے سربراہ نامور عالم دین اور فقیہ یگانہ ہونے کی بناء پر آپ مسلمانوں میں ہی غیر معمولی مقام نہیں رکھتے تھے بلکہ انگریزی حکومت ہندو اور سکھ آپ کو یکساں عزت و احترام کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ آپ ایسے مفتی تھے کہ جس کے فتویٰ کو معاشرتی ہی نہیں بلکہ سرکاری سطح پر بھی قول فیصل کا درجہ حاصل تھا۔ بعض اوقات حکومت انگلشیہ دینی معاملات آپ پر چھوڑ دیتی تھی اور دیگر مذاہب کے لوگ اپنے اپنے مذاہب کے مطابق آپ ہی کی رائے کو فوقیت دیتے تھے۔ حکومت انگلشیہ کا دور مسلمانوں کیلئے انتہائی کٹھن تھا، حکومت ہاتھوں سے چھن چکی تھی۔ اب اسلامی اقدار کا وجود بھی خطرے میں تھا۔ آپ نے اس نازک صورتحال کو بھانپ لیا اور اہل اسلام کی بھرپور راہنمائی اور قیادت کا حق ادا کیا۔

انگریزی حکومت نے بھی آپ کے مقام و مرتبہ اور سماجی و علمی حیثیت کو دیکھتے ہوئے شہر گوجرانوالہ کی ترقی و بہبود کیلئے آپ کو تیس برس تک مسلمانوں کے واحد نمائندہ کے طور پر نامزد کئے رکھا۔ اس کے علاوہ آپ متعدد سماجی تعلیمی اور معاشرتی اداروں کے رکن اور سربراہ بھی تھے۔ آپ نے تمام دینی و دنیاوی امور میں اس شان سے راہنمائی اور قیادت کا حق ادا کیا کہ اپنے ہی نہیں بلکہ اغیار بھی آپ کی خداداد صلاحیتوں کے معترف ہو گئے۔ آپ کے نام متعدد حکومتی مراسلوں اور اسناد سے آپ کی سیاسی اور دینی بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ آپ کی زندگی کے حالات پر ایک طائرانہ نظر ڈالیں تو درجنوں ایسے واقعات نظر آتے ہیں جو آپ کی علمی سیادت، ہر دلعزیزی اور روحانی بلندیوں کی شہادت دے رہے ہیں۔ یاد رہے کہ آپ تیس سال تک گوجرانوالہ شہر کی انتظامیہ کے اعلیٰ رکن رہے تھے۔

آپ صحیح معنوں میں مرد درویش تھے۔ اپنے دور کی نامور ترین سماجی، روحانی اور علمی شخصیت ہونے کے باوجود آپ نے مدرسہ اور اپنے شاگردوں کی تدریس کو کبھی فراموش نہ کیا۔ آپ کی زندگی رضائے الہی کی تصویر تھی اور حق تو یہ ہے کہ جب مرد مومن رضائے الہی میں ڈھل جاتا ہے تو اس کی تدبیر خدا کی تقدیر کا پرتو بن جاتی ہے اور یہیں سے کرامات کا ظہور ہوتا ہے۔ آپ صاحب کرامات کثیرہ تھے لیکن ہمارے نزدیک آپ کی سب سے بڑی کرامت یہی تھی کہ آپ نے ظلمت کدوں

میں خدا آگاہی کے چراغ روشن کئے۔ زوال پذیر مسلمانوں کو علمی لحاظ سے باوقار ہونے کا شعور بخشا۔ جھوٹے عقائد اور نظریات کے خلاف جہاد کیا اور بندگان خدا کو صحیح معنوں میں معرفت خداوندی کی لذت عطا کر دی۔

ایک طویل عرصہ تک رشد و ہدایت کے چراغ روشن رکھنے کے بعد بالآخر اس مرد کامل کی زندگی کی آخری ساعتیں آ پہنچیں۔ آپ نے پیرانہ سالی کے باوجود تعلیم و تدریس اور تبلیغ اسلام کا مشن جاری رکھا۔ بالآخر ۱۵ رمضان المبارک ۱۳۲۱ھ بمطابق ۵ دسمبر ۱۹۰۳ء جمعہ اور ہفتہ کی درمیانی شب کو ساڑھے گیارہ بجے کے قریب آپ نے پیام اجل پر لبیک کہتے ہوئے اپنی جان خدا کے سپرد کر دی۔ وفات کے وقت بھی آپ کے لبوں پر دل نواز مسکراہت رقصاں تھی۔

نشان مرد مومن باتو گویم

چوں مرگ آید تبسم برب اوست

آپ کی نماز جنازہ میں شہر اور علاقہ کے ہر مکتبہ فکر اور تمام شعبہ جات سے تعلق رکھنے والے افراد نے ہزاروں کی تعداد میں شرکت کی اور آپ کو خانقاہ عالیہ قادریہ نوریہ بیرون کھیالی دروازہ میں دفن کر دیا گیا۔ یہی وہ روحانی گلستان تھا جو آپ کے علمی فیوض کی بدولت ایک طویل عرصہ تک اپنی بہار دکھاتا رہا۔ آپ کی وفات پر برصغیر پاک و ہند کے درجنوں شعراء نے آپ کو منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔

آپ کے بارے میں تذکار کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے متعدد علمی اور فقہی تصانیف کے حواشی بھی تحریر کئے اور کئی کتابوں پر اعلیٰ فقہی انداز کی تقاریر اور آراء بھی تحریر کیں۔ ان تذکار سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ گونا گوں مصروفیات سے وقت نکال کر تصنیف و تالیف کی جانب بھی رخ کر لیا کرتے تھے۔ اس سلسلہ میں بطور خاص آپ کی تصنیف ”شرح اللہ الحسین والحسین والدعا المرثی“ کا نام سامنے آتا ہے مگر امتداد زمانہ نے جس طرح آپ کا عظیم کتب خانہ نگاہوں سے اوجھل کر دیا اسی طرح آپ کی علمی اور ادبی کاوشیں بھی صرف تذکروں کی زینت بن کر رہ گئی ہیں۔ اے کاش ماضی واپس لوٹ آئے اور کسی طور آپ کی متاع گم گشتہ اصحاب تحقیق کی توجہ کا مرکز بن سکے تاکہ آپ کے جلائے ہوئے چراغوں سے نئے تحقیقی چراغ روشن ہو سکیں۔

چونکہ درگاہ حضرت میاں میر رحمۃ اللہ علیہ آپ کی تمام روحانی توجہات کا مرکز تھی اس لئے آپ وہاں کے اعراس اور تقاریب میں باقاعدگی سے شریک ہوتے۔ خطہ لاہور کے اولیائے کرام اور

برصغیر کے صوفیائے کرام کے مزارات پر حاضری دیتے۔ گوجرانوالہ میں غوث العصر حضرت خواجہ محمد عمر عباسی قادری رحمۃ اللہ علیہ کی ذات آپ کے خلوص و محبت کا خصوصی مرکز تھی۔ خانقاہ معلیٰ قادریہ بازار خراداں اور خانقاہ عالیہ قادریہ نوریہ کھیالی دروازہ کا روحانی تعلق خاطر ہر دور میں اپنی مثال آپ بن کر جگمگاتا رہا۔ آپ خانقاہ عالیہ قادریہ نوریہ میں اپنے تمام اسلاف کے اعراس باقاعدگی سے منعقد کرواتے رہے کہ آج بھی اس درگاہ عالیہ کی تمام روحانی تقاریب تواتر اور باقاعدگی سے منعقد ہو رہی ہیں۔ ۵ دسمبر کو منعقد ہونے والا عرس پاک بھی اسی درگاہ کے روحانی مشاغل کی پاکیزہ کڑی ہے جو ایک صدی سے زائد عرصے سے باقاعدگی سے انعقاد پذیر ہو رہا ہے۔

شمس العلماء حضرت مولانا محبوب عالم رحمۃ اللہ علیہ کے روحانی فیوض کے سلسلے کو آپ کے بعد ممتاز روحانی شخصیت حضرت مولانا غلام جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے تادم آخر جاری رکھا۔ حضرت مولانا غلام جیلانی، مولانا محمد عبداللہ کے فرزند تھے اور ان کے دادا کا نام مولانا حسام الدین تھا جو مولانا محبوب عالم رحمۃ اللہ علیہ کے برادر بزرگ تھے۔ چونکہ مولانا محبوب عالم رحمۃ اللہ علیہ کی اپنی اولاد نہیں تھی اس لئے آپ نے حضرت مولانا غلام جیلانی رحمۃ اللہ علیہ ہی کو اپنا جانشین نامزد کر دیا۔ مولانا غلام جیلانی نے اپنی روحانی ریاضت اور زہد و تقویٰ سے ثابت کر دیا کہ آپ کا انتخاب نہایت درست اور تاریخ تصوف کا اہم اور روشن باب تھا۔

حضرت قبلہ مولانا محبوب عالم رحمۃ اللہ علیہ نے علم و فضل کے فروغ کیلئے تمام زندگی بھر پور کاوشیں کیں جن کا اعتراف ایک زمانے کو ہے۔ دینی اور روحانی تعلیمات کا سلسلہ آپ کے بعد بھی جاری رہا۔ آج جب ہم درگاہ قادریہ نوریہ کے روحانی ماحول میں داخل ہوتے ہیں تو یہاں کی ایمان آفریں اور روحانی لحاظ سے پُر شکوہ عمارات کا ایک سلسلہ بے اختیار دامان توجہ کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ درگاہ کے احاطہ میں داخل ہوتے ہی حضرت مولانا نور احمد رحمۃ اللہ علیہ کا مزار پاک نظر آتا ہے۔ آگے بڑھیں تو جامع مسجد کا ظاہری اور باطنی حسن اپنی جانب متوجہ کرتا ہے۔ اور پھر فوراً حضرت داتا شاہ جمال نوری رحمۃ اللہ علیہ کا پُر شکوہ روضہ اقدس اپنے تمام تر حسن کے ساتھ زائرین کے قلب و نظر میں سما جاتا ہے۔ حضرت داتا شاہ جمال نوری رحمۃ اللہ علیہ کے روحانی سائے میں شمس العلماء مولانا محمد محبوب عالم رحمۃ اللہ علیہ حضرت مولانا غلام جیلانی رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے روحانی اکابرین آرام فرما رہے ہیں۔ دینی تعلیمات کے فروغ کیلئے مدرسہ فیض العلوم آج بھی اپنی فکری خوشبو لٹا رہا ہے۔ ان عظیم اور دلکش عمارات کی تعمیر کے سلسلہ میں حضرت مولانا غلام جیلانی کے فیض خوردہ اور

آپ کے روحانی فیوض سے دل و جان کو آباد کرنے والے حضرت پیر عاشق جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا کردار بھی شمع روشن کی طرح جگمگا رہا ہے، جنہوں نے اپنے وصال تک اپنے مرشد کی محبت کو متاع جان بنائے رکھا۔ آج وہ دنیا میں نہیں مگر پیر خانے سے ان کی محبت کی داستایں دلوں کو عقیدت کا حسن بخش رہی ہیں۔

ہم مشہور شاعر غلام بھیک نیرنگ کے اس شعر پر اس تحریر کو ختم کر رہے ہیں؛

اسم تو محبوب عالم منظر نور خدا
قاضی شرع محمد ہادی راہ صفا



جمال الاولیاء

حضرت داتا شاہ جمال نوری رحمۃ اللہ علیہ

تاریخ اسلام شاہد ہے کہ اولیائے کرام نے ہر عہد میں ہر علاقے میں عظمت اسلام کے چراغ روشن کئے ہیں۔ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ اسلام تلوار کے زور سے نہیں بلکہ اولیاء و صوفیاء کے کردار کی سر بلندیوں اور ان کے اخلاق عالیہ کی تاثیر سے پھیلا ہے۔ سلاطین اور شہنشاہوں نے انسانی جسموں پر حکومت کی ہے جبکہ اولیائے کرام کی لازوال حکمرانی عوام الناس کے دل و دماغ پر رہی ہے اور حکمرانی وہی ابدی ہوتی ہے جس کا تعلق دل سے ہوتا ہے۔ اس لئے ان صوفیائے عظام کی حکومت دائمی ہے۔ کائنات انسانی کے دوسرے علاقوں کی طرح برصغیر پاک و ہند میں کروڑوں مسلمانوں کا وجود انہی اولیائے کرام کی مقدس تعلیمات اور ان کی روحانی مساعی کا مرہون منت ہے۔ ان صوفیائے عظام نے شہروں، بستیوں، جنگلوں، ویرانوں غرضیکہ ہر علاقے اور خطے میں خدا اور رسول خدا حضور محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام سرمدی سنایا۔ علم و حکمت کے جواہر تقسیم کئے، رشد و ہدایت کے انعامات لٹائے اور کفر و ضلالت میں گھرے ہوئے انسانوں کے دلوں کو اسلام کی روشنی اور ایمان کی تابندگی عطا کر دی۔

سلسلہ عالیہ قادریہ چشتیہ نقشبندیہ سہروردیہ سمیت تمام سلاسل معرفت کے صوفیاء کی خدمات اس ضمن میں ہماری تاریخ ایمان و یقین کا اعزاز ہیں۔ سلسلہ قادریہ کے عظیم روحانی پیشوا اور سلطنت فقر کے تاجدار حضرت میاں میر بالا پیر لاہوری قادری رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت اور آپ کی مساعی جلیلہ کا تذکرہ ہم گذشتہ باب میں کر چکے ہیں۔ اس باب میں ہمیں آپ ہی کے سلسلے کے روشن ضمیر ولی حضرت داتا شاہ جمال نوری قادری رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ مقصود ہے جنہوں نے میاں میر قادری لاہوری کے حکم کی تعمیل میں سرزمین گوجرانوالہ کو قادریت کے سدا بہار فیوض کی نعمت سے بہرہ ور کر دیا۔

ولادت

حضرت داتا شاہ جمال نوری قادری رحمۃ اللہ علیہ کی پیدائش موضع حضرت والا ضلع ڈیرہ غازی خاں میں ہوئی۔ آپ کا وطن مالوف قبلہ عالم حضرت میاں میر قادری لاہوری کے علاقہ پیدائش سے قریب ہی ہے۔ حضرت میاں میر قادری سیوستان کے رہنے والے تھے۔ حضرت داتا شاہ جمال نوری کے حالات زندگی بہت کم دستیاب ہیں۔ بیشتر حالات کا دارو مدار دو چار کتب تذکرہ اور ان کے خاندان میں سینہ بہ سینہ منتقل ہونے والی روایات پر ہے۔ تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کے خاندان کے مورث اعلیٰ فاتح سندھ عماد الدین محمد بن قاسم کے ہمراہ فتوحات اور تبلیغ اسلام کے سلسلہ میں سندھ میں تشریف لائے۔ چونکہ مسلم فاتحین اپنے ساتھ مبلغین اسلام اور فقہاء و علماء کو لے کر چلتے تھے کہ مفتوحہ علاقہ کو اسلام کی روشنی سے جگمگا سکیں۔ اس لئے شاہ جمال نوری کے مورث اعلیٰ کا فاتح فوج کے ساتھ برصغیر میں آنا قرین قیاس اور تاریخی حقیقت کے عین مطابق نظر آتا ہے۔

اس خاندان کے مورث اعلیٰ نے پہلے پہل اوچ شریف میں قیام کیا اور پھر ڈیرہ غازی خاں میں مقیم ہوئے اور کچھ عرصہ گزرنے کے بعد یہ خاندان ڈیرہ غازی خاں کے قریبی گاؤں حضرت والا میں آ کر مقیم ہو گیا۔ معلوم نہیں اس گاؤں کا پہلا نام کیا تھا مگر چونکہ حضرت داتا شاہ جمال نوری رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت تک اس گاؤں میں اس خاندان کے کئی صاحب فکر و نظر بزرگ یکے بعد دیگرے رشد و ہدایت کا سلسلہ پھیلا چکے تھے۔ اس لئے ہم سمجھتے ہیں کہ اس گاؤں کو اس خاندان کی عالی نسبی اور علمی و روحانی حیثیت کی بناء پر ”حضرت والا“ کہا جاتا تھا۔

حضرت داتا شاہ جمال نوری رحمۃ اللہ علیہ کی تاریخ پیدائش کا تعین نہیں کیا جاسکتا۔ گمان اغلب یہ ہے کہ جن دنوں آپ لاہور تشریف لائے تھے۔ حضرت میاں میر قادری کی روحانی عظمت و شہرت چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ لاہور میں داتا شاہ جمال نوری کی آمد تحصیل علم کیلئے تھی۔ یہ آپ کی طالب علمی کا ابتدائی اور حضرت میاں میر قادری رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کا آخری دور تھا۔ حضرت میاں میر قادری کا سن وفات ۱۰۲۵ھ ہے۔ اگر یہ تصور کر لیا جائے کہ آپ حضرت میاں میر قادری رحمۃ اللہ علیہ کے وصال سے دس برس بیشتر لاہور تشریف لائے اور اس وقت آپ کی عمر تقریباً پچیس سال ہو (جیسا کہ یہ عمر ابتدائی تعلیم کے بعد دینی و روحانی تعلیم کیلئے مخصوص ہوتی ہے) تو پھر آپ کا سن ولادت اندازاً ۱۰۱۰ھ کے لگ بھگ بنتا ہے۔

حسب و نسب:

حضرت شاہ جمال نوری رحمۃ اللہ علیہ حسب و نسب کے لحاظ سے قریشی صدیقی تھے۔ آپ کا سلسلہ نسب ۱۷ واسطوں سے خلیفہ اول حضرت سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے جا ملتا ہے۔ روحانی سلسلے سے آپ قادری تھے اس طرح آپ کا سلسلہ مختلف شیوخ قادریت کی وساطت سے خلیفہ چہارم سیدنا حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے واسطوں سے جا ملتا ہے۔ ہم آپ کے خاندانی اور روحانی سلاسل درج کر رہے ہیں۔

شجرہ بلحاظ خاندان (صدیقی قریشی)

حضرت شاہ جمال نوری بن حضرت شاہ مرید الدین بن حضرت شاہ حسام الدین بن حضرت شیخ محمد شریف بن حضرت شیخ محمد حاجی بن حضرت شیخ محمد احمد بن حضرت شیخ عبدالرحمن بن حضرت شیخ محمد شریف بن حضرت شیخ معروف بن حضرت شیخ داؤد بن حضرت شیخ وجہ الدین بن حضرت شیخ نجم الدین بن حضرت شیخ محمد سلیمان بن حضرت شیخ ابراہیم بن حضرت شیخ عبدالشکور بن حضرت شیخ علاؤ الدین بن حضرت شیخ مودود بن حضرت شیخ قاسم بن حضرت شیخ عبداللہ درمی بن حضرت شیخ عبدالحمید بسطامی بن حضرت شیخ ابوالحسن گادزونی بن حضرت شیخ محمد راضی بن حضرت شیخ محمود بغدادی بن حضرت شیخ جعفر بغدادی بن حضرت شیخ محمد قاسم بن حضرت شیخ ابو محمد مکی بن سیدنا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ

سلسلہ بلحاظ طریقت (سلسلہ عالیہ قادریہ)

حضرت داتا شاہ جمال نوری صدیقی قادری مرید حضرت شاہ ابوسعید معصوم مرید شیخ العالم حضرت میاں محمد میر بالا پیر قادری لاہوری مرید حضرت خضر ابدال بیابانی مرید حضرت سید احمد مرید حضرت سید ابد کبیر مرید حضرت شیخ ابوالقاسم مرید حضرت موسیٰ حلپی مرید حضرت خواجہ ابوبکر مقتول مرید حضرت ابوداؤد مرید حضرت شاہ سلیمان مرید حضرت حفص ابوبکر مرید حضرت خواجہ حسن قرشی مرید حضرت عبدالرزاق مرید غوث الاعظم سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی بغدادی مرید حضرت شیخ ابوسعید مرید حضرت شیخ سنکاری مرید حضرت شیک ابوالفرح طرطوسی مرید حضرت شیخ عبدالواحد یمنی مرید حضرت شیخ شبلی مرید سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی مرید حضرت سری سقطلی مرید حضرت خواجہ حبیب بنگالی مرید حضرت خواجہ حسن بھری مرید شیر خدا حضرت علی کرم اللہ وجہہ۔

شیخ کامل کے حضور حاضری

آپ نے ابتدائی تعلیم اپنے ہی موطن میں اپنے دادا حضرت شاہ حسام الدین رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل کی اور پھر مزید دینی تعلیم کیلئے لاہور چلے آئے۔ آپ ہی کے علاقہ کے حضرت میاں میر قادری رحمۃ اللہ علیہ اس سے قبل لاہور آ کر زمانے بھر کو علمی فیضان بخش رہے تھے۔ جس طرح سے حضرت دادا شاہ جمال نوری حضرت میاں میر قادری کی تقلید میں اپنے علاقہ سے لاہور چلے آئے اور پھر جس طرح آپ کی حضرت میاں میر قادری رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات ہوتی اس سے خیال ہوتا ہے کہ یہ پہلے سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں گے اور کچھ بعید نہیں کہ ان میں آپس کی رشتہ داری بھی ہو۔

جب دادا شاہ جمال نوری رحمۃ اللہ علیہ طلب علم کی آرزو لئے لاہور پہنچے تو آپ نے تحصیل علوم دینیہ کیلئے اس دور کے مختلف مدارس علمیہ سے رجوع کیا۔ ایک روایت کے مطابق آپ میاں وڈھا کی درسگاہ میں دینی علوم کی تحصیل کرتے رہے۔ تحصیل علم کے اسی عرصہ کے دوران میں آپ کی ملاقات حضرت میاں میر قادری رحمۃ اللہ علیہ سے ہوئی اور یہی ملاقات آپ کو زندگی کی آخری سانس تک ان کے حلقہ بگوش بنا گئی۔ ایک روز حضرت شاہ جمال نوری رحمۃ اللہ علیہ اپنے مدرسہ سے کچھ فاصلہ پر کھڑے تھے کہ ادھر سے حضرت میاں میر قادری رحمۃ اللہ علیہ کا گزر ہوا۔ آپ نے اس سعید بخت نوجوان کو دیکھا تو طبیعت میں ذوق سخاوت چل اٹھا اور پوچھا:

”نوجوان! تم نے کیا پڑھا ہے؟“

حضرت شاہ جمال نوری رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کے سوال کے جواب میں عرض کیا: حضرت میں نے علوم دینیہ پڑھے ہیں۔

حضرت میاں میر قادری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: نہیں نوجوان تم کچھ بھی نہیں پڑھے۔

شاہ جمال نوری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی عرض پر اصرار کرتے ہوئے کہا: یا حضرت! میں دینی علم پڑھ رہا ہوں۔

حضرت میاں میر قادری رحمۃ اللہ علیہ نے بدستور فیصلہ کن لہجہ میں فرمایا: نوجوان تمہارا اصرار غلط ہے ہمارے حساب سے تم بالکل نہیں پڑھے۔

حضرت میاں میر قادری رحمۃ اللہ علیہ کے اس فیصلہ کن جواب نے نوجوان شاہ جمال نوری کی نگاہیں روشن کر دی۔ دل پر خرد کی بے بسی اور علم کی بے بھری واضح ہو گئی۔ فوراً اظہار

ندامت میں عرض کیا:

”حضور! آپ سچ فرماتے ہیں کہ میں نے کچھ نہیں پڑھا، مگر اب میں پڑھنے کا متمنی ہوں، لگا ہیں بے اختیار آپ کی جانب اٹھ رہی ہیں۔ اللہ کرم فرمادیتے۔“

حضرت میاں میر قادری رحمۃ اللہ علیہ نے ایک شان استغناء سے نوجوان شاہ جمال نوری رحمۃ اللہ علیہ کی طرف دیکھا اور چپکے سے اپنی خانقاہ کی طرف ہو لئے۔ نوجوان شاہ جمال نوری کہ جن کے قلب و نظر میں محشر پاتا تھا، بصد منت وزاری آپ کے پیچھے پیچھے چلنے لگے، جب حضرت میاں میر قادری رحمۃ اللہ علیہ خانقاہ میں جا پہنچے تو شاہ جمال نوری رحمۃ اللہ علیہ نے دست بستہ عرض کیا کہ ”حضور! خرد کی گتھیاں تو سلجھا چکا ہوں اب آپ کے فیضانِ نظر کا منتظر ہوں۔ خدارا مجھے اپنے دامانِ کرم سے وابستہ کر لیجئے۔ حضرت میاں میر قادری رحمۃ اللہ علیہ کا بحر کرم تو پہلے ہی موجی پر تھا۔ وہ تو اپنی جوان رعنا کی پیشانی سے ابھرتے ہوئے آثارِ سعادت کو پہلے ہی ملاحظہ فرما چکے تھے فوراً اپنا دامان لطف دراز کر دیا اور اس بلند قسمت نوجوان طالب علم شاہ جمال نوری رحمۃ اللہ علیہ کی روحانی و باطنی تربیت کا مرحلہ شروع کر دیا۔

روحانی تربیت

شاہ جمال نوری رحمۃ اللہ علیہ دینی علوم کی تحصیل تو کر چکے تھے روحانی و باطنی فیوض کی بارانِ رحمت نے انہیں مسِ خام سے کندن بنا دیا۔ حضرت میاں میر قادری رحمۃ اللہ علیہ کی خانقاہ ان کیلئے دبستانِ معرفت ثابت ہوئی۔ کہتے ہیں کہ زمین جس قدر زرخیز ہوا اتنا ہی زیادہ نم قبول کرتی ہے۔ شاہ جمال نوری رحمۃ اللہ علیہ کی کشتِ آرزو تو مدتوں سے ایسے ہی ابر گوہر بار کے برسنے کی منتظر تھی اس لئے آپ نے حضرت میاں میر قادری رحمۃ اللہ علیہ کے سرچشمہ معرفت سے جی بھر کر سیرابی حاصل کی۔ حضرت میاں میر قادری رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کو روحانی گداز، باطنی مشاہدات اور روحانی سوز و ساز سے بہرہ ور کر دیا۔ عبادت و ریاضت میں اوقات بسر ہونے لگے مجاہدے اور ریاضتیں ان کا معمول بنتی گئیں اور پھر وہ وقت بھی آیا کہ حضرت میاں میر قادری رحمۃ اللہ علیہ آپ کی روحانی کاوشوں کو اپنی پسندیدگی سے نوازنے لگے۔

حضرت میاں میر قادری رحمۃ اللہ علیہ کا معمول تھا کہ کسی طالبِ راہِ حق کو خصوصی عنایات سے نوازتے تو اسے مجاہدوں اور ریاضتوں سے گزار کر اپنے کسی خلیفہ خاص کے سپرد کر دیتے تاکہ پیرہ نور و راہ شوق منزلِ حق و صداقت پر فائز ہو سکے۔ شاہ جمال نوری رحمۃ اللہ علیہ کی روحانی تربیت

کی تکمیل کیلئے حضرت میاں میر قادری رحمۃ اللہ علیہ نے انہیں اپنے مرید خاص اور خلیفہ حضرت شاہ ابوسعید معصوم رحمۃ اللہ علیہ کے سپرد کر دیا اور انہیں تاکید فرمائی کہ اس صاحب ذوق و شوق کی باطنی تربیت میں کوئی کمی واقعی نہ ہونے پائے۔ ایک تو مرشد کا حکم تھا اور دوسرے شاہ جمال نوری رحمۃ اللہ علیہ کی طبع ساز کا کمال تھا کہ حضرت شاہ ابوسعید معصوم نے ان پر باطنی توجہ کو بطور خاص مرکوز کر دیا اور یہ نہایت تیزی سے فکری و نظری فیوض سے بہرہ یاب ہونے لگے۔ حضرت شاہ ابوسعید معصوم رحمۃ اللہ علیہ عظیم المرتبت ولی اللہ تھے۔ آپ کا مزار اقدس کوٹ رندھاوا ضلع امرتسر میں ہے۔

اگرچہ شاہ جمال نوری رحمۃ اللہ علیہ کی باقاعدہ بیعت حضرت ابوسعید معصوم رحمۃ اللہ علیہ سے تھی لیکن آپ کو حضرت میاں میر قادری رحمۃ اللہ علیہ کے انعامات بھی مسلسل حاصل ہوتے رہے۔ اپنے مرشد کامل کے ارشادات کی روشنی میں شاہ جمال نوری کا مقدر ہر آن سنورتا رہا۔ ان کی کتنی بڑی خوش نصیبی تھی کہ ان پر ایک طرف تو مرشد کامل کی نوازشات برس رہی تھیں اور دوسری طرف حضرت میاں میر قادری رحمۃ اللہ علیہ بھی انہیں مسلسل اپنی باطنی توجہ کا حقدار بنائے ہوئے تھے۔

ع..... یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

حضرت ابوسعید معصوم رحمۃ اللہ علیہ کی نگاہِ کیمیا اثر نے حضرت میاں میر قادری رحمۃ اللہ علیہ کے حکم کی تعمیل میں اس نوجوان صالح کو روحانی طور پر وہ سر بلندیاں عطا کیں کہ دوسرے مریدین اس پر رشک کرنے لگے جب شیخ کامل نے دیکھ لیا کہ صاحب دل مرید نے اس کے حلقہ تربیت سے پورا پورا استفادہ کر لیا ہے تو انہوں نے حضرت شاہ جمال نوری کو خرقہ خلافت عطا کر دیا۔ حضرت شاہ جمال نوری رحمۃ اللہ علیہ تو خرقہ خلافت سے زیادہ اپنے شیخ کی صحبت میں رہنا پسند کرتے تھے۔ انہیں اپنے شیخ سے دوری گوارا نہ تھی مگر حضرت ابوسعید معصوم رحمۃ اللہ علیہ نے شفقت سے سمجھایا کہ:

”شمع کا کام روشنی پھیلانا ہے۔ اسلام کا مقصود بھی یہی ہے کہ ہدایت کی روشنی پھیلتی رہے۔ ہم نے حق و صداقت کی جو شمع تمہارے سینے میں روشن کی ہے تمہارا فرض ہے کہ اس کی روشنی سے زیادہ سے زیادہ خلق خدا کو فیضیاب کرو اور اپنے علم و حکمت سے ان علاقوں کو فیضیاب کرو جو تعلیمات اسلامی کی روشنی سے محروم ہیں۔“

اپنے شیخ کے حکم کی تعمیل میں آپ نے اپنے سر کو جھکا لیا تو حضرت ابوسعید معصوم حضرت میاں میر قادری کے ایما پر فرمانے لگے

”ہم نے گوجرانوالہ کی ولایت تمہارے سپرد کی ہے۔ جاؤ اور اس علاقے میں عظمت اسلام

کے پیغام کو عام کر دو۔ اس علاقہ کی مخلوق خدا کو اسلام اور قرآن کی تعلیم سے آشنا کرو، ظلمتوں میں ایمان کے چراغ روشن کرو اور تاریک دلوں کو نورِ ہدایت سے جگمگا دو۔

گوجرانوالہ آمد

آپ نے اپنے شیخ عالی مقام کے حکم پر آمنا و صدقنا کہا اور حکم کو بجالاتے ہوئے گوجرانوالہ کو روانہ ہو گئے۔ اس دور میں گوجرانوالہ شہر کی کوئی خاص اہمیت نہیں تھی۔ اس نام کا ایک گاؤں جی ٹی روڈ کے کنارے آباد تھا۔ آپ گوجرانوالہ کے نواحی گاؤں کھیالی میں مقیم ہو گئے اور رشد و ہدایت کا سلسلہ شروع کر دیا۔ تبلیغ و اشاعت دین کیلئے گاؤں کی فضا تنگ محسوس ہوتی تو کھیالی گاؤں سے جنوب کی جانب اپنی خانقاہ قائم کی۔ آج تو گوجرانوالہ اور کھیالی کے درمیان آبادی کی کثرت کی بناء پر فاصلہ نظر نہیں آتا۔ اس دور میں آپ کی خانقاہ اس راستے پر قائم تھی جو کھیالی سے گوجرانوالہ کو جاتا تھا۔ آنے والے ادوار میں جب گوجرانوالہ کی حدود وسیع ہوئیں تو شہر گوجرانوالہ کی آبادی آپ کی خانقاہ تک آ پہنچی اور آپ کی خانقاہ کے محل وقوع کو بیرون کھیالی دروازہ کہا جانے لگا۔

جس طرح خوشبو پھول کے لپٹن سے پھوٹی اور ماحول کو معطر کر دیتی ہے اسی طرح اولیاء اللہ کا پیغام بھی ان کے دلوں سے ابھر کر عوام الناس کے دلوں میں اپنا مقام بناتا ہے۔ حضرت شاہ جمال نوری رحمۃ اللہ علیہ کا پیغام فی الحقیقت محبت و خلوص کی خوشبو کا پیغام تھا۔ یہ پیغام معرفت الہی اور جذب و شوق کا پیغام تھا، یہ تو دکھ درد کے مارے ہوؤں کیلئے امن و راحت کا پیغام تھا، یہ تعلیمات قرآنی کی اشاعت اور عشق مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام تھا۔ آپ کا پیغام دلوں میں گھر کرنے لگا، اہل نظر آتے اور دامانِ مراد بھر کر لے جاتے، جو ایک بار آپ کے حلقہٴ صحبت میں آتا، ہمیشہ ہمیشہ کیلئے آپ کا ہو کر رہ جاتا۔ آپ کی صحبت دلوں کو روحانی گداز اور ایمانی تب و تاب بخش دیتی۔ غم حیات کے مارے ہوئے آپ کے دامن میں پناہ لیتے تو انہیں آلام روزگار کی سختیوں سے رہائی کا احساس ہونے لگتا۔ آہستہ آہستہ آپ کے نام کے ساتھ ”داتا“ کا لفظ مختص ہو گیا اور ارادت مند آپ کو داتا شاہ جمال نوری رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے پکارنے لگے۔ یہی نام آج تک نیاز مندوں کیلئے پیغام سکون بنا ہوا ہے۔

تبلیغ و اشاعت اسلام

حضرت داتا شاہ جمال نوری رحمۃ اللہ علیہ سلسلہ عالیہ قادریہ کے نامور راہنمائے طریقت

تھے۔ آپ کو غوث الاعظم شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ سے غیر معمولی عقیدت تھی اور سلسلہ عالیہ قادریہ کے روحانی معمولات نہایت پابندی سے ادا فرماتے، جس دور میں آپ نے خانقاہ قادریہ کے ذریعہ روحانی فیوض لٹانے شروع کئے تھے اس دور میں یہ علاقہ اسلامی تہذیب و تمدن کی روشنی سے بڑی حد تک محروم تھا۔

اس علاقہ میں ہندو سکھ کثرت سے آباد تھے اور بیشتر زمینوں پر بھی وہی قابض تھے۔ مسلمانوں کی تعداد بھی کم تھی اور ہندوؤں سکھوں کی دیکھا دیکھی کئی غیر اسلامی رسوم مسلمانوں میں رواج پذیر ہو گئی تھیں۔

حضرت داتا شاہ جمال نوری رحمۃ اللہ علیہ نے عظمت اسلام کا پرچم اس شان سے لہرایا کہ چاروں طرف اسلامی تعلیمات کا دور دورہ ہونے لگا۔

آپ نے جہاں غیر مسلموں کو اسلام کی عظمت و حقانیت کی طرف مائل کیا وہاں ان مسلمانوں کو جو جادہ حق سے بھٹک چکے تھے پھر سے صراط مستقیم پر گامزن کیا۔ ہندو سکھ آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور آہستہ آہستہ ان پر اسلام کی حقانیت کا رنگ غالب آنے لگتا اور وہ حلقہ بگوش اسلام ہو جاتے۔ وہ مسلمان جو خدا و رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے غافل ہو چکے تھے آپ نے انہیں پھر سے شعائر ایمان کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا۔

حضرت داتا شاہ جمال نوری رحمۃ اللہ علیہ کا انداز تبلیغ نہایت سادہ اور موثر تھا۔ آپ بحث و مباحثہ سے گریز کرتے اور پُر تاثیر انداز سے وعظ و نصیحت فرماتے۔ یہی وجہ تھی کہ جس کے کانوں میں ایک بار آپ کے کلمہ حق کی صدا پہنچ جاتی پھر وہ آپ کی خانقاہ عالیہ کے فیضان سے مستقل سیراب ہونے لگتا۔ آپ کی نگاہ میں غضب کی تاثیر تھی اور کیوں نہ ہوتی کیونکہ یہ تاثیر حضرت میاں میر قادری رحمۃ اللہ علیہ جیسے ولی کامل کی عنایت خاص تھی کہ جن کی چوکھٹ پر سلاطین وقت حاضری دینا اپنے لئے اعزاز تصور کرتے تھے۔ اس علاقہ میں شورشوں نے سر اٹھا رکھا تھا۔ قتل و رہزنی اور غارت گری عام تھی۔ حملہ آوروں کے لشکر گزرتے اور بستیوں کو تاخت و تاراج کرتے ہوئے آگے بڑھ جاتے۔ اس دور پُر آشوب میں آپ نے جس طور خلق خدا میں امن و سکون اور تسکین حیات کی دولت تقسیم کی اور جس طرح حالات کے ستائے ہوئے انسانوں کو قرار عطا کیا اس نے آپ کو مرجع خلائق بنا دیا۔

سیرت و کردار

آپ کی زندگی سنت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا عملی نمونہ تھی۔ آپ نہ صرف خود سیرت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے عملی تقاضوں پر سختی سے کار بند تھے بلکہ اپنے مریدین اور ارادت مندوں کو بھی ارشادات مصطفویٰ پر عمل پیرا ہونے کی شدید تلقین کیا کرتے تھے۔ آپ نے بہایت سادگی اور توکل سے زندگی بسر کی۔ فقر و استغنا کو اپنا معمول بنائے رکھا، درویش بے ریا کی صورت خدا کے بھروسے پر اشاعت اسلام کی شمع روشن کی اور پھر بہت جلد اس شمع ایمانی کی روشنی پورے علاقہ کا ظلمت زدہ ماحول منور کرنے لگی۔

شاہ جمال نوری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے اخلاص عمل بے ریائی جذبہ خدمت خلق خدا، معرفت الہی اور تزکیہ نفس کا جو بیخ صدیوں پیشتر بویا تھا، اس سے پھوٹنے والے شجر سایہ دار نے مدتوں اصحاب علم و فضل کو اپنے وقار کا احساس دلانے رکھا۔ آپ نے بیرون کھیاالی دروازہ میں ایک خانقاہ کے قیام کی صورت میں ایک ایسا دبستان معرفت قائم کیا تھا جس سے زمانہ صدیوں اکتساب فیض کرتا رہا۔ آنے والے برسوں میں یہ خانقاہ اہل نظر کیلئے بیش بہا سرچشمہ معرفت ثابت ہوئی۔

حضرت شاہ جمال رحمۃ اللہ علیہ بلاشبہ اس علاقہ کے راہنمایان طریقت میں مرکزی حیثیت کے حامل تھے۔ علمائے کرام اور شیوخ آپ کی خدمت میں حاضری دینا باعث سعادت تصور کیا کرتے تھے۔ آپ قطب یگانہ اور غوث وقت تھے۔ آپ کی حیات ظاہری میں بھی اولیائے عظام آپ کی خانقاہ میں حاضری باعث فخر سمجھتے تھے اور آپ کی وفات کے بعد بھی اولیائے کرام آپ کے دربار میں اسی حسن عقیدت کے ساتھ حاضر ہوتے رہے۔ آپ کی خانقاہ میں اولیاء کی حاضری ایک معمول کے طور پر صدیوں سے جاری ہے۔ جب کسی صاحب ولایت کو اس علاقہ میں تبلیغ و اشاعت کا فرض سونپا جاتا ہے تو وہ آپ کے مزار پر حاضر ہوتا ہے۔ گویا اپنے فرائض کو بجالانے کیلئے اجازت طلب کرتا ہے اور جب وہی صاحب ولایت اس علاقہ سے رخصت ہوتا ہے تو پھر وہ سلام کیلئے آپ کے مزار پر حاضر ہوتا ہے۔ گویا وہ رخصت ہونے کی اجازت طلب کر رہا ہوتا ہے۔ یوں کہنا بجا ہوگا کہ اس طور ان اصحاب معرفت کی فکری و روحانی حیثیت پر مہر تصدیق ثبت ہوتی ہے۔

آپ صاحب کرامات کثیرہ تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ جب بندہ رضائے الہی میں ڈھل جاتا ہے اور اپنی زندگی مکمل طور پر خوشنودی خدا و رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں بسر کر دیتا ہے تو پھر تقدیر خداوندی اس بندہ خاص کی تدبیر کا مزاج پہچاننے لگتی ہے اور یہ بندہ خاص اپنی زبان سے جو کچھ بھی

کہتا ہے وہ پر تو تقدیر یزداں بن جاتا ہے۔ اسی حقیقت کی طرف شاعر مشرق علامہ محمد اقبال نے اشارہ کیا ہے:

گفتہ او گفتہ اللہ بود
گرچہ از حلقوم عبد اللہ بود

حضرت شاہ جمال کی زندگی خدا کے احکام کی تعمیل اور خوشنودی خدا کے حصول میں بسر ہوئی تھی۔ اب یہ کس طرح ممکن تھا کہ ان کے فرمودات تائید ربانی کی بدولت تقدیر کے تقاضوں کے امین نہ بنتے۔ آپ کی کرامات بلاشبہ اہل ایمان کے دلوں کو روحانی جلا بخشنے کا سبب ثابت ہوئیں لیکن ہمارے نزدیک آپ کی سب سے بڑی کرامت یہی ہے کہ آپ نے کفر و ضلالت کی تاریک راہوں پر سفر کرنے والے گنہگاروں کو توحید خداوندی کی روشنی عطا کی بتوں کی پرستش کرنے والوں کو خدائے واحد کے تصور سے آشنا کیا اور تعلیمات اسلامی سے دور ہٹنے والے مسلمانوں کو اسوۂ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عملی اتباع کا ذوق بخشا۔ آپ کی نگاہوں کا فیضان ایک کرامت کی صورت مدتوں جاری رہا اور ایمان کی دولت سے محروم انسان آپ کی صحبت میں کچھ وقت گزار کر دنیاوی اور اخروی سرخروئی کا سامان حاصل کرتے رہے۔ آپ کا یہ فیضان آج بھی جاری ہے۔

یہ فیضان نظر تھا یا کہ کتب کی کرامت تھی
سکھائے جس نے اسماعیل کو آداب فرزندہ

اہل ایمان تو آپ کے گرویدہ تھے ہی، غیر مسلم بھی آپ کی خدمت میں حاضری دینا اپنے لئے سعادت سمجھتے تھے۔ کتنے ہی ہندو سکھ تھے جو آپ کی خدمت میں حاضری دینے کی بدولت چوری چکاری، ڈاکہ زنی، لوٹ مار اور دوسری برائیوں سے اجتناب کرنے لگے۔ ہندو سکھ آپ کی وفات کے بعد بھی آپ کے مزار پر حاضر ہوتے اور آپ کے عرس کی تقریب میں شرکت کرتے تھے۔ آپ کا پیغام امن و آتش اور صلح و محبت کا پیغام تھا اور یہی وہ پیغام ہے جو دلوں کو مسخر کرتا اور روح انسانی کو تسلیم و رضا کے آداب سکھاتا ہے۔

وفات

آپ نے ۱۰۶۰ھ میں وفات پائی۔ اس وقت آپ کی عمر ۷۹ برس تھی۔ وفات کے بعد آپ اسی مرکز رشد و ہدایت یعنی خانقاہ قادریہ بیرون کھیالی دروازہ گوبرا نوالہ میں مدفون ہوئے جہاں آپ نے زندگی بھر تعلیمات مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم کو عام کرنے کا مقدس فریضہ انجام دیا تھا۔ آپ کی

وفات کو صدیاں بیت چکی ہیں لیکن آپ کا روحانی فیض اسی انداز سے جاری ہے جس طرح آپ کی حیات ظاہری میں تھا۔ اہل نظر آپ کے مزار پر حاضر ہو کر اس عظیم المرتبت ولی اللہ کو سلام عقیدت پیش کرتے ہیں۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

حضرت داتا شاہ جمال نوری رحمۃ اللہ علیہ کی یادگار خانقاہ قادریہ آج بھی آپ کے ایمان افروز جلوؤں سے آباد ہے۔ آپ کے خاندان میں یکے بعد دیگرے ایسے فرزندان حکمت مطلع علم و عمل پر ابھرنے جنہوں نے آپ کے پیغام کو چار جانب پہنچانے کیلئے اپنا مشن جاری رکھا۔ آپ کے اہل خاندان نامور خلفاء اور ذوق یقین سے بہرہ ور ارادت مندوں نے آپ کی تعلیمات کی عظمت کو ہمیشہ ملحوظ رکھا اور نہ صرف اس علاقہ میں بلکہ دور دراز کے معروف اور گمنام علاقوں میں اپنے عظیم مرشد کے روحانی سلسلہ کو آگے بڑھاتے رہے۔



شہباز طریقت حضرت مولانا غلام جیلانی رحمۃ اللہ علیہ

رب کائنات کو جب کسی قوم یا علاقے کی راہنمائی مقصود ہوتی ہے تو وہاں ایسے بلند فکر نفوس تخلیق کرتا ہے جو اپنی مبلغانہ مساعی اور محبت خدا و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بدولت اس علاقے کی روحانی و فکری راہنمائی اور اخلاقی تربیت کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ عظیم المرتبت مرد درویش حضرت مولانا مولوی غلام جیلانی رحمۃ اللہ علیہ بھی ایسے ہی زاہر کامل اور مرد یگانہ تھے کہ جنہوں نے اپنے فیضان تربیت روحانی بصیرت اور ایمان آفریں تعلیمات کی بدولت اسلاف کی روایات کو زندہ کر کے ثابت کر دیا کہ:

یک زمانہ صحبت باولیاء
بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

حضرت مولانا غلام جیلانی رحمۃ اللہ علیہ خطہ پنجاب کے عظیم ولی حضرت داتا شاہ جمال نوری رحمۃ اللہ علیہ کے خاندان کے رکن رکین تھے جنہیں آفتاب قادریت حضرت میاں میر بالا پیر قادری لاہوری رحمۃ اللہ علیہ سے براہ راست فیض معرفت عطا ہوا تھا۔ آپ کے والد محترم کا نام مولانا محمد عبد اللہ اور دادا کا نام مولانا حسام الدین تھا جو شمس العلماء حضرت مولانا محبوب عالم علیہ الرحمۃ کے برادر بزرگ تھے۔ مولانا غلام جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت ۱۸۷۳ء کو ہوئی، سن شعور کو پہنچے تو شمس العلماء مولانا محبوب عالم نے اپنے حلقہ طریقت میں لے لیا اور اپنی خصوصی توجہ اور باطنی تصرفات کی بدولت بہت جلد آپ کو مس خام سے کندن بنا دیا۔ مولانا محبوب عالم صاحب کشف بزرگ تھے۔ انہوں نے مولانا غلام جیلانی کی ولادت پر ہی انہیں ان کے والدین سے مانگ کر مستقبل کیلئے جانشین نامزد کر کے خانقاہ عالیہ قادریہ نوریہ کھیالی دروازہ کے ماحول میں روحانی تربیت دینے کا اہتمام کر لیا تھا۔

مولانا جیلانی نے ابتدائی تعلیم سکول سے حاصل کی اور پھر شمس العلماء حضرت محبوب عالم رحمۃ اللہ علیہ عظیم عالم دین نظریاتی علوم پر کامل دسترس رکھنے والے استاذ العلماء تھے۔ علاقہ کی مسلم سیاست میں آپ کا خصوصی مقام تھا۔ صرف پنجاب ہی نہیں بلکہ ہندوستان کے دور دراز علاقوں سے

طالبان علم آپ کی خدمت میں حاضری دے کر علوم دین حاصل کرتے۔ غرضیکہ اس دور کے مختلف تذکروں اور تواریخ کے مطابق مولانا محبوب عالم رحمۃ اللہ علیہ کی ذات ہر لحاظ سے مرجع خلاق تھی۔ چنانچہ جب ایسا ایمان افروز ماحول مولانا غلام جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کو میسر آیا اور شیخ طریقت نے انہیں خصوصی توجہات سے نوازا تو ان کی خوش بختی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا اور نہایت تعجیل سے روحانی مراتب سے ہمکنار ہونے لگے۔

جب مولانا محبوب عالم رحمۃ اللہ علیہ کا وصال ہوا تو خانقاہ قادریہ نوریہ کے حوالے سے اصحاب شوق کی باطنی رہنمائی کا اعزاز مولانا غلام جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا مقدر بنا۔ آپ نے مولانا محبوب عالم کے علمی مقام و مرتبہ کو اپنی نگاہوں سے دیکھا تھا۔ بچپن سے ہی آپ کو خانقاہی رسوم کو جاری رکھنے کی تربیت عطا ہوئی تھی۔ لہذا جب آپ سجادہ نشین مقرر ہوئے آپ نے اپنے اخلاص عمل درویشانہ خصائل اور مخلوق خدا سے محبت باعث ثابت کر دیا کہ آپ سے بڑھ کر اس مرکزی روحانیت کا کوئی اور حق دار نہ تھا۔

مولانا غلام جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کو قدرت نے گونا گوں خصائل و صفات سے نواز رکھا تھا۔ آپ کی نگاہ باطن آشنا تھی آپ دلوں پر حکومت کرنے والے مرد حق تھے۔ بے ریائی آپ کی طبیعت کا خاص جزو تھی۔ طریقت و معرفت کی بلندیوں سے بہرہ ور تھے۔ آپ سادگی کی دلکش تصویر اور درویشی و استغنا کی تنویر تھے۔ دوسروں کی روحانی و اخلاقی تربیت اور تالیف قلوب کا خیال حد درجہ دامن گیر رہتا اور حتی الامکان کوشش فرماتے کہ ان کی ذات دوسروں کے دکھوں کا مرہم اور غمزدوں کے آلام کا چارا ثابت ہو۔ آپ نے پوری زندگی اپنی خانقاہ میں آنے والے مردان خدا کی خدمت اور ان کی تربیت میں صرف کر دی۔ جوانی میں آپ کی شادی ایک پاکیزہ خصائل خاتون سے ہوئی جو ایک بچی کو جنم دے کر آغوش اجل میں چلی گئی۔ بعد میں بچی بھی فوت ہو گئی۔ اس کے بعد اس صاحب ایمان پیکر رشد و ہدایت نے دنیاوی امور سے مکمل کنارہ کشی اختیار کر کے فقط خدمت انسانیت اور تربیت خلق خدا کو اپنا معمول بنا لیا۔

آپ صاحب کردار اور انتہائی پاکیزہ سیرت رکھنے والی شخصیت تھے۔ آپ نے کبھی کسی کا دل نہ دکھایا، انسان تو انسان ہوتے ہیں جانوروں پر بھی ظلم برداشت نہ کرتے۔ آپ کی خدمت میں جہاں فرزانے حاضری دینا وجہ سعادت سمجھتے وہاں دیوانے بھی چلے آتے۔ یہ مجذوب صفت دیوانے وقت کی ٹھوکریں کھا کر مولانا غلام جیلانی کے آستانے کو دارالامان سمجھ کر حاضر ہوتے۔ آپ فرزانوں

سے زیادہ دیوانوں کی خدمت کرتے۔ اس سلسلہ میں ان مجذوب اور دیوانوں کا رویہ بعض اوقات نہایت تلخ اور ناقابل برداشت ہو جاتا مگر آپ کمال تحمل اور بردباری سے ان مجذوب صفت بزرگوں کی خدمت میں لگے رہتے۔ لوگ متعجب ہوتے تو فرماتے کہ عقل والوں سے تو ہر کوئی نباہ کر لیتا ہے حق تو یہ ہے کہ ان عقل و خرد سے عاری انسانوں کی خدمت کی جائے۔ کیا یہ خدا کی مخلوق نہیں.....؟ آپ کے آستانہ پر جو بھی حاضر ہوتا آپ اس کو مخدوم بن کر نہ ملتے بلکہ خدمت کا حق یوں ادا کرتے جیسے آپ خدمت گار ہیں اور آنے والا مہمان مخدوم ہے۔ آپ اس حقیقت سے بہرہ ور تھے کہ:

ع..... ہر کہ خدمت کرد او مخدوم شد

خدمت خلق اور راہ حق سے بھٹکے ہوؤں کی راہنمائی کا یہی جذبہ تھا جس نے آپ کو اہل نظر کی آنکھ کا تارا اور اصحاب طریقت کا پیارا بنا دیا۔ آپ خدمت گار نظر آتے مگر مخدوم بن کر عوام الناس کے دلوں پر حکومت کرتے۔ آپ کی خانقاہ کا دروازہ ہر ایک کیلئے کھلا رہتا۔ یہاں امیر بھی آتے اور غریب بھی، بزرگ صوفیاء بھی آتے اور علماء بھی، پاکیزہ کردار رکھنے والے نفوس بھی آتے اور دنیا کے دھتکارے ہوئے مظلوم انسان بھی، آپ کی ذات سب کیلئے یکساں طور پر مرکزِ محبت تھی۔ آپ نہ تو کبھی کسی دولت مند کی امارت سے مرعوب ہوئے اور نہ ہی کسی کی غربت آپ کی نظر میں ناپسندیدہ ٹھہری۔ آپ کا دل سب کیلئے کشادہ تھا، آپ کی تعلیمات سب کیلئے سحابِ رحمت تھیں۔ آپ کے فیوض اس آفتابِ ہدایت کی طرح تھے جو سب کو ایک جیسی روشنی سے ضوئکن کرتا ہے۔ رات کو درگاہ میں آئے ہوئے مہمانوں اور ارادت مندوں کو کھانا کھلا کر آخر میں خود کھاتے۔

مولانا غلام جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے عہد حیات میں خانقاہ کی حیثیت محبت سرا کی ہوتی تھی کہ جہاں سبھی آپ کی محبت کی گھنیری چھاؤں تلے امن و سکون کی نیند سویا کرتے۔ شب و روز میلے کا سماں رہتا تھا۔ رونق ہی رونق ہوتی تھی، اہل نظر کا تانتا بندھا رہتا۔ بعض اوقات درویشوں کا ہجوم اس قدر بڑھ جاتا کہ رات کو خانقاہ کے احاطے کے باہر بھی چار پائیاں بچھ جاتیں۔ آپ کی کوشش ہوتی کہ کوئی مہمان بے آرام نہ ہو، خود راتوں کو جاگ جاگ کر دوسروں کے آرام کا خیال رکھتے۔

آپ کی طبیعت میں علم و تواضع اور مروت و خلوص بدرجہ اتم موجود تھے۔ سوالی کو خالی ہاتھ واپس لوٹانا کسی صورت گوارا نہ ہوتا۔ کوشش فرماتے کہ آنے والا جو حاجت لے کر آیا ہے وہ پوری کی جائے۔ آپ کی شخصیت میں بلا کی روحانی کشش اور ایمانی تاثیر بھی تھی کہ جو ایک مرتبہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا، ہمیشہ ہمیشہ کیلئے آپ کا ہو جاتا۔ بڑوں کیلئے تو آپ کی ذات سراپا مہر و وفا تھی

ہی بچوں پر بھی خصوصی شفقت فرماتے۔ خود بڑھ کر بچوں کو سلام کرتے اور انہیں دعاؤں اور انعامات و تحائف سے نوازتے۔ فرمایا کرتے کہ یہ بچے ہماری نسبت خوش قسمت ہیں کہ ان کا دامن ابھی گناہ سے آلودہ نہیں ہوا۔

مولانا غلام جیلانی رحمۃ اللہ علیہ سلسلہ عالیہ قادریہ کے نامور شیخ طریقت تھے۔ آپ کی زندگی محبوب خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں بسر ہوئی۔ سیرت و کردار کے لحاظ سے آپ سنت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا عملی نمونہ تھے۔ آپ نے اتباع سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ایسا حسین نمونہ پیش کیا کہ آپ کے ارادت مند بھی سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم خدا کا مرقع بن گئے۔ آپ کوئی دنیا دار و اعظ یار یا کار مبلغ نہیں تھے۔ آپ کا سلسلہ رشد و ہدایت نہایت سادہ اور پُر اثر تھا۔ احباب کے اجتماع میں روحانی و دینی امور اس سادگی سے زیر بحث لاتے کہ ان پر خشک و عظم کا گمان نہ ہوتا بلکہ عشق و سرمستی کا حسن دلوں میں گھر کرتا ہوا محسوس ہوتا اور آپ کے نصائح بغیر کسی ذہنی تردد یا ارادی کوشش سے حاضرین محفل کے قلوب میں راسخ ہو جاتے۔ آپ نے خود کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پاکیزہ صورت و سیرت کے سانچے میں اس طرح ڈھال لیا تھا کہ آپ کے حلقہ فیوض سے خوشہ چینی کرنے والے بھی اپنے اعمال اور اطوار کے لحاظ سے اپنے شیخ کا نمونہ بن گئے۔

حضرت مولانا غلام جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے بزرگوں کی روایات کو زندہ رکھا، آپ کا یہی بہت بڑا کمال ہے کہ آپ نے اپنے تمام اسلاف کے اعراس مبارکہ کو ان کی تواریخ پر پورے روحانی جمال و کمال کے ساتھ جاری رکھا، اسی طرح حضرت میاں میر بالا پیر قادری رحمۃ اللہ علیہ کے عرس اقدس پر آپ کی حاضری ایک خصوصی اہتمام کی حامل ہوتی تھی، آپ مدتوں پہلے تیاری کرتے جیسے یہ زندگی کا سب سے بڑا تہوار ہے، آپ چلتے تو علماء و مشائخ بھی ہمراہ ہوتے۔ ارادت مندوں کا ایک بڑا ہجوم ہمراہ ہوتا، جب دربار حضرت میاں میر قادری رحمۃ اللہ علیہ قریب آنے لگتا تو آپ کے دل کی دھڑکن تیز سے تیز ہونے لگتی، سانس تھمنے لگتا، یہی حال آپ کے مریدوں اور آپ کے چاہنے والوں کا ہوتا، جتنے دن وہاں گزارتے اس طور رہتے جس طرح سرزمین حرم پر ہیں۔ مجال ہے کہ اس درگاہ پاک کے احترام و عقیدت میں معمولی سی کمی بھی آجائے۔ آپ کو بجا طور پر احساس ہوتا کہ انہوں نے اور ان کے بزرگوں نے جو کچھ بھی روحانی مقام و مرتبہ حاصل کیا ہے، یہیں سے کیا ہے، حضرت میاں میر کے احاطہ پاک میں آپ کی سخاوت کے در کھل جاتے، جو کچھ پاس ہوتا حاجت مندوں پر نچھاور کر دیتے، مانگنے والے ہاں بار انداز بدل کر آپ کے پاس آتے مگر بہت کچھ جان کر

بھی چشم عنایت سے کام لیتے اور لطف و جود کا بزلا مظاہرہ کرتے۔ ایسے ہی اہل سخا کے بارے میں کسی نے کہا:

یوں بھی کچھ لوگ انہیں لوٹ کے لے جاتے ہیں
کچھ طبیعت بھی فقیروں کی غنی ہوتی ہے

آپ کی زندگی میں سادہ دلی اور درویشی کے عناصر کوٹ کوٹ کر بھرے تھے، انداز گفتگو انتہائی سادہ مگر دل میں اتر جانے والا تھا۔ باتوں میں ایسی دلکشی اور رعنائی تھی کہ جو ایک مرتبہ آپ کی بارگاہ اقدس میں آتا تھا ہمیشہ ہمیشہ کیلئے آپ کا ہو جاتا تھا۔ آپ کی انتہائی سادہ روش دیکھ کر بعض اوقات پہلی نظر میں احساس ہی نہ ہوتا کہ آپ اتنی بڑی روحانی وراثت کے امین ہیں مگر جب آنے والا آپ کی محفل پاک میں چند گھڑیاں گزارتا تو اسے احساس ہونے لگتا کہ مولانا غلام جیلانی بلاشبہ ایسے مرد درویش ہیں جو بوریے پر بیٹھ کر دلوں پر حکومت کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ آپ نے کبھی اپنی شہرت اور ناموری کیلئے کرامات کا سہارا نہیں لیا لیکن یہ قدرت کا اصول ہے کہ صاحب ایمان جب خدا کی خوشنودی میں ڈھل جاتا ہے تو پھر تقدیر الہی اس کی تدبیر کے تابع ہو جاتی ہے اور قدرت خداوندی اس مرد مومن کے ہاتھ پاؤں اور آنکھ بن جاتی ہے تاکہ اس کے ذریعہ عظمت خداوندی کا ظہور ہوتا رہے، حق تو یہ ہے کہ حضرت مولانا غلام جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے کردار اور عمل سے اپنے خدا کو راضی کر لیا تھا اور وہ علامہ محمد اقبال کے لفظوں میں اس مقام تک پہنچ گئے تھے کہ:

غلامی میں نہ کام آتی ہیں تدبیریں نہ شمشیریں
جو ہو ذوق یقین پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
کوئی اندازہ کر سکتا ہے کہ اس کے زور بازو کا
نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

مولانا غلام جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی خانقاہ عالیہ کے دروازے زمانے بھر کیلئے کشادہ تھے اپنے ہوں یا بیگانے، یار ہوں یا اغیار، دوست ہوں یا دشمن، علمائے حق ہوں یا مردان باصفا، درویشان خدا مست ہوں یا مشائخ، والاتبار سب آپ کی خانقاہ عالیہ میں آ جاتے۔ یہاں کا لنگر اور فیض عالم اس قدر زبردست انداز سے جاری تھا کہ کسی سے سوال ہی نہیں کیا جاتا کہ وہ کہاں سے آیا ہے اور کتنے دن یہاں قیام کرے گا؟ سب کے خورد و نوش کا اہتمام ہوتا، بعض اوقات جیب خالی ہوتی مگر آپ کے خادم خاص حضرت عاشق جیلانی رحمۃ اللہ علیہ روایت کرتے ہیں کہ خدائے کریم کے دست

غیب سے سب کچھ عطا ہو جاتا۔ ایسا لگتا تھا جیسے دست قدرت بھی عطا کرنے کا بہانہ ڈھونڈتا ہے۔ آپ کا ہر عمل رضائے الہی کیلئے وقف تھا، اس لئے رضائے الہی بھی اس مرد کامل پر لطف و کرم کا بادل برسانے کیلئے بے قرار رہتی تھی، اس لحاظ سے دیکھیں تو آپ کی سب سے بڑی کرامت یہی نظر آتی ہے کہ آپ نے عوام الناس کے دل جیت لئے، بیگانوں کو اپنا بنا لیا، بندگانِ خدا کو راہِ حق کا خوگر بنا دیا۔ جس سے کوئی بات کرنا بھی پسند نہیں کرتا تھا، وہ آپ کی نگاہِ الطاف کی بدولت عوام کی نگاہوں کا مرکز بن گئے، آپ کے خلق نے گرتوں کو اٹھایا، اُنھنے والوں کو راہِ حق پر چلنے کا انداز سکھایا، راہِ حق پر چلنے کا عزم رکھنے والوں کو خدا آگاہ بنایا اور خدا آگاہی سے آشنائی پیدا کرنے والوں کو خدا کا بندہ خاص بنا دیا، آپ کا اندازِ تربیت انتہائی دلکش تھا، آپ کی محفلِ پاک میں بیٹھنے والے حاصلِ زمانہ بن گئے۔ آپ کا کردار صحیح معنوں میں آپ کی سب سے بڑی کرامت تھی جس نے راہِ ظلمت میں سفر کرنے والوں کو سفرِ نور کا مسافر بنا دیا، یہ حقیقت ہے کہ:

درودِ آلام کے مارے ہوئے کیا دیتے ہیں
ہم تو بس اُن کی نگاہوں کو دُعا دیتے ہیں
بندہ بننا ہے خدا کا تو گدا بن ان کا
جو فقیروں کو شہنشاہ بنا دیتے ہیں
اللہ اللہ کئے جانے سے اللہ نہ ملے
اللہ والے ہیں جو اللہ سے ملا دیتے ہیں

مولانا غلام جیلانی بلاشبہ شہبازِ طریقت تھے۔ صرف القاب پڑھ دینے سے کسی کا مقام و مرتبہ نہیں بڑھ جاتا بلکہ طریقت کی بلند یوں کو وہی چھو سکتا ہے جو حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی بلند یوں سے آگاہ ہو، آپ نہ صرف خود شریعتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر سختی سے عمل پیرا تھے بلکہ ہر عقیدت مند سے شریعت کی بجا آوری کی توقع رکھتے تھے، یہی وجہ تھی کہ آپ کی مجلسِ پاک میں بیٹھنے والوں نے شریعتِ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس طور پر پاسداری کی کہ دیکھتے ہی دیکھتے مردانِ طریقت بن گئے اور جب طریقت کے اسرار و اشکاف ہوئے تو معرفتِ الہی سے آشنا ہو گئی، یہ آپ کا وہ فیضان ہے جس نے ایک زمانے کا مقدر بدل کر رکھ دیا:

نگاہِ ولی میں یہ تاثیر دیکھی
بدلتی ہزاروں کی تقدیر دیکھی

آپ کو فطرت نے باطنی پاکیزگی کے ساتھ ساتھ صورت کی دلکشی سے بھی نوازا تھا۔ آپ کا قد بلند تھا، چہرہ حسین اور خوبصورت تھا، لباس ہمیشہ سادہ پہنتے، گرتا اور تہہ۔ دولت و حشمت کا کبھی خیال نہ آیا۔ جو کچھ آتا خیرات کر دیتے۔ آپ کی بڑی متاع خانقاہ قادریہ نوریہ تھی جو آپ کے نام کے حوالے سے ”ڈیرہ مولانا غلام جیلانی“ کہلاتی تھی۔ آپ کا طرز عمل صوفیانہ اور آپ کی وضع قطع مکمل طور پر درویشانہ تھی۔ گفتگو میں عاجزی اور انکساری ہوتی۔ آپ ایسے درویش خدامت تھے جس پر دنیا بھر کی دولت و ثروت فدا کی جاسکتی ہے۔ عمر بھر پاس کچھ جمع نہ ہونے دیا، جو کچھ آیا لنگر میں خرچ کر دیا۔ لنگر کو جاری رکھنا بزرگوں کی سنت تصور کرتے تھے جب آپ کا وصال ہوا تو اس وقت بھی آپ کے پاس ایک روپیہ تک برآمد نہ ہوا بلکہ لنگر اور خانقاہ شریف کے اخراجات کیلئے کئی حضرات سے لیا ہوا قرض ادا کرنا باقی تھا جو آپ کی وصیت کے مطابق بہت جلد ادا کر دیا گیا۔

آپ کے اسلاف میں نامور اولیائے کرام، مشائخ عظام اور درویشان باخدا شامل تھے۔ آپ نے زندگی بھر اپنے بزرگوں کے روحانی معمولات کو جاری کئے رکھا، آپ فرمایا کرتے کہ میں تو اپنے اسلاف کی عظمتوں کا امین ہوں۔ آپ کے اسلاف کا روحانی لحاظ سے شہنشاہ ولایت حضرت میاں میر بالا پیر قادری رحمۃ اللہ علیہ سے خصوصی تعلق تھا۔ آپ بھی حضرت میاں میر رحمۃ اللہ علیہ سے غیر معمولی ارادت و عقیدت رکھتے اور ہر سال پابندی سے حضرت میاں میر رحمۃ اللہ علیہ کے عرس کی تقاریب میں حاضری دیتے اور عرس کے تمام ایام وہیں گزارتے۔ ان دنوں حضرت میاں میر رحمۃ اللہ علیہ کا مزار محکمہ اوقاف کی تحویل میں نہیں آیا تھا، جب مولانا غلام جیلانی رحمۃ اللہ علیہ دربار حضرت میاں میر پہنچتے تو وہاں کے سجادہ نشین حضرت مخدوم سید سید علی شاہ رحمۃ اللہ علیہ آپ کو خصوصی مقام دیتے۔ مولانا غلام جیلانی رحمۃ اللہ علیہ رضائے خداوندی اور تعلیمات مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم کا عملی نمونہ تھے۔ زمانہ شاہد ہے کہ جب بندہ رضائے الہی میں ڈھل کر فنا فی اللہ ہو جاتا ہے تو پھر اس کی تدبیر تقدیر خداوندی کا نمونہ بن جاتی ہے۔ مولانا غلام جیلانی رحمۃ اللہ علیہ اس حقیقت کا تفسیر تھے۔ آپ صاحب کرامات کثیرہ تھے۔ ایک زمانہ آپ سے فیضیاب ہوتا رہا مگر آپ کی سب سے بڑی عظمت یہ ہے کہ آپ نے مردہ دلوں کو ذوق یقین عطا کر دیا، بندوں کو آداب بندگی سکھائے اور خدا آشنا کر دیا، کم کوشوں کو دولت عمل بخش دی، گمراہوں کو نشان منزل بخش دیا۔ راہ حق سے بھٹکے ہوؤں کو صراط مستقیم پر گامزن کر دیا۔ باطل رسوم کے خاتمہ کیلئے جدوجہد کی۔ مسلمانوں کو اسلاف کی ایمانی رفعتوں کا احساس دلایا۔ درو آلام کے مارے ہوئے آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور قلبی و

روحانی سکون کی لافانی دولت سے بہرہ یاب ہوئے۔ آپ نے زندگی میں ہر کام پر محبت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو خضر راہ بنائے رکھا۔ اس کی ایک ادنیٰ سی مثال یہ ہے کہ آپ نے زندگی بھر کبھی کالا یا سبز تہہ نہیں باندھا اور نہ ہی ان رنگوں کا جوتا استعمال کیا، کالے رنگ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کالی کملی کا تصور ہوتا اور سبز رنگ گنبد خضریٰ کی یاد دلاتا ہے۔ اپنے ملنے والوں کو ہر انداز سے احترام حضور ملحوظ رکھنے کی تلقین فرماتے۔ آپ پابند صوم و صلوٰۃ اور زاہد شب زندہ دار تھے۔ ماہ صیام کے روزوں سے پہلے ماہ شعبان کے آخری پندرہ روزے بھی تواتر سے رکھا کرتے۔ یہ صالح عمل زندگی بھر جاری رہا۔

ایک طویل عرصہ تک اصحاب ایمان کو جادۂ عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب گامزن کرنے والے اس مرد کامل حضرت مولانا غلام جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا وقت وصال آ پہنچا۔ ۱۸۔ اپریل ۱۹۵۷ء بمطابق ۱۷ رمضان المبارک بمطابق (۶ بیساکھ) کو آپ نے داعی اجل کو لبیک کہا اور بے شمار اژادت مندوں کو غمگین و ملول کر کے راہی ملک بقاء ہو گئے۔

وصال کے بعد آپ کو آفتاب معرفت حضرت داتا شاہ جمال نوری رحمۃ اللہ علیہ کے قرب میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ پہلے آپ کا مزار پاکی کی صورت میں تھا۔ چند برس پیشتر آپ کے خصوصی فیض یافتہ حضرت حاجی عاشق جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی خصوصی توجہ اور محنت سے آپ کے مزار پر انوار کی از سر نو تعمیر کی گئی۔ قبلہ عالم حضرت میاں میر رحمۃ اللہ علیہ کے مزار کی طرز پر آپ کا خوبصورت مزار تعمیر کیا گیا جو مزار داتا شاہ جمال نوری رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے موسوم ہے۔ یہ مزار حسن تعمیر، آرائش و زیبائش اور ظاہری و باطنی و دلکشی کی بناء پر اپنی مثال آپ ہے۔ حضرت حاجی عاشق حسین جیلانی آپ کے فکری جانشین تھے۔ آپ نے شیخ طریقت کے فیوض کو عام کیا اور دربار پاک کی تعمیرات کا بے مثال فریضہ انجام دیا جسے مدتوں یاد رکھا جائے گا۔

آج اگرچہ مولانا غلام جیلانی رحمۃ اللہ علیہ جسمانی طور پر ہمارے درمیان موجود نہیں لیکن آپ کے باطنی تصرفات اور روحانی فیوض کا سلسلہ آج بھی جاری و ساری ہے۔ آپ کی تعلیمات آج بھی شیخ عمل کی صورت ضوکلن ہیں۔ اہل دل آتے ہیں اور آپ کے فیوض و برکات سے مستفیض ہوتے ہیں:

حق تو یہ ہے کہ:

بعد از وفات تربت مادر زمیں مجھ
در سینہ ہائے مردم عارف مزار ما

آپ کے عرس مبارک کی تقریبات ہر سال ۱۸ اپریل کو پورے اہتمام سے منعقد ہوتی ہیں۔ اس تقریب کی نگرانی خانقاہ عالیہ نوریہ کے سجادہ نشین صاحبزادہ ڈاکٹر محمد وسیم گل صدیقی فرماتے ہیں۔ ڈاکٹر صدیقی صاحب اپنے اسلاف کی عظمت و عقیدت سے بہرہ ور ہیں۔ وہ مسلسل اس کوشش میں رہتے ہیں کہ درگاہ عالیہ کے ارادت مندوں کی حاجات پوری ہوتی رہیں۔ انہیں رب کریم نے خدمت انسانیت کے جذبے سے نوازا ہے۔ یہی عظیم جذبہ مولانا غلام جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا اعزاز تھا اور صاحبزادہ وسیم اسی جذبے کو عام کئے ہوئے ہیں:

جمال معرفت ہیں در حقیقت شاہ جیلانی
وقار معرفت ہیں در حقیقت شاہ جیلانی



فخر الاصفیاء حضرت ملا محمد سعید رحمۃ اللہ علیہ

خلیفہ حضرت میاں میر قادری لاہوری رحمۃ اللہ علیہ

حضرت میاں میر بالا پیر لاہوری رحمۃ اللہ علیہ کی عادتِ قدسیہ تھی کہ جب کوئی آپ کی بارگاہ میں بیعت کیلئے حاضر ہوتا تو آپ استفسار فرماتے کہ تم اکیلے ہو یا اہل و عیال بھی رکھتے ہو؟ اس پر اگر وہ شخص عرض کرتا کہ حضور اہل و عیال بھی رکھتا ہوں تو آپ اسے فرماتے کہ تمہارے لئے بہتر یہی ہے کہ واپس چلے جاؤ اور بیوی بچوں کے حقوق پورے کرو۔ یہی عبادت ہے اور یہی بندگی ہے۔ بعض اصحاب آپ کا یہ فرمان سن کر واپس چلے جاتے اور خانگی مسائل میں الجھ جاتے مگر جو صادق الیقین ہوتے وہ اس بات پر اڑ جاتے کہ حضور ساری زندگی آپ کے قدموں میں گزار دیں گے آپ خواہ کچھ بھی کہیں۔ یہاں سے اٹھ کر ہر گز ہر گز کہیں نہیں جائیں گے۔ آپ طالبانِ شوق کا جذبہ صادق دیکھتے تو فرماتے کہ:

”میاں ہم تمہاری بات مان لیتے ہیں لیکن ہمارا حکم ہے کہ پہلے تم اپنے گھر جاؤ اپنے بیوی بچوں کو کسی بزرگ کی سپرداری میں دے کر ان کے نان و نفقہ کا مناسب اہتمام کر کے آؤ۔ اس صورت میں تم ہمارے ساتھ چل سکو گے۔“

چنانچہ جو طالبانِ شوق آپ کے حکم کی تعمیل میں ایسا کرتے پھر وہ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے حضرت میاں میر قادری رحمۃ اللہ علیہ لاہوری کے ہو کر رہ جاتے۔ انہی انتہائی خوش قسمت اور برگزیدہ شخصیات میں ایک مشہور نام حضرت ملا محمد سعید قادری رحمۃ اللہ علیہ کا ہے جنہوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اپنے شیخ کے قدموں میں نچھاور کر کے خود کو فنا فی الشیخ کے درجہ سے ہمکنار کر لیا تھا۔ آپ گفتار اور کردار کے لحاظ سے اپنے شیخ عالی مرتبت کی ہو بہو تصویر تھے۔ آپ نے قریباً ساٹھ سال سے زائد کا عرصہ حضرت میاں میر قادری لاہوری رحمۃ اللہ علیہ کی بارگاہِ قدسیہ میں بسر کیا۔ اس ضمن میں میاں محمد دین کلیم لاہوری حضرت میاں میر رحمۃ اللہ علیہ کے خلفاء کا ذکر کرتے ہوئے اپنی

تصنیف لطیف ”تذکرہ حضرت میاں میر رحمۃ اللہ علیہ“ میں یوں رقمطراز ہیں:

”حضرت ملا تقریباً پچاس سال تک حضرت میاں میر رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت اقدس میں رہے اور انہیں سے سلسلہ عالیہ قادریہ میں بیعت کی۔ ”سکینۃ الاولیاء“ میں شہزادہ داراشکوہ نے آپ کی زبانی بے شمار کرامات و خوارق حضرت میاں میر قادری بیان کی ہیں“

حضرت میاں میر لاہوری رحمۃ اللہ علیہ کی یہ عادت تھی کہ اپنے جس مرید کو اپنے قرب خاص اور خاص توجہ سے نوازتے تھے تو اسے علوم دینیہ کی منازل سے بھی ہمکنار فرماتے تھے اور جب وہ مرید علوم دینیہ میں کامل دسترس اور طریقت و روحانیت میں کمال حاصل کر لیتا تو آپ اسے ملا کے لقب سے یاد فرماتے۔ اس زمانے میں یہ لقب انتہائی معزز و محترم اور لائق صد ستائش تھا اور کسی کسی کو یہ سعادت نصیب ہوتی تھی کہ اسے اس لقب سے پکارا جائے۔ اس لئے حضرت محمد سعید کیلئے یہ عظیم اعزاز تھا کہ ان کے شیخ نے انہیں ملا کے لقب سے پکارا۔ یہی وجہ ہے کہ داراشکوہ نے بھی ”سکینۃ الاولیاء“ میں آپ کا اسی لقب سے اور دینی اعزاز کے ساتھ تذکرہ کیا ہے۔

حضرت ملا محمد سعید قادری رحمۃ اللہ علیہ صحیح النسب سادات میں سے تھے۔ مشہور علمی و روحانی شخصیت حضرت ملا شاہ بدخشانی سے بھی آپ کا خاص تعلق تھا اور آپ ان کے ساتھ کئی سال کشمیر میں بھی رہے۔ ملا محمد سعید قادری رحمۃ اللہ علیہ کو مختلف تذکرہ نگاروں نے مختلف اسمائے گرامی سے یاد کیا ہے۔ کہیں ملا محمد سعید لکھا ہے اور کہیں ملا محمد سعید قادری۔ کہیں آپ کو ملا محمد سعید خاں قادری کے نام سے یاد کیا گیا ہے تو کہیں ملا ابو سعید معصوم محمد سعید رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے ذکر ہوا ہے۔ بہر حال یہ امر طے ہے کہ آپ ہی وہ شیخ کامل ہیں جنہوں نے حضرت میاں میر قادری رحمۃ اللہ علیہ کے مرید خاص داتا شاہ جمال کی روحانی تعلیم و تربیت اس انداز سے فرمائی کہ آپ آنے والے ادوار میں آسمان علم و حکمت پر مہر تاباں کی صورت جگمگاتے رہے۔

حضرت ملا محمد سعید رحمۃ اللہ علیہ کو بہت زیادہ عرصہ تک حضرت میاں میر قادری رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت میں رہنا پڑا تھا اس لئے آپ اپنے قول و عمل سے اپنے شیخ کی تصویر بن گئے تھے۔ آپ کی زندگی اپنے شیخ کے زہد و ریاضت کی تفسیر تھی۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت میاں میر قادری رحمۃ اللہ علیہ کی جس قدر کرامات اور ایمان افروز واقعات حضرت ملا سعید رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہوئے ہیں اتنے اور کسی خلیفہ میاں میر رحمۃ اللہ علیہ سے روایت نہیں ہوئے۔ داراشکوہ سے لے کر آج تک جملہ مؤرخین اور تذکرہ نگاروں نے حضرت محمد سعید کے بیان کردہ واقعات کو احترام اور عقیدت کے

جذبات کے ساتھ اپنے دل و جان میں جگہ دی ہے۔ اب ہم ”سکینۃ الاولیاء“ کے حوالے سے چند اہم واقعات کا ذکر کرتے ہیں جو حضرت ملا محمد سعید سے روایت ہیں۔ حضرت میاں میر قادری رحمۃ اللہ علیہ کس طور عبادت کرتے تھے اس سلسلہ میں داراشکوہ ملا محمد سعید رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے سکینۃ الاولیاء میں رقمطراز ہیں:

”ملا محمد سعید خاں رحمۃ اللہ علیہ سے میں نے سنا ہے وہ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ کا ذکر ہے جناب حضرت میاں میر صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ لاہور شہر کے باہر ایک ویران مکان میں پندرہ روز تک ذکر و فکر میں مشغول رہا تھا لیکن مجھے اطمینان قلبی نصیب نہ ہوا تھا تو میرے دل میں خیال پیدا ہوا کہ میں اس مکان سے کسی دوسری جگہ کو منتخب کر لوں۔ قریب ہی ایک کنواں تھا جس کے قریب ایک سقہ رہتا تھا اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ میں نے پندرہ دن اس ویران مکان میں گزارے ہیں۔ یہ سقہ میرے پاس آ کر مجھے پوچھنے لگا کہ آپ کس لئے یہاں سے چلے گئے ہیں۔ میں نے کہا بھائی اس مکان میں میرے دل کو اطمینان حاصل نہیں ہو سکا یہ سن کر وہ کہنے لگا کہ آپ کے قیام سے ایک دن پہلے کی بات ہے کہ ایک بارات کہیں باہر سے شہر کی طرف آرہی تھی کہ اس مقام پر ان کو رات ہو گئی۔ اس لئے یہ براتی اس مکان میں رات رہے اور تمام رات کھیل تماشا کرتے رہے۔ یہ بات سن کر میں نے اندازہ لگا لیا کہ ان لوگوں کے کھیل کھیلنے اور لہو و لعب کی وجہ سے اس مکان میں نحوست کے آثار پیدا ہو گئے ہیں۔ یعنی لہو و لعب کا اثر اس مکان پر پڑ گیا ہے جس کی وجہ سے مجھے اطمینان حاصل نہ ہو سکا۔ میں نے اپنے لئے ایک اور جگہ کا انتخاب کیا اور وہاں جا کر اپنے ذکر و فکر میں مشغول ہو گیا۔

اسی طرح ایک اور مقام پر ملا محمد سعید خاں قادری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ایک دن میں نے ”تفحات الانس“ میں سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات پڑھتے ہوئے یہ واقعہ پڑھا اور تعجب ہوا کہ اہل ارادت کی کیا کیفیت ہوتی ہے۔ وہ واقعہ یہ تھا کہ جب ایک مرید حضرت بغدادی کے خلیفہ اور جانشین ہو گئے تو ہر روز لوگوں سے کہا کرتے تھے کہ میں نے کامل تیس سال تک حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کے فضلے کو اپنے ہاتھوں سے اٹھایا ہے۔ میرے دل میں آیا کہ عجب قسم کی عاجزی اور کسر نفسی ہے کہ آنجناب کی خدمت کرتے رہے ہیں اور اس پر اور تعجب انگیز بات یہ ہے کہ آپ نے جناب حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کے فضلے کو اٹھایا ہے۔ حضرت مولانا فرماتے ہیں کہ جب میں نے یہ واقعہ ”تفحات الانس“ کا جناب میاں

میر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو سنایا تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے جو اس نے کیا بلکہ یہ آسان ہے جو شخص چاہے کر سکتا ہے اور اس طرح کی خدمت بجالا سکتا ہے لیکن مشکل کام تو وہ ہے جو کہ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے خادم کے ساتھ کیا ہے کہ اپنے مرید کامل کا دل غیر اللہ کے گند سے پاک کر دیا ہے اور یہ تمام نظام تعلیمات دنیاوی کے چھوڑنے سے ہی کامل ہو سکتا ہے اور جناب میاں میر رحمۃ اللہ علیہ کے طریقے میں پہلے تجرید (قطع تعلقات دنیوی) کا سبق دے دیا جاتا ہے تاکہ طالب جلدی اپنا حقیقی مقام حاصل کرنے کی قابلیت حاصل کر لے۔

(بروایت ”سکینۃ الاولیاء“)

اسی طرح ملا محمد سعید اپنے مرشد حضرت قبلہ میاں میر قادری رحمۃ اللہ علیہ کی ایک اور کرامت یوں بیان کرتے ہیں:

ملا محمد سعید عقیدت کے ساتھ حضرت کی خدمت میں جایا کرتے تھے۔ مولانا صاحب ارشاد فرماتے ہیں کہ میں حضرت کی بارگاہ میں حاضر تھا کہ آپ نے ارشاد فرمایا مولانا گھر کی کیا خبر ہے میں نے عرض کیا کہ دو بیٹیاں تو ام پیدا ہو گئی ہیں۔ ایک فوت ہو گئی ہے اور دوسری زندہ ہے۔ اب میری بیوی حاملہ ہے سر سے چادر اُتار کر سجدہ میں رکھ کر روتی ہے۔ اے اللہ تو مجھے بیٹھا دے دے۔ حضرت میاں میر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ وہ خدا کیلئے بچہ دینے کا کام مشکل سمجھتی ہے کہ وہ ایک بچہ دے دے۔ اللہ کریم دو بچے عنایت فرمائے گا۔ چند ماہ کے گزرنے کے بعد ملا محمد سعید کے گھر دو لڑکے تو ام پیدا ہوئے، جنہوں نے طویل عمر پائی۔ (بروایت ”سکینۃ الاولیاء“)

حضرت ملا محمد سعید رحمۃ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں کہ شیخ میاں میر قادری رحمۃ اللہ علیہ کی بارگاہ سے جملہ حاجت مندوں کی حاجت پوری ہوتی تھی۔

اس سلسلہ میں ایک واقعہ کا حوالہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

”ناصر مخدوم محمد اعظم شیخ محمد زاہد حاجی کے تھے اور بلخ سے آ کر لاہور قیام کر لیا تھا۔ اکبر بادشاہ کے ساتھ مراسم پیدا کر لئے اور سلطان اکبر نے ایک اشرفی روز کا خرچ مقرر کر دیا۔ اب وہ ماہ گزر گئے اکبر بادشاہ کی طرف سے روزینہ بند ہو گیا۔ صوفی محمد ناصر نے حضرت میاں جی کی خدمت بابرکت میں حاضر ہو کر تمام واقعہ بیان کر دیا اور عرض کیا کہ اب تو میرے دوستوں کو فاتحے ہیں۔ آپ سے دعا کی امید لے کر حاضر ہوئے ہیں۔ آپ نا امید نہ فرمائیں اور دعا کریں کہ روزینہ مقرر ہو جائے۔ آپ نے فرمایا صوفی آپ خود صاحب صلاح اور متقی ہیں، خود کیوں دعا نہیں فرماتے۔ عرض

کیا اگر میری دعا قبول ہوتی تو میں آپ کو زحمت دیتا۔ فرمایا آپ جائیں آج رات آپ کے روزینہ کا فیصلہ ہو جائے گا اور آپ کو روزینہ مل جائے گا۔ اسی رات بادشاہ اکبر نے صوفی ناصر کو بلایا اور پوچھا کہ کیا وظیفہ باقاعدہ مل رہا ہے۔ صوفی صاحب نے سارا حال بیان کر دیا، بادشاہ نے دو ماہ کا وظیفہ اکٹھا دلوا دیا اور آئندہ کیلئے باقاعدہ روزینہ دینے کا وعدہ کر کے صوفی صاحب کو رخصت کیا۔

(بروایت سکینۃ الاولیاء)

حضرت میاں میر رحمۃ اللہ علیہ کے فیض عام کی ایک اور داستان ملا محمد سعید کی زبانی سنئے۔ ملا صاحب فرماتے ہیں کہ:

”میں نے دربار میں نماز ظہر کے بعد حاضر ہونے کا ارادہ کیا، جب قبلہ حضرت میاں صاحب کے مکان پر پہنچا تو خیال آیا کہ حضرت میاں میر رحمۃ اللہ علیہ اس وقت آرام کرتے ہیں اور اکثر حضرت میاں جی فرماتے ہیں کہ گرمیوں کی دوپہر سردیوں کی آدھی رات کی طرح ہوتی ہے اور اس وقت لوگوں پر نیند کا غلبہ ہوتا ہے۔ لہذا نماز ظہر کے بعد آپ آرام فرما رہے ہوں گے۔ یہاں ہی بیٹھ جاتا ہوں تاکہ اس وقت آپ کو پریشان نہ کروں اور ساتھ ہی یہ احتیاط کی کہ اپنی آواز وغیرہ کو بند کر لیا تاکہ حضرت پریشان نہ ہوں۔ اسی حالت میں ایک خادم دوڑا آیا اور آ کر عرض کی قبلہ حضرت صاحب آپ کو بلا تے ہیں۔ میں نے کہا کہ آپ کو کس نے خبر دی کہ میں آیا ہوا ہوں۔ خادم نے کہا میں خود حیران ہوں کہ حضرت تو سو رہے تھے ناگہاں آنکھیں کھول کر دیکھنے لگے اور مجھے بلا کر فرمایا کہ باہر جاؤ، دالان میں ملا سعید خاں بیٹھے ہیں ان کو بلا لاؤ۔ میں اس کرامت کو دیکھ کر حیران تھا کہ حضرت کو کس طرح پتہ چل گیا کہ میں باہر بیٹھا ہوا ہوں۔ دربار میں حاضر ہو کر قدم بوسی کا شرف حاصل کیا۔“ (بروایت سکینۃ الاولیاء)

حضرت میاں میر قادری رحمۃ اللہ علیہ کس طرح اپنے نیاز مندوں کی دستگیری فرماتے تھے اس کی ایک جھلک حضرت ملا محمد سعید رحمۃ اللہ علیہ کی زبان سے ملاحظہ کیجئے:

”ایک دن حضرت میاں میر نے الہامی زبان میں ارشاد فرمایا کہ ایک پٹھان میرے پاس آیا اور وہ بڑا بے قرار تھا اور مجھ سے دعا کی درخواست کی، میں نے دعا کر دی لیکن میں نے کہہ دیا کہ ننگے کو کپڑے پہناؤ اور بھوکے کو کھانا کھلاؤ تو ساری مشکل کا میں ضامن ہوں، وہ جب وہاں سے چلا گیا تو ایک بھوکا اس کو راستے میں مل گیا اس کو اپنی انگلی دے کر کہا کہ کھانا کھائے آگے چند ننگے آدی ملے ان کو کپڑے پہنا کر پٹھان اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا تو اس کو ایک آدی گھر کی

طرف سے آتا ہوا ملا۔ پٹھان نے خیال کیا کہ شاید مرنے کی خبر لایا ہے لیکن جب وہ ملا تو اس نے بیمار کے تندرست ہونے کی خبر دی۔ گھر جا کر اس نے حلوہ بنایا اور تھالوں میں بھر کر لایا اور ساتھ نقدی پیش کی۔ میں نے کہا یہ حلوہ کیسا اور یہ رقم کس لئے لائے ہو۔ پٹھان نے کہا کہ کل آپ نے فرمایا تھا بھوکے کو کھانا کھلاؤ اور ننگے کو کپڑے پہناؤ میں تمہارا ضامن ہوں۔ میں نے اسی طرح کیا اور آپ کی دعا سے بیمار کو صحت حاصل ہو گئی۔ یہ حلوہ اور یہ نقد حاضر ہے آپ قبول فرمائیں۔ آپ نے حلوہ تو یہاں کے درویشوں میں تقسیم کر دیا اور نقد رقم اس کو واپس کر دی اور فرمایا اپنی ذات پر خرچ کر لو۔ (بروایت سکینہ الاولیاء)

حضرت میاں میر رحمۃ اللہ علیہ کس حد تک دنیاوی محفلوں سے کنار کشی کرنے کا حکم دیتے تھے۔ ملا محمد سعید رحمۃ اللہ علیہ اس طرف یوں اشارہ کرتے ہیں:

”ملا محمد خاں آصف خاں کے استاد تھے۔ تین بار حضرت میاں میر کی خدمت میں حاضر ہوئے اور پہلی دو ملاقاتوں میں حضرت نے ارشاد فرمایا کہ ملا جی بہتر ہے دنیا سے تعلقات کو کم کر دو اور حق تعالیٰ سے دل کو لگا دو اور جب ملا محمد خاں تیسری مرتبہ حضرت میاں میر رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے فرمایا کہ مولانا ہم نے آپ کو آزمایا ہے آپ دنیا کو نہیں چھوڑ سکتے تعلقات دنیاوی کو ختم کرنا آپ کیلئے مشکل ہے۔ یہ ہمت کا کام ہے جو آپ نہیں کر سکتے لیکن یہ ضرور کرو کہ آصف خاں کی دوستی چھوڑ دو۔ آصف خاں کی دوستی آپ کو سخت نقصان دے گی۔ ملا جی نے حضرت میاں جی کی نصیحت کو چھوڑ دیا اور کوئی پروا نہ کی اور آصف خاں کے ساتھ کابل روانہ ہو گئے۔ دریائے کابل کے کنارے آصف خاں کے دشمن نے آپ کو قتل کر دیا اور اس دوستی کا نتیجہ ہلاکت نکلا۔ اسی طرح ایک مرتبہ ملا محمد سعید رحمۃ اللہ علیہ کے اکبر آباد چلے جانے پر مشہور ہو گیا کہ آپ فوت ہو گئے ہیں مگر حضرت میاں میر رحمۃ اللہ علیہ نے لاہور میں بیٹھ کر اس غلط خبر کی بذریعہ کشف تردید فرمائی۔ اس کی روداد ملا محمد سعید سے سنئے۔ کہتے ہیں:

”میں اکبر بادشاہ کے ساتھ اکبر آباد چلا گیا اور وہاں بیمار ہو گیا۔ لاہور میں اطلاع اس طرح آئی کہ میں فوت ہو گیا ہوں۔ ایک دن حضرت میاں میر نے میرے متعلق لوگوں سے دریافت فرمایا کہ ملا محمد سعید کا کیا حال ہے۔ لوگوں نے کہا حضور ہم نے سنا ہے وہ فوت ہو گئے ہیں۔ فرمایا یہ خبر غلط ہے میں دیکھ رہا ہوں کہ ملا محمد سعید زندہ ہیں اور صحیح سلامت ہیں۔ اللہ کی شان کہ میں نے اکبر آباد سے لاہور آنے کا ارادہ کیا جب لاہور آیا تو حضرت کی غلامی کی خاطر حاضر دربار ہوا تو فرمایا

کہ یہاں تو لوگوں نے آپ کے متعلق غلط بات مشہور کر رکھی تھی لیکن میں آپ کو زندہ سلامت دیکھتا تھا۔ چنانچہ سچ وہی ہوا جو حضرت کی نگاہ باطن نے دیکھا تھا۔ (بروایت سکینۃ الاولیاء)

حضرت ملا محمد سعید کے حالات و افکار کے ضمن میں سکینۃ الاولیاء میں داراشکوہ نے اور بھی کئی بزرگانِ دین کا تذکرہ کیا ہے جو زبردست روحانی قوت کے حامل تھے۔ ان میں سے ایک حضرت ملا شاہ صاحب تھے جو ترک دُنیا، فقر و غنا، توکل اور تسلیم و رضا میں اپنے ساتھیوں سے کہیں آگے بڑھ گئے تھے۔ سکینۃ الاولیاء میں حضرت ملا محمد سعید حضرت ملا شاہ کا تذکرہ فرماتے ہیں کہ:

”حضرت میاں میر جی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں بیٹھے تھے۔ ملا شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی اس مجلس میں رونق افروز تھے۔ میں نے اس موقع پر یہ بات عرض کی کہ شاہ شجاع کرمانی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات میں لکھا ہے کہ وہ تیس سال تک نہیں سوئے اور نہ پہلو کے بل لیٹے۔ ایک دفعہ ایک لمحہ کیلئے سو گئے تو اس ساعت میں خواب میں اللہ تعالیٰ کو دیکھا اور اُٹھ کر اللہ کریم کی بارگاہ میں دعا کی کہ الہی اگر مجھے معلوم ہو جاتا کہ سو جانے اور نیند کرنے میں تیرا دیدار ہوتا ہے تو میں زیادہ عرصہ سویا رہتا۔ فرشتہ غیبی نے آواز دی کہ یہ تیس سال کی بیداری کا انعام ہے۔ مولانا شاہ صاحب نے اپنا منہ میری طرف کر لیا اور فرمایا کہ حضرت میاں میر جی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں ایسے درویش بھی ہیں جو پانچ سال سے نہ سوئے ہوں اور نہ پہلو کے بل لیٹے ہوں، جب ملا شاہ صاحب چلے گئے تو حضرت میاں میر نے فرمایا کہ یہ بات شاہ صاحب نے اپنی کتاب میں بیان کی ہے کہ پانچ سال سے نہیں سوئے ان کے رات دن میں کوئی فرق نہیں ہے اور یہ آپ کی پہلی حالت تھی اب مدت گزر چکی ہے۔ آپ بیدار رہتے ہیں اور آپ کی عمر اس وقت اٹھاون برس کی تھی اور آپ نے بڑی بڑی سخت ریاضتیں کی تھیں لیکن بدن میں تازگی اور توانائی پوری طرح موجود ہے۔

ہم نے سکینۃ الاولیاء کے حوالے سے حضرت میاں میر رحمۃ اللہ علیہ کے وہ احوال و افکار بیان کئے ہیں جو آپ سے روایت ہیں۔ آپ کو چونکہ حضرت میاں میر قادری رحمۃ اللہ علیہ کی بارگاہ میں ساٹھ سال سے زائد عرصہ گزارنے کی سعادت نصیب ہوئی تھی اس لئے آپ سے روایت شدہ واقعات کی تعداد بھی حضرت میاں میر رحمۃ اللہ علیہ کے دوسرے خلفاء کی نسبت زیادہ ہے۔ اب ہم داراشکوہ کی روایت سے دیکھتے ہیں کہ حضرت قبلہ میاں میر قادری رحمۃ اللہ علیہ اپنے مرید صادق حضرت مولانا (ملا) محمد سعید قادری کے بارے میں کیا جذبات اور احساسات رکھتے تھے۔ داراشکوہ ایک خصوصی مجلس کا حال قلمبندی کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ اس محفل میں حضرت میاں میر رحمۃ اللہ

علیہ نے ملا محمد سعید کا تذکرہ یوں فرمایا:

”پہلے حضرت ملا محمد سعید خاں رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق ارشاد فرمایا کہ آپ صحیح النسب سید ہیں۔ کمال درجہ کی فضیلت رکھتے ہیں اور تیس برس ہو گئے ہم اکٹھے رہتے ہیں (حضرت ملا محمد سعید کو اس کے بعد ایک طویل عرصہ تک حضرت میاں میر رحمۃ اللہ علیہ کی مزید صحبت نصیب ہوئی تھی) اور کشمیر کو ہم نے اپنا وطن بنا لیا اور میرا دل نہیں چاہتا کہ کسی دوسری جگہ جائیں اور طریقہ تصوف میں آج جو شخص کامل ہے وہ ملا محمد سعید خاں ہے۔ آپ عارف کامل ہیں میں نے اپنے بعض دوستوں کو ان کے حوالے کر دیا ہے تاکہ تربیت فرمائیں اور ان کے فرزندوں کو میں اپنا فرزند جانتا ہوں میں نے اپنا تمام اثاثہ ان کے سپرد کر دیا ہے۔“

حضرت میاں میر قادری رحمۃ اللہ علیہ کے ان اقوال مبارکہ سے جہاں حضرت مولانا محمد سعید قادری کی قدر و منزلت ظاہر ہوتی ہے جو آپ کو اپنے مرشد کے دربار میں حاصل تھی وہاں حضرت میاں میر کے اس جملہ میں کہ ”میں نے اپنے دوستوں کو ان کے حوالے کر دیا ہے تاکہ تربیت فرمائیں“ سے یہ حقیقت اظہر من الشمس ہو جاتی ہے کہ حضرت میاں میر قادری رحمۃ اللہ علیہ اپنے جن نیاز مندوں کو حضرت ملا محمد سعید قادری رحمۃ اللہ علیہ کے سپرد کر دیتے تھے وہ معمولی نہیں ہوتے تھے۔ انہی خوش نصیب بزرگوں میں داتا شاہ جمال نوری بھی ہیں کہ پہلے تو انہیں حضرت میاں میر قادری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی خصوصی باطنی توجہات سے نوازا اور پھر انہیں حضرت ملا محمد سعید قادری رحمۃ اللہ علیہ کے سپرد کر دیا کہ یہ شہباز ہے اس کی اڑان لاہوتی ہونی چاہیے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور داتا شاہ جمال نوری رحمۃ اللہ علیہ ان کی نگاہ فیض رساں سے خاص طور پر فیضیاب ہوئے۔

حضرت ملا محمد سعید قادری رحمۃ اللہ علیہ نے طویل عمر پائی اور وفات کے بعد موضع دھرم کوٹ رندھاوا ضلع امرتسر میں مدفون ہوئے جہاں آپ کا سالانہ عرس پورے روحانی تزک و احتشام کے ساتھ منایا جاتا ہے۔ عرس کی تقاریب میں مسلمانوں کے پہلو بہ پہلو غیر مسلم بھی اس عظیم روحانی راہنما کو خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔



مبلغ اسلام مولانا غلام احمد چشتی

جن دنوں پنجاب کا علاقہ ہندو تہذیب اور سکھا شاہی کی یلغار کی زد میں تھا۔ ان دنوں کفر و ضلالت کا زور اس قدر تھا کہ اصحاب ایمان کیلئے اپنے دین پر پامردی سے قائم رہنا بہت دشوار ہو رہا تھا۔ ایسے عالم میں جن بزرگان دین نے ظلمت کدوں میں نور اسلام سے اُجالا کیا اور دلوں کو معرفت یقین سے آشنا کرتے رہے ان میں سے قصبہ کولوتارڈ کے مولانا غلام احمد خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ آپ تیرھویں صدی ہجری کے تیسرے یا چوتھے عشرے میں موضع سہارن چٹھہ تحصیل وزیر آباد ضلع گوجرانوالہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد بزرگوار مولوی شیر محمد ولد جان محمد و سیر اپنے علاقہ کے معروف عالم دین تھے۔

ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد سے حاصل کی۔ بعد میں علامہ غلام رسول علی پوری کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ وہاں سے علوم ظاہری کے ساتھ ساتھ علوم باطنی کی دولت بھی عطا ہوئی۔ دل میں کسی مرشد کامل کی برکات معرفت سے مستفیض ہونے کی طلب جاگ اُٹھی۔ یہی طلب آپ کو حضرت خواجہ محمد موسیٰ چشتی نظامی فتح پوری کی خدمت میں لے گئی۔ انہوں نے نہایت شفقت سے آپ کو ظاہری و باطنی فیوض عطا فرمائے اور آپ کو ہر چہار سلسل میں خلافت و اجازت بخشی۔ آپ کے دادا پیر مکھڈ شریف والے بزرگ تھے۔

سند فراغت اور خلافت و اجازت کے حصول کے بعد اپنے گھر موضع سہارن پہنچے۔ وہاں سے بمطابق سنت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اشاعت اسلام اور تبلیغ دین کی خاطر گھر سے نکلے اور موضع کولوتارڈ میں قدم رنجہ فرمایا اور پھر ہمیشہ کیلئے یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ اس وقت یہ علاقہ شرک و گمراہی کا شکار تھا۔ مسلمان نام کے کلمہ گو تھے۔ ان کو مبادیات اسلام سے ہی آگاہی نہیں تھی۔ ان کے وہاں قیام کے اولین ایام میں عید الاضحیٰ کے موقع پر ایک شخص نے ان کی دعوت کی۔ آپ کے سامنے گوشت جیسی کوئی چیز رکھ کر اس شخص نے کہا کہ یہ وہ خون ہے جو عید قربان کے جانوروں کو ذبح کر کے اکٹھا کر کے خشک کیا جاتا ہے اور پھر پکا لیا جاتا ہے۔ یہ نہایت لذیذ چیز ہے..... آپ نے یہ

سن کر فرمایا کہ یہ تو حرام چیز ہے، کیا تمہیں پتہ نہیں کہ ہر قسم کے خون کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ اس پر وہاں کے لوگوں نے اس بارے میں لاعلمی کا اظہار کیا۔ آپ نے گاؤں کے جملہ باشندوں کو اکٹھا کر کے وعظ فرمایا جس میں سب کو اس گناہ کبیرہ پر نادم ہونے اور توبہ کرنے کی تلقین کی..... آپ مسلسل تبلیغ اسلام کی خاطر مصروف عمل رہے، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کچھ عرصہ بعد اس علاقہ میں ایسی بری رسوم کا قلع قمع ہو گیا جو مسلمانوں میں سیاسی و اقتصادی زوال کے رد عمل کے طور پر پیدا ہوئی تھیں۔ آپ نے علاقہ کے سرکردہ افراد کو سمجھایا کہ اگر تمہارے زیر اثر علاقہ میں ایسی فبیج رسوم اور مشرکانہ عادات رہتی ہیں تو اس کا عذاب تمہیں ہوگا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ یہ معززین اپنے اپنے علاقہ میں اصلاح احوال کیلئے کام کرنے لگے۔

آپ کے پُر اثر اور پُر کشش انداز تبلیغ سے رفتہ رفتہ ظلمت و جہالت کی گھٹائیں چھٹنے لگیں اور انوار اسلام پھیلنے لگے۔ آپ کے انداز تبلیغ سے متاثر ہو کر مسلمانوں نے خود کو شعائر اسلامی کے سانچے میں ڈھال لیا اور بہت سے ہندو اور سکھ بھی مسلمانوں کے کردار کی سر بلندی دیکھ کر آپ کے دست حق پرست پر اسلام قبول کرنے لگے۔ آپ نے اصلاح احوال اُمت اسلامیہ کے ساتھ ساتھ یہاں درس و تدریس کا سلسلہ بھی شروع کر دیا تا کہ یہاں کے مسلمانوں کو تعلیمات اسلامی سے صحیح معنوں میں آگاہی ہو سکے۔

اس علاقہ کے علاوہ دور دراز کے علاقوں کے طالبان علم بھی آپ کے حلقہ تربیت میں حاضری دینے لگے۔ آپ کی نگاہ فیض ترجمان اور سلسلہ تعلیم و تدریس نے اس علاقہ کی قسمت بدل کے رکھ دی۔ آپ کے تلامذہ میں متعدد ایسے علماء و فضلاء شامل ہیں جنہوں نے آپ سے فیوض و برکات کے حصول کے بعد مختلف علاقوں میں تبلیغ اسلام کا فریضہ بحسن و خوبی انجام دیا۔

آپ نامور خطاط اور خوشنویس بھی تھے۔ آپ کی کتابت کردہ متعدد کتب آپ کی اولاد کی تحویل میں ہیں جن سے فن کتابت میں آپ کی مہارت اور شاندار خطاطی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ آپ چونکہ جملہ امور مذہبی میں عوام کی راہنمائی فرماتے تھے اس لئے فتویٰ بھی جاری فرمایا کرتے تھے۔ آپ کے فتاویٰ کو اصحاب علم قدر و وقعت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے اور ہر جگہ شرعی امور میں آپ کی رائے کو مقدم سمجھا جاتا تھا۔ اپنے دور کے نامور علماء و مشائخ سے آپ کے قریبی تعلقات تھے۔ حضرت خواجہ غلام محی الدین قصوری، مولانا غلام دستگیر قصوری، خواجہ زین الدین مکھڑوی، مولانا مئی الدین بگوی اور مولانا احمد الدین بگوی جیسی شخصیات آپ کو بے حد عزیز جانتی تھیں۔

آپ عربی، فارسی اور پنجابی میں شعر کہتے تھے۔ آپ کے کلام بلاغت نظام کا زیادہ حصہ نعت گوئی پر مشتمل ہے۔ بزرگان دین کی شان میں مناقب بھی کافی تعداد میں ہیں۔ دیگر اصناف سخن پر آپ کی مشق سخن کے نمونے بھی ملتے ہیں۔ آپ کے کلام مبارکہ میں سے چند منتخب اور مشہور و معروف مولود شریف، حلیہ شریف پنجابی اور حلیہ شریف فارسی بھی شامل ہیں۔ آپ کے پوتے اور ناحور عالم دین حضرت حافظ محمد عالم آسی نقشبندی امرتسری نے وضع اطوار محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے آپ کا کلام ۱۳۲۹ھ میں لاہور سے شائع کیا تھا جو آج کل نایاب ہے۔ اس کی ابتداء میں حضرت علامہ آسی نے تفصیلی دیباچہ بھی رقم فرمایا ہے۔ ان کے علاوہ آپ کا لکھا ہوا پنجابی حلیہ شریف اور شجرہ طریقت بھی کئی بار طبع ہوئے ہیں۔ مولود شریف کا مطلع یہ ہے:

ذره خاک پائت گرب دست آید مرا

تو تیاے چشم سازم ہر صباح و ہر مسام

پنجابی کلام میں حلیہ شریف پنجابی کے علاوہ نماز، شش کلمہ، دعائے قنوت اور ایمان مفصل و مجمل کے پنجابی منظوم تراجم بھی ہیں۔ حضرت علامہ محمد عالم آسی رقمطراز ہیں:

”مولانا غلام احمد رات دن سنت نبویہ کے مطابق اپنا رویہ رکھنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ اُن کے مد نظر یہی امر رہا کرتا تھا کہ انسان کی بود و باش، صورت و سیرت، طرز رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق ہونی چاہئے۔ جہاں تک ہوسکا طریق نبوی کے مطابق ہی اپنی خوراک، پوشاک اور صورت و سیرت رکھی ہوئی تھی اور اپنے شاگردوں اور احباب کو یہی وصیت فرما گئے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حلیہ مبارک کو از بزر اور یاد کرو تا کہ تمہیں اس طریق پر چلنے کی توفیق ہو۔ واقعی امر بھی یہی ہے کہ اس حلیہ شریف کو فارسی نظم میں ترجمہ کرنے اور پھر اسی مضمون کو پنجابی نظم میں دہرانے سے بجز اس کے اور کچھ غرض نہیں کہ عوام الناس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک خصوصیات کی اطلاع ہو جائے اور اس سے اپنی وضع قطع کا اندازہ لگاتے رہیں کہ ہم کس قدر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مشابہت رکھتے ہیں یا کتنے دور پڑے ہیں؟

آپ کے نعتیہ کلام سے انتخاب کی صورت میں چند اشعار ملاحظہ ہو:

جاں بلب از حسرت دیدار پر انوار تو

دل پر از نومیدی از کجروی گردش سا

روئے زینا گر نمائی یکشب اے بدر الدجی

از فروغ پر تو رویت شود روئم ضیا

اندر فراق آوردہ ام ز ہجر تو پڑ مردہ ام
آرام از دل بردہ ام تسکین دہ دل عاشقان
سازی بریں عاشق اگر از گوشہ چشم نظر
یابم دگر بارہ عمر تازہ شود روح رواں
آپ کے حلیہ شریف منظوم پنجابی سے اقتباس پیش خدمت ہے:
وال مبارک بہتے کالے..... ناں سدے ناں گھندھڑیا لے
زیتوں دے اوہ آہے پالے..... صلی اللہ علیہ وسلم
ابرو دس وانگ کماناں..... لمیاں پکان تیر سناناں
کزن شکار خواب دیاں جاناں..... صلی اللہ علیہ وسلم
رخسارے بھی بہت نورانی..... حوراں دیکھ ہوون قربانی
عاشق کر دے جان مشانی..... صلی اللہ علیہ وسلم
نک کنڈ ہارا اچا دتے..... نور الہی چھم چھم و سے
منہ تبسم ہا سا جسے..... صلی اللہ علیہ وسلم
موتیاں دنداں دا چکارا..... ملکاں کیتا جدوں نظارا
سجد ڈگا عالم سارا..... صلی اللہ علیہ وسلم

آپ کا منظوم پنجابی ترجمہ نماز بھی فنی اور علمی لحاظ سے قابل قدر کاوش ہے۔ ایک شعر میں
تعوذ کا ترجمہ فرماتے ہیں:

پناہ دیویں یا اللہ مینوں برکت ذات الہی
اُس شیطان رجیم کو لوں جو سدا وچ گمراہی
مولانا غلام احمد عاشق رسول تھے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور آپ کے اُسوۃ
حسنہ کو تمام عمر پیش نظر رکھا، نہ صرف خود تعلیمات مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر بدل و جان کار بند رہے
بلکہ اپنے جملہ معتقدین اور فرزند ان اسلام کو بھی سیرت و کردار مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے سانچے میں
ڈھل جانے کی تلقین فرماتے رہے۔ عمر بھر رشد و ہدایت کی خوشبو لٹانے کے بعد بالآخر آپ ۱۸ ربیع

الآخر ۱۲۹۹ھ کو اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ آپ کو موضع کولوتارڑ ہی میں سپرد خاک کیا گیا۔ کئی زبانوں میں آپ کے مادہ ہائے تاریخ وقات لکھے گئے۔

عابد و مولوی غلام احمد ۱۲۹۹ھ

آپ کا عرس مبارک صاحبزادہ محمد خالد نعیم کی زیر سرپرستی ہر سال شرعی تقدس کے ساتھ

منعقد کیا جاتا ہے۔



خواجہ محمد کریم اللہ عباسی قادری رحمۃ اللہ علیہ

دربار قادریہ گوجرانوالہ

درگاہ معلیٰ حضرت غوث العصر رحمۃ اللہ علیہ (بازار خراداں و گوجرانوالہ) بھی ایسی ہی خوش بخت درگاہ ہے جہاں سے علم و حکمت کے ظاہری و باطنی فیوض عطا ہوتے ہیں۔ ان فیوض کا مرکز و معدن وہ فرزند ان جلیل ہیں جو مختلف ادوار میں اس درگاہ کو اپنا مرکز بنا کر فیوض اسلام کی دولت تقسیم کرتے رہے۔ مخدوم العصر خواجہ محمد کریم اللہ عباسی قادری رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت باسعادت یکم رمضان المبارک ۱۲۹۳ھ کو گوجرانوالہ میں ہوئی۔ آپ حضرت خواجہ محمد عبداللہ عباسی قادری کے چھوٹے صاحبزادے تھے۔ آپ انتہائی خوش بخت تھے کہ آپ کو خواجہ محمد عبداللہ جیسے ولی اللہ کی گود نصیب ہوئی۔ اس کے ساتھ ساتھ حضرت غوث العصر بھی آپ کو باطنی توجہات سے نوازتے رہے۔ حضرت سلطان العصر آپ کو نگاہوں کا ستارا سمجھتے تھے اور انکی آرزو تھی کہ آپ درگاہ غوث العصر کی علمی و فکری پہچان بن جائیں۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ آپ کے والد اپنے فرزند کی صورت میں درگاہ عالیہ کے ایک بڑے کارواں سالار کو یادگار کردار ادا کرتے دیکھ رہے تھے۔

روحانی توجہات تو عظیم والد اور محترم دادا جان کی عنایات خصوصی سے حاصل ہو رہی تھیں۔ علوم دینیہ کی تحصیل اس درگاہ عالیہ کے صوفیائے کرام کا خصوصی اعزاز رہی ہے۔ خواجہ محمد کریم اللہ عباسی قادری رحمۃ اللہ علیہ کی طبیعت بھی روحانی علوم کے پہلو بہ پہلو دینی علوم کی تحصیل کیلئے مچل رہی تھی۔ ان دنوں شمس العلماء والفقہاء حضرت مولانا محبوب عالم قادری رحمۃ اللہ علیہ (خانقاہ قادریہ کھیالی دروازہ گوجرانوالہ) کے علمی کمالات کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ مولانا محبوب عالم نامور مفتی، فقیہ عالم دین، روحانی راہنما اور ممتاز مصنف تھے۔ حضرت خواجہ محمد عبداللہ نے خواجہ محمد کریم اللہ کی دینی تعلیم کیلئے مولانا محبوب عالم کا ہی انتخاب کیا۔ ”خانقاہ نوریہ کھیالی دروازہ“ اور ”درگاہ معلیٰ غوث العصر بازار خراداں“ کے اکابر آپس میں محبت و ارادت اور روحانی تعلقات کے حوالے سے اس مقام پر تھے کہ عہد حاضر میں اس کی مثال تلاش کرنا محال ہے۔ خواجہ محمد کریم اللہ کھیالی دروازہ میں خانقاہ داتا شاہ

جمال اللہ نوری میں آئے تو انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ ان دونوں خاندانوں کے درمیان روحانی فیضان کا سلسلہ تھا جو مختلف ادوار کے حوالے سے کبھی ادھر سے ادھر اور کبھی ادھر سے ادھر منتقل ہوتا رہا تھا۔ مولانا محبوب عالم نے اس شاگرد رشید کو خصوصی توجہ سے نوازا۔ بعض اوقات استاد کیلئے خدمت بجا لانے کی ضرورت محسوس ہوتی تو خواجہ محمد کریم اللہ آداب شاگردی بجالانے کیلئے دوسروں پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے مگر استاد محترم روک دیتے۔ کبھی نامور شاگرد کی ضد غالب آجاتی تو مولانا محبوب عالم اجازت دے دیتے، آپ کے سامنے یہ حقیقت اپنی شرح کمال کے ساتھ آجا کر تھی کہ

شیخ مکتب ہے ایک صنعت گر
جس کی صنعت ہے روح انسانی

مولانا محبوب عالم رحمۃ اللہ علیہ نے صنعت گری کا ثبوت بہم پہنچانے کیلئے اپنی تمام تر توجہات صرف کر دیں۔ خواجہ محمد کریم اللہ نے عربی زبان پر دسترس تو گھر میں ہی حاصل کر لی تھی جب مولانا محبوب عالم قادری کی علمی صحبت میسر آئی تو علوم دینیہ کا بحر بے کراں بڑی تیزی کے ساتھ سینے میں منتقل ہونے لگا۔

خواجہ محمد کریم اللہ اپنے استاد محترم کی راہنمائی میں جو کچھ یاد کرنا چاہتے تھے بہت جلد کر لیتے تھے۔ انہیں کچھ ایسا محسوس ہوتا جیسے یہ سبق پہلے ہی یاد کر رکھا ہے۔ آپ نے بہت کم عرصے میں عربی و فارسی کی آخری درجے کی کتابوں پر عبور حاصل کر لیا۔ حضرت مولانا محبوب عالم قادری جیسی دانائے روزگار شخصیت کی تعلیم و تربیت نے حضرت خواجہ محمد کریم اللہ عباسی قادری رحمۃ اللہ علیہ کو تاریخ علم و حکمت کا روشن باب بنا دیا۔ ایسا باب کہ جس کے مطالعہ سے مریدین کو علمی و روحانی بالیدگی عطا ہوتی تھی۔

آپ کا کمال گہرائی میں جا کر علوم دینیہ حاصل کرنا طلب علم صادق کی روشن مثال ہے۔ آپ پیرزادے تھے ایک معروف روحانی خاندان سے آپ کا تعلق تھا۔ بے شمار افراد آپ کے چاہنے والے تھے۔ صاحبزادگی کا نشہ جب منفی انداز میں غالب آجاتا ہے تو بہتوں کے قدم اکھڑ جاتے ہیں اور وہ منزل کے حصول سے پہلے ہی اپنی ذات کے خول میں گم ہو جاتے ہیں لیکن خواجہ محمد کریم اللہ عباسی قادری کے ساتھ ایسا معاملہ نہیں تھا۔ آپ کا تعلق جس روحانی خاندان سے تھا وہاں علم کو ہمیشہ سے غیر معمولی اہمیت دی گئی تھی۔ آپ کے احساسات علم کی خوشبو سے معنبر تھے اور پھر علم کی راہوں پر روانہ کرنے والے آپ کے عظیم والد خواجہ محمد عبد اللہ قادری تھے جو آپ کے روحانی راہنما بھی تھے

اور پھر آپ جس شخصیت (مولانا محبوب عالم قادری) سے علوم دینیہ حاصل کر رہے تھے وہ اپنے دور کی بے مثال علمی، فقہی اور روحانی شخصیت تھے۔

علوم دینیہ کی طلب کے ساتھ ساتھ علوم روحانی کی طلب بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ غوث العصر رحمۃ اللہ علیہ کی نوازشیں بھی جاری تھیں اور والد حضرت قبلہ خواجہ محمد عبد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی عنایات کا سلسلہ تو تھا ہی۔ جب آپ علوم دینیہ کی تکمیل کر چکے تو روحانی لطائف کی طلب فزوں تر ہو گئی۔ ادھر آپ کے بزرگ اس فرزندِ عظیم کا جذبہ صادق مچلتا دیکھ کر روحانی سرشاری سے دوچار ہو رہے تھے۔ آپ نے کمال جذب و شوق سے والد محترم کی خدمت میں راہ طریقت کی راہنمائی کیلئے عرض کیا۔ اسی دوران خواجہ محمد عبد اللہ بیمار پڑ گئے تو آپ ان کیلئے ساگودانے کی کھیر پکوا کر لائے۔ حضرت خواجہ صاحب نے کھیر کھائی، ایک لقمہ باقی رہ گیا تو حضرت محمد کریم اللہ عباسی رحمۃ اللہ علیہ کو کھانے کا اشارہ کیا۔ آپ حکم بجالائے نہ صرف لقمہ کھا گئے بلکہ پیالہ دھو کر تمام پانی بھی پی گئے۔ بس پھر کیا تھا انہیں ایسا محسوس ہوا جیسے دنیاوی حجابات اٹھتے جاتے ہیں، روحانی اسرار منکشف ہو رہے ہیں، قلب پر تجلیات معرفت کا بے تحاشا نزول ہو رہا ہے۔ انہیں ایسا معلوم ہوا جیسے علائق دنیوی سے ان کا رشتہ کٹ گیا ہے اور عالم بالا کی طرف مائل پرواز ہیں۔ رقت طاری ہو گئی، آنکھوں سے آنسوؤں کے آگینے پھلکنے لگے۔

آپ نے عبادت و ریاضت کو حاصل حیات بنا لیا۔ علوم دینیہ میں آپ کو یہاں تک دسترس تھی کہ آپ نے کئی بد عقیدہ افراد سے مناظرے کئے۔ شامتان رسالت کے غرور کو مٹی میں ملایا۔ گستاخانِ بارگاہ نبوت کے غرور کے بت کو چکنا چور کر دیا اور زمانہ پر واضح کر دیا کہ محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی وہ واحد کسوٹی ہے جس کی بدولت ایمان کی عظمت کا اظہار ہوتا ہے۔ اگر سینے محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے خالی ہوں تو ایمان کا اظہار محض ایک لفظی دعویٰ بن کر رہ جاتا ہے۔ آپ کی باتوں میں گلوں کی خوشبو ہوتی تھی۔ باتیں دل سے نکلتیں اور غیر محسوساتی طور پر سننے والوں کے دل و دماغ کا احاطہ کر لیتیں اور آپ کی مجلس میں مستقل طور پر بیٹھنے والوں کو یہ اقرار کرنا پڑتا کہ مخدوم العصر کی باتیں ہم پر اس طرح اثر انداز ہوتی ہیں جس طرح قطرہ قطرہ ٹپکنے والی بارش زمین کو حقیقی نم عطا کر دیتی ہے۔

آپ ذکر خداوندی میں اس قدر کھوئے رہتے کہ صرف ظاہر ہوتا کہ یہ عبادت و ریاضت محض آپ کا معمول ہی نہیں بلکہ رضائے الہی اور معرفت خداوندی کا نشان لازوال ہے۔ خواجہ محمد عبد اللہ قادری جوں جوں آپ کو عبادت و ریاضت میں مجبور دیکھتے، انہیں بے پناہ مسرت کا احساس ہونے

لگتا۔ قبلہ عالم آپ پر اور زیادہ شفقت و عنایت فرمانے لگے۔ دراصل وہ جان چکے تھے کہ یہ نوجوان فرزند اپنے ہم عمروں سے بالکل مختلف ہے۔ یہ دنیا والوں کے درمیان رہ کر بھی زمانے بھر سے بیگانہ ہے۔ اسے صرف رضائے الہی عزیز ہے اور زمانہ بھر کے اعزازات اس کی نگاہ میں پرکاش سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔ اپنے والد محترم کی خصوصی توجہ سے آپ نے بہت جلد وہ مقام حاصل کر لیا جو اوروں کو زندگیوں گزار کر بھی نصیب نہیں ہوتا۔ یہ اپنے اپنے مقدر کی بات ہے اور آپ کا مقدر تو طریقت و معرفت کے ہفت افلاک کی بلندیوں کو چھو رہا تھا۔

جب حضرت قبلہ خواجہ محمد عبداللہ عباسی قادری رحمۃ اللہ علیہ نے دیکھا کہ ان کا فرزند ارجمند دینی علوم اور روحانی بلندیوں سے بہرہ ور ہو چکا ہے تو اندازہ کر لیا کہ شاہین شہ لولاک اس قابل ہو چکا ہے کہ میرے بعد درگاہ معلیٰ قادریہ کی روحانی سربراہی کے منصب عظیم کا حقدار بن سکے تو آپ کو خرقہ خلافت عطا کر کے آپ کی سجادہ نشینی کا اعلان کر دیا۔ آپ اس اعزاز کے متمنی نہ تھے۔ آپ تو فقط رضائے الہی کے نام پر زندہ رہنا چاہتے تھے مگر خلق خدا کو آپ کی ضرورت تھی، آنے والا دور اپنی تمام تر رفعتوں سمیت آپ کا انتظار کر رہا تھا، مستقبل اپنی بہت سی فکری سرفرازیوں کو لے کر آپ کے در لطف و کرم پر دستک دے رہا تھا کہ:

اے تماشا گاہ عالم روئے تو
تو کجا بہر تماشای روی

اس درگاہ معلیٰ کے دوسرے عالی مرتبت اصحاب فقر کی طرح آپ نے بھی مردہ دلوں کو زندہ کیا۔ دل خدا کا عرش ہے اس میں رب اپنی تجلی فرماتا ہے وہ بد قسمت ہے جو دل کے آئینے کو زنگ آلود کر لے۔ خواجہ محمد کریم اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے دلوں کی اجڑی ہوئی نگریاں آباد کر دیں۔ ویران دلوں کو ذکر خداوندی سے آباد کر دیا۔ وہ دل جو زمانے بھر کے توہمات کا شکار تھے ان کو خدا اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت سے صوریز کر دیا۔ دلوں کو زندہ کرنا کارِ عظیم ہے۔ یہ عظمت انہی کا مقدر بنتی ہے جن کے اپنے دل یاد خداوندی سے ہر لحظہ اور ہر آن پر نور رہتے ہوں۔ خواجہ محمد کریم اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ارادت مندوں کو باور کرایا کہ وہ دلوں کو حیات نو بخش کر ہی کونین میں کامیابی کا تصور کر سکتے ہیں۔ آپ نے اپنی تقاریر و خطبات، مواعظ حسنہ، ہند و نصائح اور انمٹ شاعری کی بدولت عوام الناس کو یاد خداوندی میں محو کر کے دلوں کو آباد رکھنے کا ہنر سکھا دیا اور یہ عرفان بخش دیا کہ جس کا دل زندہ ہے، حقیقت میں وہی زندہ ہے اور مردہ دلوں کا جینا یا مرجانا برابر ہے۔

آپ کی طبیعت جمال و جلال سے عبارت تھی۔ آپ اپنے صحبت نشینوں سے محبت و شفقت سے پیش آتے مگر جب کسی کو اسلام کے جادہ مستقیم سے بھٹکتا ہوا دیکھتے کہ وہ شعائر اسلامی کی خلاف ورزی کر رہا ہے پھر آپ کی طبیعت میں جلال جلوہ گر ہو جاتا اور گمراہوں کو جی بھر کر فہمائش کرتے۔ گناہوں سے بچنے کی تلقین کرتے۔ جو نبی ملاحظہ فرماتے کہ آپ کی باتیں دلوں پر اثر کر رہی ہیں اور راہ حق سے بھٹکنے والے منزل ایمان پر گامزن ہونے لگے ہیں تو فوراً جلال پر جمال غالب آ جاتا اور پھر پہلے کی طرح لطف و عنایت کا مظاہرہ فرمانے لگے اور انداز ایسا ہو جاتا جیسے ان کی طبیعت میں جلال کا عنصر ہی نہیں ہے سچ ہے کہ:

ہو حلقہ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

آپ حضرت خواجہ محمد عبداللہ قادری رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کے بعد ایک طویل عرصہ تک درگاہ معلیٰ قادریہ کے سجادہ نشین کی حیثیت سے اپنی روحانی ذمہ داریاں انجام دیتے رہے۔ آپ کا کمال یہ ہے کہ آپ نے نہ صرف اپنے عظیم اسلاف کی روایات اعراس مبارکہ اور تقریبات کے سلسلے کو قائم رکھا بلکہ اسے مزید فروغ عطا کیا۔ جب بھی اس خانوادہ روحانی کی تاریخ لکھی جاتی ہے تو اپنے اسلاف کی طرح آپ کا نام نہایت نمایاں حیثیت سے سامنے آتا ہے۔

کہتے ہیں کہ ”شاعری جزویست از پیغمبری“ یعنی شاعری پیغمبری کا جزو ہے۔ پیغمبر شاعر نہیں ہوا کرتے۔ کہنے والے کا مقصد یہ تھا کہ جس طرح پیغمبران عظام کے اس کائنات میں تشریف لانے کا مقصد ایمان و یقین کی شمعیں روشن کرنا تھا، بت کدوں میں رکھے اصنام کے طلسم کو توڑ کر خدائے واحد کی حقانیت کے تصور کو دلوں میں راسخ کرنا تھا۔ مردہ اور ایمان کی حرارت سے محروم دلوں کو خدا شناسی کی طرف راغب کرنا تھا۔ اسی طرح اگر شاعر بلند بخت چاہے تو وہ بھی اپنے اعجاز بیان سے مردہ نفسوں کو ایمانی حرارت بخش کر خواب غفلت سے بیدار کر کے خدا آشنا بنا سکتا ہے۔ خواجہ محمد کریم اللہ قادری علمی و روحانی اوصاف سے بدرجہ کمال بہرہ ور تھے۔ چنانچہ جب آپ نے تبلیغ دین، حمد رب جلیل، اصلاح احوال اور توصیف مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے شاعری کو وسیلہ اظہار بنایا تو پھر فکر و آگہی کے جواہر بے بہا بکھیرتے چلے گئے۔ آپ کی شاعری کا تذکرہ نہایت ہمہ گیر اور جامعیت کا پہلو لئے ہوئے ہے۔

شاعری کے ضمن میں آپ ان عظیم المرتبت صوفیائے کرام کے نقوش قدم پر چل رہے تھے جن کی شاعری ان کے افکار کی شارح اور ان کے روحانی جذبات کی ترجمان ہوتی ہے۔ تاریخ

تصوف میں ایسے صوفیائے کرام بڑی تعداد میں ملتے ہیں جنہوں نے تقریر، تبلیغ اور نثر کے ساتھ ساتھ شاعری کا سہارا بھی لیا۔ خواجہ محمد کریم اللہ قادری رحمۃ اللہ علیہ بھی اس خوش بخت قافلے کے محترم رکن تھے آپ نے لکھا اور خوب لکھا۔ راقم (پروفیسر محمد اکرم رضا) آپ کی شعری عظمتوں کو مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہونے والے مضامین میں بالخصوص اُجاگر کر چکا ہے اور اس سلسلہ میں راقم کی تصنیف ”تجلیات مخدوم“ کا مطالعہ روحانی و علمی جادہ پیاؤں کیلئے یقیناً نشان منزل ثابت ہوگا۔ راقم کے قلم سے آپ کی حکیمانہ بصیرت کو خراج عقیدت پیش کرنے کا سلسلہ بدستور جاری ہے کیونکہ جہاں عشق اور دل کا معاملہ ہو وہاں قلم رکتا نہیں، بلکہ فکر کا راہوار تھوڑی دیر کیلئے سستا ہے اور پھر نئے عزم سے سرشار ہو کر کہیں زیادہ برق رفتار سے آگے کو روانہ ہو جاتا ہے۔

یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ فیاضی قدرت نے آپ کو شعری ذوق کے حوالے سے خوب نوازا تھا۔ آپ عربی، اردو، فارسی اور پنجابی پر یکساں عبور رکھتے تھے۔ پنجابی شاعری میں آپ عاشق اور اردو فارسی شاعری میں کریمی اور کریم تخلص فرماتے تھے۔ آپ نے اپنی شاعری کے ستارے بکھیر کر کرافق ادب کو زلفشاں بنا دیا۔ اہل شوق کو توحید خداوندی کے حقیقی مفہوم سے آگاہ کیا۔ نعت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف آئے تو محبت و عقیدت کے گلاب کھلا دیئے۔ بزرگان دین کے مناقب رقم کرنے بیٹھے تو قلم سے پھول جھڑنے لگے۔ نظم، غزل، مسدس، مخمس، مثنوی، ترکیب بند، ترجیع بند، کافیاں، دوہڑے، چومصرے اور سی حرفیاں سمیت ہر صنف سخن میں فکر آزمائی کے جوہر دکھائے۔ توجہ طلب اور قابل تحسین امر یہ ہے کہ کسی بھی صنف سخن میں آپ اپنے حقیقی مقصود و مدعا سے غافل نہیں ہوئے۔ آپ نے ان اصناف سخن کے شکوہ یا عصری تقاضوں کو اپنی حکیمانہ بصیرت پر حاوی نہیں ہونے دیا بلکہ ان تمام اصناف سخن سے اپنی پسند اور مرضی کا کام لیا۔

آپ نے تمام اصناف سخن میں مقصدی شاعری فرمائی مگر مقصدیت کو اولیت دیتے ہوئے آپ نے ان اصناف سخن کے فنی لوازم اور سخن گوئی کے اہم امور کو فراموش نہیں کیا بلکہ قادر الکلامی اور فنی مہارت کے ساتھ شعر و سخن کی خوشولٹائی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی شاعری بیک وقت مقصدیت اور فنی و فکری لوازم سے آراستہ نظر آتی ہے۔ آپ کی شاعری حقیقت آفرینی کی تصویر ہے۔ اس میں کمال کا درد و سوز ہے، ایسا لگتا ہے جیسے کسی نے اپنے دل کے ٹکڑے کاغذ کی زینت بنا دیئے ہوں۔ اب ہم ایک نظر آپ کے شعری اسالیب پر ڈالتے ہیں تاکہ ہمارے قارئین تک آپ کی شعری سرفرازیوں کی ایک جھلک پہنچ سکے۔ حمد خدائے کائنات ہمیشہ سے اہل شوق کا موضوع خاص

رہی ہے۔ صوفیائے کرام نے بالخصوص خدا کو اپنا محبوب حقیقی جان کر معرفت کے اسرار تک رہنمائی کرنے کی کوشش کی ہے۔ صوفیائے عظام خدا کیلئے ہی جیتے اور اُس کی رضا میں فنا ہوتے ہیں اور اسی فنا کو وہ بقا کی منزل سے تعبیر کرتے ہیں۔ خواجہ محمد کریم اللہ قادری رحمۃ اللہ علیہ بھی محبت خدا میں حد درجہ گم رہنے والی شخصیت ہیں۔ آپ کو چاروں جانب سے اللہ ہو کی صدائیں سنائی دیتی ہیں۔ آپ محبت رب دو عالم کے انوار میں گم ہو جاتے ہیں۔

ہے نور جمالت تیرا سو بہ سو
ہے ذکر جلالت ترا کو بہ کو
ہے دونوں جہاں میں تری جستجو
گل و برگ میں ہیں ترے رنگ و بو
جدھر دیکھتا ہوں ادھر تو ہی تو
تو ہی ہے وحدہ وحدہ وحدہ

خواجہ محمد کریم اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی حمد یہ شاعری میں حسن صوت کی جلوہ گری بھی ہے یعنی اگر پڑھنے والا صدق دل سے پڑھے تو الفاظ کی موسیقیت اور معانی کا حسن اسے ایک نئی دنیا میں لے جاتے ہیں۔ وہ دنیا جہاں حرص و ہوس کا گزر نہیں، جہاں اصل شہو و شاہد و مشہود کے ایک ہونے کا گمان گزرتا ہے۔ جہاں زبان گنگ رہ جاتی ہے اور بے زبانی شرح حال کرنے لگتی ہے۔

پاک ہے وہ جس نے خود سبحانک اللہ کہہ دیا
حمد اس کی جس نے خود الحمد للہ کہہ دیا
شربت عرفاں پلا کر اولیاء اللہ کو
فرط اُلفت سے انہیں پھر رحمۃ اللہ کر دیا

خواجہ محمد کریم اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں نعت مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم کے انوار بشریح کمال ملتے ہیں۔ ایسے لگتا ہے جیسے یہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے انوار میں گم ہو کر معرفت الہی کے آداب سکھا رہے ہوں۔ نعت شریف کہنا حمد سے زیادہ مشکل امر ہے۔ کیونکہ یہاں قدم قدم پر یہ گمان ہوتا ہے کہ کہیں گستاخی نہ ہو جائے، نعت میں یہ احساس دامنگیر ہوتا ہے:

ہزار بار بشویم دہن بمشک و گلاب
ہنوز نام تو گفتن کمال بے ادبی است

اس لئے نعت کہتے ہوئے شاعر کو قدم قدم پر راہوار فکر کو تھام کر رکھنا پڑتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو جائے کہیں ویسا نہ ہو جائے۔ خواجہ محمد کریم اللہ قادری رحمۃ اللہ علیہ کو تو علوم روحانی کے ساتھ ساتھ علوم دینیہ کی دولت بھی وافر مقدار میں عطا ہوئی تھی اور آپ شریعت کے تقاضوں کی بجا آوری کا بطور خاص اہتمام کیا کرتے تھے۔ قرآن کے معارف و اسرار پر گہری نظر تھی۔ نگاہوں میں صورت و سیرت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے انوار سمائے ہوئے تھے۔ اس لئے آپ کے بہک جانے کا گمان تک نہیں تھا۔ آپ تو صوفیائے کرام کے اس سلسلے کی ایک روشن کڑی تھی جس نے محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے جلوؤں میں کھو کر خدائے کریم کے انوار تک رسائی حاصل کی تھی۔

حضرت خواجہ محمد کریم اللہ کی شاعری حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت و صورت کی تابشوں سے ضو بار ہے۔ جمال و کمال مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی سرفرازیوں ان کے اشعار میں جا بجا ملتی ہیں۔ حضور پر نور سید یوم النور صلی اللہ علیہ وسلم مصدر شان لولاک ہیں۔ مصداق یسین و طہ ہیں۔ شرح و معنی اول و آخر ہیں باعث تخلیق کائنات ہیں۔ قصہ مختصر یہ کہ ”بعد از خدا بزرگ توئی“ کے مصداق کائنات کی بزرگ ترین شخصیت ہیں۔ جب خواجہ محمد کریم اللہ کا قلم حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حسن و جمال اور آپ کے اسوۂ حسنہ کے کمالات بیان کرتا ہے تو افکار کو تازگی اور ذہنوں کو بالیدگی کا احساس ہونے لگتا ہے۔

یا رسول اللہ حبیب کبریا خیر الوری

نقطہ اک تعریف کا تیری ہے ”لولاک لما“

نور خورشید نبوت جب ہوا جلوہ فلکن

ہر طرف ظاہر ہوئی عالم میں شان کبریا

آپ کی نعت گوئی کے درجنوں مظاہر قاری کے ذہن و فکر کو اپنی جانب کھینچتے ہیں۔ ان میں

سے ایک آپ کی کہی ہوئی طویل پنجابی نعت ”نوری سہرا ہے“۔

پاک نبی سرسہرائی سیو پاک نبی سرسہرائی

پاک نبی سرتاج لولاکی روشن نوری چہرائی

احمد سرور دوہاں جہاناں کرسی عرش زمین آسماناں

چمک نوری تاج شہاناں عرشین راج بسیرانی

نعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو بہ پہلو آپ نے غزلیات بھی لکھی تھیں لیکن صوفیائے

کرام تو غزل کے پیرائے میں بھی محبوب حقیقی خدائے کریم کی شان و تسبیح بیان کر جاتے ہیں۔ انہیں مجازی محبوبوں سے کیا لینا؟ ان کی نظروں میں تو خدائے ذوالجلال کے لاقانی جلوے بسے ہوتے ہیں۔ جیسا کہ ہم پہلے رقم کر چکے ہیں کہ خواجہ محمد کریم اللہ عباسی قادری رحمۃ اللہ علیہ نے مناقب بھی رقم فرمائے۔ اپنے جانندان قدسیہ کے اکابرین کے علاوہ آپ نے عالم اسلام کی انتہائی محترم شخصیات کے حضور مناقب کی صورت میں خراج عقیدت پیش کیا۔ بالخصوص تاجدار بزم قادریت حضرت غوث اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے حضور آپ کی طویل منقبت عباسی پہلی کیشنز گوجرانوالہ کے زیر اہتمام ”ارمغانِ کریمی“ کے عنوان سے شائع ہو چکی ہے۔

مسدس کا ذکر چھڑا ہے تو آپ کی مسدس معرفت بذات خود ایک تحفہ بے بہا ہے جس کے شعر شعر سے خدا شناسی کی خوشبو پھوٹی ہے جس میں شریعت، معرفت اور طریقت کے اسرار منکشف کئے گئے ہیں۔ اسی طرح جب ہم آپ کی پنجابی شاعری پر نگاہ دوڑاتے ہیں تو نعتوں، منظومات اور مناقب کے علاوہ معرفت آفریں سی حرفیوں اور کافیوں کا ایک بیش بہا خزانہ ملتا ہے۔ اگر ہم صرف انتخاب کے حوالے سے چند اقتباسات ہی نقل کرنے لگیں تو زیر نظر کتاب کی ضخامت بڑھ جائے گی۔ جبکہ ہمارا اصل مقصود تو اس حقیقت کو آشکار کرنا ہے کہ درگاہِ معلیٰ حضرت غوث العصر کا عظیم تر اعزاز ہے کہ یہاں سے یکے بعد دیگرے ابھرنے والی شخصیات نے اسے مسلسل مرکز تجلیات بنائے رکھا۔ حضرت مخدوم العصر رحمۃ اللہ علیہ عالم اجل تھے، فاضل اکمل تھے، صوفی باصفا تھے، درویش بے ریا تھے، کاروانِ معرفت کے سالار تھے، ارادت مندوں کے دلوں پر حکومت کرنے والے تاجدار تھے، تبلیغی دوروں کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا، ہر آن شرح عقائد اور تبلیغ دین کا عمل بھی جاری تھا، درگاہِ معلیٰ قادریہ کے روحانی معمولات بھی جاری تھے، لنگر شریف کا بھی اہتمام تھا، خدا کی مخلوق کی رضا جوئی بھی مطلوب تھی، عبادت و ریاضت بھی زندگی کا اعزاز تھی، یہ سب کچھ ہوتے ہوئے اس قدر موثر شاعری کا اتنا بڑا ذخیرہ اللہ اکبر! تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ یہ عین فضل الہی تھا۔ خدا جب کسی عظیم انسان سے بڑا کام لینا چاہتا ہے تو اس کے سینے کو علوم کا مرکز و معدن بنا دیتا ہے۔ آپ کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ تھا:

ادھر مخلوق میں ادھر سے واصل

آپ کی حیات مقدسہ میں آپ کا ایک شعری مجموعہ ”کلام عاشق“ کے نام سے شائع ہو چکا تھا۔ یہ مجموعہ کلام ۱۳۳۳ھ میں شائع ہوا تھا، جب گوجرانوالہ میں شائع ہونے والے شعری مجموعوں کی

تعداد محدودے چند تھی مگر آج عباسی پہلی کیشنز کے زیر اہتمام آپ کی مندرجہ ذیل تصانیف زیو
رطباعت سے آراستہ ہو چکی ہیں جبکہ باقی زیر طبع ہیں۔

۱۔ گنج عرفان

۲۔ میزان عشق

۳۔ دیوان عشق

۴۔ برہان عشق

۵۔ ایقان عشق (پنجابی شعری مجموعہ جات)

۶۔ زمرہ احمد

۷۔ آداب المریدین

۸۔ بیان مخدوم

۹۔ ارمغانِ کریمی

حضرت مخدوم العصر رحمۃ اللہ علیہ درگاہ عالیہ حضرت غوث العصر کے میر کارواں تھے۔ درویشی
و پارسائی آپ کی پہچان تھی۔ آپ نے شاعری کو اپنی پہچان نہیں بنایا مگر ”مرکز تجلیات“ کو اپنے افکار
سے منور کرنے والے مردِ کامل پر خدائے کریم کا خصوصی احسان تھا کہ یہ شعری سرمایہ آپ کے افکار کا
ترجمان بن کر مخلوقِ خدا تک پہنچے اور اس کی بدولت بے شمار گم گشتگان راہ کو منزل عرفان خداوندی
نصیب ہو۔ شاعری آپ کیلئے محض ایک ذریعہ ابلاغ تھی، مقصود بالذات نہیں۔ اور ”مرکز تجلیات“ کا
فیضان دیکھئے کہ آج یہی شاعری کتنے ہی اصحابِ نظر کے قلم سے خراج عقیدت لے رہی ہے۔

مخدوم العصر حضرت خواجہ محمد کریم اللہ نے ایک طویل عرصہ تک خلقِ خدا کی راہنمائی کی۔
بالآخر آپ کا وقت وصال آ پہنچا۔ یہ وقت وصال کیا تھا حبیب کی حبیب سے ملاقات کا بہانہ تھا۔
آپ ۱۹۴۲ء میں مرض الموت میں مبتلا ہوئے۔

اور پھر شعبان ۱۳۶۱ھ کی اٹھارہ تاریخ آ پہنچی۔ پیر کا روز تھا، وقت تہجد کی نورانی ساعتیں تھیں
اور آپ اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ (انا للہ وانا الیہ اجعون)

آپ کے وصال کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی اور ارادت مند ہجوم در ہجوم آنے
لگے۔ (خانقاہ قادریہ نوریہ کھیالی دروازہ) کے سجادہ نشین حضرت مولانا غلام جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے
آپ کو غسل دیا۔ حضرت خواجہ محمد بشیر عباسی قادری پانی ڈال رہے تھے، غسل مبارک کے بعد آپ کو

کفن کے کپڑوں میں لپیٹ دیا گیا۔ ارادت مندوں کا ہجوم رات بھر قرآن خوانی کرتا رہا۔ جب جنازہ گھر سے اٹھایا گیا تو اشکوں کا طوفان بہہ نکلا۔ کثیر ہجوم کے پیش نظر جنازہ کی چار پائی کے ساتھ لمبے لمبے بانس باندھ دیئے گئے تھے۔ اس وقت بازار خراواں وسیع میدان کی صورت تھا۔ چاروں طرف انسانوں کے سر دکھائی دے رہے تھے۔ پہلے آپ کے صاحبزادے جناب صوفی محمد شریف غیرت قادری رحمۃ اللہ علیہ نے نماز جنازہ پڑھائی۔ دوسری مرتبہ سلسلہ عالیہ نقشبندیہ کے مشہور بزرگ صاحبزادہ غلام سرور جان مجددی سرہندی سجادہ نشین باؤلی شریف گجرات کی اقتداء میں نماز جنازہ پڑھی گئی۔ ایک اور بزرگ نے تیسری مرتبہ نماز جنازہ پڑھائی۔

آپ کا روئے مبارک ماہ تاباں کی طرح جگمگا رہا تھا۔ وصال سے چھتیس گھنٹے بعد آپ کے جسد پاک کو ہزاروں سوگواروں کی موجودگی میں آپ کی والدہ ماجدہ کے قدموں میں سپرد خاک کر دیا گیا۔



امیر العصر

حضرت خواجہ محمد بشیر عباسی قادری رحمۃ اللہ علیہ

دربار قادریہ گوجرانوالہ

حضرت خواجہ محمد بشیر عباسی قادری رحمۃ اللہ علیہ یکم اپریل ۱۹۲۰ء کو پیدا ہوئے۔ آپ کے والد محترم خواجہ محمد کریم اللہ نے آپ کی ولادت کو رشد و ہدایت کے سلسلے کی سرفرازی سے تعبیر فرمایا اور اس جذبے کا اظہار کیا کہ ان کا یہ فرزند روحانیت کی دنیا میں معتبر حوالہ بنے گا۔ آپ بچپن ہی سے ذہین و فطین اور صاحب فہم و ذکاوت تھے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم کے بعد محبوب عالم اسلامیہ ہائی سکول گوجرانوالہ میں داخلہ لیا اور امتیازی نمبروں کے ساتھ میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ پھر مزید تعلیم کیلئے دیال سنگھ کالج لاہور میں داخل ہوئے۔ کالج میں تعلیم کے دوران آپ کا تعلیمی کردار لائق توصیف اور قابل رشک رہا۔ اپنی تعلیمی اور ذہنی استعداد کی بناء پر آپ کو دوسرے طلبہ پر فوقیت حاصل تھی۔ آپ کو اس دوران نامور اساتذہ کرام میسر آئے جن میں ممتاز ادیب اور شاعر سید عابد علی عابد خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ سید عابد علی عابد رحمۃ اللہ علیہ آپ کے فارسی کے استاد تھے۔ ان کی خصوصی شفقت اور راہنمائی نے آپ کو فارسی زبان میں خصوصی مہارت عطا کی۔

قدرت حق سے آپ کو شعری ذوق ارزاں ہوا تھا۔ آپ مخدوم العصر خواجہ محمد کریم اللہ قادری رحمۃ اللہ علیہ کے ہونہار لخت جگر تھے جن کی شاعری کا ایک زمانہ معترف ہے۔ اتنے عظیم والد کے سایہ الطاف میں پرورش پا کر ممکن ہی نہیں تھا کہ آپ شعری ذوق سے بے بہرہ رہتے بلکہ حیرت تو تب ہوتی جب شاعری کی طرف متوجہ ہی نہ ہوتے۔ اپنے شعری ذوق کو پروان چڑھانے اور بلند یوں سے آشنا کرنے کیلئے آپ نے اردو کے نامور شاعر علامہ تاجور نجیب آبادی کے سامنے زانوئے تلمذ طے کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ علامہ تاجور نجیب آبادی ایک قادر الکلام شاعر تھے اور ان کے تمام معاصرین ان کی شعری مہارت کے قائل تھے۔ شاعری کے حوالے سے اس قدر قد آور استاد

شاعر کی راہنمائی آپ کے ذوق کی سر بلندی کیلئے سونے پر سہاگہ ثابت ہوئی اور آپ بہت جلد مختلف اصناف سخن میں مہارت علمی کے ساتھ اپنی شعری صلاحیتوں کا مظاہرہ کرنے لگے۔

کالج کی تعلیم کے دوران آپ کے تعلیمی مشاغل تو جاری ہی تھے آپ ان کے ساتھ ساتھ معاون نصاب سرگرمیوں میں بھی حصہ لیا کرتے۔ خاص طور پر سپورٹس میں آپ کا نام گونج رہا تھا۔ آپ کالج کی ہاکی ٹیم کے کپتان تھے قدر عطا اور دل کشا پایا تھا، ورزشی جسم، دلاویز خدو خال۔ آپ کی تعلیمی اور جسمانی صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے حکومت برطانیہ نے آپ کو فوج میں سیکنڈ لیفٹیننٹ کیلئے منتخب کرنے کے احکام صادر کر دیئے تھے۔ آپ ابھی سوچ ہی رہے تھے کہ والد گرامی حضرت مخدوم العصر رحمۃ اللہ علیہ (جو کہ آپ کے روحانی راہنما بھی تھے) کی طرف سے ارشاد نامہ ملا کہ:

”بیٹے فوراً درگاہ عالیہ میں چلے آؤ“

آپ نے ایک لمحہ کیلئے بھی تامل نہ کیا اور بلا تاخیر درگاہ عالیہ قادریہ میں حاضر ہو گئے۔ حضرت مخدوم العصر رحمۃ اللہ علیہ آپ کی تعلیم اور پھر حکومت برطانیہ کی طرف سے فوج میں آپ کے انتخاب سے بخوبی آگاہ تھے انہوں نے اپنے ارشاد کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا:

”بیٹے! ہم نے آپ کو خلق خدا کیلئے تعلیم دلوائی ہے۔ اللہ کے پیغام کو عام کرنے کیلئے دینی اور دنیاوی علوم کی تحصیل کا اہتمام کیا تا کہ تم زیادہ سے زیادہ مخلوق خدا کے کام آسکو، رشد و ہدایت کے سلسلے کو پھیلا سکو تمہاری تمام تر تعلیم اہل ایمان کی بہتری اور درگاہ عالیہ کے انوار کو عوام الناس تک پہنچانے کیلئے ہو، غیروں کیلئے نہیں۔ جو کام ہم تم سے لینا چاہتے ہیں وہ منشاء قدرت ہے اور وہ کام اس کام سے افضل ہے جو حکومت برطانیہ تم سے لینا چاہتی ہے۔ ہمارا مقصود خانقاہی نظام کا فروغ ہے انگریز کی اطاعت نہیں۔“

مخدوم العصر رحمۃ اللہ علیہ چونکہ آپ کو درگاہ عالیہ کا مستقبل قرار دے چکے تھے۔ اس لئے انہوں نے آپ کو اپنی باطنی توجہات کا خصوصی مرکز بنا لیا۔ آپ تو پہلے ہی مرد ہونہار تھے۔ شیخ کامل کی صحبت میں بہت تیزی کے ساتھ طریقت و روحانیت کے مراحل طے کرنے لگے۔

مخدوم العصر رحمۃ اللہ علیہ آپ کو ہمراہ رکھتے اپنی نگرانی میں آپ کو مشاہدات حقیقی کے سفر پر گامزن کرتے۔ تذکار میں رقم ہے کہ مخدوم العصر رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کو سخت روحانی ریاضت سے گزارا۔ آپ کے دل کو عبادات کی لذات سے بہرہ ور کیا۔

جب حضرت مخدوم العصر رحمۃ اللہ علیہ کا وصال ہوا تو آپ کی عمر فقط بیس سال کی تھی لیکن

طریقت اور معرفت کی بلندیاں آپ کا احاطہ کئے ہوئے تھیں۔ مخدوم العصر رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال پر ملاں کے بعد سجادہ نشینی کے حوالے سے ایک بڑا خلا پیدا ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ مخدوم العصر رحمۃ اللہ علیہ کے وصال انور کے کچھ عرصہ بعد ایک بڑی تقریب منعقد ہوئی، اس تقریب میں شہر اور مختلف علاقوں سے تعلق رکھنے والے ممتاز علمائے کرام اور مشائخ عظام نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔ جانشینی کا مرحلہ آیا تو تمام علماء و مشائخ نے اتفاق رائے سے حضرت خواجہ محمد بشیر عباسی قادری رحمۃ اللہ علیہ کو درگاہ عالیہ حضرت غوث العصر رحمۃ اللہ علیہ کا سجادہ نشین منتخب کر کے دستار فضیلت و معرفت آپ کے سر اقدس پر سجادی۔ یہ عظیم ذمہ داری بھی تھی اور بہت بڑا اعزاز بھی اور رحمت خداوندی کے سہارے آپ ان ذمہ داریوں سے بحسن و خوبی عہدہ برآ ہونے والے تھے۔

خواجہ محمد بشیر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے اسلاف کے مزارات کی تعمیر کی طرف خصوصی توجہ فرمائی۔ ان مزارات کی تعمیر اور مرصع کاری کیلئے تمام صلاحیتیں وقف کر دیں۔ آپ نے اپنی نگرانی میں حضرت غوث العصر رحمۃ اللہ علیہ کا روضہ مبارک پہلے ۱۹۳۳ء میں اور پھر ۱۹۶۵ء میں تعمیر کروایا۔ یہ روضہ مبارک حسن تعمیر، آرائش، نقاشی اور مرصع کاری میں اپنی مثل آپ ہے۔ بیشتر اشعار اور قطعات حضرت امیر العصر رحمۃ اللہ علیہ کے اپنے زور سخنوری کا نمونہ ہیں۔ یہ اشعار نامور خطاط محمد صدیق الماس رقم مرحوم کی خطاطی کا شاہکار ہیں۔ آیات قرآنی، احادیث نبوی اور صاحب مزار سے متعلق مناقب اشعار کی صورت میں فکر و فن کی نئی بہار بکھیر رہے ہیں۔ ایک شاعر جب روضہ اقدس پر حاضر ہوتا ہے تو یہ نقاشی اور شعری تحریریں اس کے دامن خرد کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہیں۔ حضرت امیر العصر رحمۃ اللہ علیہ نے خود عشق و عقیدت کو خضر راہ بنا کر خطاطی کے ان شہ پاروں کو پوری صحت لفظی کے ساتھ روضہ اقدس کی دیواروں پر منتقل کیا ہے۔ اس کمال فن کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے اور یہ یقین ہو جاتا ہے کہ یہ بھی خاص عطائے ربانی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ”اللہ جمیل و یجب الجمال“ یعنی اللہ خود سراپا جمال ہے اور حسن کو پسند فرماتا ہے۔ جس طرح خواجہ صاحب نے روضہ اقدس کی تعمیر میں اپنی فکری اور فنی کاوشوں کا حسن بکھیرا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کی یہ محنت اور جانکاری خدا کے نزدیک کس قدر محبوب تر ٹھہرے گی۔

اس کے علاوہ آپ نے اپنے خاندان کے مورث اعلیٰ فخر الاسیاء حضرت سخی احمد یار رحمۃ اللہ علیہ (پیر و کوٹ ضلع گوجرانوالہ) کے مزار اقدس کی تعمیر اور آرائش کا فریضہ بھی انجام دینا شروع کیا، آپ نے اس مزار اقدس کیلئے اعلیٰ قسم کا سنگ مرمر منگوایا۔ آپ کام کو بہت حد تک آگے لے گئے

تھے کہ زندگی کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور وقت نے مزید مہلت نہ دی، آپ کے وصال کے بعد اس فریضہ کو آپ کے جانشین جناب ڈاکٹر صاحبزادہ شبیر احمد کمال عباسی قادری نے اس حسن اہتمام سے انجام دیا کہ چاہنے والوں کے دلوں سے بے اختیار دعائیں نکلتی ہیں اور دیکھنے والوں کی نظریں اس روضہ اقدس کے حسن ظاہر پر مرکوز رہ جاتی ہیں۔ جناب ڈاکٹر صاحبزادہ شبیر احمد کمال عباسی صاحب کیلئے یہ فریضہ باعث سعادت بھی تھا اور اپنے والدہ ماجد کی ریاضت کی تکمیل کا باعث بھی۔ ہر گام پر نظر آتا ہے یہ خون جگر کے معجزات ہیں۔

نقش ہیں سب نا تمام خون جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خون جگر کے بغیر

آپ خوبصورت سراپا رکھتے تھے۔ لباس سادہ مگر قد موزوں پر سجتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ گفتگو میں غضب کی تاثیر ہوتی تھی۔ تقریر نہایت ایمان آفریں کرتے تھے۔ بات بات میں نکات، جملہ جملہ علم و حکمت کے جواہر سے مرصع، لوگ سنتے تو جھوم جھوم اٹھتے۔ عوام کے حسب مذاق تقریر فرماتے تھے تاکہ آپ کی گفتگو دلوں میں گھر کر جائے۔ درگاہ عالیہ کے اعراس کے علاوہ اپنے ارادت مندوں کے ہاں تشریف لے جاتے تو ان کے اصرار پر کلمات عالیہ سے نوازتے۔ آپ کی تقریر کی طرح آپ کی تحریر بھی دلکش اور موثر تھی۔

آپ روحانی معالج تو تھے ہی جسمانی امراض کا علاج بھی فرماتے تھے۔ حکمت اور طبابت ہمیشہ سے صوفیائے کرام اور مشائخ عظام کا خاصہ رہی ہے۔ آپ کی ادائیں لطافت آشنا تھیں تو عزائم سے پہاڑوں کی بلندی اور وسعت جھلکتی تھی۔ آپ علم و حکمت کا ایسا خزانہ نظر آتے تھے کہ جس سے جتنا بھی فیضیاب ہوا جائے کم ہے۔ آپ سے مل کر یہی احساس ہوتا ہے کہ اقبال کے مرد مومن سے ملاقات ہو رہی ہے۔ وہ مرد مومن کہ جو عشق کے مضراب سے نغمہ تار حیات ابھر رہا ہے۔

عشق کے مضراب سے نغمہ تار حیات
عشق سے نور حیات، عشق سے تار حیات

جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ آپ پر تاثیر مقرر تھے بلکہ آپ کی تقریر و وعظ و تبلیغ کا رنگ لئے ہوتی تھی۔ مقصد یہی ہوتا ہے کہ آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ سامعین کے دلوں پر نقش ہو جائے۔ قرآن حکیم اور احادیث نبوی پر آپ کی گہری نظر تھی۔ اشعار کا ذخیرہ بھی وسعت ذہن و فکر میں موجود ہوتا اور بر محل اشعار کے استعمال سے مضمون کو کہیں سے کہیں پہنچا دیتے۔ مولانا روم، سعدی

جائی اقبال سمیت بلند فکر شعراء کے شعری سرمایہ سے بھرپور استفادہ کرتے۔ گفتگو کرتے ہوئے قرآن و حدیث سے اتنے دلائل پیش کرتے کہ دل بے اختیار سبحان اللہ پکار اُٹھتے۔ آپ کے علمی وقار کا قائل ہونا پڑتا۔

حضرت خواجہ محمد بشیر عباسی قادری رحمۃ اللہ علیہ جہاں علمی فضیلتوں سے بہرہ ور پیر طریقت اور صاحب اسرار معرفت تھے وہاں آپ صاحب فکر شاعر بھی تھے۔ بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ شاعری آپ کو ورثہ میں عطا ہوئی تھی جس طرح دوسرے صوفیائے کرام شاعری سے تبلیغ دین اور اشاعت پیغام مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا کام لیتے آتے ہیں آپ کے پیش نظر بھی یہی مقصد تھا۔ آپ کی شاعری عظمت اسلام کا شکوہ لئے ہوئے ہے۔ اس میں عشق سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے ستارے جگمگا رہے ہیں۔ آپ نے اپنی شاعری سے اپنے والد محترم کی طرح اصلاح احوال امت کا کام لیا۔ آپ پنجابی، اردو اور فارسی تینوں زبانوں میں شاعری کرتے تھے۔ زبان کوئی بھی ہو آپ نے اپنے مقصود و مدعا کو تبدیل نہیں کیا اور اپنی ایمان آفریں شاعری کی بہار لٹا کر نعت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمزمے سنائے۔ دینی عقائد اور نظریات کو سادہ اور دلکش انداز میں بیان کیا۔

حضرت خواجہ محمد بشیر عباسی قادری رحمۃ اللہ علیہ صحیح معنوں میں اپنے جد اعلیٰ کی پر مغز اور فکر انگیز شاعری کے شارح تھے۔ آپ کا یہ کمال کیا کم ہے کہ آپ نے خواجہ محمد کریم اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے گراں قدر شعری سرمایے کو محفوظ رکھا۔ ”سیرت الفقراء“ کو ترتیب دیا کہ خاندان عباسیہ قادریہ کی تاریخ محفوظ رہے۔ مخدوم العصر رحمۃ اللہ علیہ کے کلام کو محفوظ رکھنا اور اپنے تشریحی بیانات کے ساتھ دینی مجالس و محافل اور تقاریب کے ذریعہ اہل شوق تک پہنچانا آپ کا بہت بڑا روحانی کارنامہ ہے۔ ورنہ تاریخ کے سفر میں ایک کڑی بھی گم ہو جائے تو تاریخ کا حسن مجروح ہو جاتا ہے۔ جد اعلیٰ کے اتنے بڑے شعری سرمایے کی ترتیب و تدوین اور شرح کمال آپ کا وصف خاص ہے جس پر انہیں کتنا ہی خراج عقیدت کیوں نہ پیش کیا جائے کم ہے۔ ہم نے جب خواجہ محمد کریم اللہ کے کلام بلاغت نظام کی شرح کے حوالے سے آپ سے گفتگو کی آپ معارف روحانی اور علوم دینی کے جواہر لٹانے لگے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ آپ کے تذکرہ نگاروں کو آپ کی اس امتیازی شان سے صرف نظر نہیں کرنا چاہئے۔

امیر العصر رحمۃ اللہ علیہ کے لطف و کرم کا سحاب مدتوں برستا رہا۔ دلوں کی بنجر کھیتیوں کو معرفت کا نم عطا ہوتا رہا۔ بالآخر ۲۶ جولائی ۱۹۸۵ء صبح چار بجے گلستان معرفت کا یہ گل نو بہار ہم سے جدا ہو گیا۔ وصال سے قبل آپ کچھ عرصہ کیلئے علالت سے دوچار ہوئے۔ آپ نے اس سال سخت

بگرمی میں روزے رکھے، ماہ صیام کے آخر میں سر میں ہلکا ہلکا درد محسوس کرنے لگے مگر آپ نے روحانی معمولات کو ترک نہ کیا اور باقاعدگی سے روحانی تقاریب کا انعقاد کرتے رہے اور اعراس کی محافل میں تشریف لے جاتے رہے۔ آہستہ آہستہ بخار اور درد نے غلبہ پالیا۔

پہلے شہر میں ہی علاج ہوتا رہا پھر آپ کو سروسز ہسپتال لاہور لے جایا گیا۔ بیماری کا حملہ جان لیوا تھا مگر آپ نے نہایت حوصلے اور پامردی کے ساتھ بیماری کا مقابلہ کیا۔ وصال خداوندی کا پیغام آچکا تھا۔ بالآخر وہ ساعت آ پہنچی جو صوفیائے کرام کے لئے ساعت وصال اور ان کے نیاز مندوں کیلئے انتہائی پر ملال ہوا کرتی ہے۔

انا لله وانا الیہ راجعون O

اسی روز رات ساڑھے آٹھ بجے آپ کے جسدِ خاکی کو نماز جنازہ کی ادائیگی کے لئے درگاہ معلیٰ حضرت غوث العصر رحمۃ اللہ علیہ میں لایا گیا تو چاروں طرف سے مغموم اصحاب عقیدت کا ہجوم اُٹ پڑا۔ ہر شخص کی یہ کوشش تھی کہ وہ آپ کے چہرے کی ایک جھلک دیکھ لے۔ آپ کے چہرے پر اس وقت نلکوئی تبسم رقصاں تھا، چہرہ گل شادات کی طرح کھلا ہوا تھا اور احساس ہی نہیں ہوتا تھا کہ یہ کسی مرحوم شخصیت کا چہرہ ہے بلکہ گمان گزرتا تھا کہ آپ ابدی سکون کی نیند سو رہے ہیں۔ حق ہے کہ:

عرش پر دھو میں مچیں وہ مومن صالح ملا

فرش سے ماتم اٹھیں وہ طیب و طاہر ملا

آپ کے وصال کے بعد آپ کی جانشینی کا مسئلہ سامنے آیا تو اس مسئلہ کو آپ کے چہلم پر طے کرنے کا فیصلہ ہوا۔ آپ کے چہلم مبارک پر ارادت مندوں کی بہت بڑی تعداد کے ساتھ ساتھ علمائے کرام اور صوفیائے عظام بھی کثیر تعداد میں شریک ہوئے۔ آپ کے تمام صاحبزادگان اور دیگر قرابت دار بھی موجود تھے۔ محترم صوفیاء و مشائخ نے اتفاق رائے سے آپ کے سب سے چھوٹے صاحبزادہ جناب ڈاکٹر شبیر احمد کمال عباسی (مدظلہ العالی) کو منتخب فرمایا۔

امیر العصر رحمۃ اللہ علیہ کے تمام صاحبزادگان سمیت جملہ ارادت مندوں نے اس حسن انتخاب پر غیر معمولی مسرت و خوشی کا اظہار کیا۔ چونکہ صاحبزادہ ڈاکٹر شبیر احمد کمال عباسی کو آپ کی مجلس نشینی کا عرصہ زیادہ سے زیادہ میسر آیا تھا اور خواجہ صاحب کئی بار آپ کو اپنا جانشین قرار دے چکے تھے۔ اس لئے ہر طرف سے مرحبا مرحبا کی صدائیں ابھرنے لگیں۔ یہ منظر ایسا جاذب نظر تھا کہ اہل شوق کی نگاہوں میں ہمیشہ ہمیشہ کیلئے جذب ہو کر رہ گیا۔



مجاہد تحریک پاکستان

سید بشیر احمد سوہدروی رحمۃ اللہ علیہ

تحریک پاکستان کے دوران میں ضلع گوجرانوالہ سے جن علماء و مشائخ نے مسلم لیگ کے پیغام کو مقبول عام بنانے کیلئے خاص کردار ادا کیا، ان میں پیر سید بشیر احمد خورشید سوہدروی کا نام بھی شامل ہے۔ اس صدی کے آغاز میں آپ کی ولادت ضلع گوجرانوالہ کے مشہور قصبہ جلال پور جٹاں میں ہوئی۔ چھوٹی عمر ہی میں اپنے آبائی گاؤں سوہدرہ میں چلے آئے۔ آپ کے والد حافظ سید بہاؤ الدین ایک جید عالم دین تھے۔ قرآن و حدیث کی تعلیم کے بعد آپ فریضہ تبلیغ دین میں مصروف ہو گئے۔

سوہدرہ میں آپ نے انجمن حزب الاحناف کی بنیاد بھی رکھی اور اس کے تحت ہر ماہ باقاعدہ سے جلسے منعقد ہونے لگے۔ آپ نے جامع مسجد اراٹیاں میں درس و تدریس کے فرائض انجام دینا شروع کر دیئے۔ آپ مسلمانوں میں جذبہ جہاد بیدار کرنے کیلئے مسلسل کوشاں رہے اور اپنی خطابت سے مردہ دلوں کو آداب زندگی سے آشنا کرتے رہے۔ جامع مسجد میں ہی آپ نے ایک دینی مدرسہ جاری کیا اور تادم مرگ دین اسلام کی ترویج و اشاعت کے ساتھ عام لوگوں کے کردار و عمل کی اصلاح کا فریضہ بھی انجام دیتے رہے۔

آپ نے صرف روحانی و دینی میدان میں ہی اپنے علاقہ کی خدمت نہیں کی بلکہ سیاسی محاذ پر بھی اسلامی قومیت کی عملی تشریح و توضیح کیلئے کوشاں رہے۔ آپ نے ”تحریک حریت کشمیر“ کی کامیابی کیلئے جس جوش و ولولہ اور جذبہ ایمانی کا ثبوت دیا، اس سے کشمیری مسلمانوں کو آزادی کیلئے آپ کی خدایات کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ آپ نے رڈوگرہ سامراج کی پُر زور مذمت کی اور نوجوانوں میں جذبہ جہاد ابھارنے کیلئے غیر منقسم ہندوستان میں بے شمار دورے کئے۔

جموں میں توہین قرآن پاک کا روج فرسا واقعہ رونما ہوا تو وادی کشمیر اور ہندوستان بھر کے مسلمانوں کی غیرت ایمانی جوش میں آگئی۔ احتجاج کا سلسلہ شروع ہوا تو ۱۳ جولائی ۱۹۳۱ء کو سرینگر کی سنٹرل جیل میں مسلمانوں پر گولی چلائی گئی جس سے دو درجن مسلمان شہید ہوئے۔ اس موقع پر سید

بشیر احمد ڈیڑھ صدیوں سے مسلمانوں کی جماعت کے ساتھ لے کر جہوں پہنچے اور میدانِ جہاد میں قیادت کا حق ادا کر دیا۔ جب توہینِ قرآن کا دردناک سانحہ پیش آیا تو آپ نے عوام الناس کے ایک بہت بڑے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

”لوگو! قرآن مجید کی حفاظت کیلئے سروں پر کفن باندھ کر عازمِ کشمیر ہو جاؤ۔ آج سے ہم نے ظالموں کے خلاف اعلیٰ کلمۃ الحق کا پرچم بلند کرنا ہے۔ اپنے عمل سے دیگر اقوام پر ثابت کر دو کہ اسلام ایک زندہ دین ہے اور تمہاری رگ حمیت میں اپنے اسلاف کی غیرت کا خون موجزن ہے جنہوں نے روم و ایران جیسی عظیم الشان سلطنتوں کو خاک میں ملا دیا تھا۔“

آپ کی یہ ولولہ انگیز تقریر اہل ایمان کے دلوں کو گرماگئی اور ان کے جذبہ عمل میں پہلے سے کہیں زیادہ شدت اور قوت پیدا ہو گئی۔

نظریہ پاکستان کی ترویج و تبلیغ اور پاکستان کے مطالبہ کو عوام کی آرزوؤں میں ڈھالنے کیلئے آپ نے اپنے علاقہ میں قابل ذکر کردار ادا کیا ہے۔ حصولِ پاکستان کی جدوجہد میں آپ نے قائدِ اعظم علیہ الرحمۃ اور مسلم لیگ کا بھرپور ساتھ دیا۔ اس نظریہ کی مقبولیت کیلئے آپ نے تحصیل وزیر آباد کے مختلف دیہات کا دورہ کیا اور اپنے دانشمندانہ اندازِ تقریر سے عوام کے سامنے تحریکِ پاکستان کے بنیادی اسلامی محرکات پیش کئے۔ اس سلسلہ میں آپ کو مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑا مگر آپ پورے خلوص اور جذبہ غیرتِ اسلامی سے سرشار ہو کر اپنے مقصد کی تکمیل کیلئے کام کرتے رہے۔

پاکستان معرض وجود میں آ گیا تو آپ نے اس کی ترقی و بقاء اور سلیمیت کیلئے اپنا مشن جاری رکھا اور مہاجرین کی آباد کاری اور لٹے پٹے قافلوں کو مناسب مقامات پر مستقل سکونت میں مدد دینے کیلئے سرگرم عمل ہو گئے۔

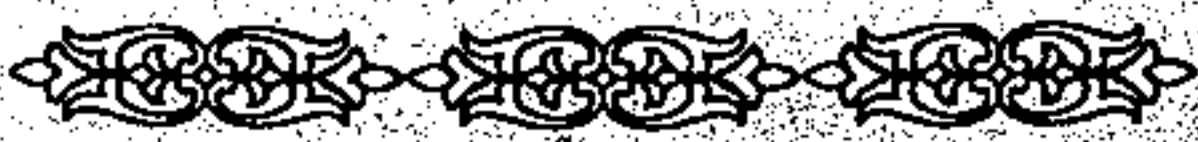
قیامِ پاکستان کے بعد اقدارِ اسلامی کے فروغ اور نظریاتی سرحدوں کی حفاظت کیلئے کسی قسم کی قربانی سے بھی دریغ نہیں کیا۔ معاملہ خواہ وطن کی نظریاتی سرحدوں کی حفاظت کا تھا یا جغرافیائی سرحدوں کی پاسبانی کا، سید بشیر احمد ہمیشہ میدانِ عمل میں پیش پیش رہے۔ آپ سچے عاشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم تھے اور حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ اقدس میں کسی قسم کی گستاخی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اسی لئے جب تحریک ختم نبوت کے دوران میں شیعہ رسالت کے پروانے دلوں میں ایثار و قربانی کی شمعیں جلائے میدانِ عمل میں لگے تو پیر سید بشیر احمد بھی اپنی غیرتِ ایمانی کے اظہار کیلئے کسی سے پیچھے نہ رہے۔ اس سلسلہ میں زندان کی کوٹھڑی بھی آپ کا مقدر بنی مگر انہوں نے

ناموس رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کی پاسبانی کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیا۔

جن دنوں وطن عزیز میں غیر اسلامی نظریات کو مسلط کرنے کی کوشش کی گئی تو پیر سید بشیر احمد نے مسلمانوں کی غیرت و حمیت کو جھنجھوڑتے ہوئے انہیں نظریہ اسلام کی حرمت و تقدس کا احساس دلاتے ہوئے فرمایا ”اے اہل ایمان ہم نے اسلام کے نام پر جدوجہد کی اور اس جدوجہد میں لاکھوں مسلمان شہید ہوئے۔ ہزاروں مسلمانوں کی عفت و عصمت برباد ہوئی۔ ایک کروڑ سے زائد مسلمانوں کو ہجرت کر کے اپنا تمام مال و اسباب غیر مسلموں کیلئے چھوڑنا پڑا۔ عجیب بات ہے کہ اسی خطہ اسلامی میں اسلام کے خلاف آواز بلند کی جا رہی ہے۔ اسلام اس ملک کا مقدر ہے اور اسلام کے خلاف تمام نظریات باطل ہمارے لئے ناقابل قبول ہیں۔“

آپ کا یہ آوازہ حق علاقہ بھر کے عوام کی دینی حمیت کو بیدار کرنے کا باعث بن گیا۔ پیر سید بشیر احمد نے پچاس برس تک مسلسل شمعِ رشد و ہدایت جلائے رکھی۔ قرآن پاک اور احادیث رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں گم گشتگان راہ کو منزل آشنا کرتے رہے۔ آپ کی تمام زندگی عشق نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا دلاویز نمونہ تھی۔ آپ صورت و سیرت کے لحاظ سے اسلاف کی تصویر تھے اور زندگی بھر ایمان و یقین سے بھٹکے ہوئے قافلہ حق و صداقت کو صراطِ مستقیم دکھاتے ہوئے دلوں کو نورِ ایمان سے منور کرتے رہے۔ ہزاروں لوگوں نے آپ کے دستِ حق پرست پر تائب ہو کر اپنی زندگیوں کو اسلامی کردار کے سانچے میں ڈھال لیا۔

۳ مئی ۱۹۷۳ء بروز جمعہ المبارک راولپنڈی سے سوہدرہ واپس آتے ہوئے آپ نے وزیر آباد کے نزدیک اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔ میت سوہدرہ لائی گئی اور دوسرے روز ہزاروں سوگواروں اور آہوں کے درمیان آپ کو سپرد خاک کر دیا گیا۔ ان دنوں سید محمد صفی اعظم جو کہ فرزند اور جانشین ہیں آپ کی جگہ پر چم ایمان و آگہی کی سر بلندی کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ بلاشبہ آپ ایک پیر طریقت ہی نہیں، صحیح معنوں میں عالم باعمل بھی تھے۔ آپ کی تمام زندگی شعائرِ اسلامی کے احیاء و فروغ اور مایوس دلوں کو حرارتِ ایمانی بخشنے کیلئے وقف تھی۔ تمام زندگی آپ کا معمول رہا کہ روزانہ بعد از نماز فجر دو گھنٹے تک قرآن مجید کا عام فہم زبان میں درس دیتے رہے۔ آپ نے تعلیمات قرآنی کی جو روشنی اپنے علاقہ میں پھیلائی تھی وہ ہمیشہ پرستارانِ ایمان کیلئے نشانِ منزل بنی رہے گی۔



حضرت خواجہ دین محمد قادری رحمۃ اللہ علیہ

تصوف ایک ایسا گلشن سدا بہار ہے جس کی خوشبو ہمیشہ اصحاب بصیرت کے مشام فکر کو معنبر کرتی رہی ہے۔ اس گلشن صدر رنگ کی جھلک جس کو بھی نصیب ہوئی دنیائے معرفت کا ستارا بن گیا۔ یہ وہ گلشن نور ہے جہاں خود شناسی سے خدا شناسی تک کی منزلیں آسان ہوتی ہیں۔ جہاں فتانی الرسول کے آداب عطا ہوتے ہیں جہاں درویشی کے روپ میں شہنشاہی کے آداب عطا ہوتے ہیں جہاں خاک نشینوں کو کون و مکاں کے اسرار سے آگاہی ہوتی ہے زمانہ شاہد ہے جن سعید بخت فرزند ان توحید کو دنیائے تصوف کی سر بلندی نصیب ہوئی وہ حاصل کائنات بن گئے۔ انہوں نے اپنے افعال کو اس طور تقدیر ربانی میں ڈھالا کہ خود پر تو تقدیر یزدانی بن گئے۔

اقبال کے لفظوں میں:

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا

نگاہِ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

صاحب اسرار تصوف حضرت قبلہ دین محمد قادری رحمۃ اللہ علیہ بھی ایسے پیکر فقر و مستی تھے کہ جنہیں دیکھ کر خدا یاد آتا تھا۔ آپ سلطان دو عالم حضور محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے فقر کی تصویر تھے۔ وہ فقر جو غلاموں کو اسرار سلطانی عطا کرتا ہے۔ آپ نے تصوف کے کوچے میں اس شان سے قدم رکھا کہ ہمیشہ کیلئے اسی کے ہو گئے۔ فقر و مستی کی اداؤں کو اپنایا تو اصحاب شوق کے دلوں کی دھڑکن بن گئے۔ آپ کا عمل آپ کے قول کی تفسیر تھا، ایسی پاکیزہ زندگی بسر کی کہ روحانیت کا گل کدہ کھلا دیا۔

حضرت خواجہ دین محمد قادری رحمۃ اللہ علیہ ۱۲۶۸ھ میں لاہور میں پیدا ہوئے اور ۱۳۶۰ھ

میں لاہور ہی میں ترانوے برس کی زندگی میں وصال فرمایا۔ لاہور میں پیدا ہونے والے اس مرد ایمان کو تصوف و معرفت کی بلند منزلوں پر فائز کرنے کا فریضہ سر زمین گوجرانوالہ کو مسکن روحانیت بنا کر ایک زمانے کو سلوک کے انوار سے مستنیر کرنے والے غوث العصر حضرت خواجہ محمد عمر قادری عباسی رحمۃ اللہ علیہ (مدفون دربار قادریہ بازار خرداں گوجرانوالہ) نے انجام دیا۔ حضرت خواجہ محمد عمر تو

روحانیت کی دنیا کے وہ پارس تھے کہ جوان سے چھو گیا وہی زیرِ خالص بن گیا۔ بے شمار بندگان الہی آپ کے فیوض باطنی کے سبب سے مس خام سے کندن بن گئے جب حضرت خواجہ دین محمد قادری اس مرد مومن کی بارگاہ ولایت میں حاضر ہوئے تو محسوس ہوا کہ کائنات کی ہر نعمت اس درویش خدامت کے قدموں میں رکھی ہوئی ہے۔ جب آپ سے بیعت ہوئے تو مرشد کا رنگ اس طور چڑھا کہ انہی کے اندازِ معرفت میں ڈھلتے چلے گئے۔ طریقت کا اصول ہی یہی ہے کہ جب کسی مرد کامل کے ہاتھ ہی ہاتھ دے دیا جائے تو اپنے وجود کو فنا کر کے اسی کی رضا جوئی میں ہی بقا ڈھونڈی جاتی ہے۔ حضرت قبلہ دین محمد قادری رحمۃ اللہ علیہ نے فکری اور نظریاتی طور پر خود کو حضرت خواجہ العصر محمد عمر قادری رحمۃ اللہ علیہ کے حلقہ تربیت کے سپرد کر دیا۔ جب منازل سلوک پر فائز ہونے کا وقت آیا تو غوث العصر خواجہ محمد عمر قادری نے مرید صادق خواجہ دین محمد قادری کو اس شان سے نوازا کہ آپ سپہر روحانیت پر نجم کامل کی صورت جگمگانے لگے۔

حضرت دین محمد قادری علیہ الرحمۃ ہاتھ سے کما کر کھانے اور کھلانے کے قائل تھے۔ چک سازی کو ذریعہ معاش بنایا ہوا تھا جو ملتا اسی سے اپنے خرچ کا اہتمام کرتے جو بچ جاتا خدا کی راہ میں خیرات کر دیتے۔

اس فقر و مستی کے عالم میں بھی سخاوت کا سلسلہ جاری رہا۔ یہ سخاوت روحانی بھی تھی اور مادی بھی اپنے در سے کسی سائل کو خالی ہاتھ نہ لوٹایا جس نے جو بھی مانگا آپ نے حسب طلب عطا کر دیا۔ آپ لوگوں کو مرید نہیں کرتے تھے لیکن پھر بھی کئی طلب صادق رکھنے والے خوش نصیب آپ کے دامانِ ولایت سے وابستہ ہو گئے۔ آپ نے زندگی بھر خود کو کبھی شیخ طریقت یا بڑا پیر نہیں سمجھا بلکہ فرمایا کرتے تھے کہ لاہور میں حضرت قبلہ عالم میاں میر قادری رحمۃ اللہ علیہ کا دربار عالی انوارِ معرفت لٹا رہا ہے۔ جانا ہے تو وہاں جاؤ راستے میں کیوں ٹھہرتے ہو یہ آپ کی انتہا درجے کی عاجزی اور سادگی تھی۔ آپ سمجھتے تھے کہ سچا درویش وہ ہے جو خود کو زمانے کی نمائش اور نمود سے بچا کر رکھے۔ لیکن خوشبو تو خوشبو ہی ہوتی ہے اسے آپ جس قدر بلند دیواروں میں چاہے قید کر لیں وہ اپنا وجود منوا کر ہی رہتی ہے۔ آپ کی خوشبوئے معرفت پھیلتی گئی اور اصحابِ ایمان آپ سے اکتساب فیض کرتے ہوئے فخر محسوس کرنے لگے۔ آپ حضرت خواجہ محمد عمر قادری سے روحانی نسبت کو اپنی زندگی کا سب سے بڑا اعزاز تصور کرتے تھے اور اکثر یہ شعر آپ کی زبان پر رہتا تھا:

من کہ رو از نیک و بد بر یافتم این سعادت از قبولش یافتم

(میں نے ہر اچھے برے سے منہ موڑ لیا ہے اور اے شیخ طریقت آپ کے حضور قبول ہو کر سعادت حاصل کر لی ہے)

حضرت دین محمد قادری رحمۃ اللہ علیہ نہایت پاکیزہ کردار کے حامل انسان تھے۔ درویشی و خدامتی کی تصویر تھے جو وسیع علمی کے باوجود کمزوروں اور ضعیفوں میں بیٹھتے تھے اہل فقر سے عاجزی کے ساتھ پیش آتے بڑوں کی عزت کرتے، چھوٹوں پر شفقت کرتے، سلام میں پہل کرتے۔ سرکشوں، ظالموں، مالداروں اور اللہ کے نافرمانوں کیلئے کھڑے نہ ہوتے۔ آپ کا دل ہمیشہ یادِ الہی میں سرمست رہتا۔ اولیائے کرام کے دستور کے مطابق تھوڑا کھانے، تھوڑا سونے اور کم بولنے کے عادی تھی۔ مگر جب بولتے تو ان کے لفظوں سے خوشبو پھوٹی ہوئی محسوس ہوتی۔ شب بیداری زندگی کا لازمی حصہ بن گئی تھی۔ رزق حلال کو بے پناہ اہمیت دیتے اور دوسروں کو بھی رزق حلال کی سختی سے تلقین فرمایا کرتے۔

جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ آپ حضرت خواجہ محمد عمر قادری عباسی رحمۃ اللہ علیہ کے مرید صادق تھے۔ حضرت خواجہ محمد عمر عباسی قادری رحمۃ اللہ علیہ اپنے برادر اکبر حضرت خواجہ سخی احمد یار رحمۃ اللہ علیہ کے جانشین تھے۔ حضرت سخی احمد یار کا مزار موضع پیروکوٹ میں واقع ہے جبکہ خواجہ محمد عمر عباسی قادری رحمۃ اللہ علیہ بازار خرداں گوجرانوالہ میں آسودۂ خد ہیں۔ حضرت خواجہ محمد عمر عباسی قادری جب بھی پیروکوٹ کی سر زمین پاک پر حضرت سخی صاحب کے عرس پر یا ویسے ہی حصول سعادت کیلئے حاضری دیتے تو آپ بھی ہمیشہ نیاز مندانہ ان کے ہمراہ ہوتے۔ پیروکوٹ پہنچنے کیلئے حافظ آباد روڈ کے راستے جانا پڑتا ہے۔ اس ضمن میں حضرت قبلہ خواجہ دین محمد رحمۃ اللہ علیہ پر ہونے والی خصوصی نوازش ملاحظہ کیجئے۔ آپ فرماتے ہیں کہ:

”میں نے اپنے پیر کامل خواجہ محمد عمر اور فخر الاسیاء حضرت سخی احمد یار کو خواب میں دیکھا ہے یہ دونوں ہستیاں آپس میں مشورہ فرما رہی تھیں کہ دین محمد کو کہاں جگہ دی جائے تو حضور حضرت خواجہ محمد عمر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنا عصا مبارک زمین میں گاڑ کر فرمایا کہ یہاں..... اگر کوئی آپ (سخی احمد یار) کی طرف جائے تو دین محمد راستہ میں ہو اور اگر آپ کی طرف سے کوئی میری طرف آئے تو بھی دین محمد راستہ میں ہو۔“

آپ کے مرید صادق جناب مرزا عبدالکریم قادری بیان کرتے ہیں کہ اس رویائے صادق کے بعد حضرت مجھے اس جگہ پر لے گئے اور حضور نے اپنا عصا مبارک بالکل اسی جگہ گاڑ دیا جہاں آج

آپ کا دربار مبارک ہے۔ میں نے دوسرے ہی دن جگہ کی الاٹمنٹ کرائی اور حضور کو اطلاع کر دی۔ حافظ آباد روڈ پر محلہ باغبانپورہ میں آپ کا مزار مبارک سڑک کے کنارے واقع ہے۔ دربار قادریہ کا سبز گنبد دور سے آپ کی روحانی سرفرازی کا ادراک بخشتا ہے۔ حضرت سخی احمد یار کی جانب جانے والے ارادت مندوں کے قافلے آپ کے مزار کے پاس سے گزرتے اور غوث العصر کے مزار تک لوٹتے ہیں۔

ان اصحاب شوق کے ان قافلوں کے پہلو بہ پہلو یقیناً آپ کی روح بھی سفر کرتے ہوئے روحانی طہانیت محسوس کرتی ہوگی۔ یہ تمام تر حقائق دلوں کی وادیوں میں سفر کرنے والوں کے ساتھ ہی پیش آتے ہیں ورنہ عالم مادیت کی کشافتوں میں گم اہل خرد کی ان مقابلات تک رسائی کہائی۔ سچ کہا ہے کسی نے:

میانِ عاشق و معشوق رمزِ لیت
کرانا کاتبیں راہم خبر نیست

آپ کا سلسلہ عالیہ قادریہ کے ساتھ روحانی لگاؤ تھا۔ اسی سلسلہ عالیہ نے آپ کو ہر بلندی سے نوازا تھا۔ آپ مشائخ قادریہ سے غیر معمولی ارادت و عقیدت رکھتے تھے۔ خطہ پنجاب میں بالخصوص حضرت میاں میر بالا پیر قادری لاہور رحمۃ اللہ علیہ کا مزار پر انوار مرجع خواص و عوام ہے۔ ایک واقعہ درج ذیل ہے جس سے آپ کی عاجزی و انکساری اور حضرت قبلہ عالم میاں میر رحمۃ اللہ علیہ لاہوری سے خصوصی عقیدت کا اظہار ہوتا ہے:

”آپ گنپت روڈ پر چک سازی کر رہے تھے تو ایک آدمی وہاں سے گزرا پہلے تو وہ گزر گیا پھر وہ واپس مڑا اور آپ کے سامنے کھڑا ہو گیا اور ایک دو روز تک متواتر اسی طرح آتا اور کافی دیر تک کھڑا رہتا۔ ایک دن حضور نے کھڑا ہونے کی وجہ پوچھی تو وہ کہنے لگا مجھے آپ سے بڑی عجیب بیماری پیاری مسور کن خوشبو محسوس ہوتی ہے اور میرا جی چاہتا ہے کہ میں اسی خوشبو کو محسوس کرتا رہوں۔ اس پر آپ نے فرمایا:

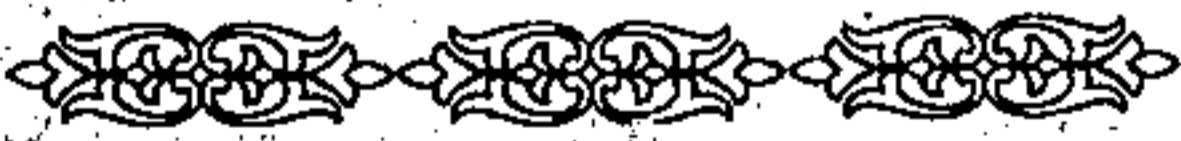
”تم کو داتا صاحب اور حضرت میاں میر کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ راستے کی خوشبوؤں پر ٹھہرا نہیں کرتے۔“

اس سلسلہ میں یہ امر خاص طور سے قابل ذکر ہے کہ آپ کے وجود سے روحانی مہک محسوس کرنے والی شخصیت مرزا عبدالرحمن کی تھی جنہوں نے آپ کے ارشاد کے موجب داتا گنج بخش رحمۃ

اللہ علیہ اور حضرت میاں میر رحمۃ اللہ علیہ کے حضور باقاعدگی سے حاضری دی اور پھر حضرت خواجہ دین محمد قادری ہی سے روحانی نسبت کا اعزاز اس شان سے عطا ہوا کہ آپ کے خلیفہ اول کہلائے۔ ہر کہ خواہد ہم نشینی با خدا..... اوشیند در حضور اولیاء
گر تو سنگ خارا و مرمر شوی..... چوں بصاحب دل روی گوہر شوی
یک زمانہ صحبت با اولیاء..... بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا
تاریخ شاہد ہے کہ جب مرد مومن خدا کی رضا میں فنا ہو جاتا ہے۔ اُس کی ہر ادا تقدیر خداوندی کا پرتو بن جاتی ہے۔ اس کی زندگی کا ہر عمل رضائے الہی کے تابع ہو جاتا ہے۔ اس کا ایک ایک لمحہ خالق کونین کی رضا جوئی کیلئے بسر ہونے لگتا ہے تو پھر تقدیر یزدانی بھی اسے اس طور نوازتی ہے کہ یہ جو چاہتا ہے وہ ہو جاتا ہے۔ اُس کی ہر آرزو مستجاب ہونے لگتی ہے اور اس کی ہر تمنا تقدیر کا فیصلہ بن کر کرامت کا روپ اختیار کر لیتی ہے۔ حضرت خواجہ دین محمد قادری علیہ الرحمۃ نے ”مرضی مولا از ہمہ اولی“ کو زندگی کا مرکز و محور بنا لیا تھا، اس لئے خالق کونین کی رحمتیں کرامات کی صورت میں ظہور پذیر ہوتی رہیں۔

آج یہ ولی روشن ضمیر ہمارے درمیان جسمانی طور پر تو موجود نہیں مگر ان کی تعلیمات علم و حکمت کی شمعوں کی صورت جگمگا رہی ہیں۔ دربار عالیہ قادریہ باغباپورہ حافظ آباد روڈ گوجرانوالہ بے شمار اصحاب نظر کیلئے قلبی تسکین کا باعث بنا ہوا ہے۔ آپ کے فرمودات اور آپ کے ارشادات شام ابد تک دلوں کو عرفان خداوندی کی دولت عطا کرتے رہیں گے۔

ہر گز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدہ عالم دوام ماست



حضرت خواجہ پیر محمد بڈھا رحمۃ اللہ علیہ

دادوالی شریف

آپ ۱۹۰۷ء میں دادوالی (متصل دھونکل) کے مقام پر پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم دھونکل سے حاصل کی، ثانوی تعلیم کی تکمیل وزیر آباد سے کی۔ آپ کے والد گرامی کا نام خواجہ غلام علی تھا۔ آپ کی روحانی تربیت انہی کے زیر سایہ ہوئی اور اس تربیت کی تکمیل حضرت خواجہ پیر سید محمد حسین آستانہ عالیہ آلومہار شریف ضلع سیالکوٹ کے فیض نظر سے ہوئی۔ والد گرامی کی وفات کے بعد سارا بوجھ آپ کے کندھوں پر آ گیا۔ گھریلو مصروفیات و دنیاوی تلخیاں اور معاندانہ سرگرمیاں آپ کے پائے ثبات کو ڈگرگانہ سکیں اور آپ جذب و سلوک اور رشد و ہدایت کی وادیوں میں گامزن رہے۔ آپ نے گرد و پیش کا روحانی تزکیہ ہی نہیں فرمایا، معاشرتی نقطہ نظر سے بھی اپنے علاقے کو سنوارا اور نکھارا۔ صحت، علم اور سفر کی سہولتوں سے اگر آپ کا دیار مالا مال ہے تو یہ آپ ہی کی سعی کا نتیجہ ہے۔ آپ نے ایک رسالہ ماہنامہ ”بتیان“ دادوالی سے جاری کیا، جس کے مدیر آپ کے صاحبزادے علامہ محمد فیض علی فیضی تھے جو مدتوں مرکزی جامع مسجد راولپنڈی کے خطیب اور رویت ہلال کمیٹی کے رکن رہے اور اب وفات پا چکے ہیں۔ یہ جزیہ تبلیغی، علمی، روحانی اور دینی نوعیت کا تھا۔ اس میں بہت ہی بلند پایہ مضامین طبع ہوتے تھے۔ وزیر آباد کا موجودہ پبلک ہائی سکول اور گاؤں کا گریڈ سکول آپ ہی کی توجہات سے وجود میں آئے تھے۔

حضرت خواجہ پیر محمد بڈھا رحمۃ اللہ علیہ دو بار حج بیت اللہ اور زیارت روضہ اقدس سے مشرف ہو چکے تھے۔ اس سفر میں آپ حضرت پیر سید جماعت علی شاہ لاٹانی علی پوری رحمۃ اللہ علیہ کے ہم رکات رہے۔ شیخ سرہند رحمۃ اللہ علیہ کے روضہ پر بھی آپ کئی بار تشریف لے گئے۔ یہ دونوں حج آپ نے عنقوان شباب میں کئے اور ۱۹۶۱ء میں بھی آپ حج کیلئے تشریف لے گئے تھے۔ آپ کی زندگی انتہائی سادہ اور پُر وقار تھی۔ آسودگی آپ کے دروازوں پر دستک دیتی تھی مگر آپ کا فقرا سے درخور اعتنا نہیں سمجھتا تھا۔ طبیعت میں جلال تھا، خلاف شریعت حرکات برداشت نہ کر

سکتے تھے اور آپ کی محفل میں کسی کو جرأت بھی نہ ہوتی تھی، دسترخوان وسیع تھا اور آپ کے دل کی وسعتوں کا اندازہ کوئی اہل دل ہی کر سکتا تھا۔

آپ کے پاس ہر مکتبہ فکر کے لوگ حاضری دیتے تھے۔ غریب بھی کہ انہیں غیرت کا درس ملتا تھا۔ امیر بھی کہ ان کے دل کی تنگیوں کو کشادگی عطا ہوتی تھی۔ اہل دل بھی کہ انہیں بصیرت و شریعت کی رفعتیں نصیب ہوتی تھیں اور گردوں وقار اور جلالت مآب بھی..... مگر تاج و تخت والوں کا فقیروں کی محفل میں آنا، فقیروں کی عظمت کی سند نہیں ہوا کرتا، تاریخ نے تخت و تاج کو قلندروں کی بارگاہ میں ہمیشہ سرنگوں دست بستہ اور دامن پھیلائے دیکھا ہے۔

ہر قلندر کے در غربت پر
تاج محتاج کرم دیکھا ہے

اور یہ بے تاج بادشاہ جو دلوں پر حکومت کرتے ہیں، ان کی موجِ نفس ازل سے دلوں کے بجھتے چراغوں کو روشنی عطا کرتی رہی ہے۔ ۲۳ اگست ۱۹۷۰ء کو روحانی دنیا کا یہ روشن چراغ قبر کی تاریکیوں میں اتر گیا مگر قبر کی گہرائیاں، روح کی دولت کو کب افسردہ کر سکتی ہیں، قبر تو اس قوت آشفتمند کی شیرازہ بند ہے جو پھلتی، پھولتی اور پھیلتی ہے یہاں تک کہ گردن گردوں میں اپنی کمنڈ ڈال دیتی ہے۔



مفسر قرآن

مولانا محمد عمر رتالوی رحمۃ اللہ علیہ

تبلیغ دین کا مقدس فریضہ اصحاب ایمان نے ہر دور میں انجام دیا ہے۔ ان برگزیدہ شخصیات نے برصغیر پاک و ہند کے ایک ایک گوشے کو نور ایمانی سے منور کر دیا۔ اپنی تقریروں، تحریروں اور شعری و ادبی صفات کی بدولت ان مبلغین نے اسلامی عقائد و نظریات کی تبلیغ و ترویج کو زندگی بھر اپنا مقصد اولیٰ تصور کئے۔ یہ شخصیات ہر قسم کی نمود و نمائش، پروپیگنڈا، تشہیر اور ناموری کا اعلان کئے بغیر محض رضائے خداوندی اور خوشنودی محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے ہمیشہ سرگرم عمل رہیں۔ انہوں نے دور دراز کے دیہات کو اپنی تبلیغی سرگرمیوں کا مرکز بنا کر یہاں علم و حکمت کے وہ گلزار کھلائے کہ ان کی خوشبوئے جان نوازا اب تک دلوں کو ایمان و یقین کی غیر فانی مہک عطا کر رہی ہے۔

حضرت مولانا مولوی محمد عمر رتالوی رحمۃ اللہ علیہ کا شمار بھی انہی محسنین علم و حکمت میں ہوتا ہے۔ آپ کے والد حضرت مولانا محمد عبد اللہ درویش تھے۔ آپ رتالی ورکاں (ضلع گوجرانوالہ) کے معروف کھوکھر خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ کا خاندان شروع ہی سے علم و فیض کا منبع اور رشد و ہدایت کا مرکز تھا۔ طالبان علم دور دراز سے آپ کے بزرگوں کے پاس تحصیل علم کیلئے آیا کرتے۔ اس طور تدریس علوم دین اس خاندان کا کئی مدتوں سے شعار حیات رہا ہے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم اپنے والد محترم اور خاندان کے دوسرے بزرگوں سے حاصل کی۔ پھر مروجہ دینی تعلیم کے حصول کیلئے دور دراز کے شہروں کا رخ کیا اور وہاں کے معروف دینی مدارس سے اکتساب فیض کیا۔ مختلف علمائے کرام سے دینی و روحانی برکات حاصل کرتے ہوئے آپ دہلی جا پہنچے اور وہاں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے مدرسہ عالیہ میں اکتساب فیض کیلئے داخل ہو گئے۔ مقررہ مدت تک حصول تعلیم کے بعد اپنے آبائی گاؤں رتالی ورکاں میں تشریف لے آئے اور اپنے گاؤں کو مرکز تدریس بنا کر علاقہ بھر کے متلاشان علم و حکمت کو زبور علوم دینیہ سے آراستہ کرنے لگے۔

علوم دین کی تکمیل ہو چکی تو آپ کو علم طریقت میں راہنمائی کیلئے کسی مردِ یگانہ کی جستجو نے آ

لیا۔ مختلف مشائخ کی خدمت میں حاضری دیتے ہوئے آلو مہار شریف کے دانائے راز حضرت پیر سید محمد امین شاہ رحمۃ اللہ علیہ کے پاس جا پہنچے۔ پہلی حاضری میں ہی گوہر مقصود کے مل جانے کا احساس ہو گیا اور حضرت شاہ صاحب سے باقاعدہ بیعت ہو گئے۔ شمع تیار ہو چکی تھی اب اسے دیا سلائی دکھانے کی ضرورت تھی۔ حضرت پیر سید محمد امین شاہ بھانپ گئے کہ ان کے پاس حاضری دینے والا صاحب علم و حکمت ہے اس لئے انہوں نے مولوی محمد عمر کی روحانی تربیت پر خصوصی توجہ دی اور بہت جلد مولوی صاحب سوز و ساز روحانی کی دولت عظیم سے بہرہ ور ہو گئے۔ شیخ نے انہیں خلافت عطا کرتے ہوئے رتالی ورکاں میں فیوض روحانی عام کرنے کی تلقین فرمائی۔

اب رتالی ورکاں میں آپ کی خدمت میں حاضری دینے والوں کی تعداد دن بدن بڑھتی گئی۔ آپ اپنے طالب علموں کو علوم دینی بھی پڑھاتے اور انہیں اپنی زندگیاں سنت نبوی کے سانچے میں ڈھالنے کے آداب بھی سکھاتے۔ آپ خود بھی صاحب طریقت و شریعت تھے۔ اس لئے آپ کے تلامذہ اور متعلقین بھی تعلیمات مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم کا نمونہ بن گئے۔ آپ کی زبان میں تاثیر تھی اس لئے آپ جس پر توجہ فرماتے وہی سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا سچا پیروکار بن جاتا۔

قدرت نے آپ کو شاعری کا ذوق بھی ودیعت کر رکھا تھا۔ آپ اپنی تعلیمات اور ارشادات کو آسان پنجابی اشعار میں ڈھال کر عوام الناس کے سامنے پیش کرتے تو عوام کے دل متاثر ہوئے بغیر نہ رہتے۔ اسی اثناء میں آپ کے مرشد حضرت محمد امین شاہ صاحب نے آپ سے فرمائش کی کہ اپنی شعری صلاحیتوں کو پورے خلوص سے بروئے کار لاتے ہوئے قرآن پاک کی منظوم تفسیر پنجابی میں تحریر کریں۔ آپ نے اپنے شیخ طریقت کے حکم پر لبیک کہتے ہوئے اس کام کا آغاز کر دیا۔ آپ نے حضرت مولانا قاضی ثناء اللہ پانی پتی کی تقلید میں اپنے پیرو مرشد کے نام پر اس تفسیر کا نام تفسیر محمد امینی رکھا۔ آپ نے اپنی زندگی ہی میں اس تفسیر کا کچھ حصہ طبع کروایا۔ پہلی جلد پانچ سینپاروں کی پنجابی منظوم تفسیر پر مشتمل تھی جس کا سن اشاعت ۱۳۱۸ھ ہے۔ اس کے صفحہ اول پر اس کا عنوان یوں رقم ہے:

قرآن مجید مترجم پنجابی مع تفسیر نور علی نور

تفسیر محمد امینی پنجابی

یہ پہلی جلد جو ہمیں آپ کے خاندان کے فاضل رکن جناب پروفیسر عزیز الرحمن کی وساطت سے میسر آئی ہے۔ بڑی تفتیح کے ۱۶۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں آیات کے نیچے پنجابی ترجمہ دیا

کیا ہے جبکہ حاشیہ میں منظوم تفسیر ہے۔ اس جلد کے اختتام پر مولانا محمد عمر رقمطراز ہیں:

بلا فخر گزارش ہے اور اللہ کو معلوم ہے اور روزِ روشن کی طرح واضح ہے کہ کس رُتبہ کا ترجمہ اہل زبان میں ہے۔ یہ ترجمہ ماشاء اللہ بہت صاف صاف تحت لفظی با محاورہ اور اہل زبان پنجاب ہوا ہے۔ توفیق الہی سے پارہ پارہ چھپتے رہیں گے۔ شائقین کو لازم ہے کہ اس کی اشاعت بڑھائیں۔

ب تفسیر کے پانچ پارے چھپ چکے ہیں اور چھٹا ماشاء اللہ زیر طبع ہے۔ اللہ تمام کرے۔ والدعا۔

احقر من عباد اللہ فقیر محمد عمر بن عبد اللہ درویش رتالیہ

قرآن کریم کی منظوم تفسیر علم و ادب کا بہت بڑا شہکار ہے۔ آپ نے یہ تفسیر لکھ کر اتنا بڑا کارنامہ انجام دیا ہے کہ جس کی نظیر محال ہے۔ آپ اور بھی بہت سی کتابوں کے مصنف تھے۔ آپ نے اربعین نووی کی تشریح بزبان پنجابی فرمائی۔ آپ کی بیشتر کتب امتداد زمانہ کے ہاتھوں عنقا ہیں۔ آپ کی اولاد میں بڑے بڑے عالم اور عابد و زاہد لوگ گزرے ہیں۔ آپ کی بدولت رتالی ورکاں ایک طویل عرصہ تک رشد و ہدایت کے خزانے لٹاتا رہا ہے۔ آپ کی اولاد نے آپ کے روحانی مشن کو مدتوں سر بلند رکھا ہے۔ ابھی حال ہی میں آپ کی اولاد میں سے مولانا حاجی عبدالقادر کا انتقال ہوا ہے جو زہد و تقویٰ کی تصویر تھے اور جن کی زبان پر وقت آخر بھی آیات قرآنی اور کلمہ طیبہ کا ورد تھا۔ حاجی عبدالقادر مرحوم کے انتقال پر پورا علاقہ رنج و اندوہ کی گہرائیوں میں کھو گیا۔ ان کے اٹھ جانے پر پورے علاقہ نے جس شدت سے غم و اندوہ کا اظہار کیا۔ اس سے مولانا محمد عمر رحمۃ اللہ علیہ کی یاد تازہ ہو گئی۔ حاجی صاحب فی الواقع شعائر ایمانی کی تفسیر اور اپنے اسلاف کی روحانی عظمت کا نمونہ تھے۔ آپ مولانا محمد عمر کی روایت دہرائے ہوئے علاقہ میں علمی و روحانی جواہر بکھیرتے رہے۔

تفسیر محمد امینی جہاں علمی و روحانی لحاظ سے متاع بے بہا ہے وہاں ادبی و شعری لحاظ سے بھی لائق صد تحسین ہے۔ آپ نے تفسیر کے دوران اس امر کا پورا اہتمام کیا ہے کہ شاعری کے اسلوب میں قرآنی تفسیر کا تقدس مجروح نہ ہونے پائے۔ آپ کی شاعری پُر تاثیر اور دلوں کو گداز شوق بخشنے والی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس تفسیر کو اپنے دور میں غیر معمولی پذیرائی حاصل ہوئی اور اہل ایمان نے اسے سرمایہ بصیرت بناتے ہوئے اس سے اکتساب فیض کرنے کو سعادت جانا۔ اب ہم نمونہ کلام کے طور پر آپ کی اس تفسیر کے مختلف مقامات سے چند اقتباسات نذر قارئین کر رہے ہیں تاکہ ادب و فن حضرات اور اہل ایمان کو اس تفسیر کی علمی و ادبی قدر و قیمت کا اندازہ ہو سکے۔

صحبت نیکاں

صحبت اولیا واں دی سارے مومن وا جب جانوں
اصحاب صفہ نبی دی صحبت رکھدے تسیں پچھانوں
صحبت پیراں کامل اکمل خاص رسولی جانوں
کیوں جو ایہہ رسولی نائب تسیں یقینوں مانوں
جدوں اللہ پیغمبر ساڈے رحمت نال بلایا
خیر الرسل ہوئے اوہ سانوں خیر الامم سنایا
صحبت نیکاں دی جے کرسو آخر نیکی پاؤ
ہو رحشرونوں سنگ انہاندے تسیں اٹھاندے جاؤ
بریاں صحبت کرنی ہر گز لائق نائیں بھائی
جوئیں چال رسول موافق اوہو برا ایہائی

حقیقی دوست

کافر مومن دشمن ظاہر یاری روا نہ آئی
خود اللہ فرماندے ایہن ویکھ کتاب الہی
زبانی نانی جانی یاری ترے قسماں ہے جانوں
زبانی دار مدار زبانی رکھدے تسیں پچھانوں
نانی تیرے نانی دوست جد تک نانے پاؤن
رات دن اوہ منہ تیرے تے گاؤن تیرے گاؤن
جانی یاراں حال سنائیں جو سرورتے بھائی
اوہ تے تیرے یار جانی نہیں بھید نہ رکھیں کائی
ایسے تیرے کم آون گے اندر حشر دیہاڑے
جس دن یار نہ کم آون پر آون متقی بھارے



حضرت قبلہ پیر محبت علی شکوری رحمۃ اللہ علیہ

تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ برصغیر پاک و ہند کے ظلمت کدوں کو نور ایمان سے منور کرنے کیلئے سب سے اہم کردار ان صوفیائے کرام نے ادا کیا ہے جنہوں نے اپنی پوری زندگی ترویج مذہب اور اشاعت دین کیلئے وقف کر رکھی تھی۔ یہ صوفیائے کرام عظمت توحید کے علمبردار اور عشق محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے دیوانے تھے۔ تبلیغ دین سے بڑھ کر انہیں کوئی مقصد عزیز نہیں تھا اور خدمت اسلام سے بڑھ کر انہیں کسی نصب العین سے پیار نہیں تھا۔ برصغیر پاک و ہند میں پہلی شمع اسلام روشن کرنے والے بزرگان دین سے لے کر اب تک مختلف ادوار میں بے شمار صوفیائے کرام اور مشائخ عظام نے ظلمات باطل کے خاتمہ کیلئے نور ایمان کی ایسی لاتعداد شمعیں روشن کی ہیں جن کی تابانیوں سے قلوب امت اسلامیہ اب تک روشن اور منور ہیں۔ حضرت پیر قبلہ محبت علی شکوری رحمۃ اللہ علیہ بھی صوفیائے کرام کے اس عظیم سلسلے کی کڑی تھے۔

حضرت پیر محبت علی شکوری رحمۃ اللہ علیہ ۱۹۱۱ء کو ضلع جہلم کے موضع ملوٹ میں پیدا ہوئے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم جہلم میں ہی حاصل کیا۔ آپ کے والد صوفی محمد نصر اللہ صوفی منٹش اور درویش صفت آدمی تھے۔ وہ اپنے بیٹے کی اخلاقی تربیت اور بلندی کردار کی خاطر خصوصی توجہ فرماتے رہے۔ اس طرح پیر محبت علی شکوری رحمۃ اللہ علیہ کو بچپن ہی سے وہ ماحول میسر آیا جس نے ان کے روحانی مدارج میں سر بلندی کیلئے اہم کردار ادا کیا۔ آپ نے نمایاں حیثیت سے بی اے کا امتحان پاس کر لیا تو طبیعت میں روحانیت کا جذبہ بیکراں انہیں تلاش شیخ کیلئے بے چین کرنے لگا۔

تعلیم سے فراغت کے فوری بعد حضرت پیر سیدستان علی شاہ رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے جو کچا کھوہ چک ۱۴ شریف ضلع ملتان میں مقیم تھے۔ ان کی خدمت میں حاضری دیتے ہی آپ کو یوں محسوس ہوا جیسے بے چین روح کو قرار آ گیا ہو اور قلب بے تاب نے اپنی منزل ڈھونڈ لی ہو۔ چنانچہ آپ حضرت پیر سیدستان علی شاہ سے سلسلہ قادریہ میں بیعت ہو گئے۔ آپ روحانی سلسلے کے لحاظ سے قادری اور مشربا چشتی تھے۔ شیخ کامل کی نگاہ فیض نے اپنے اس مرید کے

مقام باطنی کو فوراً ہی پہچان لیا اور چند معمولات اور اوراد کی ادائیگی کی تلقین کے ساتھ ہی انہوں نے آپ کو خلافت و اجازت سے سرفراز فرما دیا۔ بیعت کے پہلے دن ہی خلافت سے سرفرازی بلاشبہ مرید صادق کے روحانی مقام کی رفعت کی دلیل روشن ہے۔

پیر محبت علی شکوری رحمۃ اللہ علیہ کو مرشد کی نگاہ فیض ترجمان نے اس قدر بے خود سرشار کر دیا کہ ان پر جذب و سرمستی کی کیفیت طاری ہو گئی۔ اس جذب و مستی نے انہیں خرد کی تنکنائی سے ماوریٰ کر دیا۔ قریباً چودہ برس آپ اس کیفیت جذب و سرمستی میں غرق رہے لیکن اس جذب و سرمستی کے عالم میں بھی شیخ کی محبت اور شریعت کی سربلندی انہیں ملحوظ خاطر رہی اور بلا ناغہ حضرت شیخ کی خدمت میں حاضری بھی دیتے رہے۔ آپ نے قریباً چالیس برس صبح و مسا اپنے شیخ حضرت پیر سید مستان علی شاہ رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت اقدس میں بلا ناغہ حاضری دی۔ اپنے شیخ کی دعاؤں سے سرفراز ہوتے رہے اور روحانی سربلندیاں ان پر پیہم نچھاور ہوتی رہیں۔ آپ نے اپنے دادا پیر حضرت شاہ عبدالشکور رحمۃ اللہ علیہ کا زمانہ بھی دیکھا ہے جو اپنے وقت کے عظیم المرتبت روحانی پیشوا تھے۔ ان کا مزار گارڈن ٹاؤن بستی جیون خانہ لاہور میں ہے۔

اپنی صلاحیتوں، زہد و تقویٰ اور خلوص و عقیدت کی بناء پر محبت علی شکوری رحمۃ اللہ علیہ صرف اپنے شیخ کی آنکھوں کے ستارے ہی نہیں تھے بلکہ آپ کے دادا پیر بھی آپ سے انتہائی شفقت فرماتے اور آپ کو مسلسل اپنی دعاؤں سے نوازتے رہتے تھے۔

ایک مرتبہ پیر محبت علی شکوری رحمۃ اللہ علیہ گھر میں تشریف فرما تھے۔ دیکھا کہ شیخ محترم حضرت سید مستان رحمۃ اللہ علیہ علی شاہ اپنے پیر طریقت حضرت شاہ عبدالشکور رحمۃ اللہ علیہ کی معیت میں تشریف لا رہے ہیں۔ حضرت عبدالشکور رحمۃ اللہ علیہ نے ہاتھوں میں ایک بھاری تھیلا اٹھا رکھا تھا۔ حضرت محبت علی شکوری رحمۃ اللہ علیہ انہیں دیکھتے ہی فرط اشتیاق سے آگے بڑھے اور عرض کیا ”حضور یہ تھیلا مجھے دیجئے میں اٹھا لیتا ہوں“۔ انہوں نے جواب میں فرمایا ”یہ تھیلا آپ کا ہی ہے لیکن ہم خود اٹھائیں گے“۔

اس جملے سے ہی حضرت شاہ عبدالشکور کی شفقت کریمانہ کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ ان کا مقصود یہ تھا کہ پیر محبت علی شکوری رحمۃ اللہ علیہ ہمارے لئے انتہائی عزیز ہے اس لئے ہم اس کا ہر قسم کا بوجھ خود اٹھائیں گے۔ پیر محبت علی شکوری رحمۃ اللہ علیہ آپ کے اس معنی خیز جملے کا مطلب سمجھ کر فوراً اظہار تشکر کیلئے آپ کے قدموں میں جھک گئے۔

آپ کو داتا گنج بخش سید علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ کی ذات سے بڑی عقیدت تھی۔ اپنے مواعظ اور تقاریر میں اکثر آپ کا تذکرہ فرماتے۔ داتا صاحب کی تعلیمات اور ارشادات کو موثر انداز میں اپنے مریدین اور عقیدت مندوں کے سامنے پیش کرتے۔ دربار حضرت داتا صاحب میں اکثر حاضری دیتے اور وہاں طویل عرصہ مراقبہ بھی فرماتے۔ آپ کا یہ سالانہ معمول تھا کہ ہر سال ماہ رمضان میں نماز تراویح کی باجماعت ادائیگی دربار داتا صاحب کی مسجد میں فرماتے۔ اپنے مریدین کو بھی داتا صاحب کے مزار پر پابندی سے حاضری کی تلقین فرماتے۔ آپ داتا صاحب کے مقام روحانی کو بخوبی سمجھتے تھے اور تبلیغ اسلام اور فروغ دین کی خاطر داتا گنج بخش علیہ الرحمۃ نے جو خدمات انجام دی تھیں ان کا اکثر ذکر فرماتے رہتے تھے۔

زندگی کے آخری مہینوں میں آپ کے دماغ پر فالج کا شدید حملہ ہوا۔ قریباً ڈیڑھ ماہ شدید بیمار رہے علاج جاری رہا اور خدا کے فضل و کرم سے آپ شفا یاب ہو گئے۔ کچھ عرصہ گزرنے کے بعد آپ کو پھر وہی عارضہ لاحق ہو گیا۔ ۱۲ فروری ۱۹۸۴ء کو رات کے دس بجے آپ کو سخت تکلیف کا احساس ہوا۔ رات اسی تکلیف میں بسر ہوئی۔ وقت سحر اپنے جملہ متعلقین کو جو وہاں موجود تھے پاس بلا لیا اور سب کو کلمہ طیبہ کا ورد کرنے کی تلقین کی۔ اس کے ساتھ ہی آپ نے فرمایا کہ ”رونا نہیں“ اور پھر آپ پر غشی طاری ہو گئی۔ آپ کو فوراً یوسی ایچ لاہور میں لے جایا گیا مگر ڈاکٹر کی سخت توجہ اور علاج کے باوجود آپ شفا یاب نہ ہو سکے اور اسی مرض الموت میں آپ کا ۱۵ فروری ۱۹۸۴ء کو بوقت سحر انتقال ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ۵ یہ بدھ کا دن تھا اور اسلامی کیلنڈر کے مطابق آپ کی تاریخ وفات ۱۲ جمادی الاول ۱۴۰۳ھ بنتی ہے۔

پیر محبت علی شکوری رحمۃ اللہ علیہ صاحب طریقت و معرفت ہی نہیں تھے بلکہ علوم شریعت پر بھی کامل دسترس رکھتے تھے۔ رمز آشنائے عرفان تھے عالم باعمل تھے۔ مذہبی امور میں امور شریعت کو ہمیشہ مقدم رکھا اور اپنی تمام زندگی شریعت محمدیہ کی تعمیل میں بسر کی۔ اپنے مریدوں اور ارادت مندوں کو شریعت کے اصولوں کے مطابق زندگی بسر کرنے کی سختی سے تلقین فرماتے۔ سفر میں ہوتے یا حضر میں بڑے اجتماع میں ہوتے یا چند نیاز مندوں کے جھرمٹ میں ہمیشہ نماز باجماعت کا اہتمام فرماتے اور خود مصلیٰ پر کھڑے ہو کر امامت فرماتے۔ یہ آپ کی تعلیمات کا ہی فیضان ہے کہ آپ کے مریدوں میں سنت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مطابق زندگی گزارنے کا شدید جذبہ موجزن نظر آتا ہے۔ آپ اخلاص و عمل، مہر و محبت اور شفقت و رحمت کے پیکر تھے جو آپ سے ایک بار ملتا ہمیشہ

ہمیشہ کیلئے آپ کی شفقت کریمانہ کا اسیر ہو جاتا۔ آپ کی جاں نواز شخصیت میں ایسی روحانی کشش تھی کہ اہل دل بے اختیار آپ کی طرف کھنچے چلے آتے تھے۔ تشنگان روحانیت ہوں یا طالبان حق و صداقت، اصحاب علم و فضیلت ہوں یا ارباب ایمان و یقین سب کو آپ کی خدمت میں حاضری دینے کر غیر معمولی سکون قلبی اور اطمینان حاصل ہوتا۔ حق تو یہ ہے کہ اس ظلمت کدہ ہستی میں آپ کی ذات ایک ایسی شمع فروزاں کی مانند تھی جس نے اپنی ایمانی روشنی سے بے شمار انسانوں کے دلوں کو منور کیا اور اب جبکہ آپ جسمانی طور پر ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں تو آپ سے نسبت روحانی رکھنے والے اب بھی اپنے دلوں میں آپ کی تعلیمات اور ارشادات کی چمک دمک اور ضیا پاشی محسوس کرتے ہیں۔ آپ کی لازوال تعلیمات اور ابذی فرمودات کی صورت میں اب بھی آپ کا فیض جاری ہے اور اہل دل اسی چشمہ فیض سے اب بھی روحانی شادکامی حاصل کر رہے ہیں۔

بعد از وفات تربت ماور زمیں مجو
در سینہ ہائے مردم عارف مزار ما



مشہور مصنف مولانا محمد عالم آسی رحمۃ اللہ علیہ

وہ بزرگ جن کا تعلق امرتسر سے رہا ہے۔ ان کیلئے یہ نام نیا اور بیگانہ نہیں ہے بلکہ ایک ایسا مانوس نام ہے جس کے گرد علم و فضل گھومتا تھا۔ یہ وہ شخصیت تھی جسے عربی کی بلاغتوں اور رفعتوں تک کما حقہ رسائی تھی وہ فارسی زبان کی حلاوتوں سے آشنا تھی اور اردو جس کی باندی تھی۔ ان کو تبحر علمی اور بصیرت دینی کا اعتراف ہر کس و ناکس کو ہے۔ انہوں نے تحقیق و جستجو کے میدان میں ایسے موتی بکھیرے ہیں کہ ان کی چمک گردش ایام کی سنگیتوں پر بھی خندہ زن ہے۔ وہ بہت سی کتابوں کے مصنف تھے ان کے شاگرد برصغیر میں بکھرے ہوئے ہے ان کی شخصیت اس قدر بارعب تھی کہ ان تک ہر ایک کو رسائی نہیں تھی۔ امرتسر میں انہیں ایک ایسا علمی سمندر کہا جاتا تھا جس کی غواصی ہر کہ و مہ کے بس کی بات نہ تھی۔ گوجرانوالہ کی ایک بزرگ علمی شخصیت جناب خواجہ محمد اسحاق کا کہنا ہے کہ ان کے ہزاروں شاگرد تھے مگر آسی صاحب اتنے لئے دیئے رہتے تھے کہ تقرب کا شرف ہر ایک کو نہ تھا۔ صرف خواجہ عبدالرحیم بارایت لاء (مرحوم) ایک ایسی شخصیت تھے جنہوں نے بطور شاگردان سے بہت کچھ لے لیا اور وہ بھی ان پر مہربان تھے مگر بہت کم لوگ اس حقیقت سے آشنا ہیں کہ مولوی محمد عالم آسی گوجرانوالہ میں پیدا ہوئے تھے۔ اکثریت انہیں امرتسر کا باشندہ سمجھتی ہے کیونکہ انہوں نے اپنی عمر عزیز کا بیشتر حصہ امرتسر میں گزارا اور وہیں وات کے بعد دفن ہوئے۔ ہمیں بھی ان کے ”گوجرانوالوی“ ہونے کا علم جناب حضرت صاحبزادہ محمد عمر بیر بلوی کی معروف کتاب ”انقلاب الحقیقت“ کے مطالعہ سے ہوا۔ حضرت بیر بلوی سکون قلب کے متلاشی اور کسی مرد حق کو کے جو یا تھے۔ ایسی تلاش میں وہ اپنے فاضل دوست مولوی محمد عالم آسی کے پاس امرتسر بھی گئے اور جناب آسی ہی نے انہیں شرقپور شریف میں حضرت میاں شیر محمد کی خدمت میں حاضر ہونے کا مشورہ دیا تھا اور وہیں سے حضرت بیر بلوی کو بصورت و بصیرت کی وہ روشنی ملی کہ شکوک و شبہات کی ظلمتیں نور کا لباس پہن کر وحدت کے سانچے میں ڈھل گئیں اور ان کا وجود رشد و ہدایت، فکر و نظر اور سوز و گداز کا ایک ایسا مرکز محور ہو گیا، جس سے ایک عرصہ تک بھٹکے ہوؤں کو صراط مستقیم، تشکیک زدہ ذہنوں کو فکری آسودگی،

سرگرواں عقل کو منزل کا احساس اور قلب و نظر کی گمراہیوں کو قرار و نور کی دولت ملتی رہی اور کتنے ہی تشنہ دہان ان کے چشمہ فیوض و برکات سے سیراب ہوتے رہے اور یہ عظیم شرف جناب آسی ہی کو حاصل ہے کہ انہوں نے صاحبزادہ محمد عمر رحمۃ اللہ علیہ کو جناب شرفپوری کی طرف متوجہ کیا اور یوں ایک شخصیت خود بھی سنبھلی اور بہت سے گرتے ہوؤں کو بھی سنبھالتی اور تھامتہ چلی گئی۔

مولانا آسی موضع راکھوسیداں ضلع گوجرانوالہ میں ۱۲۹۸ھ میں پیدا ہوئے۔

مدرسہ نعمانیہ لاہور سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد مولوی عالم مولوی فاضل زبدۃ الحکماء حکیم صاذق ادیب فاضل اور مختار عدالت وکالت وغیرہ کے امتحانات پاس کئے۔ آپ حضرت شاہ ابوالخیر دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے مرید و خلیفہ تھے۔ آپ اسلامیہ سکول امرتسر میں عربی کے استاد تھے۔ تمام عمر وہیں گزری بہت بڑے عالم تھے۔ پچاس سے زائد کتابوں کے مصنف ہیں۔ ۱۳۶۳ھ میں بمقام امرتسر واصل بحق ہو کر مدفون ہوئے۔

”الکاوۃ علی الغاویہ“ آپ کی ایک معروف تصنیف ہے جو تحقیق و جستجو کا ایک نادر نمونہ ہے

اس میں چودھویں صدی ہجری کے ان مدعیان نبوت کے مختصر تاریخی حالات ہیں۔ جنہوں نے امام الزمان مسیح وقت محمد ثانی اور کرشن و مظہر الہی بن کر قرآنی تعلیم کو بدلتے ہوئے الگ الگ اپنا دستور العمل مسلمانوں کے سامنے پیش کر کے اپنی تعلیم کو مدار نجات قرار دیا۔ لیکن تحقیق پسند مسلمانوں نے بڑے زبردست دلائل کی روشنی میں ان کی تعلیم کو پائے استحقاق سے ٹھکرا دیا۔ اس کے علاوہ ان قرامطہ و ملاحدہ کا تذکرہ بھی ہے جنہوں نے ساتویں صدی ہجری کے ماحول میں دعوائے نبوت اور ترمیم و تنسیخ کر کے اسلام پیش کیا اور جن میں حسن بن صباح اور دروزی زیادہ تر مشہور ہیں۔

گویا یہ کتاب چودھویں صدی ہجری کے مدعیان نبوت کا ایک انسائیکلو پیڈیا ہے۔ اس کتاب کے حصہ دوم کے صفحہ ۵۵۰ پر گوجرانوالہ کے ایک مدعی نبوت سید محبوب عالم شاہ کا ذکر ہے جن کی الہامی کتاب کا نام ”امام حقیقی“ تھا جس میں انہوں نے دعویٰ کیا کہ پنجاب میں پنجابی نبی بھی آسکتا ہے۔

رموز الاجزاء آپ کی ایک مفید کتاب ہے جس میں عربی صرف و نحو کی ابتدائی اصطلاحات کو آسان اردو میں بطور جدید اور بطرز قدیم نظماً اور نثرأ بیان کر کے طلبہ کی مشکلات کو حل کر دیا گیا ہے۔ اسی طرح منظومۃ النحو بھی ان کی ایک کاوش ہے جو دراصل شرح مائتہ عامل عبدالرسول (فارسی) کل اردو نظم میں ترجمہ و تشریح ہے اور وہ مسائل بھی ہیں جو مائتہ عامل نہیں تھے اسی طرح کتاب

الصرف جدید اور کتاب النحو جدید بھی۔ ان کی کتابیں ہیں جو اپنے دور میں عربی زبان کی تحصیل کیلئے لازمی سمجھی جاتی تھیں۔ دور حاضر تو الا ماشاء اللہ عربی کی بلاغتوں، نزاکتوں اور گہرائیوں سے نا بلد ہے۔ فارسی کا بھی ذوق اٹھ گیا ہے، عربی تو دور کی بات بھی ہے..... اور اب کہاں مولوی محمد عالم آسی کی سی شخصیات کہ جو عربی کی بحرنا پیداکنار کے اسے غواص تھے کہ ان کا وجود خود اہل زبان کیلئے وجہ فخر و ناز تھا اور اب تو وہ سانحہ ہی ٹوٹ گیا ہے جس میں ایسے نابغہ وجود ڈھلا کرتے تھے۔ اس لئے علامہ اقبال نے فرمایا تھا کہ ”آج تعلیم بڑھ گئی ہے علم گھٹ گیا ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ سائے بڑھ کر طویل ہوتے جا رہے ہیں اور انسان ٹھگنے اور بونے ہو کر گھٹتے چلے جا رہے ہیں اور شاید اسی کا دوسرا نام قحط الرجال ہے۔“

آہ! یہ انسانوں کی بستی آہ کہاں انسان
چلتے پھرتے سایوں سے ہیں بام و در آباد



مسند آرائے علم و حکمت

علامہ مفتی بشیر حسین قادری رحمۃ اللہ علیہ

علمائے کرام اور صوفیائے عظام کا وجود رہ نور دان جادۂ شوق کیلئے منارۂ ہدایت سے کم نہیں ہوتا۔ ان کی تعلیمات ان کے مواعظِ حسنہ اور ان کے پند و نصائح بلاشبہ اہل ایمان و یقین کیلئے سرمایہٴ اعزاز ہوتے ہیں۔ یہ علمائے کرام دین مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاسبان اور ناموسِ حق و صداقت کے پاسدار ہوتے ہیں۔ ان کی گفتار ان کے کردار کی گواہی اور ان کا روشن کردار ان کے اعجازِ نطق کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ یہ پاکیزہ نفوس زندگی بھر اقدارِ اسلامی کے فروغ اور دین مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم کی سر بلندی کیلئے کوشاں رہتے ہیں اور وصال کے بعد ان کی تعلیمات کی روشنی نشانِ منزل بن کر تیرہ و تار دلوں میں جگمگاتی اور اُجالے بکھیرتی رہتی ہے۔

مولانا مفتی بشیر حسین بھی اسی قافلہٴ علم و عمل کے ایک رکن رکین تھے جنہوں نے اپنی تمام زندگی اتباعِ شرعِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم اور تبلیغ و اشاعتِ اسلام کیلئے وقف کر دی تھی۔ وہ بلاشبہ بہت بڑے عالمِ دین تھے علومِ قرآنی کے ماہر اور علمِ حدیث کی عظمتوں کے آشنا تھے۔ بہترین خطیب اور علومِ اسلامیہ پر غیر معمولی دسترس رکھتے تھے۔ حمیتِ اسلامی سے بہرہ ور اور تحریکِ پاکستان کے مثالی کارکن تھے نامور عاشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور تحفظِ ناموسِ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زبردست علمبردار تھے۔ نرم دم گفتگو اور گرم دم جستجو ہونے کے ساتھ ساتھ ایسے مفتیِ اسلام بھی تھے کہ جن کی رائے علمی حلقوں میں ہمیشہ احترام و توقیر سے دیکھی جاتی تھی۔

آپ ۱۹۰۶ء میں قصبہ رسول نگر ضلع گوجرانوالہ میں پیدا ہوئے۔ والد محترم مفتی محمد دین رحمۃ اللہ علیہ معروف عالمِ دین اور وہاں کے ہائی سکول میں عربی کے استاد تھے۔ بعد میں انہوں نے اپنے خاندانِ سمیت گوجرانوالہ میں رہائش اختیار کر لی۔ مفتی صاحب نے گورنمنٹ ہائی سکول گوجرانوالہ سے میٹرک کرنے کے بعد والد محترم سے دینی تعلیم حاصل کرنی شروع کر دی۔ والد محترم کے علاوہ مولانا محمد چراغ سے بھی علومِ دینیہ کی تحصیل کرتے رہے۔ ۲۵ برس کی عمر تک پیشتر علومِ دینیہ پر عبور

حاصل کر چکے تھے۔

پھر علوم ویدیہ کی مزید تحصیل کا شوق انہیں دارالعلوم دیوبند تک لے گیا۔ آپ وہاں دل لگا کر پڑھتے رہتے وہاں تحصیل علم کے علاوہ جو فارغ وقت پچتا، اس میں مختلف بزرگان دین کے مزاروں پر حاضری دینے چلے جاتے۔ اسی دوران میں ایک دفعہ حضرت علی احمد صابر کلیر شریف کے دربار میں حاضری کیلئے گئے تو اچانک حالت مراقبہ میں صاحب مزار کی زیارت نصیب ہوئی انہوں نے دست شفقت مفتی صاحب کے سر پر پھیرا۔ مفتی صاحب کہا کرتے تھے کہ یہ پیر کلیری کے دست شفقت ہی کا فیضان تھا کہ میری قوت حافظہ پہلے کی نسبت بہت بڑھ گئی اور علم قرآن و حدیث کے حصول کے سلسلہ میں میری بہت سی مشکلات حل ہو گئیں۔

آپ کا خط تحریر اتنا خوبصورت تھا کہ الفاظ نگینوں کی طرح بکھرے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ ایک دفعہ دارالعلوم دیوبند میں امتحان کے دوران میں آپ نے اپنے پرچے اس قدر خوشخطی سے تحریر کئے کہ آپ کے ممتحن حیران رہ گئے اور انہوں نے گمان کیا کہ اس طالب علم نے یہ اوراق کتابوں سے پھاڑ کر لگا دیئے ہیں۔ ممتحن حضرات نے انہیں بلا کر اپنے سامنے لکھنے کا حکم دیا۔ آپ نے ان کے سامنے پھر اسی خوبصورت انداز سے لکھا تو وہ بہت خوش ہوئے اور آپ کی بلندی درجات کیلئے دعا کی۔ آپ نے دارالعلوم دیوبند کے سالانہ امتحان میں اولین پوزیشن حاصل کی اور آپ کی تعلیمی قابلیت کے پیش نظر آپ کو ایک علیحدہ تعریفی سند بھی دی گئی۔

دینی تعلیم کے حصول کے بعد مرشد کامل کی تلاش کے سلسلہ میں شیر ربانی حضرت میاں شیر محمد شرقپوری کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے تو یوں محسوس ہوا کہ جیسے گوہر مراد پالیا ہے۔ حضرت میاں صاحب نے آپ کو سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ میں بیعت کیا اور آپ کو اپنی بہترین دعاؤں سے نوازتے ہوئے تعلیمات اسلامیہ کی ترویج و تبلیغ کی تاکید کی۔ آپ تمام عمر اپنے مرشد روحانی کے اس فرمان کی بجا آوری کے سلسلہ میں مصروف عمل رہے۔

انہوں نے سب سے پہلے کھیالی دروازہ والی مسجد میں خطابت کے فرائض انجام دینا شروع کئے اور پھر شہر سے باہر عید گاہ گراؤنڈ اور جناز گاہ میں جمعہ پڑھانا شروع کیا۔ یہ حضرت میاں شیر محمد شرقپوری کی دعاؤں کا فیضان تھا کہ اطراف و اکناف سے لوگ دیوانہ وار ان کا وعظ سننے آنے لگے اور بہت جلد آپ کے علمی مقام اور انداز خطابت کی دھوم مچ گئی۔ اردو کے علاوہ پنجابی میں تقریر کرنا آپ پر ختم تھا۔ آپ کا لہجہ انتہائی دلکش اور انداز بیان ایسا موثر تھا کہ آپ کی ہر تقریر سامعین کے

دلوں کی دھڑکنوں میں ڈھل جاتی تھی۔

عوام کا اشتیاق اور حاضرین کی والہانہ عقیدت دیکھ کر آپ کو اسی جگہ پر جامع مسجد بنانے کا خیال آیا۔ ایک رات آپ کے ایک ساتھی کو خواب میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زیارت نصیب ہوئی۔ استفسار پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ وہ مفتی بشیر حسین کی مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھنے جا رہے ہیں۔ صبح کو اس شخص نے یہ خواب آپ سے بیان کیا تو آپ نے قبرستان کے پاس وسیع رقبہ (جس کے سامنے عطا محمد ہائی سکول واقع ہے) خریدا اور اسی دن مسجد کا سنگ بنیاد رکھ دیا اور پھر بہت جلد اس شہر کی یہ عظیم الشان مسجد ”الجامعۃ الغوثیہ“ کے نام سے تکمیل کے مراحل طے کرنے لگی۔

ضلع گوجرانوالہ میں تحریک پاکستان کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کیلئے آپ نے شبانہ روز کام کیا۔ قائد اعظم محمد علی جناح دو دفعہ گوجرانوالہ تشریف لائے تو آپ نے ان کی آمد پر دونوں جلسہ ہائے عام میں علمائے اہلسنت وجماعت کی بھرپور نمائندگی کی۔ ان جلسوں میں تلاوت کرنے کی سعادت بھی آپ ہی کے حصے میں آئی۔ مسلم لیگ میں نہ صرف اپنے رفقاء کے ساتھ شامل ہوئے بلکہ مسلم لیگ کو اپنے ضلع میں مقبول و محبوب بنانے کیلئے بھی دن رات مختلف علاقوں کے دورے کئے۔ قیام پاکستان کے بعد بھی آپ اسی جذبہ خدمت سے سرشار ہو کر مہاجرین کی دیکھ بھال اور آباد کاری کیلئے شہر کی انتظامیہ سے بھرپور تعاون کرتے رہے۔

مفتی بشیر حسین اقدار اسلامی اور شرع مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت بڑے علمبردار تھے۔ قیام پاکستان سے قبل نکا چوک گوجرانوالہ میں عصمت فروشی کا مذموم کاروبار ہوتا تھا جب قیام پاکستان کے بعد بھی یہ گھناؤنا کاروبار اسی انداز سے ہوتا رہا تو آپ نے اپنے مواعظ میں عوام اور انتظامیہ کی حمیت اسلامی کو جھنجھوڑا مگر جب اصلاح احوال کے آثار نظر نہ آئے تو آپ نے نماز جمعہ کے بعد غیور مسلمانوں کے بہت بڑے ہجوم کو ساتھ لیا اور اس بازار میں پہنچ کر عوام سے خطاب میں احکام شرعیہ کی حرمت کو واضح کیا اور کہا کہ جب تک یہ بازار گناہ سے پاک نہیں ہو جاتا ہم نہیں جائیں گے۔ اس مذموم کاروبار میں حصہ لینے والوں نے جب باحمیت اور غیور مسلمانوں کے جم غفیر کو دیکھا تو پھر وہ مایوس ہو کر ہمیشہ ہمیشہ کیلئے یہ شہر چھوڑ گئے۔ اس دن سے یہ بازار پاک بازار کے نام سے پکارا جانے لگا۔

اسی طرح تحریک ختم نبوت کے دوران میں بھی آپ نے اپنی ایمان افروز تقریروں کے ذریعہ مقام مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے تحفظ کا عظیم فرض انجام دیا۔ آپ کی تقاریر نہایت پُر جوش اور

موثر ہوتی تھی چونکہ آپ کا پیغام دل کی گہرائیوں سے نکلتا تھا، اس لئے فوراً دل میں گھر کر جاتا تھا، ناموس رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کے دفاع کے سلسلہ میں ہی آپ کو پابند زنداں بھی ہونا پڑا مگر آپ اسی ولولہ ایمانی اور جذبہ اسلامی کے ساتھ اپنے پیغام حق کو عام کرتے رہے۔

آپ کی حمیت اسلامی کا ثبوت اس واقعہ سے بھی ملتا ہے کہ قیام پاکستان کے بعد گوجرانوالہ میں حج پر مبنی فلم لائی گئی۔ یہ فلم عقائد اسلامی کے خلاف تھی اور بلاشبہ اس سے جمہور مسلمانوں کے جذبات شدید طور پر مجروح ہوتے تھے۔ آپ نے انتظامیہ سے اس فلم کی نمائش رکوانے کا مطالبہ کیا، جب مطالبہ کی پذیرائی نہ ہوئی تو آپ فرزند ان توحید کا بہت بڑا جلوس لے کر سینما کے سامنے گئے اور فلم پر پابندی کا مطالبہ کیا۔ پولیس نے وہاں آ کر لاٹھی چارج شروع کر دیا۔ ایک پولیس افسر نے آپ کی توہین کی اور بہت سے دوسرے مسلمانوں کے ساتھ انہیں بھی گرفتار کر لیا گیا۔ آپ کی گرفتاری کی خبر سنتے ہی پورا شہر احتجاج کی عملی تصویر بن گیا۔ سارے شہر میں ہڑتال ہو گئی اور ہر طرف سے احتجاجی جلوس نکلنے لگے۔ اس پر نہ صرف اس فلم کی نمائش کے ذمہ داروں کو مجبور ہو کر اس شہر میں فلم کی نمائش روکنا پڑی بلکہ حکومت نے پاکستان بھر میں اس فلم کی نمائش ممنوع قرار دے دی اور مفتی صاحب کو باعزت طور پر رہا کر دیا گیا۔

مفتی بشیر حسین رحمۃ اللہ علیہ تمام عمر تعلیمات اسلامی پر کاربند رہے۔ زندگی بھر نماز تہجد پورے اہتمام سے ادا کرتے رہے۔ آپ کو رسول کریم حضور محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی سے بے پناہ عشق تھا، جب بھی آپ شان رسالت بیان کرتے تو فرط عقیدت سے آنکھیں نم ہو جاتی تھیں۔ چاروں روحانی سلاسل میں خلافت سے نوازے گئے تھے۔ تادم آخر اپنے عقیدت مندوں اور ارادت کیشوں کو بھی شرع مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم پر عمل پیرا ہونے کی تلقین کرتے رہے۔

یہ رب کریم کی خاص کرم نوازی تھی کہ آپ نے پانچ مرتبہ حج بیت اللہ شریف اور زیارت روضہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سعادت حاصل کی۔ آپ اس سعادت کو حضور سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر کرم سے تعبیر کیا کرتے تھے۔ آپ کی تمام زندگی نیکی و پرہیزگاری اور سادگی کا نمونہ تھی۔ آپ کی علمی قدر و منزلت اور دینی امور میں آپ کی غیر معمولی دسترس کے سبھی قائل تھے۔ ملک کے طول و عرض سے علمائے کرام آپ سے مختلف امور دینی پر فتویٰ حاصل کرنے کیلئے آتے تھے۔ اس سلسلہ میں دوسرے مکاتیب فکر کے علماء بھی آپ کی رائے اور فیصلہ کو احترام کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ آپ پوری تحقیق، غور و خوض اور مطالعہ کے بعد فتویٰ جاری کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ آپ کے

لکھے ہوئے فتاویٰ عدالتوں میں بھی پیش ہوتے تھے اور تسلیم کئے جاتے تھے۔

آپ کا سلسلہ نسب حضرت بابا فرید الدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کے واسطے سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ تک جا پہنچتا ہے۔ اسی لئے آپ قریشی فاروقی کہلاتے تھے۔ قدرت نے آپ کو عربی اور فارسی زبانوں پر بھی دسترس عطا کی تھی۔ آپ منطق، فلسفہ، صرف و نحو، حدیث اور تفسیر غرضیکہ تمام علوم اسلامی میں مہارت کامل رکھتے تھے۔ انہیں دوسرے بزرگان دین اور علمائے کرام کے ساتھ ساتھ حضرت مولانا احمد رضا خان فاضل بریلوی علیہ الرحمۃ کی ذات سے بھی بے پناہ عقیدت تھی اور اپنے مواعظ میں جا بجا انہیں خراج عقیدت پیش کرتے تھے۔

قدرت نے انہیں کثرت مطالعہ کا ذوق بھی عطا کر رکھا تھا۔ تحقیقی و علمی کتب کا حصول اور بھر پور مطالعہ زندگی بھر آپ کا معمول بنا رہا۔ آپ کی ذاتی لائبریری مختلف زبانوں میں دینی و مذہبی کتب کے بہت بڑے ذخیرہ پر مشتمل ہے۔ اس ذخیرہ کتب میں تین سو سے زائد غیر مطبوعہ قلمی نسخے بھی شامل ہیں۔ ان قلمی کتب میں سے بیشتر آپ کے بزرگوں کے ہاتھوں کی لکھی ہوئی ہیں۔ مفتی صاحب نے مختلف موضوعات دینیہ پر متعدد کتب بھی تصنیف کی ہیں جن میں سے چند ایک کے نام درج ذیل ہیں:

وسیلہ ایثار خلیل اللہ، فتاویٰ حنفیہ، نماز جنازہ کے بعد دعا، نماز تراویح، عدم القراۃ خلف الامام، ہاتھ باندھنے کا مسنون طریقہ، مسائل قربانی، حیات النبی۔

آپ کا انتقال جمعہ المبارک کے روز بتاریخ ۸ دسمبر ۱۹۷۸ء ہوا۔ آپ اس رات حسب معمول نماز تہجد کیلئے بیدار ہوئے تو وضو کے وقت اچانک گر گئے۔ ڈاکٹر کو بلایا گیا، آپ نے آنکھیں کھولیں تو اچانک مسکرانے لگ گئے۔ اس دل نواز تبسم کی بدولت اہل خانہ کو یقین ہو گیا کہ آپ خالق حقیقی سے وصال پانے ہی والے ہیں اور یہی ہوا۔ آپ اللہ اللہ کا ورد کرتے ہوئے کچھ ہی دیر بعد اس دارِ فانی سے دارالبقا کی طرف کوچ کر گئے۔ اقبال نے اسی ایمان افروز کیفیت کی نشاندہی یوں کی ہے:

کہاں سے تو نے اے اقبال سیکھی ہے درویشی

کہ چرچا بادشاہوں میں ہے تیری بادشاہی کا

وفات کے وقت آپ کی عمر اے برس کی تھی۔ آپ کے انتقال سے علم و حکمت، زہد و تقویٰ اور

ایمان و یقین کی یہ شمع حسین گل ہو گئی جس کی روشنی ایک عرصہ تک قلب و نظر کو اجالا بخشتی رہتی ہے۔ وفات کی خبر بہت جلد سارے شہر میں پھیل گئی۔ نماز جمعہ کے بعد جب آپ کا جنازہ اٹھایا گیا تو بے شمار لوگ آپ کے جنازہ کے جلوس میں شامل تھے۔ ہر آنکھ اشکبار تھی، ہر دل رو رہا تھا کہ ایک عظیم عاشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ کیلئے نگاہوں سے اوجھل ہو گیا، جب جنازہ اٹھایا گیا تو جنازہ میں شامل ہونے والوں کی تعداد کہیں زیادہ بڑھ چکی تھی کہ عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے۔ ہر مکتب فکر کے علمائے کرام نے اور ہر شعبہ زندگی سے تعلق رکھنے والے اصحاب فکر و نظر نے آپ کے جنازہ میں شمولیت کی۔ دیکھنے والے کہتے ہیں کہ بعد از مرگ بھی آپ کے چہرے سے زندگی کی ضیائیں پھوٹ رہی تھیں۔ مفتی صاحب کے اہل خاندان کی روایت ہے کہ آپ نے اپنی موت سے تھوڑا عرصہ پیشتر گورکن سے کہہ دیا تھا کہ میری قبر فلاں جگہ بنانی ہے اور اتنے دنوں تک میں اس قبر میں ابدی نیند سونے کیلئے آ جاؤں گا۔

نماز جنازہ کے بعد آپ کو قبرستان میں اپنی والدہ ماجدہ کے پہلو میں دفن کر دیا گیا۔ یہ امر واقعی ہے کہ مفتی صاحب کی پوری زندگی تعلیمات قرآنی کی تشریح اور فرمودات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی عملی تفسیر نظر آتی ہے۔ وہ ایسے عظیم المرتبت عاشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم تھے کہ انہوں نے ہر پہلو سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی سر بلندی کو مقدم رکھا، بہت بڑے عالم دین تھے کہ جہالت کے اندھیروں میں علم و آگہی کے چراغ روشن کرتے رہے۔ توحید خداوندی کے علمبردار تھے کہ باطل قوتوں کے سامنے پوری جرأت ایمانی کے ساتھ ڈٹ جایا کرتے تھے، مرد مومن تھے کہ فرشتہ اجل کی آواز پر لبیک کہنے تک شعائر اسلامی کو شعائر حیات بنائے رکھا۔ نظریہ پاکستان کے ایسے فدائی تھے کہ اپنی ولولہ انگیز تقریروں کے ذریعہ اس نظریہ کو دلوں کی آواز بنانے کے لئے کوشاں رہے۔

ع..... خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را



حضرت مولانا محمد حسین اہل رحمۃ اللہ علیہ

جذب و جنون اور سلوک و تصوف کی تاریخ اس ذکر کے بغیر تشنہ تشنہ سی ہے۔ آپ پشے کے لحاظ سے وکیل تھے مگر سلسلہ قادریہ کی ایک عظیم شخصیت حضرت چودھری محمد امانت خاں رحمۃ اللہ علیہ رئیس اعظم بیگم پور کی توجہات سے دل امور دنیا سے اچاٹ ہو گیا اور یادِ الہی سے معمور اس قلبی انقلاب کی روداد خود ان کے الفاظ میں ملاحظہ ہو۔

میری پہلی دفعہ باریابی حضور اقدس کی خدمت میں جون ۱۹۲۵ء کے آخر میں ہوئی، جب حضور گوجرانوالہ میں اتفاقاً میرے ایک عزیز کے ہاں تشریف فرما تھے۔ بس نگاہ سے نگاہ ملتے ہی:

آں دل کہ رم نمودے از خو برو جواناں

دیرینہ سال پیرے بروش بیک نگاہے

زاں بعد جولائی کے مہینے میں میں خود ان کی خدمت عالیہ میں حاضر ہوا۔ بس پھر کیا تھا،

نظر کیمیا اثر نے دم بھر میں یہ کیفیت پیدا کر دی اور بار بار میری زباں پر یہ شعر آتا رہا:

حاصل عمر فدائے سر یارے کروم

شادم از زندگی خویش کہ کارے کروم

بعد میں مولوی اہل صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مرشد کے جملہ مکاتیب جو ان کے نام

آتے رہے۔ ایک کتاب (میخانہ عشق) کی شکل میں جمع کر دیئے جو کم و بیش ۷۰۰ صفحات پر مشتمل

ہے۔ اس میں راہ سلوک کی مشکلات کا ذکر بھی ہے اور ان کا حل بھی۔ بصارت کی عظمت بھی ہے اور

بصیرت کی رفعت بھی، محبت کی نوب بھی ہے اور عشق کی تخیر آفرینیاں، خود مرتب کے لحاظ میں ”یہ مکتوبات

محض عشق اور فقر کے جوش سے لبریز ہیں۔ جو صاحب فقر سے محبت نہ رکھتے ہوں خدا کیلئے وہ ان کو

نہ پڑھیں، ورنہ انکار اور اعتراض سے وہ کفر و ضلال کے گڑھے میں گر جائیں گے۔“

مولوی محمد حسین اہل رحمۃ اللہ علیہ کا حلقہ ارادت خاصا وسیع تھا۔ جبکہ آپ خود کفیل تھے۔ یہ

آپ کی عظمت کی دلیل ہے کہ بہت سے وہ دکلاء بھی آپ ارادت مند تھے جو آپ کے ساتھ کام

کرتے رہے۔ بہر کیف آپ کے فیوض و برکات کا سلسلہ بیکراں تھا اور ایک دنیا تھی کہ بقدر ظرف
حضوری اور کیف کی دولت سمیٹتی چلی جاتی تھی مگر موت کا ایک وقت مقرر ہے جو ٹل نہیں سکتا۔ ۷
جنوری ۱۹۶۲ء کو دنیائے عشق و مستی کی یہ دلاویز شخصیت مالک حقیقی سے جا ملی۔ آپ کو پہلے مقامی
قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا اور پھر ۶۔ اکتوبر ۱۹۶۸ء کو آپ کا صندوق جی ٹی روڈ متصل اوور ہیڈ
برج (نزد سیا لکوٹ بائی پاس) ایک مقام پر منتقل کیا گیا۔ جہاں آج کل آپ کا مزار مرجع خواص و عوام
م ہے۔ وہیں آپ کی اہلیہ محترمہ بھی دفن ہیں جو خود تصوف کی دنیا میں ایک قابل قدر مقام کی حامل
تھیں اور حضرت چودھری محمد امانت خاں رحمۃ اللہ علیہ سے فیضیاب تھیں۔ آپ فی الواقع فنا فی الشیخ
کے عظیم مقام پر تھے اور بحر عشق کے شناور تھے۔ عشق کا نقطہ آغاز خرد کا مقام آخر ہوا کرتا ہے۔ عشق
جنون کے ساز پر رقص کرتا ہے اور عقل اس منظر کو دیکھ کر کانپتی اور لرزتی رہ جاتی ہے۔

درس عشقش رازبانے دیگر است
این معلم را بیانے دیگر است



حضرت محمد حسین شاہ رحمۃ اللہ علیہ

برصغیر پاک و ہند کی تاریخ ادبیات میں ایسے درویش صفت اور صوفی منش شعراء کے شعری ورثہ کو فراموش نہیں کیا جاسکتا، جنہوں نے اپنی خداداد صلاحیتوں، فکری رفعتوں اور علمی ریاضتوں کی بدولت لاتعداد طالبان حق و صداقت کو مقصود حقیقی سے بہرہ یاب کیا ہے۔ حضرت محمد حسین شاہ رحمۃ اللہ علیہ بھی اس کاروان روحانیت اور کاروان شاعری کے ایک رکن ہیں، جس کا ہر فرد دولت ایمانی سے مالا مال ہوتا ہے۔ ان کی غزلیات، قطعات اور رباعیات کا ایک مجموعہ ان کی وفات کے بعد ۱۹۵۶ء میں ”دیوان ضیا حسین“ کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ دوسرے صوفی شعراء کی طرح انہوں نے بھی اپنے حمدیہ، نعتیہ اور عارفانہ کلام کو غزلیات کا نام دیا ہے۔ چونکہ ان کا مطلوب اور مقصود ذات خداوندی اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات والا صفات تھی اس لئے ان کی تمام شاعری کا مرکز و محور خدا اور اس کے حبیب پاک کی ذات ہے۔

بابا حسین شاہ ۱۸۶۶ء میں اٹاری ضلع امرتسر کے قریب ایک گاؤں چھینہ کے رہنے والے تھے۔ ایک روز آپ کسی کام سے جسر وال چھینہ پہنچے تو حضرت محمد خیر بہار رحمۃ اللہ علیہ سجادہ نشین دربار فاضلیہ راجہ سانسی سے ملاقات ہو گئی۔ پہلی ملاقات ہی میں بیعت ہو گئے۔ حضرت خیر بہار نے جوہر قابل سمجھتے ہوئے ان پر خصوصی توجہ دی۔ شیخ سے ان کا تعلق خاطر اتنا بڑھا کہ زیادہ وقت شیخ ہی کی صحبت میں بسر کرنے لگے۔ یہ ان کے شیخ کی تربیت کامل اور ان کی عقیدت و محبت کا کمال تھا کہ حضرت خیر بہار کی وفات کے بعد ان کو وہاں کا سجادہ نشین منتخب کر لیا گیا۔

بابا حسین شاہ طویل عرصہ تک راجہ سانسی میں مقیم رہے اور ارادت مندوں کی تربیت روحانی فرماتے رہے۔ ۱۹۳۳ء میں تقسیم پاک و ہند کا مسئلہ آیا تو ان کیلئے وہاں رہنا مشکل ہو گیا۔ چنانچہ اپنے وابستگان عقیدت کے ہمراہ وہاں سے چل پڑے اور موضع چندالی ضلع گوجرانوالہ میں مقیم ہو گئے اور تادم آخر یہیں سے اپنے سلسلہ روحانی کو فروغ دیتے رہے۔ ۹۰ برس کی طویل عمر پا کر بالآخر جون ۱۹۵۶ء میں اس دار فانی سے کوچ کر کے اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ آپ کا مزار آپ کے

عقیدت مندوں کیلئے مرجع فیوض روحانی ہے۔

حضرت حسین شاہ صاحب علم و فضیلت اور واقف رموز شریعت بزرگ تھے۔ انہوں نے اوائل عمر میں مختلف اصحاب علم و دانش کے سامنے زانوئے تلمذ طے کرتے ہوئے اردو کے علاوہ عربی اور فارسی میں دسترس حاصل کر لی تھی۔ مشکل سے مشکل مسائل لمحوں میں سلجھا دیتے تھے۔ آہستہ آہستہ یہ اپنے پیغام کو مزید دل نشین اور قابل قبول بنانے کیلئے منظوم صورت میں پیش کرنے لگے۔ ان کی شاعری ان کے وسیع مطالعہ اور عمیق مشاہدات روحانی کی آئینہ دار ہے۔ ان کی صوفیانہ شاعری ایک لحاظ سے ان کے روحانی مراحل کے ارتقائی عمل کی داستان بھی ہے جس سے ہم ان کی ذاتی فکر انگیزیوں کے حوالے سے کائنات کے اسرار و رموز پر گہری نظر ڈالنے کے قابل ہو سکتے ہیں۔

دیوان ضیا حسین ان کا ضخیم شعری مجموعہ ہے جو ان کے ارادت مندوں نے ان کی وفات کے بعد بڑے سائز پر شائع کیا تھا۔ اس میں ان کی بیسیوں نعتیں اور دوسری نظمیں ہیں۔ مثنوی کی صورت میں طویل نظمیں بھی ہیں۔ کلام کا بیشتر حصہ پنجابی، اردو اور فارسی زبانوں میں ہے۔ خواہ یہ حمد رب کریم لکھیں یا نعت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم یا کوئی نظم، بہر صورت تصوف کی چاشنی ہر مقام پر موجود ہوتی ہے۔ حضور محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے انہیں دلی لگاؤ تھا۔ وہ عقلی و فکری طور پر کسی نہ کسی صورت میں اپنے عقائد کی پختگی اور جذباتی وارفتگی کا اظہار کرتے جاتے ہیں۔ ہم ان کے نعتیہ کلام سے انتخاب کے طور پر چند شعر پیش کرتے ہیں:

محمد کا نقشہ ہے نقشہ خدا کا
جو منشاء خدا کا وہی مصطفیٰ کا
جمال الہی اگر دیکھنا ہو
تو دیدار کافی ہے خیر الوریٰ کا
جو تیرا کہاؤے وہ کس در پہ جاوے
کہ رحمن کا در ہے در مصطفیٰ کا

عشق نے باندھا تصور جب رسول اللہ کا
علم میں تب آ گیا نقشہ صنی اللہ کا
نقطہ علم الہی ہے محمد مصطفیٰ

اس لئے اُمی لقب ہے اس حبیب اللہ کا
جنش نقطہ سے ہے سارے دفاتر کی بناء
لب سے پیغمبر کے نازل ہے کلام اللہ کا
حضرت حسین شاہ کی کہی ہوئی نعتیں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقام و مرتبہ کی
شارح اور آپ کی شخصیت کی روحانی و ایمانی عظمتوں کی ترجمان ہیں۔ ایک نعت کے کچھ اشعار نذر
قارئین ہیں جن میں یہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت سامانی اور اپنی کم مائیگی کا اظہار
کرتے ہیں:

عنایت کی نظر اک بار ہی مجھ پر کرو پیا
وگر رحمت نہ کیجئے گے تو مرنے سے برا جیا
نہ طاقت نہ لیاقت ہے یہ کہنا بھی حماقت ہے
ترا جاروب کش روشن کرے دربار میں دیا
لب دریائے مدحت تشنہ لب بیٹھا ہوں مدت سے
پیا سا اس قدر خامش گلا خشکی نے ہے سیا
عنایت بس عنایت ہو تھی شاہ ولایت ہو
ہو روشن ہر دو عالم میں ترا دیا مرا لیا

اب چند نعتوں کے چیدہ چیدہ اشعار ملاحظہ ہوں جن میں حسین شاہ حضور نبی کریم صلی اللہ
علیہ وسلم کے حسن و جمال کی تابشوں اور سیرت و کردار کی بلندیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنا ماجرائے
غم بھی سنائے چلے جاتے ہیں کیونکہ انہیں احساس ہے حضور محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی کرم باریوں
کی بدولت ہی ان کی کشت آرزو کو نئی زندگی ملے گی۔

وہ اپنی شان میں کونین کے سردار بیٹھے ہیں
چمن میں جس طرح شاہ گل و گلزار بیٹھے ہیں
کئی عاشق مثال عندلیب زار بیٹھے ہیں
ترپتے ہیں سکتے طالب دیدار بیٹھے ہیں
جز تمہارے سے کچھ نہیں ہر دو جہاں میں رونما
کون ہے جز آپ کے جس سے مری امداد ہو

آپ کے کہلاتے ہیں ہم کہ بُرے ہیں یا بھلے
ہم کہاں جائیں ترا در چھوڑ کر ارشاد ہو
جلوہ ریز زمانے میں وہ اللہ اللہ کون ہو
عارض رنگین کا کل مشکین، رُوئے مجلی کون ہو
گیسو کالے کنڈل والے کون سنبھالے کون بتا
پشماں مست است کرشمہ نور تجلی کون ہو
نور جمالی لب کی لالی کا کل کالی عارض پہ
صورت عالی پھین نرالی ماشاء اللہ کون ہو

خدا کا شکر ہے امشب پیا تشریف لے آئے
مبارک خیر مقدم ہے خوشی کا جام بھر لائے
تری بزم منور میں مری سرکار ہم کیا ہیں
فقیر بے سرو ساماں بجا لائے تو کیا لائے
منور کر دیا خانہ بدل دی نور سے ظلمت
نخستہ بام ہے میرا فلک نے پھول برسائے

آپ کے دربار میں آیا ہے طالب یا طلب
جام بھر دے ساقیا آیا گدائے تشنہ لب
کون ہے ایسا جو اس دربار سے خالی گیا
اے شہ خیر الوریٰ خیر العطاء عالی نسب

تیرا یہ در یوزہ گر مدت سے کرتا ہے صدا
طفل پن سے مانگتے کو وقت پیری آ گیا
داغ حسرت کو نہ لے جاؤں یہاں سے اے کریم
شاہ کے بازار کی رونق گداؤں کی صدا

حضرت حسین شاہ اُردو کے علاوہ عربی اور فارسی علوم کے بھی ماہر تھے۔ ان کی فارسی نعتیں بھی ان کے دلی گداز اور روحانی سوز و ساز کی غماز ہیں۔ ان فارسی نعتوں کے مطالعہ سے اُن کی فارسی زبان پر گرفت کا بجا طور پر احساس ہوتا ہے۔ بلاشبہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدحت و ثناء کسی بھی زبان اور اہل زبان کیلئے وجہ صدا عزاز ہے۔ فارسی زبان میں نعت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم رقم کرتے ہوئے جناب حسین شاہ کے قلم کی روحانی سرمستیاں ملاحظہ کیجئے۔

اے بت رشک بتان آزی
سجدہ گاہ عرشیاں ابروئے تو
تاجدارانِ جہاں خاک ورت
کس نہ دیدم جز حسین خوشخوئے تو

مقدم خیر بسم اللہ شہ خیر الوری آمد
شہ عرش بریں آقائے عالم مصطفیٰ آمد

چہ خوش نام نامیت نام محمد
کلام کلیم و کلام محمد
شدہ مست و مخمور آں مرد عارف
چشیدہ کے جام جام محمد
تصور الہی لقاے محمد
بنائے جہاں از ضیائے محمد
ثنائے محمد ثنائے الہی
ثنائے خدا شد ثنائے محمد

در خادمانِ شاہے بدنام خاکسارم
آوردہ بار عصیاں جز عیبہ ندارم
من چشمہ ندامت اے صاحب کرامت

در خاک پائے دامت دم دائما گزارم
نے زہد نے ریاضت نے طاقت عبادت
نے پائے استقامت تاراج حال آرم
نادار و ناتوانم جز تو نہ سچ دانم
بندۂ بندگانم در گلشن تو خارم

الغرض حضرت محمد حسین رحمۃ اللہ علیہ شاہ قلب و نظر کی بصیرتوں، قرطاس و قلم کی عظمتوں اور فکر و خیال کی رفعتوں کے امین تھے۔ وہ عامل بھی تھے اور عالم بھی، جوں جوں انسان غور کرتا ہے حیرت بڑھتی چلی جاتی ہے کہ ہم کیسے کیسے انسانوں کو مٹی کے حوالے کر آتے ہیں اور کیسے کیسے چراغ ہیں کہ ان کی لو کو موت کے تھپڑے بھی بجا نہیں سکتے کہ وہ عشق کے نور سے روشن ہیں۔

کیا کیا چھپائے خاک میں انسان چاند سے
سچ پوچھیے اگر تو زمیں آسمان ہے اب



حضرت موسیٰ بن سلیمان ہاشمی رحمۃ اللہ علیہ

کون سا انسان ہے جس پر عنایات الہی کا بادل نہیں برستا، کون سا دل ہے جس میں انوار الہی کی بارش نہیں ہوتی اور کون سی روح ہے جو فیضان الہی سے سیراب نہیں ہوتی مگر بعض ایسے کور باطن اور بے حس لوگ بھی ہوتے ہیں جو انعامات الہی سے فیضیاب بھی ہوتے ہیں مگر اس کا شکریہ بھی ادا نہیں کرتے۔ ہم پر ہر آن لطف و کرم نچھاور کرنے والی ذات خداوندی ہم سے کیا چاہتی ہے۔ فقط یہی کہ ہم اس کے انعامات کا تذکرہ کرتے رہیں۔ اس لئے نہیں کہ ہمارے تذکرے سے شان خداوندی میں اضافہ ہوتا ہے۔ بلکہ اس لئے کہ اس ذکر خداوندی کی بدولت ہم پر رحمت خداوندی مزید شدت سے نازل ہونے لگتی ہے۔

بعض انسان خواب غفلت میں سرمست ہوتے ہیں۔ اپنے خدا کی یاد سے غافل اور دنیا بھر کے مشاغل میں الجھے رہتے ہیں۔ خدا نے انہیں ہر قسم کے انعامات اور لطف و کرم سے نوازا رکھا ہوتا ہے مگر بد قسمتی سے ان کے دل میں بھول کر بھی یہ خیال نہیں آتا کہ چند لمحوں کیلئے ہی رب کریم کے حضور سجدہ ریز ہو جائیں یا کبھی تو اپنے مالک و خالق کو ہی یاد کر لیا کریں، وہ ہر احساس سے بے نیاز ہوتے ہیں، جانوروں کی طرح، ہر سوچ اور عمل سے بے نیاز، لیکن قربان جائیں ذات خداوندی کے، ہم اسے بھول جاتے ہیں مگر وہ ہمیں کبھی نہیں بھولتی۔ ہماری غفلتوں میں بھی ہمیں یاد رکھتی ہے اور ہر لحظہ ہم پر دامن کرم دراز رکھتی ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ رحمت خداوندی اپنے نافرمان بندے کو توبہ کی توفیق عطا کرتی ہے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے نافرمان اور سرکش انسان توبہ کے فیض سے اپنے خالق و مالک کے حضور سجدہ ریز ہو جاتا ہے اور پھر رحمت الہی کا بادل اس پر اس شان سے برستا ہے کہ یہی انسان خدا کے خصوصی بندوں میں شمار ہونے لگتا ہے۔ ایسے ہی موقعہ کیلئے علامہ اقبال نے کہا ہے:

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے جن لئے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

ایسا ہی توبہ کا واقعہ حضرت موسیٰ بن محمد بن سلیمان ہاشمی کے ساتھ پیش آیا۔ جو راہِ حق سے
بھٹکا ہوا انسان تھا مگر جب رحمتِ خداوندی نے اسے آغوش میں لے لیا تو اس کا مقدر ہی بدل گیا۔
وہ ذرے سے آفتاب اور قطرے سے گہر بن چکا تھا۔ اس واقعہ کے راوی مشہور صوفی بزرگ حضرت
محمد بن سماک رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ مشہور کتاب ”نزہۃ البساتین“ میں محمد بن سماک کے حوالے سے
مرقوم ہے کہ موسیٰ بن محمد بن سلیمان ہاشمی نہایت عیاش اور بے فکر نوجوان تھا۔ سوائے کھانے پینے، لہو
لعب، راگ رنگ، خوش پوشاکی اور مہ جبین عورتوں کی صحبت کے اسے کوئی کام نہ تھا۔ وہ ہر اس کام
میں مشغول رہتا تھا جو گناہ اور تاریکی کی طرف لے جاتا تھا۔

سال بھر میں اس کی تین لاکھ تین ہزار کی آمدنی تھی۔ وہ یہ بڑی رقم سب کی سب اپنے عیش و
عشرت اور رنگ رلیوں میں گزار دیتا تھا۔ ایک رات وہ شراب پینے اور نغمہ گری کی محفل میں مصروف
تھا۔ اس عالم میں محل کے پاس سے ایک نہایت دردناک لے میں کسی مضطرب دل کی فکر کو لرزیدہ کر
دینے والی آواز گونجی۔ یہ آواز اس قدر سوزناک اور درد انگیز تھی کہ اس کا دل تڑپ اٹھا۔ اس کے دل پر
چوٹ پڑنے لگی۔ سنانے والا سنا رہا تھا، کبھی یہ آواز اس کے کان میں آ جاتی اور کبھی خلا میں کھو جاتی۔

موسیٰ بن محمد بن سلیمان ہاشمی نے محفل کو درخواست کیا اور پوری توجہ سے اس صدائے درد
ناک کو سننے لگا اور اس کے ساتھ ہی غلاموں کو حکم دیا کہ وہ تحقیق کریں کہ یہ دردناک آواز کس کی
ہے۔ اسے میرے پاس لاؤ، غلام اس مردِ ایمان کی تلاش میں چلے اور بالآخر اس تک پہنچ گئے۔ دیکھا
کہ دردناک آواز میں آوازِ حق بلند کرنے والا ایک نوجوان ہے جو نہایت کمزور اور لاغر ہے، اس کی
گرن بالکل سوکھ گئی ہے، رنگ اور لب خشک ہیں۔ سخت پریشان حال نظر آتا ہے، اس نے پھٹے پرانے
کپڑے پہن رکھے ہیں، ننگے پاؤں کھڑا ہے اور اپنے پاک پروردگار کے حضور بڑی عاجزی کے ساتھ
مناجات کر رہا ہے۔ انہوں نے اسے مسجد سے نکالا اور لے گئے۔ موسیٰ بن محمد شراب کے نشے میں
دھت تھا، اس نے اپنے معاصرین سے دریافت کیا کہ یہ کون ہے؟ غلاموں اور نیاز مندوں نے عرض
کیا کہ:

حضور! یہ وہ آواز والا ہے جس کی آواز آپ نے سنی تھی۔

محمد بن سلیمان نے پوچھا:

یہ کہاں تھا؟

غلاموں نے عرض کہا:

یہ مسجد میں کھڑا نماز میں قرآن حکیم کی تلاوت کر رہا تھا۔

محمد بن سلیمان نے اس خستہ حال درویش سے پوچھا:

”اے مردِ مومن! تو کیا پڑھ رہا تھا؟“

اس مردِ درویش نے کہا کہ

”میں قرآن حکیم کی تلاوت کر رہا تھا۔“

محمد بن سلیمان کے منہ سے بے اختیار نکلا کہ

”اے اللہ کے بندے جو کچھ تم پڑھ رہے تھے وہ ہم کو پھر سناؤ“

اس مردِ درویش نے پہلے اعوذ اور پھر بسم اللہ شریف تلاوت کی اور پھر پڑھا:

”بے شک نیک بندے آرام میں ہوں گے، تختوں پر بیٹھے (سیر) دیکھ رہے ہوں گے، تو

پچانے گا ان کے چہروں پر تازگی نعمت کی۔ ان کو پلائی جائے گی خاص شراب سر بہر۔ اس کی مہر موم

کے بجائے مشک کی ہوگی اور اس شراب میں رغبت کرنے والوں کو چاہئے کہ رغبت کریں اور اس میں

تسلی ملی ہوئی ہوگی۔ وہ ایک چشمہ ہے جس سے مقرب بندے پیتے ہیں۔“

اس مردِ درویش نے ان آیاتِ قرآنی کی تلاوت کی پھر ترجمہ سنایا اور کہنے لگا:

”تم دھوکے میں پڑے ہوئے انسان ہو، ان نعمتوں کا بیان کہاں اور تیرا یہ محل کہاں، یہ سب

متقیوں کیلئے ہے۔ اب کافروں کی سنئے ان کیلئے آگ ہے اور آگ بھی کیسی کہ جس میں ہمیشہ ہمیشہ

کیلئے رہیں گے اور عذاب کبھی ہلکا نہ کیا جائے گا۔“

جب موسیٰ بن سلیمان ہاشمی نے یہ سنا تو بے اختیار اٹھا اور اس جوان سے لپٹ کر رونے لگا

اور سب مصاحبوں، درباریوں اور غلاموں سے مخاطب ہو کر کہنے لگا کہ:

”میرے پاس سے چلے جاؤ اور خود اس جوان کو لے کر محل کے صحن میں آ کر بورجے پر چلے

گیا اور اپنی عمر کے گزرے ہوئے ستائیس سال رائیگاں جانے پر افسوس، حسرت اور رنج و الم کا اظہار کرنے لگا۔ اپنے نفس کو ملامت کرنے لگا کہ اے نفس امارہ تو نے مجھے تباہ کر دیا۔ مجھے آخرت کے انعامات سے غافل کر کے دنیا کے عیش و عشرت میں الجھا دیا۔ اس کے ساتھ ہی موسیٰ بن محمد بن سلیمان زار و قطار روتا رہا۔ وہ مرد درویش اسے نصیحت سے نوازتا رہا۔ پوری رات اسی عالم میں بسر ہو گئی۔ دونوں ہی رو رہے تھے ایک اپنے گناہوں پر تائب ہو کر اور دوسرا اپنی نصیحت کا ثمر دیکھ کر۔

موسیٰ بن محمد کے دل کی دنیا بدل چکی تھی۔ اس کا دل یکسر مکروہات دنیاوی سے اُچاٹ ہو چکا تھا، خدا کے جلوے نگاہوں اور دل و دماغ میں بس گئے تھے آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں، دل خوف خداوندی سے لرز رہا تھا۔ اس نے اپنی تمام دولت، مال و متاع اور محلات، زمینیں غریبوں میں تقسیم کر دیئے اور اپنے آپ کو ہمہ وقت خدا کی یاد میں محو کر لیا۔ غلام اور کنیزوں کو آزاد کرتے ہوئے کہا کہ جو کچھ لے سکتے ہو لے جاؤ۔ میرا بتم سے کوئی تعلق نہیں۔ میرا اب فقط خدائے کریم سے رشتہ ہے اور میں گذشتہ عمر کے گناہوں کی تلافی کرنا چاہتا ہوں۔

دنیا کے مکروہات سے یکسر کنارہ کشی کر کے موسیٰ بن محمد نے لباس فاخرہ اتار دیا اور موٹے کپڑے پہن لئے۔ تذکرہ نگاروں کے مطابق اب اس کی یہ حالت ہو گئی کہ تمام رات عبادت میں مصروف رہتا، دن کو روزہ رکھتا، شبانہ روز خدا کی یاد میں مصروف رہتا۔ عبادت میں اس حد تک ڈوب گیا کہ بڑے بڑے عبادت گزاروں اور صلحاء کو پیچھے چھوڑ دیا۔ دوسرے صوفیائے کرام اس کی حالت کو دیکھتے اور کہتے کہ:

”اے خدا کے بندے اپنے نفس پر اتنی سختی نہ کرو۔“

وہ جواب میں عرض کرتا کہ:

”میں نے تمام عمر گناہ کئے، اللہ کی نافرمانی کی، راہ حق سے بھٹکا رہا، خدا را مجھے میرے حال

پر چھوڑ دو۔“

یہ کہہ کر وہ خوب روتا اور پھر خدا کی یاد میں گریہ زاری کرتے ہوئے عبادت میں کھو جاتا۔ اُس کی عبادت رنگ لائی، اس کے بے قرار دل کو قرار آنے لگا۔ اس پر یہ حقیقت واضح ہوتی لگی کہ فقط اللہ کا ذکر ہی دلوں کو اطمینان دیتا ہے۔ اس کی روح پر اللہ کی تجلیات نازل ہونے

لگیں۔ اسے یوں محسوس ہوتا جیسے وہ منزل یقین کی طرف بڑھ رہا ہے اور منزل ابھی دور ہے۔ تجلیات ربانی نے اس کے دل و دماغ کو ضو بار کر دیا اور اس کے دل میں حج بیت اللہ اور روضہ رسول کی زیارت کی تمنا جلوہ ریز ہونے لگی۔ اس نے سامان سفر پر غور کیا۔ اُس کے پاس ایک پیالے اور توشہ دان کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ وہ اس شان سے حج بیت اللہ کیلئے روانہ ہوا کہ اس کے پاؤں ننگے تھے پیالے میں پانی پیتا اور توشہ دان میں کچھ موجود ہوتا تو ایک دو لقمے کھا لیتا ورنہ کئی کئی دن فاقے سے کٹ جاتے۔ دنوں کو روزہ رکھتا اور دوران سفر میں ہر منزل پر جہاں بھی رات گزارتا پوری رات یادِ خدا میں بسر کر دیتا۔

بالآخر حج بیت اللہ کی سعادتوں کو سمیٹنے کیلئے منزلِ حق کا یہ مسافر مکہ مکرمہ پہنچ ہی گیا۔ وہاں وہ تجلیات ربانی میں کھویا رہتا۔ طواف کرتا اور پھر خدا کے گھر کو تکتے تکتے دن سے رات کر دیتا۔ سچی توبہ اپنا رنگ دکھا رہی تھی۔ ایک وقت کا گنہگار اور راندہ درگاہ موسیٰ بن محمد اب عارف کامل اور خدا کا محبوب بندہ بن چکا تھا۔ اب لوگ اس کی زیارت کیلئے آتے۔ دل میں خیال آیا کہ خدا کا گھر دیکھ لیا، اس کے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کا گھر دیکھ لیا، اب اور کیا چاہئے؟ کیوں نہ مکہ مکرمہ ہی کو مستقل طور پر اپنا ٹھکانہ بناؤں تا کہ گذشتہ گناہوں کا کفارہ بھی ادا ہوتا رہے اور بقید زندگی رحمت الہی کے پُر انوار سایوں میں بسر ہو جائے۔ چنانچہ وہ مکہ ہی میں مستقل طور پر رہائش پذیر ہو گیا۔ بیت اللہ کے سامنے بیٹھا رہتا اور لوگوں سے اپنی خطاؤں کی معافی طلب کرتا۔ خواہ اس نے کسی کا نقصان کیا ہوتا یا نہ کیا ہوتا، یہ ہر ایک سے رورور معافی کا طالب ہوتا، جب بھی دل بے چین ہوتا وہ بیت اللہ کے روبرو آ جاتا اور گریہ و زاری کرتے ہوئے غلافِ کعبہ کو تھام کر عرض کرنے لگتا:

اے رب کریم مجھے معاف فرما دے، میں نے زندگی بھر کوئی نیک کام نہیں کیا، میری گذشتہ زندگی رائیگاں گزر گئی، مجھ سے کوئی نیک کام نہ ہو سکا، میں جب حشر میں لایا جاؤں گا تو میرا نامہ اعمال سیاہ ہوگا، تیری رحمت کے علاوہ میرا کوئی سہارا نہیں ہے، بس تیری رحمت ہی مجھے درکار ہے۔ مجھ سے درگزر فرما، اے سارے زمانے کو فیضیاب کرنے والے مجھے اپنی رحمت سے محروم نہ رکھ۔

اس کا رونا سن کر دوسرے افراد بھی رونے لگتے۔ اس کی آواز میں بلا کا درد تھا۔ وہ خود کو گنہگار رکھنا چاہتا تھا مگر جب ایک گنہگار کو بچے میں اس کی وفات ہوئی تو اولیائے مکہ نے خواب میں

دیکھا کہ منادی کرنے والا کہہ رہا ہے کہ کل میرے ایک دوست کا جنازہ اٹھایا جائے گا جو اس کے جنازے میں شریک ہوگا وہ بخشش خداوندی کا حق دار ٹھہرے گا۔ اور پھر گمنام زندگی بسر کرنے والے کا جنازہ اٹھا تو چشم فلک دیکھ کر حیران رہ گئی کہ اس کے جنازہ میں شرکت کیلئے پورا مکہ ہی اُٹھ آیا تھا۔ حق یہ ہے کہ توبہ ہو تو ایسی ہو کہ جس پر زمانہ رشک کرے۔

گناہوں پر جسے توبہ کا لطف عام ملتا ہے
اُسے ہی رحمت کونین کا پیغام ملتا ہے
جسے اپنی خطاؤں پر عذامت ہر گھڑی آئے
اسے اللہ کی بخشش کا توری جام ملتا ہے



سلطان محمود غزنوی

ایک پُر وقار شخصیت

اس وقت ہمارے سامنے یمن الدولہ سلطان محمود غزنوی کی شاندار شخصیت ہے۔ اس بت شکن کہلانے والے محمود کو تاریخ میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔ اسلام کا یہ بطل جلیل راجگان ہند کو ایک عبرت ناک شکست دینے اور باطل کے ظلم کو پارہ پارہ کر دینے کیلئے اٹھا تھا۔ محمود ایک نیک دل، نیک سیرت اور خدا ترس حکمران تھا۔ اس کے حملوں کا مقصد مال و زر کی ہوس نہیں تھی بلکہ یہ ہندوستان کے راجوں اور مہاراجوں کو ان کی بد عہدیوں، بد اعمالیوں اور بد کرداریوں کی سزا دینے کیلئے آیا کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے ہندوستان کے کسی بھی علاقہ کو اپنی سلطنت میں شامل نہ کیا، حالانکہ اگر وہ چاہتا تو بخوبی ایسا کر سکتا تھا۔

اس وقت محمود کی افواج لاہور، نگرکوٹ، ملتان اور مٹھرا کی تسخیر کے بعد قنوج پر حملہ آور ہیں۔ قنوج کے راجہ کے لشکر میں پانچ لاکھ پیادہ اور تیس ہزار سوار ہیں۔ سلطان کا لشکر صرف ایک لاکھ جانباز اور جانثاروں پر مشتمل ہے۔ قنوج کی افواج قلعہ بند ہیں۔

شام کا وقت ہے، سلطان نماز پڑھ کر اپنے خیمہ میں بیٹھا ہوا ہے۔ فوج کے سپاہی کل کو لڑی جانے والی جنگ کیلئے تیاری کر رہے ہیں۔ دو سپاہی ایک بوڑھے آدمی کے ساتھ خیمہ کے اندر داخل ہوتے ہیں اور سلطان کے سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

سلطان نے نظر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا ”کیا کام ہے؟“

ایک سپاہی نے کہنا شروع کیا ”عالی جاہ! ہم لشکر کے گرد گھوم رہے تھے کہ یہ بوڑھا ہمیں اس طرف دکھائی دیا۔ ہم نے اس سے متعدد سوالات کئے مگر یہ صرف یہی کہتا رہا کہ مجھے سلطان کے پاس لے چلو، یہ بہت گھبرایا ہوا معلوم ہوتا ہے۔“

سلطان نے بوڑھے کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا، وہ کچھڑ میں لت پت تھا اور کانپ رہا تھا۔ سپاہیوں کو باہر جانے کا اشارہ کر کے سلطان نے بوڑھے سے کہا۔

”بیٹھ جاؤ“ (بوڑھا بیٹھ گیا)

سلطان نے کہا: آپ ہندو معلوم ہوتے ہیں۔

جی ہاں۔ بوڑھے نے جواب دیا۔

سلطان: ”اور آپ اسی علاقہ کے رہنے والے ہیں؟“

بوڑھا: ”ہاں عالی جاہ!“

سلطان: ”اب کہو مجھ سے کیا چاہتے ہو؟“

بوڑھا: ”میں آپ سے امداد کا خواستگار ہوں۔“

سلطان: ”تعجب ہے کہ جب تمہیں معلوم ہے کہ ہم تم سے جنگ کرنے کیلئے آئے ہیں تم

امداد کے طالب ہو۔“

بوڑھا: جب ایک انسان اپنوں سے مایوس ہو جاتا ہے تو غیروں کی طرف رجوع کرتا ہے۔

یہاں سے تین میل دور شمال کی جانب ایک بستی ہے، میں وہاں کا نمبردار ہوں، میری بیوی فوت ہو چکی ہے، اسکی نشانی دو بچے ہیں۔ ایک لڑکا اور ایک لڑکی۔

دونوں جوان ہیں، لڑکا فوج میں ہے، لڑکی کی منگنی کر چکا ہوں، مگر آہ! یہاں کا دلی عہد شیوہر بہت ظالم ہے، ملک کی جو بھی خوبصورت لڑکی اس کی نظر پڑتی ہے اسے بالجبر اپنی ہوس پرستی کا شکار بنا لیتا ہے، ان دنوں میری لڑکی نرملہ کے درپے ہے۔ آج پچھلے پہر جب میرا لڑکا اور نوکر قلعہ میں تھے وہ میدان خالی دیکھ کر ہمارے گھر تین چار غنڈوں کے ساتھ گھس آیا اور مجھے باہر نکال دیا۔ میں بھاگ کر آپ تک پہنچا ہوں۔“

سلطان (غصہ سے) تف ہے ایسے نالائق ولی عہد پر جس کے ملک میں کل فیصلہ کن جنگ لڑی جانے والی ہے مگر وہ عیش میں مست ہے۔

بوڑھا: ”(روتے ہوئے) عالی جاہ! اب آپ سمجھ گئے ہوں گے میں کیوں آپ کے پاس آیا ہوں۔ اگرچہ ہمارا حکمران بہت نیک ہے مگر اس وقت دادخواہی کیلئے اس تک رسائی انتہائی مشکل تھی۔“

سلطان: ”فکر نہ کرو اگرچہ تم مسلمان نہیں ہو، میرے مخالف ہو، مگر میں ضرور تمہاری مدد کروں گا۔“

بوڑھا: ”(منت سے) حضور! جلدی کیجئے کہیں میری لڑکی ان درندوں کا شکار نہ ہو جائے۔“

سلطان: (اٹھ کر ایک غلام سے) ”جاؤ میرا گھوڑا لاؤ۔“

گھوڑا لایا جاتا ہے۔ سلطان سوار ہو کر غلام کو بھی ایک اور گھوڑے پر ساتھ چلنے کا حکم دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے:

”جناب والا! کہیں یہ دشمن کی چال ہی نہ ہو خدا نخواستہ.....“

سلطان: (جوش سے) ”ہٹ جاؤ تم میرے ساتھ نہیں جا سکتے تم نہیں جانتے کہ ایک دوشیزہ کی عصمت محمود کی جان سے زیادہ قیمتی ہے۔“ ایک اور سپاہی کو ساتھ چلنے کا حکم دیتا ہے اور اگلے ہی لمحہ دونوں گھوڑے ہوا سے باتیں کر رہے ہیں

رات کا اندھیرا ہر سو پھیل چکا ہے۔ سلطان اور سپاہی گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتے ہوئے گاؤں میں پہنچ جاتے ہیں۔ گاؤں پر خاموشی طاری ہے۔ دونوں ایک طرف سے گزر رہے ہیں کہ انہیں بلند آوازیں سنائی دینے لگتی ہیں، ٹھہر جاتے ہیں۔

”تمہیں میرے سامنے جھکنا پڑے گا“ ایک تحکمانہ آواز سنائی دی۔ ”ذلیل کتے تم مجھے نہیں چھو سکتے“ ایک کپکپاتی جوش بھری نسوانی آواز تھی ”تمہیں اچھی طرح معلوم ہے میں ولی عہد ہوں، جوان ہوں، خوبصورت ہوں، میرے ساتھ آدمی ہیں تم اکیلی ہو“ پہلی آواز پھر سنائی دی ”ہاں تم سب کچھ ہو مگر انسان نہیں ہو“ عورت کی آواز تھی۔

پھر انہیں ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے آگے بڑھنا چاہا، پھر اس کے سر پر کسی چیز کے پڑنے کی آواز آئی اور اگلے ہی لمحہ غصہ سے بے قابو ولی عہد کی آواز سنائی دی۔ ”دیکھتے کیا ہو سیدھا کر دو“۔ سلطان میں صبر کی ہمت نہ رہی، شمشیر برہنہ ہاتھ میں لے کر سپاہی کو دروازہ میں ٹھہرا کر اندر داخل ہوا، تین بدصورت آدمی ایک عورت کی طرف بڑھ رہے تھے اور وہ آہستہ آہستہ پیچھے ہٹ رہی تھی۔ ”ٹھہر جاؤ“! سلطان نے گرج کر کہا۔

ایک نے تلوار اٹھانے کی کوشش کی مگر سلطان کی تلوار نے اسے مہلت نہ دی اور ٹھنڈا کر دیا۔ سب پر اس افغان کا رعب طاری ہو چکا تھا۔ سلطان آگے بڑھا، لڑکی کو بازو سے پکڑا اور جب دروازے کے قریب آیا تو شیوہر نے غصہ سے کہا:

”تم ان افغانوں کی سر پھری فوج کے ایک سپاہی معلوم ہوتے ہو جو ہماری راجدھانی پر حملہ کرنے کیلئے قضا مول لے کر آئی ہیں۔ صبح کا سورج تمہاری زندگی کا آخری سورج ہوگا۔ کان کھول کر سن لو میرا نام شیوہر ہے اور میں یہاں کا ولی عہد ہوں۔ نرملہ جہاں کہیں بھی ہوگی وہ برآمد کر لی جائے گی اور تمہیں اس جنسارت کا بدلہ مل کر رہے گا۔“

سلطان مسکرایا اور کہا ”جس ملک کے تم جیسے ولی عہد ہوں وہ ملک کبھی بھی سلامت نہیں رہ سکتا۔“

باہر نکل کر سلطان نے لڑکی کو گھوڑے پر بٹھایا اور لشکر میں لا کر اس کے باپ کے حوالے کر دیا۔

اکلی صبح سلطان کی فوج نے صفوں کو درست کرنا شروع کر دیا۔ سلطان خود فوج کو ہدایات دے رہا تھا۔ ابھی قلعہ بند فوج پر کسی کاری ضرب لگانے کے متعلق سوچا ہی جا رہا تھا کہ قلعہ کا بھاری دروازہ کھلا اور ایک آدمی صلح کا جھنڈا لہراتے آتا ہوا دکھائی دیا، قریب آیا، سلطان کے سامنے جھکا اور کہا: ”ہمارے راجہ نے بجائے جنگ و جدل کے آپ کی اطاعت قبول کر لی ہے اور یہ ہیں شہر کی چابیاں۔ ہمیں اُمید ہے کہ شہریوں کو مکمل امان دی جائے گی۔“

یہ مسرت افزاء خبر سن کر لشکر نے اللہ اکبر کا ایسا نعرہ بلند کیا کہ شہر کے در و دیوار تھرا اُٹھے۔

.....○.....

سلطان فاتحانہ انداز سے شہر کے اندر داخل ہوا۔ اہل شہر کو مکمل امان دی گئی۔ پہلے ہی راجہ کو برقرار رکھا گیا اور سپاہیوں کو کسی چیز کے لوٹنے کی قطعاً ممانعت کر دی گئی۔

امرائے شہر نے رسم کے مطابق سلطان کی خدمت میں تحائف پیش کرنے شروع کئے۔ ایک شخص نام پکارتا جا رہا تھا۔ جب ولی عہد شیوہر کا نام بولا گیا تو سلطان نے نظر اٹھا کر اس کی سمت دیکھا۔ شیوہر شاندار لباس پہنے چہرے کو سجائے چھوٹا سا تاج سر پر رکھے ایک ادا کے ساتھ قدم اٹھاتا اپنا تحفہ لئے مسند کی جانب آتا دکھائی دیا۔ جب وہ سلطان کے بالکل قریب آ گیا تو سلطان اس کی طرف دیکھ کر معنی خیز انداز سے مسکرایا۔ شیوہر نے بھی سلطان کی طرف دیکھا۔

یہ کیا.....!! یہ تو وہی افغان معلوم ہوتا ہے جس نے رات کے وقت نرملا کو اس کے بچہ ہوں سے چھڑایا تھا۔

سلطان نے ہولے سے کہا: ”شیوہر! میں تمہارے سامنے حاضر ہوں، میری جسارت کی جو سزا دینا چاہتے ہو دے لو۔“

شیوہر کانپ گیا

”شیوہر تم اپنے معاملہ میں کیا کہنا چاہتے ہو؟“ سلطان نے دریافت کیا۔

شیوہر پھر خاموش رہا، سلطان نے کہا: ”معلوم ہوتا ہے تم قصور وار ہو اور کچھ نہیں کہنا

چاہتے۔ میں تمہارا مقدمہ تمہارے باپ کی عدالت میں پیش کرتا ہوں۔ پھر سلطان راجہ اور درباریوں کی طرف مڑا اور بلند آواز سے راجہ سے کہا:

”مہاراج رات کے وقت میں نے دیکھا کہ آپ کے ولی عہد شیوہر ایک دوشیزہ دام ہوس کا شکار بنا رہے ہیں لیکن میں نے عین وقت پر خدا کی مہربانی سے لڑکی کو بچا لیا یہ لڑکی آپ کی رعایا ہے آپ ملکی قانون کے تحت فیصلہ دیجئے۔“

راجہ کا سرندامت سے جھکا جا رہا تھا۔ اس نے سر اٹھایا اور کہا ”عالی جاہ! میں نے آپ کا قانون تسلیم کر لیا ہے میرا قانون ختم ہو گیا“ فیصلہ کرنا آپ کا کام ہے۔“

سلطان یہ سن کر فوراً اٹھا اور گرجدار آواز سے کہنا شروع کیا:

”ہمارے مذہب میں اس کی سزا تو بہت سخت ہے مگر میں ولی عہد شیوہر کے ساتھ رعایت کرتا ہوں اسے نرملا کے ساتھ شادی کرنا پڑے گی۔ اس نے ایک بے گناہ اور معصوم لڑکی کو داغدار کرنے کی کوشش کی ہے اب کوئی دوسرا شخص اسے قبول نہیں کرے گا۔ میں چاہتا ہوں کہ اپنی روائگی سے قبل شادی کا نظارہ خود دیکھوں آج پچھلے پہر شادی ہوگی۔“

○

شیوہر اور نرملا کا بیاہ بڑی دھوم دھام سے ہوا۔ سلطان خود بھی بیاہ میں شریک ہوا۔ جب شادی کی تمام رسومات ختم ہو گئیں تو سلطان آگے بڑھا نرملا کے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا:

”بیٹی! میں نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے جب کبھی تکلیف ہو تو اپنے پٹھان باپ کو نہ بھولنا۔“

اس کے جواب میں نرملا کی نرگسی آنکھوں سے آنسو بہ نکلے یہ آنسو عقیدت اور محبت کے آنسو تھے۔



نیکی اور بدی کے دو کردار

واتل علیہم نبا ابنی ادم بالحق اذ قربا قربانا فتقبل من احدہما ولم يتقبل من الاخر ط قال لا قتلک ط قال انما يتقبل اللہ من المتقین۔

پو پھٹ رہی تھی، تاریکی کا پردہ چاک ہوتا جا رہا تھا، ہر چیز اب صاف نظر آنے لگی تھی۔ جہاں رات کی تاریکیوں کا بسیرا تھا، وہاں اب صبح کی آمد آمد تھی۔ وہ کافی دیر سے ایک چٹان پر بیٹھا گردو پیش سے قطعاً بے نیاز کسی گہری سوچ میں غرق تھا۔ اس کی آنکھوں میں سرخی دکھائی دے رہی تھی، جس سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ رات بھر کسی خاص بات پر غور کرتا رہا ہے۔ یکا یک اس نے خود سے دریافت کیا: آخر مجھے کیا کرنا چاہیے؟

قائیل! سوچنے سے کچھ نہیں بنے گا، یہ اس کے اندر کی آواز تھی، تم اقلیما کے بارے میں سوچتے ہی رہ جاؤ گے اور وہ کسی اور کی ہو جائے گی۔ اقلیما تمہاری ہے اور تمہاری ہی رہے گی۔ مگر ابا جان کا حکم؟..... اس کے جذبات سرد پڑ گئے۔ واہ! ابا جان تو مجھ سے نفرت کرتے ہیں، تبھی تو وہ یسودا کے ساتھ میری شادی کر دینا چاہتے ہیں اور پھر یسودا کا خیال آتے ہی اس کے دل میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ اقلیما میرے ساتھ پیدا ہوئی ہے تو کیا ہوا۔ یسودا کی۔ جس کے ساتھ میری شادی ہونے والی ہے، اقلیما کے مقابلہ میں کیا حیثیت ہے۔ اقلیما آفتاب ہے تو یسودہ ذرہ۔ ایک دن ہے تو دولتری رات۔

میں اقلیما کو ہر قیمت پر حاصل کروں گا خواہ مجھے اس کے لئے بغاوت ہی کرنا پڑے۔ ہاں بغاوت!..... اس نے ڈہرایا اس کی رگیں تن گئیں، اس نے اپنے بازوؤں کی اُبھرتی ہوئی مچھلیوں اور کوہ وقار سینہ کی جانب فخر سے دیکھا۔ باپ سے بغاوت، مذہب سے بغاوت، میں کروں گا۔ ہائیل کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ اقلیما کے ساتھ شادی کرے۔ طاقت والے قانون خود وضع کرتے ہیں اور ابا جان تو میرا حق چھین کر ہائیل کو دینا چاہتے ہیں..... اور پھر وہ گھر کی طرف چل دیا۔

.....○.....

ہر طرف سناٹا سا طاری تھا، قدرت کی شہکاریاں اور فن کاریاں تو تھیں مگر ان کا نظارہ کرنے والا کوئی نہ تھا۔ آخر قدرت نے انسان کی پیدائش کے تمام سامان مکمل کر لئے۔ خطہ عرب کے میدانِ عرفات کے اندر طویل جدائی کے بعد حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا علیہا السلام کا ملاپ ہو چکا تھا۔ خدائے دو جہاں کی مشیت سے آدم علیہ السلام سے حضرت حوا کے ہاں جڑواں بچے پیدا ہونے لگے جن میں ایک لڑکی ہوتی تھی اور ایک لڑکا۔ ان کو خدا کی طرف سے یہ حکم دیا گیا تھا کہ جب یہ جوان ہو جائیں تو لڑکے کی شادی اس کی بہن کے علاوہ جو اس کے ساتھ پیدا ہوئی ہو کسی اور لڑکی کے ساتھ کر دی جائے۔ آپ اسی فرمان پر عمل کرتے رہے جس کے نتیجہ میں بے شمار جوڑے اس کرہ ارضی پر آباد ہو گئے۔ معمول کے مطابق ایک روز ان کے ہاں قابیل اور اس کے ساتھ ایک لڑکی اقلیما پیدا ہوئی۔ اقلیما بہت ہی حسین خوبصورت اور نازک اندام تھی۔ اس کے چند ہی دنوں بعد ہابیل اور یسودا پیدا ہوئے۔ یسودا اقلیما جتنی خوبصورت نہ تھی بلکہ سانولے رنگ کی تھی۔

حضرت آدم علیہ السلام نے ارادہ کیا کہ قابیل کی شادی یسودا ساتھ اور ہابیل کی اقلیما کے ساتھ کر دی جائے۔ جب قابیل کو اس شادی کرنے کا پتہ چلا تو اس نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ میری شادی ہر صورت میں اقلیما کے ساتھ ہوگی۔

اب نازک صورتحال پیدا ہو گئی۔ آج تک کسی نے بھی ان کے حکم سے سرتابی کی جرأت نہیں کی تھی۔ یہ حضرت آدم علیہ السلام کا ہی حکم نہیں تھا بلکہ عین منشاء قدرت تھی جس سے روگردانی کرنا ناممکن تھا۔ آج قابیل فیصلہ کر چکا تھا کہ وہ ہر صورت میں اقلیما کو حاصل کر کے رہے گا۔ حضرت آدم علیہ السلام نے سوچا کہ قابیل کی شادی تو بعد میں ہوگی پہلے ہابیل کی شادی اقلیما کے ساتھ کر دی جائے۔ جب قابیل کو آپ کے اس ارادہ کے بارے میں معلوم ہوا تو فوراً آپ کے پاس پہنچا اور کہنے لگا ”ہابیل کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ اقلیما کے ساتھ شادی کرے اور اس کے بدلہ میں اپنی بدصورت بہن کو میرے نکاح میں دے دے۔“

حضرت آدم علیہ السلام نے فرمایا ”ہم فرمان الہی کے پابند ہیں تمہارے ماننے یا نہ ماننے سے فرمان الہی کو ٹالا نہیں جاسکتا“ میں کسی صورت میں بھی تمہاری شادی اقلیما کے ساتھ نہیں کر سکتا۔“ قابیل کیلئے یہ جواب بہت ہی سخت تھا، اس نے غصہ میں آکر کہا ”میں دیکھوں گا کہ ہابیل کس طرح اقلیما کے ساتھ شادی کرتا ہے۔ میں ہابیل کو قتل کر دوں گا“ حضرت آدم علیہ السلام نے سوچا کہ کہیں یہ سچ ہی فساد نہ کر بیٹھے چنانچہ اسے حلیمی سے سمجھایا..... قابیل! خدا کا خوف کرو، خدا

کی پکڑ بڑی سخت ہے، وہ اپنے حکم سے سرتابی کرنے والوں کو کبھی بھی معاف نہیں کرتا، مشیت ایزدی سے منہ موڑنے والوں کا اس دنیا میں کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔ اگر تم اس پر اڑے رہے تو مجھے ڈر ہے کہ کہیں تم پر خدا کا عذاب نہ ٹوٹ پڑے سوچ سمجھ کر قدم اٹھاؤ۔ جاؤ! اور ٹھنڈے دل سے اس معاملہ پر غور کرو شاید تم صحیح راہ پر چل نکلو“

قائیل نے جو حضرت آدم علیہ السلام کو نرم ہوتے دیکھا تو اور گرم ہو گیا ”میرا یہ فیصلہ اٹل ہے اور میں اس فیصلہ سے کبھی بھی دستبردار نہیں ہو سکتا۔ میں اقلیما سے شادی ضرور کروں گا“..... حضرت آدم علیہ السلام نے پھرے ہوئے قائل کو دیکھا اور پھر ایک خیال آتے ہی اُن کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ قائل اور ہاتیل! کل تم دونوں اپنی اپنی قربانیاں بارگاہ ایزدی میں حاضر کرو۔ تم میں سے جو صحیح راہ پر ہوگا اس کی قربانی قبول ہو جائے گی۔ جاؤ اور اپنی اپنی قربانیوں کا بندوبست کرو تا کہ حق و باطل میں امتیاز ہو سکے۔“

اس شرط پر قائل نے بھی سر جھکا لیا اور باہر نکل گیا۔



اس زمانہ میں یہ دستور تھا کہ جس شخص کے متعلق یہ فیصلہ کرنا ہوتا تھا کہ وہ راہِ راست پر ہے یا نہیں، تو اُس کی قربانی ایک میدان میں رکھ دی جاتی تھی۔ آسمان سے آگ سی نمودار ہوتی تھی۔ اگر وہ آگ اس قربانی کو بھسم کر ڈالے تو سمجھا جاتا تھا کہ وہ شخص مقبول خدا ہے اور اس کے ارادے نیک ہیں۔ اگر آگ اس قربانی کو نہ جلاتی تو اُسے اس شخص کی بے ایمانی کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام نے بھی شادی کے جھگڑے کا فیصلہ کرنے کیلئے دونوں کو قربانی کا حکم دیا تھا۔

آج قربانی کا دن تھا، ہاتیل کے پاس بے شمار بھیڑ بکریاں تھیں۔ چنانچہ اس نے ایک عمدہ سی بھیڑ قربانی کے لئے منتخب کی۔ ہاتیل کے دل میں خلوص تھا، وہ حضرت آدم علیہ السلام کے حکم کا ہر حالت میں پابند تھا۔ اس کے مقابلہ میں قائل کے دل میں حسد و رقابت کی آگ جل رہی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ ہاتیل چونکہ مسکین طبیعت، عاجزی پسند اور منکسر المزاج ہے اور اسے زیادہ شعور بھی نہیں ہے اس لئے وہ دربار خداوندی میں بھی مقبول نہیں ہو سکتا۔ اس نے بے ادبی سے گندم کی ایک بوری چنی اور اسے لے کر قربان گاہ میں آ گیا۔

ہاتیل اور قائل دونوں نے اپنی اپنی قربانیاں بارگاہ خداوندی میں پیش کر دیں۔ حضرت آدم علیہ السلام اپنی تمام اولاد کے ساتھ وہاں موجود تھے۔ اچانک ایک زوردار گڑ گڑاہٹ کی آواز سنائی

دی۔ سب کے دل دہل گئے۔ بجلی سی کوندی، آگ کا ایک طویل و عریض شعلہ لپکا اور اگلے ہی لمحہ سب نے دیکھا کہ ہابیل کا مینڈھا قربان گاہ سے غائب ہو چکا تھا مگر قابیل کی گیبوں کی بوری جوں کی توں پڑی ہوئی تھی..... دیکھا تم نے؟

حضرت آدم علیہ السلام نے قابیل کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا، اگر تمہارے دل میں خلوص ہوتا اور تم نیک نیت اور صحیح راہ پر ہوتے تو یقیناً تمہاری قربانی قبول ہو جاتی، قابیل سب کے سامنے اپنی تذلیل برداشت نہ کر سکا۔ اس نے..... حضرت آدم علیہ السلام کے ہاتھ کو پرے ہٹایا اور..... ہونٹ سکڑ لئے۔

.....O.....

اور پھر اسی روز شام کو وہ ہابیل سے چراگاہ میں کہہ رہا تھا ”ہابیل! میں تمہیں قتل کر دوں گا“ لیکن بھائی جان میں نے آپ کا کیا بگاڑا ہے؟..... ”ہوں۔ تمہارا جرم یہی ہے کہ تمہاری قربانی کیوں قبول ہوئی۔“

تو یہ بات ہے بھائی جان..... خدا کی قسم اس میں میرا کیا قصور ہے۔ اللہ تعالیٰ صرف اُن لوگوں کی قربانی قبول کرتا ہے جو راہِ راست پر ہوتے ہیں اور جن کے دل کبر و حسد اور دشمنی سے یکسر پاک ہوتے ہیں۔“

”ہابیل! خواہ کچھ بھی ہو، میں اپنے اپنی ہاتھوں سے تمہاری گردن ضرور مروڑ دوں گا۔“ قابیل نے اپنے ہاتھوں کو حرکت دیتے ہوئے لال لال آنکھیں پھاڑ کر کہا۔

”بھائی جان!..... ہابیل نے حلیمی سے جواب دیا: میں آپ پر ہاتھ نہیں اٹھاؤں گا خواہ آپ مجھے قتل کر دیں۔ میں جانتا ہوں کہ اگر آپ نے حسد سے مغلوب ہو کر مجھے قتل کر بھی ڈالا تو پھر آپ پر خدا کا غضب نازل ہوگا اور گنہگار و مغضوب کا ٹھکانہ دوزخ کے علاوہ اور کہیں بھی نہیں ہے۔“

ہابیل کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ قابیل اسے قتل کر دے گا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ یہ سب باتیں اشتعال میں آ کر کہہ رہا ہے اور جب اس کا غصہ اُتر جائے گا تو وہ اپنے رویہ پر شرمسار ہوگا لیکن اگلے ہی روز جبکہ حضرت آدم علیہ السلام کہیں دور تشریف لے گئے تھے اور ہابیل سویا ہوا تھا تو قابیل نے ایک بڑا سا پتھر اٹھایا اور اسے ہابیل کے سر پر دے مارا۔ ہابیل نے ایک چیخ ماری، تھوڑی دیر تڑپا اور پھر ہمیشہ کیلئے خاموش ہو گیا۔ اب قابیل کے سامنے سوال یہ پیدا ہوا کہ لاش کہاں چھپائے۔ یہ تختہ ارضی پر پہلا قتل تھا، اس کے قبل لوگ قتل کے حقیقی مفہوم سے بھی

نا آشنا تھے۔ اس نے لاش کو کاندھے پر اٹھایا اور بھاگ نکلا۔ سورج نصف النہار پر پہنچ چکا تھا، گرمی سے برا حال تھا، اس کی سانس اُکھڑ چکی تھی اور خیالات اس قدر پریشان تھے کہ وہ اس بار سے چھٹکارا پانے کے بارے میں کچھ بھی نہ سوچ سکا۔ ادھر ادھر مارا مارا پھرتا رہا۔ اچانک اس کی نگاہ دو کووں پر پڑی جو لڑ رہے تھے۔ ایک نے دوسرے کو مار ڈالا، اپنی چونچ سے چھوٹا سا گڑھا کھودا اور پھر وہیں مردہ کوٹے کو دفن کر کے زمین برابر کر دی۔ یہ دیکھ کر قابیل کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ اُس نے بھی گڑھا کھودا اور ہابیل کو اس میں رکھ کر اوپر مٹی ڈال دی۔

.....O.....

اب وہ ایک انجانی سمت کی طرف بڑھ رہا تھا مگر اکیلا نہیں تھا بلکہ اب اس کے ساتھ اقلیم بھی تھی۔ قتل کرنے کے بعد اب اس کا بستی میں رہنا ناممکن تھا۔ انہیں متواتر چلتے ہوئے دو دن اور دو راتیں ہو چکی تھیں۔ دونوں تھکاوٹ سے چور ہو کر ایک چشمے کے کنارے ٹھہر گئے۔ قابیل نے کپڑے سے کھانا نکالا اور ابھی پہلا لقمہ ہی کھانے پایا تھا کہ اُسے آواز سنائی دی۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ایک بوڑھا جو اس کیلئے بالکل اجنبی تھا اور جس نے جسم پر لمبا سا لبادہ اوڑھ رکھا تھا اور جس کے ہاتھ میں لمبا سا عصا تھا، اُس سے کہہ رہا تھا ”شاباش قابیل! تم نے واقعی ایک عظیم کارنامہ کر دکھایا۔“

”مگر تم کون ہو“.....؟ قابیل کی نظریں اس کے چہرے پر جم گئیں ”میں کوئی بھی ہوں تمہیں اس سے کیا، میں تمہاری ہمت کی داد دیتا ہوں“..... مگر تمہیں نہیں معلوم کہ مجھے اس کیلئے ایک جرم کا ارتکاب کرنا پڑا ہے“.....؟ ”میں جانتا ہوں کہ اس کیلئے تمہیں معصوم بھائی کو قتل کرنا پڑا مگر تم جانتے ہو تمہاری قربانی کیوں قبول نہیں ہوئی؟“

قابیل سراپا استعجاب بن کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ ”اُس کی وجہ یہ تھی کہ ہابیل آگ کی پرستش کرتا تھا، وہ سب سے چھپ کر چراگاہ میں آگ جلا کر اس کی پرستش کیا کرتا تھا اسی لئے آگ نے اس کی قربانی قبول کر لی“..... ”واقعی“.....؟

”ہاں!..... اور تمہارے گناہ بھی معاف ہو سکتے ہیں تم بھی ایک عظیم انسان بن سکتے ہیں مگر اس کیلئے تمہیں آگ کی پرستش کرنا پڑے گی۔ مجھے دیکھو میں آگ کی پرستش کرتا ہوں اور یہ دیکھو میری طاقت“۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہاں آگ پیدا ہو گئی۔ ”جھک جاؤ اس آگ کے سامنے“ اجنبی بوڑھے نے ہاتھ پھیلا کر کہا: قابیل جھک گیا، دیکھتے کیا ہو؟ جھک جاؤ تمہاری قربانی بھی قبول ہو سکتی ہے اور پھر اگلے ہی لمحہ قابیل نے آگ کے سامنے سر جھکا دیا۔

○

قائیل دنیا میں سب سے پہلا قاتل آگ کے سامنے جھکا ہوا تھا اور بوڑھا ابلیس اس آنے والے دور کو دیکھ رہا تھا جس میں قائل کی اولاد آگ کی پرستش کرنے کے ساتھ ساتھ شرک و فسق و گناہ کے سمندروں میں ڈوبی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ ”میں انتقام لوں گا اولادِ آدم سے خوفناک انتقام..... ابلیس بڑ بڑایا اور غائب ہو گیا۔“



خواجہ محمد عمر عباسی قادری رحمۃ اللہ علیہ

سلسلہ عالیہ قادریہ کے مہر منیر حضرت خواجہ محمد عمر عباسی قادری رحمۃ اللہ علیہ ۱۸۶۲ء بکری میں ضلع گوجرانوالہ کے ایک گاؤں مان میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ماجد حضرت خواجہ محمد جیون رحمۃ اللہ علیہ نہایت پارسا، خدا ترس اور صاحب سلوک شخصیت تھے جبکہ آپ کی والدہ ہمہ وقت ذکر خداوندی میں محو رہنے والی خاتون تھیں۔ یہ انہی محترم والدین کی دعاؤں کا اثر تھا کہ ان کے فرزند جلیل خواجہ محمد عمر قادری رحمۃ اللہ علیہ مطلع رشد و ہدایت پر نجم تاباں کی صورت طلوع ہوئے۔ جب خواجہ محمد عمر پیدا ہوئے تو آپ کی والدہ محترمہ کثرت ریاضت و عبادت سے نحیف ہو چکی تھیں اس لئے پرورش کی غرض سے آپ کو برادر بزرگوار فخر الاسخیا حضرت سخی احمد یار قادری کی اہلیہ محترمہ کی گود میں دے دیا گیا۔ یہی فخر الاسخیا تھے جنہوں نے خواجہ محمد عمر قادری کے شیخ طریقت کی حیثیت سے انہیں ذوق پرواز بخش کر عالم لاہوت کا شاہین بنا دیا۔

خواجہ محمد عمر قادری رحمۃ اللہ علیہ ابھی پانچ برس ہی کے تھے کہ والد ماجد انتقال فرما گئے۔ عظیم والد کے سائے سے محرومی کے باوجود آپ نے حصول تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔ اوائل عمر ہی میں قرآن مجید ناظرہ پڑھ لیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ دیگر علوم و فنون سے آشنائی حاصل کر لی۔ آپ بچپن ہی سے خلوت پسند اور عبادت کی طرف مائل تھے۔ دل میں یاد خداوندی کی تجلیات ضوئیں رہتیں۔ آپ کی روشن پیشانی سے آپ کی بلند مقامی کے آثار ہویدا تھے آپ کا لڑکپن یاد خدا کی طرف مائل رہنے اور احکام شرعیہ کو بجالانے کی ہر ممکن سعی کرنے کی بناء پر اس حقیقت کا غماز تھا۔

ع..... کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالے کی حنا بندی

آپ کی جوانی نہایت پاکیزہ اور صالحیت کی تصویر تھی آپ کے سامنے برادر بزرگ حضرت سخی احمد یار قادری رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت آسمان معرفت پر آفتاب کی صورت جگمگا رہی تھی۔ آپ کے بھائی بھی تھے اور آپ کی چاہتوں کا محور بھی۔ لہذا آپ نے بے اختیار ہو کر حضور فخر الاسخیا سے استدعا کی کہ مجھے بیعت فرمائیں۔ انہوں نے اس برادر خوش خصال کو کئی آزمائشوں سے گزارنے کے بعد

جب بیعت فرمایا تو خواجہ محمد عمر قادری کی دنیا ہی بدل گئی۔ کھانے پینے کا ہوش جاتا رہا، دنیاوی علاقے سے دل بیزار ہو گیا اور ہر وقت یاد خداوندی کی فکر دامن گیر رہنے لگی۔ یہ دیکھ کر حضرت فخر الاسخیا نے فرمایا کہ جب دنیا میں رہنا ہے تو پھر اس سے بھی تعلق ہونا چاہیے۔ شیخ کامل کا یہ ارشاد ہی آپ کی دنیاوی امور کی طرف رغبت کا باعث بن گیا۔ اس کے باوجود بھی زیادہ سے زیادہ وقت شیخ کامل کی راہنمائی میں رضائے خداوندی اور خوشنودی مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے حصول کیلئے صرف کرتے۔

خواجہ محمد عمر قادری کی زندگی عبادت و ریاضت سے عبارت تھی۔ شیخ و مرید کی راہنمائی میں بلند سے بلند مقام عطا ہو رہا تھا مگر پھر بھی یہی تمنا چل رہی تھی کہ مجھے اور آگے بڑھنا چاہیے۔ پیرو مرشد کے روکنے کے باوجود اصرار غالب آ جاتا۔ آپ کے سینے میں عشق خداوندی کا دھارا پھوٹ رہا تھا جو کہیں رکنے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔ اسی دوران میں مقام حقیقت کے ادراک کے سلسلہ میں ایک الجھن پیش آ گئی جو آپ کے شعور سے بالاتر تھی۔ آپ نے فخر الاسخیا سے الجھن کا حل دریافت فرمایا تو انہوں نے کہا کہ ابھی بچے ہو اس پر آپ نے عرض کیا ”حضرت آپ مجھے سمجھا دیجئے“ زیادہ سے زیادہ کیا ہوگا سوکھ کر کاٹنا ہو جاؤں گا۔“

آپ کا اتنا کہنا تھا کہ جسم سوکھنے لگا اور جسم و سر پر ایک بال بھی نہ رہا۔ حضرت نے فرمایا کہ ”بیٹا مجھے اسی بات کا خدشہ تھا، خیر مرضی مولا از ہمہ اولیٰ“

آپ کو مختلف طبیبوں، معالجین اور ویدوں کے پاس لے جایا گیا مگر بجائے صحت یابی کے مرض بڑھتا رہا۔ حتیٰ کہ معروف طبیب شکر داس نے کہا کہ آپ کا مرض بہت بڑھ گیا ہے اس لئے آپ کو گاؤں سے باہر دوسروں سے الگ رکھا جائے اور آپ کے خورد و نوش کا بھی علیحدہ بندوبست ہونا چاہیے۔ چنانچہ اس پر عمل ہونے لگا۔

آپ گاؤں سے باہر ایک مقام پر بیٹھے رہتے۔ اپنی حالت دیکھتے اور اسے خالق کی رضا سمجھ کر چپ ہو رہتے۔ ان ایام میں آپ کی زبان پر حضرت امام بوسیری رحمۃ اللہ علیہ کا تصنیف کردہ ”قصیدہ مضریہ“ ہر وقت جاری رہتا تھا، سوتے جاگتے اسی قصیدہ مبارک کا ورد کرتے رہتے۔ دل اس تمنا میں مچلتا رہتا کہ کاش وہ شرف مجھ کو عطا ہو جائے جو صاحب قصیدہ امام بوسیری کا مقصد بنا تھا۔ اور پھر اس خلوت کدہ آرزو کے چراغاں چراغاں ہونے کی ساعت آ پہنچی۔ یہ وہ ساعت ہے جس کی آرزو میں نجانے کتنے عشاق کی زندگیاں بیت گئیں۔ ایک دوپہر کو آپ شہتوت کے درخت کے نیچے بیٹھے قصیدہ مضریہ پڑھ رہے تھے۔ آنکھوں سے جوئے اشک رواں تھی اتنے میں بجانب مغرب

ایک شعلہ نور چمکا اور سلطان دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سواری پر تشریف فرما ادھر سے گزرے۔ ایک غلام ہمراہ تھا اس نے عرض کی:

”یا رسول اللہ! نگہ کرم فرمائیے یہ بھی ایک گنہگار ہے۔“

رحمت پناہ بے کساں علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کمال رحمۃ للعالمین سے ارشاد فرمایا:

”اگر یہ گنہگار ہے تو ہم نے معاف فرما دیا“

پھر حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی چادر مبارک کا ایک کونہ آپ کے گلو سے سر کی طرف لہرایا اور پھر محبوب کائنات نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ آپ نے ایک کسان سے پوچھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کدھر کو گئے ہیں۔ وہ کسان کیا بتاتا، یہ جلوہ نظر تو فقط آپ کیلئے مخصوص تھا۔ آپ نے سر پر ہاتھ پھیرا تو ایک باریک چمڑے کی ٹوپی جس میں بالوں کے سوراخ نظر آتے تھے الگ ہو گئی۔ ہاتھوں اور پاؤں کو دیکھا، چہرے پر ہاتھ پھیرا تو سب کچھ صحیح سالم نظر آیا جیسے کبھی بیمار ہوئے ہی نہ تھے۔ آپ حیران و متعجب حضرت فخر الاخیا کی خدمت میں تشریف لائے تو وہ روشن ضمیر شخصیت دیکھتے ہی پکار اٹھی کہ:

”محمد عمر بے شک تم پر فضل الہی ہو چکا ہے“

آپ پھر ان حکیموں اور معالجوں کے پاس گئے جو آپ کو لاعلاج اور روگی قرار دے چکے تھے۔ انہوں نے بیک زبان کہا کہ یہ کسی طبیب کی دوا کا اثر نہیں بلکہ

”یہ تو محبوب عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ ہے“

آپ کی حیرت انگیز صحت یابی نے عشاق مصطفیٰ کے دلوں کو غیر معمولی ایمانی تازگی بخش دی۔ آپ کی صحت یابی حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اعلان عام بن گئی۔ سچ ہے کہ:

ع..... یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا

اگرچہ آپ کے مرشد آپ کے برادر بزرگ تھے جو آپ سے بیٹوں کی طرح والہانہ پیار کرتے تھے مگر آپ نے ارادت و عقیدت کی راہوں پر چل کر حضور فخر الاخیا کو ہمیشہ اپنے شیخ محترم کی نظر سے دیکھا اور اس احترام و عقیدت کے رشتے میں خونی رشتوں کو حائل نہ ہونے دیا۔ حضرت سخی احمد یار رحمۃ اللہ علیہ نے بھی آپ کو مقامات تصوف کی بلندیوں پر فائز کرنے کیلئے ہر قسم کی عبادات اور مجاہدات کے کٹھن مراحل سے گزارا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آپ بہت جلد اس روحانی مقام و مرتبہ پر فائز ہو گئے، جس کیلئے بہت سے اصحاب نظر عمر کی آخری ساعتوں تک تمنائی رہتے ہیں۔ حضور فخر الاخیا

نے آپ کو اپنی زندگی ہی میں اپنی مسند ارشاد کا جانشین مقرر فرمایا۔ جب ارادت مند آداب سلوک سے آشنا ہونے کیلئے فخر الاسخیا کی خدمت میں حاضر ہوتے تو وہ انہیں یہ فرماتے ہوئے خواجہ محمد عمر قادری رحمۃ اللہ علیہ کے سپرد فرمادیتے کہ:

”محمد عمر میری کتاب ہے جس نے میری کتاب پر شک کیا، اس نے مجھ پر شک کیا، جس نے مجھے پڑھنا اور سمجھنا ہو وہ میری کتاب کو پڑھے اور سمجھے۔“

جب فخر الاسخیا حضرت سخی احمد یار رحمۃ اللہ علیہ وصال فرما گئے تو ارادت مندوں کی تمام تر توجہ حضرت خواجہ محمد عمر قادری کی طرف ہو گئی۔ آپ فخر الاسخیا کے چہیتے اور ان کے فکری و نظری جانشین تھے اس لئے جب آپ نے مسند ارشاد پر جلوہ گر ہو کر روحانی فیوض کو عام کرنے کا سلسلہ شروع کیا تو چاروں طرف آپ کے کمال سخاوت کی دھوم مچ گئی اور دور دور سے ارادت مند شوق آرزو لئے آپ کی خدمت میں حاضری دینے لگے۔

کچھ عرصہ کے بعد حضرت فخر الاسخیا نے خواجہ محمد عمر قادری سے عالم رویا میں ارشاد فرمایا:

”بیٹا اب تم یہاں سے (پیرو کوٹ سے) کسی اور جگہ چلے جاؤ۔“

آپ نے جواب میں شیخ کے قدموں سے دوری کا عذر کیا تو فخر الاسخیا نے فرمایا:

”بیٹا اسی میں بہتری سمجھتا ہوں کہ تم یہاں سے ہجرت کر جاؤ اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ جس

جگہ جاؤ گے میرے قدم بھی اسی جگہ جائیں گے یہاں نہیں رہیں گے۔“

صبح ہوئی تو آپ شیخ کے حکم کی تعمیل میں پیرو کوٹ سے چل پڑے۔ استغراق کا غلبہ تھا۔

گوجرانوالہ کے قریب آ کر معلوم ہوا کہ مشرق کی طرف چل رہے ہیں۔ چنانچہ گوجرانوالہ پہنچنے کو خدا

کی مرضی پر محمول کیا اور پھر اس شہر میں سکونت فرمائی جو زندگی کے آخری لمحات تک جاری رہی اور آج

بھی بعد از وصال یہیں سے آپ کا اور فخر الاسخیا کا فیض روحانی جاری ہے۔

گوجرانوالہ میں غوث العصر خواجہ محمد عمر قادری کی تشریف آوری اس علاقہ کے عوام کے بخر

دلوں کیلئے بارانِ رحمت کا سبب ثابت ہوئی۔ سکھا شاہی کے اس دور میں مسلمانوں کے حقوق پامال کئے

جا رہے تھے۔ مسلمان اپنے روشن ماضی سے بے خبر عہدِ حال کی تاریکیوں میں گم تھے۔ ان کے دلوں

سے احساسِ زیاں رخصت ہو چکا تھا۔

آپ نے مسلمانوں کو احساسِ زیاں سے بہرہ ور کیا کہ تمہارے اسلاف کیا تھے اور اپنی بد

اعمالیوں کی بدولت تم کس قدر ذلیل و خوار ہو گئے ہو۔ آپ نے مسلمانوں کو رسوماتِ بد کی ادائیگی سے

روکا اور وہ غلط رسوم جو کفار کی دیکھ دیکھی ان میں رائج ہو گئی تھیں ان کے خاتمہ کیلئے جدوجہد شروع کی۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ نے تبلیغ اسلام کا سلسلہ شروع کیا۔ آپ کے راستے میں بیٹھارے کاٹنے کی گئیں۔ آپ کی مبلغانہ اور اصلاحی مساعی کو ناکام بنانے کیلئے اغیار کی طرف سے طرح طرح کے حربے آزمائے گئے مگر آپ تو نور حق کی تصویر تھے اور

نور حق شمع الہی کو بجھا سکتا ہے کون

جس کا حامی ہو خدا اس کو مٹا سکتا ہے کون

آپ کے فیوض عام کا سلسلہ پھیلتا گیا۔ آپ کی صحبت سے مسلمان بھی مستفیض ہوتے اور غیر مسلم بھی۔ غیر مسلم جب آپ کے پاکیزہ کردار کا مطالعہ کرتے تو آہستہ آہستہ ان پر آپ کا رنگ غالب آنے لگتا اور بعض کی خوش بختی انہیں حلقہ بگوش اسلام کر دیتی۔ حضرت غوث العصر احکام شرعیہ کی مکمل تفسیر تھے۔ آپ کی زندگی سنت رسول کی تصویر تھی، خود بھی سنت رسول اور احکام شرعیہ پر سختی سے عمل فرماتے اور اپنے ارادت مندوں اور مریدوں کو بھی تلقین فرماتے کہ دنیاوی و اخروی فوز و فلاح کا واحد ذریعہ احکامات رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مکمل اتباع میں ہی مضمر ہے۔

غوث العصر خواجہ محمد عمر قادری سے ایک زمانہ فیضیاب ہوتا رہا۔ آپ کے فیوض کا بحر بے کراں صرف اپنوں کیلئے ہی نہیں بلکہ غیروں کیلئے بھی مواج تھا۔ یار و اغیار کی قید نہ تھی، آپ کی صحبت دلوں کو خدا آشنا کر دیتی۔ آپ کے حلقہ تربیت میں علماء بھی آتے اور فضلاء بھی۔ درویش بھی حاضری دیتے اور اغنیاء بھی، غرباء بھی آتے اور امراء بھی۔ علوم ظاہری کے متلاشی بھی آتے اور نور باطنی کے جو یا بھی۔ آپ کا سحاب لطف و کرم سب کو یکساں انداز سے فیضیاب کرتا۔ آپ کی نگاہ پر تاثیر تھی، جس پر پڑی اسے ذرے سے آفتاب اور ناقص سے کامل بنا دیا۔ دنیا دار آپ کی محفل میں آئے تو دین کی طلب کے سوا کچھ یاد نہ رہا۔ آپ کے خوان رحمت سے فیضیاب ہونے والوں میں حکیم الامت علامہ محمد اقبال جیسے نابغہ روزگار بھی شامل تھے۔ غوث العصر کے ایک خلیفہ حضرت سائیں عبداللہ شاہ قادری سیالکوٹ کے رہنے والے تھے۔ علامہ محمد اقبال سے غیر معمولی ارادت رکھتے۔ جب غوث العصر سیالکوٹ تشریف لے جاتے تو شیخ نور محمد مسلسل آپ کی خدمت میں حاضر رہتے۔ علامہ محمد اقبال بھی اس مرد قلندر سے خصوصی ارادت و عقیدت رکھتے اور گوجرانوالہ آ کر بازار خرداں میں غوث العصر کے مزار پر انوار پر حاضری دیتے اور کافی دیر تک اس مزار پر حالت مراقبہ میں رہتے۔ شاعر مشرق کی ہمیشہ کے صاحبزادے ڈاکٹر نظیر صوفی سیالکوٹی کے بقول ”علامہ اقبال جس وقت چار برس کے تھے تو حضرت خواجہ محمد عمر عباسی

قادری اپنے خلیفہ سائیں عبداللہ قادری کے ہاں سیالکوٹ تشریف لائے۔ شیخ نور محمد نے اپنے دادا پیر کی دعوت کی اور اقبال کو مرشد کے توسط سے دادا پیر کی گود میں بٹھایا۔ غوث العصر نے اپنا لعاب دہن علامہ کے منہ میں لگا کر بسم اللہ پڑھوائی۔

یہ حضور غوث العصر رحمۃ اللہ علیہ ہی کا فیض تھا جس نے علامہ محمد اقبال کے گھرانے کو تصوف کا ترجمان بنا دیا اور سیالکوٹ سے شاعری کے افق پر ابھرنے والے محمد اقبال تاریخ اور شعر و ادب میں حکیم الامت، شاعر مشرق اور ترجمان اسرار خودی کے القاب سے یاد کئے گئے۔ ایک علامہ محمد اقبال ہی پر کیا موقوف یہاں تو علم و حکمت اور تصوف و روحانیت کا چمنستان کھلا ہوا تھا، جس کی خوشبو سے وقت کے اصحاب علم و حکمت اور اصحاب فکر و نظر یکساں طور پر اپنے مشام جان کو معنبر کر رہے تھے۔ طریقت و معرفت کی گتھیاں سلجھائی جاتیں، سلوک و تصوف کے انوار لٹائے جاتے۔ غوث العصر کی ذات میخانہ تصوف کی ساقی بنی ہوئی تھی اور جو ایک بار اس میخانہ تصوف کے مئے معرفت سے بہرہ یاب ہو جاتا پھر ہمیشہ ہمیشہ کیلئے یہیں کا ہو جاتا۔ کس کس کا ذکر کیا جائے، کس کس کا نام لیا جائے، ان اصحاب فکر کی ایک بڑی تعداد تاریخ کے البم میں محفوظ ہے جو غوث العصر رحمۃ اللہ علیہ کی نگاہ فیض ترجمان کی بدولت دینی و دنیاوی مدارج طے کر کے شہرت عام اور بقائے دوام کی سر بلندیوں کے حق دار ٹھہرے۔ آپ کی سیرت صحیح معنوں میں سیرت مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم کا رنگ لئے ہوئے تھی۔ آپ کا کردار اسلاف کے کردار کا احسن نمونہ تھا۔ آپ سے بے شمار کرامات مروی ہیں جن کے اظہار کیلئے ایک دفتر درکار ہے۔ ہمارے نزدیک آپ کی سب سے بڑی کرامت آپ کا خطہ پنجاب کو اسلامی شعائر اور دینی ماحول سے آشنا کرنا ہے۔ آپ نے مردہ دلوں کو اپنے انداز مسیحائی سے زندہ کر دیا اور یہ دل خدا کی محبت و عنایت کے مخزن بن گئے۔

آپ کی ذات غم و آلام کے ستارے ہوؤں کیلئے سراپا تسلی تھی۔ آپ نے دنیا بھر کے ٹھکرائے ہوؤں کو سینے سے لگا کر اپنا بنا لیا اور پھر وہی لوگ زمانے کی آنکھ کا تارا بن گئے۔ غوث العصر نحیف البدن، دراز قد اور گندی رنگت کے حامل تھے۔ چہرے سے نورانیت عیاں تھی، سینہ کشادہ اور محبت رسول کا معدن تھا۔ آپ نے گمراہوں کو صراط مستقیم کا شعور بخشا، بے یقینوں کو یقین کی دولت عطا کی۔ ایمان کی روشنی سے محروم انسانوں کے قلب کو نور ایمان سے ضوئیں کر دیا۔ وہ بد قسمت کہ جنہیں اپنی پہچان بھی محال تھی آپ کے حلقہ تربیت میں آ کر عرفان خداوندی کی منزل پر فائز ہو کر خوش بخت بن گئے۔ آپ کی خلافت کا معیار کڑا تھا مگر آپ نے جسے خلافت عطا کر دی وہی روح عصر بن گیا۔ یہ اعزاز

عظمت حقیقت پر مبنی ہے کہ:

۔ وہ اک مرد عمل جس کو دلوں کا تاجور کہیے
اسے غوث زماں کہیے اسے خواجہ عمر کہیے
وہ جس کا اسوۂ پر نور شمع راہ ایماں ہے
اسی کی ہر ادا کو شوکت اہل نظر کہیے
(رضا)

ایک طویل عرصہ تک دلوں کو روشنی اور عشق رسول کے انوار سے آباد کرنے کے بعد یہ مرد
عظیم ۵ محرم الحرام ۱۳۰۹ء بمطابق ۲۸ ساون ۱۹۲۹ء بکرمی بوقت تہجد اپنے عشاق کو غمزدہ و ملول چھوڑ
کر راہی ملک بقا ہو گیا۔ اس وقت آپ کی عمر تقریباً ۸۴ برس تھی۔ غوث العصر رحمۃ اللہ علیہ کے وصال
انور کے بعد آپ کے سلسلہ روحانیت کو آپ کے فرزند جلیل حضرت خواجہ محمد عبداللہ عباسی قادری رحمۃ
اللہ علیہ نے آگے بڑھایا۔ ان کے بعد ان کے فرزند حضرت خواجہ محمد کریم اللہ عباسی قادری اس دربار
عالیہ کے فیوض و برکات کو عام کرتے رہے۔ پھر یہ شرف ان کے فرزند حضرت قبلہ خواجہ محمد بشیر عباسی
قادری رحمۃ اللہ علیہ کا مقدر بنا۔ آج یہ تمام شخصیات اپنے اپنے دور میں غوث العصر کے انوار روحانی
کو عام کرنے کے بعد دربار عالیہ قادریہ بازار خراواں میں آسودہ لحد ہیں مگر ان کی تعلیمات آج بھی
مہر و ماہ کی طرح ضرور یز ہیں۔



شہر یارِ خطابت

صاحبزادہ سید فیض الحسن شاہ آلو مہاروی رحمۃ اللہ علیہ

تاریخ انسانیت میں وہی لوگ حیات دوام کے مستحق ٹھہرتے ہیں جو حالات کی گردشوں کو ٹھوکر سے اڑاتے ہوئے مرکب وقت کے شہسوار ہونے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ یہ سعید بخت نفوس زندگی کا وقار اور اپنے عہد کا افتخار ہوتے ہیں۔ آزادی برصغیر کے جاں بکف قافلے کے ہر اول دستے کے مرد صف شکن خطیب الاسلام صاحبزادہ سید فیض الحسن آلو مہاروی رحمۃ اللہ علیہ کا شمار بھی انہی فرزند ان عظیم میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنی خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے انگریز اور انگریزی سرکار کے زیر سایہ پرورش پانے والی خانہ زاد نبوت کے خلاف اس مجاہدانہ انداز سے جنگ لڑی کہ اپنے تو اپنے اغیار بھی ان کی صلاحیتوں کو ارمغان عقیدت پیش کرنے پر مجبور ہو گئے۔

خطیب الاسلام صاحبزادہ سید فیض الحسن شاہ ۱۹۱۱ء کو پنجاب کے مشہور روحانی مرکز آلو مہار شریف میں پیدا ہوئے آپ کا خاندان کئی پشتوں سے پنجاب بھر میں روحانیت و طریقت کے انوار تقسیم کر رہا تھا۔ سادات آلو مہار میں حضرت سید جیون شاہ وہ پہلے بزرگ ہیں جنہوں نے اس بستی میں علم و عرفان کی دولت تقسیم کی۔ بعد میں ممتاز روحانی شخصیت حضرت پیر سید چمن شاہ رحمۃ اللہ علیہ کی بدولت یہ بستی اسلامیان برصغیر کے دلوں کی دھڑکن بن گئی۔ سید چمن شاہ رحمۃ اللہ علیہ کے بعد ان کے صاحبزادے خواجہ سید محمد امین شاہ اور ان کے بعد پیر سید محمد حسین شاہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس سلسلہ عالیہ کو اس قدر وسعت دی کہ آلو مہار شریف کا نام روحانی اقدار کی عملی تفسیر بن گیا۔ خطیب الاسلام سید فیض الحسن انہی خواجہ سید محمد حسین رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے تھے اور اسی پیکر علم و آگہی نے اپنے فرزند ارجمند کی اس طور تربیت کی کہ یہ شاہسوار خطابت آنے والے ادوار میں آزادی و حریت کے قافلے کی آبرو بن گیا۔

ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں سے حاصل کرنے کے بعد انہوں نے مرے کالج سیالکوٹ سے امتیازی حیثیت سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ کالج کی تعلیم کے دوران میں یہ اپنی قوت تقریر کا

لوہا اس طرح منوا چکے تھے کہ پنجاب بھر کے کالجوں اور دینی مجالس میں آپ کی تقاریر کی صدائے باز گشت سنائی دینے لگی۔ اسی دور میں نامور شاعر فیض احمد فیض بھی اس کالج میں زیر تعلیم تھے۔ صاحبزادہ صاحب کے وصال کے بعد فیض مرحوم نے اپنے ایک انٹرویو میں صاحبزادہ سید فیض الحسن کی ادبی و شعری صلاحیتوں کا برملا اعتراف کیا۔ حالانکہ صاحبزادہ صاحب مدتوں اپنی شعر گوئی کی صلاحیت کو چھپائے رہے۔ دنیاوی تعلیم کے ساتھ ساتھ آپ نے دینی تعلیم کے حصول کیلئے نامور علمائے دین مولانا عبدالجید سنبھلی اور مولانا لطف اللہ کیرت پوری کے حضور زانوائے تلمذ طے کیا۔ ۱۹۳۳ء میں جب پیر سید محمد حسین رحمۃ اللہ علیہ نے داعی اجل کو لبیک کہا تو صاحبزادہ سید فیض الحسن شاہ اس مرکز روحانیت کے سجادہ نشین مقرر ہوئے۔

صاحبزادہ سید فیض الحسن کو قدرت نے جذبہ حریت کی دولت اس شان سے ودیعت کی تھی کہ یہ زمانہ طالب علمی ہی میں انگریزی سامراج کی تشددانہ پالیسیوں پر تنقید کرنے لگے تھے۔ یہ وہ وقت تھا جب انگریزی اقتدار کا آفتاب نصف النہار پر جگمگا رہا تھا۔ چاروں طرف ظلم و تشدد کی تاریک رات مسلط تھی۔ انگریز کا دعویٰ تھا کہ وہ برصغیر پر کم از کم ایک ہزار برس حکومت کرے گا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس کی سلطنت میں سورج کے غروب ہونے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ انگریزی پالیسیوں پر تنقید کا دوسرا مطلب دارورسن کی آزمائش سے دوچار ہونا تھا۔ برطانوی سامراج نے ایک طرف وحشت و بربریت کے مہیب سائے پھیلا رکھے تھے اور دوسری طرف خطابات القابات اور مراعات کے نام پر حرص و آرزو کا دام پھیلا رکھا تھا۔ یہ وہ کٹھن دور تھا جب آزادی و حریت کا نام لینا عبرتناک موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ اس پر آشوب دور میں صاحبزادہ سید فیض الحسن کی اولوالعزمی ایمانی استقامت اور جذبہ جہاد سے لگن آزادی پسند حلقوں کیلئے راہ عزیمت میں مردانہ وار آگے بڑھنے کا پیغام بن کر ابھری۔ انہوں نے ایک طرف حریت پسندوں کو ولولہ تازہ سے آشنا کیا اور دوسری طرف برصغیر کے خانقاہ نشینوں کو یہ کہہ کر پیغام شبیری کے تقاضوں سے بہرہ ور کیا کہ:

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسم شبیری

کہ فقر خانقاہی ہے فقط اندوہ دلگیری

صاحبزادہ سید فیض الحسن شاہ رحمۃ اللہ علیہ نے ایک ایسے ماحول میں آنکھ کھولی تھی جہاں چاروں طرف خدام اور چاہنے والوں کا ہجوم تھا، ارادت مند گروہ درگروہ تھے مگر اس پیکر حریت کے سینے میں شعلہ آزادی اس شان سے رقصاں ہوا کہ اٹھتی جوانی میں اس راہ کا انتخاب کر لیا جس پر

شہادت کہ الفت میں قدم رکھنے کا اطلاق ہوتا تھا۔ ایک بہت بڑے مقرر اور خطیب کی حیثیت سے آپ کی شہرت پنجاب کی حدود سے نکل کر دوسرے صوبوں تک پہنچ چکی تھی۔ ان دنوں مجلس احرار کی صورت میں انہیں ایک ایسا پلیٹ فارم میسر آیا جہاں سے وہ برطانوی استبدادیت اور قادیانیت پر یکساں قوت سے ضرب کاری لگا سکتے تھے کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ یہ دونوں مفاسد اندر سے ایک ہیں۔ آپ نے اپنی ولولہ انگیز تقاریر سے ایوان باطل کو لرزا کر رکھ دیا۔ آپ کا سحر خطابت بے شمار دلوں کو ختم نبوت اور آزادی و حریت کی حرارت سے ہمکنار کرتا رہا۔ اس دوران میں برطانوی آقاؤں کی جانب سے اس جواں عزم پیکر استقلال کو خانقاہ کے گوشہ عافیت میں واپس لوٹ جانے کے لئے کئی ترغیبات پیش کی گئیں برے انجام سے دوچار کرنے کی دھمکیاں دی گئیں مگر یہ سید زادہ تو سنت شبیری ادا کرنے کیلئے وقت کے میدان کربلا میں سر پر کفن باندھ کر آیا تھا اور اہل شوق کہتے ہیں کہ اس راستے پر سفر کا آغاز تو کیا جاسکتا ہے مگر واپسی کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ صاحبزادہ سید فیض الحسن رحمۃ اللہ علیہ نے وقت کی بارگاہ سے خطیب الاسلام اور رئیس المتکلمین کے القاب حاصل کئے اور ہر سمت اسم احمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی چاندنی بکھیرنے لگے۔

آلو مہار شریف کے سجادہ روحانیت کے اس شہزادے نے دارورسن کی آزمائش کو آزادی کا انعام سمجھ کر قبول کیا۔ اس سلسلہ میں آپ کو جیل جانا پڑا تو غیر متزلزل ایمانی جذبے کیساتھ ہر صعوبت کو برداشت کیا مگر برطانوی استعماریت اور قادیانیت کا تعاقب ترک نہ کیا۔ اسی دوران میں حضرت قائد اعظم محمد علی جناح کی قیادت میں پاکستان کے حصول کیلئے جدوجہد فیصلہ کن دور میں داخل ہو چکی تھی۔ صاحبزادہ سید فیض الحسن مجلس احرار میں رہتے ہوئے بھی قائد اعظم محمد علی جناح کی مساعی کے معترف تھے اور پاکستان کو اسلامیان برصغیر کے خوابوں کی تعبیر سمجھتے تھے۔ چونکہ برصغیر کے جملہ سنی علماء و مشائخ اس معاملہ میں قائد اعظم کے شانہ بشانہ چل رہے تھے اس لئے ایک بڑے شیخ طریقت ہونے کے ناطے صاحبزادہ سید فیض الحسن نے ہر گام پر قائد اعظم کے موقف کو برحق اور پاکستان کو نجات کا واحد راستہ قرار دیا۔ اسی سلسلہ میں ایک قدم آگے بڑھتے ہوئے آپ نے مجلس احرار سے وابستگی ترک کر دی تاکہ قیام پاکستان کیلئے ان کے علاقہ میں زیادہ موثر انداز سے کام ہو سکے مگر فرنگی آمریت اور قادیانیت کو لٹکانے کا عمل اسی شان سے جاری رہا۔

آپ ایک سحر طراز خطیب تھے وہ خطیب کہ جس کے لبوں کی جنبش سے وقت کی نبض تھمتی اور حرارت حاصل کرتی ہے۔ پنجابی اور اردو میں یکساں مہارت سے خطاب کرتے۔ آپ کے قد و قامت

حسن و جمال، دلکشی و رعنائی، مردانہ وجاہت، فکری ثقاہت، نظریاتی پختگی، الفاظ کے زیور، اندازِ تکلم، پر جوش لہجے اور مرصع و مسجع پیرایہ اظہار کو دیکھ کر بے اختیار یہ احساس ہوتا کہ قدرت نے حسنِ خطابت کیلئے یہ سانچہ بطور خاص موزوں کیا ہے۔ خطابت کا میدان آپ کی فکری و نظریاتی رزم گاہ تھا، جہاں آپ نے اسلام اور حضور ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں کے خلاف فاتحانہ جنگ لڑی۔ آپ نے بمبئی اور راس کماری سے لے کر پشاور کے دور افتادہ دیہات تک اسلام کا پیغام پہنچایا۔ آپ کا دور خطابت نصف صدی سے زیادہ عرصے پر محیط ہے۔ دورانِ تقریر یوں محسوس ہوتا جیسے زمانے بھر کے الفاظ اس شہنشاہِ اقلیم خطابت کے روبرو حاضر ہیں۔

لفظ اس کی بارگہ میں اس طرح تھے لا کلام
باوشہ کے سامنے جیسے کہ حاضر ہوں غلام
چن لیا جس لفظ کو اس نے ستارا ہو گیا
آسمان علم کا وہ شاہپارا ہو گیا
(محمد اکرم رضا)

تقریر کے دوران میں ہاتھوں کا اٹھانا، متضاد اور مترادف الفاظ کی یلغار، جوشِ تکلم کے ساتھ ساتھ بازوؤں کا بلند ہوتے جانا، الفاظ کی برستی ہوئی رم جھم اشعار و تراکیب کا بر محل استعمال، قد رعنا اور پھر لفظوں کی ساحری، خوش لباسی و خوش پوشی اور نثر میں شاعری اور پھر انگشت شہادت کا اوپر کو اٹھانے کا مخصوص انداز، یوں محسوس ہوتا جیسے خطابت خود حسنِ خطابت کو دیکھ کر محو تماشا ہو گئی ہو۔ اجتماع ہزاروں کا ہوتا یا لاکھوں کا یہ شہریار خطابت سننے والوں کے دلوں میں اتر کر ہمیشہ ناقابل فراموش تاثر چھوڑنے میں کامیاب رہتا۔

ناطقہ تیری طلاقت پہ اگر قربان تھا
تھی طلاقت تیرے انداز خطابت پر نثار
اس طرح منہ سے ترے چھرتے تھے پھول الفاظ کے
خلد سے جیسے بہاروں کا گرے اک آبشار

صاحبزادہ سید فیض الحسن شاہ رحمۃ اللہ علیہ کو قدرت حق سے عشقِ مصطفوی کی دولت غیر معمولی طور پر ودیعت ہوئی تھی۔ ایک تو خاندانی روحانی تربیت اور پھر شاعر مشرق علامہ محمد اقبال سے والہانہ عقیدت، اقبال کا کلام دل پر چب مصطفیٰ کے انوار کا نزول کرتا رہا۔ یہی محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم

ان کیلئے زندگی کی تمام مسافتوں میں خضر راہ بن گئی۔ تحریک آزادی برصغیر سے لے کر ناموس رسالت کی پاسداری تک اور استحکام پاکستان سے لے کر نظام مصطفیٰ کی ترویج تک انہوں نے ہر گام پر عشق رسول کا پرچم فراز وقت پر اس شان سے لہرانے کی کوشش کی کہ ان کی ہر ادا آوازہ عمل میں ڈھل گئی۔ وقت کی ہر آزمائش گاہ میں زندگی کے ہر دشت ابتلا میں تاریخ کے ہر معرکہ حق و باطل میں یہ محبت رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سہارے سرخرو رہے۔ قیام پاکستان کے بعد انہوں نے جملہ صلاحیتوں کا مرکز و محور فروغ دین اسلام کو بنا لیا تھا کیونکہ آپ جانتے تھے کہ اس دن کی بنیادوں میں دو قومی نظریہ اسلام کا نور موجزن ہے اور پاکستان کی نظریاتی اساس سے انحراف محبت رسول سے غداری کے مترادف ہے۔ ۱۹۶۷ء میں جب اس وقت کی حکومت نے قادیانیوں کو دائرہ اسلام سے خارج قرار دیا تو اس وقت بھی قادیانیت کے مفاسد سے عوامی اور قومی حلقوں کو آگاہ کرنے کیلئے جو ملک گیر تحریک تحفظ ختم نبوت چلائی گئی تھی اس کے پس منظر میں بھی صاحبزادہ سید فیض الحسن کی مساعی خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ جس روز قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے کا اعلان ہوا اس روز شام کو راقم کی آپ سے ملاقات ہوئی تو میں نے آپ کو اس قدر شاداں و فرحاں دیکھا کہ اس وقت کی کیفیت کو قلم بند نہیں کر سکتا۔ فرماتے تھے۔

آج ہمارا وہ عہد پورا ہو گیا ہے جس کی حرمت کو مد نظر رکھتے ہوئے ہم نے نصف صدی پیشتر عشق مصطفیٰ کی راہوں پر سفر کرنے کیلئے پہلا قدم اٹھایا تھا۔ اگر میرا آج ہی انتقال ہو جائے تو میں اس خوشگوار احساس کے ساتھ دنیا سے جاؤں گا کہ لحد میں رحمت خداوندی اور عنایات مصطفوی میری منتظر ہوں گی۔

لحد میں عشق رخ شہ کا داغ لے کے چلے

اندھیری قبر سنی تھی چراغ لے کے چلے

صاحبزادہ سید فیض الحسن ہمیشہ عوام و خواص کی آنکھوں کا تارا بنے رہے۔ تحریک ختم نبوت کے دوران ہمیشہ کلیدی کردار ادا کیا۔ جمعیت المشائخ اور جمعیت العلمائے پاکستان کی قیادت کرتے ہوئے ہمیشہ نظام مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ترویج و اشاعت کو عزیز رکھا۔ اسلامی نظریاتی کونسل اور مرکزی رویت ہلال کی رکنیت کے دوران بھی اسلامی شعار کی سرفرازی کیلئے کوشاں رہے۔ انہیں قدرت نے اس قدر تحمل بردباری اور رواداری سے نوازا تھا کہ آج کے پر آشوب دور میں ان کی فراموشی طلب و فکر کا اندازہ کرتے ہوئے حیرت ہوتی ہے۔ سیاست کی واوی پر خار میں سفر کرتے ہوئے اسلام اور

پاکستان کے نظریاتی دشمنوں سے پنچہ آزمائی کرتے ہوئے، گستاخانہ بارگاہ رسول کے مقابل صف آراء ہوتے ہوئے انہیں بارہا طعن و تشنیع اور بے سروپا الزامات کے پل صراط کو عبور کرنا پڑا مگر یہ مرد مجاہد گالیاں کھا کر بھی مسکراتا رہا۔ پتھروں کی چھین برداشت ہوئے دشمنوں کو دعا دیتا رہا۔ اپنے تو اپنے تھے اغیار کیلئے بھی کبھی اخلاق و تہذیب سے گری ہوئی زبان استعمال نہ کی۔ آل رسول سے تعلق رکھنے والا یہ مرد و حید اعداء کے بچھائے ہوئے کانٹوں پر چل کر بھی ان کی ہدایت کیلئے دست بدعا رہا۔ یہ غیر معمولی حوصلہ بلند ظرفی، کشادگی، فکر و نظر، عشق مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا صدقہ تھی جس کو فیاضی فطرت کے سبب صورت کی دلاویزی کے ساتھ ساتھ سیرت و کردار کی خلعت دوام بھی عطا ہو چکی تھی۔ ان کی زندگی اس پیغام کی تفسیر تھی کہ:

دہر کو سیرت سرکار سکھا دی جائے

سنگباری جو کرے کوئی دعا دی جائے

یہ محبت حضور ہی کا فیضان تھا کہ صاحبزادہ سید فیض الحسن کو نعت گوئی کی سعادت عظمیٰ عطا ہوئی۔ یہ علامہ محمد اقبال اور ظفر علی خاں کا زمانہ تھا۔ شاعری کے یہ آفتاب و ماہتاب برصغیر کی ہر تحریک آزادی پر اثر انداز ہو رہے تھے۔ صاحبزادہ سید فیض الحسن علامہ محمد اقبال کے زبردست مداح اور ان کی نظریاتی فکر کے پرستار تھے۔ یہی محبت انہیں کئی مرتبہ علامہ اقبال کی مجالس میں لے گئی۔ اقبال اور ظفر علی خاں کی فکر ان کے ذہن پر یوں اثر انداز ہوئی جب نعت گوئی کیلئے قلم سنبھالا تو اقبال کے سوز و گداز اور ظفر علی خاں کی شاعرانہ تب و تاب کے امتزاج سے مدحت حضور کے گلاب مہکانے لگے۔ ان کا شعری مجموعہ (نعت و نظم) ”ارمغان فیض“ کے عنوان سے شائع ہو کر ارباب نقد و نظر سے خراج تحسین حاصل کر چکا تھا۔ آپ کی نعتیں ادبی و فنی لحاظ سے نہایت بلند پایہ ہیں۔ اس قدر خوبصورت شاعری رقم کرنے کے باوجود آپ نے اسے کبھی ذریعہ شہرت نہ بنایا، جب اس کے بارے میں سوال کیا جاتا تو مسکرا کر ٹال دیتے۔ مشاعروں میں کبھی اپنا کلام نہ سنایا، تقاریر میں اپنے اشعار استعمال نہ کئے۔ آپ تو کلام اقبال کے حافظ تھے۔ دوران تقریر میں علامہ اقبال کے اشعار اس خوبصورتی سے بر محل استعمال کرتے کہ ان اشعار کے نئے نئے مفاہیم اجاگر ہونے لگے۔ آپ کی نعتوں میں محبت حضور تمام تر شدتوں کے ساتھ جلوہ ریز ہے۔ اس میں سوز و ساز جاودانہ کی تڑپ بھی ہے اور تمنائے ناتمام کی کسک بھی۔ دامان رسول سے وابستگی کا اظہار بھی ہے اور حسن عقیدت کا نکھار بھی۔

تبر کا چند اشعار درج ہیں۔

زہے نصیب سعادت ملی ہے مدحت کی
مری نجات کو یہ انتخاب کافی ہے
جناب! بندہ بے دام مصطفیٰ ہوں میں
نکیر کو یہ لحد میں جواب کافی ہے



جمشید کا تو جام تھا جام جہاں نما
جام خدا نما ہے مگر جام مصطفیٰ



تیری نوائے شوق سے وجد میں ہے حریم ذات
تیری نظر کے کیف سے مست ہے محفل حیات
مرہم زخم بے کسی خندہ زیرب ترا
چارہ درد عاجزی تیری نگاہ التفات



یہ فیض عام ہے اے رحمت تمام ترا
جہاں میں درد کوئی لاوا نہیں ملتا
وہ آئے ساقی کوثر کے میکدے میں ذرا
جسے گمان ہے آب بقا نہیں ملتا



صاحبزادہ سید فیض الحسن کی شخصیت میں ہمہ گیریت کا پہلو غالب تھا۔ ظاہری اور باطنی طور پر قد آور جس مجلس میں گئے وہیں صدر محفل قرار پائے۔ ”اشداء علی الکفار ورحماء بینہم“ کی عملی تفسیر تھے جرات و ہمت کے پیکر ایمانی استقامت کی علامت، حریت فکر کی پہچان، غیرت ملی اور تدبیر و تفکر کا اک مظہر ذیشان، تمام عمر محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر جسے خانقاہ نشینوں کو عصر حاضر کے نظریاتی تقاضوں کی بجا آوری کے آداب سکھائے، خاک نشینوں کو شاہینی پرواز کے لاہوتی نعمات سنائے۔ شاہ جی بولتے تو زمانہ ہمہ تن گوش ہو جاتا کہ روح عصر جو تکلم ہے ان کی نواؤں میں بونے اسد اللہی کی تاثیر اور اواؤں میں قلندری و آزادی فکر کی تنویر نظر آتی۔ انہوں نے باطل قوتوں

کے سامنے جھکنا نہیں بلکہ انہیں جھکانا سیکھا تھا۔

شاہ جی ایسے پیر طریقت تھے کہ بے شمار ارادت مندوں کو عرفان الہی سے بہرہ ور کر گئے، ایسے رہبر فرزانه تھے کہ عشاقِ مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دلوں کو عشقِ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے انوار سے ضو بار کر گئے، قائدِ اہلسنت تھے کہ ملتِ احناف کو اس کا فکری تشخص بخش گئے، وقارِ نقشبندی تھے کہ باطل قوتوں کو لٹکار کر سیدنا مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے نصب العین کو حیاتِ تازہ عطا کر دی۔ راہنمائے گردوں طراز تھے کہ زمانہ ان کی قیادت کو سرمایہٴ اعزاز سمجھتا تھا۔ سحر طراز مقرر تھے کہ ان کے اعجازِ نطق نے ملتِ اسلامیہ کے جسدِ مردہ میں آزادی کی روح پھونک دی، مدحت نگارِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم تھے کہ ان کے نعماتِ نعتِ مدتوں مادیت زدہ دلوں کو عشق و عقیدت کی لطافتوں سے معمور کرتے رہیں گے۔ ان کے تکلم پر ساحری اور ان کی تحریر پر شاعری کا گمان گزرتا تھا۔ بے داغ جوانی سے باوقار بڑھاپے تک زندگی اس شان سے گزاری کہ آج ان کا ذکر کرتے ہوئے بہت کچھ لکھ کر بھی قلم کو عاجزی و درماندگی کا احساس ہوتا ہے کہ:

ع..... ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

آپ بڑے فخر سے اس سعادت کا اعلان کرتے کہ میں نے پچاس برس تک خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام برِ صغیر کے ہر شہر اور قصبے میں پہنچایا ہے۔ زندگی کے آخری دور میں اپنی تقاریر کو فقط روحانیت کے اسرار و رموز کی گرہ کشائی کیلئے وقف کر دیا تھا۔ آپ کے اس دور کے خطابات بلاشبہ تاریخِ تصوف کا روشن باب ہیں۔ آپ کے ریڈیو پر نشر ہونے والے سینکڑوں خطباتِ اسلامی تعلیمات اور ادب و انشاء کے امتزاج کا دل نشیں نمونہ ہیں۔ ۱۹۶۵ء کے معرکہٴ پاک بھارت میں آپ کی خطیبانہ مساعی پر آپ کو حکومت پاکستان کی طرف سے تمغہٴ امتیاز دیا گیا۔ یہ تو ایک قومی اعزاز تھا، ورنہ آپ کا اصل اعزاز تو آپ کا وہ سفرِ آخرت تھا جو آپ کی لافانی محبت رسول کا انعام تھا۔ وفات سے چند ماہ پیشتر دل کو تکلیف کا احساس ہوا۔ کچھ عرصہ میوہسپتال میں رہے، طبیعت سنبھلی تو واپس آ گئے۔ تقاریر اور خطابت کا سلسلہ ختم کر دیا اور خود کو فقط تعلیماتِ تصوف کے فروغ کیلئے وقف کر دیا۔ ۲۳ فروری ۱۹۸۳ء کو دن کے ساڑھے گیارہ بجے گھبراہٹ کا احساس ہوا تو نقشبندی معمولات کو دہرایا۔ اچانک آپ کے چہرے کی دلکشی اور رعنائی میں اضافہ ہو گیا اور اہل خانہ سے فرمایا:

”روشنی آ رہی ہے، پردے ہٹا دو“

شہریارِ خطابت کی زبان سے ادا ہونے والا یہ آخری جملہ تھا اور پھر وہ شمعِ روشنِ لحد کی آغوش

میں ضرور یز ہوگئی جس نے مدتوں اہل نظر کے دلوں میں اسم محمد سے اجالا کیا تھا۔ ایک شخص نہیں بلکہ ایک دور تاریخ کے نہاں خانوں میں روپوش ہو گیا۔ دبستان خطابت کا آخری زمزمہ پرداز خاموش ہو گیا۔ وہ بطل جلیل خاموش ہو گیا جو مجاہدین آزادی کا وقار بھی تھا اور ناموس رسالت کا پاسدار بھی۔ گلزار نعت کا وہ گل نو بہار نگاہوں سے اوجھل ہو گیا جس کی تعلیمات اور مدحت و نعت کی خوشبو ہمیشہ مشام افکار کو معنبر کرتی رہے گی۔



شیخ الحدیث

مولانا مفتی عبداللہ قادری مردانوی رحمۃ اللہ علیہ

صغیر ہستی پر بلاشبہ وہی شخصیات انہٹ نقوش ثبت کرنے میں کامیاب رہتی ہیں جن کی زندگی کا ہر عمل رضائے الہی کے تابع ہوتا ہے۔ یہ خوش بخت نفوس اپنی زندگیاں اس شان کے ساتھ اطاعت خداوندی اور اتباع سنت مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم میں بسر کرتے ہیں کہ ان کا وجود صحیح معنوں میں مرد مومن کی تفسیر نظر آتا ہے۔ شیخ القرآن والحدیث استاذ العلماء مولانا محمد عبداللہ قادری کا شمار بھی ان محسنین اسلام اور عشاق مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم میں ہوتا ہے۔ آپ نے تمام عمر علوم دینیہ کی تدریس میں اس تندہی کے ساتھ بسر کر دی کہ آپ کا وجود اہل ایمان کی دھڑکنوں میں ڈھل گیا اور یہ آپ کی صفات حسنہ خدمات جلیلہ اور فروغ اسلام کیلئے کی جانے والی مخلصانہ جدوجہد ہی کا نتیجہ ہے کہ آج آپ ظاہری طور پر جدا ہو کر اصحاب ایمان کے دلوں کے خلوت کدوں میں جاگزیں معلوم ہوتے ہیں۔

بعد از وفات تربت مادر زمیں بخو

در سینہ ہائے مردم عارف مزار ما

استاذ العلماء حضرت مولانا محمد عبداللہ قادری رحمۃ اللہ علیہ ایک نابغہ روزگار استاد اور اہل حق کو صراط مستقیم پر گامزن کرنے والے مذہبی راہنما تھے۔ آپ محبت و شفقت کی روشن تصویر تھے۔ جو بھی ایک بار آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا ہمیشہ ہمیشہ کیلئے آپ ہی کا بن جاتا۔ آپ متمدن علاقوں سے دور علاقہ جدون تحصیل صوابی ضلع مردان میں پیدا ہوئے۔ یہ علاقہ علم و حکمت کی فضا کیلئے انتہائی ناسازگار بلکہ بنجر تھا۔ جب آپ بچے تھے تو یہاں علم کے حصول کا تصور کرنا دیوانے کا خواب سمجھا جاتا تھا۔ آپ کے والد محترم کا اسم گرامی مولانا فیض الرساں تھا جو اپنے لخت جگر کو بھرپور انداز سے زیور تعلیم سے آراستہ کرنا چاہتے تھے مگر ان کی زندگی نے وفانہ کی اور وہ اپنے بیٹے کو یتیمی کی تاریکیوں میں بھٹکتا چھوڑ کر آغوشِ لحد میں آرام فرما ہو گئے۔ مولانا فیض الرساں جب تک حیات رہے محمد عبداللہ قادری بھی اپنے والد بزرگوار کی ایمان افروز صحبتوں سے بہرہ ور ہوتے رہے۔ صوابی کا علاقہ پہاڑی

علاقہ ہے، جہاں برف باری کثرت سے ہوتی ہے اور جن چشموں سے پانی حاصل کیا جاتا تھا ان کے اوپر ہمہ وقت برف جمی رہتی تھی۔ مولانا فیض الرساں جب برف توڑ کر چشمے کے شدید خنک پانی سے وضو کرتے تو ننھے عبداللہ قادری بھی اپنے والد محترم کی اتباع میں اسی ٹھنڈے پانی سے وضو کرتے اور والد محترم کے ساتھ نماز ادا کرتے۔ مولانا فیض الرساں کی صحبت انہیں جتنا عرصہ بھی میسر رہی انہیں فقر و درویشی کے آداب سکھاتی رہی۔ اسی طرح آپ کی طبیعت بچپن ہی سے یاد الہی کی طرف مائل ہوتی گئی کیونکہ:

نہیں مشاطگی کی کچھ ضرورت حسن معنی کو

کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالے کی خنا بندی

والد محترم کی بے وقت رحلت کے بعد جب آپ نے علم کے حصول کا ارادہ ظاہر کیا تو آپ کے بھائیوں نے جواب آپ کے سر پرست تھے آپ کی سخت مخالفت کی۔ اور آپ کی مزید حوصلہ شکنی کیلئے کھیتی باڑی کے مشکل ترین کام میں لگا دیا۔ ننھے عبداللہ قادری کھیتوں پر محنت بھی کرتے رہے مگر بھائیوں کی حوصلہ شکنی اور نامساعد حالات کی یورش ان کے شوقِ تعلیم کی جگمگاتی ہوئی شمع کو گل نہ کر سکی اور پھر ایک دن زمانے نے یہ منظر بھی دیکھا کہ تعلیم کے ابتدائی وسائل نے بھی محروم یہ بچہ آنے والے ادوار میں شیخ الحدیث مولانا محمد عبداللہ قادری رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے متمدن علاقوں کے ترقی پذیر گھرانوں کے افراد کو تہذیب و تمدن کی حقیقی روشنی عطا کر رہا تھا۔

آپ نے تحصیل علم کیلئے مختلف علاقوں سے خوشہ چینی کی مگردل کی تشفی نہ ہو سکی اور علم کی تشنگی کا احساس دل سے نہ مٹ سکا۔ بالآخر دینی علوم کے حصول کا جذبہ آپ کو فیصل آباد میں عظیم فقہیہ محدث اعظم پاکستان حضرت مولانا سردار احمد رحمۃ اللہ علیہ کے آستانے پر لے گیا۔ جب آپ اس بحر العلوم کے آستانے پر پہنچے تو یوں محسوس ہوا، جیسے بے چین روح کو قرار آ گیا ہو۔ محدث اعظم حضرت مولانا سردار احمد رحمۃ اللہ علیہ نامور عالم دین، عظیم شیخ الحدیث، تحریک پاکستان کے بے لوث کارکن، دو قومی نظریہ کے پاسدار اور عظیم المرتبت روحانی پیشوا تھے۔ ان کی علمی مجالس مولانا محمد عبداللہ کیلئے پیام شوق ثابت ہوئیں اور ان کے شب و روز اس مرد کامل کی فکری و روحانی صحبتوں کی نذر ہو کر رہ گئے۔ آپ محدث اعظم کے قائم کردہ دینی مدرسہ جامعہ رضویہ فیصل آباد سے دینی علوم کی تحصیل بھی فرماتے اور محدث اعظم کے روحانی فیوض و برکات سے بہرہ اندوز بھی ہوتے۔ آپ کا شمار محدث اعظم مولانا سردار احمد رحمۃ اللہ علیہ کے اولین اور ممتاز شاگردوں میں ہوتا ہے۔ حضرت محدث اعظم بھی

آپ سے غایت درجہ شفقت فرماتے تھے۔ آپ نے اپنی آنکھوں سے جامعہ رضویہ کو ابتدائی مراحل سے لے کر ترقی کی بلند منازل کی جانب گامزن ہوتے دیکھا ہے۔ آپ نہ صرف محدث اعظم کے نامور شاگرد تھے بلکہ آپ نے ان کے دست حق پرست پر بیعت کر کے سلسلہ قادریہ کے فیوض بھی حاصل کئے۔

دینی علوم کی تحصیل کے دوران میں آپ نے بہت سی معاشی اور مادی تکالیف کا سامنا کیا ہے۔ آپ نے محنت مزدوری کو کچھ عار نہ سمجھا بلکہ ہر جائز طریقے سے محنت کے ذرائع استعمال کئے۔ اپنے تعلیمی اخراجات پورے کرنے کیلئے آپ نے جلد سازی کا کام بھی شروع کر دیا اور بہت جلد اس فن میں ایسے طاق ہوئے کہ آپ کے اساتذہ بھی آپ سے جلدیں بندھوانے لگے۔ آپ نے اپنے محترم اساتذہ کے ہر حکم کی تعمیل فرض عین عبادت سمجھ کر کی اور یہ محترم اساتذہ کی تربیت اور ان کی مخلصانہ دعاؤں کا ہی نتیجہ تھا کہ آپ نے آئندہ زندگی میں دینی علوم کی تدریس کے سلسلہ میں جو مقام حاصل کیا، اسے دیکھ کر آپ کے اساتذہ بھی آپ پر فخر کرنے لگے۔ جب آپ محدث اعظم مولانا سردار احمد رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے زانوئے تلمذ طے کر کے درس نظامی کی تکمیل کر رہے تھے تو ایک مرتبہ تحصیل علم کے سلسلہ میں پیش آنے والی مشقتوں کو دیکھ کر گھبرا گئے۔ اسی رات خواب میں والد محترم مولانا فیض الرساں مرحوم کی زیارت نصیب ہوئی۔ جنہوں نے فرمایا کہ بیٹا علم میں محنت اور استقامت دو لازمی چیزیں ہیں ہمت نہ ہارنا تم انشاء اللہ بہت جلد منزل بکنار ہونے والے ہو۔ مولانا محمد عبداللہ فرمایا کرتے تھے کہ اس کے بعد میں نے پہلے سے بھی زیادہ ایمانی استقامت اور روحانی تہ و تاب کے ساتھ تحصیل علم کیلئے اپنی صلاحیتیں نذر کر دیں اور بالآخر حضور محدث اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے روحانی فیوض سے دل و جان کو صوبار کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

حضرت مولانا محمد عبداللہ قادری رحمۃ اللہ علیہ نے محدث اعظم مولانا سردار احمد رحمۃ اللہ علیہ کی ایمان افروز مجالس میں جو وقت گزارا ہے اسے حاصل زندگی تصور کرتے تھے۔ محدث اعظم سے آپ کی محبت عشق کی سرحدوں کو چھوتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ جب حضور محدث اعظم کا انتقال ہوا تو آپ کو یوں محسوس ہوا جیسے دنیا آپ کی نگاہوں میں اندھیر ہو گئی ہے جب بھی محدث اعظم کا تذکرہ چھڑتا تو آپ کی آنکھیں آنسوؤں کے موتی پر رونے لگتیں۔

آپ کی اپنے اعزاء و اقارب سے محبت کا یہ عالم تھا کہ جب آپ شہرت و ناموری کی بلندیوں پر پہنچ گئے تو وہی رشتہ دار جنہوں نے بچپن میں آپ پر عرصہ حیات تنگ کر دیا تھا، تجدید تعلقات کیلئے

آپ کے پاس آئے تو آپ نے کمال شفقت سے نہ صرف سب کو معاف کر دیا بلکہ ان کی تہذیب و اصلاح اور ترقی کیلئے سعی کرنے لگے۔ آپ اپنی زندگی میں جن شخصیات سے سب سے زیادہ متاثر ہوئے ان میں محدث اعظم مولانا سردار احمد رحمۃ اللہ علیہ کے علاوہ آپ کے والد محترم مولانا فیض الرساں سرفہرست تھے اور یہ والد محترم سے محبت ہی کا تقاضا تھا کہ جب آپ نے دینی مدرسہ کی بنیاد رکھی تو اسے اس نسبت سے دارالعلوم نعمانیہ رضویہ فیض العلوم کا نام دیا۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ جب اس نام کو دہراتا ہوں تو مجھے روحانی گداز کا احساس ہوتا ہے۔

تخصیص علم کے بعد جب آپ گوجرانوالہ تشریف لائے تو کئی برس تک یہاں کی معروف دینی درس گاہ جامعہ حنفیہ رضویہ سراج العلوم میں شیخ الحدیث کی حیثیت سے فرائض انجام دیتے رہے۔ اسی دوران میں آپ نے کئی مساجد میں خطابت اور درس قرآن کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ بلاآخر آپ کے ذہن میں نئی جامعہ کے قیام کے منصوبے نے جنم لیا اور آپ نے دارالعلوم نعمانیہ رضویہ فیض العلوم جیسے معیاری دانش کدہ کی بنیاد رکھی۔ اس درس گاہ کے قیام سے لے کر زندگی کے آخری ایام تک آپ شیخ القرآن والحدیث اور مفتی کی حیثیت سے فرائض منصبی انجام دیتے رہے۔ آپ کو یہ درس گاہ اس قدر عزیز تھی کہ جس روز آپ کا انتقال ہوا اس روز بھی اس کی عمارت کی شاپان شان تکمیل اور اس میں خاطر خواہ اضافے کیلئے کام کرتے رہے۔

دارالعلوم نعمانیہ رضویہ فیض العلوم کے قیام کے ساتھ ہی آپ نے مدرسہ سے ملحق جامع مسجد نعمان کی بنیاد رکھی جس جگہ آج مسجد نعمان کی خوبصورت عمارت نظر آتی ہے پہلے یہاں پانی ہی پانی تھا۔ اس جگہ کئی بار مٹی ڈلوائی گئی پھر یہ جگہ بنیاد رکھنے کے قابل ہوئی۔ آپ تعمیر کے کام کی دلچسپی سے نگرانی کرتے۔

مولانا محمد عبداللہ قادری اپنے کردار کے لحاظ سے مسلمانوں کی عظمت رفتہ کی نشانی تھے۔ آپ کی انتہائی آرزو تھی کہ جہالت کا دور دورہ ختم ہو اور امت اسلام کے افراد کے دل شیخ اسلام کی عالمگیر روشنی سے جگمگا اٹھے۔ آپ کا شمار شہر کی مقبول ترین شخصیات میں ہوتا تھا۔ آپ سے علم حاصل کرنے والوں میں ایک تعداد ان خواتین کی تھی جو گھریلو ذمہ داریوں کی بناء پر باقاعدہ داخلہ نہیں لے سکتی تھیں۔ یہ خواتین فرط احترام سے آپ کو اباجی کہتی تھیں۔ ان کو دیکھا دیکھی علاقہ کی تمام خواتین اور بچیاں آپ کو اباجی کہنے لگیں۔ آپ نے پدرانہ شفقت کے ساتھ اسلامی تعلیمات کی دولت تقسیم کی۔ آپ کی زندگی اس حقیقت کی تفسیر تھی۔

یہی ہے آرزو تعلیم قرآن عام ہو جائے
ہر اک پرچم سے اونچا پرچم اسلام ہو جائے
مولانا محمد عبداللہ قادری رحمۃ اللہ علیہ صحیح معنوں میں عالم باعمل اور عاشق رسول تھے۔ آپ
نے اپنی زندگی کو اس طرح سے سیرت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے سانچے میں ڈھال دیا تھا کہ آپ
کو دیکھ کر بے اختیار عشق مصطفیٰ کی رفعتوں کا احساس ہونے لگتا تھا، جب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا
اسم گرامی سنتے تو آنکھیں شوق عقیدت سے نم ہو جاتیں۔ ہمیشہ اتباع مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم کی
کوشش کرتے۔ سادہ لباس زیب تن کرتے اور فرمایا کرتے کہ علماء کا حقیقی افتخار ”الفقر فخری“ ہے علماء کو
دنیاوی تعیشات اور حرص و ہوس سے بے نیاز ہو کر اسوۂ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔

محبت رسول کا یہ عالم تھا کہ آخری دنوں میں کہنے لگے کہ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ میری
عمر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ رہی ہے۔ یہ تو عشق رسول نہ ہو، عشق رسول تو محبوب خدا
کی ایک ادا کی پیروی کا دوسرا نام ہے۔ آپ نے اپنی عمر کے بڑھنے کا حسرت آمیز ذکر جس روز
کیا اس سے دو دن بعد ہی آپ کا وصال ہو گیا۔

یہ محبت رسول ہی کا فیضان تھا کہ پوری زندگی میں انسانیت نوازی کو شعار حیات بنائے رکھا
اور دکھیوں اور غریبوں کی دل کھول کر امداد فرماتے رہے۔

کہتے ہیں ہر بڑے آدمی کی زندگی کے پس منظر میں جھانکنے پر اس کی رفیقہ حیات کی محنت
بھی بدرجہ اتم کارفرما نظر آتی ہے۔ آپ کی رفیقہ حیات نے جو ایک صالحہ اور نہایت پاکباز اور باہمت
خاتون ہیں، اس علمی جدوجہد میں ہر قدم پر آپ کا ساتھ دیا۔ آپ کو اپنی رفیقہ حیات کے جذبہ ایثار
فکری تعاون اور جرأت و حوصلہ کا بھرپور احساس تھا۔ اس سلسلہ میں آپ خود کو نہایت خوش بخت تصور
کیا کرتے تھے کہ ایسی خاتون کی رفاقت میسر آئی ہے جو مشکلات و حوادث کے مقابل ایمانی استقامت
کے ساتھ سینہ سپر ہونے کا حوصلہ رکھتی ہے۔

مولانا محمد عبداللہ قادری رحمۃ اللہ علیہ زاہد خشک نہ تھے بلکہ صحیح معنوں میں عالم باعمل اور عابد
شب زندہ دار تھے۔ صبح تہجد کیلئے اٹھنا اور عبادت و ریاضت میں کثیر وقت صرف کرنا ان کی زندگی کا
معمول تھا۔ قرآن حکیم کی بہت زیادہ تلاوت فرماتے۔ بالخصوص ماہ رمضان المبارک میں کثرت سے
قرآن پاک ختم کرتے۔ ان کی زندگی درویشی و پارسائی کا مرقع تھی۔ سادگی ایسی کہ سجاوٹ کو رشک
آئے۔ پارسائی ایسی کہ ایمان کی سر بلندیوں کا احساس ہونے لگے۔ علوم دینیہ پر دسترس کا یہ عالم کہ

بڑے بڑے عالم آپ کے سامنے زانوئے تلمذ طے کرنا وجہ صد افتخار سمجھیں۔ آپ کے حلقہ درس سے فیضیاب ہونے والے بہت سے علماء شہر گوجرانوالہ اور ملک کے دوسرے علاقوں میں خطابت اور درس و تدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

آپ مطالعہ کے نہایت شوقین تھے۔ درس و تدریس سے جتنا وقت میسر آتا، کتب دینیہ کے مطالعہ میں صرف کر دیتے۔ آپ کی لائبریری قرآن و احادیث، تفاسیر اور فقہی مسائل پر مشتمل کتب کے بہت بڑے ذخیرے پر مشتمل ہے۔ جس رات آپ کا وصال ہوا، اس رات بھی آپ درس و تدریس سے فراغت پا کر کھانے سے فارغ ہوئے تو دیر تک عبادات اور ذکر الہی میں مشغول رہے۔ یہ سب کچھ آپ کے معمولات کا حصہ تھا۔ عبادات سے فارغ ہوئے تو مطالعہ میں مصروف ہو گئے۔

دینی کتب کے مطالعہ کا یہ سلسلہ ساڑھے گیارہ بجے شب تک جاری رہا۔ ذرا دیر کے بعد دل کو گھبراہٹ ہوئی تو کتاب ایک طرف رکھ دی۔ گھر والے ڈاکٹر کی تلاش میں نکلے تو فرمایا اس کا کوئی فائدہ نہیں، ہمیں رب کائنات کی طرف سے بلاوا آچکا ہے۔ ڈاکٹر بہت جلد مل گیا اور اندر آپ کے پاس پہنچا اور آپ کی نبض پر ہاتھ رکھا۔ اہل خانہ کا بیان ہے کہ ڈاکٹر کی تلاش میں جانے اور ڈاکٹر کے آنے کے دوران میں آپ نے کلمہ شہادت کا ورد کیا، آیات قرآنی تلاوت فرمائیں، صبر کی تلقین کی اور خاموش ہو گئے۔ یہ سب کچھ اتنی جلدی ہوا کہ گھر والے اس حقیقت کو تسلیم کرنے پر تیار ہی نہیں تھے کہ شیخ الحدیث ہم سے جدا ہو چکے ہیں۔ وقت اجل یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے آپ ابدی نیند سو رہے ہوں۔ چہرے پر ایک دائمی ملکوتی تبسم رقصاں تھا، اس وقت آپ اس بندہ مومن کی تفسیر نظر آ رہے تھے جس کو دنیا کے قرب سے زیادہ خلاق عظیم کی قربت عزیز ہوتی ہے اور جو ”موتو قبل انت موتو“ کی زندہ تفسیر میں ڈھل کر اس شعر کا مصداق بن جاتا ہے کہ:

اے موت آ کے فقیروں سے تجھے کیا لینا ہے

مرنے سے پہلے ہی یہ لوگ تو مر جاتے ہیں

آپ کی تاریخ وصال ۳۱ اکتوبر ۱۹۸۸ء بروز پیر شریف ہے جبکہ آپ کے جدا ہونے کی ساعت ساڑھے بارہ بجے شب ہے۔ آپ کے وصال کی خبر آپ کے بے شمار تلامذہ، ارادت مندوں، عقیدتمندوں اور آپ سے جذباتی وابستگی رکھنے والے علماء و فضلاء، مشائخ اور زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے اصحاب پر بجلی بن کر گری۔ جب آپ کا جنازہ اٹھایا گیا تو چاروں جانب سوگواروں کا ہجوم ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ نماز جنازہ میں ہزاروں غم زدہ افراد نے شرکت کی۔ ہر دل آپ کے فراق

میں گریہ کناں تھا اور ہر آنکھ اشکبار۔ بالآخر آپ کو اسی جامعہ نعمانیہ فیض العلوم کے پہلو میں سپرد خاک کر دیا گیا، جس کی فضاؤں میں آپ نے عشق مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشبو بکھیری تھی اور جس کے در و دیوار برسوں سے آپ کی علمی و فقہی کاوشوں کے شاہد تھے۔

آپ کے سانچے ارتحال کے بعد سب سے اہم کام آپ کے مدرسہ کو سلامت رکھنا، اس کے معیار کو قائم رکھنا اور اسے آپ کی دینی یادگار سمجھ کر چلانا تھا۔ حالات نہایت نامساعد تھے مگر آپ کی باہمت صاحبزادی محترمہ سمعیہ عبداللہ قادری جو دینی و دنیاوی تعلیم سے بہرہ ور تھیں، ایمانی استقلال سے آگے بڑھیں اور جامعہ کی مہتمم کے فرائض بحسن و خوبی سنبھال لئے۔ لڑکوں کی تعلیم کیلئے حافظ و قاری اور علمائے دین فرائض تدریس انجام دے رہے ہیں، جبکہ بچیوں کی دینی تدریس کا فریضہ وہ خود انجام دے رہی ہیں۔ پردے کا سختی سے اہتمام ہے اور لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم کے علیحدہ علیحدہ باپردہ حصے ہیں۔ صاحبزادی سمعیہ عبداللہ قادری ذہنی علوم کی عالمہ ہونے کے علاوہ ممتاز مقررہ بھی ہیں اور اصلاح احوال اور دینی موضوعات پر خواتین کے بڑے بڑے باپردہ اجتماعات سے خطاب کرتی ہیں۔



غزالی دوراں

رئیس المحدثین حضرت علامہ سید احمد سعید کاظمی

مہد سے لحد تک

تاریخ اسلام اس امر کی شاہد ہے کہ علمائے حق نے تبلیغ دین مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم کی ترویج و اشاعت کیلئے ہمیشہ ناقابل فراموش خدمات انجام دی ہیں۔ تحریک احیائے دین ہو یا ظلمات فکر کے خلاف جہاد کا مرحلہ اصلاح امت اسلام کا مسئلہ ہو یا جدوجہد آزادی کی زہرہ گداز داستان عزیمت ان بزرگان دین نے اپنی تمام فکری و روحانی قوتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنے مقصد عظیم کی کامیابی کیلئے لازوال کردار ادا کیا ہے۔ چونکہ ان کے مقاصد عظیم، عزائم سر بلند اور حوصلے فراخ ہوتے ہیں اس لئے تائید ایزدی ان کے شامل حال ہوتی ہے۔

غزالی دوراں رازی زماں حضرت قبلہ سید احمد سعید کاظمی کی ذات والا صفات مدتوں ایک شمع حق و صداقت کی صورت ظلمات خرد کو منور کرتی رہی۔ آپ رئیس المحدثین تھے کہ آپ کے بے شمار تلامذہ علم حدیث میں غیر معمولی کمال حاصل کر چکے ہیں۔ استاذ الاساتذہ تھے کہ آپ کے حلقہ تلمذ سے فیضاب ہونے والے علماء علوم دینیہ کی گھٹیاں سلجھا رہے ہیں۔ دانائے عصر تھے کہ آپ کی فکری رفعتیں متلاشیان منزل علم و آگہی کو افکار تازہ کا سلیقہ بخش رہی ہیں۔ پیر طریقت تھے کہ ان کی نگہ فیض رساں سے ایک زمانہ روحانی لذتوں سے بہرہ یاب ہو رہا ہے۔ پیکر رشد و ہدایت تھے عظمت اسلاف کے امین تھے شفقت بے کراں کا نشان اور رفعت کردار کی پہچان تھے۔ ان کی فکری سر بلندیاں اس امر کا منہ بولتا ثبوت تھیں کہ:

مستند ہے میرا فرمایا ہوا

سارے عالم پر ہوں میں چھایا ہوا

علامہ کاظمی ۱۹۱۳ء کو امر وہہ کے مقام پر پیدا ہوئے۔ والد گرامی حضرت سید محمد مختار کاظمی رحمۃ

اللہ علیہ تھے۔ ابتدائے عمر ہی میں آپ کے والد محترم وفات پا گئے تو برادر بزرگوار حضرت علامہ سید محمد خلیل کاظمی رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کی تعلیم و تربیت کا بار عظیم اٹھایا۔ علامہ سید محمد خلیل کاظمی محدث امر وہی اپنے وقت کے نامور عالم دین اور صاحب طریقت تھے۔ شاہ جہان پور کے مدرسہ بحر العلوم میں جہاں علامہ سید محمد خلیل فرائض تدریس انجام دے رہے تھے، حضرت کاظمی کی تعلیمی زندگی کا آغاز ہوا۔ آپ نے علوم دینیہ و شرعیہ پر اس تیزی سے عبور حاصل کیا کہ سولہ سال کی عمر ہی میں آپ کو فارغ التحصیل قرار دیا گیا۔ حضرت قبلہ شاہ حسین اشرفی کچھوچھوی رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کی دستار بندی فرمائی۔ دستار بندی کے مبارک اجتماع میں صدر الافاضل حضرت مراد آبادی سمیت کتنے ہی نادر روزگار شیوخ و علماء اس تاریخی اجلاس کی سعادتوں میں اضافہ کر رہے تھے۔

آپ کی تدریسی زندگی کا آغاز برصغیر کی عظیم مذہبی درس گاہ جامعہ نعمانیہ لاہور سے ہوا۔ آپ لاہور کے جید علمائے کرام سے ملاقات کی خاطر یہاں تشریف لائے۔ جامعہ نعمانیہ پہنچے اور وہاں دوران گفتگو دینی مسائل پر اس حسن اعتماد اور فکری سوز کے ساتھ گفتگو فرمائی کہ حضرت علامہ حافظ محمد جمال بے بیجاہ متاثر ہوئے اور فوراً جامعہ کے اکابرین سے کہہ کر آپ کی تقرری وہاں کروالی۔ آپ نے جامعہ نعمانیہ میں اس جذباتی لگن علمی و فکری اور روحانی جذب و خلوص سے پڑھایا کہ جامعہ نعمانیہ تشنگان علوم دینیہ کیلئے روحانی سکون کا مظہر بن گئی۔ کچھ عرصہ اس جامعہ میں فرائض انجام دینے کے بعد آپ اپنے آبائی قصبہ امر وہہ (مراد آباد) میں تشریف لے گئے اور چار سال تک وہاں کے مدرسہ محمدیہ حنفیہ امر وہہ میں پڑھاتے رہے۔ آپ نے یہاں بھی اپنی علمی قابلیت کا لوہا منوا کر اس درسگاہ کو اصحاب علم کے دلوں کی دھڑکن بنا دیا۔ ایک سال کیلئے آپ نے اوکاڑہ میں بھی فرائض تدریس انجام دیتے ہوئے ترویج علوم دین کا مقدس فریضہ سرانجام دیا۔

ایک عظیم شیخ الحدیث اور ماہر علوم اسلامی کی حیثیت سے آپ کی شہرت برصغیر پاک و ہند میں پھیل چکی تھی۔ اس بارہ وقت آچکا تھا کہ آپ اپنی تمام علمی و روحانی قوتوں کو ایک مرکز پر سمیٹ کر کاروان سعید کی حدی ثوانی کا فریضہ انجام دیں۔ آپ نے علوم دین کی شمع روشن کرنے کیلئے مدینہ الاولیاء ملتان شریف کا انتخاب کیا۔ ۱۹۳۵ء میں آپ ملتان تشریف لے آئے اور مدرسہ انوار العلوم کی بنیاد رکھی۔ اس شہر میں تدریس کا آغاز آپ نے اپنے رہائشی مکان سے کیا۔ کچھ عرصہ ایک مسجد میں پڑھاتے رہے۔ پھر چلے گئے۔ بعد جب طالبان علوم اسلامیہ کی تعداد بہت زیادہ بڑھ گئی تو آپ نے ایک وسیع خطہ زمین خرید کر عظیم الشان جامعہ انوار العلوم کی تعمیر کا آغاز کر دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے

یہ دارالعلوم ایک شاندار عمارت میں اشاعت دین کا پرچم لہرانے لگا۔ آج جامعہ انوار العلوم ملتان کا شمار برصغیر پاک و ہند کے چند عظیم الشان دینی اداروں میں ہوتا ہے۔ آپ نے بے شمار تلامذہ کو علمی سر بلندیاں ہی عطا نہیں کیں بلکہ اپنے افکار کی روشنی سے ان کے قلوب و اذہان کو یوں جگمگا دیا کہ وہ آج اپنے وطن ہی میں نہیں بلکہ پوری دنیا میں اسلامی تعلیمات کے فیوض عام کر رہے ہیں۔ سچ ہے کہ:

۔ جہان تازہ کی افکار تازہ سے ہے نمود

کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

حضرت علامہ سید کاظمی رحمۃ اللہ علیہ کا شمار تحریک پاکستان کے نامور مجاہدین میں ہوتا ہے۔ مشائخ و علمائے اہلسنت و جماعت کو یہ شرف حاصل ہے کہ انہوں نے اسلامیان برصغیر کی بروقت ناخدائی کرتے ہوئے قیام پاکستان کیلئے ناقابل فراموش خدمات انجام دیں۔ حضرت علامہ کاظمی نے دوسرے شیوخ و علماء کے ہمراہ مسلم لیگ کے پیغام کو عام کرنے اور نظریہ پاکستان کے حقیقی مفہوم کو برصغیر کے مسلمانوں تک پہنچانے کیلئے تاریخ ساز کردار ادا کیا۔ آپ نے نہ صرف اسلام دشمن قوتوں کی ریشہ دوانیوں کا بھرپور جواب دیا بلکہ کانگریس نواز مسلم علماء کے پاکستان مخالف پروپیگنڈا کا بھی دندان شکن جواب دیتے رہے۔ آپ نے پاکستان کے مقاصد عظیم کی اہمیت کو عام کرنے کیلئے مختلف وقفوں سے منعقد ہونے والی سنی کانفرنسوں میں شرکت کی۔

۱۹۴۶ء میں بنارس میں منعقد ہونے والی سنی کانفرنس میں آپ نے صرف شریک ہوئے بلکہ اس کی قراردادوں کو موثر بنانے اور کاروان آزادی کی رفتار کو تیز تر کرنے کیلئے کام کرتے رہے۔ صدر الافاضل حضرت مراد آبادی، حضرت محدث کچھوچھوی، حضرت امیر ملت محدث علی پوری، پیر صاحب مانگی شریف، شاہ عبدالعلیم میرٹھی، مولانا عبدالحامد بدایونی، مولانا ابوالحسنات، شیخ القرآن علامہ ہزاروی (رحمۃ اللہ علیہم) جیسے مشائخ و علمائے اہلسنت کے ہمراہ آپ نے برصغیر کے طول و عرض میں دورے کئے اور بے شمار اجتماعات سے خطاب کرتے ہوئے قیام پاکستان کو اسلامیان برصغیر کا مقدر قرار دیا۔ آپ جب ۱۹۴۵ء میں حج کیلئے تشریف لے گئے تو وہاں بھی علماء کے عظیم اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے پاکستان کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ حضرت قائد اعظم محمد علی جناح سے ملاقات کر کے انہیں مسلمانان برصغیر کے جذبات سے آگاہ کیا اور نظریہ پاکستان کی اسلامی اہمیت کو روشناس کرانے کیلئے اخبارات میں متعدد مضامین رقم فرمائے۔ انگریز اور ہندو کی مشترکہ قوت نے آپ کا راستہ روکنا چاہا مگر آپ ثابت قدمی سے اپنے موقف پر جمے رہے۔ بالآخر آپ اور دوسرے مشائخ و علماء کی قربانیوں

کا شمر قیام پاکستان کی صورت میں صبح آزادی کی تنویر بن گیا۔

قیام پاکستان کے بعد ضرورت تھی کہ کاروان سنیت کو پھر سے منظم کیا جاتا۔ چنانچہ آپ کی تحریک پر مدرسہ انوار العلوم ملتان میں ۱۹۴۸ء میں وسیع پیمانے پر مشائخ و علمائے کرام کا کنونشن بلایا گیا۔ اس اجلاس میں خدمت دین و وطن کی خاطر جمعیت علمائے پاکستان کی داغ بیل ڈالی گئی۔ اس موقع پر حضرت ابوالحسنات علامہ سید محمد احمد قادری رحمۃ اللہ علیہ جمعیت کے صدر اور آپ ناظم اعلیٰ منتخب ہوئے۔ آپ ایک عرصہ تک اس عہدہ پر کام کرتے رہے۔ آپ نے جمعیت العلمائے پاکستان کو عوام میں متعارف کروانے اور اس کے قیام کی افادیت بیان کرنے کیلئے طویل دورے کئے۔ آپ نے عوام اہلسنت کی بیداری کیلئے شبانہ روز کام کیا۔ آپ کی قیادت اور تعاون کے سہارے اکتوبر ۱۹۷۸ء میں ملتان میں کل پاکستان سنی کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس تاریخی کانفرنس میں تیس لاکھ کے قریب غلامان مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وسلم) شریک ہوئے۔ اسی اجتماع عظیم میں آپ اور حضرت مولانا شاہ احمد نورانی سمیت جملہ قائدین پر بھرپور اعتماد کرتے ہوئے جماعت اہلسنت پاکستان کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اسی تاریخی اجتماع میں آپ کو جماعت اہلسنت پاکستان کا مرکزی صدر منتخب کر لیا گیا۔ آپ وصال تک اسی عہدہ پر کام کرتے ہوئے ملت احناف کی روحانی و علمی قیادت فرما رہے تھے۔

حضرت علامہ کاظمی نومبر ۱۹۷۸ء میں تنظیم المدارس اہلسنت و جماعت پاکستان کے مرکزی صدر منتخب ہوئے۔ پیرانہ سالی کے باوجود آپ نے قوم کی آواز پر لبیک کہا اور سنی مدارس کو اشاعت دین اور ترویج تعلیمات محمدیہ کی خاطر نئی زندگی بخش دی۔ ان مدارس کے طریق تعلیم، نصاب اور انداز تدریس کو پہلے کی نسبت کہیں زیادہ موثر بنا دیا۔ پاکستان کے مختلف شہروں سے تعلق رکھنے والے سینکڑوں مدارس مدتوں آپ کی راہنمائی نہ بصیرت سے مستفیض ہوتے رہے۔ آپ کے علمی کمالات اور فقہی عظمتوں کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب اسلامی یونیورسٹی بہاولپور کا قیام عمل میں لایا گیا تو صدر شعبہ حدیث کے عہدہ کیلئے آپ سے درخواست کی گئی۔ یہ عہدہ آپ ہی کیلئے نہیں بلکہ جملہ علمائے اہلسنت و جماعت کیلئے اعزاز تھا۔ خدمت علم الحدیث کی خاطر آپ نے اس عہدہ کو قبول کر لیا اور اس یونیورسٹی میں ۱۹۶۳ء سے ۱۹۷۲ء تک علمی و فقہی جواہر پارے لٹاتے رہے۔

آپ کو خدائے کریم نے غیر معمولی طور پر مناظرانہ صلاحیتوں سے بہرہ ور فرمایا تھا۔ زبردست مطالعہ عظیم قوت استدلال، بلند نکتہ رسی، تبحر دینی اور بے مثال فقہی کمالات کی بدولت آپ نے تبلیغ اسلام کی خاطر مخالفین اسلام کے ساتھ مناظرے کئے اور انہیں شکست دیکر عظمت اسلام کا پرچم لہرایا۔

آپ کی زندگی کا مشن تحفظ مقام مصطفیٰ تھا اس لئے حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شان اقدس میں معمولی سی گستاخی بھی آپ کیلئے ناقابل برداشت تھی۔ آپ نے گستاخان مقام مصطفیٰ کو بروقت لٹکارا اور میدان مناظرہ میں اپنی ایمانی سطوتوں کا اظہار فرماتے ہوئے مخالفین کو عبرتناک شکست سے دوچار کیا۔ آپ نے فتنہ انکار حدیث، فتنہ قادیانیت، فتنہ ارتداد کے ساتھ ساتھ توہین رسالت کا ارتکاب کرنے والوں کی اس طور سرکوبی کی کہ عظمت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شمع حسین کی جلوہ گری خرد گزیدہ دلوں کو مستنیر کرنے لگی۔

آپ کے محاسن کا تذکرہ کرتے ہیں تو آپ کی ہمالہ صفت علمی و روحانی شخصیت کی رفعتوں کا تصور کرتے ہوئے ذہن و قلم کو عجز کا اظہار کرنا پڑتا ہے۔ آپ اپنے برادر محترم حضرت علامہ سید محمد خلیل رحمۃ اللہ علیہ سے جو کہ آپ کے استاد بھی تھے بیعت تھے۔ انہی سے آپ کو خلافت عطا ہوئی۔ چھوٹی سی عمر میں اپنے برادر بزرگوار کے ہمراہ حضور اعلیٰ حضرت شاہ احمد رضا خاں بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت اقدس میں بریلی شریف حاضر ہوئے تو اعلیٰ حضرت نے بے اختیار انہیں گود میں اٹھالیا اور دیر تک آپ کو اپنی دعاؤں اور شفقتوں سے نوازتے رہے۔ یہ انہی دعاؤں کا فیضان تھا کہ آپ عرصہ تک خاتم المحدثین کی حیثیت سے دنیائے اسلام کو اپنے فیوض و برکات سے بہرہ یاب فرماتے رہے۔ جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ حضرت علامہ کاظمی رحمۃ اللہ علیہ نے سولہ سال کی عمر میں ہی دینی تعلیم مکمل کر کے تدریسی زندگی کا آغاز فرما دیا تھا۔ اس چھوٹی عمر میں اس قدر عظمت علم و فکر بہت کم اصحاب کو ودیعت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے معاصرین ہر دور میں آپ کے وجود کو سرمایہ افتخار سمجھتے رہے ہیں جبکہ بزرگان دین آپ کے علمی کمالات کا اعتراف کرتے ہوئے آپ کو اپنی دعاؤں اور روحانی نوازشات سے نوازتے رہے۔ آپ کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ آپ اپنی تدریسی زندگی کے آغاز ہی میں جلیل القدر مشائخ و علمائے کرام کی توجہ کے مرکز اور ان کی آنکھوں کا تارا بن گئے تھے۔ حضرت صدر الافاضل مولانا نعیم الدین مراد آبادی، حضرت سید محدث کچھوچھوی اور حضرت مولانا دیدار علی شاہ الوری رحمۃ اللہ علیہم اور جملہ بزرگان ملت آپ کو دعاؤں سے نوازتے اور آپ کی علمی صلاحیتوں کی تابندگی کی نوید سناتے رہے۔ بزرگان ملت اسلام کی یہی دعائیں تازیت امام اہلسنت حضرت علامہ سید احمد سعید کاظمی رحمۃ اللہ علیہ کی پشتیان اور ان کی زندگی کا سرمایہ افتخار بنی رہیں۔ سید صاحب کی شخصیت بلاشبہ بھی خواہاں سنیت ہی کیلئے نہیں تمام فرزند ان توحید کیلئے باعث اعزاز تھی۔ اپنے ہی نہیں بلکہ اغیار بھی آپ کی علمی صلاحیتوں کے معترف اور قدردان تھے۔ وطن عزیز

پاکستان ہی میں نہیں بلکہ پوری دنیائے اسلام میں آپ کے علمی کمالات کا علم صداقت آفریں لہر رہا تھا۔ اسلامی نظریاتی کونسل کے فاضل رکن کی حیثیت سے آپ کی خدمات لائق صد تحسین تھیں۔ آپ بے شمار فقہی مسائل، اجتہادی نکات اور علمی امور میں کونسل کی راہنمائی فرماتے رہے۔

حضرت علامہ کاظمی اسلامی اقدار کے علمبردار اور نظریہ پاکستان کے فدائی تھے۔ آپ کو تحریک پاکستان میں موثر کردار ادا کرنے کا شرف حاصل رہا ہے اسلئے آپ کی تحریروں میں دو قومی نظریہ پاکستان کی تشریح و تعبیر جھلکتی ہے۔ جس طرح باغبان کو گوارا نہیں ہوتا کہ اس کے گلشن کو معمولی سا نقصان بھی پہنچے اسی طرح آپ بھی کسی ملک دشمن قوت کے ناپاک عزائم کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ آپ دوسرے سینکڑوں علماء و مشائخ کے ساتھ مل کر اپنے خون جگر سے گلشن پاکستان کی آبیاری کرتے ہوئے اور مخالفین پاکستان کی ناپاک جسارتوں کا منہ توڑ جواب دیتے ہوئے ہمیشہ اس مملکت خدا داد کی نظریاتی سرحدوں کا دفاع کرتے رہے۔ چونکہ پاکستان اسلام کے نام پر قائم ہوا ہے اس لئے آپ نے ہمیشہ اس امر پر زور دیا کہ اس کا نظریاتی تشخص فقط اسی صورت برقرار رہ سکتا ہے کہ یہاں نظام مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں اسلامی نظام بلا تاخیر رائج کیا جائے۔ پاکستان دنیائے اسلام کا قلعہ اور عالم انسانیت کی امیدوں کا مرکز ہے۔ اسلام اس ملک کا افتخار بھی ہے اور اس کی پہچان بھی۔

۔ اک ابر نور بہار فضاؤں پہ چھا گیا

اسلام اس چمن کی رگوں میں سا گیا

حضرت علامہ سید احمد سعید کاظمی رحمۃ اللہ علیہ کو رب ذوالجلال نے علمی و روحانی سر بلندیوں کے ساتھ ساتھ تقریر و تحریر کی غیر معمولی رفعتوں سے بھی نوازا تھا۔ آپ کا انداز تقریر نہایت موثر اور دل نشیں تھا۔ بات کرتے تھے تو خوشبوئے جاں بخش کی طرح اس کی تاثیر مشام فکر کو معنیر کرنے لگتی تھی۔ دوران تقریر میں الفاظ کے جواہر بے بہا لٹاتے تھے تو حاضرین کو دامن ادراک کی تنگی کا احساس ستانے لگتا تھا۔ آپ کی تقریر کا یہ حیرت انگیز کمال دیکھا کہ علمی و فقہی مسائل سلجھاتے ہوئے حکمت و موعظت کا بحر بے کراں ٹھاٹھیں مار رہا ہے اور عوام اس درجہ استغراق سے محو سماعت اور مصروف نظارا ہیں کہ انہیں وجود کا احساس تک نہیں ہو رہا۔ اگر احساس ہوتا بھی تو یہی:

۔ دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

آپ صاحب تصانیف کثیرہ بھی تھے۔ مختلف مذہبی، اخلاقی و روحانی، علمی اور فکری و فقہی

موضوعات سے آپ کی متعدد تصانیف زیور طباعت سے آراستہ ہو چکی ہیں۔ یہ تصانیف دنیائے علم و ادب کا سرمایہ اعزاز بھی ہیں اور علمائے امت محمدیہ کیلئے مشعل راہ بھی۔ مقالات کاظمی کے نام سے آپ کے مبسوط اور تحقیقی مضامین کے تین ضخیم مجموعے اشاعت پذیر ہو چکے ہیں۔ چوتھا مجموعہ عنقریب شائع ہو رہا ہے۔ آپ کی دیگر تصانیف میں سے ”الحق المبین“ ”معراج النبی“ اور ”حیات النبی“ خصوصی اہمیت کی حامل ہیں۔ آپ کی انتہائی آرزو تھی کہ تفسیر قرآن مکمل کر جاؤں مگر آپ دارالعلوم کی انتظامی و تدریسی ذمہ داریوں، جماعت اہلسنت کے تنظیمی امور، تبلیغ اسلام اور اپنے روحانی سلسلے کے ضمن میں مریدوں اور شاگردوں کی اصلاح احوال میں اس طور گھر چکے تھے کہ وقت نکالنا مشکل تھا۔ مصروفیات کے اس کوہ گراں سے نبرد آزما ہو کر بھی آپ نے تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری رکھا۔ ”البيان“ کے عنوان سے تفسیر قرآن کا کچھ حصہ مکمل کر چکے تھے۔ تاہم اسی نام سے ترجمہ قرآن اصحاب ایمان کی فکری و نظری جلا کا باعث بن رہا ہے۔ آپ نے باطل نظریات کے رد کیلئے اپنے قلم سے تلوار کا کام کیا۔ اس سلسلہ میں تقریر منیر، اسلام اور عیسائیت، مکالمہ کاظمی و مودودی، قربانی پر تحقیق، اسلام میں رجم کا مسئلہ، اسلام میں سیاسی جماعتیں وغیرہ بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

آپ کی ذات والا صفات سیرت و کردار کا ایک ایسا گلشن بے خزاں تھی جس کی عطر بیزی سے ایک زمانہ معطر ہوتا رہے گا۔ آپ کی شخصیت ایک ایسا مینار ہدایت تھی جس سے پھوٹنے والی کرنیں ظلمات خرد کو کافور کرنے کا باعث بنتی رہیں گی۔ زندگی کے قافلے زواں دواں رہیں گے لیکن آپ جیسا دانائے راز شاید ہی دیکھنے کو ملے گا۔

سفر آخرت

ع..... ایک روشنی تھی ساتھ گئی آفتاب کے

پیرانہ سالی میں آپ کی صحت عرصہ سے خراب تھی مگر آپ نے اپنے معمولات کو ترک نہیں کیا تھا۔ آپ اپنی پوری توجہ ترجمہ اور تفسیر قرآن اور مدرسہ انوار العلوم پر صرف کئے ہوئے تھے۔ اگرچہ صحت کی کمزوری کی بناء پر آپ بیرونی دوروں پر جانے سے گریز کرتے تھے۔ پھر بھی چاہنے والوں کی محبت تھی کہ آپ کو مجبور کر دیا کرتی تھی اور آپ کو تنظیمی اور تبلیغی اجتماعات سے خطاب کیلئے جانا ہی پڑتا تھا۔

آپ کے فیوض سے ایک زمانہ مستفیض ہو رہا تھا۔ آپ کی برکات کی کہکشاں دلوں کو عرفان خدا کی روشنی عطا کر رہی تھیں۔ اگرچہ آپ کی تیزی سے گزرتی ہوئی صحت عشاق کو بعض اوقات پریشان

کر دیا کرتی تھی پھر بھی ہر آن دلوں سے یہی دعا ابھرتی تھی کہ خدایا غزالی دوران کی عنایات ہم پہ ہمیشہ سایہ نغمہ رہیں اور ان کی سیادت و قیادت میں کاروان سنیت اسی طور منزل مقصود کی جانب گامزن رہے۔
ع..... پر تلا کرتی ہیں تدبیروں سے تقدیریں کہیں

۴ جون ۱۹۸۶ء کا دن امام اہلسنت کے چراغ حیات کے گل ہونے کا ایمان آفرین نظارا دیکھنے کیلئے افق فطرت سے ابھر آیا۔ یہ ماہ رمضان المبارک کی پچیس تاریخ تھی۔ خرابی صحت کے پیش نظر معالجین کے شدید طور پر منع کرنے کے باوجود آپ روزے رکھ رہے تھے۔ جملہ روحانی، تبلیغی اور نظریاتی معمولات بھی جاری تھے، مجال خاص، ارادت مندوں اور متلاشیان حق کا ہجوم آپ کی رہائش گاہ پر رات گئے تک موجود رہتا۔ دراصل پروانوں کو شمع کی روشنی ماند پڑنے کا احساس ہو چلا تھا اس لئے ان دنوں ہجوم کچھ زیادہ ہی بڑھ گیا۔

اس تاریخ کو بھی آپ نے روزہ رکھا۔ دن ڈھلنے لگا، آپ کی رہائش گاہ کے لان میں پروانوں کا ہجوم بڑھنے لگا۔ افطاری کا اعلان ہو گیا تو آپ نے اہل خانہ کے ساتھ روزہ افطار کیا۔ صنفیں بچھ چکی تھیں، امام اہلسنت آگے بڑھے اور مصلیٰ پر کھڑے ہو گئے۔ اچانک دل پر دباؤ محسوس ہوا، فوراً دل پر ہاتھ رکھا اور لیٹ گئے۔ صاحبزادگان آگے بڑھے انہوں نے گمان کیا کہ یہ معمول کا دورہ ہے۔ آگے بڑھے اور آپ کے دل پر مالش کرنے لگے مگر کچھ حاصل نہ ہوا اور بہت جلد امام اہلسنت خالق حقیقی سے جا ملے۔

ہچکیاں دو آئیں گویا یار کا پیغام تھا

شاید پیک اجل کے ہاتھ سے کا جام تھا

صاحبزادگان نے آنسو بہاتی ہوئی نظریں اٹھا کر ارادت مندوں کے ہجوم کی طرف دیکھا۔ عشاق جاں نواز سمجھ گئے کہ ان آنسوؤں میں کیا پیغام پوشیدہ ہے۔ ان کے دم سینوں میں رکنے لگے آنکھوں سے آنسوؤں کے چشمے ایلنے لگے۔ وہ دیکھ رہے تھے اور ان کا قائد سفر ابدیت کی طرف ہمیشہ
ہمیشہ کیلئے روانہ ہو چکا تھا۔ انا لله وانا الیہ راجعون ○

اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے آپ کی وفات حسرت آیات کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پورے
بلتان میں پھیل گئی اور ذرائع ابلاغ، اخبارات و رسائل ٹیلیفون کے ذریعہ وطن عزیز کے اطراف و
جوانب میں بلکہ عالم اسلام کے ہر اہل نظر تک پہنچ گئی۔ اس روز تو کاروباری زندگی اپنا دن بھر کا سفر
طے کر چکی تھی اگلے روز کیلئے جملہ کاروباری اداروں کی طرف سے تعطیل اور تجارتی مراکز بند کر دینے

کا اعلان کر دیا گیا۔

یہ خبر کیا تھی، درد و الم کی کوکھ سے ابھرتا ہوا وحشت اثر نغمہ تھا کہ جس نے سنا دل تھام کر رہ گیا کہ خدایا یہ کیا ہو گیا۔ ہماری دعائیں التجائیں سب رائیگاں گئیں اور تیری مشیت کی اسیر اجل نے ہماری محبوب ہستی کو ہم سے جدا کر دیا۔ ہر آنکھ اشکبار تھی، ہر دل زور ہا تھا، ہر فکر پریشان تھی، ہر چہرہ غم و آلام کی علامت بنا ہوا تھا۔

اپنے رور ہے تھے کہ اب ان کے سر پر دست شفقت کون رکھے گا، بیگانے غمگین تھے کہ علم و حکمت کی گتھیاں کون سلجھائے گا، آشنا گریاں تھے کہ غزالی دوراں کی تدبیر آفرینی کی جھلکیاں دیکھنے کو نہیں ملیں گی، غیر آشنا مضمحل تھے کہ اس دانائے راز کے اٹھ جانے سے پیدا ہونے والا خلا کون پر کرنے گا۔ ارادت مندوں کو قیامت ٹوٹنے کا گمان ہو رہا تھا کہ اب کتاب دل کی تفسیر کون لکھا کرے گا۔ شاگردوں کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑیاں لگی ہوئی تھیں کہ اب اپنے اعجاز نطق سے ہمارا مستقبل کون سنوارے گا۔ علماء و فضلاء سر نہادہ تھے کہ اس بطل جلیل کے اٹھ جانے سے ہمارا بھرم جاتا رہا ہے، خطیبان ملت گنگ تھے کہ منبر و محراب کا وقار رخصت ہو گیا۔ مدرسۃ الاولیاء ملتان کی عظیم المرتبت درگا ہوں کے سجادہ نشین آنکھوں سے آنسوؤں کے ساغر چھلکا رہے تھے کہ ہم سے پوچھو وہ کیا تھا، بس کے دم قدم سے ملتان عظمت اسلاف کی علامت بنا تھا، وہ ولی اللہ ہم سے جدا ہو گیا، نوجوان اور بوڑھے بچوں کی طرح بلک بلک کر رور ہے تھے۔ کوچہ و بازار، درو دیوار اداسی و غمگینی کی علامت بنے ہوئے تھے اور یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے شہر ملتان، ملت اسلامیہ کے رنج و اندوہ کو اپنے دامن میں سمو کر آنسوؤں کے سیلاب میں ڈوب گیا ہے۔ حوصلے شل اور جذبات زندگی اپنی تب و تاب کھو چکے ہیں اور افسردہ ہواؤں کا ایک ایک جھونکا زبان حال سے کہہ رہا تھا کہ:

۔ تھی وہ اک شخص کے تصور سے

اب وہ رعنائی خیال کہاں

وفات کی خبر عام ہوتے ہی آپ کی رہائش گاہ پر تل رکھنے کو جگہ نہ رہی۔ آپ سے محبت کرنے والوں کا انبوہ کثیر جمیع ہو چکا تھا۔ رہائش گاہ کے اندر اور باہر سڑکوں پر اہل نظر کا ہجوم تھا۔ یہ سب اس خبر کی تصدیق کرنے کیلئے یہاں جمع ہوئے تھے لیکن دلوں میں آرزو و میل رہی تھی کہ کاش یہ خبر غلط ہو۔ اس ہجوم میں علماء، فضلاء، طلبہ، مشائخ، دانشور، سیاستدان، صحافی، وزراء اور افسران حکومت سبھی شامل تھے۔ سب آپ کے صاحبزادگان سے مل کر اپنے غم و اندوہ کا اظہار کر رہے تھے اور صاحبزادگان

تک اپنے غم کے جذبات پہنچاتے ہوئے انہیں اس سانحہ عظیم کو صبر و استقلال سے برداشت کرنے کی تلقین کر رہے تھے۔ دربار حضرت موسیٰ پاک شہید کے سجادہ نشین مخدوم سید وجاہت حسین گیلانی حضرت علامہ کاظمی کا آخری دیدار کرنے رہائش گاہ پر پہنچے تو فرط غم سے رو پڑے۔ وزیر اعظم محمد خاں جو نجو نے اپنے تعزیتی پیغام میں آپ کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھا کہ آپ کی المناک رحلت سے جو خلا پیدا ہوا ہے وہ پر ہونا مشکل ہے۔ وفاتی وزیر ریلوے سید یوسف رضا گیلانی نے اسی وقت اپنے تعزیتی تاثرات میں کہا کہ علامہ کاظمی کی وفات کسی عظیم قومی المیہ سے کم نہیں۔ آپ نے راہ فکر و عمل میں جو اہم نقوش چھوڑے ہیں۔ وہ مسلم قوم کیلئے مشعل راہ ثابت ہوں گے۔ درگاہ حضرت بہاؤ الدین زکریا اور حضرت شاہ رکن عالم کے سجادہ نشین اور گورنر پنجاب مخدوم سجاد حسین قریشی کو ٹیلیفون پر خبر پہنچی تو رو پڑے اور مرحوم کے انتقال کی تفصیلات دریافت کرتے رہے۔ انہوں نے علامہ سید احمد سعید کاظمی مرحوم کے صاحبزادگان سے کہا کہ وہ بھی آج لاکھوں سوگواروں میں شامل ہیں۔ بے شمار تنظیموں کے عہدیداران نے اس سانحہ پر اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے کہا کہ آج صرف ملتان شہر ہی نہیں بلکہ پورا پاکستان یتیم ہو گیا ہے۔

غرضیکہ ہر زبان پر آپ کا چرچا اور تذکرہ تھا۔ آپ کے محاسن اور اوصاف بیان کئے جا رہے تھے۔ آپ کے سر بلند کردار کے روشن پہلوؤں کو خراج عقیدت پیش کیا جا رہا تھا۔ چاروں طرف سے جذبات الم کا سیلاب امنڈ پڑا تھا۔ شہر کی مختلف مساجد میں علامہ کاظمی کی وفات کی خبر سنتے ہی اس روح فرسا سانحہ کے اعلانات کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا اور رات گئے تک ان کی نماز جنازہ کے بارے میں عوام کو اطلاعات بہم پہنچائی جاتی رہیں۔ شہر کی تمام بڑی بڑی مساجد میں نماز تراویح کے بعد قرآن پاک کی تلاوت اور درود شریف کا ورد شروع کر دیا گیا تھا اور ملک کے اطراف و جوانب سے آپ کے عقیدت مندوں، مریدین اور شاگردوں نے ملتان میں آمد کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ ہر ایک کے دل میں آپ کے آخری دیدار کی آرزو مچل رہی تھی اور لبوں پر ایصالِ ثواب کیلئے آیات قرآنی کی تلاوت اور درود و سلام کی سوغات بھی ہوئی تھی۔ اسی روز اعلان کر دیا گیا کہ آپ کی نماز جنازہ اگلے روز یعنی ۵ جون کو پانچ بجے شام ڈویژنل سپورٹس گراؤنڈ میں ادا کی جائے گی۔ ملک بھر کے ذرائع ابلاغ کے اہم ارکان بھی رپورٹنگ کیلئے ملتان پہنچ رہے تھے۔ اسی اثناء میں وفاتی وزیر حاجی محمد حنیف طیب بھی اٹکوں کی برسات برساتے ہوئے ملتان آ پہنچے۔ انہوں نے آپ کے قل شریف تک تمام سرکاری مصروفیات منسوخ کر دی تھیں۔ غرضیکہ کس کس کا ذکر کیا جائے۔ ایک سے ایک بڑھ کر شخصیت موجود

تھی مگر سب فرط الم سے نڈھال اور بے قرار تھے۔

اور پھر ۵ جون کا سورج لاکھوں ارادت مندوں کی متاع زیست کے لٹ جانے کا تماشا دیکھنے کیلئے طلوع ہو گیا۔ علامہ کاظمی مرحوم کی اقامت گاہ پر موجود ہجوم میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی تھی۔ اگر آپ کا آخری دیدار کر کے دس افراد جاتے تو پچاس اور آ موجود ہوتے تھے۔ آپ کو غسل دینے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ اس وقت تک آپ کی رہائش گاہ اور ملحقہ سڑکوں پر ہجوم بہت بڑھ چکا تھا۔ ملک بھر سے عقیدت مندوں کی بہت بڑی تعداد ملتان پہنچ چکی تھی۔ ریلوے اسٹیشن اور بس اسٹینڈ سے آپ کی رہائش گاہ تک سڑکوں پر غمزدہ انسانوں کے قافلے رواں تھے، ادراک کی وسعتوں سے ہر لحظہ صدا بھر رہی تھی۔

۔ جو نقش ہے جاذب نظر ہے

کیا جانیے کس کی رہگزر ہے

آپ کے وجود کو غسل دیا جا چکا تو ایک بار پھر ارادت مندوں کا ہجوم آپ کے آخری دیدار کو لپکا۔ بے شمار انسانوں کا ہجوم اپنے قائد کی آخری جھلکیوں کو اپنی نگاہوں کے البم میں سجانے کیلئے کوشاں تھا۔ دیکھنے والے آپ کا چہرہ دیکھتے تھے طبیعت سیر نہیں ہوتی تھی، بار بار دیکھتے اور پھر دیکھنے کی آرزو کرتے۔

چہرے پر ایک ملکوتی تبسم رقصاں تھا۔ یوں نظر آ رہا تھا جیسے آپ آسودہ خواب ہیں۔ پروقار چہرہ، شگفتہ لب کہ جن سے نصف صدی سے زائد عرصہ تک قال اللہ اور قال الرسول کی مہک پھوٹی تھی۔ وہ وجود کہ جس نے وطن عزیز کے کونے کونے میں عظمت و شان مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے نغمے سنائے تھے۔ آج ابدی سکوت کی چادر اوڑھے مرجع خلائق بنا ہوا تھا۔ امام اہلسنت کے چہرے کی شگفتگی ان کی ابدی سرخروئی کی غماز تھی۔

جنازہ اٹھا تو کہرام پھا ہو گیا۔ اہل دل پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ ہر شخص جنازے کو کندھا دینے کیلئے بے قرار تھا، جو کندھا نہیں دے سکتے تھے وہ فقط جنازہ کے ساتھ بندھے ہوئے بانسوں کو ہاتھ لگانے کو ہی سعادت تصور کر رہے تھے۔ علامہ کاظمی مرحوم کی رہائش گاہ سے ڈویژنل پولیس گراؤنڈ تک کا راستہ انسانوں سے اٹا ہوا تھا۔ یوں نظر آتا تھا جیسے انسانوں کا جنگل اگ آیا ہو۔ علامہ کاظمی مرحوم کے خلف اکبر پروفیسر سید مظہر سعید کاظمی (کہ جنہیں حضرت نے اپنا جانشین نامزد فرمایا تھا) اور دوسرے صاحبزادگان سید ارشد سعید کاظمی، صاحبزادہ سید راشد سعید کاظمی، صاحبزادہ سید حابد سعید کاظمی

جو کہ خود غم و اندوہ سے نڈھال تھے سینے پر صبر کی سہل رکھ کر ارادت مندوں کے بڑھتے ہوئے ہجوم کی ڈھارس بندھا رہے تھے۔ سورج شدت سے چمک رہا تھا۔ لاکھوں عقیدت مند جو روزے سے تھے کلمہ شہادت کا ورد کرتے ہوئے جنازے کے ساتھ چل رہے تھے۔ اخباری اطلاعات کے مطابق بیسیوں آدمی شدت غم سے بے ہوش ہو گئے۔ ڈھاڑیں مار کر رونے والے کہہ رہے تھے کہ ہمارا باپ چلا گیا، بتاؤ ہم اسے کہاں ڈھونڈیں۔

اب کہاں سے لائیں گے تجھ سا شفیق و مہرباں
چھوڑ کر کشتی بھنور میں چل دیئے سوئے جناں

جنازے میں دنیائے اہلسنت کے سربراہ آوردہ اصحاب اور روحانیت و طریقت کے تابندے ستارے بڑی کثرت سے موجود تھے۔ کس کس کا ذکر کیا جائے وہاں تو ہر شخص یہی محسوس کر رہا تھا کہ مجھ سے زیادہ صدمہ کسی اور کو نہیں ہے۔ علامہ کاظمی مرحوم کی رہائش گاہ واقع شاداب کالونی ملتان (جہاں سے جنازہ اٹھایا گیا) سے ڈویژنل سپورٹس گراؤنڈ کا فاصلہ قریباً ڈیڑھ گھنٹے میں طے ہوا۔ چاروں طرف سے کلمہ شہادت، کلمہ طیبہ، درود و سلام اور تسبیح و تہلیل کی قدسی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔ اس روز سورج اگرچہ شدت سے روشن تھا مگر غم و اندوہ کی تاریکیوں میں گھرے ہوئے ارادت مندوں کو اپنے شیخ کے تصور سے ہٹ کر کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ جنازے کے جلوس میں علماء و صلحاء، صوفیائے کرام، صنعت کار، طالب علم، تاجر، دوکاندار، مزدور اپنی متاع خلوص غزالی دوراں رحمۃ اللہ علیہ کی نذر کرنے کیلئے بھیگی پلکوں پر آنسوؤں کے گہرہائے تابدار سجائے ہوئے تھے۔ شرکائے جنازہ کی تعداد لاکھوں تک پہنچتی ہے۔ یوں نظر آتا ہے جسے آج تمام راستے ڈویژنل سپورٹس گراؤنڈ کی جانب جا رہے ہیں۔ نماز جنازہ ہو چکنے کے بعد بھی سوگواروں کی آمد جاری رہی۔ بعض ایسے علاقے تھے جہاں اخبار نہیں پہنچتا اور اگر پہنچتا بھی ہے تو تاخیر سے اس لئے ان علاقوں سے آنے والے حضرات کا تاخیر سے پہنچنا ایک لازمی امر تھا۔

جنازہ ڈویژنل سپورٹس گراؤنڈ میں پہنچ گیا۔ علامہ کاظمی مرحوم کے صاحبزادگان، جید علمائے کرام عوام سے صبر و استقامت کی تلقین کرتے ہوئے انہیں صف بندی کی تلقین کر رہے ہیں مگر صفیں ہیں کہ بنتی ہیں تو پیچھے سے آنے والے سوگواروں کا ریلا انہیں توڑ کر رکھ دیتا ہے۔ صف بندی کا عمل مکمل ہونے لگتا ہے تو سوال اٹھا کہ نماز جنازہ کی امامت کے فرائض کون انجام دے۔ حضرت مولانا شاہ احمد نوری کے بارے میں بارہا اعلان ہو چکا تھا کہ وہ نماز جنازہ کی امامت فرمائیں گے مگر عین

وقت پر مولانا نورانی نے علامہ کاظمی مرحوم کے جانشین صاحبزادہ پروفیسر سید مظہر سعید کاظمی کو مصلیٰ پر یہ کہتے ہوئے کھڑا کر دیا کہ یہ امامت آپ ہی کو زیبا ہے۔

نماز جنازہ ادا ہو چکی تو آپ کے جسد خاکی کو شاہی مسجد عید گاہ ملتان کے احاطہ میں سپرد خاک کرنے کیلئے لے جایا گیا۔ آپ کی قبر پہلے ہی تیار ہو چکی تھی۔ شاہی مسجد عید گاہ کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ آپ اس میں برسوں جمعہ کا خطبہ ارشاد فرماتے رہے۔ قبر کے گرد اصحاب فکر و نظر کا ہجوم تھا۔ یہ غزالی دوراں کی قبر تھی، رازی زماں کی قبر تھی، امام اہلسنت اور نازش دین و ملت کی قبر تھی، یہ قبر اس درویش خدا مست کی تھی جس کی ساری زندگی اتباع شرع مصطفوی کا عملی نمونہ تھی، یہ قبر اس قائد اسلامیاں کی تھی جس نے ہر آڑے وقت میں ملت احناف کی ناخدائی کا فریضہ انجام دیا تھا۔ یہ قبر اس پیکر ایمان و یقین کی تھی جس نے اپنے خلوص عمل سے شمع محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو روشن کر کے بے شمار دلوں کو عشق آشنا کر دیا۔ یہ اس حکیم فرزانه کی قبر تھی جس کی تدبیر آفرینیوں پر عظمت اسلاف کا گماں ہوتا تھا۔ یہ اس بطل جلیل کی قبر تھی جس نے اگرچہ چودھویں صدی ہجری میں جنم لیا تھا مگر جو اپنے فکر و عمل سے قرون اولیٰ کے مسلمانوں کی سیرت کا پر تو لئے ہوئے تھا۔ یہ اس غلام سرور کونین علیہ الصلوٰۃ والسلام کی قبر تھی جس کی ایمان افروز تقاریر اور تصانیف نے ایک زمانے کی تقدیر بدل کر رکھ دی۔

اور پھر وہ حسرت آفریں ساعتیں آ پہنچیں کہ جب آپ کے جسم پاک کو آغوش لحد میں اتار دیا گیا۔ ذرا سی دیر کو چہرے سے کفن کا پردہ ہٹا تو یوں محسوس ہوا جیسے بدلیوں سے چاند نکل آیا ہو اور پھر یہ ماہتاب رشد و ہدایت آفتاب علم و حکمت ہمیشہ ہمیشہ کیلئے لحد کے خلوت کدے میں روپوش ہو گیا۔ عقیدت مندوں، شاگردوں اور متعلقین کے اشکوں کی برسات آپ کی تربت کی مٹی میں جذب ہوتی رہی۔ لاکھوں ہاتھ بے اختیار خدا کے حضور دراز ہو گئے۔ آپ کے مقامات اخروی کی سرفرازی کیلئے آپ کے درجات عالیہ میں سر بلندی کیلئے۔ دور کہیں سے بزم گیتی مدہم سروں میں محدود عاتقی۔

یہ سعادت سر بسر اللہ کا انعام ہے
یہ ابد کی سرخروئی کا حسین پیغام ہے



علامہ شاہ عبدالعلیم میرٹھی رحمۃ اللہ علیہ

اس سفیرِ عظمتِ اسلام پر لاکھوں سلام
اس خدائے پاک کے انعام پر لاکھوں سلام
ایک ہی تھی آرزو اسلام کو عظمت ملے
دینِ سلطانِ عرب کو پھر نئی شوکت ملے
تھے مناظر اور مفسرِ شوکتِ ایام تھے
ہند ہو یورپ ہو ہر سو ذکر ان کے عام تھے
زندگی کی آرزو تھی عام ہو دینِ میں
ہر جگہ کرتے گئے قرآن کی شرح میں
یہ محبِ مصطفیٰ تھے دینِ فطرت کے سفیر
راہِ تبلیغ و اشاعت میں تھے آپ اپنی نظیر
اپنے بیگانے سبھی تھے معترف ان کے تمام
جملہ اصحابِ یقین میں ان کا اونچا تھا مقام
ملکِ پاکستان کی خاطر کیا دن رات کام
کر دیا مشہور ہر سو اس حسین خطے کا نام
چاہتے تھے اے رضا یہ شہرِ طیبہ میں لحد
آرزو پوری ہوئی انعام ہے اب تا ابد

(محمد اکرم رضا)

مبلغ اسلام

حضرت علامہ شاہ عبدالعلیم میرٹھی رحمۃ اللہ علیہ

شاہ عبدالعلیم میرٹھی عظیم مبلغ اسلام تھے داعی پیغام حق تھے۔ دو قومی نظریہ پر دل و جان سے نثار تھے کیونکہ یہ نظریہ مکمل طور پر تعلیمات مصطفویٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے عبارت تھا۔ آپ کی زندگی کا مرکز و محور محبت رسول تھی اس لئے آپ دو قومی نظریہ کے زبردست مبلغ اور داعی تھے اور اس ضمن میں جو تحریک بھی چلی آپ نے اس کے ساتھ تعاون کیا۔ آپ امام احمد رضا رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ تھے اور خانوادہ امام احمد رضا نے برصغیر پاک و ہند میں دو قومی نظریہ کی پرچارک ہر تحریک کا ڈٹ کر ساتھ دیا۔ تحریری طور پر، تقریری طور پر، ہر لحاظ سے عظمت اسلام کا بول بالا کرنے کی کوشش کی۔ بلاآخر یہی نظریہ غالب آ کر رہا اور اسی نظریہ کی کوکھ سے پاکستان نے جنم لیا۔

حضرت علامہ شاہ عبدالعلیم میرٹھی اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ عربی، اردو، فارسی، سنسکرت، انگریزی، سواحلی زبانوں کے علاوہ کئی اور زبانوں پر مضبوط گرفت رکھتے تھے۔ آپ نے پاک و ہند کے علاوہ ملائیشیا، انڈونیشیا سمیت بہت سے یورپی ممالک کے طویل طویل سفر کئے اور ساٹھ ہزار سے زائد کفار کو حلقہ بگوش اسلام کیا۔

جب تحریک پاکستان چلی تو آپ نے فاضل بریلوی کے دوسرے خلفاء اور ارادت مندوں کے ساتھ اس ضمن میں یادگار کردار ادا کیا۔ قائد اعظم محمد علی جناح سے ملے اور جب قائد اعظم محمد علی جناح مسلم لیگ اور کانگریس کیلئے مشترکہ پلیٹ فارم کے بارے میں سوچ رہے تھے تو آپ نے اصرار کے ساتھ ان سے کہا کہ ہندو کے ساتھ اتحاد دو قومی نظریہ کی نفی ہے۔ ہندو کبھی پاکستان کا حامی نہیں ہو سکتا۔ اس لئے پاکستان کیلئے تمام تر کوششیں صرف کر دیں۔ قائد اعظم محمد علی جناح آپ کی علمی شخصیت اور بین الاقوامی حیثیت سے آگاہ تھے اور آپ کے مقام و مرتبہ کو بھی خوب سمجھتے۔ قائد اعظم محمد علی جناح نے آپ کو تمام اسلامی دنیا میں پاکستان کا غیر سرکاری سفیر مقرر کر دیا کہ آپ جہاں تبلیغ اسلام کا کام کرتے ہیں وہاں دنیا بھر کے مسلمانوں کو پاکستان کے قیام کے مضمرات سے

بھی آگاہ کریں۔ بحمد اللہ آپ قائد اعظم محمد علی جناح کی توقعات پر پورے اترے اور پاکستان کو عالم اسلام کی تمناؤں کا مرکز بنا دیا۔ آپ کے بعد آپ کے صاحبزادہ حضرت علامہ شاہ احمد نورانی رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کی تبلیغی اور نظریاتی مساعی کو تادم مرگ کما حقہ طریق سے ادا کیا۔

ایک مرد با خدا عبدالعلیم میرٹھی

نازش بزم وفا عبدالعلیم میرٹھی

وہ مبلغ تھا مفسر، شارح قرآن تھا

روح فطرت کی صدا عبدالعلیم میرٹھی

سفیر اسلام شیخ التبلیغ علامہ شاہ عبدالعلیم میرٹھی صدیقی رحمۃ اللہ علیہ ۱۵ رمضان المبارک ۱۴۱۰ھ

برطانیہ ۳۔ اپریل ۱۸۹۲ھ کو میرٹھ (یوپی) کے ایک مشہور صدیقی خانوادہ میں پیدا ہوئے۔ پانچ سال کی عمر میں ناظرہ قرآن کریم ختم کرنے کے بعد اردو، فارسی، عربی اور دینیات کی تعلیم حاصل کرنا شروع کر دی۔ سولہ برس کی عمر میں میرٹھ کے مشہور دینی ادارہ دارالعلوم عربیہ قومیہ سے درس نظامی کے نصاب سے فراغت حاصل کر کے علوم جدید بالخصوص انگریزی علوم کے حصول کی طرف متوجہ ہوئے۔

اثاؤہ ہائی سکول سے میٹرک اور ۱۹۱۷ء میں ڈویژنل کالج میرٹھ سے گریجوایشن کی اور اول پوزیشن حاصل کی۔ ان کی روحانی تربیت ان کے والد محترم جناب علامہ شاہ عبدالحکیم برادر حقیقی جناب مولانا احمد مختار صدیقی، حضرت سید علی شاہ محدث کچھوچھوی اور امام اہلسنت حضرت مولانا شاہ احمد رضا بریلوی رحمۃ اللہ علیہم نے کی۔ اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے دست حق پرست پر سلسلہ قادریہ میں بیعت ہوئے۔

علاوہ ازیں مولانا عبدالباری فرنگی محلی، حضرت شیخ احمد الثمس اور لیپیا کے روحانی بزرگ حضرت شیخ السوسی سے نہ صرف روحانی فیوض و برکات حاصل کیں بلکہ قرآن و حدیث اور فقہ میں بھی استفادہ کیا۔ ۱۹۱۹ء میں حج بیت اللہ سے واپسی پر اعلیٰ حضرت عظیم البرکت رحمۃ اللہ علیہ نے خرقہ خلافت سے نواز کر بیرونی ممالک میں تبلیغ اسلام کیلئے روانہ فرمایا۔

مولانا موصوف بڑے پائے کے خطیب تھے۔ ۹ سال کی عمر میں آپ نے جامع مسجد میرٹھ میں سفل میلاد کے کثیر مجمع کے سامنے پہلی تقریر کی۔ تقریر کو سننے والوں نے سمجھ لیا تھا کہ یہ بچہ غضب کا خطیب بنے گا، اندازہ صحیح ثابت ہوا۔ آگے چل کر آپ نے خطابت میں وہ کمال حاصل کیا کہ اپنے تو اپنے غیر بھی آپ کو خطابت کا بادشاہ مانتے تھے۔ دوران تقریر لوگ نہایت خاموشی سے خطاب سنا

کرتے تھے آپ کا انداز بیان اس قدر مسحور کن تھا کہ لوگ ملنے کا نام نہیں لیتے تھے اور پھر یہ کمال صرف اردو زبان ہی میں حاصل نہ تھا جب آپ عربی، فارسی، انگریزی وغیرہ زبانوں میں خطاب فرماتے تو اہل زبان منہ میں انگلیاں لے لیا کرتے تھے۔ جاپان کے پروفیسر برلاس نے آپ کے کمال خطابت کا تذکرہ کچھ اس طرح کیا ہے کہ

”مولانا کی تقریر سے ہر شخص محفوظ و مستفیض ہو سکتا ہے کیوں نہ ہو جبکہ ایک طرف مولانا کی مقناطیسی شخصیت ہو دوسری طرف آپ کی نغمہ بار آواز اور تیسری جانب آپ کی ٹھوس اور مدلل تقریر ہو۔“

اور پھر یہ کہ کسی ایک زبان میں خصوصاً مادری زبان میں ابوالکلام بن جانا بڑی بات نہیں ہے مولانا کا کمال یہ تھا کہ وہ بیک وقت تمام اہم عالمی زبانوں میں خطابت کے شہنشاہ تھے اور اس سے حیرت انگیز بات یہ ہے کہ مولانا کو کبھی جاپان، چائے امریکہ اور برطانیہ کے اہل علم حضرات کے مجمع سے خطاب کرنا پڑتا اور کبھی پاک و ہند اور افریقہ کے پس ماندہ علاقوں میں غیر پڑھے لکھے لوگوں سے مخاطب ہونا پڑتا۔ حالانکہ ان علاقوں کے حالات مختلف ہیں ان کی تہذیب و تمدن اور نفسیات بلکہ سوچنے سمجھنے کے معیار بھی مختلف ہیں لیکن قربان جائیے مولانا کے زور خطابت کے کہ آپ ان تمام مقامات پر خوب جم کر بولتے تھے اور لوگوں کے قلوب کی اتھاہ گہرائیوں تک اسلام کا پیغام محبت پہنچا دیا کرتے تھے۔ بلاشبہ اس فن میں مولانا اپنی مثال آپ تھے۔

تبلیغی سرگرمیاں

تعلیم مکمل کرنے کے بعد آپ نے ایک مبلغ کی حیثیت سے اپنے مشن کا آغاز کیا۔ آپ نے پورے کرہ ارض کو اپنی تبلیغی سرگرمیوں کا دائرہ کار بنایا، اسی لئے آپ متعدد بار دنیا کے مختلف ممالک کے دورے پر گئے جس کی ایک نامکمل فہرست درج ذیل ہے۔

برطانیہ، امریکہ، جرمنی، فرانس، جاپان، چائے، کنیڈا، ویت نام، برما، ملائیشیا، انڈونیشیا، تھائی لینڈ، فلپائن، سیلون، مارشیس، ری یونین، ڈگاسکر، ساوتھ افریقہ، پرتگال، لبنان، کینیا، کانگو، تنزانیہ، یوگنڈا، سعودی عرب، مصر، شام، فلسطین، اردن، عراق، ویسٹ انڈیز، گیانا، ساوتھ امریکہ، زنجبار، اٹلی، سنگاپور، بیجیم گئے۔ آپ نے مسلسل ۳۰ سال تک تبلیغی دورے فرمائے اور ایسے دور دراز علاقوں میں اسلام کا پیغام پہنچایا جہاں پہلے لوگ اسلام کے نام تک سے واقف نہ تھے۔ یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ آپ کے دورے کسی سرمایہ دار تاجر یا سیاح کے دورے نہیں تھے بلکہ ایک مبلغ کے دورے تھے

جس میں ایک لمحہ کیلئے بھی آرام کی گنجائش نہیں ہوتی۔

یہی تھی آرزو اسلام ہر سو عام ہو جائے
ہر اک دل میں شہ کونین کا پیغام ہو جائے
تمنا تھی یہی اسلام سے ہر سو اجالا ہو
نہ کچھ خواہش تھی ان کی کہ ہمارا نام ہو جائے

مولانا عبدالعلیم میرٹھی صدیقی رحمۃ اللہ علیہ اسلام کے ایک عظیم مفکر، شعلہ بار مقرر اور بہترین ادیب تھے۔ آپ دنیا کی تقریباً ہر زبان بالخصوص انگریزی میں بڑی روانی سے تقریر کرتے تھے۔ آپ کا انداز خطابت نہایت دلنشین اور آواز مسحور کن تھی۔ تقریر کے دوران مکمل سکوت طاری رہتا تھا۔ آپ نے برما، سیلون، ملائیشیا، انڈونیشیا، جنوبی و مشرقی افریقہ کی نو آبادیات، سعودی عرب، عراق، اردن، فلسطین، شام اور مصر کے متعدد تبلیغی دورے کئے۔ ان ممالک میں تمام لوگوں کو اسلام کی دعوت دی۔ اسلامی لٹریچر ہر زبان میں شائع کیا۔ مذاہب عالم کی کانفرنسیں منعقد کیں، مناظرے، مکالمے، تبلیغی سوسائٹیاں، لائبریریاں، کالج، مدارس اور مساجد قائم کیں، اسی اثناء میں زیادہ تر سائنس دانوں، فلاسفروں اور دہریوں کے مذہب اور اسلام کے منکروں سے واسطہ پڑا، جن کی اکثریت مولانا کے ہاتھ قبول اسلام کرتی گئی۔ پاکستان نیوز، مسلم ڈائجسٹ، ٹرینی ڈاڈ مسلم اینول (جنوبی افریقہ) اور ملایا میں عربی یونیورسٹی کی بنیاد آپ ہی نے ڈالی اور بہت سی مساجد تعمیر کرائیں۔ حنفی جامع مسجد کولمبو، سلطان مسجد سنگاپور اور مسجد ناگریہ جاپان زیادہ مشہور ہیں۔ ۱۹۵۱ء میں پوری دنیا کا طویل تبلیغی دورہ کیا جس کی مثال دور حاضر کی اسلامی تاریخ میں نہیں ملتی۔ آپ کی تبلیغی کوششوں سے بورنیو کی شہزادی، جنوبی افریقہ کے فرانسیسی گورنر مردات اور ٹرینی ڈاڈ کی ایک وزیر مشرف بہ اسلام ہوئے۔

بانی پاکستان حضرت قائد اعظم، مراکش کے غازی عبدالکریم، فلسطین کے مفتی اعظم سید امین الحسینی، اخوان المسلمین کے سربراہ حسن البنا، سیلون کے آنریبل جسٹس ایم مروانی، کولمبو کے جسٹس ایم۔ ٹی اکبر سنگاپور کے ایس این دت اور مشہور انگریز ڈرامہ نویس اور فلاسفر جارج برنارڈشا آپ کی روحانی و علمی شخصیت سے از حد متاثر تھے۔

حضرت علامہ صدیقی کی خدمات کو سراہتے ہوئے سنگاپور میں تمام مذاہب کے پیشواؤں کی مشترکہ کانفرنس میں آپ کو ہزار گز الٹا ہولی ٹنس کا خطاب دیا۔ نیز مصر میں آپ نے مختلف اسلامی مکاتب فکر کی تنظیم بھی قائم کی جس کا نام تنظیم بین المذاہب الاسلامی رکھا گیا۔ تبلیغ اسلام کے ساتھ

ساتھ حضرت علامہ صدیقی علیہ الرحمۃ نے نہایت گرانقدر سیاسی خدمات بھی انجام دی ہیں۔ یہ خدمات صرف برصغیر پاک و ہند تک محدود نہیں تھیں بلکہ دنیا کے جس کسی ملک میں بھی آپ مسلمانوں پر ظلم و ستم ہوتے دیکھتے تھے آپ کی حساس روح فوراً مضطرب ہو جاتی تھی۔

تحریک خلافت اور اس کے بعد شدھی تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، تحریک پاکستان کا جب آغاز ہوا تو آپ نے اپنے عالمی تبلیغی دوروں میں مسلم لیگ اور تحریک پاکستان کے حق میں زبردست پروپیگنڈہ کیا۔ مسلم لیگ کی طرف سے باقاعدہ طور پر علماء کی ایک جماعت کے لیڈر کی حیثیت سے مکہ معظمہ گئے اور وہاں حج کی ادائیگی کیلئے آئے ہوئے تمام دنیا کے مسلمانوں کے سامنے تحریک پاکستان کی اہمیت واضح کی اور دیگر ممالک کے بڑے بڑے لیڈروں سے ملے اور ان کو نظریہ پاکستان کی حقیقت سے روشناس کرایا۔ تقسیم ملک کے بعد کراچی میں آپ کی اقتداء میں نماز عید ادا کی گئی۔

قائد اعظم محمد علی جناح بھی اس میں شریک ہوئے۔ قائد اعظم کے وصال کے کچھ عرصہ پہلے حضرت مولانا صدیقی رحمۃ اللہ علیہ عالمی دورہ سے پاکستان واپس آئے اور کراچی میں سندھ، پنجاب اور مشرقی پاکستان کے علماء و مشائخ کی ایک عظیم الشان کانفرنس منعقد کی۔

۱۹۳۶ء میں آپ نے جنوب مشرقی ایشیا کا دورہ کیا۔ اس دوران آپ نے فرانس، ہند چینی، یورپین چین (ہانگ کانگ) شنگھائی اور پکنگ میں زیادہ عرصہ قیام کیا۔ جاپان کے مشہور شہر کعب کی جامع مسجد کمیٹی اور نیشنل کلچرل سوسائٹی کے زیر اہتمام آپ نے مختلف اجتماعات اور مجالس سے خطاب کیا۔ اس کے بعد آپ مصر تشریف لائے اور یہاں اخوان المسلمین کے بانی حسن البنا مرحوم کے ہاں مہمان ٹھہرے اور ان کی معیت میں پورے مصر کا دورہ کیا اور مختلف اجتماعات مجالس اور دینی پروگراموں میں حصہ لیا۔ اس کے بعد آپ شام، عراق، لبنان اور پھر ترکی تشریف لائے۔ اس کے بعد یورپ کا دورہ کیا۔ روم میں قیام کے دوران آپ نے پاپائے روم کو ایک عرضداشت بھی پیش کی جس میں انہیں دعوت دی کہ وہ دہریت کے خلاف ان کی (مولانا کی) مہم میں شریک ہوں۔ روم کے قیام کے بعد سپین، جرمنی اور پھر ہالینڈ تشریف لے گئے۔ شیکاگو کے قیام کے دوران آٹھ امریکی مسلمان ہوئے۔ ایک دن نیویارک کے سٹی ہال میں آپ نے اسلام کی حقانیت کے موضوع پر بہت فاضلانہ تقریر کی اور جلسہ برخاست ہوتے ہی ۱۹۲ امریکیوں نے اسلام قبول کیا۔ جس میں مشہور سائنسدان مسٹر جارج ایہنن ہوف اور اکی بیگم شامل تھیں۔ واشنگٹن میں مختلف تعلیمی اداروں میں لیکچر دیئے اور ۳۶ انگریز پروفیسروں

نے مسلمان ہونے کے بعد آپ کی زیر سرپرستی ایک اسلامی میگزین The Islamic World and U.S.A ”اسلامی دنیا اور امریکہ“ کے نام سے جاری کیا جو اب بھی شائع ہوتا ہے۔ کینیڈا میں گیارہ علمی اداروں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں لیکچر دیئے۔ مونٹریال میں بھی کافی عرصہ تک قیام کیا۔ ۱۹۳۵ء میں آپ نے جنوبی افریقہ کا دورہ کیا۔ یہاں آپ نے With Waters Rand یونیورسٹی میں متعدد بار خطاب کیا۔ اس کے بعد زنجبار دارالسلام اور مہاسبہ تشریف لے گئے۔

یہیں ۱۷ اپریل ۱۹۳۵ء کو مشہور انگریز مفکر ڈاکٹر جارج برنارڈ شا کے ساتھ اسلام اور عیسائیت کے موضوع پر مکالمہ ہوا جس کے اختتام پر ڈاکٹر برنارڈ شا نے کہا ”مجھے افسوس ہے کہ مجھے زیادہ دیر تک آپ سے گفتگو کا موقع نہ ملا“۔ یہیں فرانسیسی گورنر مروات نے آپ کے ہاتھوں اسلام قبول کیا اور اسی کے توسط سے آپ نے مراکش کے مشہور لیڈر غازی عبدالکریم سے قید میں ملاقات کی۔ یہاں سے آپ نیوزی لینڈ اور آسٹریلیا تشریف لے گئے۔ اپنے شاگرد مسٹر عزیز ایچ عباسی کو نیوزی لینڈ میں اور ڈاکٹر محمد عالم کو آسٹریلیا میں تبلیغی امور پر مامور کیا۔

جہاں آپ پوری دنیا میں تبلیغ اسلام میں مصروف رہے وہیں آپ برصغیر کی سیاست اور دو قومی نظریے کی بقاء کی تحریک سے بھی کبھی غیر متعلق نہیں رہے۔ تحریک پاکستان سے قبل آپ نے بین الاقوامی سطح پر فلسطین، کشمیر و دیگر مظلوم قوموں کی حمایت میں آواز بلند کی۔

۱۹۳۵ء میں ہندوستان میں جو زبردست فسادات ہوئے اس سلسلے میں آپ نے پنڈت نہرو سے ملاقات کی اور ہندوؤں کے رویے کے خلاف سخت احتجاج کیا۔ بمبئی اور مدراس میں تقریریں اور تنظیم کر کے مسلمانوں کی ڈھارس بندھائی۔

۱۹۳۶ء میں بنارس میں آل انڈیا سنی کانفرنس میں شرکت فرما کر تحریک پاکستان کی بانگ دہل حمایت فرمائی۔ ملک کے طول و عرض میں مسلم لیگ کا پیغام پہنچایا۔ اسی سال حج کے موقع پر مسلم لیگ کی طرف سے سعودی عرب تحریک پاکستان کے سلسلہ میں تشریف لے گئے اور یہیں آپ نے ”رابطہ اسلامیہ ہند“ کے رئیس وفد اور ملایا، مشرقی و جنوبی افریقہ اور جزائر شرقیہ کے مندوب کی حیثیت سے سعودی حکومت کی طرف سے حجاج پر عائد کردہ ٹیکسوں میں تخفیف کروائی اور حجاج کی مزید سہولتوں کیلئے سلطان عبدالعزیز بن سعود سے مذاکرات کئے۔ ان مذاکرات کی تفصیل ”البیان“ کے نام سے عربی میں شائع ہوئی تھی جس کا ابتدائیہ اخوان المسلمین کے بانی حسن البناء (مصر) نے لکھا انہوں نے حضرت شاہ عبدالعلیم کی خدمات کا برملا اعتراف ان الفاظ میں کیا:

اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے دو سال ہوئے ارض مقدس میں بیت اللہ شریف کے پاس صاحب فضیلت مبلغ اسلام الشیخ محمد عبدالعلیم صدیقی سے ملاقات ہوئی۔ ہم اللہ تبارک و تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ صاحب فضیلت استاد شیخ محمد عبدالعلیم صدیقی کو تمام مسلمانوں کی طرف سے جزائے خیر عطا فرمائے۔ (عربی سے ترجمہ)

آپ نے تقریباً پینتیس برس تک (۱۹۱۹ء تا ۱۹۵۴ء) یورپ، افریقہ، ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور جنوبی ایشیا کے متعدد ملکوں میں تبلیغ اسلام کی، ان ممالک میں تعلیمات اسلامیہ کو عام کرنے کیلئے آپ نے ہر پہلو پر توجہ دی۔ متعدد و مساجد و مدارس تعمیر کرائے، جن میں حنفی جامع مسجد کولبو، سلطان مسجد سنگاپور، مسجد ناگریہ ٹوکیو، اسلامی کتب خانہ نائیجیریا اور عربک یونیورسٹی ملایا، بہت مشہور ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ آپ نے کئی ممالک سے مختلف جرائد و رسائل جاری کروائے جن میں پاکستان نیوز، مسلم ڈائجسٹ ٹرینی ڈاڈ، مسلم اینول (لاٹینی امریکہ)، سٹار آف اسلام (کولبو) دی جینین اسلام (سنگاپور) خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔

۱۹۲۳ء میں آپ مسلمانان سیلون کی دعوت پر وہاں تشریف لے گئے، اس وقت وہاں کے مسلمانوں میں بہت زیادہ مذہبی انتشار تھا۔ آپ نے وہاں پہنچ کر مسلمانوں کو متحد کیا اور ان کی مختلف متحارب جماعتوں کو توڑ کر ایک جماعت میں متشکل کیا۔ اسی دوران سیلون حکومت کے ایک عیسائی وزیر (مسٹراف کنگن بری) نے اسلام قبول کیا۔

۱۹۲۴ء میں جب تمام اسلامی ممالک سیاسی بحران میں گھرے ہوئے تھے تو ان کے مسائل کو حل کرنے کیلئے جو کانفرنس ”مسلم کانگریس یروشلم“ کے نام سے منعقد ہوئی اس میں حکومت مکہ کی طرف سے آپ ہی کو نمائندہ بنا کر بھیجا گیا۔

۱۹۲۸ء میں آپ دوبارہ سیلون کے مسلمانوں کی دعوت پر وہاں تشریف لے گئے، وہاں پہنچ کر آپ نے ”سٹار آف اسلام“ کے نام سے ایک اخبار جاری کیا۔ جس کی ادارت اپنے شاگرد مسٹر موش جے میجد کو سونپی۔

یہاں سے فارغ ہو کر آپ نے جنوب مشرقی ایشیائی ممالک کا بہت طویل دورہ کیا۔ ان ممالک میں مسلمان برائے نام مسلمان رہ گئے تھے۔ انہوں نے مرزائیت اور عیسائیت کے اثرات کو بہت حد تک قبول کر لیا تھا۔ ان تمام ممالک سیلون، برما، انڈونیشیا، فرانس، ہند چینی، ملایا، جاپان اور سنگاپور میں قیام فرما کر عیسائی مشنریوں کے اثرات کو ختم کرنے اور مسلمانوں کو صحیح مسلمان بنانے کیلئے زبردست

کوششیں کیں۔ جن کے نتیجہ میں اٹھارہ ہزار سے زیادہ مسلمان جو عیسائی یا قادیانی بن گئے تھے دوبارہ راہ اسلام پر گامزن ہوئے۔

آپ کے قدم ایک جگہ ٹکلتے نہیں تھے۔ آج ہندوستان میں ہیں تو کل ملائیشیا، فلپائن اور انڈونیشیا کا دورہ کر رہے ہیں۔ آج ملایا اور جاپان میں ہیں تو کل یورپی ممالک میں پرچم اسلام کو سر بلند کرنے کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ آپ کی زندگی سفیر اسلام کی زندگی تھی، تمام زندگی کبھی آرام سے بیٹھنا گوارا نہ کیا اور جہاں تک ممکن ہو سکا ہر قدم پر خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام پہنچاتے رہے۔

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی آن نئی شان

گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان

آپ کی مساعی سے کتنے ہی عیسائی، لاندہب اور دہریے حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔ یہ آپ کی عظمت گفتار اور شوکت کردار کا کرشمہ تھا۔ آپ نے مختلف ممالک میں درجنوں تبلیغی مراکز قائم کئے جن میں سے بعض اب بھی کام کر رہے ہیں۔ آپ کے بعد ان اداروں کی سرپرستی آپ کے عظیم فرزند علامہ مولانا شاہ احمد نورانی فرماتے رہے۔

آپ کی انہی خدمات پر مدینہ منورہ کے لوگ آپ کو ”الطیب الہندی“ کے نام سے پکارتے تھے۔ قیام پاکستان کے وقت بھی آپ غیر ملکی دورے پر تھے قائد اعظم محمد علی جناح نے حضرت شاہ عبدالعلیم رحمۃ اللہ علیہ کو پاکستان کی پہلی نماز عید الفطر پڑھانے کیلئے قائد ملت خان لیاقت علی خاں کو کہا اور آپ نے وطن پہنچ کر پہلی نماز عید الفطر کا خطبہ ارشاد فرمایا، جس میں نوزائیدہ مملکت میں نفاذ شریعت پر زور دیا۔

متعدد تحقیقی اور نظریاتی کتب آپ کی یادگار ہیں۔ ان میں سے نوائگریزی زبان میں ہیں، چھ کتب اردو میں اور دو عربی میں ہیں۔ یہ تصانیف کئی بار طبع ہوئیں اور کئی زبانوں میں ان کے ترجمے بھی ہوئے اور اب تک ہو رہے ہیں۔ کتب کے نام یہ ہیں۔

عربی زبان میں

(۱) حقیقۃ المرزائین

(۲) ضرائب الحج

اردو زبان میں

- (۱) ذکر حبیب
- (۲) کتاب التصوف
- (۳) بہار شباب
- (۴) صوت الحق
- (۵) مرزائی حقیقت کا اظہار
- (۶) احکام رمضان

انگریزی زبان میں

1. Elementary Teachings of Islam.
2. Principles Of Islam.
3. Quest of True Happiness.
4. How to Face Communism.
5. Islam,s Answer to the Challenge of Communism.
6. Women and their Status In Islam.
7. A Shavian and a Theologian.
8. The Forgotten Path of Knowledge.
9. Codification Of Islamic Law.

رضا فاروقی آپ کی وفات کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

بالآخر آپ کا وقت وصال آ پہنچا۔ آپ نے بارگاہ ایزدی میں یوں التجا کی تھی کہ

علیم خستہ جاں تنگ آ گیا ہے درد ہجران سے

الہی کب وہ دن آئے کہ مہمان محمد ہو

پھر وہ وقت بھی آ پہنچا۔ ۲۳ ذوالحجہ ۱۳۷۳ھ کو آپ اس دار فانی سے رخصت ہوئے۔ اکثر

آپ بیرونی ممالک کے دورہ سے واپسی پر روحانی تسکین کیلئے سرکارِ دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کے در

اقدم پر حاضری دیتے تھے اور مدینہ سے تو واپسی کو جی ہی نہ چاہتا تھا اور اکثر زبان پر رہتا تھا۔

مدینے جاؤں پھر نہ آؤں وہیں پہ رہ جاؤں
در حبیب پہ قصہ تمام ہو جائے
یہ دیرینہ خواہش پوری ہوئی اور آپ جنت البقیع میں مدفون ہوئے۔
تھک گیا تھا جو مسافر گردش ایام سے
آج سوتا ہے مدینہ میں بڑے آرام سے
بزم ہستی رہنمائی آپ سے لیتی رہے
اس حسین آغاز سے اور دلنشین انجام سے



امام فضلِ حق خیر آبادی رحمۃ اللہ علیہ

وہ امام عاشقانِ وہ صاحبِ روشن ضمیر
برق تھا طوفان تھا سیماب تھا اس کا خیر
خاندانِ علم و عرفان کا تھا اک روشن چراغ
کاروانِ حریت کا راہِ ایماں میں امیر
اس کی بے باکی و جرأت پر عدو حیران تھے
جگمگاتا ہی رہا ظلمت میں وہ بدرِ منیر
وہ برائے ظلم و استبداد تھا پیغامِ موت
رہنمائی کیلئے اونچا رہا اس کا سرِ
کب جھکا وہ ظلمتِ طاغوت کے آگے کبھی
کب ڈرا سکتے تھے اس کو فتنہ ہائے داروگیر
اس کے ہر انداز میں مضمر تھی ملت کی بقا
شعلہ زن تھا شوکتِ اسلام میں اس کا ضمیر
دین و دنیا میں رہا وہ کامیاب و سرخرو
حامی و ناصر تھے احمد مہربان ربِّ قدیر
اس کی ہمت اور جرأت کو رضا میرا سلام
رحمتیں اللہ کی ہوں اُس کے مرقد پر مدام

(محمد اکرم رضا)

مجاہد تحریک آزادی

امام فضل حق خیر آبادی رحمۃ اللہ علیہ

امام فضل حق خیر آبادی رحمۃ اللہ علیہ فکر و عمل میں اپنی مثال آپ تھے۔ ایک بہت بڑے علمی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ علوم دینیہ میں خوب خوب کمال حاصل کیا۔ تقریر و تحریر میں یکساں مہارت حاصل تھی۔ تفسیر حدیث فقہ اور دیگر علوم اسلامیہ میں مہارت حاصل کی۔ اپنے دور میں اپنے علم و فضیلت کی بناء پر اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ قاضی القضاة بھی رہے۔ انگریز کے دور حکومت سے پہلے بہادر شاہ ظفر کے دربار اور مسلم ریاستوں میں ان کے علم کا طوطی بولتا تھا۔ نثر نویسی اپنی جگہ تھی، شاعری بھی کرتے تھے۔ آرزو ان کا تخلص تھا۔ اس سے بڑھ کر ان کا ادبی و شعری کمال کیا ہوگا کہ مرزا اسد اللہ خاں غالب نے اشاعت کیلئے اپنا مجموعہ کلام آپ کے حوالے کر دیا کہ آپ ہی اس میں سے انتخاب فرمائیں۔ چونکہ آپ مرزا غالب اور ہم عصر اصحاب سخن کے دوست تھے اس لئے غالب نے محض مروتا ایسا نہیں کیا تھا بلکہ غالب کو آپ کے ادبی مقام و مرتبہ کا علم تھا۔ آپ نے غزلیات کا انتخاب فرمایا، درجنوں غزلیں نکال دیں، غالب اپنے عہد پر قائم رہے اور آپ ہی کا انتخاب شائع ہوا۔

آپ کو تدریس علوم میں کمال حاصل تھا۔ دور دور سے طالبان علم کھینچے چلے آتے اور خیر آباد کی عظیم المرتبت درس گاہ میں علم حاصل کرتے۔ والد محترم کا علم و فضل میں ڈنکا بجاتا تھا۔ جب آپ کی باری آئی اور آپ کی علمی مہارتوں کی دھوم عام ہوئی تو زمانہ پکار اٹھا کہ اس بڑے باپ کے بیٹے کو ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ عقیدت مند ارادت کیش اور شاگرد آپ کو پلکوں پر بٹھاتے، آنکھوں میں جگہ دیتے۔ جب ہندوستان میں انگریز کے خلاف بغاوت ہوئی تو آپ نے ”آئین جواں مرداں حق گوئی و بے باکی“ کی سنت کو ادا کرتے ہوئے انگریز کے خلاف فتویٰ دیا، ہر سزا برداشت کی مگر اپنے الفاظ پر قائم رہے کہ:

ہم سے بزم وفا کی ہیں رونقیں قائم
کہ ہم نے سر کو جھکانا کبھی نہیں سیکھا

حضرت امام فضل حق ایک ممتاز خاندان کے فرد تھے جن کے علم و فضل اور یگانہ کمالات کے باعث پورے خاندان کی شہرت کو چار چاند لگے۔ مولوی رحمن علی مصنف ”تذکرہ علمائے ہند“ انہیں عمری حنفی، ماتریدی اور چشتی لکھتے ہیں۔ یعنی مولانا کا نسب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے فقہی لحاظ سے وہ حنفی تھے عقائد میں ماتریدی اور سلسلہ چشتیہ میں انہوں نے بیعت کی تھی۔

ان کے والد علامہ فضل امام کو دہلی میں صدر الصدور کا منصب حاصل تھا۔ والد سے تعلیم پائی۔ شاہ عبدالقادر محدث دہلوی سے حدیث پڑھی۔ مولانا عبدالشاہد خاں شروانی نے اساتذہ حدیث میں شاہ عبدالعزیز محدث کا اسم گرامی بھی شامل کیا ہے۔ ۱۲۱۲ھ / ۱۷۹۷ء میں پیدا ہوئے۔ تیرہ برس کی عمر میں تمام مروجہ علوم عقلیہ و نقلیہ سے فارغ ہو چکے تھے۔ حافظہ اتنا اچھا تھا کہ چار مہینے میں قرآن مجید حفظ کر لیا۔

ایک روایت ہے جسے مولانا عبدالشاہد خاں نے تواتر کا درجہ دیا ہے کہ شاہ عبدالعزیز محدث کی ”تحفہ اثنا عشریہ“ شائع ہوئی تو ایران سے ملا باقر داماد صاحب افق المہین کے خاندان کا ایک جید عالم شاہ صاحب سے مناظرے کیلئے دہلی آیا۔ شاہ صاحب نے اس کے قیام کا بندوبست کر دیا۔ شام کے وقت مولانا فضل حق اس عالم کی خدمت میں پہنچے اور مزاج پرسی کے بعد علمی گفتگو شروع کر دی۔ پہلے ”افق المہین“ پر اعتراضات کئے جن کا جواب ایرانی عالم نہ دے سکا۔ پھر خود ہی شافی جوابات دیئے۔ آخر میں کہا کہ میں شاہ صاحب کا ادنیٰ شاگرد اور کنفش بردار ہوں۔ ایرانی عالم یہ سن کر اتنا متاثر ہوا کہ مناظرے کا ارادہ ہی ترک کر دیا سوچا کہ جس شخص کے شاگردوں کا یہ حال ہے وہ خود خدا جانے کیسا ہوگا؟

مولوی رحمن علی لکھتے ہیں کہ میں نے لکھنؤ میں مولانا کی زیارت کا شرف حاصل کیا تھا۔ دیکھا کہ حقہ بھی پی رہے تھے اور شطرنج بھی کھیل رہے تھے۔ ساتھ ساتھ ایک طالب علم کو ”افق المہین“ کا درس بھی دے رہے تھے اور تمام مطالب بڑی خوبی سے بیان فرماتے جاتے تھے۔

اسی زمانے میں قاعدہ تھا کہ طالب علم سے فراغت کے بعد درس بھی دیا جاتا۔ اس کے بغیر حاصل کردہ علوم میں پختگی نہ آتی تھی۔ چنانچہ مولانا فضل حق خیر آبادی نے بھی درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ مولانا فضل امام نے ایک بڑی عمر کے طالب علم کو بھی آپ کے حوالے کر دیا جو غالباً کند ذہن تھا۔ اسے تھوڑا سا سبق پڑھایا پھر کتاب اٹھا کر پھینک دی اور درس سے اٹھوا دیا۔ وہ مولانا فضل امام کی خدمت میں پہنچا اور کیفیت عرض کی۔ چنانچہ مولانا فضل حق ابلائے گئے۔ مولانا فضل امام

نے اس زور سے تھپڑ مارا کہ دستار فضیلت دور جا پڑی، پھر فرمایا تو تمام عمر بسم اللہ کے گنبد میں رہا، ناز و نعم میں پرورش پائی، جس کے سامنے کتاب رکھی اس نے خاطر داری سے پڑھایا۔ طلبہ کی قدر و منزلت تو کیا جانے۔ اگر مسافرت کرتا، بھیک مانگتا اور طالب علم بنتا تو حقیقت معلوم ہوتی۔ طالب علم کی قدر ہم سے پوچھ۔

بہر حال مولانا نے فارغ التحصیل ہونے کے بعد کسی بھی دور میں درس و تدریس ترک نہ کی۔ جو بھی فیض حاصل کرنے کیلئے آتا اسے بے تامل مستفیض فرماتے۔ یہاں تک کہ مشاغل تفریح میں بھی اس کا خاص خیال رکھتے جیسا کہ مولوی رحمن علی کے مذکورہ بالا بیان سے واضح ہے۔

مولانا نے دھومن شاہ دہلوی سے بیعت کی۔

والد کے انتقال کے وقت مولانا کی عمر اٹھائیس سال کی تھی۔ اس زمانے میں ملازمت اختیار کر لی اور ریزیڈنٹ دہلی کے دفتر میں سررشتہ دار بن گئے۔ پھر نواب فیض محمد خان والی جھجھنے پانچ سو روپے ماہوار پر انہیں بلا لیا۔ روانگی کے وقت ولی عہد (بعد ازاں بہادر شاہ ظفر) سے ملنے کیلئے گئے تو اس نے اپنا خاں دو شالہ آپ کو اڑھایا اور آبدیدہ ہو کر کہا جب آپ رخصت کا ذکر کرتے ہیں تو میرے لئے اسے قبول کئے بغیر چارہ نظر نہیں آتا، لیکن خدا جانتا ہے کہ رخصت کا لفظ دل سے زبان پر لانے کیلئے آلات جرقیل استعمال کرنے پڑتے ہیں۔

جھجھ کے بعد الور چلے گئے۔ بعد ازاں آٹھ برس رام پور میں رہے پھر لکھنؤ میں پہلے صدر الصدور بنا دیئے گئے۔ جب ایک نئی کچھری ”حضور تحصیل“ کے نام سے بنی تو اس کے مہتمم قرار پائے۔ ایک روایت ہے کہ مولانا نے ہومان گڑھی کے واقعہ المیہ سے متاثر ہو کر لکھنؤ کی ملازمت چھوڑی۔ دوسری روایت ہے کہ ترک ملازمت مولانا احمد اللہ شاہ سے بات چیت کا نتیجہ تھا، بہر حال ۱۸۵۶ء میں لکھنؤ سے نکل کر آپ الور چلے گئے۔

امام فضل حق خیر آبادی رحمۃ اللہ علیہ سیاست کے آدمی نہیں تھے۔ تعلیم و تعلم آپ کا میدان تھا۔ طلبہ کی تدریس سے دلچسپی تھی۔ رشد و ہدایت کا مینار تھے۔ زمانہ از خود ان سے رجوع کرتا تھا۔ تقریر اور خطابت تو علم و فضل کے ساتھ ساتھ ان کا امتیاز خاص تھے۔ مناظرہ میں بھی یہ حال تھا کہ کبھی پسپا نہ ہوئے بلکہ حریفوں کو پسپا کر کے چھوڑا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے بے پناہ عقیدت رکھتے تھے اس لئے انہیں رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں معمولی سی گستاخی بھی گوارا نہیں تھی۔ جو لوگ ان سے عداوت رکھتے تھے اور آپ سے علمی کمالات میں پست تھے وہ آپ کے علمی

فضائل کو کم کرنے کی کوشش کرتے لیکن کبھی پھونکوں سے بھی چراغ حق بجھا ہے یا بادلوں سے بھی کبھی سورج کی روشنی چھن سکی ہے۔ آپ نے نہایت باوقار زندگی گزاری۔ لاکھوں چاہنے والے تھے بے شمار علماء فخر سے اپنے آپ کو اس خاندان کا شاگرد لکھتے تھے۔ آپ نے ایام اسیری سے پہلے بڑی شاندار زندگی گزاری اور خود کو تعلیم و تدریس اور فتویٰ نویسی تک محدود رکھا۔ طبیعت میں جمال بھی تھا اور جلال بھی۔ جمال اپنوں کیلئے اور جلال غیروں کیلئے۔ مولانا اسماعیل دہلوی اور ان کے ہم نواؤں نے اسلامی معتقدات پر ضرب کاری لگائی تو ہندوستان بھر کے علماء اور عشاق رسول صلی اللہ علیہ وسلم چونک پڑے، ایک طوفان پھا ہو گیا۔ جناب اسماعیل دہلوی کے بقول انہیں خود بھی اس شدید رد عمل کا احساس تھا۔ ہم سمجھنے سے قاصر ہیں۔ جب احساس تھا تب کیا ہی کیوں؟ امام فضل حق خیر آبادی عالم بے نظیر تھے۔ عربی اردو فارسی پر یکساں گرفت رکھتے تھے۔ ”امتناع نظیر خاتم النبیین اور امکان نظیر“ کے حوالے سے میدان عمل میں آگئے۔ تحریروں کا انبار لگا دیا، کئی بار مناظرے کئے۔ ہر مرتبہ کامیاب رہے لیکن حریف نفرت کا جو تیر اپنے ترکش سے نکال چکا تھا وہ تو چل چکا تھا۔ آپ نے تمام زندگی محبت رسول اور فیوض و برکات بزرگان دین کے کمالات دیکھے تھے۔ ان کج فہمیوں کو کیسے برداشت کر لیتے۔ محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر وہ انداز اختیار کرنے پر مجبور کیا جس کی بدولت وہ اپنا مدعا ہندوستان بھر کے علماء اور غلامان رسول تک پہنچا سکتے تھے۔

آپ کی علمی سرفرازی ہر جگہ کام آئی۔ آپ کے ساتھ شاگردوں اور علماء کی ایک بڑی تعداد تھی۔ اپنا پیغام عام کر کے چھوڑا۔ لیکن کون جانتا تھا کہ وہ عظیم شخص جس کی اب تک کی زندگی علمی ریاضتوں اور فکری مباحثوں میں گزری ہے جو استاذ الاساتذہ کے منصب پر فائز ہے، اسے ایک روز ایام اسیری برداشت کرنے ہوں گے اور حق گوئی کی پاداش میں وہ سزا برداشت کرنا ہوگی جس کے بارے میں سوچ کر دل لرز اٹھتے ہیں۔ آپ کی زندگی کا قافلہ ایک ہی ڈگر پر رواں تھا یعنی تعلیم و تدریس۔ طلبہ کی تربیت، علماء و فضلاء سے علمی مباحث، ہندوستان بھر سے آنے والے سائلوں کیلئے فتویٰ نویسی، اگر کبھی وقت میسر آیا تو شاعری بھی کر لی اور مشاہیر علم و ادب سے ملاقاتیں بھی ہو جاتیں۔ آہستہ آہستہ آپ پر آشکارا ہونے لگا کہ انگریز ہندوستان بھر کے مسلمانوں کو عیسائی بنانے پر تلا ہوا ہے۔ وہ فارسی ختم کر رہا ہے، اسلامی شعائر کا مذاق اڑا رہا ہے، مسلمانوں کی نوکریاں ختم کر رہا ہے تو آپ نے سمجھا کہ انگریز سب کو عیسائی بنا لینے کے درپے ہیں اور ان کے نزدیک اپنی حکومت کو مستحکم کرنے کی یہی بہترین تدبیر ہے، معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت سے انگریزوں کے متعلق طبیعت

میں تکدر پیدا ہوا جو آخری دم تک بڑھتا ہی گیا۔ مولانا نے انگریزوں کی مخالفت کے جو محرکات اپنی کتاب میں بیان کئے ہیں انہیں یہاں خلاصہ درج کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

(۱) داعیہ تبدیلی مذہب

(۲) پیداوار کاشتکاروں سے لے کر انہیں نقد دام دینا، اس طرح خود خام جنسوں پر قابض ہو کر منڈیوں کے نرخ گھٹانے بڑھانے کا مختار بن جانا۔ مقصود یہ تھا کہ لوگوں کو خوراک نہ ملے گی تو وہ ان کے ہر حکم کی تعمیل پر مجبور ہوں گے۔

(۳) مسلمانوں کو ختنہ کرانے سے روکنا، پردہ نشین خواتین کا پردہ ختم کرانا، نیز دوسرے احکام دین کو مٹانا۔

(۴) ہندو اور مسلمان لشکریوں کو ان کے رسوم و اصول سے ہٹانا اور انہیں مذہب و عقائد سے گمراہ کرنا۔

ان محرکات پر بحث کی ضرورت نہیں، بعض ایسے ہیں کہ انہیں آج شاید محض وسوسہ سمجھا جائے لیکن اس زمانے میں مولانا کی طرح اکثر اصحاب کو قرآن کی بناء پر یقین ہو گیا ہوگا کہ یہ سب کچھ ہونے والا ہے۔

۱۸۵۷ء کا ہنگامہ شروع ہونے کے وقت مولانا الور میں تھے۔ کہا جاتا ہے کہ وہاں بیٹھے ہوئے نشر و اشاعت کرتے رہے اور اگست ۱۸۵۷ء میں دہلی پہنچے۔ دہلی پہنچنے کے بعد وہ دربار میں آتے جاتے ضرور تھے، بادشاہ سے مل کر باتیں بھی کرتے تھے بعض اوقات فرامین بھی لکھتے تھے لیکن ان سے کوئی خاص کام نہ لیا گیا۔ جیون لال کے روزنامے سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۶ اگست کو انہوں نے دربار میں حاضر ہو کر ایک اشرفی بطور نذر پیش کی۔ یہ غالباً الور سے آ کر پہلی حاضری تھی۔ ۱۸ اگست کے حالات میں مرقوم ہے کہ مولانا نے انگریزی اخباروں کی رپورٹ کا ذکر کیا جس کا مفاد یہ تھا کہ فتح دہلی کے بعد قتل عام کیا جائے گا۔ شہر کا نشان مٹا دیا جائے گا، بادشاہ کے حق میں ایک بھی صدا بلند نہ ہونے دی جائے گی اور نہ اسے پانی کا ایک قطرہ ملے گا۔

بہادر شاہ ظفر کے مقدمے میں ذکر ہے کہ ۱۸ اگست ۱۸۵۷ء کو دوسرے افراد کے علاوہ مولانا نے بھی مختلف اشخاص کے نام فرامین لکھے لیکن ان پر مہریں نہ لگ سکیں اس لئے کہ نواب زینت محل ملکہ عالم استراحت فرما رہی تھیں اور مہر انہیں کے پاس تھی۔

دوسرے مقام پر مذکور ہے کہ مولانا نے مولوی عبدالحق خاں کے نام ضلع گوڑگانوہ کے مالے

کی تحصیل کیلئے فرمان لکھوایا اور مولانا کے ایک عزیز کو وہاں بھیجنے کا فیصلہ ہو چکا تھا۔
مولانا کی کتاب سے ظاہر ہوتا ہے کہ دہلی میں صورت حال کے معائنے کے بعد انہیں نتیجے کے متعلق کوئی حسن ظن نہ رہا تھا۔ وہ فرماتے ہیں۔

(۱) بہادر شاہ ضعیف، غم زدہ اور ناتجربہ کار تھا۔

(۲) وہ آمر و حاکم ہونے کے بجائے اپنی اہلیہ اور وزیر یعنی زینت محل اور حکیم احسن اللہ خاں کا مامور و محکوم تھا۔

(۳) اس کے بیٹے عاقبت نا اندیش، خالی ذہن، خائن اور بزدل تھے۔ انہیں دیانت دار عقل مندوں سے نفرت تھی۔

(۴) انہیں نہ کبھی میدان جنگ سے سابقہ پڑا تھا، نہ فتون حرب سے آگاہ تھے۔ بازاری لوگوں کو انہوں نے اپنا ہم نشین و جلیس بنا لیا تھا۔

انگریزوں کا مقابلہ کرنے والوں میں بعض بے سردار تھے اور بعض کی طاقت فقر و فاقہ نے سلب کر لی تھی، صرف ایک گروہ نصاریٰ کا جواب دیتے ہوئے بہادری سے لڑتا رہا۔

ظاہر ہے کہ ان تاثرات کے بعد مولانا یہ کیوں کر سمجھ سکتے تھے کہ نتیجہ حسب مراد نکلے گا؟ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت بحث نتیجے سے نہ تھی، صرف یہ مطلوب تھا کہ جو کچھ ہو سکتا ہے اس میں توقف نہ ہونا چاہیے۔

فتویٰ

مولانا کے دہلی پہنچنے سے پیشتر بھی بعض لوگوں نے جہاد کا پرچم بلند کیا تھا۔ مولانا پہنچے تو مسلمانوں کو جنگ پر آمادہ کرنے کی غرض سے باقاعدہ ایک فتویٰ مرتب ہوا، جس پر علماء دہلی سے دستخط لئے گئے۔ میرا خیال ہے کہ یہ فتویٰ مولانا فضل حق خیر آبادی ہی کے مشورے سے تیار ہوا تھا اور انہیں نے علماء کے نام تجویز کئے جن سے دستخط لئے گئے۔ اسی فتویٰ پر مفتی صدر الدین آزرہ کے دستخط تھے جن کے سلسلے میں بعد ازاں ایک لطیف توجیہ کی گئی اور مفتی صاحب الزام شرکت سے بری ہوئے۔ غالباً یہی فتویٰ تھا جو انجام کار مولانا کے خلاف مقدمے کا باعث بنا ورنہ انہوں نے نہ کسی جنگ میں حصہ لیا تھا، نہ ان کے پاس کوئی عہدہ تھا، نہ کسی کے قتل میں شرکت کی تھی اور نہ ان کے خلاف کوئی اور سنگین الزام تھا۔

دہلی سے روانگی

۱۹ ستمبر کو شہر دہلی فتح ہوا ان کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ پانچ روز بھوکے پیاسے مکان میں بند رہے پھر اہل و عیال کو ساتھ لیکر رات کے وقت چھپ چھپا کر نکلے اور مشقتوں کے بعد بھیکن پور ضلع علی گڑھ پہنچے۔ وہاں اٹھارہ روز چھپے رہے ان کے فرزند ارجمند عبدالحق بھی ساتھ تھے پھر نواب صدر یار جنگ بہادر کے عم محترم نواب عبدالشکور خاں رئیس بھیکن پور نے سانکرہ کے گھات سے جو بھیکن پور سے آٹھ میل پر ہے دریا کے پار اتار دیا۔ وہ کچھ مدت چھپے رہے یہ زمانہ کہاں کہاں گزارا؟ اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔

گرفتاری

جب ملکہ وکتوریا کی طرف سے غنوعام کا اعلان ہوا تو مولانا بھی اس پر بھروسا کر کے خیر آباد پہنچ گئے۔ فرماتے ہیں۔

مجھے اس کا بالکل خیال نہ رہا کہ بے ایمان کے عہد و پیمان پر بھروسا اور بے دین کی قسم و بیمن پر اعتماد کسی بھی حالت میں درست نہیں خصوصاً جبکہ وہ بے دین جزا و سزائے آخرت کا بھی قائل نہ ہو۔

چند روز اطمینان سے گزر گئے پھر دو آدمیوں نے مولانا کی مخبری کی جنہیں وہ مرتد جھگڑالو اور تند خو بتاتے ہیں چنانچہ انہیں مکان سے جا کر گرفتار کر لیا گیا اور مقدمے کیلئے لکھنؤ بھیج دیا گیا۔ ”سیر العلماء“ کا بیان ہے کہ مولانا ۱۸۵۹ء میں سیتا پور سے لکھنؤ لائے گئے اور ان کی سلطنت مغلیہ سے وفاداری یا فتوائے جہاد یا جرم بغاوت میں مقدمہ چلا۔

مقدمے کی کیفیت یوں بیان کی گئی ہے کہ منصفوں میں سے ایک نے واقعات سن کر مولانا کو رہا کر دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ مولانا سرکاری وکیل سے خود بحث کرتے تھے لطف یہ کہ: چند الزام اپنے اوپر خود ہی قائم کئے پھر خود ہی مثل تار عنکبوت عقلی و قانونی اولہ سے توڑ دیئے۔ ن یہ رنگ دیکھ کر پریشان تھا اور ان سے ہمدردی بھی تھی۔ جج نے صدر الصدوری کے عہد میں مولانا سے کچھ عرصہ کام سیکھا تھا۔

دوسرے دن مولانا نے مخبری کی تصدیق کر دی اور کہا کہ واقعی فتویٰ میں نے دیا تھا۔ گواہ نے پہلے سچ کہا تھا اب میری صورت دیکھ کر مر رہا ہو گیا اور اس نے جھوٹ بولا۔ فتویٰ میرا لکھا ہوا ہے

اور آج اس وقت میری بھی رائے یہی ہے۔

مولانا غلام رسول مہراپنی کتاب ”۱۸۵ء کے مجاہد“ میں لکھتے ہیں۔

یہ بیان میرے نزدیک سراسر بے اصل ہے، اصل معاملہ بے حد نازک تھا اور اس کے ساتھ مولانا کی زندگی وابستہ تھی۔ یہ بات ذہن میں نہیں آسکتی کہ انہوں نے اسے اپنے علمی کمالات یا زور استدلال کی نمائش کا ذریعہ بنا لیا ہو، وہ اس طرح کہ کبھی اپنے اوپر الزام لگائے اور کبھی رد کر دیئے۔ پھر خود ہی ہر شے کا اقبال کر لیا۔ حقیقت یہ ہے کہ معقولات میں مولانا کی یگانگی کے پیش نظر لوگوں نے بطور خود داستان باخیال کر لیں۔

عجیب بات یہ ہے کہ جس جج کو مولانا کا شاگرد اور ہمدرد بتایا گیا اس کے متعلق خود مولانا اپنی کتاب میں فرماتے ہیں۔

میرا معاملہ ایسا ظالم حاکم کے سپرد کر دیا جو مظلوم پر رحم کرنا ہی نہ جانتا تھا..... اس ظالم نے میری جلا وطنی اور عمر قید کا فیصلہ صادر کر دیا۔

اس واضح ارشاد کے بعد کیونکر مانا جاسکتا ہے کہ حاکم مولانا سے واقف تھا اور چونکہ ان سے کام سیکھ چکا تھا اس لئے ہمدردی تھی۔

بہر حال مولانا کیلئے جس دوام کا حکم صادر ہوا اور ان کی کتابیں جائیداد مال و متاع اہل و عیال کے رہنے کا مکان غرض ہر شے ضبطی میں آگئی۔

مرزا غالب کے ایک مکتوب سے واضح ہوتا ہے کہ اس فیصلے کے خلاف مراجعہ کیا گیا تھا لیکن فیصلہ بحال رہا بلکہ تاکید کر دی گئی کہ مولانا کو جلد انڈیمان روانہ کر دو۔

مولانا بالکل بجا فرماتے ہیں کہ قید میں ہر ممکن اذیت پہنچائی گئی اور قصور صرف یہ تھا کہ وہ ایمان و اسلام پر مضبوطی سے قائم رہے تھے اور ان کا شمار علماء اعلام میں ہوتا تھا۔

مولانا نے پوری زندگی اعلیٰ درجے کے امیرانہ انداز میں گزار دی تھی۔ قید میں انہیں ایسی خوفناک تکلیفوں سے واسطہ پڑا جو معمولی قیدیوں کو بھی شاید ہی پیش آئی ہوں، کس درد سے فرماتے ہیں۔

دشمن میری ایذا رسانی میں کوشاں اور میری ہلاکت کے درپے ہیں۔ دوست میرے مرض کے علاج سے لاچار ہیں۔ دشمنوں کے دل میں میری طرف سے بغض اور کینہ مذہبی عقائد کی طرح راسخ ہو گیا ہے۔ ان کے پلید سینے کینہ و عداوت کے گنجینے بن گئے ہیں۔ ان اسباب پر نظر کرتے ہوئے اپنی

رہائی سے مایوس اور اپنی امیدوں کو منقطع پاتا ہوں۔

کچھ معلوم نہیں کہ کب انڈیمان پہنچے ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ ان سے پیشتر مفتی عنایت احمد کا کوروی مفتی مظہر کریم دریا بادی اور بہت سے دوسرے علماء وہاں پہنچ چکے تھے۔ لہذا جس حد تک صحبت و مجلس کا تعلق ہے انڈیمان یہاں کے اکثر شہروں سے زیادہ مرکز محفل علم بن گیا تھا لیکن معاملہ قید کا تھا اور قید اس زمانے میں بڑی ہی سخت تھی بلکہ انڈیمان میں تو بعد ازاں بھی بڑی سخت رہی۔

مولانا نے انڈیمان کا جو نقشہ چند الفاظ میں کھینچا ہے وہ آج کل بھی نادرست نہیں اور مولانا کے زمانے میں تو حرف بہ حرف درست تھا وہ فرماتے ہیں آب و ہوا ناموافق پہاڑی علاقہ اس میں دشوار گزار گھاٹیاں اور راہیں وہاں کی نسیم سحر گرم و تیز ہوا سے بھی زیادہ سخت غذا احتفل سے زیادہ کڑوی پانی سانپوں کے زہر سے بڑھ کر ضرر رساں اس کے سنگریزے بدن کی پھنسیاں۔

پھر قید خانے کی کیفیت بتاتے ہیں۔ ہر کوٹھڑی پر چھپر جس میں رنج و مرض بھرا ہوا چھتیں چکتی تھیں مرض ارزاں درد کراں بیماریاں بے شمار خارش و قوبا دام بیمار کے علاج تندرست کی بقائے صحت اور زخم کے اندمال کی کوئی صورت نہ تھی۔

وہ خود بھی متعدد سخت امراض میں مبتلا ہو گئے۔ خارش کے باعث بدن زخموں سے چھلنی ہو گیا، روح کو تحلیل کر دینے والے درد اور تکلیف کے ساتھ زخموں میں اضافہ ہوتا رہا۔

بیان کیا جاتا ہے کہ مولانا انڈیمان میں پہنچے تو انہیں صفائی کی خدمت پر مامور کیا گیا۔ ٹوکرا لے لیتے اور کوڑا کرکٹ جمع کر کے پھینک آتے۔ ان کے کپڑے اتروالئے گئے تھے تہبند اور کملی دے دی گئی پاؤں میں جوتا بھی نہ تھا۔

انڈیمان کے سپرنٹنڈنٹ کی پیشی میں ایک مولوی تھا۔ سپرنٹنڈنٹ کے پاس علم ہیئت کی ایک قلمی کتاب تھی۔ مولوی کو دے کر کہا کہ اس کی عبارت درست کر دی جائے۔ مولوی یہ کام مولانا کے پاس لے آیا۔ انہوں نے نہ صرف عبارتیں درست کیں بلکہ مطالب میں اضافے اور حاشیے پر کتابوں کے حوالے دے دیئے۔ اس طرح مولانا کے علم و فضل اور علو مرتبت کا حال سپرنٹنڈنٹ پر کھلا۔ اس وقت سے مولانا کیلئے برائے نام تحریری کام تجویز کر دیا گیا اور تکلیفوں میں ایک حد تک کمی آ گئی۔

ادھر مولانا کے صاحبزادے نے ولایت میں مرافعہ کر دیا تھا۔ وہ منظور ہوا اور مولانا کی رہائی کا حکم آ گیا۔ صاحبزادہ انہیں لانے کیلئے انڈیمان روانہ ہو گیا، جہاز سے اترنے پر ایک جنازہ پر نظر پڑی جس کے ساتھ بڑا مجمع تھا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ مولانا کا جنازہ ہے۔

۱۲ صفر ۱۲۷۸ھ / ۱۹ اگست ۱۸۶۱ء کو اس جہان فانی سے عالم بقاء کی جانب سدھارے۔ مولانا عبدالشاہد خاں فرماتے ہیں کہ مولانا کا مزار اب تک مرجع انام اور زیارت گاہ خاص و عام ہے۔ دیکھتے جہاد آزادی نے خاک وطن کے کتنے جواہر پاروں کو ان سنسان اور وحشت ناک جزیروں کی آغوش میں پہنچا دیا، جہاں کوئی انسان بہ طیب خاطر ایک دن بھی بسر کرنا گوارا نہ کرے۔ تمام مورخین اس امر پر متفق ہیں کہ آپ نے جزائر کالاپانی میں اسیری کا زمانہ بڑی بہادری، دلیری اور اولوالعزمی سے بسر کیا۔ اپنے پائے استقلال میں کچھ بھی لغزش نہ آنے دی۔ آپ کی تحریریں جزائر اندیمان کی سخت ترین زندگی اور آپ پر ہونے والے ظلم و ستم کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ چونکہ آپ نے عملاً کسی جنگ میں حصہ نہیں لیا تھا۔ ایک بڑے عالم دین کی حیثیت سے عوام ہندوستان کی راہنمائی کرنا اور فتویٰ دینا آپ کا حق تھا۔ اس کے باوجود تمام عرصہ قید و بند میں آپ پر سخت ترین مظالم ڈھائے جاتے۔ لاکھوں شاگردوں کے استاذ، کروڑوں انسانوں کے دلوں پر حکومت کرنے والے امام فضل حق کو غلامان کا لباس پہنا دیا گیا۔ سر پہ ٹوکری رکھ دی گئی کہ جہاں گندگی نظر آئے صاف کرو۔ بلکہ جو بھی انگریز آقا کہے اس کی اطاعت کرو۔ یہ سلوک بڑے بڑے جنگی قیدیوں کے ساتھ بھی روا نہیں رکھا جاتا مگر آپ استقلال و پامردی کے ساتھ سب کچھ برداشت کرتے رہے۔ بڑھاپا بھی تھا، بیماریوں نے بھی پریشان کئے رکھا مگر کبھی کوئی رعایت طلب نہ کی۔ آپ کے صاحبزادے علامہ عبدالحق اپنی جگہ آپ کی رہائی کیلئے کوشاں رہے۔

مگر قربان جائیے اس مجاہد آزادی کے جذبہ ایمانی پر کہ جیتے جی اس عقوبت گھر سے آنا گوارا نہ کیا، وہیں جان دے دی۔ یہ شہادت کی موت تھی۔ علم و حکمت کے گلستاں کا نذر خزاں ہونا تھا۔ علم و فضل کے آفتاب کا گہنا جانا تھا، کچھ بھی کہئے مگر آپ کی روح نے رہائی کیلئے انگریز کا ممنون احسان ہونا گوارا نہ کیا۔ حق تو یہی ہے کہ

۔ دنیا میں ٹھکانے دو ہی تو ہیں آزاد منش انسانوں کے

یا تحت جگہ آزادی کی یا تحتہ مقام آزادی کا

حضرت امام فضل حق خیر آبادی صاحب تصانیف کثیرہ تھے۔ آپ کی تصانیف آپ کے علم و فضل کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ آپ علم و فضل کا بحر بے کراں تھے۔ لیکن تذکرہ نگاروں کا کہنا ہے کہ آپ کا فارسی اور اردو میں پایہ اس قدر بلند تھا کہ بہت کم فضلاء اس مقام تک پہنچتے نظر آتے ہیں۔ مولانا نے دو شادیاں کیں۔ اصل اہلیہ سے تین صاحبزادیاں تھیں اور ایک صاحبزادہ یعنی

شمس العلماء مولانا عبداللہ الحق دوسری اہلیہ سے دو صاحبزادے تھے مولوی شمس الحق اور مولوی عطاء الحق تلامذہ کا حد و شمار نہیں بلکہ کہنا چاہیے بعد کے دور کے اکثر اکابر علم انہیں کے شاگرد یا شاگردوں کے شاگرد تھے۔

مولانا نے گونا گوں مشاغل کے باوجود تصانیف بھی خاصی مقدار میں چھوڑیں۔

(۱) الجئس الغالی شرح جواہر العلالی

(۲) حاشیہ افق السین

(۳) حاشیہ تلخیص الشفاء

(۴) حاشیہ شرح مسلم

(۵) الہدیۃ السعیدیۃ

(۶) رسالہ تشکیک ماہیات

(۷) رسالہ کلی طبعی

(۸) رسالہ علم و معلوم

(۹) الروض المجددی تحقیق حقیقۃ الوجود

(۱۰) رسالہ قاطنیوریاس

(۱۱) رسالہ تحقیق حقیقۃ الاجسام

(۱۲) الثورة البندیۃ یعنی حالات جنگ آزادی

(۱۳) قصائد فتنۃ البند

(۱۴) مجموعۃ القصائد

(۱۵) امتناع نظیر

(۱۶) تحقیق الفتویٰ فی الطغویٰ

عقبی میں ہر اک نعمت والا نصیب ہو
تجھ کو امام! جنتِ اعلیٰ نصیب ہو
تجھ پہ تمہیں ختمِ علم و فضیلت کی خوبیاں
حُبِ نبی سے رُحْمہٗ بالا نصیب ہو



حضرت قطب جمال الدین ہانسوی رحمۃ اللہ علیہ

شان فقر و آگہی حضرت جمال الدین تھے
سر بسر ہی روشنی حضرت جمال الدین کی
عالم کامل فقیہ وقت روح زندگی
فکر و فن کی تازگی حضرت جمال الدین تھے
لاڈلے گنج شکر کے چشتیوں کے رہنما
معرفت کی دلکشی حضرت جمال الدین تھے
آپ کی مہر صداقت تھی ولایت کی سند
دین حق کی رہبری حضرت جمال الدین تھے
بخش کر قلب و نظر کو علم و عرفاں کا جمال
اک پیام زندگی خواجہ جمال الدین تھے
زندگی کے نام پر سکھائے آداب نیاز
شرح حسن بندگی حضرت جمال الدین تھے
منزل عرفان حق کا بخش کر ہم کو شعور
ذوق و شوق رہبری حضرت جمال الدین تھے
جن کے فرمودات تھے روشن رضا ہر دور میں
جھمکتی روشنی حضرت جمال الدین تھے

(محمد اکرم رضا)

حضرت قطب جمال الدین احمد ہانسوی رحمۃ اللہ علیہ

حضرت قبلہ جمال الدین احمد ہانسوی رحمۃ اللہ علیہ عظمت اسلام کی تصویر تھے۔ آپ عالم کامل، درویش اکمل اور صاحب جود و کرم تھے۔ آپ کا خزانہ برکات علمیہ سے بھرپور تھا، جو بھی ارادت مند آتا اسے حصہ وافر عطا کرتے۔ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت بابا فرید الدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کی بارگاہوں سے فیوض سمیٹتے اور عمر بھر انہی فیوض کو مخلوق خدا میں تقسیم کرتے رہے۔ حضرت بابا فرید رحمۃ اللہ علیہ کو ان سے اتنا پیار تھا کہ جب کسی ارادت مند کو معرفت کی منزلوں سے گزار کر خلافت عطا فرماتے تو اسے یہ تاکید بھی کرتے کہ اس پر حضرت جمال الدین ہانسوی کے دستخط کروا کر ان کی مہر بھی لگوانی ہے۔ صوفیاء اور مشائخ میں ان کا درجہ بہت بلند ہے۔ اپنے ہم عصروں میں عزت و احترام کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے اور آج تک آپ کے روحانی مقام و مرتبہ میں کوئی کمی نہیں آئی بلکہ ہر آنے والا دوران کی عزت و توقیر میں اضافہ کر رہا ہے۔

آپ بہت بڑے عالم دین تھے اس لئے مختلف ادوار میں آپ سرکاری طور پر قضا اور خطابت کے مناصب پر بھی فائز رہے۔ سرکاری طور پر زمین ملی ہوئی تھی اور بہت سی مراعات بھی حاصل تھیں مگر جب مردان حق کی مجلس میں بیٹھنے لگے اور ان محافل سے روحانیت کے مدارج حاصل کئے تو پھر دنیا کے مناصب اور دنیاوی اعزازات سے یک دم جی اچاٹ ہو گیا اور وہ سب کچھ حکومت کو لوٹا دیا جو انہیں مل رہا تھا۔

دراصل سلسلہ عالیہ چشتیہ کی تعلیمات ہی کچھ ایسی ہیں۔ یہ مردان کامل جب رب کی رضا میں گم ہو جاتے ہیں تو دنیا ان کی نظروں میں گھاس کے تنکے کے برابر بھی حیثیت نہیں رکھتی۔ اور ان پر یہ حقیقت آشکارا ہو جاتی ہے کہ دنیا اور رب دو عالم میں سے صرف ایک ہی سے محبت کی جاسکتی ہے اور جب وہ ان دونوں کا موازنہ کرتے ہیں تو انہیں دنیا اور اس کے جاہ و حشمت پر ہنسی آتی ہے اور پھر دل یاد الہی میں اس قدر سرشار ہو جاتا ہے کہ اگر دنیا ان کیلئے سونے کی بھی بنا دی جائے تو یہ اس کی طرف ایک نظر دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے۔ وہ بجا طور پر سمجھتے ہیں کہ

۔ حیف ہے اس کی بادشاہی پر

تیرے در کا جو گدا نہ ہوا

ان کی یہی درویشی اور فاقہ مستی ان کے روحانی کمالات میں مسلسل اضافہ کرتی رہتی ہے۔ عوام الناس تو کیا علماء و رفقاء ان کی بارگاہ میں حاضری دینا باعث سعادت اور سلاطین ان کی مجلس میں آنے کو سرمایہ اعزازات سمجھتے ہیں۔ اس قطب یگانہ کے حالات زندگی قارئین کی نذر کئے جاتے ہیں۔ آپ کا اسم گرامی احمد اور لقب جمال الدین تھا۔ آپ ۵۸۳ھ میں غزنی شہر (افغانستان) میں تولد ہوئے۔ آپ کے والد محترم حضرت قاضی حمید الدین عرف شیخ محمد تھے جو دینی علوم کے علاوہ فن سپہ گری میں بھی مہارت تامہ رکھتے تھے۔ جب سلطان شہاب الدین محمد غوری نے ہندوستان پر دوسرا حملہ کیا تو قاضی حمید الدین اس لشکر میں ایک پلٹن کے سالار تھے۔ جب جمال الدین ہانسوی پانچ سال کے تھے تو والدین کے ہمراہ مستقل طور پر رہنے کیلئے ہانسی آ گئے۔

حضرت قطب جمال کے نانا سید احمد گیسو دراز غزنوی تھے جو خدا رسیدہ بزرگ تھے۔ سراج النسب میں لکھا ہے کہ موصوف کی دو بیٹیاں تھیں ان میں سے ایک بی بی حافظہ جمال صاحبہ تھیں جن کے بطن نوری سے حضرت شیخ شرف الدین عرف بوعلی شاہ قلندر رحمۃ اللہ علیہ پانی پتی پیدا ہوئے تھے۔ دوسری صاحبزادی سائرہ بی بی نامی تھیں جو حضرت قطب جمال کی والدہ تھیں۔

حضرت جمال الدین احمد نے ابتدائی تعلیم اپنے گھر پر حاصل کی۔ بچپن سے ہی بڑے ذہین و فطین تھے۔ آپ کے والد بزرگوار آپ کی تعظیم و تربیت پر خصوصی توجہ فرماتے تھے۔ علوم مروجہ (یعنی تفسیر قرآن مجید احادیث فقہ تاریخ صرف و نحو اور طب) میں سند فضیلت حاصل کی۔ آپ علوم ظاہری و باطنی میں درجہ کمال تک پہنچے ہوئے تھے۔ فقہ آپ کا خصوصی مضمون تھا۔ آپ فن تقریر میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ مبداء فیض نے آپ کو شاعری کا بھی ملکہ عطا کیا تھا۔ آپ صاحب دیوان شاعر تھے اور خطیب تخلص کرتے تھے۔ حضرت جمال شریعت کے بڑے پابند اور خلق محمدی کا نمونہ تھے۔ نوجوانی میں بھی بڑے پارسا اور پرہیزگار رہے۔ چھوٹی سے چھوٹی سنت کی ادائیگی کا بھی بڑا خیال رکھتے تھے۔ آپ کے والد محترم حضرت قاضی حمید الدین ابھی حیات تھے کہ آپ شہر ہانسی کے خطیب مقرر ہوئے۔

حضرت قطب جمال کی عمر پچاس برس تھی کہ آپ حضرت شیخ الاسلام بابا فرید الدین مسعود چشتی رحمۃ اللہ علیہ کے مرید ہوئے اور خلافت پائی۔ بابا صاحب سے آپ کی بیعت ہانسی میں ہی ہوئی۔ حضرت بابا فرید الدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ بوجہ محبت حضرت قطب جمال ہانسی میں ہی فروکش رہے۔

رواق منظر چشم من آشیانہ تست
کرم نماد فرود آ کہ خانہ خانہ تست

حضرت بابا فرید الدین رحمۃ اللہ علیہ ہانسی میں مقیم تھے کہ آپ کے پیر روشن ضمیر حضرت قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ دہلوی کی وفات کی خبر آئی۔ چنانچہ آپ نے دہلی کا سفر اختیار کیا۔ وہاں پہنچے تو حضرت قاضی حمید الدین ناگوری سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے حسب ارشاد قطب الاقطاب آپ کو ان کی نعلین، عصا اور خرقة سپرد کئے۔ بابا صاحب نے خرقة زیب تن کیا اور تین چار روز آستانہ قطب صاحب پر قیام کرنے کے بعد عازم سفر ہوئے۔ آپ کے پیر بھائیوں اور مریدین قطب الاقطاب نے عرض کیا کہ چونکہ آپ کو قطب صاحب نے اپنا جانشین مقرر فرمایا ہے اس لئے اب آپ کا قیام دہلی میں ہی ہونا چاہیے لیکن آپ نے جواباً ارشاد فرمایا کہ ہمیں جو نصیحت پیر نے عطا کی ہے وہ ہانسی اور اس کے جنگل میں ہے۔

چنانچہ حضرت بابا فرید رحمۃ اللہ علیہ ہانسی پہنچے اور حضرت قطب جمال کو خلافت عنایت کی۔ نیز حضرت قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کے تبرکات یعنی خرقة، عصا، نعلین اور قلمی کتب عوارف المعارف مصنفہ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ عطا فرمائے۔ حضرت بابا فرید الدین رحمۃ اللہ علیہ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ ”جمال جمال است“ اور کبھی ارشاد ہوتا کہ ”جمال می خواہم کہ گرد سر تو بگردم“ اور کبھی یوں ارشاد فرماتے کہ ”از خود برنجم لیکن از جمال زنجم“ (یعنی خود سے رنجیدہ ہو جاتا ہوں لیکن جمال سے کبھی نہیں) حضرت قطب جمال کو بھی اپنے مرشد سے کمال الفت تھی۔ ان کی منقبت میں بہت سے اشعار لکھتے ہیں۔

اپنی والہانہ خدمت و خلوص اور ارادت کی بدولت حضرت جمال الدین بابا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے منظور نظر بن گئے۔ پاکپتن پہنچ کر انہوں نے کافی عرصہ اپنے مرشد کی خدمت میں گزارا۔ یہاں آپ کے سپرد لنگر فریدی کیلئے جنگل سے ڈیلہ (ایک قسم کا جنگلی پھل) لانے کی ڈیوٹی لگی۔ آپ یہ کام نہایت مستعدی سے سرانجام دیتے رہے۔

حضرت قطب جمال نے جب بابا فرید صاحب کی صحبت اختیار کی تو سرکاری عہدہ قضا و خطابت سے استعفی دے دیا۔ حکومت وقت نے مدد معاش کیلئے جو اس عہدہ و منصب کے ضمن میں دیہات اور کافی اراضیات دے رکھی تھیں، وہ قطب صاحب نے واپس کر دیں۔ متقدمین پیران سلسلہ کے طریق پر آپ تمام عمر بادشاہ یا امراء کے در پر نہیں گئے۔

۔ پشت پازن تخت کیاؤس را

سربده از کف مده ناموس را

حضرت قطب جمال نے تمام عمر امیرانہ لباس زیب تن نہیں کیا۔ آپ کی خوراک سادہ ہوتی تھی اور مقدار بہت کم۔ آپ ہمیشہ کم گفتن، کم گفتن، کم خوردن پر عامل رہے۔ مہمان نوازی آپ کا خاصہ تھا۔

سفر میں گھوڑے کی سواری کے علاوہ پیدل بھی چلتے تھے۔ قطب صاحب نے سات مرتبہ پاکستان جا کر اپنے پیرومرشد حضرت بابا صاحب کی خدمت میں حاضری دی۔

۔ برائے دیدن روئے چو ماہست

ہمیشہ جان و دل سویت کشانت

دنیاوی شان و شوکت اور سرکاری مرتبہ و منصب ترک کر کے آپ نے درویشی اختیار کی اور یہ غریبی آپ کیلئے باعث فخر تھی۔

۔ نزدیک جہانیاں گدا نیم در عالم فقر بادشاہیم

حضرت قطب جمال رحمۃ اللہ علیہ کسی سے کچھ طلب نہ کرتے تھے۔ تحائف قبول کرنے میں بھی آپ کو تامل رہتا۔ خانقاہ اور گھر بار کے خرچ میں تنگی رہتی تھی لیکن آپ نہایت حوصلہ مندی سے اور صبر سے گذر اوقات کئے جاتے تھے۔

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ دہلوی سے روایت ہے کہ وہ پاکستان جاتے ہوئے ہانسی پہنچے اور شیخ جمال الدین قطب سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے فرمایا کہ مرشد بابا فرید (رحمۃ اللہ علیہ) سے عرض کر دینا کہ میرے خرچ میں تنگی رہتی ہے فراخی کیلئے دعا فرمائیں۔ بابا صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) نے جواباً ارشاد فرمایا کہ قطب جمال کو واضح کر دیجئے کہ جب کسی کو کہیں کی ولایت دی جاتی ہے تو اس کو چاہیے کہ وہاں کے لوگوں کو اپنی جانب مائل کرے۔

حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ قطب جمال کی قدر افزائی بابا صاحب رحمۃ اللہ علیہ یہاں تک کرتے تھے کہ جب مجھے خلافت نامہ عطا ہوا تو مرشد نے ارشاد کیا کہ یہ خلافت نامہ مولانا جمال الدین کو دکھا دینا۔ چنانچہ ہانسی پہنچ کر میں نے اپنا وہ خلافت نامہ برائے ملاحظہ پیش کیا تو آپ خوش ہوئے اور شفقت سے میری (مزید روحانی) تربیت فرمائی اور یہ شعر پڑھا:

۔ خدائے جہاں را ہزاراں سپاس کہ گوہر سپردم گوہر شناس

صاحب طبقات حسامی نے تحریر کیا ہے کہ بابا فرید رحمۃ اللہ علیہ جس کو خلیفہ نامزد کرتے اسی کو قطب جمال کے پاس بھیجتے تھے۔ قطب صاحب اس کی تربیت فرماتے۔ اگر لائق خلافت سمجھتے تو خلافت منظور فرماتے ورنہ خلافت نامہ چاک کر دیتے۔ وہ اگر بابا صاحب سے شکایت کرتا تو جواب ملتا کہ ”دریدۂ جمال را فرید نتواند و دخت“

نقل ہے کہ ایک بار حضرت بہاؤ الدین زکریا سہروردی ملتانی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت بابا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو لکھا کہ میرے سارے مرید اور خلفاء کے بدلے آپ احمد جمال کو ہمیں دے دیجئے اور شرط محبت یہ ہے کہ اس سودے کو آپ درہم برہم نہ کریں۔ بابا صاحب نے جواب دیا کہ جمال میرا جمال ہے سودا مال میں ہوتا ہے نہ کہ جمال میں۔

مولانا شمس الدین دبیر رحمۃ اللہ علیہ قطب جمال احمد ہانسوی رحمۃ اللہ علیہ اور نظام الدین اولیاء محبوب الہی رحمۃ اللہ علیہ حضرت بابا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے آستانہ پر چند دن قیام کرنے کے بعد رخصت لینے گئے۔ قاعدہ یہ تھا کہ قافلہ میں جو بزرگ ہوتا تھا اس کو مرشد رخصت کے وقت مناسب نصیحت فرماتے۔ اس موقع پر بابا صاحب نے قطب صاحب کو نصیحت فرمائی کہ نظام الدین کی خبر گیری کرنا۔ قطب جمال نے بڑی خبر گیری فرمائی۔ جب قصبہ اگروہہ وارد ہوئے تو وہاں کا حاکم حضرت قطب جمال کا دوست تھا وہ اپنے مکان پر لے گیا اور نہایت پر تکلف دعوت کی۔ قطب صاحب نے روانگی کیلئے اجازت چاہی تو اس نے عرض کیا کہ یہاں لوگ قحط میں مبتلا ہیں جب تک بارش نہ ہو آپ یہیں تشریف رکھیں۔ قطب صاحب خاموش ہو رہے۔ صبح نہ ہونے پائی تھی کہ خوب زور سے بارش ہونے لگی صبح کو حاکم اگروہہ نے سواری کیلئے گھوڑی پیش کی اور ہم وہاں سے روانہ ہو گئے۔ حضرت نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ

میں (نظام الدین) جب خلیفہ نامزد ہونے کے بعد قطب صاحب کے پاس گیا تو انہوں نے تعظیم نہ دی۔ میرے دل میں خیال آیا کہ پہلے تو ہمیں تعظیم دیتے تھے اب کیوں نہ دی۔ وہ خود گویا ہوئے کہ اے نظام الدین تعظیم نہ دینے کا سبب یہ ہے کہ اب میں اور تم ایک ہو گئے کیا کوئی اپنے کو تعظیم دیتا ہے۔

جب میں (نظام الدین) اپنا خلافت نامہ لے کر قطب صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا تو تمپ کی نذر کیلئے جنگل سے کچھ خشک لکڑیاں اور مٹی کے چند ڈھیلے اپنے رخساروں سے صاف کر کے لے گیا۔ اس پر خلوص نذر پر حضرت قطب صاحب بے حد مسرور ہوئے اور فرمانے لگے کہ ہمارے غسل

میت کا پانی ان لکڑیوں سے گرم کیا جائے اور یہ ڈھیلے ہماری قبر میں ساتھ رکھ دیئے جائیں۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔

میں نے وصال کے بعد شیخ جمال الدین احمد رحمۃ اللہ علیہ کو خواب میں دیکھا فرماتے تھے کہ میں ہمیشہ نماز مغرب کی سنتوں کے ساتھ صلوٰۃ الروح اور فرضوں کے متصل آیت الکرسی پڑھا کرتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے اسی عمل کے سبب بخش دیا۔

حضرت خواجہ بہاؤ الدین زکریا ملتانی علیہ الرحمۃ نے مخدوم بابا فرید الدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ اجودھنی سے کئی مرتبہ شیخ جمال الدین احمد ہانسوی رحمۃ اللہ علیہ کو مانگا لیکن بابا صاحب ہر بار یہی جواب دیتے کہ

”جمال الدین جمال ماست وکے شخص جمال خویش را بہ دیگرے نمی دہد“

آخر خواجہ بہاؤ الدین زکریا نے اپنے جذب باطنی سے شیخ جمال الدین کو اپنی طرف کھینچا۔ شیخ جمال کے دل میں اضطراب پیدا ہو گیا اور انہوں نے بابا صاحب سے خواجہ زکریا ملتانی کے پاس جانے کی اجازت طلب کی۔ مرشد گرامی کو ان کا یہ اصرار ناگوار گزرا اور ایک روز حالت جلال میں شیخ جمال الدین ہانسوی رحمۃ اللہ علیہ سے فرمایا۔

”بردور وئے خود سیاہ کن“

یہ الفاظ نکلتے ہی شیخ جمال الدین کا جمال صورت متغیر ہو گیا اور کمالات باطنی سلب ہو گئے۔ وہ خانقاہ فریدی سے نکل کر دیوانہ وار دشت نور دی کرنے لگے کہ بابا صاحب کی ناخوشی ان کیلئے سوہان روح بن گئی تھی۔ ہر وقت آہ و زاری کرتے اور مرشد گرامی کو یاد کرتے، اکثر حالت جذب و جنوں میں اپنا لباس پھاڑ ڈالتے اور کبھی سر پر خاک ڈالتے۔ اسی حالت میں ایک سال گزر گیا۔ بابا فرید رحمۃ اللہ علیہ کا عقیدت مند ایک سوداگر مسمی شیخ عالم اس جنگل سے اپنے قافلہ کے ساتھ گزرا جہاں شیخ جمال الدین پریشان پھر رہے تھے۔ اس نے آپ کو پہچان لیا اور آپ کے حال پر نہایت تعجب اور افسوس کا اظہار کیا۔ شیخ جمال نے ”ہائے فرید“ کا نعرہ مارا اور بے ہوش ہو گئے۔ جب ہوش میں آئے تو سوداگر سے التجا کی کہ سرکار فرید میں میری طرف سے یہ عرض کر دینا۔

حضرت گنج شکر قطب زماں قطب زمیں

چشم رحمت بکشا جانب درویش بہ ہیں

حضرت قبلہ بابا فرید رحمۃ اللہ علیہ نے ان کی آہ و زاری دیکھ کر نظر کرم فرمائی اور تمام روحانی

مراتب دوبارہ بحال کر دیئے۔

بابا صاحب نے شیخ جمال الدین احمد کو قطب کا خطاب دے کر ہانسی روانہ کر دیا۔ جہاں آپ نے بقیہ عمر اصلاح خلق میں گزاری۔

حضرت بابا فرید الدین رحمۃ اللہ علیہ کے بھانجے مخدوم علاؤ الدین علی احمد صابر رحمۃ اللہ علیہ جب ہانسی پہنچے اور اپنی سند خلافت تصدیق و توثیق کیلئے شیخ قطب جمال کو پیش کی تو رات کا وقت تھا۔ حجرے کا چراغ ہوا کے ایک تیز جھونکے سے بجھ گیا۔ مخدوم علاؤ الدین نے اپنی انگلی کھڑی کی اور وہ چراغ کی طرح روشنی دینے لگی۔ قطب جمال کو ان کا یہ اظہار کرامت پسند نہ آیا اور انہوں نے خلافت نامہ چاک کر دیا۔ مخدوم علاؤ الدین جلال میں آگئے کہ آپ نے میری سند خلافت چاک کی اور میں نے آپ کا سلسلہ چاک کر دیا۔ مخدوم بلا توقف واپس اجودھن پہنچے اور سب واقعہ بابا صاحب کے گوش گزار کیا۔ بابا صاحب نے فرمایا کہ ”تیر پہلوانان دیں خطائی رود“ اور پھر پوچھا تم نے جمال الدین ہانسوی رحمۃ اللہ علیہ کا سلسلہ کس طرف سے چاک کیا۔ مخدوم علی احمد صابر رحمۃ اللہ علیہ نے جواب دیا۔ اول سے ”بابا صاحب“ نے فرمایا کہ یہ بھی اچھا ہوا۔ اللہ تعالیٰ کچھ مدت بعد تمہارے ایک مرید کی دعا سے سلسلہ جمالیہ درست کر دے گا“ میں تمہیں نئی سند لکھ دیتا ہوں۔

حضرت قطب جمال ہانسوی رحمۃ اللہ علیہ نے دو نکاح کئے، پہلی بیوی سے ایک صاحبزادہ تولد ہوا جنکا نام شاہ حامد عرف کمال الدین عرف رضی الدین تھا اور ایک بیٹی بانو نامی تھی۔ صاحبزادہ شاہ حامد کچھ مجذوب سے تھے۔ حضرت نظام الدین اولیاء دہلوی فرماتے تھے کہ وہ دیوانہ معنوی تھے۔ ایک روز جب ان سے پوچھا گیا کہ العلم حجاب الاکبر سے کیا مراد ہے تو فرمانے لگے کہ ”علم دون حق است و ہرچہ دون حق است حجاب اکبر است“

اور یہ معانی ایسے ہیں کہ ہم نے ہزار ہوشیاروں سے بھی نہیں سنے۔ قطب صاحب کی دوسری زوجہ حضرت شرف الدین بوعلی قلندر رحمۃ اللہ علیہ پانی پتی کی ہمشرہ تھیں، جن کے بطن سے حضرت قطب دوم صوفی برہان الدین علیہ الرحمہ پیدا ہوئے۔

حضرت جمال الدین احمد خطیب قطب ہانسوی رحمۃ اللہ علیہ صاحب تصنیف تھے۔ آپ کی علمی یادگاروں میں ایک دیوان فارسی ہے جو دو جلدوں میں ہے اور ۱۸۸۹ھ میں طبع ہوا۔ آپ کا وصال ۱۲ شعبان المعظم ۶۵۹ھ بروز پنج شنبہ کو ہوا۔ اس وقت آپ کی عمر ۷۶ سال تھی۔ آپ کا مزار ہانسی میں ہے جو آج بھی مرجع خلائق ہے۔ ہر سال آپ کا عرس بڑی شان و شوکت

سے منایا جاتا ہے اور ہزاروں بندگان خدا کیلئے منبع فیوض و برکات ہے۔
آپ کے مجموعہ ہائے کلام چھ صد سے زائد صفحات پر مشتمل ہیں۔ ان میں حمد، نعت، مناقب، منظومات، غزلیات سب کچھ شامل ہے۔ کلام نہایت پختہ اور دلآویز ہے مگر تحریر کی طوالت اقتباسات پیش کرنے سے قاصر ہے۔ بہر حال یہ کلام نہایت پختہ اور ادبی اور عرفانی لحاظ سے بلند مرتبہ کا حامل ہے جسے بہت زیادہ پسندیدگی کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ نمونہ کے طور پر امام ابوحنیفہ کیلئے کہی ہوئی منقبت کے اشعار درج ہیں۔

مرا فخر است بر اہل زمانہ کہ گشتم مدح خوانِ بوحنیفہ
مسائل کے شود حل مفسر نکر دے ترجمانِ بوحنیفہ
قرین رحمت و رضوان خود دار بماہ و سال جانِ بوحنیفہ
ایک صاحب نظر نے حضرت قطب جمال الدین ہانوسی رحمۃ اللہ علیہ کی منقبت کہی ہے۔
تبرک کے طور پر اس سے بھی کچھ اشعار نقل کئے جاتے ہیں۔

اے جمال ہانسوی اے جانِ جانانِ فرید
تیری آنکھیں ایک مرکز کثرت انوار کا
تیری ہستی میں ہیں انوارِ ازل جلوہ فگن
طلعت بابا فرید الدین ہے طلعت تری
حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے خلیفہ خاص جمال الدین ہانسوی
رحمۃ اللہ علیہ سے اس قدر محبت تھی کہ بارہ برس تک حضرت بابا فرید ان کی محبت سے ہانسی میں رہے
اور ان کے حق میں فرمایا کرتے تھے کہ ”جمال“ میرا جمال ہے اور کبھی فرماتے کہ جمال میں چاہتا ہوں
کہ تمہارے سر کے گرد پھروں اور جب اپنا خلافت نامہ آپ کسی کو عطا فرماتے، حضرت جمال الدین
ہانسوی رحمۃ اللہ علیہ بحال کر دیتے تو خلافت درست ہوتی اور اگر وہ رد کر دیتے تو شیخ بھی یہ کہتے ہوئے
رد فرما دیتے کہ جمال کے پارہ کئے ہوئے کو میں بھی نہیں سی سکتا۔

رہبر راہِ ہدیٰ حضرت جمال الدین تھے
ان کے جلوؤں میں جمال حضرت بابا فرید
منبع لطف و عطا حضرت جمال الدین تھے
معرفت کے ناخدا حضرت جمال الدین تھے



حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ

چشتیوں کی سلطنت کے حکمراں خواجہ نظام جن کے فیض عام سے ہے قلب ہستی شاد کام ہے جبین شوق جھکتی جن کی عظمت کے حضور روح ایمان دل کا درماں ہیں وہی تو لاکلام حضرت گنج شکر کے بے کراں الطاف سے سر بسر نور ہدایت ہیں یہ بہر خاص و عام ان کا مرقد ہے زیارت گاہ اصحاب یقین جو یہاں پر پیش کرتے ہیں عقیدت سے سلام آپ کے لنگر سے تھا سارا زمانہ فیضیاب آپ تھے عالی نسب، جان یقین، عالی مقام تذکرہ چھڑتا ہے جب بھی رہبران قوم کا نام لیتا ہے زمانہ آپ ہی کا صبح و شام یہ ہیں محبوب الہی اہل ایمان کیلئے ان کے ہر اک قول کو ہے اے رضا حاصل دوام

(محمد اکرم رضا)

محبوبِ الہی

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ

سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ دنیائے تصوف کی نہایت ہی برگزیدہ اور قابل تکریم شخصیت ہیں۔ آپ سلسلہ چشتیہ کے حوالے سے بطور خاص بے شمار اہل نظر کے دلوں کی دھڑکن ہیں۔ آپ نے تبلیغ اسلام اور فروغ دین حق کیلئے تمام زندگی ناقابل فراموش کردار ادا کیا۔ آپ کے والدین نہایت پاکیزہ صفت اور متقی تھے۔ آپ کے والد خواجہ احمد بڑے صالح مزاج کے پاکیزہ کردار کے حامل انسان تھے۔ وقت کے سربراہ نے انہیں بدایوں کا قاضی مقرر کر دیا تھا۔ آپ ۲۷ صفر المظفر ۶۳۲ھ میں پیدا ہوئے۔ پانچ برس کی زندگی میں آپ یتیم ہو گئے۔ پچیس برس کے ہوئے تو اپنی والدہ ماجدہ کو لے کر دہلی آ گئے اور مولانا شمس الدین شمس الملک جیسی یگانہ روزگار شخصیت کے حلقہ درس میں شریک ہوئے۔ مولانا کمال الدین زاہد سے بھی کتب دینیہ پڑھیں۔ آپ حضرت نجیب الدین متوکل کے پڑوسی تھے۔ زندگی کے یہ تمام برس فقر و فاقہ میں بسر ہوئے۔ آپ نے فقر و فاقہ اور تنگدستی کو نہایت خندہ پیشانی سے قبول کیا، کبھی زبان پر شکوہ نہ آنے دیا۔ کئی درباروں سے ملازمت کی پیشکش ہوئی مگر اسے شان فقر و درویشی کے خلاف سمجھتے ہوئے انکار کر دیا۔ روزہ دار رہتے تھے۔

سلسلہ عالیہ چشتیہ کی خوش بختی رہی ہے کہ اسے یکے بعد دیگرے ایسے نادر روزگار شیوخ اور جانشین میسر آئے جن میں سے ہر ایک آسمان رشد و ہدایت کا ماہتاب ثابت ہوا۔ خواجہ غریب نواز خواجہ محمد معین الدین چشتی، خواجہ قطب الدین بختیار کاکی، حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکر، حضرت محبوب الہی خواجہ نظام الدین اولیاء رحمہم اللہ تعالیٰ اور ان کے بعد کی شخصیات بھی اس قدر سر بلند ہیں کہ ان میں سے کسی کے روشن کردار سے بھی صرف نظر نہیں کیا جاسکتا۔ حق تو یہ ہے آج برصغیر پاک و ہند اسلام کے جن انوار سے جگمگا رہا ہے ان میں غالب حصہ مشائخ چشتیہ کا ہے۔

اولیائے چشت ہیں بزم تصوف کا نگین
ان کی تعلیمات سے پر نور ہے یہ سرزمین
خواجہ ہندالولی کا فیض ہے پھیلا ہوا
تھے مثال ماہتاب نور ان کے جانشین

آپ بدایوں میں جبکہ آپ کی عمر ابھی بارہ ہی سال کی تھی۔ حضرت بہاؤ الدین زکریا ملتانی اور حضرت بابا فرید الدین کا شہرہ کمال سن چکے تھے اور ابو بکر قوال سے یہ معلوم کر کے آپ کا قلب بابا صاحب کی طرف راغب ہو رہا تھا۔ دہلی سے سند فضیلت علوم ظاہری حاصل کر کے آپ بشوق ارادت پاکپتن روانہ ہوئے۔

حضرت بابا صاحب نے نہایت محبت سے ان کا استقبال کیا۔ اہل اللہ سے کوئی بات چھپی نہیں رہتی۔ حضرت کو علم ہو گیا تھا کہ ارض بدایوں سے ایک مرد جلیل آ کر آپ کی مسند پر متمکن ہوگا۔ آپ کی زبان سے کچھ بھی نہ نکلا۔ خدمت شیخ میں رہ کر شیخ سے چند اہم کتب پڑھیں، مرید ہو گئے۔ عرض کی کہ کیا اب ترک تعلیم کر کے مصروف عبادت رہوں، فرمایا ”میں کسی کو تعلیم سے نہیں روکتا، یہ بھی کرو اور وہ بھی کرو“۔

پھر فرمایا ”درویش کیلئے علم ضروری ہے تاکہ وہ فریب شیطان سے محفوظ رہے۔ چنانچہ آپ مصروف عبادت ہو گئے اور چند روز بعد ۶۷ھ میں آپ کو خلافت بھی عطا کر دی گئی۔ فرمایا: ان دنوں شیخ پر بڑی تنگی تھی۔ مرید ہی اپنے ہاتھوں لکڑیاں پانی اور کریر لاتے اور وہ ابال کر سب کھاتے۔ ایک روز میں نے تھوڑا سا نمک ڈال دیا۔ فرمایا: مشتبہ ہے نہیں کھاتا، عرض کی قرض لا کر نمک ڈالا ہے۔ فرمایا: درویش فاقوں سے مرجائیں گے مگر لذت نفس کیلئے قرضہ نہ لیں گے۔

نفس کیلئے قرض نہ لیں گے اس لئے کہ قرض اور توکل میں بعد المشرقین ہے لیکن مجھے چلتے وقت دعا دی کہ تو کسی کا محتاج نہ رہے گا اور دشمنوں کو خوش رکھنا اور جس سے کبھی قرض لیا ہو اسے ادا کرنا۔

جب آپ دہلی آئے تو پہلے جنگلوں میں مصروف عبادت رہے۔ پھر غیبی حکم سے غیاث پور تشریف لے آئے۔ عبادت و ریاضت پر بہت وقت دیتے۔ ہمیشہ روزہ دار رہے۔ افطار کرتے تو باسی روٹی سے کرتے۔ خادم اصرار کرتے تو فرماتے کہ درویش تو فاقے سے رہیں اور میں اچھی روٹی کھاؤں۔ آپ نے معز الدین کی قباد کے بسائے ہوئے شہر میں جانے کا ارادہ کیا تو ایک فقیر نے نمودار ہو کر کہا:

”اول تو مشہور ہی نہ ہونا چاہیے اور مشہور ہو گیا ہے تو ایسا نہ کرنا کہ قیامت کے روز بارگاہ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم میں شرمندہ ہونا پڑے۔ حوصلہ مندی کا تقاضا یہی ہے کہ خلق خدا کے درمیان رہو اور خدا سے لو لگائے رکھو۔“

آپ نے ارادہ ملتوی کر دیا اور اسی فقر و فاقہ کو شعار حیات بنائے رکھا۔ ایک روز ایک پارسا عورت کو آپ کے فقر و فاقہ کا علم ہوا تو اپنے پاس موجود آدھ سیر جو کا آٹا لاکر انہیں دیا۔ مریدوں نے پانی ملا کر پلایا۔ ایک درویش حیرت انگیز طور پر اچانک وہاں آگئے اور فرمایا ”نظام الدین کچھ کھلانے کو ہے۔“ آپ نے ہانڈی لاکر سامنے رکھ دی اس نے گرم ہی گرم کھانا شروع کر دی اور کھا کر ہانڈی پھوڑ دی اور فرمایا:

”نعمت باطنی تو تجھے بابا فرید الدین گنج شکر سے ملی تیرا ظاہری فاقہ ہم نے توڑ دیا ہے۔“ پھر وہ فقیر غائب ہو گیا۔ اس کے بعد فتوحات ظاہری و باطنی کی کمی نہ رہی۔ عوام الناس کثرت سے مرید ہونے لگے۔ وقت کے امراء بھی آپ سے بیعت ہونے لگے۔ یہ سلسلہ اس قدر بڑھا کہ ہزاروں لاکھوں فاقہ کش اور مرید آپ کے لنگر سے فیضیاب ہونے لگے۔ آپ مرجع عام بن گئے۔ سلاطین بھی رشک کرنے لگے آپ کی خانقاہ عالیہ عظیم روحانی اور باطنی درس گاہ بھی تھی جہاں صرف لنگر سے کھانا ہی نہیں عطا ہوتا تھا بلکہ عام طلبہ کے ساتھ ساتھ علماء فضلاء بھی یہاں سے تعلیم حاصل کرتے۔

آپ کی کرامات کثیرہ ظاہر ہونے لگیں۔ سلطان علاؤ الدین تغلق ادب سے حاضر ہوتا اور اپنی حاجات آپ سے عرض کر کے من کی مراد پاتا۔ سلطان غیاث الدین تغلق آپ سے کشیدگی رکھتا تھا۔ اس نے آپ کو غیاث پورہ سے چلے جانے کو کہا اور کہا ”میں آ رہا ہوں اس سے پہلے ہی چلے جائیں۔“ اس سے پہلے ہی آپ نے فرمایا ”ہنوز دلی دور است“ چنانچہ دہلی پہنچنے سے پیشتر تغلق آباد میں مکان کے نیچے دب کر مر گیا۔

سلطان علاؤ الدین خلجی بہت معتقد تھا۔ اس نے اپنے بیٹے خضر خاں کو کئی بار بھیجا کہ حضور میرے کاشانہ پر قدم رنجہ فرمایا کریں اس میں میری سعادت ہے۔ جواب دیا ”بادشاہ سے کہنا ایک گوشہ میں پڑا ہوں تیرا کچھ بگاڑ نہیں رہا بادشاہ اور تمام مسلمانوں کیلئے دعائے خیر کرتا رہتا ہوں۔ اگر بادشاہ نے اصرار کیا تو میں دہلی سے چلا جاؤں گا۔ خضر خاں یہ جواب لے کر گیا تو اس نے خود آنے کا ارادہ کیا۔ فرمایا: اس کی بھی کوئی ضرورت نہیں میں یہیں سے مصروف دعا ہوں بلکہ غیب کی دعا زیادہ

موثر ہوتی ہے۔ میرے مکان کے دو دروازے ہیں اگر بادشاہ ایک دروازہ سے آیا تو میں دوسرے سے نکل جاؤں گا۔ جب چنگیزیوں نے دہلی آ کر یکا یک گھیر لیا تو علاؤ الدین بہت پریشان ہوا کہ تمام لشکر دہلی سے باہر گیا ہوا تھا، آپ سے دعا کا خواستگار ہوا اور یہ آپ ہی کی دعا کا اثر تھا کہ رات کو خود بخود غنیم کے لشکر پر ہیبت طاری ہو گئی اور وہ محاصرہ چھوڑ کر بھاگ نکلے۔

سلطان قطب الدین مبارک شاہ نے آپ کے مرید خضر خاں کو شہید کیا اور آپ کو بھی تکلیف دینی چاہی۔ تمام امراء و وزراء نے معتقد و مرید ہونے کے باعث چندے صبر کیا۔ ایک روز قاضی محمد غزنوی سے کہا کہ نظام الدین کے پاس خرچ کرنے کو اتنا روپیہ آ کہاں سے جاتا ہے؟ یہ بھی مخالف تھا۔ بولا آتا کہاں سے آپ کے امراء و ملازمین تو دیتے ہیں، بھلا کہیں ٹھکانہ ہے کہ وہ ہزار تنگہ سرخ روز کا صرف ہے جو صرف لشکر کیلئے وقف ہے۔ اس نے فوراً ایک فرمان صادر کر دیا کہ ہمارے ملازمین و امراء میں سے کوئی نظام الدین کے پاس نہ جائے اور نہ کچھ دے ورنہ سزا پائے گا۔ آپ نے خبر پاتے ہی خواجہ اقبال کو حکم دیا کہ آج سے لشکر خانہ کا طمع دگنا کر دیا جائے اور جو ضرورت ہو فلاں طاق سے بسم اللہ کہہ کر اور ہاتھ ڈال کر لے لیا کرے۔ سلطان وقت کا حکم اہل شہر بھی خوف کے مارے نہ گئے۔ سلطان نے جو خفیہ معلوم کرایا تو پتہ چلا کہ واقعی کسی نے کچھ نہیں دیا۔ یہ محض کرامت ہے تو دل میں بہت شرمندہ ہوا اور کہلا بھیجا کہ آپ شہر میں رہ کر مجھ سے نہیں ملتے حالانکہ شیخ رکن الدین جیسے بزرگ بھی میرے پاس آتے ہیں۔ اس میں میری تحقیر ہے۔ فرمایا: میرے پیروں کا یہ طریقہ نہیں رہا، سلطان نے غضبناک ہو کر کہلا بھیجا کہ آپ کو میرے حکم کی تعمیل کرنی ہوگی۔

آپ نے شیخ علی سنجر کو بادشاہ کے پیر شیخ ضیاء الدین رومی کے پاس بھیجا کہ بادشاہ کو سمجھائیں، فقیر کی ایذا رسانی میں کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ وہ اتفاق سے بہت علیل تھے۔ تیسرے روز وصال ہو گیا، ان کی فاتحہ میں تمام امراء و مشائخ و اکابر جمع ہوئے۔ آپ بھی تشریف لے گئے، آپ کو دیکھتے ہی سب کے سب تعظیم کیلئے کھڑے ہو گئے مگر سلطان وقت تلاوت قرآن میں مصروف رہا اور بالکل توجہ نہ کی۔ کچھ لوگ بولے کہ سلطان بھی شریک مجلس ہے، سلام علیک کر لیجئے۔ فرمایا: مصروف تلاوت ہے کوئی ضرورت نہیں، سلطان نے پھر مشائخ سے کہا کہ انہیں سمجھائیے، روز نہیں تو آٹھویں دن ورنہ ہر چاند رات کو مبارک باد دینے تو ضرور آیا کریں، آپ واپس چلے گئے تھے۔ چنانچہ سید قطب الدین یہ پیغام لے کر گئے اور کہا سلطان کا ارادہ اچھا نہیں، مصلحت یہی ہے کہ منظور کر لیں، آپ نے صرف ان شاء اللہ کہا اور خاموش ہو گئے۔

سب سمجھ گئے کہ حضور جائیں گے۔ بادشاہ بھی خوش تھا، عین چاند رات کو امیر خسرو اور خواجہ وحید آئے اور جانے کو پوچھا۔ فرمایا: ہرگز نہیں۔ بولے سلطان منتظر ہے اور آپ انکاری، یہ تو بڑا فساد ہو جائے گا۔ فرمایا: سلطان مجھ پر غالب نہ ہوگا۔ ابھی تک ایک پہر ہی رات گزری تھی کہ امیر غیاث الدین تغلق نے سلطان اور قاضی دونوں کو کوشک ہزارستون میں قتل کر دیا۔

(اخبار الاخیار اخبار الاولیاء)

مولانا ضیاء الدین برنی ”تاریخ فیروز شاہی“ کے مصنف، امیر خسرو اور امیر حسن علانی یک جان سے قلب دوست تھے۔ ایک روز سوچا کہ پہلے مشائخ مرید کرنے میں بہت احتیاط کرتے تھے میرے شیخ احتیاط نہیں کرتے نہ معلوم کیا حکمت ہے؟ فوراً حضرت نے فرمایا کہ:

”ہر زمانے کا رنگ اور حالات جدا ہوتے ہیں اور ان کے مطابق ہی عمل ہوتا ہے کسی کا مرید ہونا غیر حق سے منقطع ہونا ہوتا ہے۔ پہلے بزرگ اس وقت تک ہرگز مرید نہیں کرتے تھے جب تک کہ وہ مرید میں طلب صادق نہ دیکھ لیتے تھے مگر حضرت ابوسعید الخیر، مرشد غوث پاک کے عہد سے لے کر شیخ سیف الدین باخزری اور شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردی کے زمانہ سے لے کر شیخ فرید الدین عطار کے وقت تک یہ حالت تھی کہ مشائخ کے دروازوں پر امراء و سلاطین و اہل خلق کا اجتماع رہتا تھا اور سلاطین بھی باز پرس آخرت کے خوف سے خود کو انہی کی پناہ میں رکھتے تھے اور یہ بھی ازراہ مہربانی ہر کسی کو مرید کر لیتے تھے۔ محبوبان خدا کے معاملات کسی کے قیاس میں نہیں آسکتے، میں بھی پیر کی متابعت میں مرید کرنے میں احتیاط نہیں کرتا۔“

اس میں متعدد فوائد بھی ہیں کہ میرے مرید نماز باجماعت ادا کرتے ہیں، گناہ سے بچتے ہیں، نوافل میں مشغول رہتے ہیں۔ اگر شرائط بزرگان قدیم ان کے سامنے پیش کی جائیں تو وہ شاید تکمیل نہ کر سکیں اور اتنے ثواب سے بھی محروم رہ جائیں، پھر بیعت کرنا گناہ سے باز رکھنا ہے پھر میرے پیر سے مریدان چشت کو بخشنے کا وعدہ ہو چکا ہے، اس لئے جو آتا ہے مرید کر لیتا ہوں کہ مخلوق گنہگار ہے اور شاید وہ میرے ہی وسیلہ سے بخشی جائے۔

شیخ برہان الدین اتنے مؤدب تھے کہ تمام عمر غیاث پور کی طرف پشت نہ کی۔ بڑے صاحب ذوق و سماع تھے۔ دیوگری (دکن) میں مامور بہ تبلیغ ہوئے تھے۔ دور دور تک کرامت کا شہرہ تھا۔ شیخ زین الدین شیرازی سے آکر مرید ہوئے، بہت سے مسلمان کئے۔ حضرت محبوب الہی درجہ قطبیت و غوثیت

سے عبور کر کے درجہ محبوبیت پر فائز ہو گئے تھے۔ ہمہ وقت یاد الہی میں مصروف رہتے تھے۔ بلاشبہ لاکھوں انسانوں کو آپ سے فیض پہنچا اور لاکھوں ہی مرید ہوئے۔ وہ آپ ہی بزرگ تھے جنہوں نے دنیا کے اس عروس البلاد اور سلطنت ہند کے عظیم الشان پایہ تخت کی کایا پلٹ کر رکھ دی تھی۔ یہ عالم تھا کہ دہلی میں جہاں چار آدمی ملتے اللہ اور رسول ہی کا ذکر کرتے اور تو اور کنیران شاہی تک کی محلات میں ایک وقت کی نماز قضا نہ ہوتی تھی۔ غریب و امیر اور عورت و مرد بلا مبالغہ سب کے سب نمازی اور پابند مذہب بن گئے تھے۔ ہر جگہ نوافل و عبادت و تلاوت کے چرچے تھے۔ ضیاء الدین برنی لکھتے ہیں کہ دہلی والے اس عہد میں قدوسیوں کی جماعت نظر آتے تھے۔ مساجد نمازیوں سے لبریز رہتی تھیں۔ دہلی سے غیاث پورہ تک کئی میل کا فاصلہ تھا مگر راستہ میں ہر وقت لوگوں کی بھیڑ رہتی تھی اور راستہ گلزار تھا۔

اس عہد میں یہ معلوم ہوتا تھا کہ خلفائے راشدین کا زمانہ آ گیا ہے۔ روزانہ ہزار ہا مرید ہوتے تھے۔ ایک طرف آپ ہی ہدایت خلق اصلاح مسلمین اور اشاعت اسلام میں مصروف نہ تھے جبکہ ملتان میں شیخ رکن الدین دور دور تک نور پھیلا رہے تھے۔ دوسری طرف آپ کے خلفاء اطراف ہند میں یہی خدمات انجام دے رہے تھے شریعت مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم کا پرچم لہرا رہا تھا۔

ہم لکھ چکے ہیں کہ آپ کے زمانہ میں دو بادشاہوں نے آپ سے مخالفت کی اور جس شدت کے ساتھ مخالفت کی اسی شدت و سختی کے ساتھ تباہ ہوئے۔ یہ دونوں سلطان قطب الدین مبارک شاہ اور سلطان غیاث الدین تغلق تھے۔ حالانکہ اول الذکر کا باپ سلطان علاؤ الدین خلجی آپ کا بے حد معتقد تھا۔ اتنا کہ اس نے ملک قراہیک ترک اپنے مشیر خاص کو اس کام پر بطور خاص مامور کر رکھا تھا کہ وہ حضرت کی مجالس سماع میں خصوصیت کے ساتھ شریک ہوا کریں اور جن ابیات و اشعار پر حضرت کو وجد و حال رونما ہو لکھ کر حضور میں پیش کیا کریں۔ چنانچہ ایک دفعہ آپ کو حدیقہ حکیم سنائی کے ان دو اشعار پر وجد ہوا۔

پیش منما جمال جاں افروز

در نمودی برو سپند بسوز

واں جمال تو چیست؟ مستی تو

واں سپند تو چیست؟ ہستی تو

سلطان کے سامنے جو یہ ابیات پیش ہوئیں تو بار بار پڑھتا اور روتا تھا۔ قراہیک خود بھی بہت

نیک اور حضرت کا مرید تھا۔ عرض کی کہ تعجب ہے کہ آپ اتنے اعتقاد و تاثر کے باوجود حضرت کے دیکھنے کیلئے تشریف نہیں لے جاتے۔ سلطان نے کہا قرابیک میں بادشاہ ہوں اور سر سے پاؤں تک گناہوں میں غرق ہوں۔ اپنی اس آلودگی میں کیونکر ایسے پاک و مطہر وجود کو دیکھ سکوں گا۔ البتہ میں اجازت دیتا ہوں کہ تو میرے دونوں فرزندوں خضر خاں اور شادی خاں کو لے کر جا حضرت کے قدموں پر ڈال دے۔ مرید کروا لے اور دو لاکھ تکہ خزانہ سے لے جا کر نذر پیش کر۔ چنانچہ یہ دونوں شہزادے حضرت کے مرید ہو گئے۔

سلطان غیاث الدین تغلق کا بڑا بیٹا محمد تغلق آپ کا بہت معتقد تھا، محبت رکھتا تھا۔ وہ بھی اسی محل کے اندر تھا۔ لیکن آپ کی عقیدت اس کی کشتی حیات کی ناخدا بن گئی اور وہ حضرت شیخ رکن الدین ابوالفتح کے انتباہ پر چند لمحے پہلے ہی محل سے نکل آیا۔ محل اتنا مضبوط بنا ہوا تھا کہ اس کے منہدم ہونے کا کوئی امکان نہ تھا اور نہ کسی سازش کی کرشمہ کاری کہی جاسکتی ہے جیسا کہ ظاہر بین لکھتے ہیں۔ نیچے کوئی بارود بچھا کر اسے بہ آسانی اڑایا جاسکتا تھا مگر نہیں گری اور صرف چھت گری اور حضرت کی بددعا سے گری۔

سلطان محمد تغلق کا چتر شاہی آپ کی عقیدت ہی بنی۔ سلطان علاؤ الدین خلجی سکندر ثانی اور ارض ہند کا فاتح اعظم آپ ہی کی دعاؤں کے سائے میں بن سکا۔ اب اور سنئے سلطان فیروز شاہ تغلق ارض ہند کا کتنا بلند پایہ مشہور نیک دل اور نیک نام بادشاہ گذرا ہے۔ اس کی تمام شہرتیں تمام نیک نامیاں تمام امن و امان اور تمام کارہائے نمایاں صرف آپ ہی کی دعائے عقیدت کے ثمرہائے شیریں تھے جب صغریٰ ہی میں سلطان آپ کی زیارت کو غیاث پورہ آیا ہے تو بہت ادب و تعظیم کے ساتھ نیاز مندانہ سامنے گیا۔ آپ کو اس کا یہ ادب و احترام بہت پسند آیا۔

دریافت کیا ”بابا چہ نام داری؟“ جواب دیا فدوی بہ اسم کمال الدین مشہور است“ ارشاد فرمایا ”عمر بہ کمال دولت بہ کمال نعمت بہ کمال اس ارشاد و دعا کا جو اثر تھا وہ دنیا کے سامنے ہے اور تاریخ شاہد ہے۔ سلطان کی زندگی کا ایک ایک ورق اس دعا کا پیکر صداقت رہا۔ سلطان محمد تغلق کی وفات کے بعد سندھ اور گجرات کے جملہ امراء عمائد نے اسے بہ اتفاق بادشاہ بننے پر مجبور کیا۔ اسی سال حکومت کی نوے برس کی عمر پائی۔ بہت نیک نام رہا، بہت امن رہا۔ ہر قسم کی نعمتیں حاصل رہیں، سب سے اہم ترین امر یہ ہے درویشانہ آئین و عقیدت کے ساتھ زندگی بسر کی۔ ضیاء الدین برنی نے اس عقیدت اور درویشانہ زندگی کے متعلق اپنی تاریخ میں پوری تفصیل دی ہے۔

تاریخ فرشتہ جلد اول مقالہ سوم میں مذکور ہے کہ سلطان علاؤ الدین بہمنی کو بھی آپ ہی کی دعا کے زیر اثر سلطنت نصیب ہوئی۔ حسن ایک نہایت مفلس و مفلوک شخص تھا۔ کچھ دنوں بعد دہلی میں ہی ایک برہمن کے ہاں کھیت جوتے اور بونے پر ملازم ہو گیا اور دن بھر کی محنت و مشقت کے بعد روکھی سوکھی ملنے لگی۔ ایک روز وہ خانقاہ کے دروازہ پر تصویر بے کسی بنا ہوا کھڑا تھا اور لوگ بہ کثرت کھانا کھا کر نکل رہے تھے۔ انہی کے نکلنے والوں میں شہزادہ محمد تغلق بھی تھا۔

شہزادہ ابھی کھانا کھا کر دروازہ سے نکلا ہی ہے کہ آپ نے خدام سے فرمایا:

”یک شاہ برفت و دیگرے بر آستانہ موجود“

”ایک بادشاہ نکلا ہے اور دوسرا دروازہ آستانہ پر موجود ہے“۔ خدام سوچنے لگے کہ ایک بادشاہ تو شہزادہ محمد تغلق ہو سکتا ہے مگر دوسرا کون ہے۔ باہر بھی دیکھ آئے مگر کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ استفسار پر فرمایا: ضرور ہے۔ پھر عرض کی کہ دروازہ پر تو ایک مفلوک و محتاج شخص ہے۔ فرمایا: اسے اندر لے آؤ وہی بادشاہ ہے۔ جب اندر آیا تو کھانا ختم ہو چکا تھا۔ ایک کچھ رکھا ہوا تھا۔ آپ نے اس کچھ کو انگلی پر بشکل چتر رکھ کر حسن سے فرمایا کہ یہ اسی سلطنت کا چتر شاہی ہے جو ایک عرصہ کے بعد کن میں تمہیں ملے گی۔ یہ کرامت ملاحظہ فرمائیے کہ اسی لمحہ سے حسن کے دن پھرنے لگے۔ غریب تھا مگر حضرت کی عظمت اور آپ کے الفاظ کی جلالت سے واقف تھا، اسلئے وہ پر امید ہو کر کچھ مدت کے بعد کن روانہ ہوا۔ متعدد انقلاب کے بعد چتر شاہی اس کے سر پر تھا اور تخت فرمان روائی اس کے قدموں کے نیچے۔ بادشاہ ہو کر اس نے نہایت شکوہ و طمطراق کے ساتھ سلطنت کی اور اس کی اولاد بھی کئی صدیوں تک کامیابی و سطوت کے ساتھ حکومت کرتی رہی۔

گلبہ کہ اس بہمنی سلطنت کا پایہ تخت تھا۔ اس خاندان کے تمام فرمانروا فقیر دوست تھے سلطان احمد خاں بہمنی کو بھی ایک بزرگ ہی کی دعا سے تخت ملا تھا۔

اس کتاب کا مطالعہ کرنے والے جا بجا یہ ملاحظہ فرمائیں گے کہ تقریباً پچانوے فیصد فرماں رواؤں کی تخت نشینی صوفیاء اور فقراؤں ہی کی دعاؤں کی رہن منت رہی ہے۔ تیمور بابر ہمایوں شیر شاہ جہانگیر شاہ جہان اورنگ زیب بہادر شاہ اول، التمش، بلبن، غیاث الدین، محمد تغلق، علاؤ الدین خلجی، بہاول لودی، سکندر لودی، حسن، کنگو، احمد خان بہمنی اور احمد خاں بگلس وغیرہ کے پر شکوہ فرماں روا ہونے کا کوئی امکان باقی نہ رہا تھا مگر صوفیاء اور اولیاء کی دعاؤں نے انہیں فرش سے اٹھا کر تخت پر بٹھا دیا۔ تقریباً تمام ہی فرماں روائان ہند اور امرائے سلطنت صوفیائے کرام کے مرید و معتقد بھی رہے ہیں مگر آج یہ

سب کچھ فضول سمجھا جاتا ہے، شرک ہے، بدعت ہے، افسوس و صد افسوس۔
سلطان محمد تغلق نے بہت سے مشائخین کو ستایا اور قتل کیا مگر اسے بھی آخر شیخ قطب الدین
منور کے سامنے سر جھکانا اور معتقد ہونا پڑا۔

فرمایا کرتے تھے، کچھ ملے تو جمع نہ کرنا، نہ ملے تو فکر نہ کرنا کہ خدا ضرور دے گا، کسی کی برائی
نہ کرنا، قرض نہ لینا، جفا کے بدلے عطا کرنا، ایسا کرو گے تو بادشاہ تمہارے در پر آئیں گے۔ فقر و
فاقر رحمت الہی ہے، جس رات فقیر بھوکا سویا وہ شب اس کی شب معراج ہے۔

سلطان علاؤ الدین خلجی نے کہلا بھیجا کہ ایک مہم گئی ہوئی ہے، کوئی خبر نہ آنے سے فکر مند
ہوں۔ براہ کرم چند لحوں کیلئے یہاں تشریف لے آئیے۔ مراقبہ کر کے فرمایا: جا کر کہہ دو میرے آنے
کی ضرورت نہیں، تمہارے بھائی الف خاں کو فتح حاصل ہوئی۔ کل آ جائے گا، ایسا ہی ہوا۔ سلطان نے
پانچ ہزار دینار نذر کئے جو اسی وقت تقسیم کر دیئے۔

آپ کی مجلس سماع میں ایک صوفی نے آہ جو کی تو جل کر خاکستر ہو گیا۔ آپ پر بھی حالت
طاری تھی، سکون ہوا تو پوچھا کہ یہ خاک کیسی ہے؟ معلوم ہوا تو پانی چھڑکا اور وہ صوفی زندہ ہو گیا۔ ارشاد
ہوا کہ تم ابھی خام ہو، جب تک پختگی نہ آ جائے، ہماری مجلس میں ہرگز قدم نہ رکھنا۔

ایک روز دیکھا کہ لب جمنا میر حسن علانی سنخری جو مشہور شاعر تھا یا ران صحبت کے ساتھ بیٹھا
ہوا جام و مینا کے کھیل میں مصروف ہے۔ آپ کو آتے دیکھ کر شرمندہ سا ہو گیا اور یہ شعر پڑھا:

سالہا باشد کہ باہم صحبت
گرز صحبتہا اثر بودے کجاست
زہدتان فسق از دل ما کم نہ کرد
فسق مایاں بہتر از زہد شماست

ترجمہ کئی سالوں سے ہم ایک دوسرے کے ہم نشین ہیں، اگر صحبت و ہم نشینی اثر رکھتی تو وہ کہاں
ہے؟

آپ کا زہد اور تقویٰ ہمارے دل سے فسق و فجور کو ختم نہ کر سکا، ہمارا فسق و فجور تمہارے زہد
سے بڑھ گیا۔

یہ سن کر حضرت نے صرف اتنا ہی فرمایا کہ ”صحبت میں تو بڑا اثر ہے“ تو اس کے قلب کی
دنیا بدل گئی، بے تاب ہو گیا، دوڑ کر قدموں پر گرا اور مرید ہو کر درجہ کمال کو پہنچا۔ اس وقت حسن کی عمر

تہتر کی تھی، فوائد الفواد انہی کی لکھی ہوئی ہے۔

آپ نے ۹۴ سال کی عمر میں ۱۷ ربیع الاخر ۳۵ھ کو وفات پائی۔ ربیع الاول میں پیدا ہوئے اور ربیع الاخر میں انتقال کیا۔ حضرت رکن الدین ابوالفتح سہروردی عیادت کیلئے آئے ہوئے تھے انہی نے نماز جنازہ پڑھائی۔ مخلوق کا ایک اژدہام تھا راستے میں ایک طوائف بڑے درد کے ساتھ گارہی تھی۔

۔ اے تماشا گاہ عالم روئے تو

تو کجا بہر تماشا سے روی

اسی وقت جنازہ سے ہاتھ باہر آگئے، حضرت نے دوڑ کر روکا کہ سمجھتی نہیں، عاشق ربانی کا جنازہ ہے۔ قبر میں نعش اتاری گئی تو حضرت نے حضور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جلوہ گرد دیکھا، اتنا اثر تھا کہ باہر نکلنے ہی فرط تاثر سے بیہوش ہو گئے۔

شہزادی جہاں آراء بیگم نے ایک دفعہ بغداد جانے کا عزم کیا، پہلے آپ کی زیارت کی رات کو خواب میں دیکھا کہ حضور غوث اعظم تشریف فرما ہیں اور کہتے ہیں جہاں آراء کہاں جا رہی ہو؟ عرض کی کہ حضور کی زیارت کو اور چادر چڑھانے کو جا رہی ہوں۔ فرمایا: میں تو یہیں دہلی میں ہوں۔ عرض کی: حضور مجھے کیا علم ہے کہ آپ دہلی میں کہاں تشریف فرما ہیں۔

فرمایا: نظام الدین کے پاس ہوں۔ جہاں آراء نے صبح ہی علماء و مشائخین کو بلا کر خواب بیان کیا۔ انہوں نے کہا: حضور غوث پاک شب کو حضور محبوب الہی کے پاس تھے کہ سب نے رات عجیب عجیب برکات کا مشاہدہ کیا ہے۔ چنانچہ جہاں آراء بیگم نے چادر اور تمام سامان جو بغداد ساتھ لے جانے والی تھیں۔ سلطان المشائخ ہی کی بارگاہ میں تقسیم کر دیں اور زر نقد فقراء اور مساکین کو تقسیم کر دیا۔ مولس الارواح میں خود ہی جہاں آراء بیگم نے یہ خواب و واقعہ لکھا ہے۔ یہ شہزادی خاندان چشتیہ ہی میں مرید تھیں، بڑی صاحب دل اور باکمال خاتون تھیں۔

وصال سے کئی روز پیشتر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم خواب میں فرما رہے تھے کہ نظام جلدی کرتیرا بہت اشتیاق ہے۔ آج بھی مزار مبارک دہلی میں زیارت گاہ خلایق ہے۔

حضرت سلطان المشائخ کے خلفاء بکثرت اور باکمال ہوئے۔ حضرت مولانا بدر الدین بڑے امیر اور دولت مند تھے، ترک علاقے کر کے مرتبہ کمال کو پہنچے۔

شیخ وحید الدین یوسف جب سے مرید ہوئے، مور کی چال چلا کرتے تھے۔ دعائے شیخ سے ہوا پر پرواز کرنے لگے، حضرت نے آپ کو چندیری میں تبلیغ ہدایت کیلئے مامور کیا تھا، وہیں مزار ہے۔

خواجہ فخر الدین رازی کتابت قرآن کیا کرتے تھے۔ لوگ زیادہ دیتے مگر آپ چار آنہ روز سے زیادہ نہ لیتے، بصارت جاتی رہی تو ملک حمید الدین نے سلطان علاؤ الدین سے سفارش کر کے سوا سو روپیہ ماہوار وظیفہ کرا دیا۔ فرمایا: ہرگز نہیں، چار آنہ روز سے زیادہ نہ لوں گا۔ چار آنے میں کچھ کھاتے، کچھ خیرات کرتے۔ بڑی مشکل و سعی سے دس آنے روز سلطان سے منظور کروائے گئے۔ رجال بھی ملا کرتے تھے، بہت بڑے بزرگ تھے۔

شیخ اخی سراج الدین بدایونی زبردست اولیاء سے تھے۔ بنگال میں ہدایت خلق پر مامور ہوئے، ہزار ہا غیر مسلم کو مسلمان کیا۔ وفات ۷۵۸ھ میں ہوئی۔

خواجہ احمد بدایونی طریقہ ابدالی رکھتے تھے، بہت بزرگ تھے۔ ماں کے سوال پر فرمایا تھا ”خوشی اسی وقت ہوتی ہے جب جماعت سے نماز ملتی ہے“۔ بے شمار خلفاء میں سے صرف چند خلفاء کے اسماء لکھ دیئے گئے ہیں، یہ سب تبلیغ و اشاعت میں مصروف تھے۔

آپ کو محبوب الہی کا لقب حضرت بابا فرید گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ ہی کا عطا کردہ تھا۔ ایک بار حضور بابا صاحب نے اس چہیتے مرید خواجہ نظام الدین اولیاء کیلئے بارگاہ الہی میں دعا فرمائی ”الہی! نظام الدین جو تجھ سے طلب کرے اسے عطا کر“۔ یہ دعا مقبول ہوئی اسی لئے وہ محبوب الہی کہلاتے۔ (سید العارفین) یہ خواجہ نظام الدین کی انتہائی خوش بختی تھی کہ جب بابا فرید رحمۃ اللہ علیہ کی بارگاہ میں پاکستن پہنچے تو اگلے روز ہی حضور بابا صاحب نے فرمایا:

”میں کسی کو نعمت دینا چاہتا ہوں مگر میرے دل میں القا کیا گیا ہے کہ نظام الدین دہلی سے آ رہے ہیں ان کا انتظار کرو۔ خواجہ نظام الدین اولیاء نے حضرت بابا فرید سے روحانی فیوض کے ساتھ ساتھ تین کتابیں بھی آپ سے پڑھیں کیونکہ بابا فرید صرف فقید المثال شیخ کامل ہی نہیں تھے بلکہ بہت عالم دین اور فقیہ زمانہ بھی تھے۔

خواجہ نظام الدین نے اپنے شیخ کامل کی بارگاہ میں جولدت حاصل کی اسے تمام عمر فراموش نہ کر سکے۔ فرمایا کرتے تھے۔

”بابا صاحب کے حسن عبادت، لطافت، لذت بیان اور شیرینی گفتار کا یہ عالم تھا کہ مخاطب کے دل پر اثر ہوتا تھا۔ حلاوت ایسی تھی کہ الفاظ کانوں میں رس گھولتے تھے اور سننے والا سوچتا تھا کہ کاش غایت ذوق و کیفیت میں اس وقت دم نکل جائے تو کتنا اچھا ہو؟ جب حضور بابا فرید رحمۃ اللہ علیہ نے خواجہ نظام الدین کو خلافت نامہ عطا کیا تو دستور کے

مطابق فرمایا کہ حضرت شیخ جمال الدین ہانسوی کو دکھاؤ تا کہ وہ بھی مہر لگا دیں۔ جب انہوں نے خلافت نامہ شیخ ہانسوی کو دکھایا تو انہوں نے نہایت شفقت فرمائی اور یہ شعر پڑھا:

خداے جہاں را ہزاروں سپاس

کہ گوہر سپردہ بہ گوہر شناس

خواجہ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کی خوش بختی کی انتہا یہ ہے کہ جب ان کے مرشد کبیر بابا فرید الدین مسعود گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ مرض الموت میں مبتلا ہوئے تو نظام الدین اولیاء کو بہت یاد کرتے تھے لیکن وہ تو دہلی میں تھے۔ باہر حضرت بابا فرید کے بیٹے ٹہل رہے تھے کسی کو اندر نہ جانے دیتے تھے اچانک سید محمد کرمانی موقعہ دیکھ کر اندر داخل ہوئے اور بابا فرید کے قدموں میں سر رکھ دیا۔

بابا فرید کے پوچھنے پر انہوں نے خواجہ نظام الدین اولیاء کا سلام پہنچایا۔

حضرت بابا فرید رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تسبیح، خرقة، نعلین، جامہ، مصلیٰ اور عصا جو حقیقتاً جانشینی کی علامتیں تھیں سید کرمانی کے سپرد کر کے کہا کہ خواجہ نظام الدین اولیاء تک پہنچا دینا۔ فرزندوں کو ناگوار گزرا مگر یہ فیصلہ روحانی صلاحیتوں کے گہرے مطالعے پر مبنی تھا اور یہ اعزاز بھی خواجہ نظام الدین اولیاء کو حاصل ہے کہ آپ نے شیخ بابا فرید رحمۃ اللہ علیہ کے مزار کے قریب بہشتی دروازہ بنوایا جہاں سے ہر سال لاکھوں زائرین گزرتے ہیں۔



حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ

عجب انسان تھا جس نے فقیری میں بھی شاہی کی فقیر ایسا کہ ملکِ علم پر جس کی حکومت تھی بخازا بلخ کا وہ حکمراں شوکت سے رہتا تھا حکومت کا تھا نشہ بحرِ نخوت میں وہ رہتا تھا اچانک اک فقیر بے نوا دربار میں آیا نگاہِ لطف سے اس کی پلٹ دی آن میں کایا تو پھر کیا تھا مٹا شاہی کا تخت و تاج کا سودا یکایک جاگزیں دل میں ہوا پھر فقر کا جذبہ فقیر بے نوا بن کر زمانے پر حکومت کی جہانِ فقر میں ہیں داستانیں ان کی شوکت کی زہے قسمت امامِ اعظم کا ان کو سیدی کہنا خدا کے ذکر میں ہر آن ہی کھوئے ہوئے رہنا رضا ام حسین ان کا براہیم ابن ادہم تھا انہی کی بارگہ میں بادشاہوں کا بھی سر خم تھا شہنشاہِ جہانِ معرفت کی شان کیا کہئے زمانے بھر میں ان کی رفعتِ ایمان کیا کہئے

(محمد اکرم رضا)

شہنشاہ گلیم پوش

حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ

حضرت ابراہیم بن ادہم کا شمار ان اہل تقویٰ اور اصحاب صدق و صفا میں ہوتا ہے جنہوں نے تمام زندگی رضائے الہی میں صرف کر دی۔ آپ کے زہد و تقویٰ اور عبادت و ریاضت کو ہر دور کے اولیاء اللہ نے تسلیم کیا ہے۔ آپ نے حصول معرفت الہی کیلئے جو قربانی دی تھی وہ حیرت انگیز ہے اور لازوال بھی۔ اور پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ جو رضائے الہی میں فنا ہو جاتا ہے رحمت خداوندی خود اس کی رضا ڈھونڈتی ہے۔ حضرت ابراہیم ادہم کو مشہور ترین علماء و فقہاء اور درویشوں نے اعلیٰ سے اعلیٰ خطابات کے ساتھ یاد کیا ہے اور حق تو یہ ہے کہ آپ کی سیرت کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ آپ واقعی ان القاب اور اعزازات کے حق دار تھے۔ آپ کا سینہ فقط رضائے الہی کی تمنا سے آباد تھا اور دنیا بھر کی خواہشات سے بے نیاز تھا۔

آپ کی زندگی کئی ادوار پر مشتمل ہے۔ سلطان وقت تھے تو دور دور ان کا پرچم لہراتا تھا۔ معرفت کی سلطنت کے حکمران بنے تو دلوں پر قبضہ مسلم ہو گیا اور جب علم و حکمت اور علوم دین کے حصول کی طرف متوجہ ہو گئے تو بڑے بڑے علماء اور فضلاء آپ کو اپنی محفلوں میں بے پناہ عزت و تکریم سے جگہ دیتے تھے۔ امام اعظم حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ آپ کے مرتبہ شناس تھے اور آپ کو پیار سے اپنی محافل میں جگہ دیتے تھے جب بھی آپ آتے تو آپ کیلئے ”سیدنا“ کا لقب سن کر متعجب ہو جاتی مگر آپ فرماتے ”تم لوگ اس مرد درویش کا مقام کیا جانو تمہارا سارا وقت دنیاوی مشاغل میں بسر ہوتا ہے اور اس کا ایک ایک سانس معرفت الہی میں گزرتا ہے۔

۔ اس کے دل میں ہے ہمیشہ معرفتِ رحمن کی
مل چکی دولت اسے ایمان کی پہچان کی
اس کا جینا اس کا مرنا ہے خدا کے واسطے
ہیں ضیائیں اس کے دل میں عظمت قرآن کی

ابتداء میں آپ بلخ کے سلطان اور عظیم المرتبت حکمران تھے۔ ایک مرتبہ آپ کو خواب تھے کہ چھت پر کسی کے چلنے کی آہٹ محسوس ہوئی تو آواز دے کر پوچھا کہ چھت پر کون ہے؟ جواب ملا میں آپ کا ایک شناسا ہوں اور اونٹ کی تلاش میں چھت پر آیا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ چھت پر اونٹ کس طرح آسکتا ہے؟ جواب ملا کہ آپ کو تاج و تخت میں خدا کس طرح مل جائے گا۔ یہ سن کر آپ ہیبت زدہ ہو گئے اور دوسرے دن جس وقت دربار جما ہوا تھا تو ایک بہت ہی ذی حشم شخص دربار میں آ پہنچا اور حاضرین پر کچھ ایسا رعب طاری ہوا کہ کسی میں کچھ پوچھنے کی سکت باقی نہ رہی اور وہ شخص تیزی کے ساتھ تخت شاہی کے نزدیک پہنچ کر چاروں طرف کچھ دیکھنے لگا اور جب ابراہیم ادہم رحمۃ اللہ علیہ نے سوال کیا کہ تم کون ہو اور کس کی تلاش میں آئے ہو تو اس نے کہا کہ میں قیام کرنے کی نیت سے آیا تھا لیکن یہ تو سرائے معلوم ہوتی ہے اس لئے یہاں قیام ممکن نہیں۔

آپ نے فرمایا کہ برادرم یہ سرائے نہیں بلکہ شاہی محل ہے۔ اس نے سوال کیا کہ آپ سے قبل یہاں کون آباد تھا۔ فرمایا کہ میرے آباؤ اجداد غرض کہ اسی طرح کئی پشتوں تک پوچھنے کے بعد اس نے کہا اور اب آپ کے بعد یہاں کون رہے گا؟ فرمایا کہ میری اولادیں۔ اس نے کہا ذرا تصور فرمائیے کہ جس جگہ اتنے لوگ آ کر چلے گئے اور کسی کو ثبات حاصل نہ ہو سکا وہ جگہ اگر سرائے نہیں تو اور کیا ہے؟ یہ کہہ کر وہ اچانک غائب ہو گیا اور ابراہیم ادہم رحمۃ اللہ علیہ چونکہ رات ہی کے واقعہ سے بہت مضطرب تھے اس لئے اس واقعہ نے اور بھی بے چین کر دیا اور آپ اس کی جستجو میں نکل کھڑے ہوئے اور ایک جگہ جب ملاقات کے بعد آپ نے ان کا نام دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا کہ مجھے خضر کہتے ہیں۔ اس ادھیڑ بن میں آپ لشکر سمیت شکار کیلئے روانہ ہوئے لیکن لشکر سے بچھڑ کر جب تنہا رہ گئے تو غیب سے ندا آئی کہ اے ابراہیم! موت سے پہلے بیدار ہو جاؤ اور یہ آواز مسلسل آتی رہی جس سے آپ کی قلبی کیفیت دگرگوں ہوتی چلی گئی۔ پھر اچانک سامنے ہرن نظر آ گئے اور جب آپ نے شکار کرنا چاہا تو وہ بول پڑا کہ اگر آپ میرا شکار کریں گے تو آپ خود شکار ہو جائیں گے اور کیا آپ کی تخلیق کا یہی مقصد ہے کہ آپ سیر و شکار کرتے پھریں پھر آپ کی سواری کے زین سے بھی یہی صدا آنے لگی اور آپ گھبرا کر اس طرح متوجہ الی اللہ ہوئے کہ قلب نور سے منور ہو گیا۔ اس کے بعد آپ تخت و تاج کو خیر باد کہہ کر صحرا بصرہ اگر یہ وزاری کرتے ہوئے نیشاپور کے قرب و جوار میں پہنچ کر ایک تاریک و بھیا تک غار میں مکمل نو سال تک عبادت میں مصروف رہے اور ہر جمعہ کو لکڑیاں جمع کر کے فروخت کر دیتے اور جو کچھ ملتا آدھا راہ مولیٰ میں دے دیتے اور باقی ماندہ رقم روٹی خرید

کر نماز جمعہ ادا کرتے اور پھر ہفتہ بھر کیلئے غار میں چلے جاتے۔

موسم سرما میں تیخ بستہ پانی کو جس نے برف کی شکل اختیار کر لی تھی توڑ کر نہائے اور پوری شب مشغول عبادت رہے اور صبح کو جب ہلاکت آمیز سردی محسوس ہونے لگی تو آپ کو آگ کا خیال آیا اور ابھی اسی خیال میں تھے کہ ایسا محسوس ہوا کہ جیسے کسی نے پشت پر گرم پوسٹین ڈال دی ہو جس کی وجہ سے پرسکون نیند آگئی اور جب بیداری کے بعد دیکھا تو ایک بہت بڑا اثر دھا تھا جس کی گرمی نے آپ کو سکون بخشا۔ یہ دیکھ کر آپ خوفزدہ ہو گئے اور اللہ تعالیٰ سے عرض کیا کہ تو نے تو اس کو میرے لئے وجہ سکون بنایا لیکن اب یہ قہر کے روپ میں میرے سامنے ہے۔ یہ کہتے ہی اثر دھا پھن زمین پر مارتا ہوا غائب ہو گیا۔

جب عوام کو آپ کے مراتب کا صحیح اندازہ ہو گیا تو آپ نے اس غار کو خیر آباد کہہ کر مکہ معظمہ کا رخ کیا۔ اس کے بعد ایک مرتبہ شیخ ابوسعید رحمۃ اللہ علیہ نے اس غار کی زیارت کر کے فرمایا کہ اگر یہ غار مشک سے لبریز کر دیا جاتا جب اتنی خوشبو نہ ہوتی جتنی ایک بزرگ کے اس غار میں چند روزہ قیام سے ہے۔

جب آپ نے بلخ کی سلطنت کو خیر باد کہا تو اس وقت آپ کا ایک بہت چھوٹا سا بچہ تھا اور جب اس نے جوانی میں اپنی والدہ سے پوچھا کہ میرے والد کہاں ہیں تو والدہ نے پورا واقعہ بیان کرنے کے بعد بتایا کہ وہ اس وقت مکہ معظمہ میں مقیم ہیں۔ اس کے بعد اس لڑکے نے پورے شہر میں منادی کرا دی کہ جو لوگ میرے ساتھ سفر حج پر چلنا چاہیں میں ان کے پورے اخراجات برداشت کروں گا۔ یہ منادی سن کر تقریباً چار ہزار افراد چلنے پر تیار ہو گئے جن کو وہ لڑکا اپنے ہمراہ لے کر والد کے دیدار کی تمنا میں کعبۃ اللہ پہنچ گئے اور جب اس نے مشائخ حرم سے اپنے والد کے متعلق دریافت کیا تو انہوں نے کہا کہ وہ تو ہمارے مرشد ہیں اور اس وقت اس نیت سے جنگل میں لکڑیاں لینے گئے ہیں کہ فروخت کر کے اپنے اور ہمارے کھانے کا انتظام کریں۔ یہ سنتے ہی لڑکا جنگل کی جانب چل پڑا اور ایک بوڑھے کو سر پر لکڑیاں کا بوجھ لاتے دیکھا تو فرط محبت سے وہ بے تاب تو ہو گیا لیکن بطور سعادت مندی اور ناواقفیت کے خاموشی کے ساتھ آپ کے پیچھے بازار پہنچ گیا اور جب وہاں جا کر حضرت ابراہیم نے آواز لگائی کہ کون ہے جو پاکیزہ مال کے عوض پاکیزہ مال خریدنے یہ سن کر ایک شخص نے روٹیوں کے عوض میں لکڑیاں خرید لیں جن کو آپ نے اپنے ارادت مندوں کے سامنے لے جا کر رکھ دیا اور خود نماز میں مشغول ہو گئے۔

آپ اپنے ارادتمندوں کو ہمیشہ یہ ہدایت فرمایا کرتے کہ کبھی کسی عورت یا بے ریش لڑکے کو نظر بھر کر نہ دیکھنا اور خصوصاً اس وقت بہت محتاط رہنا جب ایام حج کے دوران کثیر عورتیں اور بے ریش لڑکے جمع ہو جاتے ہیں اور تمام افراد اس ہدایت کے پابند رہتے ہوئے آپ کے ہمراہ طواف میں شریک رہتے، لیکن ایک مرتبہ حالت طواف ہی میں آپ کا لڑکا سامنے آ گیا اور بے ساختہ آپ کی نگاہیں اس پر جم گئیں اور فراغت طواف کے بعد آپ کے ارادت مندوں نے عرض کیا کہ اللہ آپ پر رحم فرمائے، آپ نے جس سے باز رہنے کی ہمیں ہدایت کی تھی اس میں آپ خود ہی ملوث ہو گئے، کیا آپ اس کی وجہ بیان کر سکتے ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ یہ بات تو تمہارے علم میں ہی نہیں ہے کہ جب میں نے بلخ کو خیر باد کہا تو اس وقت میرا چھوٹا سا بچہ تھا اور مجھے یقین ہے کہ یہ وہی بچہ ہے پھر اگلے دن آپ کا ایک مرید جب بلخ کے قافلہ کی تلاش کرتا ہوا وہاں پہنچا کہ وہی لڑکا دیکھا اور حریر کے خیمہ میں ایک کرسی پر بیٹھا تلاوت قرآن کر رہا ہے۔ جب اس نے آپ کے مرید سے آمد کا مقصد دریافت کیا تو مرید نے سوال کیا کہ آپ کس کے صاحبزادے ہیں؟ یہ سنتے ہی اس لڑکے نے روتے ہوئے کہا کہ میں نے اپنے والد کو نہیں دیکھا لیکن کل ایک بوڑھے لکڑہارے کو دیکھ کر یہ محسوس ہوا کہ شاید یہی میرے والد ہیں اور اگر ان سے کچھ پوچھ گچھ کرتا تو اندیشہ تھا کہ وہ فرار ہو جاتے کیونکہ وہ گھر سے فرار ہیں اور ان کا اسم گرامی ابراہیم بن ادہم (رحمۃ اللہ علیہ) ہے۔ یہ سن کر مرید نے کہا: چلئے میں ان سے آپ کی ملاقات کروادوں اور اپنے ہمراہ آپ کی بیوی اور لڑکے کو لے کر بیت اللہ میں داخل ہو گیا اور جس وقت بیوی اور بچے کی آپ پر نظری پڑی تو وفور محبت سے بیتابانہ لپٹ گئے اور روتے روتے بیہوش ہو گئے اور ہوش آنے کے بعد جب حضرت ابراہیم نے پوچھا کہ تمہارا دین کیا ہے؟ تو لڑکے نے جواب دیا ”اسلام“

پھر سوال کیا کہ تم نے قرآن کریم پڑھا ہے؟ لڑکے نے اثبات میں جواب دے دیا۔ پھر پوچھا کہ اس کے علاوہ اور بھی کچھ تعلیم حاصل کی ہے؟ لڑکے نے کہا ”جی ہاں“ یہ سن کر فرمایا: الحمد للہ۔ اس کے بعد جب آپ جانے کیلئے اٹھے تو بیوی اور بچے نے اصرار کر کے روک لیا، جس کے بعد آپ نے آسمان کی جانب چہرہ اٹھا کر کہا کہ الہی! انٹھی! یہ کہتے ہی آپ کے صاحبزادے زمین پر گر پڑے اور فوت ہو گئے اور جب ارادت مندوں نے سبب دریافت کیا تو فرمایا کہ جب میں بچے سے ہم آغوش ہوا تو وفور جذبات اور فرط محبت سے بیتاب ہو گیا اور اسی وقت ندا آئی کہ ہم سے دوستی کے بعد دوسرے کو دوست رکھتا ہے۔ یہ ندا سن کر میں نے عرض کیا کہ یا اللہ! یا تو لڑکے کی جان لے لے یا

پھر مجھے موت دے دے۔ چنانچہ لڑکے کے حق میں دعا قبول ہوگئی اور اگر اس پر کوئی اعتراض کرے تو میرا یہ جواب ہے کہ یہ واقعہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ سے زیادہ تخریز نہیں کیونکہ انہوں نے بھی تعمیل حکم میں اپنے بیٹے کو قربان کر دینے کی ٹھان لی تھی۔

ایک دن آپ کے پاس حضرت شقیق بلخی رحمۃ اللہ علیہ آئے اور سوال کیا کہ آپ نے دنیا سے فرار کیوں اختیار کیا؟ فرمایا کہ اپنے دین کو آغوش میں لئے صحرا بصرہ اقریہ قریہ اس لئے بھاگتا پھرتا ہوں کہ دیکھنے والے مجھے یا تو مزدور تصور کریں یا دیوانہ تاکہ اپنے دین کو سلامت لے کر موت کے دروازے سے نکل جاؤں۔ ماہ رمضان میں آپ جنگل سے گھاس لے کر فروخت کیا کرتے اور اس سے حاصل ہونے والی رقم کو خیرات کر کے پوری شب مصروف عبادت رہتے اور جب آپ سے سوال کیا گیا کہ آپ کو نیند نہیں آتی، فرمایا کہ جس کی آنکھوں سے ہمہ وقت سیلاب اشک رواں ہو اس کو بھلا نیند نہیں آتی ہے اور آپ کا یہ معمول تھا کہ فراغت نماز کے بعد اپنا چہرہ چھپا کر فرماتے کہ مجھے یہ خوف رہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ میری نماز کو منہ پر نہ دے مارے۔

ایک یوم آپ کو کھانا نصیب نہ ہوا تو شکرانے کی چار سورتیں ادا کیں اور جب اسی طرح مکمل سات یوم گزر گئے اور آپ کے ضعف و نقاہت میں اضافہ ہوتا چلا گیا تو آپ نے بھوک کا اظہار کیا۔ چنانچہ اسی وقت ایک نوجوان آپ کے پاس آیا اور اپنے مکان پر لے جا کر عرض کیا کہ میں آپ کا دیرینہ غلام ہوں اور میری تمام املاک آپ ہی کی ملکیت ہے۔ یہ سن کر آپ نے اسے آزاد کر دیا اور تمام جائیداد بھی اسی کے حوالے کر دی اور یہ عہد کر لیا کہ اب کبھی کسی سے کچھ طلب نہ کروں گا کیونکہ روٹی کے ایک ٹکڑے کی طلب پر پوری دنیا پیش کر دی گئی۔

ایک دن ارادت مندوں کے ہمراہ آپ ایک مسجد میں قیام فرما ہوئے اور جب رات کو تیز و تند سرد ہوائیں چلنے لگیں تو آپ مسجد کا دروازہ روک کر کھڑے ہو گئے اور مریدین کے سوال پر فرمایا کہ میں تمہیں اذیت سے بچانے کیلئے کھڑا ہو گیا تاکہ تم سرد ہواؤں سے محفوظ رہ سکو۔ دوران سفر ایک مرتبہ آپ کے پاس زادراہ ختم ہو گیا تو آپ نے چالیس یوم مٹی کھا کر اس لئے گزار دیئے کہ میری وجہ سے کسی کو زادراہ پیش کرنے کی زحمت نہ ہو۔

آپ نے جب سلطنت چھوڑ کر فقیری کو اختیار کیا تو پھر کبھی پیچھے پلٹ کر نہ دیکھا۔ مختلف مواقع پر جو لوگ آپ کو پہچان لیتے انہیں آپ کا ملک میں خوشحالی کا دور یاد آ جاتا۔ آپ کے پاؤں پڑ جاتے ہاتھ جوڑتے، منت سماجت کرتے کہ خدا کیلئے ملک جا کر سلطنت کی باگ دوڑ سنبھالئے۔ وہ

یہ بھی کہتے کہ آپ بادشاہی بھی کیجئے اور درویشی بھی کیجئے۔ اس طرح عوام الناس زیادہ سے زیادہ درویشی اور خدا پرستی کی طرف مائل ہوں گے، سلطنت کا نظام بھی بہتر ہوگا اور تعلیمات اسلام کو بھی فروغ حاصل ہوگا۔ آپ یہ کہتے ہوئے انکار کر دیتے کہ اس میں بھی شیطان کی چال ہے جو ایک مرتبہ حکومت کے ایوان میں گیا، حکومت اپنے جلال شاہی کے ساتھ اسے جکڑ لیتی ہے اور پھر وہ کسی قسم کا نہیں رہتا، مزید فرمایا کہ جتنا آرام مجھے اس گلیم پوشی میں ہے وہ بادشاہی کے زریں لباس اور تخت و تاج میں کیا تھا۔

۔ ہم دہر سے رشتہ توڑ چکے ہم حرص و ہوا کو چھوڑ چکے

جو زنجیریں ہم توڑ چکے تم لا کے وہی پہناتے ہو

ایک مرتبہ بوسیدہ لباس میں حمام کے اندر جانے لگے تو لوگوں نے آپ کو روک لیا اور آپ نے عالم جذب میں فرمایا کہ جب غریب کو ابلیس کے گھر (حمام) میں داخلہ کی اجازت نہیں تو پھر بغیر بندگی کے کوئی خدا کے گھر میں کیوں کر داخل ہوگا۔

سفر حج کے دوران آپ کو کھانا میسر نہ آیا تو ابلیس نے سامنے آ کر کہا کہ سلطنت چھوڑ کر سوائے فاقہ کشی کے اور کیا ملا؟ اس وقت آپ نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا کہ غنیم کو دوست کے پیچھے کیوں لگا دیا؟ ندا آئی کہ تمہاری جیب میں جو چیز ہے اسے پھینک دو تمہیں اس کا راز معلوم ہو جائیگا۔ چنانچہ آپ نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو تھوڑی سی چاندی برآمد ہوئی، وہ پھینکتے ہی ابلیس رفو چکر ہو گیا۔ آپ فرمایا کرتے کہ ایک مرتبہ حضرت جبرائیل علیہ السلام کو خواب میں دیکھا کہ وہ کوئی کتاب سی بغل میں دبائے ہوئے ہیں اور میرے سوال کے جواب میں فرمایا ”میں اس میں اللہ کے دوستوں کے نام درج کرتا رہتا ہوں“ پھر میں نے پوچھا کہ کیا اس میں میرا نام بھی شامل ہے۔ فرمایا کہ تمہارا شمار خدا کے دوستوں میں نہیں ہوتا۔ میں نے عرض کیا کہ اس کے دوستوں کا دوست تو ضرور ہوں۔ یہ سن کر وہ کچھ دیر ساکت رہے پھر فرمایا کہ مجھے منجانب اللہ یہ حکم ملا ہے کہ سب سے پہلے تمہارا نام درج کروں اس کے بعد دوسروں کا کیونکہ اس راستہ میں مایوسی کے بعد ہی امید ہوتی ہے۔

آپ فرمایا کرتے کہ میں ایک رات بیت المقدس میں مقیم تھا اور اس خوف سے کہ کہیں وہاں کے خدام باہر نہ نکال دیں، چٹائی لپیٹ کر بیٹھ گیا اور ابھی ایک تہائی رات باقی تھی کہ دروازہ خود بخود کھلا اور ایک بزرگ چالیس افراد کے ہمراہ تشریف لائے اور تمام حضرات ٹاٹ کے لباس میں ملبوس تھے پھر سب نے محراب مسجد میں نماز ادا کی اور محراب کی جانب پشت کر کے بیٹھ گئے اور ان میں سے

ایک نے کہا کہ آج مسجد میں کوئی شخص ایسا ضرور ہے جس کا تعلق ہماری جماعت سے نہیں۔ یہ سن کر ان بزرگ نے فرمایا کہ وہ ابراہیم بن ادہم ہیں، جن کو چالیس راتیں عبادت کرتے گزر گئیں لیکن کوئی لذت نہ حاصل کر سکے۔ آپ کہتے ہیں کہ میں یہ سن کر چٹائی سے نکل آیا اور عرض کیا کہ اگر ریاضت کا یہی مفہوم ہے تو آج سے میں بھی آپ کی جماعت میں شامل ہوتا ہوں۔

آپ نے اپنے نفس کو کبھی بھی حاوی نہ ہونے دیا، جب دیکھتے کہ عوام الناس آپ کی بے پناہ پذیرائی کر رہے ہیں تو کوئی ایسی حرکت کر دیتے یا ایسا جملہ کہہ دیتے جس سے ظاہر بینوں کو غصہ آ جاتا اور وہ آپ کو زد و کوب کرتے۔ آپ براماننے کے بجائے اپنے نفس کو ملامت کرتے کہ تو نے اپنی ناجائز خواہشات اور اپنی خود پرستی کا انجام دیکھ لیا ہے۔ کیا تو سمجھتا ہے کہ میں تجھے من مانی کرنے دوں گا۔ آپ مخلوق خدا میں گھل مل کر رہتے اور اپنی امتیازی حیثیت کا احساس تک نہ ہونے دیتے اور اگر کبھی ایسا ہونے لگتا تو بھرے ہجوم میں گم ہو جاتے۔ ایک مرتبہ آپ مکہ معظمہ میں حرم شریف کی زیارت کو چلے۔

آپ قطع مسافت کرتے اور گریہ و زاری فرماتے مکمل کئی برسوں میں مکہ معظمہ پہنچے اور جب اہل حرم کے بزرگوں کو آپ کی آمد کی اطلاع ملی تو وہ برائے استقبال نکل کھڑے ہوئے اور آپ نے محض اس خوف سے کہ کوئی شناخت نہ کر سکے خود کو قافلہ سے جدا کر لیا اور جب خدام اہل حرم نے جو آگے آگے تھے دریافت کیا کہ ابراہیم بن ادہم کتنی دور ہیں؟ اس لئے کہ اہل حرم ان سے نیاز حاصل کرنے آ رہے ہیں تو آپ نے فرمایا کہ وہ لوگ ایک ملحد و دہریہ سے کیوں ملنا چاہتے ہیں؟ یہ سنتے ہی خدام نے آپ کے منہ پر پھٹڑ مارتے ہوئے کہا کہ ملحد و دہریہ تو خود ہے۔ آپ نے فرمایا کہ میں بھی تو یہی کہہ رہا ہوں اور وہ لوگ جب آگے نکل گئے تو آپ نے اپنے نفس سے فرمایا کہ اپنے کروت کی سزا بھگت لی۔ خدا کا شکر ہے کہ اہل حرم کے استقبال کرنے کی خواہش پوری نہ ہو سکی اور اس کے بعد جب لوگوں نے آپ کو شناخت کر لیا تو اس قدر عقیدت مند ہو گئے کہ آپ نے بھی وہیں سکونت اختیار کر لی اور بے شمار افراد آپ کے ہاتھوں پر بیعت ہوئے اور آپ کی یہ حالت تھی کہ جنگل سے خود لکڑیاں کاٹ کر لاتے، خود کھانا پکاتے، آپ بھی کھاتے اور اپنے ساتھیوں کو بھی کھلاتے۔

”تذکرۃ الاولیاء“ میں رقم ہے۔

صحرائی سفر میں آپ کی ایک ایسے خدا رسیدہ بزرگ سے ملاقات ہوئی جس نے آپ کو اسم اعظم کی تعلیم دی اور آپ ہمیشہ اسی اسم اعظم کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے رہے، پھر اسی دوران آپ

کی ملاقات جب حضرت خضر علیہ السلام سے ہوئی تو انہوں نے فرمایا کہ جن بزرگ نے تمہیں اسم اعظم کی تعلیم دی وہ میرے بھائی حضرت الیاس ہیں۔ اس کے بعد آپ نے باقاعدہ طور پر حضرت خضر علیہ السلام کی بیعت کی اور بلند مراتب تک پہنچے۔ پھر فرمایا کہ ایک مرتبہ میں بیابانوں کی خاک چھانتا ہوا جب نواح عراق میں پہنچا تو میں نے ایسے ستر فقراء کو دیکھا جو راہ مولیٰ میں اپنی جان نچھاور کر چکے تھے لیکن ان میں ایک ایسا فرد باقی تھا جس میں زندگی کے کچھ آثار موجود تھے اور جب میں نے اس واقعہ کی نوعیت دریافت کی تو اس نے کہا کہ اے ابراہیم بس محراب اور پانی کو جزو حیات بنا کر آگے جانے کی سعی نہ کرو ورنہ مہجور ہو جاؤ گے اور قربت کا تصور بھی چھوڑ دو ورنہ اذیت اٹھاؤ گے کیونکہ کسی کی تاب و طاقت نہیں کہ سلامت روی کی حالت میں گستاخی کا مرتکب ہو سکے اور اس دوست سے بھی ڈرتے رہو جو حجاج کو کفار روم کی مانند بذریعہ جنگ تہ تیغ کر دیتا ہے اور ہم اس بیابان میں یہ عہد کر کے کہ خدا کے سوا کسی سے سروکار نہ رکھیں گے محض توکل الی اللہ کے سہارے مقیم ہو گئے اور جب قطع مسافت کرتے ہوئے بیت اللہ کے قریب پہنچے تو حضرت خضر علیہ السلام سے شرف نیاز ہو گیا اور ہم نے آپ کی ملاقات کو مبارک فال تصور کرتے ہوئے اپنی سعی کے بار آور ہونے پر خدا کا شکر ادا کیا لیکن اسی وقت ندا آئی کہ اے عہد شکنو! اے فریب کارو! کیا تمہارا یہی عہد تھا کہ مجھ کو فراموش کر کے دوسروں سے رسم و راہ بڑھاؤ سن لو کہ میں تمہیں اس جرم کی سزا میں موت کے گھاٹ اتار دوں گا۔ چنانچہ اے ابراہیم یہ تمام فوت شدہ لوگ اسی کے قہر کا شکار ہو گئے اور اگر تم بھی خیریت چاہتے ہو تو ایک قدم بھی آگے نہ بڑھانا اور حضرت ابراہیم رحمۃ اللہ علیہ نے حیرت زدہ ہو کر اس شخص سے پوچھا کہ تم کیسے زندہ بچ گئے تو جواب دیا کہ ابھی نیم پختہ ہوں اور اب انہی کی طرح پختہ ہو کر جان دینا چاہتا ہوں یہ کہہ کر وہ بھی جاں بحق ہو گیا۔

آپ کے نزدیک درویش کا مقام بہت بلند تھا۔ یہ فرماتے تھے کہ ہر چیز فانی ہے مگر جس کو سچی درویشی نصیب ہوگی اس کا ذکر کبھی فنا نہیں ہوتا اس کے تذکار سے زمانہ جگمگاتا رہتا ہے۔ فرمایا کرتے تھے کہ باہر سے زیادہ اپنے اندر سے رابطہ قائم کرو کہ اسی سے خدا ملتا ہے۔

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن

آپ اکثر یہ فرماتے کہ پندرہ برس کی مکمل اذیتوں کے بعد سے یہ ندا سنائی دی کہ عیش و راحت کو ترک کر کے اس کی بندگی اور احکام کی تعمیل کیلئے مستعد ہو جا۔ ایک مرتبہ لوگوں نے سوال کیا کہ آپ

نے سلطنت کو کیوں خیر باد کہا؟ فرمایا کہ ایک دن آئینہ لئے ہوئے میں تخت شاہی پر متمکن تھا تو اس وقت مجھے خیال آیا کہ نہ تو میرے پاس طویل سفر کیلئے زادراہ ہے اور نہ کوئی حجت و دلیل؛ جبکہ میری آخری منزل قبر ہے اور حاکم بھی عادل و منصف ہے۔ بس یہ خیال آتے ہی میرا دل بچھ سا گیا اور مجھے سلطنت سے نفرت ہو گئی۔

پھر لوگوں نے سوال کیا کہ خراساں کو خیر باد کیوں کہا؟ فرمایا کہ روزانہ لوگ مزاج پرسی کو آنے لگے تھے۔ پھر سوال کیا کہ آپ نکاح کیوں نہیں کر لیتے؟ فرمایا کہ کیا کوئی عورت اپنے شوہر کے گھر تنگی بھوکی رہنے کیلئے نکاح پر تیار ہو سکتی ہے اور اگر میرا بس چلے تو میں خود اپنے آپ ہی کو طلاق دے دوں؛ پھر بھلا ان حالات میں کس طرح میں کسی عورت کو اپنی وابستگی سے فریب دے سکتا ہوں۔ کسی نے ایک درویش سے سوال کیا کہ کیا آپ کی بیوی ہے؟ تو درویش نے نفی میں جواب دیا۔ جس کے بعد سائل نے جواب دیا کہ آپ بہت اچھے رہے کیونکہ جس نے نکاح کیا وہ گویا کشتی پر نوار ہو گیا اور جب اولاد کا سلسلہ شروع ہوا تو سمجھ لو کہ کشتی غرق ہو گئی۔

کسی درویش نے آپ کے سامنے دوسرے درویش کا شکوہ کیا تو فرمایا کہ تو نے مفت خریدی ہوئی درویشی بے سود اختیار کی اور جب اس نے پوچھا کہ کیا درویشی بھی خریدی جاسکتی ہے؟ فرمایا کہ یقیناً کیونکہ میں نے سلطنت بلخ کے بدلہ میں درویشی خریدی اور بہت ارزاں خریدی کیونکہ درویشی سلطنت کے مقابلہ میں بہت بے بہا شے ہے۔

آپ نے فرمایا کہ توکل کر کے ایک جنگل میں پہنچ گیا، کئی دن کچھ نہ کھایا۔ خیال آیا قریب ایک دوست سے کھا لیا جائے؛ لیکن یہ تصور بھی آ گیا کہ میرا توکل ہی کا لعدم ہو جائے گا۔ ایک مسجد میں جا کر یہ کلمہ ورد کرنا شروع کر دیا تو غلٹ علی الحی الہدی لا یموت یعنی میرا توکل اس پر ہے جو زندہ ہے اور کبھی نہیں مرے گا۔ ندائے غیبی آئی کہ اللہ نے متوکلین سے عالم کو پاک کر دیا ہے۔ پھر ندا آئی وہ متوکل نہیں جو دوستوں کے یہاں کھانے کا ارادہ کرے۔ فرمایا کہ میں نے ایک متوکل سے پوچھا کہ تمہارے پاس کھانا کہاں سے آتا ہے؟ جواب دیا کہ یہ سوال تو آپ اللہ کو کریں؛ میرے پاس ایسی بیہودہ بات کا جواب نہیں۔

ایک مرتبہ ایک غلام خرید کر نام پوچھا۔ جواب دیا: جس نام سے جی چاہے پکاریں۔ فرمایا: کھاتے کیا ہو؟ جواب ملا: جو کھلا دیں۔ فرمایا: تمہاری خواہش کیا ہے؟ جواب دیا: جو خواہش آپ کی غلام کو ان چیزوں سے بحث نہیں۔ یہ سن کر میں نے سوچا کہ کاش میں بھی اللہ تعالیٰ کا یونہی اطاعت

گزار ہوتا تو کتنا بہتر تھا۔

سچ ہے کہ:

غیرت ہے بڑی چیز جہاں تک و دو میں

پہناتی ہے درویش کو تاج سردار

سلطان الفقیر حضرت ابراہیم بن ادہم درویشی میں بھی بڑے فیاض تھے۔ کسی سے کسی حالت میں کچھ لینا پسند نہیں کرتے تھے بلکہ اپنی محنت سے جو حاصل کرتے اسے خدا کی راہ میں خرچ کر دیتے۔ اپنے ارادتمندوں کو مرید یا نیاز مند تصور نہ کرتے بلکہ ہر لحاظ سے ان کی خدمت کر کے خوش ہوتے۔ کوشش فرماتے کہ مجھ سے دنیا والوں کو زیادہ سے زیادہ راحت پہنچے۔ حضرت سہل رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

ایک مرتبہ آپ کے ہمراہ دوران سفر بیمار ہو گیا اور آپ کے پاس جو کچھ تھا وہ سب میری بیماری پر خرچ کر دیا، جب سب چیزیں ختم ہو گئیں تو اپنا خچر فروخت کر کے خرچ کیا اور صحت یاب ہونے کے بعد جب میں نے خچر کے بارے میں دریافت کیا تو فرمایا کہ وہ تو میں نے فروخت کر دیا۔ پھر جب میں نے عرض کیا کہ میں سفر کس طرح کر سکوں گا تو فرمایا کہ میرے کاندھوں پر۔ آپ یقین کر لیں کہ مجھے اپنے کاندھوں پر بٹھا کر تین منزل تک سفر کیا۔ ایک روایت میں ہے کہ جب آپ کے پاس کھانے کو کچھ باقی نہ رہا تو مسلسل پندرہ یوم تک صرف ریت کھا کر گزار دیئے اور آپ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے کبھی مکہ معظمہ میں اس لئے کوئی پھل نہیں خریدا کہ وہاں کی بیشتر زمینیں فوجیوں نے خرید رکھی تھیں۔ آپ فرماتے تھے کہ میں نے بے شمار حج کرنے کے بعد بھی محض اس خوف سے کبھی آب زمزم نہیں پیا کہ اس پر حکومت کا ڈول رہتا ہے۔

آپ دن بھر کی مزدوری کے بعد جو رقم ملتی وہ سب اپنے ارادتمندوں پر صرف کر دیتے اور ایک رات جب آپ کو آنے میں بہت تاخیر ہو گئی تو اس تصور سے کہ شاید آپ نہ آئیں سب مریدین کھانا کھا کر سو گئے اور آپ نے واپسی پر سب کو محو خواب دیکھ کر خیال کیا کہ شاید یہ سب بھوکے ہی سو گئے ہیں۔ چنانچہ آپ آٹالے کر آئے اور آگ روشن کرنے میں مصروف ہو گئے۔ اتفاق سے اسی وقت ایک مرید بیدار ہو گیا اور سوال کیا کہ آپ یہ مصیبت کیوں برداشت کر رہے ہیں؟ فرمایا کہ مجھے خیال آیا کہ شاید تم لوگ بغیر کھائے سو گئے اس لئے کھانے کی تیاری میں مصروف ہوں۔ یہ سن کر مرید کو بے حد ندامت ہوئی اور دوسرے مرید سے کہنے لگا کہ ہم سب تو آپ کی آمد میں تاخیر کی وجہ سے نہ جانے کن شکوک و شبہات میں مبتلا تھے اور آپ ہمارے لئے کتنی اذیت برداشت کر

رہے ہیں۔

اگر کوئی آپ کی معیت اختیار کرنا چاہتا تو آپ اس کے سامنے تین شرطیں پیش فرماتے۔ اول یہ کہ میں سب کا خادم بن کر رہوں گا۔ دوم اذان بھی خود دیا کروں گا۔ سوم جو شے مجھے میسر ہوگی وہ سب میں مساوی تقسیم کروں گا۔ اور جب ایک شخص نے کہا کہ میں ان شرائط کی پابندی نہیں کر سکتا تو فرمایا کہ مجھے تیری صداقت پر حیرت ہے۔

ایک شخص برسوں آپ کی صحبت میں رہ کر واپس جانے لگا تو عرض کیا کہ اگر کچھ خامیاں یا برائیاں آپ نے میرے اندر دیکھی ہوں تو متنبہ فرما دیں تاکہ میں ان کے ازالے کی سعی کرتا رہوں فرمایا کہ میں نے تمہیں سدا نظر محبت سے دیکھا ہے اور عیوب پر صرف دشمن کی نظر ہوتی ہے۔ ایک دن کوئی مزدور دن بھر کی ناکامی کے بعد جب گھر کی طرف چلا تو خیال آیا کہ آج اہل و عیال کو کیا جواب دوں گا۔ اسی عالم میں سر راہ اس کی ملاقات حضرت ابراہیم بن ادہم سے ہو گئی اور اس نے عرض کیا کہ مجھے آپ کی حالت پر صرف اس لئے رشک آتا ہے کہ آپ تو آسودہ و مطمئن ہیں لیکن میں شب و روز مصائب میں مبتلا رہتا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ آج تک کے عبادات صدقات میں تجھے نذر کرتا ہوں اور تو صرف آج کی پریشانیاں مجھے عطا کر دے۔

آپ اکثر یہ فرماتے کہ مجھے یہ جستجو ہو رہی ہے کہ رات میں کسی وقت خانہ کعبہ خالی مل جائے لیکن ایسا موقع نصیب نہ ہوتا تھا۔ اتفاق سے ایک شب بارش ہو رہی تھی اور میں تنہا طواف میں مشغول تھا اور میں حسن اتفاق سمجھ کر حلقہ کعبہ میں ہاتھ ڈال کر اپنے گناہوں کی مغفرت طلب کرنے لگا۔ لیکن یہ ندا آئی کہ پوری مخلوق مجھ سے طالب مغفرت ہوتی ہے اور اگر میں سب کو معاف کر دوں تو پھر میری غفاریت و رحمانیت کی کیا قدر رہ جائے گی۔ یہ سن کر آپ نے عرض کیا کہ اے اللہ! میری مغفرت فرما دے۔ ندا آئی کہ دوسروں کے متعلق ہم سے سوال کر اپنے متعلق ہم سے کچھ نہ کہہ کیونکہ دوسروں کیلئے تیری سفارش مناسب ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ میں اکثر یہ دعا کیا کرتا اے اللہ! تو علیم وخبیر ہے کہ تیری عنایت و کرم جو مجھ پر ہے اس کے مقابلہ میں آٹھوں جنتوں کی بھی کوئی حیثیت نہیں اور اسی طرح تیری محبت کے مقابلے میں آٹھوں جنتیں ہیج ہیں۔ لہذا اے خدا رسوائی معصیت سے بچاتے ہوئے مجھے اطاعت کا شرف عطا فرما دے اور جو تیری ذات سے واقف ہے اسے کیا خبر کہ اس شخص کی کیفیت کیا ہوگی جو تجھ سے قطعاً ناواقف ہے۔

اگرچہ کرامت نشان ولایت نہیں ہوتی اور اولیاء کرامتیں دکھانے سے احتیاط برتتے ہیں۔ ان

کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ ان کا کردار دلوں کی تسکین اور ایمان کی پہچان کا باعث بن جاتے۔ وہ ایمان اور بلندی کردار کی سب سے بڑی علامت کردار و سیرت کی سرفرازی سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان اولیاء کے کردار نے کتنے ہی زمانے تسخیر کر لئے۔ حضرت ابراہیم بن ادہم کا کردار ایک شمع روشن تھا جس سے بے شمار لوگ فیضیاب ہو رہے تھے لیکن یہ خدا کی عطا ہے کہ وہ اپنے محبوب بندوں کے مقام کی سر بلندی دکھانے کیلئے ان سے کرامات کا ظہور کرواتے اور خلق خدا کو ان کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ ایک مجذوب پراگندہ حال اور چہرہ غبار آلود آپ کے سامنے آ گیا تو آپ نے اپنے ہاتھوں سے اس کا منہ دھویا اور فرمایا کہ جو منہ ذکر الہی کا مظہر ہو اس کو پراگندہ نہ ہونا چاہیے اور جب مجذوب کو ہوش آیا تو لوگوں نے پورا واقعہ اس سے بیان کیا جس کو سن کر اس نے توبہ کی پھر آپ نے خواب میں دیکھا کہ کوئی یہ کہہ رہا ہے کہ تم نے محض خدا کے واسطے ایک مجذوب کا منہ دھویا، اس لئے اللہ نے تمہارا قلب دھو ڈالا۔

آپ کسی بزرگ سے ایک پہاڑی پر مصروف گفتگو تھے تو انہوں نے سوال کیا کہ اہل حق کے مکمل ہونے کی کیا علامت ہے؟ فرمایا کہ اگر وہ پہاڑ کو چلنے کا حکم دے تو وہ اپنی جگہ چھوڑ دے۔ یہ کہتے ہی وہ پہاڑ حرکت میں آ گیا تو آپ نے فرمایا کہ میں نے تجھے چلنے کو نہیں کہا تھا چنانچہ وہ ٹھہر گیا۔ کسی بزرگ کے ہمراہ کشتی میں شریک سفر تھے اچانک شدید طوفان آیا۔ غیب سے ندا آئی اندیشہ نہ کرو ابراہیم بن ادہم (رحمۃ اللہ علیہ) تمہارے ہمراہ ہیں۔ اسی وقت طوفان ختم گیا۔ اسی طرح سفر کرتے شدید طوفان آ گیا۔ آپ نے قرآن کریم ہاتھ میں لے کر کہنا شروع کر دیا کہ یا اللہ! ہمارے ہمراہ تیری مقدس کتاب بھی غرق ہو جائے گی۔ ندا آئی ایسا نہیں ہوگا۔ سفر کے دوران ملاح نے کرایہ طلب کیا لیکن آپ کے پاس کچھ نہ تھا۔ نماز پڑھ کر دعا کی کہ یا اللہ! یہ ملاح کرایہ طلب کرتا ہے۔ چنانچہ اسی وقت پورا ریگزار سونا بن گیا اور آپ نے ایک مٹھی بھر کر ملاح کو دے دی۔

آپ کچھ بزرگوں کے ہمراہ ایک قلعہ کے نزدیک ایک پڑاؤ ڈال کر آگ روشن کرنے لگے تو کسی نے کہا کہ اس جگہ آگ اور پانی دونوں کا انتظام ہے اگر جائز قسم کا گوشت مل جائے تو بھون کر کھائیں۔ آپ یہ فرما کر کہ اللہ کو سب قدرت ہے مشغول نماز ہو گئے۔ اسی وقت شیر ایک گورخر کو گھیر لایا۔ چنانچہ گورخر کو ذبح کیا۔ جب تک یہ لوگ کھانا کھاتے رہے شیر ان کی نگرانی کرتا رہا۔ حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی نہایت سختی سے گزرتی تھی۔ گزراوقات کیلئے شدید محنت کرتے عبادت و ریاضت میں شدید طور پر مصروف رہتے۔ باقی جو وقت بچتا اس میں لوگوں

کو تعلیمات ایمانی کی تعلیمات فرماتے۔ اس کے علاوہ احوال عوام سے آگاہی کیلئے سفر بھی کرتے اور جہاں تک ممکن ہوتا، بھٹکے ہوئے عوام کی راہنمائی فرماتے۔ رزق حلال کی سختی سے تلقین کرتے اور فرمایا کرتے کہ جس سینے میں رزق حلال نہ ہو اس کی کوئی دعا قبول نہیں ہوتی اور اس کا ہر عمل غیر موثر ہوتا ہے۔ اس ضمن میں درج ذیل حقائق پر نظر ڈالئے۔

آپ نے کسی سے سوال کیا کہ کیا تم جماعت حق میں شمولیت چاہتے ہو؟ جب اس نے اثبات میں جواب دیا تو آپ نے فرمایا کہ دنیا و آخرت کی رتی بھر پرواہ نہ کرتے ہوئے خود کو غیر اللہ سے خالی کر لو اور رزق حلال استعمال کرو۔ پھر فرمایا کہ صوم و صلوة اور جہاد و حج پر کسی کو جو انمردی کا مرتبہ اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا جب تک وہ محسوس نہ کر لے کہ اس کی روزی کس قسم کی ہے۔

روایت ہے کہ کسی نے آپ سے ایک صاحب وجد اور عبادت و ریاضت میں مشغول رہنے والے نوجوان کی بہت تعریف کی۔ چنانچہ اشتیاق ملاقات میں جب آپ اس کے یہاں پہنچے تو اس نے آپ سے تین یوم کیلئے اپنے یہاں مہمان رکھنے کی استدعا کی اور جب آپ نے تین یوم میں اس کے احوال کا مطالعہ کیا تو محسوس ہوا کہ اس کی جتنی تعریف سنی تھی اس سے کہیں زیادہ بہتر ثابت ہوا۔ لیکن پھر آپ کو یہ خیال آیا کہ کہیں ابلیس کے کسی فریب میں مبتلا تو نہیں ہے اس لئے یہ دیکھنا چاہیے کہ یہ حلال رزق استعمال کرتا ہے نہیں؟ جب آپ کو یقین ہو گیا کہ اس کی روزی حلال نہیں ہے تو پھر آپ نے اس سے اپنے یہاں تین یوم مہمان رہنے کیلئے فرمایا اور اس کو اپنے ہمراہ لا کر کھانا کھلایا جس کے بعد اس کی پہلی سی حالت باقی نہ رہی۔ اس نے پوچھا کہ آپ نے یہ کیا کر دیا ہے؟ تو فرمایا کہ تجھے رزق حلال حاصل نہ ہونے کی وجہ سے شیطان کی کار فرمائیاں جاری تھیں اور اب میرے یہاں کے رزق حلال نے تیری باطنی حالت کو تبدیل کر کے رکھ دیا ہے اور تجھے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ تمام عبادت و ریاضت کا تعلق صرف رزق حلال پر موقوف ہے۔

خلیفہ معتمد باللہ نے آپ سے آپ کی مصروفیات کے متعلق سوال کیا تو فرمایا کہ میں نے دنیا و آخرت انکے طلب گاروں کیلئے وقف کر کے اپنے لئے آخرت میں صرف دیدار الہی کو منتخب کر لیا ہے۔ پھر کسی اور نے آپ سے یہی سوال کیا تو فرمایا کہ اللہ کے کارندوں کو کسی بھی کام کی حاجت نہیں رہتی۔

ایک مرتبہ حجام آپ کا خط بنا رہا تھا کہ کسی نے عرض کیا کہ اس کو کچھ معاوضہ دے دیجئے گا۔ چنانچہ آپ نے ایک تھیلی اٹھا کر اس کو دے دی لیکن اسی وقت اتفاق سے ایک سائل آ گیا اور حجام نے

وہ تھیلی اسے دے دی۔ یہ دیکھ کر آپ نے فرمایا کہ اس میں تو سونا اور اشرفیاں بھری ہوئی تھیں۔ اس نے کہا کہ اس کا علم تو مجھ کو بھی ہے اور یہ بھی معلوم ہے کہ انسان دل سے غنی ہوتا ہے نہ کہ دولت سے لیکن میں جس کی راہ میں لٹاتا ہوں اس سے آپ ناواقف ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ اس کا یہ جملہ سن کر مجھے بے حد ندامت ہوئی اور میں نے نفس سے کہا کہ جیسا تو نے کیا ویسی ہی سزا مل گئی۔

کسی نے بطور نذرانہ آپ کو ایک ہزار درہم پیش کئے لیکن آپ نے فرمایا کہ فقیروں سے کچھ نہیں لیتا۔ اس نے عرض کیا کہ میں تو بہت امیر ہوں۔ فرمایا کہ کیا تجھے اس زائد دولت کی تمنا نہیں ہے؟ اور جب اس نے اثبات میں جواب دیا تو فرمایا کہ اپنی رقم واپس لے جا کیونکہ تو فقیروں کا سردار ہے۔ روایت ہے کہ جب آپ کے اوپر واردات غیبی کا نزول ہوتا تو فرمایا کرتے کہ اگر سلاطین عالم آ کر دیکھیں کہ یہ کیسی واردات ہے۔ اپنی شوکت و سلطنت پر نادم ہوں پھر فرمایا کہ خواہشات کا بندہ کبھی سچا نہیں ہو سکتا کیونکہ خدا کے ساتھ اخلاص کا تعلق صدق اور خلوص نیتی سے ہے۔

آپ قرآن حکیم کی تعلیمات سے بخوبی واقف تھے۔ ہر لحظہ خدا کے خوف سے لرزتے رہتے تھے۔ آپ پر آشکارا تھا کہ فقط خوف الہی ہی دلوں کو دنیا کی آلائشوں سے پاک رکھتا ہے۔ آپ کا اسوہ زمانے بھر کیلئے قیامت تک کیلئے انتہائی روشن مثال ہے کہ کس طرح ایک بڑی سلطنت کا سردار خوف الہی سے لرز کر حکومت سے کنارہ کش ہو جاتا ہے۔ ہر دکھ کو برداشت کرتا ہے ہر غم کو سہتا ہے کہ محبت الہی کو حاصل کر کے ہی رہنا ہے۔

جب لوگوں نے سوال کیا کہ آپ کس کی بندگی کرتے ہیں؟ آپ لرزہ بر اندام ہو کر گر پڑے پھر بیٹھ کر یہ آیت تلاوت کی۔

ان کل من فی السموات والارض الا الی الرحمن عبدا

آسمان اور زمین کے رہنے والے سب کے سب خدا کے سامنے بندے ہو کر آنے والے ہیں۔

لوگوں نے سوال کیا کہ زمین پر گرنے سے قبل آپ نے یہ آیت تلاوت کیوں نہیں کی۔ فرمایا کہ خود کو اللہ کا بندہ کہوں تو وہ حق بندگی طلب کرے گا اور بندہ ہونے سے منکر بھی ہو سکتا ہوں کسی نے پوچھا کہ آپ کے مشاغل کیا ہیں؟

فرمایا میرے پاس چار سواریاں ہیں جب نعمت ملتی ہے تو شکر کی سواری پر جب فرمانبرداری کرتا ہوں تو خلوص کی سواری پر جب معصیت کا مرتکب ہوتا ہوں تو ندامت و توبہ کی سواری پر اور

مصائب میں مبتلا ہوتا ہوں تو صبر کی سواری پر اس کے سامنے جاتا ہوں۔ آپ کا ایک قول یہ بھی ہے کہ جب تک بندہ اہل و عیال کو چھوڑ کر کتوں کی مانند گھوڑے کی کمر پر نہ لوٹے اس وقت تک وہ مردوں کی صف میں شمار نہیں ہوتا۔ اسلئے آپ نے سلطنت چھوڑ کر عاجزی و فروتنی اختیار کی جس کی وجہ سے دولت فقر سے مالا مال ہوئے۔

غلامی میں نہ کام آتی ہیں تدبیریں نہ تقدیریں
جو ہو ذوق یقین پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زور بازو کا
نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں



امام ابوعلیٰ ترمذی رحمۃ اللہ علیہ

اے امام ترمذیؒ نورِ عملِ جانِ یقین
شارحِ اقوالِ احمدؒ حافظِ ناموسِ دین
ہے آئمہ پاک میں تیرا بہت اونچا مقام
نازشِ فکر و عمل اے نازشِ دینِ متین
تیرے فرمودات ہیں جانِ قلوبِ مومنوں
تیرے ارشادات ہیں ایمان کی شمعِ حسین
حافظہ تیرا بلا کا تھا خدا کی شان تھی
ناز تجھ پر تھا بخاری کو اے فطرت کے امین
تو نے تعلیم و تعلم میں گزاری زندگی
تیری ہر تحریر تھی جانِ نگارشِ دلنشین
خدمتِ اسلام تو نے کی تھی ایسی شان سے
عالموں کی شان ہے تو بحرِ حکمت کا نگین
ایک مینارِ عمل ہے تو رضا کے واسطے
تیری یادوں سے مہکتی ہے دلوں کی سر زمین

(محمد اکرم رضا)

محدث کثیر

امام ابو عیسیٰ ترمذی رحمۃ اللہ علیہ

امام ابو عیسیٰ ترمذی بلاشبہ تاریخ اسلام کے عظیم محسن ہیں۔ آپ نامور شخصیت اور مفسر تھے۔ آپ حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ جیسی نادر روزگار شخصیت کے شاگرد تھے۔ ممتاز آئمہ اور محدثین کا کہنا ہے کہ ان کا شمار ان محدثین میں ہوتا ہے جن کی زمانہ تقلید کرتا ہے۔ آج ہم کس قدر خوش بخت ہیں کہ احادیث مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے مجموعہ ہائے مبارک ہمارے سامنے ہیں، ان کی مدد سے تعلیم و تدریس کا کام ہو رہا ہے، مدرسے آباد ہیں، خانقاہوں میں علوم کے نور کی فراوانی ہے۔ اعلیٰ سے اعلیٰ کتب منظر عام پر آ رہی ہیں۔ حدیثوں کے انہی مجموعوں کی بدولت تحقیق اور ریسرچ کے کام زوروں پر ہیں۔ ان کے وجود سے لائبریریاں آباد ہو رہی ہیں۔ کتب خانوں کی زینت اور مدارس کی رونق بڑھ رہی ہے۔ اساتذہ ان کے نور سے اپنے سینے اور اپنے شاگردوں کے دل و دماغ منور کر رہے ہیں۔ امام ابو عیسیٰ ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے جامع تواریخ اور علل کی تصنیف کی۔ آپ ایسے نامور عالم دین تھے کہ جید علمائے کرام آپ کے سامنے زانوئے تلمذتہ کرنا باعث اعزاز سمجھتے تھے۔

اگرچہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا حافظہ بھی بلا کا تھا مگر آپ نے بھی ذہن رسا پایا تھا۔ جو حدیث یا حدیث کی سند ایک مرتبہ ذہن و فکر کی الماری میں آگئی، مجال ہے کہ ادھر ادھر ہونے پائے۔ امام ترمذی جہاں علوم حدیث کے فروغ میں نمایاں مقام رکھتے تھے وہاں ہر وقت خوف خدا سے لرزتے رہتے۔ شب و روز میں سے کام کے ساتھ ساتھ جو وقت بچتا عبادت الہی میں گزار دیتے۔ ساری ساری رات گریہ و زاری کرتے کرتے گزر جاتی۔ یہ اسی شدید گریہ و زاری کا ہی اثر تھا کہ آخری عمر میں آپ نابینا ہو گئے۔

رب کریم بھی اپنے خاص خاص بندوں کو کس کس طرح آزماتا ہے۔
جو خدا کے ہو گئے شہر فنا میں کھو گئے
نور حق کا بیج ہر بنجر زمیں میں بو گئے

عمر ساری وار دی عشقِ خدائے پاک پر
داغ بزمِ زندگی کے آنسوؤں سے دھو گئے
وقت پیری ترمذی کی گو بصارت کھو گئی
خالق کونین کی نظروں میں بیٹا ہو گئے

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا درجہ حدیث کی ترتیب و تدوین میں بہت ہی بلند ہے لیکن آپ کی عظمت تھی کہ شاگرد کو خراجِ تحسین پیش کرنے میں بھی کمال کر دیا۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے مجھ سے اتنا استفادہ نہیں کیا جتنا میں نے اس سے کیا ہے۔ ایک اور محدث عمران بن علان کا کہنا ہے کہ امام بخاری نے اپنے وصال کے بعد اہل خراساں اور دنیائے اسلام کیلئے علم و عمل میں امام ابو عیسیٰ ترمذی جیسا کوئی شخص نہیں چھوڑا۔

زہے قسمت کہ استاد کی نظر کرم نوازے بھی تو اس شان سے۔

صحیح ترمذی کے نام میں اختلاف ہے۔ حاجی خلیفہ کشف الظنون میں لکھتے ہیں کہ بعض لوگ اس کو سنن ترمذی کہتے ہیں لیکن اس کا زیادہ مشہور نام ”الجامع الصحیح“ ہی ہے۔ سنن اصطلاح حدیث میں حدیث کی اس کتاب کو کہتے ہیں جس کی ترتیب ابواب فقہ کی طرز پر کی گئی ہو اور چونکہ ترمذی کی ترتیب اسی طور پر ہے اسلئے اس کو سنن کہنا بھی درست ہے۔ رہا الجامع الصحیح کہنا تو ترمذی کے جامع ہونے میں تو کوئی کلام نہیں البتہ صحیح کہنے پر یہ سوال وارد ہوتا ہے کہ اس میں حسن اور ضعیف روایات بھی کافی تعداد میں موجود ہیں پھر اس کو صحیح کہنا کیونکر درست ہوگا۔ جواب یہ ہے کہ اس کو صحیح تغلیباً کہا گیا ہے۔

امام ترمذی نے اپنی جامع کی ترتیب میں جو اسلوب اختیار کیا ہے وہ اس قدر عمدہ اور مفید ہے جس کی وجہ سے اس کتاب کو تمام کتب صحاح میں نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ اس سلسلہ میں صحیح ترمذی کے حوالے سے مزید گفتگو کا ایک اور پہلو دیکھئے۔

شیخ ابواسامیل ہروی نے کہا کہ میرے نزدیک ابو عیسیٰ ترمذی کی کتاب بخاری اور مسلم کی کتابوں سے زیادہ مفید ہے۔ انہوں نے اس کا سبب بتلاتے ہوئے کہا کہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم سے سوا ماہرین علوم حدیث کے اور کوئی شخص استفادہ نہیں کر سکتا، بخلاف صحیح ترمذی کے کیونکہ یہ کتاب فقہاء محدثین اور عام علماء کیلئے یکساں مفید ہے۔

امام ترمذی فرماتے ہیں کہ میں نے اس کتاب کو تصنیف کے بعد علمائے حجاز پر پیش کیا تو انہوں نے اس کو پسند کیا۔ پھر علماء خراساں پر پیش کیا تو انہوں نے بھی اس کو تحسین کی نظر سے

دیکھا۔ امام ترمذی کہتے ہیں جس شخص کے گھر میں یہ کتاب ہو وہ یوں سمجھے گویا اس کے گھر میں نبی کلام کر رہا ہے۔

کتب حدیث کے حوالے سے ناقدانہ اور گہری نظر رکھنے والوں کے نزدیک۔

امام ابو عیسیٰ ترمذی کی جامع صحیح، ترتیب صحاح کے لحاظ سے نسائی اور ابو داؤد کے بعد آتی ہے لیکن اس کی اپنی جودت ترتیب اور اولیت اور جامعیت کی وجہ سے جو شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی، اس کے سبب اس کو عام طور پر بخاری اور مسلم کے بعد شمار کیا جاتا ہے۔ چنانچہ حاجی خلیفہ اس کا ثالث الکتاب السنۃ کے عنوان سے کشف الظنون میں ذکر کرتے ہیں۔

حافظ ابن اثیر ”جامع الاصول“ میں لکھتے ہیں کہ جامع ترمذی کتب صحاح میں سب سے احسن ہے کیونکہ اس کی افادیت سب سے زیادہ اور ترتیب سب سے عمدہ ہے نیز اس میں تکرار سب سے کم ہے۔ مذاہب آئمہ اور وجوہ استدلال کے ذکر اور انواع حدیث اور احوال رواۃ کے بیان میں یہ کتاب سب سے مفرد ہے۔

اب تک ہم صحیح ترمذی کے مقام و مرتبہ کے حوالے سے گفتگو کر رہے تھے کہ آئمہ کرام محدثین، مفسرین اور اہل فضیلت کے نزدیک اس تاریخی شہ پارہ اور نادرہ روزگار مجموعہ حدیث کا کیا مقام ہے۔ اب ایک نظر محدث کبیر حضرت امام ابو عیسیٰ ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات زندگی پر ڈالتے ہیں تاکہ اندازہ ہو سکے کہ یہ یگانہ روزگار شخصیت خاندانی حسب و نسب، تعلیم اور ذوق جمع حدیث کے حوالے سے کس مقام کی حامل ہے۔

امام ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ بن سورہ بن موسیٰ بن الضحاک ابن السکن علمی ترمذی ۲۹۸ھ میں بلخ کے شہر ترمذ میں پیدا ہوئے جو دریائے جیحون کے قریب واقع ہے۔

کنیت ابو عیسیٰ

امام ترمذی کا نام محمد اور کنیت ابو عیسیٰ ہے۔ جامع ترمذی میں انہوں نے اپنے نام کی بجائے کنیت کو اختیار کیا ہے اور جہاں اپنا ذکر کرتے ہیں، قال ابو عیسیٰ کے ساتھ ذکر کرتے ہیں۔ اس جگہ یہ سوال وارد ہوتا ہے کہ امام ابن ابی شیبہ نے پوری سند کے ساتھ اپنی تصنیف میں روایت کیا ہے کہ ایک شخص کی کنیت ابو عیسیٰ تھی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سن کر فرمایا ”عیسیٰ کا کوئی باپ نہیں تھا“۔ اس روایت کے سبب بعض علماء نے ابو عیسیٰ کنیت رکھنے کو مکروہ قرار دیا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کنیت ابو عیسیٰ سے نہ منع فرمایا ہے نہ اس کو ناپسند کیا ہے بلکہ صرف ایک امر واقعی کا

بیان فرمایا ہے کہ واقعہ میں حضرت عیسیٰ کا کوئی باپ نہیں تھا۔ ثانیاً یہ کہ حضور کا یہ فرمان مزاج کے قبیل سے تھا جیسا کہ ایک شخص نے ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سواری کیلئے اونٹ مانگا تو آپ نے فرمایا میں تمہیں اونٹ کے بچے پر سوار کروں گا۔ وہ کہنے لگا: حضور اونٹ کا بچہ تو مجھے گرا دے گا۔ آپ نے فرمایا: ہر اونٹ کسی نہ کسی اونٹ کا بچہ ہی ہوتا ہے۔

کنیت ابو عیسیٰ کے سلسلہ میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ حضرت مغیرہ بن شعبہ کی کنیت بھی ابو عیسیٰ تھی، جب حضرت عمر کو اس کنیت کا علم ہوا تو انہوں نے اس کنیت کو ناپسند فرمایا۔ حضرت مغیرہ بن شعبہ نے بتلایا کہ ان کی کنیت حضور نے رکھی تھی تو حضرت عمر نے اس کو حضور کی خصوصیت قرار دیا اور اس کنیت سے بدستور منع کرتے رہے، لیکن اس استدلال میں بھی کچھ جان نہیں ہے کیونکہ حضرت مغیرہ بن شعبہ کی یہ کنیت خود حضور نے رکھی تھی اور حضرت عمر کا اس کو حضور کی خصوصیت قرار دینا اس وقت معتبر ہوتا جب حضور نے اس کنیت سے منع فرمایا ہوتا۔ نیز یہاں اب کا لفظ ابوت کے معنی میں ہے ہی نہیں بلکہ اشتعال اور لزوم کے معنی میں ہے جیسے ابوتراب، ابوہریرہ اور ابو بکر وغیرہ کنیتوں میں بھی یہی معنی ہے۔

امام ترمذی غضب کا حافظہ رکھتے تھے۔ انکی قوت حفظ سے متعلق ایک واقعہ عام تذکرہ نگاروں نے نقل کیا ہے۔ خود امام ترمذی بیان کرتے ہیں کہ میں نے ایک شیخ سے ان کی احادیث کے دو جز نقل کئے تھے۔ ایک مرتبہ مکہ کے سفر میں وہ میرے ہمراہ تھے مجھے اب تک ان اجزاء کی دوبارہ چانچ پڑتال کا موقع نہیں ملا تھا۔ میں نے شیخ سے درخواست کی کہ آپ ان احادیث کی قرأت کریں اور میں سن کر ان کا مقابلہ کرتا جاؤں۔ شیخ نے منظور فرمایا، پھر میں نے ان اجزاء کو اپنے سامان میں تلاش کیا مگر وہ نہ مل سکے۔ بالآخر میں نے ان کے اجزاء کی مثل سادہ کاغذ اپنے ہاتھوں میں پکڑ لئے اور شیخ سے قرأت کی درخواست کی۔

شیخ قرأت کرتے رہے اور میں اپنے ذہن میں ان احادیث کو محفوظ کرتا رہا۔ اتفاقاً شیخ کی نظر ان سادہ کاغذوں پر پڑ گئی اور وہ ناراض ہو کر کہنے لگے کہ تم کو شرم نہیں آتی مجھ سے مذاق کرتے ہو۔ پھر میں نے سارا ماجرا سنا کر اپنا عذر پیش کیا اور کہا کہ آپ کی سنائی ہوئی تمام احادیث مجھے محفوظ ہو گئی ہیں۔ شیخ نے کہا سناؤ۔ میں نے وہ تمام احادیث من وعن سنا ڈالیں۔ شیخ نے دوبارہ امتحان لینے کیلئے چالیس ایسی احادیث پڑھیں جو صرف ان سے روایت کی جاتی تھیں، امام ترمذی نے ان احادیث کو بھی اسی طرح ترتیب وار سنا ڈالا۔ اس پر شیخ نے انہیں تحسین و آفرین کرتے ہوئے بے اختیار کہا

”مارایت ملکہ“ میں نے تمہاری مثل آج تک کسی کو نہیں دیکھا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ جہاں سورج چمکتا ہے وہاں بادل بھی (عارضی طور پر ہی سہی) اس کی چمک دمک کو گہنانے کو آجاتے ہیں۔ مگر ان بادلوں کا وجود مختصر سی مدت کیلئے ہوتا ہے جبکہ سورج نے تو چمکتے ہی رہنا ہے۔ اسی طرح جب کوئی شخصیت خدا کی رحمت کے سہارے عروج اور کمال کو چھوتی ہے تو اس سے بغض رکھنے والے اور اس کے کام میں نقائص تلاش کرنے والے بھی آجاتے ہیں۔ بعض کو چشم ناقدرین کو تو عظیم المرتبت شخصیت میں سرے سے ہی کوئی خوبی نظر نہیں آتی۔ سارا زمانہ ایک طرف اور یہ خود تراشیدہ نقائص کا پٹارہ اٹھائے ڈھنڈوا پیٹنے والا ایک طرف۔ امام ابو عیسیٰ ترمذی کے ساتھ بھی یوں ہوا۔

۔ آنکھ والا تیرے جو بن کا تماشا دیکھے
دیدہ کور کو کیا آئے نظر کیا دیکھے

بعض تذکرہ نگاروں کے نزدیک ابو محمد ابن حزم المتوفی ۴۵۶ھ نے الصال میں امام ترمذی کو مجہول قرار دیا ہے جبکہ غیر مقلدین حضرات کیلئے ابن حزم امام اور پیشوا کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس لئے انہیں اس کے انکار پر تعجب ہوا اور انہوں نے ابن حزم کے قول کی تاویلات اور توجیہات کرنی شروع کر دیں لیکن ہمارے لئے یہ امر چنداں باعث حیرت نہیں ہے کیونکہ ابن حزم نے محلی میں امام ابو حنیفہ امام مالک اور امام شافعی وغیرہم مجتہدین کرام کیلئے جگہ جگہ کذب اور سفاہت کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ پس جو شخص ان جیسے صلحاء امت اور آئمہ دین کیلئے کذب اور سفاہت کے الفاظ لاسکتا ہے ایسے زبان دراز شخص کیلئے امام ترمذی کو مجہول کہہ دینا کیا بڑی بات ہوگی۔

اتفاق دیکھئے کہ امام ترمذی کے کئی ہم نام گزرے ہیں۔

امام ترمذی کے ایک ہم نام حکیم ترمذی ہیں اور بسا اوقات بعض ناواقف لوگ حکیم ترمذی کی روایات کو امام ترمذی کی روایات خیال کر لیتے ہیں حالانکہ حکیم ترمذی نے نوادر الاصول میں اکثر ضعیف اور غیر معتبر روایات جمع کر دی ہیں اور امام ترمذی کی جامع صحیح میں اکثر صحیح اور معتبر روایات ہیں۔

تحقیق یہ ہے کہ ترمذی نام کے تین مشاہیر اعلام گزرے ہیں۔

(۱) امام ابو عیسیٰ الترمذی صاحب الجامع الصحیح المتوفی ۲۷۹ھ

(۲) ابوالحسن احمد بن الحسن بن جبید الترمذی المتوفی ۲۳۵ھ۔ یہ ترمذی کبیر کے نام سے مشہور تھے

اور امام بخاری اور امام ترمذی کے استاذ تھے۔

(۳) ابو عبد اللہ محمد بن علی بن الحسن الحکیم الترمذی۔ المتوفی ۳۵۵ھ۔ حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ یہ نبوت پر ولایت کی فضیلت کے قائل تھے۔ اس عقیدہ کے سبب ان کو ترمذ سے نکال دیا گیا پھر یہ بلخ چلے گئے جہاں ان کو ہمنوا مل گئے۔ ان کی کتاب نوادر الاصول فی معرفۃ اخبار الرسول بہت مشہور ہے جس میں ۲۸۸ احادیث ذکر کی گئی ہیں۔ حافظ سیوطی نے ان پر زیادتی بھی کی ہے۔

بہر حال یہ تو تحقیق برائے محققین امام ترمذی کے ہم ناموں کی جستجو تھی۔ ورنہ اس کا امام ابو عیسیٰ ترمذی کے مقام و مرتبہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ایک آدمی کے کتنے ہی ہم نام ہوتے ہیں مگر جو ہر قابل اسی کا مقدر بنتا ہے جس کی قسمت میں مالک تقدیر نے رقم کر دیا اور امام ترمذی بلاشبہ ایسے ہی خوش بخت ہیں جن سے حدیث کی ترتیب و تدوین کا سلسلہ آگے کو پھیلا۔

جس طرح کسی شخصیت کے حسب و نسب کو دیکھ کر اس کے بلند مرتبہ خاندان کا اندازہ کیا جا سکتا ہے اسی طرح کسی عالم روزگار کے اساتذہ کرام کے اسمائے گرامی پر ایک نگاہ ڈالتے ہی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ شخصیت کس قدر بلند مرتبہ ہوگی جسے اس قدر بلند فکر عالی نظر اور علوم و فنون پر کمال کی دسترس رکھنے والے اساتذہ کرام میسر آئے۔ یہ عین عطاء خداوندی ہے اور امام ابو عیسیٰ کو اساتذہ کرام کے فیوض کی نعمت وافر انداز سے دستیاب ہوئی۔

امام ترمذی نے حصول علم کی خاطر خراسان، عراق اور حجاز کے متعدد شہروں کا سفر کیا اور اپنے وقت کے بہترین افاضل علوم حدیث کے ماہرین اور جید اساتذہ کے سامنے زانوئے تلمذتہ کیا۔ ان کے اساتذہ میں سے چند حضرات کے اسماء یہ ہیں۔

قتیبہ بن سعید، ابو معصب، ابراہیم بن عبد اللہ ہروی، اسماعیل بن موسیٰ اسدی، سوید بن نصر، لی بن حجر، محمد بن عبد الملک بن ابی شوارب، عبد اللہ بن معاویہ، محمد بن اسماعیل البخاری، مسلم بن الحجاج القشیری، امام ابوداؤد۔

جہاں ہم بلند مرتبہ اساتذہ کے میسر آنے سے شاگرد کی خوش بختی کا اندازہ لگاتے ہیں کہ ان کی نظر کرم نے اس شاگرد خاص کو کس شان سے بام عروج پر پہنچا دیا وہاں جب وہ شخصیت بام عروج سے ہمکنار ہو جاتی ہے تو تذکرہ نگار اس کے شاگردوں کی جستجو کرتے ہیں تاکہ اندازہ لگا سکیں کہ عظیم اساتذہ کے فیضان سے خوشہ چینی کرنے والوں نے اگلی نسل کو کیا دیا اور اپنے شاگردوں اور جوئندگان علم کو کس طرح سے فیضیاب کیا۔ اس حوالے سے امام ترمذی کے شاگردوں کے اسماء بھی دیکھئے۔ جن میں سے کئی ایسے ہیں کہ ان کا شمار فروغ حدیث کیلئے کام کرنے والے نامور اساتذہ اور اہل کمال میں

ہوتا ہے۔

امام ترمذی کے تلامذہ کی بھی ایک طویل فہرست ہے اور بے شمار لوگوں نے ان سے احادیث کا سماع کیا ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے ان میں سے بعض حضرات کا ذکر کیا ہے، جنکی تفصیل یہ ہے۔ ابو حامد احمد بن عبداللہ بن داؤد مروزی، یثیم بن کلیب شامی، محمد بن محبوب، ابوالعباس محبوبی مروزی، احمد بن یوسف نسفی، ابوالحارث اسد بن حمدویہ، داؤد بن نصر بن سہیل بزدوی، عبد بن محمد بن محمود نسفی، محمد بن نمیر، محمد بن محمود، محمد بن مکی بن فوج، ابو جعفر محمد بن سفیان بن نصر نسفی، محمد بن منذر ابن سعید ہروی اور امام بخاری۔

ہم ایک نظر دیکھتے ہیں کہ کتب احادیث میں صحیح ترمذی کا مقام کیا ہے۔

صحت احادیث اور قوت سند کے اعتبار سے جامع ترمذی کا مقام نسائی اور ابوداؤد کے بعد ہے اور کتب صحاح میں یہ پانچویں درجہ پر آتی ہے کیونکہ امام ترمذی طبقہ رابعہ سے اصالتہ احادیث روایت کرتے ہیں جبکہ نسائی اور ابوداؤد اس طبقہ سے صرف انتخاب کرتے ہیں۔ نیز امام ترمذی ضعفاء اور مجہولین کے پانچویں طبقہ سے بھی روایت قبول کر لیتے ہیں جبکہ نسائی اور ابوداؤد اس طبقہ سے اصلاً روایت نہیں کرتے۔ اسی سبب سے حافظ جلال الدین سیوطی امام ذہبی کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ جامع ترمذی کا مقام سنن نسائی اور ابوداؤد کے بعد ہے کیونکہ امام ترمذی مصلوب اور اکلبی کی روایات کا بھی اخراج کرتے ہیں۔

البتہ حسن ترتیب حدیث اور فقہ کے متعدد علوم کے شمول اور افادیت کے لحاظ سے جامع ترمذی نسائی اور ابوداؤد پر مقدم ہے۔ شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں کہ جامع ترمذی کے بارے میں یہ بجا طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ یہ مجتہد کیلئے کافی ہے اور مقلد کیلئے معنی ہے اور غالباً اسی وجہ سے حاجی خلیفہ نے ”کشف الظنون“ میں اس کو ثالث الکتاب السنۃ سے تعبیر کیا ہے اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی بھی شاید اسی وجہ سے بخاری اور مسلم کے بعد اسی کا ذکر کرتے ہیں۔

دوسری کتب احادیث کی طرح امام ابو عیسیٰ ترمذی کی جامع ترمذی کی بہت سے حضرات علم و فکر نے شرحیں لکھیں لیکن افسوس کہ بعض تو کمال نہ ہو سکیں اور بعض کے نام ملتے ہیں مگر ان تشریحات (شرح) کا وجود نہیں ملتا۔ یوں تو دنیا بھر میں ہی آپ کی شرحیں نایاب ہیں مگر برصغیر میں تو ایک بھی شرح دستیاب نہیں۔ آگے ہم جامع ترمذی کی چند شرحوں کا ذکر کر رہے ہیں۔ ان میں سے اکثر کا تذکرہ حاجی خلیفہ متوفی ۷۰۰ھ نے کشف الظنون میں کیا۔ بہر حال یہ بھی غنیمت ہے کہ شرحیں نہ

سہی کچھ کے نام تو دستیاب ہو گئے۔ ان سے بخوبی یہ اندازہ ہوتا ہے کہ جامع ترمذی کا مقام محدثین مفسرین اور شارحین کے نزدیک کیا تھا۔ شمع جس قدر شدت کے ساتھ ضوئیں ہوگی، پروانے بھی اسی شدت کے ساتھ اس جانب متوجہ ہوں گے۔

جامع ترمذی کی چند شرحوں کے نام درج ذیل ہیں۔

(۱) عارضہ الحوذی:

یہ شرح الحافظ ابوبکر محمد بن عبداللہ الاشعری الماکی المتوفی ۵۴۶ھ کی تالیف ہے جو ابن العربی کے نام سے مشہور ہے۔

(۲) شرح الشذی:

یہ شرح حافظ ابوالفتح محمد بن محمد الشافعی المتوفی ۳۳۲ھ کی تالیف ہے یہ ایک مبسوط کتاب ہے۔ ترمذی کے دو ٹکٹ سے کم کی شرح دس جلدوں میں کی گئی ہے۔ مصنف اس شرح کو پایہ تکمیل تک نہ پہنچا سکے۔ بعد میں حافظ زین الدین عراقی نے اس کو مکمل کرنا شروع کیا لیکن وہ بھی پوری نہ کر سکے۔

(۳) شرح الزوائد علی الصحیحین وابی داؤد:

یہ شرح سراج الدین عمر بن علی ابن المقلن المتوفی ۸۰۴ھ کی تصنیف ہے۔

(۴) العرف الشذی:

یہ سراج الدین عمر ابن رسلان اللقینی المتوفی ۸۰۵ھ کی تالیف ہے اور نامکمل ہے۔

(۵) شرح الجامع:

یہ شرح حافظ زین الدین عراقی متوفی ۸۰۶ھ کی تالیف ہے اور نامکمل ہے۔

(۶) شرح الترمذی:

یہ شرح حافظ زین الدین عبدالرحمن بن احمد بن نقیب الحسینی المتوفی کی تالیف ہے۔ یہ شرح بیس جلدوں پر مشتمل تھی مگر ایک فتنہ میں جل کر ضائع ہو گئی۔

(۷) شرح الترمذی:

یہ شرح الحافظ زین الدین عبدالرحمن بن احمد بن رجب الحسینی المتوفی ۹۵ھ کی تالیف ہے۔

(۸) قوت المقتدی:

یہ شرح الحافظ جلال الدین السیوطی المتوفی ۹۱۱ھ کی تصنیف ہے۔

(۹) شرح ترمذی:

یہ شرح علامہ محمد طاہر گجراتی صاحب مجمع البحار المتونی ۹۸۶ھ کی تالیف ہے۔

(۱۰) نفع قوت المقتدی:

یہ شرح علامہ سید علی بن سلیمان المالکی المتونی ۱۲۹۸ھ کی تالیف ہے۔

امام ابو عیسیٰ ترمذی نامور محدث اور مفسر تھے۔ درس و تدریس آپ کا خصوصی امتیاز تھا۔ پھر فروغ حدیث کیلئے ایک جگہ سے دوسری جگہ کا سفر کرنا، جمع الحدیث کیلئے درجنوں شہروں کا سفر کرنا اور وہاں کے مشاہیر سے ملاقاتیں کرنا۔ عصر حاضر میں تو ہمارے سامنے مرتبہ مواد موجود ہے مگر ہم سلام نیاز پیش کرتے ہیں ان عالی مرتبت محسنین کو جنہوں نے اپنی زندگیاں عظمت اسلام کی نذر کر دیں۔ ان تمام امور کی انجام دہی کے ساتھ ساتھ آپ کا کلام طلبہ کو مقامات احادیث سے آگاہ کرنا اور دین کی تعلیم سے بہرہ ور کرنا تھا۔ کئی بیماریوں نے بھی آزمایا مگر یہ بندۂ خدا اپنے عظیم الشان مشن میں مصروف کار رہا اور آج یہ اس کی علمی لگن اور حدیث سے محبت ہی کا نتیجہ ہے کہ جامع ترمذی فیوضات اسلام اور معجزات بانی اسلام حضور محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا بہت بڑا ذریعہ بنی ہوئی ہے۔

درس و تدریس کی بے پناہ مصروفیات اور کثرت مشاغل کے باوجود امام ترمذی سے مندرجہ

ذیل تصانیف یادگار ہیں۔

- (۱) جامع ترمذی
- (۲) کتاب التاریخ
- (۳) کتاب الزہد
- (۴) کتاب الاسماء والکنی
- (۵) کتاب الشمائل النبویہ
- (۶) کتاب العلل

جمع احادیث کیلئے جامع ترمذی اور دوسری قابل ستائش تصانیف کا ورثہ مستقبل کی نذر کرنے کے بعد بالآخر اس نابغہ روزگار امام ابو عیسیٰ پر بھی موت نے پر پھیلا دیئے۔ موت ہمارے لئے خوف مسلسل کا دوسرا نام ہے مگر ان اولیائے کرام کیلئے موت محبوب حقیقی (رب کریم) سے وصال کا دوسرا نام ہے ان کیلئے تو یہ انتقال ہے۔ ایک مقام سے دوسرے مقام پر منتقل ہو جانا جہاں خدائے دو جہاں کی رحمتیں اور انوار مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اس فرزند جلیل کے منتظر ہوتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں

یہ لوگ تو جیتے جی ہی رضائے الہی میں اس قدر گم ہو جاتے ہیں کہ انہیں موت کے آنے پر ہلکی سی آہٹ کا بھی احساس نہیں ہوتا۔ یہ سمجھتے ہیں کہ

۔ دانش میں خوف مرگ سے مطلق ہوں بے نیاز

میں جانتا ہوں موت ہے سنت حضور کی

لیکن اجل بہر حال ایک حقیقت ہے اور اس کی آرزو بھی مشیت ایزدی کا لازمی تقاضا ہے اور اسی تقاضے کے تحت امام عیسیٰ ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنی جان رب کائنات کے سپرد کر دی۔

۱۳ رجب المرجب ۲۷۹ھ کو مقام ترمذ میں امام ترمذی کا انتقال ہو گیا اور وہیں آپ کو دفن کیا گیا۔ حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ اس سال جن اور مشاہیر محدثین کا وصال ہوا ان کے اسماء یہ ہیں:

(۱) محدث ابن خلیل بن ثابت

(۲) ابو جعفر برجلانی

(۳) ابراہیم بن عبد اللہ العبسی الکوفی

(۴) محدث مکہ ابو یحییٰ عبد اللہ بن ابی مسرة

(۵) محدث جعفر بن محمد بن شاکر



شرح مکتوبات امام ربانی

حضرت علامہ ابوالبلیان محمد سعید احمد مجددی رحمۃ اللہ علیہ

علامہ محمد سعید احمد مجددی کثیر الجہات شخصیت تھے۔ قدرت کا اٹل اصول ہے کہ جب وہ کسی انسان سے بڑے کام کی انجام دہی کی تمنائی ہوتی ہے تو اسے ایسی صفات سے نوازتی ہے جو اس کی شخصیت کا جزو لازم بن جاتی ہیں اور پھر جوں جوں وقت کی آزمائش گاہ میں اترنے اور تاریخ کی میزان پر فیصلہ کن کردار ادا کرنے کا وقت آتا ہے تو یہی صفات اس شخصیت کا پرتو عمل بن کر ناممکنات زمانہ کو ممکنات کا ملبوس عطا کرنے لگتی ہیں۔ علامہ مجددی کے سینے میں حساس اور درد مند دل تھا جو اپنوں کیلئے ہی نہیں بلکہ غیروں کیلئے بھی تڑپتا تھا۔ یہی دل درد مند محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نظریاتی اور عملی تقاضوں سے آباد تھا۔ محبت رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کی یہ دولت انہیں پہلے اپنے ممتاز روحانی خانوادے اور پھر سرخیل دنیائے معرفت قبلہ عالم سید فیض الحسن شاہ آلو مہاروی سے عطا ہوئی تھی۔ وہ تاجدار آلو مہار شریف کہ جسے پاسدار ناموس رسالت ہونیکا شرف حاصل ہوا تھا اور جو اپنی جان پر کھیل کر بھی ختم نبوت کے علم حق کو وقت کے ہمالہ کی زینت بنا سکتا ہے۔ اسی فیضان تربیت نے علامہ ابوالبلیان رحمۃ اللہ علیہ کو گوہر تابدار بنا دیا۔ اب ان کی تمام تر مساعی سے تحریکات اور تنگ و تاز کے سرچشمے محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے پھوٹ رہے تھے۔

ختم نبوت پر ایمان مسلمات دین میں سے ہے اسی لئے جب بھی وقت نے آواز دی۔ زبان کی تلخیوں نے پکارا، وقت کے جابر حکمرانوں کے سامنے کلمہ حق کہنے کا وقت آیا تو آپ باطل قوتوں کے سامنے سینہ سپر ہو گئے۔ آپ جانتے تھے کہ جب مرد ایمان کا رزار عمل میں داخل ہوتا ہے تو اپنی تمام صلاحیتیں داؤ پر لگا دیتا ہے وہ ہر حالت میں جہاد کرتا ہے جہاد بالقلم ہو یا جہاد بالسیف، جہاد باللسان یا جہاد بالایمان وہ جرأت رندانہ دکھاتا، مشکلات کو ٹھوکروں سے اڑاتا، طاغوتی قوتوں کو نیچا دکھاتا، عصر حاضر میں ماضی کی تاریخ دہراتا اور عظمت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت منواتا ہو اس احساس کے ساتھ آگے بڑھتا ہے کہ

مجھے راز دو عالم دل کا آئینہ دکھاتا ہے
وہی کہتا ہوں جو کچھ سامنے نظروں کے آتا ہے

حضرت علامہ محمد سعید احمد مجددی کی زندگی بھی اشاعت تعلیمات مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم سے عبارت تھی۔ اس تبلیغ و اشاعت کے معدن و مرکز سے جتنے دھارے پھوٹے ان کا تعلق محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ہی عبارت تھا غلام قادیانی کی خانہ ساز نبوت کا مجاہدانہ تعاقب آزادی کشمیر کیلئے سنی جہاد کونسل کا قیام اور اس کیلئے عملی جدوجہد اور تربیت کا اہتمام روحانی سرفرازیوں سے ہمکنار ہو کر متلاشیانِ راہِ حق کیلئے مجاہدوں اور روحانی ریاضتوں کا انصرام۔ اگر آپ کا بنظر غائر دیکھیں تو جہاد کے ان تمام پہلوؤں میں روحانیت کی تب و تاب کا فرما نظر آتی ہے۔ وہ روحانیت جو رو باہی نہیں سکھائی بلکہ اسد اللہی فقر کے اسلوب بخشتی ہے۔

۱۹۹۲ء میں آپ کی مساعی سے ایک ہزار سے زائد علماء مشائخ کی موجودگی میں آل جموں و کشمیر سنی جہاد کونسل کا قیام اس جذبہ جہاد کا نقش بلاخیز ہے جس نے ملک کے ایک کونے سے لے کر دوسرے کونے تک غلامان رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو غلبہ دین حق کیلئے سربلکف کر دیا۔ علامہ مجددی واضح طور پر سمجھتے تھے کہ جذبہ جہاد فقط قیل و قال کا محتاج نہیں بلکہ یہ تو وقت کی کارگاہ میں لہو اور حسن عمل کا خراج مانگتا ہے۔ آپ نے روحانیت کے گلستان سدا بہار کے معنبر ماحول میں روحانی مجاہدوں سے گزرتے ہوئے جہاد بالنفس کے مراحل طے کئے اور پھر یہیں سے جب آگے بڑھے تو آزمائشوں کا سلسلہ دراز سے دراز تر ہوتا چلا گیا۔

ہم نے جب وادی غربت میں قدم رکھا تھا
دور تک یاد وطن آئی تھی سمجھانے کو

علامہ مجددی کے فکر و تدبیر کی تمام تر دلکشی و رعنائی اس فقر غیور سے عبارت ہے جو غلاموں کو اسرار شہنشاہی سکھاتا، بے نام و نشان افراد کو اعزاز حیات بناتا، مولوں کو شاہینوں سے لڑاتا، بزدلوں کو جرأت دلیری کا خوگر بناتا اور روحانیت کی مئے صدر رنگ سے سرمست ہو کر وقت کی کجھلاہی کو اپنا پابند بناتا ہے وہ فقر غیور جو اس حقیقت کا غماز ہے۔

تری زندگی اسی سے تری آبرو اسی سے
جو رہی خودی تو شاہی نہ رہی تو سیاہی

علامہ ابوالبلیان رحمۃ اللہ علیہ کا جذبہ عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم غیر متزلزل اور لازوال تھا۔

اس جذبے کی حدت نے انہیں ہر باطل قوت کے ساتھ نبرد آزما ہونا سکھا دیا تھا۔ آپ محبان رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے راہنمائے یگانہ تھے وہ راہنما جو نگاہ بلند سخن دل نواز اور جاں پر سوز کی عملی تفسیر ہوتا ہے۔ آپ پاکستان کی نظریاتی سرحدوں کے محافظ تھے۔ جہاں بھی اشرا باطل کو انوار حق کے ساتھ معرکہ آراء دیکھا وہیں عشق خلیل کے ترجمان بن کر وقت کے دھارے میں اتر آئے۔ آپ کا شخصیتی تجزیہ کرتے ہوئے اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ آپ جہاں استعماری قوتوں کیلئے اشداء علی الکفار کی تصویر تھے وہاں اپنوں کیلئے ”رحماء بینہم“ کا فکری پرتو لئے رہے تھے۔ آپ کا یہ تمام تر عمل ہر قسم کی جہادی قوت بلائیز کے باوجود روحانیت ہی کے دبستان فکری کا مرہون منت تھا اسی لئے آپ کی شخصیت اس صداقت کی عملی گواہی دیتی نظر آتی ہے۔

۔ ان کا جو فرض ہے وہ اہل سیاست جانیں

میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

بزرگ پاک و ہند کے عظیم خطیب اور آستانہ عالیہ آلومہار شریف کے تاجدار خطیب الاسلام صاحبزادہ سید فیض الحسن شاہ رحمۃ اللہ علیہ ایک عہد ساز مقرر، سحر طراز خطیب، نعت گو شاعر اور زبان و بیان کی معراج کو چھونے والے بطل جلیل تھے۔ آپ کے خانوادہ روحانیت سے ایک زمانہ فیوضات روحانی سمیٹ رہا تھا۔ حضرت علامہ محمد سعید احمد مجددی نے خطیب الاسلام کے فکری و نظریاتی، علمی و روحانی اور ادبی و نظری انوار سے اپنی متاع قلب و جان کو یوں مستنیر کیا کہ ان کے خصائل کا بے مثال نمونہ بن گئے۔ تمام اصحاب نظر کا متفقہ فیصلہ ہے کہ علامہ مجددی صاحب روحانی اور نظری طور پر ہی نہیں بلکہ شوکت زبان اور حسن بیان کے لحاظ سے بھی خطیب الاسلام کے صحیح جانشین اور ان کے محاسن علمیہ کی منہ بولتی تصویر تھے۔

آپ نے سید فیض الحسن کے علاوہ متعدد مشائخ سے فیض حاصل کیا۔ اس روحانی تناظر میں دیکھیں تو علامہ ابوالبیان محمد سعید احمد مجددی کی بلند اوصاف شخصیت انسانی کمالات و خصائل کا ایک ایسا جامع سنگم نظر آتی ہے جہاں آکر متعدد روحانی سلاسل کے نظری دھارے یکجا ہو جاتے ہیں۔

۔ ہوئی منزل کی جانب اس طرح سے جاہ پیمائی

کہ منزل خود بخود ان کے قدم کو چومنے آئی

شہریار خطابت حضرت صاحبزادہ سید فیض الحسن شاہ قدس سرہ کا سحاب کرم ان پر مدتوں سایہ نکل رہا۔ ان کے فیضان خطابت سے آپ نے یوں راہنمائی لی کہ بہت جلد اس ممدوح علم کی خطابت

کا عکس جمیل بن گئے۔ جب تقریر کرتے تو ہزاروں کے مجمع پر چھا جاتے۔ سامعین کے دلوں کی دھڑکنیں رک جاتیں۔ علامہ ابوالبلیان محمد سعید احمد مجددی رحمۃ اللہ علیہ کی خطابت کے لوہے نے ہر لوہے کو کاٹا اپنے تو اپنے اغیار نے بھی ان کی خطابت کی سحر آفرینی کو تسلیم کیا۔ مقررین کا جم غفیر ہوتا مگر جب علامہ مجددی محو خطابت ہوتے تو پھر ہر طرف آپ ہی کے اندر تقریر کی دل نشینی بہار جاوداں بن کر چھاتی ہوئی محسوس ہوتی۔

آپ کی تقاریر چند موضوعات پر مشتمل نہ تھیں بلکہ ان میں موضوعات کی رنگارنگی، مطالب کی گہرائی، مفاہیم کی وسعت، مطالعہ کی جامعیت، حسن ادا کی نکبت کے پہلو بہ پہلو انداز تکلم کی رفعت کا ر فرما تھی۔ اصحاب ایمان کیلئے آپ کی تقاریر حکمت و موعظت کے شہ پاروں کی حیثیت رکھتی تھیں اس لئے عوام ہجوم در ہجوم آپ کے خطابات کو سنتے، آپ کی تقاریر سے ضروریز ہونے والے فکر و نظر کے جواہر بے بہا کو چنتے، موضوعات کی دل نشینی کی مہک سے قلب و جان کو معنبر کرتے اور دلوں کی خلوتوں میں ان خطبات عالیہ کی بصیرت آفرینی سے اجالا کرنے کا سامان مہیا کرتے۔ آپ کی تقاریر میں مترادفات کی کثرت اور ہم وزن الفاظ کا تکرار ایک سماں باندھ دیتا، ایسا سماں کہ جسے تصور کی آنکھوں میں محفوظ تو کیا جاسکتا تھا مگر بیان نہیں کیا جاسکتا۔

آپ سلسلہ عالیہ نقشبندیہ مجددیہ کے رکن رکین تھے۔ آپ حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد فاروقی سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کی حق گوئی، راست روی، ایمانی استقامت اور غیر معمولی جذبہ جہاد کے امین تھے۔ اس لئے آپ راہبانہ تصوف کے قائل نہ تھے۔ آپ بجا طور پر سمجھتے تھے کہ خانقاہوں سے نکل کر ہی رسم شبیری ادا کی جاسکتی ہے، میدان عمل میں اترے بغیر وقت کے کج کلاہوں کو عجز و نیاز کا خوگر نہیں بنایا جاسکتا۔ اس عزم اور جذبہ رندانہ کی بجا آوری کیلئے آپ نے ایسی تمام تحریکات میں بھر پور حصہ لیا جن کا مقصد وطن عزیز میں نظریاتی قوتوں کو استحکام مہیا کر کے اس سرزمین کو اسلامی تعلیمات کا مرکز بنایا تھا۔ آپ نے جمعیت علمائے پاکستان، جماعت اہلسنت پاکستان، جمعیت المشائخ پاکستان اور جمعیت علمائے آزاد کشمیر کے پیغام کو آگے بڑھانے کیلئے نہایت فعال اور سرگرم کردار ادا کیا۔ آپ مجاہد ختم نبوت بھی تھے۔ آپ نے تحریک ختم نبوت کے عظیم قافلہ سالار صاحبزادہ سید فیض الحسن شاہ رحمۃ اللہ علیہ کی زیر قیادت بھرپور کردار ادا کیا۔ تحریک نظام مصطفیٰ کے دوران میں آپ کا کردار ہر لحاظ سے قابل رشک رہا یہی نہیں بلکہ ملک کے جس گوشے سے بھی فروغ اسلام اور احیائے دین مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم کی تحریک اٹھی آپ اس کے پیغام کو آگے بڑھانے میں ہمیشہ پیش پیش نظر آئے۔

خطیب العصر علامہ ابوالبلیان پیر محمد سعید احمد مجددی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک بڑا کارنامہ ۱۹۸۰ء میں ”عالمی ادارہ تنظیم الاسلام“ کی بنیاد رکھنا ہے۔ آپ کی زندگی کا مرکز و محور محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم رہی ہے۔ اولیائے کرام اور مشائخ امت اسلام کا اسوہ ہمیشہ آپ کیلئے خضر راہ رہا ہے۔ اس لئے آپ کی تمنائیں کہ جو شمع نورانی میرے قلب و جگر میں ضوئیں ہے اسی سے زمانے بھر میں اجالا ہو جائے تو بجزہ تعالیٰ ”عالمی ادارہ تنظیم الاسلام“ کے پلیٹ فارم سے آپ نے احیائے اسلام غلبہ دین حق اور نظام مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے نفاذ کیلئے قابل رشک کردار ادا کیا۔

آپ نے اپنا فکری و نظری اور روحانی پیغام صرف وطن عزیز میں عام نہیں کیا بلکہ دوسرے ممالک تک بھی اس پیغام کو پہنچایا۔ کفرزاروں میں اسلامی انوار کو عام کرنے کی جدوجہد کی۔ آپ کی مبلغانہ مساعی کا سلسلہ پاکستان سے نکل کر آسٹریلیا، ملائیشیا اور کئی دیگر ممالک تک دراز ہوتا گیا۔ آپ نے کتاب و سنت کی ترویج اور تبلیغ اسلام کیلئے ہر جگہ مسلمانوں کو متحد و منظم کیا، ان کی علمی اور عملی راہنمائی کی، انہیں ہر گام پر یہ احساس دلایا کہ قدرت تم سے زمانے بھر کی امامت و قیامت کا کام لینا چاہتی ہے مگر تم گروہ بندیوں میں الجھ کر اپنے مقصد اولیٰ کو فراموش کر بیٹھے ہو۔ آپ نے حکمت و بصیرت سے اہل وطن اور دوسرے ممالک کے اصحاب ایمان کو باور کرایا کہ

بے خبر تو جوہر آئینہ ایام ہے

تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے

علامہ محمد سعید احمد مجددی رحمۃ اللہ علیہ نے قرطاس و قلم کو بھی بھرپور انداز سے تبلیغ اسلام اور تصوف و روحانیت کی ترویج کا ذریعہ بنایا۔ آپ نے ماہنامہ ”دعوت تنظیم الاسلام“ کا اجراء فرمایا جو علمی و ادبی مضامین اور تعلیمات تصوف کے فروغ کا ایک اہم ادبی ذریعہ ہے۔ اسی ادبی مجلہ میں آپ نے حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی شیخ احمد فاروقی سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کے مکتوبات شریفہ کی اردو شرح ”الہینات“ کے عنوان سے لکھنے کا آغاز فرمایا۔ اس مقصد کو عام کرنے کیلئے آپ نے ایک مدت پیشتر تبلیغی دروس کا اہتمام فرمایا۔ تعلیمات مجدد الف ثانی اور شرح مکتوبات امام ربانی کے حوالے سے آراستہ ہونے والی محافل مقدسہ میں تصوف و روحانیت کے جواہر پارے لٹاتے رہے۔ اہل شوق ان جواہر پاروں کو اپنے دامان شوق میں سمیٹ کر اسلامی تعلیمات سے عملی آگہی کا سامان مہیا کرتے رہے۔ یہی نہیں بلکہ آپ نے ”مکتوبات مجدد الف ثانی“ کی تشریح کے پہلو بہ پہلو حضور داتا گنج بخش سیدنا علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ کی شہرہ آفاق روحانی تصنیف ”کشف المحجوب“ کی شرح کو بھی پایہ تکمیل

تک پہنچایا۔ آپ کشف المحجوب کے ہفتہ وار دروس مسلسل آٹھ برس تک اہل ایمان کے قلوب کی زینت بناتے رہے۔ عالمی ادارہ تنظیم الاسلام کے شعبہ مطبوعات کے زیر اہتمام سیدنا مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے مکتوبات عالیہ کی اردو شرح ”الہینات شرح مکتوبات“ کے نام سے اشاعت پذیر ہو چکی ہے۔ علامہ محمد سعید احمد مجددی کی ولولہ انگیز خطابت سے متاثر ہو کر تقریر و انشاء کی منزلوں کے راہی نہیں ”ابوالبیان“ کے فکر آفریں لقب سے یاد کرتے ہیں۔ یہ لقب بہت جلد آپ کے نام کا اس طور حصہ بن گیا کہ ملک کے طول و عرض میں فقط ”ابوالبیان“ کہہ دینے سے ہی آپ کی ذات مراد لی جاتی ہے۔ آپ کے خطبات و تقاریر کو ”البيان“ کے نام سے شائع کیا جا رہا ہے۔ دو جلدیں شائع ہو چکی ہیں اور کئی جلدیں اشاعت کے اہتمام سے گزر رہی ہیں اور مقالات اور مضامین کو ”مقالات ابو البیان“ کے عنوان سے شائع کیا گیا ہے۔

حضرت علامہ محمد سعید احمد مجددی رحمۃ اللہ علیہ بلاشبہ علماء و مشائخ کے محبوب نظر تھے۔ اہل نظر کی محافل میں آپ کو نہایت عزت و توقیر سے پکارا جاتا تھا۔ آپ بیک وقت تقریری اور تحریری محاذوں پر غلبہ دین اسلام کیلئے مصروف عمل رہے ایک صاحب تحقیق جب کمال احتیاط سے آپ کی شخصیت کا جائزہ لیتا ہے تو اسے خوشگوار حیرت ہوتی ہے کہ ایک شخصیت بیک وقت کس طرح مختلف امور کی انجام دہی میں راہنمایانہ کردار ادا کرتی رہی آپ نے جو انان وطن کو اسلاف کی روحانی اور ایمانی عظمتوں سے آشنا کیا، بزرگان دین کو احیائے اسلام کیلئے اتفاق و اتحاد کا درس دیا، مختلف سلاسل کے فیوض سے بہرہ ور ہو کر ان سلاسل کی برکات کو نسل نو تک پہنچانے کا اہتمام کیا، قلم کی نوک سے تبلیغ دین اسلام کے گلاب مہکا کر کثافت آلود دلوں کو مہکبار کیا، محبت رسول کی شمعیں روشن کر کے جہالت اور تصوف دشمنی کی تاریکیوں کو انوار تصوف کی پوری جامعیت کے ساتھ کافور کیا، مکتوبات امام ربانی اور کشف المحجوب جیسے عہد ساز علمی اور روحانی نوادرات کے دروس اور شرح مبین کا سلسلہ جاری کیا اور اسے کبھی رکنے نہ دیا۔

آپ نے اپنی حیات مستعار کا ایک ایک پل فروغ دین اور عشق سرور کو نین صلی اللہ علیہ وسلم کی بہار جانفزا لٹانے میں صرف کیا۔ مصروفیات کا ایک ہجوم تھا جو ہر وقت آپ کی خداداد صلاحیتوں کا احاطہ کئے رہتا تھا۔ مصروفیات کا یہی بوجھ آپ کی صحت کے تیزی سے گرنے کا سبب بنا۔ آپ کئی برس مسلسل صاحب فراش رہے۔ آپ کی بیماری کی خبر جب عام ہوئی تو مساجد مدارس اور تصوف کدوں میں آپ کی صحت مندی کیلئے دعاؤں کا سلسلہ چل نکلا۔ لاکھوں دل آپ کی صحت یابی

کی تمنائے دھڑکتے رہے۔ آپ نے اپنی زندگی ہی میں اپنے ہونہار اور صاحب علم بھتیجے جناب صاحبزادہ محمد رفیق احمد مجددی مدظلہ کی روحانی تربیت فرما کر انہیں اپنا جانشین نامزد کر دیا تھا۔

۱۱ اگست بروز اتوار کو آپ کے انتقال پر ملال کی خبر ملک بھر کے عشاقِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے بے پناہ رنج و الم کا سبب بن کر چاروں طرف پھیل گئی۔ بے شمار دل صدے سے چاک اور بیشمار آنکھیں آنسوؤں سے نمناک ہونے لگیں۔ آپ کی نماز جنازہ پولیس لائن گراؤنڈ گوجرانوالہ میں آپ کے جانشین حضرت صاحبزادہ محمد رفیق احمد مجددی مدظلہ نے پڑھائی۔ چاروں طرف آنسوؤں کے نذرانے پیش کرتا ہوا اہل شوق کا ہجوم ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کی طرح نظر آ رہا تھا۔ جہاں تک نظر اٹھتی تھی سو گواروں کے سر دکھائی دے رہے تھے۔ شہر گوجرانوالہ کے علاوہ ملک بھر سے آئے ہوئے مشائخ عظام اور علمائے کرام کی ایک بڑی تعداد بھی نماز جنازہ میں شریک تھی۔ سسکیوں اور آنسوؤں کے درمیان آپ کی نماز جنازہ ادا کی گئی۔

آج خطیب العصر جسمانی طور پر ہمارے درمیان نہیں تو بہت کچھ کھودینے کا احساس ہوتا ہے یوں لگتا ہے جیسے قافلے سے متاع سفر چھین گئی ہو جیسے افکار کی زمینیں بنجر اور احسانات کے گلزار ویران ہو گئے ہوں۔ جیسے حسن تکلم نے اپنا سحر کھو دیا ہو۔ جیسے الفاظ و معانی کے چاند تاروں نے جلمگانا چھوڑ دیا ہو۔ جیسے حلقہٴ عشاقِ جان تمنائے محروم ہو گیا ہو۔ جیسے کاروانِ فکر و عمل کی رفتار مدہم ہو گئی ہو۔ جیسے عمل کی میزان تو سچی ہو مگر جان عمل جاتا رہا ہو۔ اس بے قراری اور اضطراب و اضطراب کے عالم میں قلم اپنا حوصلہ تحریر کھوتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

خطیب العصر جسمانی طور پر تو جدا ہو گئے مگر روحانی اور باطنی طور پر ہر صاحب نظر انہیں اپنے پاس ہی محسوس کرتا ہے۔ افکار شخصیات سے زیادہ طاقتور اور اعمالِ افراد سے زیادہ ہمہ گیر ہوتے ہیں۔ تربیت کی تاثر انگیزی ہر آن مرجعِ طریقت کے روحانی اور معنوی وجود کا احساس دلاتی ہے۔ حضرت علامہ ابوالبیان محمد سعید احمد مجددی رحمۃ اللہ علیہ کے افکار کی جلوہ افروزی اب بھی ان کے بھرپور وجود کا احساس دلا رہی ہے۔

موت کو سمجھے ہیں غافل اختتامِ زندگی
کہے یہ شامِ زندگی صبحِ دوامِ زندگی
سلام عقیدت حضرت خطیب العصر آپ کیلئے کہ ایسی تاریخ ساز خوش بختیاں کم ہی کسی کا
مقدر بنتی ہیں۔

پیشوائے کمالاں

حضرت شیخ ابوالحسن علی بن احمد خرقانی رحمۃ اللہ علیہ

حضرت ابوالحسن علی بن احمد خرقانی رحمۃ اللہ علیہ کا شمار ان عظیم اولیائے کرام میں ہوتا ہے۔ جنہوں نے اپنے لازوال کردار اور پاکیزہ سیرت سے زمانے کے مقتدر کو بدل دیا۔ آپ مادر زاد ولی تھے۔ امی تھے۔ یعنی جو کچھ بھی حاصل ہوا رب کونین کی عنایات سے حاصل ہوا۔ مسلسل بیس برس تک آپ کا یہ معمول رہا کہ خرقان سے بعد نماز عشاء حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر پہنچ جاتے اور وہاں کھڑے ہو کر عرض گزار ہوتے کہ

”اے رب العالمین! جو مرتبہ تو نے حضرت بایزید بسطامی کو عطا کیا ہے وہی مجھ کو عطا کر دے۔“

اس دعا کے بعد خرقان واپس آتے۔ نماز فجر ادا کرتے۔ تذکروں میں لکھا ہے کہ حضرت ابوالحسن خرقانی کے ادب کا یہ عالم تھا کہ بسطام میں حاضری کے بعد اس نیت کے ساتھ اٹھے پاؤں واپس ہوتے کہ کہیں صاحب مزار کی بے ادبی نہ ہو جائے۔ آپ ایک طویل عرصہ اس روحانی معمول پر قائم رہے۔ سردی ہو یا گرمی آپ نے اس معمول کو کبھی ترک نہ کیا۔ آخر یہ عقیدت رنگ لے آئی اور ”آپ نے حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کی قبر سے یہ آواز سنی کہ اے ابوالحسن اب تیرا بھی دور آ گیا ہے۔ آپ نے جواب میں عرض کیا حضور والا! میں تو قطعی امی ہوں اور اسی وجہ سے امور شرعیہ سے ناواقف ہوں۔ آپ ہی میری ہمت افزائی فرمائیں گے تو پھر کچھ ممکن ہے۔ قبر اطہر سے صدا آئی اے ابوالحسن! مجھے جو کچھ مرتبہ حاصل ہوا ہے۔ وہ صرف تمہاری ہی وجہ سے عطا ہوا ہے۔ آپ نے بصد احترام عرض کیا۔ حضور! آپ کو تو پردہ فرمائے ہوئے ۳۹ برس گزر چکے ہیں۔ میرے اور آپ کے زمانے میں بہت فرق ہے۔ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کی قبر سے پھر صدا آئی۔ تیرا قول درست ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ جب میں اپنی زندگی میں سرزمین خرقان سے گزرتا تھا تو اس سرزمین پر زمین سے آسمان تک نور ہی نور نظر آتا تھا۔ چاروں طرف خوشبوئیں بکھری ہوئی محسوس کرتا۔ میں مسلسل تیس برس تک دعا کرتا رہا کہ میری ایک حاجت قبول ہو جائے مگر وہ نہ ہوئی۔ مجھے

خدا کی طرف سے حکم دیا گیا کہ اگر تو سرزمین خرقان میں پھیلے ہوئے نور کو ہماری خدمت میں پیش کرے گا تو تیری دعا قبول ہو جائیگی۔ چنانچہ اے مرد خوش بخت! تمہاری آمد سے میری وہ آرزو پوری ہو گئی۔“
حضرت ابوالحسن خرقانی یہ سن کر از حد مسرور ہوئے۔ دل و دماغ میں عنایات خداوندی کے چشمے ابلتے ہوئے محسوس ہونے لگے۔ واپس آئے تو فقط ۲۴ دن میں قرآن مجید حفظ کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے شرعی علوم کے انوار ان کے سینے پر اس تیزی سے ضو بار ہنے لگے کہ بہت جلد ان کا شمار انتہائی ممتاز علمائے دین اور صوفیائے کرام میں ہونے لگا، سچ ہے۔

خدائے پاک کی جبکہ عنایت خوب ہوتی ہے
تو وہ ہستی فضائے دہر کو محبوب ہوتی ہے
وہی ہستی کہ مدت سے رہا کرتی ہے پردوں میں
وہ ایک پل میں خدائے پاک کی مطلوب ہوتی ہے

خدا کی عنایات کا یہ عالم تھا کہ اپنے باغ کی کھدائی کرتے ہوئے چاندی برآمد ہوئی۔ دوسری مرتبہ ہل چلا تو سونا برآمد ہوا۔ تیسری جگہ سے مردارید اور چوتھی جگہ سے جواہرات برآمد ہوئے۔ آپ نے کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا اور خود سے مخاطب ہو کر کہا کہ ”اے دنیا! ابوالحسن تجھ پر فریفتہ نہیں ہو سکتا۔“
ہل چلاتے وقت جب نماز کا وقت آتا تو سارے کام چھوڑ کر نماز ادا کرتے، نماز کی ادائیگی کے بعد جب زمین کی طرف واپس آتے تو زمین تیار ملتی جیسے کوئی اور ہل چلا گیا ہو۔

آپ کی بہت سی کرامات مشہور ہیں۔ ایک مرتبہ شیخ ابوسعید اپنے مریدین کے ساتھ آپ کے یہاں مہمان ہوئے۔ اس وقت گھر میں چند ٹکیوں (روٹیوں) کے سوا کچھ نہ تھا۔ آپ نے بیوی کو حکم دیا کہ رات ٹکیوں پر ایک چادر ڈال دے اور بقدر ضرورت نکال نکال کر دیتی جائے۔ تمام مہمانوں نے سیر ہو کر کھانا کھایا۔ دوسری روایت یہ ہے کہ اس وقت دسترخوان پر بہت سے مہمان تھے۔ آپ نے خادم کو چادر ڈالنے کا حکم دیا۔ وہ حکم کے مطابق ٹکیاں نکال نکال کر رکھتا رہا۔ ایسی برکت پیدا ہوئی کہ مسلسل ٹکیاں اور روٹیاں نکلتی رہیں۔ جب خادم نے آزمانے کیلئے چادر اٹھا کر دیکھا تو نیچے ایک بھی روٹی نہ تھی۔ آپ نے فرمایا کم بخت! تو نے برا کیا اور چادر نہ اٹھاتا تو غیب سے ہمیں ہمیشہ روٹیاں عطا ہوتی رہتیں۔

آپ ابوالحسن خرقانی کی کنیت سے مشہور ہوئے۔ ایک مرتبہ ایک شخص نے آپ سے عرض کیا کہ آپ اپنا خرقہ مجھے پہنا دیجئے۔ آپ نے فرمایا کیا کوئی عورت مردانہ لباس پہن کر مرد بن سکتی ہے

تو اس نے کہا کہ نہیں ہرگز نہیں۔ پھر آپ نے فرمایا کہ جب ایسا ہونا ممکن نہیں تو پھر تم میرا خرقة پہن کر کسی طرح مجھ جیسے نہیں بن سکتے ہو؟ فرمایا بات لباس کی نہیں اس عبادت، خلوص اور ریاضت کی ہے جو بندے کو خدا کا قرب عطا کرتی ہے۔

فاتح سومنات سلطان محمود غزنوی اور آپ کی ملاقات کا واقعہ بڑا ایمان افروز ہے۔ سلطان محمود غزنوی نے ہندوستان پر سترہ حملے کئے مگر سومنات فتح نہ ہو سکا۔ کسی نے اسے آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر دعا کروانے کا مشورہ دیا۔ سلطان اولیاء اللہ کا خادم تھا۔ اس نے آزمائش کی خاطر اپنے غلام ایاز کو ساتھ لیا اور کہا کہ میں تجھے اپنا لباس فاخرانہ پہنا کر اپنی جگہ بٹھا دوں گا اور تیرا غلامانہ لباس پہن کر غلام کی جگہ لے لوں گا۔ یہ اہتمام کر کے سلطان محمود حضرت ابوالحسن خرقانی کی خدمت میں حاضر ہوا اور قاصد سے کہا کہ حضرت سے کہہ دینا کہ میں صرف آپ سے ملاقات کی غرض سے حاضر ہوا ہوں۔ لہذا از راہ کرم میرے خیمے تک تشریف لائیے اگر وہ آنے سے انکار کر دیں تو یہ آیت تلاوت کرنا ”اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم“ (یعنی اللہ اور رسول کی اطاعت کرو اور ان کے ساتھ اپنی قوم کے حکمران کی بھی اطاعت کرتے رہو)۔ قاصد نے آپ کا پیغام پہنچایا تو آپ نے فرمایا محمود سے کہنا کہ میں تو ”اطیعوا اللہ“ میں ایسا غرق ہوں کہ ”اطیعوا الرسول“ میں بھی ندامت محسوس کرتا ہوں۔ اس حالت میں ”اولی الامر منکم“ کیلئے وقت کیسے نکالوں؟ محمود فوراً آپ کی فراست ایمانی کا قائل ہو گیا۔ خود زیارت کا ارادہ کر لیا۔ ایاز کا لباس خود پہنا، ایاز کو اپنا لباس پہنایا اور دس کنیروں کو مردانہ لباس پہنا کر آپ کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ آپ نے سلام کا جواب تو دے دیا لیکن محمود جو غلام کے لباس میں تھا اس کی طرف متوجہ ہو گئے اور اس سے گفتگو کرنے لگے۔ شاہانہ لباس والے ایاز کی جانب بالکل توجہ نہیں کی۔ محمود نے پوچھا آپ نے بادشاہ کی عزت کیوں نہیں کی؟ آپ نے فرمایا یہ سب فریب ہے پھر محمود کا ہاتھ تھام کر کہا ان سب نامحرموں کو باہر نکالو۔ جب سب لوٹیاں چلی گئیں تو محمود آپ کے قدموں میں گر پڑا اور دعاؤں کا خواستگار ہوا۔ آپ نے خاص طور پر فرمایا اے محمود! تیری عاقبت محمود ہو۔ محمود نے اشرافیوں کا ایک توڑا لنگر کیلئے پیش کیا تو آپ نے جو کی خشک روٹی اسے دے کر کہا کہ اسے کھاؤ۔ جب وہ اس سے کھائی نہ گئی اور حلق میں پھنس گئی تو آپ نے فرمایا جس طرح یہ روٹی تیرے حلق سے نہیں اترتی اسی طرح یہ اشرافیاں ہم سے ہضم نہیں ہوتیں۔ جب محمود رخصت ہوا تو آپ اس کی تعظیم کیلئے کھڑے ہو گئے۔ اس نے کہا میری آمد پر تو آپ کھڑے نہیں ہوئے مگر رخصت پر کھڑے ہو گئے۔ آپ نے فرمایا تو جب آیا تو تکبر میں تھا لیکن عاجزی اور

درویشی کے ساتھ واپس جا رہا ہے۔

محمود نے عرض کیا حضور سومنات کا مندر اور قلعہ فتح نہیں ہوتے۔ آپ نے اپنا پیرا ہن اتار کر اسے دیا اور فرمایا کہ صبح نماز کے بعد میرا پیرا ہن ہاتھ میں لیکر دعا کرنا کہ خدایا اس پیرا ہن والے کے صدقے میں مجھے کامرانی نصیب فرما۔ یہ اس درویش کا مل کے پیرا ہن کا صدقہ تھا کہ سومنات فتح ہو گیا۔ رات کو محمود نے خواب میں دیکھا کہ حضرت ابوالحسن فرما رہے ہیں کہ اے محمود! تم نے اس قدر معمولی شے کیلئے میرے پیرا ہن کے صدقے میں دعا کی۔ اگر تو اس پیرا ہن کے صدقے میں تمام عالم کفار کے مسلمان ہونے کیلئے دعا مانگتا تو دنیا سے یقیناً کفر کا خاتمہ ہو جاتا۔

عجب انداز دیکھا ہے ترا اے شاہ خرقانی
ترے در سے عطا ہوتی ہے درویشوں کو سلطانی
ترے حسن دعا سے امن کا پرچم تھا لہرایا
ترے افکار سے پھیلی زمانے میں مسلمانی

ایک مرتبہ آپ نے یہ غیبی آواز سنی کہ اے ابوالحسن! تو نکیرین سے کیوں نہیں ڈرتا؟ آپ نے فرمایا جس طرح جوان مرد اونٹ کی گھنٹی سے خوفزدہ نہیں ہوتا اسی طرح میں بھی مردوں سے خوفزدہ نہیں ہوتا اور پھر عرض کیا کہ جب تو مجھے زمین سے اٹھا کر میدان حشر میں کھڑا کرے گا تو میں ابوحنسی لباس اتار کر بحر وحدانیت میں غوطہ لگاؤں گا تا کہ وحدانیت کے سوا کچھ باقی نہ رہے اور جب ابوالحسن ہی نہیں ہوگا تو فرشتے کس پر عذاب نازل کریں گے۔

ایک مرتبہ آپ نے تصوف کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا کہ جو بندہ دنیا میں انبیائے کرام اولیاء اور خدا سے شرم کرتا ہے۔ عقبتی میں خدا بھی اس سے شرم کرتا ہے۔ فرمایا کہ تین قسم کے لوگوں کو قرب الہی حاصل ہوتا ہے۔ اول مجرد اور صاحب علم کو دوم صاحب سجدہ کو اول کسب و ہنر کو۔ پھر ارشاد فرمایا کہ نان جویں کھانے اور ٹاٹ کا لباس پہن لینے سے صوفی نہیں بن جاتا۔ کیونکہ صوفی بننے کا دار و مدار اس پر ہوتا تو تمام اون والے اور جو کھانے والے جانور صوفی بن جایا کرتے۔ بلکہ صوفی وہ ہے جس کے قلب میں صداقت اور عمل میں خلوص ہو۔ پھر ارشاد کہا کہ مجھے مرید کرنے کی خواہش نہیں ہے کیونکہ میں تو ہر وقت ”اللہ کافی“ کہا کرتا ہوں۔

ایک مرتبہ دوران مجلس آپ نے فرمایا کہ اگر تم نے عمر میں ایک مرتبہ بھی خدا تعالیٰ کو آزر دہ کیا ہے تو زندگی بھر اس سے معذرت چاہتے رہو۔ کیونکہ اگر وہ اپنی رحمت سے معاف بھی کر دے

جب بھی تمہارے قلب سے یہ داغ حسرت محو نہیں ہونا چاہیے کہ تم نے رب دو عالم کو آزرہ کیا ہے پھر فرمایا قابل صحبت وہی ہے جو آنکھ سے اندھی کان سے بہری اور منہ سے گوئی ہو۔ یعنی ایسے شخص کی صحبت اختیار کرنی چاہیے جو اپنی آنکھ سے خدا کے علاوہ کسی اور کا مشاہدہ نہ کرتا ہو۔ کان سے بہری اور منہ سے گوئی کا مطلب یہ ہے کہ ایسے شخص کی صحبت اختیار کرنی چاہیے جو اپنی آنکھ سے خدا کے سوا کسی کو دیکھتا نہ ہو اور اپنے کانوں سے حق کے سوا کوئی بات سنتا نہ ہو اور زبان سے حق کی ترجمانی کے علاوہ کچھ کہنے کی جرأت رکھتا نہ ہو۔

حضرت ابوالحسن خرقانی کے ایک اور بھائی بھی تھے۔ اگر آپ رات کو عبادت میں مصروف ہوتے تو دوسرے بھائی پوری رات اپنی والدہ محترمہ کی خدمت میں گزار دیتے۔ ایک دن جب دوسرے بھائی کا نمبر ماں کی خدمت کرنے کا تھا تو اس نے آپ سے کہا اگر آپ آج تمام رات ماں کی خدمت کر لیں تو میں خدا کی عبادت کر لوں گا۔ آپ نے ان کو اجازت دے دی اور خود امی جان کی خدمت میں مصروف ہو گئے۔ اسی شب عبادت کی ابتداء کرتے ہی آپ کے بھائی نے یہ غیبی ندا سنی کہ ہم نے تمہارے بھائی کی مغفرت کرنے کے ساتھ تمہیں بھی بخش دیا۔ یہ سن کر بھائی کو حیرت ہوئی اور بارگاہ ایزدی میں عرض کیا کہ یا خدا! میں تو تیری عبادت کر رہا ہوں اور وہ ماں کی خدمت گزار میں ہے پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ میری مغفرت کے بجائے پہلے اس کی مغفرت کر کے مجھے اس کا طفلی بنا دیا۔ غیب سے ندا آئی کہ ہمیں تیری عبادت کی حاجت نہیں بلکہ محتاج ماں کی خدمت کرنے والے کی اطاعت ہمارے لئے باعث خوشنودی ہے۔

ایک مرتبہ مجلس جمعی ہوئی تھی۔ اہل ذوق کا اجتماع تھا۔ کسی طالب شوق نے سوال کیا کہ عبادت کیا ہے؟ آپ نے ارشاد فرمایا کہ چالیس سال تک عبادت کرنا ضروری ہے دس سال تک تو اس لئے کہ زبان میں صداقت اور راست بازی پیدا ہو جائے اور دس سال تک اس لئے جسم کا بڑھا ہوا گوشت کم ہو جائے۔ دس سال تک اسلئے کہ اب دو عالم سے تعلق روحانی پیدا ہو جائے۔ اور دس سال تک اس لئے کہ تمام اعمال اور اعمال درس ہو جائیں اور جو شخص چالیس سال تک اس طرح عبادت کرے گا وہ مراتب میں سب سے بڑھ جائے گا۔

مرد یگانہ حضرت ابوالحسن خرقانی رحمۃ اللہ علیہ یوم عاشورہ ۳۳۵ھ میں واصل بحق ہوئے۔ وفات کے وقت آپ نے فرمایا کہ کاش میرا قلب چیر کر مخلوق کو دکھایا جاتا تا کہ ان کو معلوم ہو جاتا کہ خدا کیساتھ بت پرستی درست نہیں۔ پھر لوگوں کو وصیت فرمائی کہ مجھے زمین سے تین گز نیچے

دفن کرنا کیونکہ یہ سرزمین بسطام کی سرزمین ہے زیادہ بلند ہے اور یہ سراسر بے ادبی ہے کہ میرا مزار حضرت سیدنا بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار سے بلند ہو جائے۔ چنانچہ آپ کی اسی وصیت پر عمل کیا گیا۔ لیکن آپ کی وفات سے دوسرے روز ہی ایک بجلی سی چمکی اور لوگوں نے دیکھا کہ ایک سفید پتھر آپ کے مزار پر رکھا ہوا ہے اور اس کے قریب ہی شیر کے قدموں کے نشان ہیں جس سے یہ اندازا کیا گیا کہ یہ پتھر شیر ہی نے لا کر رکھا ہے اور بعض لوگوں کا کہنا تھا کہ آپ کے مزار پاک کے اطراف ایک شیر کو مسلسل گومتے ہوئے بھی دیکھا گیا۔ عوام الناس کا عقیدہ ہے کہ آپ کے مزار کو تھام کر جو دعا بھی مانگی جائے وہ قبول ہوتی ہے۔

بعض لوگوں نے آپ کے وصال کے بعد آپ کو خواب میں دیکھا اور سوال کیا کہ خدا نے آپ کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ آپ نے فرمایا کہ میرا اعمال نامہ میرے ہاتھ میں دے دیا گیا جس پر میں نے عرض کیا کہ تو مجھے اعمال نامے میں کیوں الجھانا چاہتا ہے جبکہ میرے اعمال سے قبل ہی تو مجھ سے بخوبی واقف تھا کہ مجھ سے کس قسم کے اعمال سرزد ہو سکتے ہیں۔ لہذا میرا اعمال نامہ کرانا کاتبین کے حوالے کر کے مجھے اس جھنجھٹ سے نجات عطا کر دے تاکہ میں ہر وقت تجھ سے ہم کلام ہو سکوں۔ نفس کو ماتحت و غلام بنانے کیلئے آپ نے بے انتہا مجاہدات کئے۔ ایک بار نفس نے سرد پانی مانگا تو آپ نے اسے چالیس سال تک محروم رکھا۔ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے ستر سال اللہ تعالیٰ کی معیت میں اس طرح گزارے ہیں کہ اس دوران میں ایک لمحہ کیلئے بھی اپنے نفس کی کبھی اتباع نہیں کی۔

حضرت ابوالحسن خرقانی امی تھے۔ لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے۔ کسی استاذ کے سامنے زانوئے تلمذ طے نہیں کئے تھے مگر جب آپ پر اسرار فطرت منکشف ہونے لگے تو دیکھتے ہی دیکھتے ان باطنی اسرار و رموز کی خوشبو دور دور تک پھیل گئی تو ایک زمانہ آپ سے اکتساب فیض کرنے لگا۔ آپ کے بعض ارشادات اتنے گہرے تھے کہ ان تک رسائی کیلئے بڑے بڑے علماء و فضلاء حیرت میں گم ہو جاتے۔ آپ حرص و ہوس اور نفسانی خواہشات سے بچنے کی زبردست تلقین فرمایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ارشاد فرمایا: ”حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایسا بحر بے کراں تھے کہ اگر اس کا ایک قطرہ بھی باہر آ جاتا تو کل کائنات اس میں غرق ہو جاتی فرمایا کہ سعی بسیار کے باوجود بھی نہیں سمجھنا چاہیے کہ تم خدا کے لائق نہیں ہو اور نہ تمہیں اس قسم کا دعویٰ کرنا چاہیے ورنہ دلیل کے بعد تمہارا دعویٰ غلط ثابت ہوگا۔ تم جو چاہو رب کریم سے طلب کرو لیکن نفس کے بندے اور جاہ و مرتبہ کے غلام نہ بنو کیونکہ محشر میں مخلوق ہی مخلوق کی دشمن ہوگی۔ ممکن ہمارا دشمن اللہ تعالیٰ ہے اور وہ جس کا دشمن ہو جائے اس کا فیصلہ کبھی نہیں ہو سکتا۔“

اس لئے خدا ہی کے دامن رحمت میں پناہ ڈھونڈا کر۔

بعض اولیائے کرام کو جن امتحانات سے گزرنا پڑتا ہے۔ ان میں سے ایک تند خو اور بد مزاج بیویوں سے نباہ کرنا بھی ہے۔ آپ کی بیوی بھی سخت بد مزاج، بے لحاظ، منہ پھٹ اور سخت زبان تھی۔ سارا زمانہ آپ کا قدر دان تھا لیکن وہ آپ کو کچھ نہیں سمجھتی تھی۔ لیکن آپ بیوی کی سخت مزاجی کو بھی خدا کا امتحان اور بلندی درجات کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ ایک مرتبہ شیخ بوعلی سینا آپ کی روحانی قدر و منزلت کی شہرت سن کر آپ سے ملاقات کیلئے خرقان میں آپ کے گھر پہنچے اور آپ کی بیوی سے پوچھا کہ شیخ ابو الحسن خرقانی کہاں ہیں؟ بیوی نے بد مزاجی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

”تم ایک زندیق کو شیخ کہتے ہو۔ مجھے نہیں معلوم شیخ کہاں ہیں؟ البتہ میرے لئے جنگل سے لکڑیاں لانے گئے ہوئے ہیں۔“

یہ سن کر شیخ بوعلی سینا کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ جب آپ کی بیوی آپ کی اس قسم کی گستاخی کرتی ہے تو پھر آپ کا مرتبہ کیا ہوگا۔ اگرچہ میں نے آپ کی تعریف بہت سنی ہے لیکن یوں لگتا ہے کہ آپ ادنیٰ درجے کے انسان ہیں۔ پھر شیخ بوعلی سینا آپ کی تلاش میں جنگل کو روانہ ہو گئے تو دیکھ کر حیران رہ گئے کہ آپ شیر کی پشت پر لکڑیاں لاد کر بستی کی طرف لا رہے ہیں۔ یہ واقعہ دیکھ کر بوعلی سینا حیرت میں گم ہو گئے اور آپ کی دست بوسی کرتے ہوئے عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایسا بلند مقام عطا فرمایا ہے اور آپ کی بیوی آپ کے متعلق بہت بری بری باتیں کہتی ہے۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟

آپ نے جواب دیا کہ اگر میں ایسی بکری کا بوجھ برداشت نہ کر سکوں تو پھر شیر میرا بوجھ کیسے اٹھا سکتا ہے۔ پھر آپ بوعلی سینا کو گھر لے گئے اور گفتگو کے بعد فرمایا ”مجھے اجازت دیجئے میں نے دیوار تعمیر کرنی ہے اور مٹی بھگو چکا ہوں۔ یہ کہہ کر آپ دیوار پر جا بیٹھے۔ اسی وقت آپ کے ہاتھ سے بسولی چھوٹ کر نیچے گر پڑی اور جب شیخ بوعلی سینا اٹھا کر دینے کیلئے آگے بڑھے تو وہ خود بخود زمین سے اٹھ کر آپ کے ہاتھ میں پہنچ گئی۔ حضرت بوعلی سینا نے یہ ایمان افروز منظر دیکھا تو فوراً آپ کے معتقدین میں شامل ہو گئے۔“

عجب شان خداوندی ہے پنہاں حق کے بندوں میں
شمار ہوتا ہے ان کا حق شعاروں سر بلندوں میں



درویشِ باکمال

پیر سید محمد معصوم شاہ گیلانی نوری رحمۃ اللہ علیہ

ممتاز روحانی شخصیت اور عشاقِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے دلوں کی دھڑکنوں میں بسنے والے حضرت پیر سید محمد معصوم شاہ گیلانی قادری نوری کا شمار بلاشبہ اہل اللہ میں ہوتا ہے۔ آپ علم اور عمل کے لحاظ سے تعلیمات قرآنی کی تصویر تھے۔ محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں گم رہتے تھے۔ عشق رسول ان کا افتخار اور اعزاز تھا۔ ان کا بہت بڑا اعزاز یہ ہے کہ تعلیمات رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور افکار شاہ احمد رضا خاں رحمۃ اللہ علیہ کو عام کرنے کیلئے انہوں نے ناقابل فراموش کردار ادا کیا۔ انہوں نے اپنے کردار اور علم سے ایسا چراغ روشن کیا جس سے بے شمار چراغ روشن ہوئے۔

آپ کی ولادت ۱۳۱۸ھ/۱۹۰۰ء میں شیخ المشائخ سید فضل کے گھرانے کے آبائی گاؤں سادہ چک شریف (ضلع گجرات) میں ہوئی۔ اس قصبہ میں آپ کے مرشد کے علاوہ آپ کے خاندان کی برگزیدہ ہستیاں دفن ہیں۔ آپ پیدائش کے تھوڑا عرصہ بعد ہی والد گرامی کے سایہ رحمت سے محروم ہو گئے۔ ابھی اس صدمے کے زخم تازہ تھے کہ اس صدمہ کے دو سال بعد والدہ محترمہ مکرمہ بھی دار فانی سے کوچ کر گئیں۔

سید معصوم شاہ گیلانی کی امی جان بڑی پاکیزہ فکر خاتون تھیں۔ انہیں اپنے وصال سے پہلے ہی بارگاہ خداوندی میں حاضری کا علم ہو گیا تھا۔ اس لئے انہوں نے وصال سے پہلے شاہ صاحب کی تایا زاد بہن کو ان کی تعلیم و تربیت کے لحاظ سے خصوصی نصیحت کی۔ آپ کی تایا زاد بہن نے اس حکم کی تعمیل میں آپ کو ممتاز عالم دین مفتی محمد امام الدین رحمۃ اللہ علیہ کے پاس بھیجا جو پہلے ہی آپ کے خاندان سے محبت رکھتے تھے۔ انہوں نے تمام علوم متداولہ میں آپ کو تعلیم دی علوم دینیہ کی تعلیم کے بعد مرشد کی تلاش ہوئی تو نامور روحانی شخصیت حضرت بابا فضل نور نوری (موزن مسجد داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ) کے دستِ حق پرست پر بیعت کی۔ پیر کامل کی نورانی صحبت میں معرفت خداوندی اور طریقت کی منازل طے کیں۔ پیر کامل نے خوب خوب نوازا اور آپ کو بہت جلد وہاں پہنچا دیا

جہاں تک پہنچنے کیلئے عمریں درکار ہوتی ہیں۔

شیخ واصل باللہ نے خرقہ دستار خلافت کی دولت سے نوازا اور کشف المحجوب کی ایک جلد مرحمت فرمائی۔ اس کے ساتھ ہی آپ کو کتاب اللہ کا درس دینے کی تلقین فرمائی۔ آپ فی الواقع خانوادہ نوریہ کے لعل شب چراغ بن گئے۔ آپ کے روئیں روئیں میں عشق محمدی کار فرما تھا۔ مرشد کے حکم کے مطابق آپ ہفتہ میں دو بار دربار حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ میں انتہائی سادہ پیرائے میں کشف المحجوب کا درس دیتے۔

سجادہ نشین دربار عالیہ آپ کی روحانیت کے اس حد تک قائل ہو گئے کہ اپنا حجرہ تک آپ کے قیام کیلئے وقف کر دیا۔ درس میں اسرار و معارف بیان کرتے تو حاضرین پر سکتے کا عالم طاری ہو جاتا اور وعظ و پند کا ایک ایک لفظ دل میں نقش ہو جاتا۔ آپ کے وعظ و تقریر میں بلا کی تاثیر اور روانی تھی، آپ نے طریقت کا وہ سلسلہ اختیار کیا تھا جس میں تعلیم دین کو تعلیم پر مقدم رکھا گیا تھا اور احکام شرع کا خاص پاس و لحاظ۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ

”حال طابع شریعت ہے نہ شریعت تابع احوال ہے“

مخدوم اہلسنت سید محمد معصوم نوری کا بڑا کارنامہ اسلام کی اشاعت و بازیافت ہے، آپ نے شعائر اسلام کے احترام پر زور دیا، پہلی دفعہ حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کے عرس پاک کی مقدس تقریب میں پند و موعظ کی مجالس کا انعقاد کیا جس کے فیضان سے لاکھوں لوگوں میں اسلامی حمیت و جرات پیدا ہوئی، جو بے عمل تھے وہ باعمل اور صاحب مقام ہو گئے۔ آپ نے دو دفعہ حج بیت اللہ شریف ادا کیا، پھر مدینہ الرسول کی زیارت اور گنبد خضریٰ کو دل کے لبوں سے بوسہ دینے کا اشتیاق پورا کیا۔ پاک و ہند اور بلاد اسلامیہ کے شیوخ کے مزارات پر بھی غلامانہ حاضری دی، فیوض و برکات سے دامن مراد بھرا۔ آپ اپنے دور کے ایک بہت بڑے شیخ طریقت ہونے کے ساتھ ساتھ بے بدل عالم شریعت بھی تھے اپنے عارفانہ اشغال میں ہمیشہ شریعت مطہرہ کو پیش پیش رکھتے۔ احکام شریعت سے سر مو انحراف گراں تھا۔ حضرت مخدوم اہلسنت کے شب و روز کا بیشتر حصہ عبادت و ریاضت میں صرف ہوتا یا خدمت خلق میں مصروف رہتے تھے۔ طبیعت میں اسلامی اخلاق و ادب کی فیضان بختی تھی، انتہائی سادگی شیوہ تھی، تکلفات سے کوسوں دور رہتے تھے، پاکیزگی اور نفاست گویا کہ لازمہ حیات تھی۔ سنت نبوی کا ہر عمل اور ہر حرکت میں خیال رکھتے تھے اور جس حد تک ممکن ہوتا اس کے مطابق عمل کرتے، سید محمد معصوم شاہ نوری بچپن ہی سے بڑے خاموش طبع تھے۔ کھیل کود ناچ گانے سے سخت نفرت تھی۔ اگر

کوئی عزیز شادی کیلئے مدعو کرتا تو اس سے پہلے ہی دریافت کر لیتے کہ کہیں اس شادی میں ڈھول باجے اور بے جا اسراف سے تو کام نہیں لیا جائے گا۔ جب تک آپ کو یہ یقین نہ ہو جاتا شادی میں شرکت نہ کرتے مریدوں اور معتقدین کا کہنا ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی میں حضرت سید محمد معصوم نوری کو خلاف شرع کام کرتے نہیں دیکھا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ سب کو نماز کی ادائیگی کیلئے سختی سے تلقین فرماتے اور بے نمازی سے میل جول پسند نہ کرتے تھے۔ درحقیقت آپ مینارۂ نور تھے اور فضائل و اعمال، عفو و حلم، جود و سخاوت، مروت و شرافت، صبر و استقامت کے اوصاف عالیہ سے آراستہ تھے۔ ان کی ذات حضور غوث اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی زندہ کرامت اور تصوف و شریعت کی صداقت و ابدیت کی روشن دلیل تھی۔

فرنگی دور میں ریاست جموں و کشمیر میں انگریزوں اور ہندوؤں کی ملی بھگت سے قرآن پاک کے خلاف مکروہ تحریک چلی۔ اس تحریک کے خلاف غیور مسلمان اور علماء مشائخ اٹھ کھڑے ہوئے اور قریہ قریہ جا کر مسلمانوں کو بیدار کرتے اور ہندو فرنگی سازش کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے تھے اس گروہ میں آپ بھی تھے ہر جگہ جا کر با آواز بلند ایک نعرہ مستانہ لاپتے کہ

”بھائیو! کشمیر وچ چلو او تھے جنت مل دی اے“

بلآخر آپ دوسرے مجاہدین کے ساتھ تعزیرات انڈیا کے تحت گرفتار ہوئے اور جیل میں چلے گئے۔ اگست ۱۹۴۷ء سے قبل جن علماء مشائخ نے تحریک پاکستان میں بھرپور حصہ لیا اور اس کو جدید زبان میں ایک سیاسی تحریک کی بجائے ایک قومی و ملی تحریک تصور کیا۔ اس درخشاں تحریک میں آپ نے اپنے ارادت مندوں کو دوسرے مشائخ کی طرح ہدایت فرمائی کہ آپ حضرت قائد اعظم محمد علی جناح رحمۃ اللہ علیہ کی قیادت میں سبز ہلالی پرچم کے تلے جمع ہو جائیں اور قیام پاکستان کی علمبردار جماعت مسلم لیگ کی ہر طرح مدد کریں چنانچہ آپ کی اس ہدایت پر آپ کے مریدوں اور عقیدت مندوں نے دل کھول کر چندے دیئے اور رائے عامہ کو مطالبہ پاکستان کے حق میں ہموار کیا۔ وجود پاکستان کے بعد مہاجرین کی آباد کاری کیلئے بھی آپ نے بہت کام کیا۔

۱۹۵۳ء میں قادیانی تحریک کے خلاف آپ بھی اٹھ کھڑے ہوئے اور علماء و مشائخ کے شانہ بشانہ رہے اور میدان عمل میں ہر طرح ان کی امداد و اعانت کرتے رہے۔

اولیائے سلف کی طرح مخدوم اہلسنت حضرت سید محمد معصوم شاہ نوری کو بھی تبلیغ کا بڑا ذوق شوق تھا چنانچہ اس شوق کی تکمیل کیلئے آپ نے پنڈی بھٹیاں ضلع حافظ آباد سبھرات اور لاہور میں

تقریباً ۲۵ مساجد اور تین عید گاہیں تعمیر کروائیں۔ ان میں جامع مسجد نوری بالمقابل لاہور ریلوے اسٹیشن خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اس کا نقشہ مسجد نبوی سے مشابہ ہے اور اس کا گنبد دہری سے ہر آنے جانے والے کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے۔ آپ نے جامع مسجد نوری کی تعمیر کے سلسلہ میں بہت سی صعوبتیں برداشت کیں، مگر پائے استقلال میں لغزش نہ آنے پائی۔ اس مسجد میں بچوں کو کلام اللہ کی تعلیم مفت دی جاتی ہے، علاوہ ازیں مریضوں کے علاج کیلئے ایک طبی مرکز بھی قائم کیا گیا ہے جہاں تمام جدید طبی سہولتیں بلا امتیاز مفت مہیا کی جاتی ہیں۔ اس مسجد کے ایک حجرے میں ”مرکزی مجلس رضا“ کا ہیڈ آفس ہے اور نظریات فاضل بریلوی کا پرچار کرتا ہے اور گاہے بگاہے کتابیں تالیف کرا کے مفت تقسیم کرتا ہے۔ تبلیغ دین کے سلسلے میں آپ کا سب سے بڑا کارنامہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خاں بریلوی، شیخ عبدالحق محدث دہلوی، مفتی احمد یار خان نعیمی گجراتی رحمۃ اللہ علیہ کی کتابوں کی از سر نو اشاعت تھا۔ اس ضمن میں حضرت ۱۹۲۵ء میں نوری کتب خانہ کے نام سے اپنا مکتبہ قائم کیا، جسے حضرت کے فرزند اصغر سیدی محمد حسن شاہ نوری ضیائی بہ طریق احسن چلا رہے ہیں، اس مکتبہ سے شائع شدہ کتابوں کے مطالعہ سے ہزاروں فرزندان توحید کے سینے نور ایمان اور عشق مصطفیٰ سے روشن و منور ہو گئے۔

مخدوم اہلسنت سید محمد معصوم نوری رحمۃ اللہ علیہ جہاں ایک بلند پایہ عالم دین ولی اللہ سچے عاشق رسول اور روحانیت کا سرچشمہ تھے وہاں ایک زبردست مصنف بھی تھے۔ آپ کی تصانیف میں مواعظ القرآن والحدیث تین جلدیں، ارشادات حضرت داتا گنج بخش، بحری روٹی (منظوم پنجابی) وغیرہ شامل ہیں۔ بالآخر یہ آفتاب علم و دانش ۶۹ سال کی عمر میں ۲۹ شوال ۱۳۸۸ھ ہفتہ وار اور اتوار کی درمیانی شب پونے سات بجے بمطابق ۱۸ جنوری ۱۹۶۹ء اپنے فرزند اصغر صاحبزادہ سید محمد حسن شاہ کی قیام گاہ معصوم منزل نوری مسجد اسلام گنج، عقب داتا دربار لاہور واصل الی اللہ ہوئے۔ لاہور میں نماز جنازہ اتوار کو نماز فجر کے بعد ۴ بجے صبح ادا کی گئی۔ یہ فریضہ مولانا سعید احمد نقشبندی امام خطیب مسجد داتا دربار نے انجام دیا۔ اس کے بعد آپ کی وصیت کے مطابق میت کو گجرات لے جایا گیا، جہاں ہزاروں کی تعداد میں اس مرد قلندر کا آخری دیدار کرنے کیلئے لوگ جمع ہوئے۔ دوسری نماز جنازہ حکیم الامت مفتی احمد یار خان نعیمی گجراتی رحمۃ اللہ علیہ نے پڑھائی۔ تیسری نماز جنازہ سید محمد معصوم نوری رحمۃ اللہ علیہ کے آبائی گاؤں چک سادہ شریف میں حضرت کے استاد زاوے عالم باعمل میاں رحمت اللہ نے پڑھائی اور جسد مبارک کو مرشد کامل کے پہلو میں دفن کیا گیا۔ آپ کا مزار مرجع خلائق ہے۔ مخدوم اہلسنت کے خلفاء میں سید محمد حسین گیلانی فرزند اکبر، سید محمد حسن گیلانی ضیائی فرزند اصغر، سید علی شاہ اور صاحب

زادہ رؤف احمد نوشاہی شامل ہیں۔

آپ کے وصال سے نجانے کتنے دلوں کو صدمہ پہنچا۔ کتنے ہی ارادت مند تھے جن کیلئے دنیا اندھیر ہو گئی۔ لیکن آج کارہائے نمایاں انجام دے گئے ان کی وجہ سے آپ کا نام قیامت تک زندہ رہے گا۔ آپ نے پنجاب میں اس وقت ”کنز الایمان“ اور اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کی کتب کی اشاعت کیلئے کام کیا جب بعض باطل قوتوں کے تعصبات نے اندھیرے پھیلا رہے تھے۔

سلام ہو آپ پر اے حضرت معصوم گیلانی

سلام ہو آپ پر عشق نبی کی شمع نورانی

جو شمعیں آپ نے ہر سو جلائیں، بجھ نہیں سکتیں

فروزاں آپ کی تربیت پہ ہوں انوار یزدانی



مصادر و مراجع

- قرآن حکیم
- کنز الایمان ترجمہ شاہ احمد رضا خاں حاشیہ علامہ نعیم الدین مراد آبادی
- تفسیر ضیاء القرآن از ضیاء الامت پیر محمد کرم شاہ الازہری
- تفسیر الحسنات، مولانا ابوالحسنات محمد احمد قادری لاہوری
- تفہیم القرآن علامہ سید ابوالاعلیٰ مودودی
- تفسیر نعیمی، حکیم الامت مولانا احمد یار خاں نعیمی علیہ الرحمۃ
- شرح بخاری شریف، ترجمہ و تفسیر علامہ عبدالحکیم خاں اختر شاہجہانپوری ۳ جلد
- موطا امام مالک، ترجمہ و تحشیہ علامہ عبدالحکیم اختر شاہجہانپوری
- شرح صحیح مسلم، شیخ الحدیث علامہ غلام رسول سعیدی کراچی (۷ جلد)
- جامع ترمذی مع شمائل ترمذی، از علامہ محمد صدیق سعیدی ہزاروی (۲ جلد)
- الخصائص الکبریٰ (حضرت جلال الدین سیوطی) ترجمہ راجہ رشید محمود، سید حامد لطیف (۲ جلد)
- قصص الانبیاء حضرت علامہ ابن کثیر دمشقی، علامہ محمد انور مگھالوی
- محسن انسانیت، نعیم صدیقی
- سیرت رسول عربی، علامہ نور بخش توکلی
- محمد رسول اللہ، شیخ محمد رضا، قاہرہ
- رحمۃ اللعالمین، قاضی محمد سلیمان منصور پوری (۳ جلد)
- ضیاء النبی، ضیاء الامت پیر محمد کرم شاہ الازہری (۷ جلد)
- سیرت المصطفیٰ، محمد ادریس کاندھلوی (۳ جلد)
- سیرت الرسول، ڈاکٹر پروفیسر طاہر القادری (۱۰ جلد)
- سیرت النبی، مولانا شبلی نعمانی، سید سلیمان ندوی
- الرحیق المختوم، مولانا صفی الرحمن مبارک پوری

فوز و فلاح کے ایک سو پچاس چراغ، طالب الہاشمی

تذکار صحابیات، طالب الہاشمی

حضرت ابو ایوب انصاری، طالب الہاشمی

تیس پروانے شمع رسالت کے، طالب الہاشمی

جمال فقر، پروفیسر محمد اکرم رضا

مرکز تجلیات، پروفیسر محمد اکرم رضا

تاجدار خطابت، پروفیسر محمد اکرم رضا

ماہنامہ قومی ڈائجسٹ، مدیر مجیب الرحمن شامی لاہور (شمارہ جنوری، فروری ۱۹۸۵ء)

چار سو باکمال خواتین، طالب الہاشمی

کشف الخجوب، ترجمہ علامہ محمد افضل گوہر

قومی ڈائجسٹ، مدیر مجیب الرحمن شامی (محمد اسلم ڈوگر) مارچ ۱۹۸۳ء

سیارہ ڈائجسٹ، ایڈیٹر علی سفیان آفاقی، نواز رومانی، مولوی عبدالکفیل

محمد ریاض قادری، عامر شہزاد جی آرا عوان، عابد شکوہ

ماہنامہ قومی ڈائجسٹ، مدیر مجیب الرحمن شامی (محمد اسلم ڈوگر) مارچ ۱۹۸۳ء

اولیائے نقشبند، سیرت حضرت شیر ربانی، محمد امین شرچپوری

خلفائے رسول، مولانا سید خضر حسین شاہ چشتی سیالوی

تذکرۃ الاولیاء، حضرت شیخ فرید الدین عطار، تصحیح مبارک علی قادری

محفل اولیاء، علامہ شاہ مراد سہروردی (تدوین: پروفیسر محمد نصر اللہ امینی)

مہر منیر، مولانا فیض احمد فیض گولڑوی

نور اسلام، اول تا سوم، اولیائے نقشبند اول، مدیر اعلیٰ صاحبزادہ میاں جمیل احمد شرچپوری (مارچ)

اپریل ۱۹۷۹ء

سیرت امیر ملت، پروفیسر محمد طاہر فاروقی، سید اختر حسین علی پوری

دلی کے بانگیں، خواجہ ڈاکٹر ظہور الحسن بشارب

جمال اکبری، پروفیسر محمد اکرم رضا

تعارف علمائے اہلسنت، مولانا محمد صدیق ہزاروی

ماہنامہ تسلسیل، سرکار پیر بلوی، نمبر مدیر حاجی فضل احمد

- نام و نسب، علامہ سید نصیر الدین نصیر گیلانی (گولڑہ شریف)
- ذکر ولی (تذکرہ حضرت قبلہ خواجہ احمد میروی) حکیم مولوی سید کرم حسین شاہ
- ماہنامہ ضیائے حرم، شیخ الاسلام نمبر
- حیات شیخ الاسلام، پروفیسر محمد اکرم رضا
- ماہنامہ ضیائے حرم، حضرت شمس العارفین نمبر مدیر ڈاکٹر خواجہ عابد نظامی
- انوار لائٹانی، محمد رفیق ابن محمد اسماعیل کھوکھر، مطبوعہ حجازی پریس لاہور
- حضرت لائٹانی، صائم چشتی، فیصل آباد۔ ۱۴۰۲ھ
- حیات اکبر، صائم چشتی، چشتی کتب خانہ فیصل آباد ۱۴۰۲ھ
- نجم الہدیٰ، مرزا ریاض احمد، مکتبہ چراغیہ لاہور ۱۹۸۶ء
- انوار لائٹانی، پروفیسر محمد امین آسی، دربار لائٹانیہ علی پور سیداں شریف ۱۹۸۲ء
- مکاشفۃ القلوب، امام غزالی
- منہاج العابدین، امام غزالی، ترجمہ علامہ سعید احمد نقشبندی
- احیائے العلوم، امام غزالی، ترجمہ محمد صدیق ہزاروی
- کیمیائے سعادت، امام غزالی، ترجمہ علامہ محمد منشاء تائبش قصوری
- رسالہ قشیریہ، ترجمہ ڈاکٹر پیر حسن
- عوارف المعارف، حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی، ترجمہ علامہ شمس بریلوی
- غنیۃ الطالبین، سیدنا عبدالقادر جیلانی بغداد، ترجمہ علامہ شمس بریلوی
- الفتح الربانی، سیدنا عبدالقادر جیلانی بغداد، قادری رضوی کتب خانہ لاہور
- فتوح الغیب، سیدنا عبدالقادر جیلانی بغداد، قادری رضوی کتب خانہ لاہور
- سر الاسرار، سیدنا عبدالقادر جیلانی بغداد، قادری رضوی کتب خانہ لاہور
- تصوف، سید خورشید احمد گیلانی
- نجات الانس، حضرت عبدالرحمن جامی، ترجمہ علامہ شمس بریلوی
- نزہۃ المجالس، امام عبدالرحمن صفوری، ترجمہ علامہ محمد منشاء تائبش قصوری
- تنبیہ الغافلین، فقیہ ابواللیث سمرقندی، فرید بک سٹال لاہور
- ہشت بہشت، علامہ عنصر صابری، شبیر برادرز لاہور
- انقلاب الحقیقت، حضرت محمد عمر بیربل شریف، زاویہ لاہور

جلو دست قدرت
بارہ میلادی
چار زندہ نبی
سیرت شریف
جہان انبیا
انعامِ نقابت
نصائحِ اعلیٰ
خطباتِ مجددیہ
خطباتِ نورانی
نورانی حکایات
شانِ حبیبِ الہی
رسالہ جہانِ نبوی
نماز کے احکام
مسلمان کا عقیدہ
یونانِ حبیبیہ
بیانِ گوہر
تذکرہ الاولیاء
سقاخت
اور
جماری ذمہ داریاں

تحفۃ القادریہ
سید صلیق اکبر
قبولِ حالات
جہانِ اولیاء

سر الاسرار
عبتِ حقیقت
کردارِ یزید
شایانِ گوہر

جناب رسول اللہ کی نماز
حداق بخشش
لمن الطاہرین
انوارِ اربعہ
تحفہ حقیقیہ
تقریح الخاطر
قبول الشیخ عبدالقادر

عذیبۃ الطاہرین
کتاب الامور
ماتہ الامور
مہجراتِ رسول کریم
اعمالِ جنت
خطباتِ الحقیقیہ
شانِ حبیبِ المتعم
روایاتِ المسلم

قصص الانبیاء
ادابِ رسول
نزیرۃ المجراس
مدارج النبوۃ
مصطفیٰ سیرت
جنتیاد
مولانا صاحب
خان محمد قادی
کی تقریریں

قادی رضوی کتب خانہ
042-7213575
کیا پ جانتے ہیں
فروع الخیث
نورۃ الخاطر
امام احمد اور شیخ مصطفیٰ
جنتیاد